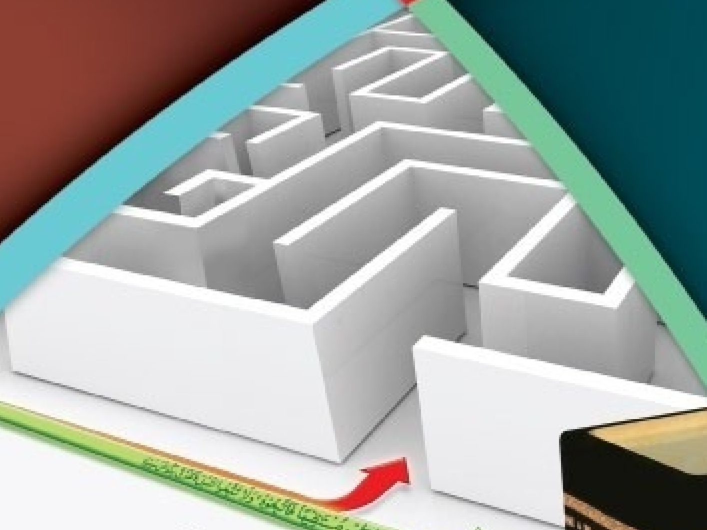
العواصم من القواصم اور المنتقی سے اہم ترین حواشی اور تخریج حدیث کے ساتھ

مختصر منہاج السنۃ

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ





4-3

اختصار وترجمہ وتعلیقات وحواشی

پیرزادہ شفیق الرحمٰن شاہ الدراوی حفظہ اللہ

فہرست مضامین

❀❀❀❀

اللہ تعالیٰ کی قدرت کے متعلق رافضی الزام پر ردّ

فصل: ...... رافضی کہتا ہے:''بعض لوگ اس طرف گئے ہیں کہ رب تعالیٰ میں بندوں جیسی بھی قدرت نہیں ۔''

اس کا جواب یہ ہے کہ: یہ مسئلہ دقیقِ کلام میں سے ہے، اہلِ سنت کے خصائص میں سے نہیں، اور نہ متفق علیہ خلفاء کے ماننے والوں کا ہے۔ بلکہ یہ بعض قدریہ کا قول ہے۔ رہے قدر کو ثابت کرنے والے اہلِ سنت تو ان میں سے کوئی اس کا قائل نہیں۔ یہ قدریہ کے ان شیوخ کا قول ہے جو توحید اور عدل کے مسائل میں ان متاخرین امامیہ کے بھی شیوخ ہیں۔ کیونکہ ان متاخرین امامیہ جیسے ابن نعمان، موسوی المرتضیٰ اور ابوجعفر طوسی وغیرہ۔ ❶ میں سے جس نے بھی عدل اور توحید کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، وہ معتزلہ کی کتابوں سے ماخوذ ہے۔ بلکہ اکثر عبارتیں تو من وعن ہیں۔ البتہ بعض عبارات میں معمولی تصرف ہے۔

اسی طرح صفات اور قدر سے متعلق آیات کی تفسیر کا حال بھی یہی ہے۔ کہ وہ معتزلہ کی تفسیر سے منقول ہے۔ جیسے الاصم ❷، جبائی ❸، عبدالجبار بن احمد الہمد انی ❹، رمانی ❺ ابومسلم اصبہانی ❻ وغیرہ کہ متقدمین امامیہ میں سے کسی ایک سے بھی ان اقوال میں سے ایک حرف بھی منقول نہیں۔ نہ تو اصولِ عقلیہ میں اور نہ تفسیر قرآن میں۔

امامیہ کے متقدمین کا اپنے آئمہ پر ان متاخرین سے زیادہ اجماع تھا۔ چنانچہ وہ لوگ جعفر صادق کے اقوال کو زیادہ لیتے تھے۔ تب پھر اگر تو ان متاخرین کے اقوال حق ہیں تو جملہ متقدمین گمراہ ہیں اور اگر ان متقدمین کے اقوال حق ہیں۔ یہ متاخرین سب کے سب گمراہ ہیں۔

---

❶ ابن نعمان: یہ محمد بن محمد بن نعمان بن عبدالسلام بغدادی کا ہے جس کا لقب شیخ مفید ہے، اور مرتضیٰ: یہ علی بن حسین بن موسیٰ بن محمد ہے، اور طوسی: یہ ابوجعفر محمد بن حسن بن علی ہے، جو امامیہ کا شیخ اور رئیس الطائفہ ہے۔ ان تینوں کا ترجمہ گزر چکا ہے۔

❷ اس کا نام ابوبکر عبدالرحمٰن بن کیسان الاصم ہے؛ قاضی عبدالجبار نے اپنی کتاب" فضل الاعتزال و طبقات المعتزلة "میں اس کا ذکر چھٹے طبقہ کے معتزلہ میں کیا ہے (ص ۲۶۷)

❸ جبائی کا پورا نام ابوعلی محمد بن عبدالوہاب ہے؛ فرقہ جبائیہ اسی کی طرف منسوب ہے۔ قاضی عبدالجبار نے اپنی کتاب" فضل الاعتزال و طبقات المعتزلة "میں اس کا ذکر آٹھویں طبقہ کے معتزلہ میں کیا ہے (ص ۲۸۷)

❹ قاضی ابوالحسین عبدالجبار بن أحمد الہمذانی أسد آبادی؛ متوفی ۴۱۵ھ؛ اس کے حالات زندگی کے لیے دیکھیں: فضل الاعتزال ص ۱۲۱۔ اس پر ڈاکٹر عبدالکریم عثمان نے'' قاضی القضاۃ عبدالجبار بن احمد الہمذانی'' کے نام سے کتاب بھی تالیف کی ہے۔

❺ ابوالحسن علی بن عیسی بن علی بن عبداللہ الرمانی؛ معتزلہ کے مفسرین میں سے تھے؛ اور بہت بڑے نحوی تھے۔ ۲۹۶ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے؛ اور ۳۸۴ھ میں یہیں پر وفات پائی۔ دیکھیں:" فضل الاعتزال و طبقات المعتزلة "(ص ۳۳۳) بغية الوعاة للسيوطى ٣٤٤؛ المنية والأمل لابن المرتضى ص ٦٥۔

❻ ابومسلم محمد بن بحر الاصفہانی؛ قاضی عبدالجبار نے اس کا ذکر دو مرتبہ کیا ہے۔" فضل الاعتزال و طبقات المعتزلة "(ص ۲۹۹۔ اور ص ۳۲۳)

فصل:......قضاء وقدر پر رافضی کا کلام

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''اکثر اہل سنت یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بذات خود افعال قبیحہ اور کفر کا مرتکب ہوتا ہے، اور یہ سب کچھ اس کی قضا وقدر کے مطابق وقوع پذیر ہوتا ہے۔ بندے کا اس میں کچھ دخل نہیں اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ کافر معاصی کا مرتکب ہوتا رہے اور وہ کافر سے اطاعت نہیں چاہتا۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی مصلحت کے لیے کوئی بھی کام نہیں کرتا۔ اور اللہ تعالیٰ کافر سے معاصی ہی چاہتا ہے؛ اور اس سے وہ اطاعت گزاری نہیں چاہتا۔ اس سے کئی برائیاں لازم آتی ہیں۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جواب]: ہم جواباً کہتے ہیں......اولاً: [اور قبل ازیں اس پر روشنی ڈال چکے ہیں]......کہ تقدیر اور عدل و جور کے مسائل کا امامت و خلافت کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں؛ نہ ہی یہ مسائل آپس میں لازم وملزوم ہیں۔ مگر شیعہ مصنف بایں ہمہ وہی مسائل دہرائے جا رہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ حضرت صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما کی خلافت کا اقرار کرنے والے بعض لوگ تقدیر میں وہی عقیدہ رکھتے ہیں جو کہ اس کتاب کے مصنف کا عقیدہ ہے۔ اس کے برعکس بعض روافض تقدیر کے قائل ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ دونوں مسئلے ایک دوسرے سے یکسر جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اور یہ باہم لازم و ملزوم نہیں ہیں۔

یہ حقیقت اپنی جگہ پر واضح ہے کہ مسئلہ تقدیر اور صفات الٰہی کے اثبات میں اہل بیت سے ان گنت روایات منقول ہیں، مگر متاخرین شیعہ نے تشیع کے عقائد کے ساتھ ساتھ جہمیہ اور قدریہ کے افکار ومعتقدات کا ضمیمہ بھی لگا لیا ہے، اور وہ صرف شیعہ عقائد ہی کے حامل نہیں رہے، یہ شیعہ مصنف بھی اسی زمرہ میں داخل ہے۔ اس سے پہلے امامیہ فرقے کے اس عقیدہ کا بیان گزر چکا ہے کہ: کیا اللہ تعالیٰ افعال العباد کا خالق ہے یا نہیں؟ اس میں ان کے دو قول ہیں؛ ایسے ہی زیدیہ کے بھی دو قول ہیں۔

اشعری نے کہا ہے: زیدیہ خلقِ افعالی میں دو فرقے بن گئے ہیں۔ ایک فرقہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ بندے کے افعال کا خالق اللہ ہے۔ رب تعالیٰ نے ان کو عدم سے وجود بخشا ہے۔ تب پھر یہ اس کے لیے حادث ہیں۔ جبکہ دوسرا ان کو اللہ کی مخلوق نہیں مانتا۔ بلکہ بندہ ان کا خالق اور کاسب ہے۔

میں کہتا ہوں کہ: اکثر متقدمین شیعہ تقدیر کو ثابت مانتے تھے۔ اس کا انکار متاخرین شیعہ میں ظاہر ہوا ہے۔ جیسے صفات کا انکار؛ کہ متقدمین شیعہ میں سے اکثر صفات کے اثبات کے قائل تھے، اور اہلِ بیت سے صفات اور قدر کے بارے میں اس قدر روایات ہیں جو شمار سے باہر ہیں۔

رہے قدری ہونے کے باوجود خلفائے ثلاثہ کی امامت کے قائل تو وہ معتزلہ اور غیر معتزلہ میں بہت زیادہ ہیں۔ اکثر قدریہ خلفائے ثلاثہ کی امامت کے قائل ہیں۔ متقدمین قدریہ میں سے اس کا منکر کوئی نہیں۔ یہ انکار تب ظہور میں آیا جب کچھ لوگ رافضی قدری اور جہمی بنے تو انہوں نے بدعتوں کے اصول کو جمع کیا۔ جیسے کہ اس کتاب کا مصنف۔

زیدیہ خلفائے ثلاثہ کے اقرار ہیں۔ حالانکہ یہ شیعہ میں سے ہیں۔ ان میں قدریہ اور غیر قدریہ اور غیر قدریہ دونوں ہیں۔ یہ زیدیہ امامہ سے بہتر ہیں، اور امامیہ کے زیادہ مشابہ جارودیہ ہیں۔ جو ابوالجارود ❶ کے پیروکار ہیں۔ جن کا یہ عقیدہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی نام لیے بغیر وصف ذکر کر کے نص کہی ہے، اور نبی کریم ﷺ کے بعد جناب علی رضی اللہ عنہ امام تھے، اور لوگ نبی کریم ﷺ کے بعد ان کی اقتداء چھوڑ کر گمراہ اور کافر ہو گئے تھے۔ پھر حسن رضی اللہ عنہ امام ہیں اور پھر حسین رضی اللہ عنہ۔

پھر ان میں سے کوئی اس بات کا قائل ہے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ نے حسن رضی اللہ عنہ کی امامت پر نص کہی، انہوں نے حسین کی امامت پر پھر یہ امامت دونوں کی اولاد میں شوریٰ تھی۔ سو ان میں سے جو بھی داعی الی اللہ نکلا اور وہ عالم و فاضل بھی ہے سو وہ امام ہے۔

زیدیہ کا دوسرا فرقہ سلیمانیہ ہے۔ یہ سلیمان بن جریر کے اصحاب ہیں۔ جن کے نزدیک امامت یہ شوریٰ ہے، اور یہ دو نیک مسلمانوں سے بھی قائم ہو سکتی ہے، اور بسا اوقات یہ مفضول میں بھی پائی جاتی ہے۔ چاہے فاضل ہر حال میں افضل ہی ہو، اور یہ حضرات شیخین ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے لیے امامت کو ثابت کرتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ امامت خطا تھی۔ البتہ تاویل کی وجہ سے صاحبِ امامت فاسق نہ تھا۔ ❷

جبکہ دوسرے قول کے قائلین بتریہ ہیں، یہ کُثَیِّر النواء کے اصحاب ہیں، ان کے بتریہ نام کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر کا لقب ابتر تھا۔ ان کے نزدیک جنابِ علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے بعد افضل الخلائق اور امامت کے سب سے زیادہ اہل تھے۔ البتہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی بیعت خطا نہ تھی۔ کیونکہ جنابِ علی رضی اللہ عنہ ان دونوں کی خاطر امامت ترک کر دی تھی۔ البتہ یہ لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے قتل کے بارے میں توقف کرتے ہیں، اور انہیں کافر نہیں کہتے۔ جیسا کہ سلیمانیہ

---

❶ یہ زیادہ بن ابی زیاد منذر ہمدانی خراسانی العبدی ہے۔ کنیت ابوالنجم تھی۔ کبھی نہدی اور ثقفی بھی کہلاتا تھا۔ ۱۵۰ھ سے ۱۶۰ھ کے درمیان وفات پائی۔ یہ زیدیہ میں سے جارودیہ فرقہ کا بانی تھا۔ شہرستانی نے نقل کیا ہے کہ جعفر صادق نے اس کا نام سرحوب رکھا اور باقر نے اس کی یہ تفسیر بیان کی ہے کہ سرحوب اندھے شیطان کو کہتے ہیں جو سمندر میں رہتا ہے۔ نوبختی کے بقول ابن جارود نگاہ کا بھی اندھا تھا اور دل کا بھی اندھا تھا۔ جارودیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جنابِ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی نص ارشاد فرمائی ہے۔ لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے بعد امام تھے اور لوگ انہیں چھوڑنے کی بناء پر کافر اور گمراہ ہو گئے تھے۔ ان کے نزدیک علی رضی اللہ عنہ کے بعد حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ امام ہیں۔ پھر امامت اولاد حسین میں شوریٰ ہے۔ غرض ان کے اور بھی متعدد گمراہانہ عقائد ہیں۔ ان کی تفصیل کے لیے دیکھیں:
فرق الشیعه للنوبختی، ص: ۷۵ ـ ۷۸ـ (۱۳۷۹/ ۱۹۵۹. ط. حیدریه النجف.)

❷ سلیمانیہ یا جریریہ: یہ سلیمان بن جریر العرقی کے اصحاب ہیں۔ خلیفہ منصور کے زمانہ میں ظاہر ہوئے۔ ان کے عقائد اس سے بھی زیادہ ہیں جو امام ابن تیمیہ نے ذکر کیے ہیں، سلیمان نے دورِ عثمانی میں ہونے والے واقعات کی بناء پر جنابِ عثمان رضی اللہ عنہ پر طعن کیا ہے اور ان واقعات کی آڑ میں معاذ اللہ انہیں کافر تک کہا ہے، اور اس نے جناب زبیر، جناب طلحہ رضی اللہ عنہما اور سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے جنابِ علی رضی اللہ عنہ سے قتال پر اقدام کی وجہ سے معاذ اللہ انہیں بھی کافر کہا ہے۔ پھر اس نے متعدد امور میں خود امامیہ رافضہ پر بھی طعن کیا ہے۔ ان کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: فرق الشیعه للنوبختی، ص: ۳۰، ۸۵، ۸۷.

کہتے ہیں۔ یہ شیعوں کا سب سے بہتر فرقہ ہے۔ انہیں صالحیہ بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ حسن بن صالح بن حی الفقیہ کی طرف منسوب ہیں۔ [1] اب ان زیدیہ میں سے کوئی تو قدر کے بارے میں اہلِ سنت کے قول پر ہے اور کوئی قدریہ کے قول پر ہے۔

بندوں کے افعال کا فاعل کون ہے؟

دوسری وجہ:...... یہ کہا جائے گا کہ: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ''اہل سنت کے نزدیک بندہ کفر و معاصی کے ارتکاب میں بے قصور ہے۔'' قطعی طور سے بے بنیاد ہے۔ تقدیر کا عقیدہ رکھنے والے جمہور اہل سنت کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ بندہ اپنے افعال کا حقیقی فاعل ہے اور وہ قدرت و استطاعت سے بہرہ ور ہے، وہ طبعی اسباب کی تاثیر کا انکار نہیں کرتے۔ بلکہ عقلی ونقلی دلائل کی بنا پر اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہواؤں کے ذریعہ بادل کو پیدا کرتے پھر بادل سے پانی اتارتے اور پانی سے فصلیں پیدا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ سبب اور مسبب دونوں کا خالق ہے۔ اور وہ ہرگز یہ بھی نہیں کہتے کہ مخلوقات میں موجود طبائع اور قویٰ کی کوئی تاثیر نہیں۔ بلکہ وہ اس کا اقرار کرتے ہیں کہ اس کی لفظی اور معنوی تاثیر ہے۔ حتیٰ کا اثر کا لفظ کتاب اللہ میں بھی آیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَ نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ﴾ (یس ۱۲)

''اور ہم لکھ رہے ہیں جو عمل انھوں نے آگے بھیجے اور ان کے چھوڑے ہوئے نشان بھی۔''

اگرچہ وہاں پر تاثیر کا معنی اس آیت میں وارد لفظ کی نسبت زیادہ عام ہے۔ مگر پھر بھی وہ یہ کہتے ہیں کہ: یہ تاثیر؛ مسببات میں اسباب کی تاثیر کے باب سے ہے۔

باوجودیکہ باری تعالیٰ خالق اسباب ہیں اس کے باوصف ایک اور سبب کا وجود ناگزیر ہے جو اس کا شریک ہو اور اس کے دوش بدوش ایک معارض کی بھی ضرورت ہے جو اسے روک دے اور اللہ کے پیدا کرنے کے باوجود اس کے اثر کو تکمیل پذیر نہ ہونے دے الا یہ کہ اللہ تعالیٰ دوسرے سبب کو پیدا کر کے موانع کا ازالہ کر دے۔

شیعہ مصنف نے جو قول نقل کیا ہے اس کے قائل قدر کو ثابت ماننے ہیں جیسے امام اشعری رحمہ اللہ اور ان کے ہم نوا اور موافقت رکھنے والے فقہاء جو کہ امام مالک؛ امام شافعی اور امام أحمد رحمہم اللہ کے اصحاب میں سے ہیں۔ اشاعرہ مخلوقات میں قُوی و طبائع کو تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ: ''اللہ تعالیٰ ان قوی کے ساتھ فعل کو انجام نہیں دیتے البتہ ان قوی کے ہوتے ہوئے وہ فعل انجام پذیر ہوتا ہے۔'' اشاعرہ کہتے ہیں کہ بندے کی قوت افعال میں مؤثر نہیں ہے۔

امام اشعری رحمہ اللہ اس سے بڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ بندہ اپنے فعل کا فاعل نہیں، بلکہ اس کا فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ البتہ بندہ اپنے فعل کا کاسب ہے، جمہور اہل سنت کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ بندہ اپنے افعال کا حقیقی فاعل ہے۔

افعال باری تعالیٰ میں حکمت:

رہا یہ مسئلہ کہ شیعہ مصنف نے جو غرض اور حکمت کی نفی کا عقیدہ نقل کیا ہے؛ کہ بیشک اللہ تعالیٰ بندوں کی مصلحت کے

[1] بتریہ:...... کثیر النواء الابتر کے اصحاب جو مذہب میں صالحیہ کے ہم نواء ہیں۔ ان دونوں کی تفصیل کے لیے دیکھیں: فرق الشیعہ للنوبختی، ص: ۳۴، ۳۵، ۷۷۔

لیے کوئی کام نہیں کرتے۔ ہم اس سے پہلے یہ بیان کر چکے ہیں کہ یہ چند ایک لوگوں کا عقیدہ ہے؛ جن میں امام اشعری بھی شامل ہیں اور وہ گروہ بھی جو اس مسئلہ میں ان کی موافقت رکھتے ہیں۔ مگر دوسرے مقام پر وہ اپنے اس عقیدہ کے خلاف کہتے ہیں۔ جب کہ جمہور اہل سنت والجماعت اللہ تعالیٰ کے افعال میں حکمت وغرض کو ثابت مانتے ہیں۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے افعال بندوں کے نفع اور ان کی مصلحت کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا عقیدہ ایسے بھی نہیں جیسے معتزلہ اور ان کے موافقین کا عقیدہ ہے؛ جو چیز اللہ تعالیٰ کے ہاں حسن ہو؛ وہ مخلوق میں بھی حسن ہی ہوگی اور جو کچھ اس کی مخلوق میں قبیح ہو وہ اس کے ہاں بھی قبیح ہوگی۔ ایسا کچھ بھی نہیں ۔ جہاں تک لفظ غرض کا تعلق ہے؛ تو معتزلہ اور بعض اہل سنت کی طرف منسوب یہ کہتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ غرض کے لیے افعال بجا لاتا ہے؛ اور مراد حکمت ہوتی ہے۔ اور بہت سارے اہل سنت اس کے لیے حکمت کا لفظ ہی استعمال کرتے ہیں؛ وہ اس کے لیے لفظ غرض کا اطلاق نہیں کرتے۔

ارادہ کی دو قسمیں:

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''اہل سنت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کافر سے معاصی کا ارادہ کرتا ہے؛ اس سے اطاعت گزاری مطلوب نہیں ہوتی ''اہل سنت کا صرف ایک گروہ یہ عقیدہ رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قدریہ کے ہم خیال ہیں؛ اور جو ''ارادہ اور مشیئت اور رضا اور محبت'' کو صرف ایک ہی قسم قرار دیتے ہیں اور محبت و رضا اور غضب کو ارادہ کا مترادف تصور کرتے ہیں۔ امام اشعری کے دونوں اقوال میں سے مشہور تر قول یہی ہے، ان کے اکثر اصحاب واتباع اور ان کی موافقت رکھنے والے فقہاء جو کہ امام مالک؛ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے ساتھیوں میں سے ہیں؛ وہ بھی اسی کے قائل ہیں۔

بخلاف ازیں تمام طوائف میں سے جمہور اہل سنت اور امام اشعری رحمہ اللہ کے بہت سارے ساتھی اور ان کے علاوہ دوسرے لوگ ارادہ، محبت اور رضا میں فرق کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ معاصی کا ارادہ تو کرتا ہے۔'' مگر انہیں چاہتا نہیں اور ان سے راضی بھی نہیں ہوتا، بلکہ ان پر ناراض ہوتا ہے؛ ان سے بغض رکھتا ہے اور ان سے منع کرتا ہے۔ اس قول کے قائلین اللہ تعالیٰ کی مشیئت اور اس کی محبت کے مابین فرق کرتے ہیں۔ اور یہی تمام سلف صالحین کا قول ہے۔ ابو المعالی الجوینی نے ذکر کیا ہے کہ قدیم اہل سنت والجماعت کا یہی عقیدہ تھا۔ پھر ابوالحسن الأشعری نے اس کی مخالفت کی اور محبت اور ارادہ کو ایک ہی شمار کرنے لگا۔ [1]

[1] مستجی زادہ نے اس پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ: ''میں نے امام الحرمین کے کلام میں دیکھا ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ کو کفر پر راضی رہتے ہیں اور اس کو پسند کرتے ہیں؛ اللہ تعالیٰ ایسی باتوں سے بہت بلند ہیں؛ اللہ آپ کو معاف کرے؛ آپ کی آراء میں بہت بڑا اختلاف پایا جاتا تھا۔ چنانچہ آپ ایک جگہ پر عقیدہ کی کتاب میں ایک بات کہتے ہیں؛ تو دوسری جگہ عقیدہ کی دوسری کتاب میں اس کے برعکس بات کہتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے ایک جگہ ''الارشاد'' میں لکھا ہے: ''جس چیز کو ہم اللہ کا دین سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ افعال انسان کے اختیار میں ہوتے ہیں؛ بندے کی قدرت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور اس کی ایجاد ہیں۔ جبکہ ''الرسالہ النظامیہ'' میں دوسری جگہ پر لکھتے ہیں: ''بندے کی قدرت اور فعل کا اس میں اثر ہوتا ہے۔'' حتی کہ ''المقاصد'' کے شارح نے ''الارشاد'' میں وارد اس کلام سے دلیل لیتے ہوئے امام سے اس قسم کے کلام کے صادر ہونے کا انکار کیا ہے۔ شاید کہ اس شارح تک رسالہ نظامیہ نہ پہنچا ہو۔

ان لوگوں کا کہنا ہے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ ہوگیا؛ جو نہیں چاہا وہ نہیں ہوا۔ پس ہر وہ چیز جسے اللہ تعالیٰ نے چاہا تو اسے یقیناً اس نے پیدا کر دیا۔ جب کہ محبت کا تعلق اس کے امر سے ہے۔ پس جس چیز کے کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے؛ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ اسی لیے فقہائے کرام کا اتفاق ہے کہ اگر قسم اٹھانے والا یوں کہے کہ: ''اللہ کی قسم! اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو میں فلاں کام کروں گا۔'' پھر وہ وہ کام نہ کرے؛ تو اس سے اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔ اگر چہ وہ کام واجب یا مستحب ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس کے برعکس اگر یہ کہا کہ: اللہ تعالیٰ نے پسند کیا تو میں وہ کام کروں گا؛ اور وہ کام واجب یا مستحب ہو۔ تو پھر اس کے نہ کرنے پر اس کی قسم ٹوٹ جائے گی۔

محققین کا قول ہے کہ ''ارادہ کا لفظ قرآن کریم میں دو معنوں میں استعمال ہوا ہے:

۱۔ ارادہ خُلقیہ قدریہ کونیہ ۲۔ ارادہ امریہ شرعیہ دینیہ''

ارادہ کونیہ قدریہ جملہ حوادث کو شامل ہے جب کہ ارادہ دینیہ شرعیہ محبت و رضا پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ عام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ ہوگیا اور جو نہیں چاہا وہ نہیں ہوا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَ مَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ﴾ (الانعام: ۱۲۵)

''تو وہ شخص جسے اللہ ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کا سینہ تنگ، نہایت گھٹا ہوا کر دیتا ہے، گویا وہ مشکل سے آسمان میں چڑھ رہا ہے۔''

دوسری جگہ حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرمایا:

﴿وَ لَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْۤ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ف وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ (ھود ۳۴)

''اور میری نصیحت تمھیں نفع نہ دے گی اگر میں چاہوں کہ تمھیں نصیحت کروں، اگر اللہ یہ ارادہ رکھتا ہو کہ تمھیں گمراہ کرے، وہی تمھارا رب ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔''

اس ارادہ کا تعلق اضلال و اغواء کے ساتھ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی وہ مشیئت ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں تو ہو جاتی ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴾ (البقرۃ: ۲۵۳)

''لیکن اللہ تعالیٰ جو کچھ چاہتے ہیں وہ کرتے ہیں۔''

یعنی جس چیز کو اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں پیدا کر دیتے ہیں؛ اس کے لیے حکم نہیں دیتے۔

کبھی ارادہ سے محبت [پسند] مراد لی جاتی ہے۔ جیسا کہ فحاشی کا کام کرنے والے سے کہا جاتا ہے کہ: یہ ایسا کام ہے جس کا ارادہ اللہ تعالیٰ نہیں کرتے؛ مراد یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کام کو پسند نہیں کرتے۔ اور کبھی اس سے مشیئت بمعنی

چاہت کے ہوتی ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: اللہ تعالیٰ نے اس چیز کا ارادہ نہیں کیا تھا۔

ارادہ شرعیہ دینیہ کی مثال مندرجہ ذیل آیات ہیں۔ قرآن کریم میں فرمایا:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (البقرۃ: ۱۸۵)

''اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانی چاہتے ہیں؛ وہ تمہارے لیے تنگی نہیں چاہتے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَ يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ يَتُوْبَ عَلَيْكُمْ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ وَ يُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ۝ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ۝﴾ (النساء: ۲۶—۲۸)

''اللہ چاہتا ہے کہ تمھارے لیے کھول کر بیان کرے اور تمھیں ان لوگوں کے طریقوں کی ہدایت دے جو تم سے پہلے تھے اور تم پر مہربانی فرمائے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔ اور اللہ چاہتا ہے کہ تم پر مہربانی فرمائے اور جو لوگ خواہشات کی پیروی کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم (سیدھے راستے سے) ہٹ جاؤ، بہت بڑا ہٹ جانا۔ اللہ چاہتا ہے کہ تم سے (بوجھ) ہلکا کرے اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّ لٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَ لِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ ﴾ (المائدۃ: ۶)

''اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی کرے اور لیکن وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور تاکہ وہ اپنی نعمت تم پر پوری کرے،۔''

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا﴾ (الاحزاب: ۳۴)

''اے نبی کے گھر والو! اللہ تعالیٰ تم سے ناپاکی کو دور کرنا چاہتے ہیں؛ اور تمہیں بالکل پاک کردے۔''

ظاہر ہے کہ ان آیات میں ارادہ کے وہ معنی نہیں جو سابقہ آیات میں ہیں۔ ان آیات میں مذکورہ ارادہ وہ نہیں جس کی مراد واجب ہو۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ﴾ (الانعام: ۱۲۵)

''تو وہ شخص جسے اللہ چاہتا ہے کہ اسے ہدایت دے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔''

مسلمانوں کا یہ قول کہ، جو اللہ نے چاہا وہ ہوا اور جو نہ چاہا وہ نہ ہوا۔ بلکہ یہ لوگوں کے برائی کے مرتکب کو اس قول میں مذکور ہے: ''یہ وہ کام کرتا ہے جو اللہ نہیں چاہتا۔'' یعنی یہ کام اللہ کو پسند اور محبوب نہیں اور نہ اس نے ایسی بات کا امر کیا ہے۔

ارادہ کی اس تقسیم کو متعدد اہلِ سنت نے ذکر کیا ہے، اور یہ کہا ہے کہ محبت اور رضا وارادہ نہیں جو جملہ مخلوقات کو شامل ہو۔ جیسا کہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد وغیرہم رحمہم اللہ کے اصحاب نے ذکر کیا ہے، جیسے ابوبکر عبدالعزیز وغیرہ، اگرچہ ایک جماعت محبت اور رضا کو ارادہ قرار دیتی ہے لیکن پہلا قول صحیح تر ہے۔

دوسرے یہ فرق بھی واضح ہے کہ ارادہ کرنے والے کا کسی کام کو کرنے کا ارادہ کرنا اور بات ہے اور اس کا کسی دوسرے سے یہ ارادہ کرنا کہ وہ اسے کرے، اور بات ہے، اور امر یہ ارادۂ ثابتہ کو مستلزم نہیں، بہ نسبت پہلی قسم کے ارادہ کے۔ رب تعالیٰ جب اپنے بندوں کو کسی کام کے کرنے کا امر فرماتا ہے تو وہ اس بات کا ارادہ کرتا ہے کہ وہ مامور کی ماموریہ پر اعانت کرے گا، اور بسا اوقات وہ حکم دینے کے باوجود اس اعانت کا ارادہ نہیں کرتا۔

اللہ کے امر کے بارے میں نزاع کی بابت قولِ فیصل کی تحقیق یوں ہے کہ: کیا یہ امر اللہ کے ارادہ کو مستلزم ہے یا نہیں؟ پس جب معتزلہ کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ بات ناگزیر ہے کہ جس بات کا وہ امر دیتا ہے، اسے چاہتا ہے اور اس کا ارادہ کرتا ہے اور یہ کہ اس نے منع اسی بات سے کیا ہے جس کے وجود کو اس نے نہیں چاہتا اور نہ اس کا ارادہ کیا ہے۔ اب قدر کو ثابت کرنے والے بیشتر متاخرین نے، جو اصولِ فقہ وغیرہ میں ابوالحسن کے پیروکار اور امام مالک و شافعی و احمد کے اصحاب میں سے ہیں، ان لوگوں کو یہ جواب دیا ہے کہ بے شک اللہ ایسی بات کا بھی حکم دیتا ہے جو وہ چاہتا نہیں۔ جیسے کفر، فسق اور عصیان۔

ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر کوئی ''ان شاء اللہ'' کہہ کر کسی واجب کے ضرور کرنے کی قسم اٹھائے تو نہ کرنے پر وہ حانث [قسم توڑنے والا] نہ ہوگا۔ اور دوسری دلیل یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے جنابِ ابراہیم علیہ السلام کو بیٹا ذبح کرنے کا حکم دیا تو ضرور تھا۔ لیکن اس کو ان سے چاہا نہ تھا۔ بلکہ کر گزرنے سے قبل ہی اسے منسوخ کر دیا تھا۔ اسی طرح معراج کی رات میں پچاس نمازوں کا امر کا معاملہ ہے۔

اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایسی بات کا بھی امر کرتا ہے جس کے پیدا کرنے کو اس نے نہیں چاہا۔ البتہ وہ صرف اسی بات کا امر کرتا ہے جو اسے محبوب اور پسند ہو اور چاہتا ہو کہ بندہ وہ کرے۔ اس معنی میں کہ وہ اسے پسند کرتا ہے، اور کفر رہا اور فسق و عصیان تو رب تعالیٰ اسے چاہتا نہیں اور نہ اسے پیدا کر کے بندے کی اس پر اعانت کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے اگر کسی نے ان شاء اللہ کہہ کر کسی واجب کی قسم اٹھائی پھر اس نہ کیا تو وہ حانث ہوگا۔ چاہے وہ کوئی واجب ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اگر اس نے ''اگر اللہ نے پسند کیا'' کہہ کر قسم اٹھائی تو نہ کرنے کی صورت میں حانث ہوگا۔ یہی حکم: ''اگر اللہ نے حکم دیا'' کہہ کر قسم اٹھانے کا ہے۔

اگر یہ کہا: میں یہ ضرور کروں گا جب اللہ نے ارادہ کیا تو اس کا ارادہ سے مراد محبت ہے۔ جیسا کہ لوگ برائی کرنے والے سے یہ کہتے ہیں: ''یہ ایسے کاموں میں لگا ہے جن کو اللہ نے نہیں چاہا۔'' اور کبھی اس کی مراد مشیئت ہوتی ہے۔ جیسا کہ لوگ نہ ہونے والے کام کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ: ''اس بات کا اللہ نے ارادہ نہیں کیا تھا۔'' پس اگر تو اس کی مراد

یہ تھی تو وہ حانث ہو گیا۔

رہا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے بیٹے کو ذبح کر دینے کا امر تو وہ رب تعالیٰ کو محبوب بھی تھا اور نفس الامر میں رب تعالیٰ نے ان سے اس بات کا ارادہ بھی کیا تھا۔ وہ یوں کہ جنابِ ابراہیم علیہ السلام نے امتثالِ امر کا قصد کیا اور فرمانبرداری کا عزم کیا۔ پس رب تعالیٰ نے سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کے امتحان اور آزمائش کے لیے یہ امر ظاہر فرمایا تھا۔ پس جب دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور جنابِ ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو پیشانی کے بل زمین پر لٹا دیا تو رب تعالیٰ نے انہیں آواز دی کہ اے ابراہیم! تحقیق تو نے وہ خواب سچ کر دکھایا اور ہم نیکو کاروں کو یوں بھی بدلا دیا کرتے ہیں، اور یہی بات پچاس نمازوں کے امر کے بارے میں بھی ہے۔

فصل:......مسئلہ قدر اور رافضی الزام کا رد

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''اہل سنت کا یہ قول چند قبائح پر مشتمل ہے۔ ایک قباحت یہ ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا سب ظالموں سے بڑا ظالم ہونا لازم آتا ہے۔ اس لیے کہ وہ کافر کو کفر کے جرم کی سزا دیتا ہے، حالانکہ اس نے خود ہی اسے کفر کی قدرت عطا کی، اور ایمان کی قدرت سے محروم رکھا، جس طرح کسی کو اس کے رنگ یا طویل القامت یا قصیر القامت ہونے پر سزا دینا ظلم ہے، اسی طرح اس معصیت کی سزا دینا بھی ظلم ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے اس میں پیدا کی۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: اس کا جواب اس سے پہلے بھی گزر چکا ہے کہ ظلم کی تفسیر میں تقدیر کو ثابت ماننے والے جمہور کے دو قول ہیں:

پہلا قول یہ ہے کہ: ظلم ممتنع لذاتہ ہے اور اللہ تعالیٰ ظلم کرنے پر قادر نہیں۔ امام اشعری، قاضی ابوبکر، ابوالمعالی، قاضی ابویعلیٰ اور ابن الزاغونی رحمہم اللہ کی یہی رائے ہے۔ ان کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ ذات باری تعالیٰ دروغ گوئی ،ظلم اور افعال قبیحہ پر قادر نہیں اور نہ اسے ان کے ساتھ موصوف کیا جا سکتا ہے۔ ذات باری سے ان افعال کا صدور اس لیے محال ہے کہ ظلم و قبح کا فاعل شرعاً مذموم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت میں ظلم اور قباحت کی مذمت کو واجب کیا ہے۔ اور قابل مذمت وہی فاعل ہوتا ہے، جو ناروا کام کرے اور ایسے فعل کا مرتکب ہو جس کا حق اسے حاصل نہ ہو۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب فاعل اس چیز میں تصرف کرے جس میں تصرف کرنے کا حق اس کی نسبت کسی اور کو حاصل ہو۔ بنا بریں ظلم کا صدور اللہ سے محال ہے، کیوں کہ اس کے تصرفات کا مالک کوئی دوسرا شخص نہیں ہو سکتا، اس تقریر سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے، کہ اللہ کے حق میں ظلم کا تصور بھی محال ہے۔

مذکورہ بالا قول کی حقیقت یہ ہے کہ قابل مذمت وہ فاعل ہے، جو غیر کی مملوکہ چیز میں دست درازی کا ارتکاب کرتا ہو اور اپنے سے اوپر والے کے حکم کی نافرمانی کرتا ہو۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص اللہ کو اپنے احکام کا مامور و مکلّف نہیں بنا سکتا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ غیر کی ملکیت میں تصرف کرتا ہے، اس لیے کہ وہ سب چیزوں کا مالک ہے۔

یہ قول ایاس بن معاویہ رحمہ اللہ سے منقول ہے، فرماتے ہیں:

''میں نے اپنی پوری عقل سے کام لے کر قدریہ فرقہ سے مناظرہ کیا اور دریافت کیا کہ ظلم کیا ہوتا ہے؟ انہوں نے کہا کسی دوسرے کی ملکیت میں تصرف کرنے کو ظلم کہتے ہیں۔ میں نے کہا: ''جب ہر چیز اللہ کی مملوک ہے تو وہ غیر کی ملکیت میں تصرف کیسے کرے گا؟''

مگر یہ لوگ تو کسی جرم کا ارتکاب کیے بغیر بھی سزا دینے کو جائز تصور کرتے ہیں، لہٰذا قصیر القامت کو چھوٹے ہونے؛ یا طویل القامت کو طویل ہونے اور سیاہ فام کو سیاہ ہونے کی بنا پر سزا دینے سے ان پر معارضہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا خیال ہے کہ سزا دینا مشیت ایزدی کے تابع ہے۔

ظلم سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ:

دوسرا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ظلم پر قادر مگر اس سے منزہ ہے؛ یہ قدر کو ثابت ماننے والے جمہور علماء کا قول ہے۔ اور بہت سے متکلمین و مناظرین قائلین قدر کا عقیدہ ہے۔ جیسا کہ کرامیہ؛ اور امام ابوحنیفہ؛ امام مالک؛ امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کے بہت سارے اصحاب کا قول ہے۔ اور قاضی ابو حازم نے بھی اس قول کو اختیار کیا ہے۔ جیسے کسی انسان کو کسی دوسرے شخص کے جرم کی سزا دینا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا﴾ (طه:۱۱۲)

''جو ایمان دار ہو اور پھر نیک اعمال انجام دے تو وہ کسی ظلم یا کمی سے نہیں ڈرے گا۔''

ان لوگوں کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ انسان کو اختیاری یا غیر اختیاری افعال کی بنا پر سزا دینے کا فرق انسانی فطرت میں جا گزیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بلاشبہ جب کسی انسان کا ایک بیٹا ہو؛ اور اس کے جسم میں یا کوئی تخلیقی عیب ہو تو اس پر اس کی مذمت کرنا یا سزا دینا غیر مستحسن ہے۔ لیکن اس کا یہی بیٹا اگر کسی پر ظلم کرے تو اسے سزا دینا مستحسن ہوگا۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ: ''تقدیر سے گناہوں پر استدلال کرنا عقلاً باطل ہے۔ اس لئے کہ دوسروں پر ظلم وستم ڈھانے والا اگر تقدیر سے استدلال کرے گا (کہ میری تقدیر میں یوں ہی لکھا تھا) تو جو شخص اس کو ظلم کا نشانہ بناتا ہے، وہ بھی یہ دلیل پیش کر سکتا ہے۔ اگر تقدیر حجت ہے تو دونوں کے حق میں حجت ہے؛ اور اگر حجت نہیں تو پھر کسی ایک کے بھی حق میں حجت نہیں۔ اس سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ معاصی کے ارتکاب پر تقدیر سے استدلال کرنا باتفاق ادیان و عقلاء باطل ہے۔ اور اس سے وہی شخص احتجاج کرتا ہے، جو اپنے اقوال میں تناقض کا شکار اور اپنی خواہش کا پیروکار ہو۔ جیسے یہ مقولہ مشہور ہے کہ: ''تم اطاعت کے وقت قدری اور معصیت کے وقت جبری بن جاتے ہو۔'' مقولہ کا مطلب یہ ہے کہ تم ہوائے نفس کی پیروی کرتے ہو جو مذہب اپنی خواہش کے موافق ہوا بس اسی کے ہو جاتے ہو۔''

اگر ظلم و قبائح کے مرتکب کے لیے تقدیر حجت ہوتی تو کوئی شخص دوسرے کو ملامت نہ کر سکتا اور نہ اسے سزا دے سکتا (کیونکہ مجرم آسانی سے کہہ سکتا تھا کہ میری تقدیر میں یونہی لکھا تھا)۔ تو ظلم و فحاشی کا کرنے والا دوسرے کے اہل و مال اور

خون میں جیسے چاہتا اپنی مرضی اور خواہشات کے مطابق ظلم و فحش کا ارتکاب کرتا اور پھر اس پر تقدیر سے دلیل پیش کرتا کہ یہ تو اس کے مقدر میں لکھا جا چکا تھا۔

جو لوگ شیعہ اور معتزلہ اور دوسرے گروہوں میں سے تقدیر کا انکار کرنے والے امر و نہی اور وعد و وعید کی تعظیم کرتے ہیں؛ وہ ان لوگوں سے بہتر ہیں جو ترک مامور اور فعل محظور پر تقدیر سے حجت پیش کرتے ہیں۔ حقیقت کے بلند بانگ دعاوی کرنے والوں مثلاً فقراء اور صوفیہ کو اکثر اس سے سابقہ پڑتا ہے وہ تقدیر کا بہانہ کر کے اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی سے انحراف کرتے ہیں۔ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ تقدیر کے بل بوتے پر کوئی شخص اوامر کو ترک کر سکتا ہے نہ محرمات کا ارتکاب کر سکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر حجت تمام کر دی ہے۔ اور وہ قدریہ جو تقدیر سے معاصی کے ارتکاب کے جواز پر استدلال کرتے ہیں وہ فرقہ قدریہ سے بھی بدتر ہیں جو سرے سے تقدیر کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں کو قدریہ کہا گیا حالانکہ وہ تقدیر کے منکر نہ تھے۔ قدریہ کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ تقدیر سے معاصی کے جواز پر احتجاج نہیں کرتے تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے جب کہا گیا کہ: ''ابن ابی ذئب منکر تقدیر تھے۔'' [1]

تو انہوں نے فرمایا: جو شخص بھی معاصی کی بنا پر لوگوں کو تنگ کرتا تو لوگ اسے قدری کہہ کر پکارتے تھے۔'' یہی وجہ ہے کہ قائلین تقدیر فواحش و منکرات پر تنقید کرنے والے کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے اور کہتے ہیں یہ بات ان کی تقدیر میں لکھی تھی۔ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ منکرات پر رد و قدح بھی تقدیر الٰہی کے عین موافق ہے۔ گویا اس نے اپنے قول سے ہی اپنی دلیل کو توڑ دیا، بعض جاہل مشائخ کا قول ہے ''میں اس رب کو ماننے کے لیے تیار نہیں جس کی نافرمانی کی جاتی ہو اور اگر میں ستر انبیاء کو قتل کر دوں تو میں گناہ گار نہ ہوں گا۔'' ایک اور جاہل شیخ کا قول ہے:

''میں وہی کام کرتا ہوں جو وہ مجھ سے کروانا چاہتا ہے، لہٰذا میرے سب کام عبادت میں داخل ہیں۔''

مسئلہ تقدیر میں احتجاج آدم علیہ السلام و موسیٰ علیہ السلام:

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تقدیر کی بنا پر احتجاج اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ یہ کھلی ہوئی جہالت ہے۔ اس لیے کہ انبیاء سب لوگوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور جس چیز کی اللہ تعالیٰ نے مذمت کی ہے؛ اس کی مذمت کرتے ہیں۔ بیشک انہیں اطاعت الٰہی کا حکم دینے اور اس کی نافرمانی سے منع کرنے کے احکام کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے؛ پھر تقدیر کی بنا پر وہ اس کی نافرمانی کیوں کر سکتے ہیں؟

مزید برآں حضرت آدم علیہ السلام نے بارگاہ ازدی میں اپنے گناہ سے توبہ کر لی تھی اور ان کی توبہ قبول کر لی گئی تھی۔ گناہ

---

[1] وابن أبی ذؤئب من أھلِ المدینۃِ، وھو محمد بن عبدِ الرحمنِ بنِ المغیرۃِ ابنِ الحارثِ بنِ أبی ذؤئب القرشی العامِری، توفی سن ۱۵۸، قال مالك بن أنس: لو برِیء ابن أبی ذِئب مِن القدرِ، ما کان علی وجہِ الأرضِ خیر مِنہ، انظر ترجمتہ فِی فضلِ الاعتزالِ وطبقاتِ المعتزِلۃِ، ص۹۸، ۳۳۵، تھذِیب التھذِیبِ ۹/ ۳۰۷-۳۰۳- العلام: ۷/ ۶۱.

سے توبہ کرنے والا ایسے ہی ہوتا ہے جیسے اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہ ہو۔

اگر تقدیر سے احتجاج کرنا درست ہوتا تو ابلیس، فرعون اور ان کے ہم نوا اس سے ضرور استدلال کرتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام پر جو تنقید کی تھی، اس کی وجہ وہ مصیبت تھی جو حضرت آدم علیہ السلام کے شجرہ ممنوعہ کا پھل کھانے کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہنچی؛ اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا:

''آپ نے ہمیں اور اپنے بیٹوں کو جنت سے کیوں نکالا؟''❶

حقیقت یہ ہے کہ بندہ عیب و گناہ کی بجائے مصائب و آلام کے وقت تقدیر کی جانب رجوع کرنے کیلئے مامور ہے۔ لہٰذا چاہیے کہ وہ مصائب و آلام میں صبر وسکون کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے اور گناہوں سے توبہ کرتا رہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ ﴾ (غافر: ۵۵)

''صبر کیجئے، بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اپنے گناہ کی مغفرت طلب کیجئے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ﴾ (الحدید: ۲۲)

''کوئی مصیبت نہ زمین پر پہنچتی ہے اور نہ تمھاری جانوں پر مگر وہ ایک کتاب میں ہے، اس سے پہلے کہ ہم اسے پیدا کریں۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهُ ﴾ (التغابن ۱۱)

''کوئی مصیبت نہیں پہنچی مگر اللہ کے اذن سے اور جو اللہ پر ایمان لے آئے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔''

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اس سے مراد وہ آدمی ہے جسے کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ یقین رکھتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے؛ پس وہ اس پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے راضی رہتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین صحابہ کرام اور تابعین رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے کئی حضرات نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

''کوئی انسان اس وقت ایمان کی حقیقت کو نہیں پا سکتا جب تک وہ یقینی طور پر نہ جان لے کہ جو مصیبت اس پر آئی ہے وہ ٹلنے والی نہ تھی؛ اور جو ٹل گئی ہے؛ وہ اس پر آنے والی نہ تھی۔''

❶ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب وفاۃ موسیٰ و ذکرہ بعد (ح: ۳۴۰۹، ۷۵۱۵) صحیح مسلم، کتاب القدر، باب حجاج آدم و موسیٰ صلی اللہ علیہما وسلم (ح:۲۶۵۲)۔

پس تقدیر پر ایمان ؛ اور جو کچھ مصائب و آلام اللہ تعالیٰ نے مقدر میں لکھ دیے ہیں ؛ ان پر رضامندی اور تسلیم ؛ ایمان کی اصل حقیقت ہے اور جہاں تک گناہوں کا تعلق ہے تو کسی ایک کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے حجت پیش کرے۔ بلکہ انسان کو چاہیے کہ وہ گناہوں کے ارتکاب سے بچ کر رہے۔ اور اگر اس سے کوئی گناہ صادر ہوجائے تو وہ فوراً اس سے توبہ کرے۔ جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے کیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ بعض مشائخ نے فرمایا ہے: ''دو سے گناہ ہوا؛ حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس؛ پس حضرت آدم علیہ السلام نے توبہ کی ؛ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمالی؛ اور انہیں چن لیا اور ہدایت سے نوازا۔ اور ابلیس نے تقدیر سے حجت پکڑتے ہوئے گناہ پر اصرار کیا۔ پس جو کوئی گناہ سے توبہ کرتا ہے تو وہ اپنے باپ حضرت آدم علیہ السلام سے مشابہت رکھتا ہے۔ اور جو کوئی مصر رہتا ہے اور تقدیر کو حجت بناتا ہے تو وہ شیطان کے مشابہ ہے۔

عقول میں بدیہی طور پر فاعل مختار اور دیگر کے مابین فرق کو استقرار حاصل ہے۔ اس سے مقصود حاصل ہوگیا۔ اور ایسے ہی عقول میں بدیہی طور پر اس بات کو بھی استقرار حاصل ہے کہ افعال اختیاریہ نفس کا کسب ہیں۔ یہ بات محتاج بیان نہیں کہ افعال اختیاریہ کی بنا پر انسان صفات محمودہ اور صفات مذمومہ دونوں حاصل کرسکتا ہے۔ بخلاف ازیں قصیر القامت ہونے یا کالے گورے ہونے کی بنا پر ان کا حصول ممکن نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''نیکی دل کا نور، چہرے کی رونق، وسعت رزق، قوت بدن اور مخلوقات کے دلوں میں محبت کی باعث ہے اور بیشک بدی کی وجہ سے چہرے پر ایک سیاہی چھا جاتی ہے؛ اور دل میں اندھیرا پیدا ہوتا ہے؛ اور بدن کمزور ہو جاتا ہے؛ اور رزق میں کمی آتی ہے؛ اور مخلوق کے دلوں میں نفرت پیدا ہوتی ہے۔''

پس نیکی کا کام کرنے کے اچھے اثرات انسان کی ذات پر بھی مرتب ہوتے ہیں؛ اور باہر بھی۔ یہی حال گناہوں کے ارتکاب کا بھی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے نیکی کو ایسی چیزوں کا سبب بنایا ہے۔ اور برائیوں کو دوسری قسم کی چیزوں کا سبب بنایا ہے۔ جس طرح زہر کھانے کو بیماری اور موت کا سبب قرار دیا ہے، تاہم تریاق سے اس کا ازالہ ممکن ہے، جس طرح برائیوں کو توبہ، اعمال صالحہ اور گناہ کو دور کرنے والے مصائب و آلام کے ذریعہ دور کیا جاتا ہے۔ اور دنیا میں پیش آنے والے مصائب گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں۔ جیسا کہ کبھی کبھار زہر کے اثرات کو دواء کے ذریعہ سے ختم کیا جاسکتا ہے۔ اور کبھی اس کے نتیجہ میں ہلکا سا مرض لاحق ہوتا ہے اور پھر صحت و عافیت مل جاتی ہیں۔

باقی رہی یہ بات کہ فعل کو پیدا کر کے خود ہی اس پر سزا دینا ظلم ہے۔ تو یہ اسی طرح ہے جیسے کہا جائے زہر کو پیدا کر کے اسے موجب ہلاکت بنانا ظلم ہے۔ اور یہ ہے کہ کسی چیز کو اس کے اصل مقام سے ہٹا کر دوسرے مقام پر رکھ دینا۔ اس انسان کا اپنے ظلم کے اثرات کا مستحق ہونا؛ جو کہ حقیقت میں اللہ کی نافرمانی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی کسی دوسرے پر ظلم کر کے اس کے اثرات کا مستحق ہوجائے۔

مسئلہ تحسین و تقبیح

اب رہا تحسین و تقبیح کا مسئلہ تو لوگوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایک فعل جہاں بندے کی منفعت اور اس کے مناسب امر کے حصول کا سبب ہوتا ہے، وہیں ایک دوسرا فعل بندے کی مضرت کے حصول کا اور اس کے غیر مناسب امر کے حصول کا سبب بھی ہوتا ہے۔ کبھی اس بات کا علم عقل سے ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک فعل کبھی صفت کمال ہوتا ہے تو کبھی دوسرا فعل صفت نقص بھی ہوتا ہے۔ اختلاف اگر ہے تو اس بات میں ہے کہ کبھی فعل عقاب اور ذم کا سبب بھی ہوتا ہے، اور اس بارے دو اقوال مشہور ہیں۔

اس باب میں امام احمد، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ کے اصحاب میں اختلاف ہے۔

رہے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب تو وہ تحسین و تقبیح دونوں کا قول کرتے ہیں، اور یہی مسلمانوں کا جمہور جماعتوں کا قول بھی ہے، اور درحقیقت یہ اختلاف لوٹتا ہے۔ ملائمت، منافرت، منفعت اور مضرت کی طرف۔ پس عقاب اور مذمت بندے کے غیر مناسب اور اس کے لیے مضر ہے۔ لہٰذا حسن و قبح محبوب و مکروہ کے حصول سے باہر نہ نکلے گا۔ پس حسن وہ ہے جو محبوب، مطلوب اور بالذات مراد کی تحصیل کا سبب ہے، اور قبیح وہ ہے جو مبغوض و مکروہ کی تحصیل کی سبب بنے۔ جب حسن محبوب کی طرف اور قبیح مکروہ کی طرف لوٹتا ہے اور یہ دونوں نافع اور ضار اور طیب اور خبیث کے بمنزلہ ہیں، لہٰذا یہ بھی احوال کے تنوع پر متنوع ہوں گے۔ پس جیسے ایک شے ضرورت کے وقت نافع ہوتی ہے تو کسی دوسرے وقت مضر ہوتی ہے۔ اسی طرح فعل بھی ہے جیسے میتہ کا کھانا کبھی قبیح تو کبھی دوسرے موقع پر (جب مرنے کا خطرہ ہو تو) حسن ہوتا ہے۔

جب بات یہ ہے تو یہ امر اختلافی نہیں۔ جیسے بندہ اس کا فاعل ہو بغیر اس کے کہ اللہ نے اس کے لیے قدرت اور ارادہ کو پیدا کیا ہے، یا اس بات کے ساتھ کہ اللہ نے اس کے لیے قدرت ارادہ کو پیدا کیا۔ جیسا کہ ان جملہ امور میں ہے جو نافع و ضار اور محبوب و مکروہ ہیں۔

یقینی دلائل کی بنا پر یہ حقیقت ثابت ہو چکی ہے کہ جو چیز بھی حادث ہے وہ اللہ کی پیدا کردہ ہے۔ اور ہر ممکن جو کہ وجود اور عدم کو قبول کرتا ہو؛ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ہو جاتا ہے اور اگر نہ چاہے تو نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ بندے کے افعال بھی حوادث کے زمرہ میں شامل ہیں۔ اور اس کی ایک وجہ یہ بھی کہ خود انسان کا فعل جب وہ اسے سرانجام دیتا ہے؛ وہ بھی حادث ہے اور عدم سے وجود میں آیا ہے؛ اس کے لیے سبب کا ہونا ضروری ہے۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ: ''فعل بندے کے ارادہ سے حادث ہوا۔'' تو ہم کہیں گے کہ: ''ارادہ بھی حادث ہے، لہٰذا اس کے لیے بھی کسی سبب کی ضرورت ہے۔ اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ فعل ممکن ہے، (یعنی اس کا وجود و عدم برابر ہے) لہٰذا اس کے وجود کو عدم پر ترجیح دینے کے لیے کسی مرجح کی ضرورت ہے، اسی طرح بندے کا فاعل ہونا بھی ممکن ہے۔ لہٰذا اس کے لیے بھی کسی محدث و مرجح کا وجود ناگزیر ہے۔ اس میں سب حوادث مساوی ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

ممکن کے وجود کو مرجح کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ تام اور ممکن کے وجود کو مستلزم ہو، وگرنہ اگر مرجح کے وجود کے ساتھ کبھی تو فعل کا وجود ممکن ہو اور کبھی عدم تو وہ مرجح کے حصول کے بعد ممکن ہوگا، اور اس کا عدم و وجود دونوں ممکن ہوگا۔ اس صورت میں وجود تب ہی عدم پر راجح ہوگا جب کوئی مرجح بھی ہو۔ اب یہ مرجح یا تو تامی اور فعل کے وجود کو مستلزم ہوگا، اور رہا اس کے ساتھ فعل کا عدم اور وجود دونوں ممکن ہوں گے۔ اگر تو دوسری بات ہے تو فعل کسی حال میں بھی موجود نہ ہوگا اور تسلسل باطل لازم آئے گا۔

پس معلوم ہوا کہ فعل تب ہی پایا جائے گا جب ایسا مرجح پایا جائے جو تام اور فعل کے وجود کو مستلزم ہو، اور ایسا مرجح تام الداعی التام اور قدرت ہے، اور یہ بات معتزلہ کی ایک جماعت کو تسلیم ہے۔ جیسے ابوالحسن بصری وغیرہ کہ وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جب داعی تام اور قدرت تام دونوں پائے جائیں تو فعل کا وجود لازم ہوتا ہے، اور داعی اور قدرت دونوں رب تعالیٰ کی مخلوق ہیں، اور یہی اہل سنت کے قبول کی حقیقت ہے جو یہ کہتے ہیں: رب تعالیٰ بندوں کے افعال کا خالق ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ ہر شے کا خالق ہے۔ آئمہ ذہل سنت کا قول ہے: رب تعالیٰ اسباب کے ذریعے اشیاء کا خالق ہے، اور حقیقت میں بندہ اپنے فعل کا فاعل ہے نا کہ خالق۔ پس اپنے ارادہ وقدرت کے ذریعے بندے کے فعل کا پیدا کرنے کی بابت ان کا قول و سیاہی ہے۔ جیسا کہ ان کا قول جملہ حوادث کو ان کے اسباب کے ذریعے پیدا کرنے کا ہے۔ لیکن یہ اس کا قول نہیں جو اجسام میں پائے جانے والے اسباب وقوی کا منکر ہے، اور بندے کی اس قدرت کی تاثیر کا منکر ہے، جس کے ذریعے وہ فعل کو پیدا کرتا ہے، اور یہ کہتا ہے کہ: بندے کی قدرت کا اس کے فعل میں سرے سے کوئی اثر ہی نہیں۔ جیسا کہ جہم، اس کے پیروکاروں، اشعری رحمہ اللہ اور ہم نواؤں کا قول ہے۔

ان لوگوں کا قول آئمہ اہل سنت اور جمہور رحمہم اللہ کا قول نہیں۔ بلکہ اس کی اصل جہم بن صفوان کا قول ہے کہ وہ رب تعالیٰ کی مشیئت کو تو ثابت کرتا تھا پر اس کے لیے حکمت و رحمت کی نفی کرتا تھا، اور وہ بندے کے لیے فعل یا قدرتِ مؤثر کا منکر ہے۔ کہتے ہیں کہ جہم کوڑھیوں کے پاس جا کر یہ کہا کرتا تھا کہ کیا تمہارے ساتھ یہ ارحم الراحمین نے کیا ہے؟ تاکہ رب تعالیٰ کے صفتِ رحمت کے ساتھ متصف ہونے کا انکار کر سکے، اور اس کا خیال تھا کہ اس کی صرف مشیتِ محضہ ہے۔ جس کا حکمت کیساتھ کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ وہ دو متماثل میں سے ایک کو دوسرے پر بلا مرجح کے ترجیح دینے کا قائل تھا۔

یہ متاخرین کی ایک جماعت کا قول ہے، اور یہ کہتے ہیں: اللہ کی تخلیق کی حکمت پر مبنی نہیں، اور نہ اس نے کسی حکمت کے تحت کوئی امر کیا ہے، اور یہ کہ پورے قرآن میں کہیں بھی ''لام کی'' نہیں ہے نہ اس کی تخلیق میں اور نہ اس کے امر میں۔ اب یہ جہمیہ مجبرہ اور وہ معتزلہ قدریہ دونوں ایک دوسرے کے قابل ہیں۔

جبکہ امت کے اسلاف، آئمہ سنت اور جمہور علماء نہ تو اِن کے قائل ہیں اور نہ اُن کے۔ اگرچہ قدر کو ثابت کرنے والے اکثر جہم کا قول کرتے ہیں۔ پس کلام تو ان اہلِ سنت کے بارے میں ہے جو خلفائے ثلاثہ کی امامت کو اور قدر کو دونوں کو ثابت کرتے ہیں۔ اس نام میں حضرات صحابہ، تابعین عظام اور حدیث، تفسیر، فقہ اور تصوف کے آئمہ، جمہور

مسلمین اوران کے جمہور فرقے شامل ہیں۔اس سے بعض شیعہ خارج ہیں۔ان کے آئمہ اور جمہور کا قولِ وسط ہے جو نہ تو جہم اوران کے پیروکار جبریہ کا قول ہے اور نہ معتزلہ ہے۔پس جو یہ کہتا ہے کہ بعض حوادث ملائکہ جن اور انس کا فعل ہیں، اور ان کو اللہ نے پیدا کیا تو وہ کتاب وسنت، اسلاف کے اجماع اور دلائلِ عقلیہ سب کا مخالف ہے۔ اسی لیے بعض اسلاف کا قول ہے: آدمیوں کا کلام اور بندوں کے افعال غیر مخلوق ہیں، اور یہ اس شخص کے قول کی منزلت پر ہے جو یہ کہتا ہے کہ اللہ کی زمین اوراس کا آسمان غیر مخلوق ہے، اور اللہ جو بھی پیدا کرتا ہے کسی حکمت کے بغیر پیدا کرتا ہے۔جیسا کہ گزشتہ میں ذکر ہوا۔

بارگاہ ایزدی میں تقدیر کا عذر مسموع نہیں

مخلوقات میں سے بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو بعض لوگوں کے لیے موجب ضرر ہیں، جیسے بیماریاں اور مصائب و آلام، یہ حکمت ایزدی کا تقاضا ہے۔پس ان صفات اور افعال کو پیدا کرنا ان جملہ اسباب میں سے ہے۔ہم جانتے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی حکمت ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہ افعال حکمت کے تحت پیدا کئے ہیں تو پھر ان کو لغو اور سفاہت نہیں کہا جاسکتا۔ جب بندے کو اس کے افعال اختیاری پر سزا دینا ظلم نہیں تو حوادث کو بارگاہ ربانی کی جانب منسوب کرنے میں بھی ایک ایسی حکمت مضمر ہے، جس کی بنا پر وہ حوادث مستحسن ٹھہرتے ہیں۔ جب بندے کی جانب اس کی نسبت کی جائے تو یہ عدل ہے، کیونکہ اسے جو سزا ملی ہے وہ اس کے جرم کی بنا پر ملی ہے۔اللہ نے اس پر ظلم نہیں کیا بلکہ اس نے خود ہی اپنی جان پر ستم ڈھایا ہے۔اس کی مثال کو یوں سمجھیں کہ یہ سزا دینے والا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی دیگر ہے۔ مثلاً جب کوئی حاکم چور کو سزا دے، اس کا ہاتھ کاٹ ڈالے اور مسروقہ مال اس کے اصلی مالک کو واپس کردے تو وہ منصف حاکم کہلائے گا۔اور حاکم کے اس کے مامور بہ ہونے سے واضح ہوجاتا ہے کہ وہ عادل ہے۔

یہاں پر یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ لوگوں کی فطرت اور عقلوں میں یہ بات راسخ ہوچکی ہی کہ جب والی غصہ میں آئے اور غصب شدہ مال اس کے اصل مالک کو واپس دلوائے اور نقصان شدہ چیز کا تاوان ادا کرے؛ تو وہ والی یا حاکم اپنی اس حکم میں عادل ہوگا۔اور عدل ہمیشہ سے لوگوں کے دلوں اور ذہنوں میں معروف رہا ہے۔اور اگر چور اسے کہے کہ میری تقدیر میں یونہی لکھا تھا، پھر تم مجھے سزا کیوں دیتے ہو......؟ تو یہ بات چور کے حق میں مفید نہ ہوگی؛ اور حاکم اسے سزا دیئے بغیر نہیں رہے گا۔

اسی طرح جب روز قیامت اللہ تعالیٰ ظالم سے قصاص لے گا تو اس کا یہ فعل عدل و انصاف کا آئینہ دار ہوگا اور اگر ظالم یوں کہے کہ: ''تو نے میری تقدیر میں اسی طرح لکھا تھا تو یہ بات اس کے حق میں کچھ بھی مفید نہ ہوگی اور تقدیر کا عذر درست نہیں مانا جائے گا، چونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے، لہٰذا اس کی تخلیق خالی از حکمت نہیں اور اس حکمت و مصلحت کے اعتبار سے تخلیق فعل اس کی نسبت سے مستحسن ہے۔اور قبیح مخلوق فعل کی قباحت اس کے فاعل کے اعتبار سے ہے چونکہ اس میں ضرر پایا جاتا ہے۔جیسا کہ کسی ظالم کو سزا دینے کا حکم والی کو خوش کرتا ہے؛ اس لیے کہ اس میں حکمت ہے؛ اور یہ حاکم عادل ہے؛ اس نے عدل پر مبنی حکم دیا ہے۔اور اس میں ظالم کے لیے ضرر بھی ہے؛ کیونکہ اس سے اسے تکلیف پہنچتی ہے۔

اور اگر فرض کیا کہ یہ حاکم اس ظلم کے حصول کا سبب ہے۔ اس طور پر کہ قابلِ ملامت نہیں۔ تو بھی ظالم کے لیے عذر نہیں۔ جیسے وہ حاکم جس کے سامنے گواہوں نے عزیم کے مال کی شہادت دی، اور اس نے قید یا سزا کا حکم سنا دیا، اور اس نے ناحق دوسرے کو مال دلوا دیا، تو رب تعالیٰ اس فیصلہ میں حاکم کو بھی سزا دے گا، اور اس نے کہا: تو نے مجھے قید میں ڈالا اور تو ادا سے عاجز تھا، اور میرے خلاصی کی اور کوئی صورت نہ تھی سوائے اس مال کے لینے کے۔ تو یہ پہلی قید اس کے حق میں ضرور ہوگی، اور دوسرے کا مال ناحق لینے پر اسے عقوبت ہوگی، اور والی کہے گا: میں نے عادل کی شہادت پر حکم دیا۔ اس میں مجھ پر کوئی گناہ نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ میں نے خطا کی ہے، اور حاکم کو خطا میں بھی اجر ہے۔ اب دونوں میں سے ہر ایک نے دوسرے کے حق میں ایسا ضرر کیا ہے جس میں وہ معذور ہے، اور دوسرا قابلِ سزا ہے۔ بلکہ مظلوم ہے البتہ تاویل کے ساتھ ہے۔

یہ مثالیں اللہ کے فعل جیسی نہیں ہیں۔ کہ اس کے جیسی کوئی شے نہیں ہے، ذات میں، نہ صفات میں اور نہ افعال میں۔ کہ وہ مختار میں اختیار پیدا کرتا ہے، اور راضی میں رضا اور محبّ میں محبت۔ اس پر سوائے اللہ کے اور کوئی قادر نہیں۔

جو شخص یہ کہتا ہے کہ: " جَبَرَ اللّٰـهُ الْعِبَادَ' (اللہ نے بندوں کو مجبور محض بنایا ہے)۔ ائمہ حدیث مثلاً امام ثوری، اوزاعی، زبیدی، اور احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اس پر بڑی جرح قدح کی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جبر کرنا، عاجز کا کام ہے۔ جیسے والد اپنی بیٹی کو اس کی مرضی کے خلاف مجبور کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارادہ اور مراد دونوں کا خالق ہے، البتہ حدیث نبوی کے اتباع میں " جَبَلَ اللّٰهُ الْعِبَادَ " (اللہ نے بندوں کو پیدا کیا) کہہ سکتے ہیں، مگر " جَبَلَ "کی بجائے " جَبَرَ " کا لفظ نہیں بولا جا سکتا۔

وہی ارادہ اور مراد دونوں کا خالق ہے۔ لہٰذا جیسا کہ سنت میں آتا ہے یہ کہا جائے گا کہ اس نے جبلت پر پیدا کیا اور یہ نہ کہا جائے کہ اس نے جبر کیا۔ جیسا کہ ایک صحیح حدیث میں آتا ہے۔ [1]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ خلق و تقدیر اور امر و تشریع کی جہتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، شرعی اوامر و احکام کا مقصد اس چیز کا اظہار و بیان ہے جو بندوں کے لیے نفع یا ضرر کی موجب ہو، جس طرح طبیب مریض کو فائدہ مند چیزوں کے استعمال کا حکم دیتا اور ضرر رساں اشیاء سے پرہیز کرنے کی ہدایت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے ذریعہ صلحاء و اشقیاء دونوں کے انجام سے آگاہ کر دیا، سعادت کی موجب اشیاء کا حکم دیا اور شقاوت کے موجبات سے روک دیا۔

باقی رہا اللہ کے خلق و تقدیر کا معاملہ تو اس کا تعلق ذات باری اور جملہ مخلوقات کے ساتھ ہے۔ چنانچہ جس چیز میں

[1] نبی کریم ﷺ نے اشج عبدالقیس سے فرمایا: تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جن کو رب تعالیٰ پسند فرماتے ہیں۔ ایک بردباری اور دوسرے وقار۔ اس نے عرض کیا کہ: کیا ان دونوں خصلتوں کو میں نے اپنایا ہے یا میں ان پر پیدا کیا گیا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں تمہاری اس پر جبلت ہے۔ تو اس نے عرض کیا: سب تعریف اس اللہ کی ہے جس نے مجھے ایسی خصلتوں پر پیدا کیا ہوا سے محبوب ہیں۔'' صحیح مسلم: ۱/ ۴۸ ـ ۴۹ـ کتاب الایمان، باب الامر بالایمان باللّٰہ تعالی.

عام مخلوقات کا فائدہ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ وہ کام کرتے ہیں، اگر چہ اس سے بعض کو نقصان پہنچنے کا بھی احتمال ہو۔ مثال کے طور پر بارش کو لیجئے کہ اس کا نزول رحمت وحکمت کے پیش نظر ہوتا ہے، تاہم بعض اوقات اس سے نقصان بھی پہنچ جاتا ہے، مثلاً کسی کا مکان گر جاتا ہے، کوئی سفر سے رک جاتا ہے اور کسی کا کاروبار معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح رسل وانبیاء کی بعثت بھی عین عنایت ربانی ہے، اگر چہ بعض قوموں کو اس سے الم ورنج پہنچتا ہے، اور ان کی قیادت و سیادت روبزوال ہو جاتی ہے۔

افعال اللہ وافعال العباد کے مابین فرق وامتیاز

پس جب کسی شخص کو اللہ تعالیٰ کے علم میں کافر مقدر کیا جاتا ہے تو یہ گہری مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔ اور کافر کو اس کے افعال اختیاری کی بنا پر سزا دی جاتی ہے، یہ سزا بھی حکمت ومصلحت سے خالی نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ کے افعال کو افعال العباد پر قیاس کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔ اس لیے کہ آقا جب غلام کو کسی بات کا حکم دیتا ہے تو وہ غلام کا محتاج ہوتا ہے، اور وہ کسی غرض کے تحت ایسا کرتا ہے۔ جب آقا غلام کو اس محنت وکاوش کا بدل عطا کرتا ہے تو یہ اس کا معاوضہ کہلاتا ہے۔ اندریں صورت آقا کو فعل مامور کا خالق نہیں کہہ سکتے۔ اور اگر فرض کیا کہ آقا غلام کو حکم بجا لانے کا معاوضہ نہیں دیتا یا غلام کا حق ادا نہیں کرتا تو ظالم ٹھہرے گا۔ جیسے کوئی سودا تو خریدے پر اس کی قیمت نہ دے۔ یا مزدوری سے مزدوری تو لے پر اسی اجرت نہ دے۔

اللہ تعالیٰ بندوں سے بے نیاز ہے اس نے بندوں کو انہی باتوں کا حکم دیا ہے جو ان کے لیے نفع رساں ہیں اور انہی باتوں سے روکا ہے جو ان کے لیے موجب ضرر ہیں۔ وہ حکم دیکر بندوں پر احسان کرتا ہے اور طاعت پر ان کی معاونت کر کے بھی ان کا محسن ہے۔ اور اگر فرض کیا ایک نیک عالم لوگوں کو ایک نیک کام کا حکم دیتا ہے۔ پھر وہ بعض کی اس نیکی پر معاونت کرتا ہے، اور بعض کی نہیں۔ تو جن کی معاونت کرتا ہے ان پر احسانِ تام کرتا ہے اور جن کی معاونت نہیں کرتا ان کے حق میں ظالم نہیں۔ اور اگر وہ گنہگار کو عدل وحکمت کے مقتضی کے تحت سزا دیتا ہے تو بھی محمود ہے۔ بلکہ دونوں صورتوں میں محمود ہے۔ تو جب بندہ دونوں صورتوں میں محمود ہے تو کہاں ارحم الراحمین اور احکم الحاکمین کی حکمت!!!

پس اللہ تعالیٰ کے یہ احکام ارشاد وتعلیم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ مامور کے بجالانے میں انسان کی مدد کرے تو اس کا احسان عظیم ہے اور اگر مدد نہ کرے اور بندے کو تنہا چھوڑ دے یہاں تک کہ وہ گناہ کا مرتکب ہو تو یہ کسی اور حکمت پر مبنی ہوگا۔ اور اگر وہ افعال بندے کے لیے موجب الم ورنج ہوں تو وہ ان افعال کی وجہ سے دکھ پائے گا، جو آرام وراحت کے موجب ہوتے ہیں اور سبب الم ورنج بھی، یہ سب کچھ تقدیر ربانی کے تحت ہوگا، اور ان دونوں میں کوئی منافات بھی نہیں پائی جاتی۔ اگر چہ اس نعمت یا الم کے دلوانے میں رب تعالیٰ کی قدرت وقضا شامل ہے۔ اس نے اپنی کمال قدرت اور حکمت سے اسے مختار بنایا ہے؛ اور اس اختیار پر مرتب ہونے والے اثرات اس کی حکمت اور قدرت کے اتمام میں سے ہیں۔

حکمت کلی پر کلام

اب یہ بات باقی رہی کہ آخر وہ کلی حکمت کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس حکمت کی معرفت حاصل کرنا بنی نوع انسان کے لیے ضروری نہیں، ان کے لیے تسلیم و رضا ہی کافی ہے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ ہر شے کو جانتا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے اور وہ بندوں پر ان کی ماؤں سے بھی زیادہ اور بے حد رحیم ہے، اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ اگر اکثر لوگ اس بات کو جان لیں تو انہیں اس علم سے ضرر پہنچے، اور ہم ایسے علم سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں جو نافع نہ ہو، اور لوگوں کا ہر بات میں اللہ کی حکمت پر مطلع ہونا ان کے حق میں نافع نہیں۔ بلکہ کبھی مضر بھی ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَلَكُمْ تَسُؤْكُمْ﴾ (المائدہ: ۱۰۱)

''ایسے امور کے متعلق مت پوچھو کہ اگر ان کا اظہار کر دیا جائے تو تم پر ناگوار گزرے۔''

یہ مسئلہ افعال الٰہی کی غایات و مقاصد کے نام سے موسوم ہے۔ اور غالباً حکمت الٰہیہ کے تمام مسائل سے عظیم تر ہے۔ ہم نے متعدد مواقع میں اس کی اور قدر کے مسئلہ کی تفصیل بیان کی ہے، اور ہم نے اس بات پر نہایت لطیف تنبیہ کی ہے کہ فعل کی تخلیق کا ظلم ہونا ممتنع ہے۔ چاہے یہ کہا جائے کہ اللہ سے ظلم کا صدور ممتنع ہے۔ یا یہ کہا جائے کہ یہ مقدور ہے۔ کیونکہ وہ ظلم جو ظلم ہے وہ بندے کو اس کے ناکردہ فعل پر سزا دینا ہے۔ البتہ اس کے فعلِ اختیاری پر اسے سزا دینا اور ظالموں سے مظلوموں کو انصاف دلوانا، یہ اللہ کے عدل کے کمال میں سے ہے۔

تعدیل اور تجویر کے باب میں یہ تفصیل ان قدریہ کے مذہب کے درمیان، جو اللہ کی صفتِ خلق کو بندوں میں عدل اور ظلم پر قیاس کرتے ہیں اور ان جبریہ کے مذہب کے درمیان ہے جو رب تعالیٰ کے افعال کے لیے حکمت کو نہیں مانتے، اور نہ اسے ظلم سے منزہ مانتے ہیں ان کے نزدیک اس میں کوئی فرق نہیں کہ اسے عدل و احسان کہا جائے یا پھر اسے ظلم کہا جائے۔

ان لوگوں کا یہی قول [عقیدہ] قدریہ کی شناعتوں کو اور زیادہ قوی کرنے کا ایک سبب بنا۔ حتیٰ کہ ان لوگوں نے دوسری جانب بے حد غلو کیا، اور سب سے بہتر امر ہے جو میانہ ہو، اور اللہ کا دین اس میں غلو کرنے والے اور اس سے منہ موڑنے والے کے درمیان سراپا عدل ہے، اور رب تعالیٰ کے کفر و معاصی پر سزا دینے میں اور رنگ اور لمبائی پر سزا دینے میں فرق ظاہر ہو چکا ہے۔ جیسا کہ یہ فرق اس وقت ظاہر ہو جاتا ہے کہ جب بعض لوگوں کو سزا دی جائے۔ کیونکہ کفر چاہیے اس میں رب تعالیٰ کا ارادہ اور اس کی اس پر قدرت پیدا ہوئی ہے۔ لیکن بہرحال بندے نے وہ فعل اپنے اختیار سے کیا ہے۔ اگرچہ یہ سب مخلوق ہے۔ جیسا کہ رب کے سوا دوسرا ان افعال پر ایسے سزا دیتا ہے چاہے یہ سب مخلوق ہے۔

[کافر میں ایمان کی قدرت کا مسئلہ اور اس کا جواب]

شیعہ مصنف کا اہل سنت کی طرف یہ عقیدہ منسوب کرنا کہ ''اس میں ایمان کی قدرت پیدا نہ کی۔'' یہ اس شخص کا قول ہے جو قدرت مع الفعل کا قائل ہے، اس کی رائے میں جو شخص کوئی فعل انجام نہیں دیتا تو وہ اس پر قادر نہیں تاہم اسے عاجز بھی نہیں کہہ سکتے۔ یہ جمہور اہل سنت کا قول نہیں۔ بخلاف ازیں اہل سنت انسان کے لیے اس قدرت کو ثابت مانتے ہیں

جس پر امر و نہی کا مدار و انحصار ہے اور وہ قدرت مقارن للفعل نہیں ہوتی، بلکہ فعل سے پہلے پائی جاتی ہیچو ضروری نہیں فعل کے ساتھ بھی ہو۔ جمہور اہل سنت کا یہ بھی قول ہے کہ جس قدرت کے ساتھ فعل واقع ہوتا ہے اس کا فعل کے ساتھ ہونا لازم ہے۔ جمہور اہل سنت کے نزدیک قدرت معرومہ کے ساتھ فعل جائز نہیں، اور نہ ارادۂ معرومہ کے ساتھ ہی جائز تھا۔ جیسا کہ فعل فاعل معدوم کے ساتھ نہیں پایا جاتا۔

جبکہ قدریہ اس بات کے قائل ہیں کہ قدرت فعل سے پہلے ہی ہوتی ہے۔ جبکہ ان کے بالمقابل مشبہ کا قول ہے کہ قدرت فعل کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ جبکہ جمہور امت اور آئمہ کا قول معتدل ہے کہ: قدرت کا فعل کے ساتھ ہونا لازم ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ کبھی فعل سے پہلے بھی ہوتی ہے۔ جیسے گنہگار مامور کی قدرت کہ وہ فعل پر متقدم ہوتی ہے کہ وہ نافرمان کے لیے ہوتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ (آل عمران: ۹۷)

''اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج (فرض) ہے، جو اس کی طرف راستے کی طاقت رکھے۔''

اس آیت میں صاحب استطاعت پر حج کو فرض قرار دیا گیا ہے، اگر صرف حج سے فارغ ہونے والے کو صاحب استطاعت تصور کیا جائے تو حج اسی شخص پر فرض سمجھا جائے گا جو فریضہ حج ادا کر لے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ترک حج کے جرم میں کسی کو بھی سزا نہیں دی جائے گی۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (التغابن: ۱۶)

''جس قدر ہو سکے تم اللہ سے ڈرو۔''

اس میں حسب استطاعت تقویٰ کو واجب قرار دیا گیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرنے والا تقویٰ کی استطاعت سے محروم ہوتا تو تقویٰ اسی شخص پر واجب ہوتا جو اس صفت سے بہرہ ور ہوتا۔ اور غیر متقی قابل عتاب وعقاب نہ ہوتا، اور یہ بات معلوم شدہ ضروریاتِ دین کے بالکل خلاف ہے۔

ان لوگوں نے یہ عقیدہ اس لیے اختیار کیا ہے کیونکہ قدریہ، معتزلہ اور شیعہ وغیرہ کا یہ قول ہے کہ قدرت فعل سے قبل ہوتی ہے تاکہ ضدین کے قابل ہو سکے۔ یعنی فعل کے بھی اور ترک کے بھی۔ سو فعل کے وقت تو فعل ہوگا اور یہ گمان کرتے ہیں اس وقت وہ قادر نہ ہوگا۔ کیونکہ قادر کا فعل اور ترکِ دونوں پر قادر ہونا لازم ہے۔ جبکہ فعل کے وقت وہ ترک پر قادر نہیں۔ لہٰذا یہ قادر نہیں۔

رہے اہل سنت تو وہ یہ کہتے ہیں کہ اس کا فعل کے وقت قادر ہونا ضروری ہے۔ پھر ائمہ اہل سنت کے نزدیک وہ فعل سے قبل بھی قادر ہے۔ البتہ ایک جماعت کا یہ قول بھی ہے کہ وہ فعل کے وقت ہی قادر ہوگا۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ قدرت ضدین کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ کیونکہ فعل سے متصل و مقارن قدرت اسی فعل کے لیے ہے اور وہ اس فعل کو مستلزم ہے۔ اس کے بغیر نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ اگر یہ قدرت علی سبیل البدلیت ضدین کے لیے ہوتی تو دو ضدوں میں ایک عدم کے ساتھ

اس کا وجود ممکن تھا، اور ایک شے سے مقارن شے اسے مستلزم ہوتی ہے، اور اس کے عدم کے ساتھ نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ ملزوم کا وجود لازم کے بغیر ممتنع ہے۔

جو قدریہ نے کہا ہے وہ ان کی فاسد اصل پر مبنی ہے، اور وہ یہ کہ رب تعالیٰ کا مومن و کافر اور نیک و فاجر کو قدرت دینا برابر ہے۔ یہ لوگ اس بات کا قول نہیں کرتے کہ رب تعالیٰ نے مطیع مومن کو اعانت کے ساتھ خاص کیا ہے جس کے ذریعے وہ ایمان حاصل کرتا ہے، بلکہ یہ لوگ یہ کہتے ہیں: رب تعالیٰ کی مطیع و عاصی کو اعانت یکساں ہے۔لیکن خود بندے نے طاعت کو ترجیح دی ہے، اور دوسرے نے خود معصیت کو ترجیح دی ہے۔ جیسے ایک والد جو اپنے ہر بیٹے کو ایک تلوار دے تو ایک تو مجاہد فی سبیل بنا اور دوسرا ڈاکو یا اس نے دونوں کو مال دیا تو ایک نے راہِ خدا میں خرچ کیا اور دوسرے نے وہ مال شیطان کی راہ میں لگا دیا۔

لیکن اس قول کے فاسد ہونے پر قدر کو ثابت کرنے والے اہل سنت کا اجماع ہے۔ ان کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اللہ کی مومن مطیع پر نعمت دینیہ ہے جو اس کے ساتھ خاص ہے نہ کہ کافر کے ساتھ۔ اور یہ کہ اس نے مومن کی وہ اعانت کی ہے جو کافر کی نہیں کی۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيۡكُمُ الۡاِيۡمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِىۡ قُلُوۡبِكُمۡ وَكَرَّهَ اِلَيۡكُمُ الۡكُفۡرَ وَالۡفُسُوۡقَ وَالۡعِصۡيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوۡنَ﴾ (الحجرات: ۷)

''اور لیکن اللہ نے تمھارے لیے ایمان کو محبوب بنا دیا اور اسے تمھارے دلوں میں مزین کر دیا اور اس نے کفر اور گناہ اور نافرمانی کو تمھارے لیے ناپسندیدہ بنا دیا، یہی لوگ ہدایت والے ہیں۔''

رب تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ اس نے ایمان کو ان کے لیے محبوب و مزین فرمایا۔

قدریہ کہتے ہیں: یہ محبوب بنانا؛ اور مزین کرنا ساری مخلوق کے لیے عام ہے۔ یا یہ دلائل حق کے بیان و اظہار کی قبیل میں سے ہے۔لیکن آیت کا مقتضی یہ ہے کہ یہ اہل ایمان کے ساتھ خاص ہے۔ اسی لیے فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوۡنَ﴾ ''اور وہی لوگ ہدایت والے ہیں۔'' جبکہ کافر راشدین [ہدایت والے] نہیں ہیں، اور فرمایا:

﴿فَمَنۡ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنۡ يَّهۡدِيَهٗ يَشۡرَحۡ صَدۡرَهٗ لِلۡاِسۡلَامِ ۚ وَمَنۡ يُّرِدۡ اَنۡ يُّضِلَّهٗ يَجۡعَلۡ صَدۡرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ﴾ (الانعام: ۱۲۵)

'' جسے اللہ ہدایت دینا چاہتا ہے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کا سینہ تنگ، نہایت گھٹا ہوا کر دیتا ہے، گویا آسمان میں چڑھ رہا ہے۔'' اور ارشاد فرمایا:

﴿اَوَمَنۡ كَانَ مَيۡتًا فَاَحۡيَيۡنٰهُ وَجَعَلۡنَا لَهٗ نُوۡرًا يَّمۡشِىۡ بِهٖ فِى النَّاسِ كَمَنۡ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمٰتِ لَيۡسَ بِخَارِجٍ مِّنۡهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلۡكٰفِرِيۡنَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ﴾ (الانعام: ۱۲۲)

''اور کیا وہ شخص جو مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لیے ایسی روشنی بنا دی جس کی مدد سے وہ

لوگوں میں چلتا پھرتا ہے، اس شخص کی طرح ہے جو اندھیروں میں ہے، ان سے کسی صورت نکلنے والا نہیں۔ اسی طرح کافروں کے لیے وہ عمل خوشنما بنا دیے گئے جو وہ کیا کرتے تھے۔''

﴿وَ كَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ بَيْنِنَا اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ﴾ (الانعام: ٥٣)

''اور اسی طرح ہم نے ان میں سے بعض کی بعض کے ساتھ آزمائش کی ہے، تاکہ وہ کہیں کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہمارے درمیان میں سے احسان فرمایا ہے؟ کیا اللہ شکر کرنے والوں کو زیادہ جاننے والا نہیں؟''

﴿يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ (الحجرات: ١٧)

''وہ تجھ پر احسان رکھتے ہیں کہ وہ اسلام لے آئے، کہہ دے مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو، بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمھیں ایمان کے لیے ہدایت دی، اگر تم سچے ہو۔''

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ دعا کرنے کی ہدایت فرمائی ہے:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ (الفاتحه)

''ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔ ان لوگوں کے راستے پر جن پر تو نے انعام کیا۔''

دعا سے زمانہ مستقبل میں ایسی چیز کا حصول مقصود ہوتا ہے جو قبل ازیں حاصل نہ ہو، اس دعا میں جس ہدایت کا ذکر کیا گیا ہے، وہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت و تبلیغ سے ایک جداگانہ چیز ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

﴿يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ﴾ (المائدة: ١٦)

''جس کے ساتھ اللہ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے پیچھے چلیں، سلامتی کے راہ پر ہدایت دیتا ہے۔''

﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ (النور: ٢١)

''اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی کبھی پاک نہ ہوتا اور لیکن اللہ جسے چاہتا ہے پاک کرتا ہے اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔''

﴿رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا﴾

(البقرة: ١٢٨)

''اے ہمارے رب! اور ہمیں اپنے لیے فرماں بردار بنا اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک امت اپنے لیے فرماں بردار بنا اور ہمیں ہمارے عبادت کے طریقے دکھا اور ہماری توبہ قبول فرما۔''

اور فرمایا:

﴿وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ﴾ (السجدہ : ۲۴)

''اور ہم نے ان میں سے کئی پیشوا بنائے، جو ہمارے حکم سے ہدایت دیتے تھے، جب انھوں نے صبر کیا اور وہ ہماری آیات پر یقین کیا کرتے تھے۔''

﴿وَ جَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ﴾ (القصص : ۴۱)

''اور ہم نے انھیں ایسے پیشوا بنایا جو آگ کی طرف بلاتے تھے۔''

کتاب وسنت میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں جو بیان کرتی ہیں کہ مومن بندے ہدایت، ایمان، عمل صالح اور نیکی کی طرف لے جانے والی عقل کے ساتھ خاص ہیں، اور عقل بھی یہی کہتی ہے۔ پس بیشک جب یہ فرض کیا کہ فاعل سے فعل کے صدور کے جملہ اسباب [سے بہرہ ور ہے] جیسا کہ وہ تارک سے بھی ہیں کہ اس میں فاعل کے فعل کے ساتھ اختصاص دو متماثلین میں سے ایک کو دوسرے پر بلا مرجح ترجیح دینے کے ساتھ ہے تو یہ بالضرور فاسد ہے، اور یہ وہ اصل ہے جس پر انہوں نے صانع کے اثبات کی بنا رکھی ہے۔ اگر ان کا یہ قول فاسد ہو تو ان کے پاس صانع کے اثبات کا کوئی طریق نہیں رہ جاتا۔

ان کے قول کی غایت سے ہے کہ قادرِ مختار دو مقدور میں سے ایک کو دوسرے پر بلا مرجح کے ترجیح دیتا ہے۔ جیسے بھوکا اور خوف زدہ، اور یہ قول فاسد ہے۔ کیونکہ برابری کی موجب اسباب کے ہوتے ہوئے ترجیح ممتنع ہے۔

پھر اگر تو بلا مرجح کے قول میں ترجیح وجود فعل سے ایک زائد معنی ہے تو یہ بھی سببِ مرجح ہے، اور اگر میں کوئی زائد معنی نہیں۔ تو فعل کے وجود سے پہلے فعل کا حال، فعل کے وقت کے حال جیسا ہوگا۔

پھر فعل دو میں سے ایک حالت میں۔ دوسری حالت کو بلا مرجح چھوڑنے کے ساتھ حاصل ہوگا۔ بلاشبہ یہ عقل کے ساتھ مکابرہ ہے۔ پھر جب قدریہ کے قول کی اصل یہ ہے کہ طاعات کا فاعل اور ان کا تارک دونوں اعانت و اِقدار میں برابر ہیں، تو ان کی اس اصل پر یہ بات ممتنع ہوگئی کہ فعل کے ساتھ قدرتِ مخصصہ ہو۔ کیونکہ وہ قدرت جو فعل کو خاص کرتی ہے وہ تارکِ فعل کے ساتھ نہ ہوگی۔ وہ تو فاعل کے ساتھ ہوگی، اور قدرت صرف اللہ ہی کی طرف سے ہوگی، اور جو اللہ کی طرف سے ہو وہ فعل کے وجود کے ساتھ مختص نہ ہوگی۔

پھر جب انہوں نے دیکھا کہ قدرت کا فعل سے پہلے ہونا لازم ہے تو یہ قول کیا: قدرت فعل کے ساتھ نہ ہوگی کیونکہ قدرت وہ ہوتی ہے جس کے ساتھ فعل اور ترک دونوں ہوں، اور فعل کے وجود کے وقت ترکِ ممتنع ہے۔ اسی لیے ان لوگوں نے کہا: قدرت فعل سے قبل ہوگی۔ لیکن یہ قول قطعاً باطل ہے۔ کیونکہ اثر کا وجود اس کی بعض شروطِ وجودیہ کے ساتھ ممتنع ہے۔ بلکہ لازم ہے کہ امور وجودیہ میں سے جن جن پر فعل موقوف ہے وہ فعل کے وقت موجود ہوں۔ پس ان کے قول کی نقیض حق ہے، اور وہ نقیض یہ ہے کہ فعل کے ساتھ قدرت ہونا لازم ہے۔

لیکن یہاں اہلِ اثبات کی بھی دو جماعتیں ہوگئیں۔ ایک جماعت کا یہ قول تھا کہ قدرت صرف فعل کے ساتھ ہوگی۔

ان کے گمان میں قدرت نوعِ واحد سے جو ضدین کے مناسب نہیں، اور ان میں سے بعض کا گمان یہ ہے کہ قدرت عرض ہے۔ لہٰذا یہ دو زمانوں میں باقی نہ رہے گی۔ لہٰذا فعل سے قبل اس کا وجود ممتنع ہوگا۔

لیکن درست وہ قول ہے جو آئمہ فقہ و اہل سنت کا ہے کہ قدرت کی دو انواع ہیں۔ ایک نوع وہ ہے جو فعل کی تصحیح کرنے والی ہے۔ اس کے فعل اور ترک دونوں جائز ہیں۔ یہی وہ قدرت ہے جس کے متعلق امر و نہی ہوتا ہے۔ یہ مطیع اور عاصی دونوں کو حاصل ہوتی ہے، اور یہ فعل سے قبل ہوتی ہے۔ یہ قدرت فعل تک باقی رہتی ہے۔ چاہے عرض بن کر جیسا کہ اس کے نزدیک جو قدرت کو عرض مانتا ہے اور چاہے قدرت کے امثال کے تجدد کے ساتھ اس کے نزدیک جس کا یہ قول ہے کہ اعراض باقی نہیں رہتے، اور یہ قدرت ضدین کے مناسب ہے۔

استطاعت کی تعریف:

اور اللہ کا بندوں کو امر اس طاقت کے ساتھ مشروط ہے۔ جس میں یہ طاقت نہ ہو اللہ اسے مکلّف نہیں بناتا، اور اس کی ضد عاجزی و درماندگی ہے۔ اس کا ذکر اس ارشادِ باری تعالیٰ میں ہے:

﴿وَ مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ﴾ (النساء: ٢٥)

''اور تم میں سے جو مالی لحاظ سے طاقت نہ رکھے کہ آزاد مومن عورتوں سے نکاح کرے۔''

اور فرمایا:

﴿وَ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ﴾ (التوبة: ٤٢)

''اور عنقریب وہ اللہ کی قسم کھائیں گے کہ اگر ہم طاقت رکھتے تو تمھارے ساتھ ضرور نکلتے۔ وہ اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ بے شک وہ ضرور جھوٹے ہیں۔''

﴿فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَاسَّا فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا﴾ (المجادله: ٤)

''تو دو پے در پے مہینوں کا روزہ رکھنا ہے، اس سے پہلے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں، پھر جو اس کی (بھی) طاقت نہ رکھے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔''

اس میں اس کی استطاعت کی نفی کا بیان ہے، جس نے فعل نہیں کیا لہٰذا یہ فعل کے ساتھ نہ ہوگی اور اسی معنی میں سرور کائنات ﷺ نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

''کھڑے ہو کر نماز پڑھیے، اگر کھڑا ہونا ممکن نہ ہو تو بیٹھ کر اور اگر بیٹھنے پر قادر نہ ہو تو پہلو کے بل لیٹ کر پڑھو۔'' [1]

[1] صحيح بخاري كتاب تقصير الصلاة ، باب اذا لم يطق قاعداً صلى على جنب (ح: ١١١٧)

اس حدیث میں آپ نے ایسی استطاعت کی نفی فرمائی جس کے ساتھ فعل نہ پایا جاتا ہو۔ اس سے یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ شریعت میں جو استطاعت مشروط ہے، وہ اس استطاعت سے خاص تر ہے جو عقل سے معلوم کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ شارع کا مقصد دین میں آسانی پیدا کرنا ہے، مثلاً مریض جو کھڑا ہونے پر قادر ہو مگر یہ خطرہ دامن گیر ہو کر کھڑا ہونے سے وہ بتاخیر صحت یاب ہوگا، ایسے شخص کو حصول ضرر کی بنا پر شرعاً غیر مستطیع تصور کیا جائے گا، اگرچہ لوگوں میں اسے مستطیع کے نام سے موسوم کیا جائے۔

خلاصہ کلام! یہ کہ شارع کی نگاہ شرعی استطاعت میں صرف امکان ہی پر نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کے لوازم کو بھی ملحوظ خاطر رکھتا ہے۔ جب شارع کی نظر میں راجح مفسدہ کے ساتھ فعل کا امکان موجود ہو؛ تو یہ شرعی استطاعت نہ ہوگی۔

جیسے وہ شخص جو ایسے ضرر کے ساتھ حج کی قدرت رکھتا ہو جو اس کے دین یا مال کو لاحق ہوتی ہو۔ یا کوئی زیادہ مرض کے ہوتے ہوئے بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھے۔ یا کوئی اپنی معیشت سے منقطع ہو کر دو ماہ کے لگا تار روزے رکھے، وغیرہ۔ تو جب شارع نے قدرت میں مفسدۂ راجحہ کے نہ ہونے کو شرط رکھا ہے؛ تو وہ کسی عاجز کو کیوں کر مکلّف و مامور کر سکتا ہے۔ تاہم یہ استطاعت وجود فعل تک باقی رہنے کے باوصف فعل کے پائے جانے کے لیے کافی نہیں، اگر ایسی استطاعت کافی ہوتی تو تارک و فاعل مساوی ہو کر رہ جاتے، اور دونوں میں فرق و امتیاز مشکل ہو جاتا۔ بخلاف ازیں مذکورہ استطاعت کے ساتھ ایک دوسری اعانت کا وجود ناگزیر ہے۔ جو اس کے مقارن ہو، مثلاً فاعل کا با ارادہ ہونا اس لیے کہ قدرت و ارادہ کے بغیر فعل کا تکمیل پذیر ہونا ممکن نہیں۔ وہ ارادہ جس میں عزم و استقلال پایا جاتا ہو استطاعت مقارنہ للفعل میں داخل ہے، البتہ جو استطاعت احکام کا مکلّف بنانے کے لیے شرط ہے اس میں ارادہ کا پایا جانا ضروری نہیں۔ اور فعل سے مقارن استطاعت میں ارادۂ جازمہ داخل ہے۔ بخلاف تکلیف میں مشروط استطاعت کے؛ اس میں ارادۂ شرط نہیں۔ مذکورہ بالا بیان سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ارادہ نہ کرنے والے کو کسی فعل کا مامور و مکلّف تو بناتے ہیں البتہ جو شخص کسی فعل کو انجام دینے سے عاجز ہو اس کو مامور نہیں کرتے۔ جیسے آقا اپنے غلام کو ایسے کام کا حکم تو دیتا ہے، جس کو انجام دینے کا وہ ارادہ نہیں رکھتا البتہ اسے ایسے کام تفویض نہیں کرتا جن سے وہ عاجز ہو۔ جب عزم راسخ اور قوت تامہ دونوں یک جا ہوتے ہیں، تو فعل کا وجود پذیر ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اور فعل کو مستلزم یہ ارادۂ وقوت ضروری نہیں کہ فعل کو مقارن بھی ہو، اور اگر وہ فعل کے مقارن نہیں تو اس کا تقدم کافی نہیں۔ کیونکہ وہ فعل کی علتِ تامہ ہے اور علتِ تامہ معلول کے مقارن ہوا کرتی ہے نہ کہ اس سے مقدم ہوتی ہے۔

دوسرے قدرت فعل کے وجود میں شرط ہے اور فاعل کا قادر ہونا بھی شرط ہے، اور اس شے کے وجود میں شرط جو قادر کے قادر ہونے کا ذریعہ ہو تو وہ شے اس کے عدم کے ساتھ نہیں۔ بلکہ اس کے وجود کے ساتھ ہوگی۔ وگرنہ فاعل قادر نہ ہونے کے وقت بھی قادر ہوگا، یا غیر قادر بھی قادر ہوگا۔

اہلِ اثبات کے اس قول کا یہی مطلب ہے جسے قاضی ابو بکر اور قاضی ابو یعلی وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ: ''ہمارے اور

معتزلہ کے درمیان اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ فاعل کو فاعل بنانے والا امر یہ اس کا قادر ہونا ہے اور ہم نے جملہ امور کو درست کرنے والے میں دیکھا ہے کہ اس امر کا اور حکم کا ثبوت اس کے درست کرنے والے کے عدم کے بغیر مستحیل ہے۔

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جب یہ بات ثابت ہوگی کہ عالم اور قادر کو درست بنانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ زندہ بھی ہوتو حیات کے بغیر کسی کا عالم و وقار ہونا ناممکن ٹھہرا۔ اسی طرح کوئی رنگ والا رنگین اور متحرک جب ہی متحرک ہوگا کہ جب وہ جو مصر بھی ہو لہٰذا غیر جوہر کا متلون و متحرک ہونا مستحیل ٹھہرے گا۔ لہٰذا کسی فاعل کا غیر قادر ہونے کے وقت فاعل ہونا بھی مستحیل ہوگا۔

اہلِ اثبات کہتے ہیں: یہ معتبر دلائل میں سے ہے، اور یہ دلیل اس بات کو مقتضی ہے کہ فعل پر قدرت کا ہونا لازم ہے۔ البتہ حکام سے قبل قدرت کے وجود کی نفی نہ کی جائے گی۔ کیونکہ درست کرنے والے امر کا وجود مشروط سے قبل بھی درست ہے اور اس کے بغیر بھی۔ جیسا کہ حیات کا علم کے بغیر اور جوہر کا حرکت کے بغیر وجود صحیح ہے۔

حدوث عالم اور فلاسفہ پر رد:

یہ وہ دلیل ہے جو حدوثِ عالم کے باب میں فلاسفہ کے خلاف پیش کی جاتی ہے۔ کیونکہ جب یہ فلاسفہ یہ کہتے ہیں کہ علتِ قدیمہ پہلے دورہ کے ختم ہونے کی شرط کے ساتھ دوسرا دورہ پیدا کرتی ہے۔

اسی کا جواب یہ ہے کہ محدث کے وجود کے وقت علتِ تامہ کا ہونا اور فاعل کا قادرِ تام ہونا اور مرید کا لازم ہے، اور اِحداث پر مقدم شے کا نرا وجود کافی نہیں۔ بلکہ اِحداث کے وقت مؤثر تام ہونا لازم ہے۔ اسی طرح مؤثر تام کے حدوث کے وقت مؤثر تام کا ہونا بھی لازم ہے، اور جب صرف ازلی علتِ تامہ ہو جو معلول کے مقارم ہو تو لازم آئے گا کہ حوادث کسی محدث کے بغیر ہی وجود میں آ گئے ہیں۔ اور یہ اس بات پر دلیل ہے کہ رب تعالیٰ اس چیز کے ساتھ متصف ہے جس کے ذریعے وہ حوادثِ مخلوقہ کو کرتا ہے جیسے وہ اقوال جو اس کے ساتھ قائم اور اس کی قدرت و مشیئت سے حاصل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ یہ موضوع اپنے مقام پر تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔

ارادہ و قدرت میں بیان کردہ یہ تفصیل اور دو قسموں میں اس کی تقسیم اس باب میں حاصل ہونے والے اشتباہ و اضطراب کو ختم کر دیتی ہے۔

اسی پر مالا یطاق امر کی تکلیف مبنی ہے۔ کیونکہ جس کا یہ قول ہے کہ قدرت فعل کے ساتھ ہی ہوگی، وہ یہ کہہ اٹھے گا کہ کافر و فاسق کو مالا یطاق امر کا مکلّف ٹھہرایا گیا ہے۔ لیکن یہ جمہور اہل سنت اور ان کے آئمہ کا قول نہیں۔ بلکہ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ: اللہ نے حج کو مستطیع پر واجب کیا ہے۔ بھلے وہ حج کرے یا نہ کرے۔ اسی طرح کفارہ میں مستطیع کو دو ماہ کے لگا تار روزوں کا حکم ہے؛ بھلے وہ روزے رکھے یا نہ رکھے۔ اور اللہ نے قادر پر عبادت کو واجب کیا ہے نا کہ عاجز پر۔ اب قادر عبادت بجالائے یا نہ لائے اس کی مرضی۔

رہا "مـا لا یطـاق" تو علماء نے اس کی دو تفسیریں بیان کی ہیں۔ یا تو وہ امرُاس سے عاجز ہونے کی وجہ سے "لا یطاق" کہلائے گا۔تو ایسے کسی کام کا رب تعالیٰ نے بندوں کو سرے سے حکم ہی نہیں دیا۔ یا اس امر کی ضد میں استغال کا نام "لا یطاق" ہے۔تکلیف ایسے امر میں دی جاتی ہے۔جیسا کہ بندوں کا ایک دوسرے کو امر دینا۔اہلِ سنت ان دونوں قسموں میں فرق کرتے ہیں۔لہٰذا کوئی اپنے نابینا غلام کو عبادت پر نقطے لگانے کو نہ کہے گا۔البتہ مثلاً بیٹھے ہوئے کو کھڑے ہونے کا امر ضرور کر دیا کرتا ہے۔ان دونوں باتوں میں فرق کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ان کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے، اور حسبِ موقع اس کے نکتے بھی بیان کر دیے ہیں۔

اسی طرح یہ قول کہ:''اللہ نے کافر میں ایمان کی قدرت پیدا نہیں کی۔'' یہ جمہور اہلِ سنت کا قول نہیں۔ بلکہ وہ تو یہ کہتے ہیں: اللہ نے اس میں تکلیف میں مشروط اس قدرت کو پیدا کر دیا ہوا ہے۔ بوامر و نہی کو درست کرنے والی ہے۔جیسا کہ بندوں میں ہے کہ جب وہ ایک دوسرے کو حکم دیتے ہیں۔اس بارے جو قدرت پائی جاتی ہے، وہ اللہ کے بندوں کو امر دینے میں پائی جاتی ہے۔ بلکہ اللہ کا تکلیف دینا زیادہ آسانی والا ہے اور حرج کی وجہ سے ''تکلیف کا رفع زیادہ بڑا ہے، اور لوگ ایک دوسرے اس سے بھی بڑی بات کی تکلیف دیتے ہیں، جس بات کی اللہ اور رسول نے لوگوں کو تکلیف دی ہے۔اس پر بھی لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ تکلیفِ بالا یطاق ہے۔

جو بھی ملوک وسلاطین کے خدام کے احوال میں غور کرتا ہے جو ان کی خدمت و طاعت میں لگے رہتے ہیں، تو وہ انہیں رب کی عبادت میں لگے بندوں سے بھی زیادہ محنت و مشقت کرتا پائے گا۔

فصل:......تقدیر کے بارے میں اہل سنت کے عقیدہ پر رافضی کا کلام اور اس پر ردّ

تقدیر کے بارے میں اہلِ سنت کے عقیدہ پر رافضی کا کلام،حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا لا جواب ہونا اور ان کی دلیل کا ختم ہونا، اور اس باب میں اور رافضی کا رد۔

[شبہ] رافضی کہتا ہے:''اور ان میں سے ایک انبیاء کا لا جواب ہونا، اور ان کی حجت نہ رہنا بھی ہے۔کیونکہ نبی علیہ السلام جب کسی کافر کو یہ کہتا ہے کہ مجھ پر ایمان لے آ اور میری تصدیق کر، اور وہ جواب میں یہ کہتا ہے: اسی سے جس نے تجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے، یہ کہہ کہ وہ مجھ میں ایمان پیدا کر دے یا مجھ میں ایمان لانے کی قدرتِ مؤثرہ پیدا کر دے تا کہ میں ایمان پر قدرت پا سکوں اور تجھ پر ایمان لے آؤں۔ وگرنہ تو مجھے ایک ایسی بات کا مکلّف کیونکر بناتا ہے جس پر میری قدرت ہی نہیں؟ بلکہ اس نے مجھ میں کفر کو پیدا کیا ہے، اور میں رب تعالیٰ پر قاصر آنے پر قادر نہیں تب پھر یقیناً وہ نبی دلیل سے خالی ہو جائے اور جواب نہ دے پائے گا۔''

[جواب:] رافضی کی اس بات کا جواب یہ ہے کہ: اس مقام میں اکثر لوگوں نے دخل اندازی کی ہے۔ چنانچہ جب کسی کو اس کے ذمے واجب امر کا حکم دیا جاتا ہے تو وہ کنی کترانے کے لیے تقدیر کو آڑ بناتا ہے اور کہتا ہے کہ: تب کروں گا

جب اللہ مجھے قدرت دے گا۔ یا اللہ مجھے اس پر قدرت دے گا یا جب اللہ اس کا میرے حق میں فیصلہ کر دے گا، اور جب اسے کسی شرعاً ممنوع بات سے روکا جاتا ہے تو وہ اسی طرح کہتا ہے: یہ تو اللہ نے میرے حق میں خود فیصلہ کیا ہے۔ اب میں کیا کروں؟ وغیرہ وغیرہ۔

اس بات پر دنیا بھر کے اہل دین و عقل کا اتفاق ہے کہ قدرت سے دلیل پکڑنا حجت باطلہ ہے، اور المیہ یہ ہے کہ اس قول کے قائل پر جب کوئی ظلم کرے یا اس کے کسی حق واجب کو ادا نہ کرے اور ظالم ظلم کی دلیل میں قدرت کو پیش کرے تو یہ خود اس دلیل کو قبول کرنے پر ہرگز تیار نہ ہوگا۔ بلکہ وہ ہر صورت میں اپنا حق اس سے مانگے گا، اور عدم ادائیگی کی صورت میں اس پر عقاب و عتاب بھی کرے گا۔

بلاشبہ یہ اس سوفسطائیہ [دھوکہ بازی] میں سے ہے جو علوم میں پیش کی جاتی ہے، اور چاہے یہ سوفسطائیت اکثر لوگوں کو پیش بھی آتی ہے۔ حتیٰ کہ بسا اوقات آدمی کو خود اپنے آپ کے وجود میں بھی شبہ پیش آ جایا کرتا ہے۔ پر آپ اس کے فاسد ہونے کو ضرور جانتے ہیں۔ پھر اسی طرح یہ سوفسطائیت اعمال میں بھی عارض ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ یہ ایک ایسا شبہ ہے جو صدق اور عدلِ واجب وغیرہ کے اسقاط میں اور کذاب وظلم وغیرہ کی اباحت میں پیش آتا ہے۔ لیکن دلوں کو پھر بھی اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ یہ شبہ باطل ہے، اور تحقیق کے وقت یہ شبہ کوئی بھی دوسرے سے قبول نہیں کرتا، اور نہ کوئی اس سے دلیل پکڑتا ہے۔ ہاں اگر فعل کی حجت معلوم نہ ہو تو اور بات ہے۔

جب آدمی کو اس بات کا علم ہو کہ اس نے جو کیا ہے وہ مصلحت اور مامور بہ ہے اور یہ کرنا مناسب تھا تو وہ کبھی بھی قدرت اور تقدیر کو آڑ نہیں بناتا۔ اسی طرح اگر اسے یہ علوم ہو کہ جو کام اس نے نہیں کیا وہ اس کے ذمہ ہی نہ تھا، یا وہ مصلحت یا مامور بہ ہی نہیں۔ تب بھی وہ تقدیر کو دلیل نہیں بناتا۔ بلکہ تقدیر کو حجت وہ بناتا ہے جو ہوائے نفس کا غلام اور علم سے کورا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب مشرکوں نے یہ کہا کہ:

﴿لَوْشَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ﴾ (الانعام: ۱۴۸)

''اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شریک بناتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز حرام ٹھہراتے۔''

تو رب تعالیٰ نے انہیں اس کا یہ جواب دیا:

﴿قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَo قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْشَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ (الانعام: ۱۴۸ - ۱۴۹)

''کہہ کیا تمھارے پاس کوئی علم ہے کہ تم اسے ہمارے لیے نکالو، تم تو گمان کے سوا کسی چیز کی پیروی نہیں کر رہے اور تم اس کے سوا کچھ نہیں کہ اٹکل دوڑاتے ہو۔ کہہ دے پھر کامل دلیل تو اللہ ہی کی ہے، سو اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ضرور ہدایت دے دیتا۔''

کیونکہ یہ مشرک اپنی عقل و فطرت دونوں سے جانتے تھے کہ ان کو پیش کردہ یہ دلیل باطل ہے۔ کیونکہ اگر کوئی ان کا

مال چھین لیتا یا عزت لوٹ لیتا یا اس کی اولاد کو قتل کر دیتا، یہ اس پر ظلم کرنے پر اڑا رہتا اور لوگ اسے ایسا کرنے سے منع کرتا اور وہ جواب میں یہ کہتا کہ اگر اللہ چاہتا تو میں ایسا نہ کرتا۔تو یہ مظلوم کسی بھی صورت میں اس ظالم و فاجر کی یہ دلیل قبول نہ کرے، اور نہ دوسرے لوگ ہی اس دلیل کو مانیں۔ یہ تو اس ظالم نے ملامت ہٹانے کے لیے دلیل بنائی ہے جس کی کوئی وجہ نہیں۔اسی لیے رب تعالیٰ نے ان مشرکوں سے فرمایا: کیا تمہارے پاس اس بات کی کوئی دلیل ہے تو پیش کرو کہ یہ شرک وتحریم اللہ نے کرنے کو کہا ہے اور اس کا فعل مناسب ہے۔تم تو اپنے گمانوں کے پیروکار ہو۔تمہارے پاس اس کا کوئی علم نہیں۔تم بس اٹکل کے تیر چلاتے اور افتراء پردازی ہی کرتے ہو۔تمہاری سب سے عمدہ دلیل صرف تمہارا گمان اور ظن ہے۔ نا کہ رب تعالیٰ کی مشیئت اور قدرت۔ کیونکہ صرف قدرت اور مشیئت نہ دلیل ہے اور نہ کسی کی کسی پر حجت ہے، اور کسی کا کسی کے سامنے عذر ہے۔ کیونکہ قدر و تقدیر میں سب لوگ ایک ہیں۔اگر قدرت ومشیئت دلیل بنے تو ظالم اور مظلوم، صادق اور کاذب، عالم اور جاہل اور نیک اور بد میں سرے سے کوئی فرق ہی نہ رہے، اور نہ اس بات میں ہی کوئی فرق رہے کہ لوگوں کے لیے کیا صالح اور کیا مفسد ہے، اور کیا نافع اور کیا ضار ہے۔ یہ مشرک جو توحید و ایمان کو اور اللہ اور اس کے رسول کو ترک کرنے کے لیے تقدیر کو حجت بناتے ہیں، خود اپنے حقوق سے اس دلیل کو سن کر دست بردار ہونے کے لیے ہرگز بھی تیار نہیں، اور نہ اس دلیل کی رو سے کسی کا ظلم سہنے کو ہی تیار ہیں۔ بلکہ ظلم کے خلاف اور اپنے حق کے لیے لڑنے تک کے لیے تیار رہتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے جب انہیں اس بات کی دعوت دی کہ وہ اللہ کے اس حق کو ادا کریں جو بندوں پر واجب ہے اور وہ اللہ کے امر کو بجا لائیں تو ان لوگوں نے بھی تقدیر کو آڑ بنایا اور اللہ کے حق کے ترک پر اور اس کے امر کی مخالفت پر تقدیر کو حجت بنایا اور جو بات پسند نہ تھی اسے تقدیر کی آڑ میں قبول نہ کیا۔

صحیحین میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں ارشاد فرمایا:

''اے معاذ! کیا تو جانتا ہے کہ اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے؟ اس کا بندوں پر یہ حق ہے کہ بندے اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں۔اور کیا تو جانتا ہے کہ جب بندے یہ کرلیں تو اللہ پر ان کا حق کیا ہے؟ بندوں کا اس پر یہ حق ہے کہ وہ انہیں عذاب نہ دے۔'' [1]

تقدیر کو حجت و جاہل لوگ پکڑا کرتے تھے جن کے پاس اس بات کا کوئی علم نہ ہوا کرتا تھا کہ کرنا کیا ہے اور کیا ترک کرنا ہے۔ وہ صرف ظن کے پیروکار تھے۔اٹکل کے تیر چلاتے تھے۔ وہ تقدیر کو صرف اللہ کے حق کے ترک میں اور اس کی نافرمانی پر جسارت میں حجت بناتے تھے، نا کہ اپنے حق کے ترک میں اور دوسرے کا ظلم سہنے میں، اور نہ اپنے امر کی مخالفت میں۔اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ نام نہاد درویش، صوفیاء، عوام، مجاہد اور فقہاء وغیرہ ظن کی پیروی اور خواہش نفس کی اتباع کے وقت تقدیر کی طرف دوڑتے تھے۔اگر ان کے پاس علم و ہدایت ہوتی تو کبھی بھی تقدیر کو حجت نہ بناتے۔ ہاں علم و

[1] صحیح البخاری: ۸/ ۱۰۵۔ کتاب الرقاق، باب من جاھد نفسه فی طاعة اللّٰه.

ہدایت نہ ہونے کے وقت وہ اسی تقدیر پر اعتماد کرتے ہیں۔

یہ بڑی بزرگ اور اہم اصل ہے جو بھی اس پر توجہ دے گا وہ جان لے گا کہ اکثر لوگوں کی ضلالت وغوایت کا منشا یہی ہے۔ اسی لیے ہم کتاب وسنت اور امر و نہی کے پیروکار مشائخ کو کثرت کے ساتھ علم وشرع کی اتباع کرنے کی وصیت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ انہیں متعدد اشیاء میں اِرادات اور ان کی محبت عارض ہوتی ہے، اور وہ اپنی خواہشات کو اللہ کا دین سمجھ کر، ان کی پیروی کرنے میں لگ رہے ہوتے ہیں۔ ان کے پاس سوائے ظن، ذوق اور وجد کے اور کچھ نہیں ہوتا جس کا مرجع نفس کی محبت و ارادت ہوتا ہے۔ چنانچہ کبھی تو وہ تقدیر کو حجت بناتے ہیں اور کبھی ظن اور اٹکل کو۔ لیکن درحقیقت وہ خواہش نفس کے پیروکار ہوتے ہیں۔ اگر وہ علم کی پیروی کریں جو شارع کی شریعت ہے تو وہ ظن اور خواہشاتِ نفس کے دام تزویر سے باہر آ جائیں، اور اپنے رب کے حکم کے پیروکار بن جائیں، جو سراسر ہدایت ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى٥﴾ (طٰه: ١٢٣)

''پھر اگر کبھی واقعی تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کے پیچھے چلا تو نہ وہ گمراہ ہوگا اور نہ مصیبت میں پڑے گا۔''

رب تعالیٰ نے سورۂ انعام، سورۂ نحل اور سورۂ زخرف وغیرہ میں مشرکین کی طرف سے اس معنی کو ذکر کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنَاهُمْ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُوْنَ٥﴾ (الزخرف: ٢٠)

''اور انھوں نے کہا اگر رحمان چاہتا تو ہم ان کی عبادت نہ کرتے۔ انھیں اس کے بارے میں کچھ علم نہیں، وہ تو صرف اٹکلیں دوڑا رہے ہیں۔''

رب تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اس بارے ان کے پاس کوئی علم نہیں، وہ صرف اٹکل کرتے ہیں، اور سورۂ انعام میں ارشاد ہے:

﴿قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ﴾ (الانعام: ١٤٩)

''کہہ دے پھر کامل دلیل تو اللہ ہی کی ہے۔''

یعنی رسولوں کو بھیجنے اور کتابوں کو اتارنے کے ذریعے۔

اور فرمایا:

﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ (النساء: ١٦٥)

''تاکہ لوگوں کے پاس رسولوں کے بعد اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہ جائے۔''

پھر رب تعالیٰ نے یہ فرما کر قدر کو ثابت کیا ہے:

﴿فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ (الانعام: ۱۴۹)

''سو اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ضرور ہدایت دے دیتا۔''

رب تعالیٰ نے حجت شرعیہ کو ثابت کیا اور مشیئت قدریہ کو بیان کیا، اور یہ دونوں حق ہیں، ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ قَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَ لَاۤ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾ (النحل: ۳۵)

''اور جن لوگوں نے شریک بنائے انھوں نے کہا اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اس کے سوا کسی بھی چیز کی عبادت کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم اس کے بغیر کسی بھی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ اسی طرح ان لوگوں نے کیا جو ان سے پہلے تھے تو رسولوں کے ذمے صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا اور کیا ہے؟''

رب تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ یہ کلام دراصل پیغمبروں کی لائی تعلیمات کی تکذیب ہے۔ جو ان کے حق میں کوئی دلیل نہیں، اور اگر یہ کلام محبت ہوتا تو ہر سچے کو جھٹلانے اور ہر ظلم کو سراہنے کی قوی دلیل ہوتا۔ بنی آدم کی فطرت میں یہ بات ہے کہ یہ کلام صحیح دلیل نہیں۔ بلکہ اسے وہ دلیل بناتا ہے جو علم سے تہی دامن اور ظن کا پیروکار ہو۔ جیسے ان لوگوں نے کیا جنہوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔ بلکہ اللہ نے رسولوں کو بھیج کر اور کتابیں اتار کر حجت تمام کر دی ہے۔ جیسا کہ ایک صحیح حدیث میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

''اللہ سے بڑھ کر کسی کو یہ محبوب نہیں کہ اس کے حضور عذر پیش کیا جائے۔ (یعنی اللہ کو بندہ کی اس کی جناب میں عذر خود ہی بے حد محبوب ہے) اور اسی لیے اس نے اپنی تعریف بیان کی ہے، اور اللہ سے بڑھ کر کوئی غیرت والا نہیں۔ اسی وجہ سے اس نے بے حیائیوں کو حرام قرار دیا ہے۔ ظاہری بے حیائیوں کو بھی اور باطنی بے حیائیوں کو بھی۔'' [1]

رب تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اسے یہ بات محبوب ہے کہ اس کی مدح بیان کی جائے۔ اس کے حضور عذر و معذرت کی جائے، اور اس نے بے حیائیوں کو حرام قرار دیا ہے، اور اسے عدل و احسان پر مدح کیا جانا پسند ہے، اور یہ کہ اس کی ظلم کے ساتھ تعریف نہ بیان کی جائے۔

یہ بات معلوم ہے کہ اس نے امر و نہی کو بیان کر دیا۔ پھر جو ان کو بجا لایا تو اس نے ان کی پریشانیوں اور تکلیفوں کو دور کر دیا۔ لیکن پھر جنہوں نے اس کے امر و نہی کی حد سے تجاوز کیا اس نے انہیں عذاب دیا اور ان سے انتقام لیا۔ پھر جب

---

[1] صحیح البخاری: ٦/ ٥٧۔ کتاب التفسیر سورۃ الانعام: باب: ﴿ولا تقربوا الفواحش﴾ عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مع اختلاف الالفاظ۔

انہوں نے کہا کہ کیا یہ اللہ نے ہم پر مقدر نہ کیا تھا؟ اگر وہ چاہتا تو ہم نہ کرتے۔

تو ان کو یہ جواب ہے کہ تمہاری کوئی حجت نہیں اور نہ تمہارے کوئی عذر ہی بتلائے کہ جو تم نے کیا وہ نیکی اور خوبی تھا۔ یا یہ کہ تم اس میں معذور تھے۔ لہٰذا تمہارا یہ کلام غیر مقبول ہے، اور جو بیان اور اعذار گزرے ان کی رو سے تم پر حجت تمام ہو چکی۔ اگر حاکم کچھ لوگوں کو ایک رقم دے کر دوسرے شہر بھیجے اور وہ اسے رستے میں کسی ویرانے میں پھینک دیں جہاں کوئی نہ ہو، ادھر حاکم ہی کا ایک دستہ سفر جہاد میں ادھر آ نکلے اور وہ اس مال کو نقطہ سمجھ کر اٹھا لیں اور سنبھال لیں تو حاکم کو پہلے لوگوں کو اس بات پر سزا دینا روا ہوگا کہ انہوں نے حکم میں کوتاہی کی اور مال کی حفاظت نہ کرتے ہوئے اسے ضائع کر دیا۔

پھر اگر وہ یہ عذر کریں کہ آپ ہمیں بتا دیتے کہ آپ پیچھے ایک دستہ بھی روانہ کر رہے ہیں تو اس مال کی خاطر خواہ حفاظت کرتے اور حاکم انہیں یہ جواب دیں کہ یہ بات مجھ پر لازم نہ تھی۔ ہاں اگر میں ایسا کر دیتا تو یہ ایک گونہ تمہاری امتثالِ امر میں اعانت ہوتی۔ لیکن مال کی حفاظت پھر بھی تم لوگوں کے ذمے تھی۔ جیسے امانتوں کی حفاظت ذمہ ہوا کرتی ہے تو اس ساری گفتگو حجت حاکم کی ہوتی اور وہ انہیں سزا دینے کی صورت میں ظالم بھی ٹھہرے گا۔ چاہے اس نے انہیں آگاہ نہ کر کے ان کی اعانت نہ بھی کی ہو تب بھی۔ البتہ مصلحت دونوں کے بھیجنے میں تھی۔

بلند مثال اللہ کے لیے ہے۔ وہ اپنے ہر فعل حکیم اور عادل ہے۔ اس کی قدرت و مشیئت سے کچھ خارج نہیں۔ لہٰذا جب وہ بندوں کو خود انہی کی مصلحت کے لیے حدود کی حفاظت اور فرائض قائم کرنے کا حکم دیتا ہے تو یہ اس کا بندوں پر احسان ہے اور انہیں ان کی نفع رساں باتوں کا علم دینا ہے، اور جب اس نے دوسرے امور کو پیدا کیا اور بندوں نے ان دوسرے امور کی وجہ سے اس کے حدود و فرائض میں تفریط و اعتداء سے کام لیا جن کی وجہ سے انہیں ضرر بھی حاصل ہوا اور اس دوسری مخلوق کی پیدائش اس کی حکمت و مصلحت تھی تو وہ ان دونوں تخلیقوں میں عادل و حکیم ہے۔ چاہے اس نے پہلی مخلوق کی ایسی زیادتی کے ساتھ مدد نہ بھی کی ہو جس کی وجہ سے وہ تفریط و عدوان سے محفوظ رہ سکیں۔ بالخصوص جب وہ جانتا بھی ہے اگر وہ اس زیادتی کو پیدا کرتا ہے تو اس سے زیادہ راجح مصلحت کا فوت ہونا لازم آتا ہے۔ کیونکہ ضدین یکجا نہیں ہوا کرتیں۔

غرض یہاں یہ بتلانا مقصود ہے کہ تقدیر کو دلیل بنانا ایک بیمار دلیل ہے۔ کیونکہ اس میں علم کی رو سے بیان کردہ حق کی عدم اتباع ہے۔ کیونکہ انسان زندہ، حساس اور متحرک بالارادہ ہے۔

اسی لیے ارشاد نبوی ہے کہ: ''سب سے سچے نام حارث اور ہمام ہیں۔'' [1]

حارث یہ کاسب و عامل کو کہتے ہیں اور ہمام بہت زیادہ ارادہ کرنے والے کو، اور ہم یہ قصد و ارادہ کے بالکل آغاز کو کہتے ہیں۔ لہٰذا ہر انسان حارث بھی ہے اور ہمام بھی، اور متحرک بالارادہ بھی ہے، اور یہ حس و شعور کے بعد ہوتا ہے۔ کیونکہ ارادہ مراد کے شعور پر مسبوق ہوتا ہے۔ لہٰذا محبت، شوق، طلب، اختیار اور ارادہ وغیرہ کا تصور شعور کے بعد ہی ہوتا ہے، اور

[1] سنن ابی داؤد: ٦/ ٣٩٤۔ کتاب الادب، باب فی تعبیر الاسماء.

یہی حکم ان امور کا بھی ہے جو شعور کی جنس میں سے ہیں۔ جیسے حسل، علم، سمع، بصر، شم، ذوق اور لمسن وغیرہ۔ پس یہ شعور و ادراک یہ ارادہ محبت اور طلب پر سابق ہوتے ہیں۔

ہر زندہ اس فطرت پر پیدا کیا گیا ہے کہ وہ مناسب و مفید کی محبت رکھتا ہے اور مکروہ و مضر سے بغض رکھتا ہے۔ لہٰذا جب وہ جب مناسب و نافع چیز کا تصور کرتا ہے تو اس کا ارادہ بھی کرتا ہے اور اسے سے محبت بھی کرتا ہے، اور جب وہ کسی مضر شے کا تصور کرتا ہے تو اس سے بھاگتا ہے اور اس سے نفرت کرتا ہے۔ لیکن یہ تصور کبھی علم تو کبھی ظن و تخمین ہوتا ہے۔ لہٰذا جب اسے معلوم ہو جائے کہ اس کی مراد نافع ہے، مصلحت ہے اور مناسب ہے تو وہ حق و ہدایت پر ہوتا ہے، اور جب اسے اس بات کا علم نہیں ہوتا تو وہ ظن اور خواہش نفس کا پیروکار ہوتا ہے، اور جب ان کے پاس یہ علم آ جاتا ہے کہ اس میں تو کوئی مصلحت نہیں تو وہ حق سے منہ موڑنے کے لیے کسی ضد کی طرح تقدیر کو حجت بناتا ہے۔ نا کہ حق پر اعتماد کرنے کے لیے۔ لہٰذا اپنے ظاہر و باطن میں تقدیر کو وہی حجت بناتا ہے جسے اس بات کا علم نہ ہو کہ وہ حق پر ہے۔

تو جب بات یہی ہے تو پھر رسولوں کے خلاف تقدیر کو حجت بنانے والا اس بات کا مضر ہوگا کہ اس کے پاس اپنے موقف کی کوئی دلیل نہیں، اور وہ بغیر علم کے کلام کر رہا ہے، اور ایسا آدمی اپنی بات میں باطل پر ہوتا ہے، اور جو بغیر علم کے حجت لائے اس کی حجت مردود ہوتی ہے۔ پھر یا تو وہ جاہل ہوتا ہے تو ایسا آدمی علم سے آراستہ ہو، اور وہ حق جاننے کے باوجود خواہش نفس کا پیرو ہوتا ہے تو اس کے ذمہ ہے کہ حق پر چلے اور خواہش ترک کر دے۔ پس واضح ہو گیا کہ تقدیر کو حجت بنانے والا بے علم اور خواہشِ نفس کا پیرو ہوتا ہے، اور بھلا اس سے بڑھ کر بے راہ کون ہوگا جو اللہ کی ہدایت کے بغیر خواہش کا پیرو ہو۔

اب اس مقام پر جواب کی کوئی صورتیں ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ یہ انقطاع ہے۔ اگر تقدیر کو حجت بنانا روا ہو۔ البتہ جب تقدیر کو دلیل بنانا باطل اور ایسا باطل ہے جو سب فطرتوں اور عقلوں میں لازم جاگزیں ہے تو سرے سے یہ سوال کرنا ہی لائقِ التفات نہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بات لوگوں کی عقل و فطرت میں راسخ ہے کہ جس سے کسی فعل اختیاری کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو اسے ایسی دلیل لانا روا نہیں ہوتا، اور جو دوسرے سے اپنا قرض مانگے تو اسے جواب میں یہ کہنا جائز نہ ہوگا کہ جب تک اللہ مجھ میں دینے کا داعیہ پیدا نہ کرے گا میں قرض نہ دوں گا۔ اس طرح سے کا خریدا ثمن کے مطالبہ پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ جب تک اللہ مجھ میں قدرت اور ادا کا داعیہ وغیرہ پیدا نہ کرے گا میں ثمن نہ دوں گا۔

یہ وہ امر ہے جس پر رب تعالیٰ نے ہر کافر و مسلم کو پیدا کیا ہے۔ چاہے وہ تقدیر کو مانتا ہو یا اس کا منکر ہو۔ تو جب عقل بدیہہ کے نزدیک اس اعتراض کا فاسد ہونا معروف ہے تو کسی کو روا نہیں کہ وہ اس بات کو پیغمبروں کے خلاف پیش کرے۔

۲۔ دوسرا یہ کہ: رسول ایسے کافر سے یہ کہے گا: میں تمہیں ڈرانے والا ہوں۔ اگر تو نے میرے امر کا امتثال کیا تو سعادت نجات پا جائے گا، اور نہ کرنے کی صورت میں سزا دیا جائے گا۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے صفا پہاڑی پر چڑھ کر یہ

فرمایا تھا: ''میں تمہیں صبح کو ہونے والے حملے سے آگاہ کرتا ہوں! لوگوں نے کہا ٹھیک ہے (ہم سننے اور ماننے کو تیار ہیں) پھر فرمایا: بھلا بتاؤ تو کہ اگر تمہیں یہ خبر دوں کہ صبح کو تم لوگوں پر حملہ ہونے والا ہے تو کیا تم لوگ میری تصدیق کرو گے؟ لوگوں نے کہا: ہم نے کبھی آپ ﷺ پر جھوٹ نہیں پرکھا۔ (کہ آپ ﷺ تو ہمیشہ سچ بولتے ہیں)۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں تمہیں آگے آنے والے ایک شدید عذاب سے ڈراتا ہوں۔'' ❶ اور یہ بھی فرمایا: ''میں تو کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔'' ❷

یہ بات معلوم ہو کہ دشمن سے ڈرائے جانے والا کبھی ڈرانے والے کو یہ نہیں کہتا کہ: تو دعا کر کہ اللہ مجھ میں ایسی قدرت پیدا کر دے کہ میں بھاگ نکلوں۔ بلکہ وہ فرار ہو جانے کی حتیٰ الامکان کوشش کرتا ہے۔ البتہ اللہ فرار میں اس کی اعانت کرتا ہے۔ پس ایسا کلام صرف وہی کرتا ہے جو رسولوں کا مکذب ہو۔ کیونکہ نذیر کو سچا سمجھتے ہوئے کوئی بھی فطرت یہ عذر نہ پیش کرے گی اور جب یہ کلام مکذبین کا ہے تو جو ان پر آفت آئے گی وہی اس پر بھی آئے گی۔

۳۔ جو رب کی تیسری صورت یہ ہے کہ ایسے شخص سے پیغمبر یہ کہے گا کہ اللہ سے ایسی بات کرنا میرے شایاں نہیں۔ بلکہ میرے ذمے تو صرف اس کی رسالت کا پہنچانا ہے۔ میرے ذمے وہ ہے جو لگایا گیا اور تیرے ذمے وہ ہے جو لگایا گیا۔ میرے ذمہ ابلاغ رسالت ہے، سو وہ میں نے کر دی۔

۴۔ چوتھا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ پیغمبر یہ کہے: نہ مجھے اور نہ کسی اور کو یہ زیبا ہے کہ وہ رب تعالیٰ سے یہ کہے کہ تو نے میرے اندر یہ کیوں نہ پیدا کیا اور وہ کیوں نہ پیدا کیا۔ کیونکہ لوگوں کے اقوال دو قسم پر ہیں۔ ایک یہ کہ: حکمت کوئی نہیں، بس نری مشیئت ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو چاہتا ہے حکم دے دیتا ہے۔ دوسرا یہ کہ: اللہ کے حکم میں حکمت ہے۔ لہٰذا وہ جو کرتا ہے مبنی پر حکمت ہوتا ہے اور وہی ترک کرتا ہے جس میں حکمت نہیں ہوتی۔

تو جب بات یہ ہے تو بندے کو اللہ کے سامنے ایسی بات کہنا روا نہیں۔ اسی لیے رب تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ هُمْ یُسْئَلُوْنَ﴾ (الانبیاء: ۲۳)

''اس سے نہیں پوچھا جاتا اس کے متعلق جو وہ کرے اور ان سے پوچھا جاتا ہے۔''

۵۔ پانچواں جواب یہ ہے کہ: وہ پیغمبر یہ کہے گا کہ: کسی فعل پر تیری اعانت کرنا، یہ اس کا فعل ہے، اور وہ جو فعل بھی کرتا ہے کسی حکمت پر مبنی ہوتا ہے، اور جو نہیں کرتا وہ حکمت نہ ہونے کی وجہ سے نہیں کرتا، اور رہی نفسِ طاعت تو وہ تیرا فعل ہے جس کی مصلحت تجھے ہی ملے گی، اور اگر وہ اس باب میں تیری اعانت کرتا ہے تو یہ اس کا تجھ پر فضل ہوگا، اور اگر وہ نہیں کرتا تو یہ اس کا تیرے ساتھ عدل ہوگا۔ پس اس کا تجھے مکلّف اس کی کسی حاجت کی وجہ سے نہیں۔ جو وہ تیری اعانت کا محتاج بھی ہو۔ جیسا کہ آقا اپنے غلام کو اپنی مصلحت کے لیے امر دیتا ہے۔

❶ صحیح البخاری: ٦/ ١١١۔ کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ الشعراء، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما مع اختلافِ الالفاظ.

❷ صحیح البخاری: ٨/ ١٠١ ـ ١٠٢۔ کتاب الرقاق، باب الانتهاء عن المعاصی عن ابی موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ.

پھر اگر غلام غیر قادر ہو تو آقا اس کی اعانت کرتا ہے تاکہ امر کی مراد کی مصلحت اسے ملے۔ بلکہ اللہ کا امر ارشاد، ہدایت اور بندوں کو ان کی دنیا و آخرت کے حق میں مفید باتوں کی رہنمائی ہے۔ پس جو نفع و نقصان والے فعل کو جان لیتا ہے اور یہ کہ اسے نافع فعل کی احتیاج ہے۔ وہ ایسی بات کبھی نہیں کرتا کہ مجھے اس امر کی احتیاج تو ہے، پر کروں گا تب جب مجھ میں اس کا فعل تخلیق ہوگا۔ بلکہ ایسا آدمی تو امرِ الٰہی کے سامنے سراپا تسلیم و رضا ہوتا ہے۔حتیٰ کہ اللہ اس کی اس فعل پر اعانت فرماتا ہے۔

جیسے اگر کسی کو یہ کہا جائے کہ وہ دشمن تجھ پر حملہ کرنے والا ہے، یا یہ درندہ تجھے پھاڑ کھائے گا، یا سیلابی ریلا تیرا گھر ڈوبنے والا ہے،تو وہ ہرگز یہ نہ کہے گا کہ میں اس وقت بھاگوں یا بچوں گا نہیں۔ جب تک اللہ مجھ میں بھاگنا پیدا نہ کرے گا، بلکہ وہ اسی وقت بھاگ کھڑا ہوگا اور اللہ سے اس پر اعانت مانگے گا۔ اسی طرح کھانے پینے کی اور لباس پوشاک کی ضرورت کے وقت بھی وہ یہ نہیں کہتا کہ جب تک اللہ مجھ میں یہ چیزیں پیدا نہ کرے گا۔ میں نہ کھاؤں پیوں گا اور نہ کچھ پہنوں گا۔ بلکہ وہ ان باتوں کا ارادہ اور کوشش کرے گا، اور اللہ سے اس کی تیسیر کا سوال کرے گا۔

پس انسانی فطرت اس بات پر بنائی گئی ہے کہ وہ قابلِ احتیاج چیزوں کو پسند کرتی ہے اور مضر اشیاء کو دفع کرتی ہے، اور اس پر رب تعالیٰ سے استعانت کرتی ہے۔ یہ اس فطرت کا موجب ہے جس پر اللہ نے بندوں کو پیدا کیا ہے۔اسی لیے اللہ نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ مامورات کی بجا آوری میں اس سے اعانت کا سوال کریں۔

٦۔ چھٹا جواب یہ ہے کہ: یہ کہا جائے کہ یا تو ایسی بات طاعت کا مرید ہی کرے گا جو جانتا ہے کہ یہ اس کے لیے نافع ہے یا وہ کرے گا جو اس کے نافع ہونے کو نہیں جانتا، اور دونوں سے ہی ایسی بات کا ہونا ممتنع ہے۔ وہ یوں کہ جو طاعت کو اور اس کے نافع ہونے کو جانتا ہے وہ عاجزی کی صورت کے سوا ہر صورت میں اطاعت کرے گا۔ کیونکہ قدرت کے ساتھ طاعت کا ارادۂ جازمہ طاعت کو واجب کرتا ہے۔ کیونکہ طاعت، قدرت، اور داعی تام کے وجود کے ساتھ مقدور کے وجود کو واجب کرتی ہے۔لہٰذا جب طاعت شہادتین کا تکلم ہے تو جس میں اس کا ارادۂ جازمہ ہوگا وہ شہادتین ضرور پڑھے گا۔ کیونکہ قدرت اور داعی تام موجود ہے، اور جو ایسا نہ کرے گا تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ ایسا کرنا ہی نہیں چاہتا۔

اگر وہ طاعت چاہنا ہی نہیں تو رسول سے اس کا یہ مطالبہ ہی ممتنع ہوگا کہ اللہ اس میں طاعت کو پیدا کرے۔ کیونکہ اگر وہ رسول سے اس کے اپنے اندر پیدا کیے جانے کا مطالبہ کرے گا تو وہ طاعت کا مرید ٹھہرے گا، اور سوائے مرید کے کوئی ایسی بات کر نہیں سکتا۔ طاعتِ مقدورہ کا مرید وہی ہوگا جو اسے کر گزرے گا۔

اس کی مزید تفصیل ساتویں جواب میں ملاحظہ ہو:

٧۔ ساتواں جواب یہ ہے کہ: اسے یہ کہا جائے گا کہ تو ایمان لا سکتا ہے اور اس پر قادر ہے۔ اگر تو نے اس کا ارادہ کیا تو کرے گا، اور اگر تم ایمان نہیں لاتے تو یہ تمہارا ارادہ نہ ہونے کی وجہ سے ہے نا کہ عدم قدرت اور عجزہ کی وجہ سے

ہے۔ یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ امر میں شرط قدرت فعل سے قبل عاصی اور مطیع دونوں میں ہوتی ہے۔ البتہ مع الامر یہ صرف مطیع میں ہوتی ہے۔ بخلاف مطیع کے مختص کے۔ کہ وہ صرف عل کے ساتھ پائی جاتی ہے۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ جس نے قدرت کو ایک ہی نوع قرار دیا ہے، جو یا تو فعل کے مقارن ہوگی یا فعل پر سابق ہوگی اس نے خطا کی ہے۔ یہ اس وقت ہے جب دو میں سے ایک نوع سے مراد فعل کو مستلزم امر کا مجموعہ ہو۔ جیسا کہ اکثر اہل کلام کی اصطلاح میں ہے۔ قدرت سے صرف مصحح ہی مراد ہو تو تب یہ قدرت ایک ہی نوع ٹھہرے گی۔ کیونکہ قدرت کی بابت کہ آیا وہ فعل کے ساتھ ہوتی ہے یا اس سے قبل؟ لوگوں کے متعدد اقوال ہیں:

(۱)...... ایک یہ کہ قدرت صرف فعل کے ساتھ ہوگی۔ اس کا مبنی یہ امر ہے کہ قدرت فعل کو مستلزم ہے، اور وہ فعل کے ساتھ ہی ہوگی۔ پھر ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ قدرت عرض ہے اور عرض دو زمانوں میں باقی نہیں رہتا۔

(۲)...... دوسرا یہ کہ قدرت صرف فعل سے قبل ہوتی ہے۔ اس قول کا مبنی یہ ہے کہ قدرت صرف مصحح ہے، اور وہ فعل کے مقارن نہیں ہوتی۔

(۳)...... تیسرا یہ کہ قدرت فعل سے قبل اور فعل کے ساتھ دونوں میں ہوتی ہے، اور یہ اصح قول ہے۔ پھر ان میں سے کوئی یہ کہتا ہے کہ قدرت کی دو انواع ہیں: مصححہ اور مستلزمہ۔ مصححہ فعل سے قبل ہوتی ہے اور مستلزمہ فعل کے ساتھ ہوتی ہے۔

کسی کا یہ قول ہے کہ قدرت صرف مصححہ ہی ہوتی ہے، اور وہ فعل سے قبل اور ساتھ دونوں زمانوں میں ہوتی ہے، اور رہا استلزام تو وہ ارادہ مع قدرت کے وجود کے ذریعے حاصل ہوتی ہے، نا کہ نفسِ قدرت و ارادہ سے جو قدرت کے مسمی کا جز ہے، اور یہ قول لغتِ قرآن کے موافق ہے۔ بلکہ یہ سب امتوں کی لغات میں ہے، اور یہ اصح قول ہے۔

اب ہم یہ کہیں گے: تو قادرِ متمکن ہے۔ اس اللہ نے تم میں ایمان لانے پر قدرت پیدا کی ہے۔ لیکن تو خود ایمان نہیں لانا چاہتا، اور اگر وہ پیغمبر سے یہ کہے کہ تو اللہ سے یہ کہہ کہ وہ مجھے ایمان لانے والا بنا دے۔ تو وہ پیغمبر اسے کہے گا: اگر تو تو اللہ سے ایمان مانگتا ہے تو تو ایمان کا ارادہ کرنے والا ہے، اور اگر تو نہیں مانگتا تو تو اپنی اس بات میں جھوٹا ہے کہ وہ مجھے ایمان لانے کا ارادہ کرنے والا بنا دے۔

اگر وہ نبی سے یہ کہے کہ تو مجھے ایک ہی ایسی بات کا امر کیسے کرتا ہے جس کا اس نے مجھے ارادہ کرنے والا بنایا ہی نہیں۔ تو یہ ارادہ کی طلب نہیں بلکہ مخاصمہ ہوگا، اور اس کا جواب دینا رسول کے ذمے نہیں۔ بلکہ اس بات کا جواب نہ دینا انقطاع نہیں۔ کیونکہ کسی کو بھی اجازت نہیں کہ وہ تقدیر کو آڑ بنائے۔

۸۔ آٹھواں جواب یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ جسے بھی کوئی دوسرا کسی فعل کی طرف بلاتا اور اس کا امر دیتا ہے یا تو وہ اس بات کا مقر ہوگا کہ اللہ بندے کے ارادہ و افعال کا خالق ہے اور بندے وہی کرتے ہیں جو وہ چاہتا ہے۔ یا پھر وہ اس بات کا مقر نہ ہوگا، اور اس بات کا قائل ہوگا کہ بندے وہ بھی کرتے ہیں جو اس نے نہیں چاہا، اور وہ رب کے

ارادہ کے بغیر اپنے جیوں کے ارادات کو پیدا کرتے ہیں۔

پھر اگر تو وہ شخص پہلی قسم میں داخل ہے تو وہ اس بات کا مضر ہے کہ اس پر یا کسی دوسرے پر ظلم کرنے والے ہر ظالم کے ارادۂ ظلم کو پیدا کیا گیا سو اس نے ظلم کیا، اور وہ ظالم کو اس بارے معذور نہیں سمجھتا، اور اسے کہا جائے گا کہ تو اس بات کا مضر ہے کہ مامور کی مخالفت کرنے والے کے لیے یہ بات حجت نہیں چاہے وہ جو کوئی بھی ہو۔

پس ثابت ہوا کہ تقدیر کو آڑ بنا کر پیغمبروں کو لا جواب کرنے کی کوشش دونوں میں سے کسی کے لیے ہم روا نہیں چاہے وہ مضر ہو یا منکر ہو۔

اگر کوئی یہ کہے: مدعی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک کورا کاغذ ہوتا ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ: یہی معاملہ ''امر'' کا بھی ہے کہ نفس امر میں حق یا تو اِن کا قول ہوگا یا اُن کا۔ دونوں صورتوں میں تقدیر کو حجت بنانا باطل ہے۔ پس مثبتین اور نفاۃ دونوں کا اس بات کے باطل ہونے پر اتفاق ہوا۔

۹۔ نواں جواب: یہ کہا جائے کہ رسالت کا مقصود مکذب اور عاصی کو عذاب کی خبر دینا ہے۔ جیسا کہ سیّدنا موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السلام نے فرعون سے یہ کہا تھا:

﴿اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى﴾ (طٰہ: ۴۸)

''بے شک ہم، یقیناً ہماری طرف وحی کی گئی ہے کہ بے شک عذاب اس پر ہے جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔''

اب اگر تو یہ شخص یہ کہتا ہے کہ یہ کفر میں پیدا ہوا تھا اور ایمان کے ارادہ میں پیدا نہ ہوا تھا تو اسے یہ جواب دیا جائے گا کہ یہ بات مکذب و متولی کے عذاب دیے جانے کے متناقض نہیں۔ پس اگر اس نے تجھ میں ایمان کو پیدا نہیں کیا تو تو ان لوگوں میں سے ہے جن کو وہ عذاب دے گا، اور اگر اس نے تجھے مومن بنایا ہے تو تو ان لوگوں میں سے جن کو اس نے سعید بنایا ہے، اور ہم اس کے رسول ہیں جو تجھے پیغام پہنچاتے اور تجھے ڈرسناتے ہیں، اور رسول کا مقصود حاصل ہو گیا اور بلاغ مبین بھی ہو گیا۔ اب یہ مکلّف صرف اپنے رب سے جھگڑنے میں لگا ہے۔ کیونکہ اس نے اسے اس بات کا حکم دیا ہے جس پر وہ اس کی اعانت نہیں کر رہا، اور یہ بات نہ رسول سے متعلق ہے اور نہ اس کے حق میں مضر ہے۔ اللہ کسی کو جوابدہ نہیں اور سب اسے جوابدہ ہیں۔

۱۰۔ دسواں جواب یہ ہے کہ یہی سوال خود اس امامی مصنف پر بھی وارد ہوتا ہے اور دیگر معتزلہ اور ان رافضہ پر بھی وارد ہوتا ہے جو ابوالحسین بصری [1] کے پیروکار ہیں۔ کیونکہ اس کا قول ہے کہ داعی اور قدرت کے ہوتے ہوئے مقدور کا وجود واجب ہوتا ہے، اور یہ کہ اللہ نے بندے میں داعی کو پیدا کر دیا ہوا ہے، اور ابوالحسین اور تقدیر کے باب میں اس کے پیروکاروں کا قول ہے اور یہی محققین اہل سنت کا بھی قول ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ نے بندے کی قدرت و ارادہ کو پیدا کیا ہے، اور یہ اللہ کے بندے کے فعل کی تخلیق کو مستلزم ہے، اور ان کا قول ہے کہ بندے حقیقت میں

[1] اس کا تعارف گزر چکا ہے۔

اپنے فعل کا فاعل اور اس کا محدث ہے۔ اسے فعل کا فاعل و محدث اللہ نے بنایا ہے۔

یہ اہل سنت کی جمہور جماعتوں کا اور اکثر اصحاب اشعری کا قول ہے۔ جیسے ابو اسحاق اسفرائینی، ابو المصالی امام الحرمین الجوینی وغیرہ۔

تو جب معتزلہ اور شیعہ کے محققین کا یہ قول تھا اور یہی جمہور اہلِ سنت اور ان کے آئمہ کا بھی قول ہے تو اختلاف قدریہ اور جہمیہ میں باقی رہ گیا کہ قدریہ کا یہ قول ہے کہ: داعی بندے کے قلب میں اللہ کی مشیئت وقدرت کے بغیر حاصل ہوتا ہے اور جہمیہ کا یہ قول ہے کہ بندے کی قدرت کی اس کے فعل میں کسی بھی اعتبار سے تاثیر نہیں ہے، اور بندہ اپنے فعل کا فاعل نہیں۔ جو جہم اور اس کے پیروکاروں کا قول ہے۔ اگرچہ ان میں سے ایک کسبِ غیر معقول کو بھی ثابت کرتا ہے۔ جیسا کہ اشعری اور ان کے ہم نواؤں نے ثابت کیا ہے۔

جب اصل میں یہ نزاع صرف قدریہ اور جہمیہ میں رہ گیا کہ قدریہ اس بات کی نفی کرتے ہیں۔ اللہ طاعات میں بندوں کا معین ہے اور وہ ان میں طاعات کا داعیہ پیدا کرتا ہے، اور اس کے ساتھ مومنوں کو خاص کرتا ہے۔ نا کہ کافروں کو، اور غالی جہمیہ جبریہ یہ کہتے ہیں کہ بندے کچھ بھی نہیں کرتے اور ان کی کسی بات پر قدرت ہے۔ یا یہ کہ ان کے پاس اگر قدرت ہے تو وہ اس کے ذریعے کچھ بھی نہیں کرتے، اور نہ اس قدرت کی کسی شے میں تاثیر ہے۔ تو یہ دونوں اقوال ہی باطل ہیں۔

مزید یہ کہ اکثر شیعہ جہمیہ مجبرہ کا قول کرتے ہیں۔

رہے اسلاف جو خلفائے اربعہ کی امامت کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک یہ دونوں اقوال ہی باطل ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ درست قول اہلِ سنت کا ہی ہے۔ پھر اگر ان میں سے کسی سے خطا ہوئی بھی ہے تو ان کی خطا شیعہ کی خطا سے بھی بڑی ہے۔

یہ سوال اس پر بھی وارد ہوتا ہے جو تقدیر کو دلیل بنانا جائز سمجھتا ہے، اور نافرمانی ہو جانے پر اپنے اور دوسرے کے لیے یہ عذر پیش کرتا ہے کہ یہ میرے مقدر میں لکھا تھا، اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کے مشہود، حقیقت کونیہ کے شہود میں ہیں۔ ایسے لوگ بہت ہیں۔ ان میں سے کوئی تو اس بات کا مدعی ہے کہ وہ اہل تونیہ کے ان خواص عارفین میں سے ہے جو توحیدِ ربوبیت میں فنا ہو گئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عارف جب شہودِ توحید ربوبیت میں فنا ہو جاتا ہے تو اس کے نزدیک اچھائی اور برائی ایک ہو جاتی ہے، اور کسی کا یہ قول ہے کہ جسے ارادۂ کا شہود ہو جاتا ہے اس سے امر ساقط ہو جاتا ہے، اور کوئی کہتا ہے: خضر نے تکلیف ساقط ہے کیونکہ انہیں ارادہ کا شہود ہو گیا تھا۔ یہ بات متعدد متاخرین شیوخ، عبادت گزار، صوفیہ، فقراء میں بلکہ متعدد فقہاء، امراء اور عوام میں پائی جاتی ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ ان معتزلہ اور شیعہ سے زیادہ بدتر ہیں جو امر و نہی کے قائل ہیں، اور تقدیر کا انکار کرتے ہیں۔ انہیں جیسے لوگوں کی بابت یہ معتزلہ اور شیعہ نام نہاد اہلِ سنت کی بابت زبانِ طعن دراز کرتے ہیں۔ کہ جو امر و نہی، وعدہ و وعید، ادائے واجبات اور ترکِ محرمات کا قائل ہو، اور یہ نہیں کہتا کہ اللہ بندوں کے فعل کا خالق ہے اور وہ

اس پر قادر نہیں، اور نہ اس نے معاصی کو چاہا۔ اس نے امر کی تعظیم، ظلم سے اللہ کی تنزیہ اور اپنے اوپر اللہ کی حجت قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن اس سے دلیل نہیں بن پڑی اور وہ اللہ کی قدرتِ تامہ، مشیئت عامہ اور خلق شاملہ میں اور اس کے عدل وحکمت، امر ونہی اور وعدہ و وعید میں جمع کی صورت پیدا نہیں کر سکا۔ پس اس نے اللہ کے حمد کو تو ٹھہرایا لیکن اس کے حکومتِ کاملہ کو نہ ٹھہرایا، اور جو لوگ اللہ کے لیے قدرت ومشیئت اور خلق کو ثابت کرتے ہیں اور اس کے ذریعے اس کے امر ونہی اور وعدہ و وعید سے معارضہ کرتے ہیں، وہ یہود ونصاریٰ سے بھی بدتر ہیں۔ جیسا کہ اس امامی مصنف نے کہا ہے:

رہا حق تو وہ جو بھی کہے گا ہم اسے ضرور قبول کریں گے، اور کسی کو بھی حق نہیں کہ وہ بدعت کا رد بدعت سے کرے، اور باطل کا مقابلہ باطل سے کرے۔ اب اگرچہ تقدیر کے منکر بدعتی ہیں۔ لیکن تقدیر کے ذریعے امر کے خلاف دلیل بنانے والے ان سے بھی بدتر بدعتی ہیں۔ اگر وہ مجوسیوں کے مشابہ ہیں، تو یہ مشرکوں اور مکذبین رسول کے مشابہ ہیں جو یہ کہتے تھے: اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا شرک نہ کرتے اور نہ ہم کسی شے کو حرام قرار دیتے۔

دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اواخر میں قدریہ کا یہ جماعت پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن تقدیر کی آڑ میں اوامر کو رد کرنے والے تو متقدمین مسلمانوں میں ان کی کوئی قابلِ ذکر جماعت نہیں تھی۔ ان کی کثرت متاخرین میں ہوئی۔ انہوں اس عقیدہ کو حقیقت کا نام دیا۔ پھر اس حقیقت کو شریعت کے معارض ٹھہرایا، اور یہ نہ سمجھا کہ حقیقت دینیہ شرعیہ میں جو قلوب کے احوال کو متضمن ہے۔ جیسے اخلاص، صبر، شکر، توکل اور اللہ کی محبت، اور حقیقت کونیہ قدریہ میں فرق ہے۔ جس پر ایمان تو لایا جاتا ہے لیکن اسے دلیل نہیں بنایا جاتا۔ البتہ مصائب کے وقت اس کی طرف تسلیم ورضا کے ساتھ رجوع کیا جاتا ہے۔

پس عارف مصائب میں تقدیر کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس پر تسلیم ورضا کے ساتھ ایمان لاتے ہوئے گناہوں سے توبہ واستغفار کرتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ﴾ (غافر: ۵۵)

''پس صبر کر، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اپنے گناہ کے لیے بخشش مانگ۔''

پس بندہ اس بات کا مامور ہے کہ وہ مصائب پر صبر کرے اور مصائب میں استغفار کرے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام وحضرت آدم علیہ السلام کے درمیان بحث والی حدیث:

یہ حدیث بھی اسی باب سے ہے جسے صحیحین وغیرہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے، اور ایک جید سند کے ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''آدم علیہ السلام وموسیٰ علیہ السلام میں جھگڑا ہوگیا۔''

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: ''مجھے آدم دکھلائیے جنہوں نے اپنی خطا کی وجہ سے ہمیں جنت سے نکلوایا۔ پس موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے آدم! آپ ابو البشر ہیں۔ اللہ نے آپ کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، اور اپنی روح

سے آپ میں پھونکا اور فرشتوں سے آپ کو سجدہ کروایا۔ تو آپ نے خود کو اور ہمیں جنت سے کیوں نکلوایا؟''
تو آدم علیہ السلام نے فرمایا: تو وہ موسیٰ ہے جسے اللہ نے اپنے کلام کے ساتھ چنا، اور اپنے ہاتھ سے تیرے لیے تورات لکھی۔ سو تو نے اس میں لکھا دیکھا ہوگا: ''اور آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور بہک گیا۔'' (یہ) میری پیدائش سے کتنا پہلے (لکھا ہوا تھا)؟ انہوں نے کہا: چالیس برس پہلے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب آدم موسیٰ علیہ السلام پر دلیل میں غالب آ گئے۔ پس آدم موسیٰ پر دلیل میں غالب آ گئے۔'' [1]

متعدد جماعتوں کا اس حدیث کے بارے میں یہ گمان ہے کہ آدم نے اپنے گناہ پر تقدیر کو دلیل بنایا ہے، اور اسی دلیل سے وہ موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے، اور ان میں سے تحقیق وعرفان کی مدعی ایک جماعت اس حدیث کو دلیل بنا کر گناہوں پر تقدیر کو آڑ بناتی ہے، اور ایک جماعت کا یہ قول ہے کہ: اس حدیث سے آخرت میں استدلال تو درست ہے۔ البتہ دنیا میں نہیں، اور ایک جماعت یہ قول کرتی ہے کہ: یہ حدیث ان خواص کی تو حجت ہے جو قدر کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ البتہ عوام کی دلیل نہیں، اور جبائی وغیرہ ایک جماعت نے اس حدیث کا ہی انکار کر دیا ہے، اور کسی نے تاویلاتِ فاسدہ کا انبار لگا دیا ہے۔ مثلاً:

❀ آدم اس لیے دلیل میں غالب آئے کیونکہ انہوں نے توبہ کر لی تھی۔
❀ آدم موسیٰ علیہ السلام کے باپ تھے اور بیٹے کو حق نہیں کہ وہ باپ کو ملامت کرے۔
❀ ایک شریعت میں یہ فعل گناہ تھا جبکہ دوسری میں نہیں۔

غرض یہ سب اقوال اس حدیث کے مقصود سے ہٹے ہوئے ہیں۔ کیونکہ حدیث تو صرف اس بات کو متضمن ہے کہ مصائب میں تقدیر کے آگے تسلیم ہے۔ کیونکہ آدم کو موسیٰ نے اس بات پر ملامت نہ کی تھی جو گناہ میں اللہ کا حق تھا۔ بلکہ ذریتِ آدم کو لاحق ہونے والی مصیبت پر ملامت کی تھی۔ اس لیے موسیٰ نے یہ عرض کیا تھا کہ مجھے وہ آدم تو دکھلایئے جنہوں نے خود کو اور ہمیں جنت سے نکلوایا، اور یہ بات بھی اس حدیث کے ایک طریق میں مروی ہے نا کہ جملہ طرق میں۔

اور یہ حق بات ہے۔ کیونکہ آدم نے گناہ سے توبہ کر لی تھی، اور موسیٰ جانتے تھے کے تائب کو ملامت نہیں، اور خود انہوں نے بھی تو توبہ کی تھی جب انہوں نے یہ کہا تھا:

﴿رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ﴾ (القصص : ١٦)
''اے میرے رب! یقیناً میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا، سو مجھے بخش دے۔''

اور فرمایا:

﴿سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَیْكَ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (الاعراف : ١٤٣)
''تو پاک ہے، میں نے تیری طرف توبہ کی اور میں ایمان لانے والوں میں سب سے پہلا ہوں۔''

---

[1] صحیح البخاری: ٩/ ١٤٨ ـ کتاب التوحید: باب وکلم اللہ موسٰی تکلیما" عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ

اور فرمایا:

﴿فَاغْفِرْ لَنَا وَ ارْحَمْنَا وَ اَنْتَ خَیْرُ الْغٰفِرِیْنَo وَ اکْتُبْ لَنَا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَیْكَ﴾ (الاعراف: ۱۵۵ ۔ ۱۵٦)

''سو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تو بخشنے والوں میں سب سے بہتر ہے۔اور ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی لکھ دے اور آخرت میں بھی، بے شک ہم نے تیری طرف رجوع کیا۔''

پھر یہ کہ گنہگار بندے تو بے شمار ہیں۔تو لوگوں کو چھوڑ کر صرف آدم کو ملامت کرنا بلا وجہ ہے۔

پھر یہ کہ اگر یہ دلیل مقبول ہوتو اسے ابلیس بھی حجت بناتا، اور قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود اور قوم فرعون بھی اس کو دلیل بناتیں۔ اگر موسیٰ پر آدم نے گناہ کی دلیل میں قدر کو پیش کیا ہوتا تو فرعون بھی قدر کو آپ پر پیش کرتا، اور اگر تقدیر گنہگار سے ملامت کے رفع کی دلیل ہوتی تو ابلیس فرشتوں کو سجدہ سے انکار کے گناہ پر تقدیر کو پیش کرتا۔ درحقیقت یہ اللہ کے خلاف سند پیش کرنا ہے۔

اللہ کے یہ دشمن قدریہ روزِ قیامت جہنم کی طرف کھینچ کر لے جائے جائیں گے۔ان کی دلیل ان کے رب کے حضور باطل ٹھہرے گی۔ان پر اللہ کا غضب ہوگا اور انہیں دردناک عذاب ملے گا۔

قدریہ کی مذمت میں مروی آثار جو ان کو شامل ہیں، وہ قدر کے ان منکرین سے زیادہ شامل ہیں جو امر کی تعظیم کرتے ہیں اور ظلم سے رب تعالیٰ کو منزہ قرار دیتے ہیں۔اسی لیے علماء قدریہ کو مرجئہ سے ملاتے ہیں۔ کیونکہ مرجئہ ایمان اور وعید کے امر کو دوگنا کر کے بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ قدریہ اللہ پر ایمان، تقویٰ اور وعید کے امر کو بڑھاتے ہیں اور جو ایسا کرتا ہے وہ ہر شریعت میں ملعون ہے۔جیسا کہ مروی ہے کہ قدریہ اور مرجئہ پر ستر پیغمبروں کی زبانی لعنت کی گئی ہے۔

اب تقدیر میں باطل طور پر گھسنے والے لوگ تین قسم کے ہیں:

(۱)...... تقدیر کے جھٹلانے والے۔

(۲)...... امر و نہی کو تقدیر کی آڑ میں دفع کرنے والے۔

(۳)...... اور امر و قدر کو یکجا کرنے پر اللہ تعالیٰ پر طعن کرنے والے، اور یہ سب سے بدتر ہیں۔اس باب میں ابلیس سے ایک مناظرہ بھی منقول ہے۔ پھر ان کے بعد ان کا اثر ہے جو تقدیر کی آڑ لے کر امر و نہی کو دفع کرنے والے ہیں، اور ان کے بعد اس شر میں تقدیر کے انکاریوں کی جگہ ہے۔

جب آپ اسلاف کو دیکھتے ہیں کہ وہ تقدیر کے جھٹلانے والوں پر زیادہ سختی کرتے ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ امر و نہی کو دفع کرنے والے اس بات کو زیادہ ظاہر نہیں کرتے اور نہ ان کی وجودی تعداد زیادہ ہیں۔ وگرنہ یہ زیادہ بدتر ہیں۔

جیسا کہ روافض کے عقائد خوارج سے زیادہ بدتر ہیں۔لیکن خوارج تلوار اٹھانے اور قتال کرنے میں روافض سے زیادہ جری ہیں۔ چونکہ ان لوگوں نے اپنا قول زیادہ ظاہر کیا، اور مسلمانوں سے مقاتلہ کیا تو ان کے بارے میں وہ باتیں

مروی ہوئیں جو ان منافقوں کے بارے میں مروی نہ ہوئیں ۔ جو زبان سے کچھ کہتے ہیں اور دل میں کچھ اور رکھتے ہیں ۔

غرض یہ بات ظاہر ہوگئی کہ آدم نے موسیٰ کے سامنے تقدیر کو مصائب اعتبار سے حجت پکڑا جو انہیں اور ان کی ذریت کو لاحق ہوئے، اور مصیبت ایک قسم کی جزع فزع لاتی ہے جو مصیبت کا سبب بننے والے کی ملامت کو مقتضی ہوتی ہے۔ سو ان کے سامنے یہ ظاہر ہو گیا کہ یہ مصیبت اور اس کا سبب مقدور اور مکتوب تھا، اور بندہ امرِ الٰہی پر صبر کرنے کا مامور ہے، اور اسے تسلیم و رضا کا حکم ہے کہ یہ بھی رب تعالیٰ کے اوامر میں سے ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ یَهْدِ قَلْبَهٗ﴾ (التغابن : ۱۱)

''کوئی مصیبت نہیں پہنچی مگر اللہ کے اذن سے اور جو اللہ پر ایمان لے آئے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔''

اسلاف اکابر جیسے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: یہ وہ شخص ہے جسے مصیبت پہنچتی ہے اور وہ جانتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور وہ تسلیم و رضا سے رہتا ہے۔

اس مصنف نے جو یہ کلام کہا ہے اور اس کلام اسے کہا جاتا ہے جو تقدیر کو گناہوں پر آڑ بناتا ہے اور پھر یہ بھی جانتا ہے کہ یہ دلیل صریح عقل کی رو سے ایمان بالقدر کے ساتھ ہر ایک کے نزدیک باطل ہے۔

اس دلیل کا بطلان تکذیب بالقدر کو لازم نہیں۔ کیونکہ نبی کی جبلت میں جلبِ منفعت اور دفع مضرت شامل ہے۔ ان کی زندگی اور دین و دنیا کی صلاح و فلاح اسی میں ہے۔ وہ اسی بات کا امتثال کریں گے جس میں ان کی منفعت کا حصول اور مضرت کا فعیہ ہو۔ چاہے کوئی رسول ان کی طرف مبعوث ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ لیکن نفع و ضرر کا علم ان کے مقاصد اور عقول کے بقدر ہوتا ہے، اور رسولوں کی بعثت مصالح کی تکمیل اور مفاسد کی تقلیل و تعطیل کے لیے ہوتی ہے۔ یوں رسولوں کے پیروکار اس باب میں سب سے کامل ترین انسان ہوتے ہیں۔ جبکہ رسولوں کے جھٹلانے والے اس کے برعکس سب سے نکمے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ مفاسد کے پیچھے چل کر اپنی مصالح کو برباد کر بیٹھتے ہیں۔ یہ بدترین لوگ ہوتے ہیں۔ پھر اس کے ساتھ متعدد امور انہیں لازم ہوتے ہیں جن کو یہ لیتے ہیں اور متعدد امور ایسے ہوتے ہیں جن سے اجتناب کرتے ہیں، اور یہ سب ان امور کو دفع کرتے ہیں جو ان ضرر پہنچاتے ہیں۔ جیسے ظلم اور فواحش وغیرہ۔

لہٰذا اگر ان میں سے ایک دوسرے کی جان، مال، عزت و آبرو پر کوئی ظلم ڈھائے تو وہ اس سے قصاص کا مطالبہ کرتا ہے، اور اسے سزا دیے جانے کا خواہاں ہوتا ہے، اور کوئی عقل والا اس باب میں دوسرے سے قدر کے عذر کو قبول نہیں کرتا۔ لہٰذا اگر کوئی ظالم یہ کہے کہ یہ میرے مقدر میں تھا جو میں نے کہا۔ میرے عذر قبول کرو۔ تو دوسرے اسے یہ کہتے ہیں کہ اگر تیرے ساتھ ایسا ہوا اور ظالم تقدیر کا عذر کرے تو خود تو اس کے عذر کو نہ مانے گا۔

اس دلیل کو ماننا وہ فساد لاتا جس کے ہوتے ہوئے صلاح ممکن نہیں۔ تو جب تقدیر کو حجب بنانا سب لوگوں اور ان کی عقلوں کے نزدیک مردود ہے۔ حالانکہ سب لوگ تقدیر کے قائل بھی ہیں تو معلوم ہوا کہ تقدیر کو ماننا یہ تقدیر کو دلیل بنانے کو دفع کرنے کے مناض نہیں۔ بلکہ اس پر ایمان لازم ہے۔ البتہ اس کو دلیل بنانے کو رد کرنا بھی لازم ہے۔ سو جب جدل حق

و باطل میں تقسیم ہوتا ہے، اور کلام بھی حق و باطل میں منقسم ہوتا ہے اور لغتِ عرب میں یہ قاعدہ ہے کہ جب ایک جنس کی دو انواع ہوں، اور ایک جنس دوسرے سے اخص اور اشرف ہو تو دونوں میں سے خاص نام اشرف کا اور غیر اشرف کا عام ہونا ہوتا ہے۔ جیسے جائز عام اور جائز خاص کا لفظ، مباح خاص اور مباح عام کا لفظ، ذوی الارحام عام اور ذوی الارحام خاص کا لفظ۔ حیوانِ عام اور خاص کا لفظ کہ اہل کلام حیوان کا اطلاق غیر ناطق پر کرتے ہیں۔ کیونکہ ناطق کا لفظ انسان کے ساتھ خاص ہے گو وہ حیوان بھی ہے۔ ایسا ہی انہوں نے جدل اور کلام کے الفاظ کے ساتھ کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں: فلاں صاحبِ کلام اور متکلم ہے۔ جبکہ وہ بغیر علم کے کلام کرتا ہو۔ اسی لیے اسلاف نے اہلِ کلام کی مذمت کی ہے۔ ایس طرح جدل ہے کہ جب کلام حجتِ صحیحہ کے ساتھ نہ ہو تو وہ جدل محض ہوتا ہے، اور تقدیر کو دلیل بنانا بھی اسی باب میں سے ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں:

''ایک رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے آئے اور ارشاد فرمایا: کیا تم دونوں اٹھ کر نماز نہیں پڑھتے؟ تو میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہماری جانیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اگر اس نے چاہا کہ وہ ہمیں اٹھا دے تو ہم اٹھ جائیں گے۔'' اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیت تلاوت فرماتے ہوئے لوٹ گئے:

﴿وَ كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا﴾ (الکہف : ٥٤)

''اور انسان ہمیشہ سے سب چیزوں سے زیادہ جھگڑنے والا ہے۔''❶

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انہیں تہجد کے لیے اٹھنے کو فرمایا تو جنابِ علی رضی اللہ عنہ نے تقدیر کو آڑ بنایا کہ اللہ نے چاہا تو وہ ہمیں اٹھا دے گا۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ بالا آیات تلاوت فرمائی۔

[اہل سنت پر تقدیر کے متعلق ایک اور الزام اور اس پر ردّ]

[اشکال ۲]: شیعہ مصنف رقم طراز ہے: ''اہل سنت کے بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کو اطاعت شعاری کے باوصف عذاب دے سکتے ہیں، اور ابلیس اپنی معصیت کاری کے باوجود اجر و ثواب حاصل کر سکتا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کسی مقصد کے پیش نظر کوئی فعل انجام نہیں دیتا۔'' دریں صورت اطاعات و عبادات کو انجام دینے والا حد درجہ احمق ہوگا، اس لیے کہ وہ یونہی عبادت میں منہمک رہ کر اپنے آپ کو محنت و مشقت میں ڈالتا ہے، مسجدیں اور مہمان خانے بنانے کے لیے اپنا مال پانی کی طرح بہاتا ہے، مگر اس سے اسے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ بایں ہمہ بعض اوقات اسے عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔ اس کے عین برعکس اگر وہ انواع و اقسام کے گناہوں کا ارتکاب کرے اور لذت گیر ہوتا رہے، تاہم اللہ تعالیٰ اسے اجر و ثواب عطا کر سکتا ہے۔ پس پہلے نظریہ کا اختیار کرنا ہر عقل مند کے نزدیک سراسر حماقت

❶ البخاري:٦/ ٨٨، کتاب التفسیر، سورة الکهف:٢/ ٥٠ کتاب التهجد، باب تحریض النبي 7علی صلاة اللیل......، المسند ط المعارف: ٢/ ٨٩، ١٧٢.

پر مبنی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ان نظریات و افکار کا نتیجہ دنیا کی ہلاکت و بربادی اور دین و شریعت محمد ﷺ میں تخریب اور ہلچل پیدا ہونے کی صورت میں ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے:

اولاً:......شیعہ مصنف کا یہ قول قطعی طور پر بے بنیاد ہے اور اس کے باطل ہونے پر مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ اہل سنت میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ انبیاء کو عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔ بخلاف ازیں وہ لامحالہ طور پر ان کے اجر و ثواب پانے کے بارے میں سب ہم نوا و یک زبان ہیں؛ اس کے خلاف بالکل نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اس بات کا وعدہ کر چکا ہے اور وہ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا، یہ بات ضرورت کے تحت معلوم شدہ ہے۔

❀ پھر مثبتین قدر اہل سنت میں سے بعض علماء کے نزدیک انبیاء کرام علیہم السلام کا حامل اجر و ثواب ہونا خبر صادق کی بنا پر معلوم ہے۔ اسے مجرد دلیل سمعی کہتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ: خبر صادق کے علاوہ دوسرے ذرائع سے بھی یہ معلوم ہوسکتا ہے۔ عقلی دلیل سے یہ چیز جانی جاسکتی ہے۔ اگرچہ اس کی طرف شارع علیہ السلام نے بھی رہنمائی کی ہے اور اس سے آگاہ فرمادیا ہے۔ جیسا کہ جب اس کی حکمت و رحمت اور عدل کا علم ہو جاتا ہے تو اس سے یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ جو ان صفات سے موصوف ہو وہ اس کے مناسب اکرام کا مستحق ہے۔ جیسا کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی نبوت کے بارے میں جاننے سے قبل نبی کریم ﷺ سے فرمایا تھا:

''ہرگز نہیں؛ اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی بھی رسوا نہیں کرے گا؛ بیشک آپ صلہ رحمی کرو۔ اور کمزور کا بوجھ اٹھاتے ہیں اور نادار کے لیے کماتے ہیں؛ اور مہمان نوازی کرتے ہیں؛ اور مشکل میں لوگوں کے کام آتے ہیں''[1]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ﴾ (الجاثیہ: ۲۱)

''یا وہ لوگ جنھوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا، انھوں نے گمان کر لیا ہے کہ ہم انھیں ان لوگوں کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے؟ ان کا جینا اور ان کا مرنا برابر ہوگا؟ برا ہے جو وہ فیصلہ کر رہے ہیں۔''

یہ استفہام انکاری ہے؛ اور اس سے ان لوگوں کی تردید مقصود ہے جو اس زعم فاسد میں مبتلا تھے۔ یہ ان لوگوں پر انکار ہے جو اس زعم فاسد میں مبتلا تھے؛ یا جو ایسے خیالات کا شکار تھے جن کا باطل ہونا ان کے لیے صاف ظاہر تھا؛ یہ ان لوگوں پر ردّ

[1] البخاري: ۱/ ۳، کتاب بدءِ الوحيِ، باب کیف کان بدء الوحي، وتکرر الحدیث فِي البخارِي فِي مواضِع کثِیرة، انظر فتح البارِي ط السلفِي: الرقام: ۳۳۹۲، ۴۹۵۳، ۴۹۵۵، ۴۹۵۶، ۴۹۵۷، ۶۹۸۲، والحدِیث عن عائِشة رضِي الله عنها فِي مسلم: ۱۳۹/ ۱، کتاب الإِیمانِ باب بدءِ الوحيِ إِلی رسولِ اللهِ صلی الله علیهِ وسلم ، المسند ط الحلبِي ۶/ ۲۲۳، ۲۳۳

نہیں جو کسی ایسے گمان میں مبتلا تھے جو کہ باطل اور غلط نہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ اہل طاعت اور اہل کفر و معصیت کی مساوات کا نظریہ بالکل باطل ہے اور اللہ تعالیٰ ایسا برا حکم صادر کرنے سے منزہ ہے۔ مثلاً ارشاد الٰہی ہے:

﴿ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ کَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ کَالْفُجَّارِ ﴾ (ص: ۲۸)

''کیا ہم اہل ایمان اور نیک اعمال انجام دینے والوں کو زمین میں فساد بپا کرنے والوں کی طرح کر دیں اور اہل تقویٰ کو فاسق و فاجر لوگوں کی طرح بنا دیں؟''

نیز ارشاد فرمایا:

﴿ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ کَالْمُجْرِمِیْنَ ٥مَا لَکُمْ کَیْفَ تَحْکُمُوْنَ ﴾ (القلم: ۳۵-۳۶)

''کیا ہم مسلمانوں کو مجرموں کی طرح بنا دیں؟ کیا ہے تمھیں، تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟''

خلاصہ کلام ! یہ کہنا کہ رب تعالیٰ نے ابرار نیکوکار اور سیہ کار فجار؛ محسنین اور ظالمین اور اہلِ طاعت و معاصی برابر بنایا ہے، یہ باطل حکم ہے، رب تعالیٰ کو اس سے منزہ قرار دینا واجب ہے۔ کیونکہ یہ اس کی حکمت و عدل کے منافی امر ہے۔ اللہ تعالیٰ مختلف اشیاء میں تسویہ و برابری کا انکار فرماتا ہے۔ سو وہ متماثلات میں برابری کرتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿اَکُفَّارُکُمْ خَیْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِکُمْ اَمْ لَکُمْ بَرَآئَۃٌ فِی الزُّبُرِ٥﴾ (القمر: ۴۳)

''کیا تمھارے کفار ان لوگوں سے بہتر ہیں، یا تمھارے لیے (پہلی) کتابوں میں کوئی چھٹکارا ہے؟''

اور فرمایا:

﴿ کَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ﴾ (آل عمران: ۱۱)

''(ان کا حال) فرعون کی قوم اور ان لوگوں کے حال کی طرح ہے جو ان سے پہلے تھے۔''

اور فرمایا:

﴿لَقَدْ کَانَ فِیْ قَصَصِھِمْ عِبْرَۃٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ﴾ (یوسف: ۱۱۱)

''بلاشبہ یقیناً ان کے بیان میں عقلوں والوں کے لیے ہمیشہ سے ایک عبرت ہے۔''

اور فرمایا:

﴿فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ٥﴾ (الحشر: ۲)

''پس عبرت حاصل کرواے آنکھوں والو۔''

اور فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنَاتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِکُمْ﴾ (النور: ۳۴)

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تمھاری طرف کھول کر بیان کرنے والی آیات اور ان لوگوں کا کچھ حال جو تم سے

پہلے گزرے۔‘‘

اور فرمایا:

﴿وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ﴾ (العنکبوت : ۴۳)

’’اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں۔‘‘

دوسری وجہ: امامی کا یہ قول کہ: اللہ کو یہ جائز ہے کہ وہ پیغمبروں کو عذاب دے اور شیطانوں کو ثواب دے۔ اگر تو اس قول سے ان کی مراد یہ ہے کہ اللہ اس پر قادر ہے تو اللہ کی قدرت میں کوئی نزاع نہیں، اور اگر اس کی یہ مراد ہے کہ آیا ہمیں اس میں شک ہے یا نہیں کہ اللہ ایسا کرے گا یا نہیں؟ تو یہ بات معلوم ہے کہ ہمیں اس باب میں کوئی شک نہیں بلکہ ہم جانتے ہیں کہ اللہ ایسا نہ کرے گا۔

اگر اس کی مراد یہ ہے کہ جو یہ کہتا ہے کہ اللہ کسی حکمت سے فعل نہیں کرتا تو اسے یہ لازم ہے کہ وہ رب تعالیٰ سے اس بات کے وقوع کو جائز قرار دے، اور یہ کہ اس سے اس بات کے وقوع کا امکان ہے۔ لیکن اکثر اہل سنت اس بات کے قائل نہیں۔ بلکہ وہ اللہ کو اس سے منزہ اور مقدس سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ اس بات کو لازم نہیں کہ طاعت نادانی ہے۔ طاعت تب نادانی ہے۔ جب اس کا عدم اور وجود دونوں ایک ہوں، حالانکہ مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ طاعت کا وجود نافع اور عدم مضر ہے۔ اگر چہ ان کا اس بارے نزاع ہے کہ کیا یہ جائز ہے کہ رب اس کے برخلاف کرے۔ کہ ان کا اختلاف جواز میں ہے نا کہ وقوع میں۔

تیسری وجہ: یہ کہا جائے کہ فرض کیا کہ اس کا وقوع جائز ہے۔ تب بھی طاعت حماقت نہیں۔ کیونکہ اس باب میں امامیہ کا اہلِ سنت کے ساتھ اتفاق ہے کہ اہلِ کبائر کی مغفرت ہو سکتی ہے، اور معتزلہ اس قول میں اہلِ سنت کے ساتھ ہیں کہ کبائر کے اجتناب کے ساتھ صغائر معاف ہو سکتے ہیں، اور اس کے ساتھ کبائر و صغائر دونوں سے اجتناب حماقت نہ ہوگا۔ بلکہ یہ اجتناب بالاتفاق واجب ہے۔

چوتھی وجہ: یہ کہا جائے کہ نوافل پڑھنا بالاتفاق نادانی نہیں۔ اگر چہ یہ جائز ہے کہ اللہ بندے کو اس کے بغیر بعض دوسرے اسباب کی وجہ سے ثواب دے دے۔ پس جس کا نافع ہونا معلوم ہونا اس کو بجالانا حکمتِ محمودہ ہے۔

اور اگر کوئی اس بات کو جائز قرار دے کہ اس کے بغیر بھی نفع حاصل ہوتا ہے۔ جیسے اموال وغیرہ۔ مطلوبہ اشیاء کا ان اسباب کے ذریعے حاصل کرنا جو عادۃً اس کی تحصیل کو مقتضی ہوں کہ یہ نادانی نہیں۔ اگر چہ یہ ممکن ہے کہ مال بغیر کوشش کے مل جائے جیسے میراث۔

پانچویں وجہ: مصنف کا قول: کیونکہ اللہ کا فعل کسی غرض کے بغیر ہوتا ہے۔ اس کا تفصیلی جواب گزر چکا ہے۔ اور ہم نے یہ واضح کیا ہے کہ اکثر اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال حکمت پر مبنی ہوتے ہیں ؛ اور غرض سے یہی مراد ہے۔ اور بعض اہل سنت والجماعت نے ان اغراض کی بھی تصریح کی ہے۔ تقدیر کے قائلین میں سے جو لوگ

اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے افعال حکمت پر مبنی نہیں ہوتے؛ اور اگرچہ اللہ تعالیٰ جو چاہیں کر گزرتے ہیں؛ تاہم اس کی مشئیت اور عدم مشئیت معلوم کی جاسکتی ہے؛ خواہ ایسا عادت سے معلوم کرنا ممکن ہو یا پھر کسی صادق/ سچے کے خبر دینے سے؛ یا پھر علم ضروری اس کا القاء ہمارے دل میں کر دیتا ہے؛ یا پھر اس کے علاوہ بھی اس علم کا کوئی وسیلہ ہوسکتا ہے۔

فصل:......تقدیر اور انبیاء کرام کی تصدیق کا مسئلہ اور رافضی شبہ پر ردّ

[اشکال ۳]:...... شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''اہل سنت کے نظریہ کے مطابق کوئی شخص نبی کی تصدیق نہ کر سکے گا، اس کی وجہ ہے کہ نبی کی تصدیق دو مقدمات پر مبنی ہے:

۱۔ پہلا مقدمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کے ہاتھوں پر معجزہ کا اظہار اس لیے کیا کہ اس کی تصدیق کی جا سکے۔''

۲۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جس کی تصدیق کی جاتی ہے وہ صادق ہوتا ہے۔''

اہل سنت کیعقیدہ کے مطابق یہ دونوں مقدمات تشنہ تکمیل ہیں، اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ کے افعال اغراض کے تابع نہیں ہوتے، تو نبی کی تصدیق کے لیے معجزات کا ظہور پذیر ہونا بھی محال ہوگا، بقول اہل سنت جب اللہ تعالیٰ افعال قبیحہ، معاصی، کذب اور ضلال کا مرتکب ہوسکتا ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ جھوٹے نبی کی تصدیق کر دے (نعوذ باللہ من ہذہ الخرافات) بنا بریں معجزات کے ظہور سے کسی نبی یا منذرین [ڈرانے والوں] کی صداقت؛ یا شریعت وادیان پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جواب]: اس کا جواب کئی وجوہ پر مشتمل ہے:

پہلی وجہ:......اس سے پہلے اس بات کا بیان گزر چکا ہے کہ خلفاء ثلاثہ کی خلافت کے قائلین اکثر حضرات اور تقدیر کا اثبات کرنے والے اکثر اہل سنت کے نزدیک افعال الٰہی حکمت و مصلحت کے آئینہ دار ہوتے ہیں، لہٰذا یہ قول اور اس کی ضد اہل سنت کے اقوال سے باہر نہیں۔ ہر دو تقدیر کی بنا پر حق اہل سنت والجماعت سے خارج نہیں ہوسکتا۔ بلکہ مذاہب اربعہ میں سے ہر ایک مذہب کے ماننے والوں میں کچھ اصحاب ایسے ہیں جن میں اس اصول میں اختلاف ونزاع پایا جاتا ہے۔ حالانکہ ان سب کا خلفاء ثلاثہ کی خلافت اور تقدیر کے اثبات اور اللہ تعالیٰ کے خالق افعال العباد ہونے پر اتفاق ہے۔ اس اصول میں امام احمد کے اصحاب کے مابین نزاع بڑا ہی معروف ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کے اصحاب میں سے کئی ایک اور ان کے علاوہ دیگر لوگ بھی جیسے کہ: ابن عقیل؛ قاضی ابو خازم [1]؛ اور دیگر لوگ معجزات کو ثابت مانتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں: رب تعالیٰ حکیم ہے۔ اور اس کی حکمت میں یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ جھوٹے کے ہاتھوں پر معجزات ظاہر کرے۔ ابو خطاب [2] کا بھی یہی ہے۔ ان کے علاوہ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کے اصحاب اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ

---

[1] أبی حازم: وسبقت ترجمة أبی خازم محمدِ بنِ محمدِ بنِ الحسینِ الفراءِ المتوفی سنة ١/ ١٤٣: ٥٢٧، ٢/ ٢٨٦ .

[2] وهو أبو الخطابِ محفوظ بن حمد بنِ الحسنِ بنِ حمد اللوذانِي المتوفی سنة ٥١٠ وسبقت ترجمة: ١/ ١٤٤ .

کے اکثر اصحاب اللہ تعالیٰ کے افعال میں حکمت کے قائل ہیں۔

دوسری وجہ: ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ انبیائے کرام اورمرسلین کی صداقت صرف معجزات ہی کے ذریعہ ظاہر کی جا سکتی ہے۔ بلکہ اس کی صداقت کا اظہار معجزات کے علاوہ دیگر مختلف طرق ووجوہ سے ممکن ہے۔جیسا کہ دوسرے مواقع پر ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ پس جس شخص کے نزدیک صرف معجزات ہی سے نبی کی صداقت کا اظہار ہوسکتا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ اس کی دلیل پیش کرے۔اس لیے کہ کسی چیز کا انکار کرنے والے پر بھی ایسے ہی دلیل پیش کرنا لازم ہوتا ہے جیسے کسی چیز کا اثبات کرنے والے پر دلیل پیش کرنا لازم ہے۔مگر شیعہ مصنف نے اس نفی پر کوئی دلیل پیش نہیں کی۔

تیسری وجہ: یہ کہا جائے کہ ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ معجزہ کی صدق پر دلالت اس بات پر موقوف ہے کہ یہ جائز نہیں کہ وہ اسے کرے جو ذکر کرے۔اس پر مزید یہ کہ کسی نبی کے صادق ہونے پر معجزات کی دلالت ایک بدیہی امر ہے جو محتاج فکر ونظر نہیں، اس لیے کہ دعویٰ نبوت کے ساتھ معجزہ کا پایا جانا اس امر کی لازمی اور بدیہی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہ معجزہ نبی کی صداقت کے لیے ظاہر کیا ہے۔اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص جب بادشاہ سے کہے کہ اگر آپ نے مجھے فلاں جانب ایلچی بنا کر بھیجا ہے تو خلاف معمول تین مرتبہ اٹھیے بیٹھیے اور بادشاہ اس کی تعمیل کر دے تو بادشاہ کا یہ فعل اس امر کی دلیل ہوگا کہ قاصد کی تصدیق کے لیے اس نے یہ فعل انجام دیا۔

چوتھی وجہ: قائل کا یہ قول کہ: اگر معجزہ صدق پر دلالت نہ کرے تو باری تعالیٰ کا تصدیقِ رسول سے عاجز آنا لازم آتا ہے اور اللہ میں عجز ممتنع ہے۔ کیونکہ تصدیق کا طریق صرف معجزہ ہے۔ یہ اکثر اصحاب اشعری اور ان کے ہم نواؤں کا طریق ہے، اور یہی قاضی ابوبکر اور قاضی ابویعلی وغیرہ کا بھی طریق ہے۔

پہلا طریق بھی ان میں سے اکثر کا ہے، اور وہ ابوالمعالی اور ان کے پیروکاروں کا طریق ہے، اور یہ دونوں اشعری کے طریق ہیں، اور اس بناء پر کیا جھوٹے مدعی نبوت پر معجزہ کا اظہار ممکن ومقدور ہوگا یا نہیں؟ اس بارے دو اقوال ہیں۔

پانچویں صورت: یہ کہا جائے کہ معجزہ اس بات پر موقوف ہے کہ اللہ نے جس کی بھی تصدیق کر دی وہ صادق ہے۔ یہ قول اس وقت صحیح ہے کہ جب معجزہ بمنزلہ تصدیق بالقول کے ہو۔اس میں اختلاف ہے۔

بعض کا قول ہے کہ معجزہ بمنزلہ انشاء رسالت کے ہے، اور انشاء میں تصدیق یا تکذیب کا احتمال نہیں ہوتا۔لہٰذا قائل کو دوسرے کو یہ قول کہ میں نے تجھے بھیجا یا میں نے تجھے وکیل بنایا وغیرہ، یہ انشاء ہے۔تو جب معجزہ کی انشائے رسالت پر دلالت اس بات پر موقوف نہیں کہ وہ اللہ کسی غرض کے لیے فعل نہیں کرتا، اور نہ اس بات پر موقوف ہے کہ وہ قبائح کا فعل نہیں کرتا تو انشاء بھی امر ونہی جیسا ہوا۔

چھٹی وجہ: یہ کہا جائے کہ چونکہ یہ محال ہے کہ وہ کسی غرض کے لیے فعل کرے تو یہ بھی محال ہوا کہ وہ معجزہ کو تصدیق کے لیے ظاہر کرے۔اس کی طرف وہ جو اس بات کا قائل ہے کہ وہ اللہ ایک شے کو دوسرے شے کے لیے کرتا ہے، یہ جواب دیتا ہے کہ کبھی وہ دو متلازم باتوں کو بھی کرتا ہے۔ جیسا کہ وہ جملہ دلائل کو ان کے مدلولات کے لیے کرتا

ہے۔ سو وہ مخلوقات کو کرتا ہے جو اس کے وجود، قدرت، علم اور مشیئت پر دلالت کرتے ہیں۔ اس نے ان کے پیدا کرنے کا ارادہ کیا اور اور ارادہ کیا ہے کہ یہ مخلوقات اپنے اس مدلول کو مستلزم ہوں جو اس کی ذات پر اس کے لیے دلالت کرتا ہو جو ان مخلوقات میں نگاہِ غور ڈالتا ہو۔

اسی طرح اس نے اس مقام پر معجزہ کو بھی پیدا کیا ہے۔ پس اس نے معجزہ کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا اور اس بات کا ارادہ کیا کہ یہ معجزہ اپنے اس مدلول کو مستلزم ہو جو رسول کی صداقت ہے، اور اس شخص کے لیے مدلول پر دال ہے جو اس میں غور کرتا ہو۔

جب اس نے معجزہ کے پیدا کرنے کا ارادہ کیا اور اس تلازم کا بھی ارادہ کیا تو مقصود حاصل ہو گیا جو معجزہ کا صدق پر دلالت کرنا ہے۔ اگرچہ اس نے دو مرادوں میں سے ایک کو دوسرے کے لیے نہیں بنایا۔ کیونکہ مقصود دونوں کے ارادہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ معجزہ بذاتِ خود دلالت نہیں کرتا۔ بلکہ اس بات کے علم پر دلالت کرتا ہے۔ معجزہ کے فاعل نے اس کے ذریعے تصدیق کا ارادہ کیا ہے۔

تو اس کا یہ جواب ہے کہ: یہ جائے اختلاف ہے، اور ہمارا مقصود اس شخص کے قول کی تائید نہیں جو اس کا قائل ہے کہ اللہ فعل کرتا ہے لیکن کسی حکمت کے لیے نہیں۔ بلکہ ہمارے نزدیک یہ قول مرجوع ہے۔ ہمارا مقصود دوسرے قول کے قائلین کی دلیل بیان کرنا ہے اور اس قول والے ان معتزلہ اور شیعہ سے بہتر ہیں۔

باری تعالیٰ اور افعال قبیحہ کا صدور؟

[شبہ]: باقی رہا شیعہ مصنف کا یہ دعویٰ کہ اہل سنت کے نزدیک جب اللہ تعالیٰ افعال قبیحہ کا مرتکب ہو سکتا ہے، تو وہ جھوٹے نبی کی تصدیق بھی کر سکتا ہے۔'' یہ اس کی دوسری دلیل ہے۔

[اس کا جواب] یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو قبائح کا مرتکب قرار نہیں دیتا، اس کی حد یہ ہے کہ جو لوگ باری تعالیٰ کو افعال العباد کا خالق مانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ: افعال قبیحہ کی قباحت کی ذمہ داری بندوں پر عائد ہوتی ہے، اللہ پر نہیں، اسی طرح ان کا ضرر بھی بندوں کو لاحق ہوتا ہے، نہ کہ اللہ تعالیٰ کو۔ پھر ان میں سے بعض کا یہ قول ہے کہ وہ اس فعل کا فاعل ہے، اور اکثر کا یہ قول ہے کہ یہ فعل اس کا مفعول لہ ہے، اور وہ فعل بندے کا ہے۔ جبکہ خرقِ عادت [یا معجزہ] بندے کا فعل نہیں ہوتا؛ کہ یہ کہا جائے کہ یہ بندوں سے قبیح ہے، اور اگر فرض کیا کہ یہ کہا جائے کہ وہ فعل اللہ سے قبیح ہے نا کہ بندے سے۔ حالانکہ رب تعالیٰ فعلِ قبیح سے منزہ ہے۔

دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ: فعل کا خالق اللہ تعالیٰ ہے تاہم بندہ اس کا کاسب ہے' اللہ کاسب نہیں۔ جہاں تک معجزات کا تعلق ہے، یہ بندوں کے اختیار میں نہیں ہوتے کہ ان کو بندوں کے افعال میں شمار کیا جائے۔

باقی رہا کذاب کی تصدیق کرنا تو اس کی صورت یہ ہے کہ اس کے صادق ہونے کی خبر دی جائے خواہ قول کے ذریعہ

ہو یا ایسے فعل سے جو قول کا قائم مقام ہو؛ ظاہر ہے کہ ذات باری سے اس کا صدور محال ہے؛ کیونکہ (کذب بیانی) ایک مذموم وصف ہے، اور عقلی طور پر اللہ سبحانہ تعالیٰ تمام نقائص اور عیوب سے منزہ ہے؛ اس پر تمام اہل خرد و دانش کا اتفاق ہے۔

جو یہ کہتا ہے کہ: اللہ سے فعل قبیح متصور نہیں، بلکہ اس کا ہر ممکن فعل حسن ہے جب وہ اسے کرے۔

وہ کہتا ہے: جو فعل صفاتِ کمال کے سلب کو اور نقص کے اثبات کو مستلزم ہو، وہ اس پر ممتنع ہے۔ جیسے عجز، جہل وغیرہ، اور کذب ایک صفتِ نقص ہے۔ جبکہ صدق صفتِ کمال ہے، اور کذاب کی تصدیق بھی ایک طرح کا کذب ہے۔ جیسا کہ صادق کی تکذیب بھی ایک قسم کا کذب ہے۔ تو جب کذب ایک صفتِ نقص ہے تو یہ اللہ کے حق میں ممتنع ہے۔

ہم نے یہ بات ایک دوسرے مقام پر تفصیل سے بیان کر دی ہے، اور ہمارا مقصد یہ نہیں کہ جو بھی اہلِ سنت کی طرف ہے اس کی تصدیق کرتے جائیں۔ بلکہ ہم حق بیان کریں گے، اور حق یہ ہے کہ اہل سنت خطا پر کبھی متفق نہیں ہوتے، اور شیعہ جہاں بھی اہلِ سنت سے جدا ہوئے ہیں، خطا پر رہے ہیں۔ بلکہ جس امر میں بھی شیعہ نے جمیع اہلِ سنت کی مخالفت کی ہے اس میں خطا پر ہیں۔ جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے جس امر میں بھی سب مسلمانوں کی مخالفت کی ہے، اس میں وہ گمراہ ہیں۔ چاہے بے شمار مسلمان خود بھی خطا پر رہے ہیں۔

جہم بن صفوان نے قدر کے جن مثبتین کی اس بات میں موافقت کی ہے کہ اللہ کا کوئی فعل حکمت و سبب کی بناء نہیں ہوتا، اور اللہ کی طرف نسبت کے اعتبار سے مامور اور محظوظ میں کوئی فرق نہیں، اور نہ اس کے نزدیک کوئی فعل محبوب یا کوئی مبغوض ہے۔ بے شک یہ قول فاسد اور کتاب و سنت اور اتفاقِ اسلاف کے خلاف ہے۔ یہ لوگ بے شمار نقائص کے رب تعالیٰ پر ممتنع ہونے کو بیان کرنے سے عاجز رہ جاتے ہیں۔ بالخصوص جب ان میں سے ایک یہ کہتا ہے: رب تعالیٰ کی نقص سے تنزیہ عقل سے نہیں بلکہ سمع سے معلوم ہوتی ہے۔

[رب سبحانہ وتعالیٰ اور امتناع کذب]

پھر جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ: تم لوگوں نے یہ کیوں کہا کہ: رب تعالیٰ پر کذب ممتنع ہے؟

تو کہتے ہیں: کیونکہ یہ نقص ہے اور اس پر نقص محال ہے۔

جب ان سے کہے کہ: تمہارے نزدیک یہ نقص سے تنزیہ اجماع سے معلوم ہوئی ہے، اور یہ بات معلوم ہے کہ رب تعالیٰ کے کذب سے منزہ ہونے پر اجماع منعقد ہے، تو جب اس بات پر اجماع کے ذریعہ دلیل لانا صحیح ٹھہرا تب پھر اس دوراز کار گفتگو کی حاجت نہ رہی۔ دوسرے کلام معنی پر دلالت کرنے والی عبارت میں ہے، جیسا کہ بعض کا قول ہے کہ: یہ بات جائز نہیں کہ اللہ کوئی لایعنی بات کرے بخلاف حشویہ کے۔

بلاشبہ یہ کسی مسلمان کا قول نہیں۔ نزاع اس میں ہے کہ کیا وہ کوئی ایسا کلام اتار سکتا ہے۔ جس کا معنی بندے نہ جانتے ہوں نا کہ یہ وہ کلام فی نفسہ لایعنی ہے۔ پھر فرض کیا کہ اس میں نزاع ہے تو قائل نے اس کے عبث ہونے پر استدلال کیا ہے اور اللہ پر عبث محال ہے۔ یہ شخص اللہ پر ہر فعل کو جائز سمجھتا ہے، اور اسے عبث اور لایعنی فعل سے منزہ قرار نہیں دیتا۔

جہمیہ اور قدریہ کے قول کے موافق ان لوگوں کے کلام میں اس قسم کے تناقضات بے شمار ہیں۔ البتہ یہ جمہور اہلِ سنت کا قول نہیں واللہ اعلم۔

بعض صفات باری تعالیٰ اور رافضی اعتراض پر رد:

[اعتـــراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''اہل سنت کے بقول یہ لازم آتا ہے، کہ ذات حق کو غفور و حلیم اور عفو کے صفات سے متصف نہ کیا جائے'' اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان صفات سے اس صورت میں موصوف ہوسکتا ہے، جب وہ فساق و فجار کو سزا دینے کا مستحق ہو اور جب وہ یہ سزا معاف کر دے تو اسے غفور و حلیم کے اسماء حسنیٰ سے ملقب کیا جائے، ظاہر ہے کہ وہ فساق کو سزا دینے کا مستحق جبھی ہوگا کہ گناہ بندے سے سرزد ہوں نہ کہ اللہ تعالیٰ سے۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جواب]: اس کا جواب کئی طریق سے ممکن ہے:

پہلا جواب: بہت سے اہل سنت کہتے ہیں ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ غفور و حلیم کے القاب سے اللہ تعالیٰ کو اسی وقت ملقب کیا جا سکتا ہے جب وہ فساق کو سزا دینے کا استحقاق رکھتا ہو۔ استحقاق سے قطع نظر۔ کیونکہ ان امور کے ذریعے استحقاق کو خاص کرنا اس بات کو مقتضی ہے کہ وہ کسی شے کا تو مستحق ہے اور کسی شے کا نہیں، اور یہ بات خود ان کے نزدیک ممنوع ہے۔ بلکہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے، اور جو چاہے حکم دے سکتا ہے۔ جب وہ سزا دینے کی قدرت رکھتا ہو اس لیے کہ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اور جو حکم دینا چاہتا ہے دیتا ہے۔ تو اس سے مغفرت، رحمت اور حلم و عفو وغیرہ درست ہوا۔

دوسرا جواب: قائل کا یہ قول کہ ''اللہ تعالیٰ انسان کو سزا دینے کا استحقاق رکھتا ہو۔'' اس سے اس کی مراد یا تو یہ ہے کہ گناہ گاروں کو سزا دینا اس کا عدل ہے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کا محتاج ہے۔ پہلی بات پر سب کا اتفاق ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ عفو و مغفرت اس کے فضل و احسان کی آئینہ دار ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو افعال العباد کا خالق قرار دیتے ہیں، ان کا یہی زاویہ نگاہ ہے جو لوگ افعال العباد کے متعلق یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ یہ اللہ کی مخلوق ہیں اور بندہ صرف ان کا کاسب ہے، وہ بھی اس بات میں متحد الخیال ہیں کہ سزا اس کے عدل پر مبنی ہے۔ اور اگر اس سے باری تعالیٰ کا محتاج ہونا مراد لیا جائے تو پھر اس کے باطل ہونے پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔

تیسرا جواب: یہ کہا جائے گا کہ: اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کے متعلق دو صورتیں ممکن ہیں:

۱۔ پہلی صورت: اللہ تعالیٰ رحمت و مغفرت کے ساتھ موصوف ہے اور سزا دینا اس کے لیے قبیح ہے۔

۲۔ دوسری صورت: اللہ تعالیٰ رحمت و مغفرت سے تب ہی موصوف ہوسکتا ہے، جب سزا دینا اس کیلئے جائز ہو۔

پہلی صورت کے مطابق لازم آئے گا کہ وہ اہل ایمان اور نیک اعمال انجام دینے والوں کے لیے غفار نہیں، اس لیے کہ ان کو سزا دینا قبیح ہے اور ان کی مغفرت واجب ہے۔ مزید برآں اس سے یہ بھی لازم آئے گا کہ ذات باری تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کے لیے غفور و رحیم نہیں اور ان لوگوں کے لیے بھی رحیم و کریم نہیں جو گناہ کر کے ان سے تائب ہو جائیں اور نیک کام کرنے لگیں۔ کیونکہ اب ان کو سزا دینا ایک قبیح فعل ہوگا۔ اور ان کے لیے رحمت اور مغفرت اس عقیدہ والوں کے

نزدیک واجب ہوجاتی ہے۔اور انبیائے کرام علیہم السلام وغیرہ میں سے جو رحمت کے مستحق ہیں، ان کے حق میں رحیم نہ ہوگا، اوراس ظالم کے حق میں بھی غفور ورحیم نہ ہوگا۔جس نے ظلم کے بعد نیکی کر لی، اور جب قرآن سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ توبہ تائب ہونے والوں کے لیے غفار اور مومنوں پر رحیم ہے تو معلوم ہوگیا کہ وہ مغفرت رحمت کے ساتھ متصف ہے، اور اگر اس سے اس کے ساتھ عذاب ممتنع ہے کہ وہ عقاب کا مستحق ہو تو بھی اسے مغفرت ورحمت کے ساتھ متصف کرنا ممتنع نہ ہوگا۔جیسا کہ اسے بخشنا اور رحم کرنا وغیرہ۔ جسے ان کے نزدیک عقاب دینا مستحسن نہیں۔

بندہ معصیت کا فاعل ہے یا کاسب؟

چوتھا جواب: بندے سے جو معصیت صادر ہوتی ہے اکثر علماء کے نزدیک وہ اس کا فاعل ہے اور بعض کے نزدیک کاسب۔ اس قول کی روشنی میں یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ آدمی ظالم کو سزا دینے کا استحقاق رکھتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ ظالموں کو سزا دینے کا اس سے بھی زیادہ مستحق ہے، جہاں تک اللہ تعالیٰ کے معصیت کو پیدا کرنے کا تعلق ہے، وہ اس کی حکمت ومصلحت پر مبنی ہے، یہ جمہور کا نظریہ ہے جو افعال الٰہی کو مبنی برحکمت قرار دیتے ہیں، یا معصیت کی تخلیق اس کی مشیت کے تابع ہے، یہ ان لوگوں کا نقطۂ نظر ہے جو افعال باری تعالیٰ کو معلل بالحکمت نہیں سمجھتے۔

فصل:......تکلیف ما لا یطاق پر اہل سنت کا عقیدہ اور شبہ کا ردّ

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا قول ہے:''اس سے تکلیف ما لا یطاق لازم آتی ہے۔اس لیے کہ اس میں کافر ایمان لانے کے لیے مکلّف و مامور ہے حالانکہ بقول ان کے اس میں یہ قدرت ہی موجود نہیں، یہ بات عقلاً قبیح ہے اور شرعاً ممنوع ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرۃ: ۲۸۶)

''اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔'' [انتھیٰ کلام الرافضی]

[جواب]: اس کا جواب یہ ہے کہ قائلین تقدیر کے بندہ کی قدرت کے بارے میں دو قول ہیں:

پہلا قول: یہ ہے کہ قدرت مع الفعل ہوتی ہے بنا بریں جس کافر کے متعلق علم الٰہی میں لکھا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا وہ کبھی ایمان لانے پر قادر نہیں ہوگا۔مصنف نے جو کچھ ذکر کیا ہے؛ وہ اسی پر وارد ہوتا ہے۔

دوسرا قول: قدرت کی دو اقسام ہیں۔ جو قدرت احکام کے مکلّف بنانے میں شرط ہے وہ قبل از فعل اور تا وقوع فعل ہوتی ہے اور جو قدرت فعل کو مستلزم ہوتی ہے وہ لازماً مع الفعل ہوتی ہے۔ان کے قول کی اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومن پر اپنا فضل خصوصی فرمایا ہے جس کی بنا پر وہ راہ ہدایت اختیار کرتا ہے، جبکہ کافر اطاعت نہ کرکے اس سے محروم رہتا ہے۔ نیز یہ کہ عند الفعل بندے کا قادر ہونا ضروری ہے۔اس کے برخلاف بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بندہ صرف قبل الفعل قدرت سے بہرہ ور ہوتا ہے، علاوہ ازیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مورد فضل وعنایت ربانی ہونے کے اعتبار سے مومن و کافر مساوی

ہیں۔جب فعل بجالانے کے وقت قدرت کا ہونا ضروری تھا۔ پس جب فعل سے پہلے وہ اس پر قادر تھا؛ اور یہ قدرت فعل کے انجام تک باقی رہی ؛ تو اس سے ان کا اصول نہیں ٹوٹتا۔لیکن دوضدین کے لیے کارگر اور مؤثر قوت کا ہونا؛ اس میں کافر اور مؤمن دونوں مشترک ہیں ۔ پس مؤمن کے لیے ان اسباب کا ہونا ضروری ہوجاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ خاص کئے ہیں؛ تاکہ وہ ایمان والا ہوسکے۔اس چیز میں مکلّف کا ایمان لانے کا ارادہ بھی داخل ہوجاتا ہے۔اوراس ارادہ کو وہ لوگ جملہ طور پراس قدرت میں داخل کرتے ہیں جوفعل کے مقارن ہوتی ہے۔ یہ ایک لفظی نزاع ہے جس کے بارے دوسرے مقامات پراس سے پہلے تفصیل گزرچکی ہے۔

پس اس صورت میں جمہور اہل سنت جن کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ کافر ایمان لانے کی قدرت سے بہرہ ور ہے ان کے نزدیک سابقہ اعتراض قطعی طور سے بے بنیاد ہے، یہ اعتراض صرف دوسرے لوگوں کے اقوال کے پیش نظر وارد ہوتا ہے، جوکہ اس کا التزام کرتے ہیں ۔سابقہ ذکرکردہ دونوں اقوال میں سے جوقول بھی قرین صدق وصواب ہو وہ قول اہل سنت سے خارج نہ ہوگا۔والحمدللہ۔

دوسری وجہ : یہ کہا جائے: تکلیف مالا یطاق کی دوقسمیں ہیں:

۱۔ عجز کی وجہ سے، جیسے اپاہج کو چلنے کے لیے کہنا، یا انسان کواڑنے کے لیے کہنا وغیرہ۔تو جمہور اہلِ سنت مثبتین للقدر کے نزدیک شریعت میں ایسا کوئی حکم نہیں،اور نہ اس کی ذکرکردہ بات اس کے وقوع کومستلزم ہے۔

۲۔ امر کی ضد میں اشتغال کی وجہ سے: جیسے کافر کفر میں لگا ہو، کہ اس کفر نے اسے ایمان لانے سے روک رکھا ہے۔ جیسے کہ بیٹھنے کی حالت والا کہ اس کے بیٹھنے نے اسے کھڑے ہونے سے روک رکھا ہے۔

دوضدین میں سے ایک کا ارادۂ جازمہ دوسری ضد کے ارادہ کے منافی ہوتا ہے۔کافرکوایمان لانے کا مکلّف بنانا اسی باب میں سے ہے،اور یہ بات کسی عاقل کے نزدیک قبیح نہیں۔ بلکہ اہلِ عقل کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ضد میں اشتغال کے وقت دوسری بات کے امر و نہی کا مکلّف بنانا درست ہے۔ بشرطیکہ اس ضد کا ترک ممکن ہواور دوسری مامور بہ ضدکو بجا بھی لا سکے۔

نزاع اس میں ہے کہ اسے تکلیف مالا یطاق کا نام دیا جائے یانہیں۔ کیونکہ فی الحال اس میں فعل کے مقارن قدرت منتفی ہے۔اب بعض مثبتین قدر اسے تکلیف مالا یطاق میں داخل مانتے ہیں۔ جیسا کہ قاضی ابوبکر اور قاضی ابویعلی وغیرہ کا قول ہے کہ مالا یطاق کی دوقسمیں ہیں:

(۱)...... عجز کی وجہ سے۔ (۲)...... ضد میں اشتغال کی وجہ سے۔

بعض نے اسے مالا یطاق میں داخل نہیں مانا، اور یہ کتاب وسنت اور کلام سلف کے زیادہ مشابہ ہے۔ کیونکہ مستطیع مامورِ حج جب وہ حج نہ کرے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ مالا یطاق کا مکلّف ہے۔ایس طرح سستی کی وجہ سے نماز وضو وغیرہ کے تارک کوبھی مالایطاق کا مکلّف کہنا درست نہ ہوگا۔

رہا ارشاد باری تعالیٰ:

﴿وَ كَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًاo﴾ (الکھف : ۱۰۱)

''اور وہ سننے کی استطاعت ہی نہ رکھتے تھے۔''

تو وہاں اللہ نے اس کلام سے یہ مراد نہیں لی۔ کیونکہ سب لوگ ایسے نہیں کہ ان کے پاس فعل سے قبل موجب فعل قدرت ہو۔ پس اس کے ساتھ صرف نافرمان خاص نہیں۔ بلکہ یہ مراد ہے کہ یہ لوگ حق بات سننے سے سدید کراہت کرتے تھے جس کے ہوتے ہوئے ان کے جی سن نہ سکتے تھے، اور یہ ان کے بغض کی وجہ سے تھا نا کہ عجز کی وجہ سے۔ جیسا کہ حاسد محسور پر احسان سے قاصر ہوتا ہے اور اس کا سبب اس کا بغض ہونا ہے نا کہ عجز۔

ایسی استطاعت کا عدم امر و نہی سے منع نہیں کرتا۔ کیونکہ اللہ بندے کو ناگوار بات کا حکم دیتا ہے اور محبوب کے ترک کا مکلّف بناتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَ هُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ﴾ (البقرۃ : ۲۱۶)

''تم پر لڑنا لکھ دیا گیا ہے، حالانکہ وہ تمھیں ناپسند ہے۔''

اور فرمایا:

﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰىo﴾ (النازعات : ۴۰)

''اور رہا وہ جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اور اس نے نفس کو خواہش سے روک لیا۔''

غرض اگر بندہ ارادے کرے تو اس پر قادر ہوتا ہے، اور ممنوع کو ترک کر سکتا ہے، اور مامور بہ بس یہ شرط نہیں کہ بندہ اس کا ارداہ بھی کرنے والا ہو، اور نہ منہی عنہ میں یہ شرط ہے کہ وہ بندے کو ناگوار بھی ہو۔ کیونکہ فعل قدرت اور ارادہ پر موقوف ہوتا ہے، اور تکلیف میں یہ بات مشروط ہے کہ بندہ فعل پر قادر ہو، یہ نہیں کہ اس کا ارادہ کرنے والا بھی ہو۔ البتہ اس کا ارادہ کرنے والا ہونا ضروری نہیں۔ ہاں فعل ارادہ کے وقت ہی پایا جائے گا۔ پس ارادہ فعل کے وجود کی شرط ہے نا کہ وجوب کی۔

تیسری وجہ: تکلیف مالا یطاق کی یہ تفسیر بیان کی جائے کہ یہ وہ فعل ہے جس پر وہ قدرت نہیں ہوتی جو اس کے مقدور کے مقارن ہوتی ہے۔ اس تفسیر کی بناء پر تکلیف مالا یطاق کا امتناع مورد نزاع ہے اور اس کی نفی دلیل محتاج ہے۔

چوتھی دلیل: قدر کے بعض مثبتین عجز کے وقت بھی مالا یطاق کی تکلیف کو جائز سمجھتے ہیں۔ بلکہ غالی تو ممتنع بالذات کی تکلیف کو بھی جائز سمجھتے ہیں، اور بعض تو اس بات کے بھی مدعی ہیں کہ شریعت میں ایسا ہے۔ جیسے ابولہب کو ایمان لانے کا مکلّف بنانا۔ حالانکہ رب تعالیٰ نے اس بات کی خبر دے دی ہے کہ وہ ایمان نہ لائے گا۔ اگرچہ یہ قول مرجوع ہے۔ لیکن اس قدری نے اس کے ابطال کی دلیل ذکر نہیں کی، اور نہ اس کے معارضہ کا جواب ہی ذکر کیا ہے۔ بلکہ صرف یہ کہنے پر اکتفاء کیا ہے کہ ایسا عقلاً ممتنع / اور قبیح ہے۔

ان لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ تحسین و تقبیح میں عقل کو مجال نہیں۔ اور اگر ان لوازم کے بارے میں اس بحث کو مکمل نہ کیا گیا تو جو کچھ وہ بیان کر رہے ہیں؛ ان پر حجت نہ ہوگا؛ چہ جائے کہ وہ ان کے علاوہ تقدیر کے قائلین پر حجت ہو۔ یا پھر حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت کو ماننے والوں پر حجت ہو۔

فصل: ......اہل سنت کے نزدیک افعالِ اختیاریہ پر رافضی کا کلام اور اس پر ردّ

جب تکلیف مالا یطاق کی تفسیر بایں طور کی جائے کہ وہ ایسا فعل ہے جس کو انجام دینے پر فاعل کو قدرت حاصل نہ ہو تو اس تفسیر کے مطابق امتناع کا دعویٰ مورد نزاع ہوگا اور اس کی نفی محتاج دلیل ہوگی۔

[اعتـــــراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''اہل سنت کے نقطۂ نگاہ کے مطابق یہ لازم آتا ہے کہ ہمارے وہ افعال اختیاری جو قصد و ارادہ کے تحت ہم سے صادر ہوتے ہیں، جیسے دائیں بائیں حرکت کرنا؛ ہاتھ سے پکڑنا اور پاؤں سے چلنا وغیرہ وغیرہ؛ وہ ان اضطراری افعال کی مانند ہو کر رہ جائیں جو بلا ارادہ ظہور پذیر ہوتے ہیں، مثلاً نبض کی حرکت یا کسی اونچی جگہ سے گرنے والا جو حرکت کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ افعال اختیاری و اضطراری کے مابین فرق و امتیاز ضروری ہے۔ کیونکہ ہر عاقل اس بات کا حکم لگاتا ہے کہ ہم حرکتِ اختیاریہ پر تو قادر ہیں لیکن آسمان میں اڑنے جیسی حرکتِ غیر اختیاریہ پر قادر نہیں۔ ابوالہذیل علاف کا قول ہے کہ: بشر کا گدھا بشر سے زیادہ عقل مند ہے۔ وہ یوں کہ اگر تو ایسے چھوٹی ندی عبور کرنے کو کہا تو وہ ندی میں داخل ہو کر اسے عبور کر لے گا۔ لیکن اگر تو اسے گہری ندی کے کنارے لائے تو وہ اس میں داخل نہ ہوگا۔ کیونکہ گدھا بھی یہ فرق جانتا ہے کہ میں کس ندی کو عبور کر سکتا ہوں اور کس کو نہیں۔ لیکن بشر مقدور اور غیر مقدور میں فرق کرنے سے قاصر ہے۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جــواب]: ہم کہتے ہیں یہ اس شخص کے نزدیک لازم آتا ہے، جس کا قول ہے کہ بندے کو اپنے افعال اختیاری پر قدرت حاصل نہیں۔ یہ کسی معروف امام کا قول نہیں اور تقدیر کے قائلین اہل سنت میں سے کوئی بھی یہ عقیدہ نہیں رکھتا۔ البتہ جہم بن صفوان اور اس کے غالی ہم نوا کہتے ہیں کہ: بندہ ہرگز قدرت سے بہرہ ور نہیں [وہ بندے سے قدرت کو سلب شدہ مانتے ہیں]۔ وہ کہتے ہیں: بندہ اسی طرح حرکت کرتا ہے، جیسے درخت ہلانے سے ہلنے لگے۔ اسلامی فرقوں میں سے امام اشعری رحمہ اللہ اور ان کے ہم نوا فقہاء امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے اصحاب ہیں؛ کا نقطۂ نظر ان سے قریب تر ہے، تاہم وہ بندہ کے لیے قدرت محدثہ کا اثبات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فعل بندے کا کسب ہے، مگر اس کے پہلو بہ پہلو وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بندے کی قدرت کو ایجاد مقدور سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وہ بندے میں جس کسب کا اثبات کرتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے۔

❀ اسی لیے کہنے والا یہ کہتا ہے: ''وہ کسب جو اشعری ثابت کرتا ہے وہ غیر معقول ہے، اور جمہور اہلِ اثبات اس بات پر ہیں کہ بندہ اپنے فعل کا فاعلِ حقیقی ہے۔ اسے قدرت اور اختیار حاصل ہے، اور اس کی قدرت مقدور میں مؤثر ہے۔

جیسا کہ قوی اور طبائع شروط و اسباب میں سے مؤثر ہوتے ہیں۔اشعری کا قول جمہور اہلِ سنت پر لازم نہیں آتا۔ہم بارہا یہ کہہ چکے ہیں کہ ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ اہل سنت سے بعض اوقات خطا سرزد ہوتی ہے مگر سب اہل سنت خطا کاری کے مرتکب نہیں ہوتے۔ بخلاف ازیں امامیہ خطا کے ارتکاب میں ایک دوسرے سے ہم نوا ہوتے ہیں اور اجماعی حیثیت سے اس کا ارتکاب کرتے ہیں، یہ ایک مسلمہ حقیقت و صداقت ہے کہ جن جن مسائل میں امامیہ نے اہل سنت سے اختلاف کیا ہے، ان میں اہل سنت کا مسلک قرین حق و صواب ہے،اور وہ مسائل جن میں اہلِ سنت اور امامیہ دونوں نے اختلاف کیا ہے۔اس میں دونوں میں سے کسی کا بھی کوئی اختصاص نہیں۔

خلاصہ کلام ! سلف و خلف کے جمہور اہلِ سنت کا مسئلہ زیرِ نظر میں زاویہ نگاہ یہ ہے کہ بندہ میں حقیقی قدرت پائی جاتی ہے، لہٰذا وہ فاعل حقیقی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے افعال کا خالق ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ ''وہ ہر چیز کا خالق ہے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ﴾ (البقرۃ: ۱۲۸)

''اے ہمارے رب! اور ہمیں اپنے لیے فرماں بردار بنا اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک امت اپنے لیے فرماں بردار بنا۔''

نیز فرمایا:﴿ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ﴾ (ابرھیم: ۴۰)

''اے میرے رب مجھے نماز کا پابند بنا لے اور میری اولاد کو بھی۔''

نیز ارشاد فرمایا: ﴿وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا﴾ (السجدہ: ۲۴)

''اور ہم نے ان میں پیشوا بنائے، جو ہمارے حکم سے ہدایت دیتے تھے، جب انھوں نے صبر کیا۔''

اور فرمایا:

﴿وَ جَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَo﴾ (الانبیاء: ۷۳)

''اور ہم نے انھیں ایسے پیشوا بنایا جو ہمارے حکم کے ساتھ رہنمائی کرتے تھے اور ہم نے ان کی طرف نیکیاں کرنے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وحی بھیجی اور وہ صرف ہماری عبادت کرنے والے تھے۔''

اور فرمایا:

﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًاo اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًاo وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًاo﴾

(المعارج: ۱۹۔ ۲۱)

''بلاشبہ انسان تھڑدلا بنایا گیا ہے۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جانے والا ہے۔اور جب اسے

بھلائی ملتی ہے تو بہت روکنے والا ہے۔''

سو رب سبحانہ وتعالیٰ نے اس بات کی خبر دی ہے کہ وہی مسلم کو مسلم، مقیم صلوٰۃ کو مقیم الصلوٰۃ اور امام ہادی کو امامِ ہادی بناتا ہے، اور حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

﴿وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّاo وَّبَرًّا بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّاo﴾ (مریم: ۳۱ ـ ۳۲)

''اور مجھے بابرکت بنایا جہاں بھی میں ہوں اور مجھے نماز اور زکوٰۃ کی وصیت کی، جب تک میں زندہ رہوں۔ اور اپنی والدہ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والا (بنایا) اور مجھے سرکش، بدبخت نہیں بنایا۔''

ان آیات میں رب تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اس نے جنابِ عیسیٰ علیہ السلام کو والدہ کے حسنِ سلوک کرنے والا بنایا، اور شقی سرکش نہیں بنایا۔ یہ اس باب میں اہلِ سنت کا صریح قول ہے کہ رب تعالیٰ بندوں کے فعل کا خالق ہے، اور فرعون اور اس کی قوم کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿وَ جَعَلْنٰھُمْ اَئِمَّۃً یَّدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ﴾ (القصص: ٤١)

''اور ہم نے انھیں ایسے پیشوا بنایا جو آگ کی طرف بلاتے تھے۔''

اور فرمایا:

﴿لِمَنْ شَآءَ مِنْکُمْ اَنْ یَّسْتَقِیْمَ o وَمَا تَشَآؤُوْنَ اِلَّا اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَo﴾

(التکویر: ۲۸ ـ ۲۹)

''اس کے لیے جو تم میں سے چاہے کہ سیدھا چلے۔ اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے، جو سب جہانوں کا رب ہے۔''

اور فرمایا:

﴿اِنَّ ھٰذِہٖ تَذْکِرَۃٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیْلًا o وَمَا تَشَآؤُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًاo﴾ (الانسان: ۲۹ ـ ۳۰)

''یقیناً یہ ایک نصیحت ہے، تو جو چاہے اپنے رب کی طرف (جانے والا) راستہ اختیار کر لے۔ اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے، یقیناً اللہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔''

اور فرمایا:

﴿کَلَّآ اِنَّہٗ تَذْکِرَۃٌo فَمَنْ شَآءَ ذَکَرَہٗo﴾ (المدثر: ٥٤ ـ ٥٥)

''ہرگز نہیں! یقیناً یہ ایک یاد دہانی ہے۔ تو جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے۔''

اس آیت سے بندے کی مشیت ثابت ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ہر کام اللہ کی مشیت

کے تابع ہے۔اور یہی واضح طور پر اہلِ سنت کا عقیدہ ہے۔

قرآن کریم کے متعدد مقامات میں بتایا گیا ہے کہ بندے مختلف کام انجام دیتے، ایمان لاتے، کفر کرتے، سچ بولتے اور دروغ گوئی کے مرتکب ہوتے ہیں، نیز یہ کہ وہ قوت واستطاعت سے بہرہ ور ہیں۔

جمہور آئمہ اہلِ سنت کا قول ہے کہ اللہ ان سب کا خالق ہے، اور ان کے نزدیک خلق یہ مخلوق نہیں ہے۔لہٰذا وہ اس بات میں کہ بندوں کے افعال رب کی مخلوق اور مفعول ہیں، اور اس بات میں فرق کرتے ہیں کہ: بندے کا وہ نفسِ فعل جو وہ کرتا ہے اور وہ فعل کا مصدر ہے جو فعل بجالاتا ہے کہ وہ مصدر کے معنی میں بندے کا فعل ہے۔ نا کہ اس اعتبار سے رب کا فعل ہے۔ بلکہ وہ رب کے حق میں مفعول ہے، اور رب تعالیٰ کو اس کے مفعولات کے ساتھ متصف نہیں کیا جاتا۔

شیعہ مصنف نے جن اعتراضات کا ذکر کیا ہے، یہ اس شخص پر وارد ہوتے ہیں، جو رب کے فعل اور مفعول کے مابین فرق و امتیاز نہیں کرتا؛ یا افعال العباد کو افعال الٰہی قرار دیتا ہے، جیسا کہ جہم بن صفوان اور اس کے ہم نواؤں کا عقیدہ ہے؛ اور اشعری اور اس پیروکار آئمہ کہتے ہیں۔ اسی لیے یہ مقام اس بحث کے لیے ناکافی اور تنگ دامن ہے۔ اس کی تفصیل دوسرے موقع پر ہو چکی ہے۔

اسی طرح یہ قباحت و شناعت اسے بھی لازم آتی ہے جو کہتا ہے کہ مخلوقات میں قوی و طبائع سرے سے موجود ہی نہیں، اور کہتا ہے کہ اللہ ان کے ہوتے ہوئے فعل کرتا ہے نا کہ ان کے ذریعے۔ اس شخص کو یہ لازم آتا ہے کہ قادر اور عاجز میں کوئی فرق نہ ہو چاہے وہ قدرت کو ثابت بھی کرتا ہو، اور کہے کہ قدرت کسب سے ملی ہوئی ہے۔ اس کو یہ جواب دیا جائے گا کہ تو جس کسب کو ثابت کیا اور جس فعل کی نفی کی ہے، ان دونوں میں کوئی اور قادر اور عاجز میں کوئی معقول فرق ثابت نہیں کیا۔ جب کہ اقتران محض کو قدرت کے ساتھ اختصاص حصال نہ ہو۔ کیونکہ بندے کا فعل اس کی حیات، علم اور ارادۂ وغیرہ کے ساتھ ملا ہوتا ہے۔ تو جب قدرت کو صرف اقتران کی تاثیر ہی حاصل ہوگی تو پھر قدرت اور غیر قدرت میں کوئی فرق نہ رہا۔

اسی طرح جو یہ کہتا ہے کہ قدرت صفتِ فعل میں موثر ہے نا کہ اصلِ فعل میں۔ جیسا کہ قاضی ابو بکر اور ان کے ہم نواؤں کا قول ہے۔ کیونکہ اگر وہ رب تعالیٰ کے پیدا کرنے کے بغیر تاثیر کو ثابت کرتا ہے تو اسے لازم آئے گا کہ بعض حوادث کا خالق رب تعالیٰ نہیں۔ چاہے اس نے ان حوادث کو رب تعالیٰ کی تخلیق پر معلق بھی کیا ہو۔ تب بھی اصل اور صفت میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

عقیدہ اہل سنت اور مسئلہ متنازعہ پر قرآنی آیات سے استشہاد

رہے جمہور آئمہ اہلِ سنت تو ان کا وہ قول ہے جس پر عقل و شرع دونوں سے ان کی شہادت ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ﴾ (الاعراف : ۵۷)

''ہم اسے مردہ شہر کی طرف ہانک لے جاتے ہیں اوراس کے ساتھ بارش اتارتے اور بارش سے ہر طرح کے پھل پیدا کرتے ہیں۔''

اوراللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ (البقرة: ١٦٤)

''اوراس پانی میں جواللہ نے آسمان سے اتارا، پھراس کے ساتھ زمین کواس کی موت کے بعد زندہ کر دیا۔''

اوراللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ﴾ (المائدة: ١٦)

''جس کے ساتھ اللہ ان لوگوں کو جواس کی رضا کے پیچھے چلیں، راہ سلامتی کی ہدایت دیتا ہے۔''

اوراللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا﴾ (البقرة: ٢٦)

''اس (قرآن) کے ساتھ بہت سے لوگوں کو گمراہ کرتا اور بہت سے لوگوں کو ہدایت عطا کرتا ہے۔''

کتاب وسنت میں اس کی متعدد مثالیں ہیں جن میں رب تعالیٰ اس بات کی خبر دے رہے ہیں کہ وہ حوادث کو اسباب کے ذریعے پیدا کرتا ہے، اور کتاب وسنت ان قوی اور طبائع کے اثبات پر بھی دلالت کرتے ہیں جن کو رب تعالیٰ نے حیوان وغیرہ میں پیدا کیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (التغابن: ١٦)

''سواللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو۔''

اور فرمایا:

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً﴾ (فصلت: ١٥)

''اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ بے شک وہ اللہ جس نے انھیں پیدا کیا، قوت میں ان سے کہیں زیادہ سخت ہے۔''

اور فرمایا:

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَيْبَةً يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ﴾ (الروم: ٥٤)

''اللہ وہ ہے جس نے تمھیں کمزوری سے پیدا کیا، پھر کمزوری کے بعد قوت بنائی، پھر قوت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا بنا دیا، وہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے۔''

اور نبی کریم ﷺ نے حضرت اشج بن عبدالقیس رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا تھا:

''تم میں دو عادتیں ایسی ہیں جو اللہ کو محبوب ہیں: بردباری اور متانت۔'' انہوں نے عرض کی: کیا میں نے دو خصلتوں کو اپنے اندر پیدا کیا ہے، یا میں ان دونوں خصلتوں پر پیدا کیا گیا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں بلکہ تم ان دونوں خصلتوں پر پیدا کیے گئے ہو۔'' اس پر انہوں نے عرض کیا: سب تعریف اس اللہ کی ہے جس نے مجھے دو ایسی خصلتوں پر پیدا کیا ہے جو اسے محبوب ہیں۔''[1]

یہ حضرات بندے کے لیے قدرت کو ثابت کرتے ہیں اور کہتے ہیں: قدرت کی مقدور میں تاثیر ایسے ہی ہے جیسے جملہ اسباب کی مسببات میں تاثیر ہے، اور سبب مسبب میں مستقل نہیں پایا جاتا۔ بلکہ وہ اپنے معاون کا محتاج ہوتا ہے۔ اس طرح بندے کی قدرت ہے کہ وہ مقدور میں مستقل نہیں، اور یہ کہ اس کا سبب اسے روکتا اور اس کی راہ میں رکاوٹ بھی بنتا ہے۔ اسی طرح بندے کی قدرت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا سبب کا خالق ہے، اور اس کا بھی جو سبب میں معاون ہو یا اس میں روکاوٹ ہو۔ اسی طرح بندے کی قدرت ہے۔

اسی طرح اس امامی نے جو ہمارے مقاصد و دواعی کے اعتبار سے واقع ہونے والے افعالِ اختیاریہ میں اور افعالِ اضطراریہ میں، جیسے نبض کی حرکت وغیرہ۔ جو ضروری فرق بیان کیا ہے، وہ برحق ہے اور اہلِ سنت والجماعت اور ان کے پیروکاروں کا قول ہے، اور اس میں امتِ مسلمہ کے کسی ایک فرد نے بھی، جسے امت میں لسانِ صدق حاصل ہے۔ جیسے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ وغیرہ، اختلاف نہیں کیا، اور مالک، ابوحنیفہ، ثوری، اوزاعی، لیث، شافعی، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ جیسے مجتہدین اور خلفاء نے اختلاف کیا ہے۔

تو جب مثبتین قدر میں ایسے لوگ ہیں جنہیں بطلانِ فرق لازم آتا ہے تو ان کا قول باطل ہوگا۔ لیکن بہر حال منکرین تقدیر کا یہ قول اس سے بھی زیادہ باطل ہے۔ سو اس قدری نے ایک باطل کا رد اس سے بھی زیادہ بڑے باطل کے ساتھ کیا ہے، اور اہل سنت ان دونوں امور میں اس کے موافق نہیں۔ یقیناً وہ صرف حق کہتے اور جانتے ہیں۔ اس قدری امامی کا قول زیادہ باطل ہے۔

مندرجہ بالا بیان اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ بندوں کے افعال حادث ہیں؛ اور معدوم ہونے کے بعد عالم وجود میں آئے ہیں، لہٰذا ان کا حکم بھی وہی ہے جو باقی حوادث کا ہے اور یہ بھی دیگر ممکنات کے زمرہ میں داخل ہیں۔ بنا بریں جس دلیل سے بھی حوادث و ممکنات کے مخلوق ہونے پر استدلال کیا جائے گا اس سے یہ بھی عیاں ہوگا کہ افعال العباد اللہ کے پیدا کردہ ہیں۔

یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ ہر محدث (حادث شدہ چیز) اپنے وجود میں محدث (وجود میں لانے والے) کی محتاج ہے۔ یہ مقدمہ جمہور کے نزدیک ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ بعینہ اسی طرح ہر ممکن مرجّح تام کا محتاج ہے، جب بندے کے افعال حادث ہیں تو ان کے لیے ایک محدث کا وجود ناگزیر ہے، جب بندے کو اپنے افعال کا موجد قرار دیا جائے تو یہ تسلیم

[1] صحیح مسلم ۔ کتاب الایمان باب الامر بالایمان باللہ تعالیٰ و رسولہ (حدیث: ۲۵/ ۱۷، ۱۸)۔

کرنا پڑے گا کہ بندہ آغاز کار میں موجد نہ تھا، یہ منصب اسے بعد میں ملا ہے۔ لہٰذا یہ ایک امر حادث ہے اور اسے بھی کسی محدث کی ضرورت ہوگی، اس لیے کہ اگر بندہ شروع ہی سے محدث ہوتا تو یہ فعل حادث بھی دائمی ہوتا [اس سے فعل حادث کا دوام لازم آئے گا]۔ اور جب بندے کا محدث ہونا حادث ہے تو اس کے لیے کسی اور محدث کی ضرورت ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ بندے کا ارادہ محدث ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ: بنا بریں ارادہ حادث ہے اور اس کے لیے کسی اور محدث کا وجود ناگزیر ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ یہ ارادہ بندے کے ارادہ سے عالم وجود میں آیا تو کہا جائے گا کہ اس ارادہ کیلئے بھی محدث کی ضرورت ہے۔

خلاصہ کلام! بندے میں جس کو آپ محدث فرض کریں گے؛ تو اس کے ساتھ اسی قسم کی گفتگو کی جاسکتی ہے، جیسے حادث اول میں بیان ہوئی۔ اگر بندہ کے افعال کو قدیم اور ازلی قرار دو گے تو یہ محال ہے۔ اس لیے کہ جو فعل بندہ سے وابستہ ہو وہ قدیم نہیں ہوسکتا، اور اگر کہو کہ فعل بندے کا وصف ہے اور اس کی قدرت اس میں پیدا کی گئی ہے اور اس میں اسی طرح گفتگو کا امکان ہے جس طرح ارادہ میں تو اس صورت میں بھی مرجّح تام کا وجود ضروری ہے۔ لیکن تمہاری یہ دلیل بھی تمہارے کام نہ آئے گی۔ جس کی یہ وجوہات ہیں:

اوّل یہ کہ کہا جائے کہ جب اس میں پیدا کی گئی یہ قدرت اس میں فعل کے حدوث سے پہلے اور حدوث کے وقت پیدا کی گئی ہے تو ایک اور سببِ حادث کا ہونا لازم ہے جو اسے منضم ہو۔ وگرنہ دو مثلین میں سے ایک کا دوسرے پر بلا مرجع کے راجح ہونا لازم آئے گا۔ اسی طرح حوادث کا بلا سبب حادث کے حلاوث لازم آئے گا۔ وگرنہ اگر بندے کا حال فعل سے قبل اور فعل کے وقت یکساں ہو تو ایک حال کی دوسرے حال پر کوئی برتری اور فوقیت نہ ہوگی، اور اس حال کی کہ بندہ اس میں فاعل ہے، دوسرے حال کی بہ نسبت کوئی تخصیص باقی نہ رہے گی، اور اس میں دو متماثلین میں سے ایک کی دوسری پر بلا مرجّح لازم آئے گی۔

اسی طرح جب یہ کہا جائے کہ بندے کے فعل کا ہونا اور نہ ہونا دونوں ممکن ہیں، اور اس کا وجود عدم پر کسی مرجّح تام کے ساتھ راجح ہوگا۔

پھر یہ مرجّح تام اگر تو بندے سے ہے تو اسی میں وہی قول ہے جو فعل میں ہے۔ تب پھر لازم ہوا کہ یہ مرجّح تام اللہ کی طرف سے ہو، اور یہ کہ اس کا وجود فعل کے وجود کو مستلزم ہو۔ وگرنہ وہ مرجّح تام نہ ہوگا۔

اسی لیے قدر کے مثبتین جمہور اہلِ سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ رب تعالیٰ نے نعمتوں کے ساتھ اہلِ ایمان کو خاص کیا ہے۔ نا کہ کافروں کو۔ وہ یوں کے اس نے اہلِ ایمان کو ہدایت سے نوازا ہے۔ اگر اللہ کی مومنوں پر نعمت کافروں پر نعمت کے جیسے ہوتی تو مومن مومن نہ ہوتا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَلَكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ٥﴾ (الحجرات: ۷)

’’اور لیکن اللہ نے تمھارے لیے ایمان کو محبوب بنا دیا اور اسے تمھارے دلوں میں مزین کر دیا اور اس نے کفر اور گناہ اور نافرمانی کو تمھارے لیے ناپسندیدہ بنا دیا، یہی لوگ ہدایت والے ہیں۔‘‘

اور فرمایا:

﴿یَمُنُّوْنَ عَلَیْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ یَمُنُّ عَلَیْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ (الحجرات: ۱۷)

’’وہ تجھ پر احسان رکھتے ہیں کہ وہ اسلام لے آئے، کہہ دے مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو، بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمھیں ایمان کے لیے ہدایت دی، اگر تم سچے ہو۔‘‘

اور فرمایا:

﴿فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَ اللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ﴾ (البقرة: ۲۱۳)

’’پھر جو لوگ ایمان لائے اللہ نے انھیں اپنے حکم سے حق میں سے اس بات کی ہدایت دی جس میں انھوں نے اختلاف کیا تھا اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے۔‘‘

اور فرمایا:

﴿اُولٰٓىِٕكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ وَ اَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ﴾ (المجادله: ۲۲)

’’یہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اس نے ایمان لکھ دیا ہے اور انھیں اپنی طرف سے ایک روح کے ساتھ قوت بخشی ہے۔‘‘

اور فرمایا:

﴿فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ یَّهْدِیَهٗ یَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَ مَنْ یُّرِدْ اَنْ یُّضِلَّهٗ یَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَیِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ﴾ (الانعام: ۱۲۵)

’’تو جسے اللہ ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کا سینہ تنگ، نہایت گھٹا ہوا کر دیتا ہے، گویا وہ مشکل سے آسمان میں چڑھ رہا ہے۔‘‘

ان قدریہ نے نعمتِ دینیہ کو مومن و کافر دونوں پر یکساں قرار دیا ہے، اور کہتے ہیں کہ اللہ نے بندے کو ایسی قدرت دی ہے جو کفر و ایمان دونوں کے مناسب ہے۔ پھر اس سے دونوں میں سے ایک کا صدور ایسے کسی سببِ حادث کے بغیر ہوتا ہے جو ترجیح کے مناسب ہو، اور ان کا یہ گمان ہے کہ قادرِ مختار اپنے مقدور کی دو طرفوں میں سے ایک کو دوسرے پر بلا مرجح کے ترجیح دیتا ہے۔ ان لوگوں نے اس بات کا دعویٰ بندے اور رب دونوں کی قدرت میں کیا ہے۔

رب کی قدرت کے باب میں اس بات پر بے شمار مثبتین تقدیر نے ان کی موافقت کی ہے۔ اور رازی اور ان جیسے

علماء جنہوں نے اس بات سے قدریہ کے خلاف حجت پکڑی ہے، اس باب میں تناقض کا شکار ہوئے ہیں۔ لہٰذا جب ان علماء نے خلقِ افعال کے مسئلہ میں قدریہ سے مناظرہ کیا ہے تو ان کے خلاف اسے دلیل بنایا ہے، اور کہا ہے کہ ممکن کے وجود کی اس کے عدم پر ترجیح مرجح تام سے ہی ہوگی۔ چاہے اس کا صدور قادر مختار ہو یا غیر قادر سے ہو۔ ان لوگوں نے حدوث عالم کے مسئلہ میں تکلم کیا ہے۔ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ حادث کے لیے سببِ حادث کا ہونا لازم ہے تو یہ لوگ قدریہ جیسا جواب دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ قادر مختار اپنے مقدور کی دو طرفوں میں سے ایک کو بلا مرجح کے ترجیح دیتا ہے۔ ان لوگوں نے قادر اور غیر قادر میں فرق کیا ہے۔ جیسا کہ قدریہ کا قول ہے۔ اور کبھی یہ بندے اور رب کے فعل میں یہ کہہ کر فرق کرتے ہیں کہ رب تعالیٰ اپنی اس مشیئتِ قدیمہ کے ذریعہ ترجیح دیتا ہے جو اس کی ذات کے لوازم میں سے ہے۔ بخلاف عبد کے کہ اس کا ارادہ غیر سے حادث ہوتا ہے۔

لیکن اکثر لوگوں کا قول ہے کہ جو لوگ ازلی اور قدیم ارادہ کو تجدد شیئے بغیر مرجح کے قرار دیتے ہیں، اِن کا قول اُن کے قول کی جنس سے ہے۔ کیونکہ ارادہ کی جملہ وقتی مقدرات کی طرف نسبت ایک ہی ہے، اور جملہ ممکنات کی طرف نسبت بھی ایک ہی ہے، لہٰذا دو متماثلین میں سے ایک کی دوسرے پر ترجیح بلا مرجح ٹھہری۔ لہٰذا جب فاعل کی فعل سے قبل اور فعل کے وقت کی حالت یکساں ہوئی، پھر فعل کی وجہ سے دو میں سے ایک حال کے ساتھ اختصاص کو فرض کیا تو اس سے ترجیح بلا مرجح لازم آئی۔ ان فرقوں کا منتہائے نظر یہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ ان کے کلام کو نہیں جانتے۔ جیسے رازی وغیرہ اور وہ دہریوں کی علت، قدریوں کے قادر اور کلابیوں کے مرید کے درمیان متردد ہیں۔ وہ رب تعالیٰ کو اپنی مشیئت وقدرت کے ساتھ ازل میں فعل اور کلام پر قادر نہیں مانتے۔ پھر ان دہریہ فلسفیوں نے جیسے ابنِ سینا وغیرہ، اس دلیل کو عالم کے حدوث کے ممتنع ہونے پر اور اس کے قدیم ہونے کے واجب ہونے کو، اپنی سب سے عمدہ دلیل قرار دیا ہے۔ لیکن ان کی مذہب کی یہاں کوئی دلیل نہیں۔ کیونکہ اس دلیل کی غایت یہ ہے کہ یہ رب تعالیٰ کی فاعلیت کے دوام کو مستلزم ہے، اور یہ فلک وغیرہ اعیانِ عالم کے قدم پر کوئی دلالت نہیں کرتی۔

لیکن ان لوگوں کا قول ہے کہ یہ دلیل تسلسل کو لازم ہے، اور تسلسل محال ہے۔ اب تسلسل سے ان کی مراد تمام تاثیر میں تسلسل ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ رہا آثار میں تسلسل تو اس کے وہ بھی قائل ہیں۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ ممتنع تسلسل وہ ہے جو دورِ ممتنع کی جنس میں سے ہو۔ کیونکہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ بندہ یہ فعلِ حادث تب کرے گا جب تک کہ وہ اس فعل کو حادث نہ کرے گا کہ جس سے وہ اس کا فاعل ہو جائے۔ لہٰذا وہ اس کے حادث ہونے کے ساتھ حادث ہوگا۔ اسی طرح دوسرا ہے، اور یہ تمام تاثیر میں تسلسل ہوگا۔

جب یہ کہا جائے کہ بندہ ایک شے کو اس وقت حادث نہ کرے گا حتی کہ دوسری شے کو حادث کر لے؛ تو یہ دورِ ممتنع ہوگا، اور یہی تسلسل ہے۔ جبکہ حوادث میں کلام مطلق ہو، اور حادث معین ہو تو یہ دور کی بات ہے۔

جہمیہ اور قدریہ پر یہ متکلمین کی حجت الزامیہ ہے۔ جبکہ اشعریہ، کرامیہ، اور معتزلہ اور ان کے موافق فقہاء وغیرہ کی بھی یہی دلیل ہے، اور اس کا دوام ان کے نزدیک ہے۔ جس نے اُسے یعنی رب تعالیٰ کو یہ ٹھہرایا ہے کہ اسے اپنی قدرت اور مشیئت کے ساتھ تکلم اور فعل ممکن نہ تھا، پھر اس لیے ممکن ہو گیا تو یہ ترجیح بلا مرجع کو اور اس تسلسل اور دور کو مستلزم ہے جس کے امتناع پر اتفاق ہے، اور ممتنع تسلسل موثرات اور تمام تاثیر میں ہے۔ البتہ رہا آثار میں تسلسل تو یہی مورد نزاع ہے۔

یہ لوگ ان دو قسموں کو باطل قرار دیتے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ جو چیز غیر متناہی ہو اس میں تفاوت ممتنع ہے، اور جمہور فلاسفہ، آئمہ اہل ملل کے ساتھ ہیں؛ وہ دوسری قسم کا انکار نہیں کرتے۔

اس صورت میں ان فلسفیوں کو یہ کہا جائے گا کہ اگر تو آثار میں تسلسل ممتنع ہے تو تمہارا قول باطل ٹھہرا، اور قول کے باطل ہونے کے ساتھ ہی تمہاری دلیل بھی باطل ٹھہری۔ کیونکہ قول باطل پر حجت صحیحہ قائم نہیں کی جا سکتی۔

اگر تسلسل فی الآثار ممکن ہے تو تمہاری دلیل باطل ٹھہری۔ کیونکہ ممکن ہے کہ اس کے کلمات غیر متناہی ہوں، اور یہ کہ وہ ازل سے اپنی مشیئت کے ساتھ متکلم بھی ہے اور فعال بھی ہے، اور وہ ایک کے بعد ایک فعل کرتا ہے جس میں افعال اور مفعولات میں سے کوئی معین شے قدیم نہیں ہوتی۔ تب پھر دلیل دونوں صورتوں میں باطل ٹھہری۔ کیونکہ جب تسلسلِ آثار ممکن ہوا تو افلاک کا حدوث اسے قبل کے اسبابِ حادثہ کی وجہ سے ممکن ہوا۔

جملہ انبیاء کرام علیہم السلام اس بات کی خبر دی ہے کہ رب تعالیٰ ہے زمینوں اور آسمانوں کو اور ان کے درمیان کی چیزوں کو چھ دن میں پیدا کیا ہے۔ جبکہ اس کا عرش ان کے پیدا کیے جانے سے قبل پانی پر تھا۔ یہ بات ضرورت اور جملہ رسولوں کے دین میں نقل متواتر سے منقول ہوتی چلی آ رہی ہے۔ جبکہ تمہاری کوئی دلیل ان کے قدم کو لازم قرار نہیں دیتی۔ لہٰذا تمام افلاک کے قدم کا قول کرنا۔ اس میں کوئی حجتِ عقلیہ نہیں، اور یہ بلا سبب پیغمبروں کی تکذیب ہے۔

پھر عقلِ صریح بھی تمہارا قول باطل قرار دیتی ہے۔ کیونکہ افلاک وغیرہ عالم مستلزم حوادث ہیں۔ اگر یہ قدیم ہوتے تو لازم آتا ہے کہ یہ حوادث اپنے ایسے موجب سے صادر ہوئے ہیں جو قدیم ہے۔ تب پھر موجب اپنے ایسے موجب و مقتضی کو مستلزم ہوتا جو اس سے متاخر نہیں ہے۔ کیونکہ اگر اس کے موجب کا اس سے تاخر جائز ہوتا تو یہ علتِ تامہ نہ ہوتا۔ کیونکہ علتِ تامہ معلول کو مستلزم ہوتی ہے۔ تو جب یہ علتِ تامہ ہی نہ ٹھہری تو اس کے موجب کا اس کے ساتھ اقتران ممتنع ٹھہرا۔ کیونکہ بدون علتِ تامہ کے معلول کا قدم ممتنع ہے۔

پھر یہ کہ اگر اس کے موجب کا تاخر جائز ہوتا۔ جبکہ ازل میں اس کے ساتھ اس کا اقتران بھی جائز ہو تو اس کی دو میں سے ایک کے ساتھ تخصیص ایسے مرجح کی محتاج ہوتی جو موجب بالذات نہ ہوتی، اور یہاں اس کے سوا اور کوئی مرجح ہے نہیں۔ سو افلاک وغیرہ کا وجود ممتنع ٹھہرا، اور یہ باطل ہے کیونکہ افلاک موجود بھی ہیں اور عیاناً مشہود بھی ہیں، اور یہ انہیں بھی تسلیم ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ افلاک علتِ قدیمہ کے ساتھ معلول ہیں، اور وہ موجب بالذات ہے اور اس کا موجب اس سے متاخر نہیں ہوتا۔

جب یہ عقلِ صریح کے ذریعے معلوم ہے اور وہ اس کے موافق بھی ہیں، بلکہ یہ ان کے قول کی اصل ہے۔ انہیں یہ کہا جائے گا کہ جو حوادث کو مستلزم ہو اس کا موجب بالذات سے صدور ممتنع ہے۔ کیونکہ حوادث رفتہ رفتہ وجود میں آتے ہیں، اور جو رفتہ رفتہ وجود میں آتا ہو۔ اس کے اجزاء ازلیہ اور قدیمہ نہیں ہوتے، اور نہ موجب بالذات سے ان کا صدور ہوتا ہے۔ لہٰذا حواد کا موجب بالذات سے صدور ممتنع ٹھہرا، اور عالم کی کسی شے کا صدور حوادثِ لازمہ کے بغیر ممتنع ممتنع ہوا۔ کیونکہ لازم کے بغیر ملزوم کا وجود ممتنع ہے۔ لہٰذا ظاہر ہوا کہ فلک کا ازلی وقدیم ہونا ممتنع ہے، اور یہ کہنا ممکن نہیں کہ ازل میں یہ حوادث سے خالی تھا، حوادث اس میں بعد میں پیدا ہوئے ہیں۔ کیونکہ تب یہ کہا جائے گا کہ ان حوادث کا سبب ہونا بھی لازم ہے۔ لہٰذا ان میں بھی وہی قول ہے جو دوسرے حوادث میں ہے۔ پس اگر تو یہ جائز ہے کہ وہ سببِ حادث کے بغیر ہیں تو یہ فلک میں ممکن ہوا، اور ان کی حجت باطل ٹھہری، اور اس سے دو متماثلین میں سے ایک کو دوسرے پر بلا مرجح کے ترجیں دینا لازم آیا، اور اگر حوادث کے لیے سبب لازم ہے تو حوادث کا تسلسل و دوام لازم آیا، اور یہ کہ فلک اور رب تعالیٰ کے سوا جملہ اشیاء ہمیشہ سے حوادث کے مقارن رہی ہیں، اور ہر ممکن جو حوادث کے مقارن ہو اس کا موجب بالذات سے صدور ممکن نہیں۔ لہٰذا خود اس حادث کا بھی قدیم ہونا ممتنع ٹھہرا۔

حوادث کو مستلزم کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے، اور یہ وہ ہے جو حوادث سے خالی نہ رہتا ہو، اور جسے اقترانِ حوادث لازم ہو۔ کیا اس کا حادث ہونا واجب ہے یا اس کے حدوث غیر واجب اور اس کا قدم جائز ہے۔ چاہے وہ واجب ما سوا سے غنی ہو، یا ممکن ہو، یا واجب بنفسہ اور ما سوا سے غنی کے درمیان اور ممکن، اور محتاج الی الغیر میں فرق کیا جائے گا۔ اس بارے تین اقوال ہیں:

۱۔ **پہلا قول**: یہ اُن اہلِ نظر و کلام کا قول ہے، جو فاعلیتِ رب کے دوام کے امتناع کے، اور ازل میں رب تعالیٰ کے اپنی مشیئت وقدرت کے ساتھ فعل وتکلم کے امتناع کے قائل ہیں اور یہ کہ یہ ممکن نہیں۔ ان لوگوں کے مستقبل میں رب تعالیٰ کی فاعلیت کے امکان کی بابت دو اقوال ہیں۔

۲۔ **دوسرا قول**: یہ ان فلاسفہ کا قول ہے جو ما سوی اللہ کے قدم کے قائل ہیں۔ جیسے افلاک یا عقول یا دوسری اشیاء وغیرہ۔ یہ رب تعالیٰ کو موجب بالذات قرار دیتے ہیں۔ جیسے عالم کی کسی شے کی تغییر یا اس کا اِحداث ممکن نہیں۔ بلکہ ان کے قول کی حقیقت یہ ہے کہ حوادث اس سے صادر ہی نہیں ہوئے۔ بلکہ ان کا حدوث وصدور کسی محدث کے بغیر ہے۔

۳۔ **تیسرا قول**: یہ ان آئمہ اہلِ ملل کا قول ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ رب تعالیٰ ہر شے کا خالق ہے، اور رب تعالیٰ کے سوا ہر شے عدم سے وجود میں آئی ہے، اور یہ کہ رب تعالیٰ کی قادریت کو دوام ہے، اور وہ ہمیشہ سے متکلم ہے جب چاہے، اور وہ اپنی ذات کے ساتھ قائم افعال کا فاعلِ ازلی ہے۔

فلاسفہ کے وہ آئمہ اور اساطین جو ارسطو سے پہلے ہو گزرے ہیں، وہ ان کے اقوال کے موافق ہیں۔ بخلاف ارسطو

اور اس کے ان پیروکاروں کے جو افلاک کے قدم کے قائل ہیں۔ کیونکہ ان کے قول کا فاسد ہونا صحیح منقول اور صریح معقول سے معلوم اور واضح ہے۔

دوسرے یہ کہ معین مفعول کا فعل کو لازم ہونا، اس کے قدیم پر قدیم اور اس کے دوام پر دائم ہونا بالذات ممتنع ہے، اور اگر فرض کیا کہ فاعل غیر مختار ہے تو اس وقت کیا جب یہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ اپنی قدرت و مشیئت کے ساتھ فاعل ہے؟

رہی ان کی یہ دلیل کہ علت معلول پر بالذات مقدم ہے۔ بغیر زمان کے، تو یہ غیر معقول اور غیر موجود ہے سوائے اس کے جس میں یہ شرط ہے۔ کیونکہ شرط کبھی مشروط کے مقارن ہوتی ہے۔ رہی وہ علت جو معلول کے لیے فاعل کا فعل ہے تو اس میں علت کی معلول کے ساتھ زمانے میں مقارنت غیر مقول ہے۔ یہ لوگ زمانے کے بغیر علت کے معلول پر بالذات تقدیم کے قائل ہیں۔ جیسے کہ ہاتھ کی حرکت انگوٹھی کی حرکت پر بالذات متقدم ہے۔ اسی طرح حرکت آواز پر مقدم ہے وغیرہ وغیرہ۔

غرض یہ لوگ جو بھی مثالیں پیش کرتے ہیں یا تو وہ شرط ہیں نا کہ فاعل اور یا پھر متقدم بالزمان ہیں۔ رہا فاعلِ غیر متقدم تو وہ ہرگز بھی معقول نہیں۔

غرض یہ مقام ان مقالات کے بیان کا نہیں۔ یہ روئے زمین کے سب سے گمراہ مقالات ہے۔ ان پر کلام کا محل دوسرا ہے۔ یہاں دراصل ان قدریہ کی اصل پر تنبیہ مقصود ہے کہ ان کے قول کی حقیقت یہ ہے کہ حیوان کے افعال فاعل کے بغیر حادث ہوتے ہیں۔ جیسا کہ دہریہ فلاسفہ کے قول کی اصل یہ ہے کہ فلک کی حرکت اور جمیع حوادث کی حرکت سبب حادث کے بغیر ہوتی ہے۔ اسی طرح اہلِ اثبات میں سے جو قدریہ کے اس بات میں موافق ہیں کہ افعال رب تعالیٰ کے ساتھ قائم نہیں ہیں۔

کہتے ہیں کہ فعل ہی مفعول اور خلق ہی مخلوق ہے۔ جیسا کہ اشعریہ اور ان کے ہم نواؤں کا قول ہے کہ اسے بھی رب کے فعل میں وہ لازم آتا ہے جو قدریہ کو لازم آتا ہے۔

اسی لیے اس رافضی کی شناعات ان لوگوں پر ہیں، اور یہ خلفائے ثلاثہ کے مثبتین کی جماعتوں میں سے ایک جماعت ہے، اور بسا اوقات بے شمار زیدیہ امامیہ وغیرہ شیعہ اس باب میں ان کی موافقت کرتے ہیں۔ لیکن بہرحال ان کا قول قدریہ کے قول سے کم خطا پر ہے۔ بلکہ ان کی اصل خطا قدریہ کی بعض خطا میں ان کی موافقت کرنا ہے۔ جبکہ آئمہ اہلِ سنت میں کوئی اس خطا کا قول نہیں کرتا۔ اسی طرح اہلِ حدیث وتفسیر وفقہ وتصوف میں سے جمہور اہلِ سنت خطا کو متضمن ان کے اقوال کے قائل نہیں۔ بلکہ وہ اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ بندوں کے افعال کا خالق ہے، اور یہ کہ بندہ قادر مختار ہے جو اپنی مشیئت قدرت سے فعل کرتا ہے، اور اللہ ہر چیز کا خالق ہے، اور یہ کہ افعالِ اختیاریہ اور اضطراریہ میں فرق ہے، اور یہ کہ رب تعالیٰ اپنی قدرت و مشیئت کے ساتھ فعل کرتا ہے، اور یہ کہ جو اس نے چاہا وہ ہوا، اور جو نہ چاہا وہ نہ ہوا، اور یہ کہ وہ ہمیشہ سے افعال پر قادر صفاتِ کمال کے ساتھ موصوف اور جب چاہے متکلم ہے، اور وہ ان صفات کے ساتھ موصوف ہے

جن کے ساتھ اس نے خود کا متصف ہونا بیان کیا ہے، اور جن صفات کے ساتھ نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کا متصف ہونا بیان کیا ہے، اور وہ اس میں کسی قسم کی تحریف، تعطیل، تکییف، اور تمثیل وغیرہ کے قائل نہیں۔ وہ رب تعالیٰ کے علم محیط قدرتِ کاملہ اس کے ہر چیز کو پیدا کرنے اور اس کی مشیئتِ نافذہ کو ثابت کرتے ہیں۔

رب تعالیٰ جنہیں اہلِ سنت کے قول کا فہم عطا فرماتا ہے، وہ جانتا ہے کہ انہوں نے محاسنِ اقوال کو جمع کیا ہے، اور انہوں نے رب تعالیٰ کو غایتِ کمال کے ساتھ متصف کیا ہے۔ ان لوگوں صحیح منقول اور صریح معقول کو مضبوطی سے تھام رکھا ہے، اور انہی کا قول صحیح اور تناقض سے محفوظ ہے اور اس کی کے ساتھ اللہ نے اپنے رسولوں کو بھیجا اور اپنی کتابوں کو اتارا ہے۔

فصل:......صالح و طالح کی عدم مساوات

اہلِ سنت کے قدر کے بارے میں مقالہ پر رافضی کا کلام کہ نیکی کرنے اور برائی کرنے کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ دونوں کا صدور اللہ سے ہوتا ہے، اور رافضی کے اس قول کا رد

[اعتــراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''اہل سنت کے نقطۂ نظر کو ماننے سے یہ لازم آتا ہے کہ جو آدمی ساری عمر اعمال صالحہ انجام دینے میں کھپا دے اور جو عمر بھر افعال قبیحہ کا ارتکاب کرتا رہے دونوں مساوی ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا، نہ ہم اول کی مدح کر سکتے ہیں اور نہ ثانی کی قدح؛ اس لئے کہ ایک کی نیکی اور دوسرے کی برائی دونوں کا فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جــواب]: یہ دونوں قول باطل اور بے بنیاد ہیں؛ اس لیے کہ نیکی و بدی کے مشترکہ طور پر اللہ کے پیدا کردہ ہونے سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ دونوں افعال جملہ احکام میں بھی مشترک ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اللہ کے سوا ہر چیز اسی کی پیدا کردہ ہے اور اس کی مخلوق ہونے میں سب مشترک ہیں۔ یہ بات عقلِ صریح سے معلوم ہے کہ امور مختلفہ متعدد امور میں مشترک ہوتے ہیں بالخصوص اس مقام میں کہ جمیع ماسوی اللہ مخلوقِ خدا ہونے میں مشترک ہیں، اور یہ کہ ان سب کا مالک و رب اللہ ہے پھر یہ بھی معلوم ہے کہ مخلوقات میں بے شمار افتراق بھی ہے جسے اللہ ہی شمار کرسکتا ہے۔ اللہ نے تاریکیوں اور نور کو پیدا کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ مَا یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَ الْبَصِیْرُ ○ وَ لَا الظُّلُمٰتُ وَ لَا النُّوْرُ ○﴾ (فاطر: ۱۹ ـ ۲۰)

''اور اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں۔ اور نہ اندھیرے اور نہ روشنی۔''

اللہ جنت دوزخ کا خالق ہے۔ لیکن دونوں برابر نہیں۔ وہ دھوپ سائے کا خالق ہے لیکن دونوں ایک نہیں۔ وہ اندھے اور بینا کا خالق ہے لیکن دونوں یکساں نہیں۔ وہ زندہ و مردہ، قادر و عاجز اور عالم و جاہل کا خالق ہے لیکن دونوں ایک سے نہیں۔ وہ نافع و ضار، اور لذت والم کا خالق ہے لیکن دونوں جدا جدا ہیں۔ تو جب اللہ اچھے برے ذائقوں کا خالق ہے۔ پھر اچھا ذائقہ پسند بھی ہوتا ہے اور مرغوب بھی۔ اس کی تعریف بھی ہوتی ہے اور اس کو چاہا بھی جاتا ہے اور برا ذائقہ

قابلِ مذمت، مبغوض اور لائقِ اجتناب ہوتا ہے۔ حالانکہ دونوں کا خالق اللہ ہے۔ اور وہ اللہ فرشتوں اور نبیوں کا بھی خالق ہے اور شیطانوں، بچھوؤں، سانپوں وغیرہ کا بھی خالق ہے۔ انبیاء وغیرہ محمود اور معظم ہیں۔ جبکہ شیاطین اور سانپ وغیرہ فاسق اور حل وحرم میں ہر جگہ پر لائق گردن زدنی ہیں۔ انبیائے کرام علیہم السلام وغیرہ میں رب تعالیٰ نے طبیعتِ کریمہ پیدا کی ہے جو خیر و احسان کا تقاضا کرتی ہے اور شیاطین وغیرہ میں طبیعتِ خبیثہ پیدا کی ہے جو شر و عداوت کو لاتی ہے، اور پھر ان میں محبت و بغض اور مدح و ذم کا بھی فرق ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت و جہنم، عالم و جاہل، شہد و زہر، راحت و رنج اور آدم و ابلیس سب کو پیدا کیا ہے۔ جب شرع و عقل دونوں اس امر میں ایک دوسرے کے ہم نوا ہیں کہ جس چیز میں منفعت و مصلحت پائی جاتی ہو، وہ واجب المدح ہے اگرچہ جمادات ہی سے کیوں نہ ہو؛ تو جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے مخلوقات میں سے انتہائی احسان کرنے والا بنایا ہو وہ کیونکر مدح کیے جانے کا زیادہ مستحق نہ ہوگا، برائی کے بارے میں بھی یونہی کہا جا سکتا ہے۔

بخلاف ازیں منکرین تقدیر کہتے ہیں کہ: احسان کی بنا پر کوئی شخص قابل مدح ہوسکتا ہے اور نہ ایذا رسانی کے باعث قابل قدح؛ وہ مدح و ستائش کا مستحق اسی صورت میں ہوسکتا ہے، جب اللہ نے اسے محسن نہ بنایا ہو۔ اس نے نیک کام کر کے ہم پر احسان نہیں کیا اور نہ ہی اس کی برائی کے ذریعہ ہمیں آزمائش میں ڈالا ہو۔ اس رافضی منکر تقدیر کے قول کی حقیقت یہ ہے کہ جہاں بندے کا شکر ادا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، وہاں اللہ کا شکر ادا نہیں کیا جا سکتا اور جہاں شکر الٰہی مطلوب ہوتا ہے وہاں بندے کا شکریہ ادا کرنا بے سود ہے۔ عقل و شرع دونوں کے نزدیک اس قول کا فساد معلوم ہے۔ کہ اس قول کی حقیقت صرف اتنی ہی ہے کہ بندہ تو مشکور ٹھہرے پر رب تعالیٰ مشکور نہ ٹھہرے، اور جہاں اللہ مشکور ہو وہاں بندہ مشکور نہ ہو۔ یہاں تک کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہمیں جو تعلیم و تبلیغ بہم پہنچائی ہے یہ اس کا احسان نہیں ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (آل عمران: ۱۶۴)

''بلاشبہ یقیناً اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا جب اس نے ان میں ایک رسول انھی میں سے بھیجا، جو ان پر اس کی آیات پڑھتا اور انھیں پاک کرتا اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔''

اس قدری کے عقیدہ کے مطابق تو اللہ کا رسول کو بھیجنا ایسا ہی ہے جیسے ایک مخلوق نے اپنا قاصد دوسری طرف بھیج دیا۔ سو رب تعالیٰ نے صرف رسول بھیج کر احسان کیا۔ یہ احسان نہیں کہ اس نے رسول کو ان کے لیے قرآن پڑھنے والا، اور انہیں پاک کرنے والا اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دینے والا بنا کر مبعوث کیا۔ بلکہ ان کے نزدیک یہ افعال رسول کی طرف منسوب ہیں جن کو اس نے پیدا کیا ہے۔ نہ کہ بھیجنے والے کی طرف جس نے ان میں سے کوئی چیز پیدا نہیں کی۔

یہ قدری کہتا ہے کہ رسول بنفسہ ناطق ہے نہ کہ اسے اللہ تعالیٰ نے ناطق بنایا ہے، اور نہ ہی اللہ نے کسی اور چیز کو ناطق

بنایا ہے۔ بلکہ اس میں قدرت پیدا کی ہے کہ چاہے تو وہ بولے اور چاہے نہ بولے۔ اور بندہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو حادث کرتا ہے، اور احداث کے بعد اور پہلے دونوں صورتوں میں اس کا حال یکساں ہے، اور وہ نطق پر رب تعالیٰ کی معونت اور تیسیر کے بغیر ناطق ہے۔

منکرین تقدیر یہ بھی کہتے ہیں: ''فرشتوں کا بندوں کے لیے طلب مغفرت کرنا، علماء کا لوگوں کو علم و فضل سے بہرہ ور کرنا اور حکام کا عدل و انصاف کے ساتھ معاملات طے کرنا انعامات الٰہیہ میں شامل نہیں ہے۔ ان کی رائے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملوک و سلاطین کو عادل یا ظالم بنانے میں بندوں کی کوئی آزمائش نہیں ہے۔

ایک معروف اثر میں وارد ہے: رب تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''میں اللہ ہوں، بادشاہوں کا مالک ہوں، بادشاہوں کے دل اور ان کی پیشانیاں میرے ہاتھ میں ہیں۔ جس نے میری اطاعت کی، میں انہیں اس پر مہربان بنا دوں گا، اور جس نے میری نافرمانی کی، میں انہیں اس پر انتقام بنا دوں گا۔ سو تم حکمرانوں کو برا بھلا کہنے میں مت لگو اور میری اطاعت کرو، میں ان کے دلوں کو تم پر مہربان کر دوں گا۔ ❶

اس قدری کے نزدیک اللہ ان ملوک کو نہ عادل بنانے پر قادر ہے اور نہ ظالم بنانے پر۔ نہ اس نے ان کو نیکوکار بنایا ہے اور نہ ہی بدکردار بنایا ہے۔ وہ اس بات پر بھی قادر نہیں کہ کسی کو کسی پر احسان کرنے والا بنائے یا کسی کو کسی کے حق میں بدکردار بنائے۔ ان کے نزدیک رب تعالیٰ اس بات پر بھی قادر نہیں کہ کسی کو کسی کے حق میں محسن بنانے کا احسان کرے۔ یا کسی کو کسی ذریعے تعذیب و اہانت میں مبتلا کرے۔

اس قدری کے قول کے مطابق رب تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے کسی کو قوت والا نہیں بنایا کہ پھر وہ دیار و امصار میں دندناتے پھریں۔ کہ اس نے نہ تو انہیں اس بات کا حکم دیا ہے اور نہ انہیں اس کا فاعل ہی بنایا ہے۔ بلکہ انہیں صرف قدرت دی ہے۔ اس طرح ان کے نزدیک اس نے شیطانوں کو ان کافروں پر نہیں بھیجا جو جا کر انہیں چوکا دیتے ہیں۔

منکرین تقدیر کے مذکورہ بالا اقوال کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی حال میں بھی مدح و ستائش کا مستحق نہیں، اس لئے کہ شکر اخروی انعامات پر ادا کیا جا سکتا ہے، یا دینی انعامات پر یا دنیوی انعامات پر۔ جہاں تک نعمت دنیاوی انعامات کا تعلق ہے؛ تو وہ ان لوگوں کے نزدیک رب تعالیٰ پر واجب ہیں۔ اسی طرح ان نعمتوں کا حال ہے جو دینی ہیں جن پر وہ قادر ہے۔ جیسے رسولوں کا بھیجنا، قدرت کا پیدا کرنا وغیرہ۔ رہا نفس ایمان اور عمل صالح تو اس قدری کے نزدیک رب تعالیٰ اس بات پر قادر نہیں کہ وہ کسی کو مومن و مہتدی نیکوکار و متقی اور صالح بنائے اور نہ وہ ان امور میں سے کسی پر شکر یہ کا مستحق ہے۔ جن کو اس نے نہیں کیا اور نہ اس قدری کے نزدیک اس نے ان امور پر قادر بنایا ہے۔

رہیں اخروی نعمتیں تو اس قدری کے نزدیک رب تعالیٰ پر جزاء دینا واجب ہے۔ جیسا کہ مستاجر پر اجیر کو اس کی اجرت دینا واجب ہوتا ہے۔ سو اس قدری کے نزدیک یہ باب عدل مستحق سے ہے نا کہ فضل و احسان کے باب سے اور

❶ الاتحاف السنيّة فى الاحاديث القدسية للشيخ محمد المدنى، ص: ٦٩، ٧٧۔ ط حيدر آباد ١٣٥٨ھ مع اختلاف الالفاظ.

یہ اس شخص کے بمنزلہ ہے جو اپنے ذمہ قرض کو ادا کرتا ہے لہٰذا وہ فضل واحسان پر مستحق شکر نہ ہوگا۔

یہ ہے اس قدری کے قول کی حقیقت۔ بھلا یہ ہر حال میں رب تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنے والے اہل ایمان کو کیونکر عار دلاتا ہے جو اس بندے کے بھی شکر گزار ہیں جن کے ہاتھ پر رب تعالیٰ خیر کو جاری فرماتے ہیں کیونکہ جس نے لوگوں کا شکر ادا نہیں کیا اس نے رب کا بھی شکر ادا نہیں کیا، اور جو ان پر ظلم واعتداء کرتا ہے یہ اس سے عدل کے ساتھ بدلہ لینے کو جائز قرار دیتے ہیں اور جب ظالم کی سزا اللہ کا حق نہ ہو تو یہ اسے معاف کر دینا افضل سمجھتے ہیں۔

ان کا اعتقاد ہے کہ رب تعالیٰ کے محسن کے ذریعے اس پر اس لیے احسان کروایا ہے تاکہ وہ اس محسن کا شکر ادا کرے۔ اور کسی کے ذریعے اس لیے ابتداء میں ڈالا ہے تاکہ یہ صبر واستغفار کرے اور راضی بہ قضاء ہے۔ جیسا کہ ایک صحیح حدیث میں وارد ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

''رب تعالیٰ بندے کے لیے جو بھی فیصلہ کرتا ہے وہ اس کے لیے خیر ہی خیر ہوتا ہے۔ سو اگر وہ اسے خوشی دیتا ہے تو وہ شکر کرتا ہے اور یہ اس کے لیے خیر ہے اور اگر اسے وہ تکلیف پہنچاتا ہے اور وہ صبر کرتا ہے تو یہ بھی اس کے لیے خیر ہے اور امر صرف مومن کے لیے ہی ہے۔'' [1]

رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ تَؤُزُّھُمْ اَزًّاo﴾ (مریم: ۸۳)

''بے شک ہم نے شیطانوں کو کافروں پر چھوڑ رکھا ہے، وہ انھیں ابھارتے ہیں، خوب ابھارنا۔''

اور فرمایا:

﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰھُمَا بَعَثْنَا عَلَیْکُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ وَ کَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًاo﴾ (الاسراء: ۵)

''پھر جب ان دونوں میں سے پہلی کا وعدہ آیا تو ہم نے تم پر اپنے سخت لڑائی والے کچھ بندے بھیجے، پس وہ گھروں کے اندر گھس گئے اور یہ ایسا وعدہ تھا جو (پورا) کیا ہوا تھا۔''

پس رب تعالیٰ کا شیطانوں کو بنی اسرائیل پر ظلم کرنے والوں پر بھیجنا، آیا یہ امر شرعی ہے؟ جس کا اس نے ان کو حکم دیا، جیسا کہ اس نے رسولوں کو نشانیوں اور ہدایت کے ساتھ بھیجا اور جیسا کہ اس نے امیوں میں رسول کو بھیجا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا تھا اور انہیں پاک کرتا تھا؟

یا یہ تقدیر اور تسلیط ہے؟ چاہے مسلط کیے جانے والا ظالم، معتدی اور رب تعالیٰ کے دین وشرع کا نافرمان ہی ہو۔

پھر یہ بھی معلوم ہے کہ روئے زمین کے اکثر لوگ تقدیر کے قائل ہیں اور اس کے باوجود وہ محسن کی تعریف اور مسیئی کی مذمت کرتے ہیں۔ سب بندوں کی فطرت یہ دونوں باتیں داخل ہیں۔ سو وہ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اللہ ہر شی کا

[1] صحیح مسلم: ٤/ ٢٢٩٥۔ کتاب الزهد، باب، المومن امره کله خیرٌ، عن صهیب رضی اللہ عنہ

خالق اور رب ہے اور اس نے یہ سب مقدر کیا ہے کہ اس کو مسلط کیا تو اس کو آسان کیا۔ اور بندے ایک کی مدح اور دوسرے کی مذمت کرتے ہیں اور قدر کے اقراری اہل اثبات محسن کی مدح اور مسیئ کی مذمت کرتے ہیں۔ جبکہ اس پر سب کا اتفاق بھی ہے کہ وہ اللہ دونوں افعال کا خالق ہے۔

سو رافضیوں کا قول کہ اس سے انہیں لازم آتا ہے کہ وہ ان دونوں باتوں میں فرق نہ کریں۔ یہ لذومِ مالا یلزم ہے۔ اور غایتِ امر یہ ہے کہ اللہ نے اسے مستحق مدح وثواب بنایا ہے اور دوسرے کو مستحق ذم وعقاب۔ تو پھر جب اس نے محسن کو قابل مدح اور مسیئ کو قابل مذمت بنایا ہے تو ایک کی مدح اور دوسرے کی مذمت ممتنع نہ ٹھہری۔ البتہ اس کا ان دونوں کو پیدا کرنا دیگر اشیاء کے پیدا کرنے کی طرح ہے اور یہ خلق مخلوقات میں حکمت کلیہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جیسا کہ بارہا بیان ہوا۔

اور اس قدری کی رائے پر شکر وثناء اور مدح کا مستحق وہی ہے جسے اللہ نے محسن نہیں بنایا اور مذمت کا مستحق بھی وہی ہے جو اس نے مسیئ نے نہیں بنایا۔ بلکہ جسے اللہ محسن یا مسیئ بنانے پر قادر نہیں۔ وہ مدح وذم کا محل نہیں فلکر اللہ کے عجز اور اس کی مشیئت وخلق میں قصور اور بدون محدث کے حدوثِ دوارث کی شرط کے ساتھ۔

❀❀❀❀

روافض کی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر دروغ گوئی

[گنہگار کون ہے؟ عقیدہ اہل سنت پر رافضی الزام وشبہ کا ردّ]

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:''ایک وہ تقسیم ہے جو ہمارے سید ومولیٰ امام موسیٰ بن جعفر کاظم رحمہ اللہ سے وارد ہے؛ آپ صغیر السن تھے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ان سے دریافت کیا، معصیت کس سے صادر ہوتی ہے؟ امام موسیٰ نے جواباً فرمایا:

۱۔ بندے سے۔ ۲۔اللہ تعالیٰ سے۔ ۳۔یا دونوں سے۔

اگر معصیت کا مصدر ومنبع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے تو اللہ تعالیٰ بندے پر کیوں کر ظلم کرسکتا ہے، اور اسے ناکردہ گناہ کی سزا کیونکر دے سکتا ہے......؟ اور اگر دونوں سے صادر ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اور بندہ گناہ کے ارتکاب میں برابر کے شریک ہوئے، اللہ تعالیٰ قوی ہے اور اس لائق ہے کہ اپنے ضعیف بندے سے منصفانہ برتاؤ کرے گا۔ اور اگر بندہ گناہ کا مرتکب ہونے میں منفرد ہے تو مذمت و ملامت کا سزاوار بھی وہی ہوگا، اور ثواب وعقاب کا زیادہ مستحق بھی وہی ہوگا اور اسی کے لیے جنت یا جہنم واجب ہوگی۔ اس پر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے یہ آیت پڑھی:

﴿ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ﴾ (آل عمران: ٣٤)

''ایسی نسل جس کا بعض بعض سے ہے۔'' [انتہی کلام الرافضی]۔

[جواب] : اس سے کہا جائے گا کہ جو بات سنداً مذکور ہو ہم اسکی صحت سے آگاہ ہیں، جو بات شیعہ مصنف نے بیان کی ہے وہ قطعی طور پر جھوٹ ہے؛ اس واقعہ کی کوئی قابل ذکر صحیح اور معروف اسناد نہیں پائی جاتی کیونکہ منقولات کی صحت جاننے کا مدار ان کی اسانید ثابتہ ہوتی ہیں۔ بالخصوص جب کسی باب میں کذب کی کثرت بھی ہو اور جب کسی واقعہ کا کذب ظاہر و باہر ہو تب تو اشکال ہی نہیں رہتا۔ کیونکہ جو لوگ امام صاحب اور ان کے مذہب سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تقدیر کے قائل ہیں اور انہوں نے ''فقہ اکبر''[1] میں منکرین تقدیر کی تردید کی ہے۔ اس کتاب میں

[1] کتاب فقہ اکبر کے بارے میں بعض روبیضہ کا کہنا ہے کہ یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تألیف نہیں؛ بلکہ کسی اور ابوحنیفہ نامی آدمی نے لکھ کر امام صاحب کی طرف منسوب کردی ہے۔ یہ بات ان کبار وقدیم علماء کے اقوال کے مخالف ہے جو اسے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تألیف لطیف تسلیم کرتے ہیں جیسے استاذ ابومنصور عبدالقاہر بغدادی؛ فخر الاسلام علی البزدوی؛ ودیگر حضرات۔ یہ امام شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ہیں؛ جنہیں کتابوں کا ایک جامع احاطہ حاصل ہے؛ آپ بھی اسی چیز کی صراحت کرتے ہیں جس کی صراحت متقدمین علماء نے کی ہے۔ حالانکہ استاذ ابومنصور رحمہ اللہ شافعی ہیں؛ اور فخر الاسلام رحمہ اللہ حنفی؛ اور ابن تیمیہ رحمہ اللہ حنبلی ہیں۔ استاذ ابومنصور اپنی کتاب ''التبصرۃ'' میں فرماتے ہیں: ''فقہاء میں سے سب سے پہلے جس ہستی نے معتزلہ کے عقائد کا بطلان ثابت کیا وہ حنفیہ کے امام؛ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ہیں۔''

امام صاحب نے جس تفصیل کے ساتھ قدریہ کا رد کیا ہے، کسی اور کا نہیں کیا اور امام صاحب کے متبعین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ ہی امام صاحب کا مذہب ہے اور یہی حنفیہ کا بھی مذہب ہے۔ اب فروع میں امام صاحب کی طرف کوئی شخص معتزلہ کے بارے میں امام صاحب کی بابت ایسی کوئی حکایت نقل نہیں کرسکتا۔ بلکہ یہ معتزلہ اور قدریہ آئمہ احناف کے نزدیک ان کا قول مفتی بہ ہوتا ہے۔ مذموم، معیوب، بدعتی اور اہل زیغ وضلال ہیں۔ لہٰذا امام صاحب اس شخص کی تائید نہیں کرسکتے، جو یہ کہتا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے افعال کو پیدا نہیں کیا۔ مزید برآں امام موسیٰ بن جعفر متقدمین شیعہ اور دیگر علماء اہل بیت تقدیر کے قائل تھے۔ انکار تقدیر شیعہ میں اس وقت رائج ہوا جب وہ بنو بویہ [1] کے دور حکومت میں معتزلہ سے مل جل گئے، اس عقیدہ کا ان سے منقول ہونا ظاہر اور معروف ہے۔ جبکہ خود قدماء شیعہ قدر وصفات کے اثبات پر متفق تھے۔ بعد میں ان لوگوں میں قدریہ آ ملے تھے۔

شیعہ مصنف نے امام موسیٰ بن جعفر سے جو قول نقل کیا ہے اس کے بیان کرنے والے زیادہ تر منکرین تقدیر کے کم سن لوگ اور بچے ہیں، یہ نظریہ قدریہ کے آغاز ظہور اور امام موسیٰ کی ولادت سے بھی پہلے لوگوں میں معروف تھا، کیونکہ موسیٰ بن جعفر مدینہ میں ۱۲۸ھ یا ۱۲۹ھ میں دولت عباسیہ سے تقریباً تین برس پہلے پیدا ہوئے تھے اور انہوں نے بغداد میں ۱۸۳ھ میں وفات پائی تھی۔ ابوحاتم کہتے ہیں: موسیٰ بن جعفر ثقہ، صدوق اور ائمہ مسلمین میں سے ہیں اور قدریہ اس تاریخ سے قبل پیدا ہوئے ہیں۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ قدریہ نے اموی دور میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ کے عہد خلافت میں پر پرزے نکالنے شروع کیے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حکایت سراپا کذب ہے۔ کیونکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ جن سے ملے تھے وہ جعفر بن محمد رحمہ اللہ ہیں۔ رہے موسیٰ بن جعفر رحمہ اللہ تو وہ ان لوگوں میں سے نہ تھے کہ جن سے امام ابوحنیفہ سوال پوچھتے۔ اور نہ ان کے ساتھ کہیں جمع ہوئے۔ امام صاحب کے اقران ومعاصرین میں سے تو جعفر بن محمد رحمہ اللہ تھے اور ابوحنیفہ بایں علمی شہرت کے ان سے علم لینے والے نہ تھے تب پھر بھلا وہ موسیٰ بن جعفر سے کیونکر علم حاصل کرتے؟

پھر رافضی نے اس حکایت میں جو یہ قول نقل کیا ہے کہ ''اللہ اس بات سے کہیں زیادہ عدل والا ہے کہ وہ اپنے بندے پر ظلم کرے اور اس کے ناکردہ پر اس کا مؤاخذہ کرے۔'' کہ یہ قدریہ کے کلام کی اصل واساس ہے جسے عوام و خواص سب جانتے ہیں۔ یہ ان کے مذہب کی اساس اور ان کا شعار ہے۔ اسی لیے یہ لوگ خود کو ''عدلیہ'' بھی کہلاتے ہیں۔ لہٰذا اگر تو اس حکایت کی موسیٰ بن جعفر کی طرف نسبت درست ہے تو اس میں ان کی نہ کوئی فضیلت ہے اور نہ تعریف و مدح۔ جبکہ قدریہ کے بچے بھی اس کو جانتے ہیں۔ پھر اس وقت حال ہوگا جب یہ حکایت جھوٹی اور اختلافی ہو؟

---

[1] بنو بویہ نے ایران اور بلادِ مشرق کو تشیع کے جہنم میں جھونک دیا، یہ شیعہ کا پہلا دور تھا، دوسرے دور کا آغاز خدابندہ نامی سلطان کے عہد حکومت سے ہوتا ہے، اسی بادشاہ کے لیے اس شیعہ مصنف نے یہ کتاب تصنیف کی جس کی تردید کے لیے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کو قلم اٹھانا پڑا، شیعہ کا تیسرا دور ایران کے سلاطین صفویہ سے شروع ہوتا ہے۔

دوسرا جواب:......اس تقسیم کی بابتیہ ہے کہ یہ تقسیم حصری نہیں۔ کیونکہ قائل کا یہ قول کہ: "اَلْـمَـعْصِيَةُ مِمَّنْ" ایک مجمل ومبہم لفظ ہے جومحتاج تشریح ہے۔ ظاہر ہے کہ معصیت ہو یا طاعت وعبادت؛ وہ ایک عرض (وہ چیز جو اپنے وجود میں کسی دوسری چیز کی محتاج ہو) ہے جو قائم بالغیر ہے؛ اورضروری طور پر اپنے قیام میں کسی محل کی محتاج ہے؛ اور لامحالہ یہ بات بھی پوشیدہ نہیں کہ اس کا قیام بندے کے ساتھ ہے، اللہ کے ساتھ نہیں، اور جو چیز بھی اللہ کی پیدا کردہ ہے اس کے متعلق یہ کہنا درست ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے، بایں معنی کہ وہ اس کی پیدا کردہ ہے،مگر یہ الگ چیز ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ اللہ کے ساتھ قائم ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے موصوف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ﴾ (الجاثية : ۱۳)

"اور اس نے تمھاری خاطر جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنی طرف سے مسخر کر دیا۔"

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:﴿ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ﴾ (النحل : ۵۳)

"تمہارے پاس جو بھی نعمت ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔"

اب اگر چہ رب تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے، اسی نے خیر وشر کو پیدا کیا ہے اور اس میں اس اعتبار سے حکمت ہے کہ اس کا فعل حسن اور متقن ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍo﴾ (السجدة : ۷)

"جس نے اچھا بنایا ہر چیز کو جو اس نے پیدا کی اور انسان کی پیدائش تھوڑی سی مٹی سے شروع کی۔"

اور فرمایا:

﴿صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (النمل : ۸۸)

"اس اللہ کی کاری گری سے جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا۔"

اس لیے نرے شر کی اللہ کی طرف نسبت نہ کی جائے گی بلکہ یا تو اسے عموم میں داخل کر کے ذکر کریں گے یا سبب کی طرف مضاف کریں گے یا اس کے فاعل کو محذوف کر کے ذکر کریں گے۔ پہلی کی مثال: ارشاد ربانی ہے:

﴿اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (الزمر : ٦٢)

"اللہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے۔"

دوسری کی مثال:

﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِo مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَo﴾ (الفلق : ۱۔۲)

"تو کہہ میں مخلوق کے رب کی پناہ پکڑتا ہوں۔ اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی۔"

تیسری کی مثال وہ ہے جو جن کی حکایت کے تحت ہے۔ ارشاد ہے:

﴿وَاَنَّا لَا نَدْرِیْ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا٥﴾ (الجن: ۱۰)

’’اور یہ کہ بے شک ہم نہیں جانتے کیا ان لوگوں کے ساتھ جو زمین میں ہیں، کسی برائی کا ارادہ کیا گیا ہے، یا ان کے رب نے ان کے ساتھ کسی بھلائی کا ارادہ فرمایا ہے۔‘‘

اور سورۂ فاتحہ میں ارشاد ہے:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ٥ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ٥ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ٥﴾ (الفاتحة: ۵۔ ۷)

’’ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔ ان لوگوں کے راستے پر جن پر تو نے انعام کیا، جن پر نہ غصہ کیا گیا اور نہ وہ گمراہ ہیں۔‘‘

پس اللہ نے ذکر کیا ہے کہ وہ فاعل نعمت ہے جبکہ فاعل غضب کو حذف کر دیا اور ضلالت کو ان کی طرف منسوب فرمایا اور حضرت خلیل علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ٥﴾ (الشعراء: ۸۰)

’’اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔‘‘

اس لیے جملہ اسمائے حسنیٰ اللہ ہی کے ہیں۔ رب تعالیٰ نے اپنے وہ اسمائے حتیٰ رکھے ہیں جو سراسر خیر کو ہی مقتضی ہیں۔ اور شر کو صرف مفعولات میں ذکر کیا جائے گا۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ وَ اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ٥﴾ (المائدة: ۹۸)

’’جان لو! بیشک اللہ بہت سخت عذاب والا ہے اور بیشک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔‘‘

اور سورۂ انعام کے آخر میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ٥﴾ (الانعام: ۱۶۵)

’’بے شک تیرا رب بہت جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ بے حد بخشنے والا مہربان ہے۔‘‘

اور سورۂ اعراف میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِیْعُ الْعِقَابِ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ٥﴾ (الاعراف: ۱۶۷)

’’بے شک تیرا رب یقیناً بہت جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ بے حد بخشنے والا رحم والا ہے۔‘‘

اور فرمایا:

﴿نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ٥ وَ اَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ٥﴾ (الحجر: ۴۹۔ ۵۰)

’’میرے بندوں کو خبر دے دے کہ بے شک میں ہی بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہوں۔ اور یہ بھی کہ بے شک میرا عذاب ہی دردناک عذاب ہے۔‘‘

اور فرمایا:

﴿حٰمٓ o تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ o غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ (غافر: ۱۔ ۳)

''حٰمٓ۔اس کتاب کا اتارنا اللہ کی طرف سے ہے، جو سب پر غالب، ہر چیز کو جاننے والا ہے۔گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا، بہت سخت سزا والا، بڑے فضل والا، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔''

یہ اس لیے کہ وہ امور جن میں بعض بندوں کے اعتبار سے شر ہوتا ہے۔رب تعالیٰ کی ان کے پیدا کرنے میں ایک حکمت ہوتی ہے۔ وہ ان کو پیدا کر کے بھی حمید و مجید ہے اسی کی بادشاہی اور اسی کی تعریف ہے اور اس کی طرف نسبت کے اعتبار سے یہ امور شر نہیں ہیں اور نہ مذموم ہی ہیں۔ سو اس کی طرف ایسی کسی بات کی نسبت نہ کی جائے گی جو اس کی نقیض سمجھی جائے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ بیماریوں، تکلیفوں، ناگوار ہواؤں، بدبوؤں، بدصورتوں، خبیث اجسام وغیرہ کا خالق ہے جیسے سانپ، بچھو، غلاظتیں اور نجاستیں وغیرہ۔ کیونکہ اس کی اس میں زبردست حکمت ہے۔

پس جب یہ کہا جائے گا کہ یہ ناگوار ہوائیں اور گندگیاں اللہ کی طرف سے ہیں۔ وہ اس بات کا وہم ڈالتا ہے کہ شاید یہ ناگوار بدبوئیں اللہ سے نکلی ہیں۔ حالانکہ اللہ اس بات سے بری ہے۔اسی طرح جب یہ کہا جائے گا کہ قبائح یا معاصی اللہ کی طرف سے ہیں کہ اس سے کبھی اس بات کا وہم ہوتا ہے کہ یہ باتیں اللہ کی ذات سے نکلی ہیں جیسا کہ بندے کی ذات سے نکلتے ہیں جیسا کہ متکلم کی ذات سے کلام نکلتا ہے۔ حالانکہ اللہ کی ذات اس سے منزہ ہے۔ یا اس سے اس بات کا وہم ہوتا ہے کہ یہ گندی چیزیں اس سے قبیح اور بری ہیں۔ حالانکہ وہ اس سے بری ہے۔ بلکہ تفویض اور تعلیل دونوں اقوال کی رو سے رب تعالیٰ کی ہر آفرینش حسن ہی حسن ہے۔ اسی طرح ذوائقوں، رنگوں اور بوؤں کے بارے میں جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ میٹھا یا کڑوا ذائقہ اللہ کی طرف سے ہے یا اس بوٹی سے ہے۔ یا یہ اچھی یا بری بو اللہ کی طرف سے ہے یا فلاں عین سے ہے۔اس طرح کی اور بھی متعدد مثالیں ہیں اور کبھی جب یہ کہا جائے گا کہ:''یہ اللہ کی طرف سے ہے۔'' تو اس بات کا بھی وہم ہوتا ہے کہ شاید اللہ نے اس کا حکم دیا ہے۔ حالانکہ نہ تو فحش بات کا حکم دیتا ہے اور نہ فساد کو پسند کرتا ہے اور نہ ہی اپنے بندوں سے کفر پر راضی ہوتا ہے۔''

یہ حضرتِ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس قول کے مثل ہے جب ان سے مفوضہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:''میں ان کے بارے میں اپنی رائے سے کہوں گا۔ اگر تو یہ رائے درست ہوئی تو اللہ کی طرف سے ہوگی اور اگر یہ رائے خطا ہوگی تو میرے اور شیطان کی طرف سے ہوگی اور اللہ اور اس کا رسول دونوں اس سے بری ہوں گے۔''

اسی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی علامہ کے بارے میں کہا تھا اور ایسا ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی کہا تھا۔

ان لوگوں کی مراد یہ تھی کہ درستی کا کبھی رب تعالیٰ نے امر کیا ہوتا ہے، اور اسے مشروع کیا ہوتا ہے اور اسے پسند ہوتی ہے اور وہ اس سے راضی ہوتا ہے۔ جبکہ کا نہ تو اس نے امر دیا ہوتا ہے، نہ اسے محبوب ہوتی ہے اور نہ اس نے خطا کو مشروع

کیا ہوتا ہے۔ بلکہ یہ تزیینِ نفس اور تزیینِ شیطان سے ہوتی ہے جو بندہ شیطان کے امر سے کرتا ہے۔ یہی مطلب ہے اس بات کا کہ وہ مجھ سے اور شیطان سے ہوگی۔

تب بھی اس کے متعدد جوابات ہیں:

اوّل:...... یہ کہا جائے کہ اعمال، اقوال، طاعات اور معاصی سب بندے سے ہیں بایں معنی کہ وہ بندے کے ساتھ قائم ہیں اور اس کی قدرت و مشیئت سے حاصل ہیں۔ وہ ان سے متصف بھی ہے اور متحرک بھی، جن کا حکم اس کی طرف لوٹتا ہے۔ کیونکہ بسا اوقات محل کے ساتھ متصف شی کے بارے میں یہ بھی کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ اس محل سے نکلی ہے۔ چاہے اس کو اس کا اختیار نہ بھی ہو۔ جیسا کہ کہتے ہیں: یہ ہوا فلاں خطے کی ہے، یہ پھل فلاں درخت کا ہے، یہ غلہ فلاں کھیت کا ہے۔ تو جو کسی زندہ با اختیار سے صادر ہو، اسے بدرجہ اول یہ کہنا جائز ہوگا کہ یہ شی فلاں سے ہے اور وہ اللہ سے ہے، بایں معنی کہ اس نے اسے پیدا کیا ہے اس حال میں کہ وہ اس کے غیر سے قائم ہے اور اس نے ان چیزوں کو بندے کا عمل، کسب اور صفت ٹھہرایا ہے۔

اس نے ان کو اپنی مشیئت اور قدرت سے اس بات کے واسطے سے پیدا کیا ہے کہ اس نے بندے کی قدرت و مشیئت کو پیدا کیا جیسا کہ وہ مسببات کو ان کے اسباب کے ذریعے پیدا کرتا ہے۔ پس وہ بادلوں کو ہواؤں سے، اور بارش کو بادلوں سے اور نباتات کو بارش سے پیدا کرتا ہے۔

حوادث کی ان کے خالق کی طرف نسبت ایک اعتبار سے ہوتی ہے۔ جبکہ ان کے اسباب کی طرف نسبت ایک دوسرے اعتبار سے ہوتی ہے۔ پس یہ اللہ کی طرف سے اس اعتبار سے ہیں کہ یہ اللہ کی مخلوق ہیں جو اس کے غیر میں پیدا کی گئی ہیں۔ اور جیسا کہ مخلوقات کی جملہ حرکات و صفات اس سے ہیں جبکہ بندے اس کی صفتِ قائمہ ہونے کے اعتبار سے ہیں۔ جیسا کہ حرکت کا صدور اس متحرک سے ہوتا ہے جو اس حرکت سے متصف ہو۔ چاہے وہ جماد ہی ہو۔ پس اس وقت کیا ہوگا جب وہ متحرک حیوان ہو؟

تب بھی اضافت کی جہت کے مختلف ہونے کی وجہ سے بندے اور رب کے درمیان کوئی شرکت نہیں۔ جیسا کہ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ یہ فلاں عورت سے ہے تو یہ اس اعتبار سے ہے کہ اس عورت نے اسے جنا ہے اور یہ اللہ کی طرف سے ہے، تو یہ اس اعتبار سے ہے کہ اسے اللہ نے پیدا کیا ہے۔ کہ دونوں نسبتوں میں کوئی تناقض نہیں۔ لہٰذا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ پھل درخت کا ہے اور یہ غلہ کھیت کا ہے تو یہ بایں معنی ہوتا ہے کہ ان کا اس میں حدوث ہوا ہے اور یہ اللہ کی طرف سے ہے بایں معنی ہوتا ہے کہ اس نے اس پھل اور کھیتی کو پیدا کیا ہے۔ کہ ان دونوں باتوں میں کوئی تناقض نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَo﴾ (الطور: ۳۵)

''یا وہ کسی چیز کے بغیر ہی پیدا ہوگئے ہیں، یا وہ (خود) پیدا کرنے والے ہیں؟''

اس کی مشہور تفسیر "ام خلقو من غیر رب" ہے۔ جبکہ ایک تفسیر "ام خلقوا من غیر عنصر" بھی ہے۔ اس طرح موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں جب ایک قبطی مارا گیا تو انہوں نے یہ کہا تھا:

﴿هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ﴾ (القصص: ۱۵)

"کہا یہ شیطان کے کام سے ہے۔"

اور فرمایا:

﴿مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَ مَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ﴾ (النسآء: ۷۹)

"جو بھلائی تجھے پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی تجھے پہنچے وہ تیرے نفس کی طرف سے۔"

اسی کے ساتھ اس سے قبل یہ ارشاد بھی پڑھیے:

﴿قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ (النسآء: ۷۸)

"کہہ دے سب اللہ کی طرف سے ہے۔"

سو یہاں پر حسنات و سیئات سے مراد نعمتیں اور مصائب ہیں۔ اسی لیے فرمایا: "مَآ اَصَابَكَ" اور یہ نہیں فرمایا کہ "ما اصبت" جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَ اِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا﴾ (آل عمران: ۱۲۰)

"اگر تمھیں کوئی بھلائی پہنچے تو انھیں بری لگتی ہے اور اگر تمھیں کوئی تکلیف پہنچے تو اس پر خوش ہوتے ہیں۔"

اور فرمان الٰہی ہے:

﴿اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَ اِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَ يَتَوَلَّوْا وَّ هُمْ فَرِحُوْنَ﴾ (التوبة: ۵۰)

"اگر تجھے کوئی بھلائی پہنچے تو انھیں بری لگتی ہے اور اگر تجھے کوئی مصیبت پہنچے تو کہتے ہیں ہم نے تو پہلے ہی اپنا بچاؤ کر لیا تھا اور اس حال میں پھرتے ہیں کہ وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔"

رب تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ نعمتیں اور مصائب اس کی طرف سے ہیں۔ پس نعمت تو ابتداء سے ہی اللہ کی طرف سے ہے جبکہ مصیبت نفس انسانی سے کسی سبب سے ہوتی ہے اور وہ اس کے گناہ ہیں۔ جیسا کہ ایک دوسری آیت ارشاد ہے:

﴿وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْ عَنْ كَثِيْرٍ﴾ (الشوریٰ: ۳۰)

"اور جو بھی تمھیں کوئی مصیبت پہنچی تو وہ اس کی وجہ سے ہے جو تمھارے ہاتھوں نے کمایا اور وہ بہت سی چیزوں سے درگزر کر جاتا ہے۔"

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿اَوَ لَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ﴾

(آل عمران: ۱٦٥)

''اور کیا جب تمھیں ایک مصیبت پہنچی کہ یقیناً اس سے دگنی تم پہنچا چکے تھے تو تم نے کہا یہ کیسے ہوا؟ کہہ دے یہ تمھاری اپنی طرف سے ہے۔''

وہ اس لیے کہ وہ محسنِ عدل ہے۔ اس سے ملنے والی ہر نعمت اس کا فضل ہے اور اس کی ہر نعمت اس کا عدل ہے اور وہ بندے پر اس کی طرف سے بنا کسی سبب کے فضل و احسان کر کے محسن ہے۔ جبکہ بدون گناہ کے وہ عقاب نہیں کرتا۔ اگر چہ اس نے ان سب افعال کو اپنی حکمت کے تحت پیدا کیا ہے۔ بے شک وہ حکیم عادل ہے۔ اشیاء کو ان کے مواقع پر رکھتا ہے اور کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

پھر جب غیر خدا اپنے نوکر کو اس کی زیادتی پر سزا دے سکتا ہے، چاہے وہ اس بات کا مقر بھی ہو کہ بندوں کے افعال کا خالق اللہ ہے اور یہ اس کی طرف سے ظلم بھی نہیں مقصود ہوتا۔ تو رب تعالیٰ اس بات کا بدرجہ اولیٰ مستحق ہے کہ گناہ پر سزا دینے میں وہ ظالم نہ ہو۔ تو جب انسان ایک مقتضائے حکمت مصلحت کو کر سکتا ہے جو کسی حیوان کو تعذیب دیے بغیر حاصل نہ ہوتی ہو (جیسے جانور کو گوشت کھانے کے لیے ذبح کرنا) اور وہ ایسا کر کے بھی ظالم نہ کہلائے تو ایسی تعذیب رب تعالیٰ سے بدرجہ اولیٰ ظلم نہ ہوگی۔

دوم:...... یہ کہا جائے کہ یہ افعال اللہ کی طرف سے بایں معنی ہیں کہ اس نے ان کو اپنے غیر میں پیدا کیا ہے اور انہیں اپنے غیر کا فعل قرار دیا ہے اور یہ بندے کی طرف سے بایں معنی ہیں کہ یہ اس کا فعل، اس کی ذات کے ساتھ قائم اور اس کا کسب ہیں جن کے ذریعے وہ جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کا کام لیتا ہے اور بندے کا یہ اعتبار کہ وہ فعل اس کے ساتھ قائم ہے۔ اور اس کے ضرر و انتفاع کا حکم خاص اسی کی طرف لوٹتا ہے کہ یہ ایسا اعتبار ہے جو اللہ کے شایانِ شان نہیں۔ کیونکہ بندوں کے افعال رب تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم نہیں ہوتے اور نہ وہ ان افعال سے متصف ہوتا ہے اور نہ ان کے وہ احکام ہی اس کی طرف لوٹتے ہیں جو اپنے موصوفات کی طرف لوٹتے ہیں۔

رب تعالیٰ کا یہ اعتبار کہ اس نے ان افعال کو پیدا کیا اور ان کو اپنے غیر کا، ان میں قدرت، مشیئت اور فعل کو پیدا کر کے، فعل بنایا ہے، ایسا اعتبار ہے جو بندہ کے لائق نہیں کہ ان باتوں پر سوائے اللہ کے کسی کو قدرت نہیں۔ اس لیے اکثر مثبتین قدر کا قول ہے کہ: بندے کے افعال رب تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور بندے کا فعل ہیں۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ کا فعل ہیں تو مراد اللہ کا مفعول ہونا ہوتا ہے۔ نا یہ کہ یہ وہ فعل ہے جو مصدر کا مسمی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خلق اور مخلوق میں فرق کرتے ہیں۔ یہ اکثر ائمہ کا قول ہے اور یہ قاضی ابو یعلی کے دو اقوال میں سے آخری قول ہے اور یہی امام احمد کے اکثر اصحاب کا قول ہے اور یہی قاضی ابو یعلی کے دو بیٹوں قاضی ابو حازم اور قاضی ابو الحسین وغیرہ کا قول ہے۔

سوم :......قائل کا قول کہ: ''اللہ اس بات سے کہیں زیادہ عادل ہے کہ وہ اپنے بندے پر ظلم کرے اور اس کا نا کردہ فعل پر مؤاخذہ کرے۔'' سو ہم اس کے موجب کا قول کرتے ہیں کہ نہ تو اللہ نے اپنے بندے پر ظلم کیا ہے اور نہ کسی نا کردہ فعل پر اس کی گرفت کی ہے۔ سوائے اس فعل کے جو بندہ اپنے اختیار اور قوت کے ساتھ کرتا ہے نا کہ اس پر جو دوسری مخلوق نے کیا ہے۔

رہا رب تعالیٰ کا ہر شی کا خالق ہونا تو یہ بندے کے ظلم پر ملوم (ملامت زدہ) ہونے کو مانع نہیں۔ جیسا کہ دوسری مخلوقات اس کے ظلم و عدوان پر اسے ملامت کرتی ہیں۔ حالانکہ وہ اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ رب تعالیٰ بندے کے افعال کا خالق ہے۔

اب جمہور امتیں تقدیر کا اقرار کرتی ہیں۔ اور مانتی ہیں کہ اللہ ہر شی کا خالق ہے اور اس کے باوجود وہ ظالموں کی مذمت بھی کرتی ہیں اور ان کے ظلم و عدوان کو دفع کرنے کے لیے ان پر عقاب بھی کرتی ہیں۔ جیسا کہ وہ اس بات کا بھی اعتقاد رکھتے ہیں اللہ مضر حیوانات و نباتات کا بھی خالق ہے اور وہ اس اقرار کے ہوتے ہوئے بھی ان نباتات وغیرہ کے ضرر و شر کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پھر سب کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ کاذب و ظالم اپنے ظلم و کذب کی وجہ سے مذموم ہے اور یہ اس میں ایک برا وصف ہے اور یہ کہ ظلم و کذب سے متصف نفس خبیث اور ظالم ہوتا ہے جو کسی ایسے اکرام کا مستحق نہیں ہوتا جو اہل صدق و عدل کے مناسب ہو۔ اگرچہ وہ اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ یہ سب مخلوق ہے۔

لوگ اس فطرت پر پیدا نہیں کیے گئے کہ وہ ظالم کے ظلم کا مقابلہ اس پر ظلم کر کے کریں۔ چاہے وہ تقدیر کے مقر بھی ہیں تب پھر اللہ بدرجہ اولیٰ اس بات کا مستحق ہے کہ ظلم کی اس کی طرف نسبت نہ کی جائے۔ یہ اہل سنت میں سے اہل حکمت وتعلیل کا طریق ہے۔ جبکہ اہل مشیئت وتفویض کے طریق پر ظلم اس کی ذات سے بالذات ممتنع ہے۔ کیونکہ ظلم یہ غیر کی ملک میں تصرف کا یا اپنی ملک سے تجاوز کرنے کا نام ہے اور رب تعالیٰ کے حق میں یہ دونوں باتیں ہی ممتنع ہیں۔

غرض رب تعالیٰ ہر حال میں اپنی ذات وصفات اور افعال میں اپنی مخلوق کے ہرگز بھی مماثل نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لیے تو مثل اعلیٰ ہے۔ لہٰذا جو کمال بھی غیر اللہ کے حق میں ثابت ہے، وہ اس کے حق میں بدرجہ اولیٰ ثابت ہے۔ اور مخلوق جس نقص سے منزہ ہے، وہ اس نقص وعیب سے بدرجہ اولیٰ منزہ ہے اور ایک قادر وغنی کے جو بھی مناسب ہے رب تعالیٰ بدرجہ اولیٰ مستحق ہے کہ وہ اس کے مناسب ہو۔ اور یہ بات نہیں ہے کہ جو بھی اس ذات سے قبیح ہو جو اس کے حق میں مضر ہو، وہ اس سے قبیح بھی ہو۔ کیونکہ بندے نہ تو اس حد کو پہنچ سکے ہیں کہ اسے ضرور پہنچا سکیں اور نہ اس حد تک جا سکے ہیں کہ اسے نفع پہنچا سکیں۔

چھارم :...... یہ کہا جائے کہ مسلمانوں میں اس بات میں کوئی نزاع نہیں ہے کہ اللہ عادل ہے اور ظالم نہیں اور یہ کہ ہر وہ چیز جو بندے سے ظلم ہو، ضروری نہیں کہ وہ اللہ سے بھی ظلم ہو اور نہ یہ کہ جو بات بندوں سے قبیح ہو وہ رب تعالیٰ سے

بھی قبیح ہو۔ کیونکہ اس کے مثل جیسی کوئی چیز نہیں نہ ذات میں نہ صفات میں اور نہ افعال میں۔

اس کی تحقیق یہ ہے کہ اگر بات یوں ہی ہوتی جیسا کہ یہ قدریہ کہتے ہیں تو لازم آتا کہ اس سے متعدد قبیح امور بھی صادر ہوں جن کو اس نے کیا ہو۔ کیونکہ اب بندہ بھی جب دوسرے کو کسی ایسے امر کا حکم دیتا ہے جس سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ پھر وہ اس پر سزا کی دھمکی بھی دیتا ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ مامور یہ امر بجا نہ لائے گا اور نافرمانی کرے گا اور مستحق عقاب ہوگا۔ تو یہ اس سے عبث اور قبیح ہوگا کیونکہ اس میں مامور اور آمر دونوں کا کوئی فائدہ نہیں۔

اسی طرح اگر وہ یہ کہے کہ میری مراد مامور کی مصلحت ہے، حالانکہ وہ جانتا ہے کہ اس پر مامور کی کوئی مصلحت مرتب نہیں ہوتی۔ بلکہ اس میں اس کا مفسدہ ہے۔ تو بھی یہ اس سے قبیح ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی کسی مراد کے لیے ایک فعل کرتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ یہ مراد حاصل نہ ہوگی تو ایسا فعل بھی اس سے قبیح ہوگا۔

یہ قدریہ کہتے ہیں کہ اللہ نے کفار کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ انہیں فائدہ دے اور ان کا اکرام کرے اور انہیں پیدا کر کے یہ جانتے ہوئے بھی امر دیا کہ یہ امر ان کے حق میں کسی نفع وضرر کو نہیں رکھتا۔ اسی طرح ایک بندہ جب یہ دیکھتا ہے اس کے غلام یا باندیاں زنا میں لگے ہیں اور ظلم کے رسیا ہیں اور وہ انہیں روک بھی سکتا ہے پھر بھی انہیں نہیں روکتا۔ تو وہ مذموم اور گنہگار اور برا ہوگا حالانکہ اللہ مذموم و مسیئی ہونے سے منزہ ہے۔

یہ قدری کہتا ہے کہ اللہ نے انہیں پیدا کرنے سے اس بات کا ارادہ کیا ہے کہ وہ اس کی اطاعت کریں اور یہ انہیں ثواب دے۔ پس اللہ نے انہیں نفع کے لیے پیدا کیا ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ نفع نہ اٹھائیں گے۔ حالانکہ یہ بات معلوم ہے کہ ایسی بات خلق سے قبیح ہے اور خالق سے قبیح نہیں ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ جب مخلوق اپنے غلاموں کو قبائح سے روکنے پر قادر ہو، تو اس کا انہیں روکنا یہ اس بات سے بہتر ہے کہ وہ انہیں ثواب پر پیش کرے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ انہیں صرف عقاب ہی حاصل ہوگا۔ جیسے وہ شخص جو اپنے بیٹے یا غلام کو نفع کے حصول کے لیے مال دے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ اس مال سے صرف زہر خرید کر ہی کھائیں گے۔ تو اس کے انہیں مال نہ دینا اس بات سے بہتر ہے کہ وہ انہیں مال دے۔ حالانکہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ یہ اس مال سے صرف ضرر ہی اٹھائیں گے۔

اسی طرح اگر کوئی دوسرے کو کفار سے قتال کرنے کے لیے تلوار دے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ یہ اس تلوار سے صرف پیغمبروں اور مومنوں سے ہی لڑے گا۔ تو اس کا انہیں تلوار دینا اس سے قبیح ہوگا اور اس نے یہ کہا کہ میرا قصداً اسے ثواب پر پیش کرنا تھا اور اللہ سے یہ قبیح نہیں ہے۔

سوان قدریہ کے نزدیک بندے کی قدرت کا یہ حال ہے اور افعال سے تشبیہ دینے والے قدریہ رب تعالیٰ کے افعال کو اس کی مخلوق کے افعال سے تشبیہ دیتے ہیں اور ان پر قیاس کرتے ہیں اور اس کے عدل کو بندوں کے عدل پر قیاس کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ بدترین فاسد قیاس ہے۔

پنجم :...... یہ کہا جائے کہ معصیت بندے سے ہے جیسا کہ طاعت بھی اسی سے ہوتی ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ

جب بندے سے طاعت ہونا بایں معنی ہے کہ بندے نے اپنی قدرت ومشیئت سے یہ طاعت بجالائی ہے۔تو یہ بات ممتنع نہ ہوگی اللہ نے اسے اپنی قدرت ومشیئت کے ساتھ طاعت کا فاعل بنایا ہے۔ بلکہ عقل وشرع دونوں اس پر دلالت کرتے ہیں۔جیسا کہ حضرت خلیل علیہ السلام کا ارشاد ہے:

﴿رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوةِ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ﴾ (ابراھیم: ٤٠)

''اے میرے رب! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی۔''

اور فرمایا:

﴿وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا﴾ (السجدة: ٢٤)

''اور ہم نے ان میں سے کئی پیشوا بنائے، جو ہمارے حکم سے ہدایت دیتے تھے۔''

اس لیے بھی کہ بندے کا فاعل ہونا بعد اس بات کے کہ وہ فاعل نہ تھا کہ یہ ایک امر حادث ہے اور امرِ حادث کے لیے ایک محدث کا ہونا لازم ہے اور بندے حق میں یہ بات ممتنع ہے کہ وہ اپنے فاعل ہونے کا فاعل بھی وہ خود ہو۔ کیونکہ اس کا فاعل ہونا اگر تو اس کے نفس فاعل ہونے سے حادث ہوا ہے تو لازم آئے گا کہ ایک چیز بغیر پیدا کرنے والے کے از خود پیدا ہوگئی ہو اور یہ بات ممتنع ہے۔اور اگر وہ کسی دوسری فاعلیت کی بنا پر فاعل ہوا ہے؛ پھر اگر تو یہ دوسری فاعلیت پہلی فاعلیت سے پیدا ہوئی ہے تو اس سے دورِ قبلی لازم آئے گا اور اگر یہ پہلی فاعلیت کے بغیر حادث ہوا ہے تو امور متناہیہ میں تسلسل لازم آئے گا اور یہ دونوں باتیں ہی باطل ہیں۔پس معلوم ہوا کہ بندے سے ایسی طاعت ومعصیت کا ہونا کہ جس سے وہ مدح وذکر اور ثواب وعقاب کی مستحق ٹھہرے، یہ اس بات کو مانع نہیں کہ وہ ہر بات رب تعالیٰ کا محتاج ہو اور کسی با بھی اس سے بے نیاز نہ ہو اور یہ کہ اس کے جملہ امور کا خالق اللہ ہو اور یہ کہ بندے کے حوادث وممکنات میں سے نفس افعال اللہ کی قدرت ومشیئت کی طرف منسوب ہوں۔

فصل:......کافر کا کفر اور اہل سنت پر الزام کا ردّ

[اہل سنت کے تقدیر کے بارے میں عقیدہ پر رافضی کا کلام کہ کافر کفر کر کے بھی رب تعالیٰ کا مطیع وفرمانبردار ہے کیونکہ وہ رب تعالیٰ کی مراد کو بجالایا ہے]۔

[اعتراض] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:''اہلِ سنت کے افکار وآراء سے لازم آتا ہے کہ: کافر اپنے کفر کے باوصف اطاعت شعار ہو اس لیے کہ اس نے جو کچھ بھی کیا ہے، اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے مطابق کیا ہے۔کیونکہ رب تعالیٰ نے اس سے کفر کا ارادہ کیا اور وہ کفر کر رہا ہے اور وہ اس ایمان کو نہیں لایا جو رب تعالیٰ کو اس سے ناپسند ہے۔سو اس نے رب تعالیٰ کی طاعت کی ہے اور اسے ایمان لانے کو کہہ کر نبی نافرمان ٹھہرے گا کیونکہ نبی اسے اس ایمان لانے کو کہہ رہا ہے جو اللہ کو اس کافر سے پسند نہیں اور اس کو اس کفر سے روک رہا ہے جو اللہ اس کافر سے چاہتا ہے۔'' [انتہی کلام الرافضی]۔

[جواب]:اس کا جواب کئی طرح سے دیا جا سکتا ہے:

پہلی وجہ:......شیعہ مصنف کا یہ خیال اس امر پر مبنی ہے کہ آیا اطاعت اللہ تعالیٰ امر کے مطابق ہے یا ارادہ کے؟ نیز یہ کہ کیا امر ارادہ کو مستلزم ہے یا نہیں؟اس میں بحث بہت مشہور ہے۔اس قدری نے اپنے قول کی صحت ذکر نہیں کی؛ اور نہ اپنے مخالفین کے قول کا فساد بیان کیا ہے۔ بلکہ اس نے صرف دعویٰ کر دیا ہے جو اس بات پر مبنی ہے کہ طاعت ارادہ کے موافق ہوتی ہے۔سو جب اس کے مخالفین نے اسے یہ کہا کہ ہم تمہارے اس دعویٰ کو تسلیم نہیں کرتے تو قدری کے پاس دلیل نہ ہونے کی وجہ سے منازعین کی اتنی ہی بات اس کے دعویٰ کے رد کے لیے کافی ٹھہری۔

دوسری وجہ:......ان کا استدلال اس بات سے ہے کہ امر ارادہ کو مستلزم نہیں کیونکہ اللہ بندوں کے افعال کا خالق ہے ۔ہم قبل ازیں یہ حقیقت واضح کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کو اپنے ارادہ سے پیدا کرتا ہے ۔ اس نے کفر و عصیان اور فسق کا حکم نہیں دیا۔تو معلوم ہوا کہ بعض اوقات وہ ایسی چیز کو پیدا کرتا ہے،جس کا وہ حکم نہیں دیتا،یہ بات کتاب و سنت اور علماء کے اجماع سے ثابت ہے۔اگر کوئی شخص حلف اٹھا کر یہ کہے کہ کل وہ اس کا حق ادا کر دے گا،ان شاء اللہ۔کل کا روز گزر جائے اور وہ قدرت کے باوجود اس کی تعمیل سے قاصر رہے تو وہ حانث نہیں ہوگا۔اور اگر ان شاء اللہ کے الفاظ میں مشیت کا لفظ امر کے معنی میں ہوتا تو وہ حانث ٹھہرتا، کیونکہ وہ اس کا مامور ہوتا۔علیٰ ہذا القیاس جب کسی فعل مامور پر حلف اٹھا کر اسے مشیت باری تعالیٰ سے معلق کر دیا جائے تو قسم اٹھانے والا اس میں حانث نہیں ہوتا۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا﴾ (یونس: ۹۹)

''اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو کرۂ ارضی پر بسنے والے سب ایمان لے آتے۔''

حالانکہ اس نے بندوں کو ایمان لانے کا حکم بھی کیا ہے۔سو معلوم ہوا کہ اس نے بندوں کو ایمان لانے کا حکم تو دیا ہے لیکن اس کو چاہا نہیں۔[اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ امر اور مشیت میں فرق ہے]۔دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿ وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا﴾ (الانعام: ۱۲۵)

''اور جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے،اس کے سینہ کو تنگ کر دیتا ہے۔''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ گمراہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے،مگر گمراہ ہونے کا حکم نہیں دیتا۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

''رب تعالیٰ کو تمہارے لیے تین باتیں ناپسند ہیں: (۱) قیل وقال (۲) کثرت سوال (۳) اور اضاعت مال۔'' [1]

امت اس بات پر متفق ہے کہ رب تعالیٰ منہیات کو ناپسند فرماتا ہے،تاکہ مامورات کو،اور یہ کہ وہ مقسطین، محسنین اور صابرین کو محبوب رکھتا ہے۔ وہ توابین اور متطہرین سے محبت کرتا ہے۔مومنوں اور نیک اعمال والوں سے راضی ہے اور یہ کہ وہ کافرین سے غصہ ہے اور ان پر غضب ناک ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

[1] صحیح البخاری، کتاب الزکاۃ، باب قول اللّٰہ تعالیٰ: لا یسئلون الناس الحاف.

''اللہ سے بڑھ کر کسی کو مدح محبوب نہیں اور اللہ سے بڑھ کر کسی کو عذر پیش کرنا محبوب نہیں۔''

اور فرمایا: ''اللہ سے بڑھ کر کوئی اس بات میں غیرت مند نہیں کہ اس کا بندہ زنا کرے یا اس کی بندی زنا کرے۔''❶

اور فرمایا: ''اللہ وتر ہے اور وتر کو پسند کرتا ہے۔''❷

اور فرمایا: ''اللہ جمال والا ہے اور جمال کو پسند فرماتا ہے۔''❸

فرمایا: اللہ کو یہ بات محبوب ہے کہ اس کی رخصتوں پر عمل کیا جائے جیسا کہ اسے یہ بات ناپسند ہے کہ اس کی نافرمانی کی جائے۔''❹

فرمایا: ''بے شک اللہ کو متقی، غنی اور گم نام بندہ پسند ہے۔''

فرمایا: ''اللہ کو تمہارے لیے تین باتیں محبوب ہیں: (۱) تم اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ (۲) اور تم سب اس کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔ (۳) اور یہ کہ اللہ نے جس کو تمہارا والی امر بنایا ہے اس کے ساتھ خیر خواہی کرو۔''❺

فرمایا: ''رب تعالیٰ کو اپنے مومن بندے کے توبہ کرنے پر اس آدمی سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے جس کی سواری ایک ویران اور ہلاکت آفرین میدان میں گم ہوگئی ہو جس پر اس کے کھانے پینے کا سامان لدا ہوا تھا اور اسے ڈھونڈنے کے باوجود بھی وہ سواری نہ ملی تھی اور اب وہ موت کے انتظار میں لیٹ گیا۔ پھر جب وہ بیدار ہوا تو اچانک اس کی وہ سواری اس کے سامنے تھی۔ پس اللہ اپنے بندے کے توبہ کرنے پر اس کے بندے پر اپنی سواری ملنے پر خوش ہونے سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے۔''

یہ حدیث صحاح میں متعدد طرق سے مروی ہے اور یہ نبی کریم ﷺ سے مستفیض ہے اور اس کی صحت و ثبوت متفق علیہ ہے۔❻

غرض اس جیسی متعدد احادیث میں تب پھر رب تعالیٰ بندوں سے طاعات کو اس ارادہ کے ساتھ چاہا ہے جو طاعات بجالانے پر اس کی محبت و رضا کو متضمن ہے۔ چاہے وہ ان کو بجا نہ بھی لائے اور اسے کفر و فسق وغیرہ بندے سے ناپسند ہے

---

❶ صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب الغیرة.

❷ ایسے الفاظ متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔ اور یہ الفاظ صحیح مسلم: ۲۰۶۲، ۲۰۶۳ کے ہیں۔ دیکھیں: کتاب الذکر والدعاء، باب فی اسماء اللّٰہ تعالیٰ.

❸ صحیح مسلم: ۱۹۳۔ کتاب الایمان، باب تحریم الکبرء بیانہ۔ یہ حدیث مختلف الفاظ کے ساتھ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔

❹ مسند احمد: ۸/ ۱۷۰۔ عن ابن عمر رضی اللہ عنہ، ط: المعارف.

❺ اس کی تخریج گزر چکی ہے۔

❻ صحیح البخاری: ۸/ ۶۸۔ کتاب الدعوات، باب التوبة عن عبداللّٰہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ بالفاظ مختلفة۔

اگر چہ اس نے ان کو ایک حکمت کے تحت پیدا بھی کیا ہے جو ان کی پیدائش کو مقتضی تھی اور جب اس نے کفر وغیرہ کو بندے نے ناپسند کیا کیونکہ یہ بندے کے لیے مضر ہے اور اللہ اسے ناپسند فرماتا ہے کہ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسے ان کا پیدا کرنا بھی ناپسند ہے۔ کیونکہ ان میں اس کی حکمت ہے۔ کیونکہ ایک فعل کبھی ایک سے اچھا تو دوسرے سے برا ہوتا ہے۔ کیونکہ دونوں فاعلوں کا حال جدا جدا ہوتا ہے۔

تب پھر یہ لازم کیسے آ گیا کہ ایک فعل جو بندے سے قبیح ہو وہ رب تعالیٰ سے بھی قبیح ہوگا۔ حالانکہ مخلوق کو اللہ سے کوئی نسبت بھی نہیں اور جب مخلوق بھی بسا اوقات ایک ایسی بات کا ارادہ کر لیتی ہے جو اسے ناگوار ہوتا ہے۔ جیسے مریض کا ایسی دوا پینے کا ارادہ کرنا جو اسے ناگوار ہو۔ اور کبھی انسان ایسی بات بھی پسند کرتا ہے جس کا وہ ارادہ نہیں کرتا۔ جیسے مریض کا ایسے کھانے کو پسند کرتا جو اس کے حق میں مضر ہو۔ اور جیسے روزہ دار کا کھانے اور پینے کو پسند کرتا حالانکہ وہ ان کا ارادہ نہیں رکھتا اور بندے کا شہوتوں کو پسند کرنا حالانکہ وہ اپنے عقل و دین دونوں کے اعتبار سے ان کو ناپسند کرتا ہے۔

پس جب ایک بغیر دوسرے کا ثبوت معقول ہے اور یہ کہ مخلوقات میں ایک دوسرے کو مستلزم نہیں۔ تو بھلا ایک کا ثبوت دوسرے کے بغیر حق تعالیٰ کے حق میں کیونکر ناممکن ہے۔

کبھی یہ کہتے ہیں کہ یہ سب امور مراد اور محبوب ہیں۔ لیکن ان میں مراد لنفسہ ہوتا ہے۔ یہ مراد بالذات ہے اور اللہ کو محبوب اور پسند ہوتا ہے اور کوئی ان میں سے مراد الغیر ہوتا ہے اور وہ مراد بالعرض ہوتا ہے کیونکہ وہ محبوب بالذات اور مراد بالذات تک وسیلہ ہوتا ہے۔

پس انسان عافیت کو بنفسہ چاہتا ہے اور دوا پینے کو اس تک وسیلہ کے اعتبار سے چاہتا ہے۔ البتہ بنفسہ محبوب ہونے کی وجہ سے نہیں چاہتا۔ تو جب مراد کی دو قسمیں ہیں: (۱) ایک مراد لنفسہ، یہ بالذات محبوب ہے۔ (۲) اور مراد لغیرہ، یہ غیر تک وسیلہ کے لیے مراد ہے۔ گو کبھی محبوب لنفسہ نہ بھی ہو۔ تو پھر اس باب میں محبت اور ارادہ میں فرق کرنا ممکن ٹھہرا۔

ارادہ کی دو قسمیں ہیں۔ جو چیز محبوب ہو، وہ مراد لنفسہ ہوتی ہے اور جو فی نفسہ محبوب نہ ہو وہ مراد لغیرہ ہوتی ہے اور اسی تقسیم پر اس مسئلہ کی بنیاد ہے کہ رب تعالیٰ کا خود اپنے محبت کرنا اور رب تعالیٰ کا اپنے بندوں کے لیے محبت کرنا۔ سو جن کے نزدیک محبت و رضا ارادہ عامہ ہے، ان کا قول ہے کہ حقیقت میں رب تعالیٰ محبت نہیں کرتا اور وہ رب تعالیٰ کے اپنے بندوں سے محبت کرنے کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ وہ انہیں ثواب دے گا اور بندوں کا رب تعالیٰ سے محبت کرنا یہ اس کی طاعت کرنے کا ارادہ کرنا ہے اور اس کا تقرب تلاش کرنا ہے۔

ان میں سے اکثر جماعتوں کا یہ قول ہے کہ وہ خود محبوب اور مستحق محبت ہے۔ البتہ اس کا دوسرے سے محبت کرنا یہ مشیئت کے معنی میں ہے۔

رہے اسلاف، حدیث و تصوف کے ائمہ اور اکثر اہل کلام و نظر تو وہ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ رب تعالیٰ محبوب لذاتہ ہے بلکہ صرف وہی محبوب لذاتہ کہلانے کا حق دار ہے اور یہ الوہیت کی حقیقت ہے اور یہی ملت ابراہیم کی حقیقت

ہے۔اور جواس بات کا اقرار نہیں کرتے ، وہ ربوبیت اور الٰہیت میں فرق نہیں کرتے اور وہ رب تعالیٰ کو معبود لذاتہ قرار نہیں دیتے اور نہ وہ اس کی طرف دیکھنے سے تلذذ کو ثابت کرتے ہیں اور نہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ اللہ اہل جنت کے نزدیک جنت کی ہر چیز سے زیادہ محبوب ہوگا۔

درحقیقت یہ ان لوگوں کا قول ہے جو ملت ابراہیم سے خارج اور اللہ کے اس کے ماسوا سے معبود ہونے کے منکر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب اوائل اسلام میں یہ قول ظاہر ہوا تو اس کے قائل کو قتل کر دیا گیا۔ یہ جعد بن درہم تھا جسے خالد بن عبداللہ قسری نے عیدالاضحیٰ کے دن عیدگاہ میں علماء کی مرضی کے عین مطابق ذبح کر دیا تھا اور یہ کہا کہ: اے اہل اسلام! اپنی قربانیاں کرو۔ اللہ تمہاری قربانیاں قبول کرے اور میں جعد بن درہم کو قربان کر رہا ہوں۔ کیونکہ جعد کا گمان ہے کہ اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل نہیں بنایا اور نہ موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا۔ اللہ جعد کی ان باتوں سے بے حد بلند و برتر ہے۔ پھر منبر سے اتر کر جعد کو ذبح کر دیا۔

ایک صحیح حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''جب جنت والے جنت میں داخل ہو چکیں گے تو ایک منادی یہ نداء کرے گا۔ اے جنت والو! اللہ کے ہاں تمہارے لیے ایک وعدہ ہے وہ اس وعدہ کو تم لوگوں کے ساتھ پورا کرنا چاہتا ہے۔'' وہ پوچھیں گے: وہ وعدہ کیا ہے؟ کیا اس نے ہمارے چہرے سفید (روشن) نہیں کر دیے اور ہماری تولیں بھاری نہیں کر دیں اور ہمیں جنت میں داخل کر کے جہنم سے بچا نہیں لیا؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''پس رب تعالیٰ حجاب کو کھول دیں گے اور اہل جنت اسے دیکھیں گے۔ پس رب تعالیٰ انہیں اپنی زیارت سے زیادہ محبوب کوئی شی نہ دے گا اور یہی ''زیادتی'' ہے (جس کا قرآن میں تذکرہ ہے)۔ [1]

سنن میں متعدد طرق سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعا میں یہ ارشاد فرمایا کرتے تھے: ''اور میں تجھ سے تیرے چہرے کی طرف دیکھنے کی لذت کا اور تیری ملاقات کے شوق کا سوال کرتا ہوں۔''

امام احمد اور امام نسائی نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعا میں یہ ارشاد فرمایا کرتے تھے: ''میں تجھ سے تیرے چہرے کی طرف دیکھنے کی لذت کا اور تیری ملاقات کے شوق کا سوال کرتا ہوں جو کسی ضرر رساں مضرت کے اور گمراہ کن فتنہ سے خالی ہو۔'' [2]

جو لوگ اس کے محبوب ہونے کو اور اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ اس کی غیر سے محبت اس کی مشیئت کے معنی میں

[1] صحیح مسلم: ۱/ ۱۶۳۔ کتاب الایمان: باب اثبات رؤیة المومنین فی الآخرة ربهم سبحانه وتعالیٰ.

[2] یہ دو طویل احادیث کا جز ہے۔ پہلا حدیث سنن النسائی: ۳/ ۴۶ ، ۴۷۔ کتاب السهو باب الدعاء بعد الذکر میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ جبکہ دوسری حدیث الفاظ کے اختلاف کے ساتھ پہلی حدیث کے معنی میں ہے جو ''مسند احمد: ۵/ ۱۹۱ ، ط ، حلبی۔ میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

ہے۔ سو ان لوگوں کا یہ گمان ہے کہ اس نے جو بھی پیدا کیا ہے، وہ اسے محبوب ہے۔ یہ لوگ بسا اوقات اباحیت کی طرف نکل جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسے کفر، فسوق اور عصیان محبوب ہے اور وہ اس پر راضی ہے اور عارف جب اس مقام کا مشاہدہ کر لیتا ہے تو اس کی قیومیت عامہ کے اور اس بات کے مشاہدہ کی وجہ سے کہ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے، اس کے نزدیک کوئی شی اچھی یا بری نہیں رہتی۔ صوفیہ اور اہل فکر و نظر کے بے شمار شیوخ اس مغالطہ کا شکار ہوئے ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک عظیم غلطی ہے۔

کتاب و سنت اور اسلافِ امت کا اتفاق بتلاتا ہے کہ رب تعالیٰ کو اس کے انبیاء و اولیاء بے حد محبوب ہیں۔ اسے اپنا امر بھی محبوب ہے اور وہ شیاطین کو اور منہی عنہ کو ناپسند کرتا ہے۔ اگرچہ یہ سب کچھ اس کی مشیئت سے ہے۔ جنید بن محمد اور اس کے اصحاب کی جماعت کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف ہوا تھا۔ تو جنید نے انہیں دوسرے فرق کی طرف دعوت دی۔ وہ یہ اس کی مخلوقات میں اور اس کی محبوب اور غیر محبوب چیزوں میں فرق کریں۔ لیکن انہیں اس میں اِشکال ہو، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ہر مخلوق اس کی مشیئت سے ہے۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کی مشیئت سے پیدا ہونے والی مخلوق میں اس کی محبوب مخلوق بھی ہے اور غیر محبوب بھی۔ سو جنید کی بات درست تھی۔

پانچویں وجہ:...... یہ کہا جائے گا کہ ارادہ کی دو قسمیں ہیں: (۱) ایک بمعنی مشیئت ہے اور یہ فاعل کا فعل کا ارادہ کرنا ہے یہ ارادہ فعل سے متعلق ہے۔ (۲) اور دوسرا یہ کہ وہ غیر سے اس بات کا ارادہ کر لے کہ وہ ایک فعل کرے یہ غیر کے فعل کا ارادہ کرنا ہے۔

لوگوں میں یہ دونوں معانی ہی معقول ہیں۔ لیکن جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ امر یہ ارادہ کو متضمن نہیں۔ وہ ارادہ کی صرف پہلی نوع کو ہی ثابت کرتے ہیں اور جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ افعالِ عباد کا خالق نہیں، وہ صرف دوسرے ارادہ کو ثابت کرتے ہیں۔

ان قدریہ کے نزدیک پہلے معنی میں رب تعالیٰ کا افعالِ عباد کا خالق ہونا ممتنع ہے۔ کیونکہ اس نے ان کو ان کے نزدیک پیدا ہی نہیں کیا اور ان کے بالمقابل دوسرے، ان کے نزدیک رب تعالیٰ کا ارادہ بایں معنی ممتنع ہے کہ وہ ارادہ خالق ہے اور جس کے پیدا کرنے کا اس نے ارادہ نہیں کیا اس کی بابت یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس کا ارادہ کرنے والا ہے۔ ان کے نزدیک وہ ہر مخلوق کا ارادہ کرنے والا ہے۔ چاہے وہ کفر ہی ہو اور اس نے جس کو پیدا نہیں کیا، اس کا اس نے ارادہ بھی نہیں کیا چاہے وہ ایمان ہی ہو۔

اگرچہ یہ لوگ حق کے زیادہ قریب ہیں۔ لیکن تحقیقی بات یہ ہے کہ دونوں قسم کا ارادہ ثابت ہے۔ جیسا کہ آئمہ اسلاف نے اس کو ثابت بھی کیا ہے۔ جیسا کہ جعفر نے کہا: ''اس نے ان کا ارادہ بھی کیا اور ان سے ارادہ بھی کیا۔'' اب ایک دوسرے کی خیر خواہی کا ارادہ کر کے اسے امر و نہی کرتا ہے اور اس کی نافع شی کو بیان کرتا ہے۔ چاہے اس کے ساتھ اس نے اس فعل پر اس کی اعانت کا ارادہ نہ بھی کیا ہو۔ کیونکہ دوسرے کو کسی بات کے امر و نصیحت کرنے میں مصلحت ہونے سے

ضروری نہیں کہ اس پر اس کی معاونت میں بھی مصلحت ہو۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ مصلحت اس امر ونصیحت کی ضد میں ہو۔

جیسے اگر ایک آدمی دوسرے سے ایک عورت کو پیغام نکاح بھیجنے کا مشورہ لے اور وہ دوسرا اسے اس عورت سے نکاح کر لینے کو کہے کیونکہ اس مشورہ لینے والے کی مصلحت اسی میں تھی۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ خود مشورہ دینے والے کی مصلحت اس میں ہو کہ اس عورت سے شادی وہ خود کر لے نا کہ کوئی دوسرا۔ لہٰذا دوسرے کی خیر خواہی کے اعتبار اسے مشورہ دینا اور بات ہے اور خود اپنے لیے کوئی فعل کرنا دوسری بات ہے۔

تو جب مخلوق کے حق میں یہ فرق ممکن ہے تو خالق کے حق میں تو بدرجہ اولیٰ ممکن ہے۔ وہ خالق و مالک مخلوق کو رسولوں کی زبانی ان کی نافع باتیں بیان کرنا ہے اور انہیں ضرر رساں باتوں سے روکنا ہے۔ پھر ان میں سے کسی کے فعل کے خلق کا تو وہ ارادہ کرتا ہے اور اسے اس فعل کا فاعل بناتا ہے اور کسی کے فعل کے خلق کا ارادہ نہیں کرتا۔ سو رب تعالیٰ کا مخلوق کے افعال کے خلق کا اور دوسری مخلوقات کے خلق کا ارادہ کرنا اور بات ہے، اور اس کا بندوں کو اس اعتبار سے امر کرنا اور بات ہے کہ وہ ان کی مصلحت یا مفسدہ کو بیان کرے۔ رب تعالیٰ نے جب فرعون اور ابولہب کو ایمان لے آنے کا حکم دیا تھا تو انہیں ان کی اس مصلحت اور منفعت کو بیان کر دیا جو امتثالِ امر میں موجود تھی اور انہیں امر دیتے ہوئے یہ ضروری نہ تھا کہ وہ ان کی اعانت بھی فرماتا۔ بلکہ بسا اوقات ان کے لیے اس فعل کے پیدا کرنے میں اور اس پر ان کی اعانت میں اس اعتبار سے مفسدہ ہوتا ہے کہ یہ اس کا فعل ہو۔ کیونکہ وہ جو بھی پیدا کرتا ہے کسی حکمت سے پیدا کرتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ جب فعل مامور بہ کے بجا لانے میں مامور کی مصلحت ہو تو اس مامور کے فعل بجا لانے میں آمر کی بھی مصلحت ہو یا وہ مامور کو اس کا فاعل بنائے۔ لہٰذا کہاں خلق کا پہلو اور کہاں امر کا پہلو۔

یہ قدریہ دوسرے کو کسی بات کا امر دینے والے کے لیے ایک مثال بیان کرتے ہیں کہ مامور جس فعل کے زیادہ قریب ہو اس کا کرنا لازم ہے۔ جیسے چہرے کی تر و تازگی، اور بیٹھنے کی جگہیں تیار کرنا وغیرہ۔

ان لوگوں کو اس کا جواب دو طرح سے دیا جائے گا:

۱۔ ایک یہ کہ آمر [حکم چلانے والے] نے دوسرے کو ایسی مصلحت کا حکم دیا ہو جو اس کی طرف لوٹتی ہو، جیسے بادشاہ کا فوج کو ایسی بات کا حکم دینا جس سے اس کا ملک مضبوط ہوتا ہے اور آقا کا غلام کو ایسی بات کا حکم دینا جس سے اس کے مال کی درستی ہوتی ہو اور آدمی کا اپنے شریک کو ایسی بات کا حکم دینا جس سے ان کے مشترکہ مفاد کی درستی ہوتی ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

۲۔ دوسرا یہ کہ آمر مامور کی اعانت میں اس کی مصلحت دیکھے۔ جیسے امر بالمعروف کہ جب آمر برّ و تقویٰ میں مامور کی اعانت کر لے۔ کیونکہ یہ بات معلوم ہے کہ اللہ اسے طاعت پر معاونت میں اجر دے گا اور یہ کہ بندہ جب تک اپنے بھائی کی اعانت میں رہتا ہے اللہ اس کی اعانت میں رہتا ہے۔

غرض جب فرض کیا گیا کہ آمر مامور کو اس کی مصلحت کے لیے امر دیتا ہے۔ نا کہ اپنے کسی نفع کے لیے جو مامور کے

کرنے سے اسے پہنچتا ہو، جیسے ناصح میشر۔ اور فرض کیا کہ جب وہ مامور کی اعانت کرے گا تو اس میں اس کی کوئی مصلحت نہیں۔ کیونکہ مامور کی مصلحت کے حصول میں آمر کی مضرت ہوتی ہو۔ جیسے کوئی مظلوم کو ظالم سے بھاگ جانے کو کہے کہ اگر وہ اس میں مظلوم کی اعانت کرتا ہے تو اس میں دونوں کی یا کسی ایک مضرت ہے۔ جیسے وہ شخص جو بستی کے پرلے کنارے سے دوڑتا ہوا موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تھا اور یہ کہا تھا کہ:

﴿اِنَّ الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِیَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّیْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِیْنَ۝﴾ (القصص : ۲۰)

''بے شک سردار تیرے بارے میں مشورہ کر رہے ہیں کہ تجھے قتل کر دیں، پس نکل جا، یقیناً میں تیرے لیے خیر خواہوں سے ہوں۔''

یہاں اس کی مصلحت صرف اسی میں تھی کہ وہ جنابِ موسیٰ علیہ السلام کو بھاگ جانے کا ہی مشورہ اور امر دے نا کہ بھاگنے میں ان کی اعانت بھی کرے۔ کیونکہ اعانت میں اس کی قوم اسے نقصان پہنچاتی۔

اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔ جیسے آدمی کسی کو اس عورت سے نکاح کرنے کا کہے جس سے وہ خود نکاح کرنا چاہتا ہے۔ یا اسے وہ سامان خریدنے کو کہے جو وہ خود خریدنا چاہتا ہے، یا اسے وہ مکان کرایہ پر لینے کو کہے جسے وہ خود کرائے پر لینا چاہتا ہے۔ یا اسے ایسی قوم سے صلح کرنے کو کہے جس سے مامور کو نفع پہنچے حالانکہ وہ قوم آمر کی دشمن ہو اور صلح کرنے کے بعد وہ اور زیادہ قوی ہو جاتی ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ کہ یہ وہ مثالیں ہیں جن میں آمر مامور کی معاونت نہیں کرتا، گو اس بات کے امر میں وہ مامور کے حق میں ناصح ہو اور اس امر کا ارادہ کرنے والا بھی ہو۔

غرض مامور کو ایک ایسے فعل کا امر کرنا جس کی مصلحت اسی کی طرف راجع ہو، یہ آمر کے اس کی اس مامور کو بجا لانے پر معاونت کرنے کے علاوہ ایک بات ہے۔ چاہے وہ مامور کی اعانت کر بھی سکتا ہو۔

پس جب یہ کہا جائے گا کہ رب تعالیٰ نے بندوں کو ان افعال کا امر دیا ہے جن میں ان کی مصلحت ہے اور ان کی مصلحت کا اس نے ارادہ بھی کیا، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا وہ مامور بہ میں ان کی معاونت بھی کرے گا۔ بالخصوص قدریہ کے نزدیک، وہ اس بات کی قدرت نہیں رکھتا کہ وہ کسی کی ایسی اعانت کرے جس سے وہ فاعل بن جائے۔ کیونکہ اگرچہ اس کے افعال معلل بالحکمت نہیں لیکن وہ ایک مراد کی دوسری مراد سے تمیز کے بغیر جو چاہے کرتا ہے۔ اس توجیہ کی بنا پر کسی فعل کی لمیت ہونا ممتنع ہے چہ جائیکہ وہ فرق کو طلب کرے۔

اگر اس کے افعال کو معلل بالحکمت کہا جائے اور یہ کہا جائے کہ لمیت نفس الامر میں ثابت ہے۔ چاہے ہم نہیں بھی جانتے۔ تو بھی یہ لازم نہیں آتا کہ جب نفس الامر میں امر میں حکمت ہو تو مامور بہ کی اعانت میں بھی حکمت ہوگی۔ بلکہ بسا اوقات حکمت اس بات کو مقتضی ہوتی ہے کہ مامور بہ میں اعانت نہ کی جائے۔ کیونکہ جب مخلوق میں یہ بات ممکن ہے کہ حکمت و مصلحت کا مقتضی یہ ہو کہ آدمی غیر کو ایک ایسی بات کا امر دے جس میں اس کی مصلحت ہو جبکہ آمر کی حکمت و مصلحت اسی میں ہو کہ وہ اس کی اس امر میں اعانت نہ کرے، تو رب تعالیٰ کے حق میں اس بات کا امکان بدرجہ اولیٰ ہوگا۔

سو رب تعالیٰ کفار کو ایک بات کا حکم دیتا ہے جسے کے بجالانے میں ان کی مصلحت ہوتی ہے۔ لیکن وہ اس امر میں ان کی معاونت نہیں کرتا اور نہ اس کو پیدا فرماتا ہے۔ جیسا کہ اس نے متعدد ایسے امور کو پیدا نہیں کیا کہ حکمت و مصلحت کا کمال ان کے پیدا نہ کرنے میں ہی تھا۔

جب مخلوق یہ دیکھتی ہے کہ رعایا کے ایک فرد کی مصلحت اس میں ہے کہ وہ تیر اندازی اور اسباب مملکت کو سیکھے تا کہ ملک کو حاصل کر کے جبکہ خود اپنے بچے مصلحت وہ اس میں دیکھتا ہے کہ وہ شخص قوی نہ بنے کہ مبادا اس کے بچے سے اس کا ملک چھین لے۔ یا اس پر چڑھ دوڑے۔ تو ہوسکتا ہے کہ وہ اس شخص کو تو وہ حکم دے جس میں اس کی مصلحت ہو، جبکہ خود وہ کرے جس میں اس کی اولاد اور رعایا کی مصلحت ہو۔

غرض مصالح و مفاسد نفوس کے مناسب و منافی ہوا کرتے ہیں۔ پس مامور کے مناسب وہ ہے جس کا اس کے ناصح نے اسے حکم دیا ہے اور آمر کے مناسب یہ ہے کہ اس مامور کو اس کی مراد حاصل نہ ہو۔ کیونکہ اس میں آمر کے مصالح اور مرادات کی تفویت ہوتی ہے۔

یہ نہایت عمدہ نکتہ ہے جسے وہی ثابت کرتا ہے جو رب تعالیٰ کے خلق و امر میں اس کی حکمت کو جانتا ہو اور وہ رب تعالیٰ کو بعض امور کے ساتھ محبت و فرح کے ساتھ متصف کرتا ہو، اور یہ کہ کبھی محبوب کا حصول ممکن نہیں ہوتا۔ مگر جبکہ جب اس کی ضد کو دفع کرے اور اس کے لازم کو موجود کرے۔ کیونکہ اجتماعِ ضدین متمنع ہے اور ملزوم کا وجود لازم کے وجود کے بغیر متمنع ہے۔

اسی لیے رب تعالیٰ ہر حال میں محمود ہے، اسی کی بادشاہی ہے، اسی کی تعریف ہے دنیا میں بھی، اور آخرت میں بھی۔ حکم اسی کا ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

سو جو بھی موجود ہے، وہ اللہ اس پر محمود ہے اور وہ چیز جو معلوم اور مذکور ہے وہ اس پر محمود ہے اور وہ اپنی ذات میں اپنے جن اسماء و صفات کے ساتھ متصف ہے، اس پر اس کی حمد ہے اور اس کی حمد ہے اس کے خلق و امر پر۔ وہ اپنی ہر آفرینش پر محمود ہے چاہے اس میں بعض لوگوں کے لیے ایک نوع کا ضرر ہو۔ کیونکہ اس میں اس کی حکمت ہے اور وہ اپنے ہر امر میں محمود ہے، کیونکہ اس میں ہدایت اور بیان ہے۔ اسی لیے اس کی حمد ہے آسمانوں بھر، اور زمینوں بھر اور درمیان کی سب فضاؤں میں اور اس کے بعد جو اس نے چاہا، اس کے بقدر۔ کہ یہ سب اس کی مخلوق ہے اور اس کے بعد وہ جو بھی چاہے گا وہ اس کی مخلوق ہوگی اور وہ اپنی ہر آفرینش پر محمود ہے۔

اب مخلوق میں ذکر کی گئی گذشتہ مثالیں اگرچہ ان کی نظیر رب کے حق میں نہیں ذکر کی جاتی۔ لیکن یہاں یہ مقصود ہے کہ حکیم مخلوق میں یہ بات ممکن ہے کہ وہ غیر کو ایک بات کا امر کر کے خود اس پر اعانت نہ کرے۔ تو خالق و مالک اپنی حکمت کے اس بات کا زیادہ مستحق ہے سو جس کو اس نے امر دیا اور فعل مامور میں اس کی اعانت بھی کی۔ تو اس مامور بہ سے اس کی خلق اور امر متعلق ہو گیا اور اس نے اس کی آفرینش اور محبت کو چاہا۔ سو وہ جہت خلق اور جہت امر دونوں اعتبار سے مراد ہوا

اور جس کی اس نے فعل مامور میں اعانت نہیں کی، تو اس مامور کے ساتھ اس کا امر تو متعلق ہوا لیکن اس کی آفرینش متعلق نہ ہوئی کیونکہ وہ حکمت معدوم تھی جو خلق کے اس سے متعلق ہونے کو مقتضی تھی اور وہ حکمت حاصل تھی جو اس کی ضد کے خلق سے متعلق تھی۔

دو ضدین میں سے ایک کا خلق دوسری ضد کے منافی ہے۔ کیونکہ بندے میں اس بیماری کا پیدا کرنا جس سے اس میں اپنے رب کے آگے ذلت و زاری، گریہ و دعا، توبہ و انابت پیدا ہوتی ہو، گناہوں کی تکفیر ہوتی ہو، دل مرجائے،؟؟ اکڑ نکل جائے، سرکشی و فعلی جاتی رہے ک یہ اس صحت کے خلق کے منافی ہیں جس کے ہوتے ہوئے یہ مصالح و منافع حاصل نہیں ہو سکتے۔

اسی طرح ظالم کے ظلم کو پیدا کرنے سے مظلوم میں وہی صفات پیدا ہوتی ہوں جو مرض کی وجہ سے پیدا ہوتی ہوں یہ اس عدل کو پیدا کرنے کے منافی ہیں جس کے ذریعے یہ مصالح و منافع حاصل نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ اس کی مصلحت اس میں ہو کہ عدل ہو۔

بندوں کی عقلیں اس بات کے سمجھنے سے قاصر و درماندہ ہیں کہ انہیں رب تعالیٰ کے خلق و امر کی حکمتیں معلوم ہوں ان قدریہ نے فاسدہ طریقہ سے تعلیل کے میدان میں قدم رکھا اور اس باب میں انہوں نے رب تعالیٰ کو اس کی خلق سے تشبیہ و تمثیل دے ڈالی اور وہ حکمت ثابت نہ کی جو اس کی طرف لوٹتی ہے۔ ان لوگوں نے رب تعالیٰ کی صفاتِ کمال جیسے حکمت و قدرت اور محبت وغیرہ رب تعالیٰ کے حق میں سلب مان لیا۔ پھر ان کے مد مقابل جھمیہ جبریہ وہ طریق اپنایا کہ انہوں نے نفس الامر حکمت و تعلیل کو ہی باطل کہہ ڈالا۔ جیسا کہ انہوں نے حسن و قبیح کے مسئلہ میں نزاع کیا کہ ان لوگوں سے اس کو اس طریق سے ثابت کیا کہ اس میں اللہ اور مخلوق کو ایک صف میں کھڑا کر دیا اور ایسا حسن و قبیح ثابت کیا جو محبوب و مکروہ کو متضمن نہیں۔ بے شک یہ قول بے حقیقت ہے۔ جیسا کہ انہوں نے اس تعلیل کو ثابت کیا جس کا حکم فاعل کی طرف سے لوٹتا۔

تو ان کے مقابلوں نے جملہ افعال ایک کر دیے اور انہوں نے اللہ کے لیے نہ مکروہ ثابت کیا اور نہ محبوب۔ ان کا گمان ہے کہ اگر تو حسن فعل کی صفتِ ذاتیہ ہے تو اس کا حال مختلف نہیں۔ لیکن یہ ان کی خطا ہے۔ کیونکہ موصوف کی صفتِ ذاتیہ سے کبھی اس کا لازم مراد ہوتا ہے۔ یہ منطقی لازم کو ذاتی اور عرضی میں تقسیم کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ تقسیم غلط ہے۔ اور کبھی صفتِ ذاتیہ سے مراد وہ صفت ہوتی ہے جو ثبوتی اور موصوف کے ساتھ قائم ہوتا کہ امورِ نسبتیہ اضافیہ سے احتراز ہو جائے۔

اس باب میں یہ لوگ احکام شرعیہ میں شدید اضطراب کا شکار ہو گئے۔ سو حسن و قبیح عقلیہ کے نفاۃ کا گمان یہ ہے کہ یہ نہ تو افعال کی صفتِ ثبوتیہ ہے اور افعال کی صفتِ ثبوتیہ کو مستلزم ہے۔ بلکہ یہ صفاتِ نسبتیہ اضافیہ میں سے ہے۔ سو حسن کے بارے میں صرف یہ کہا جائے گا کہ اسے کر لے۔ یا یہ کہ اس کے کرنے میں کوئی حرج نہیں اور قبیح کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ اسے مت کر۔

ان لوگوں کا کہنا ہے کہ قول سے متعلق قول کی کوئی صفتِ ثبوتیہ نہیں اور یہ لوگوں اپنے منازعین کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ ان کا قول ہے کہ: احکام یہ افعال کی صفتِ ذاتیہ ہیں۔ لیکن انہوں نے اس کی نقیض یہ پیش کی ہے ک جنس کے ایک ہونے کے باوجود احکام میں تغیر تبدل ہوسکتا ہے۔

اس کی تحقیق یہ ہے کہ افعال کے احکام صفاتِ لازمہ میں سے نہیں ہیں۔ بلکہ یہ افعال کی صفتِ عارضہ ہیں۔ جو ان ی مناسبت اور منافرت کے اعتبار سے ہیں۔ لہٰذا حسن اور قبیح اس اعتبار سے ہوگا کہ ایک شی محبوب یا مکروہ، نافع یا ضار، یا مناسب اور غیر مناسب ہو، اور یہ موصوف کی صفتِ ثبوتیہ ہے۔ لیکن اس میں شی کے احوال کے تنوع سے تنوع آتا ہے۔ البتہ یہ اسے لازم نہیں۔

جس نے یہ کہا ہے کہ افعال میں ایسی کوئی صفت نہیں ہوتی جو حسن وقبیح کو مقتضی ہو۔ تو یہ اس کے اس قول کے بمنزلہ ہے کہ اجسام میں ایسی کوئی صفات نہیں جو تسخین (گرم کرنا) اور تبرید (ٹھنڈا کرنا) کو اور اِشباعِ (پیٹ بھرنا) اور رواء (پیاس بجھانا) کو مقتضی ہو۔ پس اعیان کی ان صفات کا سلب جو آثار کو مقتضی ہوں، یہ افعال کو ان صفات کے سلب کے جیس اہے جو آثار کو مقتضی ہوں۔

البتہ اعیان کی صفات اور طبائع و آثار کو ثابت کرنے والے جمہور مسلمان ہیں۔ اسی طرح وہ اشیاء میں حسن وقبیح کو بھی ثابت کرتے ہیں۔ جو ان کی مناسبت اور منافرت کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىِٕثَ﴾ (الاعراف: ۱۵۷)

''جو انھیں نیکی کا حکم دیتا اور انھیں برائی سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا اور ان پر ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے۔''

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ فعل فی نفسہ معروف بھی ہوتا ہے اور منکر بھی اور مطعوم طیب بھی ہوتا ہے اور خبیث بھی اور اگر اعیان میں اور افعال میں کوئی صفت نہیں ہوتی مگر جب امر ونہی اس کے متعلق ہو۔ تو پھر اس آیت کی تقدیری عبارت یوں ہوتی: ''وہ انہیں امر دیتا ان باتوں کا جن کا وہ حکم دیتا ہے اور انہیں ان باتوں سے روکتا ہے جن سے روکتا ہے اور ان کے لیے وہ حلال کرتا ہے جو ان کے لیے حلال کرتا ہے اور ان پر وہ حرام کرتا ہے جو ان پر حرام کرتا ہے۔ حالانکہ رب تعالیٰ ایسے کلام سے منزہ اور پاک ہے اسی طرح ارشاد ہے:

﴿وَ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤی اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَ سَآءَ سَبِیْلًا﴾ (الاسراء: ۳۲)

''اور زنا کے قریب نہ جاؤ، بے شک وہ ہمیشہ سے بڑی بے حیائی ہے اور برا راستہ ہے۔''

اور فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ﴾ (الاعراف: ۲۸)

''بے شک اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔''

اوراس کی نظائر وامثال بے شمار ہیں۔

فصل:......اہل سنت پر اللہ کی طرف سفاہت کے انتساب کا الزام اوراس پر ردّ

اہل سنت کے قدر کے بارے میں مقابلہ پر رافضی کا یہ قول کہ: ''رب تعالیٰ کی طرف سفاہت کی نسبت جائز ہے کیونکہ وہ کافروں کوایمان لانے کا امر تو دیتا ہے پر ان سے ایمان لانے کا ارادہ نہیں کرتا۔''

[شبہ] رافضی امامی کہتا ہے: اور ایک بات یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی طرف سفاہت کی نسبت لازم آتی ہے۔ کیونکہ وہ کافر کو ایمان لانے کا امر دیتا ہے۔ حالانکہ اس سے اس کا ارادہ نہیں کرتا اور اسے معصیت سے روکتا ہے جبکہ اس سے معصیت کے ارتکاب کا ارادہ کرتا ہے اور ہر وہ عاقل جو ایسی بات کا حکم دے جس کا اس نے ارادہ نہ کیا اور ایسی بات سے روکے جس کا اس نے ارادہ کیا ہو کہ اس کی طرف سفاہت کی نسبت جائز ہے۔ حالانکہ رب تعالیٰ سے منزہ و بلند ہے۔

[جواب] :اس رافضی کو یہ جواب دیا جائے گا کہ گزشتہ میں محققین اہل سنت والجماعت کا یہ قول گزر چکا ہے کہ ارادہ کی دو قسمیں ہیں: (۱) ایک ارادۂ خلق (۲) اور دوسری ارادۂ امر۔ سو امر کا ارادہ یہ مامور سے مامور بہ فعل کا ارادہ ہے اور خلق کا ارادہ، یہ ان افعالِ عباد کے پیدا کرنے کا ارادہ ہے جن کو وہ بندے سے پیدا کرتا ہے اور امر یہ پہلے ارادہ کو مستلزم ہے نا کہ دوسرے کو۔

رب تعالیٰ نے کافر کو اس بات کا حکم دیا ہے جس کا اس نے اس سے اس اعتبار سے ارادہ کیا ہے اور وہ اسے محبوب اور پسند ہے اور اسے اس معصیت سے روکتا ہے جس کا اس نے بندے سے ارادہ نہیں کیا۔ یعنی اس اعتبار سے وہ اسے محبوب اور پسند نہیں ؛ یعنی رب تعالیٰ کو بندے سے کفر محبوب اور پسند نہیں اور نہ فساد ہی محبوب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِذْ یُبَیِّتُوْنَ مَا لَا یَرْضٰی مِنَ الْقَوْلِ﴾ (النسآء: ۱۰۸)

''جب وہ رات کو اس بات کا مشورہ کرتے ہیں جسے وہ پسند نہیں کرتا۔''

ارادۂ خلق یہ وہ مشیئت ہے جو مراد کی وقوع کو مستلزم ہے۔ یہ ہے وہ ارادہ جو وجود سے متعلق ہوتا ہے سو جو رب نے چاہا وہ ہوا اور جو نہ چاہا وہ نہ ہوا اور یہ کہ وہ بندے سے اس بات کا ارادہ کرے کہ وہ خود فعل کرے کہ یہ لا محالہ ہو کر رہے گا کیونکہ وہ اپنی مراد پر قادر ہے۔ سو جب ارادہ اور قدرت دونوں جمع ہو جاتے ہیں تو مراد کا وجود واجب ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ وہ بندے سے اس بات کا ارادہ کرے کہ وہ اپنے لیے کوئی فعل انجام دے ؛ ان دونوں باتوں میں فرق ہے کیونکہ اس دوسرے ارادے میں یہ لازم نہیں کہ وہ بندے کی اس پر اعانت بھی کرے۔

رہی قائلین تقدیر کی ایک جماعت جن کا یہ گمان ہے کہ ارادہ کی صرف ایک قسم ہوتی ہے اور وہ ہے مشیئت۔ سو ان کا کہنا ہے کہ وہ اس بات کا بھی حکم دیتا ہے جس کا ارادہ نہیں کرتا۔

پھر یہ لوگ دو قسم پر ہیں: ایک وہ لوگ ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ وہ اس بات کا حکم دیتا ہے جو اسے محبوب اور پسند ہو،

چاہے اس نے اس کا ارادہ نہ بھی کیا ہو، یعنی اس کے وجود کو نہ چاہا ہو۔ یہ جمہور فقہاء کا قول ہے۔

دوسرے وہ لوگ ہیں جن کا قول ہے کہ محبت اور رضا ہی ارادہ ہے اور وہی مشیئت ہے۔ سو وہ ایسی بات کا بھی حکم دیتا ہے جس کا اس نے ارادہ نہیں کیا اور نہ اسے وہ محبوب اور پسند ہے۔ ان کے نزدیک کفر وفسق اور معصیت کا ارتکاب اسے محبوب اور پسند ہے۔ جیسا کہ اس نے اس کا ارادہ کیا اور اسے چاہا۔ ان کا کہنا ہے کہ: اللہ تعالیٰ کو کفر باعتبار دین ہونے کے محبوب اور پسند نہیں۔ جیسا کہ اس نے کفر کے دین ہونے کا نہ ارادہ کیا اور نہ اسے چاہا؛ اور نہ ہی یہ اسے اس سے بڑھ کر محبوب اور پسند ہے؛ جس سے اس کا وقوع نہیں ہوا۔ جیسا کہ اس سے ارادہ نہیں کیا جس سے اس کا وقوع نہیں ہوا اور نہ اس سے چاہا ہے جس سے اس کا وقوع نہیں ہوا۔ یہ اشعری اور اس کے اکثر اصحاب کا قول ہے۔ جسے خود اشعری نے اہل اثبات کی ایک جماعت سے حکایت کیا ہے اور اشعری سے پہلے قول جیسا قول بھی حکایت کیا گیا ہے۔ اس قول والے معتزلہ اور شیعہ وغیرہ قدریہ ہیں۔ جو رضا اور محبت کو ارادہ کے معنی میں قرار دیتے ہیں۔ پھر یہ منکرین تقدیر کہتے ہیں: اس بات پر نص اور فقہاء کا اجماع ہے کہ اس نے کفر، فسق اور معاصی کو نہ پسند کیا ہے اور نہ ہی اسے محبوب ہیں۔ نہ اس نے ان کا ارادہ کیا ہے اور نہ چاہا ہے۔

قائلین تقدیر کہتے ہیں: اس بات پر نص اور جماع ہے کہ اس نے ان کو چاہا ہے۔ لہٰذا یہ اسے محبوب اور پسند ہے اور اس نے اس کا ارادہ کیا ہے۔ البتہ جمہور مشیئت وارادہ میں اور محبت ورضا میں فرق کرتے ہیں۔ جیسا کہ خود لوگوں میں ان دونوں باتوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ جیسے آدمی بسا اوقات ایسی کڑوی دوا بھی پی جاتا ہے جس کا پینا اسے غیر محبوب اور مبغوض ہوتا ہے اور ان اشیاء کا کھانا اسے محبوب ہوتا ہے جن کی اسے اشتہاء ہوتی ہے۔ جیسے مریض کا ممنوع اشتہاء کے کھانے کی اشتہاء، اور روزہ دار کی بھوک اور پیاس کے وقت ٹھنڈے پانی اور گرم کھانے کی خواہش؛ حالانکہ وہ ایسا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ سو ظاہر ہو گیا کہ بسا اوقات انسان اس چیز کو محبوب رکھتا جس کا اس نے ارادہ نہیں کیا ہوتا اور ایسی چیز کا ارادہ بھی کرتا ہے جو اسے محبوب نہیں ہوتی۔ وہ یہ کہ کبھی مراد دوسرے کے لیے ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ ناگوار اشیاء کا اس لیے ارادہ کرتا ہے کہ ان میں انجام کار اشیاء محبوبہ ومرغوبہ ہوتی ہیں۔ اور بسا اوقات اپنے محبوب فعل کو بھی ناپسند کرتا ہے کیونکہ اس کا انجام ناگواری پر ہوتا ہے۔

رب تعالیٰ کی اپنی ہر آفرینش میں حکمت ہے۔ وہ متقین، محسنین، توابین سے محبت کرتا ہے، ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے اور بندے کی توبہ پر اس شخص سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جو ایک بے آب وگیاہ وادی میں اپنے کھانے پینے کے سامنے سے لدے اونٹ کو گم کر بیٹھے؛ اور وہ اب مایوس ہو کر موت کی تیاری میں ہو کہ اچانک اسے وہ گم شدہ اونٹ مل جائے۔ جیسا کہ متعدد صحیح احادیث میں یہ مضمون آیا ہے۔ فرمان نبوی ہے:

''یقیناً اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی ایک کی توبہ پر اس آدمی سے بھی زیادہ خوش ہوتے ہیں جس نے صحرا میں اپنی سواری کھو دی؛ اس پر اس کا کھانا پینا بھی ہو۔ وہ اسے تلاش کے باوجود نہ پائے تو وہ موت کے انتظار لیٹ

گیا۔ پس جب وہ بیدار ہوا تو اس کی سواری اس کے پاس کھڑی تھی؛ وراس پر اس کا کھانا پینا بھی تھا۔ پس اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ پر اس انسان کی سواری مل جانے کی خوشی سے بڑھ کر خوش ہوتے ہیں۔'' [اس کی تخریج گزر چکی ہے]

اب یہ فلاسفہ فرح و محبت کی تعبیر، سرور، لذت اور عشق سے کرتے ہیں۔ اب اگر یہ بات ہے تو رب تعالیٰ بعض اشیاء کے وجود کو اس لیے چاہتا ہے کہ وہ اس کی محبت و رضا تک پہنچاتی ہیں اور بسا اوقات رب تعالیٰ کسی محبوب کو اس لیے نہیں کرتا کہ وہ کسی مبغوض و مکروہ کے وجود کو مستلزم ہوتی ہے۔ سو رب تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ ہر نطفہ سے مراد پیدا کر لے جو مومن ہو اور اسے اس کا ایمان اور وہ مومن محبوب ہو۔ لیکن وہ کسی حکمت کے تحت ایسا نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ کسی مبغوض و مکروہ تک لے جائے گا۔

اگر یہ کہا جائے گا کہ پھر وہ یہ کیوں نہیں کرتا اور مبغوض کو روک کیوں نہیں دیتا؟

تو اس کا جواب یہ ہے: متعدد اشیاء ممتنع لذاتہ ہوتی ہیں اور بعض ممتنع لغیرہ ہوتی ہیں۔ کھانے سے حاصل ہونے والی لذت پینے، سونگھنے اور سننے وغیرہ سے حاصل نہیں ہوتی۔ ان سے حاصل ہونے والی لذت اور ہے۔

پھر منہ میں کھانے کی لذت پینے کی لذت سے جدا ہے۔ پھر ایک آواز کی لذت دوسری آواز کی لذت سے مختلف ہوتی ہے لہٰذا ضروری نہیں کہ بندے کو ہر محبوب اور لذیذ چیز آنِ واحد میں یکجا ہو جائے۔ بلکہ ایک کا حصول تب ہی ہوگا جب اس کی ضد کو فوت کیا جائے گا۔

پھر ہر مخلوق کے لوازم بھی ہیں اور اضداد بھی۔ سو وہ شی تب ہی پائی جائے گی جب اس کے لوازم پائے جائیں اور اضداد غیر موجود ہوں اب اللہ کو بندے سے جہاد بھی محبوب ہے اور حج بھی۔ وہ جو بھی کرے محبوب ہوگا۔ لیکن بندہ بیک وقت مشرق اور مغرب دونوں کا مصر نہیں کر سکتا۔ بلکہ بیک وقت حج اور جہاد دونوں کو نہیں کر سکتا۔ کہ دونوں میں سے ایک دوسرے کے نہ کرنے سے ہی حاصل ہوگا۔ حج فرض اور جہاد نفل ہی ہو۔ تو حج زیادہ محبوب ہوگی اور اگر دونوں نفل دونوں فرض ہوں گے پھر اگر تو اسے جہاد زیادہ محبوب ہوگا۔

اب رب تعالیٰ کو دونوں میں سے ایک محبوب جو دوسرے کو نہ کر کے حاصل ہوا ہے، پسند ہے۔ کیونکہ اگر دوسرے کو فوت کیے بغیر اس کا وجود ممکن ہوتا تو یہ بھی محبوب ہوتا اور اگر اس کا وجود اس دوسرے زیادہ محبوب کو فوت کر کے حاصل ہوتا تو بھی ایک اعتبار محبوب ہوتا تو دوسرے اعتبار سے مکروہ ہوتا۔

اب رب تعالیٰ نے جو بعض لوگوں میں طاعت کو مقدر نہیں کیا تو اس میں اس کی حکمت ہے۔ جیسا کہ جب اس نے دو میں ادنیٰ محبوب کا حکم نہیں دیا تو اس میں بھی اس کی حکمت ہے اور وہ ہر بات پر قادر ہے۔ لیکن اجتماعِ ضدین عمومِ اشیاء میں داخل نہیں۔ کیونکہ یہ بالذات محال ہے۔ یہ ایسا کہنے کے بمنزلہ ہے: بھلا رب تعالیٰ نے بندے کو اس بات پر قادر کیوں نہ بنایا کہ وہ آنِ واحد میں مشرق کو حج کے لیے اور مغرب کو جہاد کے لیے جا سکتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جسم واحد کا دو جگہوں میں ہونا بالذات محال ہے۔ لہٰذا یہ دونوں آنِ واحد میں ہونے ممکن نہیں۔ اور یہ کوئی چیز نہیں ہے کہ یہ کہا جائے: کہ یہ مقدر ہے بلکہ یہ ایک بے حقیقت بات ہے اور کچھ بھی نہیں۔ بلکہ یہ ایک ایسی بات ہے جس کا ذہن تصور کرتا ہے جیسے کہ ذہن رب تعالیٰ کی نظیر کے خارج میں پائے جانے کا تصور کرتا ہے تا کہ خارج میں اس کے امتناع کا حکم لگائے۔ وگرنہ ممکن نہیں کہ ذہن خارج میں اس کی نظیر کا تصور کرے۔ لیکن ذہن محل واحد میں لون اور طعم کے اجتماع کا تصور کرتا ہے، جیسے سفید حلوہ اور سفید رنگ وغیرہ۔ پھر ہی ذہن اس بات کا بھی تصور کرتا ہے کہ کیا سفیدی اور سیاہی محل واحد میں جمع ہو سکتی ہے۔ جیسے کہ لون اور طعم ایک محل میں جمع ہو جاتے ہیں۔ تو وہ جان لیتا ہے کہ یہ اجتماع خارج میں ممتنع ہے اور جان لیتا ہے کہ یہ بات تو ممکن ہے کہ زید مشرق میں اور عمرو مغرب میں ہو۔ پھر وہ ذہن میں یہ سوچتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ زید فی نفسہ دو مکانوں میں بیک وقت موجود ہو۔ جیسا کہ وہ اور عمرو دو جگہوں میں تھے؟ تو وہ جان لیتا ہے کہ یہ ممتنع ہے۔

یہ اس شخص کا کلام ہے جو ارادہ کو دو قسمیں قرار دیتا ہے اور وہ دونوں میں سے ایک نوع میں اور محبت و رضا میں فرق کرتا ہے۔ البتہ جو اس سب کو ایک نوع قرار دیتا ہے وہ دو باتوں کے بیچ میں ہوتا ہے۔

❀ اگر تو وہ محبت و رضا کو اس نوع میں سے قرار دیتا ہے تو اسے مذکورہ شنیع محظورات لازم آتے ہیں۔

❀ اگر وہ محبت و رضا کو وہ نوع قرار دیتا ہے؛ جو ارادہ کو مستلزم نہیں ہوتی اور کہتا ہے کہ کبھی وہ اس چیز کو بھی پسند کرتا ہے جس کا وہ کسی صورت بھی ارادہ نہیں کرتا اور اس وقت اس کا "لا یریدہ" کے قول سے مقصود یہ ہوتا کہ اس نے اس کے کون و جود کا ارادہ نہیں کیا۔ وگرنہ وہ اس کے نزدیک محبوب اور پسندیدہ ہے۔

سو اس نے ارادہ کو ہی خلق کی مشیئت قرار دیا ہے اور یہ اگر چہ سنت کی طرف منسوب ایک جماعت کا قول ہے جو امام مالک امام شافعی اور امام احمد کے اصحاب فقہاء میں سے ہیں۔ لیکن یہ کتاب و سنت کے استعمال کے خلاف ہے۔ تب پھر اس کے ساتھ نزاع لفظی ہوگا اور لفظی نزاعات میں دوستی کا زیادہ مستحق وہ ہے جس کا لفظ قرآن و سنت کے موافق ہو۔

یہ بات واضح ہو چکی ہے قرآن نے اس نوع کو مراد قرار دیا ہے۔ لہٰذا اس بات پر اطلاق کی حاجت نہیں کہ اللہ اس بات کا حکم دیتا ہے جس کا ارادہ نہیں کرتا۔ پھر یہ بھی واضح ہو گیا کہ ارادہ کی دو قسمیں ہیں اور یہ کہ وہ اس بات کا بھی امر دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اس بات کا بھی امر دیتا ہے جسے پیدا کرنے کا وہ ارادہ نہیں کرتا اور اس بات کا حکم دیتا ہے جس کی بابت وہ پسند کرتا ہے اور اسے محبوب ہے کہ اس کے بندے وہ کام کریں۔

اگر ایک آدمی کہتا ہے: "اللہ کی قسم! میں وہ کروں گا جو اللہ مجھ پر واجب کرے گا یا وہ اسے میرے لیے پسند کرتا ہے ان شاء اللہ" تو فقہاء کا اتفاق ہے کہ وہ حانث نہ ہوگا اور اگر اس نے یہ کہا: "اللہ کی قسم! میں وہ کروں گا جو اللہ مجھ پر واجب کرے گا۔ اگر اللہ کو وہ محبوب یا پسند ہوگا" تو وہ نہ کرنے کی صورت میں بالا نزاع حانث ہو جائے گا۔ یہیں سے مکذبین قدر کی دلیل کا بطلان ظاہر ہو گیا۔ کیونکہ جب وہ یہ کہتا ہے کہ ہر عاقل جو اس بات کا امر کرے جو وہ چاہتا نہیں اور اس بات

سے روکے جو وہ چاہتا ہے، اسے سفاہت کی طرف منسوب کیا جائے گا۔ تو اسے جواب دیا جائے گا کہ جب وہ خود غیر کو ایسی بات کا حکم دیتا ہے جو وہ نہیں چاہتا تو کیا ایسا کر کے وہ بھی سفیہ بنتا ہے یا نہیں؟ حالانکہ اس صورت میں امر کرنے والے اور اس امر پر اعانت نہ کرنے والے کا غیر سفیہ ہونا سب عقلاء کے نزدیک مسلم ہے۔ بلکہ حکماء و عقلاء کے سب اوامر اسی باب سے ہیں۔

اگر ایک طبیب ایک دوا تجویز کرتا ہے تو اس کے ذمہ نہیں کہ وہ دوا پینے پر بھی اس کی معاونت کرے۔ اسی طرح فتویٰ دینے والے مفتی پر مفتیٰ بہ پر معاونت اور نکاح تجارت وغیرہ کا مشورہ دینے والے پر مشورہ میں اعانت لازمی نہیں۔ لہٰذا دوسرے کو محبوب شی کا امر دینے کے بعد کسی مفسدہ کی بنا پر اس میں معاونت نہ کرنا سفاہت نہیں۔

پس قدریہ اور ان جیسے دوسرے لوگوں کی دلیل کا بطلان ظاہر ہو گیا۔ اسی طرح جو غیر کو اس بات سے روکتا ہے جس کی بابت اس کا ارادہ ہے کہ وہ اسے کرے کہ ایسا کرنے والا سفیہ نہیں۔ کیونکہ بسا اوقات اس میں روکنے والے کی مصلحت ہوتی ہے۔ لہٰذا مسہلات پینے والا مریض اگر اپنے بچے کو ان کے پینے سے روکے تو سفیہ نہ ٹھہرے گا اور تیرنے والا اگر اناڑی کو تیرنے سے روکے تو سفیہ نہ ہو گا۔ غرض اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔

اگر روکنے والا کسی کو اس کی خیر خواہی کے لیے کسی مضر شی سے روکے اور خود ناہی کی مصلحت اس کے کرنے میں ہو تو وہ اس فعل پر محمود ٹھہرے گا جیسا کہ بہت سارے لوگ کئی کاموں سے روکتے ہیں بسا اوقات انہی کی مصلحت کے لیے اس فعل کو طلب کرتے ہیں۔

البتہ مخلوق میں ایسی کوئی مثال ممکن نہیں جو ہر اعتبار سے رب تعالیٰ کے فعل کے مطابق ہو۔ کیونکہ اس جیسی کوئی شی نہیں نہ ذات ہیں، نہ صفات اور نہ افعال میں۔ غرض مقصود یہ ہے کہ مخلوق میں یہ ممکن ہے کہ انسان ایک بات کا امر کرے پر اس پر اعانت کا ارادہ نہ ہو اور روکنے والے ایسی بات سے روکے کہ خود اس کے کرنے میں اس کی مصلحت میں۔ تو معلوم ہوا کہ اس قدری وغیرہ نے لفظ مجمل کے ساتھ کلام کیا ہے۔ لہٰذا جب انہوں نے یہ کہا کہ جس نے ایسی بات کا امر دیا جو وہ چاہتا نہیں تو وہ سفیہ ہے، تو انہوں نے لوگوں کو اس بات کا وہم ڈالا کہ اللہ نے اس بات کا امر دیا جس کی بابت اس نے یہ ارادہ نہیں کیا کہ بندہ وہ کام کرے اور اللہ نے بندے کو ایسا حکم نہیں دیا کہ جس کے نہ کرنے پر وہ راضی ہو اور اس کے کرنے پر راضی نہ ہو۔ اللہ نے اس معنی میں ان سے فعل کے کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ اس نے بعض کو ایسی بات کا حکم دیا ہے کہ اس نے اس بات کا ارادہ نہیں کیا کہ وہ اپنی مشیئت سے اسے پیدا کرے اور اس نے بندوں کو ان کا فاعل نہیں بنایا اور یہ بات معلوم ہے کہ آمر کے ذمہ نہیں کہ وہ فعل مامور بہ پر مامور کی مدد کرے۔ بلکہ قدریہ کے نزدیک یہ ممتنع ہے اور دوسروں کے نزدیک وہ اس پر قادر ہے لیکن اس کو اس بات کا اختیار ہے کہ چاہے تو کرے اور چاہے نہ کرے۔

اب جو تو مشیئت کو حکمت غائیہ کے بغیر ثابت کرتا ہے اس کا قول ہے کہ: یہ دیگر ممکنات کی طرح ہے، چاہے تو چاہے اور چاہے تو نہ کرے اور جو حکمت کو ثابت کرتا ہے، اس کا قول ہے کہ اسے اس بات کا اختیار ہے کہ وہ اس کو حکمت کی بنا پر

حادث نہ کرے۔ جیسا کہ دیگر وہ تمام امور جن کو اس نے حادث نہیں کیا اور کبھی اس کے راحداث میں اس مامور کے علاوہ کے لیے ایک عظیم مفسدہ ہوتا ہے جو حاصل ہونے والی حکمت سے بھی بڑا ہوتا ہے اور کبھی اس فعل مامور میں مصلحت حاصلہ سے بھی بڑی مصلحت کی تفویت ہوتی ہے اور حکم وہ ہوتا ہے جو دو میں سے بڑی مصلحت کو کو مقدم کرتا ہے اور دو میں سے بڑے مفسدہ کو دفع کرتا ہے۔ اللہ کی حکمتوں کی تفصیل جاننا یہ مخلوق کے ذمے نہیں۔ بلکہ ان کے حق میں علم عام اور ایمان تام ہی کافی ہے۔

اب جس نے ارادہ کو ایک نوع قرار دیا ہے، اگرچہ اس کا قول مرجوح ہے، پر وہ ان قدرِ کے قول سے بہتر ہے جو ارادہ، محبت اور مشیئت سب کو ایک شی قرار دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بھی ہوسکتا ہے جو اس نے نہیں چاہا اور جو چاہتا، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ نہ ہو۔ کیونکہ اس کا قول ہے کہ سفہ اس پر جائز ہے جس پر اعتراض جائز نہ ہوں اور اعتراض غیر کی طرف حاجت کو اور حاجت کے بغیر نقص کو مستلزم ہوتی ہیں اور یہ اللہ پر ممتنع ہے اور اللہ کے حق میں یہ تسلسل اور اس کے ساتھ حوادث کے قیام کو مستلزم ہے اور اس خصم کے نزدیک یہ ممتنع ہے۔

سو جب معتزلہ اور ان کے ہم نوا شیعہ نے ان اصول کو تسلیم کرلیا تو ان کی دلیل منقطع ہوگئی۔ وہ یوں کہ جب انہوں نے یہ قول کیا کہ وہ کسی غرض سے فعل کرتا ہے۔ تو انہیں یہ جواب دیا جائے گا کہ اللہ کی طرف غرض کے وجود اور اس کے عدم کی نسبت برابر ہے۔ یا غرض کا وجود اس کے زیادہ سزا وار ہے۔ پھر اگر تو یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں پہلو یکساں ہیں تو اس کے ساتھ یہ بات ممتنع ٹھہری کہ وہ ایسا فعل کرے جس کے عدم اور وجود کی اس کی طرف نسبت یکساں ہو اور یہ ہم میں سفیہ گنا جائے گا اور یہ ہم میں عبث ہوگا۔

اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ اس نے بندوں کے نفع کے لیے کیا ہے۔ تو یہ جواب دیا جائے گا کہ ایک انسان بھی اپنی دینی یا دنیاوی مصلحت کے لیے دوسرے کے نفع کا کوئی کام کر دیتا ہے۔ رہا دوسرے پر احسان کر کے لذت اندوز ہونا جیسے کہ نفوسِ کریمہ دوسروں پر احسان کر کے لطف اندوز اور خوش ہوتے ہیں اور یہ ان نفوس کی مصلحت و منفعت ہے۔

رہا نفس سے رقت کے الم کو دور کرنا۔ تو جب ایک آدمی دوسرے کو بھوک کی کلفت میں دیکھتا ہے تو اسے کھانا دے دیتا ہے جس سے اس کی کلفت جاتی رہتی ہے اور زوالِ کلفت بھی ایک منفعت و مصلحت ہے۔ اس کے علاوہ باتوں کو تو جانے دیجیے جیسے تعریف کی امید، یا بدلہ کی امید یا اللہ سے اجر کی امید کہ یہ علیحدہ مطالب و مقاصد ہیں۔ لیکن نفس فاعل میں یہ دونوں امر موجود ہیں۔ سو جس نے دوسرے کو نفع دیا اور نفع کا عدم و وجود اس کی طرف نسبت کے اعتبار سے ہمہ پہلو یکساں ہوتو یہ بے وقوف ترین ہوگا اگر پایا جائے۔ تو جب یہ ممتنع ہوگا تو پھر؟...... کیونکہ یہ بات ممتنع ہے کہ ایک مختار کوکام کرے یہاں تک کہ وہ اس کے نزدیک راجح نہ ہو جائے۔ تب پھر اس کے نزدیک اس کا کرنا اس کے نہ کرنے سے زیادہ محبوب ہوگا اور احب کی ترجیح بھی ایک لذت اور منفعت ہے۔

اب یہ قدریہ جو غرض کی تعلیل کے قائل ہیں، یہ اس شی کو ذکر کرتے ہیں جس کا غرض ہونا ممتنع ہوتا ہے۔ وہ یا تو ممتنع

ہوتا ہے یا سفاہت ہوتی ہے اور اگر یہ ایسی غرض کو ثابت کریں جو اس کے ساتھ قائم ہو تو اس کا محل حوادث ہونا لازمی آتا ہے اور وہ اس کا حیلہ کرتے ہیں۔

پھر اگر ایک غرض دوسرے غرض کے لیے ہو تو تسلسل لازم آئے گا۔ وہ اس کو ماضی کی طرف لے جاتے ہیں اور مستقبل کے بارے میں ان کے دو اقوال ہیں اور اگر وہ دوسری غرض کے لیے نہ ہو تو اس کا کسی غرض کے بغیر حدوث جائز ہوگا۔ سو یہ وہ اصول ہیں جن پر قدریہ اور یہ متفق ہیں یہ اُن کی اِن پر حجت ہے۔

فصل:......امور اختیاریہ پر بحث

جو امورِ اختیاریہ کے رب تعالیٰ کے ساتھ قیام کی نفی کرتا ہے اسے متناقض اور فاسد اقوال کرنے ہی پڑتے ہیں۔

غرض جو رب تعالیٰ کے ساتھ امورِ اختیاریہ کے قیام کی نفی کرتا ہے وہ ضرور متناقض و فاسد اقوال کرے گا تو جب جھمیہ مجبر اور قدریہ معتزلہ اس بات میں مشترک تھے کہ ان میں سے کوئی چیز اس کی ذات کے ساتھ قائم نہیں ہے۔ پھر اس کے بعد ان لوگوں میں اس کے افعال و احکام کی تعلیل میں اختلاف ہو گیا تو دونوں میں سے ہر ایک قول اس امر کو لازم ہوا جو اس کے متناقض و فساد کو ظاہر کرتا ہے۔

سو تعلیل کے اثبات کے قائلین کا قول ہے کہ: جو حکمت کے بغیر کوئی فعل کرتا ہے وہ سفیہ ہے یہ بات اس میں تو ضرور ہے جو ایسی حکمت کے بغیر فعل کرے جو اسی کی طرف لوٹتی ہو۔ ان لوگوں کا گمان ہے کہ رب تعالیٰ اپنی طرف لوٹنے والی حکمت کے بغیر فعل کرتا ہے۔ پھر اگر بغیر حکمت کے فعل کرنے والا سفیہ ہے تو اسے سفاہت لازم آئی اور اگر وہ سفیہ نہیں تو تناقض لازم آیا۔ کیونکہ ان کا فعل کو ایسی حکمت کے ساتھ ثابت کرنا جو فاعل کی طرف نہ لوٹتی ہو، غیر معقول ہے۔ چہ جائیکہ ایسا فاعل حکیم ہو۔

یہ رب تعالیٰ کی صفات اور کلام میں ان کے قول کی نظیر ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں: وہ اپنی مشیئت اور قدرت سے ہی تکلم کرتا ہے، اور قرآن کا قدیم ہونا ممتنع ہے۔ کیونکہ اس میں قدم کے منافی امور ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ متکلم وہ ہی عاقل ہوتا ہے جو اپنی قدرت و مشیئت سے کلام کرتا ہو۔ نا کہ وہ کہ کلام اس کی قدرت کو لازم ہو اور اس کی قدرت و مشیئت سے حاصل نہ ہوتا ہو۔

ان کو یہ جواب دیا جائے گا کہ اسی طرح ایسا ہی متکلم معقول ہے کہ کلام جس کے ساتھ قائم ہو۔ رہا وہ متکلم جس کے ساتھ کلام قائم نہ ہو، یا وہ مرید کہ جس کے ساتھ ارادہ قائم نہ ہو، یا وہ عالم کہ جس کے ساتھ علم قائم نہ ہو تو یہ غیر معقول ہے۔ بلکہ خوفِ معقول ہے۔

بلکہ کلام کی بابت ان کا قول اس بات کو متضمن ہے کہ جس کے ساتھ کلام قائم ہو، وہ متکلم ہی نہ ہو۔ کیونکہ متکلم تو وہ ہوتا ہے جو اپنے غیر میں کلام کو حادث کرے۔ اسی طرح رب تعالیٰ کی محبت و رضا، اور ارادہ و غضب وغیرہ کی بابت کی بھی

ایسا ہی کلام ہے کہ یہ امور اس کی ذات کے ساتھ قائم نہیں ہیں۔ بلکہ یہ امور اس کی ذات سے جدا ہیں۔ سو انہوں نے رب تعالیٰ کو ایسے امور کے ساتھ موصوف ٹھہرایا ہے، جو اس کی ذات کے ساتھ قائم نہیں، بلکہ اس کی ذات سے منفصل ہیں۔ یہ خلافِ معقول بھی ہے اور مشتمل بر تناقض بھی ہے کہ اس سے انہیں یہ بات لازم آتی ہے کہ وہ ہر اس شی کے ساتھ موصوف ہے جس کو وہ مخلوقات میں پیدا کرتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ ہر اس کلام سے بھی موصوف ہے جس کو وہ پیدا کرتا ہے اور وہ مخلوق کلام اس کا کلام ہوگا۔ سو جب وہ اپنی مخلوقات کو ناطق بنائے گا تو یہ اس کا اپنا کلام ہوگا نا کہ اس مخلوق کا جسے اس نے ناطق بنایا ہے۔ اس کی تفصیلی اپنی جگہ موجود ہے۔

غرض یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ ان کا کلام کہ وہ حکمت کی وجہ سے فعل کرتا ہے، اس بات کو مستلزم ہے کہ اس کے نزدیک حکمت کا وجود اس کے عدم سے زیادہ راجح ہو۔ یا یہ کہ وہ حکمت اس کی ذات کے ساتھ قائم ہو، وغیرہ لوازم کہ جو صرف اسی میں معقول ہیں جو ایسی حکمت کے لیے فعل کرے کہ جس کے ساتھ متصف ہو۔ وگرنہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ جمیع حوادث کی نسبت اس کی طرف یکساں ہے اور ان میں سے بعض کا بعض سے ارجح ہونا اس کے نزدیک ممتنع ہو، تو یہ بات بھی ممتنع ٹھہری کہ وہ بعض حوادث کو دوسرے بعض کی وجہ سے کرے۔

پھر جب ان مجبرہ جہمیہ نے قدریہ کے اس عقیدہ کے فاسد ہونے کو دیکھا، حالانکہ وہ اس اصل میں ان کے شریک بھی تھے، تو کہنے لگے: یہ بات سرے سے ممتنع ہے کہ وہ ایک چیز کو دوسرے چیز کے لیے بجا لائے اور یہ بات بھی ممتنع ہے کہ اسے ایک چیز دوسری سے زیادہ محبوب ہو، اور یہ بھی ممتنع ہے کہ اسے ایک مخلوق محبوب ہو اور دوسری نہ ہو، یا اس سے ایک بات کا تو ارادہ کرے دوسری کا نہ کرے۔ بلکہ جو بھی حادث ہوتا ہے، وہ اس کی مراد ہے اور اسے محبوب اور پسند ہے۔ چاہے وہ کفر ہو یا ایمان، اچھائی ہو یا برائی، نبی ہو یا شیطان، اور جو بھی حادث نہیں ہوا، نہ وہ اسے محبوب ہے، نہ پسند اور نہ مراد ہی ہے۔ جیسا کہ اس نے اس غیر حادث کو چاہا ہی نہیں۔ ان کے نزدیک اللہ نے جو چاہا وہ ہوا، اور وہ اسے محبوب، پسند اور اس کی مراد بھی ہے اور جو نہ چاہا وہ نہ ہوا اور نہ وہ اسے محبوب اور پسند ہے اور نہ اس کی مراد ہی ہے۔

قدریہ کہتے ہیں: اس نے جس چیز کا بھی امر کیا ہے، وہ اس کی مراد بھی ہے اور اس نے اسے چاہا بھی ہے۔ جیسا کہ وہ اسے محبوب اور پسند بھی ہے اور جس چیز کا اس نے امر نہیں کیا، نہ اسے چاہا اور نہ وہ اس کی مراد ہے۔ جیسا کہ وہ اسے محبوب اور پسند بھی نہیں۔ بلکہ اس کی ملک میں وہ بھی ہے جسے اس نے نہیں چاہا، اور اس چیز کو بھی چاہا جو نہیں ہے۔

پھر ان جہمیہ مجبرہ پر جب یہ آیت تلاوت کی جاتی ہے:

﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ﴾ (البقرۃ: ۲۰۵)

''اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔''

اور فرمایا:

﴿وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ﴾ (الزمر: ۷)

''اور وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری پسند نہیں کرتا۔''

تو کہتے ہیں کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ نہ تو اسے کفر و مفاد محبوب ہے، نہ اس نے ان کو چاہا ہے اور نہ ان کا ارادہ کیا ہے، اس سے کہ جس سے یہ پائے نہیں گئے یا یہ معنی ہے کہ اسے بطور دین کے کفر وفساد محبوب نہیں اور نہ اس نے ان کو اس اعتبار سے چاہا اور نہ ان کا ارادہ کیا۔ بایں معنی کہ وہ کفر وفساد والے کو ثواب نہیں دینا چاہتا۔

رہا واقع ہونے والا کفر، فسق اور عصیان تو ان کے نزدیک اسے وہ محبوب اور پسند ہے جیسا کہ اس نے ان کو چاہا ہے البتہ اسے کفر وعصیان والے کو ثواب نہیں دینا محبوب نہیں جیسا کہ اس نے کفر وعصیان والے کو ثواب دینا نہیں چاہا۔ ان کے نزدیک رب تعالیٰ کا کسی قوم کو تعذیب یا کسی کو انعام دینا کسی حکمت وسبب کے نہیں اور نہ بعض مخلوقات کے وہ قویٰ و طبائع ہیں جن کے ذریعے وہ حادث ہوا ہے اور نہ وہ کسی حکمت کی بنا پر حادث ہی ہوا ہے اور نہ اس کا امر ونہی کسی معنی کے لیے ہے اور نہ اس نے نبیوں اور فرشتوں کو ان میں پائے جانے والے کسی معنی کی وجہ سے ہی چنا ہے۔ نہ اس نے کسی معنی کی بنا پر طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام ٹھہرایا ہے۔ جو معنی کہ حلال کو طیب اور حرام کو خبیث ٹھہراتا ہے اور نہ اس نے لوگوں کے اموال کی حفاظت کی خاطر چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا ہے اور نہ اس نے حد سے اعتداء کرنے والے ڈاکوؤں کو اس لیے سزا دینے کا حکم دیا ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ظلم سے بچایا جائے اور نہ بارش اس لیے برسائی ہے کہ حیوانات پانی پئیں اور نباتات پانی سینچیں۔

ان دونوں اقوال میں وہ تناقض ہے جو حد شمار سے باہر ہے۔ لیکن اس امامی نے جب اہل سنت کے اقوال کا مطلق تناقض ذکر کیا تو اس پر یہ واضح ہوا کہ جملہ قدریہ اپنے مقابل مجبرہ پر حجت قائم کرنے سے عاجز ہیں، جیسا کہ روافض اپنے مقابل خوارج وتواصب پر اقامت حجت سے قاصر ہیں چہ جائیکہ کتاب وسنت کے متبعین، اہل استقامت واعتدال پر حجت قائم کرسکیں۔

اسی لیے ہم نے اس ان گنت فساد وتناقض کے بعض پہلوؤں پر تنبیہ کی ہے۔ ان اشعریہ وغیرہ اہل اثبات نے اپنے اصول میں ان کے تناقض کے بیان کو مشروع کیا اور ان کے اقوال کے تناقض کا استیعاب کیا۔

اشعری کی جبائی کے ساتھ تین بھائیوں کے بارے میں حکایت مشہور ہے کہ وہ رب تعالیٰ پر اس بات کو واجب ٹھہراتے تھے کہ وہ ہر بندے کے ساتھ وہی کرے جو اس کے دین کے لیے زیادہ مناسب ہے۔ وہی دنیا تو بغدادی معتزلہ اس کو بھی واجب کرتے ہیں۔ البتہ بصری معتزلہ اسے واجب نہیں کرتے۔

چنانچہ اشعری نے جبائی سے کہا: فرض کرو کہ اللہ نے تین بھائی پیدا کیے۔ ان میں سے ایک تو نابالغی کی عمر میں ہی فوت ہو گیا۔ جبکہ دوسرے دو بلوغت کو پہنچ گئے۔ پھر ان میں سے ایک کافر بن گیا اور دوسرا ایمان لے آیا، سو کافر دوزخ میں اور مومن جنت میں جا پہنچا۔ لیکن اللہ نے اس بالغ بھائی کا درجہ نابالغ جنتی بھائی سے بلند کیا۔ تب اس نابالغ نے کہا: اے میرے رب! میرا درجہ بھی میرے بھائی جتنا کر دے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا: تم اس جیسے نہیں ہو، اس نے تو ایمان لا کر

نیک اعمال بھی کیے تھے۔ جبکہ تو نے نابالغی کی وجہ سے نیک اعمال نہ کیے۔ اس نابالغ نے کہا: اے میرے رب! مجھے کم سنی میں موت تو نے دی۔ اگر تو مجھے زندہ رکھتا تو میں بھی اس جیسے نیک عمل کرتا۔ رب تعالیٰ نے فرمایا: میں نے تیری مصلحت کو پیش نظر رکھا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر تو بلوغت کو پہنچتا تو کفر کرتا۔ اسی لیے میں نے تمہیں کم سنی میں ہی موت دے دی۔ اس پر وہ تیسرا دوزخ میں سے چلایا: اے اللہ! تو نے میرے ساتھ ایسا کویں نہ کیا جیسا کہ تو نے میرے اس کم سن بھائی کے ساتھ کیا؟ کہ بات تو میرے حق میں بھی مصلحت تھی؟

چنانچہ جب اشعری نے جبائی پر یہ اعتراض کیا تو وہ لا جواب ہوگیا۔ وہ اس لیے کہ یہ لوگ دو متماثلین میں رب تعالیٰ پر عدل کرنے کو واجب قرار دیتے ہیں اور یہ کہ وہ دونوں میں سے ہر ایک کے ساتھ وہ کرے جو اس کے لیے زیادہ مناسب ہو۔ جبکہ یہاں اس نے ان لوگوں کے نزدیک ایک کے ساتھ دوسرے سے زیادہ مناسب معاملہ کیا ہے۔ غرض یہ مقام اس کی تفصیل کا نہیں۔

جب بات یہ ہے تو ان کا رب تعالیٰ کو مخلوق کے ساتھ تشبیہ دینا باطل ٹھہرا اور اِن کو اُن لوگوں نے یہ کہا: ہم اور تم اس بات پر تو متفق ہیں کہ رب تعالیٰ کے فعل کو اس کی مخلوق کے فعل پر قیاس نہ کیا جائے گا۔ اور ہم اور تم اس فاعل کو ثابت کرتے ہیں جو ایسا فعل کرتا ہے جو اس کی ذات سے منفصل ہوتا ہے، بغیر کسی ایسی شی کے جو اس کی ذات میں حادث ہیں۔ حالانکہ مشاہدہ میں یہ بات غیر معقول ہے اور ہم ایسا فاعل ثابت کرتے ہیں جو ہمیشہ سے غیر فاعل ہو۔ یہاں تک کہ وہ کسی شی کے تجدد کے بغیر فعل کرتا ہے۔ حالانکہ مشاہدہ میں یہ بات بھی غیر معقول ہے۔

تم وہ غرض ثابت کرتے ہو جو ایسے فاعل کو ثابت کرتی ہے جو ہمیشہ سے غیر فاعل ہو۔ حتی کہ وہ کسی چیز کے تجدد کے بغیر فعل کرتا ہو۔ یہ بات بھی مشاہدہ میں غیر معقول ہے اور تم وہ غرض ثابت کرتے ہو جو مشاہدہ میں غیر معقول ہے۔ اور اس پر مستزاد اس بات کے بھی مدعی ہو کہ تم رب تعالیٰ کی ذات سے سفاہت کی نفی کرتے ہو اور اسے حکیم بھی ٹھہراتے ہو۔ حالانکہ جو تم ثابت کرتے ہو وہی تو رفاہت ہے جو کتاب وسنت اور حکمت کے مخالف اور مشاہدہ میں معقول ہے۔

تو جب بات یہ ہے تو تمہارا یہ قول کہ ہر وہ عاقل جو ایسی بات کا حکم دے جس کا اس نے ارادہ نہیں کیا اور ایسی بات سے روکے جس کا اس نے ارادہ کیا ہے کہ اس کی سفاہت کی طرف نسبت کی جائے گی، حالانکہ رب تعالیٰ اس بات سے منزہ اور پاک ہے۔

تو تمہیں یہ جواب دیا جائے گا کہ اگر تو یہ فاعل کوئی مخلوق ہے تو تم یہ کیوں کہتے ہو کہ خالق بھی اسی طرح ہے۔ حالانکہ ہم اس بات پر متفق ہیں کہ خالق اور مخلوق میں فرق ہے؟ اور مخلوق جلب منفعت اور دفع مضرت کی محتاج ہے۔ حالانکہ اللہ اس بات سے منزہ ہے اور بندہ مامور بھی ہے اور منہی بھی ہے۔

سو اگر تو تم لوگوں نے یہ قضیہ کلیہ کر کے لیا تو اس میں خالق بھی داخل ہو جائے گا۔ جبکہ عقلاء کا ماثور و منقول اجماع ہمیں اس بات سے روکتا ہے اور اگر تم یہ قضیہ مخلوق میں لیا تا کہ اس پر خالق کو قیاس کریں، تو قیاسِ فاسد ہے۔ تمہیں یہ

قیاس کرنا صحیح نہیں نا اس لیے کہ یہ قیاسِ مشمول ہے یا اس لیے کہ یہ قیاسِ تمثیل ہے۔

اشعری نے ان لوگوں کو ایک اور یہ جواب دیا ہے کہ ہم اس بات کو ہی تسلیم نہیں کرتے کہ آدمی کا مطلق ایسی بات کا حکم دینا سفاہت ہے جس کا اس نے ارادہ نہیں کیا بلکہ بسا اوقات یہ حکمت بھی ہوتا ہے جب اس کا مقصود مامور کا امتحان لینا ہوتا کہ لوگوں کے سامنے اس کا عذر آ جائے اور اسے سزا نہ ملے۔ جیسے وہ آدمی جو اپنے غلام کو اس کی نافرمانی پر سزا دے اور ملامت کرے۔ پھر وہ اپنا یہ عذر پیش کرے کہ یہ میرا نافرمان ہے۔ پھر اس سے اس کی تحقیق کا مطالبہ کیا جائے اور وہ امتحان لینے کا حکم دے۔ اب اس وقت اس کا یہ ارادہ نہیں کہ وہ مامور بہ کو بجا لائے۔ بلکہ وہ چاہتا ہے کہ یہ نافرمانی کر کے دکھائے تا کہ اس کا عذر مقبول ہو سکے۔

اس طرح سے اس نے اس نفس کلام کو ثابت کیا جسے وہ ثابت کرتا ہے اور یہ کہ نفس کے ساتھ قائم طلب نہ تو ارادہ ہے اور ارادہ کو مستلزم ہے۔ جیسا کہ اس نے خبر کے معنی کو ثابت کیا ہے کہ وہ اخبارِ کاذب کا علم نہیں۔ سو اس نے ممتحنین کے امر اور کاذب کی خبر اعتماد کیا ہے۔

لیکن جمہور اہل سنت اس جواب سے مطمئن نہیں۔ کیونکہ درحقیقت یہ امر نہیں ہے بلکہ اظہارِ امر ہے۔ اس طرح خبر کاذب کہ اس نے زبان سے وہ کہا ہے جو اس کے دل میں نہیں۔ سو کاذب کی خبر اس کے دل کی خبر نہیں۔ بلکہ یہ جی کی بات کا اظہار ہے۔ سو ممتحن کا امر اس مذاق کرنے والے کے امر کی طرح کا ہے کہ جس کے مذاق کو مامور نہیں جانتا۔

اسی لیے مامور نے امر ممتحن کو جان لیا تا کہ وہ اسے سزا دے اور یہ اس کی مراد نہیں۔ مگر جبکہ وہ نافرمانی کرے کہ اس حال میں وہ اس کی اطاعت کرے گا۔

پھر ممتحن کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک وہ کہ جس کا قصد ہی یہ ہے کہ مامور اس کی نافرمانی کرے تا کہ وہ اسے سزا دے۔ جیسے اوپر کی مثال میں ذکر ہوا اور دوسرا وہ کہ جس کی مراد مامور کی طاعت اور اس کا امتثالِ امر ہے۔ نا کہ نفس فعل مامور بہ۔ جیسے رب تعالیٰ کا حضرت خلیل کو اپنا بیٹا ذبح کرنے کا حکم دینا کہ یہاں مراد جنابِ ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام کی طاعت اور امتثالِ امر اور طاعت الٰہی میں اپنے بیٹے کو ذبح کر دینے کی پوری کوشش کرنا تھی اور یہ کہ رب تعالیٰ کی طاعت و محبت اور اس کی مراد انہیں اپنے بیٹے سے بھی زیادہ محبوب ہو۔ سو جب یہ مراد حاصل ہوگئی تو رب تعالیٰ نے فدیہ میں قربانی کا ایک عظیم جانور بھیجا۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ o وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَّاإِبْرٰهِيمُ o قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ o إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ o وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ o﴾ (الصافات: ۱۰۳۔ ۱۰۷)

’’تو جب دونوں نے حکم مان لیا اور اسے پیشانی کے بل لیٹا دیا۔ اور ہم نے اسے آواز دی کہ اے ابراہیم! یقیناً تو نے خواب سچا کر دکھایا، بے شک ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں۔ بیشک یہی تو یقیناً کھلی آزمائش ہے۔ اور ہم نے اس کے فدیے میں ایک بہت بڑا ذبیحہ دیا۔‘‘

اس باب میں ان معانی کا جاننا بے حد مفید ہے جن میں شدید اضطراب واقع ہوا ہے۔

فصل: ......راضی بہ رضا رہنے پر رافضی کا اعتراض اور اس کا جواب

''رب تعالیٰ کی قضا وقدر پر راضی رہنے'' پر رافضی کا کلام اور اس کا ردّ۔

[شبہ] یہ امامی قدری کہتا ہے: اور ایک بات یہ ہے کہ ''اس سے رب تعالیٰ کی قضا پر ناراض ہونا لازم آتا ہے حالانکہ قضائے الٰہی پر راضی رہنا واجب ہے۔ لہٰذا اگر تو کفر رب کی قضاء وقدر سے ہے تو ہم پر واجب ہے کہ اس پر راضی رہیں۔ لیکن کفر پر رضا جائز نہیں۔''

[جواب]: اس کے متعدد جوابات ہیں:

اوّل یہ کہ بے شمار اہل اثبات کا جواب یہ ہے کہ ہم یہ تسلیم ہی نہیں کرتے کہ رب تعالیٰ کی جملہ مقتضیات پر راضی رہنا واجب ہے کیونکہ اس کے وجوب پر کوئی دلیل نہیں۔

علما کا مرض، فقر، اور ذلت پر راضی رہنے میں اختلا ہے کہ آیا یہ مستحب ہے یا واجب؟ امام احمد وغیرہ کے اس بارے دو اقوال ہیں۔ جبکہ اکثر علماء کا قول ہے کہ مرض وغیرہ پر راضی رہنا مستحب ہے نا کہ واجب۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے اہل رضا کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا ہے:

﴿رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ (البینة : ۸)

''اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے۔''

ہاں! اللہ نے جو واجب کیا ہے، وہ صبر ہے۔ جس کا رب تعالیٰ نے متعدد آیات میں حکم دیا ہے۔ جبکہ مقدور پر راضی رہنے کا حکم نہیں دیا۔ ہاں مشروع رضا کا حکم دیا ہے۔

سو مامور بہ پر رضا واجب ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿وَ لَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَیُؤْتِیْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ رَسُوْلُهٗٓ اِنَّآ اِلَی اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ﴾ (التوبة : ۵۹)

''اور کاش کہ واقعی وہ اس پر راضی ہو جاتے جو انھیں اللہ اور اس کے رسول نے دیا اور کہتے ہمیں اللہ کافی ہے، جلد ہی اللہ ہمیں اپنے فضل سے دے گا اور اس کا رسول بھی۔ بے شک ہم اللہ ہی کی طرف رغبت رکھنے والے ہیں۔''

جبکہ دوسرا قول رضا کے وجوب کا ہے کیونکہ یہ رب تعالیٰ کے رب ہونے پر راضی ہونا؛ اور اسلام کے دین ہونے پر راضی ہونے کی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے پر راضی ہونے کی تمامیت میں سے ہے، کیونکہ ایک روایت میں آتا ہے: ''جو میری قضاء پر راضی نہ ہو، اور میری آزمائش پر صبر نہ کرے تو میرے سوا کسی اور کو رب بنا لے۔''

لیکن اس سے بھی حجت قائم نہیں ہوتی، کیونکہ رب تعالیٰ سے اس کا ثبوت معروف نہیں۔
رہا اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر راضی ہونا اور اسلام کے دین ہونے پر راضی ہونا اور محمد ﷺ کے نبی ہونے پر راضی ہونا۔ تو یہ واجب ہے اور یہ وہ رضا ہے جس پر کتاب وسنت کی دلالت ہے۔
رہا رب تعالیٰ کی جملہ مخلوقات اور تقدیر پر راضی رہنا تو کتاب وسنت کی اس پر کوئی دلالت نہیں اور نہ اسلاف میں سے کسی کا یہ قول ہے۔ بلکہ اللہ نے اس بات کی خبر دی ہے کہ وہ متعدد امور پر راضی نہیں حالانکہ وہ امور اسی کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿وَلَا يَرْضَى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ﴾ (الزمر: ۷)
''اور وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری پسند نہیں کرتا۔''

اور فرمایا:

﴿إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَى مِنَ الْقَوْلِ﴾ (النساء: ۱۰۸)
''جب وہ رات کو اس بات کا مشورہ کرتے ہیں جسے وہ پسند نہیں کرتا۔''

ہم نے ایک مستقل کتاب میں رضا بالقضا کی بابت مفصل کلام کیا ہے اور بتلایا ہے کہ اس باب میں لوگ کیونکر مختلف فرقوں میں بٹ گے۔ سو ایک فرقہ یہ گمان کرنے لگا کہ وہ رب تعالیٰ کی حام کردہ باتوں پر اس لیے راضی ہیں کیونکہ یہ اللہ کی قضا ہے اور ایک فرقہ رب تعالیٰ کی قضاء وقدر کا اس لیے منکر ہو گیا کیونکہ اس سے اس پر راضی ہونا لازم آتا ہے اور ان فرقوں کی بنا اس بات پر تھی کہ رب تعالیٰ کی جملہ مخلوقات پر رضا مامور بہ ہے۔ حالانکہ بات یوں نہیں۔ بلکہ رب تعالیٰ بے شمار حوادث سے محبت یا بغض یا ناراضی رکھتا ہے اور ہم کو بھی اللہ نے ان امور سے بغض و ناگواری رکھنے کا حکم دیا ہے۔

دوم: یہ کہا جائے کہ رب تعالیٰ جن باتوں پر خود راضی ہے ان سے راضی ہونا مشروع ہے۔ اب اللہ نے اس بات کی خبر دی ہے کہ وہ فساد اور کفر کو پسند نہیں کرتا اور اسی طرح راتوں کی خفیہ سازشانہ سرگوشیوں کو بھی پسند نہیں فرماتا اور یہ بات بندوں کے اقوال میں بھی موجود ہے اور اللہ نے بھی خبر دی ہے کہ وہ ان باتوں کو پسند نہیں فرماتا تو جب ایک بات سے وہ خود راضی نہیں، اس سے راضی رہنے کا حکم وہ اپنے بندوں کو کیونکر دے سکتا ہے؟ بلکہ یہ بات واجب ہے کہ جن باتوں سے اللہ ناراض ہے اور انہیں ناپسند فرماتا ہے، بندے بھی ان باتوں سے ناراض ہوں اور انہیں ناپسند کریں اور جن باتوں پر اللہ راضی ہے بندے بھی ان باتوں پر راضی ہوں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمُ اتَّبَعُوا مَا أَسْخَطَ اللَّهَ وَكَرِهُوا رِضْوَانَهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ﴾ (محمد: ۲۸)
''یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے اس چیز کی پیروی کی جس نے اللہ کو ناراض کر دیا اور اس کی خوشنودی کو برا جانا تو اس نے ان کے اعمال ضائع کر دیے۔''

سو رب تعالیٰ نے اس آیت میں ان لوگوں کی مذمت بیان کی ہے جو اس کی ناراضیوں پر چلتے ہیں اور اس کی رضا

سے کتراتے ہیں اور ان کی مذمت بیان نہیں کی جو اس کی ناراضیوں کو ناپسند کرتے ہیں اور اس کی رضا پر چلتے ہیں۔

جب یہ کہا جائے گا کہ بھلا رب تعالیٰ اپنی قدر وقضا پر کیونکر ناراض ہوسکتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں وہ ایسا کرسکتا ہے جیسا کہ گزشتہ میں بیان ہوا۔ جبکہ اکثر کے طریق پر اس لیے کہ مقضی ایسی شی ہے جو اس نے بنائی ہے اور ان کے نزدیک بغض یہ ارادہ کے مغایر ہے۔

رہا اقل کا طریق تو وہ یہ کہتے ہیں کہ: رب تعالیٰ کی ناراضی اور بغض یہ اس کا فاعل کے عقوبت کا ارادہ کرنا ہے اور رہے ہم تو ہم اس بات کے مامور ہیں کہ ہم منہی عنہ سے کراہت کریں۔ لیکن اس قول پر جواب پہلے جواب کی طرف لوٹتا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک رب تعالیٰ کا کسی شی کا نفس ارادہ کرنا اور اسے پسند کرنا اور اسے محبوب رکھنا کہ اللہ نے بندے کو اس بات کا حکم دیا ہے کہ وہ اسے ناپسند کرے، اس سے بغض رکھے اور اس پر ناراض ہو۔ سو یہ لوگ کہتے ہیں ہر مقدورِ مقضی ضروری نہیں کہ وہ ایسا مامور بھی ہو کہ جس پر راضی ہوتا ہے۔

سوم : یہ کہا جائے کہ گزشتہ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ رب تعالیٰ جو کرتا ہے وہ کسی حکمت کے تحت ہوتا ہے۔ اور جو معاصی اور عقوبات بندوں کو ضرر پہنچاتے ہیں ان کے پیدا کرنے میں بھی حکمت ہوتی ہے اور انسان کبھی ناگوار فعل بھی کر جاتا ہے جیسے کڑوی دوا پینا۔ کیونکہ اس میں وہ حکمت ہوتی ہے جو چاہتا ہے۔ جیسے صحت اور عافیت، سو یہ دوا پینا ایک اعتبار سے اگر محبوب ہے تو دوسرے اعتبار سے مکروہ ہے۔ پس بندہ رب تعالیٰ کی اس امر میں موافقت کرتا ہے کہ وہ گناہوں کو برا جانتا ہے اور ان سے بغض رکھتا ہے۔ کیونکہ گناہ رب تعالیٰ کو مبغوض ومکروہ ہوتے ہیں اور وہ اس حکمت پر راضی رہتا ہے جس کی بنا پر رب تعالیٰ نے ان کو پیدا کیا ہوتا ہے۔ لہٰذا بندے کے فعل کے اعتبار سے یہ مکروہ اور مسخوط ہے جبکہ رب تعالیٰ کے پیدا کرنے کے اعتبار سے یہ محبوب و پسندیدہ ہے۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے اسے ایک حکمت کے تحت پیدا کیا ہے اور بندہ اسے کرتا ہے حالانکہ وہ اس کے لیے مضر ہوتا ہے اور موجب عذاب ہوتا ہے۔ سو ہم ان کا انکار کرتے ہیں، ان کو ناپسند کرتے ہیں اور ان سے روکتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ نے ہمیں ان کا حکم دیا ہوتا ہے۔ کیونکہ خود اللہ بھی ان سے ناراضی اور بغض رکھتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اللہ نے ان کو ایک حکمت کے تحت پیدا کیا ہے۔ سو ہم اس کی قضاء وقدر پر راضی ہوتے ہیں۔

سو جب ہم اس پہلو کو ملحوظ رکھتے ہیں کہ یہ اللہ کی قضا وقدر ہے تو ہم اللہ پر راضی ہوکر اس کے حکم کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ رہا یہ پہلو کہ ان کو بندہ کرتا ہے تو ہم ضرور اسے ناپسند کریں گے، اسے روکیں گے اور حتی الامکان اسے دور کریں گے۔ کہ اللہ کو ہم سے یہ بات محبوب ہے اور اللہ جب کافروں کو ہم پر مسلط کرتا ہے تو اسے اللہ کی قضاء جانتے ہوئے اس پر راضی رہیں گے اور ان بھگانے میں اور ان سے لڑنے میں پوری کوشش کریں گے اور دونوں میں سے کوئی ایک امر دوسرے کے منافی نہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے چوہا، سانپ اور کٹ کھنا کتا پیدا کیا ہے اور پھر ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم ان کو مار ڈالیں۔ جب اللہ نے ان کو پیدا کیا تو ہم اس پر راضی ہیں اور جانتے ہیں کہ اس میں اس کی کوئی حکمت ہوگی اور اس کے حکم پر انہیں قتل بھی کریں گے۔ کیونکہ اللہ کو یہ بات محبوب اور پسند ہے۔

بعض نے ایک اور جواب بھی دیا ہے، وہ یہ کہ: ہم قضاء پر تو راضی ہیں البتہ مقضی پر نہیں اور ایک جواب یہ بھی دیا گیا ہے کہ ہم ان باتوں پر رب تعالیٰ کی مخلوق ہونے کے اعتبار سے تو راضی ہیں البتہ ان کے کسب ہونے کے اعتبار سے ان پر ناراض ہیں۔

لیکن یہ جواب تیسرے جواب کی طرف لوٹتا ہے البتہ کسب کا اثبات اس وقت ہے جب اس نے بندے کو فاعل نہ بنایا ہو۔ اس پر ایک دوسرے مقام میں مفصل گفتگو کی جا چکی ہے۔

سو جن لوگوں نے بندے کو کاسب بنایا ہے نا کہ فاعل۔ جیسے جہم صفوان، حسین نجار، ابو الحسن اشعری اور ان کے پیروکار کہ ان کا کلام متناقض ہے۔ اسی لیے یہ لوگ اس کسب پر اور کسب اور فعل کے درمیان فرق پر کوئی معقول گفتگو نہیں کر سکتے۔ سو کبھی تو یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ وہ قدرتِ حادثہ کے ساتھ مقدور ہے اور کبھی یہ کہتے ہیں کہ وہ محل قدرت یا قدرتِ حادثہ کے محل کے ساتھ قائم ہے۔

جب ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ قدرتِ حادثہ کیا ہے؟ تو کہتے ہیں کہ جو محل کسب کے ساتھ قائم ہو۔ وغیرہ وغیرہ کہ یہ عبادات اور جوابات دور کو مستلزم ہیں۔

پھر ان لوگوں کا یہ قول بھی ہے کہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ مختار کی حرکت اور رعشہ زدہ کی حرکت میں فرق ہے۔ بے شک یہ بات درست ہے لیکن یہ بات خود ان کے خلاف حجت ہے کیونکہ یہ فرق اس بات سے روکتا ہے کہ دونوں میں سے ایک دوسرے کو چھوڑ کر مراد ہو۔ کیونکہ یہ بات ممکن ہے کہ انسان دوسرے کے فعل کا ارادہ کرے۔ سو یہ فرق اس بات کی طرف لوٹے گا کہ بندے کی دونوں میں سے ایک پر قدرت ہے جس کے ذریعے فعل حاصل ہوتا ہے نا کہ دوسرا۔ اور فعل کسب ہے اور ایک ہی محل میں ایسی دو چیزیں معقول نہیں کہ دونوں میں سے ایک فعل ہو اور دوسری کسب۔

اہل سنت کا تقدیر پر اور شیطان سے پناہ جوئی:

[اعتراض]: [شیعہ مضمون نگار مزید لکھتا ہے]: اہل سنت کے بقول یہ لازم آتا ہے کہ ہم اللہ کی گرفت سے ڈر کر ابلیس لعین کی پناہ میں آئیں، جبکہ یہ آیت قرآنی: ﴿فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ﴾ (النحل: ۹۸) ''پس تم شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگو'' کے صریح منافی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل سنت کفار و ابلیس کو گناہوں سے منزہ قرار دے کر انہیں اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، بنا بریں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حق میں ابلیس سے بھی بدتر ہے۔ تعالیٰ اللہ عن ذلک۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جواب]: جواباً عرض ہے کہ یہ کلام کئی وجوہات کی بنا پر ساقط عن الاحتجاج ہے:

پہلی وجہ:...... چونکہ اس کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں:

۱۔ پہلی صورت یہ ہے کہ ابلیس نے کچھ افعال انجام دیے ہوں گے۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس نے کوئی کام نہ کیا ہو۔

بصورت ثانی اس کی پناہ حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے کہ جب ابلیس سرے سے کوئی کام ہی انجام نہیں دیتا تو وہ کسی کو پناہ بھی نہیں دے سکتا اور اگر بصورت اول وہ بعض افعال کا مرتکب ہو چکا ہے، تو وہ گناہوں سے منزہ نہیں ہوسکتا، لہٰذا اعتراض دونوں صورتوں میں باطل ہے خواہ تقدیر کا اثبات کیا جائے یا نفی۔ پس معلوم ہوا کہ یہ ایسے انسان کا اعتراض ہے جو دونوں اقوال سے غافل ہے۔ اسی طرح ابلیس کا فعل نہ ہونے کی تقدیر پر ہے کہ اب اس کا کوئی شر نہ ہوگا کہ یہ کہا جائے کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا اس سے زیادہ شریر ہے چہ جائیکہ یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ ابلیس سے زیادہ شر والا ہے۔

لہٰذا اس بات کا دعویٰ کہ: ''انہیں یہ بات لازم آتی ہے کہ اللہ ان پر ابلیس سے زیادہ شر والا ہو'' ایک باطل دعویٰ ہے کیونکہ زیادہ سے زیادہ یہ جبر محض کا عقیدہ ہے جیسا کہ جہم اور اس کے شیعہ کے بارے میں حکایت نقل کیجاتی ہے۔ اور اس قول کی غایت یہی ہے کہ ابلیس وغیرہ کی کوئی قدرت ومشیئت اور فعل نہیں ہے۔ بلکہ ابلیس کی حرکت ہوا کی حرکت کی طرح ہے۔ اس تقدیر کی بنا پر ابلیس میں نہ خیر ہے اور نہ شر؛ اور اس سب کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ سو اس تقدیر کی بنا پر یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ رب تعالیٰ کی بعض مخلوق اس سے زیادہ شر والی ہے۔

دوسری وجہ:...... یہ ہے کہ ابلیس سے پناہ جوئی اس صورت میں مستحسن ہے جب وہ پناہ دینے پر قادر ہو، خواہ اللہ تعالیٰ کو افعال العباد کا خالق قرار دیا جائے یا نہیں۔

یہ امر قابل غور ہے کہ اس کتاب کا شیعہ مصنف اور اس کے ہم نوا منکرین تقدیر یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ:

- ابلیس وہ کام انجام دیتا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اس کی تقدیر میں نہیں لکھے۔
- نیز یہ کہ ابلیس بلا ارادہ الٰہی بھی بعض افعال کا مرتکب ہوتا ہے۔
- اور رب تعالیٰ کی بادشاہی میں وہ بھی ہوتا ہے جو اس نے نہیں چاہا۔
- اور یہ کہ رب تعالیٰ ابلیس اور دوسرے زندوں کو حرکت دینے پر قادر نہیں۔
- وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو نیک عمل سے ہٹا کر برے کام پر نہیں لگا سکتا اور نہ یہ قدرت رکھتا ہے کہ افعال قبیحہ سے ہٹا کر نیک اعمال پر لگا دے۔

ان سب اقوال کے باوجود جو یہ لوگ ابلیس کے لیے ثابت کرتے ہیں نا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے۔ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ابلیس اللہ کے مقابلے میں کسی کو پناہ دینے کی اور کسی کو بچانے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اس بنا پر ابلیس سے استعاذہ ممتنع ٹھہرا اور اگر، معاذ اللہ! اس بات کو فرض کر لیا جائے کہ یہ لوگ جو لازم کرتے ہیں کہ مخلوق پر کوئی ابلیس سے بھی زیادہ شر ہوسکتا ہے اور وہ اس کے باوجود رب تعالیٰ کی قضا وقدر کو ہٹا دینے سے عاجز ہے تو پھر شیطان سے بلکہ کسی بھی مخلوق سے پناہ مانگنے والا بے یار و مددگار رہ جائے گا۔ جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا۝﴾ (الاسراء: ٢٢)

''اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود مت بنا، ورنہ مذمت کیا ہوا، بے یار ومددگار ہو کر بیٹھا رہے گا۔''

اور فرمایا:

﴿قُلْ مَنْ بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ٥ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ٥﴾ (المومنون : ۸۸۔ ۸۹)

''کہہ کون ہے وہ کہ صرف اس کے ہاتھ میں ہر چیز کی مکمل بادشاہی ہے اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں پناہ نہیں دی جاتی، اگر تم جانتے ہو؟ ضرور کہیں گے اللہ کے لیے ہے۔ کہہ پھر تم کہاں سے جادو کیے جاتے ہو؟''

اور فرمایا:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ٥﴾ (العنکبوت : ٤١)

''ان لوگوں کی مثال جنھوں نے اللہ کے سوا اور مددگار بنا رکھے ہیں مکڑی کی مثال جیسی ہے، جس نے ایک گھر بنایا، حالانکہ بے شک سب گھروں سے کمزور تو مکڑی کا گھر ہے، اگر وہ جانتے ہوتے۔''

تیسری وجہ: صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنے سجدوں میں یہ دعا مانگا کرتے تھے:

((اَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ لا أحصى ثناءً عليك ؛ أنت كما أثنيت على نفسك .)) [1]

''اے اللہ! میں تیرے رضا کے طفیل تیری ناراضی سے (پناہ مانگتا ہوں) اور تیری معافی کے طفیل تیری عقوبت سے اور تیرے طفیل تجھ سے پناہ مانگتا ہوں۔ میں تیری ثناء شمار نہیں کرسکتا تو ویسا ہی ہے جیسا کہ تو نے خود اپنی تعریف بیان کی ہے۔''

ایک روایت میں یہ بھی ہے آپ ﷺ یہ دعا وتروں میں پڑھا کرتے تھے۔ اس حدیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات و افعال کے ساتھ اس کی بعض دوسری صفات اور افعال سے پناہ طلب کیا کرتے تھے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے عقاب و عتاب سے خود اسی کی پناہ طلب کرتے تھے، پھر یہ کیونکر منع ہوا کہ اس کی بعض مخلوقات کی ایذا سے اس کی پناہ طلب کی جائے۔

چوتھی وجہ:...... یہ کہا جائے گا کہ: اہل سنت کے ہاں اس بات میں کوئی قباحت نہیں پائی جاتی کہ بندہ اپنے رب کی پناہ طلب کرکے اور اسے پکار کر اپنی حاجات و ضروریات مطلوبہ کے پانے یا مرہوب کے دفع کرنے کا سبب بنے جیسے وہ اعمال صالحہ جن کا حکم وارد ہوا ہے۔ سو اہل سنت جب رب تعالیٰ سے شیطان مردود سے پناہ مانگتے ہیں تو ان کا نفس استعاذہ اس بات کا سبب ہوتا ہے کہ رب انہیں شیطان سے پناہ دے دیتا ہے۔

[1] صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب ما یقال فی الرکوع والسجود، (حدیث:٤٨٦)

❀ ہم نے بعض ظلم و ستم پر قادر لوگوں کو دیکھا ہے کہ جب وہ ظلم و عدوان سے کسی کے ضرر کا حکم دیتے ہیں اور تب ان سے کوئی پناہ مانگ لے اور ان کے آگے عاجزی و زاری کرنے لگے تو اس پر ہونے والے ظلم کو روک دینے کا حکم دے دیتا ہے۔ پھر رب تعالیٰ کے لیے تو اونچی مثال ہے۔ وہ تو ظلم و ستم سے منزہ ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ مہربان ہے جتنی والدہ اپنی اولاد پر مہربان ہوتی ہے، لہٰذا اسباب شر سے اس کی پناہ طلب کرنا عین قرینِ عقل و دانش ہے۔

دوسرا طریق:......اربابِ علت و حکمت کا قول ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو اسی طرح پیدا کیا جس طرح سانپوں، بچھوؤں اور آگ جیسی موذی اشیاء کو۔ کیونکہ ان کی تخلیق گہری حکمت و مصلحت پر مبنی ہے۔ اس کے پہلو بہ پہلو اس نے حکم دیا ہے کہ ہم امکانی حد تک اپنے سے ضرر و ایذا کو دور کریں جس کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ اس کے دامن حکمت و رحمت میں پناہ لی جائے۔''

[اہل سنت پر شیعہ مصنف کا افتراء]:

[اشکال] : چھٹی وجہ: شیعہ مضمون نگار کا کہنا ہے کہ: ''اہل سنت کے یہاں کا فرو ابلیس گناہوں سے پاک ہیں، اور ان کو اللہ کی طرف منسوب کر دیا ہے وغیرہ وغیرہ۔''

[جواب] : یہ صریح قسم کا بہتان ہے۔ بخلاف ازیں اہل سنت بالاتفاق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ معصیت کا ارتکاب کرنے والا عاصی اور قابل مذمت ہے۔ نیز یہ کہ افعال کے ساتھ اس شخص کو موصوف کر سکتے ہیں جو ان کو انجام دیتا ہو، پیدا کرنے والے کو نہیں۔ تو جب ان باتوں کا ارادہ سے تعلق بھی نہ تھا۔ جیسے ذائقے اور رنگ کہ ان سے متصف ان کے محل ہوتے ہیں نا کہ ان کا خالق تو پھر افعالِ اختیاریہ کا کیا حال ہوگا؟

رب تعالیٰ نے جب ان فواسق کو پیدا فرمایا: جیسے سانپ، بچھو، پاگل کتے وغیرہ، اور ان کو فواسق قرار دیا تو کیا رب تعالیٰ ان سے موصوف بھی کہلائے گا؟ اور جب اس نے خبیث چیزوں کو پیدا کیا جیسے نجاستیں، گندیاں، خون اور شراب وغیرہ اور ان اشیاء کو خبیث کو ٹھہرایا تو کیا وہ ان اشیاء سے متصف بھی ٹھہرے گا؟ بھلا کہاں اس صفت کی اس موصوف کی طرف نسبت جو اس موصوف کے ساتھ قائم ہے اور کہاں اس مخلوق کی اپنے خالق کی طرف نسبت؟ جو ان دونوں فرقوں کو نہ سمجھے تو سمجھ لو کہ اس سے انسانیت مسلوب ہو چکی ہے۔

ساتویں وجہ:...... یہ کہ رب تعالیٰ نے ہمیں عذابِ قبر اور عذابِ جہنم وغیرہ سے پناہ مانگنے کا حکم دیا ہے جن کے مخلوق ہونے پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ تو معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ کے پیدا کردہ شر سے پناہ مانگنے میں کوئی امتناع نہیں۔ جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِo مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَo﴾ (الفلق : ۱ ـ ۲)

''تو کہہ میں مخلوق کے رب کی پناہ پکڑتا ہوں۔ اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی۔''

اوراس باب میں ابلیس اور دوسری مخلوقات میں کوئی فرق نہیں۔

فصل:...... وعد و وعید پر عدم اعتماد؟

رافضی کا قول کہ:''اللہ کے وعدہ اور وعید میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔''

منکر تقدیر شیعہ انتہائی طوالت سے کام لیتے ہوئے لکھتا ہے:''اہل سنت کے نقطۂ نظر کے مطابق اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور وعید پر سے اعتماد اٹھ جائے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی جانب دروغ گوئی کی نسبت درست ہے، بنا بریں اس کی دی ہوئی خبریں بھی جھوٹ ہوں گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انبیاء کی بعثت عبث ہوگی اور کسی فائدہ کی موجب نہیں ہوگی۔ بلکہ یہ بھی جائز ٹھہرا کہ وہ کذابوں کو بھی بھیج سکتا ہے پس سچے اور جھوٹے نبیوں میں فرق کرنے کی کوئی سبیل ہمارے ہاتھوں میں باقی نہ رہی۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]۔

[جواب]: اس بات کا جواب کئی طرح سے دیا جا سکتا ہے۔

اوّل:...... بارہا یہ بات گزر چکی ہے کہ جس بات سے وہ خود متصف ہے اس میں اور اس میں فرق ہے جس کو اس نے اپنے غیر کی صفت بنا کر پیدا کیا ہے اور یہ کہ مخلوق کی اپنے خالق کی طرف نسبت میں اور صفت کی اپنے موصوف کی طرف نسبت میں فرق ہے۔ خالق و فاعل کے مابین فرق و امتیاز سب عقلاء کے نزدیک مسلم ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ جب کسی چیز میں حرکت پیدا کریگا تو ذات باری کو متحرک قرار نہیں دے سکیں گے، جب وہ بادل میں گرج پیدا کرتا ہے، تو گرج کو اس کی آواز نہیں کہہ سکتے۔ بعینہ اسی طرح جب وہ حیوانات و نباتات میں مختلف قسم کے رنگ پیدا کرتا ہے، تو اسے ان رنگوں سے موصوف قرار نہیں دے سکتے۔ جب وہ کسی چیز میں علم اور حیات و قدرت کی صفات پیدا کرتا ہے تو یہ اس کی صفات نہیں کہلاسکتیں۔ علی ہذا القیاس جب وہ کسی چیز میں اندھا پن اور بہرہ پن پیدا کرتا ہے، تو یہ اس کی صفت نہیں کہلاتی جب اللہ تعالیٰ کسی میں روزہ، طواف اور خشوع وخضوع پیدا کرتا ہے تو اسے روزہ دار، طواف کنندہ اور خاشع کے ناموں سے یاد نہیں کیا جا سکتا، باقی رہی قرآن حکیم کی یہ آیت کریمہ:﴿ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ﴾ (الانفال:۱۷)

''جب آپ نے تیر پھینکا تو وہ آپ نے نہیں بلکہ اللہ نے پھینکا ہے۔''

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بلاشبہ وہ تیر آپ نے پھینکا ہے، مگر اسے نشانہ پر لگانا آپ کا فعل نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور اس کی عنایت ہے۔ آیت کا حاصل یہ ہے کہ تیراندازی سرور کائنات ﷺ کا فعل ہے اور اسے دشمنوں تک پہنچانا اللہ کا کام۔ پس تیراندازی آپ کے دست مبارک کی طرف منسوب ہوئی اور اس کی ہدف تک رسائی اللہ تعالیٰ کی طرف۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ تیرانداز اور تیراندازی دونوں اللہ کے پیدا کردہ ہیں۔ لہٰذا حقیقی تیرانداز اللہ تعالیٰ کی ذات ہے یہ خیال قطعی طور پر بے بنیاد ہے۔ کیونکہ اگر یہ بات درست ہوتی کیونکہ وہ تیراندازی کا خالق ہے تو یہ بات دیگر جملہ افعال میں بھی جاری ہوگی۔ تب پھر لوگ یہ بھی کہہ سکتے کہ میرا چلنا دراصل اللہ کا چلنا ہے اور میرا تھپڑا مارنا

دراصل اللہ کا تھپڑ مارنا ہے۔ اسی طرح سوار ہونا، نماز وغیرہ کا ادا کرنا یہ بھی دراصل اسی کا فعل ہے کیونکہ وہ ان سب افعال کا خالق ہے۔ حالانکہ ان سب باتوں کے باطل ہونے کو سب جانتے ہیں۔[[اگر کسی چیز کے پیدا کرنے کی بنا پر اس کی نسبت ذات باری کی جانب کی جا سکتی تو ہر فعل کو اللہ کی جانب منسوب کر دیا جاتا، حالانکہ یہ بداہۃً غلط ہے]]۔ بلا شبہ یہ تقدیر کے قائلین کا غلو ہے۔ روایات میں مذکور ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ محصور ہوئے تو بلوائی آپ پر پتھر پھینکنے لگے، حضرت عثمان نے پوچھا تم پتھر کیوں پھینکتے ہو......؟ وہ کہنے لگے ہم پتھر نہیں پھینک رہے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ پھینکتا ہے، آپ نے فرمایا: تم جھوٹ کہتے ہو اگر اللہ تعالیٰ پتھر پھینکتا تو اس کا نشانہ ہرگز نہ چوکتا مگر تمہارے سب نشانے بیکار ثابت ہو رہے ہیں۔''

یہ منکرین تقدیر کی حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر حجت ہے کہ وہ اس بات کے قائل نہ تھے کہ اللہ افعالِ عباد کا خالق ہے۔ جیسا کہ بعض مثبتہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے:

﴿وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی﴾ (الانفال: ۱۷)

''اور لیکن اللہ نے [تیر] پھینکا۔''

لیکن یہ دونوں فریق ہی خطا پر ہیں۔ کیونکہ رب تعالیٰ جب کسی بندے میں ایک فعل کو پیدا کرتے ہیں تو لازم نہیں کہ وہ بندے سے درست بھی ہو۔ جیسے کسی جسم میں بو کو پیدا کرنے سے یہ لازم نہیں کہ وہ جو خوش گوار بھی ہو۔ اسی طرح کسی بندے میں آنکھیں اور زبان پیدا کرنے سے یہ لازم نہیں آ جاتا کہ وہ بصیر اور ناطق بھی ہو۔ سو لوگوں میں پائے جانے والے کذب کی استناد ایسی ہی ہے جیسی مخلوقات میں موجود صفاتِ قبیحہ اور احوال مذمومہ کی استناد ہے۔ کہ یہ اس کے فی نفسہ مذموم ہونے کو مقتضی نہیں اور نہ اس بات کو مقتضی ہے کہ وہ ان صفات کے ساتھ متصف بھی ہے۔ البتہ استناد کا لفظ مجمل ہے۔ کیا مخلوق کے عجز کو محض اس لیے اللہ کی طرف منسوب کرنا جائز ہوگا کہ وہ اس عجز کا خالق ہے؟ بلا شبہ یہ دلیل واضح طور پر باطل ہے۔

دوم: ان کی رائے میں اللہ تعالیٰ یہ جانتے ہوئے دروغ گوئی کی قدرت پیدا کرتا ہے کہ وہ شخص جھوٹ بولے گا۔ اسی طرح وہ اس علم کے باوصف ظلم و فحش کی قدرت عطا کرتا ہے، کہ یہ آدمی ظلم و فحش کا مرتکب ہوگا۔

یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ ہم میں سے جو شخص افعال قبیحہ کے انجام دینے میں کسی کی مدد کرتا ہے، وہ گویا بذات خود ان افعال کا ارتکاب کرتا ہے، بنا بریں ظلم و کذب کی مدد کرنے والے کو ظالم و کاذب قرار دیا جائے گا۔ اور ہمارے لیے گناہ کے کام پر کسی کی مدد کرنا جائز نہیں۔ اس بات سے خود اللہ نے بھی منع فرمایا ہے۔ سو جو بات اس سے قبیح ہے وہ ہم سے بھی قبیح ہے تو لازم آیا کہ اس پر اس بات کو جائز قرار دیا جائے کہ جب وہ کذب پر اعانت کرتا ہے تو کذب بھی کرتا ہے اور یہ محذور ہے جو ان اہل سنت کو لازم آ رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کا اثبات:

اگر سوال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو قدرت اطاعت کے لیے عطا کی ہے نافرمانی کے لیے نہیں۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب اسے معلوم تھا کہ قدرت ملنے پر نافرمانی کرے گا تو یہ اسی طرح ہوا جیسے کسی کو کفار سے جہاد کرنے کے لیے تلوار دی جائے جب کہ یہ معلوم ہو کہ وہ اسی تلوار سے کسی نبی کو قتل کر دے گا۔ ظاہر ہے کہ جب یہ باتیں بندوں کے بھی مناسب حال نہیں ہیں؛ کیونکہ جو آدمی یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ غرض مجھے حاصل نہ ہوگی؛ پھر بھی وہ فعل کرے تو اسے ہمارے نزدیک نادان تصور کیا جاتا ہے؛ تو اللہ کی ذات اس سے کہیں بلند ہے۔ سو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے افعال میں حکم اپنے بندوں کے افعال کے برعکس ہوتا ہے۔ بھلے ان لوگوں نے اس کی کوئی ایسی علت بیان کی ہو جو اسے مستقیم کر دے تو انہیں کہا جائے گا کہ اسی طرح وہ غیر میں جو پیدا کرتا ہے اس کی حکمت ہوتی ہے جیسے قدرت کے ساتھ اس پر اعانت کرنے میں حکمت ہوتی ہے۔

سوم :...... یہ کہا جائے کہ: یہ بات کہ ہر وہ چیز جو ممکن الوقوع ہو اور اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہو تو یہ ضروری نہیں کہ وہ چیز وقوع پذیر بھی ہو جائے۔ بخلاف ازیں ہم قطعی طور پر جانتے ہیں کہ قدرت کے باوصف وہ بہت سے کام انجام نہیں دیتا، مثلاً وہ سمندر کو پارے میں تبدیل نہیں کرتا، پہاڑوں کو یاقوت کی شکل میں تبدیل نہیں کرتا۔ سب کو مسخ کر کے بندر اور خنزیر نہیں بناتا اور نہ اس نے سورج اور چاند کو درخت کی دو ڈالیاں بنایا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کذب سے منزہ ہے اور کذب کا صدور اس سے محال ہے۔

چہارم:...... ہم کہتے ہیں: ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ صفاتِ کمال سے موصوف ہے، موجودات عالم میں جو بھی کمال پایا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کا زیادہ حق دار ہے، وہ ہر نقص و عیب سے منزہ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ حیات اور علم و قدرت صفاتِ کمال ہیں لہٰذا وہ ان کا زیادہ مستحق ہے، راست بازی و صداقت بھی اس کا خاص وصف ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا﴾ (النسآء: ۸۷)

''اللہ (وہ ہے کہ) اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ہر صورت تمھیں قیامت کے دن کی طرف (لے جا کر) جمع کرے گا، جس میں کوئی شک نہیں اور اللہ سے زیادہ بات میں کون سچا ہے۔''

نبی کریم ﷺ اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا کرتے تھے:

((اِنَّ اَصْدَقَ الْكَلَامِ كَلَامُ اللّٰهِ))[1]

''بیشک سب سے سچا کلام اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔''

---

[1] النسائی۔ کتاب صلاۃ العیدین۔ باب کیف الخطبة (ح: ۱۵۷۹) کتاب السهو۔ باب نوع آخر من الذکر بعد التشهد (ح: ۱۳۱۲) بلفظ" احسن الكلام كلام الله" المطالب العالية (۳۱۰۵) بلفظ " ان اصدق الحديث كلام الله۔"

پنجم:...... یہ کہا جائے کہ سلف وخلف اہل سنت والجماعت کا اس بات پر اتفاق ہے اللہ تعالیٰ کا کلام اس کے ساتھ قائم اور غیر مخلوق ہے۔ پھر اختلاف اس امر میں ہے کہ آیا وہ اپنی قدرت ومشیئت کے ساتھ کلام کرتا ہے یا نہیں؟ اس بارے دو اقوال معروف ہیں۔ پہلا قول اسلاف اور جمہور کا ہے جبکہ دوسرا قول ابن کلاب اور اس کے متبعین کا ہے۔

❀ پھر ابن کلاب کے متبعین کا اس میں اختلاف ہے؛ کہ کیا وہ قدیم جو معنوی طور پر اس کی مشئیت اور قدرت سے تعلق نہیں رکھتا؛ اور وہ بذات خود قائم ہے؛ اور کیا حروف؛ یا حروف اور اصوات ازلی ہیں؟ اس میں دو قول ہیں؛ اور ان پر اپنی جگہ پر تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ پس جب معاملہ ایسے ہی ہے تو پھر جس نے یہ کہا کہ وہ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی مشئیت سے نہیں ہے تو یہ بات بھی ممتنع ٹھہری کہ کوئی دوسرا اس کے ساتھ قائم ہو؛ جس کے ساتھ وہ متصف ہے۔ اب ان کے نزدیک صدق ایک علم ہے یا ایسا معنی ہے جو علم کو مستلزم ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ علم اس کی ذات کے لوازم میں سے ہے اور علم کے لوازم اس کی ذات کے لوازم میں سے ہوئے لہٰذا صدق اس کی ذات کے لوازم میں سے ہوا۔ تب پھر اس کا اپنی نقیض کے ساتھ متصف ہونا ممتنع ہوا۔ کیونکہ لازم کا عدم ملزوم کے عدم کو مقتضی ہے۔ دروغ گوئی، بہرے پن اور گونگے پن کی طرح ایک عیب ہے۔ اللہ تعالیٰ بلاشبہ گونگے اور بہرے لوگوں کو پیدا تو کرتا ہے، مگر بذات خود اس میں یہ عیب نہیں پایا جاتا۔ بعینہ اسی طرح وہ کاذب میں کذب کو تو پیدا کرتا ہے، مگر خود دروغ گوئی کا ارتکاب نہیں کرتا۔ تو یہ بھی واجب ٹھہرا کہ وہ صدق کے ساتھ کذب کے بغیر متصف ہو۔[1]

رہا یہ کہنا کہ کلام اس کی قدرت ومشیئت کے متعلق ہے۔ تو ان کے اکثر یہ کہتے ہیں کہ وہ کسی حکمت سے کلام اور فعل کرتا ہے اور وہ فعل قبیح سے منزہ ہے اور ان لوگوں کے رب تعالیٰ کو فعل قبیح سے منزہ قرار دینے کے دلائل معتزلہ کے دلائل سے زیادہ قوی اور عظیم تر ہیں۔ کیونکہ ہر وہ دلیل جو اس بات پر دلالت کرے کہ وہ ہر قبیح فعل سے منزہ ہے اور وہ فعل اس کی ذات سے منفصل ہے۔ تو وہ دلیل اس بات پر بدرجہ اولیٰ دلالت کرتی ہے کہ وہ ایسے ہر فعل قبیح سے منزہ ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہو۔ کیونکہ اس کی ذات کے ساتھ قائم قبائح کا نقص ہونا، اس کی ذات سے منفصل قبیح افعال کے نقص ہونے سے زیادہ ظاہر ہے۔ ت وجب یہ ممتنع ہوا تو وہ تو بدرجہ اولیٰ ممتنع ہوا۔

ششم:...... دلائل عقلیہ بھی یہی بتلاتے ہیں کہ رب تعالیٰ کی ذات کا نقائص وقبائح کے ساتھ متصف ہونا ممتنع ہے اور یہ کہ وہ جس بات کے ساتھ بھی متصف ہے، وہ اس کی ذات کے ساتھ قائم بھی ہے۔ اب کلام متکلم کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ لہٰذا رب تعالیٰ کا کذب کے ساتھ تکلم ممتنع ہوا۔ کیونکہ اس کا کلام اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور یہ بات ممتنع ہے

[1] اس میں شبہ نہیں کہ کلام ایک صفت کمال ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کا اس سے متصف ہونا ناگزیر ہے، خواہ کلام کی کوئی صورت بھی ہو، اس ضمن میں ان کے متعدد اقوال ہیں:

پہلا قول یہ ہے کہ صفت کلام اللہ کی قدرت ومشیت سے وابستہ نہیں یہ ایک ایسی صفت ہے جو بذات خود قائم ہے۔

دوسرا قول: کلام حروف یا اصوات قدیمہ کا نام ہے۔ تیسرا قول: کلام مشیت ایزدی سے متعلق ہے۔

چوتھا قول: اللہ تعالیٰ پہلے متکلم نہ تھا یہ صفت بعد ازاں اس میں پیدا ہوئی۔ پانچواں قول: وہ ازل ہی سے متکلم تھا۔

کہ ایسی قبیح بات اس کے ساتھ قائم ہو جسے اس نے اختیار کیا ہے۔

رب تعالیٰ کو کذب سے منزہ قرار دینے کا یہ طریق انہی لوگوں کے ساتھ خاص ہے جو اہل اثبات ہیں۔معتزلہ اس طور پر رب تعالیٰ کو کذب سے منزہ قرار نہیں دے سکتے۔کیونکہ ان معتزلہ کے نزدیک رب تعالیٰ کا کلام اس کی ذات سے منفصل اور جدا ہے۔سو جب یہ اہل اثبات ان معتزلہ سے یہ کہتے ہیں کہ دلیل تو صرف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس کی ذات فی نفسہ قبائح کے ساتھ متصف ہونے سے منزہ ہونے پر اور قبیح فعل کرنے سے منزہ ہونے پر دلالت کرتی ہے، اور فعل وہ ہوتا ہے جو فاعل کے ساتھ قائم ہو۔اور رہی منفصل کی بات ؛ تو وہ فاعل کا مفعول ہوتا ہے نا کہ اس کا فعل اور تم لوگوں نے ایسی کوئی دلیل ذکر نہیں کی جو اس کے مفعولات میں وقوع کے امتناع پر دلالت کرے اور یہی محمل نزاع ہے اور ان لوگوں کی دلیل قدریہ پر ظاہری حجت ہے۔

ہفتم :...... یہ کہ اس کا کلام جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے وہ اہل سنت کے نزدیک غیر مخلوق ہے۔کیونکہ کلام صفت کمال ہے۔لہٰذا لازمی ہے کہ رب تعالیٰ اس کے ساتھ متصف ہو۔چاہے وہ یہ کہیں کہ اس کا اس کی قدرت ومشیئت سے تعلق نہیں اور وہ ایک معنیٰ ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔یا وہ قدیم حروف اور آواز ہے۔یا وہ یہ کہیں کہ وہ اس کی قدرت ومشیئت کے متعلق ہے یا وہ غیر متکلم ہونے کے بعد متکلم ہے۔یا وہ ہمیشہ سے متکلم ہے جب چاہے۔غرض ان سب اقوال کے مطابق کلام اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور کذب یہ نقص ہے جیسے اندھا پن، گونگا پن اور بہرا پن اور رب تعالیٰ اس بات سے منزہ ہے کہ اس کی ذات کے ساتھ نقائص قائم ہوں۔باوجود یہ کہ اس نے ایسی مخلوقات کو پیدا کیا ہے جو نقائص سے متصف ہیں۔سو وہ اندھا پن، گونگا پن اور بہرا پن پیدا کرتا ہے پر یہ امور اس کی ذات کے ساتھ قائم نہیں ہیں۔اسی طرح وہ کاذب میں کذب کو پیدا کرتا ہے لیکن یہ کذب خود اس کی ذات کے ساتھ قائم نہیں۔

ہشتم:...... یہ سوال شیعہ پر وارد ہوتا ہے، شیعہ کا عقیدہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ دوسروں میں کلام پیدا کرتا ہے۔اندریں صورت کلام کا قیام اگرچہ دوسروں کے ساتھ ہوتا ہے مگر اسے اللہ کا پیدا کردہ قرار دیں گے۔اس کے ساتھ ساتھ شیعہ یہ بھی کہتے ہیں کہ:''جو کلام بندوں سے صادر ہوتا ہے وہ خدا کا کلام نہیں اور اس کا پیدا کردہ بھی نہیں۔''جب ان کے نزدیک یہ دونوں باتیں درست ہیں تو اس بات کا اعتراف کرنا ان کے لیے ناگزیر ہے کہ یہ اس کا کلام ہے اور وہ اس کا کلام نہیں۔

[شبہ: جھوٹے انبیاء کی بعثت اور اس پر رد]:

[اعتراض]: شیعہ مصنف کہتا ہے:

''اہل سنت کے قول کے مطابق یہ لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ جھوٹے نبی بھیجتا ہے۔''[انتہی کلام الرافضی]۔

[جواب]:اس کا جواب کئی طرح سے دیا جا سکتا ہے:

اول:...... بلاشبہ اللہ تعالیٰ جھوٹوں کو بھی بھیجتا ہے، جیسا کہ شیاطین کے بھیجنے کا اس آیت میں ذکر ہے۔ارشاد ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ تَؤُزُّھُمْ اَزًّاo﴾ (مریم: ۸۳)

’’کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بے شک ہم نے شیطانوں کو کافروں پر چھوڑ رکھا ہے، وہ انھیں ابھارتے ہیں، خوب ابھارنا۔‘‘:

اورانہیں مبعوث بھی کرتا ہے۔جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ﴾ (الاسراء: ۵)

’’تو ہم نے تم پر اپنے سخت لڑائی والے کچھ بندے بھیجے۔‘‘

لیکن یہ تب ہی ہو گا جب ان کے ساتھ وہ امر بھی بھیجا جائے جو ان کے کذب کو عیاں کر دے۔ مثلاً مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی جھوٹے نبی تھے؛ اللہ تعالیٰ نے ان کا کاذب ہونا رسول اللہ ﷺ کے ذریعے واضح کر دیا تھا،[بنا بریں ان کا صدق وکذب کسی پر مخفی نہیں رہا]۔اسی طرح ظالم جاہل، فاجر، اندھے، اور بہرے وغیرہ کو بھیجنا ہے کہ ان میں ایسے امور ضرور ہوتے ہیں جن کی مدد سے ان میں اور دوسروں میں فرق کیا جا سکے۔ پھر لفظ ’’ارسال‘‘ یہ ہواؤں کے بھیجنے کو بھی اور شیاطین کے بھیجنے کو بھی دونوں کو شامل ہے؛ اور اس کے علاوہ کو بھی۔

دوم:...... یہ کہا جائے کہ: ان کے نزدیک یہ بات جائز ہے کہ وہ ایسے کو پیدا کرے کہ جس کے کاذب ہونے کو وہ جانتا ہے اور وہ اسے کذب پر قدرت بھی دیتا ہے۔ جیسے اس نے مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی کو پیدا کیا،سو جب رب تعالیٰ کا مسیلمہ کو پیدا کرنا جائز ٹھہرا جبکہ اس نے اس میں اور صادق میں فرق کو بھی واضح کر دیا تو اس کا کذاب کو اس کے کذب کے ساتھ پیدا کرنا بھی جائز ٹھہرا۔

سوم:...... جب اس نے مدعی نبوت کو پیدا کیا حالانکہ وہ کاذب ہوتا ہے۔ پھر اگر یہ کہتے ہیں کہ اس پر سچ کی نشانیاں کا اظہار بھی جائز ہے تو یہ ممتنع ہے اور بالاتفاق باطل ہے اور اگر یہ اسے ناجائز کہتے ہیں تو سچ کی نشانیوں کے بغیر نبوت کا محض دعویٰ مضر نہیں۔ کیونکہ اگر کسی دلیل کے بغیر کوئی اپنے طبیب یا سنار ہونے کا دعویٰ کرے تو اسے کوئی لائق التفات نہیں سمجھتا چہ جائیکہ مدعی نبوت بلا دلیل کے؟

❀ اگر یہ کہا جائے کہ جب اللہ تعالیٰ کاذب کی ذات میں کذب کو پیدا کر سکتا ہے تو اس کے ہاتھوں ایسے معجزات کیوں ظاہر نہیں کر سکتا جو اس کی صداقت کی دلیل ہوں......؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا ممکن نہیں، اس لیے کہ صدق کے دلائل صداقت کو مستلزم ہیں، کیونکہ دلیل مدلول کو مستلزم ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ کذاب پر علامات صدق کا اظہار ممتنع لذاتہ ہے۔

❀ اگر وہ کہیں کہ کذاب کے ہاتھوں خوارق کا ظہور جائز ہے،تو ہم کہیں گے کہ مدعی الوہیت مثلاً دجال کے حق میں یہ جائز ہے۔ مدعی نبوت سے خوارق کا ظہور صرف اس صورت میں ممکن ہے جب ان خوارق سے اس کی صداقت واضح نہ ہوتی ہو جس طرح ساحر و کاہن سے ایسے خوارق کا ظہور جائز نہیں جو اس کے صدق کی دلیل ہوں۔اس مسئلہ پر اپنی جگہ پر تفصیل کے ساتھ گفتگو ہو چکی ہے۔

چہارم : یہ ہے کہ نبوت کے دلائل و براہین کا دائرہ صرف خوارق ہی میں نہیں بلکہ ان کی کئی قسمیں ہیں جس طرح جھوٹ کی پہچان حاصل کرنے کے متعدد طریقے ہیں۔اس مسئلہ پر بھی اپنی جگہ پر تفصیل کے ساتھ گفتگو ہو چکی ہے۔

فصل:......مسئلہ تقدیر اور تعطیل حدود

[اہل سنت کے عقیدہ تقدیر سے متعلق مسئلہ پر رافضی کا کلام کہ ''اس سے تو حدود اور معاصی پر زجر کا تعطل لازم آتا ہے'' اور اس کا ردّ]

[اعتراض] : شیعہ مضمون نگار لکھتا ہے:''اگر اہل سنت کی بات تسلیم کر لی جائے تو اس سے شرعی حدود کا بے کار ہونا لازم آتا ہے،مثلاً زنا اور سرقہ جیسے جرائم کا صدور جب اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے مطابق ہوا اور اس کا ارادہ ان افعال کی انجام دہی میں مؤثر ہو تو کسی بادشاہ کو اس پر گرفت کرنے کا حق حاصل نہ ہوگا۔اس لیے کہ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ چور کو اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے باز رکھنے کے لیے کوشاں ہوتا ہے۔اور اسے ایسے کام پر لگاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔ظاہر کہ اگر کوئی شخص ہمیں اپنے ارادہ کی تکمیل سے باز رکھنے کی کوشش کرے تو ہمیں اس سے کوفت ہوگی،اور ایسا کرنے والا ملامت کا مستحق ٹھہرے گا؛ تو پھر اللہ تعالیٰ کو یہ بات کیوں کر پسند ہوگی؟ اس سے یہ بھی لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نقیضین کو عملی جامہ پہنانا چاہتا ہے،ایک طرف تو وہ معصیت کا ارادہ کرتا ہے اور پھر اس سے روکتا بھی ہے۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جواب] : ہم کہتے ہیں: گزشتہ میں اس کی کافی وضاحت گزر چکی ہے لیکن پھر بھی ہم یہاں اس کا متعدد طرح سے جواب دیں گے۔ان شاءاللہ!

اول:...... یہ کہ اللہ تعالیٰ نے صرف ان امور کو مقدر کیا تھا جو ظہور پذیر ہو چکے، جو امور تاہنوز عالم وجود میں نہیں آئے، وہ اللہ کے علم میں بھی مقدر نہیں تھے۔ جو امور وقوع پذیر ہو چکے ہیں،کوئی شخص ان کے روکنے پر قادر نہ تھا۔شرعی حدود و زواجر سے ان امور کو روکا جاتا ہے، جو ابھی وقوع میں نہیں آئے۔سو جو اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ ہوا اور جو نہ چاہا وہ نہ ہوا۔

❀ شیعہ مصنف کا یہ قول کہ:''وہ شخص چور کو اللہ کے ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔''

❀ یہ صریح جھوٹ ہے؛ کیونکہ وہ شخص تو چور کو اس کام سے روکنا چاہتا ہے جو اس نے ابھی سرانجام نہیں دیا، اور جو کام ابھی وقوع پذیر نہیں ہوا، اس کا ارادہ اللہ نے بھی نہیں کیا۔یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص حلف اٹھا کر کہے کہ ان شاء اللہ وہ اس مال کو چرا لے گا اور پھر اسے نہ چرائے تو وہ اجماعاً اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں چاہا کہ وہ چوری کا مرتکب ہو۔

[ارادہ اور امر میں فرق و امتیاز:]

بخلاف ازیں قدریہ (منکرین تقدیر) ارادہ کو امر کے معنی میں لیتے ہیں؛ وہ اس زعم باطل میں مبتلا ہیں کہ سرقہ جب اللہ تعالیٰ کے ارادے سے وقوع میں آتا ہے،تو وہ مراد کے ساتھ ساتھ مامور بہ بھی ہے۔

حالانکہ تمام مسلمانوں کا اجماع ہے؛ اور ان کے دین میں یہ بات بدیہی اور اضطراری طور پر معلوم شدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سرقہ کا حکم نہیں دیا۔اب جوکوئی اس بات کا قائل ہے کہ جو واقع ہو وہ مراد ہوتا ہے تو وہ یہ کہہ رہا ہے کہ یہ مراد ہے پر مامور بہ نہیں ۔اور جوشخص اس کا قائل ہے کہ چوری مراد اور مامور ہے؛ اس کا کفر کسی شک وشبہ سے بالا ہے۔لیکن یہ بات کبھی کبھی ان اباحیت پسندوں اور قدر کی آڑ میں گناہوں پر دلیل پکڑنے والوں کو کہی جاتی ہے کیونکہ ان میں سے کوئی اس بات کا قائل نہیں ہوتا کہ وہ انسان کا اس گناہ میں معارضہ کرے جو اس کے نزدیک اس کے مقدر میں ہے؛ اور جو کوئی اس بات کا قائل ہے کہ وہ اس پر معاونت کرے؛ کیونکہ اس کے گمان میں یہ رب تعالیٰ کی مراد ہے اور اگر چہ یہ فعل حرام اور معصیت ہے لیکن وہ رب تعالیٰ کی مراد سے نہیں روکتے۔سو معلوم ہوا کہ کسی بھی لحاظ سے مرادالٰہی سے روکنا ممکن نہیں۔

دوم:...... یہ کہا جائے کہ گزشتہ میں یہ بات ذکر کی جا چکی ہے کہ معاصی، قبائح اور ظلم سے روکنا، ظالم سے دفاع کرنا، اس سے مظلوم کا حق لینا اور ظلم پر تقدیر کو حجت بنانے والوں پر رد کرنا لوگوں کی فطرتوں میں جا گزیں ہے باوجود یہ کہ وہ تقدیر کو بھی مانتے ہیں اور یہ کہ اگر لوگ جو چاہے برائی کریں اور اس پر تقدیر کی پناہ لینے لگ جائیں کہ نظامِ زندگی درہم برہم ہو جائے۔ یہ گناہوں پر تقدیر کو آڑ بنانے والے یہود ونصاریٰ سے بھی بدتر ہیں حالانکہ وہ منکرین تقدیر سے بھی برے ہیں۔

سوم:......علاوہ ازیں اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ بندہ کی تقدیر میں بعض باتیں ایسی مقدر ہوتی ہیں جن کا دور کرنا ایک امر مستحسن ہوتا ہے۔جیسے مرض وغیرہ کہ یہ بالاتفاق رب تعالیٰ کا فعل اور اس کی مراد ہے۔لیکن اس باوجود روادار رواور حزم واحتیاط کر کے اس کا دفعیہ مستحسن ہے۔حالانکہ یہ مرادالٰہی کو دور کرنا ہے۔

پھر اگر یہ کہا جائے کہ سارق کا قطع مرادِالٰہی کو روکنا ہے تو مرض میں دوا پینا بھی اسی قبیل میں سے ہے۔اسی طرح سیلابوں کی روک تھام، آگ بجھانا، گرتی دیوار کو سیدھا کرنا جیسا کہ جنابِ خضر عَلَیْہِ السَّلَام نے کیا تھا۔کھا پی کر بھوک مٹانا، سردی گرمی کو دور کرنا، دھوپ میں سایہ لینا وغیرہ بھی اسی قبیل میں سے ہوگا۔ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ:

> ''اے اللہ کے رسول! ذرا بتلایئے کہ یہ جو ہم دوائیوں سے مرض کا علاج کرتے ہیں اور دم کرتے ہیں اور بچاؤ کے اسباب اختیار کرتے ہیں کیا یہ رب تعالیٰ کی تقدیر کو ٹالتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ بھی تقدیر میں سے ہیں۔'' [1]

سو آپ ﷺ نے واضح فرما دیا کہ خود رب کی تقدیر سے اس کی تقدیر کو ہٹا سکتے ہیں۔ یا دفع کر کے یا اٹھا کے۔ دفع کر کے اس کو جس کے وجود کا سبب منعقد ہو گیا ہو اور رفع کر کے اس کو جو موجود ہو۔ جیسا کہ مرض۔اسی معنیٰ میں یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ﴾ (الرعد: ١١)

---

[1] سنن ترمذی، کتاب الطب، باب ما جاء فی الرقی والادوية (حديث: ٢٠٦٥، ٢١٤٨)، سنن ابن ماجة، کتاب الطب۔ باب ما انزل الله داء الا انزل له شفاء (حديث: ٣٤٣٧)۔

''اس کے لیے اس کے آگے اور اس کے پیچھے یکے بعد دیگرے آنے والے کئی پہرے دار ہیں، جو اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔''

معقبات کی تفسیر میں دو اقوال ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ یہ اللہ کے امر میں سے ہیں جن کی وہ حفاظت کرتے ہیں۔

۲۔ دوسرا یہ کہ وہ اس کی اللہ کے اس امر سے حفاظت کرتے ہیں جو وارد ہوا ہے اور حاصل نہیں ہوا۔ وہ اس کی حفاظت کرتے ہیں کہ اس تک پہنچے اور ان کا حفاظت کرنا اللہ کے امر سے ہے۔

[شبہ:...... نقیضین کا ارادہ ربانیہ؛ اور اس پر ردّ:]

چہارم:...... **[شبـــہ]**: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ''اس سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ لازم آتا ہے کہ وہ نقیضین کا ارادہ کرنے والا ہے۔ کیونکہ معصیت بھی اللہ کی مراد ہے اور اس سے روکنا بھی اس کی مراد ہے۔''

[جواب]: [یہ شبہ سرے سے] ناقابل اعتبار بات ہے۔ اس لیے کہ ان دو چیزوں کو باہم نقیض قرار دیتے ہیں جن کا اجتماع اور ارتفاع محال ہو یا وہ دو چیزیں جن کا باہم جمع ہونا ممکن نہ ہو ان کو ایک دوسرے کی ضد بھی کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ زجر و عتاب اس امر کے بارے میں نہیں ہوتا اور نہ وہ مراد ہے۔ جو وقوع پذیر ہو چکا ہو اور اس کا ارادہ بھی کر لیا گیا ہو۔ بخلاف ازیں زجر کی حیثیت ماضی کے اعتبار سے سزا کی ہوتی ہے اور مستقبل کے لحاظ سے زجر و توبیخ کی۔ جو زجر اس کے حسب ارادہ ہوتا ہے، اگر اس سے امر مقصود حاصل ہو جائے تو اس سے صرف زجر مراد ہوتا ہے، اور اگر مقصود حاصل نہ ہو تو یہ زجر کامل نہیں۔ جس طرح کسی کو تلوار سے مارنے کا ارادہ کیا جاتا ہے اور کسی کو زندہ رکھنے کا۔ اور جس طرح اس مہلک مرض کا ارادہ کیا جاتا ہے جو بعض اوقات موت کا باعث بنتا ہے اور اس سے زندگی کا ارادہ بھی کیا جاتا ہے۔

❀ سو سبب کا ارادہ مسبب کے ارادہ کو موجب نہیں۔ مگر جبکہ سبب موجب تام ہو اور زجر یہ رکنے کا سبب ہے جیسا کہ دوسرے اسباب ہوتے ہیں۔ جیسا کہ مرض موت کا سبب ہوتا ہے۔ جیسا کہ فعل کا امر اور اس کی ترغیب اس کے وقوع کا سبب ہوتی ہے۔ پھر کبھی تو مسبب واقع ہوتا ہے اور کبھی واقع نہیں ہوتا۔ سو اگر تو واقع ہو تو دونوں مراد ہوں گے وگرنہ صرف خاص وہ مراد ہوگا جو واقع ہو۔

پنجم:...... یہ گزر چکا ہے کہ ارادہ کی دو قسمیں ہیں ایک مخلوق کی مشیئت کے معنی میں ہے اور یہ ہر حادث کو شامل ہے نہ کہ غیر حادث کو اور ایک مامور بہ کی محبت کے معنی میں ہے اور یہ طاعات کے متعلق ہے۔ تب پھر واقع ہونے والی معصیت پہلے معنی میں ہوگی۔ کہ جو اس نے چاہا وہ ہوا اور جو نہ چاہا وہ نہ ہوا۔ سو جو بھی ہوا اس نے اس کے ہونے کو چاہا۔ سو معاصی پر زجر یہ دوسرے معنی میں ہے کہ وہ نہی عن المنکر کو محبوب رکھتا اور اسے پسند کرتا ہے اور اس کے فاعل کو ثواب بخشتا ہے۔ بخلاف نفس منکر کے کہ وہ نہ اسے محبوب ہے اور نہ پسند ہے اور نہ وہ اس کے فاعل کو ثواب دے گا۔ پھر زجر غیر واقع سے ہوتی ہے اور عقوبت ما وقع پر ہوتی ہے سو جب قضاء وقدر سے سرقہ واقع ہو جائے گا اور رب تعالیٰ نے اس پر حد قائم کرنے

کا حکم بھی دیا ہے تو یہ اقامت حد مامور بہ، محبوب اور پسند ہوگی اور اس نے اس کا ارادہ امر کے اعتبار سے ارادہ کیا نا کہ ارادۂ خلق کے اعتبار سے۔ پھر اگر اس نے اس پر اعانت کی ہوگی تو اس نے اس کے خلق کا ارادہ کیا ہوگا۔ کہ اب اقامت حد شرعاً وقدراً اور خلقاً وامراً مراد ہوگی کہ اس نے اسے چاہا بھی ہے اور اس کو پیدا بھی کیا ہے۔

اگر وہ زجر واقع نہیں ہوئی تو واقع ہونے والی معصیت کو پیدا کرنا اس نے چاہا ہے۔ البتہ اس کا ارادہ نہیں کیا اور نہ شرعاً اس کو محبوب رکھا ہے۔

کہتے ہیں کہ: ایک شخص نے چوری کر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ کہا کہ: میں نے اللہ کی قضاء وقدر سے چوری کی ہے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا اور میں اللہ کی اس قضاء وقدر سے تیرا ہاتھ کاٹوں گا۔ اللہ کی حدود سے تجاوز کرنے والے کو اور جو بندوں کی اس کی عقوبت شرعیہ پر معاونت کرتا ہے۔ جیسا کہ وہ جو کفار سے جہاد پر مسلمانوں کی اعانت کرتا ہے۔ یہی کہا جائے گا کہ: یہ سب اللہ کی قضاء وقدر سے ہے۔ البتہ اسے وہ محبوب اور پسند ہے اور اس نے اس کا دین وشرع کے اعتبار سے ارادہ کیا ہے، جس کا اس نے امر کیا ہے۔ جیسا کہ اس نے اس کے خلق وکون کو چاہا ہے۔ بخلاف اس کے جس سے اس نے روکا ہے۔

فصل:......افعال اختیاریہ پر دلالت عقلی اور اس کا ردّ

رافضی کا کلام کہ ''اس کے نزدیک افعالِ اختیاریہ پر عقل کی دلالت ہے۔'' اور اس کا رد۔

[شبہ]: شیعہ مصنف رقم طراز ہے: ''اور یہ کہ اس سے معقول اور منقول میں مخالفت لازم آتی ہے۔ معقول کی یوں کہ یہ بات گزر چکی ہے اور سب جانتے ہیں کہ ہمارے افعال ہماری جانب منسوب کیے جاتے، اور ہمارے ارادہ کے مطابق وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب ہم دائیں جانب حرکت کرنا چاہتے ہیں تو وہ بائیں جانب واقع نہیں ہوتی اور اگر بائیں جانب حرکت کرنا مقصود ہو تو دائیں طرف حرکت نہیں کرتے، یہ ایسی مسلمہ حقیقت ہے کہ اس میں کسی شک و ریب کی گنجائش نہیں۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: اس کا جواب بھی کئی طرح سے ہے:

اوّل:...... بلاشبہ جمہور اہل سنت یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ ہمارے افعال کی نسبت ہماری طرف کی جاتی ہے، اور ہم ہی ان کے فاعل ہیں اور ان کو عالم وجود میں لاتے ہیں۔ اس میں اختلاف ان لوگوں کا ہے جو ان افعال کو بندہ کا فعل نہیں مانتے۔ اور یہ کہ بندے کی قدرت کی اس میں کوئی تاثیرا/ اثر نہیں اور نہ بندے نے اس فعل کو وجود دیا ہے۔ یہ اہل اثبات متکلمین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ جبکہ جمہور اہل سنت کا یہ عقیدہ نہیں۔ قرآن وحدیث کی نصوص کثیرہ سے یہ حقیقت بالکل واضح ہوتی ہے۔ اللہ اور رسول نے بندہ کا یہ وصف بیان کیا ہے کہ وہ فعل وعمل کرتا ہے۔

دوم:...... یہ کہا جائے کہ منکرین تقدیر علم ضروری کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ امر محتاج غور وفکر ہے کہ بندہ

پہلے فاعل اور ارادہ کنندہ نہ تھا بعد میں اس وصف سے بہرہ ور ہوا۔ بنابریں اس کا ایک امر حادث ہونا اظہر من الشّمس ہے، اب دو ہی صورتیں ہیں:

۱۔اس کا کوئی محدث ہوگا۔ ۲۔دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی اس کا محدث نہیں۔

بصورت ثانی حوادث کا ظہور بلا کسی محدث کے لازم آ تا ہے۔ بصورت اول وہ محدث یا تو بندہ خود ہوگا، یا ذات باری تعالیٰ۔ یا دونوں کے علاوہ کوئی ہوگا۔ اگر بندہ کو محدث قرار دیا جائے تو پھر اس کا اور بھی کوئی محدث ہوگا، جس کا نتیجہ تسلسل کی صورت میں رونما ہوگا، جو کہ بالاتفاق باطل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بندہ عدم سے وجود میں آیا ہے۔ لہٰذا اس کے ساتھ ایسے حوادث کا قیام ممکن نہیں جن کا نقطۂ آغاز معلوم نہ ہو۔ اور اگر اس کا محدث غیر اللہ ہے تو اس میں بھی وہی قول ہے جو بندے میں ہے۔ تب پھر یہ بات متعین ہوگئی کہ وہ رب ہے جو خالق ہو۔ کیونکہ بندہ فاعل و مرید ہے اور وہ مطلوب ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ بندے کا مرید و فاعل ہونا ذات باری تعالیٰ کا رہین منت ہے، اسی لیے اہل سنت کہتے ہیں کہ:'' بندہ فاعل ہے اور اللہ نے اسے فاعل بنایا ہے، بندہ صاحب ارادہ ہے اور اللہ نے اسے صاحب ارادہ بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا o وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾

(الانسان: ۲۹۔ ۳۰)

''یقیناً یہ ایک نصیحت ہے، تو جو چاہے اپنے رب کی طرف (جانے والا) راستہ اختیار کرلے۔ اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔''

اور فرمایا:

﴿لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ o وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ o﴾

(التکویر: ۲۸۔ ۲۹)

''اس کے لیے جو تم میں سے چاہے کہ سیدھا چلے۔ اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے، جو سب جہانوں کا رب ہے۔''

ان آیات میں رب تعالیٰ نے بندے کی مشیت کو ثابت کیا ہے اور اس مشیت کو ایسا بنایا ہے کہ وہ رب تعالیٰ کی مشیت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ چنانچہ جنابِ ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ﴾ (ابراھیم: ٤٠)

''اے میرے رب! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی۔''

اور فرمایا:

﴿فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْۤ اِلَیْهِمْ﴾ (ابراهیم: ۳۷)

’’سو کچھ لوگوں کے دل ایسے کر دے کہ ان کی طرف مائل رہیں۔‘‘

اور جنابِ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام فرماتے ہیں:

﴿رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ﴾ (البقرة: ۱۲۸)

’’اے ہمارے رب! اور ہمیں اپنے لیے فرماں بردار بنا اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک امت اپنے لیے فرماں بردار بنا۔‘‘

اور فرمایا:

﴿وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا﴾ (الانبیاء: ۷۳)

’’اور ہم نے انھیں ایسے پیشوا بنایا جو ہمارے حکم کے ساتھ رہنمائی کرتے تھے۔‘‘

اور فرمایا:

﴿وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ﴾ (القصص: ۴۱)

’’اور ہم نے انھیں ایسے پیشوا بنایا جو آگ کی طرف بلاتے تھے۔‘‘

غرض کتاب وسنت میں اس کی متعدد مثالیں ہیں۔

انسانی ارادہ اور مشیت ایزدی:

سابق الذکر بیانات اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ بندے کا ارادہ ومشیئت اپنی جگہ پر درست ہے مگر مشیت ایزدی کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ اور یہ دونوں باتیں برحق ہیں۔

جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ بندے کو نہ کوئی اختیار حاصل ہے اور نہ مشیئت، یا اسے کوئی قدرت حاصل نہیں، یا بندے نے وہ فعل نہیں کیا یا اس کی قدرت کا اس فعل میں کوئی اثر نہیں اور اس نے اپنے تصرفات کو حادث نہیں کیا۔ تو اس نے ضرورت اولیٰ کے موجب کا انکار کیا۔ اور جو یہ کہتا ہے کہ بندہ کا ارادہ اور فعل بغیر کسی ایسے سبب کے حادث ہوا ہے جو اس کے حدوث کو مقتضی ہو اور اسے بندے نے حادث کیا ہے اور اس فعل کے اِحداث کے وقت اس کا حال ویسا ہی تھا جیسا کہ اس کے اِحداث سے قبل تھا بلکہ وہ دو میں سے ایک زمانہ کو احداث کے ساتھ بغیر کسی ایسے سبب کے خاص کرتا ہے جو اس کی تخصیص کو مقتضی ہو، اور یہ کہ بندہ فاعل، ایجاد کنندہ اور ارادہ کنندہ بن گیا جبکہ وہ پہلے نہ تھا بغیر کسی چیز کے جس نے اسے فاعل محدث بنایا ہو، تو اس نے بغیر کسی فاعل کے حوادث کے حدوث کا عقیدہ اختیار کیا۔

جو لوگ کہتے ہیں: ارادہ کی کوئی علت نہیں ہوتی؛ تو ان کا یہ قول بے حقیقت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ارادہ ایک حادث چیز ہے۔ لہٰذا اس کے لیے ایک محدث کا وجود از بس ناگزیر ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بلا سبب اور کسی محل کے بغیر ارادہ کو عالم وجود میں لاتا ہے، اور بغیر ایسے سبب کے

حادث کو وجود بخشتا ہے جو اس کے حدوث/ وجود کا تقاضا کرتی ہو؛ وہ لوگ تین محالات کا ارتکاب کرتے ہیں:

۱۔ حادث کا اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے بغیر وجود میں آنا۔

۲۔ کسی سبب کے بغیر حادث کا ظہور پذیر ہونا۔

۳۔ صفت کا بلا محل اپنی ذات کے ساتھ قیام۔

اگر آپ چاہیں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا مرید ہونا امر ممکن ہے اور جب تک کوئی مرجح تام نہ ہو ممکن کا وجود اس کے عدم پر، یا اس کی ایک طرف اس کی دوسری طرف پر راجح نہیں ہوتی۔

امام رازی نے اس دلیل کے ساتھ ان لوگوں پر حجت پکڑی ہے جو فی نفسہ صحیح ہے لیکن انہوں نے حدوثِ عالم کے مسئلہ میں متناقض قول اپنایا ہے۔اور اس امامی نے جو دلیل ذکر کی ہے وہ ابوالحسین بصری سے مروی ہے؛ جو صحیح ہے۔جیسا کہ دوسری دلیل بھی صحیح ہے۔لہٰذا دونوں کا قول اپنانا واجب ہوگا۔ باوجودیکہ جمہور قدریہ کا قول یہ ہے کہ بندے کا اپنے افعال کا محدث ہونے کا علم نظری ہے نا کہ ضروری؛ اور یہ لوگ اس بارے ابوالحسین کے مخالف ہیں۔

ابوالحسین اس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ فعل داعی اور قدرت پر موقوف ہے اور دونوں کے وقت فعل واجب ہوتا ہے اور یہی اہل اثبات کے قول کی حقیقت ہے۔اسی لیے ان کے متعدد لوگ ایسی ہی تعبیر کرتے ہیں جیسے ابوالمعالی اور رازی وغیرہ۔

لیکن جب اس کے ساتھ یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ بندوں کے افعال کا خالق ہے تو دونوں کے درمیان جمع ممکن ہو جاتا ہے۔اس کے نزدیک بھی جو یہ قول کرتا ہے کہ رب تعالیٰ نے اشیاء کو اسباب کے ذریعے پیدا کیا ہے اور جو اس کا قائل نہیں، وہ کہتا ہے اس نے ان امور کے وقت فعل کو پیدا کیا نا کہ ان امور کے ذریعے۔ یہ ان کا قول ہے جو قدرت کا مقدور میں کوئی اثر نہیں ٹھہراتے جیسے اشعری وغیرہ۔

انسانی افعال اور مشیت ایزدی:

[اعتراض]: اگر سوال کیا جائے کہ جب بندہ اپنے ارادہ کی تکمیل خود کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کا محدث کیونکر ہوا؟

[جواب]: اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ کو پیدا کیا بایں طور وہ اس کا محدث ہے۔اس نے ان امور کو پیدا کیا ہے جو اس کی ذات سے جدا اور بندے کی ذات کے ساتھ قائم ہیں، سو اس نے بندے کو ان امور کا فاعل ٹھہرایا، [بندہ ارادے کا فاعل ہے کیونکہ] اس نے اللہ کی ودیعت کردہ قدرت و مشیت سے اس ارادہ کی تکمیل کی۔ یہ دونوں احداث ایک دوسرے کو مستلزم ہیں۔اللہ تعالیٰ کا بندے کے فعل کو پیدا کرنا وجود فعل کو مستلزم ہے اور بندے کا فاعل ہونا اس امر کو مستلزم ہے کہ رب تعالیٰ اس کا خالق ہے۔ وہ اس سے جدا اور مخلوق کے ساتھ قائم ہے اور جب فعل کو بندے نے حادث کیا ہے وہ اس کے ساتھ قائم ہے۔لہٰذا بندہ اپنی قدرت و مشیت کے ساتھ اس فعل کا فاعل نہ ہوگا یہاں تک اللہ اسے ایسا بنا دے۔ سو وہ اس میں اس فعل کی قدرت و مشیت کو پیدا کر دے گا اور اس کے ذریعے اس فعل کو پیدا کرے گا اور جب اللہ اسے فاعل بنا دے گا تو اس فعل کا وجود واجب ہوگا۔

سو رب تعالیٰ کا بندے کے فعل کو پیدا کرنا اس فعل کے وجود کو مستلزم ہے اور بندے کے فاعل ہونے کو بھی مستلزم ہے حالانکہ وہ اس سے پہلے فاعل نہ تھا اور یہ رب تعالیٰ کے اس فعل کے خالق ہونے کو بھی مستلزم ہے۔ بلکہ جمیع حوادث اپنے اسباب کے ساتھ اسی باب سے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ اس کا قول ہے جو اس بات کا قائل ہے کہ یہ حوادث رب تعالیٰ کا اور بندے کا فعل ہیں۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ: جو کوئی اسے دونوں کا فعل بایں معنی کہتا ہے کہ دونوں کی اس میں شراکت ہے تو یہ قول خطا پر مبنی ہے۔ اور جو کہتا ہے کہ رب کا فعل اس سے جدا ہے اور پھر کہتا ہے کہ یہ دونوں کا فعل ہے جیسا کہ ابواسحاق اسفرائنی کا قول ہے۔ تو اس کے کلام کی کوئی معقول توجیہ وتفسیر ضروری ٹھہرے گی۔

البتہ جمہور اہل سنت جن کا عقیدہ ہے کہ: ''یہ حوادث رب تعالیٰ کا مفعول ہیں نا کہ فعل۔ جب وہ ایسا کام کرتا ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک فعل مفعول ہٹ کر ایک چیز ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ یہ حوادث رب تعالیٰ کا مفعول ہیں نا کہ فعل اور یہ فعل بندے کا ہیں۔

جیسا کہ بندے کی قدرت کی بابت ان کا عقیدہ ہے کہ بندے کی قدرت رب کا مقدور ہے نا کہ بذات خود رب کی قدرت۔ اسی طرح بندہ کا؛ بندے کا ارادہ ہے؛ اور رب کی مراد ہے۔ یہی حکم بندے کی جملہ صفات کا ہے کہ وہ بندے کی صفات تو ہیں لیکن رب کی مفعول اور اس کی مخلوق ہیں۔ محض اس کی صفات نہیں۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رب تعالیٰ نے بے شمار حوادث کو اپنی طرف اور اپنی بعض مخلوقات کی طرف منسوب کیا ہے۔ یا تو اس کی عین یا نظیر کو منسوب کرتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿اللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ (الزمر: ٤٢)

''اللہ جانوں کو ان کی موت کے وقت قبض کرتا ہے اور ان کو بھی جو نہیں مریں ان کی نیند میں، پھر اسے روک لیتا ہے جس پر اس نے موت کا فیصلہ کیا اور دوسری کو ایک مقرر وقت تک بھیج دیتا ہے۔''

اور فرمایا:

﴿وَ هُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَ يَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ﴾ (الانعام: ٦٠)

''اور وہی ہے جو تمھیں رات کو قبض کر لیتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم نے دن میں کمایا۔''

اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہے:

﴿قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ﴾ (السجدۃ: ١١)

''کہہ دے تمھیں موت کا فرشتہ قبض کرے گا، جو تم پر مقرر کیا گیا ہے۔''

اور فرمایا:

﴿تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَ هُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ﴾ (الانعام: ٦١)

''اسے ہمارے بھیجے ہوئے قبض کر لیتے ہیں اور وہ کوتاہی نہیں کرتے۔''

اسی طرح ہوا کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا﴾ (الاحقاف: ٢٥)

''جو ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے برباد کردے گی۔''

اور فرمایا:

﴿وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَ مَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ﴾ (الاعراف: ١٣٧)

''اور ہم نے برباد کر دیا جو کچھ فرعون اور اس کے لوگ بناتے تھے اور جو عمارتیں وہ بلند کرتے تھے۔''

اور فرمایا:

﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ﴾ (الاسراء: ٩)

''بلاشبہ یہ قرآن اس (راستے) کی ہدایت دیتا ہے جو سب سے سیدھا ہے۔''

اور فرمایا:

﴿يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ﴾ (المائدة: ١٦)

''اس سے اللہ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے پیچھے چلیں، سلامتی کے راستوں کی ہدایت دیتا ہے۔''

اور فرمایا:

﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ﴾ (یوسف: ٣)

''ہم تجھے بہترین بیان سناتے ہیں، اس واسطے سے کہ ہم نے تیری طرف یہ قرآن وحی کیا ہے۔''

اور فرمایا:

﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ﴾ (النمل ٢٧)

''بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل کے سامنے اکثر وہ باتیں بیان کرتا ہے جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔''

اور فرمایا:

﴿وَ يَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ وَ مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ﴾

(النساء: ١٢٧)

''اور وہ تجھ سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں، کہہ دے اللہ تمھیں ان کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے اور جو کچھ تم پر کتاب میں پڑھا جاتا ہے۔''

یعنی جو کتاب میں تمھیں پڑھ کر سنایا جاتا ہے وہ تمھیں عورتوں کے بارے میں بتلاتا ہے۔

اورفرمایا:

﴿فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ وَ اَمَ نْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيْجٍ﴾(الحج: ٥)

''پھر جب ہم اس پر پانی اتارتے ہیں تو وہ لہلہاتی ہے اور ابھرتی ہے اور ہر خوبصورت قسم میں سے اگاتی ہے۔''

رب تعالیٰ نے یہاں اگنے کی نسبت زمین کی طرف کی ہے۔

اورفرمایا:

﴿وَ الْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ اَنْبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍo﴾ (الحجر: ١٩)

''اور زمین، ہم نے اسے پھیلا دیا اور اس میں پہاڑ رکھے اور اس میں ہر نپی تلی چیز اگائی۔''

اورفرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّ مِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَo يُنْبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَ الزَّيْتُوْنَ وَ النَّخِيْلَ وَ الْاَعْنَابَ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ﴾ (النحل: ١١)

''وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا، تمھارے لیے اسی سے پینا ہے اور اسی سے پودے ہیں جن میں تم چراتے ہو۔ وہ تمھارے لیے اس کے ساتھ کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے۔''

اورفرمایا:

﴿حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَ ازَّيَّنَتْ وَ ظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ لا اَتٰهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا﴾ (یونس: ٢٤)

''حتی کہ جب زمین نے اپنی آرائش حاصل کرلی اور مزین ہوگئی اور اس کے باشندوں نے یقین کرلیا کہ بیشک وہ اس پر قادر ہیں تو رات یا دن کو اس پر ہمارا حکم آگیا تو ہم نے اسے کٹی ہوئی کردیا۔''

اورفرمایا:

﴿اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا﴾ (الكهف: ٧)

''بے شک ہم نے زمین پر جو کچھ ہے اس کے لیے زینت بنایا ہے۔''

اورفرمایا:﴿اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ نِ الْكَوَاكِبِ﴾ (الصافات: ٦)

''بے شک ہم نے ہی آسمان دنیا کو ایک انوکھی زینت کے ساتھ آراستہ کیا، جو ستارے ہیں۔''

اورفرمایا:

﴿يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا﴾

(الحديد: ٤)

''وہ جانتا ہے جو چیز زمین میں داخل ہوتی ہے اور جو اس سے نکلتی ہے اور جو آسمان سے اترتی ہے اور جو اس میں چڑھتی ہے۔''

اور فرمایا:

﴿یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ﴾ (النحل: ۲)

''وہ فرشتوں کو وحی کے ساتھ اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے۔''

اور فرمایا:﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُo﴾ (الشعراء: ۱۹۳)

''جسے امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے۔''

اور فرمایا:﴿وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ﴾ (الاسراء: ۱۰۵)

''اور ہم نے اسے حق ہی کے ساتھ نازل کیا اور یہ حق ہی کے ساتھ نازل ہوا۔''

اور فرمایا:

﴿وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَیْنَا قَالُوْا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ﴾

''اور وہ اپنے چمڑوں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف شہادت کیوں دی؟ وہ کہیں گے ہمیں اس اللہ نے بلوا دیا جس نے ہر چیز کو بلوایا اور اسی نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا۔''(فصلت: ۲۱)

اور جناب سلیمان علیہ السلام نے فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ وَاُوْتِیْنَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ﴾ (النمل: ۱۶)

''اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی اور ہمیں ہر چیز میں سے حصہ دیا گیا ہے۔''

اور فرمایا:

﴿فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَo﴾ (الذاریات: ۲۳)

''سو آسمان و زمین کے رب کی قسم ہے! بلاشبہ یہ (بات) یقیناً حق ہے اس (بات) کی طرح کہ بلا شبہ تم بولتے ہو۔''

سو وہ بولے اور انہیں اللہ نے بلوایا اور وہی ہر شے کو زبان دیتا ہے۔

سو جب باری تعالیٰ نے جمادات میں ایسے قویٰ رکھے ہیں جو فعل کرتے ہیں اور اس نے اس فعل کو ان جمادات کی طرف منسوب کیا ہے اور یہ بات رب تعالیٰ کے خالق افعال ہونے کو مانع نہیں، تو حیوان کے فعل کی اس کی طرف اضافت بدرجہ اولیٰ مانع نہ ہوگی۔ اگرچہ ان افعال کا خالق اللہ ہی ہے۔

ان قدریہ کا اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ رب تعالیٰ ان جمادات کے قویٰ اور حرکات کا خالق ہے۔ اللہ نے خبر دی ہے کہ زمین اگاتی ہے۔ بادل پانی لادے پھرتے ہیں جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًاo﴾ (الذاریات : ۲)

''پھر ایک بڑے بوجھ (بادل) کو اٹھانے والی ہیں۔''

اور ہوا بادلوں کو ایک جگہ سے دوسری منتقل کرتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿وَ هُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ حَتّٰۤی اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ﴾ (الاعراف : ۵۷)

''اور وہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت سے پہلے بھیجتا ہے، اس حال میں کہ خوش خبری دینے والی ہیں، یہاں تک کہ جب وہ بھاری بادل اٹھاتی ہیں تو ہم اسے کسی مردہ شہر کی طرف ہانکتے ہیں۔''

اور بتلایا کہ یہ ہوا ہر شے کو تباہ بھی کرتی ہے اور بتلایا کہ پانی چڑھ آیا کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿اِنَّا لَمَّا طَغَی الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِی الْجَارِیَةِo﴾ (الحاقة : ۱۱)

''بلاشبہ ہم نے ہی جب پانی حد سے تجاوز کر گیا، تمھیں کشتی میں سوار کیا۔''

بلکہ رب تعالیٰ نے ان چیزوں کی بابت ان سے بھی زیادہ بلیغ باتوں کی خبر دی ہے، وہ ان اشیاء کا تسبیح وسجدہ کرنا ہے: چنانچہ ارشاد ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَ النُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَ كَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَ كَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْهِ الْعَذَابُ﴾ (الحج : ۱۸)

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ، اسی کے لیے سجدہ کرتے ہیں جو کوئی آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے لوگ۔ اور بہت سے وہ ہیں جن پر عذاب ثابت ہو چکا۔''

یہ تفصیل اس بات سے مانع ہے کہ اسے اس بات پر محمول کیا جائے کہ مراد ان کا مخلوق ہونا اور اپنے خالق پر دلالت کرنے والا ہونا ہے اور یہ کہ مراد ان کا زبانِ حال سے اس کی شہادت دینا ہے کہ یہ تو سب انسانوں میں عام ہے۔ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ وَالطَّیْرَ وَ اَلَنَّا لَهُ الْحَدِیْدَo﴾ (سبا : ۱۰)

''اے پہاڑو! اس کے ساتھ تسبیح کو دہراؤ اور پرندے بھی اور ہم نے اس کے لیے لوہے کو نرم کر دیا۔''

اور فرمایا:

﴿اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ یُسَبِّحْنَ بِالْعَشِیِّ وَالْاِشْرَاقِo وَالطَّیْرَ مَحْشُوْرَةً كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌo﴾ (صٓ : ۱۸-۱۹)

''بے شک ہم نے پہاڑوں کو اس کے ہمراہ مسخر کر دیا، وہ دن کے پچھلے پہر اور سورج چڑھنے کے وقت تسبیح

کرتے تھے۔ اور پرندوں کو بھی، جب کہ وہ اکٹھے کیے ہوتے، سب اس کے لیے رجوع کرنے والے تھے۔''

رب تعالیٰ نے اس بات کی خبر دی ہے کہ پہاڑ اور پرندے ان کے ساتھ رب کے آگے رجوع رہتے تھے اور اس نے انہیں تسبیح کرنے پر لگا دیا ہوا ہے اور فرمایا:

﴿اَلَمْ تَرَیْ اَنَّ اللّٰهَ یُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صَافَّاتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِیْحَهٗ﴾ (الاسراء: ٤٤)

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ، اس کی تسبیح کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پرندے پر پھیلائے ہوئے، ہر ایک نے یقیناً اپنی نماز اور اپنی تسبیح جان لی ہے۔''

اور فرمایا: ﴿وَ لِلّٰهِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا﴾ (الرعد: ١٥)

''اور آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے اللہ ہی کو سجدہ کر رہا ہے، خوشی اور ناخوشی سے۔''

اور فرمایا:

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِیَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا یَشَّقَّقُ فَیَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا یَهْبِطُ مِنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ﴾ (البقرة: ٧٤)

''پھر اس کے بعد تمھارے دل سخت ہو گئے تو وہ پتھروں جیسے ہیں، یا سختی میں (ان سے بھی) بڑھ کر ہیں اور بے شک پتھروں میں سے کچھ یقیناً وہ ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں اور بے شک ان سے کچھ یقیناً وہ ہیں جو پھٹ جاتے ہیں، پس ان سے پانی نکلتا ہے اور بے شک ان سے کچھ یقیناً وہ ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں۔''

ان اشیاء کے سجود و تسبیح کرنے پر ایک دوسرے مقام میں مفصل کلام ذکر کیا جا چکا ہے۔

یہاں یہ بتلانا مقصود ہے کہ یہ سب اشیاء بالاتفاق رب تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ باوجودیکہ اس نے ان اشیاء کے لیے فعل کو پیدا کیا ہے جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے۔ سو معلوم ہوا کہ یہ امر رب تعالیٰ کے خالق کل شیء ہونے میں مانع نہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ تمھارا یہ قول کہ جب ہم اللہ کو فاعل ٹھہراتے ہیں تو اس فعل کا وجود واجب ہوا اور خلق فعل اس کے وجود کو مستلزم ہے۔ وغیرہ دیگر اقوال کہ یہ تو جبر کو مستلزم اور مقتضی ہیں اور وہ باطل قول ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ جبر کتاب وسنت میں کہیں بھی وارد نہیں۔ نا اس کی نفی ہے نا اثبات۔ لفظ کی حرمت اس وقت ہوتی ہے جب وہ معصوم سے ثابت ہو اور وہ نصوص کے الفاظ ہیں ان کے معانی کی اتباع ہم پر واجب ہے۔ رہے نو ایجاد الفاظ جیسے جبر تو یہ جہت اور حیز وغیرہ نو ایجاد الفاظ جیسا ہے۔ اسی لیے اوزاعی ثوری اور احمد بن حنبل جیسے ائمہ اہل سنت سے یہ مروی ہے کہ اس لفظ کی نہ مطلق نفی کی جائے اور نہ مطلق اثبات کیا جائے۔ کیونکہ یہ لفظ مجمل ہے۔

علماء اسلاف میں سے زبیدی نے اس کی مطلق نفی کی ہے۔ یہ لغت کے مشہور معنی کے اعتبار سے ہے کیونکہ جبر و اجبار کا لغوی اطلاق مجبور کے بلا ارادہ فعل پر ہوتا ہے جس میں ناگواری کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ جیسے باپ اپنی بیٹی کو نکاح پر مجبور کرے اور یہ معنی رب تعالیٰ کے حق میں منتفی ہے، کیونکہ وہ بندے کے فعل اختیاری کو اس کے اختیار کے بغیر پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ اسی نے تو بندے کو مرید مختار بنایا ہے اور اس بات پر سوائے اللہ کے کسی کو قدرت نہیں۔ اسی لیے اسلاف میں سے کسی کا قول ہے کہ اللہ جبر کرنے سے بلند و برتر ہے۔ دوسرے کو تو وہی مجبور کرتا ہے جس نے اسے مختار نہ بنایا ہو۔ اللہ نے بندے کو مختار بنایا ہے، اس لیے اسے جبر کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسی لیے اوزاعی اور زبیدی وغیرہ کا قول ہے کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اس نے جبلت بنائی اور یہ نہیں کہتے کہ اس نے مجبور کیا۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اشج عبدالقیس سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا:

: تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جن کو رب تعالیٰ پسند فرماتے ہیں۔ ایک بردباری اور دوسرے وقار۔ اس نے عرض کیا کہ: کیا ان دونوں خصلتوں کو میں نے اپنایا ہے یا میں ان پر پیدا کیا گیا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں تمہاری اس پر جبلت ہے۔ تو اس نے عرض کیا: سب تعریف اس اللہ کی ہے جس نے مجھے ایسی خصلتوں پر پیدا کیا ہو اسے محبوب ہیں۔''[1]

سو لفظ جبر سے نفس وہ فعل مراد ہوگا جو وہ چاہے اگرچہ اس نے بندے کا اختیار بھی پیدا کیا ہے۔ جیسا کہ محمد بن کعب قرظی کا قول ہے کہ جبار وہ ہے جو بندے کو اس پر مجبور کرے جو اس نے ارادہ کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ماثور ایک دعا کے یہ الفاظ ہیں:

''اے اللہ! اے پھیلی چیزوں کو پھیلانے والے، اے بلند چیزوں کو بلند کرنے والے! دلوں کو اپنی فطرت پر سعادت والی یا شقاوت والی فطرت پر مجبور کرنے والے!''

اگر تو جبر سے یہ مراد ہو تو یہ حق ہے اور اگر پہلا معنی مراد ہو تو وہ باطل ہے۔ لیکن مطلق طور پر بولتے وقت پہلا معنی مفہوم ہوتا ہے۔ جبکہ یہ اطلاق جائز نہیں ہے۔

جب سائل یہ کہے کہ میں نے جبر سے اس کا دوسرا معنی مراد لیا ہے؛ یعنی رب تعالیٰ کا بندے کو نفس فاعل قادر بنانا یہ جبر کو مستلزم ہے، اور داعی اور قدرت کا نفس ہونا یہ فعل کے وجود کو مستلزم ہے کہ یہ جبر ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ معنی حق ہے جس کے ابطال کی کوئی دلیل نہیں اور ابوالحسین بصری جیسے سمجھ دار معتزلہ اس معنی کو تسلیم کرتے ہیں اور مانتے ہیں کہ نفس داعی اور قدرت کے وجود کے ساتھ فعل کا وجود واجب ہے۔ اس کتاب والے نے یہی طریق اختیار کیا ہے، اسے جبر کی اس تفسیر سے انکار ممکن نہیں۔ اسی لیے ان امور میں ابوالحسین کی طرف تناقض کو منسوب کیا گیا ہے۔ کیونکہ جب وہ دوسرے سمجھ دار معتزلہ اس بات کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ داعی اور قدرت کے ساتھ فعل کا

[1] صحیح مسلم: ۱/ ٤٨ ـ ٤٩ـ کتاب الایمان، باب الامر بالایمان باللّٰہ تعالی.

وجود واجب ہے اور مانتے ہیں کہ داعی اور قدرت کا خالق اللہ ہے تو لازم آیا کہ بندوں کے افعال کا خالق اللہ ہو۔

ان ماہرین علمائے معتزلہ نے ان دونوں مقدمات کو تو تسلیم کیا ہے؛ لیکن اس کا نتیجہ ماننے سے انکاری ہیں؛ اور طوسی جسے یہ امامی بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اس نے ''تلخیص المحصل'' میں رازی کی دلیل کو ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

''مرجح تام کے وجود کے وقت فعل کا وجود واجب ہے اور اس کے عدم کے وقت ممتنع ہے۔ تو معتزلہ کا قول بالکلیہ باطل ہو گیا۔ یعنی جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ وہ جواز کے طور پر فعل کرتا ہے جیسا کہ ان کا مشہور مذہب یہی ہے تو طوسی اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہتا ہے: یہ بات بارہا ذکر کی جا چکی ہے کہ مختار ممکن کی دو طرفوں میں بسے ایک کو دوسری پر ترجیح دے سکتا ہے۔ بلا مرجح کے۔ یہاں یہ حکم محال ہے۔ پھر موثر کی احتیاج اور اثر کے حصول کے عدم کے امتناع کی تقدیر پر کہتا ہے: معتزلہ کا قول بالکلیہ باطل ہو گیا۔''

وہ کہتا ہے: یہ اعتراض وارد نہیں۔ کیونکہ وہ لکھتا ہے کہ ابوالحسین معتزلہ میں سے ہے؛ اور ایک دوسری جگہ پر ذکر کیا ہے کہ معتزلہ میں سے ایک آدمی کا یہ عقیدہ ہے۔ اور یہاں یہ کہتا ہے کہ وہ اس طرف گیا ہے کہ قدرت اور ارادہ مقدور کے وجود کو واجب کرتے ہیں تو پھر ان کا قول بالکلیہ کیونکر باطل ٹھہرا؟

اس کا بیان یہ ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں: اختیار کا معنی صرف قدرت کی نسبت کے اعتبار سے دونوں اطراف کی برابری ہے اور ارادہ کے اعتبار سے دونوں میں سے کسی ایک کے وقوع کا وجوب ہے۔ پس جب مرجح تام پایا جائے گا اور یہ ارادہ ہے تو فعل واجب ہوگا اور جب وہ حاصل نہ ہوگا تو فعل ممتنع ہوگا اور یہ صرف قدرت پر قیاس کرتے ہوئے طرفین کے استواء کے منافی نہیں۔ تب پھر وہ لزوم جو اس نے ذکر کیا ہے، وہ ان کے قول کے ابطال میں قطعی نہیں۔

میں کہتا ہوں: وہ قول جس کے بطلان کو رازی نے قطعی کہا ہے، وہ ان کا مشہور قول ہے۔ وہ یہ کہ فعل داعی پر موقوف نہیں بلکہ قادر دو میں سے ایک طرف کو دوسری پر بلا مرجح کے راجح کرتا ہے۔ پھر اس کا داعی فعل کو حادث کرتا ہے جیسے ارادہ اور یہ صرف اس کے قادر ہونے کے ذریعے ہے۔ جبکہ اس کے وجود اور عدم کی طرف نسبت کے اعتبار سے قدرت کی برابر ساتھ ہو۔ اب کبھی تو داعی کی تفسیر علم، یا اعتقاد یا ظن سے کر دی جاتی ہے اور کبھی ارادہ سے اور کبھی ان سب سے، اور کبھی اس سے جس پر مراد مشتمل ہو، جو اس کے ارادہ کو مقتضی ہو۔

رازی کہتے ہیں: ابوالحسین کے قول میں تناقض ہے۔ کیونکہ رازی نے اقوال میں ان لوگوں کا قول بھی نقل کیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ فعل داعی پر موقوف ہے۔ لہٰذا جب قدرت حاصل ہو گئی اور اس کے ساتھ داعی بھی مل گیا تو دونوں مل کر فعل کے وجود کی علت بن گئے۔

رازی کہتے ہیں: یہ جمہور فلاسفہ کا قول ہے اور ابوالحسین بصری اور دیگر معتزلہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ اگرچہ ابوالحسین ایک غالی معتزلیہ ہے حتیٰ کہ اس نے اس بات تک کا دعویٰ کر دیا ہے کہ اس بات کا علم ضروری ہے کہ بندہ اپنے افعال کا موجد ہے البتہ پھر بھی اس کا یہ مذہب تھا کہ فعل داعی پر موقوف ہے۔ تو جب استواء کے وقت فعل کا وقوع ممتنع ہوا

تو مرجوحیت کے حال میں بدرجہ اولیٰ ممتنع ہوگا۔تو جب مرجوح ممتنع ہوا تو راجح واجب ہوا۔ کیونکہ نقیضین سے خروج نہیں ہوتا اور یہ بعینہٖ جبر کا قول ہے۔ کیونکہ مرجح کے حصول کے وقت فعل کا وجود واجب ہے اور مرجح کے عدم کے وقت اس کا وجود ممتنع ہے۔سو ثابت ہوا کہ جبر کے معاملہ میں ابوالحسین زبردست غالی معتزلی ہے۔گو کہ بظاہر وہ خود کو عظیم غالی معتزلی ہے(نہ کہ جبری)۔

میں کہتا ہوں کہ یہ جمہور اہل سنت اور ان کے ائمہ کا قول ہے اور اس کے قریب قریب ابوالمعالی جوینی اور قاضی ابوخازم بن قاضی ابویعلی کا اور کرامیہ کا قول ہے اور یہ اس قول کی حقیقت ہے کہ اللہ بندے کے فعل کا خالق ہے اور اسباب کو ثابت کرنے والے جمہور اہل سنت کا بھی یہی قول ہے، جو کہتے ہیں کہ بندے کی قدرت کو فعل میں تاثیر ہے اور جو اس تاثیر کو نہیں مانتا جیسے اشعری تو جب وہ وجوب کی تفسیر وجوبِ عادی سے کترا ہے تو یہ ممتنع نہیں اور جب اس کی تفسیر وجوب عقلی سے کرتا ہے تو ممتنع ہوا۔

رہا لفظ جبر تو اس میں نزاع لفظی ہے جیسا کہ گزرا اور اس کا ظاہری لغوی معنی یہ نہیں۔اسی لیے اسلاف نے اس کے اطلاق پر انکار کیا ہے۔پس جب قدریہ کہتے ہیں کہ یہ بندے کے مختار ہونے کے منافی ہے۔ کیونکہ مختار کا معنی تب ہی ہے جب وہ فعل اور ترک دونوں پر قادر ہو اور جب چاہے یہ کر لے اور جب چاہے وہ کر لے۔

ان کو یہ جواب دیا جائے گا کہ یہ مسلّم ہے، لیکن یہ کہا جائے گا کہ بندہ یا تو فعل اور ترک پر علی سبیل البدل قادر ہے یا علی سبیل الجمع؟ دوسرا قول باطل ہے، کیونکہ فاعل ہونے کی حالت میں وہ تارک نہیں ہوسکتا۔اسی طرح اس کے برعکس ہے۔کیونکہ فعل اور ترک دونوں ضدین ہیں، ان کا اجتماع ممتنع ہے اور قدرت ممتنع پر نہیں وہا کرتی۔

پس معلوم ہوا کہ ہمارا قول کہ وہ فعل اور ترک پر قادر ہے اس کا یہ معنی ہے کہ وہ عدمِ ترک کے حال میں فعل پر اور عدمِ فعل کے حال میں ترک پر قادر ہے۔اسی طرح یہ قولِ قائل ہے کہ قادر چاہے تو فعل کرے اور چاہے تو نہ کرے کہ یہ قول علی سبیل البدل پر محمول ہے کہ بندہ فعل اور ترک دونوں پر بیک وقت قادر نہیں ہوسکتا۔ بلکہ فعل کی مشیئت کے حال میں ترک کا مرید اور ترک کی مشیئت کے حال میں فعل کا مرید نہیں ہوسکتا۔

جب یہ بات ہے تو وہ قادر جو چاہے تو فعل کرے اور چاہے تو ترک کرے کہ جب وہ فعل کو چاہتا ہے اور قدرتِ تامہ بھی ہوتی ہے تو اس حال میں فعل کا وجود واجب ہوتا ہے اور فعل کے وجود کے حال میں اس کا ترک کا مرید ہونا ممتنع ہے اور وہ فعل کے ساتھ ترک کے وجود پر قادر ہے۔ بلکہ اس کی فعل پر قدرت بایں معنی ہے کہ وہ فعل کے بعد اس کا تارک ہو گا۔لہٰذا وہ فعل کے وجود کے دوسرے زمانہ میں ترک پر قادر ہوگا نہ کہ فعل کے وجود کے حال میں۔

جب قائل یہ کہتا ہے کہ یہ اس بات کو مقتضی ہے کہ فعل واجب ہو نہ کہ ممکن۔سو اگر تو اس کی مراد یہ ہے کہ وہ فعل فی نفسہ ممکن ہونے کے بعد غیر کے ذریعے واجب ہوا تو یہ بات برحق ہے۔جیسا کہ وہ عدم کے بعد وجود میں آیا اور اس کا وجود کے حال میں معدوم ہونا ممتنع ہے۔

سو اللہ نے جو بھی پیدا کیا ہے، وہ اسی طرح پر ہے کہ جو اس نے چاہا وہ ہوا اور رب تعالیٰ کی مشیئت وقدرت سے اس کا وجود واجب ہوا اور جو اس نے نہ چاہا وہ نہ ہوا اور رب تعالیٰ کی عدمِ مشیئت کی وجہ سے اس کا وجود ممتنع ہوا۔ ساتھ یہ کہ اس نے جو چاہا، وہ اس کی مخلوق، محدث اور مفعول ہے اور اس کے پیدا کرنے سے پہلے اس کا وجود اور عدم دونوں ممکن تھے۔ لیکن جب وہ اللہ کی قدرت ومشیئت سے موجود ہو گیا تو اب اس کا معدوم ہونا ممتنع ٹھہرا۔ البتہ موجود ہونے کے بعد اس کا معدوم ہونا ممکن ہے۔ ایسی کوئی شے نہیں کہ ایک ہی وقت میں اس کا وجود اور عدم دونوں ممکن ہوں۔ بلکہ عدم کے بدلے وجود اور وجود کے بدلے عدم ممکن ہے۔ سو جب وہ موجود ہے تو اس کا وجود جب تک وہ موجود ہے واجب بغیرہ ہے۔

جب اسے بایں معنی ممکن کہا گیا کہ یہ مخلوق، محدث اور مفعول ہے تو یہ صحیح ہے۔ نہ کہ یہ معنی ہو کہ اس کے وجود کے وقت اس کا عدم اس کے وجود کے ہوتے ہوئے ممکن ہے۔ کیونکہ جب یہ مراد لیا جائے گا کہ وجود کے وقت اس کا عدم وجود کے ہوتے ہوئے ممکن ہے تو یہ قول باطل ہے کہ یہ نقیضین کو جمع کرنا ہے۔

اگر اس کی مراد یہ ہے کہ اس کا عدم اس وجود کے بعد ممکن ہے تو یہ صحیح ہے لیکن یہ اس بات کا مناقض نہیں ہے کہ اس کے وجود کا وجوب بغیرہ اس وقت تک ہے جب تک وہ موجود ہے اور یہ قادر کے ذریعے موجود ہے نا کہ بنفسہٖ موجود ہے اور وہ اس حال میں بایں معنی ممکن ہے کہ وہ محدث، مخلوق اور رب کا محتاج ہے۔ نہ کہ بایں معنی کہ اس کا وجود کے حال میں معدوم ہونا ممکن ہے۔ سو جس نے یہ بات سمجھ لی اس پر سے بے شمار وہ اشکالات کافور ہو جائیں گے جو لوگوں کو قدر کے باب میں پیش آتے ہیں۔ بلکہ رب تعالیٰ کے قادر مختار ہونے میں بھی اشکالات جاتے رہیں گے کہ جو اس نے چاہا وہ ہوا اور جو نہ چاہا وہ نہ ہوا۔

اسی لیے اشعری وغیرہ نے رب تعالیٰ کی سب سے بڑی صفت اد رعلی الاختراع ہونے کی بیان کی ہے پھر یہ کہ قائل کا قول کہ قادر وہ ہے کہ جو جب چاہے فعل کرے اور جب چاہے ترک کرے، اس معنی میں ہے کہ فعل اور ترک سے قبل دوسرے زمانے میں اگر اس نے اس میں فعل کے وجود کو چاہا یا اس کے ترک کو چاہا تو اس کو دونوں میں اختیار ہو گا۔ تب پھر فعل کے وجوب کے حال میں فعل واجب ہو گا اور تخییر کے زمانے میں کہ جب فعل اور ترک دونوں میں تخییر ہو، واجب نہ ہو گا، اور فعل کے وجوب کے وقت وہ مخیّر نہ ہو گا۔

جی ہاں! کبھی فعل کے حال میں وہ فعل کے بعد ترک کو چاہنے والا ہوتا ہے اور یہ دوسرا ترک ہے اور یہ فعل کے وجود کے حال میں اس کا ترک نہیں۔ سو قادر کبھی بھی دو چیزوں کے درمیان ان میں سے ایک کے وجود کے حال میں مخیّر نہیں ہوتا۔ مگر دوسرے زمانے میں تخییر کے معنی میں۔ وگرنہ دونوں میں سے ایک کے وجود کے حال میں وہ عدم اور وجود کے درمیان مخیّر نہیں ہوتا۔ لہٰذا جب تک ایک فاعل فاعل ہے، وہ تارک نہیں ہے اور نہ اسے ترک پر مقدور ہے، کیونکہ ممتنع مقدور نہیں ہوا کرتا اور ضدین پر قدرت یہ دونوں پر علی سبیل البدل ہو گی نہ کہ دونوں کے جمع پر اور یہ اس کہنے کی طرح ہے وہ کپڑے کو سفید اور سیاہ کرنے پر اور مشرق اور مغرب میں سفر کرنے پر، دائیں بائیں جانے پر اور دونوں بہنوں کو بیک

وقت نکاح میں لانے پر قادر ہے، جو کہ ممتنع ہے۔

فصل:......افعالِ اختیاریہ پر دلالتِ نقل کی بابت رافضی کا کلام اور اس کا ردّ

[قرآن کریم اور انسانی افعال کا انتساب:]

[شبہ]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''قرآن کریم میں اکثر افعال انسانی کو بنی نوع انسان کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤى﴾ (النجم: ۳۷)

''اور ابراہیم کے (صحیفوں میں) جس نے (عہد) پورا کیا۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (مریم: ۳۷)

''تو ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کفر کیا، بڑی ہلاکت ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ (الانعام: ۱۶۴)

''اور نہ کوئی بوجھ اٹھانے والی کسی دوسری کا بوجھ اٹھائے گی۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (النحل:۳۲)

''جنت میں داخل ہو جاؤ؛ بسبب ان نیک اعمال کے جو تم کیا کرتے تھے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ﴾ (غافر: ۱۷)

''آج ہر شخص کو اس کا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کمایا۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (الجاثیۃ: ۲۸)

''آج تمھیں اس کا بدلہ دیا جائے گا جو تم کیا کرتے تھے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا﴾(الانعام ۱۶۰)

''جو شخص نیکی لے کر آئے گا تو اس کے لیے اس جیسی دس نیکیاں ہوں گی اور جو برائی لے کر آئے گا سوا سے

جزا نہیں دی جائے گی، مگر اسی کی مثل۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لِيُوَفِّيَهُمْ أُجُورَهُمْ﴾ (فاطر: ٣٠)

''تا کہ وہ انھیں ان کے اجر پورے پورے دے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ (البقرة: ٢٨٦)

''اسی کے لیے ہے جو اس نے (نیکی) کمائی اور اسی پر ہے جو اس نے (گناہ) کمایا۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ﴾ (النساء: ١٦٠)

''ان کے بڑے ظلم ہی کی وجہ سے ہم نے ان پر کئی پاکیزہ چیزیں حرام کر دیں۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ﴾ (الطور: ٢١)

''ہر آدمی اس کے عوض جو اس نے کمایا گروی رکھا ہوا ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا﴾ (فصلت: ٤٦)

''جس نے نیک عمل کیا سو اپنے لیے اور جس نے برائی کی سو اسی پر ہوگی۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ذَٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدَاكَ﴾ (الحج: ١٠)

''یہ اس کی وجہ سے ہے جو تیرے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ﴾ (الشورى: ٣٠)

''اور جو بھی تمھیں کوئی مصیبت پہنچی تو وہ اس کی وجہ سے ہے جو تمھارے ہاتھوں نے کمایا۔'' [انتھیٰ کلام الرافضی]

[جواب]: رافضی کے اس کلام کے کئی جوابات ہیں:

اوّل:...... یہ کہا جائے کہ یہ سب حق ہے اور جمہور اہل سنت اس کے قائل ہیں کہ بندہ اپنے فعل کا حقیقی فاعل ہے نہ کہ مجازی۔ اس میں متکلمین اہل اثبات کی ایک جماعت نے اختلاف کیا ہے، جیسے اشعری اور اس کے پیروکار۔

دوم:...... یہ کہ قرآن اس بات سے معمور ہے کہ اس میں انسانی افعال کی نسبت بنی نوع آدم کی طرف کی گئی

ہے، اور بندوں کے افعال رب تعالیٰ کی قدرت، مشیت اور خلق سے ہی وجود میں آتے ہیں اور قرآن کی ہر بات پر ایمان لانا واجب ہے۔ یہ جائز نہیں کہ بعض پر تو ایمان لائیں اور بعض کا انکار کر دیں۔ فرمان ربانی ہے:

﴿وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ٥﴾ (البقرة: ٢٥٣)

''اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے اور لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ﴾ (الانعام: ١٢٥)

''تو جسے اللہ چاہتا ہے کہ اسے ہدایت دے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ اسے گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ، نہایت گھٹا ہوا کر دیتا ہے، گویا وہ مشکل سے آسمان میں چڑھ رہا ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ٥﴾ (الانعام: ١١٢)

''اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔ پس چھوڑ انھیں اور جو وہ جھوٹ گھڑتے ہیں۔۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا٥ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (الكهف: ٢٣-٢٤)

''اور کسی چیز کے بارے میں ہرگز نہ کہہ کہ میں یہ کام کل ضرور کرنے والا ہوں۔ مگر یہ کہ اللہ چاہے۔''

علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ اگر کسی نے یوں قسم اٹھائی کہ میں ان شاء اللہ کل ظہر کی نماز پڑھوں گا، یا اپنے ذمے قرض ادا کروں گا، یا حق والوں کو ان کا حق دوں گا، یا یہ امانت لوٹاؤں گا، وغیرہ وغیرہ پھر اس نے ایسا نہ کیا تو وہ اپنی قسم میں حانث نہ ہوگا اور اگر مشیت بمعنی امر کے ہو تو حانث ہو جائے گا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے:

﴿رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا﴾(البقرة: ١٢٨)

''اے ہمارے رب! اور ہمیں اپنے لیے فرماں بردار بنا اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک امت اپنے لیے فرماں بردار بنا اور ہمیں ہمارے عبادت کے طریقے دکھا۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا﴾ (البقرة: ٢٦)

''وہ اس کے ساتھ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور اس کے ساتھ بہتوں کو ہدایت دیتا ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهٖ﴾ (الانفال: ٢٤)

''اور جان لو کہ بے شک اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان رکاوٹ بن جاتا ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ○ وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ○﴾ (یس: ۸-۹)

''بے شک ہم نے ان کی گردنوں میں کئی طوق ڈال دیے ہیں، پس وہ ٹھوڑیوں تک ہیں، سو ان کے سر اوپر کو اٹھا دیے ہوئے ہیں۔ اور ہم نے ان کے آگے سے ایک دیوار کر دی اور ان کے پیچھے سے ایک دیوار، پھر ہم نے انھیں ڈھانپ دیا تو وہ نہیں دیکھتے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ جَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ وَ اَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا○ وَّ بَرًّا ۢ بِوَالِدَتِيْ وَ لَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا○﴾ (مریم: ۳۱-۳۲)

''اور مجھے بابرکت بنایا جہاں بھی میں ہوں اور مجھے نماز اور زکوٰۃ کی وصیت کی، جب تک میں زندہ رہوں۔ اور اپنی والدہ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والا (بنایا) اور مجھے سرکش، بدبخت نہیں بنایا۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ جَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا﴾ (الانبیاء: ۷۳)

''اور ہم نے انھیں ایسے پیشوا بنایا جو ہمارے حکم کے ساتھ رہنمائی کرتے تھے۔''

اور بنی اسرائیل کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ﴾ (السجدة: ٢٤)

''اور ہم نے ان میں سے کئی پیشوا بنائے، جو ہمارے حکم سے ہدایت دیتے تھے، جب انھوں نے صبر کیا اور وہ ہماری آیات پر یقین کیا کرتے تھے۔''

اور آل فرعون کے بارے میں فرمایا:

﴿وَ جَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ○﴾ (القصص: ٤١)

''اور ہم نے انھیں ایسے پیشوا بنایا جو آگ کی طرف بلاتے تھے اور قیامت کے دن ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔''

اور ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ رَبَّنَا وَ تَقَبَّلْ دُعَآءِ○﴾ (ابراهيم: ٤٠)

''اے میرے رب! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی، اے ہمارے رب! اور میری دعا

قبول کر۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿رَبَّنَآ اِنِّیۡۤ اَسۡكَنۡتُ مِنۡ ذُرِّيَّتِىۡ بِوَادٍ غَيۡرِ ذِىۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَيۡتِكَ الۡمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ فَاجۡعَلۡ اَفۡـئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهۡوِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ﴾ (ابراھیم: ٣٧)

''اے ہمارے رب! بے شک میں نے اپنی کچھ اولاد کو اس وادی میں آباد کیا ہے، جو کسی کھیتی والی نہیں، تیرے حرمت والے گھر کے پاس، اے ہمارے رب! تاکہ وہ نماز قائم کریں۔ سو کچھ لوگوں کے دل ایسے کر دے کہ ان کی طرف مائل رہیں۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمۡ اَنَّا حَمَلۡنَا ذُرِّيَّتَهُمۡ فِى الۡفُلۡكِ الۡمَشۡحُوۡنِۙ‏ o وَخَلَقۡنَا لَهُمۡ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ مَا يَرۡكَبُوۡنَ o﴾ (یس: ٤١-٤٢)

''اور ایک نشانی ان کے لیے یہ ہے کہ بے شک ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔ اور ہم نے ان کے لیے اس جیسی کئی اور چیزیں بنائیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں۔''

اب کشتی بنی آدم کی مصنوعات میں سے ہے اور یہ رب تعالیٰ کے اس قول کی مثل ہے:

﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمۡ وَمَا تَعۡمَلُوۡنَ o﴾ (الصافات: ٩٦)

''حالانکہ اللہ ہی نے تمھیں پیدا کیا اور اسے بھی جو تم کرتے ہو۔''

مثبتین قدر کی ایک جماعت کا قول ہے کہ یہاں ''ما'' مصدریہ ہے اور مراد یہ ہے کہ اس نے تمھیں اور تمھارے اعمال کو پیدا کیا ہے۔ یہ بے حد ضعیف تفسیر ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہاں ''ما'' الذی کے معنی میں ہے اور مراد یہ ہے کہ اللہ نے تمھیں اور ان بتوں کو پیدا کیا جن کو تم بناتے ہو۔ جیسا کہ حدیث حذیفہ رضی اللہ عنہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''رب تعالیٰ نے ہر صانع کو اور اس کی صنعت کو پیدا کیا ہے۔'' [1]

اور رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اَتَعۡبُدُوۡنَ مَا تَنۡحِتُوۡنَ o وَاللّٰهُ خَلَقَكُمۡ وَمَا تَعۡمَلُوۡنَ o﴾ (الصافات: ٩٦)

''تم اس کی عبادت کرتے ہو جسے خود تراشتے ہو؟ حالانکہ اللہ ہی نے تمھیں پیدا کیا تمہارے عمل کو۔''

رب تعالیٰ نے ان تراشے ہوئے بتوں کی عبادت کرنے پر ان کی مذمت اور ان پر انکار کیا ہے۔ پھر یہ بیان فرمایا کہ رب تعالیٰ اس عابد کا، اس معبود اور اس تراشے ہوئے بت کا خالق ہے اور عبادت کا مستحق وہی اللہ ہے۔

اگر یہ مراد لیا جائے کہ اس نے تمھیں اور تمھارے جملہ افعال کو پیدا کیا ہے تو یہ مناسب نہ ہوگا کیونکہ اس نے ان کی

[1] صحیح الجامع الصغیر للالبانی: ١١٦، عن حذیفة رضی اللہ عنہ.

عبادت اقسام کی مذمت بیان کی ہے جو ان کا عمل ہے۔لہٰذا خالق افعال و اعمال کے بتلانے میں قابل مذمت باتوں کا ذکر مناسب نہیں۔ بلکہ یہ عذر کے زیادہ قریب ہے۔

البتہ یہ آیت بتلاتی ہے کہ وہ ایک اور اعتبار سے بندوں کے افعال کا خالق ہے اور وہ یہ کہ جب اس نے اس معمول کو پیدا کیا جو بندے کرتے ہیں اور وہ تراشا ہوا بت ہے تو اس نے اس تالیف کو پیدا کیا جو اس کے ساتھ قائم ہے اور یہ ابن آدم کے عمل کا مسبب ہے اور خالق مسبب بطریقہ اولیٰ خالق سبب ہے۔

سو یہ اس ارشاد باری جیسا ہو گیا:

﴿وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهِ مَا يَرْكَبُوْنَ٥﴾ (یٰسٓ: ٤٢)

''اور ہم نے ان کے لیے اس جیسی کئی اور چیزیں بنائیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں۔''

یہ بات معلوم ہے کہ کشتیوں کی لکڑیاں تیرتی ہیں اور بنی آدم ان پر سوار ہوتے ہیں۔ لہٰذا کشتی بنی آدم کا معمول ہے جیسا کہ بت بنی آدم کا معمول ہے۔ یہی حکم بندے کی جملہ مصنوعات کا ہے جیسے کپڑے، کھانے اور عمارتیں وغیرہ۔ سو جب اللہ نے اس بات کی خبر دی ہے کہ اس نے بھری کشتی کو پیدا کیا ہے اور اسے اپنی نشانی ٹھہرایا ہے اور اسے اپنے بندوں پر اپنا انعام بنایا ہے تو معلوم ہوا کہ وہ بندوں کے افعال کا خالق ہے۔

اب قدریہ کے قول کے مطابق اللہ نے صرف لکڑی کو پیدا کیا ہے جو کشتی وغیرہ بن سکتی ہے اور یہ معلوم ہے کہ صرف مادہ کا پیدا کرنا بنی آدم کی افعال سے حاصل ہونے والی صورت کے پیدا کرنے کو واجب نہیں کرتا گو کہ بنی آدم اس صورت کا خالق نہیں۔اسی جیسی یہ آیت بھی ہے:

﴿وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَ يَوْمَ اِقَامَتِكُمْ﴾ (النحل: ٨٠)

''اور اللہ نے تمھارے لیے تمھارے گھروں سے رہنے کی جگہ بنا دی اور تمھارے لیے چوپاؤں کی کھالوں سے ایسے گھر بنائے جنھیں تم اپنے کوچ کے دن اور اپنے قیام کے دن ہلکا پھلکا پاتے ہو۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ٥﴾

(النحل: ٨١)

''اور اللہ نے تمھارے لیے اپنی پیدا کردہ چیزوں سے سائے بنا دیے اور تمھارے لیے پہاڑوں میں چھپنے کی جگہیں بنائیں اور تمھارے لیے کچھ قمیصیں بنائیں جو تمھیں گرمی سے بچاتی ہیں اور کچھ قمیصیں جو تمھیں تمھاری لڑائی میں بچاتی ہیں۔اسی طرح وہ اپنی نعمت تم پر پوری کرتا ہے، تاکہ تم فرماں بردار بن جاؤ۔''

یہ بات معلوم ہے کہ بنائے ہوئے گھر اور کپڑے یہ بنائی ہوئی کشتیوں کی طرح ہیں۔ رب تعالیٰ نے اس بات کی خبر دی ہے کہ یہ کشتیاں بندوں کی صنعت ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا ہے کہ ان کا خالق اللہ ہے۔ جیسا کہ نوح علیہ السلام کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿وَ یَصۡنَعُ الۡفُلۡکَ﴾ (ہود: ۳۸)

''اور وہ کشتی بناتے تھے۔''

غرض قرآن میں اس کا طویل بیان ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿فَرِیۡقًا ھَدٰی وَ فَرِیۡقًا حَقَّ عَلَیۡھِمُ الضَّلٰلَۃُ﴾ (الاعراف: ۳۰)

''ایک گروہ کو اس نے ہدایت دی اور ایک گروہ، ان پر گمراہی ثابت ہو چکی۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَھَدَی اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لِمَا اخۡتَلَفُوۡا فِیۡہِ مِنَ الۡحَقِّ بِاِذۡنِہٖ﴾ (البقرۃ: ۲۱۳)

''پھر جو لوگ ایمان لائے اللہ نے انھیں اپنے حکم سے حق میں سے اس بات کی ہدایت دی جس میں انھوں نے اختلاف کیا تھا۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلٰـکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیۡکُمُ الۡاِیۡمَانَ وَلَکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیۡکُمُ الۡاِیۡمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ وَ کَرَّہَ اِلَیۡکُمُ الۡکُفۡرَ وَالۡفُسُوۡقَ وَالۡعِصۡیَانَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الرّٰشِدُوۡنَo﴾ (الحجرات: ۷)

''اور لیکن اللہ نے تمھارے لیے ایمان کو محبوب بنا دیا اور اسے تمھارے دلوں میں مزین کر دیا اور اس نے کفر اور گناہ اور نافرمانی کو تمھارے لیے ناپسندیدہ بنا دیا، یہی لوگ ہدایت والے ہیں۔''

یہ بات معلوم ہے کہ یہاں ہدایت سے وہ ہدایت مراد نہیں جو کافر اور مسلمان کے درمیان مشترک ہے جیسے رسولوں کا بھیجنا، فعل کی تمکین اور بیماریوں کا دُور کرنا وغیرہ۔ بلکہ مراد وہ ہدایت ہے جو مومن کے ساتھ خاص ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد میں ذکر ہے:

﴿وَ اجۡتَبَیۡنٰھُمۡ وَ ھَدَیۡنٰھُمۡ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍo﴾ (الانعام: ۸۷)

''اور ہم نے انھیں چنا اور انھیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت دی۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَآتَیۡنَاھُمَا الۡکِتٰبَ الۡمُسۡتَبِیۡنَo وَھَدَیۡنَاھُمَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَo﴾ (الصافات: ۱۱۷-۱۱۸)

''اور ہم نے ان دونوں کو واضح کتاب دی۔ اور ہم نے ان دونوں کو سیدھے راستے پر چلایا۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ o صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ o غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ o﴾ (الفاتحة: ٦-٧)

'' ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔ ان لوگوں کے راستے پر جن پر تو نے انعام کیا، جن پر نہ غصہ کیا گیا اور نہ وہ گمراہ ہیں۔''

کیونکہ ہدایت مشترکہ مانگنے کی بھی احتیاج نہیں۔ مانگی تو وہ ہدایت جاتی ہے جو مہتدین کیساتھ خاص ہے اور جس نے اس کی تاویل زیادتِ ہدایت اور تثبیت سے کی ہے اور اسے جزا کہا ہے، اس کے قول میں تناقض ہے۔

کیونکہ کہا جاتا ہے: یہ مطلوب اگر بندے کے اختیار سے حاصل نہ ہو تو اس پر ثواب مرتب نہیں ہوتا کیونکہ ثواب تو اسی فعل پر ملتا ہے جو اختیار سے کیا ہو اور اگر وہ اس کے اختیار سے ہے تو ثابت ہو گیا کہ اللہ نے اس فعل کو حادث کیا ہے جسے بندے نے اپنے اختیار سے کیا ہے۔ یہی اہل سنت کا مذہب ہے۔

اسی طرح رب تعالیٰ نے قرآن میں اضلال اور ہدایت کا جو ذکر کیا ہے، یہ لوگ اس کی تاویل ماتقدم کی جزا سے کرتے ہیں۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ ان لوگوں کی عام تاویلات اللہ اور اس کے رسول کی مراد نہیں ہیں۔ حالانکہ یہ جزا فعل پر فاعل کو دی جاتی ہے اور اگر وہ اس بات کو جائز قرار دیتے ہیں کہ اللہ بندے کو اس فعل اختیار پر جزا دیتا ہے جو اس نے بندے پر انعام کیا ہے تو پھر یہ بھی جائز ہو کہ وہ بندے کو اس کے طاعت کو اختیار کرنے ابتدا سے ہی انعام دے اور اگر ان کے نزدیک بندے کو اس کے فاعل بنائے جانے پر ثواب وعقاب جائز نہیں ہے۔ تو ہدایت وضلالت پر ثواب وعقاب کو مراد لینا باطل ٹھہرے گا اور رب تعالیٰ نے جو ان باتوں کی خبر دی ہے کہ ان کی گردنوں میں طوق ڈالے جائیں گے اور ان کے آگے پیچھے آگ کی دیواریں کھڑی کر دی جائیں گی کہ یہ سب ممتنع ہو۔ حالانکہ اللہ نے یہ ارشاد فرمایا ہے:

﴿اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ﴾ (النحل: ٣٧)

''اگر تو ان کی ہدایت کی حرص کرے تو بے شک اللہ اسے ہدایت نہیں دیتا جسے وہ گمراہ کر دے۔''

اللہ نے اس بات کی خبر دی ہے کہ جسے وہ گمراہ کر دے وہ ہدایت نہیں پایا کرتا۔

غرض قرآن کریم میں ایسی متعدد آیات ہیں جو اس مضمون پر مشتمل ہیں کہ اللہ بندوں کے افعال کا خالق ہے اور وہی دلوں کو بدلتا ہے، جسے چاہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہے گمراہ کرتا ہے، وہی ہدایت والے پر ہدایت کا انعام کرتا ہے۔ غرض یہ بڑی طویل بحث ہے جس کا استقصاء اس مقام پر مشکل ہے۔

اسی طرح قرآن میں یہ مضمون بھی ہے کہ رب تعالیٰ کی صفت خلق عام ہے۔ ارشاد ہے:

﴿اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (الرعد: ١٦)

''اللہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے۔''

یہ آیات بتاتی ہیں کہ وہ فعال لما یرید ہے اور یہ کہ اگر وہ چاہے تو سب کو ہدایت دے دے۔ اس طرح کی دیگر

آیات بھی ہیں جن کا بیان کرنا طوالت اختیار کر جائے گا
جب یہ کہا جاتا ہے کہ:'' یہ آیات قدریہ کے نزدیک متاول ہیں کیونکہ ان کے نزدیک یہ آیات متشابہ ہیں۔''
تو اس کا جواب دوطرح سے ہے:
اوّل:...... یہ کہ یہ تاویلاتِ جبریہ کے مقابلہ ہے جن کو انھوں نے دلیل بنایا ہے اور متشابہ کہہ کر یہ لوگ صرف نص کو ذکر کرتے ہیں اور ہم نے طرفین کی نصوص ذکر کی ہیں۔
دوم:...... یہ کہ ہم ان کی ایک ایک تاویل کو فساد کو واضح کریں جیسا کہ دوسرے مقام پر کیا ہے اور یہ کہ ان کی تاویلات میں کلمات کو ان کی جگہ سے پھیرنا، لغت کی مخالفت، معانی کا تناقض، اسلافِ امت کے اجماع کی مخالفت ہے۔ جو بتلاتے ہیں کہ ان کی تاویلات باطل ہیں اور یہ کہ قرآن میں ایسا کوئی محکم نہیں جو اس کے مناقض ہو کہ یہ بھی کہنا پڑے کہ یہ محکم ہے اور یہ متشابہ، بلکہ قرآن تو ایک دوسرے کی تصدیق کرتا ہے۔
ان بدعتیوں میں سے جس نے بھی اس باب کو کھولا ہے وہ ثابت قدم نہیں رہ سکتا کیونکہ اس کا خصم بھی وہی کرتا ہے جو یہ کرتا ہے پھر اس کے ہاتھ میں معارضہ سے سلامت کوئی دلیل رہ نہیں جاتی۔ کیونکہ ان کی عام تاویلات کو اللہ اور اس کے رسول نے اپنے کلام میں مراد نہیں لیا۔

فصل:......قادر کے مقدور کو راجح کرنے کی بحث

[افعالِ اختیاریہ کی بابت رافضی کا یہ قول ہے ''قادر اپنے مقدور کو راجح نہیں کر سکتا'' اور اس کا ردّ]

[اعتــــراض] : شیعہ مضمون نگار لکھتا ہے:'' ہمارے مخالفین کا عقیدہ یہ ہے کہ صاحب قدرت کے ہر دو مقدور میں سے بلا مرجّح کسی کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ ظاہر ہے کہ ترجیح دینے کی صورت میں فعل واجب ہو جاتا ہے، اور قدرت باقی نہیں رہتی۔ علاوہ ازیں اس سے لازم آتا ہے کہ بندہ اللہ کا شریک ہو؛ جب کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ٥﴾ (الصافات: ۹٦)

'' حالانکہ اللہ ہی نے تمھیں پیدا کیا اور اسے بھی جو تم کرتے ہو۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]۔

[جــــواب] : پہلا جواب: یہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق سے مقابلہ کرنے والی بات ہے۔ اگر قدرت مرجّح کی محتاج ہو اور مرجّح سے نتیجہ کا ظہور و وقوع واجب ہو جاتا ہو تو اس سے اللہ تعالیٰ کا مختار نہیں بلکہ موجب ہونا لازم آتا ہے، جس کا نتیجہ کفر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

دوسرا جواب:...... بھلا یہاں کون سی شرکت ہے۔ جب اللہ تعالیٰ بندے کو مقہور و معدوم کرنے پر قادر ہے [[تو اس کے شریک ہونے کا احتمال کیوں کر پیدا ہو گیا؟]]۔ جیسے اگر حاکم کسی کو کسی علاقہ کا امیر مقرر کر دے اور وہ ظلم و ستم پر اتر آئے تو سلطان اور حکم اس کے قتل پر، اس سے انتقام لینے پر اور اس کے چھینے اموال کے واپس لینے پر قادر ہوتا ہے۔ وہ

سلطان کا شریک نہیں ہو جاتا۔

تیسرا جواب :......آیت قرآنی ''وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ '' کا جواب یہ ہے کہ اس میں ان بتوں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جن کو وہ خود ہی گھڑا کرتے تھے، ان بتوں کی مذمت میں فرمایا:

﴿ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ (الصافات:۹۵۔۹۶)

''کیا تم ان کو پوجتے ہو جن کو تراش لیتے ہو، حالانکہ تم اور تمہارے اعمال اللہ نے پیدا کیے ہیں۔''

شیعہ مصنف نے قائلین تقدیر کے صرف چند دلائل بیان کیے ہیں[اور ان کے دلائل کو مفصل ذکر نہیں کیا۔] بایں ہمہ تین دلائل کا شیعہ کے پاس کوئی صحیح جواب نہیں:

پہلی دلیل کے معقول ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص یہ دلیل پیش کرتا ہے، وہ یہ نہیں کہتا کہ جب فعل واجب ہو جاتا ہے تو قدرت باقی نہیں رہتی، اس کے برخلاف عام اہل سنت کا قول ہے کہ بندے میں قدرت پائی جاتی ہے، یہ اکثر اہل سنت کا مذہب ہے۔حتیٰ کہ غالی مثبتین قدر کا بھی؛ جیسے اشعریہ؛ وہ بھی اس بات پر متفق ہیں کہ بندے کو قدرت حاصل ہے۔ اور اس مذکورہ دلیل سے ابوعبداللہ رازی رحمہ اللہ وغیرہ نے حجت پکڑی ہے۔ وہ اس بات کی تصریح کرتے ہیں کہ وہ جبریہ عقیدہ کے قائل ہیں۔لیکن اس کے باوجود کہتے ہیں کہ بندے کو قدرت حاصل ہے۔ اگرچہ ان کا اس امر میں اختلاف ہے کہ یہ قدرت اپنے مقدور میں موثر ہے، یا اس کی بعض صفات میں موثر ہے، یا اس کی سرے سے کوئی تاثیر ہی نہیں۔

ابوالحسین بصری اور دیگر معتزلہ کا قول ہے کہ فعل میں صرف قدرت کافی نہیں؛ بلکہ یہ داعی پر موقوف ہے۔ان کا کہنا ہے کہ قادر مختار محض قدرت سے ترجیح نہیں پیدا کرسکتا۔ بلکہ داعی کے ذریعے جو قدرت کے مقارک ہو۔جیسا کہ اکثر مثبتین تقدیر کا قول ہے؛ وہ کہتے ہیں: رب تعالیٰ محض قدرت سے ترجیح اختیار نہیں کرتا بلکہ قدرت کے ساتھ ارادہ کے ذریعے ترجیح پیدا کرتا ہے۔ائمہ اربعہ کے اکثر اصحاب کا یہی قول ہے۔اصحاب احمد میں سے قاضی ابوخازم کا بھی یہی قول ہے۔

گزشتہ میں مذکور ہو چکا ہے کہ اس باب میں متوسط قول یہ ہے کہ قدرت کو تاثیر ہے جو اسباب کی مسببات میں تاثر کی خبر میں سے ہے۔البتہ اسے خلق اور ابداع کی تاثیر نہیں اور نہ اس کا وجود اس کے عدم کے جیسا ہے۔اس دلیل کی توجیہ یہ ہے کہ قادر کے لیے بلا مرجح کے دو میں سے ایک مقدور کو ترجیح دینا ممتنع ہے۔ وہ اس لیے کہ جب فعل اور ترک دونوں کی قادر کی طرف نسبت یکساں ہوگی تو دو متماثلین میں سے ایک کی دوسرے پر ترجیح بلا مرجح ہوگی اور یہ بات عقل بدیہہ کے نزدیک ممتنع ہے۔جس کی تفصیل اپنے مقام پر موجود ہے۔ جہاں اس شخص کی خطا کو بیان کیا گیا ہے جو اس بات کا گمان رکھتا ہے کہ قادر دو مقدور متماثلین میں سے ایک کو دوسرے پر بلا مرجح کے ترجیح دیتا ہے۔اور یہ مرجح بندے کی طرف سے نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس مرجح میں قول بالکل ویسے ہی ہے جیسے بندے کے فعل میں۔علاوہ ازیں اس امر سے بھی مذکورہ بالا دلیل کی تائید ہوتی ہے کہ صاحب قدرت کا مقدور کسی مرجّح کے بغیر ترجیح نہیں پا سکتا، یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ یہ مرجّح بندے میں نہیں پایا جاتا، لہٰذا اس کا من جانب اللہ ہونا متعین ہوا، یہ بھی ظاہر ہے کہ مرجّح تام کے موجود

ہونے کی صورت میں فعل کا پایا جانا ضروری اور اس کا عدم وجود ممتنع ہوتا ہے، اس لیے کہ اگر مرجّح کے پائے جانے کے بعد بھی فعل کا وجود و عدم مساوی ہو جیسا کہ وجود مرجح سے قبل تھا تو وہ فعل ممکن ٹھہرے گا اور ممکن کا وجود اسی صورت میں عدم کے مقابلہ میں راجح ہوتا ہے جب کوئی مرجّح تام پایا جاتا ہو۔ جس کے وقت فعل کا وجود واجب ہوا۔

جب بندے کا فعل اللہ کی طرف سے مرجح کے بغیر حاصل نہیں ہوتا کہ جس کے پائے جانے کے وقت فعل کا وجود واجب ہوتا ہے تو بندے کا فعل دیگر حوادث کی طرح ٹھہرے گا جو ان اسباب سے حادث ہوتے ہیں جن کو اللہ نے پیدا کیا ہے کہ جن کے ہونے کے وقت حادث کا وجود واجب ہوتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ بندے کے فعل کا خالق ہے اور یہ کہ اللہ نے بندے میں قدرتِ تامہ اور ارادہ جازمہ کو پیدا کیا ہے کہ جن کے وجود کے وقت فعل کا وجود واجب ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ فعل کا سبب تام ہے اور جب سبب تام پایا جاتا ہے تو مسبب کا وجود واجب ہوتا ہے۔ پھر اللہ مسبب کا بھی تو خالق ہے کہ یہ سب اس کی مخلوق ہے۔ جیسے جب اللہ تعالیٰ کسی کپڑے میں آگ پیدا کرتے ہیں تو اسکے بعد اس کے مابعد اثرات کا ہونا لازم ہے اور یہ سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔

[اللہ تعالیٰ کے ساتھ معارضہ کی بحث]:

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ اس فعل سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ معارضہ لازم آتا ہے۔ تو اس کے کئی جوابات ہیں:

اول:...... یہ عقلی و یقینی دلیل ہے اور یقینیات کا معارضہ ممکن نہیں، جو ان کو باطل قرار دے دے اور اگر فرض کیا کہ اس کو دلیل بنانے والا موجب بالذات کا قائل ہے تو بھی اس سے ہماری ذکر کردہ دلیل منقطع نہیں ہوتی۔ بالخصوص ان کے نزدیک یہ مسئلہ ان عقلیات میں سے جن کو بدون سمع کے جانا جاتا ہے لہٰذا اس میں عقلی جواب کا ہونا لازم ہے۔

دوم:...... یہ کہا جائے کہ رب تعالیٰ اپنی قدرت سے اپنی مشیئت کے ساتھ فعل کرتا ہے کہ جو اس نے چاہا وہ ہوا اور جو اس نے نہ چاہا وہ نہ ہوا اور یہ بات نہیں کہ ہر وہ بات جس پر وہ قادر ہو اس نے اسے کیا بھی ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ﴾ (القیامة: ٤)

''کیوں نہیں؟ ہم قادر ہیں کہ اس (کی انگلیوں) کے پورے درست کر (کے بنا) دیں۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓی اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ یَلْبِسَكُمْ شِیَعًا وَّ یُذِیْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ﴾ (الانعام: ٦٥)

''فرما دیں وہی اس پر قادر ہے کہ تم پر تمھارے اوپر سے عذاب بھیج دے، یا تمھارے پاؤں کے نیچے سے، یا تمھیں مختلف گروہ بنا کر گتھم گتھا کر دے اور تمھارے بعض کو بعض کی لڑائی کا مزہ چکھائے۔''

بخاری و مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓی اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ﴾ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا:

’’میں تیرے چہرے کی پناہ میں آتا ہوں، پھر یہ نازل ہوئی: ﴿أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ﴾ تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں تیرے چہرے کی پناہ میں آتا ہوں۔ پھر یہ نازل ہوئی: ﴿أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا.... الی آخر الآیة . تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ دونوں باتیں زیادہ ہلکی ہیں۔‘‘

اور ارشاد ہے:

﴿وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا﴾ (یونس: ۹۹)

’’اور اگر تیرا رب چاہتا تو یقیناً جو لوگ زمین میں ہیں سب کے سب اکٹھے ایمان لے آتے۔‘‘

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ (هود: ۱۱۸)

’’اور اگر تیرا رب چاہتا تو یقیناً سب لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا۔‘‘

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا﴾ (البقرة: ۲۵۳)

’’اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے۔‘‘

غرض قرآن کریم میں اس کی متعدد مثالیں مذکور ہیں۔

جب بات یہ ہے کہ جو اس نے چاہا وہ ہوا تو یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ اس پر قادر ہے۔ کیونکہ غیر مقدور فعل غیر ممکن ہوا کرتا ہے۔ سو معلوم ہوا کہ جب فعل محض اس کے قادر ہونے کی وجہ سے واقع ہوا ہے تو ہر مقدور واقع ہوگا۔ بلکہ قدرت کے ساتھ ارادہ لازمی ہے۔ مزید برآں قائل کا قول کہ: قدرت ربانی مرجّح کی محتاج ہے، ظاہر ہے کہ مرجّح صرف اللہ کا ارادہ ہی ہوسکتا ہے، یہ امر بھی مسلّم ہے کہ ارادہ الٰہی کا صدور غیر سے ممکن نہیں بخلاف بندے کے ارادہ کے کہ وہ غیر سے صادر ہوسکتا ہے، جب ارادہ الٰہی مرجّح ہوا تو فاعل بالاختیار ہوگا، نہ کہ موجب بالذات بلا اختیار۔ اندریں صورت کفر بھی لازم نہیں آئے گا۔

کیا اللہ تعالیٰ موجب بذاتہٖ ہے......؟:

سوم:......شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ’’اس سے اللہ تعالیٰ کا موجب بالذات ہونا لازم آتا ہے۔‘‘

ہم پوچھتے ہیں کہ اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بلا قدرت و ارادہ تاثیر پیدا کر دیتا ہے؟ یا تمہارا مقصد یہ ہے کہ مرجّح یعنی ارادہ مع القدرت کے ساتھ تاثیر کا پیدا ہوجانا ناگزیر ہوجاتا ہے۔ بصورت اول ہم تلازم کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں، اس لیے کہ ہم فرض کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ صاحب قدرت اور ترجیح دینے والا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہاں دو چیزیں ہیں:

۱۔قدرت ۲۔امر [جس کی تفسیر ہم نے ارادہ سے کی ہے]

پھر یہ کہنا کیوں کر درست ہے کہ اللہ تعالیٰ قدرت وارادہ کے بغیر ترجیح دینے والا ہے؟

اگر شیعہ مضمون نگار کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ارادہ مع القدرت کے پائے جانے کی صورت میں نتیجہ کا ظہور ایک لابدی امر ہے تو یہ ایک حق بات ہے اور سب اہل اسلام اس کے قائل ہیں، اور کوئی اس کا نام موجب بالذات رکھ دیتا ہے تو یہ نزاعِ لفظی ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ اللہ تعالیٰ جس چیز کو عالم وجود میں لانا چاہتے ہیں وہ اس کی قدرت و مشیت کے مطابق ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔ بعینہ اسی طرح جس چیز کا وجود ذات باری کو پسند نہیں ہوتا وہ اس کی مشیت و قدرت کے نہ ہونے کی بنا پر عالم وجود میں نہیں آتی۔ پہلی قسم مشیت ایزدی کے باعث واجب اور دوسری عدم مشیت کی وجہ سے ممتنع ہوتی ہے۔

قدریہ کا یہ قول کہ اللہ تعالیٰ بعض اشیاء کو چاہتے ہیں مگر وہ وجود پذیر نہیں ہوتیں اور بعض اشیاء اس کی مشیت کے بغیر ظہور میں آ جاتی ہیں، [صریح ضلالت کا آئینہ دار ہے] اہل سنت اس پر انکار کرتے ہیں۔

چہارم:...... کہ وہ پاک ذات قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتے ہیں تو وہ دو حال سے خالی نہیں:

ا۔ اس کا وجود میں آنا واجب ہو۔ ۲۔ دوسرا یہ کہ اس کا ظہور پذیر ہونا واجب نہ ہو۔

بصورت اول مطلوب حاصل ہو گیا اور مرجّح کے ہوتے ہوئے اثر ونتیجہ بھی رونما ہو گیا، خواہ اس کا نام موجب بالذات رکھا جائے، یا کچھ اور۔ بصورت ثانی اس چیز کا وجود واجب نہیں۔ لہٰذا وہ ممکن ہوئی جس کا وجود و عدم مساوی ہے اور جس کے لیے کسی مرجّح کا ہونا از بس ضروری ہے، علی ہذا القیاس۔ ایسا ہی ہر اس امر میں ہوگا جو وجود کو قبول کرنے والا ہو اور اس کا وجود واجب نہ ہوگا تو اس کا وجود ممکن اور عدم اور وجود دونوں کا احتمال رکھتا ہوگا اور ایسا تب ہی حاصل ہوگا جب مرجح تام حاصل ہو جو اس کے وجود کو موجب بالذات ہو۔

سو ظاہ ہوا کہ جو بھی پایا گیا، اس کا وجود اللہ کی قدرت ومشیت سے واجب ہوا اور یہی مطلوب ہے اور یہ معتزلہ کی ایک جماعت کا قول ہے جیسے ابوالحسین بصری وغیرہ۔ اور قدریہ کی ایک جماعت اس باب میں یہ کہتی ہے کہ مرجح کے وجود کے وقت فعل کا وجود اولیٰ ہے۔ البتہ یہ اولویت وجوب تک نہیں جاتی۔ جیسا کہ محمود خوارزمی اور زمخشری وغیرہ کا قول ہے جو کہ باطل ہے۔ کیونکہ جب یہ اولویت وجوب کی حد تک نہیں پہنچتی تو یہ ممکن ہوا جو مرجح کا محتاج ہوتا ہے۔ سو یا تو واجب ہے یا ممکن ہے، اور ممکن عدم و وجود دونوں کو قبول کرتا ہے۔

پھر قدریہ اور جہمیہ کی ایک تیسری جماعت بھی ہے یہ ابوالحسین وغیرہ کے متکلمین اصحاب ہیں؛ اور ائمہ اربعہ کے اصحاب اور شیعہ وغیرہ ہیں۔ یہ کہتے ہیں: قادر مرجح کے بغیر ترجیح دیتا ہے۔ ان کے نزدیک ارادہ بلا مرجح کے حادث ہے۔ یہ لوگ اللہ کے ارادہ کو حادث قرار دیتے ہیں جو کسی محل میں نہیں ہوتا اور اس ارادہ کے ساتھ فعل کو ممکن ٹھہراتے ہیں نہ کہ واجب۔ یہ ان کے ان اصولوں میں سے ہے جن میں یہ لوگ اللہ کے فعل اور حدوث عالم، فعل عبد اور قدر کے مسئلہ میں شدید اضطراب کا شکار ہیں۔

پنجم :...... یہ کہا جائے کہ موجب بالذات کے لفظ میں اجمال ہے۔ اگر تو اس سے وہ مراد لیا جو فلاسفہ کہتے ہیں کہ یہ علت تامہ مستلزمہ للعالم ہے تو یہ باطل معنی ہے۔ کیونکہ علت تامہ اپنے معلول کو مستلزم ہوتی ہے اور اگر یہ عالم معلول اور ایسی علت کو لازم ہے جو ازلی ہے تو اس میں حوادث نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ حوادث علت تامہ ازلیہ سے حادث نہیں ہوتے اور یہ خلافِ محسوس ہے۔ چاہے یہ کہا جائے کہ یہ علت تامہ صفات سے مجرد ایک ذات ہے جیسا کہ صفات کی نفی کرنے والے فلاسفہ کا قول ہے۔ جیسے ابن سینا اور اس جیسے دوسرے۔ یا یہ کہا جائے کہ وہ صفات سے موصوف ایک ذات ہے۔ لیکن وہ اپنے معلول کو مستلزم ہے۔ تو یہ بھی باطل ہے اور اگر موجب بالذات کی تفسیر یہ بیان کی جائے کہ وہ اپنے اپنے وقت میں ایک ایک مخلوق کو اپنی قدرت و مشیئت کے ساتھ واجب کرتی ہے، تو یہ مسلمانوں کا، دوسرے اہل مذاہب کا اور اہل سنت کا مذہب ہے۔ پس جب وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ اپنی قدرت و مشیئت کے ساتھ بندوں کے افعال اور حوادث وغیرہ کو واجب کرتا ہے تو یہ قول اہل سنت کے موافق ہے نہ کہ دہریہ کے معنی کے۔

ششم :...... ہم شیعہ قلمکار سے کہتے ہیں کہ: ''تم نے جو عقلی دلیل بایں طور پیش کی ہے کہ بندہ کے اختیاری افعال اسی کی جانب منسوب کیے جاتے ہیں، اور اس کے حسبِ اختیار وقوع میں آتے ہیں؛ یہ ان افعال سے چکنا چور ہو جاتی ہے، جن کو بندہ انجام نہیں دیتا، مثلاً انسان اپنی صواب دید کے مطابق اپنے کپڑے کو رنگتا ہے، اور اس کو انسان کی صنعت شمار کیا جاتا ہے حالانکہ رنگ اس کا پیدا کردہ نہیں۔ اسی طرح کھیتی باڑی اور درخت بعض اوقات انسان اپنی مرضی سے بوتا ہے اور اس فعل کو اپنی جانب منسوب کیا جاتا ہے حالانکہ اگانا اس کا کام نہیں ہے، اس بیان سے یہ حقیقت منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہے کہ جو چیز انسان کی طرف منسوب ہو اور اس کے حسبِ مرضی وقوع پذیر ہو یہ ضروری نہیں کہ اس کی پیدا کردہ ہو، یہ عقلی معارضہ ہے۔ جو نفس دلیل کے الفاظ سے ہے۔ جبکہ وہ ایسا معارضہ عقلیہ ہے جو نفس دلیل کے الفاظ سے نہیں۔

ہفتم :...... یہ کہا جائے کہ یہ امامی اور اس جیسے دوسرے لوگ تناقض کا شکار ہیں کیونکہ انہوں نے یہ بات بارہا ذکر کی جا چکی ہے کہ جب داعی مع القدرت ہو تو فعل واجب ہوتا ہے۔ جبکہ یہاں پر کہتا ہے کہ داعی اور قدرت کے باوجود فعل کا وجود واجب نہیں ہوتا۔ سو معلوم ہوا کہ لوگ اپنی رائے کے موافق اور اپنے قول کی تائید میں کلام کرتے ہیں نہ کہ حق پر اعتماد کرتے ہیں؛ اور نہ ہی وہ حق جانتے اور مانتے ہیں نہ اس کی نصرت ان کا مقصد ہے۔

فصل ......رافضی کا قول کہ ''بھلا یہاں کون سی شرکت ہے؟'' اور اس کا ردّ

باقی رہا شیعہ مضمون نگار کا یہ قول کہ ''اس میں شرک کیسے پیدا ہو گیا؟''

تو اس کا جواب یہ ہے کہ: ''حوادث کا بلا قدرت الٰہی پیدا ہو جانے کا عقیدہ ہی بہت بڑا شرک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منکرین تقدیر [روافض] کو مجوس کے مماثل/ مشابہ قرار دیا گیا ہے، جو خیر و شر کے دو الگ الگ خالق تسلیم کر کے وہ ایک اور کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ ان لوگوں نے حاکم کی جو مثال پیش کی ہے، وہ اس شراکت کو اور بھی زیادہ موکد کرتی ہے۔

کیونکہ حاکم کے نائبین مملکت کے امور میں اس کے شریک ہوتے ہیں اور حاکم ان کا محتاج ہوتا ہے، نہ تو وہ ان کا خالق ہوتا ہے اور نہ رب۔ بلکہ وہ ان کی قدرت کا بھی خالق نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ نائبین اس کی خارج از قدرت اور اس کے معاون ہوتے ہیں کہ اگر یہ نائبین نہ ہوں تو وہ ملک نہیں چلا سکتا ہے۔

سو جس نے بندوں کے افعال کو اللہ کے ساتھ بمنزلہ نائبین حاکم کے افعال ان کے حاکم کے ساتھ، قرار دیا اس نے وہ صریح شرک کیا جو بتوں کے پجاری بھی نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ ربوبیت میں شرک ہے نا کہ الوہیت میں۔ کیونکہ اس بات کا اعتراف ان بت پرستوں کو بھی تھا کہ یہ بت اللہ کی ملک ہیں اور وہ حج میں "لبیك لا شریك لك الا شریكا هو لكن تملكه و لا ملك" کہا کرتے تھے۔ (اے اللہ! میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں سوائے اس شریک کے جس کا تو مالک ہے نہ کہ وہ خود کسی شے کا مالک ہے)۔

یہ لوگ بندہ جن افعال کا مالک ہے؛ اسے اللہ کی ملک قرار دیتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''توحید کی شیرازہ بندی عقیدہ تقدیر سے ہوتی ہے۔'' [1]

سو جس نے اللہ کو ایک کہا اور تقدیر پر ایمان لایا، تو اس کی توحید کامل ہوگئی اور جس نے اللہ کو ایک کہا، پھر تقدیر کا انکار کیا تو اس کی توحید بھی جھوٹی ہے۔ اس عقیدہ کو تسلیم کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بعض حوادث کسی خالق کے بغیر از خود پیدا ہو جاتے ہیں۔ نیز یہ کہ اللہ کے سوا کوئی اور فاعل مستقل بھی موجود ہے، یہ دونوں کفر کی شاخیں ہیں، اس لیے کہ ہر کفر کی جڑ تعطیل و شرک کے تخم سے جنم لیتی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

''یہ لوگ کہتے ہیں کہ بندہ بغیر کسی محدث کے فاعل ارادہ کنندہ ہوا ہے؛ حالانکہ وہ پہلے ایسا نہ تھا؛ اور یہ ایک امر حادث ہے جو پہلے نہ تھا۔ اور ان کے نزدیک اس امر کا حدوث کسی محدث کے بغیر ہے اور یہی تعطیل کی اصل ہے۔ سو جس نے کسی محدث کے بغیر حدوث حادث کو جائز قرار دیا اور یہ کہ ممکن کا وجود اس کے عدم پر بلا مرجح کے راجح ہے اور یہ کہ دو متماثلین میں سے ایک بلا مخصص کے مختص ہو جاتا ہے۔ یہ ان حوادث اور ممکنات کی جنس میں سے ہے جن کے لیے ایک فاعل کا ہونا ممکن ہے۔ لاریب ان کا فاعل اللہ ہے؛ سو ان کا یہ عقیدہ رب تعالیٰ کو اپنی مخلوقات کے خالق ہونے سے معطل کرنا ہے۔

رہا شرک تو یہ لوگ کہتے ہیں: بندہ فعل کے احداث میں مستقل ہے بغیر اس کے کہ اللہ نے اسے فعل کا محدث بنایا ہو۔ جیسے شاہوں کے اعوان و انصار جو شاہ کی طرف سے فاعل بنے بغیر متعدد امور کو سرانجام دیتے ہیں۔ یہ عقیدہ اللہ تعالیٰ کے لیے شرکاء کا اثبات ہے۔ جو اس کی بعض مخلوقات کو پیدا کرتے ہیں۔

یہ دونوں محذور، تعطیل اور شرک فی الربوبیت، ہر اس شخص کو لازم ہیں جو اللہ کے سوا فاعل مستقل کو ثابت کرتے ہیں۔ فلاسفہ بھی اسی زعم فاسد میں مبتلا ہیں کہ افلاک فاعل مستقل ہیں اور وہ حوادث ارضی کو بغیر کسی ایسے سبب کے جنم دیتے

[1] السنة لعبد الله بن احمد (۹۲۵)، الشريعة للآجري (ص:۲۲۶، ح:۴۵٦)، وسنده ضعيف لجهالة الراوي۔

ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی حرکت کو واجب کرتا ہو۔ اور نہ اس کے اوپر کوئی متجدد ہے جو اس کی حرکت کا تقاضا کرتی ہو۔ کیونکہ اس وقت فلک کی حرکت اس کے اختیار سے ہوگی۔ جو انسان کی اپنے اختیار سے حرکت کی طرح ہوتی ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ فلک کا اپنے اختیار و قدرت کے ساتھ حرکت کرنا یہ ممکن ہے نہ کہ واجب بنفسہ لہٰذا اس کے لیے مرجح تام کا ہونا لازم ہے۔ لہٰذا وہ ہر وقت میں اپنے قدرت و اختیار سے حرکت کرتا ہے۔ سو اس کے محترک بننے کے لیے کسی امر کا ہونا لازم ہے جو اسے واجب کرے۔ وگرنہ حوادث کا بلا محدث کے حدوث لازم آئے گا۔

[اعتراض]: اگر یہ کہا جائے کہ موجب بذاتہ وہ مرجح ہے یا فاعل مرجح ہے، چاہے وہ بالواسطہ فاعل ہو یا بلا واسطہ اور وہ عقل یا عقول سے صادر ہوتا ہے۔

جواب: یہ قول باطل ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک موجب بذاتہ ازل سے ابد تک ایک ہی حال پر ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ بات ممتنع ٹھہری کہ اس سے کسی حادث کا صدور ہو بعد اس بات کے کہ اس سے اس حادث کا صدور پہلے نہ ہوا تھا اور حرکت کا ہر جز حادث ہے بعد اس کے کہ پہلے وہ نہ تھا۔ لہٰذا اس حادث کا ازل میں ثابت ہونا ممتنع ٹھہرا اور یہ کہ ازل میں اس کے فاعل کا علت تامہ ہونا بھی ممتنع ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ان حوادث کا ازل میں علت تامہ سے صدور ممتنع ہوا۔

پھر یہ کہ حوادث کا مرجح اگر تو ازل میں مرجح تام ہے تو اس کے لیے مفعول لازم ہوا۔ حالانکہ اس سے اس کے بعد کوئی شے حادث نہیں ہوئی اور اگر وہ ازل میں مرجح تام نہیں؛ تو وہ عدم کے بعد مرجح بنا؛ تو یہ بات ممتنع ہے کہ کسی غیر نے اسے مرجح بنایا ہو۔ پس اس کا مرجح وہی ہوگا؛ جو اپنے ارادہ سے اس کی ذات کے ساتھ قائم ہو۔ اور یہ امور ازل میں مرجح تام نہیں۔ وگرنہ حوادث کا بطلان لازم آئے گا۔ سو مرجح سے ازل میں کسی ایسی چیز کا صدور ممتنع ہوا جو اس کے مقارن ہو۔ سو فلک کا قدیم ہونا بھی ممتنع ٹھہرا۔

یہ اس کے لیے مرجح ٹھہرا جو اسے عدم کے بعد راجح کرتا ہے۔ اسی طرح حوادث کی اس کی طرف اضافت واجب ٹھہری کیونکہ حوادث کی مرجح تام کی طرف اضافت واجب ہے۔ سو ثابت ہوا کہ ان افلاک کے اوپر ایک موثر ہے جس کی تاثیر متجدد ہوتی رہتی ہے اور وہی مطلوب ہے۔

جب ان لوگوں نے اس بات کو ثابت نہ کیا تو فلک اور حوادث کی حرکت کے لیے کسی فاعل کے ہونے کو معطل ٹھہرایا اور یہ تعطیل افعالِ عباد کے لیے کسی محدث ہونے کی تعطیل سے بھی بڑی ہے۔

پھر ان لوگوں نے فلک کو فاعل مستقل قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ان قدریہ نے حیوان کے بارے میں یہ مقرر کیا ہے وہ بطریق استقلال حرکت کرتا ہے نہ کہ ہر حرکت کے وقت اللہ اس میں ایسی قدرت کو پیدا کرتا ہے جو اس حرکت کے مقارن ہو۔ کیونکہ ان کے نزدیک ایک فلک سے دوسرا فلک حادث ہوتا ہے اور دوسرے فلک کی شرط پہلے فلک کا ختم ہو جانا ہے۔ جیسے وہ شخص جو ایک مسافت کو رفتہ رفتہ طیکرتا ہے۔ لیکن یہ مسافت طے کرنے والا، دوسری مسافت کو اس قوت و ارادہ کے ساتھ طے کرتا ہے جو اس کے ساتھ قائم ہے۔ سو فاعل کے لیے ارادہ و قوت کا تجدد ہوتا ہے کہ جس کے ذریعے ایک کے

بعد دوسری مسافت قطع ہوتی ہے۔ لہٰذا فلک کے لیے ہر وقت اس ارادہ اور قوت کا ہونا لازم ہوا جس کے ذریعے وہ حرکت کرتا ہے؛ لیکن لازم ہے کہ اس کا مجدد اس کا غیر ہو۔ کیونکہ وہ ممکن ہے نہ کہ واجب اور اس میں حوادث کا اس سے ہونا ناجائز ہوگا۔ کیونکہ اگر اس نے پہلے کے بعد دوسرے کو حادث کیا ہے تو دوسرے کے وقت موثر تام کا ہونا لازم ہوا۔ چاہے اسے پہلے کے ختم ہونے کے بعد دوسرے کو حادث کیا ہو۔ چاہے اسے پہلے کے ختم ہونے کے بعد دوسرے میں کمالِ تاثیر حاصل ہوا ہو۔ سو اس کمال کا فاعل ہونا لازم ہوا۔ اور یہ لوگ اس بات کو جائز کہتے ہیں کہ ماتقدم اس کا فاعل ہو۔ لہٰذا ہر حال میں ایک فاعل کا ہونا لازم ہوا جو اس امر کو حادث کرے جس سے حرکت حاصل ہو اور یہ واجب بنفسہ کے خلاف ہے، کیونکہ جو افعال اس کے ساتھ قائم ہوتے ہیں ان کا غیر سے صدور جائز نہیں ہوتا۔

[فلاسفہ اور معطلہ کا شرک:]

ان فلاسفہ کا شرک وتعطیل قدریہ کے شرک وتعطیل سے کہیں بڑھ کر ہے۔ کیونکہ یہ لوگ فلک کو ان حوادث کا محدث قرار دیتے ہیں جو ساری زمین میں برپا ہوتے ہیں۔ انھوں نے اللہ کو کسی شے کا بھی حادث نہیں ٹھہرایا۔ بخلاف قدریہ کے کہ انھوں نے حیوان کے افعال کو اور جو اس سے پیدا ہوتا ہے، اس کو اس کے احداث سے نکالا ہے۔ سو حوادث کو بلامحدث کے ثابت کر کے، اور رب تعالیٰ کو کسی بھی حادث سے معطل کر کے اور ایک شریک کو ثابت کر کے انھیں تعطیل لازم آئی جو جمیع حوادث کا فاعل ہے۔

مگر تعجب ہے کہ وہ قدریہ کے اس قول کو تسلیم نہیں کرتے کہ ''اللہ تعالیٰ اس عالم کو پیدا کرنے سے قبل بیکار تھا۔'' فلاسفہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پہلے بھی افعال سے معلل رہا ہے اور بدستور اسی حالت پر قائم ہے؛ بلکہ اس کا کوئی بھی کام نہیں۔ جو چیزیں لوازم ذات میں داخل ہیں، مثلاً عقل وفلک یہ اس کا فعل نہیں، کیونکہ فعل کا ظہور تدریجی طور پر ہوتا ہے، جو چیز ذات کے لوازم میں سے ہو وہ صفات کے قبیل سے ہوتی ہے، مثلاً انسان کا رنگ اور درازیِ قد۔ ظاہر ہے کہ یہ اس کا فعل نہیں، بخلاف ازیں اس کی حرکات کو اس کا فعل قرار دے سکتے ہیں، اگرچہ یہ حرکات بھی اس کے لیے مقدر تھیں۔ جیسے نفس انسانی کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ اس میں مختلف تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں۔ اور بیشک دل میں سب سے زیادہ تغیرات رونما ہوتے ہیں، وہ اس ہنڈیا کی طرح ہے جو ابلتے ہوئے جوش وخروش کا پیکر بنی ہوئی ہوتی ہے۔

فاعل کی تعریف:

خلاصہ کلام! فاعل دراصل وہ ہے جس کے ساتھ کوئی فعل وابستہ ہو اور اس فعل کا ظہور اس سے تدریجاً ہو۔ بخلاف ازیں جس کے ساتھ کوئی وصف ازل ہی سے مقارن چلا آ رہا ہو؛ اس وصف کا اس کا فعل ہونا معقول نہیں۔ اس سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ فلاسفہ اصلاً اللہ کے لیے کسی فعل کا اثبات کرتے ہی نہیں اور بایں طور پر وہ اصلی اور حقیقی معطلہ ہیں۔ ارسطو اور اس کے اتباع صرف علت اولیٰ کے قائل ہیں، اور وہ بھی اس لیے کہ وہ حرکت افلاک کی علت غائی ہے۔ ان کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ حرکت فلک انسانی حرکت کی طرح اختیاری ہے، لہٰذا اس کے لیے کسی مراد ومطلوب کا وجود ناگزیر ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: افلاک کی حرکت علت اولیٰ کے ساتھ تماثل وتشابہ کی رہین احسان ہے۔ جیسے مأموم اپنے امام کی؛ اور مقتدی اپنے پیشوا کی اتباع کرتا ہے۔ ان کے استدلال کی انتہا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وجود عالم کی شرط ہے اور وہ عالم کو اسی طرح متحرک رکھتا ہے، جیسے معشوق عاشق کو۔ اس کو ایک مثال کے ذریعہ ذہن نشین کر سکتے ہیں، مثلاً ایک شخص لذیذ کھانے کو دیکھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھائے یا محبّ محبوب کو دیکھ اس کی طرف حرکت کرے، ظاہر ہے کہ دونوں مثالوں میں حرکت کی علت لذیذ کھانا اور محبوب کا وجود ہے۔

مندرجہ بالا بیان اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ فلاسفہ کے نزدیک حرکت افلاک کا محدث وخالق فلک کے سوا اور کوئی نہیں، جس طرح قدریہ کے نزدیک حیوان کے افعال کا خالق بھی حیوان ہی ہے۔ بنا بریں فلاسفہ کے نزدیک فلک ایک بڑے حیوان کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ ان کا کہنا ہے کہ فلک علت اولی کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے حرکت کرتا ہے۔ کیونکہ علت اولی اس کا معبود اور محبوب ہے۔

اسی لیے کہتے ہیں کہ فلسفہ بہ حسب طاقت الٰہ سے تشبہ ہے اور درحقیقت ان فلسفیوں کے نزدیک اس عالم کا نہ کوئی رب ہے اور نہ الٰہ اور نہ ہی باقی جہانوں کا کوئی رب ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ لوگ بس یہ ثابت کرتے ہیں کہ الٰہ عالم کے وجود کی شرط ہے اور مخلوق کا کمال اس کے ساتھ مشابہ ہونے میں ہے۔ ان کے نزدیک الوہیت کا تصور بس یہی ہے اور یہی ربوبیت ہے۔ اسی لیے ان کا قول یہود ونصاری کے قول سے بھی بدتر ہے۔ یہ معقول ومنقول دونوں سے ان سے کہیں زیادہ دُور ہیں۔ اس کی تفصیل اپنے مقام پر موجود ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ فلاسفہ جملہ حوادث عالم کے بارے میں قدریہ کے ہم نوا ہیں اور بنا بریں [وہ بنی آدم میں سب سے بڑے گمراہ بلکہ ہر] شر وفساد کی جڑ ہیں۔ فلاسفہ قدریہ کی طرح حوادث کو جسمانی طبائع کی جانب منسوب کرتے ہیں اور ان کے خالق وموجد کو تسلیم نہیں کرتے، زیادہ سے زیادہ وہ خالق کائنات کو وجود عالم کی شرط قرار دیتے ہیں۔ یہ حوادث کا کوئی محدث ثابت نہیں کرتے۔

فلاسفہ کی جہالت وضلالت:

ان لوگوں کے قول کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ رب العالمین کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔ پس یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو رب العالمین ثابت نہیں کرتے؛ بلکہ ان کے عقیدہ کی انتہاء وغایت اسے اس عالم کے وجود کے لیے شرط قرار دینا ہے۔ اور حقیقت میں یہ رب العالمین کو معطل کہتے ہیں۔ جیسے ان فلاسفہ کا بھی عقیدہ ہے جو فلک کو واجب الوجود بنفسہٖ ٹھہراتے ہیں۔

البتہ یہ لوگ علت کو ثابت کرتے ہیں۔ یا تو علت غائیہ کو جو ان کے قدماء کے نزدیک ہے، یا علت فاعلیہ کو جو ان کے متاخرین کے نزدیک ہے۔ جس کی عند التحقیق کوئی حقیقت نہیں، اس لیے ان میں سے طبائعیوں نے اس پر انکار کیا ہے۔
جب یہ فرض کیا کہ فلک اپنے اختیار سے حرکت کرتا ہے اور اللہ اس کی حرکت کا خالق نہیں تو اس بات پر کوئی دلیل

نہیں ہوتی کہ اس متحرک کی علت علت معشوقہ ہے جو اس کے مشابہ ہے۔ بلکہ یہ جائز ہے کہ متحرک ہی خود محرک ہو۔ یہ بات اپنی جگہ مفصل مذکور ہے۔ جہاں ارسطو کے علم الٰہی کے متعلق عقیدہ کے بطلان کو کئی طرح سے واضح کیا گیا ہے؛ اس سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ فلاسفہ ذات باری کے متعلق جاہل مطلق ہیں۔اور انہیں اللہ کی ہستی کا کچھ علم نہیں۔ فلاسفہ میں سے کچھ لوگ بعض مذاہب کی طرف منسوب ہیں؛ جیسے کہ کچھ اسلام کی طرف نسبت رکھتے ہیں؛ مثلاً فارابی، ابن سینا، موسیٰ بن میمون؛ اور دیگر یہودی ملحدین اور متی بن یحییٰ بن عدی اور ان جیسے عیسائی ملحدین۔ یہ ملاحدہ اہل ملل میں سے ہونے کے باوجود الحادو دہریت کے ساتھ ساتھ فہم و فراست سے بیگانہ اور ارسطو کے اتباع سے بھی گئے گزرے ہیں۔۔ اگر چہ ان لوگوں نے امور طبعیہ و ریاضیہ میں متعدد امور میں ان ملاحظہ سے سبقت کی ہے۔

غرض یہاں یہ بتلانا مقصود ہے کہ یہ لوگ امور الٰہی سے از حد جاہل اور بے حد گمراہ ہیں کہ ان لوگوں کو اہل ملل کے نور، عقل اور ہدایت سے ایک قسم مل گئی۔ یوں یہ لوگ ان ارسطو وغیرہ سے کم گمراہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن سینا نے علت اولیٰ کے اثبات میں اپنے اسلاف کے طریق سے عدول کر کے معروف طریق کو اختیار کیا جو وجود کی واجب اور ممکن میں تقسیم کا طریق ہے اور یہ کہ ممکن واجب کو مستلزم ہے۔

اس کا اور اس کے متبعین کا یہی طریقہ معروف ہے؛ جیسے سہروردی مقتول اور دیگر فلاسفہ؛ اور ابو حامد، اور رازی، اور آمدی اور دیگر متاخرین اہل کلام کا یہی طریقہ ہے۔ جنھوں نے فلسفہ اور کلام کو خلط ملط کر دیا تھا۔

جن نے فلسفہ اور کلام کو خلط ملط کر دیا تھا یہ لوگ شدید اضطراب، شکوک اور حیرت میں مبتلا رہے اور جوں جوں ان کا فلسفہ اور کلام میں خلط ملط بڑھتا گیا ان کی ظلمت میں اضافہ ہوتا گیا۔ جبکہ اہل ملت کے کلام میں داخل ہونے کی بنا پر ان کی ظلمت کم ہوتی گئی جب کہ ان لوگوں کے فلسفیوں کے کلام میں گھستے چلے جانے کی وجہ سے ان کی ظلمت میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔

البتہ یہ بھی ملحوظ رہے کہ ان اہل ملل کے متکلمین میں بھی متعدد اشیاء میں شک و اضطراب ہے اور متعدد مواقع میں حق سے خروج بھی پایا جاتا ہے جبکہ متعدد مواقع میں ہوائے نفس کی اتباع اور حق میں کوتاہی پائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے علمائے ملت اور ائمہ دین نے ان کی مذمت بیان کی ہے؛ کیونکہ وہ ان دلائل عقلیہ کی معروفت میں کوتاہ اندیشی سے کام لیا ہے جن کو اللہ نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ اور ان بدعتی طرق کی طرف چلے گئے جن میں باطل ہے اور اس کی وجہ سے بعض اس حق سے نکل گئے جو ان میں اور دوسروں میں مشترک تھا۔

لطف یہ ہے کہ بعض متکلمین ان کے زمرہ میں شامل ہو کر توحید باری اور اسماء و صفات الٰہی کے اثبات جیسے اسلامی عقائد کو چھوڑ بیٹھے۔ یہ لوگ صرف توحید ربوبیت کو تسلیم کرتے ہیں، توحید ربوبیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق و رب ہے ظاہر ہے کہ مشرکین بھی اس توحید کے قائل تھے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ (لقمان : ٢٥)

''یقیناً اگر تو ان سے پوچھے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو ضرور ہی کہیں گے: اللہ نے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ o سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ﴾ (المومنون: ۸۷)

''کہہ ساتوں آسمانوں کا رب اور عرش عظیم کا رب کون ہے؟ ضرور کہیں گے اللہ ہی کے لیے ہے۔''

اور ان مشرکوں کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿وَ مَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ o﴾ (یوسف: ۱۰۶)

''اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، مگر اس حال میں کہ وہ مشرک ہوتے ہیں۔''

اسلاف کی ایک جماعت کا قول ہے: ان سے پوچھا جائے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے اور اس اقرار کے باوجود وہ بتوں کو پوجا کرتے تھے۔

جو توحید بندوں سے مطلوب ہے دراصل وہ توحید الوہیت ہے جس میں توحید ربوبیت بھی داخل ہے۔ توحید الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ صرف اسی کی عبادت کی جائے، اسی سے ڈرا جائے اور اسی کو پکارا جائے۔ اسی اللہ کو پکارے اور اللہ اسے ہر شے سے زیادہ محبوب ہو۔ اللہ کے لیے دوسرے سے محبت کریں۔ اور اسی پر بھروسہ کریں۔ عبادت میں جہاں غایت درجہ کی محبت ہوتی ہے، وہیں اللہ کے آگے غایت درجہ کی ذلت وانکساری بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا مومن بندے اس کی محبت بھی کمال کے ساتھ کرتے ہیں اور اس کے آگے ذلت بھی کمال کی اختیار کرتے ہیں۔ نہ اس سے منہ موڑتے ہیں، ان کے ہم سر تجویز کرتے ہیں اور نہ اس کے سوا کسی دوست اور سفارشی بناتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس توحید کو متعدد مقامات پر بیان کیا ہے۔ یہ قرآن کی وہ مرکزی پلی ہے جو پورے قرآن کا مرکزی محور ہے۔ یہ علم اور قول میں اور ارادہ اور عمل میں توحید کو متضمن ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان گرامی ہے:

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ o اَللّٰهُ الصَّمَدُ o لَمْ يَلِدْ ۵ وَلَمْ يُوْلَدْ o وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ o﴾

(سورۃ الاخلاص)

''کہہ دے وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ ہی بے نیاز ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا۔ اور نہ کبھی کوئی ایک اس کے برابر کا ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ یہ آیات ثلثِ قرآن کے مساوی ہیں۔ کیونکہ ان میں رب رحمٰن کی صفت کی بیان ہے۔

قرآن کے ایک ثلث میں توحید، دوسرے ثلث میں قصص اور تیسرے ثلث میں امر و نہی کا بیان ہے۔ کیونکہ یہ کلام اللہ ہے اور کلام یا تو خبر ہوتی ہے یا انشاء۔ پھر خبر یا تو خالق کے بارے میں ہوتی ہے یا مخلوق کے بارے میں۔ یوں یہ تین اجزاء ہو گئے۔ ایک خبر میں امر، نہی اور اباحت کا بیان ہے۔ یہ انشاء ہوا۔ دوسرے جز میں مخلوق کی خبر ہے، یہ قصص ہوا۔ اور تیسرے خبر میں خالق کی خبر ہے۔ یہ توحید ہوئی۔ جیسے سورۂ اخلاص میں توحید مذکور ہے۔ جو صرف رب رحمٰن کی صفت کا

بیان ہے ہم نے ارشاد نبوی کہ ''یہ سورت ایک ثلث قرآن کے برابر ہے''❶ کی تفسیر میں مفصل کلام ایک مستقل جلد میں کر دیا ہوا ہے۔ رہی عبادت، ارادہ اور عمل میں توحید تو جیسے سورۂ کافرون میں ارشاد ہے:

﴿قُلْ يَاأَيُّهَا الْكَافِرُونَ o لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ o وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ o وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَا عَبَدْتُمْ o وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ o لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ o﴾ (الکافرون)

''کہہ دے اے کافرو! میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ اور نہ میں اس کی عبادت کرنے والا ہوں جس کی عبادت تم نے کی۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ تمھارے لیے تمھارا دین اور میرے لیے میرا دین ہے۔''

سو پہلی توحید یہ رب تعالیٰ کے لیے صفات کمال کے اثبات کو متضمن ہے، وہ یوں کہ اس میں رب تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور صفاتِ کمالیہ کا بیان ہے اور دوسری توحید اخلاصِ دین کو متضمن ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾ (البینۃ: ٥)

''اور انھیں صرف یہ حکم دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں دین کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے۔''

اب پہلی توحید میں تعطیل سے براءت ہے تو دوسری توحید میں شرک سے براءت ہے اور شرک کی اصل یا تو تعطیل ہے جیسے فرعون کی موسیٰ کے سامنے تعطیل اور جناب ابراہیم علیہ السلام سے ان کے رب کے بارے میں جھگڑنے والے کی ان کے سامنے تعطیل، دجال مسیح ضلالت کی اپنے خصم جناب عیسیٰ بن مریم مسیح ہدایت کے سامنے تعطیل۔

صفات باری میں دوسروں کو شریک قرار دینا، یہ عقیدہ امم واقوام میں تعطیل کی نسبت زیادہ پایا جاتا ہے۔ اور مشرک جمہور انبیاء کرام علیہم السلام کے دشمن رہے ہیں جبکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مخالفین میں معطلہ اور مشرکین دونوں فریق پائے جاتے تھے۔ تعطیل ذات کا عقیدہ تعطیل صفات کی نسبت کم رائج ہوا، تعطیل صفات کا نظریہ تعطیل ذات کو مستلزم ہے، تعطیل صفات کے قائل واجب الوجود کو ان صفات سے متصف کرتے ہیں جو ممتنع الوجود کا خاصہ ہیں۔

یہ امر قابل غور ہے کہ سلف صالحین میں سے جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ وتابعین کرام سے جتنا بھی زیادہ قریب تھا، وہ اسی قدر توحید و ایمان اور عقل وعرفان سے قریب تر تھا۔ اور جو شخص ان سے جتنا بھی زیادہ دور تھا وہ اسی قدر ان اوصاف سے بعید تر تھا۔ بنا بریں متکلمین میں سے جو لوگ متاخر تھے، اور جنھوں نے علم الکلام کو فلسفہ سے گڈ مڈ کر دیا۔

❶ البخاري٦/ ١٨٩ کتاب فضائل القرآن، باب فضل قل هو الله أحد:٥/ ١١٥۔١١٤ اِ کتاب التوحيد، باب ما جاء في دعاء النبي۔ ﷺ۔ أمته إلى توحيد الله تبارك وتعالى، مسلم:٥٥٧، ٥٥٦ کتاب صلاة المسافرين، باب فضل قراة قل هو الله أحد، سنن أبي داؤود:٢/ ٩٧، ٩٨ کتاب الوتر، باب في سورة الصمد، سنن الترمذي٢/ ٢٤٠، ٢٤٣ کتاب فضائل القرآن، باب ما جاء في سورة الإخلاص......، سنن ابن ماجه: ٢/ ١٢٤٤ کتاب الأدب باب ثواب القرآن، المسند، ط المعارف:٨١/ ١٥٢، ١٥٣.

مثلاً امام رازی، علامہ آمدی اور ان کے نظائر و امثال ۔ یہ لوگ اثبات توحید و صفات کمال میں امام جوینی رحمہ اللہ سے کم درجہ کے تھے ۔علی ہذا القیاس اس ضمن میں امام جوینی، قاضی ابوبکر، ابن الطیب رحمہ اللہ علیہم اور ان کے معاصرین سے فروتر درجہ کے تھے، اور یہ لوگ کسی طرح بھی امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتے ۔ [1] جبکہ امام اشعری کا درجہ ابومحمد بن کلاب سے نیچے ہے اور ابن کلاب اس ضمن میں ائمہ سلف کی ہم سری کا دعویٰ نہیں کر سکتے ۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ متکلمین میں سے جو لوگ تقدیر کے قائل ہیں وہ منکرین تقدیر معتزلہ و شیعہ کی نسبت اثبات توحید و صفات کمال میں ان سے کہیں بہتر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قائلین تقدیر باری تعالیٰ کے لیے کمال قدرت، کمال مشیت، کمال خلق اور اس کے منفرد ہونے کا اثبات کرتے ہیں؛ اور کہتے ہیں کہ وہ تنہا تمام اعیان و اعراض کا خالق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی رائے میں قوت اختراع اللہ تعالیٰ کی خصوصی صفت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قدرت اختراع اللہ تعالیٰ کے جملہ خصائص میں سے ایک ہے اور صرف یہی صفت اس کی خصوصی صفت نہیں۔

بخلاف ازیں تقدیر کا انکار کرنے والے شیعہ و معتزلہ حیوان کے احوال کو اللہ کی مخلوق قرار نہیں دیتے، دراصل ان کے نزدیک ان حوادث کا کوئی بھی خالق نہیں، بلکہ ان کو انجام دینے والے اللہ کے شریک ہیں، جو ان حوادث کے فاعل ہیں۔ متاخرین قدریہ میں سے بہت سے لوگ بندوں کو ان کا خالق قرار دیتے ہیں، البتہ متقدمین قدریہ اس سے احتراز کرتے تھے۔

پھر متکلمین اہل اثبات رب تعالیٰ کے لیے حیات، علم، قدرت، کلام، سمع اور بصر جیسی صفاتِ کمال کا اثبات کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے ان صفات کو ثابت تو کیا ہے لیکن بعض صفات کی بابت کوتاہی کر گئے ہیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے توحید میں کوتاہی کی اور یہ سمجھے کہ کمالِ توحید توحید ربوبیت ہے اور اس توحید الوہیت کی جانب نہ بڑھے جس کو اللہ کے پیغمبر لے کر آئے اور جس کو لے کر آسمانی کتابیں اتریں۔

---

[1] متکلمین کے احوال و کوائف سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص دو حقیقتوں سے کلیۃً آگاہ ہے:

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ متکلمین اسلامی حقائق کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے والوں کے مقابلہ میں کلامی فلسفہ کے اسالیب کو ایک شرعی ضرورت تصور کیا کرتے تھے، البتہ عرصہ دراز تک اسے جاری رکھنے کی بنا پر وہ ان اسالیب و اطوار کے خوگر ہو گئے تھے۔

۲۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ آگے چل کر جب ان میں پختگی کے آثار پیدا ہوئے تو نور الٰہی کی بدولت ان پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ ان کلامی مباحث سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ لاحق ہو رہا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں ان اسالیب کو ترک کرنے کا میلان پیدا ہوا، اور وہ عقائد میں سلف صالحین کی پیروی کرنے لگے۔

قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ امام جوینی کی کتاب "الرسالة النظامية" میں ہے کہ جب ابوجعفر ہمدانی نے علو کے موضوع پر آپ سے تبادلہ افکار کیا تو امام جوینی طریق سلف کی جانب لوٹ آئے تھے، اس سے بھی عمدہ ترین واقعہ یہ ہے جو امام اشعری کو ان کی زندگی کے تیسرے دور میں پیش آیا اور اسی پر ۳۲۴ھ میں ان کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا، یہ واقعہ ان کی تصنیف "كتاب الابانة" میں مذکور ہے جو ان کی آخری کتاب ہے۔ (شذرات الذهب: ۲/ ۳۰۳ نیز مجلة الازهر، م:۲۶ / ۳۱۔ ۳۳)۔ یہ تیسرا دور ۳۰۳ ہجری سے شروع ہوتا ہے؛ جس میں انہوں نے سلف کی موافقت کی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کا زیادہ تر کلام معتزلہ سے ماخوذ ہے اور معتزلہ اس باب میں بے حد کوتاہ ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں نے توحید ربوبیت کا حق ادا نہیں کیا تو بھلا توحید الوہیت کا حق کیونکر ادا کیا ہوگا؟

اس کے باوجود معتزلہ کے شیوخ وائمہ اور اشعریہ وکرامیہ کے ائمہ توحید ربوبیت کی تضریر میں ان فلسفہ زدہ اشعریہ سے پھر بہتر ہیں جیسے رازی، آمدی اور ان جیسے دوسرے لوگ کہ ان لوگوں نے اس توحید کو ابن سینا جیسے لوگوں کی بیان کردہ توحید کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے۔ جس کا کلام تحقیق توحید سے سب سے زیادہ بعید ہے۔ اگرچہ خود ان کا کلام ان کے اپنے قدماء ارسطو وغیرہ سے بہتر ہے۔

کیونکہ ان لوگوں نے زیادہ سے زیادہ واجب الوجود کو ثابت کیا ہے۔ بے شک یہ بات حق ہے جس میں نہ معطلہ کا اختلاف ہے اور نہ کسی مشرک کا، بلکہ سب کے سب لوگ واجب کے وجود کے اثبات پر متفق ہیں۔ سوائے چند لوگوں کے جو کہتے ہیں کہ یہ عالم ازخود وجود میں آیا ہے۔ البتہ یہ کسی معروف جماعت کا قول نہیں۔ اسے صرف مقدر مانا جاتا ہے، جیسے شبہ سوفسطائیہ تاکہ اس کی تحقیق کی جائے۔ یہ بعض لوگوں پر گزرنے والا ایک خیال ہے جیسے جیسا کہ سفسطہ جیسے خیالات لوگوں کے دلوں پر گزرتے ہیں۔ غرض یہ کسی معرفو جماعت کا قول نہیں ہے۔ اس قول کا فساد اتنا ظاہر ہے کہ کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ بلا محدث کے حدوث حوادث کا امتناع سب سے زیادہ ظاہر ہے اور یہ نہایت واضح علم ضروری ہے۔

پھر جب ان لوگوں نے واجب بذاتہ کو مان لیا تو اسے ایک اور اکیلا ٹھہرانے کا ارادہ کیا کہ جو صرف اذہان میں پایا جائے نہ کہ اعیان میں اور یہ اطلاق کی شرط کے ساتھ وجود مطلق ہے۔ جس کی خارج میں کوئی حقیقت نہیں۔ کیونکہ وجود مطلق بشرط الاطلاق صرف اذہان میں پایا جاتا ہے نہ کہ اعیان میں۔ یا تو سلوب واضافات کے ساتھ مقید ہوتا ہے جیسا کہ ابن سینا اور اس کے پیروکاروں کا قول ہے اور یہ پہلے قول سے بھی زیادہ تعطیل پر مشتمل قول ہے۔

ان لوگوں نے ان معتزلہ کی مشابہت میں اسے خالص توحید سمجھا جو نفی صفات میں ان کے شریک ہیں اور اسے توحید کا نام دیا۔ پھر یہ لوگ تعطیل میں جسے وہ توحید سمجھتے ہیں، ایک دوسرے کا مقابلہ اور فخر کرنے لگے کہ کون اس باب میں زیادہ حاذق ہے۔ حتیٰ کہ ان کے اگلوں نے بھی ان کی طرح باہم فخر کیا جیسے ابن سبعین اور جیسے فلسفہ کے پیروکار۔ اور ابن تومرت جیسے جو جہمیہ کے پیروکار ہیں۔ یہ سب وجود مطلق کے قائل ہیں۔

پھر ایک دوسرے پر تعطیل کے بارے میں زیادہ باریک بینیاں کر کے فخر کرتے ہیں۔

چنانچہ ان کے چند لوگ میرے پاس بھی آئے تھے۔ میں نے ان سے بات کی تھی اور میں نے کتابیں لکھ کر ان کے کشف اسرار معرفت توحید اور ان کے فساد کو بیان کیا۔ یہ سمجھتے تھے کہ ان کا کلام لوگ سمجھ نہیں سکتے اور مجھے بھی یہ کہا کہ اگر تم ان کے کلام کی حقیقت کو کھول نہ سکے اور اس کے فساد کو واضح نہ کر سکے تو اس بارے لوگوں کے ردّ کو نہ مانیں گے۔

سو میں نے ان کے مقاصد کے حقائق کو ان پر کھولا اور انھوں نے مانا کہ ان کی مراد یہی ہے اور ان کے سرداروں

نے بھی ان کی موافقت کی۔ پھر میں نے ان کے کلام کے فساد و الحاد کو بیان کیا۔ جس پر انھوں نے اپنے عقائد سے رجوع کر لیا اور اب اپنے ملحد اسلاف کے ردّ میں کتابیں لکھنے لگے۔ جو کبھی ان کے نزدیک تحقیق، توحید، عرفان اور یقین کے ائمہ تھے۔

فلاسفہ اور دلائل توحید:

ان فلاسفہ کے پاس اپنی تعطیل زدہ توحید کے زیادہ سے زیادہ اور وزنی دلائل دو ہیں:

اول:...... اگر واجب بالذات دو ہوتے تو وجوب میں شریک ہوتے اور ہر ایک دوسرے سے اپنا ایک امتیازی وصف رکھتا اور وصف مشترک، امتیازی وصف سے جدا ہوتا۔ جس سے واجب الوجود کا مرکب ہونا لازم آتا اور مرکب اپنے اجزا کا محتاج ہوتا ہے اور اجزاء مرکب کا غیر ہوتے ہیں اور غیر کا محتاج واجب بالذات نہیں ہوسکتا۔

دوم:...... یہ کہ جب وہ دونوں ذاتیں وجود میں متفق ہوں گی اور ہر ایک اپنے امتیازی وصف کے ساتھ دوسری ذات سے جدا ہوگی تو لازم آئے گا کہ مشترک مختص کے ساتھ معلول ہو۔ جیسے دو آدمی انسانیت میں مشترک ہوں اور دونوں میں سے ہر ایک دوسرے سے اپنی شخصیت کی وجہ سے ممتاز ہوگا۔ پس مشترک یہ مختص کے ساتھ معلول ہوگا اور یہ باطل ہے۔ کیونکہ مشترک اور مختص میں سے ہر ایک اگر دوسرے کے عارض ہو تو وجوب کا واجب کو عارض ہونا یا اس کا معروض ہونا لازم آئے گا اور دونوں صورتوں میں وجوب واجب کی صفت لازمہ نہ ہوگی اور یہ محال ہے کیونکہ واجب کا غیر واجب ہونا ممکن نہیں۔

اگر ہر ایک دوسرے کو لازم ہو تو مشترک کا مختص کی علت ہونا جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ جہاں بھی علت پائی جاتی ہے معلول بھی پایا جاتا ہے۔ سو لازم آیا کہ جہاں بھی مشترک پایا جائے گا تو مختص اور مشترک اس میں اور اس میں بھی پایا جائے گا۔ تو لازم آئے گا کہ جو ایک کا مختص ہے وہ دوسرے میں پایا جائے اور یہ محال ہے جو اختصاص کو اٹھا دیتا ہے۔

ابن سینا نے ''الاشارات'' میں اور اشارات کے شارحین جیسے رازی اور طوسی وغیرہ نے جو کلام ذکر کیا ہے، یہ اس کا اختصار ہے۔ فارابی اور سہروردی وغیرہ فلاسفہ نے بھی ان دونوں دلائل کو اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ابو حامد غزالی نے بھی ''تہافت الفلاسفۃ'' میں ان دلائل کو ذکر کیا ہے۔ رازی اور آمدی نے وجوب کے صفت ثبوتیہ ہونے کے منع ہونے کی بابت ان دونوں دلائل کا جواب دیا ہے۔ اگرچہ وہ جواب ہمیں پسند آیا ہے۔ لیکن اس کا جواب دو طرح سے ہے:

۱۔ معارضہ کے طور پر۔ وہ یوں کہ وجود کی دو قسمیں (۱) واجب (۲) اور ممکن۔ اور دونوں میں سے ہر ایک وجود اپنے ایک خاصہ کی وجہ سے دوسرے سے ممتاز ہوتا ہے۔ جس سے لازم آئے گا کہ واجب اس چیز سے مرکب ہے جو اس میں مشترک ہے اور جو اس میں ممتاز ہے۔ اور یہ بھی لازم آئے گا کہ وجود واجب معلول ہو اور معارضہ حقیقت کے ذریعے بھی ہے۔ کیونکہ حقیقت بھی واجب اور ممکن میں تقسیم ہوتی ہے اور واجب اپنے خاصہ کی بنا پر ممکن سے ممتاز ہوتا ہے۔ سو لازم آیا کہ حقیقت واجبہ مشترک اور مختص سے مرکب ہو اور یہ بھی لازم آیا کہ حقیقت واجبہ معلول ہو۔ اور معارضہ

لفظ ماہیت کے ذریعے بھی ہوسکتا ہے، وہ یوں کہ ماہیت واجب اور ممکن میں تقسیم ہوتی ہے۔ الی آخر الکلام۔

۲۔ دوسرا حل شبہ کے طور پر۔ وہ یوں خارج میں موجود دو چیزیں، چاہے وہ دونوں واجب ہوں یا ممکن، اور چاہے وہ دونوں موجود جسم ہوں یا جوہر، حیوان ہوں یا انسان وغیرہ وغیرہ کہ خارج میں دونوں میں سے کوئی ایک چیز دوسری کو اپنے خصائص میں شریک نہ کرے گی۔ نہ وجوب میں، نہ وجود میں، نہ ماہیت میں اور نہ کسی اور چیز میں۔ وہ صرف اس کے ساتھ اس چیز میں مشابہ ہوگی۔

وہ مطلق جس میں وہ شریک ہوں گی، وہ خارج میں کلی مشترک نہ ہوگا مگر ذہن میں۔ اور وہ خارج میں کلی عام مشترک نہ ہوگا بلکہ جب یہ کہا جائے گا کہ دو واجب جب وجوب میں مشترک ہوتے ہیں تو لازم ہے کہ ہر ایک دوسرے سے اپنی خصوصیت کے ساتھ ممتاز ہو اور یہ اس کہنے کی طرح ہے: جب دونوں حقیقت میں مشترک ہوں گے تو ضروری ہے کہ ہر ایک اپنی خصوصیت کے ساتھ دوسرے سے ممتاز ہو۔

سو حقیقت حقیقت عامہ بھی ہوتی ہے اور حقیقت خاصہ بھی۔ جیسا کہ وجوب عام بھی ہوتا ہے اور خاص بھی۔ اب عام مشترک نہ ہوگا۔ مگر ذہن میں اور خارج میں صرف خاص ہوگا جس میں کوئی اشتراک نہیں ہوتا اور جس میں اشتراک ہو اس میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا اور جس میں امتیاز ہو، اس میں اشتراک نہیں ہوتا۔ سو اب خارج میں ایسی کوئی شے واحد نہ رہ گئی جس میں مشترک اور ممیّز دونوں ہوں۔ البتہ اس میں وصف ہوتا ہے جس میں دوسرا اس کے مشابہ ہوتا ہے اور ایسا وصف بھی ہوتا ہے جس میں دوسرا اس کے مشابہ نہیں ہوتا۔

ان لوگوں نے الٰہیات میں بھی ویسی ہی غلطی کی ہے جیسی انھوں نے منطق کی کلیات: جنس، نوع، فصل، خاصہ اور عرضِ عام وغیرہ میں کی ہے۔ وہ یوں کہ انھیں اس بات کا وہم ہوا کہ خارج میں کلی مشترک پائی جاتی ہے۔ ہم نے اس پر تنبیہ کر دی ہے اور واضح کر دیا ہے کہ خارج میں کلی مشترک کا کوئی وجود نہیں۔ مگر مختص پایا جاتا ہے جس میں کوئی اشتراک نہیں ہوتا۔ اور اشتراک، عموم اور کلیت وجود کو تب عارض ہوتی ہے جب وہ خارج میں نہ ہو بلکہ ذہن میں ہو۔ ان لوگوں نے کلی کی تین اقسام کر دی ہیں: (۱) طبیعی (۲) منطقی اور (۳) عقلی

کلی طبیعی: ...... یہ مطلق ہے جو کسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں۔ جیسے انسان "من حيث هو هو" اپنی جمیع قیود سے قطع نظر۔

کلی منطقی: ...... یہ عام اور خاص اور کلی اور جزئی ہے۔ سو نفس وصف کلی یہ منطقی ہے۔ کیونکہ منطق میں قضایا پر اس اعتبار سے بحث کی جاتی ہے کہ یہ قضیہ کلیہ ہے یا جزئیہ۔

کلی عقلی: ...... یہ دو باتوں کا مجموعہ ہے اور یہ انسان کا عام اور مطلق ہونے کے ساتھ موصوف ہونا ہے۔ ان کے نزدیک یہ کلی صرف ذہن میں ہی پائی جاتی ہے۔ البتہ افلاطون کے حواریوں سے امثلہ افلاطونیہ حکایت کی جاتی ہیں جن کا باطل ہونا بے غبار ہے۔ کیونکہ خارج میں عام نہیں پایا جاتا اور رہی کلی منطقی تو وہ بھی صرف ذہن میں پائی جاتی ہے۔ البتہ

کلی طبیعی کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ خارج میں پائی جاتی ہے۔ پس جب ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ انسان ہے تو اس میں انسان ''من حیث ہو ہو'' ہوتا ہے لیکن کہا جائے گا کہ یہ خارج میں ثابت ہے۔ لیکن تعیین اور تخصیص کی قید کے بغیر۔ نا کہ اطلاق کی قید کے ساتھ، اور مطلق لا بشرط ہوگا۔ سو خارج میں نہ تو مطلق لا بشرط ہوتا ہے اور نہ مطلق بشرط الاطلاق ہوتا ہے۔ بلکہ خارج میں معین اور مخصص ہوتا ہے۔

پس ذہن جسے مطلق لا بشرط التقیید مانتا ہے، وہ خارج میں بشرط التقیید ہوتا ہے دراصل ان لوگوں پر اذہان کی چیزیں اعیان کے ساتھ مشتبہ ہوگئی ہیں۔ ہم نے ایک اور جگہ اس کی تفصیل بیان کر دی ہے اور منطقیوں کی اس غلطی پر تنبیہ کر دی ہے جس کی بنا پر وہ امور الٰہی اور طبیعیہ میں گمراہ ہوئے ہیں۔ جیسے صرف عقل میں موجود امورِ عقلیہ کو خارج میں موجود امور سمجھ لینا وغیرہ کہ جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

الٰہیات پر بحث کرنے والے منطقی یہ بھی کہتے ہیں کہ کلیات صرف اذہان میں ہوتی ہیں نہ کہ اعیان میں۔ چنانچہ ان کا ایک جگہ کا کلام خود ان کے دوسری جگہ کے کلام کی خطا کو واضح کرتا ہے۔ کیونکہ اللہ نے اپنے بندوں کو صحت وسلامتی پر پیدا کیا ہے، جبکہ فسادِ فطرت عارضی ہوتا ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ آدمی کے اپنے فاسد کلام میں ہی ایسی بات مل جاتی ہے جو اس کے پہلے کلام کے فاسد ہونے کو بتلاتی ہے۔ یوں دونوں کلاموں میں تناقض سامنے آ جاتا ہے۔

غرض یہاں ان فلسفیوں کی توحید پر تنبیہ کرنا مقصود ہے۔ یہ لوگ لفظ واجب میں اسی بات کو پہنچے جس کو معتزلہ لفظ قدیم میں پہنچے۔ سو انھوں نے کہا کہ واجب ایک ہی ہوگا۔ اس کی کوئی صفت ثبوتیہ نہ ہوگی۔ جیسا کہ ان لوگوں نے کہا کہ قدیم صرف ایک ہوگا اور اس کی کوئی صفت ثبوتیہ نہ ہوگی۔ جس سے ان فلسفہ زدہ متاخرین متکلمین کے کلام کا بطلان ظاہر ہوگیا۔ جنھوں نے فلسفہ اور کلام کو ایک کر دیا اور ان کے کلام کی خطا وغلطی بھی سامنے آ گئی جنھوں نے تصوف میں فلسفہ گھسا دیا۔ جیسے ''صاحب مشکاۃ الانور'' اور ''الکتب المضنون بھا علی غیر اھلھا'' وغیرہ۔ اور ان جیسی دیگر کتب۔ اس مسئلہ پر کئی مقامات پر تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔

برہان تمانع:

حتی کہ یہ متاخرین اپنے متقدمین کی دلیل توحید کی تقریر تک نہ پہنچ سکے اور وہ ہے دلیل تمانع۔ انھیں اس دلیل میں اشکال پیش آیا اور یہ سمجھے کہ شاید یہ دلیل قرآن کی اس آیت میں مذکور ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ (الانبیاء: ۲۲)

''اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے تو وہ دونوں ضرور بگڑ جاتے۔''

حالانکہ بات یوں نہیں۔ بلکہ یہ لوگ معرفت قرآن سے قاصر رہ گئے ہیں اور یہ متاخرین ان کوتاہ بینوں کے کلام کے سمجھنے سے بھی قاصر رہے ہیں۔ سو جب یہ نبی کریم ﷺ کی لائی تعلیمات کو سمجھنے سے قاصر رہے تو ان باتوں کی طرف پھرے جنھوں نے انھیں سوائے حیرت وشک ضلالت وغوایت کے اور کچھ نہیں دیا۔ جس کی تفصیل اپنے مقام پر موجود

ہے۔لیکن ہم یہاں اس پر تنبیہ کریں گے۔

متکلمین کے نزدیک مشہور دلیل تمانع یہ ہے کہ اگر اس عالم ارضی کے دو صانع ہوتے تو ان میں سے ایک کسی بات کا ارادہ کرتا تو دوسرا اس کی مخالفت کرتا، مثلاً ایک چاہتا کہ آفتاب مشرق سے طلوع ہو اور دوسرا چاہتا کہ مغرب سے، ظاہر ہے کہ دونوں کا ارادہ پورا نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ یہ جمع بین الضدین ہے، بنا بریں جس کی بات پوری نہ ہوگی، وہ رب نہیں ہوسکتا۔ یا دونوں میں سے کسی ایک کی مراد حاصل ہوتی اور دوسرے کی نہ ہوتی۔ تو رب وہ ٹھہرتا جس کی مراد حاصل ہوئی ہے نہ کہ دوسرا۔ اس کی تاکید یہ کہہ کر ہوسکی ہے کہ جب ایک نے ایسی بات کا ارادہ کیا کہ محل دونوں سے خالی نہ ہوتا۔ اسی طرح دونوں خداؤں میں سے ایک جب کسی چیز کو حرکت دینا چاہے اور دوسرا اسی چیز کو ساکن کرنا چاہے تو بھی یہی صورت ہوگی۔ یا تو دونوں کی مراد پوری ہونا ممتنع ٹھہرے گی۔ جبکہ دونوں کی مراد کا عدم بھی ممتنع ہے۔ کیونکہ جسم حرکت اور سکون دونوں سے خالی نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا دونوں میں سے ایک کی مراد کا حصول متعین ہوگیا اور وہی رب کہلائے گا۔

اس تقریر پر ایک مشہور سوال ہوتا ہے، وہ یہ کہ ہوسکتا ہے کہ:

❀ دونوں خداؤں کے ارادے باہم متحد بھی ہوسکتے ہیں؟ تب کہاں کا اختلاف؟

❀ متاخرین نے اس سوال کے متعدد جوابات دیئے ہیں جو خود یہ ایک دوسرے سے ٹکراؤ رکھتے ہیں۔ اور یہ لوگ قدماء کی تقریر پر مطلع نہیں ہوسکے۔ جیسے اشعری، قاضی ابوبکر، قاضی ابوالحسین بصری اور قاضی ابویعلی وغیرہ۔ کیونکہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ارادہ میں دونوں کے اتفاق کا وجوب دونوں کے عجز کو مستلزم ہے۔ جیسے دونوں کا تمانع دونوں کے عجز کو مستلزم ہے۔ پھر ان میں سے کسی نے اس تقریر کا ذکر کرنے سے اعراض کیا ہے کیونکہ اس کا مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ دونوں کا فرض کرنا دونوں کے عجز کا تقاضا کرتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ دونوں میں سے کسی ایک کے لیے دوسرے کی مخالفت ممکن نہیں، تو یہ اس کے عجز میں زیادہ ظاہر ہے۔ ان میں کوئی تو اس کو بیان کرتا ہے، جیسے انھوں نے دونوں میں سے ہر ایک کے استقلال کے امتناع کو بیان کیا ہے۔

اس کے جواب میں یہ بھی کہتے ہیں: دو رب فرض کرنے کی صورت میں یا تو ان میں سے ہر ایک بذات خود قادر ہوگا یا دوسرے کے ساتھ ملے بغیر قدرت سے بہرہ ور نہ ہوگا، بصورت ثانی وہ ممتنع لذاتہٖ ہوگا، نیز اس سے علت و فاعل دونوں میں دور لازم آئے گا۔ اس کی وجہ اس امر کا امکان ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک نے دوسرے کو قادر بنایا ہو۔ یہ بات مسلم ہے کہ دونوں خداؤں میں سے ہر ایک اسی صورت میں فاعل ہوسکتا ہے جب وہ قدرت سے بہرہ ور ہو۔ جب دونوں میں سے ہر ایک نے دوسرے کو قادر بنایا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر ایک نے دوسرے کو فاعل بھی بنایا یعنی رب ہونے میں اس کی مدد کی، کیونکہ رب کا تو خود قادر ہونا لازم ہے۔ سو یہ ایک اس دوسرے کو فاعل قادر اور رب بنائے گا۔ اسی طرح یہ دوسرا اس پہلے کو؛ ظاہر ہے کہ جب دونوں رب واجب و قدیم تھے تو وہ ایک دوسرے کے محتاج کیوں کر ہوئے، یہ بداہۃً ممتنع ہے۔

کیونکہ ان میں سے ایک اس وقت تک قادر، رب اور فاعل نہ بنے گا جب تک اسے وہ دوسرا اس قابل نہ بنائے۔

اسی طرح وہ دوسرا پہلے کو جب تک قادر وغیرہ نہ بنائے وہ پہلا رب نہ بنے گا۔اور یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی کہے: ''یہ پہلا اس وقت تک موجود نہ ہوگا جب تک وہ دوسرا اسے موجود نہ بنائے۔'' اور اس کا ممتنع ہونا لازم ہے۔ جیسا کہ گزشتہ میں اس کی طرف اشارہ گزرا ہے۔ وہ یہ کہ دورِ قبلی کے ممتنع لذاتہ ہونے پر عقلاء کا اتفاق ہے۔ جیسے کہ علل اور فاعلین میں دور ممتنع ہے۔لہٰذا دونوں میں سے ہر ایک کا دوسرے کے لیے علت ہونا یا اس کے لیے فاعل ہونا یا علت اور فاعل کا جزء ہونا ممتنع ہوتا ہے۔تو جب دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کے بغیر قادر یا فاعل نہیں تو لازم آیا کہ دونوں میں سے ہر ایک علت فاعلہ ہو یا اس کے تمام کی علت ہو جس کے ذریعے دوسرا فاعل قادر بنتا ہے اور یہ عقلاء کا اتفاق ہے کہ بالضرور ممتنع ہے۔ پس لازم آیا کہ رب قادر بنفسہٖ ہو اور جب وہ قادر بنفسہٖ ہوگا۔ پھر اگر تو اسے دوسرے کے ارادہ کے خلاف ارادہ ممکن ہوا تو دونوں میں اختلاف ممکن ہوا اور اگر اسے یہ ممکن نہ وا اور صرف وہی ہوگا جو دوسرا ارادہ کرے گا تو یہ عاجز ٹھہرا۔

اگر فرض کیا کہ اسے صرف وہی ارادہ اور فعل ہی ممکن ہے جو دوسرے کا ارادہ اور فعل ہے تو اس میں دونوں کا عجز لازم آیا۔ بلکہ یہ بھی ممتنع لنفسہٖ ہوا۔اسی طرح اگر دوسرا جب تک قادر نہ ہو یہ پہلا قادر نہ ہوگا تو یہ ممتنع لذاتہ ہوگا اور اگر یہ تب ہی ممکن ہو جب دوسرا ممکن بنائے تو یہ اس کہنے کے بمنزلہ ہے کہ ''پہلا تب ہی قادر بنے گا جب دوسرا اسے قادر بنائے گا۔''

دوسرے اس تقریر پر دونوں میں سے ہر ایک کے لیے مانع دوسرا ہوگا۔ پھر دونوں میں سے ہر ایک مانع بھی ہوگا اور ممنوع بھی اور مانع تب مانع ہوتا ہے جب وہ منع پر قادر ہو اور جو دوسرے کو فعل سے منع کرنے پر قادر ہو، تو اس کی فاعل ہونے پر قدرت بدرجہ اولیٰ ہوگی۔سو دونوں میں سے ہر ایک فاعل نہ بنے گا یہاں تک کہ وہ فعل پر قادر ہو اور جب وہ فعل پر قادر ہوگا تو اس کا ممنوع ہونا ممتنع ہوگا۔سو دونوں میں سے ہر ایک کا مانع اور ممنوع دونوں ہونا ممتنع ہوا اور یہ دونوں کے ایک فعل پر اتفاق کے وجوب کو لازم ہے۔سو معلوم ہو گیا کہ دونوں کا ایک فعل کے اتفاق پر وجوب ممتنع ہے اور دونوں کے اختلاف کا امکان ثابت ہو گیا۔سو جب دونوں کے اتفاق کا لزوم فرض کیا جائے گا تو یہ ممتنع لذاتہ ہوگا۔ ہاں یہ مخلوقین میں ممکن ہے۔ کیونکہ ان کی قدرت غیر سے مستفاد ہوتی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ ایک قادر نہ ہوگا یہاں تک کہ وہ دوسرا قادر ہو۔تو یہاں ایک تیسرے کا ہونا ممکن ٹھہرا جو دونوں کو قادر بنائے۔ یہیں سے ایک مخلوق کا دوسری مخلوق کے لیے معاون ہونا ممکن ہوا۔ جبکہ خالقوں پر معاونت ممتنع ہے۔ کیونکہ معاون مخلوق میں سے ہر ایک کو غیر سے قدرت حاصل ہوتی ہے۔جس کی وجہ سے وہ قادر بنتا ہے۔ کیونکہ دونوں میں سے ہر ایک کو دوسرے کی اعانت سے قبل قدرت تھی اور دونوں کے اجتماع کے وقت دونوں میں سے ہر ایک کی قدرت دوسرے کی قوت سے مل کر اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ جیسے دو ہاتھ جو ایک دوسرے سے مل کر وقت میں بڑھ جاتے ہیں کیونکہ دونوں میں سے ہر ایک کی قدرت ہوتی ہے جو ملنے پر بڑھ جاتی ہے۔سو دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کو دینے والا بھی ہے اور اس سے لینے والا بھی ہے۔جس سے اجتماع کے وقت قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

جبکہ یہ خالقوں میں ممتنع ہے۔ کیونکہ خالقِ قدیم واجب لنفسہ کی قوت اس کی ذات کے لوازم میں سے ہے جس کا غیر سے مستفاد ہونا جائز نہیں۔ کیونکہ اگر دونوں میں ہر ایک انفرادی طور پر قادر ہے تو عندالانفراد اسے ممکن ہے کہ جس پر اسے قدرت ہو، وہ اس کو کر لے اور اس کے فعل میں دوسرے کی معاونت مشروط نہ ہوگی اور اس وقت دونوں میں سے ہر ایک کو وہ کرنا ممکن ہوگا جو دوسرے کا اراد ہو۔ یا وہ کرنا ممکن ہوگا کہ دوسرے کا ارادہ اس کے خلاف ہو۔ اور اگر انفراد کے وقت وہ قادر نہیں تو اجتماع کے وقت دونوں کو قوت حاصل ہونا ممتنع ہوگا کیونکہ اس میں دور ہے۔ کیونکہ ایک اس وقت تک قادر نہیں یہاں تک دوسرا قادر ہو اور تیسرا کوئی ہے نہیں جو ان دونوں کو قادر بنائے۔ لہٰذا دونوں میں سے کوئی بھی قادر نہ بنے گا۔

دو مخلوق جنہیں عندالانفراد قوت نہیں ہوتی، انہیں اجتماع کے وقت تبھی قوت حاصل ہوگی جب وہ ان دونوں کے علاوہ سے ہو اور دو خالقوں کے لیے کوئی ایسا تیسرا ہونا ممکن نہیں جو ان دونوں کو قوت دے۔ لہٰذا دونوں کا عندالانفراد قادر ہونا لازم ہوا۔

اگر یہ کہا جائے کہ دونوں میں سے ایک اس پر قادر ہے جس پر دوسرا موافق ہو۔ تو یہ اس دوسرے کی موافقت سے ہی قادر بنے گا۔

اگر یہ کہا جائے کہ ایک اس امر پر قادر ہے جس میں دوسرا مخالفت نہیں کرتا تو دونوں میں سے ہر ایک اپنے مقدور سے دوسرے کو مانع ہوگا، تب بھی دونوں میں سے کوئی قادر نہ ہوگا۔ پھر یہ بھی کہ اس کا اُس کو منع کرنا بھی قدرت سے ہی ہو گا اور اُس کا اِسے منع کرنا بھی قدرت سے ہی ہوگا۔ لہٰذا لازم آئے گا کہ تمانع کے حال میں دونوں میں سے ہر ایک قادر ہو گا اور یہ مخالفت کے وقت ہے۔ سو دونوں اتفاق کے وقت اور اختلاف کے وقت قادر ہوں گے۔ پھر یہ کہ ایک اس وقت تک ممنوع نہ ہوگا جب تک کہ اسے دوسرا منع نہ کرے۔ اسی طرح اس کے برعکس ہوگا۔ لہٰذا دونوں میں سے ایک دوسرے کے منع کرنے سے ہی ممنوع ہوگا اور یہ کہ دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے مانع ہوگا۔ پس دونوں میں سے ہر ایک مانع بھی ہوگا اور ممنوع بھی اور یہ جمع بین النقیضین ہے۔

غرض یہ اور ان کے علاوہ دوسری وجوہ بتلاتی ہیں دو ایسے رب کا ہونا ممتنع ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کا معاون ہو، یا ہر ایک دوسرے کے لیے مانع ہو، سو صرف یہ صورت ہی باقی رہ جائے کہ دونوں میں سے ہر ایک قادرِ مستقل ہو کہ اب دونوں میں اختلاف ممکن ہے اور جب دونوں اختلاف کریں تو لازم آئے گا کہ دونوں میں سے کوئی کچھ نہ کرے۔ کہ اس سے دونوں کا عجز لازم آئے گا اور یہ بھی لازم آئے گا کہ دونوں میں سے ہر ایک مانع بھی ہو اور ممنوع بھی۔

پس دو رب کا ممتنع ہونا واضح ہوگیا۔ چاہے دونوں متفق ہوں یا ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہوں، اور جب یہ فرض کیا جائے کہ دونوں مستقل بھی ہیں اور خلق عالم میں بھی مستقل ہیں۔ تو یہ اور بھی زیادہ ممتنع ہے۔ کیونکہ دونوں کا استقلال اس سے مانع ہے کہ خلق عالم میں کوئی اس کا شریک ہو۔ تو اس وقت کیا ہوگا کہ جب دونوں میں سے ایک

دوسرے کی وجہ سے مستقل ہو؟ سو دونوں میں سے ہر ایک کو مستقل فرض کرنا اس بات کو مقتضی ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک نے یہ فعل مستقل کیا ہو اور دوسرے نے اس میں کچھ بھی نہ کیا ہو۔ سو اس سے دو بار اجتماعِ نقیضین لازم آئے گا۔ اسی لیے یہ بات ممتنع ہوگی کہ دونوں میں سے ہر ایک موثر، تام، مستقل اور ایک اثر پر جمع ہو۔ اس کی مثال میں ہم یہ کہتے ہیں کہ: اس نے یہ کپڑا اکیلے سیا ہے اور اس نے بعینہ وہ کپڑا اکیلے سیا ہے۔ یا: اس نے یہ کھانا اکیلے کھایا ہے۔ یا اس نے بعینہ وہ کھانا اکیلے کھایا ہے۔

یہ سب باتیں تصور کرنے کے بعد عقل بدیہہ کے نزدیک ممتنع ہیں۔ لیکن بعض لوگ اس کو عمدہ طریق سے تصور نہیں کرتے۔ بلکہ اس کے ذہن میں لوگوں کے دو شریک آتے ہیں جو ایک فعل میں مشترک ہوں اور دو مشترک میں سے کسی نے بھی وہ فعل اکیلے پورے کا پورا نہیں کیا ہوتا اور نہ اس کی قدرت اشتراک کی وجہ سے حاصل ہوئی ہوتی ہے۔ بلکہ اشتراک سے اس کی قدرت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور دونوں میں سے ہر ایک کو عندالانفراد ایک شی کرنا ممکن ہوتا ہے اور وہ دوسرے کے ارادہ کے خلاف ارادہ کر سکتا ہے۔ پھر اگر اس نے اس کے خلاف کا ارادہ کیا اور دونوں کی قدرت ایک دوسرے کے ہم پلہ ہے، تو دونوں منع ہو جائیں گے اور دونوں کچھ نہ کریں گے اور ایک زیادہ قوی ہوا تو وہ دوسرے پر غالب آ جائے گا اور اگر عندالانفراد دونوں میں سے ایک کو قدرت نہیں تو اسے اجتماع کے وقت جو قدرت حاصل ہوگی وہ دوسرے سے ہوگی۔ باوجود یہ کہ اس کا وجود معروف نہیں۔ بلکہ معروف ی ہے کہ عندالانفراد دونوں میں سے ہر ایک کو قدرت حاصل ہو۔ جو اجتماع کے وقت کامل ہو جائے گی۔

یہ بھی کہ فعل اور مفعول میں مشترک کے لیے لازم ہے کہ ہر ایک کا فعل دوسرے سے ممتاز ہو اور بعینہ شیء واحد مشترک نہ ہو۔ وہ یوں کہ دونوں نے اس کو کیا ہو۔ کہ یہ بھی ممتنع ہے جیسا کہ گزرا۔ پھر اگر دو رب ہوتے تو دونوں میں سے ہر ایک کی مخلوق دوسرے کی مخلوق سے ممتاز ہوتی۔ جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (المومنون : ۹۱)

''اس وقت ضرور ہر معبود، جو کچھ اس نے پیدا کیا تھا، اسے لے کر چل دیتا اور یقیناً ان میں سے بعض بعض پر چڑھائی کر دیتا۔''

اس آیت میں رب تعالیٰ نے دو مفعول کے امتیاز کے وجوب کو دونوں میں سے ایک کے دوسرے پر غالب آ جانے کے وجوب کو ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ اس کی تقریر گزر چکی ہے اور یہ دونوں باتیں ممتنع ہیں۔

غرض یہ آئمہ نظار ان جیسے طرق سے توحید ربوبیت کو بیان کرتے ہیں۔ یہ طرق صحیح اور عقلی ہیں لیکن یہ متاخرین ان طرق کی توجیہ و معرفت کی راہ نہیں پا سکے۔

پھر یہ متقدمین متکلمین گمان کرتے ہیں کہ یہ قرآنی طرق ہیں، حالانکہ ایسا نہیں۔ بلکہ قرآن نے اس توحید الوہیت کو پختہ کیا ہے جو توحید ربوبیت کو متضمن ہے اور قرآن نے اس کو ان لوگوں سے زیادہ کامل بیان کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (المومنون: ۹۱)

''اللہ نے نہ کوئی اولاد بنائی اور نہ کبھی اس کے ساتھ کوئی معبود تھا، اس وقت ضرور ہر معبود، جو کچھ اس نے پیدا کیا تھا، اسے لے کر چل دیتا اور یقیناً ان میں سے بعض بعض پر چڑھائی کر دیتا۔''

رب تعالیٰ نے اس آیت میں اس بات پر دو یقینی برہان پیش کیے ہیں کہ اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ نہیں۔ وہ دو برہان یہ ہیں:

﴿اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (المومنون: ۹۱)

یہ بات معروف ہے کہ ہر الٰہ اپنی مخلوق کو نہیں لے گیا اور نہ ایک سے زیادہ الٰہ ایک دوسرے پر غالب آئے ہیں اور اس کے ذکر کو اس لیے ترک کیا کیونکہ مخاطبین اس کو جانتے ہیں اور یہ کہ اس کا ذکر بے جا کی تطویل تھا۔ یہ ہے قرآن کا طریقہ جو صحیح اور فصیح و بلیغ ہے۔ بلکہ خطاب میں خود عوام کا یہ طریق ہے کہ وہ محتاجِ بیان مقدمہ کو تو ذکر کرتے ہیں اور جس کے بیان کی احتیاج نہ ہو اسے ترک کر دیتے ہیں۔

جیسے یہ کہا جائے کہ تم یہ کیوں کہتے ہو کہ ہر نشہ لانے والی شی حرام ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ نبی کریم ﷺ سے ایک صحیح حدیث میں ارشاد منقول ہے:

''ہر نشہ نے والی شی شراب ہے اور ہر شراب حرام ہے۔''[1]

یہ بات معلوم ہے کہ قولِ رسول حجت اور واجب الاتباع ہے کہ اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسی کے مثل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ (الانبیاء: ۲۲)

''اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے تو وہ دونوں ضرور بگڑ جاتے۔''

یعنی جب دونوں نہیں بگڑے تو معلوم ہوا کہ دونوں میں اللہ کے سوا اور الٰہ نہیں ہیں اور یہ بات اس قدر واضح ہے کہ محتاجِ بیان نہیں۔ کیونکہ خطاب سے مقصود بیان ہوتا ہے اور واضح کو بیان کرنا بسا اوقات ایک قسم کا ضیاعِ وقت بن جاتا ہے اور بیانِ دلیل کبھی ایک مقدمہ کا محتاج ہوتا ہے اور کبھی دو مقدمات کا اور کبھی تین کا اور کبھی اس سے زیادہ کا سو مستبدل اتنے ہی مقدمات بیان کرتا ہے جن کی احتیاج ہوتی ہے۔

رہی منطقیوں کی یہ بات کہ دلیل نظری میں دو مقدمات کا ہونا ضروری ہے کہ نہ اس سے زیادہ کی ضرورت اور نہ اس سے کم پر گزارہ اور جب ایک مقدمہ پر اکتفاء کیا جائے تو کہتے ہیں کہ دوسرا مقدمہ حذف ہے اور اسے قیاسِ ضمیر کا نام دیتے ہیں۔ اور اگر تین یا چار مقدمات ہوں تو کہتے ہیں: یہ قیاسات ہیں نا کہ ایک قیاس۔ یہ نرا دعویٰ ہے۔ جس کی کوئی

[1] صحیح مسلم: کتاب الاشربة، باب بیان ان کل مسکر خمر.

عقلی دلیل نہیں اور نہ کسی عادتِ عامہ کی طرف اس کی استناد ہے۔ہم نے ایک مقام پر اس بحث کو مفصل بیان کر دیا ہوا ہے۔رب تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿إِذًا لَذَهَبَ كُلُّ إِلَٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ﴾ (المومنون: ۹۱)

جب یہ لازم منتفی ہوا تو ملزوم بھی منتفی ہوا۔ جو اللہ کے ساتھ دوسرے الٰہ کا ثبوت ہے اور تلازم کا بیان یہ ہے کہ جب اللہ کے ساتھ دوسرے الٰہ ہوں گے تو اللہ کا خلق عالم میں مستقل ہونا ممتنع ٹھہرے گا۔ جبکہ اللہ ہی خلق عالم میں مستقل ہے۔ جیسا کہ گزرا کہ اس کا فاسد ہونا ہر عاقل کے نزدیک ضروری طور پر معلوم ہے اور یہ کہ یہ جمع بین النقیضین ہے۔

یہ بھی ممتنع ہے کہ دو رب میں سے ایک دوسرے کا مشارک اور معاون ہو کہ اس سے دونوں کا عجز لازم آتا ہے اور عاجز کوئی شی نہیں کرتا۔ لہٰذا نہ تو وہ رب ہو گا اور نہ الٰہ۔ کیونکہ جب ان میں سے ایک دوسری کی اعانت سے ہی قادر بنے گا تو انفرادی حالت میں اس کا عجز لازم آیا اور اس کا اجتماع کے حال میں قادر ہونا بھی ممتنع ٹھہرا۔ کیونکہ یہ ''دورِ قبلی'' ہے۔ کیونکہ ان میں سے ایک دوسرے کے قادر بنائے بغیر قادر نہ بنے گا۔ یا اس کی مدد کے بغیر قادر نہ بنے گا۔

پس جب اس کے ساتھ دوسرے الٰہ کو فرض کیا جائے گا تو لازم ہو گا کہ عندالانفراد سب قادر ہوں اور ایسا ہے نہیں۔ لہٰذا یہ قول باطل ٹھہرا۔

اسی طرح اگر ایک کا فعل دوسرے کے فعل کو مستلزم ہو، وہ یوں کہ جب تک دوسرا فعل نہ کر لے یہ فعل نہ کرے گا تو لازم آئے گا کہ دونوں میں سے ہر ایک عندالانفراد غیر قادر ہے اور دونوں اصل فعل میں تعاون کے محتاج ٹھہریں گے اور یہ بالضرور ممتنع ہے۔

غرض واضح ہو گیا کہ اگر اللہ کے ساتھ دوسرے الٰہ ہوتے تو ہر ایک اپنی اپنی مخلوق لے کر چلتا بنتا۔ لیکن ایسا غیر واقع ہے۔ کیونکہ عالم کی ہر چیز دوسرے کے ساتھ مرتبط ہے۔ جیسا کہ گزرا۔ اس لیے جب دو متعاون ایک کام کریں گے دونوں میں سے ہر ایک کے ساتھ قائم فعل دوسرے کے فعل سے ممتاز ہو گا۔

رہا وہ جو اس سے خارج میں حادث ہوتا ہے۔ تو وہ کسی کو ممکن نہیں بنائے گا کہ وہ اپنے سے منفصل شی کے ساتھ مستقل ہو۔ بلکہ اس کا ایک معاون ہونا بقول اس کے ضروری ہے یہ جو کہتا ہے کہ: بندے کا فعل مباشر اور غیر مباشر میں منقسم ہوتا ہے اور رہا وہ جو یہ کہتا ہے کہ اس کا فعل اس کے محل قدرت سے خارج نہیں ہوتا، سو اس کا کوئی منفصل منعول نہیں ہے پھر جب ایک کا مفعول دوسرے کے مفعول سے خلط ملط ہو جائے گا۔ جیسے دو لکڑیاں اٹھانے والے تو اجتماع کے وقت دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کا محتاج ہو گا اور ہر ایک کی انفرادی اور اجتماعی حالت میں ایک خاص قدرت ہو گی جو اس کے لیے یہ ممکن بنائے گی کہ وہ اس قدرت کے ذریعے وہ فعل کرے جس سے وہ دوسرے سے منفرد اور ممتاز ٹھہرے۔ لہٰذا دونوں میں سے ہر ایک کے لیے ایسا فعل ہونا لازم ہے جو اس کیساتھ خاص ہو اور دوسرے کے فعل سے ممتاز ہو۔ لہٰذا دو الٰہ مقصود نہ ہوں گے؛ حتی کہ ایک کا مفعول دوسرے کے مفعول سے ممتاز ہو۔ پھر ہر ایک اپنی اپنی مخلوق کو لے جائے۔ تو

جب لازم منتفی ہے تو ملزوم بھی منتفی ہوا۔

رہی دوسری دلیل تو وہ یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَعَلَا بَعۡضُهُمۡ عَلَىٰ بَعۡضٍ﴾ (المومنون: ۹۱)

''اور یقیناً ان میں سے بعض بعض پر چڑھائی کر دیتا۔''

دونوں کا قدرت میں مساوی ہونا ممتنع ہوگا۔ کیونکہ جب وہ قدرت میں برابر ہوں گے تو دونوں میں سے ہر ایک کا مفعول دوسرے سے ممتاز ہوگا اور یہ باطل ہے جیسا کہ گزرا۔ دوسرے یہ کہ جب دونوں قدرت میں ہم پلہ ہوں گے تو اتفاق اور اختلاف دونوں حالتوں میں کچھ نہ کریں گے۔ چاہے دونوں کو اتفاق لازم ہو یا اختلاف۔ یا دونوں باتیں جائز ہوں۔

کیونکہ جب یہ فرض کیا جائے گا کہ دونوں کو اتفاق لازم ہے تو دونوں میں سے ایک اس وقت ہی کسی بات کا ارادہ اور فعل کرے گا جب دوسرا ارادہ اور فعل کرے گا اور کسی ایک کا تقدم دوسرے کے تقدم سے اولیٰ نہ ہوگا۔ کیونکہ دونوں مساوی ہیں۔ سو لازم آیا کہ دونوں میں سے کسی کا فعل نہ ہو۔

اگر فرض کیا کہ ایک کا فعل و ارادہ دوسرے کے فعل و ارادہ کے مقارن ہے تو تقدیر یہ ہوگی کہ تو وہ دوسرے کے بغیر ارادہ اور فعل نہ کر سکے گا اور اب اس کا فعل و ارادہ دوسرے کے فعل و ارادہ کے ساتھ مشروط ہوگا۔ جس کے بغیر وہ فعل و ارادہ سے عاجز ہوگا۔ سو دونوں میں سے ہر ایک حالِ انفراد میں عاجز ہوگا اور یہ کہ حالِ اجتماع میں دونوں کا قادر بن جانا بھی ممتنع ہوگا جیسا کہ گزرا۔

جب دونوں کو اختلاف لازم ہوگا۔ تو تساوی کے ہوتے ہوئے دونوں کا کوئی فعل کرنا ممتنع ٹھہرے گا۔ کیونکہ دونوں کے ہم پلہ ہونے کی وجہ سے ہر ایک دوسرے کو روکے گا۔ لہٰذا دونوں کوئی فعل نہ کریں گے۔ پھر یہ کہ ایک کا امتناع دوسرے کے منع کرنے کے ساتھ مشروط ہے۔ تو ایک جب تک دوسرا منع نہ کرے گا ممنوع نہ ہوگا۔ اسی طرح اس کے برعکس۔ جس سے دونوں کا مانع اور ممنوع دونوں ہونا لازم آئے گا جو کہ ممتنع ہے۔

یہ کہ ہر ایک کی قدرت کا زوال حالِ تمانع میں، دوسرے کی قدرت سے ہی ہوگا۔ ت وجب ایک کی قدرت زائل نہ ہوگی جب تک کہ دوسرے کی قدرت اسے زائل نہ کر دے۔ اسی طرح اس کے برعکس، تو دونوں میں سے کوئی قدرت زائل نہ ہوگی اور دونوں قادر ہوں گے۔

دونوں کا ایک فعل کی قدرت رکھنا اس حال میں کہ دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کے منع کرنے کی وجہ سے عاجز اور ممنوع ہو کہ یہ محال ہے۔ کیونکہ یہ سب جمع بین النقیضین ہے۔

جب اتفاق اور اختلاف دونوں کا امکان فرض کیا جائے۔ تو اتفاق کے بغیر اختلاف کی تخصیص اور اختلاف کے بغیر اتفاق کی تخصیص اس کی محتاج ہوگی جو ایک کو دوسرے پر راجح کرے اور مرجح بھی تو وہی دو خود ہیں اور دونوں میں سے ایک کا دوسرے کے بغیر ترجیح دینا محال ہے اور ایک کا دوسرے کے ساتھ مل کر ترجیح دینا اتفاق ہوگا۔ جس کی تخصیص ایک

اور مرجح کی محتاج ہوگی۔ جس سے علل میں تسلسل لازم آئے گا جو سب عقلاء کے نزدیک ممتنع ہے۔

پھر یہ کہ دونوں کافی نفسہ اتفاق بھی ممتنع ہے اور اختلاف بھی ممتنع ہے۔ چاہے اسے لازم فرض کیا جائے اور چاہے نہ کیا جائے۔ کیونکہ اتفاق کے وقت ایک کو اس وقت فعل کرنا ممکن ہوگا جب دوسرا کرے گا۔ سو اتفاق کے وقت دونوں کسی فعل میں مستقل ہونے سے عاجز ہوں گے۔ تو جب دونوں اتفاق کے وقت فعل مستقل سے عاجز ہیں تو عندالانفراد بھی عاجز ہوں گے اور جو عندالانفراد ہر شی سے عاجز ہو، وہ عندالاتفاق بدرجہ اولیٰ عاجز ہوگا۔

شریک لوگوں میں سے ہر ایک کے لیے ضروری ہے کہ وہ اشتراک کے وقت دوسرے سے فعل میں منفرد ہو۔ کیونکہ وہ حرکت جو دونوں میں سے کوئی کرتا ہے وہ حالِ تمکن میں دوسرے کے بغیر اس کے ساتھ مستقل ہوتا ہے۔ اسی طرح سے مالِ انفراد میں دوسرے کے بغیر کوئی اثر چھوڑنا ممکن ہوتا ہے۔ پس ایسے دو کا اتفاق ممتنع ٹھہرا چاہے وہ مخلوق یا خالق کہ جس میں دونوں میں سے ہر ایک حالتِ انفراد میں عاجز ہو، چاہے اتفاق لازم ہو یا ممکن۔

اگر مخلوق میں فرض کرلیا جائے کہ دو مخلوق اجتماع کے وقت قادر ہوں گی۔ تو یہی بات ہے۔ کیونکہ یہاں ایک تیسرا بھی ہے جو دونوں میں اتفاق و اجتماع کے وقت قدرت پیدا کرتا ہے اور یہاں یہ بات ممتنع ہے کہ خالق قدیم واجب بنفسہ سے اوپر کوئی ایسا ہو جو اسے قادر بنائے تو یہ بھی ممتنع ہوا کہ دونوں کے اوپر کوئی ہو جو اجتماع کے وقت نا کہ انفراد کے وقت دونوں میں قوت پیدا کرے۔ کیونکہ ان دونوں اللہ کے ماسوا تو سب مخلوق ہوگا۔ پس مخلوق کا خالق کو قادر بنانا ممتنع ہوگا۔

رہا ان کے اختلاف کا امتناع، گو وہ لازم نہ بھی ہو، تب بھی زیادہ ظاہر ہے۔ کیونکہ اختلاف کے وقت تمانع حاصل ہوگا۔ غرض یہ وہ معانی ہیں کہ جن کی جس طرح چاہے تعبیر کو لو صحیح ہیں۔ کہ: دو اللہ کا وجود ممتنع ہے چاہے وہ باہم متفق ہوں یا ان کا اختلاف ہو۔ سوائے اس صورت کے جب ہر ایک حالت انفراد میں قادر ہو۔ تو جب ہر ایک حالت انفراد میں قادر ہو گا تو دونوں میں سے ہر ایک کا ایسا فعل اور مفعول ہوگا جو اس کے ساتھ خاص اور دوسرے سے منفرد ہوگا۔ تب پھر وہ کسی بھی فعل یا مفعول میں متفق نہ ہوں گے اور نہ سرے سے کسی ایک شی میں متفق ہی ہوں گے۔ کیونکہ فعل حادث جو ایک کے ساتھ قائم ہوگا۔ وہ نہ ہوگا جو دوسرے کے ساتھ قائم ہوگا۔ کیونکہ یہ ممتنع لذاتہ ہے۔

مخلوق منفصل کہ اس میں جو ایک کا نفس اثر ہے وہ دوسرے کا نفس اثر نہ ہوگا۔ بلکہ دو اثروں کا ہونا لازم ہے۔ پھر اگر ایک اثر دوسرے کے لیے شرط ہوا تو ہر ایک دوسرے کا محتاج ہوگا۔ تو وہ حالتِ انفراد میں قادر نہ ہوگا اور اگر ایسا نہیں تو ایک کا مفعول دوسرے کا مفعول نہ ہوگا اور نہ اس کا لازم ہوگا۔ تو یہاں سرے سے ایک مفعول میں بھی اتفاق نہ ہوگا۔ یہ ہر اللہ کے اپنی مخلوق کو لے جانے جیسے کلام کی جنس میں سے۔ لیکن یہاں خاص بات یہ ہے کہ جب دو ایسی شی ہوں کہ دونوں میں سے ہر ایک کا دوسرے کے ساتھ ہونا شرط ہو۔ ان کے لیے ضروری ہے کہ کوئی تیسرا ہو جو ان دونوں کو حادث کرلے۔ جیسے ایک معلم کے دو مزدور نصوص کی طرف رجوع کرنے والے دو مفتی، ایسے امر کی طرف رجوع کرنے والے دو مشورہ کرنے والے جو دونوں کو مجتمع کردے۔ لہٰذا یہاں ایک تیسرا ضروری ہے جو دونوں کو جمع کردے۔

البتہ دو خالقوں کے اوپر کچھ نہیں۔ رہا یہ قول کہ دونوں وہ کریں گے جو مصلحت ہوگا وغیرہ۔سو ہر حادث دونوں کے تابع اور ان سے حادث ہوگا۔ ہر شی دونوں کے علم و قدرت سے ہوگی۔ بخلاف مخلوق کے جو متعدد امور کو دوسرے کے بغیر حادث کرتی ہے اور دوسری مصلحت کے امر میں اس کی معاونت کرتی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ دونوں آئندہ ہونے والے امر کو جانتے ہیں۔ پس حادث کا علم معلومِ حادث کے تابع ہوا اور حادث اپنے محدث کے ارادہ کے تابع ہوا۔

رہے دو خالق تو دونوں میں سے ہر ایک کے ارادہ کا اس کی ذات کے لوازم میں سے ہونا لازم ہے۔ یا وہ مستقل بالارادہ ہو۔تب پھر ایک کا ارادہ دوسرے کے ارادہ کی شرط پر موقوف نہ ہوگا۔ وگرنہ وہ مستقل بالارادہ نہ ہوگا اور نہ یہ اس کی ذات کے لوازم میں سے ہوگا۔ کیونکہ جب ہر ایک کا ارادہ اور فعل دوسرے کے ارادہ اور فعل کے ساتھ ہوگا تو ہر ایک کا ارادہ اور فعل مقتضی کا جز ہوگا۔ کیونکہ دوسرا مرید فاعل ہے اور یہ جزءِ علت میں دور ہے۔ جیسے ابوت اور بنوت دونوں متلازم ہیں۔ کیونکہ دونوں کا مقتضی تام ان کا غیر ہے۔اگر ارادہ اور فعل متلازم ہوں تو دونوں کا مقتضی تام دونوں کا غیر ہوگا اور یہ ممتنع ہے۔ کیونکہ دونوں خالقوں سے اوپر کچھ نہیں جو انہیں ایسا بنا دے۔سو لازم آیا کہ دونوں نہ مرید ہوں اور نہ فاعل سو معلوم ہو گیا کہ اگر دو قدرت میں پلہ الٰہ ہوں تو اتفاق اور اختلاف دونوں احوال میں وہ کچھ نہ کریں گے۔تب پھر ایک کا دوسرے سے زیادہ قدرت والا ہونا لازم ہوگا۔ کہ ایک دوسر پر قدرت میں بالضرور عالی ہوگا۔سو اگر متعدد الٰہ ہوتے تو ان کا ایک دوسرے پر غاب آنا واجب ہوتا۔تب پھر کوئی بھی مستقل بالذات نہ ہوتا۔مگر اکیلا عالی الٰہ۔ کیونکہ اگر تو مقہور فعل میں دوسرے عالی کی اعانت کا محتاج ہے تو وہ عاجز ہوا اور اس کی قدرت غیر سے ہوئی اور جو ایسا ہو وہ الٰہ بنفسہ نہیں ہوسکتا۔ سو اللہ نے اپنی مخلوقات میں سے کسی کو بھی الٰہ نہیں بنایا۔سو مقہور کا الٰہ ہونا ممتنع ہوا اور اگر مقہور فعل میں مستقل ہو تو عالی الٰہ اسے فعل سے روک نہیں سکتا اب پھر عالی عاجز ٹھہرا۔تب پھر معلوم ہوا کہ الٰہ کے ایک دوسرے پر غالب آنے کی صورت میں مغلوب الٰہ نہیں۔ نہ وہ دوسرے کی اعانت کے وقت الٰہ ہے اور غناء عن الآخر کے وقت الٰہ ہے۔ کیونکہ غنی پر کوئی عالی نہیں ہوسکتا۔ وگرنہ تو وہ عالی کا محتاج اور عاجز ہوگا اور غیر سے مغلوب زبردست اور اپنے پر سے دوسرے کو دور کرنے والا نہیں ہوتا تو وہ اوروں پر سے کسی کو کیونکر دور کرے گا؟

تو جب مغلوب الٰہ منیع نہ ہوا۔تو قوی و قادر بدرجہ اولیٰ نہ ہوا اور غیر قوی رب اور فاعل نہیں ہوتا۔

غرض یہ ان دو برہانوں کی قدرے تفصیلی تقدیر ہے۔ جو بتلاتی ہے کہ خارج اور وجود دو ایسے الٰہ نہیں جو ایک دوسرے کے شریک اور ہم پلہ ہوں اور نہ کوئی ثالث ہوگا جس کی طرف وہ رجوع کریں گے کہ دو ہم پلہ بادشاہ بھی ایک دوسرے کی طرف رجوع نہیں کرتے اور تو اور ایک ہانڈی پکانے والے دو باورچی ایک دوسرے کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ اسی طرح دو مستری اور دو شجر کار ایک دوسرے کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ اسی طرح دو امر کرنے والے، دو طبیب، دو درزی بھی۔ان سب مشارکات میں دو کا اتفاق متصور نہیں۔مگر تب کہ جب ایک ان میں سے دوسرے پر فائق ہو۔ یا دونوں کے

اوپر ایک ثالث ہو اور اس کی تقریر گزر چکی ہے۔

سو دو ہم پلہ کا کہ جن کے اوپر کوئی نہ ہو، اشتراک ممتنع ہے اور جب کسی امر شرعی میں دو شریک ہوں تو دونوں امر شارع کی طرف لوٹیں گے جو ان کے اوپر ہے۔ یا پھر دونوں تجارت کے کسی ماہر کی طرف لوٹیں گے جو تجارت کہ وہ کرنا چاہتے ہیں۔ سو دونوں اس کا ارادہ کریں گے اور نزاع کے وقت یا تو شارع یا ماہر تجارت دونوں میں فیصلہ کرے گا۔ البتہ جب دونوں نہ تو ثالث کو مانیں اور نہ ایک دوسرے کے تابع ہو تو دونوں کا اشتراک ممتنع ہو گا۔ البتہ دونوں کبھی کبھی ایک دوسرے کی طرف لوٹیں گے جیسے دو متعارض کہ اس وقت دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کی طرف رجوع کے حال میں اصل ہو گا اور دوسرا اس کی فرع ہو گا۔ اسی لیے حدث کم بھی ہو اور لوگ تھوڑے ہوں تب بھی امارت قائم کرنا واجب ہوتا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

''تین کے لیے حلال نہیں کہ وہ سفر کریں یہاں تک کہ کسی ایک کو اپنا امیر بنا لیں۔'' (مسند احمد)

کیونکہ اجتماع کے وقت سر پرست کا ہونا لازم ہے۔ ورنہ اجتماع ممتنع ہو گا اور جب دو مساوی سر پرست ہوں تو اجتماع باطل ہو گا۔ یہ بات سب لوگوں کی فطرت میں جاگزین ہے اور جب متعدد والی ہوں تو ان میں تناوب ضروری ہے۔ وہ یوں کبھی یہ اُس کی طاعت کرے اور کبھی وہ اس کی طاعت کرے۔ جیسا کہ بادشاہوں وزراء اور اعوان میں ہوتا ہے اور جب دو میں اتفاق نہ ہو گا تو وہ تیسرے کی طرف رجوع کریں گے جو ان کے اوپر ہو گا۔ وگرنہ ایک امر دو سے بیک وقت صادر نہیں ہوا کرتا۔

سو دو ہم پلہ اصل میں تمانع حاصل ہوتا ہے۔ چاہے دونوں میں اتفاق ہو یا اختلاف۔ البتہ اختلاف کی صورت میں تمانع زیادہ ظاہر ہے اور اتفاق میں بھی تمانع ہے۔ جیسا کہ اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

غرض یہاں دو برہان ہیں۔ جن میں سے کوئی دوسرے پر مبنی نہیں۔ بلکہ ہر برہان مستقل ہے اور دوسرے الٰہ پر ہر برہان لازم ہے۔ یہ مشرک اس توحید کو مانتے تھے جس میں دو خالق ہوں۔ مشرکین عرب اس میں نزاع نہ کرتے تھے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا:

﴿اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ﴾ (النحل: ۱۷)

''تو کیا وہ جو پیدا کرتا ہے، اس کی طرح ہے جو پیدا نہیں کرتا؟ پھر کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔''

وہ مانتے تھے کہ ان کے الٰہ تخلیق سے عاری ہیں، اسی لیے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ o سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ o قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ o سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ o قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ o سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ o بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ o مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ

مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَo عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَo﴾ (المؤمنون : ٨٤۔ ٩٢)

''کہہ یہ زمین اوراس میں جوکوئی بھی ہے کس کا ہے، اگر تم جانتے ہو؟ ضرور کہیں گے اللہ کا ہے۔ کہہ دے پھر کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟ کہہ ساتوں آسمانوں کا رب اور عرش عظیم کا رب کون ہے؟ ضرور کہیں گے اللہ ہی کے لیے ہے۔ کہہ دے پھر کیا تم ڈرتے نہیں؟ کہہ کون ہے وہ کہ صرف اس کے ہاتھ میں ہر چیز کی مکمل بادشاہی ہے اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں پناہ نہیں دی جاتی، اگر تم جانتے ہو؟ ضرور کہیں گے اللہ کے لیے ہے۔ کہہ پھر تم کہاں سے جادو کیے جاتے ہو؟ بلکہ ہم ان کے پاس حق لائے ہیں اور بے شک وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔ اللہ نے نہ کوئی اولاد بنائی اور نہ کبھی اس کے ساتھ کوئی معبود تھا، اس وقت ضرور ہر معبود، جو کچھ اس نے پیدا کیا تھا، اسے لے کر چل دیتا اور یقیناً ان میں سے بعض بعض پر چڑھائی کر دیتا۔ پاک ہے اللہ اس سے جو وہ بیان کرتے ہیں۔ غائب اور حاضر کو جاننے والا ہے، پس وہ بہت بلند ہے اس سے جو وہ شریک بناتے ہیں۔''

ان کا شرک یہ نہ تھا کہ انہوں نے ان بتوں کو خالق بنا رکھا تھا۔ بلکہ انہوں نے ان بتوں کو عبادت میں واسطہ مقرر کیا ہوا تھا وہ انہیں سفارشی بناتے تھے اور ان کی عبادت اللہ کا قرب پانے کے لیے کرتے تھے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَo﴾ (یونس : ١٨)

''اور وہ اللہ کے سوا ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انھیں نقصان پہنچاتی ہیں اور نہ انھیں نفع دیتی ہیں اور کہتے ہیں یہ لوگ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ کہہ دے کیا تم اللہ کو اس چیز کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے اور نہ زمین میں؟ وہ پاک ہے اور بہت بلند ہے اس سے جو وہ شریک بناتے ہیں۔''

اب جن لوگوں نے اللہ کے سوا کو فاعل مستقل بنا رکھا ہے جیسے آدمی اور فلک، انہوں نے ان حوادث کو اللہ کی مخلوق نہیں ٹھہرایا۔ ان میں وہ شرک اور تعطیل ہے جو مشرکین عرب میں بھی نہ تھا۔ کہ قدر کا اقرار تو وہ بھی کرتے تھے اور ایک اللہ کو ہر شی کا خالق مانتے تھے۔ اسی لیے دوسری آیت میں ارشاد ہے:

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا﴾ (الاسراء: ٤٢)

''کہہ دے اگر اس کے ساتھ کچھ اور معبود ہوتے، جیسا کہ یہ کہتے ہیں تو اس وقت وہ عرش والے کی طرف کوئی راستہ ضرور ڈھونڈتے۔''

سو وہ ان بتوں کو سفارشی اور وسیلہ مانتے تھے نا کہ خالق، فرمایا:

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا﴾

جیسا کہ دوسری آیت میں ارشاد ہے:

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ○﴾ (الاسراء: ۵۶۔ ۵۷)

''کہہ پکارو ان کو جنھیں تم نے اس کے سوا گمان کر رکھا ہے، پس وہ نہ تم سے تکلیف دور کرنے کے مالک ہیں اور نہ بدلنے کے۔ وہ لوگ جنھیں یہ پکارتے ہیں، وہ (خود) اپنے رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں، جو ان میں سے زیادہ قریب ہیں اور اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک تیرے رب کا عذاب وہ ہے جس سے ہمیشہ ڈرا جاتا ہے۔''

معلوم ہوا کہ اللہ کے سوا جو فرشتوں وغیرہ کو پکارا جاتا ہے تو یہ رب تک وسیلہ بنانے کے لیے پکارا جاتا ہے۔ کیونکہ معبود برحق وہی ہے۔ اس سب کے محتاج ہیں کہ وہ رب ہے، اس سے سب ملا ہے اور الٰہ ہونے کے اعتبار سے اس کے بغیر اس کے ارادہ کی منتہا نہیں۔ اگر وہ ہی معبود نہ ہوتا تو یہ عالم برباد ہو جاتا۔ کیونکہ اگر ارادات کا مراد لذاتہ نہ ہوتا اور مراد یا تو لنفسہ ہے یا لغیرہ ہے اور مراد لغیرہ کے لیے لازم ہے کہ وہ غیر مراد ہے۔ تاکہ امر مراد لنفسہ تک منتہی ہو۔ پس جیسے علت فاعلیہ میں تسلسل ممنوع ہے؛ ایسے ہی علتِ غائیہ میں بھی تسلسل ممنوع ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ ارسطو اور اس کے متبعین قدیم فلاسفہ نے اس طریقہ سے اول کو ثابت کیا ہے؛ لیکن انہوں نے اسے صرف علت غائیہ کی جہت سے ثابت کیا ہے؛ لیکن ان لوگوں نے علت غائیہ کو تشبہ کے معنی میں قرار دیا ہے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں: فلسفہ بقدر طاقت الٰہ سے مشابہت ہے۔ وہ اسے ایسے معبود اور محبوب لذاتہ قرار نہیں دیتے جیسے رسول یہ پیغام لیکر آئے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ متأخرین میں سے جو کوئی ان کے طریقہ پر تصوف اختیار کرتا ہے؛ اور عبادت گزاری کرتا ہے؛ وہ الوہیت اور ربوبیت کا دعوی بھی کر بیٹھتا ہے۔ ان میں فرعونیت کی ایک قسم پائی جاتی ہے۔ بلکہ ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو فرعون کی بڑی تعظیم کرتے ہیں اور اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت دیتے ہیں؛ اور یہ بات ان میں سے ایک گروہ کے کلام میں پائی جاتی ہے۔

جب کہ ان دونوں چیزوں کو ثابت کرنا واجب ہے: ۱۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کے رب ہیں ۲۔ وہی ہر ایک چیز کے معبود برحق ہیں۔ پس جب حرکات ارادیہ اس کی مراد لذاتہ کے بغیر قائم نہیں ہوسکتیں؛ اس کے بغیر فساد اور خرابی پیدا ہو جاتی ہے؛ تو یہ بھی جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور مراد لذاتہ ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی دوسرا موجود لذاتہ نہیں ہے۔ اور اگر زمین و آسمان؛ ان دونوں میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے تو وہ دونوں کا نظام ضرور بگڑ جاتا۔

اس آیت مبارکہ میں یہ بیان ہورہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی بھی معبود برحق نہیں ہے۔ اور اگر زمین و آسمان ؛ان دونوں میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتا تو زمین و آسمان کا نظام ضرور بگڑ جاتا۔ جبکہ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ:

﴿ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ ﴾ (المومنون: ۹۱)

''اس وقت ضرور ہر معبود، جو کچھ اس نے پیدا کیا تھا، اسے لے کر چل دیتا۔''

اس خرابی اور فساد کے لازم آنے کی وجہ یہ بیان کی جارہی ہے کہ جب دو مدبر تسلیم کر لیے جائیں؛ تو پھر جیسے پہلے گزر چکا کہ یہ ممتنع ٹھہرتا ہے کہ دونوں غیر متکافی ہوں۔ اس لیے کہ ان میں سے جو بھی مقہور و مغلوب ہوگا؛ وہ رب نہیں ہوگا؛ بلکہ تربیت یافتہ اور پالا ہوا ہوگا۔ اور اگر یہ دونوں متکافی[برابر] ہوں تو پھر ان دونوں سے اختلاف یا اتفاق ہر دو صورتوں میں اس نظام کی تدبیر ممتنع ٹھہرتی ہے۔ اور دنیا کا نظام تدبیر نہ ہونے کی وجہ سے تباہ و برباد ہو کر رہا جاتا۔ نہ ہی علیحدہ مستقل صورت میں اس کا کوئی حل نکلتا اور نہ ہی اشتراک کی صورت میں۔ جیسا کہ اس سے پہلے بھی یہ بیان گزر چکا۔

یہ اس صورت میں ہے جو دو خداؤوں کی ربوبیت کا ماننا ممتنع ہو۔ ان دونوں کی ربوبیت کے امتناع کی بنیاد پر ان کی الوہیت بھی ممتنع ٹھہری۔ اس لیے کہ جو کوئی کچھ بھی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا؛ وہ اس قابل نہیں ہوسکتا کہ رب بنے اور اس کی عبادت کی جائے۔ اور نہ ہی اللہ نے اس کی عبادت کرنے کا حکم دیا ہے۔ پس اسی لیے اللہ تعالیٰ نے واضح بیان کر دیا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہیں ہوسکتا؛ کبھی اس طرح بتایا کہ وہ دوسرا خالق نہیں ؛[پس خالق نہیں وہ رب نہیں ہوسکتا] اور کبھی اس طرح سے کہ اس نے ہمیں اس کا حکم نہیں دیا۔ جیسے فرمایا:

﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ اِئْتُوْنِيْ بِكِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَا اَوْ اَثَارَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ﴾

(الاحقاف: ٤)

''کہہ دے کیا تم نے دیکھا جن چیزوں کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، مجھے دکھاؤ انھوں نے زمین میں سے کون سی چیز پیدا کی ہے، یا آسمانوں میں ان کا کوئی حصہ ہے؟ لاؤ میرے پاس اس سے پہلے کی کوئی کتاب، یا علم کی کوئی نقل شدہ بات، اگر تم سچے ہو۔''

اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر اللہ کی عبادت کی بابت یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ:''بیشک یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت دی ہو؛ کیونکہ اس میں منفعت ہے۔'' تو اللہ تعالیٰ نے یہ واضح کردیا کہ: اس نے کسی ایسی چیز کو مشروع نہیں ٹھہرایا۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَاسْاَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَا اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ﴾

(الزخرف: ٤٥)

''اور ان سے پوچھ جنھیں ہم نے تجھ سے پہلے اپنے رسولوں میں سے بھیجا، کیا ہم نے رحمان کے سوا کوئی معبود بنائے ہیں، جن کی عبادت کی جائے؟''

یہ موضوع دوسری جگہ پر تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔ یہاں پر اتنا بتانا مقصود ہے کہ یہاں پر الوہیت کا امتناع اس اعتبار سے بیان ہو رہا ہے جو غیر اللہ کی عبادت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مخلوق کی اصلاح صرف معبود لذاتہ ہی میں ہے۔ خواہ وہ ان کے افعال کی غایت اور حرکات کے انجام کے اعتبار سے ہو؛ یہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے لیے مناسب اور کارگر نہیں ہو سکتی۔ اگر زمین و آسمان میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی دوسرا معبود ہوتا تو اس اعتبار سے ان کے نظام میں خرابی اور فساد پیدا ہو جاتا۔ پس بیشک اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی معبود برحق محبوب لذاتہ ہے۔ جیسا کہ وہ اپنی مشیئت کے اعتبار سے رب اور خالق ہے۔

اسی معنی میں نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان گرامی ہے:

''سچی بات جو شاعر نے کہی ہے؛ وہ لبید کی بات ہے؛ [وہ کہتا ہے]:

ألا کل شئی ما خلا اللہ باطل ۔۔۔ وکل نعیم لا محالة زائل

''آگاہ رہو اللہ تعالیٰ کے علاوہ ہر چیز باطل ہے۔ اور ہر نعمت نے لامحالہ ختم ہو جانا ہے''[1]

اسی لیے اللہ تعالیٰ سورت فاتحہ میں یوں فرماتے ہیں:

﴿اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ﴾ (الفاتحة ٤)

''ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔''

یہاں پر سورت فاتحہ میں اسم ''اللہ'' کو اسم ''رب'' پر مقدم کیا گیا ہے؛ جیسا کہ ارشاد فرمایا:

﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾

''سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔''

پس معبود ہی مقصود اور مطلوب اور محبوب لذاتہ ہوتا ہے۔ اور وہی غایت اور معین ہے۔ وہی خالق و باری اور مبدع ہے۔ اسی سے ہر چیز کی ابتداء ہوتی ہے؛ غایات کا حصول بدایات پر منحصر ہوتا ہے۔ اور بدایات غایات کی طلب کے لیے ہوتی ہیں۔ پس الوہیت غایت [انتہیٰ اور انجام] ہے۔ اور اس کی حکمت اسی سے متعلق ہوتی ہے۔ پس وہی ذات بذات خود اس بات کی مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے؛ اس سے محبت کی جائے؛ اور اس کی حمد و ثناء اور بزرگی بیان کی جائے۔ وہ ذات پاک خود اپنی تعریف بیان کرتی ہے؛ اور اپنی ہستی کے لیے ثنا خواں ہے؛ اس کی بزرگی بیان کرتی ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی تعریف کیا گیا؛ یا تعریف کرنے والا اس کا مستحق نہیں۔

---

[1] البخاري، کتاب مناقب الأنصار، باب أیام الجاهلیة؛ کتاب الأدب، باب ما یجوز من الشعر، مسلم:١٧٦٩، کتاب الشعر، الأحادیث ٧-١ـ سنن ابن ماجه، کتاب الأدب، باب الشعر، المسند ط المعارف١٣/ ١١٠.

یہ امور دوسرے مقامات پر تفصیل سے بیان ہو چکے ہیں۔ اور ہم نے یہ واضح کر دیا ہے کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اس کے ساتھ یوں بناتا ہے جیسے بادشاہ کے انصار و مددگار ہوتے ہیں؛ تو وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ سب سے بڑا شرک کرنے والا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ آیت پر رافضی کے کلام پر تبصرہ:

اس کا جواب یہ ہے کہ: ان کا اس آیت سے حجت پکڑنا: ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ (الصافات: ٩٦) ''حالانکہ اللہ ہی نے تمھیں پیدا کیا اور اسے بھی جو تم کرتے ہو۔'' کہ بیشک اس سے مراد بت ہیں؛ تو ہمارا اس کے ساتھ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس سے مراد بت ہیں؛ اور دو اقوال میں سے صحیح تر قول یہی ہے۔ یہاں پر ''ما'' بمعنی "الذی" کے ہے۔ اور جس نے کہا: ''یہ ''ما'' مصدر یہ ہے؛ اور اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اور تمہارے عمل کو پیدا کیا ہے؛ اس کا قول ضعیف ہے۔ اس لیے کہ سیاق کلام پہلے قول پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ٥ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ٥﴾ (الصافات: ٩٦)

''تم اس کی عبادت کرتے ہو جسے خود تراشتے ہو؟ حالانکہ اللہ ہی نے تمھیں اور تمہارے عمل کو پیدا کیا۔''

رب تعالیٰ نے اپنے تراشے ہوئے بتوں کی عبادت کرنے پر ان کی مذمت اور ان پر انکار کیا ہے۔ پس یہی مناسب تھا کہ اس تراشے ہوئے بت کے متعلق ہی بات کی جائے کہ بیشک وہ اللہ کی مخلوق ہے۔ اس کی تقدیر عبارت یوں ہوگی: ''اللہ تعالیٰ نے اس عابد اور معبود دونوں کو پیدا کیا ہے۔'' اگر یوں کہا جاتا کہ: ''اللہ تعالیٰ نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور تمہارے عمل کو بھی؛ تو اس میں وہ مذمت نہ ہوتی جس کا بیان کرنا اس شرک کی وجہ سے مطلوب تھا۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے تو ان کی طرف سے عذر پیش کر دیا۔ اس لیے کہ اس آیت کریمہ:

﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ٥﴾ (الصافات: ٩٦)

''حالانکہ اللہ ہی نے تمھیں پیدا کیا اور اسے بھی جو تم کرتے ہو۔''

میں وارد ہونے والا ''واؤ'' حال کا ہے؛ جبکہ یہاں پر حال ظرف سے مشابہ ہوتا ہے۔ اور یہ دونوں علت کے معانی کو متضمن ہیں۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: ''کیا تم فلاں کی مذمت کرتے ہو؛ حالانکہ وہ نیک آدمی ہے؛ اور تم اس کے ساتھ برا سلوک کرتے ہو جب کہ وہ تمہارے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے'' پس اس سے وہ تقریر حاصل ہوگئی جس سے اس کی مذمت ہوتی ہے؛ اور اس کے فعل پر انکار ہوتا ہے۔

رب تعالیٰ نے ان کے اپنے تراشے ہوئے بتوں کی عبادت کرنے پر ان کی مذمت کی اور ان پر انکار کیا ہے۔ اور انہیں اس فرمان میں یاد دلایا ہے کہ:

﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ٥﴾ (الصافات: ٩٦)

''حالانکہ اللہ ہی نے تمھیں پیدا کیا اور اسے بھی جو تم کرتے ہو۔''

یہ آیت ان کے شرکیہ افعال پر ان کی واجب مذمت اور اس سے ان کے لیے ممانعت کو شامل ہے۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی ان کی تیار کردہ چیز کو بھی پیدا کیا ہے۔اور اگر اس سے مراد ان کی تخلیق اور ان کے کفریہ اور دیگر اعمال ہوتے تو پھر اس میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس پر ان کی مذمت مناسب ہوتی۔اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے تخلیق کردہ اپنے بندوں کے اعمال میں کوئی ایسی چیز ہوتی کہ شرک پر ان کی مذمت کا بیان کرنا واجب ٹھہرتا۔

لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ: یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ بندوں کے اعمال بھی مخلوق ہیں۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی یوں ہے کہ:''اس نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے؛ اورتم جو صنم تراشنے کے اعمال بجالاتے ہو؛ انہیں بھی۔'' یہ لوگ بت تراشا کرتے تھے۔پس یہ آیت دو احتمالات سے خالی نہیں : یا تو اس سے مراد ان کو تراشنے اور ان پر کارگری کرنے سے پہلے کی حالت ہوگی۔یا پھر پہلے اور بعد کی دونوں حالتیں مراد ہوں گی۔

اگر ان کا ذکر کرنے سے مراد پہلی حالت میں ان کا مخلوق ہونا ہو؛ تو پھر اس میں کوئی حجت نہیں رہتی کہ مخلوق اس تراشے ہوئے اور کاریگری کئے ہوئے کو کہا جائے۔کیونکہ مخلوق اس وقت تک تھا جب تک تراشا نہیں گیا ؛ اور اس پر کاریگری نہیں کی گئی۔اور اگر اس تخلیق سے مراد تراشے جانے اور کاریگری کے بعد کی حالت ہے؛ تو یہ معلوم شدہ ہے کہ اس تراشنے میں ان کا اثرات اور عمل کو دخل حاصل ہے۔

قدریہ کے نزدیک انسان کے فعل کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی چیز اس کا اپنا فعل ہوتی ہے؛ اللہ تعالیٰ کا فعل نہیں ہوتی۔پس دریں صورت تراشنا اور تصویر بنانا ان کا اپنا فعل ہوگا؛ اللہ تعالیٰ کا نہیں۔پس جب یہ ثابت ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس تراش وخراش اور تصویر سمیت پیدا کیا ہے؛ تو اس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ ان چیزوں کا بھی خالق ہے جو ان کے فعل کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں۔اور پیدا ہونے والی چیز فعل مباشر کے لیے لازم اور وہ اس کے لیے ملزوم ہے۔اور متلازمین میں سے کسی ایک کی تخلیق دوسرے کی تخلیق کو مستلزم ہے۔پس یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان افعال کا بھی خالق ہے جو ان کی ذات کے ساتھ قائم ہیں۔اور ان چیزوں کا بھی خالق ہے جو اس کے نتیجہ میں متولد ہوتی ہیں۔اور ان اعیان کا بھی خالق ہے جن کے ساتھ وہ متولد قائم ہے۔اور ایسا ممکن نہیں ہے کہ متلازمین میں سے ایک ایک رب کی تخلیق ہو؛ اور ایک دوسرے رب کی۔کیونکہ اس سے رب کا کسی دوسرے کا محتاج ہونا لازم آتا ہے۔

مزید برآں ان کی نفسِ حرکات بھی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں داخل ہیں:

﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ﴾ (الصافات : ٩٦) ''حالانکہ اللہ ہی نے تمھیں پیدا کیا۔''

اس لیے کہ ان کے اعراض ان کے اسماء کے مسمیٰ میں داخل ہیں۔سو اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کی تمام تر اعراض کے ساتھ پیدا کیا ہے۔اس کی حرکات اس کی اعراض میں سے ہیں۔پس اللہ تعالیٰ نے واضح کردیا ہے کہ اسی نے ان کے اعمال کو بھی پیدا کیا ہے؛ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ﴾ (الصافات : ٩٦) ''حالانکہ اللہ ہی نے تمھیں پیدا کیا۔''

جو کچھ اس کے نتیجہ میں پیدا ہو؛ جیسے تراشنا؛ اور تصویر بنانا؛ وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں شامل ہے:

﴿وَمَا تَعْمَلُوْنَ o﴾ (الصافات : ۹٦) ''اور اسے بھی جو تم کرتے ہو۔''

پس ثابت ہوا کہ یہ آیت مبارکہ اس چیز پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دو میں سے ہر ایک کا خالق ہے۔ اور یہی چیز بیان کرنا مطلوب ہے حالانکہ بندوں کے اعمال کے مخلوق ہونے پر دلالت کرنے والی آیات بہت زیادہ ہیں۔ جیسا کہ اس پر تنبیہ اس سے پہلے بھی گزر چکی ہے۔ لیکن مصنوعات کے لیے اس کی تخلیق کا ہونا جیسے کشتی؛ اور عمارتین؛ اور لباس وغیرہ؛ یہ بالکل تراشے ہوئے بت کی مثل ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ (41) وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ o﴾ (یس)

''اور ایک نشانی ان کے لیے یہ ہے کہ بے شک ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔ اور ہم نے ان کے لیے اس جیسی کئی اور چیزیں بنائیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ o﴾ (النحل)

''اور اللہ نے تمھارے لیے ان چیزوں سے جو اس نے پیدا کیں، سائے بنا دیے اور تمھارے لیے پہاڑوں میں سے چھپنے کی جگہیں بنائیں اور تمھارے لیے کچھ قمیصیں بنائیں جو تمھیں گرمی سے بچاتی ہیں اور کچھ قمیصیں جو تمھیں تمھاری لڑائی میں بچاتی ہیں۔ اسی طرح وہ اپنی نعمت تم پر پوری کرتا ہے، تاکہ تم فرماں بردار بن جاؤ۔''

کیا رؤیت باری تعالیٰ ممکن ہے؟:

[اشکال] : شیعہ مضمون نگار لکھتا ہے: ''اشاعرہ کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجرد عن الجہات ہونے کے باوصف آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے، حالانکہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ﴾ (الانعام: ۱۰۳) ''آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔''

اشاعرہ اس بدیہی بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ آنکھ سے صرف اس چیز کا ادراک کرنا ممکن ہوتا ہے جو بالکل سامنے ہو یا اس کے حکم میں ہو۔ اور اس مسئلہ میں انہوں نے تمام عقلاء کی مخالفت کی ہے۔ اشاعرہ کہتے ہیں ممکن ہے کہ ہمارے سامنے رنگا رنگ بلند پہاڑ کھڑے ہوں اور ہم انہیں دیکھ نہ سکیں، ہر طرف سے مہیب آوازیں آ رہی ہوں، اور ہم انہیں سن نہ سکیں؛ یا کثیر تعداد عساکر مختلف قسم کے مہیب اسلحہ کے ساتھ برسر پیکار ہوں؛ ہمارے اجسام تو آپس میں ٹکرا رہے ہوں مگر ہم ان کی صورت اور حرکات کو دیکھنے سے قاصر رہیں۔ اور نہ ہی ان کی آوازیں سن سکیں۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ہم دور

افتادہ مغرب میں اقامت پذیر ہونے کے باوصف مشرق کے ایک ذرہ تک کو ملاحظہ کرسکیں، یہ ایک زبردست مغالطہ [دھوکہ بازی] ہے۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جواب]: اوّل:...... جہاں تک آخرت میں اثبات رؤیت کا تعلق ہے؛ تو ائمہ سلف امت آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رؤیت کے قائل ہیں، اہل مذاہب اربعہ میں سے جمہور مسلمین کا بھی یہی مذہب ہے۔ محدثین کے ہاں احادیث متواترہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ جمہور قائلین رویت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بروز قیامت اسی طرح دیکھیں گے جیسے آمنے سامنے کسی چیز کا مشاہدہ کیا جاتا ہے اور جس طرح دیکھنا عقلاً معروف ہے۔ سرور کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تم بروز قیامت اسی طرح دیدار الٰہی سے مشرف ہوگے جس طرح تم آفتاب و ماہتاب کو دیکھتے ہو اور لوگوں کی بھیڑ دیکھنے سے مانع نہیں ہوتی ''❶

ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: '' جیسے تم مطلع صاف ہونے کی صورت میں شمس وقمر کو دیکھتے ہو۔''

دوسری روایت میں فرمایا:'' جب مطلع صاف ہو تو آفتاب کو دیکھتے وقت کیا لوگوں کی بھیڑ مانع ہوتی ہے؟

لوگوں نے کہا: نہیں۔

فرمایا:'' جب مطلع صاف ہو تو کیا ماہتاب کو دیکھتے وقت کیا لوگوں کی بھیڑ مانع ہوتی ہے؟

تو فرمایا'' یقیناً تم اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے جس طرح شمس وقمر کو دیکھتے ہو۔''❷

جب بات یہی ہے تو یہ ہوسکتا ہے کہ بعض اہل سنت جو رؤیت کو مانتے بھی ہیں ان کا اس باب میں بعض احکام میں خطا کر گئے ہوں؛ ایسا ہو جانا اہل سنت کے حق میں قدح کا موجب نہیں۔ کیونکہ ہم سب کے لیے عصمت کے مدعی نہیں۔ البتہ سب کا ضلالت و گمراہی پر جمع ہونا محال ہے۔ اور بیشک یہ کہ ہر وہ مسئلہ جس میں اہل سنت والجماعت اور روافض کا اختلاف واقع ہوا ہے؛ اس میں حق اہل سنت والجماعت کے ساتھ ہے۔ اور جہاں کہیں روافض حق پر ہیں؛ تو اہل سنت کی بھی کوئی نہ کوئی جماعت اس حق میں ان کے ساتھ ہوگی۔ لیکن روافض میں ایسی غلطیاں موجود ہیں جن میں اہل سنت ان کا ساتھ نہیں دیتے۔ تمام اہل سنت والجماعت سے ہٹ کر روافض کے ہاں کوئی ایک بھی انفرادی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس میں ان کی موافقت کی گئی ہو۔ اور وہ اس مسئلہ میں غلطی پر ہوں؛ جیسے بارہ ائمہ کی امامت اور ان کے معصوم ہونے کا مسئلہ۔

دوم:...... جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ روبرو ہونے کے بغیر بھی اللہ تعالیٰ کو دیکھ سکتے ہیں ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ذات باری فوق العالم نہیں، چونکہ وہ ذات باری کیلئے رؤیت کا اثبات اور علو کی نفی کرتے ہیں۔ بنا بریں اس امر کی

---

❶ صحیح بخاری۔ کتاب التوحید۔ باب قول الله تعالیٰ ﴿وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ......﴾ (ح:٧٤٣٤) لیکن اس میں سورج کے بجائے قمر کا ذکر ہے۔ واللہ اعلم۔

❷ صحیح بخاری کتاب التوحید باب قول الله تعالیٰ ﴿وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ......﴾ (ح:٧٤٣٩) واللفظ له۔ صحیح مسلم۔ کتاب الایمان۔ باب معرفة طریق الرؤیة (ح:١٨٣)۔

ضرورت لاحق ہوئی کہ دونوں مسئلوں میں تطبیق دے کر یہ ثابت کریں کہ ان میں تضاد نہیں ہے۔ کلابیہ اور اشاعرہ کی ایک جماعت بھی یہی نظریہ رکھتی ہے؛ یہ سب کا عقیدہ نہیں؛ اور نہ ہی ان کے ائمہ کا عقیدہ ہے۔ بلکہ اشاعرہ کے ائمہ اللہ تعالیٰ کو اس کی ذات کے ساتھ فوق العرش تسلیم کرتے ہیں۔ پھر بھی ان میں سے جس نے بھی اس بات کی نفی کی ہے، اس نے معتزلہ کی موافقت میں کی ہے اس کی اور اس کے ملزومات کی نفی کی ہے۔[معتزلہ فوقیت و رؤیت کسی کو بھی نہیں مانتے]۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انہوں نے حدوث عالم کے مسئلہ میں معتزلہ کے ساتھ صحیح دلیل میں ان کی موافقت کی؛ وہ دلیل یہ ہے کہ: جسم حرکت اور سکون سے خالی نہیں ہوتا۔ اور جو کچھ ان دو امور سے خالی نہ ہو وہ حادث ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ایسے حوادث کا ہونا ممتنع ہے جن کی کوئی ابتداء ہی نہ ہو۔ تو کہنے لگے: اس سے ہر جسم کا حادث ہونا لازم آتا ہے۔ پس یہ ممتنع ہے کہ باری سبحانہ وتعالیٰ جسم ہو۔ اس لیے کہ وہ ہستی قدیم ہے۔ اور پھر اس کا کسی جہت میں ہونا بھی ممتنع ٹھہرا۔ اس لیے کہ جہت میں صرف جسم ہی ہوسکتا ہے۔ پس یہ بات ممتنع ٹھہری کہ وہ دیکھنے والے کے مقابلہ میں ہو۔ اس لیے کہ مقابلہ صرف دو اجسام میں ہوسکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جمہور عقلاء خواہ وہ روئت کے قائلین ہوں یا منکرین؛ وہ کہتے ہیں: ''بیشک اس قول کا فاسد ہونا ضرورت کے تحت معلوم شدہ ہے۔ اسی لیے رازی نے کہا ہے کہ: امت کے تمام فرقے اس مسئلہ میں اس کے ساتھ اختلاف کرتے ہیں ۔لیکن وہ اپنے اوپر الزام لگانے والے اس آدمی سے کہتے ہیں: ''بیشک ہم رؤیت کو ثابت مانتے ہیں؛ اور جہت کا انکار کرتے ہیں۔ اس سے وہ کچھ لازم نہیں آتا جو تم نے ذکر کیا ہے۔ پس اگر مرئی کا دیکھا جانے؛ دیکھنے والے کی جہت سے ممکن ہو تو اس سے ہمارے قول کی صحت ثابت ہوئی۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو دو میں سے ایک مسئلہ میں ہمارا غلطی پر ہونا لازم آیا۔ یا تو رؤیت کی نفی میں؛ یا پھر اللہ تعالیٰ کے اپنی مخلوق سے مبائین اور ان کے اوپر عالی ہونے کی نفی میں۔

جب ان دو میں سے ایک مسئلہ میں خطاء لازم آئی تو اس سے رؤیت کی نفی میں خطاً میں نفی متعین نہیں ہوتی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ غلطی علو اور مبائین ہونے کی نفی کرنے میں ہو۔ ہمارا تمہارے ساتھ کسی چیز میں اتفاق کرنا تمہارے حق میں حجت نہیں ہوسکتا۔ ہمارے اقوال میں تناقض اللہ تعالیٰ کے مخلوق پر بلند ہونے کی نفی کرنے میں تمہارا قول درست ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتی۔ بلکہ رؤیت الٰہی مستفیض نصوص کی روشنی میں اجماعِ سلفِ امت سے ثابت ہے؛ اور ساتھ ہی عقل بھی اس پر دلالت کرتی ہے۔

پس اس صورت میں لازمِ حق بھی حق ہی ہوتا ہے۔ جب ہم اس حق کو ثابت کرتے ہیں اور اس کی بعض لوازم کی نفی کرتے ہیں؛ تو یہ تناقض حق اور اس کے لوازم کی نفی کی نسبت کم اور آسان ہے۔ اور تم ہو کہ رؤیت کی بھی نفی کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ کے علو اور مخلوق سے جدا ہونے کی نفی بھی کرتے ہو۔ پس ہمارے قول کی نسبت تمہارا قول معقول و منقول سے ہر لحاظ سے بہت دور ہے۔ اور تمہارے قول کی نسبت ہمارا قول حق کے زیادہ قریب ہے۔ اور اگر ہمارے قول میں تناقض پایا جاتا ہے؛ تو یاد رہے کہ تمہارے قول میں ہماری نسبت زیادہ تناقض پایا جاتا ہے؛ اور تمہاری کتاب وسنت کی نصوص اور سلف

امت کے اجماع کی مخالفت زیادہ واضح اور ظاہر ہے۔اس لیے کہ نصوص الٰہیہ اور نصوص سلف امت میں اللہ تعالیٰ کی صفات اور؛اس کی رؤیت ؛ اور علو کا ہونا متواتر اور مشہور اخبار سے ثابت ہے۔

جب کہ اس کے منکرین نہ ہی کتاب اللہ پر اعتماد کرتے ہیں اور نہ ہی نصوص سنت پر اور نہ ہی اجماع امت پر۔ بلکہ وہ ان سب کے مقابلہ میں اپنی فاسد آراء وافکار پیش کرتے ہیں ؛اور نبی کریم ﷺ اور آپ کے تابعدار صحابہ مہاجرین و انصار اوران کے متبعین کے مقابلہ میں اپنی آراء سے اٹکل اڑاتے ہیں۔

جہاں تک تناقض کی بات ہے؛ تو بلا شک وشبہ منکرین رؤیت کہتے ہیں: ''بیشک اللہ تعالیٰ موجود تو ہے مگر نہ ہی عالم کے داخل میں ہے اور نہ ہی خارج میں۔اور نہ ہی اس سے مبائین ہے اور نہ ہی وہ کسی چیز کے قریب ہے؛ اور نہ ہی کوئی چیز اس کے قریب ہے۔اور نہ ہی کوئی اسے دیکھ سکتا ہے۔اور نہ ہی کسی ایک چیز کو چھوڑ کر دوسری چیز کو اس کے دیدار سے روکا جاسکتا ہے۔اور نہ ہی کوئی چیز اس کی طرف چڑھتی اور نہ ہی اس کی طرف سے نازل ہوتی ہے۔اس طرح کے ان کے دیگر عقائد وافکار بھی ہیں۔

جب ان سے کہا جاتا ہے: یہ عقیدہ عقل کے مخالف ہے؛ یہ صفات ایسے معلوم معدوم کی ہیں جس کا وجود ممتنع ہے۔ تو وہ کہتے ہیں: یہ نفی وہم کے حکم سے ہے۔

پس ان سے کہا جائے گا: جب عقل پر کوئی ایسی چیز موجود چیز پیش کی جائے جو جسم نہ ہو کہ بذات خود قائم ہو؛ تو اس کا دیکھا جانا ممکن ہے؛اور عقل اس کے سامنے ہو؛ تو وہ اس بات کا انکار نہ کریں گے۔پس جب اس کے ساتھ ہی ان سے یہ کہا جائے: ''بیشک اللہ تعالیٰ کو بلا مقابلہ دیکھا جاسکتا ہے۔پس اگر یہ کہا گیا کہ: ایسا ہونا ممکن ہے؛ تو ان کا عقیدہ باطل ٹھہرا۔اور اگر یہ کہا گیا کہ: یہ ایسا معاملہ ہے کہ عقل اسے ممنوع ٹھہراتی ہے۔تو ان سے کہا جائے گا: جس چیز کو تم واجب اور موجود کہتے ہو؛عقل اسے اس سے بڑا ممتنع ٹھہراتی ہے۔

اگر تم کہتے ہو: یہ نفی وہم کے حکم سے ہے۔

تو تم سے کہا جائے گا کہ: تو پھر اس صورت میں اس کا انکار وہم کے حکم میں ہونے کا زیادہ حق دار ہے۔

اور اگر تم کہو کہ: یہ انکار عقل کا حکم ہے۔

تو تم سے کہا جائے گا کہ: تو پھر اس کا انکار بھی بدرجہ اولیٰ انکار عقلی ہونے کا حق دار ہے۔

بیشک تم کہتے ہو کہ: وہم کا حکم باطل ہے؛ کہ کوئی ایسا حکم لگایا جائے جو نہ ہی محسوس ہے اور نہ محسوس کے حکم میں ہے۔ پس اس صورت میں جب تم نے کہا کہ: بیشک باری تعالیٰ غیر محسوس ہیں؛ تو یہ بھی ممکن ہے کہ تم اس میں وہ حکم قبول کرلو جو محسوس میں ممتنع ہوتا ہے؛ اور وہ بلا مقابلہ امتناع رؤیت ۔

اگر تم کہو کہ: بیشک وہ محسوس ہے؛ اور اس کا احساس ہونا ممکن ہے؛ تو اس میں وہم کا حکم باطل نہیں ہوگا؛ لیکن یہ ممتنع ہو جائے گا کہ نہ ہی وہ عالم کے داخل میں ہو اور نہ ہی خارج میں ۔ پس اس صورت میں اس کی رؤیت جائز ٹھہرے گی۔

اگر تم کہو کہ: جب وہ غیر محسوس ہے تو وہ غیر مرئی بھی ٹھہرا۔

تو تم سے کہا جائے گا کہ: اگر محسوس سے تمہاری مراد معتاد حس ہے؛ تو دیدار کے قائلین جس بلا مقابلہ رؤیت کو ثابت مانتے ہیں؛ تو وہ وہی معتاد رؤیت نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایسی رؤیت ہے جس کی مواصفات کو ہم نہیں جانتے۔ جیسا کہ تم لوگ ایسے موجود کے وجود کو ثابت مانتے ہو جس کی صفات ہمارے علم میں نہیں۔ پس ہر وہ تناقض اور شناعت جس کا الزام تم دیدار کے قائلین پر دھرتے ہو؛ اس سے اکثر تناقضات تم پر لازم آتے ہیں۔

سوم:...... یہ کہا جائے کہ اہل حدیث وسنت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ علو، مبانیہ اور رؤیت ثابت ہے۔ اب جس نے ایک تو ثابت کیا اور دوسرے کی نفی کی وہ اس سے زیادہ عقل و شرع کے قریب ہے جو دونوں کی نفی کرتا ہے۔

پس وہ اشاعرہ جو رؤیت کو ثابت مانتے ہیں اور جہت کا انکار کرتے ہیں؛ وہ ان معتزلہ اور شیعہ کی نسبت عقل اور شرع کے زیادہ قریب ہیں جو اس کا انکار کرتے ہیں۔ اس کا شریعت سے قریب ہونا اس لیے ہے کہ جو آیاتِ وأحادیث اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے منقول آثار و روایات علو اور رؤیت پر دلالت کرتی ہیں؛ ان کا شمار دشوار ہے۔ جبکہ علو اور رؤیت کی نفی کرنے والوں کے پاس کوئی شرعی دلیل نہیں۔ ان کا مدار بس عقل پر ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اِن تناقض کا شکار اشعریہ کا قول اُن کے قول سے بہتر ہے۔ وہ یوں کہ جب ہم عقل پر ایک ایسے موجود کے وجود کو پیش کرتے ہیں کہ:

❀ جس کی طرف نہ اشارہ ہوسکتا ہے۔ ❀ نہ اس کے قریب جا سکتے ہیں۔

❀ نہ اس کی طرف کوئی چیز چڑھ سکتی ہے۔ ❀ نہ اس کے پاس سے کوئی چیز اترتی ہے۔

❀ نہ وہ عالم میں داخل ہے اور نہ خارج میں۔ ❀ اور نہ اس کی طرف ہاتھ اٹھائے جا سکتے ہیں۔

اس طرح کے دیگر اقوال وافکار؛ تو فطرت اس کا انکار کرتی ہے؛ اور سب فطرتی عقل والے اس کا انکار کرتے ہیں کہ جن کی عقل بگڑ نہ گئی ہو۔ اس کا اقرار صرف وہی کرتا ہے جس کے پاس نفاۃ کے اقوال اور دلائل ہیں۔ وگرنہ فطرت سلیمہ اس کے انکار پر متفق ہے جو خرقِ عادت پر انکار سے بھی زیادہ ہے۔ اس لیے کہ عادات کا معجزہ بن جانا جائز نہیں ہو سکتا۔ اس پر تمام اہل ملت اور عقلاء کا اور فلاسفہ کا اتفاق ہے۔

پس ہم کہتے ہیں: منکرین دیدار کا قول اگر حقیقت میں عقل میں بھی مقبول ہو تو؛ بغیر جسم کے عرش پر رب تعالیٰ کا اثبات عقلی طور پر قبولیت کے زیادہ قریب ہے۔ اور جب یہ ثابت ہوگیا کہ وہ عرش کے اوپر ہے؛ تو اس چیز کے دیدار کا عقیدہ جو انسان کے اوپر ہو؛ بھلے وہ جسم نہ بھی ہو؛ منکرین دیدار کے عقیدہ کی نسبت عقلی طور پر قبولیت کے زیادہ قریب اور اس کا حقدار ہے۔

چہارم:...... اشعریہ کہتے ہیں: ''بیشک اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ وہ ہمارے سامنے ایسی شی کو پیدا کر دے کہ جس کو نہ ہم دیکھ سکیں اور نہ سن سکیں چاہے وہ جسم ہو یا آواز اور وہ ہمارے سے بے حد بعید شی کو بھی ہمیں دکھلا سکتا ہے۔ لیکن

یہ نہیں کہتے ہیں کہ یہ واقع میں بھی ایسا ہے۔ بلکہ صرف یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے اور جس پر بھی وہ قادر ہے، وہ اس کے وقوع میں شک نہیں کرتے۔ بلکہ یہ مانتے ہیں کہ فی الحال یہ واقع نہیں ہے اور وقوع کو جائز قرار دینا یہ اس میں شک کرنے کے علاوہ ایک امر ہے۔

لیکن اس ناقل کی عبارت تقاضا کرتی ہے کہ ایسا اس وقت میں موجود بھی ہے؛ لیکن ہم اسے نہیں دیکھ سکتے۔ پر اس کا کوئی بھی عاقل قائل نہیں ہے۔ ایسا صرف الزامی طور پر کہا گیا ہے۔ ان سے یہ کہا جائے گا کہ: جب تم لوگ اس کے قائل ہو کہ بغیر کسی جہت کے دیکھا جاسکتا ہے؛ تو انہوں نے بھی اس کو جائز کہا ہے۔ تو وہ کہتے ہیں: ہاں ہم اس کو جائز کہتے ہیں۔ جیسے تم اس بات کو جائز کہتے ہو کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا دیدار جائز ہے؛ یعنی اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ وہ ہمیں دنیا میں اپنا دیدار کرا دے حالانکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ دنیا میں کوئی اللہ تعالیٰ کے دیدار پر قادر نہیں۔ ہاں اس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ کے دیدار الٰہی کے متعلق اختلاف ہے۔ پس ان میں سے جو کوئی اس دنیا میں دیدار واقع ہونے میں شک کا شکار ہوا؛ وہ اس کی نفی کے دلائل سے اپنی جہالت کی بنا پر اس کا شکار ہوا ہے۔

نبی کریم ﷺ کے علاوہ دوسروں کے لیے اس دنیا میں رب تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بارے میں اشعری نے دو قول نقل کئے ہیں۔ لیکن جس پر تمام اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے؛ وہ یہ عقیدہ ہے کہ کوئی ایک بھی اس دنیا میں اپنی آنکھوں سے رب تعالیٰ کا دیدار نہیں کرسکتا۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ نے اس نفی پر سلف صالحین کا اتفاق نقل کیا ہے۔ اور خصوصاً نبی کریم ﷺ کے علاوہ کسی کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ صحیح مسلم اور دیگر کتب میں نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے آپ نے فرمایا:

''جان لیجیے تم میں سے کوئی اپنے رب کو نہیں دیکھ سکتا حتی کہ وہ مر جائے۔'' [سبق تخریجہ]

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دیدار کا سوال کیا تھا؛ تو آپ کو منع کر دیا گیا۔ پس عوام الناس میں سے کوئی ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام سے افضل نہیں ہوسکتا۔ اور جملہ طور پر ہر وہ بات جو کہنے والا کہہ دیتا ہے کہ: ''بیشک ایسا ہونا ممکن اور مقدور ہے؛'' اس کے واقع ہونے میں شک نہیں کیا جاسکتا۔

اشاعرہ اور ان کی موافقت رکھنے والے شوافع؛ مالکیہ اور حنابلہ اگرچہ رؤیت کے بارے میں عادت کے برعکس بعض امور کے جائز ہونے کا کہتے ہیں۔ پس وہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ اور بندے کے مابین کوئی حجاب نہیں ہوتا؛ مگر اتنی بات ہے کہ آنکھوں میں دیدار کی صلاحیت نہیں پیدا کی گئی۔ ایسے ہی ان کا تمام مرئیات کے بارے میں کہنا ہے۔

پس وہ اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ آنکھ میں ایسی کوئی امتیازی قوت ہو جس کی بنا پر دیدار کا حصول ممکن ہو سکے۔ اور اس بات کو بھی ممنوع کہتے ہیں کہ اسباب اور مسببات میں کوئی التزام/[ملازمت] ہو۔ اور یہ کہ موانع اور ممنوعات کے مابین کو ممانعت ہو۔ وہ ان تمام چیزوں کو محض عادت قرار دیتے ہیں؛ جو محض مشئیت کی طرف منسوب کرتے ہیں؛ اور پھر اس محض مشئیت سے خرق عادت کے ہونے کو جائز کہتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ: ہم ایسی بہت ساری چیزوں کا منتفی ہونا جانتے ہیں جن کے امکان کا علم ہوتا ہے۔جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ سمندر کبھی خون نہیں بن سکتا؛ اور نہ ہی پہاڑ یاقوت بن سکتے ہیں۔اور نہ ہی حیوانات درخت بن سکتے ہیں۔ بلکہ ایسی چیزوں کے علم کو عاقل اور مجنون کے درمیان وجہ فرق سمجھا جاتا ہے۔اور وہ لوگ اگر چہ اپنے بعض ان عقائد میں تناقض کا شکار ہیں جو کہ عقلاً ونقلاً باطل ہیں؛ پھر بھی تقدیر؛ صفات اور رؤیت کے بارے میں ان کے اقوال وعقائد ان معتزلہ اور موافقین شیعہ کے عقائد سے بہتر ہیں۔اگر چہ صواب وہی بات ہے جس پر سلف صالحین اور ائمہ اہل سنت قائم ہیں؛ جو کہ ائمہ اربعہ اور ان کے جمہور کبار اصحاب کا عقیدہ ہے۔اور ان ائمہ مذکورین سے ماثور نصوص دوسرے مقامات پر بیان کی جا چکی ہیں۔

مکمل بیان وہی ہوتا ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے بیان کر دیا ہو۔اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ﷺ مخلوق میں سب سے بڑے عالم ؛ اور مخلوق کے سب سے بڑے خیر خواہ تھے۔اور حق کے بیان میں ان سب سے بڑے فصیح اللسان تھے۔پس آپ ﷺ نے جو کچھ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات بیان کئے ہیں ؛ اور اللہ تعالیٰ کا عرش پر بلند ہونا؛ اور اس کا دیدار ہونا بیان کیا ہے وہ اس باب کی منتہی ہے؛ اور اللہ ہی حق کی توفیق دینے والا ہے۔

فصل :......کلام اللہ کے متعلق اشاعرہ کا عقیدہ اور رافضی اعتراض پر ردّ

رافضی کہتا ہے: اشاعرہ کا مذہب ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے ازل میں امر ونہی کی ہے۔حالانکہ اس وقت اس کے پاس کوئی مخلوق نہ تھی۔وہ کہتا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ﴾ (الاحزاب : ۱)

''اے نبی! اللہ تعالیٰ سے ڈر۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ ﴾ (البقرة : ۲۷۸)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ ﴾ (النسآء : ۱)

''اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو۔''

اگر ایک شخص خالی جگہ میں بیٹھ جائے ؛ جہاں اس کا غلام اس کے پاس نہ ہو؛ اور وہ اسے پکار کر یہ کہے: او سالم! اٹھ کھڑا ہو۔اے غانم! تم کھاؤ۔اے نجاح! تم اندر آجاؤ۔تو اس سے پوچھا جائے گا کہ تم کس کو پکار رہے ہو؟ اور وہ جواب دے کہ ایک ایسے غلام کو پکار رہا ہوں جسے میں بیس برس بعد خرید نے کا ارادہ رکھتا ہوں۔تو سب عقل والے اسے احمق اور بے وقوف

کہیں گے۔تو بھلا ان لوگوں نے اس بات کو رب تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کو کیونکر احسن جان لیا۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جواب]: اس کے کئی جوابات ہیں:

اوّل:...... یہ کہا جائے گا کہ یہ کلابیہ کا قول ہے۔کلابیہ ان لوگوں میں سے ایک جماعت ہیں جو کہتی ہے کہ کلام اللہ غیر مخلوق ہے۔اور یہ خلفائے ثلاثہ کو ماننے والی ایک جماعت کا قول ہے۔ان کا قول چاہے حق ہو یا باطل تب بھی مذہبِ رافضہ کی صحت کو مقتضی نہیں اور نہ اہلِ سنت کے قول کے بطلان کو ہی مقتضی ہے۔پس اس نے جس قول کا ذکر کیا ہے؛ اگر یہ باطل ہے تو خلفاء ثلاثہ کے ماننے والوں کی اکثریت اس کا عقیدہ نہیں رکھتی۔اور نہ ہی وہ لوگ اس کا عقیدہ رکھتے ہیں جو قرآن کو مخلوق کہتے ہیں؛ جیسے معتزلہ۔جو لوگ قرآن کو غیر مخلوق قرار دیتے ہیں، مثلاً کرامیہ، سالمیہ ائمہ سلف اور مذاہب اربعہ کے اہل الحدیث وہ اس نظریہ کے قائل نہیں جس کا تذکرہ شیعہ مضمون نگار نے کیا ہے[پس اس کو ذکر کرنے سے رافضی کا مقصود حاصل نہیں ہوتا]۔

دوم:...... یہ کہا جائے کہ: اکثر شیعہ اور ائمہ اہل بیت بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ قرآن غیر مخلوق ہے۔یہ قول ان کے اقوال میں سے ایک ہے اور اگر یہ حق نہیں تو یہ کہنا بھی ممکن ہے ان کے دیگر اقوال بھی ایسے ہی ہیں۔

سوم:...... یہ کہا جائے گا کہ: فرقہ کلابیہ اور اشاعرہ نے یہ نظریہ اس لیے اختیار کیا کہ اس مسئلہ کی اصل واساس میں وہ معتزلہ کے ہمنوا ہیں۔یہ سب حدوث اجسام کی دلیل کو صحیح تسلیم کرنے میں یک زبان ہیں۔یہی وجہ ہے کہ یہ اس چیز کو بھی حادث قرار دیتے ہیں جو حوادث سے خالی نہ ہو۔وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس چیز کے ساتھ حوادث کا قیام ہو وہ حوادث سے خالی نہ ہوگی، جب کہا جاتا ہے کہ جسم حرکت وسکون سے خالی نہیں ہے؛ تو وہ کہتے ہیں کہ: ازلی سکون ممتنع الزوال ہوتا ہے۔اس لیے کہ وہ ازل سے موجود ہے اور جو چیز ازل سے موجود ہو اس کا زوال محال ہوتا ہے۔علی ہذا القیاس جو چیز حرکت کو قبول کرسکتی ہے اور وہ ازلی بھی ہو تو اس کی حرکت بھی ازلی اور ممتنع الزوال ہوگی۔ازلی حرکت کو تسلیم کرنے سے یہ لازم آئے گا کہ کچھ ایسے حوادث بھی ہوں جو ازلی ہوں اور ان کا نقطۂ آغاز معلوم نہ ہو۔حالانکہ یہ ممتنع ہے۔اس سے یہ لازم آیا کہ ذات باری کے ساتھ حوادث کا قیام ممکن نہیں۔علاوہ ازیں یہ بات ادلہ عقلیہ یقینیہ سے ثابت ہے اور انہیں بخوبی معلوم ہے کہ کلام متکلم کے ساتھ اسی طرح وابستہ ہوتا ہے، جس طرح صفت علم کا قیام عالم کے ساتھ ہوتا ہے، قدرت قادر کے ساتھ اور حرکت کا متحرک کے ساتھ، یہ بھی مسلم ہے کہ جو کلام اللہ تعالیٰ کسی دوسری چیز میں پیدا کر دیتے ہیں وہ اس کا کلام نہیں ہوتا بلکہ وہ اس چیز کا کلام کہلائے گا جس کے ساتھ وہ قائم ہے۔ اس لیے کہ صفت جب کسی محل کے ساتھ قائم ہو؛ تو اس کا حکم اسی محل پر لوٹتا ہے۔اسے کسی دوسرے پر نہیں لوٹایا جاتا۔اس محل کے لیے اس سے نام مشتق کیا جاتا ہے جو کہ کسی دوسرے کے لیے مشتق نہیں کیا جاتا۔پس اگر کسی دوسرے میں پیدا کیا گیا کلام اللہ تعالیٰ کا کلام ہوتا تو اس سے چار باطل امور لازم آتے:

۱۔ اس سے مشتق اسم اور صفت کا ثبوت غیر اللہ کے لیے۔۲۔اللہ تعالیٰ سے اس حکم اور اسم کی نفی جو کہ دونوں عقلی اور

سمعی طور پر اس لیے لازم ہیں کہ وہ کلام اس جگہ کی صفت ہیں؛ اللہ کی نہیں۔۳۔ پس وہ ایسی چیز کا منادی ہوگا جس کے ساتھ وہ قائم ہو۔ پس دریں صورت وہ درخت جس میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے لیے آواز پیدا کی تھی؛ وہی اس قول کا قائل ہوگا: "إنني أنا الله ۔" پھر یہ آواز دینے والی ہستی اللہ تعالیٰ کی نہیں ہوگی۔ اور اس سے لازم آئے گا کہ آپ اس کلام کرنے والے درخت کو ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام کہیں؛ اور اس سے یہ بھی لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نہ ہی متکلم ہوں اور نہ ہی منادی اور مناجی۔ جب کہ یہ باتیں دین اسلام ضرورت کے تحت معلوم شدہ عقائد کے خلاف ہیں۔ اور یہ ساری تفصیل دوسری جگہ پر بیان ہو چکی ہے۔

۲۔ پھر یہ کہ اگر وہ ازل میں متکلم نہیں تو پھر اس کی نقیض سے متصف ہوگا جو سکوت یا گونگا پن ہے۔

یہ لوگ کہتے ہیں: اگر اس کا کلام مخلوق ہے تو پھر اگر اس نے کلام کو ایک محل میں پیدا کیا ہے تو یہ اس محل کا کلام ہوگا اور اگر اس نے کلام کو قائم بنفسہ بنایا ہے تو صفت اور عرض قائم بنفسہ ٹھہریں گے اور اگر اس نے کلام کو خود اپنے میں پیدا کیا ہے تو لازم آئے گا کہ اس کی ذات محلِ مخلوقات ہو۔ یہ تینوں لوازم باطل ہیں؛ اور کلامِ الٰہی کے مخلوق ہونے کے قول کو باطل قرار دیتے ہیں۔ یہ ساری تفصیل دوسری جگہ پر بیان ہو چکی ہے۔

پس جب ان کے نزدیک یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ کلام کا قیام صرف متکلم کے ساتھ ہوتا ہے، اور وہ معتزلہ کی ہم نوائی میں یہ بھی کہتے ہیں کہ حوادث ذات قدیم کے ساتھ قائم نہیں ہو سکتے، تو ان ہر دو قواعد سے کلام کا قدیم ہونا ثابت ہو گیا۔

کیا اصوات قدیم ہیں؟:

اشاعرہ کے نزدیک اصوات کا قدیم ہونا ممتنع ہے۔ وہ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ صوت (چونکہ عرض ہے اس لیے وہ دو) زمانوں تک باقی نہیں رہ سکتی۔ بنا بریں یہ بات متعین ہوگئی ہے کہ کلام قدیم ایک معنوی چیز ہے اور حرف و صوت سے عبارت نہیں، اندریں صورت وہ ایک ہی صفت سے متصف ہوگا اگر وہ ایک سے بڑھ جائے تو اسے غیر محدود ماننا پڑے گا اور ظاہر ہے کہ غیر متناہی معانی کا وجود ممتنع ہوتا ہے۔ یہ ان کے عقیدہ کی اصل ہے۔ وہ کہتے ہیں ہم اس بات میں تمہارے ہم خیال ہیں کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کی مراد و مقدور ہو وہ اس کی ذات کے ساتھ قائم نہیں ہو سکتی۔ تاہم ہم یہ بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ کلام الٰہی اس کا پیدا کردہ مگر اس سے منفصل ہے۔ تمہارے ذکر کردہ اصول کی بنا پر اس سے ہمارے ساتھ مناقضہ لازم آتا ہے۔ اگر کسی طرح جمع و تطبیق ممکن ہو تو تناقض رفع ہو جائے گا۔ تطبیق ممکن نہ ہونے کی صورت میں ہمارے ان دونوں مسئلوں میں سے ایک کو مبنی بر خطا تسلیم کرنا پڑے گا، یہ ضروری نہیں کہ وہی مسئلہ غلط ہو جس میں ہم نے تمہاری مخالفت کی ہے۔ بخلاف ازیں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ جس مسئلہ میں ہم متحد الخیال ہیں وہی درست نہ ہو۔ یعنی کہ اللہ تعالیٰ اپنی مشیت و قدرت کے مطابق وہ کلام نہیں کرتا جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ حالانکہ جمہور اہل الحدیث، متکلمین کرامیہ اور شیعہ سب یہی عقیدہ رکھتے ہیں بالفاظ صحیح تر یوں کہنا چاہیے کہ اکثر اسلامی فرقے اس کے قائل ہیں۔

جب ان دونوں مسئلوں میں سے کسی ایک غیر متعین میں ہمارا مبنی بر خطأ ہونا لازم آتا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ ہی راست اور حق پر ہوں۔ اور جب مجبوراً ہمیں دونوں فرقوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہم آہنگ ہونا پڑا تو ہم اس فرقہ کی موافقت کو پسند کریں گے جس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے تو بولتا ہے۔ جو فرقہ یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی اور چیز میں اپنا کلام پیدا کر دیتا ہے، ہم اس کے ہم نوا بننا پسند نہیں کریں گے، اس لیے کہ یہ نظریہ شرعاً وعقلاً فاسد ہے بہ نسبت اس قول کہ وہ ایسا کلام کرتا ہے جو اس کے ساتھ قائم ہے؛ اور وہ اس کی مشیئت اور قدرت سے متعلق ہے۔

پھر وہ جمہور مسلمین جو کہتے ہیں: بیشک اللہ تعالیٰ اپنی مشیئت اور قدرت سے ایسا کلام کرتا ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہوتا ہے؛ ان کا دو اقوال میں اختلاف ہے۔ ان میں سے بعض کہتے ہیں: بیشک اللہ تعالیٰ اپنی مشیئت اور قدرت سے ایسا کلام کرتا ہے جو پہلے سے اس میں موجود نہیں تھا۔ یہ کرامیہ اور ان کے موافقین کا مذہب ہے۔۔ ان میں سے بعض کہتے ہیں: بیشک اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے متکلم رہا ہے؛ وہ جب چاہے اور جیسے چاہے کلام کرتا ہے۔ جیسا کہ ائمہ اہل سنت و الجماعت اور کلابیہ اور دیگر محدثین جیسے عبداللہ بن مبارک؛ أحمد بن حنبل اور ان کے علاوہ دوسرے ائمہ اہل سنت کا عقیدہ ہے۔ کلابیہ کہتے ہیں: اگر ہم ان میں سے کسی ایک کی موافقت کے لیے مجبور ہوں جو کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا کلام مخلوق ہے؛ اور جو کہتے ہیں: اس کا کلام اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے؛ اور جنس کلام اس کی ذات میں عدم کے بعد پیدا ہوئی ہے؛ تو ان کے کلام میں معتزلہ کے عقیدہ کی نسبت بہت کم فساد اور خرابی پائی جاتی ہے۔ معتزلہ کے عقیدہ کا فساد زیادہ ظاہر ہے۔ بلاشک وشبہ دلیل اس کی نفی کرتی ہے کہ کسی چیز کا اس کی ذات سے اور اس کی ضد سے خالی نہیں ہوتی۔ یہ ایسی کمزور حجت ہے کہ اس کے ضعف کا اعتراف اس فرقہ کے بڑے ماہر علماء اور اہل انصاف لوگوں نے کیا ہے؛ ان کا اعتراف ہے کہ: ان کے پاس کوئی ایسی عقلی یا سمعی دلیل نہیں ہے جو حوادث کے اس ساتھ قائم ہونے کی نفی کرتی ہو؛ سوائے اس دلیل کے جو مطلق طور پر صفات کی نفی کرتی ہو۔ تو پھر کی دوسرے قول کی طرف پلٹنا کیسے ممکن ہے جو کہ اسلاف محدثین کا قول ہے۔

غرض اہل حدیث کا یہ قول کہ وہ ہمیشہ سے متکلم ہے جب چاہے [کلام کرے]؛ دو مقدمات پر مبنی ہے:

ایک یہ کہ: اس کے ساتھ امور اختیاریہ قائم ہیں اور یہ کہ اس کا کلام بے نہایت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَ لَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴾ (الکهف: ۱۰۹)

''کہہ دے اگر سمندر میرے رب کی باتوں کے لیے سیاہی بن جائے تو یقیناً سمندر ختم ہوجائے گا اس سے پہلے کہ میرے رب کی باتیں ختم ہوں، اگرچہ ہم اس کے برابر اور سیاہی لے آئیں۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ (لقمان: ۲۷)

''اور اگر زمین بھر کے درخت قلمیں ہوں اور سمندر اس کی سیاہی ہو، جس کے بعد سات سمندر اور ہوں تو بھی اللہ تعالیٰ کی باتیں ختم نہ ہوں گی، یقیناً اللہ تعالیٰ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔''

بہت سارے علماء کرام نے فرمایا: ''بیشک اس جیسے کلام سے مراد اس امر پر دلالت ہوتی ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ کا کلام نہ ختم ہوسکتا ہے اور نہ ہی مٹ سکتا ہے؛ بلکہ اس کی کوئی انتہاء نہیں ہوتی۔ اور جس نے یہ کہا کہ: بیشک اللہ تعالیٰ اپنی مشئیت اور قدرت سے ایسا کلام کرتا ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہو؛ وہ یہ بھی کہتے ہیں: بیشک اس کلام کی مستقبل میں کوئی انتہاء نہیں ہے۔ جب کہ ماضی کے متعلق ان کے دو قول ہیں:

ان میں سے بعض کہتے ہیں: ماضی میں اس کی ابتداء ہوتی ہے۔ اور ان کے ائمہ کہتے ہیں: ماضی میں اس کی کوئی ابتداء ایسے ہی نہیں ہے جیسے مستقبل میں اس کی کوئی انتہاء نہیں ہے۔ اور یہ قول ایسے کلمات کو مستلزم ہے جس کی ازل اور ابد میں کوئی انتہاء نہیں ہے۔

کلام صفتِ کمال ہے اور اپنی مشئیت و قدرت کے ساتھ کلام کرنے والا اس سے زیادہ کامل ہے جو اپنی مشئیت و قدرت سے کلام نہیں کرتا۔ بلکہ متکلم تو ہوتا ہی وہ ہے جو اپنی قدرت و مشئیت سے کلام کرے۔ بلکہ اس کے بغیر کسی متکلم کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اور کلام اس وقت تک صفت کمال نہیں ہوسکتا جب تک وہ متکلم کے ساتھ قائم نہ ہو۔ اور رہ گئے وہ امور جو ذات سے منفصل ہیں؛ تو وہ کسی بھی صورت میں صفت نہیں بن سکتے۔ کجا کہ وہ صفت کمال یا نقص ہوں۔

کہتے ہیں: سلف صالحین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور تابعین عظام رحمہم اللہ اور ان کے علاوہ دیگر ائمہ مسلمین میں سے کسی ایک کے متعلق بھی معلوم نہیں ہوسکا جو اس اصول کا انکار کرتا ہو۔ اور نہ ہی کسی نے یہ کہا ہے کہ: ایسے کلمات کا وجود ممتنع ہے جن کی ماضی اور مستقبل [ازل اور ابد] میں کوئی انتہا ہی نہ ہو۔ اور نہ ہی کسی نے اس سے امتناع کے لزوم کا کہا ہے۔

بیشک ایسا کہنے والے کچھ متکلمین مبتدعین ہیں جو سلف اور ائمہ اہل سنت کے ہاں مذموم ہیں۔ جنہوں نے اسلام میں اللہ تعالیٰ کی صفات؛ اس کے اپنی مخلوق پر علو [بلند ہونے] اور آخرت میں دیدار کے انکار کا عقیدہ ایجاد کیا۔ اور وہ کہنے لگے: ''بیشک اللہ تعالیٰ کلام نہیں کرتا۔'' اور پھر کہنے لگے: وہ کلام تو کرتا ہے مگر اس کا کلام مخلوق اور اللہ تعالیٰ سے جدا ہوتا ہے۔

وہ کہتے ہیں: بیشک ہم یہ بات اس لیے کہتے ہیں کہ ہم نے حدوث عالم پر حدوث اجسام سے استدلال کیا ہے؛ اور اجسام کے حدوث پر ان حوادث سے استدلال کیا ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہوتے ہیں۔ اور جو چیز حوادث سے جدا نہ ہو وہ بھی حادث ہی ہوتی ہے؛ اس لیے کہ حوادث کا بلا ابتداء ہونا ممتنع ہے۔ اور اگر ہم کہیں کہ: صفات اور کلام اس کے ساتھ قائم ہوتے ہیں؛ تو پھر حوادث کا اس ساتھ قیام لازم آتا ہے۔ اس لیے کہ یہ تمام اعراض حوادث ہیں۔

پس اہل سنت ان کو جواب میں کہتے ہیں: ''بیشک تم بدعات ایجاد کرکے یہ گمان کرتے ہو تم اسلام کی نصرت کررہے ہو؛ حالانکہ نہ ہی تم نے اسلام کی نصرت کی اور نہ ہی دشمن کو نیچا دیکھایا۔ بلکہ تم اہل عقل و شرع کو اپنے اوپر مسلط کردیا؛ وہ لوگ جو کہ مرسلین علیہم السلام کی نصوص کے علماء تھے؛ وہ جانتے تھے کہ تم ان کی مخالفت کررہے ہو؛ اور بیشک تم گمراہ اور بدعت

پرست ہو۔ اور معقول کے معانی جاننے والے علم رکھتے ہیں کہ تم ایسی بات کہتے ہو جو معقول کے خلاف ہے۔ اور تم خطا پر اور گمراہی کا شکار ہو۔

جن فلاسفہ کے متعلق تمہارا خیال ہے کہ تم ان پر حجت قائم کر رہے ہو؛ اس طریقہ سے وہ تم پر مسلط ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ تم صریح معقول میں ان کی مخالفت کر رہے ہو۔ فلاسفہ الٰہیات اور شرع میں تمہاری نسب بڑے جاہل ہیں۔ لیکن جب انہوں نے خیال کیا کہ جو کچھ تم لیکر آئے ہو وہی شریعت ہے؛ اور پھر انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ ایسا کرنا عقل کے خلاف ہے تو وہ تمہاری نسب عقل اور شرع سے بہت دور چلے گئے۔ لیکن انہوں نے تمہارا مقابلہ عقلی دلائل بلکہ شرعی دلائل سے کیا؛ تو اس باب میں تم ان کے مقابلہ میں حق اور صواب بیان کرنے سے عاجز آ گئے۔

یہ سبب ان کے نفوس میں ان کی مزید گمراہی اور تمہارے اوپر مسلط ہونے کا سبب بنی۔ اور اگر تم ان کے ساتھ ان لوگوں کی راہ اختیار کرتے جو معقول اور منقول کی حقیقت کو جانتے ہیں؛ تو یہ بات تمہارے لیے بڑی مددگار ہوتی؛ اور رسول اللہ ﷺ کی اتباع کے لیے سب سے بڑھ کر ہوتے۔ لیکن تمہارا حال اس انسان کی طرح تھا جو کفار سے جہاد تو کرتا ہے مگر جھوٹ بول کر اور زیادتی و سرکشی کرتے ہوئے۔ اور انہیں اس وہم میں مبتلا کر رہا ہو کہ یہ انسان ایمان کی حقیقت میں داخل ہو چکا ہے۔ پس ان لوگوں تک ان کا جو جھوٹ اور عداوت و سرکشی پہنچی تھی؛ وہ ان کے دعوی ایمان میں نقد و قدح کا موجب بن گئی۔ اور جب ان لوگوں نے دیکھا کہ بادشاہی؛ ریاست اور مال میں بھی اسی قس کی دھوکہ بازی اور حیلہ سازی پائی جاتی ہے؛ تو وہ ایسی راہ پر چل پڑے جو دھوکہ اور حیلہ سازی میں ان گمراہ مبتدعین کے طریقہ سے بھی دو ہاتھ آگے بڑھ کر تھی۔ تو ان کے دین سے خروج کی وجہ سے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں ان لوگوں پر مسلط کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَوَ لَمَّآ اَصَابَتۡکُمۡ مُّصِیۡبَۃٌ قَدۡ اَصَبۡتُمۡ مِّثۡلَیۡہَا ۙ قُلۡتُمۡ اَنّٰی ہٰذَا ؕ قُلۡ ہُوَ مِنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِکُمۡ ﴾

(آل عمران ۱٦٥)

''اور کیا جب تمھیں ایک مصیبت پہنچی کہ یقیناً اس سے دگنی تم پہنچا چکے تھے تو تم نے کہا یہ کیسے ہوا؟ کہہ دے یہ تمھاری اپنی طرف سے ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ تَوَلَّوۡا مِنۡکُمۡ یَوۡمَ الۡتَقَی الۡجَمۡعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسۡتَزَلَّہُمُ الشَّیۡطٰنُ بِبَعۡضِ مَا کَسَبُوۡا ۚ وَ لَقَدۡ عَفَا اللّٰہُ عَنۡہُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ حَلِیۡمٌ ﴾ (آل عمران ۱٥٥)

''بے شک وہ لوگ جو تم میں سے اس دن پیٹھ پھیر گئے جب دو جماعتیں بھڑیں، شیطان نے انھیں ان بعض اعمال ہی کی وجہ سے پھسلایا جو انھوں نے کیے تھے اور بلاشبہ یقیناً اللہ نے انھیں معاف کر دیا، بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت بردبار ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَآ اَصَابَکُمۡ یَوۡمَ الۡتَقَی الۡجَمۡعٰنِ فَبِاِذۡنِ اللّٰہِ وَ لِیَعۡلَمَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ﴾ [آلعمران ۱۶۶]

''اور جو مصیبت تمھیں اس دن پہنچی جب دو جماعتیں بھڑیں تو وہ اللہ کے حکم سے تھی اور تا کہ وہ ایمان والوں کو جان لے۔''

پس جو کچھ رسول اللہ ﷺ لیکر آئے ہیں؛ وہ محض حق ہے؛ اور اس کی تصدیق صریح معقول اور صحیح منقول سے ہوتی ہے۔ اور اس کے مخالف اقوال؛ اگرچہ ان کے کہنے والے بڑی تعداد میں مجتہدین تھے؛ جن کی خطأ معاف ہے؛ تاہم وہ علمی دلائل کی روشنی میں اس مؤقف کی نصرت کا ملکہ نہیں رکھتے۔ اور جن علمی دلائل سے اس پر قدح کی جاسکتی ہے؛ اس کا کوئی جواب ان کے پاس نہیں ہے۔ اس لیے کہ صحیح عقلی دلائل صرف حق بات پر ہی دلالت کرتے ہیں۔ اور وہ صحیح جوابات جو اپنے فریق مخالف کے دلائل کو باطل ثابت کرسکیں؛ وہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کے دلائل باطل ہوں بھی۔ اس لیے کہ باطل پر صحیح دلیل قائم نہیں ہوسکتی۔ اور جو چیز حق اور درست ہو اسے صحیح دلیل کے ذریعہ ختم نہیں کیا جاسکتا۔

یہاں پر یہ بتانا مقصود ہے کہ جو کوئی ایسی بات کہے؛ جس میں ایک لحاظ سے راستی پر ہو؛ اور ایک لحاظ سے غلطی کر رہا ہو؛ حتی کہ وہ اس میں اپنے ہی قول سے تناقض کا شکار ہو؛ اور اس طرح اس نے اپنی بات میں دو متناقض امور کو جمع کر دیا ہو۔ وہ اپنے مخالف مناقض سے تسلیم شدہ جدلی مقدمہ میں کہہ رہا ہو: میرا تناقض ان دو میں سے کسی ایک بات میں میرے غلطی پر ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔ اور جو قول اس کے التزام سے تم مجھ پر لازم ٹھہرا رہے ہو؛ وہ تمہارے قول کی صحت پر دلالت نہیں کر رہا۔ بلکہ یہ ممکن ہے کہ میرا دوسرا قول درست ہو۔

اشاعرہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام مخلوق نہیں ہے۔ اور اس لیے بھی کہ یہ اس امت کے اسلاف اور ائمہ کا عقیدہ ہے۔ اور اس پر شرعی اور عقلی دلائل موجود ہیں؛ جب ان سے کہا جائے کہ قرآن کریم کے قدیم ہونے کا قول ممتنع ہے۔ تو ان کے لیے یہ کہنا ممکن ہے کہ: جو لوگ اسے غیر مخلوق کہتے ہیں؛ ان کے ہاں مزید دو اقوال ہیں؛ جیسا کہ اس سے پہلے گزر چکا۔ اور ان میں سے کوئی ایک قول بھی لازم نہیں آتا؛ وگرنہ جو لوگ اسے مخلوق کہتے ہیں؛ ان کا عقیدہ اس سے بڑی خرابی اور فساد پر مشتمل ہے۔

عقل مند انسان آگ کی گرمی سے پناہ نہیں طلب نہیں کرتا؛ اگر وہ اپنے مؤقف کو چھوڑ دیتا ہے؛ تو وہ مرجوح قول سے راجح کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور جو لوگ کہتے ہیں: ''بیشک اللہ تعالیٰ اپنی مشیئت اور قدرت سے کلام کرتے ہیں؛ حالانکہ اس سے پہلے وہ متکلم نہیں تھا؛ اس میں معتزلہ اور ان جیسے دیگر لوگوں کے لیے ان کے خلاف کوئی حجت نہیں؛ سوائے صفات کی نفی کی حجت کے۔ اور یہ حجت بھی انتہائی بیکار اور بودی ہے۔ کلابیہ کے پاس ان کے خلاف کوئی دلیل ہے ہی نہیں؛ سوائے اس کے کہ اس سے دوام حوادث لازم آتا ہے۔ اس لیے کہ کسی چیز کا مقابل اس سے اور اس کی ضد سے خالی

نہیں ہوتا۔اور اس لیے بھی حوادث کی قابلیت اس کی ذات کے لوازم میں سے ہوتی ہے۔

یہ بہت ہی کمزور دلائل ہیں جن کا یہ لوگ التزام کرتے ہیں؛ اور اس کا اعتراف ان کے بڑے بڑے ماہر علماء کر چکے ہیں کہ اس باب میں وارد تمام عقلی دلائل انتہائی کمزور ہیں۔جبکہ شرعی دلائل وہ مثبتین صفات کے ساتھ ہیں منکرین کے ساتھ نہیں۔

یہ کہنا کہ: اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے متکلم ہیں؛ وہ جب چاہیں کلام کرتے ہیں؛ کلام رب تعالیٰ کی ذات کے لوازم میں سے ہے؛ اس پر اتنے دلائل ہیں کہ ان کے اعداد وشمار سے یہ کتاب تنگ پڑ جائے گی۔اور جو قول بھی صحیح ہو؛ ہمارے لیے اس کا اختیار کرنا ممکن ہے۔

امام رازی اور دیگر کہتے ہیں: تمام عقلاء پر لازم آتا ہے کہ وہ حوادث کے اس کی ذات کے ساتھ قائم ہونے کا قول اختیار کریں۔ پس جب یہ صحیح ثابت ہو جائے تو یہ کہنا بھی ممکن ہوگا کہ وہ اپنی مشیئت اور قدرت سے کلام کرتا ہے۔اس باب میں ہم نے دانشمندوں کی عقول کی منتہی پر تفصیل سے بات کی ہے۔اور یہ بھی بتایا ہے جس پر کتاب وسنت اور سلف امت کے اقوال دلالت کرتے ہیں؛ یہ تفصیل ہماری کتاب ''درء تعارض العقل و النقل '' اور دیگر کتب میں مل جائے گی۔

خلاصہ کلام ! جو بھی دلیل اس بات پر مبنی ذکر کی جائے کہ سکون ایک امر وجودی ہے؛ اور بیشک اللہ تعالیٰ فاعل بنے ہیں؛ حالانکہ وہ پہلے فاعل نہ تھے؛ پس اس صورت میں حوادث غیر دائمی ٹھہریں گے۔اور یہ تو معلوم شدہ ہے کہ ان دونوں اقوال کا فاسد ہونا صاف ظاہر نہیں ہے؛خصوصاً تحقیق کے وقت ان دونوں اقوال یا ان میں سے ایک قول کی صحت ظاہر ہوتی ہے۔اور ان میں سے جو قول بھی صحیح ثابت ہو جائے ؛ تو اس کے ساتھ یہ کہنا بھی ممکن ہو جاتا ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ ایسا کلام کرتے ہیں جو اس کی مشیئت اور قدرت کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔

❀ اشاعرہ کہتے ہیں: جب یہ بات حق ہے؛ تو جب ہم کہتے ہیں کہ: اس کا کلام اس کے ساتھ قائم ہوتا ہے؛ پس وہ اس کی مشیئت اور قدرت کے ساتھ معلق نہیں ہوتا؛ تو ہم نے حق بات تو کہی لیکن اس میں تناقض کا شکار ہو گئے۔تو پھر بھی ہمارا قول ان لوگوں کے قول سے بہتر ہے جو کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا کوئی کلام ہی نہیں؛ سوائے اس کے جو وہ کسی دوسرے میں پیدا کرتا ہے۔اور اس قول میں شریعت اور عقل کی مخالفت پائی جاتی ہے۔

چہارم :......اور ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ابھی تک کسی معدوم چیز کو خطاب کا اہل نہیں سمجھا گیا اور کسی چیز سے بشرطِ وجود مخاطب ہونا اس متکلم کے وجود کو تسلیم کرنے کی نسبت اقرب الی العقل ہے جس کا کلام اس کے ساتھ قائم نہ ہو اور رب ہونے کے باوصف جس سے صفات کمال مسلوب ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے جس عرض کو بھی کسی جسم میں پیدا کیا ہے وہ اس جسم کی صفت ہے خالق کی نہیں۔ باقی رہا اس چیز سے مخاطب ہونا جو سر دست اگر چہ معدوم ہے تاہم اس کا وجود متوقع ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ وصیت کنندہ بعض اوقات کہتا ہے، کہ میری موت کے بعد ایسا کریں ویسا کریں اور جب میرا فلاں بچہ

بالغ ہوجائے تو میرا یہ حکم اسے پہنچا دیا جائے، بعض اوقات وہ اپنی جائیداد وقف کرنے کی وصیت کرتا ہے جو عرصہ دراز تک باقی رہتی ہے اور اس نگران کے نام وصیت کر جاتا ہے، جو وصیت کے وقت پیدا بھی نہیں ہوا ہوتا۔

❀......شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''یا سالم! اے غانم! [وغیرہ اگر غیر موجود غلام کا نام لے کر پکارنا حماقت کی دلیل ہے]۔'' [انتہی کلام الرافضی]۔

تو اس کا جواب یہ ہو کہ اگر مالک غیر موجود کو خطاب کے الفاظ میں پکارے تو اس کی قباحت میں کلام نہیں اور اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ اس غلام کو پکار رہا ہے جس کا وجود متوقع ہے۔ مثلاً وہ یوں کہے کہ مجھے ایک صادق القول شخص نے بتایا ہے کہ میری لونڈی غانم نامی ایک بچہ جنے گی جب وہ بچہ پیدا ہو تو وہ آزاد ہے، میں اپنی اولاد کو بھی اس بات کی وصیت کرجاتا ہوں اور اے غانم! [پیدا ہونے والے بچے] میں تمہیں فلاں فلاں بات کی وصیت کرتا ہوں یہ وصیت بالکل درست ہے؛ اس میں کوئی ممنوعہ بات نہیں۔ اس لیے کہ یہ خطاب ایک ایسے بچہ سے ہے جو حاضر فی العلم مگر مشاہدہ کے اعتبار سے غائب ہے۔ اور انسان بسا اوقات ان لوگوں سے خطاب کرنے کا خوگر ہے جو اس کے تصور اور خیال میں موجود ہوں اور خارج میں موجود نہ ہوں، تخیل کے اسی عالم میں وہ ذہنی اشخاص سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:

''اے فلاں! کیا میں نے تجھ سے فلاں بات نہیں کہی تھی......؟''

شیعہ اور اہل سنت سبھی نے روایت کیا ہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب آپ کا گزر صحرائے کربلا میں ہوا تو آپ نے فرمایا: ''اے ابوعبداللہ! صبر کیجئے؛ ''اے ابوعبداللہ! صبر کیجئے۔ آپ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر رہے تھے۔''

اس لیے کہ آپ کو علم ہو چکا تھا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو عنقریب قتل کر دیا جائے گا۔ یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے کربلا میں آنے اور لوگوں کے آپ کی قتل کے درپے ہونے سے بہت پہلے کا واقعہ ہے۔

اسی طرح سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے خروج دجال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''اے اللہ کے بندو! ثابت قدم رہنا۔''[1] حالانکہ وہ لوگ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

ایسے ہی مسلمان اپنی نمازوں میں پڑھتے ہیں: "السلام علیك أیھاالنبی ورحمة الله و برکاته۔" تو اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس [جسمانی طور پر تو] موجود نہیں ہوتے؛ مگر ان کے دلوں میں موجود ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ (یس: ۸۲)

''اس کا حکم تو، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، اس کے سوا نہیں ہوتا کہ اسے کہتا ہے ''ہو جا'' تو وہ ہو جاتی ہے۔''

[1] صحیح مسلم۔ کتاب الفتن۔ باب ذکر الدجال، (حدیث:۲۹۳۷) مطولاً۔

اکثر علمائے کرام رحمہم اللہ کے نزدیک یہ خطاب اس چیز سے ہوتا ہے جسے رب سبحانہ وتعالیٰ اپنے نفس میں جانتے ہیں؛ لیکن خارج میں ابھی تک اس کا وجود نہیں ہوتا۔ اور جس کسی نے یہ کہا کہ: یہ خطاب شروع تکوین سے متعلق ہے؛ تو اس نے مفہوم خطاب کی مخالفت کی۔ اور آیت کریمہ کو اس پر محمول کرنا اس خطاب کے ان معانی میں استعمال ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ اور بیشک جس زبان میں قرآن مجید نازل ہوا ہے؛ یہ بھی اسی میں ہے۔ وگرنہ کسی ایک کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے خطاب کو اپنی مرضی پر چسپاں کردے۔ قرآن کریم جو کہ عربی بان میں اور قریش کی لغت میں نازل ہوا ہے؛ اس میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خطاب میں عادتاً ایسی چیزیں معروف ہیں؛ کسی ایک ان سے خروج کا اختیار حاصل نہیں۔

خلاصہ کلام! ہمارا مقصد ان لوگوں کے قول کی حمایت کرنا نہیں جو کہتے ہیں: قرآن قدیم ہے؛ بیشک یہ قول اسلام میں سب سے پہلے ایجاد کرنے والا ابو محمد عبداللہ بن سعید بن کلاب ہے؛ اور پھر کچھ گروہ اس کے پیچھے چل پڑے۔ اس طرح دو گروہ ہوگئے۔ ایک گروہ کہتا تھا: قدیم ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ اور دوسرا گروہ کہنے لگا: مطلب یہ ہے کہ وہ حروف ہیں؛ یا حروف اور آوازیں ہیں۔

ان میں سے ہر قول کی طرف اہل سنت کے کچھ طوائف منسوب ہوگئے؛ جن کا تعلق امام مالک؛ امام شافعی؛ اور امام أحمد بن حنبل رحمہم اللہ اور دیگر کے اصحاب سے تھے۔ ان میں سے کوئی ایک قول بھی ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کا قول بھی نہیں تھا۔ بلکہ ائمہ اربعہ اور دیگر تمام ائمہ اس پر متفق ہیں کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے؛ وہ اس کا کلام ہے؛ مخلوق نہیں۔ اور کئی ایک ائمہ نے صراحت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مشئیت اور قدرت سے متکلم ہے۔ یہ بھی صراحت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے متکلم ہے؛ وہ جب اور جیسے چاہے کلام کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں جو ان ائمہ سے منقول ہیں۔ اس مسئلہ میں سلف صالحین نے کلام کیا ہے۔ لیکن یہ نزاع اس وقت زیادہ مشہور ہوا جب ائمہ اسلام پر امتحان کا دور آیا۔ اور جس ہستی کو اللہ تعالیٰ اس دور ابتلاء وامتحان میں ثابت قدم رکھا؛ اور ان کے ذریعہ سے سنت کی نصرت کی؛ وہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ کا اور دیگر ائمہ کا کلام بہت سی کتابوں میں موجود ہے۔ اگرچہ آپ کے متأخر متبعین کے ایک گروہ نے ابن کلاب کے قول کی موافقت کی ہے کہ قرآن قدیم ہے۔ جب کہ آپ کے مذہب کے ائمہ اس کی نفی کرتے آئے ہیں؛ انکے نزدیک کلام قدیم ہے؛ یعنی کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے اپنی قدرت اور مشئیت سے متکلم رہے ہیں۔

❀ جب کہ ان کے دو قول ہیں:

۱۔ کیا اللہ تعالیٰ کو ہر قسم کے کلام سے سکوت سے موصوف کیا جاسکتا ہے؟

۲۔ یا پھر اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے متکلم ہیں؛ اور اسے بعض اشیاء سے سکوت سے موصوف کیا جاسکتا ہے؟

یہ دونوں قول ابو بکر عبدالعزیز اور ابو عبداللہ بن حامد اور دیگر نے ذکر کئے ہیں۔ ان کے اکثر ائمہ اور جمہور کا عقیدہ

ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے متکلم ہے؛ اور اسے بعض اشیاء سے سکوت سے موصوف کیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان گرامی القدر ہے:

((الحلال ما أحله الله فِی کِتابِهِ ، والحرام ما حرّمه الله فِی کِتابِهِ ، وما سکت عنه فهو مِما عفا عنه)) . ❶

''حلال وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال قرار دیا ہے، اور حرام وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہے، اور جس کے بارے میں چپ رہے وہ معاف ہے۔''

امام احمد رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ سلف فرماتے ہیں: ''بیشک اللہ تعالیٰ آواز کے ساتھ کلام کرتے ہیں؛ لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ یہ معین آواز قدیم ہے۔''

❀❀❀❀

❶ فِی سننِ التِرمِذِی:۳/ ۱۳٤ کتاب اللِباسِ باب ما جاء فِی لبسِ الفِراءِ ، ونصه: سئِل رسول اللهِ ﷺ عنِ السمنِ والجبنِ والفِراءِ فقال: الحلال...... الحدِیث . وقال التِرمِذِی: وفِی البابِ عنِ المغِیرِ: هذا حدِیث غرِیب لا نعرِفه مرفوعا إِلا مِن هذا الوجهِ ، وروی سفیان وغیره عن سلیمان التیمِیِ عن أبِی عثمان قوله: وکأن الحدِیث الموقوف أصح ، والحدِیث أیضاً فِی: سننِ ابنِ ماجه:۲/ ۱۱۱۷ کتاب الأطعِمةِ ، باب أکلِ الجبنِ والسمنِ ، وذکره التبرِیزِی فِی مِشکاةِ المصابِیحِ ؛ ونقل الألبانِی کلام التِرمِذِیِ . اس کی سند میں ہارون ضعیف ہے، لیکن شاہد کی بنا پر یہ حدیث حسن ہے۔

مسئلہ عصمت انبیاء علیہم السلام

[رافضی مصنف کا خیال ہے کہ اہل سنت والجماعت عصمت انبیائے کرام علیہم السلام کے منکر ہیں؛ اس عقیدہ پر رد]

[اعتراض]: رافضی مضمون نگار لکھتا ہے: امامیہ واسماعیلیہ کے علاوہ دیگر اسلامی فرقوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انبیاء و ائمہ غیر معصوم ہیں۔ بنا بریں ان کے خیال میں ایک نبی کاذب و سارق اور سہو ونسیان کا مرتکب ہوسکتا ہے۔[نعوذ باللہ من ذلک]۔تو پھر عوام الناس کو ان کی باتوں پر کون سا اعتماد باقی رہ جائے گا؟ اور لوگ کیسے ان کی بات مانیں گے؟ نیز ان کے ماننے والوں پر انبیاء کی اتباع کیونکر واجب ہوگی جب کہ ان کے لیے غلط حکم دینے کو بھی جائز سمجھتے ہیں؟۔ نیز انہوں نے ائمہ کی تعداد مقرر نہیں کی؟ بلکہ ان کے نزدیک جو بھی قریش کی بیعت کرے اس کی امامت وخلافت درست ہوگی۔اور تمام مخلوق پر اس کی اطاعت واجب ہوجائے گی اگر چہ وہ مستور الحال ہی کیوں نہ ہو۔اور بھلے وہ کفر؛ فسق اور نفاق کی حدوں کو چھوتا ہو۔''[انتہیٰ کلام الرافضی]۔

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے:

پہلی بات:.......شیعہ مصنف نے جمہور کے متعلق جو ذکر کیا ہے کہ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کو معصوم نہیں مانتے؛ اور ان کے لیے خطاء؛ جھوٹ؛ اور چوری کے صادر ہونے کو جائز سمجھتے ہیں۔ہم کہتے ہیں کہ:''یہ مسلک جمہور پر عظیم افترا ہے۔ خوارج کے ایک گروہ کے سوا مسلمانوں کے تمام فرقے اس بات پر متفق ہیں کہ انبیاء اللہ تعالیٰ کے احکام امر ونہی پہنچانے میں معصوم تھے اور ان کی اطاعت واجب ہے۔اور اس پر بھی تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ جس چیز کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دے دیں اس کی تصدیق کرنا واجب ہوجاتی ہے۔

جمہور کے نزدیک انبیاء سے صغائر کا صدور ممکن ہے تاہم وہ صغائر پر قائم نہیں رہتے۔

انبیائے کرام علیہم السلام جس بات کی خبر دیں؛ باجماع مسلمین اس کی تصدیق کرنا واجب ہوتی ہے۔اور جس چیز کا حکم دیں اور جس چیز سے منع کریں اس میں ان کا حکم ماننا واجب ہوجاتا ہے۔اس پر تمام مسلمان فرقوں کا اتفاق ہے۔سوائے خوارج کے ایک گروہ کے۔وہ کہتے ہیں:''نبی اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچانے میں معصوم ہوتا ہے؛ اپنی طرف سے حکم دینے اور منع کرنے میں معصوم نہیں ہوتا۔اہل سنت والجماعت کا اس فرقہ کے گمراہ ہونے پر اتفاق ہے۔

ہم اس سے پہلے کئی بار ذکر کرچکے ہیں کہ اگر مسلمانوں میں سے کچھ لوگ کوئی غلط بات کہہ دیں تو ان کی اس غلطی کی وجہ سے تمام مسلمانوں پر قدح وارد نہیں ہوگی۔اگر ایسا ہوتا تو پھر رافضیوں کی خطاؤں کی مسلمانوں کے دین میں عیب سمجھا جاتا۔تمام فرقوں اور گروہوں میں رافضیوں سے بڑھ کر جھوٹا اور خطاً کار فرقہ کوئی دوسرا نہیں۔مگر اس کے باوجود اس سے

مسلمانوں پر کچھ ضرر نہیں آتا۔ ایسے ہی اگر رافضیوں کے علاوہ کوئی دوسرا خطا کار بھی ہو تو اس سے مسلمانوں کے دین میں کچھ فرق نہیں آتا۔ اکثر لوگ -انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے- کبیرہ گناہ کو جائز نہیں سمجھتے ۔ جمہور مسلمین جو کہ صغیرہ گناہ کے صدور کو جائز سمجھتے ہیں؛ وہ کہتے ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو ان غلطیوں پر مستمر نہیں رہنے دیا جاتا۔ [فوراً اللہ تعالیٰ اس پر آگاہ کردیتے ہیں] ۔ نیز توبہ کرنے کی وجہ سے انہیں پہلی منزلت سے زیادہ عالیشان اور بڑی منزلت نصیب ہوتی۔ جیسا کہ پہلے بیان گزر چکا ہے۔

خلاصہ کلام ! مسلمانوں میں کوئی ایک بھی یہ نہیں کہتا کہ: ''خطأ کے جواز کے ساتھ ان امور میں رسولوں کی اطاعت واجب ہے۔ بلکہ سب کا اتفاق ہے کہ صرف صحیح حکم میں ہی رسول کی اطاعت واجب ہے۔ پس رافضی کا یہ کہنا: ''ان کے ماننے والوں پر انبیاء کی اتباع کیونکر واجب ہوگی جب کہ ان کے لیے غلط حکم دینے کو بھی جائز سمجھتے ہیں۔'' امت میں سے کسی پر لازم نہیں آتا۔ [اور نہ ہی کسی ایک کا یہ عقیدہ ہے۔]

اجتہادی مسائل میں انبیاء کرام علیہم السلام سے چوک ہوجانے کے مسئلہ میں لوگوں کے دو معروف قول ہیں:

۱۔ ان سب کا اتفاق ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو خطا پر باقی نہیں رہنے دیا جاتا۔

۲۔ انبیا کرام علیہم السلام کی اطاعت ان امور میں ہوگی جن پر انہیں باقی رہنے دیا جائے ؛ ان امور میں نہیں ہوگی جن میں تبدیلی کردی جائے یا جن امور سے منع کردیا جائے ؛ اوران امور میں بھی نہیں جن میں اطاعت کرنے کا حکم نہیں ملا۔

البتہ عصمت ائمہ کے بارے میں شیعہ مضمون نگار کا بیان درست ہے؛ اسماعیلیہ اور امامیہ کے علاوہ کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔ اوراس کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ امامیہ واسماعیلیہ کے سوا مسلمانوں کا کوئی بھی فرقہ ائمہ کو معصوم قرار نہیں دیتا۔ اس دعویٰ عصمت کے بے بنیاد ہونے پر آپ کے لیے اتنی ہی گواہی کافی ہے کہ منافقین اور ملحدین؛ جن کے بڑے شیوخ یہود و نصاریٰ اور مشرکین سے بڑے کافر ہیں؛ان کے علاوہ کسی نے بھی اس مسئلہ میں ان کا ساتھ نہیں دیا۔ یہ رافضیوں کی فطرت ثانیہ ہے کہ وہ ہمیشہ سے اقوال و افعال؛ موالات اور قتال میں مسلمانوں کی جماعت کو چھوڑ کر یہود و نصاری اور مشرکین سے جا ملتے ہیں۔

کیا اس قوم سے بڑھ کر بھی کوئی گمراہ ہوگا جو مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین سے تو نفرت اور دشمنی کرتے ہیں، مگر یہود و نصاریٰ اور منافقین سے محبت کرتے اور دوستی رکھتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ وَیَحْلِفُوْنَ عَلَی الْكَذِبِ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ○ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ○ اِتَّخَذُوْا اَیْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ○ لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَا اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ○ یَوْمَ یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا فَیَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا یَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَیَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰی شَیْءٍ اَلَا اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ○

اسۡتَحۡوَذَ عَلَیۡهِمُ الشَّیۡطَانُ فَاَنۡسَاهُمۡ ذِکۡرَ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ حِزۡبُ الشَّیۡطَانِ اَلَا اِنَّ حِزۡبَ الشَّیۡطَانِ هُمُ الۡخَاسِرُوۡنَ o اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحَادُّوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ اُولٰٓئِكَ فِی الۡاَذَلِّیۡنَ o کَتَبَ اللّٰهُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیۡ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیۡزٌ o لَا تَجِدُ قَوۡمًا یُّؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ یُوَآدُّوۡنَ مَنۡ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَلَوۡ کَانُوۡۤا اٰبَآءَهُمۡ اَوۡ اَبۡنَآءَهُمۡ اَوۡ اِخۡوَانَهُمۡ اَوۡ عَشِیۡرَتَهُمۡ اُولٰٓئِكَ کَتَبَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمُ الۡاِیۡمَانَ وَاَیَّدَهُمۡ بِرُوۡحٍ مِّنۡهُ وَیُدۡخِلُهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا رَضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ اُولٰٓئِكَ حِزۡبُ اللّٰهِ اَلَاۤ اِنَّ حِزۡبَ اللّٰهِ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴾ (المجادلة ١٤ ـ ٢٢)

’’کیا آپ نے ان لوگوں کونہیں دیکھا جنھوں نے ان لوگوں کو دوست بنا لیا جن پر اللہ غصے ہو گیا، وہ نہ تم سے ہیں اور نہ ان سے اور وہ جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے بہت سخت عذاب تیار کیا ہے، بے شک یہ لوگ جو کچھ کرتے رہے ہیں، وہ بہت برا ہے۔ انھوں نے اپنی قسموں کو ایک طرح کی ڈھال بنا لیا، پس انھوں نے اللہ کی راہ سے روکا، سو ان کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔ ان کے اموال اللہ کے مقابلے میں ہرگز ان کے کسی کام نہ آئیں گے اور نہ ہی ان کی اولاد کام آئے گی۔ یہ لوگ آگ میں جانے والے ہیں، اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ جس دن اللہ ان سب کو اٹھائے گا تو وہ اس کے سامنے قسمیں کھائیں گے جس طرح تمھارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں اور گمان کریں گے کہ بے شک وہ کسی چیز پر (قائم) ہیں، سن لو! یقیناً وہی اصل جھوٹے ہیں۔ شیطان ان پر غالب آ گیا، سو اس نے انھیں اللہ کی یاد بھلا دی، یہ لوگ شیطان کا گروہ ہیں۔ سن لو! یقیناً شیطان کا گروہ ہی وہ لوگ ہیں جو خسارہ اٹھانے والے ہیں۔ بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہی سب سے زیادہ ذلیل ہونے والوں میں سے ہیں۔ اللہ نے لکھ دیا ہے کہ ضرور بالضرور میں غالب رہوں گا اور میرے رسول، یقیناً اللہ بڑی قوت والا، سب پر غالب ہے۔ آپ ان لوگوں کو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نہیں پائیں گے کہ وہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہوں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی، خواہ وہ ان کے باپ ہوں، یا ان کے بیٹے، یا ان کے بھائی، یا ان کے اہل خاندان۔ یہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اس نے ایمان لکھ دیا ہے اور انھیں اپنی طرف سے ایک روح کے ساتھ قوت بخشی ہے اور انھیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے۔ یہ لوگ اللہ کا گروہ ہیں، یاد رکھو! یقیناً اللہ کا گروہ ہی کامیاب ہونے والے ہیں۔‘‘

یہ آیات منافقین کے متعلق نازل ہوئیں۔ منافقین کی تعداد رافضیوں سے زیادہ کسی دوسرے گروہ میں نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ روافض میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس میں نفاق کا ایک شعبہ نہ پایا جاتا ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''جس شخص میں یہ چاروں خصلتیں جمع ہو جائیں تو وہ خالص منافق ہے۔اور جس میں ان میں سے کوئی ایک خصلت پائی جائے تو سمجھ لو کہ اس میں منافق کی ایک خصلت پیدا ہوگئی جب تک کہ اس کو چھوڑ نہ دے: جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔جب عہد کرے تو توڑ ڈالے۔جب اسے امانت دی جائے تو خیانت کرے اور جب جھگڑا کرے تو آپے سے باہر ہو جائے۔'' ❶

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿تَرٰی کَثِیْرًا مِّنْهُمْ یَتَوَلَّوْنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَ فِی الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَo وَ لَوْ کَانُوْا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ النَّبِیِّ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِیَآءَ وَ لٰکِنَّ کَثِیْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ﴾ (المائدة ۸۰۔۸۱)

''ان میں سے بہت سے لوگوں کو آپ دیکھیں گے کہ وہ کافروں سے دوستیاں کرتے ہیں، جو کچھ انہوں نے اپنے لئے آگے بھیج رکھا ہے وہ بہت برا ہے کہ اللہ ان سے ناراض ہوا اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے۔اگر انہیں اللہ تعالیٰ پر اور نبی پر؛ اور جو نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان ہوتا تو یہ کفار سے دوستیاں نہ کرتے، لیکن ان میں اکثر لوگ فاسق ہیں۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ کَانُوْا یَعْتَدُوْنَo کَانُوْا لَا یَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْکَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَo تَرٰی کَثِیْرًا مِّنْهُمْ یَتَوَلَّوْنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا....﴾ [المائدة ۷۸۔۸۰]۔

بنی اسرائیل کے کافروں پر حضرت داد علیہ السلام اور حضرت عیسی بن مریم علیہ السلام کی زبانی لعنت کی گئی اس وجہ سے کہ وہ نافرمانیاں کرتے تھے اور حد سے آگے بڑھ جاتے تھے۔آپس میں ایک دوسرے کو برے کاموں سے جو وہ کرتے تھے روکتے نہ تھے جو کچھ بھی کرتے تھے یقیناً بہت برا تھا۔تو ان میں سے بہت سوں کو دیکھے گا وہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہیں جنھوں نے کفر کیا......''

غالب طور پر رافضی برائی سے منع نہیں کرتے۔ بلکہ شیعہ کے علاقوں میں سب سے زیادہ جور وستم، ظلم اور فحاشی کا ارتکاب ہوتا ہے۔اور یہ ان کفار سے دوستی لگاتے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا ہے۔پس یہ لوگ نہ ہی مسلمانوں کے ساتھ ہوتے ہیں اور نہ ہی کفار کے ساتھ۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

❶ صحیح مسلم:کتاب ایمان :باب منافق کی خصلتوں......:ح ۲۱۲]البخارِي ۱/ ۱۲ ؛ کتاب الإِیمانِ باب علامِة النِفاقِ ٤/ ۱۰۲؛ کتاب الجِزیةِ والموادعةِ ، باب إِثمِ من عاهد ثم غدر ، سننِ أبِی داود ٤/ ۳۰۵ ؛ کتاب السنةِ ، باب الدلِیلِ علی زِیادةِ الإِیمانِ ونقصانِهِ .

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ﴾

(المجادلة ١٤)

''کیا آپ نے ان لوگوں کونہیں دیکھا؟ جنہوں نے ان سے دوستی کی ان پر اللہ غضبناک ہو چکا ہے نہ یہ(منافق) تمہارے ہی ہیں نہ ان کے ہیں۔''

یہی وجہ ہے کہ جمہور مسلمین انہیں ایک دوسری قوم شمار کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب ان کے ساتھ ان کے دیار میں جبال بلاد ساحل شام میں جنگ کی گئی؛ کیونکہ یہ [وہاں سے گزرنے والے] مسلمانوں کا خون بہاتے تھے' اوران کا مال و اسباب چھین لیتے؛ راہزنی کی وارداتیں کرتے؛ اوراسے وہ اپنے مذہب میں حلال سمجھتے تھے۔ترکمان کے ایک گروہ نے ان سے جنگ کی ؛ تو یہ لوگ دہائیاں دینے لگے کہ ہم مسلمان ہیں ۔مگر انہوں نے کہا: نہیں تم کوئی اور قوم ہو۔ان لوگوں نے اپنے دلوں کی سلامتی کی وجہ سے سمجھ لیا تھا کہ یہ لوگ مسلمانوں سے جداگانہ طور واطوار رکھتے ہیں اس لیے یہ مسلمان نہیں ؛ بلکہ کوئی اور قوم ہیں ۔[بھلے یہ لوگ اپنی زبانی اسلام اور مسلمان ہونے کا دعوی کرتے رہیں] (کیونکہ ان کی پہچان ہی جدا ہے) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

﴿ وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ (المجادلة : ١٤)

''باوجود علم کے پھر بھی جھوٹی قسمیں کھا رہے ہیں۔''

رافضیوں کا یہی حال ہے۔ایسی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

﴿اِتَّخَذُوْا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ .... لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ﴾ (المجادلة١٦ ـ ٢٢)

''انھوں نے اپنی قسموں کو ایک ڈھال بنا لیا، پس انھوں نے اللہ کی راہ سے روکا ......آپ ان لوگوں کو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں،نہیں پائیں گے کہ وہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہوں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی۔''

ان میں ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں ہے جو اپنے دل کی گہرائیوں سے مسلمانوں سے بڑھ کر کفار سے محبت و دوستی رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جب مشرق کی طرف سے ترک کفار کا خروج ہوا ؛ اورانہوں نے بلاد خراسان عراق' شام'اور الجزیرہ وغیرہ میں مسلمانوں کا خون بہایا' اورانہیں قتل کیا ۔تو اس موقع پر رافضی مسلمانوں کے خلاف تاتاریوں کی مدد کر رہے تھے۔حکومت بغداد کا وزیر ابن علقمی [شیعہ] اوراس جیسے دوسرے لوگ اس وقت میں مسلمانوں کے خلاف کفار کی مدد کرنے والے سب سے بڑے اور اہم ترین عنصر تھے۔ایسے ہی جب عیسائیوں نے بلاد شام میں مسلمانوں سے جنگ چھیڑی تو اس وقت رافضی ان کے سب سے بڑے مددگار تھے۔اور جب یہودیوں نے بلاد شام میں یہودی سلطنت قائم کرنے کی کوشش کی تو اس وقت رافضی ان کے سب سے بڑے حمایتی اور مددگار تھے۔رافضیوں کا ہمیشہ کے لیے وطیرہ رہا

ہے کہ وہ مسلمانوں کو قتل کرنے کے لیے یہود و نصاری اور مشرکین کا ساتھ دیتے آئے ہیں۔

[عصمت ائمہ کے بے دلیل دعویٰ]

باقی شیعہ مصنف نے جو ائمہ کے معصوم ہونے کا دعوی کیا ہے اور اس پر کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ سوائے اس کے کہ روافض کا یہ قول ہے'' یہ عالم ارضی ائمہ کے وجود سے کبھی خالی نہیں رہتا، کیونکہ کائنات ارضی کی بھلائی اور ان کے ساتھ مہربانی اسی میں مضمر ہے۔''

ہم کہتے ہیں کہ: یہ بات یقینی طور پر معلوم ہے کہ شیعہ جس امام منتظر کے لیے زحمت انتظار میں ہیں اس کے وجود سے دنیا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور نہ ہی کوئی مصلحت حاصل ہوئی۔ خواہ ہماری طرح انہیں مردہ [معدوم] تصور کیا جائے ؛ جیسے جمہور کا مسلک ہے' یا شیعہ کی طرح انہیں زندہ قرار دیں۔ اسی طرح امام غائب کے اجداد کے وجود سے بھی دنیا کو کوئی [ایسا] فائدہ حاصل نہیں ہوا، جس طرح یہ خاک دان ارضی سرور کائنات ﷺ کے وجود مسعود سے ہجرت کے بعد نفع اندوز ہوا تھا۔ اس لیے کہ آپ اس وقت مؤمنین کے امام تھے جن کی اطاعت واجب تھی۔ اسی وجہ سے سعادت حاصل ہوئی۔ سرور کائنات ﷺ کے عہد سعادت مہد کے بعد دعوی عصمت کی سعادت صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئی۔

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے زمانہ میں مسلمانوں کو جو سکون و آرام نصیب ہوا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پر آشوب و تفرقہ دور خلافت کو اس سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ امامیہ فرقہ والے جن ائمہ کے لیے معصوم ہونے کا دعوی کرتے ہیں ان میں سے سوائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے؛ کسی بھی امام کی بیعت اہل حل وعقد نے نہیں کی۔ اور آپ کے عہد مسعود میں مکلفین کے لیے جو دینی و دنیاوی لطف و مہربانی اور مصلحتیں حاصل ہوئیں' وہ اس سے بہت کم تھیں جو آپ سے پہلے تین خلفاء کے دور میں حاصل ہوئیں۔ یہ بات ضرورت کے تحت سبھی لوگ جانتے ہیں کہ امامیہ فرقہ والے اپنے ائمہ معصومین کے ذریعہ جس لطف و مہربانی کا دعوی کرتے ہیں وہ قطعی طور پر باطل ہیں۔

یہ تو بالکل ویسے ہی ہے جیسے کچھ لوگ لبنان کے پہاڑوں میں روپوش کسی مہدی پر ایمان رکھتے ہیں' اور اس کے ذریعہ ہدایت حاصل ہونے کے دعویدار ہیں۔ ایسے ہی دعوے کچھ اور پہاڑوں کے متعلق بھی کیے جاتے ہیں؛ جیسے: دمشق میں جبل قاسیون؛ اور مغارة الدم ؛ مصر میں جبل فتح ؛ اور اس طرح کے دیگر پہاڑ اور غار۔ ایسے مقامات پر جنات بسیرا کرتے ہیں۔ اور وہاں پر شیاطین بھی ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار یہ شیاطین اور جنات لوگوں کو نظر بھی آجاتے ہیں؛ جب کہ اکثر اوقات آنکھوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ جاہل لوگ انہیں [نیک] انسان گمان کرنے لگتے ہیں ؛ حالانکہ وہ جنات ہوتے ہیں۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا﴾ (الجن: ٦)

''بیشک چند انسان بعض جنات سے پناہ طلب کیا کرتے تھے جس سے جنات اپنی سرکشی میں اور بڑھ گئے۔''

یہ لوگ ان رجال غیب پر اور اپنے آپ کو ان کی طرف منسوب کرنے والے گمراہ فرقوں کے مشائخ پر ایمان رکھتے

ہیں۔مگر وہ مشائخ جو کہ رجال غیب پر ایمان رکھتے ہیں ؛ ان کی وجہ سے اتنا فتنہ وفساد پیدا نہیں ہوتا جتنا ان لوگوں کی وجہ سے ہوتا ہے جو امام معصوم کی طرف دعوت دیتے ہیں۔اس امام کے ماننے والے ہر طرح سے کثرت کے ساتھ فتنہ وفساد کا شکار ہوتے ہیں۔اس لیے کہ یہ لوگ ایسے امام معصوم کی طرف دعوت دیتے ہیں [جس امام کی کوئی حقیقت نہیں]۔اور ان کے ہاں کوئی صاحب سیف وقوت حکمران نہیں پایا جاتا جس سے مدد حاصل کریں [اور وہ ان کی اصلاح کے کام کرے]؛ سوائے کچھ کفار و فجار اور فاسقین اور منافقین اور جہلاء کے۔ان کے سردار اور بڑے ان اصناف سے باہر نہیں ہو سکتے۔

اسماعیلیہ فرقہ کے لوگ ان میں سب سے زیادہ برے ہیں۔وہ [ظاہر میں] تو امام معصوم کی طرف دعوت دیتے ہیں' مگر حقیقت میں ان کی دعوت فاسقین اور منافقین کی طرف ہوتی ہے جو اپنے باطن میں یہود و نصاری سے بڑے کافر ہوتے ہیں۔پس امام معصوم کی دعوت دینے والے حقیقت میں حاکم معصوم نہیں بلکہ ایسے کافر حکمرانوں کی طرف بلاتے ہیں جو کفر و ظلم میں انتہاء کو پہنچے ہوئے ہیں۔یہ مسئلہ اتنا مشہور ہے کہ لوگ اپنے تجربات کی روشنی میں اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ﴾

''اے ایمان والو! فرمانبرداری کرو اللہ تعالیٰ کی اور فرمانبرداری کرو (رسول اللہ علیہ وسلم) کی اور تم میں سے اختیار والوں کی۔ پھر اگر کسی چیز پر اختلاف کرو تو اسے لوٹا، اللہ تعالیٰ کی طرف اور رسول ﷺ کی طرف، اگر تمہیں اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہے یہ بہت بہتر ہے اور باعتبار انجام کے بہت اچھا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ جب تنازع پیدا ہو تو اللہ و رسول کی طرف رجوع کیا جائے اگر مسلمانوں میں رسول ﷺ کے سوا کوئی اور بھی معصوم ہوتا تو اس کی طرف مراجعت کرنے کا حکم صادر کیا جانا ضروری تھا۔پس قرآنی آیات کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کوئی دوسرا معصوم نہیں ہے۔

فصل:......ائمہ کی تعداد کا عدم تعین

[اعتراض]: شیعہ مصنف کہتا ہے:''انہوں نے ائمہ کی تعداد مقرر نہیں کی۔''

[جواب]: اس نے یہ حق بات کہی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (النساء: ۵۹)

''اے ایمان والو! فرمانبرداری کرو اللہ کی اور فرمانبرداری کرو رسول اللہ ﷺ کی اور تم میں سے اختیار والوں کی۔''

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ان اختیار والے ائمہ کی تعداد متعین نہیں کی۔ ایسے ہی نبی کریم ﷺ سے جو احادیث مبارکہ صحیح اسناد اور شہرت کے ساتھ ثابت شدہ ہیں ؛ ان میں بھی ائمہ [حکام] کی تعداد متعین نہیں کی گئی۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے میرے محبّ مکرم آنحضرت ﷺ نے وصیت فرمائی تھی :

''امیر کی بات سنتے رہو اور اطاعت کرتے رہو اگر چہ وہ مقطوع الاعضاء حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو۔'' ❶

صحیح مسلم میں ام الحصین رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے حجۃ الوداع کے موقع پر منی میں یا میدان عرفات میں رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

''اطاعت کرتے رہو، اگر چہ تم پر ایک سیاہ فام کان کٹے حبشی غلام کو امیر کیوں نہ مقرر کر دیا جائے، بشرطیکہ وہ کتاب اللہ کی روشنی میں تمہاری قیادت کر رہا ہو۔'' ❷

بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''سنو اور اطاعت کرو اگر چہ تم پر حبشی غلام حاکم ہی کیوں نہ ہو جس کا سر کشمش کی طرح (یعنی چھوٹا سا) ہو۔'' ❸

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''یہ معاملہ (یعنی حکومت) قریش میں ہی رہے گا، جب تک کہ لوگوں میں سے دو آدمی بھی باقی رہیں گے۔''

جب کہ بخاری کے الفاظ ہیں: ''جب تک کہ ان میں سے دو آدمی بھی باقی رہیں گے۔'' ❹

صحیحین میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے چلا۔ اور میرے ساتھ میرے والد تھے۔ تو میں نے آپ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

''لوگوں کا معاملہ یعنی خلافت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک بارہ خلفاء ان کے حاکم بنیں گے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی کلمہ ارشاد فرمایا؛ جسے میں نہ سمجھ سکا؛ یا مجھ پر مخفی رہا۔ تو میں نے اپنے باپ سے پوچھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا؟ تو انہوں نے کہا: [فرمایا ہے]: سب خلفاء قریش کے خاندان سے ہوں گے۔'' ❺

صحیحین میں ہی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

---

❶ صحیح مسلم۔ باب وجوب طاعة الامراء فی غیر معصیة (ح: ۱۸۳٦)

❷ مسلِم: ۲/ ۹٤٤ ؛ کتاب الحجِ، باب استِحبابِ رمیِ جمرةِ العقبةِ یوم النحرِ راکِبا: ۳/ ۱٤٦۸ کتاب الإمارةِ، باب وجوبِ طاعةِ الأمراءِ فِی غیرِ معصِیة . سننِ الترمِذِیِ: ۳/ ۱۲۵ ؛ کتاب الجِهادِ باب ما جاء فِی طاعةِ الإمامِ، سننِ ابنِ ماجه: ۲/ ۹۵۵ کتاب الجِهادِ باب طاعةِ الإمامِ، المسندِ ط الحلبِی: ٤/ ۷۰، ۵/ ۳۸۱ .

❸ صحیح مسلم۔ أیضاً (ح: ۱۸۳۸)

❹ صحیح بخاری: حکام کا بیان : امراء قریش میں سے ہوں گے۔ ح ۲۰۲٦۔

❺ صحیح مسلم: امارت اور خلافت کا بیان: لوگ قریش کے تابع ہیں اور خلافت قریش میں ہونے کے بیان میں: ۲۱۳۔

''لوگوں کا معاملہ یعنی خلافت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک ان میں بارہ خلفاء ان کے حاکم رہیں گے۔'' ❶

صحیحین میں حضرت عامر بن سعد ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اپنے غلام نافع کی ذریعہ جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ آپ مجھے کسی ایسی حدیث کی خبر دیں جو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو۔'' توانہوں نے مجھے جواباً لکھا کہ:

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جمعہ کی شام کو جس دن ماعز اسلمی کو رجم کیا گیا سنا:'' دین ہمیشہ قائم وباقی رہے گا یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے یا تم پر بارہ خلفاء حاکم ہو جائیں اور وہ سب کے سب قریش سے ہوں گے۔'' ❷

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے کئی احادیث ذکر کی ہیں؛ مثلاً: یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لوگ اس معاملہ میں یعنی خلافت وحکومت میں قریش کے تابع ہیں مسلمان قریشی مسلمانوں کے تابع ہیں اور کافر قریشی کافروں کے تابع ہیں۔'' ❸

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''لوگ بھلائی اور برائی میں قریش کی پیروی کرنے والے ہیں۔'' ❹

صحیح بخاری میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ آپ فرماتے ہیں:

''میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ ﷺ فرماتے تھے:'' خلافت قریش میں رہے گی جب تک وہ دین کو درست رکھیں گے جو شخص بھی ان سے دشمنی کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو اوندھے منہ گرا دے گا۔'' [صحیح بخاری: ح ۷۲۷]

فصل:......قریش کی امامت وخلافت

[اعتــــراض]: [شیعہ مصنف اہل سنت کا قول نقل کرتے ہوئے کہتا ہے]:'' جو بھی قریش کی بیعت کرے' اس کی امامت وخلافت منعقد ہو جاتی ہے' اور تمام لوگوں پر اس کی اطاعت کرنا واجب ہے۔ حتی کہ اگرچہ وہ مستور الحال ہو۔ بھلے وہ انتہائی درجہ کے فسق وکفر اور نفاق میں مبتلا ہو''۔ [انتہی کلام الرافضی]۔

---

❶ صحیح مسلم: امارت اور خلافت کا بیان: أیضاً ۲۱۲۔ ❷ صحیح مسلم: أیضاً؛ ۲۱٤۔

❸ البخاري: ٤/ ۱۷۸ کتاب المناقب، باب قول الله تعالی: یا أیها الناس إنا خلقناکم من ذکر وأنثی، مسلم: ۳/ ۱٤٥۱ کتاب الإمارة، باب الناس تبع لقریش، المسند ط المعارف: ۱۳/ ۳۰، رقم: ۷۳۰٤۔ صحیح مسلم: امارت اور خلافت کا بیان: أیضاً ۲۰٥۔

❹ صحیح مسلم: امارت اور خلافت کا بیان: أیضاً؛ ۲۰٦۔

[جواب]: اس اعتراض کا جواب کئی نکات پر مشتمل ہے:

پہلی بات:...... یہ اہل سنت والجماعت کا قول [عقیدہ] نہیں ہے۔ اہل سنت کا مذہب یہ نہیں ہے کہ صرف کسی ایک قریشی کے بیعت کرنے سے بیعت منعقد ہو جاتی ہے اور تمام لوگوں پر اس کی اطاعت واجب ہو جاتی ہے۔ یہ بات اگر چہ بعض متکلمین [اہل کلام] نے کہی ہے؛ لیکن اس کا ائمہ اہل سنت والجماعت کے عقیدہ سے کوئی تعلق نہیں؛ بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے:

''جو کوئی بھی مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی کی بیعت کرے۔ تو نہ ہی اس بیعت کرنے والی کی بیعت کی جائے اور نہ ہی جس کی بیعت کی گئی ہے؛ اس کی بیعت کی جائے؛ بلکہ ان دونوں کو قتل کر دیا جائے۔'' [رواہ البخاری]

دوسری بات: اہل سنت والجماعت حاکم کے ہر حکم کو واجب الاطاعت نہیں سمجھتے؛ بلکہ حاکم کی اطاعت کو صرف ان امور میں ہی جائز سمجھتے ہیں جن میں اطاعت کرنے کی اجازت شریعت نے دی ہے۔ پس اہل سنت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت کو جائز نہیں سمجھتے؛ بھلے وہ عادل [زاہد و عابد] حکمران ہی کیوں نہ ہو۔ جب وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم دے گا تو اس کی اطاعت کی جائے گی۔ جیسے کہ: نماز قائم کرنے کا حکم دے؛ زکوٰۃ ادا کرنے؛ سچائی؛ عدل؛ حج؛ جہاد فی سبیل اللہ کا حکم دے۔ اس صورت میں لوگ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں۔ اگر کوئی کافر اور فاسق کسی ایسے کام کا حکم دے جو حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہو؛ تو پھر اس صورت میں اس کے فسق کی وجہ سے اس کی اطاعت کا وجوب ساقط نہیں ہوگا۔ جیسے اگر وہ حق بات کہے تو کسی کے لیے اس کی بات کو جھٹلانا جائز نہیں۔ اور نہ ہی اتباع حق کا وجوب اس وجہ سے ساقط ہوگا کہ اس کلمہ کا کہنے والا فاسق ہے۔ پس اس سے ظاہر ہوگیا کہ اہل سنت والجماعت مطلق طور پر کسی حاکم کی اطاعت نہیں کرتے؛ بلکہ صرف ان امور میں اطاعت کرتے ہیں جو اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی اطاعت کو متضمن ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (النساء: ۵۹)

''اے ایمان والو! فرمانبرداری کرو اللہ کی اور فرمانبرداری کرو رسول اللہ ﷺ کی اور تم میں سے اختیار والوں کی۔''

یہاں پر مطلق اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم ہے۔ اور پھر اطاعت رسول اللہ ﷺ کا حکم ہے؛ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم دیتے ہیں؛ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء: ۸۰)

''جس نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی یقیناً اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔''

پھر حکمرانوں اور اولیاء الامور کی اطاعت کو بھی اسی ضمن میں شامل کیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ اس کے علاوہ کسی تیسری طاعت کا کوئی ذکر نہیں۔ اس لیے کہ حاکم کی اطاعت مطلق طور پر نہیں ہوگی۔ بلکہ صرف نیکی اور

بھلائی کے کاموں میں اس کی اطاعت ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''بیشک اطاعت نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ہوگی۔'' ❶

نیز ارشاد فرمایا: ''اللہ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہیں ہوگی۔'' ❷

اور ارشاد فرمایا: ''خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی کوئی اطاعت نہیں ہوگی۔'' ❸

مزید فرمایا: ''جو کوئی تمہیں اللہ کی نافرمانی کا حکم دے؛ تو اس کی بات نہ مانو۔'' ❹

ان رافضیوں کا قول جسے یہ شیعان علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ: ''غیر رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ان کے ہر حکم میں مطلق طور پر واجب ہے؛ یہ شیعان عثمان رضی اللہ عنہ اہل شام کی طرف منسوب قول سے انتہائی برا اور فاسد ہے جو کہتے ہیں: ولی الامر کی اطاعت مطلقاً واجب ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ تو قوت وشوکت والے کی اطاعت کرتے ہیں جو زندہ اور موجود ہوں۔ جب کہ رافضی معدوم ومفقود امام معصوم کی اطاعت کو واجب ٹھہراتے ہیں۔ نیز یہ لوگ اپنے ائمہ کے معصوم ہونے کا دعوی بھی نہیں کرتے جیسے شیعہ اپنے ائمہ کی عصمت کا دعوی کرتے ہیں۔ بلکہ یہ لوگ اپنے ائمہ کو خلفاء راشدین اور عادل حکمران قرار دیتے ہیں؛ جن کی ایسے امور میں اطاعت کی جاسکتی ہے جن کی حقیقت منکشف نہ ہو۔ اور کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ ان کی نیکیاں قبول کرنے والا اور گناہوں کو معاف کرنے والا ہے۔ یہ بات اس دعوی کی نسبت آسان ہے جو لوگ کہتے ہیں کہ:

''امام معصوم ہوتا ہے اس سے کوئی غلطی نہیں ہوسکتی۔''

پس اس سے ظاہر ہوگیا کہ شیعان عثمان رضی اللہ عنہ میں سے جن لوگوں کو ناصبیت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے؛ اگرچہ ان

---

❶ البخاری ٥/ ١٦١؛ کتاب المغازی، باب بعثِ النبیِ ﷺ خالد بن الولیدِ لِ بنی خزیم: ٩/ ٦٣ ، کتاب الحاکمِ، باب وجوبِ طاعةِ الأمرا فِی غیرِ معصِیة: ٩/ ٨٨ کتاب الآحادِ، باب ما جاء فِی إجازةِ خبرِ الواحِدِ ـ مسلِم: ١٤٦٩،٣ ، کتاب الِإمارةِ، باب وجوبِ طاعةِ الأمراءِ فِی غیرِ معصِیة۔ سننِ أبِی داود:٣ ، کتاب الجِهادِ، باب: فِی الطاعةِ۔ سننِ النسائِی:٧/ ١٤٢ ، کتاب البیعِ، جزاء من أمر بِمعصِیة فأطاع .

❷ المسند: ٤/ ٤٢٦ ورِجاله ثِقات رِجال الشیخینِ غیر أبِی مِرای هذا، ذکره ابن حبان فِی الثِقاتِ، ووردہ الهیثمِی فِی جامِعِ الزوائِدِ:٥/ ٢٢٦ وقال: رواه البزار والطبرانِی فِی الکبِیرِ والأوسطِ ورِجال البزارِ رِجال الصحِیحِ .

❸ المسند ٥/ ٦٦۔ أورده التِبریزِی فِی مِشکاةِ المصابِیحِ:٢/ ٣٢٣ عنِ النواسِ بنِ سمعان، وقال: رواه فِی شرحِ السنةِ، وذکر الألبانِی فِی تعلِیقِهِ أنه حدِیث صحِیح، وجاء فِی المسندِ ط، الحلبِی: ٥/ ٦٦ ، بِألفاظ مقارِب، وجاء بِمعناه فِی المسندِ، ط۔ الحلبِی: ٤/ ٤٣٢ ، ٥/ ٦٦ ، ٦٧۔ المستدرکِ: ٣/ ٤٤٣ وقال الحاکِم: هذا حدِیث صحِیح الاِسنادِ ولم یخرِجاه، وانظر سِلسِلة الأحادِیثِ الصحِیحة: ١/ ١٠٩ ، ١١١۔ الحدِیث ، رقم:١٧٩ .

❹ المسند ٣/ ٦٧۔ سننِ ابنِ ماجه:٢/ ٩٥٥ ، کتاب الجِهادِ، باب لا طاعة فِی معصِیةِ اللهِ، وفِی التعلِیقِ فِی الزوائِدِ:إِسناده صحِیح، وجاء الحدِیث فِی صحِیحِ الجامِعِ الصغِیرِ:٥/ ٢٥٩۔ وقال السیوطِی: أحمد وابن ماجه والحاکِم عن أبِی سعِید، وحسنه الألبانِی ولفظه: من أمرکم مِن الولاةِ بِمعصِیة فلا تطِیعوه .

سے بھی حق وعدل کا دامن کچھ نہ کچھ چھوٹ جاتا ہے' مگر ان کی نسبت رافضہ کا معاملہ زیادہ خطرناک ہے' وہ حق وعدل سے بہت زیادہ اور سخت خروج کرنے والے ہوتے ہیں۔ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ کتاب وسنت کے بالکل مطابق ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ حاکم یا ولی امر کی اطاعت صرف ان امور میں ہوگی جن میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہو۔ اگر وہ اللہ کی نافرمانی کا کوئی حکم دے تو اس کی کوئی اطاعت نہیں ہوگی۔

تیسری بات:......لوگوں نے فاسق اور جاہل حکمران [ولی امر کی اطاعت] کے متعلق [بذیل اقوال میں] اختلاف کیا ہے:

پہلا قول:......اگر وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم دے' تو اس کی اطاعت کی جائے گی؛ اوراس کے حکم کو نافذ کیا جائے گا اوراس کی قسم کو پورا کیا جائے گا؛ جب کہ وہ عدل وانصاف کے تقاضوں کے مطابق ہو۔

دوسرا قول:......کسی بات میں بھی اس کا حکم نہیں مانا جائے گا' اور نہ ہی اس کا حکم چلے گا اور نہ ہی اس کی قسم کو پورا کیا جائے گا۔

تیسرا قول :......امام اعظم یعنی حکمران اوراس کے فروع یعنی قاضی وغیرہ کے درمیان فرق کیا جائے گا۔ [یہ تین اقوال ہیں]

اہل سنت والجماعت کے ہاں سب سے ضعیف ترین قول اس کی تمام باتوں کا رد کرنا' حکم نہ ماننا اورقسم پوری نہ کرنا ہے۔ جب کہ صحیح ترین قول پہلا قول ہے۔یعنی جب اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم دے تو پھر اس کی بات مانی جائے گی۔ اس کا حکم تسلیم کیا جائے گا' اوراس کی قسم کو پورا کیا جائے گا۔ اس شرط کے ساتھ کہ جب اس کا حکم عدل پر مبنی ہو۔ یہاں تک کہ جاہل قاضی اورظالم انسان بھی اس کے حکم کو عدل وانصاف کے ساتھ نافذ کرے تو اس کی بات مانی جائے گی۔ یہ اکثر فقہاء کا قول ہے۔

تیسرا قول یہ تھا کہ:امام اعظم اور دوسروں کے درمیان فرق کیا جائے گا۔ اس لیے کہ حاکم کو فسق و فجور کی بنا پر اپنے عہدہ سے قتال اور فتنہ کے بغیر معزول کرنا ممکن نہیں۔ بخلاف قاضی یا گورنر وغیرہ کے ۔انہیں معزول کیا جانا ممکن ہے۔ یہ فرق بھی ضعیف ہے ۔اس لیے کہ جب گورنر وغیرہ کو اصحاب شوکت وقوت لوگوں نے مقرر کیا ہو تو اسے بھی فتنہ کے بغیر معزول کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ جب اسے معزول کرنے کی کوششوں میں اس کے اس عہدہ پر باقی رہنے سے زیادہ فساد کا اندیشہ ہو تو پھر اس صورت میں چھوٹے فساد کو ختم کرنے کے لیے بڑے فساد کو دعوت دینا کسی طرح بھی جائز نہیں ۔ یہی حال حکمران کا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اہل سنت والجماعت کے مذہب میں یہ مشہور ہے کہ: یہ لوگ حکمرانوں کے خلاف مسلح خروج اوران سے جنگ وقتال کو جائز نہیں سمجھتے ۔اگر چہ یہ حاکم ظالم ہی کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے مروی صحیح احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں ۔اس لیے کہ ان کے ساتھ جنگ وقتال کرنے میں جو فتنہ وفساد ہے' وہ ان کے ظلم پر خاموش رہنے کے

فتنہ وفساد سے بہت بڑھ کر ہے۔تو پھر اس صورت میں بڑے فتنہ وفساد سے بچنے کے لیے اس سے کم درجہ کے فتنہ وفساد کو قبول کیا جاسکتا ہے۔تاریخ میں یہ بات معلوم نہیں ہوسکی کہ حکمران کے خلاف بغاوت کے نتیجہ میں کوئی فائدہ حاصل ہوا ہو؛ بلکہ اس بغاوت کی وجہ سے پہلے فتنہ وفساد سے بڑا فساد پیدا ہوا جسے یہ لوگ ختم کرنا چاہتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر باغی اور ظالم کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا خواہ کیسے بھی ہو۔اور نہ ہی باغیوں سے جنگ شروع کرنے کا حکم دیا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدَاهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوْا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْءَ اِلٰى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآئَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ ﴾

(الحجرات : ۹)

''اگر مومنوں کی دو جماعتیں باہم برسر پیکار ہوں تو ان میں صلح کرا دیجئے اور اگر ایک گروہ دوسرے پر ظلم کرے؛ تو اس سے لڑو جو دوسرے پر ظلم کررہا ہو؛ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم پر لوٹ آئے۔اگر وہ اللہ کے حکم پر لوٹ آئے تو ان کے مابین عدل وانصاف کے ساتھ صلح کرا دو۔''

اللہ تعالیٰ نے ایک باغی جماعت سے بھی جنگ شروع کرنے کا حکم نہیں دیا تو پھر حکمران سے جنگ چھیڑنے کا حکم کیسے دیا جاسکتا ہے؟ صحیح مسلم میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'' عنقریب ایسے امرا ہوں گے جن کے خلاف شریعت اعمال کو تم پہچان لوگے اور بعض اعمال نہ پہچان سکو گے۔پس جس نے اس کے اعمال بد کو پہچان لیا وہ بری ہوگیا۔جو نہ پہچان سکا وہ محفوظ رہا۔لیکن جو ان امور پر خوش ہوا اور تابعداری کی [وہ ہلاک ہوا]۔صحابہ نے عرض کیا: کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہیں جب تک وہ نماز ادا کرتے رہیں۔''[صحیح مسلم: ح۳۰۳]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حکمرانوں کے ساتھ جنگ کرنے سے منع فرمایا ہے؛ حالانکہ آپ ہی خبر بھی دے رہے ہیں کہ تم لوگ ان میں برے امور دیکھو گے۔پس یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ حکمرانوں کے خلاف تلوار لیکر نکلنا جائز نہیں۔جیسا کہ بعض فرقے حکمرانوں سے برسر پیکار رہتے ہیں جیسے خوارج؛معتزلہ وغیرہ۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'' عنقریب میرے بعد حقوق تلف کئے جائیں گے اور ایسے امور پیش آئیں گے جنہیں تم ناپسند کرتے ہو۔ صحابہ نے عرض کیا:''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں سے انہیں حکم کیا دیتے ہیں؟ جو یہ زمانہ پائے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:'' تم پر کسی کا جو حق ہو وہ ادا کردو اور اپنے حقوق تم اللہ سے مانگتے رہنا۔''

[صحیح مسلم:ح۲۷۸]

اس حدیث مبارک میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ حکمران ظلم کریں گے اور برائیوں کے مرتکب ہوں

گے۔مگر اس کے باوجود آپ ہمیں حکم دے رہے ہیں کہ ہم حکمرانوں کا حق ادا کریں'اور اللہ سے اپنے حق کے لیے دعا کرتے رہیں۔ہمیں ہرگز یہ اجازت نہیں دی کہ ہم جنگ کر کے اپنا حق حاصل کریں۔اور نہ ہی اس بات کی رخصت دی ہے کہ ہم ان کا حق روک کر رکھیں۔[کیونکہ اس سے پھر فتنہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو آدمی اپنے امیر میں کوئی ایسی بات دیکھے جو اسے ناپسند ہو تو چاہیے کہ صبر کرے کیونکہ جو آدمی جماعت سے ایک بالشت بھر بھی جدا ہوا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔'' [صحیح مسلم:ح ۲۹۳]

دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا:

''جسے اپنے امیر کی کوئی بات ناپسند ہو تو چاہیے کہ اس پر صبر کرے کیونکہ لوگوں میں سے جو بھی سلطان کی اطاعت سے ایک بالشت بھی نکلا اور اسی پر اس کی موت واقع ہوگئی تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔''

[صحیح مسلم:ح ۲۹٤]

اس سے پہلے ایک حدیث میں یہ بیان بھی گزر چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''وہ [ایسے حکمران ہوں گے] جو میری سنتوں پر عمل نہیں کریں گے اور میری راہ پر نہیں چلیں گے۔تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! پھر ہمیں کیا حکم ہے؟ اگر ہم انہیں ایسے پائیں تو کیا کریں؟ آپ نے فرمایا:'' حکمران کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو' اگر وہ تمہاری پیٹھ ٹھونکے اور تمہارا مال چھین لے تب بھی اس کی بات سن اور اطاعت کر۔'' [صحیح مسلم:ح ۳/ ۱٤۷٦]

حکمران کے ظلم کے باوجود اس کی اطاعت گزاری کا یہ حکم ہے۔اس سے پہلے حدیث میں گزر چکا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:'' جس انسان پر کسی کو والی[حاکم] بنادیا جائے؛ پس وہ انسان دیکھے کہ یہ والی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر رہا ہے۔تو اسے چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کو ناپسند کرے' اور[جائز امور میں] اس کی نافرمانی سے ہاتھ نہ کھینچے۔''[تخریج گزر چکی ہے]

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

''ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تنگی اور آسانی میں پسند و ناپسند میں اور اس بات پر کہ ہم پر کسی کو ترجیح دی جائے؛ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سننے اور اطاعت کرنے کی بیعت کی اور اس بات پر بیعت کی کہ ہم حکام سے حکومت کے معاملات میں جھگڑا نہ کریں گے اور اس بات پر بیعت کی کہ ہم جہاں بھی ہوں گے حق بات ہی کہیں گے اللہ کے معاملہ میں ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہ رکھیں گے۔''

[صحیح مسلم:۳/ ۱٤۷۰؛ البخاری ۹/ ٤۷]

اس حدیث مبارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں وصیت فرمارہے ہیں کہ ہم حکمرانوں کے ظلم وستم کے باوجود ان کی اطاعت کریں؛ اور ان سے حکومت کے بارے میں جھگڑا نہ کریں۔اس میں حکمرانوں کے خلاف بغاوت اور خروج کی

ممانعت ہے۔اس لیے کہ حکمرانوں کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔اس سے مراد وہ حاکم ہے جن کا حکم چلتا ہو۔اس سے مراد وہ نہیں ہے جو کہ حاکم بننے کا مستحق ہو' مگر [حاکم نہ بنا ہو] اور اسے کوئی شوکت وغلبہ حاصل نہ ہو۔اوراس سے عادل متولی بھی مراد نہیں اس لیے کہ کبھی کبھار وہ بھی ظلم کرتے ہیں؛پس حدیث دلالت کرتی ہے کہ اس سے مراد ظالم حکام سے جھگڑے کی ممانعت ہے۔یہ ایک وسیع باب ہے۔

چوتھی بات:......اگر ہم یہ بات مان لیتے ہیں کہ ہر حاکم کے لیے عدل کا ہونا شرط ہے۔تو پھر اس صورت میں صرف ان ہی حکمرانوں کی اطاعت کی جائے گی جو عادل ہوں۔ظالم کی کوئی اطاعت نہیں ہوگی۔اس میں کوئی شک نہیں کے لیے والیان کے لیے عادل ہونے کی شرط رکھنا گواہوں کے عادل ہونے کی شرط سے بڑھ کر نہیں ہے۔اس لیے کہ گواہ کبھی ایسی چیز کی بھی گواہی دیتا ہے جس کے متعلق وہ کچھ حقائق نہیں جانتا۔اگر وہ عادل نہ ہو تو پھر اس کی بتائی ہوئی بات کی تصدیق نہ کی جائے۔جب کہ والی حکومت کسی چیز ایسی چیز کا حکم دیتا ہے جس کا علم اسے کسی دوسرے کے ذریعہ سے ہوسکتا ہے۔اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا کام ہے یا نافرمانی کا۔اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ جَائَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْا﴾ (الحجرات: ٦)

''اے مسلمانو!اگر تمہیں کوئی فاسق خبر دے تو تم اس کی اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو۔''

اگر کوئی فاسق انسان کسی بات کی خبر دے تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں تحقیق کرنے کا حکم دیا ہے۔اس میں شک نہیں ہے کہ ظلم اطاعت کا کام کرنے اور نیکی کا حکم دینے میں مانع نہیں ہوسکتا۔امامیہ کا اس بات پر ہمارے ساتھ اتفاق ہے۔امامیہ یہ نہیں کہتے کہ: کبیرہ گناہ کرنے والا ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ان کے نزدیک بھی فسق و فجور کی وجہ سے ساری نیکیاں ضائع نہیں ہوتیں۔بخلاف ان لوگوں کے جو اس مسئلہ میں اختلاف کرتے ہیں؛ جیسے معتزلہ' زیدیہ اور خوارج۔جو کہتے ہیں کہ:فسق کی وجہ سے ساری نیکیاں تباہ ہوجاتی ہیں۔اگر ساری نیکیاں ضائع ہوگئیں تو ایمان ضائع ہوگیا۔جب ایمان ضائع ہوگیا تو انسان کافر اور مرتد ہوگیا' اس کا قتل کرنا واجب ہوجاتا ہے۔

جب کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی نصوص اور اجماع امت اس پر دلالت کرتے ہیں کہ چوری کرنے والا' زنا کرنے والا' شراب پینے والا' بہتان تراشی کرنے والا؛ انہیں ان جرائم کی پاداش میں قتل نہیں کیا جائے گا؛ بلکہ ان پر حد لگائی جائے گی۔جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ لوگ مرتد نہیں ہوئے۔ایسے ہی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا﴾ (الحجرات: ٩)

''اگر مومنوں کی دو جماعتیں باہم برسر پیکار ہوں تو ان میں صلح کرا دیجئے۔''

یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ ان گروہوں کے آپس میں برسر پیکار ہونے [اور ایک دوسرے کو قتل کرنے] کے باوجود ان میں ایمان موجود ہے۔صحیح احادیث میں رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:

((من كانت له مظلمة من أخيه من عرضه فليتحلله منه اليوم قبل أن لايكون دينار ولا

درھم۔ إن کان لہ عمل صالح أخذ منہ بقدر مظلمتہ ، وإن لم یکن لہ حسنات أخذ من سیئات صاحبہ فطرحت علیہ ثم ألقي في النار .))❶

''جس نے اپنے بھائی کو تکلیف پہنچائی ہو، یا اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہو، پس اسے وہ اس دنیا میں ہی ختم کر دے، اس سے قبل کہ وہ دن آئے جب اس کے پاس نہ دینار ہوا اور نہ ہی درہم ،اور اگر اس کا کوئی نیک عمل ہوگا تو اس سے اس ظلم کی قدر اعمال لیکر مظلوم کو دیے جائیں گے ، اور اگر اس کی کوئی نیکی نہ ہوگی تو مظلوم کی برائیاں لیکر اس پر ڈالی جائیں گی۔اور پھر اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔''

صحیحین میں ایک حدیث ہے :ایک بار نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام سے پوچھا:

((أ تدرون من المفلس ؟قالوا: المفلس فینا من لا درھم لہ ولا متاع لہ۔فقال :إنما المفلس من أمتی من یأتی بصلواۃ وصوم وزکوٰۃ ، ویأتی قد شتم ھذا، وقذف ھذا، وأکل مال ھذا، وسفك دم ھذا، وضرب ھذا، فیعطی ھذا من حسناتہ، وھذا من حسناتہ ، فإن فنیت حسناتہ قبل أن یقضی ما علیہ، أخذ من خطایاھم وطرحت علیہ ثم طرح فی النار .))❷

''کیا تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟ کہنے لگے : ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ دینار ہے اور نہ ہی درہم ہے،،۔آپ ﷺ نے فرمایا:,,میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت والے دن نماز، روزے، اور زکوٰۃ لیکر آئیگا ،اور اس کی حالت یہ ہوگی کہ کسی کو اس نے گالی دی ہوگی ،اور کسی پر تہمت لگائی ہوگی، اور کسی کا مال ناحق کھایا ہوگا ،اور کسی کا خون بہایا ہوگا ،اور کسی کو مارا ہوگا۔پس اس کو بھی اس کی نیکیاں دی جائیں گی اور اس کو بھی اس کی نیکیاں دی جائیں گی۔اور اگر اس کی نیکیاں اس پر حساب پورا ہونے سے پہلے ختم ہوگئیں تو ان لوگوں کے گناہ لے کر اس شخص پر ڈالے جائیں گے اور اسے جہنم کی آگ میں ڈالا جائے گا۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ﴾ [ھود ۱۱۴]

''یقیناً نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں یہ نصیحت ہے نصیحت پکڑنے والوں کے لئے۔''

یہ آیت مبارکہ دلالت کرتی ہے کہ انسان سے جب کوئی برائی ہو' اور اس کے بعد نیکیاں کی جائیں تو یہ نیکیاں ان برائیوں کے اثرات کو ختم کر دیتی ہیں۔اور یہ بھی ہے کہ اگر ایسی برائیاں ہوں جو نیک اعمال سے ختم نہ ہوں تو وہ توبہ سے

❶ البخاري:۳/ ۱۲۹ کتاب المظالِم والغصبِ، باب من کانت لہ مظلِمۃ عِند الرجلِ فحللھا لہ: ۹/ ۱۱۱ ، کتاب الرِقاقِ، باب القِصاصِ یوم القِیامۃِ، سننِ التِرمِذِي:۳۷/ ٤ ، کتاب صِفۃِ القِیامۃِ، باب ما جاء فِی شأنِ الحِسابِ والقِصاصِ۔ المسندِ ط۔ الحلبِي: ۲/ ٤۳۵ ، ۵۰٦ .

❷ مسلِم:٤/ ۱۹۹۷ کتاب البِرِ والصِلۃِ والآدابِ باب تحرِیمِ الظلم ، سننِ التِرمِذِي:٤/ ۳٦ کتاب صِفۃِ القِیامۃِ، باب ما جا فِی شأنِ الحِسابِ والقِصاص، المسند:۵/ ۱۷۹۔ ابن حبان: ۱۰/ ۲۵۹ .

معاف ہو جاتی ہیں۔اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ۔

نائب امام کی عصمت کا مسئلہ:

یہاں پر بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فسق کو خبر کے قبول کرنے میں مانع قرار دیا ہے۔ جب کہ نیکی کے کمانے میں فسق مانع نہیں ہوسکتا۔ کتاب وسنت اور اجماع سے ثابت ہے کہ گواہی صرف عادل لوگوں کی ہی قبول کی جائے گی اور اس میں صرف ظاہر پر ہی اکتفاء کیا جاتا ہے۔ ایسے ہی اگر ولایت میں بھی عادل ہونے کی شرط لگائی گئی تو اس کے لیے ظاہری حالت ہی کافی ہوگی ۔

اس سے معلوم ہوگیا کہ ولایت [حاکم ہونے] کے لیے اتنے علم کی شرط نہیں ہے جتنے علم کا ہونا گواہوں کے لیے شرط ہے۔ اس کی وضاحت اس مسئلہ سے بھی ہوتی ہے کہ امامیہ اور دوسرے سارے لوگ امام کے نائب کے لیے غیر معصوم ہونے کو جائز سمجھتے ہیں؛ اگرچہ امام کو اپنے نائبین کے گناہوں کا علم نہ ہو۔اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ولید بن عقبہ بن معیط کو والی مقرر فرمایا' پھر اس نے واپس آ کر ان لوگوں کی طرف سے جنگ شروع کرنے کی خبر دی جن کے پاس آپ کو بھیجا گیا تھا۔تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ﴾ (الحجرات : ٦)

''اے مسلمانو! اگر تمہیں کوئی کمزور بیان والا خبر دے تو تم اس کی اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو ایسا نہ ہو کہ نادانی میں کسی قوم کو ایذا پہنچا دو پھر اپنے کیے پر پریشانی اٹھاؤ۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نائبین میں سے بہت سارے ایسے تھے جو آپ کے ساتھ خیانت کرتے تھے' اور بہت سارے آپ سے بھاگ گئے تھے۔آپ کے نائبین کا کردار کسی سے مخفی نہیں۔اس سے معلوم ہوگیا کہ ایسے مفاسد کی موجودگی میں بھی ظاہر پر اعتبار کرنے میں امام معصوم کے لیے کوئی چیز مانع نہیں ہے۔اور ائمہ کے لیے معصوم ہونے کی شرط ایسی شرط ہے جو نہ شریعت میں مامور بہ ہے؛اور نہ ہی [احوال کے لحاظ سے] مقدور بہ ہے۔ اور ایسی شرط سے نہ ہی کوئی دنیاوی فائدہ حاصل ہوا اور نہ ہی کوئی اخروی فائدہ حاصل ہوا۔

جیسا کہ بہت سارے عبّاد جو اپنے مشائخ کے لیے ایسے امور کا عالم ہونا شرط لگاتے ہیں جنہیں بشریت میں کوئی دوسرا انسان نہیں جان سکتا؛ تو یہ لوگ اپنے مشائخ کے لیے بھی اس جنس کی صفات کا ہونا شرط لگاتے ہیں جو امام معصوم کے لیے امامیہ شرط لگاتے ہیں ۔لیکن انجام کار یہ ہوتا ہے کہ ایسی شرطیں لگانے والے کسی جاہل اور ظالم شیخ کے پیروکار بن کر بیٹھ جاتے ہیں ۔ یہی حال شیعہ کا ہے آخر میں یہ لوگ بھی کسی ظالم و جاہل حاکم کو ہی قبول کرلیتے ہیں ۔ان کی مثال اس بھوکے انسان کی ہے جو شرط لگادے کہ وہ اس شہر کا کھانا اس وقت تک نہیں کھائے گا جب تک اس کے لیے جنت کے کھانوں جیسا کھانا پیش نہ کیا جائے۔ پھر اس کو کسی صحرا کی طرف نکال دیا جائے' تو وہاں پر اسے چوپائیوں کے چارے

کے علاوہ کچھ بھی نہ ملے؛ جو جنت کے کھانوں پر بضد تھا آخر کار مویشیوں کا چارہ کھا کر گزر کر رہا ہے۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو زہد و عبادت وغیرہ میں شریعت کے عادلانہ نظام سے تجاوز کر جاتے ہیں؛ ان کی خواہشات ایسے ہی آخر میں دم توڑ دیتی ہیں اور یہ لوگ حرام کے ارتکاب کا شکار ہو جاتے ہیں۔

فصل: ......اہل سنت پر قیاس کا طعنہ اور اس کا رد

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''تمام اہل سنت نے رائے و قیاس کو اختیار کر کے اس چیز کو دین کا جزو قرار دیا ہے جو اس میں سے نہیں۔ علاوہ ازیں احکام شریعت میں تحریف کا ارتکاب کیا، مذاہب اربعہ ایجاد کیے، جو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے زمانہ میں موجود نہ تھے، اور اقوال صحابہ کو ترک کیا۔ حالانکہ ان سب نے قیاس ترک کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور انہوں نے کہا تھا: ''سب سے پہلے قیاس کرنے والا ابلیس ہے۔'' [انتہی کلام الرافضی]۔

[جواب]: اس کا جواب کئی ایک طرح سے دیا جا سکتا ہے:

پہلی وجہ: ......شیعہ کا یہ دعوی کہ تمام اہل سنت والجماعت جو کہ سابقہ تین خلفاء کی خلافت کو درست مانتے ہیں' وہ قیاس کے قائل ہیں؛ یہ ایک باطل دعوی ہے۔ ان میں ایسے بھی لوگ ہیں جو قیاس کو نہیں مانتے۔ جیسے معتزلہ اور بغدادیہ؛ اور ظاہر یہ جیسے داؤد اور ابن حزم وغیرہ؛ اور ایک گروہ اہل حدیث میں اور صوفیاء کا ایک گروہ قیاس کو نہیں مانتے۔

خود زیدیہ شیعہ قیاس کے قائل ہیں۔ تو اس معاملہ میں شیعہ کے مابین بھی نزاع ایسے ہی ہو گیا جیسے اہل سنت کے مابین۔

دوسری وجہ: ...... قیاس کو اگرچہ ضعیف کہا گیا ہے؛ تاہم یہ ان لوگوں کی تقلید کرنے سے کہیں بہتر ہے جو علم میں مجتہدین کے پایہ کو نہ پہنچ سکے ہوں۔ جس انسان کو بھی ادنی انصاف حاصل ہو' اور علم سے اس کا شغف ہو؛ وہ جانتا ہے کہ ائمہ مجتہدین جیسے: امام مالک، لیث بن سعد؛ اوزاعی اور ابوحنیفہ؛ ثوری، ابن ابی لیلی؛ اور جیسے کہ امام شافعی، احمد؛ اسحق اور ابو عبید جیسے عظیم القدر مجتہدین رحمہم اللہ امام حسن عسکری رحمہ اللہ کے اتباع اور ان کے نظائر و امثال سے بڑے عالم اور مجتہد ہیں۔

نیز یہ علمائے کرام و مجتہدین عظام اس امام منتظر سے ہزار درجہ بہتر ہیں جس کے بارے میں کوئی علم نہیں کہ وہ کیا کہتا ہے [اور کیا کرتا ہے]۔ حالانکہ ان ائمہ مذکورین کے پاس نبی کریم ﷺ سے منقول نصوص موجود ہیں۔ اور اس میں ادنیٰ سا بھی شک نہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے منقول نص کو قیاس پر ترجیح و برتری حاصل ہے۔ اگر اس کے پاس نص نہ ہو' اور قیاس سے بھی نہ کہے؛ تو پھر یہ انسان جاہل ہوگا۔ وہ قیاس جس سے انسان کو گمان [ظن/علم] حاصل ہو؛ وہ اس جہالت سے بہتر ہے جس کے ساتھ نہ کوئی علم ہو اور نہ ہی ظن۔

❀ اگر کوئی یہ کہے کہ: یہ [ائمہ] وہی کچھ کہتے ہیں جو ان کے پاس نبی کریم ﷺ سے ثابت شدہ ہوتا ہے۔''

❀ تو اس کا جواب یہ ہے کہ: یہ قول اس انسان کے قول سے کمزور ہے جو کہتا ہے: ''مجتہد کی ہر بات نبی کریم ﷺ کا قول ہوتی ہے۔ اہل رائے میں سے ایک گروہ کا یہی خیال ہے۔ ان لوگوں کا قول بھی رافضیوں کے قول کے قریب

تر ہوتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ان لوگوں کا قول ایک صریح جھوٹ ہے۔''

مزید برآں یہ ان لوگوں کا قول ہے جو اہل مدینہ کے عمل کو[بطور حجت] لیتے ہیں ؛ کیونکہ انہوں نے یہ اعمال صحابہ کرام سے حاصل کیے ہیں' اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے یہ اعمال نبی کریم ﷺ سے حاصل کیے ہیں ۔ یہ ان لوگوں کا قول ہے جو صحابہ کرام میں قیاس کو نہیں مانتے ۔ اس لیے کہ صحابی صرف وہی بات کہہ سکتا ہے جو اسے نبی کریم ﷺ کی جانب سے پہنچی ہو۔ ایسے ہی وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ : مجتہد کا قول اور عارف کا الہام اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتے ہیں' ان کی اتباع کرنا واجب ہوتا ہے۔

اگر اس پر اعتراض کیا جائے کہ: ''ان کا آپس میں اختلاف ہے۔''

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ : فریق مخالف کا بھی ایسے ہی آپس میں اختلاف ہے ۔ پس [رافضہ کے لیے] یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی بھی باطل دعوی کریں' مگر اس جیسے یا اس سے بہتر دعوی کا ساتھ اس کا معارضہ کیا جائے گا۔

اور ان میں کوئی سچی بات کہنے والا ایسا نہیں ہوگا جس سے بہتر اور بڑھ کر حق کہنے والا اہل سنت والجماعت میں موجود نہ ہو۔اس لیے کہ بدعت کی سنت کے ساتھ مثال ایسے ہی ہے جیسے کفر کی مثال ایمان کے ساتھ ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا﴾ (الفرقان : ۳۳)

''یہ آپ کے پاس جو کوئی مثال لائیں گے ہم اس کا سچا جواب اور عمدہ دلیل آپ کو بتا دیں گے۔''

تیسری وجہ:...... باقی رہا شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''اہل سنت نے دین میں وہ باتیں داخل کر دیں جو اس میں شامل نہ تھیں، اور احکام شریعت میں تحریف کا ارتکاب کیا۔'' تو یہ بات شیعہ میں سب فرقوں کی نسبت زیادہ پائی جاتی ہے۔ شیعہ نے اللہ کے دین میں رسول علیہ السلام تک کو جھوٹ کا نشانہ بنانے سے گریز نہ کیا جب کہ دوسرا کوئی اسلامی فرقہ یہ جسارت نہ کر سکا۔ اور لاتعداد ایسی صداقتوں کو تسلیم نہ کیا جن کو رد کرنے کی جرأت کوئی دوسرا نہ کر سکا۔ اور انہوں نے قرآن میں ایسے تحریف کی کہ کوئی دوسرا اس تحریف کا ارتکاب نہ کر سکا۔[شیعہ کی تحریف کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل تفسیری اقوال سے لگایئے]:

۱۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُولُهٗ وَ الَّذِينَ اٰمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رٰكِعُونَ﴾ (المائدة ۵۵]'' تمھارے دوست تو صرف اللہ اور اس کا رسول اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے، وہ جو نماز قائم کرتے اور زکوۃ دیتے ہیں اور وہ جھکنے والے ہیں۔'' کہتے ہیں: یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جب آپ نے نماز میں اپنی انگوٹھی زکواۃ میں ادا کر دی۔

۲۔ ﴿ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ﴾ اس سے بقول شیعہ حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا مراد ہیں۔

۳۔ ﴿يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ﴾ لؤلؤ و مرجان سے حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما مراد ہیں۔

۴۔ ﴿وَ كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ﴾۔ اس سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

۵۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ ﴾' آل عمران سے آل ابی طالب مراد ہے ابو طالب کوعمران سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۶۔ ﴿اَلشَّجَرَةُ الْمَلْعُوْنَةُ فِي الْقُرْآنِ﴾ اس سے مراد بنوامیہ ہیں۔

۷۔ ﴿ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ﴾ اس سے مراد طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما ہیں۔

۸۔ ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً﴾ بقرہ (گائے) سے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا مراد ہیں۔

۹۔ ﴿لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ ﴾ یعنی اگر تو نے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو ولایت میں شریک کیا۔

شیعہ مذہب کی کتابوں میں ایسی لاتعداد تحریفات پائی جاتی ہیں۔شیعہ کے فرقہ اسماعیلیہ والوں نے واجبات و محرمات تک میں تحریف کرنے سے اجتناب نہ کیا، بنا بریں اگر ان کو ائمہ تحریف کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔کیونکہ یہ لوگ آیات کو اپنے اصل مقصود سے بدل دیتے ہیں۔اگر کوئی ان کے پاس مبلغ علم پر غور کرے تو اسے جھوٹی منقولات اور حق بات کی تکذیب؛ آیات کے معانی میں تحریف کے علاوہ کچھ بھی نہ ملے گا۔یہ باتیں اس طرح آپ کو کسی دوسرے اسلامی فرقہ میں نہیں ملیں گی۔

شیعہ نے یقینی طور پر اللہ کے دین میں ہر فرقہ سے بڑھ کر چیزیں داخل کی ہیں اور کتاب اللہ میں ایسے تحریف کی ہے کہ دوسرے لوگوں کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی۔

[مذاہب اربعہ اور شیعہ اعتراض کا جواب:]

چوتھی وجہ:...... شیعہ قلمکار کا یہ قول کہ'' اہل سنت نے مذاہب اربعہ ایجاد کیے جو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے زمانہ میں نہیں تھے اور اقوال صحابہ کو ترک کر دیا۔''

جواب: ہم رافضی مصنف سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے یہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی مخالفت اور ان کے اقوال سے انحراف کب سے مذموم قرار پائے؟

جبکہ اہل سنت والجماعت کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے محبت و دوستی رکھنے اور باقی تمام زمانوں پر ان کو ترجیح دینے پر اتفاق ہے؛ اور ان کے ہاں صحابہ کرام کا اجماع حجت بھی ہے۔اور انہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے اجماع سے کسی طرح بھی خروج کی اجازت نہیں۔ بلکہ عام ائمہ مجتہدین وضاحت و صراحت کے ساتھ فرما رہے ہیں:

''ہمارے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے اقوال کو ترک کرنا جائز نہیں۔''

پھر جو لوگ [شیعہ] یہ کہتے ہیں کہ اجماع صحابہ حجت نہیں ہے' اور صحابہ کرام کو ظلم اور کفر کی طرف منسوب کرتے ہیں؛ تو وہ کیسے اہل سنت پر اعتراض کر سکتے ہیں؟[[کیا ہم اجماع صحابہ کے مخالف ہیں یا تم؟ پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو گمراہ اور کافر کون کہتا ہے؟ اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اہل سنت اجماع صحابہ کے خلاف متفق ہو جائیں]]۔

مزید برآں اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا اجماع حجت ہے تو وہ دونوں گروہوں پر حجت ہے۔اور اگر اجماع صحابہ حجت

نہیں تو پھر اس کو بنیاد بنا کر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

[اعتراض]:اگر یہ کہے کہ:''اہل سنت والجماعت اجماع صحابہ کو حجت مانتے ہیں اور پھر اسکی مخالفت کے مرتکب ہوئے ہیں۔''

[جــواب] :اہل سنت والجماعت کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اجماع صحابہ کرام کے خلاف یک زبان ہو جائیں۔ جب کہ یہ ایک مسلمہ صداقت ہے کہ شیعہ امامیہ عترت نبوی[اہل بیت؛ بنو ہاشم]اور حضرات صحابہ دونوں کے متفق اجماع کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔سرور کائنات ﷺ اور خلفائے راشدین کے عہد سعادت مہد میں بنی ہاشم کا کوئی فرد اس بات کا مدعی نہ تھا کہ:''بارہ امام معصوم ہوں گے؛ یا یہ کہ سالار رسل ﷺ کے بعد کوئی شخص معصوم بھی ہو سکتا ہے۔''

بخلاف ازیں کوئی شخص خلفائے ثلاثہ کے کفر کا قائل تھا نہ ان کی امامت پر طعن و تشنیع کرتا تھا اور نہ ہی صفات اللہ تعالیٰ کا کوئی منکر تھا اور نہ تقدیر کا۔[اس سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے، کہ امامیہ اہل بیت وصحابہ دونوں کی مخالفت کرنے میں متحد الخیال ہیں، پھر انہیں لوگوں پر معترض ہونے کا کیا حق ہے، جو اہل بیت وصحابہ دونوں کے اجماع کو حجت مانتے ہیں اور اس کی مخالفت سے اجتناب کرتے ہیں]]۔

پانچویں وجہ:......یہ اعتراض کہ:'' اہل سنت نے مذاہب اربعہ ایجاد کر لیے جو نبی کریم ﷺ کے دور میں نہیں تھے۔''

[جـــواب] :اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس کے خیال میں اہل سنت نے حضرات صحابہ کے عین برخلاف جمع ہو کر باتفاق رائے یہ مذاہب ایجاد کر لیے تھے تو یہ عظیم افترا ہے۔اس لیے کہ یہ چاروں مذاہب ایک ہی زمانہ میں نہ تھے۔ بلکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی وفات ۱۵۰ ہجری میں ہوئی۔امام مالک رحمہ اللہ کی وفات ۱۷۹ ہجری میں ہوئی ۔امام شافعی رحمہ اللہ کی وفات ۲۰۴ ہجری میں ہوئی ۔امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی وفات ۲۴۱ ہجری میں ہوئی۔

مزید برآں ان میں سے کوئی بھی دوسرے کی تقلید نہیں کرتا تھا اور نہ دوسروں کو اپنی پیروی کا حکم دیتا تھا۔ بخلاف ازیں یہ سب ائمہ اتباع کتاب وسنت کی دعوت دیتے اور دوسروں پر تنقید کیا کرتے تھے۔باقی رہا یہ معاملہ کہ لوگ ائمہ اربعہ کی اطاعت کرتے ہیں؛ تو یہ ایک اتفاقی بات ہے۔نیز یہ کہ: جب ان میں سے کوئی ایک کوئی ایسی بات کہے جو کتاب و سنت کی مخالف ہو تو اس کو چھوڑ دینا واجب ہو جاتا ہے؛ اور لوگوں پر اس کی تقلید واجب نہیں ہوتی۔

❀ اگر تم شیعہ کہو کہ: لوگ ان مذاہب کی پیروی کر رہے ہیں؛ یہ کوئی اتفاقیہ امر نہیں ہے۔ بلکہ لوگوں نے آپس میں اتفاق سے طے کیا ہے کہ تم اس کی پیروی کرو اور تم اس کی پیروی کرو۔ان کی مثال ان حجاج کی ہے جنہیں کسی رہبر کی تلاش ہو' پھر انہیں کوئی رہنما مل جائے۔ کچھ لوگ اسے ماہر راہبر سمجھ کر اس کے پیچھے چلنے لگیں اور کچھ لوگ اس کو چھوڑ کر الگ چل دیں۔

[جــواب] :اگر واقعی ایسا ہے تو پھر بھی اہل سنت والجماعت کا اتفاق کوئی باطل نہیں ہے۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک گروہ دوسرے کی خطا پر آگاہ کرتا ہے۔کیونکہ ان کا اتفاق اس بات پر نہیں ہے کہ جو کچھ بھی متعین شخص کہے؛ وہ ہر حال میں

قبول کیا جائے۔ بلکہ جمہور مسلمین نبی کریم ﷺ کے علاوہ کسی متعین شخص کی تقلید کا حکم نہیں دیتے۔

اللہ تعالیٰ نے اس امت کی عصمت کی ضمانت دی ہے۔ یہ عصمت کی نشانی ہے کہ اس امت میں کئی کئی علماء ہوتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک کسی چیز میں غلطی کر جائے تو دوسرا کوئی اس مسئلہ میں حق پر ہوتا ہے تا کہ حق بات باقی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر بعض علماء کرام کے ہاں بعض مسائل میں خطاء ہو جائے؛ جیسا کہ شیعہ مصنف نے بطور مثال کے کچھ مسائل ذکر کیے ہیں؛ تو [ان ہی علماء کے دوسرے قول میں یا] دیگر علما کے اقوال میں حق موجود ہوتا ہے۔ تو اس سے ظاہر ہوا کہ اہل سنت والجماعت کا اتفاق کبھی بھی گمراہی پر نہیں ہوا۔ رہ گیا بعض علماء کرام سے بعض دینی مسائل میں خطاء کا سرزد ہو جانا؛ تو ہم اس سلسلہ میں کئی بار وضاحت کر چکے ہیں کہ اس معمولی [یا جزوی] خطاء سے کوئی نقصان نہیں ہوتا؛ جیسا کہ بعض عام مسلمانوں سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ جب کہ شیعہ کا معاملہ اس سے مختلف ہے؛ ہر وہ مسئلہ جس میں وہ تمام اہل سنت کی مخالفت کرتے ہیں' اس میں وہ خطاء پر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ یہود و نصاریٰ ہر اس مسئلہ میں خطاء پر ہیں جس میں وہ مسلمانوں کی مخالفت کر رہے ہیں۔

چھٹی وجہ:......شیعہ کا اعتراض ہے کہ:''یہ مذاہب نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے زمانہ میں موجود نہیں تھے''

[جواب] :اگر اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے مذاہب کے اقوال نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے نقل نہیں کئے گئے؛ بلکہ ان لوگوں نے نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے اقوال کو ترک کر کے اپنی طرف سے بدعات گھڑ لیں' تو یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی مخالفت پر کبھی بھی اہل سنت کا اتفاق نہیں ہوا۔ بلکہ تمام اہل سنت اپنے اقوال و آراء میں صحابہ کرام کے پیروکار ہیں۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ بعض اہل سنت والجماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے اقوال کا علم نہ ہونے کی بنا پر مخالفت کے مرتکب ہوئے ہیں؛ تو پھر ایسے بھی ہے کہ باقی اہل سنت صحابہ کرام کی اتباع پر متفق ہیں؛ اور ان کی مخالفت کرنے والے کی غلطی سے اس کو آگاہ کر رہے ہیں۔ [اور اس کو غلطی مان رہے ہیں] اگر شیعہ کے اعتراض سے مراد یہ ہے کہ ان مذاہب اربعہ کے ائمہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے دور میں موجود نہیں تھے؛ تو اس میں کوئی ایسی ممانعت کی بات نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہر آنے والے زمانے کے لوگ پہلے لوگوں کے بعد ہی آتے ہیں۔

اقوال صحابہ ترک کرنے کا الزام اور اس کا رد::

ساتویں وجہ:......شیعہ کا اعتراض:''انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے اقوال کو ترک کر دیا۔''

[جواب] : یہ ایک من گھڑت جھوٹ ہے۔ بلکہ ان مذاہب کے ماننے والوں کی کتابیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے اقوال اور ان سے استدلال سے بھری پڑی ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض مذاہب کے پاس ایسی روایات ہیں جو دوسرے فرقہ کے پاس نہیں ہیں۔ اور اگر شیعہ مصنف کے اعتراض سے مراد یہ ہو کہ: یوں نہیں کہتے: یہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مذہب ہے؛ یہ عمر رضی اللہ عنہ کا مذہب ہے؛ وغیرہ۔ تو اس کا سبب یہ ہے کہ ان ائمہ میں سے کسی ایک نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے اقوال جمع

کیے اور پھر ان سے مسائل کا استنباط کیا ؛ اس بنا پر ان اقوال کو ان ائمہ کی طرف منسوب کیا جانے لگا۔ جس طرح کتب حدیث کو ان کے جامعین مثلاً امام بخاری و مسلم اور ابو داؤد کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، بعینہ اسی طرح مختلف قراءتوں کو ان ائمہ کی جانب منسوب کیا جاتا ہے جنھوں نے وہ قرأت اختیار کی تھیں ؛ جیسے کہ نافع اور ابن کثیر وغیرہ۔

غالب طور پر ان ائمہ کرام رحمہم اللہ کے اقوال سابقین سے منقول ہیں۔ بعض کے ہاں ایسے بھی کچھ اقوال پائے جاتے ہیں جو کہ متقدمین سے منقول نہیں ہیں۔ لیکن انہوں نے یہ اقوال ان ہی اصولوں کی بنیاد پر استنباط کیے ہیں۔ اس سے ان کے اقوال میں موجود غلطی واضح ہوگئی۔ یہ سب کچھ دین کی حفاظت کے لیے ہوا ہے تا کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ اس صفت کے اہل ہو جائیں [جس میں ارشاد فرمایا ہے]: ﴿يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (التوبه: ۷۱)

''وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں۔''

پس جب بھی کسی سے بھول کر یا عمداً غلطی واقع ہوئی تو دوسرے علماء کرام نے اس پر آگاہ کیا ؛ اور اس غلطی پر رد کیا۔ علمائے کرام رحمہم اللہ کا مرتبہ انبیاء علیہم السلام سے بڑھ کر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَ كُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۝ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ وَ كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا وَّ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَ الطَّيْرَ وَ كُنَّا فٰعِلِيْنَ﴾ (الأنبياء: ۷۸۔۷۹)

''اور داود اور سلیمان (علیہما السلام) کو یاد کیجئے جبکہ وہ کھیت کے معاملہ میں فیصلہ کر رہے تھے کہ کچھ لوگوں کی بکریاں رات کو اس میں چر گئی تھیں اور ان کے فیصلے میں ہم شاہد تھے۔ ہم نے اس کا صحیح فیصلہ سلیمان کو سمجھا دیا۔ ہم نے ہر ایک کو حکمت و علم دے رکھا تھا اور داؤد کے تابع ہم نے پہاڑ کر دیئے تھے جو تسبیح کرتے تھے اور پرند بھی ؛ ہم ایسا کرنے والے ہی تھے۔''

صحیحین میں ثابت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ''جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ احزاب سے واپس ہوئے تو ہم لوگوں سے فرمایا: ''کوئی عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنی قریظہ میں پہنچ کر۔''

چنانچہ لوگوں کے راستہ میں ہی نماز عصر کا وقت ہوگیا، تو بعض نے کہا کہ: ہم نماز نہیں پڑھیں گے جب تک کہ وہاں (بنی قریظہ) تک پہنچ نہ جائیں۔ اور بعض نے کہا کہ ہم تو نماز پڑھیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ نہ تھا کہ ہم قضا کریں۔ اور بعض نے بنو قریظہ میں پہنچ کر غروب آفتاب کے بعد نماز پڑھی۔ جب اس کا ذکر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو ملامت نہ کی۔'' [1]

---

[1] البخاري:٥/ ١١٢؛ كتاب المغازي، باب مرجع النبي ﷺ من الأحزاب:٢/ ١٥كتاب صلاة الخوف، باب صلاة الطالب والمطلوب راكبا وإيماءً، مسلم:٣/ ١٣٩١، كتاب الجهاد والسير، باب المبادر بالغزو، وفيه: أن لا يصلين أحد الظهر إلا في بني قريظة.

یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ مجتہدین کا نبی کریم ﷺ کا کلام سمجھنے میں اختلاف ہوسکتا ہے؛ مگر ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی گنہگار نہیں ہوتا۔

آٹھویں وجہ:......اس پر مزید یہ کہ اہل سنت نے یہ کبھی نہیں کہا کہ ائمہ اربعہ کا اجماع ایک بے خطا دلیل ہے۔ اور نہ ہی کسی نے یہ کہا ہے کہ: حق ان کے اقوال کے دائرہ میں محدود و محصور ہو کر رہ گیا ہے؛ جو بات ان سے خارج ہے وہ باطل ہے۔ ❶ بلکہ اگر ان ائمہ کے متبعین کے علاوہ کوئی دوسرا جیسا کہ سفیان الثوری؛ اوزاعی؛ لیث ؛ سعد اور ان سے پہلے یا ان کے بعد والے مجتہدین اگر کوئی ایسی بات کہیں جو ان ائمہ اربعہ کے اقوال کے خلاف ہو' تو اس معاملہ کو کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ پر پیش کیا جائے گا۔ اور ان میں سے راجح قول وہی تصور ہوگا جس پر دلیل قائم ہوگی۔

نویں وجہ:......شیعہ کا قول کہ: ''صحابہ کرام نے صراحت کے ساتھ قیاس ترک کرنے کا حکم دیا ہے۔''

[جواب] :[شیعہ سے کہا جائے گا کہ]: جمہور مسلمین جو قیاس کو حجت مانتے ہیں ؛ وہ کہتے ہیں: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے قیاس و رائے اور اجتہاد بھی ثابت ہے۔ انہوں نے اجتہاد و قیاس کیا۔ اور ان سے قیاس کی مذمت بھی ثابت ہے۔ [قیاس و رائے کے موافق و مخالف دونوں قسم کے اقوال منقول ہیں]۔ قیاس مذموم وہ ہے جو نص کا معارض ہو؛ جیسے ان لوگوں کا قیاس ہے جو کہتے ہیں کہ سود بھی تجارت کی طرح ہے۔ اور ابلیس مردود کا قیاس جب اس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کے حکم الٰہی پر اعتراض کیا تھا۔ اور مشرکین کا قیاس جو کہتے ہیں: کیا جسے تم قتل کرتے ہو اس کا گوشت کھا لیتے ہو' اور جس کو اللہ مار دیتا ہے اس کا گوشت نہیں کھاتے ؟ اللہ تعالیٰ [ایسے باطل قیاس کرنے والے لوگوں کے بارے میں] فرماتے ہیں:

﴿وَ اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِهِمْ لِیُجَادِلُوْكُمْ وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ﴾

(الانعام: ۱۲۱)

''اور یقیناً شیاطین اپنے دوستوں کی طرف وحی کرتے ہیں تاکہ یہ تم سے جھگڑا کریں ؛ اور اگر تم ان لوگوں کی اطاعت کرنے لگو تو یقیناً تم مشرک ہو جاؤ گے۔''

ایسے ہی وہ قیاس بھی ہے جس میں فرع مدار حکم میں اصل کی شریک نہ ہو۔ ایسے قیاس کا فاسد ہونا کسی شک و شبہ سے بالا ہے۔ [مگر اس کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ قیاس کوئی بھی ہو فاسد ہوتا ہے]۔ وہ قیاس فاسد ہوتا ہے جس میں شرطیں نہ پائی جائیں' اور وہ اصل مدار حکم میں مساوی نہ ہو۔ ایسا کسی مانع کی موجودگی کی وجہ سے ہوتا ہے؛ اور یہ مانع وہ نص ہوسکتی ہے جس کو قیاس پر مقدم کرنا واجب ہوتا ہے۔ اگر دونوں نفس امر میں متلازم ہوں' تو شرط کبھی بھی فوت نہیں ہوسکتی مگر وہاں پر کسی مانع کے موجود ہونے کی وجہ سے۔ اور جب بھی کوئی مانع پایا جاتا ہے تو شرط مفقود ہوجاتی ہے۔

پس رہ گیا وہ قیاس جس میں مدار حکم میں اصل اور فرع دونوں برابر ہوں' اور ان کے ساتھ اس سے راجح کوئی

❶ مجتہدین کے یہاں جو نزاع و اختلاف پایا جاتا ہے، وہ صرف کلام رسول ﷺ کے فہم و ادراک کے بارے میں ہے اور بس! [مترجم]

نصِ معارض بھی نہ ہوتو پھر یقیناً ایسا قیاس قابل اتباع ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں قیاس میں فاسد قیاس بھی پایا جاتا ہے۔ بہت سارے فقہاء نے فاسد قیاس کیا ہے۔ان میں سے بعض نص کی روشنی میں باطل ہیں۔اور بعض قیاس کے باطل ہونے پر اتفاق ہے۔لیکن بہت سارے امور میں قیاس کے باطل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام کا تمام قیاس سرے سے ہی باطل ہے۔جس طرح موضوع احادیث کے پائے جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام احادیث نبویہ کو تسلیم نہ کیا جائے۔

قیاس کا مدار اس پر ہے کہ دوصورتیں موجب حکم اور اس کے مقتضیٰ میں برابر ہوں۔پس جب بھی ایسے ہوگا تو قیاس بلاشک وشبہ صحیح ہوگا۔لیکن بسا اوقات قیاس کرنے والے ایسی چیز کو مناطِ حکم سمجھ لیتے ہیں؛ جو کہ اصل میں ایسے نہیں ہوتی؛ پس اس وقت غلطی ہو جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ قیاس کرنے والوں کے نزدیک اس چیز کی اصل بنیاد ان کے مابین مشترک تأثیر ہے؛ جسے یہ لوگ سوالِ مطالبہ کے جواب کا نام دیتے ہیں تو ان سے کہا جائے گا: ہم یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ حکم کی علت اس میں اصل اور فرع میں وصف مشترک ہے؛ تاکہ فرع کو اصل سے ملایا جائے۔اس لیے کہ قیاس کی صحت اس وقت تک ثابت نہیں ہوتی جب تک کہ دونوں مشترکہ صورتیں اس چیزیں بھی مشترک ہوں جو حکم کو مستلزم ہے۔خواہ یہ اشتراک نفسِ علت میں ہو؛ یا پھر علت کی دلیل میں۔اور ایسا اس وقت ہوتا ہے جب ان کو جمع کرنے والی خصوصیت ظاہر ہو۔اور کبھی ان کے مابین فرق کے ختم ہو جانے کی وجہ سے۔پس جب یہ علم ہو جائے کہ ان دونوں صورتوں کے مابین کو مؤثر فرق نہیں ہے؛ تو حکم میں بھی ان دونوں کے برابر ہونے کا علم بھی حاصل ہوگیا۔اگرچہ ان کے مابین جامع وصف کا علم نہ بھی ہو سکے۔

جب کہ وہ مطرود قیاس کو ثابت کرتے ہیں۔اس کا مطلب ہے کہ: مناط حکم میں شریک ہونے کی وجہ سے فرع میں ویسا ہی حکم ثابت کرنا جیسا اصل میں ثابت ہے۔اور قیاس عکس یہ ہوتا ہے کہ فرع سے اصل کے حکم کی نفی کرنا۔اس لیے کہ یہ دونوں مناطِ حکم میں جدا جدا ہیں۔پس ان دونوں کے مابین فرق کیا جائے گا۔اس لیے اصل میں ثابت حکم کی جو علت ہے؛فرع میں اس کی نفی کی جاتی ہے۔جب کہ دوسری جگہ ان دونوں کو جمع کرنے والی چیز فرع میں ثابت شدہ علت کا وجود ہے۔یہ موضوعات کئی مقامات پر تفصیل سے بیان ہو چکے ہیں۔

فصل:......بعض فقہی مسائل پر شیعہ کی تشنیع

[اعتـــراضات] : رافضی مضمون نگار رقم طراز ہے: قیاس کی وجہ سے اہل سنت لا تعداد امور قبیحہ میں گرفتار ہو گئے، چنانچہ حسب ذیل مسائل قیاس کی پیداوار ہیں:

۱۔ جو لڑکی زنا سے پیدا ہوئی ہو وہ زانی کے لیے حلال ہے۔

۲۔ جو شخص اپنی ماں اور بہن سے یہ جانتے ہوئے نکاح کر لے کہ یہ محرمات میں سے ہیں؛ اس پر حد شرعی نہیں۔

۳۔ جو انسان اپنے ذکر پر کپڑا لپیٹ کر اپنی ماں یا بیٹی سے زنا کر لے؛ اور جو کوئی لواطت کرے [تو اس پر کوئی حد نہیں] حالانکہ لواطت زنا سے زیادہ بری اور قبیح چیز ہے۔

۴۔ اگر کسی شخص کی بیٹی مشرق میں سکونت پذیر ہو اور خود مغرب میں رہتا ہو، پھر وہ مغرب ہی میں غائبانہ طور پر کسی آدمی سے اپنی لڑکی کا نکاح کر دے، رات و دن میں کسی وقت بھی ان کا جوڑ نہیں ہوا ہو۔ چھ ماہ کے بعد اس لڑکی کے یہاں بچہ پیدا ہو تو وہ بچہ اسی خاوند کا قرار دیا جائے گا۔ اور وہ مغرب میں اس کا باپ قرار پائے گا۔ حالانکہ اس انسان کا اس عورت تک پہنچنا کئی سال کے بعد ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ بلکہ اگر کسی انسان کو حکمران اس کے نکاح کے وقت سے ہی قید کر دے؛ اور پچاس سال تک کے لیے اس پر پہرہ بیٹھا دے؛ پھر جب وہ اپنی بیوی کے شہر میں پہنچے تو وہاں پر اپنے بچوں اور پوتوں وغیرہ کا ایک جم غفیر دیکھے؛ تو پھر بھی ان سب کا نسب اس انسان کیساتھ لگایا جائے گا جو ایک دن کے لیے بھی اس عورت کے [یا کسی دوسری عورت کے] قریب تک نہیں گیا۔

۵۔ نبیذ مباح ہے؛ اگر چہ نشہ آور ہو۔ اور اس کے ساتھ وضو جائز ہے۔

۶۔ کتے کی کھال پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے۔

۷۔ گندگی جب خشک ہو جائے تو اس پر نماز پڑھ سکتے ہیں۔

بعض فقہاء سے بعض بادشاہوں کے دربار میں طریقہ ءنماز حکایت منقول ہے۔ بادشاہ کے پاس حنفی فقہاء موجود تھے۔ ایک فقیہی اپنے غصب کردہ گھر میں داخل ہوا؛ نبیذ کے ساتھ وضوء کیا؛ اور فارسی میں بغیر نیت کے تکبیر کہی۔ اور پھر ﴿مدھامتان﴾ آیت فارسی میں پڑھی۔ اس کے علاوہ کوئی آیت نہیں پڑھی۔ پھر اطمینان کے بغیر کچھ دیر کے لیے سر جھکایا؛ اور ایسے ہی سجدہ بھی کیا۔ پھر تلوار کی دہار کے برابر سر اٹھایا؛ پھر دوسرا سجدہ کیا۔ پھر کھڑا ہو گیا اور دوسری رکعت میں بھی ایسے ہی کیا۔ پھر سلام پھیرنے کے بجائے گوز ماری؛ [اور نماز ختم کر دی؛ یہ دیکھ کر] بادشاہ نے - جو کہ حنفی مذہب رکھتا تھا - اس مذہب سے برأت کا اظہار کر لیا۔

۹۔ مال غصب مباح ہے۔ اگر چہ غصب کرنے والا اس میں تبدیلی ہی کیوں نہ کر دے۔

۱۰۔ ان کا کہنا ہے: اگر چور کسی کے گھر میں داخل ہو؛ جس میں اس کے جانور چکی اور کھانا وغیرہ ہو۔ اور وہ جانور چکی استعمال کر کے آٹا پیس لے تو وہ اس آٹے کا مالک قرار پائے گا، اگر [اصل] مالک آ کر اس سے جھگڑنے لگے تو ظالم ہو گا، اور چور مظلوم ہو گا۔ اگر وہ دونوں لڑنے لگیں اور چور مارا جائے تو وہ شہید تصور کیا جائے گا، اگر چور مالک کو مار ڈالے تو چور پر قصاص یا دیت نہیں آئے گی [اس کا خون رائیگاں ہو گا]۔

۱۱۔ اگر زانی گواہوں کو جھٹلا دے، تو اس پر حد لگائی جائے گی۔ اور اگر ان کی تصدیق کر دے تو حد ساقط ہو جائے گی گویا مجرم کے اقرارِ جرم اور گواہوں کی گواہی کے باوجود اس پر حد نہیں لگائی جائے گی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حدود کو ختم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ پس جس کسی پر بھی زنا کی گواہی دی جائے اور وہ گواہوں کو جھٹلا دے تو گواہی ساقط ہو گی۔

۱۲۔ کتے کا گوشت کھانا مباح ہے۔

۱۳۔ غلام کے ساتھ لواطت مباح ہے۔

۱۴۔ باجے گاجے اور ساز وغیرہ اسباب غفلت مباح ہیں۔

ان کے علاوہ بھی ایسے کئی مسائل ہیں جن کے بیان کا موقع یہ نہیں ہے۔'' [انتہی کلام الرافضی]۔

[جوابات]:

پہلا جواب:......ان میں ایسے مسائل بھی ہیں جو جمہور اہل سنت پر محض بہتان ہیں۔ جمہور اہل سنت والجماعت ان میں سے کسی کو بھی درست تسلیم نہیں کرتے۔[1] ان میں سے ہر ایک مسئلہ کے برعکس اقوال موجود ہیں۔ اگرچہ بعض لوگوں نے یہ باتیں کہی بھی ہوں؛ تو اہل سنت میں دوسرے ایسے لوگ موجود ہیں جن کے پاس حق اور صواب موجود ہے۔ اور اگر ان میں سے کوئی بات درست ہو تو بھی حق اہل سنت و الجماعت کے ساتھ ہی ہے۔ دونوں صورتوں میں اہل سنت والجماعت حق سے باہر نہیں جاتے۔

دوسرا جواب:......ہم کہتے ہیں کہ: خود رافضی فقہ میں بھی ایسے مسائل کی کمی نہیں، جنہیں دین کے بارے میں ادنی معرفت رکھنے والا مسلمان بھی اپنی زبان پر لانا گوارہ نہیں کرتا۔ ان میں سے شیعہ کے یہاں بعض مسائل متفق علیہا ہیں اور بعض متنازع فیہا ہیں۔ ان میں سے چند مسائل ملاحظہ ہوں۔

۱۔ شیعہ جمعہ و جماعت کے تارک ہوتے ہیں۔

۲۔ روافض مساجد کو ویران رکھتے ہیں جنہیں آباد کرنے اور ان میں جمعہ اور باجماعت نماز میں اللہ کا ذکر کرنے کا حکم اللہ نے دیا ہے۔ اور مقبروں کو رونق بخشتے ہیں۔ جن کا بنانا ہی اللہ اور اس کے رسول نے حرام ٹھہرایا ہے۔ ان قبروں اور درگاہوں کو باڑے بنا لیتے ہیں۔ اور ان میں بعض لوگ ان درگاہوں کی زیارت کو حج کے برابر قرار دیتے ہیں۔[2] اس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ رافضی عالم شیخ مفید نے 'مناسک حج المشاہد'' (حج قبور کے احکام) کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ہے جو بالکل عیسائیوں کی کتابوں کی طرح کذب و شرک کا پلندہ ہے۔

---

[1] جاہل شیعہ...... جو روافض کے مشہور علماء میں شمار ہوتا ہے،......اور اس کے نظائر و امثال کی افتراء پر دازیوں نے علامہ ہند حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی ابن شاہ ولی اللہ دہلوی کو مجبور کیا کہ آپ شیعی فقہ کے رسوائے عالم مسائل واحکام کا راز طشت از بام کریں، چنانچہ آپ نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف تحفہ اثنا عشریہ کے ساتویں باب میں از صفحہ ۱۰۸ تا ۲۲۷ (طبع سلفیہ) اس قسم کے سب مسائل جمع کر دیے ہیں، ان سطور کے قاری سے گذارش کی جاتی ہے کہ امام ابن تیمیہ کی تنقیدات کا مطالعہ کرنے کے بعد تحفہ اثنا عشریہ میں شیعی فقہ کے اعجوبۂ روزگار اور حیران کن مسائل ملاحظہ کرے اور پھر شیخ الاسلام کے بیان کردہ حقائق سے ان کا موازنہ کرے۔

[2] عجیب بات یہ ہے کہ بعض قبروں میں وہ لوگ سرے سے مدفون ہی نہیں جن کے نام سے وہ مشہور ہیں مثلاً نجف میں حضرت علی کی قبر اور کربلا میں حضرت حسین کا مزار صرف اسی امکان کی بنا پر بنا دیا گیا کہ یہ دونوں حضرات وہاں مدفون ہیں، یہ تاریخی حقائق ہیں شیعہ کا ان سے انکار ایک جداگانہ امر ہے، لطف یہ ہے کہ مقبرے تعمیر کرتے وقت شیعہ اس حقیقت سے کلیۃً آگاہ تھے کہ وہ حضرات یقیناً ان میں مدفون نہیں اس کے باوجود وہ مزار تعمیر کرنے اور انہیں ان کے نام سے مشہور کرنے پر مصر تھے۔

۳۔ شیعہ یہودیوں کی ہم نوائی کرتے ہوئے مغرب کی نماز میں تاخیر کرتے ہیں۔

۴۔ اہل کتاب کا ذبیحہ روافض کے نزدیک حلال نہیں۔

۵۔ شیعہ کے نزدیک ایک مخصوص مچھلی [مرماہی اور جری] حرام ہے۔

۶۔ بعض شیعہ کے نزدیک اونٹ کا گوشت حرام ہے۔

۷۔ بعض شیعہ طلاق کے وقت گواہوں کی موجودگی کو شرط قرار دیتے ہیں۔

۸۔ مسلمانوں کے اموال میں سے اس کا پانچواں حصہ بطور خمس کے وصول کرتے ہیں۔

۹۔ شیعہ کے نزدیک سب ورثہ بیٹی کو ملے گا، اور میت کے چچا اور باقی عصبہ کو کچھ نہیں ملے گا۔[1]

۱۰۔ شیعہ ہمیشہ کے لیے دو دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھتے ہیں۔

۱۱۔ بعض شیعہ کے نزدیک روزوں کا انحصار دنوں کی تعداد پر ہے چاند پر نہیں۔ چاند نظر آنے سے پہلے روزہ رکھتے ہیں اور چاند نظر آنے سے پہلے عید کر لیتے ہیں۔ اس طرح کے دیگر مسائل واحکام بھی ہیں جن کے بارے میں یقینی طور پر علم ہونے کے بعد بھی کہ یہ اس دین اسلام کے خلاف ہیں' جو دین دیکر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث فرمایا' اور آپ پر اپنی کتاب قرآن مجید نازل کی۔ [پھر بھی شیعہ ان پر عمل پیرا ہیں۔] ہم نے ابھی تک ان امور کا ذکر کیا ہے جو عقل وشریعت کی رو سے باطل ہیں۔ اگرچہ بعض متقدمین نے اس پر ان کی موافقت کی ہو' مثال کے طور پر:

۱۲۔ روافض کے نزدیک متعہ حلال ہے۔

۱۳۔ طلاق معلق بالشرط قصد وارادہ کے باوجود واقع نہیں ہوتی۔

۱۴۔ جو طلاق کنایہ سے دی جائے وہ واقع نہیں ہوتی اور اس میں گواہ بنانا شرط ہے۔

تیسرا جواب:...... [جو مسائل اہل سنت پر تھوپے جا رہے ہیں] ان کے کہنے والے فقہاء کے ہاں ان کا کوئی نہ کوئی ماخذ ضرور ہے؛ اگرچہ جمہور کے ہاں وہ خطا پر ہی کیوں نہ ہو۔ اہل سنت خود ان لوگوں کی غلطی کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس وجہ سے حق وصواب ان سے باہر نہیں جا سکتا۔ حق وصداقت کا بیان ان ہی کے ساتھ لازم رہتا ہے۔

[شیعی اعتراضات کے جوابات]:

زنا سے پیدا شدہ بیٹی کو جمہور اہل سنت جیسے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ امام احمد اور امام مالک رحمہم اللہ -ایک روایت میں-

---

[1] شیعہ اس مسئلہ میں تناقض کا شکار ہیں؛ چنانچہ ان کی معتبر کتابوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ: جب کوئی شخص فوت ہو جائے تو اس کی غیر منقولہ جائیداد (مکان، زمین وغیرہ) میں سے عورتوں کو وراثت نہیں ملتی۔ ابو جعفر کہتے ہیں: ''اللہ کی قسم! یہ بات علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے لکھی ہوئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی املا کرائی ہوئی ہے۔'' بصائر الدرجات: ۱۸۵۔ ح: ۱٤۔ باب فی الائمه علیهم السلام وأنه صارت الیهم ......''

الکلینی نے ابو جعفر رحمہ اللہ سے بیان کیا کہ عورتیں زمینی جائیداد میں کسی چیز کی وارث نہیں ہوتیں۔'' فروع الکلینی: ۷/ ۱٦۷۸ کتاب المواریت، حدیث:٤، باب ان النساء لا یرثن۔ بحار الأنوار:۲٦/ ٥١٤۔ ح: ۱۰۱ (باب جهات علومهم ......''

بالاتفاق حرام قرار دیتے ہیں؛ امام شافعی رحمہ اللہ کا ایک قول بھی یہی ہے۔امام احمد رحمہ اللہ کا خیال نہیں تھا کہ اس مسئلہ میں کوئی نزاع ہوگا؛ اس وجہ سے انہوں نے اس کے مرتکب کے واجب القتل ہونے کا فتوی دیا تھا۔جن لوگوں نے اس کے جواز کا کہا تھا جیسے: امام شافعی اور ابن ماجشون ؛[انہوں نے اسے احکام وراثت پر قیاس کیا تھا؛اس لیے کہ] ان کا خیال ہے کہ جب [زنا کی اولاد کو] وراثت نہیں مل سکتی ؛ تو اس کے باقی سارے احکام کی بھی نفی ہوگی۔اسی طرح حرمت کا مسئلہ بھی ان ہی احکام میں سے تھا۔جن لوگوں نے اس کا انکار کیا ہے' وہ کہتے ہیں: نسب کے احکام وراثت کے احکام سے مختلف ہوتے ہیں۔بعض انساب کے لیے ایسے احکام ثابت ہوتے ہیں جو دوسرے بعض انساب کے لیے نہیں ہوتے۔جب کہ تحریم کا لفظ ان تمام احکام کو بھی شامل ہے اگرچہ وہ مجازاً ہی اس کے دائرہ میں آتے ہوں۔ یہاں تک کہ [اس] بیٹی کی بیٹی بھی حرام ہوجاتی ہے۔بلکہ رضاعت سے بھی وہ رشتے حرام ہوجاتے ہیں جونسب کی وجہ سے حرام ہوتے ہیں ۔تو پھر جولڑکی اسی کے پانی سے پیدا ہوئی ہو وہ حکم حرمت کی زیادہ حق دار ہے۔بخلاف وراثت کے۔وراثت ان لوگوں کے لیے ہی ثابت ہوسکتی ہے جنہیں میت کی طرف منسوب کیا جاتا ہو۔پس وراثت بیٹوں کی اولاد کے لیے تو ثابت ہوتی ہے مگر بیٹیوں کی اولاد کے لیے نہیں۔

محرمات سے نکاح کرنے کی صورت میں صورتی عقد کی موجودگی میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ حد شرعی کے قائل نہ تھے ان کی رائے میں شبہ کی بنا پر حد ساقط ہوجاتی ہے۔جبکہ بقیہ ائمہ کرام رحمہم اللہ اسے شبہ نہیں قرار دیتے ۔بلکہ وہ فرماتے ہیں: اس میں حد مغلظ ہوگی۔اس لیے کہ اس نے دو حرام کاموں کا ارتکاب کیا ہے: حرام عقد؛ اور وطی۔

ایسے ہی لواطت کا مسئلہ بھی ہے؛ اکثر ائمہ لواطت کنندہ کے مطلق قتل کے قائل ہیں۔اگرچہ وہ شادی شدہ نہ بھی ہو۔ بعض کے نزدیک اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔اہل مدینہ جیسے: امام مالک رحمہ اللہ وغیرہ کا مسلک بھی یہی ہے۔امام احمد و شافعی رحمہما اللہ سے بھی ایک روایت اسی کے مطابق منقول ہے۔اس کے مطابق اگر لواطت کرنے والا بالغ ہو تو اسے قتل کیا جائے۔امام شافعی رحمہ اللہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ لواطت کی حد وہی ہے جو زنا کی ہے، یہ امام ابو یوسف و محمد رحمہما اللہ کا قول ہے؛اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کا بھی ایک قول یہی ہے۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لواطت کرنے والا زانی کی طرح ہے۔اور یہ بھی کہا گیا ہے: مفعول بہ کو مطلق طور پر قتل کیا جائے گا۔اور یہ بھی کہا گیا ہے: اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فاعل کے اعتبار سے اس میں فرق کیا جائے گا۔حد شرعی کے اسقاط میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ منفرد ہیں [اور اس مسئلہ میں دوسرا کوئی امام آپ کا ہم خیال نہیں]۔

اسی طرح مشرق میں سکونت رکھنے والی عورت کے بچے کا مغربی آدمی کے ساتھ الحاق بھی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا انفرادی مسلک ہے اور دوسرے ائمہ اس کی تائید نہیں کرتے ۔دراصل امام صاحب کا نقطہ نظر یہ ہے کہ نسب کا اثبات صرف میراث حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے،اس مقصود کے مطابق وراثت تقسیم کی جائے گی ۔جیسا کہ جب دو عورتیں ایک بچے کی وراثت کا دعوی کریں تو وہ وراثت ان دونوں کے درمیان تقسیم کی جائے گی؛ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ ان

دونوں عورتوں سے پیدا ہوا ہے۔

ایسے ہی جب کوئی انسان اپنی بیوی کو وطی سے پہلے طلاق دیدے؛ تو بچے کو اس کی طرف منسوب کیا جائے گا؛اس سے مراد یہ ہے کہ یہ ایک دوسرے کے وارث بنیں گے۔اس سے مراد یہ نہیں کہ وہ بچہ اس کے پانی سے پیدا ہوا ہے۔امام صاحب رحمہ اللہ کے مذہب کی حقیقت یہ ہے کہ آپ نسب کے ثبوت کے لیے حقیقی ولادت کو شرط نہیں مانتے ۔ بلکہ آپ کے نزدیک بیٹا خاوند کا ہوگا۔ جو کہ اصل میں صاحب فراش ہے ۔حالانکہ اسے قطعی یقین ہے کہ یہ عورت اس سے حاملہ نہیں ہوئی ۔ [1]

یہ بالکل ویسے ہی ہے جب کوئی انسان اپنی دو بیویوں میں سے کسی ایک کو طلاق دے'اور خود مر جائے ؛ یہ پتہ نہ چلے کہ اس نے کونسی بیوی کو طلاق دی ہے؟ تو اس کی وراثت دونوں بیوں میں تقسیم کی جائے گی۔جبکہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: دونوں بیویوں کے درمیان قرعہ ڈالا جائے گا۔اور امام شافعی رحمہ اللہ نے اس میں توقف کیا ہے' ان کے نزدیک کوئی فیصلہ اس وقت تک نہیں کیا جائے گا جب تک معاملہ واضح نہ ہوجائے یا پھر دونوں آپس میں صلح کرلیں۔جبکہ جمہور علماء کرام رحمہم اللہ [اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی] مخالفت کرتے ہیں ۔ان کا کہنا ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ بچہ اس کا نہیں ہے تو پھر نہ ہی اس سے نسب ثابت ہوگا اور نہ ہی کوئی دوسرا حکم ۔ جب کہ امام صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں : بچے کی نفی کے باوجود بعض احکام ثابت ہوتے ہیں ۔

یہ مطلب نہیں کہ وہ اس کا صلبی بچہ ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ اگر یہ فقہی مسائل غلط ہیں تو اس میں شبہ نہیں کہ جمہور ائمہ ان کے خلاف ہیں اور اگر درست ہیں تو اقوال اہل سنت سے خارج نہ ہوں گے۔

جیسا کہ امام صاحب رحمہ اللہ نے یہ بھی کہا ہے کہ : اگر کوئی انسان اپنے سے بڑی عمر کے غلام سے اگر یہ کہے کہ تم میرے بیٹے ہو۔تو اسے اس غلام کے آزاد کرنے سے کنایہ سمجھا جائے گا؛ اس سے نسب ثابت نہیں ہوگا۔ جبکہ جمہور علماء کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں یہ ایسا اقرار ہے جس کا جھوٹ ہونا ظاہر ہے۔اس کی بنا پر کوئی بھی حکم ثابت نہیں ہوگا۔پس امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر جو الزام لگایا جارہا ہے' اگر وہ حق ہے تو جمہور اہل سنت آپ کی موافقت کرتے ہیں۔اور اگر جھوٹ و باطل ہے تو اس سے باقی لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔حالانکہ الزام لگانے والا اس خیال سے الزام لگاتا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ یہ کہتے ہیں کہ : یہ اولاد اسی آدمی کے پانی سے ہے ؛ اگرچہ اس کا اپنی بیوی سے اجتماع نہ بھی ہوا ہو۔ایسی بات تو انتہائی درجہ کا بیوقوف انسان بھی نہیں کہہ سکتا۔تو پھر ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے متعلق اس قسم کے الزام کو کیوں سچ سمجھا جاسکتا ہے۔

مگر آپ کا یہ خیال ضرور ہے کہ آپ ولادت کا نہیں ؛ بلکہ نسب کا حکم لگاتے ہیں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس میں آپ منفرد ہیں ؛ جمہور نے آپ کی مخالفت کی ہے' اور اس قول کو مبنی بر خطاء کہا ہے ۔بعض علماء کرام رحمہم اللہ نے شوہر کے لیے وطی ممکن ہونے

---

[1] اصل میں امام صاحب اس حدیث کے مطابق فیصلہ دے رہے ہیں جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کی ہے: بچہ چارپائی والے کا ہوگا؛ اور زنا کار کے لیے پتھر ہوں گے۔'' مختصر الطحاوی۔

کی صورت میں نسب ثابت ہونے کا حکم لگایا ہے؛ جیسے امام شافعی اور امام احمد کے بہت سارے ساتھی یہی کہتے ہیں۔ رحمہم اللہ۔ ان میں سے بعض یہ بھی کہتے ہیں: نسب اس وقت تک ثابت نہیں مانا جائے گا جب تک ان دونوں کے مابین خلوت [دخول] حاصل نہ ہو جائے۔ یہ امام مالک رحمہ اللہ وغیرہ کی رائے اور امام احمد رحمہ اللہ کا دوسرا قول ہے۔

[نبیذ کا مسئلہ اور اہل سنت پر الزام کا جواب:]

ایسے ہی نبیذ کو حلال کہنے کا مسئلہ بھی ہے۔ جمہور اہل سنت والجماعت اسے حرام قرار دیتے ہیں۔ اور اس میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں؛ یہاں تک کہ جو انسان تاویل کی وجہ سے بھی اسے پی لے تو اس پر شراب پینے والے کی حد لگاتے ہیں۔ نبیذ پینے والے کے فاسق ہونے کے بارے میں دو قول ہیں:

۱۔ ایسا انسان فاسق ہے؛ یہ امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب ہے' اور امام احمد رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت میں یہی منقول ہے۔

۲۔ اس کو فاسق نہیں کہا جائے گا؛ یہ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت میں یہ منقول ہے۔

محمد بن الحسن رحمہ اللہ نبیذ کو حرام کہتے ہیں۔ یہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اصحاب میں سے اہل انصاف کے ہاں مختار قول ہے؛ جیسے ابواللیث سمرقندی رحمہ اللہ وغیرہ۔

شیعہ مضمون نگار کی بوالعجمی ملاحظہ کیجئے کہ وہ کہتا ہے: ''نشہ میں مشترک ہونے کے باوجود نبیذ کو مباح کہتے ہیں۔''

ابھی تو وہ قیاس سے انکار کر رہا تھا؛ اور ابھی قیاس کی مدد سے نبیذ کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے خلاف حجت پیش کر رہا ہے، اگر قیاس حق ہے تو اس کا انکار باطل تھا۔ اور اگر قیاس باطل تھا تو اس کی حجت باطل ہوگئی۔ اس کے بجائے اگر حدیث: '' كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٍ وَكُلُّ خَمْرً حَرَامٌ '' ❶ سے استدلال کیا ہوتا تو یہ زیادہ بہتر تھا۔

رہا نبیذ سے وضوء کا مسئلہ: تو جمہور علماء اس کا انکار کرتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے اس بارے میں دو روایتیں ہیں۔ اس بارے نے آپ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو اس باب میں نقل کی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے: '' تمرة طيبة و ماء طهور۔''

''کھجور پاکیزہ پھل ہے' اور اس کا پانی پاک ہے۔'' ❷

جمہور اس حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: اگر یہ حدیث صحیح بھی ہو تب بھی آیت وضوء اور آیت تحریم خمر سے منسوخ ہو چکی ہے۔ حالانکہ اس بات کا احتمال ہے کہ ابھی وہ نبیذ نہ بنا ہو؛ بلکہ پانی ہی ہو۔ اور یہ اس وقت ہوگا جب

❶ صحيح مسلم كتاب الاشربة۔ باب بيان ان كل مسكر خمر، (ح:۷۵/ ۲۰۰۳)۔

❷ في: سننِ أبي داود:۱/ ۵۴؛كتاب الطهورِ، باب الوضوءِ بِالنبِيذِ، ونصه عن عبدِ اللهِ بنِ مسعود أن النبي ﷺ قال له ليلة الجِنِ: ((ما في إداوتِ؟ قال: نبيذ. قال: تمرة طيبة وما طهو. والحدِيث فِي سننِ الترمِذِي:۱/ ۵۹؛ كتاب الطهورِ، باب ما جا فِي الوضوءِ بِالنبِيذِ، وقال الترمِذِي: وإنما روى هذا الحدِيث عن أبي زيد عن عبدِ اللهِ عنِ النبِيِ ﷺ، وأبو زيد رجل مجهول عِند أهلِ الحدِيثِ لا تعرف له رِواية غير هذا الحدِيثِ، والحدِيث أيضاً فِي سننِ ابنِ ماجه:۱/ ۱۳۵؛كتاب الطهارةِ وسننِها، باب الوضوءِ بِالنبِيذِ۔

پانی اپنی اصلیت پر باقی ہو؛ اس میں تبدیلی نہ ہوئی ہو۔ یا تھوڑی بہت یا زیادہ تبدیلی ہوئی ہو؛ مگروہ پھر بھی ان علماء کے مطابق پانی ہی شمار ہوتا ہو جو ملاوٹ شدہ پانی سے وضوکو جائز کہتے ہیں ۔

جیسے باگلہ کا پانی؛ اور چنے کا پانی اور اس طرح کے دیگر پانی۔ یہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک ہے؛ اور احمد احمد رحمہ اللہ سے بھی اکثر روایات میں یہی منقول ہے۔ یہ قول دوسرے کی نسبت حجت میں زیادہ قوی ہے۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان یہ ہے: ﴿ فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً ﴾ (النساء: ٤٣) ''اورتم پانی نہ پاؤ۔''اس جملہ میں نفی کے سیاق میں لفظ ''مـاءً'' نکرہ آیا ہے جو کہ ان تمام پانیوں کوشامل ہے جوان میں پاکیزہ چیزیں ملنے کی وجہ سے بدل گئے ہوں۔ جیسا کہ یہ ان پانیوں کو بھی شامل ہے جو اپنی اصل خلقت کے اعتبار سے بدلے ہوئے ہوں۔ یا پھر جن پانیوں کی حفاظت ممکن نہ ہو؛ کیونکہ لفظ ان تمام پانیوں کو شامل ہے۔ جیسا کہ سمندر کے پانی سے وضوء کرنا جائز ہے۔ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا: اللہ کے رسول! ہم سمندر کا سفر کرتے ہیں اور اپنے ساتھ تھوڑا پانی لے جاتے ہیں اگر ہم اس سے وضوکر لیں تو پیاسے رہ جائیں گے، کیا ایسی صورت میں ہم سمندر کے پانی سے وضوکر سکتے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اس کا پانی بذات خود پاک اور دوسرے کو پاک کرنے والا ہے، اوراس کا مردار حلال ہے۔''

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ ❶

پس سمندری پانی پاک ہے؛ حالانکہ وہ انتہائی درجہ کا نمکین ؛ کڑوا اور کسیلا ہوتا ہے۔ پس جو پانی پاکیزہ چیزوں سے بدل جائے؛ اس کی حالت اس سے بہتر ہوتی ہے۔لیکن یہ تبدیلی اصلی ہے؛ اور وہ لاحق ۔

کتے کا چمڑا اور دباغت کا مسئلہ:

رہا کتے کے چمڑے میں نماز کا مسئلہ؛ تو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اسے اس شرط کے ساتھ جائز قرار دیتے ہیں کہ چمڑے کو دباغت دی گئی ہو۔علماء کی ایک جماعت کا یہی خیال ہے۔آپ اس مسئلہ میں منفرد نہیں ہیں۔ان کی دلیل یہ حدیث نبوی ہے:

((أَيُّمَا إِهَابٍ دُبِغَ فَقَدْ طَهُرَ)) ❷ (جو چمڑا بھی رنگا جائے وہ پاک ہوجاتا ہے)۔[عموم حدیث کے پیش نظر کتے کا چمڑا بھی دباغت سے پاک ہوجاتا ہے]

یہ مسئلہ اجتہادی ہے۔ یہ ان شنیع مسائل میں سے نہیں ہے۔ اگر اس کے منکر [شیعہ] سے اس کی حرمت کی قطعی دلیل طلب کی جائے تو بتا نہ سکے گا۔ بلکہ اگر اس سے کتے کے حرام ہونے پر دلیل طلب کی جائے ؛ تا کہ امام مالک رحمہ اللہ سے منقول ایک قول پر رد کیا جا سکے۔اس لیے کہ امام مالک اپنے ایک قول میں کتے کومکروہ قرار دیتے ہیں؛ حرام نہیں کہتے۔تو

---

❶ سنن الترمذی، الطهارة ٢٥ [٩٦]، سنن النسائی، الطهارة ٧٤ ، سنن ابن ماجه، الطهارة ٨٣ ٦٨٣۔ موطا امام مالك ، الطهارة ٣ [٢١]، مسند احمد :٢/ ٧٣٢ ، سنن الدارمی, الطهار ٣٥ [٥٥٧] صحيح .

❷ صحيح مسلم۔ كتاب الحيض۔ باب طهارة جلود الميتة بالدباغ(ح:٣٦٦) سنن ترمذی۔ كتاب اللباس ۔ باب ما جاء فی جلود الميتة اذا دبغت ، (ح:١٧٢٧) واللفظ له......

اس کا رد کرنا رافضی کے بس کی بات نہ ہوگی۔حالانکہ صحیح بات جس پر جمہور علمائے کرام رحمہم اللہ کا مذہب یہی ہے کہ کتے اور باقی درندوں کا چمڑا دباغت دینے سے پاک نہیں ہوتا۔اس لیے کہ نبی کریم ﷺ سے کئی ایک اسناد کے ساتھ منقول ہے کہ:

''آپ درندوں کے چمڑوں کو دباغت دینے سے منع فرمایا کرتے تھے۔''❶

رہ گیا یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((اَیُّمَا إِھَابٍ دُبِغَ فَقَدْ طَھُرَ)) ''جو چمڑا بھی رنگا جائے وہ پاک ہوجاتا ہے۔''

اس حدیث کو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور دوسرے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔حالانکہ اسے امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔❷

ایسے ہی کتے کے حرام ہونے پر شرعی دلائل موجود ہیں۔لیکن ان امامیہ کے بس میں نہیں ہے کہ یہ امام مالک رحمہ اللہ سے وارد ہونے والے ایک قول پر رد کرسکیں۔

خشک گندگی پر بغیر کسی حائل کے نماز پڑھنے کا مسئلہ:

خشک گندگی پر بغیر کسی حائل کے نماز پڑھنا؛ یہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ یا ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا۔لیکن اگر زمین کو نجاست لگے جائے؛ اور پھر سورج کی وجہ سے یا ہواؤوں کی وجہ سے یا زمین میں تحلیل ہوجانے کی وجہ سے ختم ہوجائے تو اکثر لوگوں کا مذہب ہے کہ یہ زمین پاک ہوگئی ہے اور اس پر نماز پڑھنا جائز ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔اور امام مالک رحمہ اللہ اور احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت میں منقول ہے۔امام شافعی رحمہ اللہ کا پچھلا قول بھی یہی ہے۔یہ قول ان لوگوں کے قول کی نسبت زیادہ ظاہر و مقبول ہے جو اسے پاک نہیں مانتے۔

وہ قصہ جس میں رافضی نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کے مطابق بادشاہ کے دربار میں نماز پڑھنے کا واقعہ بیان کیا ہے۔یہاں تک کہ حنفی بادشاہ نے اپنے مذہب سے رجوع کرلیا۔یہ قصہ اہل سنت والجماعت کا مذہب فاسد ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔اس لیے کہ اہل سنت والجماعت کہتے ہیں:حق ان سے خارج نہیں ہوسکتا۔وہ ہرگز یہ نہیں کہتے کہ:ان میں سے کوئی ایک خطا نہیں کرسکتا۔

اس طرح کی نماز کا جمہور اہل سنت والجماعت انکار کرتے ہیں۔جیسا کہ امام شافعی؛ امام مالک؛ احمد بن حنبل رحمہم اللہ

---

❶ سننِ أبِی داود:٤/ ٩٦؛ کتاب اللِباسِ، باب ما جاء فِی جلودِ النمورِ والسِباعِ، سننِ التِرمِذِي:٣/ ١٥٢؛کتاب اللِباسِ، باب ما جاء فِی النھیِ عن جلودِ السِباعِ، سننِ النسائِي:٧/ ١٥٦؛کتاب الفرعِ والعتِیرۃِ، باب النھیِ عنِ الاِنتِفاعِ بِجلودِ السِباعِ، المسند ط۔ سننِ النسائِي:٧/ ١٥٥؛ کتاب الفرعِ والعتِیرِ، باب الرخصِ فِی الاِستِمتاعِ بِجلودِ المیتِ إذا دبِغت۔

❷ مسلِم:١/ ٢٧٧؛ کتاب الحیضِ، باب طھارۃِ جلودِ المیتۃِ بِالدِباغِ، ولفظہ:إذا دبِغ الإِھاب فقد طھر، وانظر شرح النووِیِ علی مسلِم:٤/ ٥٣؛ والحدِیث فِی سننِ أبِی داود:٤/ ٩٣؛کتاب اللِباسِ، باب فِی أُھُبِ المیتۃ، سننِ التِرمِذِي:٣/ ١٣٥؛کتاب اللِباسِ، باب ما جاء فِی جلودِ المیتۃِ إِذا دبِغت، سننِ النسائِي:٧/ ١٥٣؛کتاب الفرعِ والعتِیرۃِ، باب جلودِ المیتۃِ، سننِ ابنِ ماجہ:٢/ ١١٩٣، کتاب اللِباسِ، باب لبسِ جلودِ المیتۃِ إِذا دبِغت۔

کا مذہب ہے۔جس بادشاہ کا ذکر اس رافضی نے کیا ہے وہ محمد بن سبکتگین ہے؛ جو کہ ایک بہترین اور عادل بادشاہ تھا۔اس نے رجوع بھی اس چیز کی طرف کیا تھا جس کا سنت نبوی ہونا اس کے لیے ظاہر ہوگیا تھا۔ یہ بادشاہ خود نیک تھا اور اہل بدعت اور خصوصاً رافضیوں پر بہت سخت تھا۔ اس نے اپنے ملک میں روافض اور ان جیسے دوسرے لوگوں پر لعنت کرنے کا حکم جاری کر رکھا تھا۔مصر کے عبیدی حاکم نے اسے خط لکھ کر دعوت دی تھی ؛اس نے اس کے ایلچی کے سامنے یہ خط جلا دیا۔اوراہل سنت والجماعت کی جو مدد کی وہ تاریخ میں مشہور ومعروف ہے۔

[غصب کی اباحت]

[اعتراض] : رافضی کا کہنا کہ:انہوں نے غصب کو مباح قرار دیا ہے۔اگر چہ غصب کرنے والا اس میں تبدیلی ہی کیوں نہ کردے۔ان کا کہنا ہے: اگر چور کسی چکی پر پہنچ کر آٹا پیس لے تو وہ آٹے کا مالک قرار پائے گا،اگر مالک آ کر اس سے جھگڑنے لگے تو ظالم ہوگا،اور چور مظلوم ہوگا۔اگر وہ دونوں لڑنے لگیں اور چور مارا جائے تو وہ شہید تصور کیا جائے گا،اگر چور مالک کو مار ڈالے تو چور پر قصاص یا دیت نہیں آئے گی۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب] : یہ مسئلہ جمہور علمائے اہل سنت والجماعت کا نہیں ہے۔یہ جس کسی نے بھی کہا ہے؛ جمہور اس کے مخالف ہیں ۔اوراس قول پر شرعی دلائل کی روشنی میں رد کرتے ہیں ۔ یہ بعض علماء کا قول ہے۔لیکن فقہاء کا اس غاصب کے بارے میں اختلاف ہے جس نے غصب شدہ چیز میں ایسی تبدیلی کردی ہو جس کی وجہ سے اس کا نام ہی بدل جائے۔مثال کے طور پر دانے پیسنے کے بعد آٹا بن جاتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ:'' یہ ایسے ہی ہے جیسے اس [غصب شدہ] چیز کو تلف کر دینا۔تو اس صورت میں اس غاصب پر غصب شدہ چیز کی قیمت ادا کرنا واجب ہوگی۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے : بلکہ وہ چیز اپنے اصل مالک کی ملکیت پر باقی رہے گی۔اگر اس میں جو کچھ زیادتی ہوگئی ہے تو وہ مالک کے لیے ہے؛ اور اگر کچھ کمی ہوگئی ہے تو اس کا تاوان غصب کرنے والے پر ہے ۔ یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ: مالک کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ اپنی چیز قبضہ میں لے لے' اور جو کچھ اس میں کمی واقع ہوئی ہے' اس کا غصب کرنے والے سے تاوان طلب کرے ۔یا پھر اس کے متبادل کا مطالبہ کرے؛اور یہ چیز غصب کرنے والے کے لیے چھوڑ دے۔امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب میں یہ مشہور قول ہے۔اگر مالک اپنی ہی چیز لے لے'تو پھر کہا گیا ہے کہ :غصب کرنے والے نے اس میں جو تبدیلی کی ہے' وہ اس میں شریک ہے ۔اور ایک قول یہ ہے کہ: اب اس کا کچھ بھی حق باقی نہیں ۔ یہ اقوال امام احمد اور دوسرے ائمہ رحمہم اللہ کے مذاہب میں موجود ہیں ۔ پس رافضی جس نے اس کا انکار کیا ہے؛ وہ جمہور اہل سنت کے مذہب کے خلاف کہہ رہا ہے۔

دوسری بات :...... رافضی نے اس قول کے نقل کرنے میں جھوٹ بولا ہے ۔ اس نے کہا ہے :'' اگر وہ دونوں آپس میں لڑ پڑیں تو مالک ظالم ہوگا۔''اس لیے کہ اگر مالک متأول ہو اور اس قول کے علاوہ کسی دوسرے قول پر اعتقاد نہ رکھتا ہو تو وہ ظالم نہیں ہوگا۔اور نہ ہی اس کے لیے لڑائی کرنا جائز ہے ۔ بلکہ جب ان دونوں کے درمیان تنازع پیدا ہو جائے تو انہیں

چاہیے کہ اپنا معاملہ کسی ایسے انسان کے پاس لے کر جائیں جو ان کے درمیان فیصلہ کر سکے۔ ایسا اس صورت میں ہوگا جب مالک کو یقین ہو کہ یہ چیز بعینہ ہی اس کی ملکیت ہے؛ اور دوسرے کا خیال ہو کہ یہ اس کی ملکیت ہے۔

❀ مزید برآں ان دونوں باتوں میں بھی فرق کیا جائے گا کہ جو کوئی دانے غصب کر لے؛ اور پھر ان دونوں کا ان کے پیسنے پر اتفاق ہو جائے۔ اور جو کوئی دانے اسی غرض سے پیس رہا ہو کہ وہ انہیں اپنی ملکیت بنائے گا۔ اس صورت میں اس کے ارادہ کا الٹ معاملہ کر کے سد ذرائع کے طور پر سزا دی جائے گی۔

خلاصہ کلام! جن مسائل کا رافضی مصنف نے انکار کیا ہے؛ وہ تمام کے تمام امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ سوائے زنا سے پیدا ہونے والی لڑکی کے' کسی مسئلہ میں کوئی امام ان کے ساتھ ان مسائل میں شریک نہیں؛ اس لڑکی کے مسئلہ میں امام شافعی رحمہ اللہ ان کے ہمنوا ہیں۔

❀ اس شیعہ کو [بطور جواب یہ بھی] کہا جائے گا:'' شیعہ کہتے ہیں:'' امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب باقی تینوں ائمہ کے مذاہب کی نسبت صحیح تر مذہب ہے۔ اور تمہارا کہنا ہے کہ جب انسان کو بوجہ مجبوری مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک سے فتوی لینا پڑے تو اسے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب پر فتوی لینا چاہیے۔ اور شیعہ محمد بن الحسن کو امام ابو یوسف پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس لیے کہ شیعہ حدیث و سنت سے نفرت کی وجہ سے ان لوگوں سے بھی نفرت رکھتے ہیں جو حدیث و سنت پر زیادہ پابند ہوں۔''

❀ جب بات ایسے ہی ہے؛ تو یہ مسائل جنہیں رافضی مصنف نے شمار کیا ہے' یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب میں سے ہیں۔ جب مذاہب اربعہ میں سے آپ کا قول ہی [شیعہ کے نزدیک] راجح ہے؛ تو ان اقوال پر طعنہ زنی کرنا شیعہ مذہب میں تناقض کی دلیل ہے۔ کیونکہ شیعہ تو آپ کے قول کو راجح کہتے ہیں' اور آپ کے مذہب کو باقی مذاہب پر فضیلت دیتے ہیں۔ تو پھر اس مذہب کی وہ کمزوریاں اور نقص بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مذہب دوسرے مذاہب کی نسبت کمزور اور ناقص ہے۔ شیعہ سے اس قسم کی تناقض کا وقوع پذیر ہونا کوئی بعید نہیں ہے؛ اس لیے کہ یہ لوگ اپنی جہالت اور ظلم کی وجہ سے بلا علم اور بلا عدل تعریف بھی کرتے ہیں اور مذمت بھی کرتے ہیں۔ اگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہی راجح تھا تو خاص اس مذہب کے جن کمزور مسائل کا ذکر شیعہ مصنف نے کیا ہے' جو کہ امام صاحب کے علاوہ کسی دوسرے کے مذہب میں نہیں پائے جاتے؛ تو اس سے شیعہ کے اقوال کا تناقض ظاہر ہو گیا۔ اگر امام صاحب کا مذہب راجح نہیں تھا تو پھر اسے دوسرے مذاہب پر ترجیح دینا باطل تھا۔ تو ہر صورت میں لازم آتا ہے کہ شیعہ باطل پر ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیعہ خواہشات نفس کے مارے ہوئے جاہل لوگ ہوتے ہیں؛ یہ ہر موقع پر ایسی بات کرتے ہیں جو ان کی غرض و غایت کے مناسب ہو۔ بھلے وہ بات حق ہو یا باطل۔

اس جگہ پر یہ اعتراض کرنے سے شیعہ مصنف کا مقصد تمام اہل سنت گروہوں کی مذمت کرنا تھا۔ پس یہ لوگ ہر

مذہب میں سے جس چیز کو مذموم خیال کرتے ہیں' اس کی مذمت کرنے لگ جاتے ہیں۔ بھلے وہ اس کے نقل کرنے میں سچے ہوں یا جھوٹے۔ اور بھلے وہ اپنی ذکر کردہ مذمت میں وہ حق پر ہوں یا باطل پر۔ اگرچہ خود شیعہ کے مذہب میں پائے جانے والے عیب دوسرے کسی بھی مذہب میں پائے جانے والے عیوب سے بڑھ کر ہیں۔

[زانی کی گواہی اور دیگر مسائل]:

[اعتراض] : شیعہ کا کہنا ہے: اگر زانی گواہوں کو جھٹلا دے، تو اس پر حد لگائی جائیگی اور اگر ان کی تصدیق کر دے تو حد ساقط ہو جائے گی گویا مجرم کے اقرار جرم اور گواہوں کی گواہی کے باوجود اس پر حد نہیں لگائی جائے گی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حدود کو ختم کرنے کا ایک ذریعہ ہے کہ جس کسی پر بھی زنا کی گواہی دی جائے اور وہ گواہوں کو جھٹلا دے تو گواہی ساقط ہو گی۔''

[جواب] : یہ قول بھی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اقوال میں سے ہے۔ جمہور علماء جیسے: امام مالک؛ امام شافعی؛ احمد بن حنبل وغیرہم رحمہم اللہ نے اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی مخالفت بھی کی ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل یہ ہے کہ جب مجرم اقرار کر لے گا تو شہادت کا حکم ساقط ہو جائے گا بشرطیکہ وہ چار مرتبہ اقرار کر لے۔ بخلاف ازیں جمہور کہتے ہیں کہ: ''مجرم کے اقرار سے شہادت میں مزید پختگی پیدا ہو جاتی ہے؛ شہادت باطل نہیں ہو گی۔ اس لیے کہ اس کا اقرار گواہی کے موافق ہے؛ اس کے مخالف نہیں ہے؛ اگرچہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے گواہوں کی تعداد چار سے بڑھ جائے۔ یا جیسے کوئی چار بار سے زیادہ اقرار کر لے۔

خلاصہ کلام! یہ جمہور اہل سنت والجماعت کا قول ہے۔ اگر پہلا قول حق ہے تو ان کا ہی قول ہے۔ اور اگر اس کے برعکس ہے تو پھر بھی قول حق وصواب ان کے پاس موجود ہے۔ پھر اس شیعہ سے یہ بھی کہا جائے گا کہ: جمہور اہل سنت و الجماعت ان مسائل کا انکار کرتے ہیں۔ اور ان کے کہنے والوں پر ایسے دلائل اور حجتوں سے رد کرتے ہیں جنہیں امامیہ نہیں جانتے۔

[اہل سنت پر کتے اور لونڈے بازی کی حلت کا الزام اور اس پر رد]:

[اعتراض] : شیعہ مصنف کہتا ہے: [اہل سنت کے ہاں] ''کتے کا گوشت کھانا مباح ہے؛ غلام کیساتھ لواطت مباح ہے باجے گاجے اور ساز وغیرہ اسباب غفلت مباح ہیں۔ انکے علاوہ بھی ایسے مسائل ہیں جن کے بیان کا موقع یہ نہیں ہے۔''

[جواب] : تمام اہل سنت کی طرف منسوب کر کے یہ قول نقل کرنا؛ اور ایسے ہی اس قول کو جمہور کی طرف منسوب کرنا بھی جھوٹ ہے۔ بلکہ اس پیرائے میں بعض ایسے جملے موجود ہیں جو خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے ماننے والوں نے کہے ہیں۔ اور بعض ان پر جھوٹ اور بہتان ہیں ان میں سے کسی ایک نے بھی نہیں کہے۔ جو جملے بعض لوگوں نے کہے ہیں جمہور اہل سنت والجماعت نے ان کا انکار کیا ہے' [اور اس پر سختی سے رد کیا ہے] اور وہ اس گمراہی پر یک زبان نہیں ہوئے [وللہ الحمد]۔

پھر اس کے برعکس بہت سے برے اور شنیع اقوال شیعہ مذہب میں موجود ہیں جو کہ کتاب وسنت اور اجماع کے خلاف ہیں؛ جو کسی بھی دوسرے مسلمان گروہ میں موجود اقوال سے بڑھ کر برے اور گندے ہیں۔ اہل سنت والجماعت کے

کسی بھی گروہ میں کوئی ایسا ضعیف قول نہیں پایا جاتا جس سے بڑھ کر ضعیف اور شنیع قول شیعہ مذہب میں موجود نہ ہو۔

اس سے واضح ہو گیا کہ اہل سنت والجماعت کا ہر گروہ ہر حال میں شیعہ سے بہتر ہے۔ اس لیے کہ شیعہ مذہب میں جس کثرت سے جھوٹ‘ تکذیب حق ؛ کثرت جہالت ؛ محال امور کی تصدیق ؛ قلت عقل ؛ غلو ؛ اتباع ہوی ؛ مجہولات سے تعلق [اور اس طرح کے دیگر مذموم امور] پائے جاتے ہیں‘ اس کی مثال کسی دوسرے فرقہ میں نہیں ملتی ۔ رہ گیا غلاموں سے لواطت کے جواز کے بارے میں شیعہ کا بیان ؛ تو وہ صریح جھوٹ ہے، علماء اہل سنت میں سے یہ کسی کا قول نہیں۔ میرا خیال ہے کہ شیعہ کا مقصد امام مالک رحمہ اللہ پر طعنہ زنی کرنا ہے ۔ اس لیے ہم نے دیکھا ہے بعض جہلاء نے امام مالک رحمہ اللہ کی طرف ایک ایسی روایت منسوب کی ہے۔ اس کی اصل عورتوں کے ادبار کے بارے میں ہے۔ اہل مدینہ کا ایک گروہ اسے مباح سمجھتا تھا۔ جب امام مالک سے اس بارے میں دو قول نقل کیے گئے تو جاہل نے یہ سمجھا کہ آپ نے غلاموں کے ساتھ لواطت کو مباح قرار دیا ہے۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے ۔ کوئی ادنی انسان بھی ایسی بات نہیں کہہ سکتا تو پھر امام مالک رحمہ اللہ جیسے جلیل القدر اور صاحب شرف و منزلت عالم کے متعلق کیسے یہ تصور کیا جا سکتا ہے؟ جب کہ آپ کے مذہب میں انسداد فواحش اور احکام سد ذرائع بکمال موجود ہیں۔ اور یہ مذہب حدود قائم کرنے کے بارے میں سب سے زیادہ حریص ہے۔ منکرات اور بدعات کے انکار میں سب سے آگے ہے۔ ❶

امام مالک رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ بالاتفاق کہتے ہیں کہ: ’’غلاموں سے لواطت کو حلال قرار دینے والا کافر ہے۔‘‘ یہ قول تمام ائمہ مسلمین کا ہے۔ لواطت کو حلال سمجھنے والا ایسے ہی ہے جیسے اپنی رضاعی بیٹی یا رضاعی بہن سے وطی کو حلال سمجھنے والا ؛ یا پھر جو اپنے باپ یا بیٹے کی بیوی سے جماع کو حلال سمجھتا ہو۔ پس رضاعی بیٹی یا ایسی مملوکہ جس نے اس سے دودھ پیا ہو؛ یا رضاعت اور سسرالی تعلق کی وجہ نکاح باتفاق مسلمین مباح نہیں ہوتا۔ پس اس کا غلام بالاولی اس حرمت کا زیادہ مستحق ہے۔ اس لیے کہ یہ جنس نہ ہی نکاح سے حلال ہو سکتی ہے اور نہ ہی ملک یمین سے ؛ بخلاف عورتوں کی جنس کے۔

امام مالک اور علماء اہل مدینہ رحمہم اللہ کا مذہب یہ ہے کہ لوطی کو رجم کر کے قتل کیا جائے۔ خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ ۔ خواہ وہ اپنے غلام سے لونڈے بازی کرے یا کسی دوسرے سے ۔ ان علماء کرام رحمہم اللہ کے ہاں فاعل اور مفعول دونوں کے لیے قتل کیے جانے کا حکم ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے ؛ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

’’فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دو۔‘‘ ❷

---

❶ وقال ابن قدامة فِی المغنِی:۹/ ۳۱ واختلفتِ الرِوايۃ عن أحمد رحِمه الله فِی حدِهِ حد اللِواطِ فروِی عنه أن حده الرجم بِكرا كان أو ثيبا ، وهذا قول علِی وابنِ عباس وجابِرِ بنِ زيد وعبدِ اللهِ بنِ معمر والزهرِيِ وأبِی حبِيب وربِيع ومالكِ .

❷ سننِ بِی داود:٤/ ۲۲۰؛ كتاب الحدودِ ، باب فِيمن عمِل عمل قومِ لوط ، ونصه فِيهِ: قال: قال رسول اللهِ ﷺ من وجدتموه يعمل عمل قومِ لوط فاقتلوا الفاعِل والمفعول بِهِ . وجاء الحدِيث أيضا فِی: سننِ الترمِذِيِ ؛ كتاب الحدودِ ، باب ما جاء فِی حدِ اللوطِی۔ سننِ ابنِ ماجه:۲/ ۸۵٦؛ كِتاب الحدودِ ، باب من عمِل عمل قومِ لوط . وقال الشيخ أحمد شاكِر رحِمه الله: إسناده صحِيح .

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے مذہب میں بھی یہی حکم ہے؛ اور امام شافعی کا بھی ایک قول یہی ہے۔پس جس کا مذہب یہ ہو کہ لواطت زنا سے زیادہ سخت اور بری چیز ہے تو پھر اس سے کیسے یہ حکایت نقل کی جا سکتی ہے کہ اس نے لواطت کو مباح قرار دیا ہے؟ ۔ایسے ہی آپ کے علاوہ بھی کسی دوسرے عالم نے اس عمل کو مباح نہیں کہا۔ بلکہ ان سب کا اس فعل کے حرام ہونے پر اتفاق ہے۔لیکن بہت ساری چیزیں ایسی ہیں کہ علماء کرام کا ان کے حرام ہونے پر اتفاق ہوتا ہے؛ مگر اس کا ارتکاب کرنے والے پر حد قائم کرنے کے بارے میں ان کے مابین اختلاف ہوتا ہے کہ کیا اس پر حد لگائی جائے ؟ یا پھر اسے تعزیر سے سزا دی جائے جو کہ حد سے کم ہو؛ جیسے کوئی اپنی ایسی مملوکہ سے وطی کر دے جو اس کی رضاعی بیٹی بھی ہو؟ ۔

[شطرنج ' گانے اور ساز کی اباحت کا الزام]:

[الزام]:[شیعہ مصنف نے کہا ہے: اہل سنت کے ہاں] ''شطرنج باجے گاجے اور ساز وغیرہ اسباب غفلت مباح ہیں۔''

[جواب] : جمہور علماء کرام رحمہم اللہ کے مذہب میں شطرنج حرام ہے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ آپ کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو شطرنج کھیل رہے تھے؛ تو آپ نے فرمایا:''یہ کیا مورتیاں ہیں جن پر تم جم کر بیٹھے ہو؟''

ایسے ہی حضرت ابوموسیٰ؛ ابن عباس ؛ ابن عمر ؛ اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے اس کی ممانعت منقول ہے ۔ لیکن اس بارے میں ان کا اختلاف ہے کہ: ان میں سے کس کی حرمت زیادہ ہے شطرنج کی یا نرد کی ؟ امام مالک رحمہ اللہ شطرنج کو نرد سے زیادہ سخت حرام سمجھتے ہیں۔ یہی بات ابن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔اس لیے کہ شطرنج دل کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے مشغول کر دیتا ہے۔اور نرد سے بڑھ کر نماز اور ذکر الٰہی میں غفلت کا سبب بنتا ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک نرد کی حرمت شطرنج سے بڑھ کر ہے ۔جب کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی شطرنج کو حلال نہیں کہا؛ لیکن آپ نے یہ کہا ہے:'' نرد حرام ہے اور شطرنج اس سے کم درجہ کا ہے۔اور میرے لیے شرح صدر نہیں ہو رہی کہ کیا یہ بھی حرام ہے؛ تو آپ نے اسے حرام کہنے میں توقف کیا ہے ۔جب کہ اس بارے میں آپ کے اصحاب کے دو قول ہیں۔اگر تحلیل کا قول راجح ہو تو پھر بھی اس میں کوئی ضرر نہیں۔اور اگر تحریم کا قول راجح ہو تو پھر بھی یہی جمہور اہل سنت والجماعت کا قول ہے۔پس دونوں صورتوں میں حق اہل سنت والجماعت سے باہر نہیں ۔

[گانے بجانے کی اباحت کی الزام اور اس پر ردّ]

[الزام]:[شیعہ مصنف کہتا ہے: اہل سنت کے ہاں] ''باجے گاجے اور ساز وغیرہ مباح ہیں۔''

[جواب] : یہ ائمہ اربعہ پر جھوٹ ہے۔اس لیے کہ ائمہ اربعہ کا ساز و باجے اور آلات لہو لعب کے حرام ہونے پر اتفاق ہے؛ اگر کسی نے ان میں سے کوئی چیز ضائع کر دی تو اس تلف کرنے والے پر کوئی تاوان نہیں ہوگا ؛ بلکہ ائمہ اربعہ کے ہاں ان چیزوں کا رکھنا بھی حرام ہے ۔لیکن کیا وہ اس کے مادہ کا تاوان ادا کرے گا۔اس بارے میں ان کے دو مشہور قول ہیں ؛ جیسا کہ اگر کوئی شراب کے برتن تلف کر دے؛ اور اس کے ساتھ ہی شراب بنانے کے مادہ کو بھی تلف کر دیا تو ایک قول کے مطابق اس پر کوئی تاوان نہیں ہوگا؛ جیسا کہ امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب ہے ۔ اور امام احمد رحمہ اللہ سے دو مشہور

روایتوں میں سے ایک یہی ہے۔ جیسا کہ حضرت موسی علیہ السلام نے اس بچھڑے کو تلف کر دیا تھا جسے سونے سے بنایا گیا تھا۔ صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو وہ رنگے ہوئے دو کپڑے جلانے کا حکم دیا؛ جو کہ آپ پہنے ہوئے تھے۔''❶

جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے خیبر کے موقع پر پہلے وہ ہانڈیاں توڑنے کا حکم دیا تھا جن میں گدھے کا گوشت پکا ہوا تھا۔ پھران کے لیے ہانڈیوں میں موجود سالن وغیرہ گرانے کی اجازت دے دی۔❷

تو حدیث دونوں باتوں کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ اورشراب حرام ہونے کے موقع پر آپ نے وہ ڈول توڑنے اور مشکیں پھاڑنے کا حکم دیدیا تھا جن میں شراب ہوتی تھی اور حضرت عمر بن خطاب اور حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہما نے وہ گھر جلانے کا حکم دیدیا تھا جہاں پر شراب فروخت ہوتی تھی۔

جو اس کو جائز نہیں کہتے: جیسے اصحاب امام ابوحنیفہ؛ امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ اپنے ایک قول میں۔

ان لوگوں کا کہنا ہے: یہ مالی عقوبات ہیں جو کہ منسوخ ہوچکی ہیں۔ جب کہ پہلے قول والے لوگ کہتے ہیں: ان میں سے کچھ بھی منسوخ نہیں ہوا۔ اس لیے کہ نسخ صرف اس صورت میں ہوسکتا ہے جب بعد والی نص پہلی نص سے متعارض ہو۔ اس طرح کی کوئی چیز شریعت میں وارد نہیں ہوئی۔ بلکہ مالی عقوبات بھی بدنی عقوبات کی طرح ہیں جنہیں مشروع طور پر استعمال میں لایا جاتا ہے۔ بلکہ مالی عقوبات نافذ کرنا بدنی عقوبات کی نسبت زیادہ اہم و اولی ہیں۔ اس لیے کہ جان یا کسی انسانی عضو کا ضائع ہوجانا مال کے ضائع ہونے سے زیادہ خطرناک اور برا ہے۔ جب بدنی عقوبات وسزائیں بھی شریعت نے مقرر کی ہوئی ہیں تو پھر مالی عقوبات اور سزائیں بالاولی مشروع ہیں۔

ایسے ہی علمائے کرام کے مابین قصاص اموال کے بارے میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ جب کوئی انسان کسی کی قمیض پھاڑ دے تو کیا وہ بھی قصاص میں اس کی قمیض اتنی ہی مقدار میں پھاڑ دے؟ اس بارے میں امام احمد رحمہ اللہ کے دو قول ہیں:

پس جس نے یہ کہا ہے: ایسا کرنا جائز نہیں؛ ان کا مقصد یہ ہے کہ: ایسا کرنے میں فساد ہے۔ اور جس نے کہا ہے:

---

❶ تفسیر ابن کثیر ٥/ ٣٤٢۔مسلم ٣/ ١٦٤٧۔ کتاب اللِباسِ والزِینۃِ، باب النھیِ عن لبسِ الرجلِ الثوب المعصفر، ونصُّہ: رأی النبی ﷺ علی ثوبینِ معصفرینِ، فقال: أأمك أمرتك بِھذا؟ قلت: غسِلھما؟ قال: بلِ احرقھما. قال المحقِق فِی شرحِہِ: معصفرینِ: أی مصبوغینِ بِعصفر، والعصفر صبغ أصفر اللونِ.

❷ البخاری:٥/ ١٣٠؛کِتاب المغازِی، باب غزوۃِ خیبر، وھو حدِیث طوِیل عن غزوۃِ خیبر، وفِیہِ: فقال النبِی ﷺ:" ما ھذِہِ النِیران؟ علی أیِ شیء توقِدون؟ قالوا: علی لحم. قال: عل أیِّ لحم؟ قالوا: علی لحمِ حمرِ الإِنسِیِ. قال النبِی ﷺ: أھرِیقوھا واکسِروھا. فقال رجل: أو نھرِیقھا ونغسِلھا. قال: أو ذاك. والحدِیث فِی: البخارِیِ:٣/ ١٣٦، کتاب المظالِمِ، باب ھل تکسر الدِنان التِی فِیھا الخمر، مسلِم:٣/ ١٤٢٧؛کتاب الجِھادِ والسِیرِ، باب غزوۃِ خیبر۔ سننِ ابنِ ماجہ:٢/ ١٠٦٥، کتاب الذبائِحِ، باب لحومِ الحمرِ الوحشِیۃ.

ایسا کرنا جائز ہے؛ تو اس نے جواب دیا ہے کہ انسانی جان یا عضو کو قصاص میں ختم کرنے میں اس سے بڑا فساد ہے؛ مگر ایسا کرنا بطور عدل اور قصاص کے جائز ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے لوگوں کو ظلم و سرکشی سے روکا جاتا ہے؛ اور مظلوم کے دل کے لیے تسلی کا سامان ہے۔ جو اس کو ناجائز کہتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ: اگر جان کے بدلے جان کی قصاص مشروع نہ ہوتی تو لوگ قتل کرنے سے نہ رکتے۔ اس لیے کہ قاتل کو علم ہوتا کہ جب وہ قتل کرے گا تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا' بلکہ وہ دیت ادا کر دے گا؛ تو اس طرح وہ قتل کا ارتکاب کر کے دیت ادا کر دیتا؛ بخلاف اموال کے۔ جبکہ اموال تلف کرنے والے سے اس مال کی طرح کا مال لیا جاسکتا ہے۔ پس اس سے قصاص اور تنبیہ حاصل ہو جاتے ہیں۔ جب کہ مال کو ضائع کر دینے میں کوئی حکمت نہیں؛ اس لیے کہ جس کا مال ضائع ہوا ہے وہ اس کا ضرورت مند ہے۔ اور قصاص کی صورت میں مال بھی ضائع ہو جاتا ہے اور اس کا عوض بھی۔ اس میں مظلوم کی تسلی کے بجائے مزید غصہ کا سامان ہے۔ ہاں اگر یہ صورت حال ہو کہ اس سے قصاص اس کا مال تلف کیے بغیر لینا ناممکن ہو تو پھر اس کا جواز صاف ظاہر ہے۔ اس لیے قصاص لینا عدل ہے اور برائی کا بدلہ اس جیسی برائی سے دیا جاسکتا ہے۔ پس جب کوئی انسان کسی کا مال ضائع کر دے؛ اور اس کا مال تلف کیے بغیر اس سے قصاص لینا ناممکن ہو تو پھر ایسا کرنا جائز ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علماء کرام کفار کے درخت اور ان کی کھیتی باڑی ضائع کرنے پر متفق ہیں؛ لیکن یہ اس صورت میں ہوگا جب وہ ہمارے ساتھ ایسا کریں۔ یا جب کفار پر غلبہ حاصل کرنا اس کے بغیر ممکن نہ ہو۔ اور اس کے بغیر اگر غلبہ ممکن ہو تو پھر کھیتی باڑی ضائع کرنے کے جواز کے بارے میں اختلاف بڑا مشہور ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے اس مسئلہ میں دو روایتیں ہیں' اور امام شافعی رحمہ اللہ اور دوسرے لوگ اسے جائز کہتے ہیں۔

یہاں پر مقصود یہ ہے کہ لہو ولعب کے آلات ائمہ اربعہ کے ہاں معروف ہیں۔ اس بارے میں ان میں سے کسی ایک سے بھی کوئی اختلاف نقل نہیں کیا گیا؛ سوائے خراسان کے متأخرین شافعیہ کے۔ ان سے اس مسئلہ میں دو قول نقل کیے گئے ہیں' صحیح ترین قول اس کی حرمت کا ہے۔ جبکہ اہل عراق اور قدیم اہل خراسان سے اس بارے میں کوئی اختلاف نقل نہیں کیا گیا۔

جب کہ فقط مجرد گانا گانا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ امام مالک رحمہ اللہ؛ امام احمد رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے ایک قول کے مطابق حرام ہے۔ اور ان دونوں ائمہ کے ایک قول میں مکروہ ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کے اصحاب میں سے ایک جماعت کا خیال ہے کہ صرف گانا گانا مباح ہے۔ اگر اس قول کو حق مان لیا جائے تو اس میں کوئی ضرر والی بات نہیں اور اگر یہ قول باطل ہو تو پھر بھی جمہور اہل سنت والجماعت گانے کو حرام کہتے ہیں۔ پس حق اہل سنت والجماعت سے باہر نہیں ہے۔

فصل:......رافضی مذہب کے راجح ہونے کا دعوی اور اس پر ردّ

[اشکال] :شیعہ مصنف لکھتا ہے:''شیعہ امامیہ کے مذہب کے واجب الاتباع ہونے کی دوسری وجہ: ہمارے استاد محترم امام اعظم خواجہ نصیر ملت وحق ودین محمد بن حسن طوسی ❶ قدس اللہ روحہ کا وہ قول ہے جو میرے ان سے مذاہب کے بارے میں سوال کرنے پر ارشاد فرمایا: ہم نے اس حدیث پر غور کیا ہے کہ:'' میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی؛ ان میں سے ایک فرقہ نجات پانے والا ہوگا باقی سارے جہنم میں جائیں گے۔''❷ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجات پانے والے اور ہلاک ہونے والے فرقہ کو ایک دوسری متفق علیہ حدیث میں متعین کیا ہے؛ آپ نے فرمایا:'' میرے اہل بیت کی مثال نوح علیہ السلام کی کشتی کی ہے۔ جو اس میں سوار ہوا وہ نجات پا گیا' اور جو اس سے پیچھے رہ گیا وہ غرق ہوگیا۔'' غور وفکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ امامیہ فرقہ ہی ناجی ہے کیونکہ یہ باقی سب فرقوں سے الگ تھلگ ہے۔'' باقی تمام مذاہب اصول وعقائد میں مشترک ہیں۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے دیا سکتا ہے:

پہلی وجہ:...... ہم کہتے ہیں کہ: اس امامی رافضی نے اس شخص کو کافر کہا ہے جو اللہ تعالیٰ کو موجب بالذات تسلیم کرتا ہے اس نے کہا ہے:''......اس سے لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ موجب بالذات ہے مختار نہیں' سو اس سے کفر لازم آتا ہے۔''

جس شخص کو اس نے اپنا شیخ اعظم کہا ہے اور اس کا قول بطور حجت کے نقل کیا ہے' یہ استاد طوسی تو قدامت عالم کا قائل ہے اور اللہ تعالیٰ کو موجب بالذات تسلیم کرتا ہے۔ جیسا کہ اس نے اپنی کتاب ''شرح الاشارات'' میں ذکر کیا ہے۔ تو شیعہ مصنف کے اس قول کی بنا پر لازم آتا ہے کہ وہ اپنے جس شیخ کے قول کو بطور حجت پیش کر رہا ہے؛ وہ کافر ہے۔ اور کافر کی بات دین اسلام میں قبول نہیں کی جاتی۔

دوسری وجہ:...... ہر خاص و عام سبھی لوگ جانتے ہیں کہ طوسی ''الموت'' کے قلعہ میں ملحد اسماعیلیہ باطنیہ کا وزیر تھا۔ پھر جب ترک مشرکین نے مسلمانوں کے ملک پر حملہ کیا اور دار الخلافہ بغداد کی طرف پیش قدمی کی تو ترکوں کے مشرک بادشاہ ہلاکو خان کا مشیر اور نجومی بن گیا۔ اس نے ہلاکو خان کو خلیفہ وقت اور علماء دین کو قتل کرنے کا مشورہ دیا۔ اور ان لوگوں

❶ یہ وہی خواجہ نصیر الدین طوسی ہے، جو اعدائے اسلام ابن علقمی اور ابن ابی الحدید کے ساتھ اس عدیم المثال مسلم کشی وخونریزی میں برابر کا شریک ہے جو ہلاکو نے ۶۵۵ھ میں دار الاسلام بغداد کے عظیم شہر میں بپا کی۔ طوسی کے الحاد وفساد اور اسلام اور مسلمانوں سے اس کی خیانت کاری سے متعلق قبل ازیں حاشیہ تحریر کیا جا چکا ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ جس کتاب کی تردید کر رہے ہیں اس کا مصنف ابن المطہر اور اس کے ہم نوا عداوت صحابہ میں طوسی اور اس کے نظائر وامثال ہی کے مقلد اور زلہ ربا ہیں۔

❷ سننِ الترمِذی:٤/ ٣٤ ؛ کتاب الإیمان، باب افتِراقِ هذِهِ الأمة، وقال الترمِذی: حدِیث أبِی هریرة حدِیث حسن صحِیح؛ سنن أبِی داؤود:٤/ ٢٧٦؛کتاب السنةِ، باب شرح السنة، سننِ ابنِ ماجه:٢/ ١٣٢١؛کتاب الفِتنِ، باب افتِراقِ الأممِ، سننِ الدارِمِی:٢/ ٢٤١؛کتاب السِیرِ، باب فِی افتِراقِ الأمةِ، المسندِ ط. المعارِف:٦/ ١٦٩؛ وصحح المحقِق الحدِیث ط الحلبِی: ٣/ ١٢٠، ٣/ ١٤٥ وتکلم الألبانِی علی الحدِیثِ طوِیلا فِی سِلسِلةِ الأحادِیثِ الصحِیحةِ برقم:٢٠٣.

کو باقی رکھنے کا کہا جو اہل حرفہ؛ صناعت گر اور تاجر وغیرہ ہوں' تاکہ ان سے دنیاوی امور میں فائدہ حاصل کیا جائے۔اس نے مسلمانوں کے اوقاف پر قبضہ کرلیا۔جس سے اس نے مشرکین کے علماء اور ان کے مشائخ ؛ جادوگروں اور ان جیسے دوسرے گندے لوگوں کو نوازنا شروع کیا؛ اور اتنا نوازا کہ اس کی صحیح مقدار کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

اسی طوسی نے صابی مشرکین کی راہوں پر مراغہ کے مقام پر سرائے تعمیر کروائی؛ اس سرائے سے سب سے کم وہ لوگ فائدہ اٹھا سکتے تھے جو اہل ملت یا ان کے قریب تر ہوں اور سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے والے صابی اور معطلہ مشرکین تھے۔

طوسی اور اس کے متبعین کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اسلام کو صرف بطورِ پردہ اور ڈھال کے استعمال کرتے تھے۔ نماز اور دیگر فرائض شریعت کے قریب بھی نہ پھٹکتے تھے۔اور نہ اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں جیسے فحاشی؛ زنا' شراب اور دوسری برائیوں سے رکتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ رمضان کے دنوں میں بھی شراب پیتے؛ حرام کاری کرتے اور نمازیں ضائع کرتے تھے۔اہل علم پر یہ باتیں مخفی نہیں ہیں۔ان کی اپنی ذات قوت اور شوکت نہیں تھی؛ بلکہ مشرکین کے سہارے پر چلتے تھے؛ جن کا دین یہود و نصاری کے دین سے برا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جیسے جیسے مغلوں میں اسلام پھیلنے اور مضبوط ہونے لگا تو ان کی شان وشوکت دم توڑتی چلی گئی؛ اس لیے کہ یہ لوگ اسلام اور اہل اسلام سے سخت بغض و نفرت رکھتے تھے۔اسی بنا پر امیر نوروز جو کہ سچا مسلمان بادشاہ اور اللہ کی راہ کا سچا مجاہد تھا؛ جس نے مغل بادشاہ غازان کو اسلام کی دعوت دی اور اس نے عہد کیا کہ اگر وہ مسلمان ہوگیا تو وہ اس کی مدد کرے گا' جس نے جادوگروں اور بخشیہ وغیرہ مشرکین کو قتل کیا؛ ان کے مندر و معبد ہدم کیے؛ بت توڑے؛ اور یہود و نصاری پر جزیہ نافذ کیا؛ اس کی وجہ سے مغلوں میں اسلام پھیلا اور غالب ہوا؛ اس بادشاہ کے ہاں ان روافض کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔بہرکیف خواجہ طوسی اور اس کے اتباع کا معاملہ کچھ ڈھکا چھپا نہیں سب مسلمان اس کی بدکرداریوں سے آگاہ ہیں۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ نصیر الدین طوسی اپنی زندگی کے آخری دور میں بہت بدل گیا تھا اور پابندی سے نماز پڑھنے لگا تھا، وہ مشہور محدث وفقیہ امام بغوی کی تفسیر قرآن اور فقہ کا مطالعہ بھی کیا کرتا تھا۔[1]

اگر اس نے واقعی اپنے الحاد سے توبہ کرلی تھی تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کے گناہ معاف کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا﴾ (الزمر:۵۳)

---

[1] اگر طوسی کی زندگی میں انقلاب و اصلاح کی یہ خبر درست ہے تو اسے چاہیے تھا کہ وہ ان کفریات سے اعلانیہ توبہ کرتا جن سے اس کی کتاب زندگی لبریز ہے۔اس نے تازیست اعلانیہ جس کفر اور اللہ و رسول ﷺ نیز مسلمانوں کے خلاف جس خیانت کاری کا ارتکاب کیا اس سے خاموشی کے ساتھ تائب ہوجانا کمال توبہ کی دلیل نہیں۔اور اگر اس کے سوا اس کا اور کوئی گناہ نہ ہوتا کہ اس نے ابن المطہر جیسے غالی شیعہ کے دلوں کو عداوت و بغض صحابہ سے بھر دیا تو لازم تھا کہ وہ اعلانیہ اپنی توبہ کا اس طرح اظہار کرتا جو ابن المطہر جیسے لوگوں پر ایک واضح حجت ہوتا۔

''فرمادیجیے: اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی! اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ، بیشک اللہ سب کے سب گناہ بخش دیتا ہے۔''

لیکن جو کچھ اس کے بارے میں نقل کیا گیا ہے؛ اگر یہ توبہ سے پہلے کا ہے' تو اس کا قول قبول نہیں کیا جاسکتا۔ اور اگر یہ توبہ کے بعد کے واقعات ہیں تو پھر اس نے رافضیت سے سچی توبہ نہیں کی تھی۔ بلکہ ممکن ہے صرف الحاد سے توبہ کی ہو [اور رافضیت پر باقی رہا ہو]۔ ہر دو صورتوں میں اس کی بات ناقابل قبول ہے۔

ظاہر بات تو یہ ہے کہ یہ مغل بادشاہ کا نجومی تھا؛ اور اہل الحاد و مشرکین کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ [اس کی توبہ کی روایت کے کوئی ثقہ راوی نہیں مل سکے]۔

طرفہ تماشا یہ ہے کہ جو انسان حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان اور ان کے علاوہ دیگر سابقین اولین مہاجرین و انصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین پر جرح و قدح کرتا ہے؛ امام مالک؛ شافعی؛ ابوحنیفہ اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ جیسے لوگوں پر اور ان کے ماننے والوں پر طعن و تشنیع کرتا ہے اور انہیں ان کی بعض غلطیوں کی وجہ سے عار دلاتا ہے' جیسے شطرنج اور گانے کو مباح کہنا۔ اسے کیسے یہ گوارا ہوگیا کہ وہ ان لوگوں کی باتیں بطور حجت کے پیش کرے جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے ' اور نہ ہی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حرام کردہ چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں۔ نہ ہی اللہ کے دین حق کو قبول کرتے ہیں۔ اور ان حرام چیزوں کو حلال سمجھتے ہیں جنہیں حرام کہنے پر پوری امت کا اتفاق ہے؛ جیسے زنا کاری اور شراب نوشی؛ اور پھر وہ بھی رمضان کے دنوں میں؛ اور نمازیں ضائع کرنا' شریعت محمدی میں نقب زنی کرنا؛ محرمات دین کو حقیر سمجھنا؛ اور مؤمنین کی راہ چھوڑ کر مشرکین کی راہ اختیار کرنا۔

ان کے بارے میں یہی رائے درست ہے؛ جیسا کہ کہا گیا ہے:

الدین یشکو بلیّة — من فرقة فلسفیة
لا یشھدون صلاة — إلا لأجل التقیة
ولا تری الشرع إلا — سیاسة مدنیة
ویؤثرون علیه — مناھجاً فلسفیة "

روافض کا ہمیشہ یہی حال رہا ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ سے اولیاء اور پرہیز گار و پارسا لوگوں صحابہ کرام مہاجرین و انصار اور سابقین اولین رضی اللہ عنہم اجمعین کے دشمن رہے ہیں۔ اور کفار و منافقین سے ان کی دوستی رہی ہے۔ اپنے آپ کو اسلام کی طرف منسوب کرنے والوں میں سب سے بڑے منافق ملحد باطنی اسماعیلیہ ہیں۔ پس جو کوئی اپنے قول کی تائید میں ان کے اقوال بطور حجت کے پیش کرے؛ حالانکہ وہ اس سے پہلے ائمہ اسلام پر طعنہ زنی کر چکا ہے؛ تو ایسا انسان لوگوں میں سب سے بڑھ کر اہل نفاق سے دوستی رکھنے والا اور اہل ایمان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

طوسی کے متعلق ابن المطہر کی رائے:

مقام حیرت واستعجاب ہے کہ یہ خبیث کذاب رافضی (ابن المطہر) جب سابقین اولین خلفاء راشدین ابوبکر وعمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین اور تابعین کرام اور دیگر ائمہ مسلمین اہل علم ودیندار لوگوں کا ذکر کرتا ہے تو ان کے خلاف من گھڑت کذب و دروغ کا طوفان کھڑا کر دیتا ہے۔ اور جب اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اعلان جنگ کرنے والے طوسی کا تذکرہ چھیڑتا ہے، تو اسے "شَیْخُنَا الْاَعْظَمْ" اور قَدَّسَ اللّٰهُ رُوْحَهٗ" کے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ پھر اسی شیخ الاعظم اور اس کے امثال پر کفر کا فتوی بھی لگاتا ہے۔ اور اگلے اور پچھلے دور کے بہترین اہل ایمان پر لعنت بھی کرتا ہے۔ یہ لوگ دراصل مذکورہ ذیل آیت قرآنی کے مصداق ہیں:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَ الطَّاغُوْتِ وَ یَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰی مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا☆اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَ مَنْ یَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِیْرًا ﴾ (النساء: ۵۱-۵۲)

"کیا آپ نے انہیں نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا کچھ حصہ ملا ہے؟ جو بت پرستی کا اور باطل معبود کا اعتقاد رکھتے ہیں اور کافروں کے حق میں کہتے ہیں کہ یہ لوگ ایمان والوں سے زیادہ راہ راست پر ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ تعالیٰ لعنت کر دے تو آپ اس کا کوئی مددگار نہ پائیں گے۔"

بیشک امامیہ فرقہ والوں کو کتاب اللہ کے بعض اجزاء پر ایمان رکھنے کی وجہ سے کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا ہے۔ اور ان میں طاغوت پر ایمان اور جادوگری کے شعبے بھی پائے جاتے ہیں۔ اللہ کے علاوہ جس کی بھی بندگی کی جائے اس کو طاغوت کہتے ہیں۔ یہ لوگ فلسفہ کی تعظیم کرتے ہیں اور مردوں کو پکارتے اور ان کی عبادت کرتے ہیں۔ قبروں پر درگاہیں تعمیر کرتے ہیں۔ قبروں کی زیارت کے سفر کو حج سے تعبیر کرتے ہیں؛ انہوں نے کتابیں تحریر کی ہیں: "درگاہوں کے حج کے ارکان۔"

ہم سے بعض ثقہ لوگوں نے بیان کیا ہے کہ ان شیعہ وروافض میں ایسے لوگ بھی ہیں جو درگاہوں کے حج کو بیت اللہ کے حج سے زیادہ باعث اجر وثواب سمجھتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے کو خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت سے عظیم تر اور اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ یہ طاغوت پر ایمان کی سب سے بڑی نشانی ہے۔

شیعہ قدم عالم اور ستاروں کے پجاریوں؛ اور مشرکین کو کافر کہنے کا انکار کرتے ہیں۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ ان سے زیادہ سیدھے راستے پر ہیں جو ایمان لائے ہیں۔ پس بیشک یہ لوگ ان ملحدین اور مشرکین کو مہاجرین وانصار سابقین اولین اور تابعین کرام پر فضیلت دیتے ہیں۔ نیز مسلمانوں کو قتل کرنے کے لیے رافضیوں کی یہود ونصاریٰ اور مشرکین کے ساتھ گٹھ جوڑ اتنی ظاہر وعام ہے کہ ہر خاص وعام اسے جانتا ہے۔ یہاں تک کہ کہا گیا ہے:

جب کبھی بھی مسلمانوں اور یہودیوں' مسلمانوں اور عیسائیوں اور مسلمانوں اور مشرکین کے مابین کوئی جنگ ہوتی ہے تو رافضی یہود ونصاریٰ اور مشرکین کے ساتھ مل جاتے ہیں۔

تیسری وجہ:...... یہ بات طے شدہ ہے کہ اسماعیلیہ اور نصیریہ میں سے ہر ایک گروہ شیعیت کا اظہار کرتا ہے۔ اگر چہ وہ باطن میں پکے کافر اور ہر ملت سے ہٹے ہوئے ہیں۔ نصیریہ غالی رافضیوں میں سے ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اِلہ مانتے ہیں۔ یہ گروہ باتفاق مسلمین یہود و نصاری سے بڑے کافر ہیں۔

اسماعیلیہ باطنیہ ان سے بھی بڑے کافر ہیں۔ ان کے عقیدہ کی حقیقت تعطیل پر مبنی ہے۔ ان کے ناموس اکبر اور بلاغ اعظم جن کا ان کے ہاں سب سے بڑا مرتبہ مانا جاتا ہے۔ ان کا شمار دھریوں میں ہوتا ہے جو کہتے ہیں: اس عالم کا بنانے والا کوئی بھی نہیں۔ نہ ہی عالم کو پیدا کرنے کی کوئی علت ہے اور نہ ہی کوئی پیدا کرنے والا خالق۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ:'' ہمارے اور فلاسفہ کے مابین صرف واجب الوجود کا اختلاف ہے۔ فلاسفہ اسے ثابت کرتے ہیں' حالانکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کا مذاق اڑاتے ہیں۔ خصوصی طور پر ''اسم جلالہ ''اللہ'' کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان میں ایسے بھی لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی کو اپنے پاؤں کے نیچے لکھتے ہیں تا کہ انہیں روند سکیں۔

ان کے علاوہ جو لوگ ہیں وہ سابق اور لاحق کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ جنہیں فلاسفہ عقل اور نفس سے تعبیر کرتے ہیں اور مجوسی اسے نور اور ظلمت سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے لیے صابئیت اور مجوسیت کے عقائد سے ایک مذہب ترکیب دیا ہے جسے وہ شیعیت کے لباس میں ظاہر کرتے ہیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ مجوسی اور صابی یہود و نصاری سے برے ہیں؛ مگر انہوں نے شیعیت کے لباس میں خود کو ظاہر کیا۔

ان کا کہنا ہے: تمام گروہوں میں سے شیعہ سب سے جلدی ہماری دعوت قبول کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ان لوگوں میں شریعت سے خروج پایا جاتا ہے؛ اور اس گروہ میں جہالت اور مجہول چیزوں کی تصدیق پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے ان کے ائمہ باطن میں فلاسفہ ہوا کرتے تھے؛ جیسے مذکورہ بالا شخص نصیر طوسی وغیرہ۔ اور سنان بصری' جس نے شام کے علاقہ میں اپنے قلعے بنا لیے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ: ان لوگوں سے نماز و روزہ و زکوٰۃ اور حج کے احکام ختم کر دیے گئے ہیں۔

اسماعیلیہ اپنے آپ کو شیعیت کے لباس میں ظاہر کرتے ہیں۔ یہ لوگ شیعیت کے راستہ سے ہی اسلام میں داخل ہوئے اور اسی راستہ سے اسلام سے نکل گئے۔ اسماعیلیہ فرقہ والے روافض کی طرف مہاجر اور ان کے انصار ہیں؛ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے انصار نہیں ہیں؛ تو اس سے پتہ چلا کہ روافض کے حق میں اسماعیلیہ کی گواہی کہ وہ حق پر ہیں باتفاق عقلاء مردود ہے۔ اس لیے کہ یہ گواہ: اگر یہ بات جانتا ہے کہ وہ جس دین وعقیدہ پر ہے وہ باطن میں دین اسلام کے خلاف ہے؛ مگر وہ شیعیت کا اظہار اس لیے کرتا ہے تا کہ مسلمانوں کے سامنے منافقت کا مظاہرہ کر سکے؛ تو اس صورت میں یہ انسان شیعہ کی تعظیم بیان کرنے کے لیے محتاج ہے۔ تو اس کی گواہی ایسے ہی ہے جیسے کوئی انسان اپنے نفس کے لیے گواہی دے۔ [کسی آدمی کی اپنی ذات کے لیے گواہی نا قابل قبول ہے]۔ لیکن اس گواہی میں گواہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ درایں حال وہ ویسے جھوٹا ہے جیسا کہ وہ باقی احوال وامور میں جھوٹ بولتا ہے۔

اگروہ باطن میں دین اسلام کا عقیدہ رکھتا ہے' مگر یہ خیال کرتا ہے کہ یہی روافض دین اسلام پر ہیں۔تو پھر بھی یہ اپنی ذات کے لیے گواہی دینے والا ہے؛ مگراب اس کی گواہی جہالت اور گمراہی پر مبنی ہے۔پس دونوں صورتوں میں کسی انسان کی اپنی ذات کے لیے گواہی ناقابل قبول ہے۔خواہ اسے اپنے جھوٹ کا علم ہو یا وہ اپنے سچا ہونے کا یقین رکھتا ہو۔جیسا کہ مسند میں نبی کریم ﷺ سے روایت کیا گیا ہے؛ آپ نے فرمایا:

''جھگڑا کرنے والی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔ اور اپنے مسلمان بھائی سے حسد رکھنے والے اور کینہ وعداوت رکھنے والے کی گواہی جائز نہیں ہے۔''[المسند ١٠/ ٢٢٤]

اسماعیلیہ جھگڑالو فریق اہل سنت والجماعت سے حسد کرنے اور بغض رکھنے والے ہیں؛انکی گواہی ہر لحاظ سے مردود ہے۔

چوتھی وجہ:...... پہلے ان سے کہا جائے گا:''تم تو ایسی احادیث سے استدلال نہیں کرتے۔اس لیے کہ یہ احادیث اہل سنت نے اپنی اسناد سے روایت کی ہیں۔یہ حدیث بذات خود صحیحین میں موجود نہیں ہے۔بلکہ اس حدیث پر بعض محدثین جیسے ابن حزم وغیرہ نے جرح بھی کی ہے۔لیکن اس حدیث کو روایت کرنے والے اصحاب سنن جیسے ابوداؤد' ترمذی ؛ابن ماجہ وغیرہ'اوراہل مسانید جیسے امام احمد وغیرہ محدثین ہیں۔تمہارے اصولوں کے مطابق یہ حدیث ثابت کہاں ہے جو تم اسے بطور حجت پیش کرتے ہو؟ اور اگراس کو ثابت مان بھی لیا جائے تو پھر بھی یہ روایت خبر واحد ہے۔تو پھر تمہارے لیے کہ کیسے روا ہوگیا کہ مسلمانوں کو گمراہ کرنے کیلئے تم اصول دین میں سے ایک اصل پر ایسی خبر واحد سے حجت پیش کرو جسے فروعات علمیہ میں بھی بطور حجت پیش نہیں کیا جاتا۔یہ تمہاری سب سے بڑی جہالت اور بہت بڑا تناقض نہیں تو اور کیا ہے؟

[حدیث تفرقہ کی تشریح]:

پانچویں وجہ:......اس حدیث کی تفسیر وتشریح دوطرح سے کی گئی ہے:

پہلی صورت:...... نبی کریم ﷺ سے نجات پانے والے فرقہ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

''نجات پانے والا فرقہ وہ ہے جو اس راہ پر ہو جس پر آج کے دن میں اور میرے صحابہ ہیں۔''

اور دوسری روایت میں ہے:''وہ جماعت ہیں۔''

دونوں تفسیروں کی روشنی میں امامیہ کے قول میں تناقض پایا جاتا ہے۔اور اس کا تقاضا ہے کہ یہ لوگ فرقہ ناجیہ سے خارج ہوں۔اس لیے کہ امامیہ مسلمانوں کی جماعت سے خارج ہیں۔ یہی نہیں بلکہ یہ لوگ اس جماعت کے ائمہ جیسے: حضرت ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کو کافر اور فاسق کہتے ہیں؛ حضرت معاویہ اور خلفاء بنوامیہ اور بنوعباس کو تو چھوڑیے؛ ان کی بات ہی علیحدہ ہے۔ ایسے ہی امامیہ اہل سنت والجماعت کے ائمہ وعلماء اور عباد وزھاد جیسے: امام مالک' ثوری؛ اوزاعی؛لیث بن سعد؛ ابوحنیفہ؛ شافعی؛ احمد؛ اسحق؛ ابوعبید؛ ابراہیم بن ادہم ؛فضیل بن عیاض؛ ابوسلیمان دارانی؛معروف کرخی رحمہم اللہ؛ اوران جیسے دیگر لوگوں کو کافر و فاسق کہتے ہیں۔جب کہ یہ لوگ بذات خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی سیرت کی

معرفت اوران کی اقتداء سے بہت دور ہیں۔یہ باتیں ہر وہ شخص جانتا ہے جسے حدیث اورمنقولات کا علم ہو۔اور ثقہ اور ضعیف راویوں کی معرفت حاصل ہو۔

امامیہ تو ان علوم سے کورے اور بہت دور ہیں ۔حدیث سے بغض رکھنے کی وجہ سے سب سے بڑے جاہل شمار ہوتے ہیں اورمحدثین اوراہل سنت سے دشمنی میں بڑھے ہوئے ہیں۔

پس اگرنجات پانے والا فرقہ وہ ہے جوعہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا مقتدا اور پیروکار ہو؛ تو پھر یہی تو اہل سنت والجماعت کا شعار ہے۔اس بنا پرنجات پانے والی جماعت اہل سنت والجماعت ہیں ۔سنت اس چیز کو کہتے ہیں : جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ گامزن ہوں ؛یا جس چیز کا آپ نے حکم دیا ہو‘یا جس کو برقرار رکھا ہو‘یا خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہو۔ جماعت وہ لوگ ہیں جواپنے دین کا شیرازہ بکھیر کر ٹولے ٹولے نہیں ہوگئے‘ بلکہ وہ ایک چیز پر جمع رہے ۔جن لوگوں نے دین میں تفرقہ ڈالا اورشیعہ [ٹولہ] بن گئے‘ وہ اس جماعت سے خارج ہیں‘اور اللہ اوراس کا رسول ان سے بری ہیں ۔تو معلوم ہوا کہ نجات یافتہ ہونا اہل سنت والجماعت کا وصف ہے ؛ رافضہ کا وصف نہیں ۔اس حدیث میں فرقہ ناجیہ [اہل سنت والجماعت] کے اوصاف اتباع سنت اورصحابہ کرام کی راہ پر گامزن رہنے اورمسلمانوں کی جماعت کے ساتھ چپکے رہنے کی وجہ سے بیان ہوئے ہیں ۔

[**احتمال**]: اگر کہا جائے : حدیث میں آیا ہے:’’ جواس راہ پر ہوجس پر آج کے دن میں اور میرے صحابہ ہیں ۔‘‘ پس جولوگ ان کے بعد آئے ؛ اس طریقہ سے نکل گئے‘تو وہ فرقہ ناجیہ میں سے نہیں ہوں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بہت سارے لوگ مرتد ہوگئے تھے پس اس بنیاد پر وہ نجات پانے والے فرقہ میں سے نہیں ہوں گے۔‘‘

[**جواب**]:اس میں کوئی شک نہیں یہ درست بات ہے؛ ارتداد میں سب سے مشہور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مخالفین ہیں‘ جن سے آپ نے جنگیں لڑیں۔ان میں مسیلمہ کذاب اوراس کے اتباع وغیرہ شامل ہیں ۔ان لوگوں سے تو رافضی محبت کرتے اور دوستی رکھتے ہیں؛ جیسا کہ کئی ایک رافضی مشائخ نے واضح کیا ہے۔خوداس امامی شیعہ مصنف کا بھی عقیدہ ہے ۔ یہ مرتدین کے بارے میں کہتے ہیں : وہ حق پر تھے۔اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں ناحق قتل کیا ہے ۔ پھر لوگوں میں سب سے بڑے مرتد وہ غالی شیعہ تھے جنہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس وقت آگ میں جلا ڈالا تھا جب انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق الہ [یعنی رب] ہونے کا دعوی کیا۔یہ لوگ فرقہ سبائیہ سے تعلق رکھتے تھے جوعبد اللہ بن سباء یہودی کے پیروکار تھے؛ جس نے سب سے پہلے حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو گالیاں دینا شروع کی تھیں۔

خود کو اسلام کی طرف منسوب کرنے والوں میں سب سے پہلے جس نے نبوت کا دعوی کیا تھا وہ مختار بن ابوعبید ثقفی تھا؛ اس کا تعلق شیعہ سے تھا۔معلوم ہوا کہ لوگوں میں سب سے بڑے مرتد شیعہ کی صفوں میں موجود ہیں۔اس لیے نصیریہ باطنیہ شیعہ اوراسماعیلیہ ملحدہ سے بڑھ کر بدحال مرتدین کا علم نہیں ہوسکا۔ جب کے مرتدین کے ساتھ قتال میں سب سے مشہور ہستی جناب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔آپ ان مرتدین کے علاوہ کسی بھی گروہ میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دشمن

نہیں پاؤ گے۔ پس اس سے دلیل واضح ہوگئی ہے کہ جو مرتدین ہمیشہ سے اپنی ایڑیوں کے بل پھرتے رہے؛ وہ اہل سنت و الجماعت کی نسبت رافضہ کے زیادہ قریب ہیں۔

یہ معاملہ ہر اس انسان کے لیے واضح ہے جسے اسلام اور مسلمانوں کی ادنی سی معرفت حاصل ہو۔اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ مرتد جو اپنے آپ کو شیعیت کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ ان مرتدین سے بڑے کافر اور ظالم ہیں جو اپنے آپ کو اہل سنت والجماعت کی طرف منسوب کرتے ہیں؛ اگر ایسے کوئی مرتد ہوں؛[لیکن ایسا ہے نہیں]۔

چھٹی وجہ:...... یہ دلیل جس سے طوسی نے امامیہ شیعہ کے فرقہ ناجیہ ہونے پر استدلال کیا ہے؛ اس نے اس کے اوصاف بیان کرتے ہوئے دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ جبکہ خود یہ دلیل اور اس سے استدلال دونوں باطل ہیں۔شیعہ کہتا ہے:

''امامیہ باقی تمام مذاہب سے جدا ہیں' اور باقی تمام مذاہب اصول عقائد میں مشترک ہیں۔''

اگر جدا ہونے سے شیعہ مصنف کی مراد یہ ہے کہ اپنے مخصوص مسائل میں باقی فرقوں سے جدا ہیں: تو تمام فرقوں میں یہ چیز پائی جاتی ہے [اس میں شیعہ کی کوئی خصوصیت نہیں]۔اس لیے کہ خوارج بھی اپنے مخصوص مسائل میں باقی تمام فرقوں سے جدا ہیں جیسے کہ وہ کبیرہ گناہوں کی وجہ سے تکفیر کرتے ہیں؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر کفر کا فتوی لگاتے ہیں؛ اور جس چیز کی خبر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ دی گئی ہو' اس میں رسول کی اطاعت کو ساقط شمار کرتے ہیں۔اور اللہ تعالیٰ کے لیے حکم؛ تقسیم اور دیگر امور میں ظلم کو جائز کہتے ہیں۔اور ان متواتر سنتوں کو نہیں مانتے جو ان کے خیال میں ظاہر قرآن کے مخالف ہیں؛ جیسے: چور کا ہاتھ کلائی سے کاٹنا؛ اور اس طرح کے دیگر امور۔

علامہ اشعری رحمہ اللہ اپنی کتاب ''المقالات'' میں فرماتے ہیں:'' خوارج کا اجماع ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تحکیم کے قضیہ کے بعد کافر ہوگئے تھے۔مگر اس بابت ان کا اختلاف ہے کہ کیا آپ کا کفر شرک بھی تھا یا نہیں؟ نجدات کے علاوہ باقی تمام خوارج کا اتفاق ہے کہ ہر کبیرہ گناہ کفر ہے۔نجدات کبیرہ گناہوں کو کفر نہیں کہتے۔اور ایسے ہی نجدات کے علاوہ باقی تمام خوارج کا اجماع ہے کہ کبیرہ گناہ کے مرتکب کو اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم کا عذاب دے گا۔

ایسے ہی معتزلہ بھی اپنے مخصوص مسائل میں باقی تمام فرقوں سے جدا ہیں۔مثال کے طور پر وہ دو منزلوں کے درمیان میں ایک منزل کا عقیدہ رکھتے ہیں؛ اور کہتے ہیں کہ:'' کبیرہ گناہ کا مرتکب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہے گا۔'' کیونکہ یہ لوگ نہ ہی مؤمن ہیں اور نہ ہی کافر۔یہی وہ قول ہے جو اصل میں معتزلہ کا عقیدہ تھا؛ اور بعد میں ان سے زیدیہ نے لیا۔

ایسے ہی سنت اور اہل سنت والجماعت کی طرف منسوب لوگوں میں سے بھی ہر ایک جماعت اپنے مخصوص مسائل میں دوسری جماعت سے جدا ہے۔کلابیہ اپنے اس قول میں تمام لوگوں سے جدا ہیں کہ: کلام کا ایک ہی معنی ہے؛ یا متعدد معانی ہیں؛ یا تین چار معانی ہیں جو کہ متکلم کی ذات کے ساتھ قائم ہوتے ہیں۔اس سے مراد امر و نہی اور خبر ہیں۔اگر اسے عربی میں تعبیر کیا جائے تو اس سے مراد قرآن ہے؛ اور اگر اسے عبری زبان میں تعبیر کیا جائے تو اس سے مراد تورات ہے۔ یہ بات باقی فرقوں میں سے کسی ایک نے بھی نہیں کہی۔

کرامیہ اپنے مخصوص عقیدہ میں باقی تمام لوگوں سے جدا ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ: ایمان صرف زبان سے اقرار کا نام ہے۔ پس جو کوئی اپنی زبان سے اقرار کرے وہ مؤمن ہو جاتا ہے۔اگر چہ وہ اپنے دل سے اس کو نہ بھی مانتا ہو۔ پس ایسا انسان مؤمن ہوگا لیکن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہے گا۔ یہ بات کرامیہ کے علاوہ کسی نے نہیں کہی۔

بلکہ اہل سنت والجماعت کے مشہور اہل علم گروہوں میں سے ہر ایک گروہ کے کچھ ایسے اقوال بھی ہیں جن پر دوسرے گروہ کسی طرح بھی ان کی موافقت نہیں کرتے۔ امام ابوحنیفہ؛ امام مالک' امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ میں ہر ایک کے کوئی ایسے منفرد مسائل ہیں جن میں وہ دوسرے تینوں ائمہ سے جدا ہے۔

اگر شیعہ مصنف کی مراد یہ ہو کہ: امامیہ اپنے تمام مسائل میں باقی فرقوں سے جدا ہیں؛ تو ایسا کہنا صحیح نہیں ہے۔اس لیے کہ امامیہ توحید میں معتزلہ کے ہم نوا اور موافق ہیں۔ان کے پرانے لوگ مجسمہ کے عقیدہ پر تھے۔ایسے ہی تقدیر کے مسائل میں بھی امامیہ معتزلہ سے موافقت رکھتے ہیں۔ ان کے پرانے لوگوں میں سے بہت سارے تقدیر کو نہیں مانتے تھے۔ان کے قدماء میں انکار تقدیر کا مسئلہ انکار صفات ربانی سے زیادہ مشہور تھا۔

ایسے ہی جہنمیوں کو جہنم سے نکالے جانے اور اہل کبائر کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے معافی اور مغفرت کے بارے میں ان کے دو قول ہیں۔ان کے متاخرین اس مسئلہ میں وقفیہ کی موافقت رکھتے ہیں۔ وقفیہ کہتے ہیں: ہمیں پتہ نہیں کیا اہل قبلہ میں سے کوئی ایک جہنم میں داخل ہوگا یا نہیں؟ وقفیہ اصل میں اشعریہ کا ایک گروہ ہیں۔ اگر چہ وہ یہ بھی کہتے ہیں: ہم یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ بہت سارے اہل کبائر جہنم میں داخل ہوں گے۔جیسا کہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے۔

جملہ طور پر ان کے کچھ خاص اقوال وعقائد ہیں۔اور کچھ ایسے اقوال ہیں جن میں دوسرے لوگ ان کے ساتھ شریک ہیں۔ یہی حال معتزلہ اور خوارج کا بھی ہے۔ جب کہ اہل حدیث اہل سنت والجماعت ان کی خصوصیت کتاب وسنت کی اتباع اور اصول وفروع میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے طریقہ کار کی اتباع ہے۔ بخلاف خوارج' معتزلہ اور روافض کے۔جو کوئی بعض اقوال میں ان کی اتباع کرے گا؛ اسے یاد رکھنا چاہیے کہ یہ فرقے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثقہ راویوں کی اسناد سے ثابت شدہ احادیث پر عمل نہیں کرتے۔

معتزلہ کہتے ہیں: یہ اخبار احاد ہیں۔رافضہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین پر اور ان سے روایات نقل کرنے والے علماء پر طعن کرتے ہیں۔اس سے مقصود باطنی طور پر رسالت محمدی پر طعنہ زنی کرنی ہوتی ہے۔خوارج میں سے کوئی کہنے والا کہتا: اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!''عدل سے کام لیجئے۔ بیشک آپ عدل نہیں کررہے۔'' یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ظلم کو جائز کہتے ہیں۔اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پہلے شخص کے لیے فرمایا تھا:

''تیری خرابی ہو جب میں عدل نہ کروں تو اور کون عدل کریگا؟ اگر میں نے عدل نہ کیا تو تو ناکام ونامراد ہو گیا۔''[1]

---

[1] البخاري:٤/ ٢٠٠؛كتاب المناقبِ، باب علاماتِ النبوةِ، مسلِم:٢/ ٧٤٤؛كتاب الزكاةِ، باب ذِكرِ الخوارِجِ وصِفاتِهِم، المسندِ الحلبِي:٣/ ٦٥، وانظر:سنن ابنِ ماجه:١/ ٦٠؛المقدِمة، باب مِن ذِكرِ الخوارِجِ، جامِع الأصولِ لِابنِ الأثِيرِ:١٠/ ٤٣٦.

یہ لوگ جاہل ہیں جو اپنی جہالت کی وجہ سے سنت سے بہت دور ہو گئے ہیں۔ جب کہ رافضہ کی بنیاد نفاق کی بدعت پر قائم ہے۔اس وجہ سے ان میں وہ زندیقیت پائی جاتی ہے جو خوارج میں بھی نہیں پائی جاتی۔علامہ ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ '' المقالات'' میں فرماتے ہیں:

''یہ حکایت اہل سنت والجماعت' اہل حدیث کی ہے۔جس مجمل عقیدہ پر اصحاب الحدیث اور اہل سنت والجماعت قائم ہیں' وہ: اللہ تعالیٰ کا' اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا اقرار ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے اس پر ایمان ہے۔اور جو خبریں ثقہ راویوں نے رسول اللہ ﷺ سے نقل کی ہیں' ان کو رد نہیں کرتے ۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اکیلا معبود برحق ہے ؛ وہ اکیلا یکتا اور بے نیاز ہے؛ اس کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں ۔ اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں ۔ اور یہ کہ جنت حق ہے' اور جہنم حق ہے ۔ اور قیامت آنے والی ہے' اس میں کوئی شک نہیں ۔ اور بیشک اللہ تعالیٰ قبروں میں پڑے ہوؤں کو دوبارہ اٹھائیں گے۔ اور بیشک اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ [طه ۵] ''رحمن نے اپنے عرش پر قرار پکڑا ہے۔''

اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے دو ہاتھ ہیں؛ جن کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ [ص ۷۵] ''میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا۔''

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ﴾ (المائدة ۶۴) ''بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔''

اور پھر آخر تک پورا کلام کیا ہے۔''

[اعتراض] : اگر کوئی کہے: جدا ہونے سے رافضی مصنف کی مراد یہ ہے کہ وہ اپنے دار کے علاوہ باقی تمام دار کے لوگوں کو کافر کہتے ہیں۔جیسا کہ کئی ایک شیعہ مشائخ نے فتوی دیا ہے کہ جب دار ایسا ہو جس میں ناصبیوں کا مذہب غالب اور ظاہر ہو جیسے: موزوں پر مسح کرنا؛ جوس پینے کو حلال سمجھنا؛ متعہ کو حرام سمجھنا؛ تو ایسا دار دار کفر ہے ۔ یہاں کی مائع چیزوں پر نجاست کا حکم لگایا جائے گا۔اور طائفہ حقہ-یعنی امامیہ- کا مذہب یہاں پر ظاہر ہو؛ تو ان تمام مائع چیزوں کی طہارت کا حکم لگایا جائے گا ۔اور اگر دونوں چیزیں برابر ہوں ؛ تو توقف کیا جائے گا؛ اور دیکھا جائے گا کہ: جو کچھ اپنے گروہ کے لوگوں کے ہاں سے ہو؛ تو اس کی مائع چیزیں پاک ہوں گی۔اور جو کچھ دوسروں کے ہاں سے ہو؛ اس پر نجس ہونے کا حکم لگایا جائے گا۔''

[جواب] : ان سے کہا جائے گا کہ: اس وصف میں خوارج بھی ان کے ساتھ شریک ہیں ۔ بلکہ خوارج اس بارے میں ان سے زیادہ قوی ہیں۔اس لیے کہ خوارج ان کو قتل کرنا حلال سمجھتے ہیں۔اہل سنت والجماعت کے ساتھ ان کی جنگیں بڑی مشہور ہیں۔خوارج کے نزدیک ان کے دیار کے علاوہ باقی تمام دیار دیار کفر ہیں۔ان میں سے بعض نے تکفیر عام میں

اختلاف کیا ہے۔ جیسے بعض امامیہ نے بھی عام تکفیر میں اختلاف کیا ہے۔ اصل تکفیر میں یہ دونوں ایک دوسرے کے موافق ہیں۔ رہا تلوار کے استعمال کا مسئلہ؛ تو زیدیہ اسے جائز سمجھتے ہیں۔ اور امامیہ اسے جائز نہیں سمجھتے۔ علامہ اشعری فرماتے ہیں:

'' رافضہ کا خروج کے باطل ہونے اور تلوار کے انکار پر اجماع ہے' بھلے انہیں قتل ہی کیوں نہ کردیا جائے۔ یہاں تک کہ ان کا امام ظاہر ہوجائے اور وہ انہیں کسی بھی بات کا حکم دے۔''

میں کہتا ہوں: یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ کفار کے ساتھ جہاد نہیں کرتے۔ اور نہ ہی اہل سنت والجماعت حکمرانوں کی قیادت میں جہاد کرتے ہیں؛ سوائے اس حکمران کے زیر سایہ قتال کرتے ہیں جو ان کے مذہب پر چلتا ہو۔ اس سے ظاہر ہوگیا کہ اصول عقائد میں مباینہ اور اشتراک رافضہ اور دوسرے فرقوں کے مابین مشترکہ قدر ہے۔

ساتویں وجہ:......ان سے کہا جائے گا: ان کا تمام مذاہب سے جدا ہونا ان کے قول کی صحت سے بڑھ کر اس کے فساد پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے کہ محض کسی گروہ کا دوسرے گروہوں سے جدا ہونا ان کے حق پر ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ اور کسی قول میں ان کا مشترک ہونا بھی ان کے باطل ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔

[تہتر فرقے ؟]:

[اعتراض]:......اگر کوئی کہے: نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کے تہتر فرقے بتائے ہیں۔ یہ تمام فرقے جہنمی ہوں گے سوائے ایک فرقہ کے۔ تو یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ اس ایک فرقہ کا باقی تمام بہتر فرقوں سے جدا ہونا ضروری ہے۔

[جواب]:......ہم کہتے ہیں: ہاں؛ ایسے ہی یہ حدیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ وہ بہتر فرقے آپس میں ایک دوسرے سے جدا ہوں۔ جیسے ایک ناجی فرقہ ان سے جدا ہوگا۔ اس حدیث میں کہیں بھی یہ دلالت نہیں ہے کہ یہ بہتر فرقے اصول وعقائد میں مشترک ہوں گے۔ بلکہ ظاہر حدیث دلالت کرتی ہے کہ یہ تمام تہتر فرقے ایک دوسرے سے جدا جدا ہوں گے۔ یہ بھی سبھی جانتے ہیں کہ آپس میں افتراق وتفرقہ قابل مذمت ہے؛ قابل مدح نہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے یک جا ہونے اور جماعت بندی کرنے کا حکم دیا ہے' اور فرقہ بندی کی مذمت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِیۡعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوۡا ﴾ [آل عمران ۱۰۳]

''اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّذِیۡنَ تَفَرَّقُوۡا وَ اخۡتَلَفُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ الۡبَیِّنٰتُ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۰۵﴾ یَّوۡمَ تَبۡیَضُّ وُجُوۡهٌ وَّ تَسۡوَدُّ وُجُوۡهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اسۡوَدَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ ۟ اَكَفَرۡتُمۡ بَعۡدَ اِیۡمَانِكُمۡ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ بِمَا كُنۡتُمۡ تَكۡفُرُوۡنَ ﴿۱۰۶﴾﴾ [آل عمران ۱۰۵۔۱۰۶]

'' تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے پاس روشن دلیلیں آ جانے کے بعد بھی تفرقہ ڈالا اور اختلاف کیا ان لوگوں کے لئے بڑا عذاب ہے۔ جس دن بعض چہرے سفید ہونگے اور بعض سیاہ؛ سیاہ چہروں

والوں (سے کہا جائے گا) کہ تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا؟ اب اپنے کفر کا عذاب چکھو۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''جن لوگوں کے چہرے سفید ہوں گے وہ اہل سنت والجماعت ہیں۔اور جن لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے وہ اہل بدعت اور فرقہ پرست لوگ ہیں۔'' [الدر المنثور:۲/ ٦٣]

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَہُمْ وَ کَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْہُمْ فِیْ شَیْءٍ ﴾ [الأنعام: ۱۵۹]

''بیشک جن لوگوں نے اپنے دین کو جدا جدا کر دیا اور گروہ بن گئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَا اخْتَلَفَ فِیْہِ اِلَّا الَّذِیْنَ اُوْتُوْہُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَ تْہُمُ الْبَیِّنٰتُ بَغْیًا بَیْنَہُمْ﴾ [البقرۃ ۲۱۳]

''صرف ان ہی لوگوں نے جو اسے دیئے گئے تھے، اپنے پاس دلائل آ چکنے کے بعد آپس کے بغض وعناد کی وجہ سے اس میں اختلاف کیا۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَ تْہُمُ الْبَیِّنَۃُ ﴾ [البینة ۴]

''اہل کتاب اپنے پاس ظاہر دلیل آ جانے کے بعد ہی (اختلاف میں پڑ کر) متفرق ہو گئے۔''

مسلمانوں کی جماعت سے علیحدہ ہونے والا گروہ جتنا ان سے دور ہوگا وہ بذات خود سب سے زیادہ قابل مذمت ہے اور جو گروہ جماعت کے ساتھ جتنا کم تفرقہ ڈالنے والا ہو؛وہ حق کے اتنا ہی زیادہ قریب ہوتا ہے۔ جب امامیہ فرقہ کے لوگ باقی سارے گروہوں اور جماعتوں سے سب سے زیادہ جدا اور دور ہیں تو وہ حق سے بھی اتنے ہی دور ہیں۔خصوصاً جب کہ یہ لوگ اپنے اندر بھی امت کے تمام گروہوں سے بڑھ کر داخلی انتشار کا شکار ہیں۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ: بہتر فرقے تو صرف شیعہ کے اندر موجود ہیں ۔ یہ تعداد تو طوسی سے اس کے بعض ساتھیوں نے نقل کی ہے۔طوسی کہا کرتا تھا: شیعہ فرقوں کی تعداد بہتر تک پہنچتی ہے۔شیعہ عالم نوبختی نے شیعہ فرقوں کی تعداد کے متعلق ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ جبکہ اہل سنت والجماعت اصول دین میں ان کے مابین باقی تمام گروہوں کی نسبت سب سے کم اختلاف پایا جاتا ہے ۔وہ ہر فرقہ کی نسبت حق سے زیادہ قریب تر ہیں ۔اہل کلام کی اصطلاح میں یہی لوگ متوسط امت ہیں۔جیسا کہ اہل اسلام باقی تمام مذاہب کے مابین متوسط ملت ہیں ۔اہل سنت والجماعت صفات باری تعالیٰ کے باب میں اہل تعطیل اور اہل تمثیل کے مابین متوسط طبقہ ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''بہترین کام متوسط درجہ کے ہیں۔''

اس لحاظ سے اہل سنت والجماعت باقی تمام فرقوں کی نسبت بہترین فرقہ ہیں ۔ تقدیر کے باب میں بھی اہل سنت و الجماعت جبریہ اور قدریہ کے درمیان میں ہیں۔اسماء اور احکام کے باب میں بھی اہل سنت والجماعت وعیدیہ اور مرجئہ کے

درمیان میں ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے باب میں بھی غالی اور جافی [جفا کرنے والے] کے درمیان میں ہیں۔ نہ ہی صحابہ کرام کی شان میں غلو کرتے ہیں جیسے رافضی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں غلو کرتے ہیں [ان کے بعض لوگ حضرت علی کو رب مانتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ آپ نبی تھے] اور نہ ہی خوارج کی طرح آپ کو کافر کہتے ہیں۔ ایسے ہی حضرت ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے باب میں بھی خوارج اور روافض کے درمیان میں ہیں۔ نہ ہی خوارج کی طرح حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو کافر کہتے ہیں اور نہ ہی روافض کی طرح حضرت ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کو کافر کہتے ہیں۔

[رافضیت کی ابتداء]:

آٹھویں وجہ:......ان کے جواب میں کہا جائے گا کہ: شیعہ کا کوئی ایک قول بھی ایسا نہیں ہے جس پر ان تمام کا اتفاق ہوا ہو۔ شیعہ مصنف نے جو قول ذکر کیا ہے وہ امامیہ شیعہ کا قول ہے۔ پھر امامیہ میں بھی ایسے گروہ ہیں جو ان سے توحید اور عدل میں اختلاف رکھتے ہیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے انکے بارے میں بیان ہو چکا۔ جمہور شیعہ بارہ اماموں کے بارے میں امامیہ اثنی عشریہ کے خلاف ہیں۔ پس زیدیہ؛ اسماعیلیہ اور کچھ دوسرے گروہ بارہ ائمہ کی امامت کے منکر ہونے پر متفق ہیں۔

❀ لوگوں کے عقائد پر لکھنے والے علماء فرماتے ہیں: ''شیعہ تین قسم کے ہیں: انہیں شیعہ اس وجہ سے کہتے ہیں کہ یہ لوگ [اپنے تئیں] حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیروکار ہیں' اور آپ کو باقی تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ غالیہ کہلاتا ہے۔ ان کا یہ نام اس وجہ سے رکھا گیا ہے کہ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں غلو کرتے ہیں اور ان کے بارے میں بہت ہی غلط قسم کے عقائد رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ آپ کو رب مانتے اور بعض نبی مانتے ہیں۔ پھر ان کی بھی کئی ایک اقسام ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ نصیریہ کا ہے۔ اور شیعہ کا دوسرا گروہ رافضہ کا ہے۔

علامہ اشعری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ان میں سے ایک گروہ کا نام رافضی پڑ گیا؛ اس لیے کہ یہ لوگ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت و امامت کا انکار کرتے تھے۔'' [المقالات ۱/ ٦٥]

میں کہتا ہوں: صحیح یہ ہے: ان کا نام رافضی اس وقت پڑا جب انہوں نے حضرت زید بن علی بن حسین بن علی ابن ابی طالب رحمہ اللہ و رضی اللہ عنہم اجمعین کا ساتھ اس وقت چھوڑ دیا جب آپ نے خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے دور میں کوفہ میں خروج کیا تھا۔ امام اشعری نے یہ بھی ذکر کیا ہے؛ اور دوسرے علماء نے بھی ذکر کیا ہے۔ [المقالات ۱/ ۱۲۹]

کہتے ہیں کہ: [شیعہ کے ایک گروہ کا نام] زیدیہ اس وجہ سے پڑ گیا کہ انہوں نے حضرت زید بن علی رحمہ اللہ کی بات کو پکڑے رکھا۔ ہشام بن عبدالملک کے ایام حکومت میں کوفہ میں حضرت زید رحمہ اللہ کی بیعت کی گئی تھی۔ اس وقت کوفہ کا امیر یوسف بن عمر ثقفی تھا۔ حضرت زید رحمہ اللہ [اپنے پردادا] علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو باقی تمام صحابہ پر فضیلت دیتے تھے؛ مگر حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت رکھتے تھے۔ آپ ظالم حکمرانوں کے خلاف بغاوت کو جائز سمجھتے تھے۔ جب کوفہ میں

آپ کا ظہور ہوا تو آپ کے ساتھ وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے آپ کی بیعت کی۔ آپ نے ان میں سے بعض سے سنا وہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما پر طعن و تشنیع کر رہے تھے۔ آپ نے ان کلمات کا انکار کیا [اور ایسا کہنے سے منع کیا]۔ تو جن لوگوں نے آپ کی بیعت کی تھی [ان میں سے کچھ لوگ] آپ کو چھوڑ کر چلے گئے۔ آپ نے ان سے پوچھا: کیا تم نے میرا ساتھ چھوڑ دیا؟ وہ کہنے لگے: ہاں؛

پس اسی وجہ سے ان کا نام رافضی [ساتھ چھوڑنے والے] پڑ گیا۔ کیونکہ حضرت زید بن علی رحمہ اللہ نے ان سے کیا تھا''رفضتمونی''، تم نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس وقت آپ کے ساتھ ایک چھوٹی سی جماعت باقی رہ گئی جن کی ہمراہی میں آپ نے یوسف بن عمر سے جنگ کی اور آپ کو شہید کر دیا گیا۔ [المقالات ۱/ ۸۷]

کہتے ہیں: رافضہ کا اجماع ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کا حکم صراحت کے ساتھ دیا تھا۔ اور آپ کا نام لیکر آپ کو خلیفہ منتخب کیا تھا۔ آپ نے اس کا اظہار و اعلان بھی کیا تھا۔ مگر صحابہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد آپ کی اقتداء ترک کر کے گمراہ ہو گئے۔ اور ان کا کہنا یہ ہے کہ: امامت نص اور وحی کے بغیر منعقد نہیں ہو سکتی۔ اور امامت حق قرابت بھی ہے۔ اور امام کے لیے جائز ہے کہ وہ تقیہ کرتے ہوئے کہے کہ وہ امام نہیں ہے۔ انہوں نے احکام میں تمام اجتہاد کو باطل قرار دیا ہے۔ ان کا ایمان ہے کہ امام صرف وہی ہو سکتا ہے جو لوگوں میں سب سے افضل ہو۔ ان کا خیال ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہر حال میں حق پر تھے۔ اور امور دین میں کبھی بھی آپ سے کوئی غلطی نہیں ہو سکتی۔ سوائے شیعہ میں سے کاملیہ فرقہ کے۔ کاملیہ فرقہ والے تمام لوگوں کو کافر کہتے ہیں اس لیے کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اتباع نہیں کی۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر کہتے ہیں اس لیے کہ انہوں نے اپنے لیے خلافت کا مطالبہ نہیں کیا۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ: ظالم حکمران کے خلاف بغاوت کرنا جائز نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ: امام منصوص کے علاوہ کسی کے لیے خروج جائز نہیں۔ امامیہ شیعہ کاملیہ کے علاوہ چوبیس فرقے ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو امامیہ بھی اس وجہ سے کہلاتے ہیں کہ ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ منصوص علیہ امام تھے۔

[رافضی فرقے اور ان کے عقائد]:

[پہلا فرقہ]:......ان میں سے پہلا فرقہ قطعیہ ہے۔ انہیں قطعیہ اس وجہ سے کہتے ہیں کہ: ان لوگوں کا پکا اور قطعی عقیدہ ہے کہ حضرت موسیٰ بن جعفر بن محمد رحمہ اللہ انتقال کر چکے ہیں۔ انکا اور جمہور شیعہ کا عقیدہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے وضاحت و صراحت کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امام اور خلیفہ منتخب کیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا تھا۔ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد اپنے لخت جگر علی بن حسین کو، علی بن حسین نے اپنے بیٹے ابوجعفر محمد کو؛ اور محمد نے اپنے بیٹے جعفر بن محمد کو؛ جعفر نے اپنے بیٹے موسیٰ کو؛ اور موسیٰ نے اپنے بیٹے علی کو، علی نے اپنے بیٹے محمد بن علی کو؛ محمد بن علی نے اپنے بیٹے علی بن محمد کو؛ اور علی بن محمد نے اپنے بیٹے حسن کو خلیفہ اور امام مقرر کیا تھا۔ حسن بن علی نے اپنے بعد اپنے بیٹے محمد بن حسن کو

امام مقرر کیا تھا۔ یہ وہی محمد بن حسن عسکری ہے جو کہ ان لوگوں کے عقیدہ کے مطابق غائب ہوگیا۔ اور ابھی تک ظاہر نہیں ہوا؛ یہ لوگ اس کے انتظار میں ہیں۔ اور جب یہ امام ظاہر ہوگا تو زمین کو ایسے عدل و انصاف سے بھر دے گا جیسے وہ ظلم و جور سے بھری ہوگی۔[المقالات ۱/ ۸۹]

[دوسرا فرقہ]:......ان کا دوسرا فرقہ کیسانیہ ہے۔ پھر کیسانیہ کے بھی گیارہ فرقے ہیں۔ ان کا نام کیسانیہ اس وجہ سے پڑا ہے کہ مختار بن ابو عبید ثقفی جس نے خون حسین رضی اللہ عنہ کا مطالبہ کیا تھا؛ اور[شروع میں] لوگوں کو حضرت محمد بن علی [محمد بن حنفیہ] کی بیعت کرنے کی دعوت دیتا تھا[بعد میں خود نبوت کا دعوی کر بیٹھا]۔ اسے کیسان بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ: یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا غلام تھا۔ کیسانیہ میں سے ایک گروہ کا دعوی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد محمد بن حنفیہ کو خلیفہ و امام مقرر کیا تھا۔ اس لیے کہ بصرہ میں آپ نے اپنی فوج کا جھنڈا آپ ہی کے سپرد کیا تھا۔

ان میں سے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو امام مقرر کیا تھا۔[المقالات ۱/ ۹۰]

ایک گروہ کہتا ہے کہ: محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ رضوی کے پہاڑوں میں زندہ ہیں۔ آپ کے دائیں جانب شیر اور بائیں جانب چیتا ہے جو کہ آپ کی حفاظت کررہے ہیں۔ اور آپ کے پاس صبح و شام رزق آتا رہے گا یہاں تک کہ آپ خروج کریں۔ ان کا خیال ہے کہ جس سبب کی وجہ سے آپ اس پہاڑ میں چھپ کر انتظار کررہے ہیں اور خلق کی نظروں سے اوجھل ہیں؛ اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی ایسی تدبیر اور حکمت ہے جسے کوئی دوسرا نہیں جانتا۔

اس مذہب کے قائلین میں ایک کثیر نامی شاعر بھی ہے؛ جو اس بارے میں کہتا ہے:

أَلا إِن الأئِـمـة مِـن قـريش ... عـلِـي والـثـلاثـة مِـن بـنِـيهِ
فـسِـبـط سِـبـط إِيـمـان وبِـر ... وسِبط لا يذوق الموت حتى
تـغـيَّب لا يُرى فِيهِم زمانا ... ولاة الحقِ أربعة سواءٌ
هـم الأسباط ليس بِهِم خفاء ... وسِبط غـيَّبَتْه كربلا
يـقـود الخيـل يقدمها اللِواء ... بِرضـوى عِنـده عسل وماء[1]

یہ بات ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا یہ عقیدہ بالکل ہی باطل پر مبنی ہے۔ ایسے ہی امامت کے بارے میں بھی ان کا عقیدہ باطل ہے۔ اس لیے کہ ان [فرقہ کیسانیہ والوں] کا زندہ اور موجود امام [محمد بن حنفیہ] کے متعلق دعوی ہے کہ وہ ہمیشہ باقی رہیں گے۔ جب کہ امامیہ تو ایسے امام [منتظر] کے متعلق دعوی کیے بیٹھے ہیں جس کا اصل میں کوئی وجود ہی نہیں۔

پھر کیسانیہ میں سے ایک فرقہ کا دعوی ہے کہ محمد بن حنفیہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ اور آپ کے بعد آپ کا بیٹا ابو ہاشم

---

[1] وردت هـذِهِ الأبيـات فِي دِيوانِ كثيرِ عزة، وشرح الدكتور حسان عباس [نشر دارِ الثقافةِ، بيروت، لبنان(۱۹۷۱-۱۳۹۱) فِي ص:۵۲۱، والأبيـات ليسـت متتـالِية فِي القـصِيدةِ المنشورةِ، وفِيها بعض الاختِلافاتِ عنِ النصِ المذكورِ هنا، وذكر الدكتور حسان ص:۵۲۲ أن هذِهِ الأبيات قد أوردها أبو الفرجِ الأصفهانِي فِي الأغانِي: ۷/ ۲۳۸، ۲۳۹.

عبداللہ امام بنا تھا۔ پھر اس گروہ میں سے ایک اور گروہ نکلا ہے' وہ کہتے ہیں کہ: ابو ہاشم نے اپنے بعد اپنے بھائی حسن کو امام بنانے کی وصیت کی تھی۔ اور حسن نے اپنے بیٹے علی بن حسن کے لیے وصیت کی تھی۔ اور علی کی موت واقعہ ہوئی تو اس نے اپنے پیچھے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ پس اب یہ لوگ محمد بن حنفیہ کے واپس آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ محمد بن حنفیہ واپس آئیں گے اور اس زمین کے مالک بنیں گے۔ اس فرقہ کے لوگ آج کل وادی ''التیہ'' میں موجود ہیں۔ ❶

اس وقت ان کا کوئی امام نہیں ہے' یہاں تک کہ محمد بن علی المعروف ابن الحنفیہ واپس آجائیں۔

ان میں سے ایک دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ: ابو ہاشم کے بعد امام محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس بنا تھا۔ اس لیے کہ امام ابو ہاشم کا شام سے واپسی کے سفر میں راستہ میں انتقال ہو گیا تھا؛ اس نے مرتے وقت محمد بن علی کے حق میں وصیت کی تھی۔ اور محمد بن علی نے مرتے وقت اپنے بیٹے ابراہیم بن محمد کو امام بنایا تھا۔ اور پھر ابراہیم بن محمد نے اپنے بعد ابوالعباس السفاح کے لیے وصیت کی تھی کہ اسے امام بنایا جائے۔ پھر اس کے بعد خلافت ابوجعفر المنصور کے سپرد ہوئی۔ اور پھر ایسے ہی وصیت کے تحت امامت ان لوگوں میں چلتی رہی۔

❀ پھر ان میں سے بعض لوگوں نے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کی وصیت فرمائی تھی؛ اور واضح الفاظ میں اس کا حکم دیا تھا۔ پھر حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد اپنے بیٹے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو امام بنانے کے لیے وصیت کی تھی۔ اور امام عبد اللہ بن عباس نے اپنے بیٹے علی بن عبداللہ کو امام بنانے کے لیے وصیت کی تھی۔ پھر یہ سلسلہ ایسے ہی چلتا رہا یہاں تک کہ ابوجعفر المنصور تک پہنچ گیا۔ شیعہ کا یہ فرقہ راوندیہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

یہ فرقہ بھی ابومسلم خراسانی کے مسئلہ میں دو گروہوں میں بٹ گیا۔ ان میں سے ایک گروہ کو الرزامیہ کہا جانے لگا؛ اس فرقے کا بڑا ارزام نامی ایک آدمی تھا۔ اس گروہ کا کہنا ہے کہ ابومسلم کو قتل کر دیا گیا ہے۔ جبکہ دوسرے گروہ کا کہنا ہے: ابو مسلم نہیں مرا۔ یہ لوگ ان چیزوں کو حلال سمجھتے ہیں جسے ان کے اسلاف حلال نہیں سمجھتے تھے۔

کیسانیہ میں سے ایک تیسرے گروہ کا خیال ہے کہ: ابو ہاشم نے اپنے بعد عبداللہ بن عمرو بن حرب کو امام مقرر کیا تھا۔ اور ابو ہاشم کی روح اس میں حلول کر گئی تھی۔ پھر ان لوگوں نے عبداللہ بن عمرو کے کچھ جھوٹ پکڑ لیے؛ اس وجہ سے اسے چھوڑ کر امام کی تلاش میں مدینہ چلے گئے۔ وہاں پر ان کی ملاقات عبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر بن ابوطالب سے ہو گئی۔ اس نے انہیں اپنی اقتداء کرنے کی دعوت دی۔ پس ان لوگوں نے عبداللہ بن معاویہ کو اپنا امام بنا لیا' اور اس کے لیے وصی ہونے کا دعوی کرنے لگے۔[المقالات ۱/ ۹٤]

پھر ان میں سے ایک گروہ کہنے لگا کہ: عبداللہ بن معاویہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اور دوسرا گروہ کہنے لگا: نہیں' بلکہ وہ دوبارہ اٹھیں گے اور پھر انتقال ہوگا۔ ایک گروہ کہتا ہے: یہ وہی مہدی ہے جس کے بارے احادیث مبارکہ میں بشارت دی

❶ التیہ وہ وادی ہے جہاں بنی اسرائیل چالیس سال تک سرگرداں رہے۔ ابن تیمیہ کے دور میں یہ لوگ اس علاقے میں رہتے تھے۔[مترجم]

گئی ہے۔ اور یہ زندہ ہے اور اصفہان کے پہاڑوں میں روپوش ہے۔

ان میں سے ایک گروہ کہتا ہے: ابو ہاشم نے اپنے بعد بیان بن سمعان کو امام بنانے کی وصیت کی تھی۔ اور دوسرا گروہ کہتا ہے: ایسا نہیں، بلکہ علی بن حسین کو امام بنایا تھا۔ یہ ان لوگوں کے عقائد و اقوال ہیں جو محمد بن علی [الحنفیہ] کو امام مانتے ہیں۔

پھر رافضیوں میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ: حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما نے اپنے بعد اپنے بیٹے علی بن حسین رضی اللہ عنہ کو امام بنانے کا حکم دیا تھا۔ پھر ان کے بعد ان کا بیٹا امام بنا؛ ابوجعفر کے دور تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ ابوجعفر نے اپنے بعد مغیرہ بن سعید کے لیے وصیت کی تھی۔ یہ لوگ مغیرہ بن سعید کو ہی اپنا امام مانتے ہیں یہاں تک امام مہدی کا ظہور ہو جائے۔ اور ان کے عقیدہ کے مطابق امام مہدی محمد بن عبداللہ بن الحسن بن علی بن ابی طالب ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ یہ مہدی حاجر کے علاقہ میں زندہ موجود ہے۔ اور اس وقت تک وہاں پر مقیم رہے گا جب تک کہ اس کے خروج کا وقت نہ آ جائے۔

روافضہ میں سے ایک گروہ کا ایمان ہے کہ: ابوجعفر محمد بن علی کے بعد امام محمد بن عبداللہ بن الحسن بنا تھا، جس نے خلیفہ ابوجعفر المنصور کے زمانہ میں مدینہ میں خروج کیا تھا۔ ان کا قصہ بڑا مشہور ہے۔ یہ لوگ مغیرہ بن سعید کو امام نہیں مانتے۔

رافضیوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ: ابوجعفر المنصور نے ابو منصور کو امام بنانے کے لیے وصیت کی تھی۔ پھر ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں: ابو منصور نے اپنے بیٹے حسین بن ابو منصور کے لیے وصیت کی تھی؛ اور ان میں سے بعض کہتے ہیں: محمد بن عبداللہ بن الحسن بن الحسین اس کے بعد امام بنے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ: ابوجعفر نے ابو منصور کے لیے وصیت کی تھی؛ باقی بنی ہاشم کے لیے نہیں۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اور حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد کو چھوڑ کر حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے لیے وصیت کی تھی۔ پھر ابو منصور کے بعد امامت ایسے ہی ابو منصور کی اولاد میں واپس چلی گئی جیسے حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں واپس چلی گئی تھی۔

ان میں سے کچھ لوگ کہتے ہیں: بیشک ابوجعفر نے اپنے بعد اپنے بیٹے جعفر بن محمد کو امام بنانے کا حکم دیا تھا۔ اور یہ جعفر ابھی تک زندہ ہے؛ مرا نہیں؛ اور اس وقت تک مرے گا نہیں جب تک کہ اس کا ظہور نہ ہو جائے؛ یہی امام القائم مہدی ہے۔

[تیسرا فرقہ:] ......روافض میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو کہتے ہیں: جعفر بن محمد مر گیا ہے؛ اور اس کے بعد اس کا بیٹا اسماعیل امام بنا ہے۔ یہ انکار کرتے ہیں کہ اسماعیل کا انتقال اس کے والد کی زندگی میں نہیں ہوا۔

اس اسماعیل کے متعلق کہتے ہیں: اس کا انتقال اس وقت تک نہیں ہوگا جب تک زمین میں بادشاہ نہ بن جائے۔ اس لیے کہ اس کے باپ نے بتایا ہے کہ اس کا وصی اور اس کے بعد امام اس کا یہی بیٹا اسماعیل ہوگا۔

[چوتھا فرقہ: قرامطہ]:...... رافضہ میں سے ایک گروہ قرامطہ کا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جعفر تک امامت منصوص چلتی آئی ہے۔ جیسا کہ اثنی عشریہ کا عقیدہ ہے۔ اور جعفر نے اپنے بعد اپنے پوتے محمد بن اسماعیل کو اپنا جانشین اور وصی [امام] بنایا تھا۔ اور ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ محمد بن اسماعیل آج کے دن تک زندہ ہے۔ ابھی تک اس کا

انتقال نہیں ہوا۔ اور اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک وہ زمین کا مالک نہ بن جائے۔ اور یہی وہ مہدی ہے جسکے متعلق احادیث میں بشارت دی گئی ہے۔ اس بارے میں انہوں نے اپنے اسلاف سے نقل کردہ روایات سے استدلال کیا ہے۔ جس میں انہوں نے کہا ہے کہ: ساتواں امام ہی قائم [یعنی مہدی] ہوگا۔ انہیں سبعیہ کہا جاتا ہے۔ جیسے دوسرے فرقہ کو اثنا عشریہ کہا جاتا ہے۔ ان لوگوں کے متعلق چوتھی صدی ہجری میں مغرب اور قاہرہ میں انکے غالب آنے سے پہلے عقائد و ملل پر لکھنے والے علماء کرام نے اپنی کتابوں میں تفصیل لکھی ہے۔ اس لیے کہ چوتھی صدی ہجری کے بعد ان میں ایسی نئی نئی باتیں پیدا ہوگئیں جن کے ذکر کا یہ موقع نہیں۔ اس کے بعد ان لوگوں میں وہ الحاد اور زندیقیت پیدا ہوگئی جس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی؛ نہ غالی رافضیوں میں نہ دوسروں میں۔

ان ملحدین کے کچھ بقایا بلادِ شام اور خراسان میں موجود تھے۔ ابن سینا کے گھر والوں نے حاکم کے زمانے میں ان کی دعوت قبول کرلی تھی۔ یہی حال طوسی اور اس کے اعوان و انصار کا ہے۔ اور یہی حال سنان کا ہے۔

ان کے ذہین و شاطر لوگ اپنی جہالت و جھوٹ کو جانتے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کی خدمت گزاری کی وجہ سے انہیں وہ مقام و مرتبہ اور مال ملتا ہے اور اسباب شہوت میسر ہوتے ہیں؛ جو اس کے بغیر ناممکن ہیں۔ یہ لوگ اپنے ان ماننے والوں کے ساتھ بھی ایسے ہی تعاون کرتے ہیں جیسے اپنے جیسے دوسرے جھوٹوں اور ظالموں کے ساتھ تعاون کرتے ہیں تاکہ اپنا مطلب پورا کرسکیں۔

رافضہ میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہے جو کہتے ہیں: امامت کا سلسلہ محمد بن اسماعیل کی اولاد میں جاری و ساری ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے: امامت کا سلسلہ محمد بن جعفر بن محمد کی اولاد میں جاری و ساری ہے؛ محمد بن اسماعیل کی اولاد میں نہیں اور نہ ہی موسی بن جعفر کی اولاد میں۔

تیسرا گروہ کہتا ہے: امامت کا سلسلہ عبداللہ بن جعفر کی اولاد میں جاری و ساری ہے۔ یہ عبداللہ اپنے باپ کا بڑا بیٹا تھا۔ اس فرقہ والوں کو فطحیہ کہا جاتا ہے۔

[پانچواں فرقہ: ممطورہ]:...... روافض میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو کہ موسی بن جعفر بن محمد کو ان کے والد کے بعد امام مانتا ہے۔ لیکن ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ: موسی بن جعفر کا انتقال نہیں ہوا؛ بلکہ وہ زندہ ہے؛ اس وقت تک اس کا انتقال نہیں ہوگا جب تک وہ مشرق و مغرب کا بادشاہ نہ بن جائے۔ اس گروہ کا نام واقفہ ہے۔ کیونکہ یہ لوگ موسی بن جعفر تک پہنچ کر رک جاتے ہیں۔ اسے آگے کسی کو امام نہیں مانتے۔ ان کو ممطورہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ جب یونس بن عبدالرحمٰن نے ان کے ساتھ مناظرہ کیا تھا؛ تو انہوں نے دوران مناظرہ ان سے کہا تھا: ''أنتم أهون علي من كلاب ممطورة''

''تم میرے نزدیک بارش میں بھیگے کتے سے بھی بڑھ کر گندے اور ذلیل ہو۔''

اس کے بعد ان لوگوں کا یہی لقب پڑ گیا۔

[چھٹا فرقہ: وقفیہ]:......ان میں سے بعض لوگ جو موسی بن جعفر کے بارے میں توقف کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

ہمیں پتہ نہیں کہ موسی بن جعفر کا انتقال ہوا ہے یا نہیں ؟

[ساتواں فرقہ :] ......اور ایک گروہ کہتا ہے: موسی بن جعفر نے اپنے بیٹے احمد کو امام مقرر کیا تھا۔

[آٹھواں فرقہ : اثنا عشریہ]: ......اثنا عشریہ رافضہ کا ایک اور گروہ بھی ہے : وہ کہتے ہیں: اس کے بعد محمد بن حسن [العسکری] امام بنے تھے؛ جن کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ یہی وہ آخری امام ہے جس کا ظہور ہوگا' اور وہ دنیا کو عدل وانصاف سے بھر دے گا اور ظلم کا خاتمہ کر دے گا۔ اس گروہ کو اثنا عشریہ [بارہ اماموں کے ماننے والے] کہا جاتا ہے۔

یہ رافضیوں کا آپس میں اختلاف ہے جن کا دعوی ہے کہ خلافت وامامت نص سے ثابت ہے۔ امت کے تمام گروہوں سے بڑھ کر ان لوگوں کا آپس میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس صورت میں یہ بات ہرگز نہیں ہوسکتی کہ رافضی وہ نجات پانے والا گروہ ہوں جس کے متعلق حدیث میں بشارت دی گئی ہے۔ اس لیے کہ نجات یافتہ گروہ کو کم از کم اصول دین اور عقائد میں متفق ہونا چاہیے؛ جیسے اہل سنت والجماعت اصول دین میں متفق ہیں۔

امامیہ اثنا عشریہ کہتے ہیں: اصول دین چار ہیں: توحید؛ عدل؛ نبوت؛ اور امامت۔ ان کا توحید؛ عدل اور امامت کے مسئلہ میں آپس میں [بہت زیادہ] اختلاف پایا جاتا ہے۔ نبوت کے بارے میں یہ لوگ بھی ایسے ہی اقرار کرتے ہیں جیسے باقی ساری امت کے لوگ اس کا اقرار کرتے ہیں۔ جب کہ امامت کے بارے میں ان کا اختلاف ساری امت کے اختلافات سے بڑا اور سخت ہے۔ اگر اثنا عشریہ یہ کہیں کہ: ہم ان تمام لوگوں سے زیادہ ہیں اس لیے حق صرف ہمارے ساتھ ہے' دوسروں کے ساتھ نہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ: اہل سنت والجماعت تعداد میں تم لوگوں سے زیادہ ہیں۔ تو حق بھی ان کے ساتھ ہے تمہارے ساتھ نہیں۔ زیادہ سے زیادہ تمہارے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ تمہارے باقی فرقوں کے ساتھ تمہارا معاملہ ایسے ہی ہے جیسے باقی مسلمانوں کا تمہارے ساتھ۔ اور اسلام ہی وہ دین حق ہے جو لوگوں کو حق پر جمع کرتا ہے۔ [شیعہ کی دیگر اسلامی فرقوں سے علیحدگی ان کے عقائد کی صحت کی بجائے ان کے افکار و معتقدات کے فساد و بطلان پر دلالت کرتی ہے، اس لیے کہ دیگر فرق وطوائف میں سے کسی فرقہ کی انفرادیت کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ راہ حق پر گامزن ہیں]۔

فصل:......شیعہ اور یقین نجات

[اشکال] :......شیعہ مصنف لکھتا ہے: فرقہ امامیہ کے نجات یافتہ ہونے کی تیسری دلیل: ''یہ کہ انہیں اپنی اور اپنے ائمہ کی نجات کا قطعی یقین ہے۔ اور اپنے مخالفین کے لیے اس کے برعکس کا یقین جازم رکھتے ہیں۔ بخلاف ازیں اہل سنت میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ وہ پختہ یقین کے ساتھ اپنی یا دوسروں کی نجات کا عقیدہ نہیں رکھتے۔ لہٰذا ان [امامیہ] کی اطاعت اولیٰ ہے۔ [اس کی مثال یہ ہے] فرض کریں کہ دو شخص بغداد سے نکلے جو کوفہ جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے آگے دو راستے دیکھے؛ ان میں سے ہر ایک ایک راستے پر چل پڑا۔ پھر ایک تیسرا آدمی آیا وہ بھی کوفہ جانا چاہتا تھا۔ اس نے ان

دونوں میں سے ایک سے پوچھا: تم کہاں جارہے ہو؟ اس نے کہا: کوفہ۔ پھر پوچھا: کیا تمہارا یہ راستہ تمہیں کوفہ پہنچادے گا؛ اور کیا یہ راستہ پرامن ہے؟۔اور کیا تمہارے ساتھی کا راستہ اسے اس کی منزل تک پہنچادے گا؟ اور کیا اس کا راستہ پرامن ہے؟۔تو اس نے کہا: میں اس بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔پھراس کے دوسرے ساتھی سے یہی سوال کیے۔اس نے جواب میں کہا: مجھے علم ہے میرا یہ راستہ مجھے کوفہ تک پہنچائے گا۔اور یہ راستہ پرامن ہے۔اور مجھے علم ہے کہ میرے ساتھی کا راستہ اسے کوفہ تک نہیں پہنچائے گا۔اب یہ تیسرا انسان اگراس کے باوجود پہلے ساتھی کی اتباع کرے گا تو اہل عقل و دانش اسے بیوقوف کہیں گے۔اور اگراس نے دوسرے ساتھی کی راہ اختیار کی تو اس نے یقین و جزم کی راہ اختیار کی۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جواب]: اس اعتراض واشکال کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے:

پہلی وجہ:......ہم کہتے ہیں: اگران ائمہ کی پیروی حق وصواب ہے جن کی اطاعت کا دم تم بھرتے اوراس کو موجب نجات تصور کرتے ہوتو پھراموی خلفاء کے اتباع جو اپنے ائمہ کی اطاعت کو واجب اور موجب نجات سمجھتے تھے حامل صدق و صواب تھے۔پھر یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگوں پر جوطعن وتشنیع کرتے تھے؛ اور شیعان علی اور دوسرے لوگوں سے انہوں نے جوجنگیں لڑیں ان میں وہ حق پر تھے۔اس لیے کہ ان کا نکتہ نگاہ یہ تھا کہ ہر بات میں ائمہ کی اطاعت واجب ہے۔ نیز یہ کہ ائمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں احتساب سے بالا ہیں۔اور جو کام وہ اطاعت امام میں انجام دیں، اس میں ان پر کوئی گناہ نہیں۔ بلکہ دلیل کے اعتبار سے ان کا مسلک شیعہ کی نسبت قوی تر تھا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان ائمہ کی پیروی کرتے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے مقرر و موید کیا، اور حکومت وسلطنت سے نوازا تھا۔ جب کہ منکرین تقدیر (جن میں شیعہ بھی شامل ہیں) کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وہی کام کرتے ہیں جن میں بندوں کی کوئی مصلحت مضمر ہوتی ہے۔تو ان کو سلطنت وحکومت و تفویض کرنے میں بھی بندوں کی مصلحت ملحوظ رکھی ہوگی۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ اموی خلفاء سے امت کو جو فوائد حاصل ہوئے وہ ان مصالح کی نسبت عظیم تر تھے جو ایک عاجز ومعدوم امام (یعنی امام غائب) کے ذریعہ معرض ظہور میں آئے۔ بنا بریں اموی خلفاء کے متبعین کو جو دینی و دنیوی فوائد حاصل ہوئے امام منتظر کے اتباع کو اس کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں ہوا۔شیعہ کا کوئی امام ایسا نہ تھا جو انہیں نیکی کا حکم دیتا، منکرات سے باز رکھتا اور دینی و دنیوی مصالح میں ان کی مدد کرتا۔اس کے عین برخلاف اموی خلفاء کے اتباع نے ان سے لاتعداد دینی و دنیوی فوائد ومنافع حاصل کیے۔

خلاصہ کلام! اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ان نام نہاد معاونین کی دلیل قرین صحت وصواب ہے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے انصار واعوان کی دلیل اقرب الی الصواب ہوگی۔اور اگر پہلی دلیل باطل ہے تو دوسری اس سے باطل تر ہے۔ جب شیعہ اس بات میں اہل سنت کے ہم نوا ہیں کہ اموی خلفاء کی مطلق اطاعت میں نجات پر یقین کامل رکھنا خطا اور گمراہی ہے تو ائمہ معصومین اوران کے نائبین کی اطاعت مطلقہ میں یقینی نجات اوران کی اطاعت مطلقہ کا عقیدہ سابق الذکر ضلالت سے بھی عظیم تر گمراہی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ شیعہ کا سرے سے کوئی امام ہے ہی نہیں، ماسوا ان شیوخ کے جو ناجائز ذرائع سے

ان کا مال بٹورتے اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔

دوسری وجہ:......مصنف کی ذکر کردہ مثال اس وقت صحیح مطابقت رکھے گی جب دو مقدمات صحیح ثابت ہو جائیں:

پہلا مقدمہ:......امام معصوم کا اثبات۔

دوسرا مقدمہ:......امام کے امر و نہی کا اثبات۔

یہ دونوں مقدمات نامعلوم ہی نہیں بلکہ باطل ہیں۔ پہلے مقدمہ کو چھوڑیے۔دوسرے مقدمہ میں: جن لوگوں کی عصمت کا دعوی کیا جاتا ہے؛ صدیوں سے ان کا انتقال ہو چکا ہے۔[امامیہ کے ہاں] امام منتظر بھی صدیوں سے غار میں غائب ہو چکا ہے۔ جب کہ دوسرے لوگوں کے نزدیک یہ امام اصل میں معدوم ہے [اس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں]۔اور جو لوگ ان رافضی شیوخ کی اتباع کرتے ہیں' یا ان کتابوں کے مطابق چلتے ہیں جو بعض رافضی شیوخ نے لکھی ہیں؛ جن کتابوں میں انہوں نے لکھا ہے کہ یہ روایات ائمہ معصومین سے منقول ہیں؛ تو یہ حقیقت ہے کہ ان کتابوں کے مصنفین رافضی شیوخ بالاتفاق معصوم نہیں ہیں۔اور نہ ہی ان کی نجات کے بارے میں قطعی طور پر یقین کے ساتھ کچھ کہا جاسکتا ہے۔ پس اس بنا پر ثابت ہو گیا کہ رافضہ ان لوگوں کی اتباع نہیں کرتے جن کی نجات و سعادت کے بارے میں انہیں قطعی یقین ہے۔اور نہ ہی اپنی نجات کے بارے میں یقین ہو سکتا ہے۔اور نہ ہی ان ائمہ کی نجات کے بارے میں انہیں کوئی یقین ہے جو براہ راست امر و نہی کا کام کرتے ہیں۔حالانکہ وہ ان کے ائمہ ہیں۔ان لوگوں کا اپنے ائمہ کی طرف منسوب ہونے میں وہی حال ہے جو بہت سارے ان لوگوں کا حال ہے جو خود کو مرے ہوئے مشائخ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔انہیں اس بارے میں کوئی علم نہیں ہوتا کہ ان شیوخ نے کس چیز کا حکم دیا ہے اور کس چیز سے منع کیا ہے۔ بلکہ ان شیوخ کے ایسے اتباع کار ہیں جو لوگوں کا مال ناحق کھاتے ہیں۔اور لوگوں کو اللہ کی سیدھی راہ سے روکتے ہیں۔ اور انہیں ان مشائخ اور ان کے خلفاء کی شان میں غلو کرنے کا حکم دیتے ہیں۔اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر انہیں اپنا رب بنالیتے ہیں۔ جیسے شیعہ شیوخ اپنے پیروکاروں کو حکم دیتے ہیں۔اور جیسے عیسائی علماء اپنے ماننے والوں کو حکم دیتے ہیں۔ یہ لوگ عوام کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے اور غیر اللہ کی عبادت کرنے کا حکم دیتے ہیں۔اور انہیں اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔اس بنا پر وہ ''لا إله إلا الله محمد رسول الله '' کلمہ توحید کی حقیقت سے خارج ہو جاتے ہیں۔اس لیے کہ توحید کی حقیقت یہ ہے کہ صرف ایک اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کی جائے؛ اللہ کے سوا کسی کو نہ پکارا جائے؛ اس کے علاوہ کسی کا خوف نہ رکھا جائے؛ اس کے علاوہ کسی سے نہ ڈرا جائے؛ اس کے علاوہ کسی پر توکل نہ کیا جائے؛ اور دین کو صرف اس کے لیے خالص مانا جائے؛ اس میں کسی مخلوق کے لیے حصہ نہ بنایا جائے۔اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر فرشتوں اور انبیاء کو رب نہ بنانا چاہیے۔تو پھر یہ امور ائمہ' شیوخ' علماء اور بادشاہوں سے کیونکر روا ہو سکتے ہیں؟

رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے امر و نہی پہنچانے کا واسطہ ہے۔پس اللہ تعالیٰ کے علاوہ مخلوق میں سے کسی ایک کی بھی مطلق اطاعت نہیں کی جاسکتی۔جب امام یا شیخ کو الہ و معبود بنالیا جائے کہ اسے اس کی

عدم موجودگی میں یا موت کے بعد پکارا جائے' اور اس سے مدد مانگی جائے؛ اس سے اپنی حاجات طلب کی جائیں؛ [تو یہ کہاں کی توحید اور کیسا دین ہے؟]

یہ لوگ تو اپنے ائمہ کی اس طرح اطاعت کرتے ہیں انہیں جو مرضی میں آئے اس کا حکم دیتے ہیں اور جس چیز سے چاہتے ہیں روک دیتے ہیں۔ گویا کہ یہ لوگ اپنے مردہ ائمہ کو اللہ تعالیٰ سے تشبیہ دیتے ہیں؛ اور زندوں کو رسول اللہ ﷺ سے۔ اس بنا پر یہ لوگ 'لا إله إلا الله محمد رسول الله '' کلمہ توحید کی حقیقت سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ توحید کی حقیقت یہ ہے کہ ہم صرف ایک اللہ کی عبادت کریں اور اس کے سوا کسی کو نہ پکاریں اور نہ ہی کسی کا ڈر محسوس کریں؛ اور نہ ہی کسی کا خوف اس کے علاوہ ہو۔ اور صرف اسی پر بھروسہ کیا جائے۔ اور دین کو صرف اس کے لیے خالص کیا جائے کسی مخلوق کے لیے نہیں۔ اور یہ کہ ہم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر انبیائے کرام علیہم السلام یا ملائکہ کو اپنا رب نہ بنائیں؛ کجا کہ ائمہ اور مشائخ اور علماء اور بادشاہوں اور دیگر کو اپنا رب بناتے پھریں۔ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہم تک اس کے امر و نہی پہنچا دیے تھے۔ پس اب مخلوق میں سے کسی کی مطلق اطاعت نہیں ہوگی۔ اب اگر کسی شیخ کو یوں بنالیا جائے گویا کہ وہ معبود ہو؛ اور اسے ہی غائبانہ طور پر یا اس کی موت کے بعد پکارا جائے۔ مشکل میں اسے دہائی دی جائے؛ اور اس سے مدد طلب کی جائے؛ اور اپنی ضروریات کے لیے اسے پکارا جائے۔ [تو ایسا کرنا ہرگز جائز نہیں؛ بلکہ یہ کام حرام اور شرک ہیں۔] بیشک اطاعت اس شخص کی کی جاسکتی ہے جو زندہ حاضر ہو؛ جیسے مرضی حکم دے؛ اور جس چیز سے چاہے منع کرے؛ تو یہ میّت گویا کہ اللہ تعالیٰ کے مشابہ [بنالیا گیا] ہے؛ اور زندہ کو رسول اللہ ﷺ سے مشابہ۔ پس اس طرح یہ لوگ اسلام کی اس حقیقت سے نکل جاتے ہیں جس کی اصل لا إلہ إلا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی اور اقرار ہے۔

پھر ان میں سے بہت سارے لوگ اپنے مشائخ سے نقل کردہ حکایات سے چمٹے رہتے ہیں؛ ان حکایات میں سے اکثر جھوٹ کا پلندہ ہوتی ہیں۔ اور بعض میں غلطی ہوتی ہے۔ پس یہ رسول معصوم ﷺ سے منقول سچی احادیث کو چھوڑ کر جھوٹی اور غیر معصوم ائمہ کی طرف منسوب کہانیوں اور کہاوتوں پر اکتفاء کرتے ہیں۔

اگر ان زندہ مشائخ کے پیروکاروں میں سے ایک گمراہ اپنے فوت شدگان مشائخ کی شان میں غلو کرنے کی وجہ سے ان کی قطعی اور دوٹوک نجات کا یقین رکھنے میں غلطی پر ہے تو شیعہ کی یہی غلطی اس سے کئی گنا بڑی اور خطرناک ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ شیعہ کا طریقہ کار درست ہے؛ اس لیے کہ انہیں اپنی نجات کا قطعی یقین ہے۔ تو پھر مشائخہ کا طریقہ کار بھی حق ہے؛ وہ بھی اپنی نجات کے بارے میں قطعی یقین رکھتے ہیں۔

تو پھر جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ: یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کا شمار ان انبیاء کرام میں ہوتا ہے جو شراب پیتے تھے؛ اور اس کے لیے شراب حلال تھی؛ اس لیے کہ بعض انبیاء کرام نے بھی شراب پی ہے۔ اور یزید بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔ اور یہ طریق کار درست اور حق ہے۔ اور یزید بھی نبی تھا۔ اور جو کوئی نبی کے خلاف خروج کرے وہ کافر ہے۔ تو پھر اس سے

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا کفر لازم آتا ہے۔اور اس بنا پر ان لوگوں کے قول کی صحت بھی لازم آتی ہے جو کہتے ہیں: ہر وہ رزق جو میرا شیخ مجھے نہ دے مجھے اس رزق کی کوئی چاہت نہیں۔اور ان لوگوں کی بات بھی درست ثابت ہوگی جو کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ اتر کر زمین پر آتے ہیں؛ اور ہر مسجد میں اللہ تعالیٰ نے اپنا پاؤں رکھا ہے۔اور پھر وہ لوگ بھی صحیح کہتے ہوں گے: جن کا عقیدہ ہے کہ ان کے شیخ نے انہیں نمازیں معاف کردی ہیں۔ان کے علاوہ بھی کفر و گمراہی پر مشتمل کئی ایک باتیں ایسی ہیں جو ان مشائخ کے پیروکاروں نے اپنے ماننے والوں میں پھیلا رکھی ہیں۔[حالانکہ یہ ساری باتیں غلط اور اسلامی عقیدہ کے خلاف ہیں]۔

ان میں سے بہت سارے لوگوں کو اپنے ائمہ و مشائخ کی سعادت و نجات کا پختہ یقین ہے۔ان میں سب سے زیادہ بلا جھجھک اور بغیر روک ٹوک یہ یقین ظاہر کرنے والے اثنا عشری ہیں۔جو اپنے ائمہ اور ان کے متبعین کی نجات کا پختہ یقین رکھتے ہیں۔اگر یہ جو کچھ ذکر کیا گیا ہے' اس کا شمار بھی اپنی نجات کے پکا یقین رکھنے میں واجب ہے؛ تو پھر ان دوسرے لوگوں [فرقہ مشائخہ] کی اتباع بھی واجب ہوتی ہے۔ جب ان کی اتباع واجب ہوگی تو اس سے پھر شیعہ عقیدہ پر قدح اور ان کے عقیدہ کو باطل سمجھنا بھی واجب ہوگا۔اور اگر یہ طریقہ درست نہیں ہے تو پھر شیعہ کی دلیل خود بخود باطل ہوجائے گی۔ (1)

اس لئے ان دونوں فریقوں سے کہا جائے گا کہ: اگر اپنی نجات کا پختہ یقین رکھنے والوں کا طریقہ کار ان لوگوں کی راہ کی نسبت اتباع کا زیادہ حق دار ہے جو لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں؛ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے میں ان اہل علم و دین کی اتباع کرتے ہیں جو انہیں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیتے ہیں؛ اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر کسی معین شخص کی اطاعت کو واجب نہیں سمجھتے۔اور سعادت و نجات کی ضمانت صرف ان لوگوں کے لیے دیتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں۔اور کہتے ہیں: ان کے علاوہ جتنے بھی لوگ ہیں ان سے غلطی بھی ہوسکتی ہے اور درستگی بھی۔پس ان کی اطاعت مطلقاً نہیں کی جائے گی۔

اب اگر ان لوگوں کی اتباع میں نقص اور خطأ کا پہلو موجود ہے؛ اور اپنی نجات کا پختہ یقین رکھنے والوں کی رائے ہی درست ہوسکتی ہے' تو پھر شیعہ کے ائمہ معصومین اور شیخیہ کے مشائخ محفوظین کی اطاعت بھی واجب ہوتی ہے۔[یہ دونوں علیحدہ علیحدہ گروہ ہیں]۔پہلی قسم کے شیعہ دوسری قسم کے شیعہ پر جرح وقدح کرتے ہیں؛ اس سے لازم آتا ہے کہ یہ

(1) [[ہم اہل سنت والجماعت معتدل امت ہیں۔ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ راہ حق ہے؛ اور اس راہ پر چلنے میں کامیابی یقینی ہے۔مگر متعین اشخاص و افراد کے متعلق بھلے وہ امام و علماء ہی کیوں نہ ہوں' یہ دوٹوک طور پر نہیں کہہ سکتے کہ وہ ہر حال میں نجات یافتہ ہیں۔بلکہ ہم اللہ تعالیٰ سے ان کے بارے میں نجات کی امید رکھتے ہیں' اور ان کی بخشش کے لیے دعا کرتے ہیں اور ایسے ہی اپنی ذات کے متعلق دوٹوک طور پر نہیں کہہ سکتے کہ ہم ہر حال میں جنت میں ہی جائیں گے؛ سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لے' اور وہ مہربان ذات ہماری مغفرت کردے۔ہمارے ہاں نجات کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بعد توحید کی پابندی اور اعمال صالحہ کی بجا آوری ضروری ہے۔جب کہ شیعہ مشائخہ کے ہاں فقط نسبت کام آسکتی ہے۔اور ان کے مشائخ ہر حال میں مغفور و بخشے ہوئے ہیں]]۔[دراوی جی]

دونوں طریقے عند اللہ پکے باطل ہوں۔اس لیے کہ ان میں جمع بین النقیضین ہے۔ کیونکہ ان کے اصول کی بنیاد ہی فساد پر رکھی گئی ہے۔ یہ بنیاد بغیر دلیل کے ان لوگوں کی اتباع ہے جنہیں [اپنے تئیں] اپنی نجات کا پختہ یقین ہے۔ پس فرقہ مشائخہ یا امامیہ میں جو بھی اپنے مشائخ کی اتباع میں نجات کا پختہ یقین رکھتے ہیں؛ان کا یہ عقیدہ بغیر علم اور دلیل کے ہے۔اس سے ان کے اقوال میں تناقض لازم آتا ہے۔ بخلاف ان اقوال کے جن کی بنیاد صحیح اصولوں پر رکھی گئی ہے؛ ان میں کوئی تناقض نہیں پایا جاتا۔

تیسری وجہ:......رافضی مصنف نے جو مثال بیان کی ہے؛ اور اس کو اصل بنا کر اس پر قیاس کیا ہے؛ اس کے مطابق حکم لگانا ممتنع ہے۔اس کہ دو آدمیوں میں سے کوئی ایک جب کہے گا کہ: کیا میرا راستہ پر امن ہے' اور مجھے منزل تک پہنچا دے گا۔ اور دوسرا آدمی اس سے کہے: مجھے پتہ نہیں کہ کیا میرا راستہ پر امن ہے؟ اور مجھے منزل تک پہنچائے گا یا نہیں؟ ۔ یا پھر پہلا انسان ایسی بات کہے؛ تو عقلاً صرف اس آدمی کے قول کی بنا پر اس کی تصدیق نہیں کی جاسکتی ۔ بلکہ اہل عقل کے نزدیک ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ یہ انسان [اس پوچھنے والے کے لیے کوئی حیلہ گری کر رہا ہو]؛ تا کہ وہ اسے اپنے ساتھ لیکر چلے' اور راستہ میں اسے قتل کر دے اور اس کا مال و اسباب چھین لے۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ انسان راستے کی حقیقت سے لاعلم ہوا سے راستہ کے خوف اور بدامنی کا کوئی پتہ ہی نہ ہو۔جب کہ دوسرا انسان سوال کرنے والے کیلئے کوئی گارنٹی نہیں دیتا۔ بلکہ اسے خود غور وفکر کرنے کے لیے کہتا ہے۔پس ایسے موقع پر انسان پر لازم ہوتا ہے کہ وہ خود سوچ و بچار کرے کہ اسے کون سے راستہ پر چلنا چاہیے؟ کیا ان دونوں راستوں میں سے ہی کوئی ایک سیدھا راستہ ہے یا ان کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ بھی ہے؟

اگر ان دونوں میں سے ہر ایک انسان یہ دعوی کرتا کہ میرا راستہ پر امن ہے' اور ہمیں منزل تک پہنچائے گا [تو پھر چاہیے تو یہ تھا کہ] ان دونوں کی بغیر کسی توقف کے تصدیق کی جائے۔ حالانکہ [اس سے لازم آتا ہے کہ] ان میں سے ہر ایک جاہل اور دروغ گو ہے۔[یہی حال شیعہ مصنف کا ہے]۔مشتبہ مسائل میں اس کا دعوی ہے کہ ہمارا قول ہی اس میں درست اور حق پر ہے۔اور میں دوٹوک طور پر یہ کہہ سکتا ہوں۔ اس لیے میں ان دونوں گروہوں کی نسبت اتباع کا زیادہ حقدار ہوں جو مسائل میں غور وفکر کرتے ہیں' اور پھر ان سے استدلال کرتے ہیں۔تو پھر چاہیے تھا کہ یہ جھوٹے مشائخ جو اپنے مریدوں کے لیے جنت کی ضمانت دیتے ہیں۔اور انہیں آسرا دلاتے ہیں کہ ان کے لیے آخرت میں ایسی ایسی نعمتیں ہوں گی۔اور یہ کہ جو کوئی بھی ان سے محبت کرے گا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا؛ اور جو کوئی انہیں مال دے گا؛ وہ اس کے بدلے میں انہیں وہ حال دیں گے جس سے وہ اللہ ذوالجلال کے قریب ہو جائیں گے۔

پھر یہ لوگ ان لوگوں کی نسبت اتباع کے زیادہ حق دار ہوتے جو اہل علم و عدل اور سچائی کے پیکر ہیں ؛ اور کسی چیز کی ضمانت بھی نہیں دیتے سوائے اس چیز کی ضمانت کے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کرنے والوں کو دی ہے۔اور پھر اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ ائمہ اسماعیلیہ جیسے معز اور حاکم ائمہ اثنا عشریہ کی نسبت اتباع کے زیادہ حق دار ہوں۔اس لیے کہ یہ لوگ اثنا عشریہ سے بڑھ کر غیب کا علم جاننے' باطن شریعت کے کشف؛ اور اعلی درجات کے دعویدار ہیں۔ یہ لوگ محرمات

کو حلال سمجھنے اور واجبات ترک کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو جنت کی ضمانت بھی دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ: ہم نے آپ سے نمازیں اور روزے اور زکوۃ اور حج ساقط کردیے ہیں۔ اور ہم اس کا دوٹوک یقین رکھتے اور اظہار کرتے ہیں۔

اثنا عشری کہتے ہیں: ''کوئی انسان اس وقت تک جنت کا مستحق نہیں ہوسکتا جب تک وہ محرمات کو ترک نہ کردے اور واجبات کو بجانہ لائے۔ اگر پختہ نجات کے صرف دعوی پر ان کی اتباع کرنی چاہیے تو پھر یہ لوگ ان لوگوں کی نسبت سے اتباع کے زیادہ حق دار ہیں جو کہتے ہیں: جب تم گناہ کروگے تو تمہیں سزا ہوسکتی ہے؛ یہ احتمال بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں معاف کردے۔ پس یہ انسان خوف اور امید کے درمیان میں رہتا ہے۔ اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ اس سے واضح ہوگیا کہ صرف اپنی نجات کے پختہ یقین کا دعوی کرلینا کسی کے اہل علم اور سچا ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتی۔ اور ایسے موقع پر اہل عقل لوگوں کی عادت یہ ہے کہ توقف اختیار کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کے لیے دلیل کی روشنی میں مسئلہ واضح ہوجائے۔

چوتھی وجہ:......شیعہ کا یہ قول کہ'' شیعہ اپنے ائمہ کے ناجی ہونے پر یقین رکھتے ہیں، جب کہ اہل سنت میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔''

جواب:...... اگر شیعہ مصنف کی مراد یہ ہے کہ ایسا اعتقاد رکھنے والا ہر ایک انسان ضرور جنت میں جائے گا، خواہ وہ شرعی اوامر کا تارک ہو اور منہیات سے کنارہ کش نہ رہتا ہو؛ تو بلاشبہ یہ امامیہ کا قول نہیں بلکہ کوئی ذی عقل اسے تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں۔ اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت ایک ایسی عظیم نیکی ہے جس کی موجودگی میں کوئی ضرر لاحق نہیں ہوتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسے شخص کو نمازوں کے ترک کرنے، زنا کاری کا ارتکاب کرنے اور بنی ہاشم کا خون بہانے سے بھی کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، بشرطیکہ وہ حب علی رضی اللہ عنہ کا دعویٰ دار ہو۔ اگر شیعہ یہ کہیں کہ سچی محبت تبھی ہوسکتی ہے، جب محبّ دیگر اعمال میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نقش قدم پر چلتا ہو تو انہوں نے از خود اداء واجبات اور ترک منکرات کی ضرورت کو تسلیم کرلیا۔

اگر شیعہ مصنف یہ کہنے کے درپے ہے کہ جو شخص عقائد صحیحہ رکھتا ہو' واجبات ادا کرتا ہو؛ اور منکرات سے باز رہتا ہو؛ وہ جنت میں جائے گا۔ تو بلاشبہ اہل سنت بھی یہی کہتے ہیں۔ قرآن کریم کی اتباع میں اہل سنت کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ ہر متقی کے لیے نجات یقینی ہے۔ البتہ وہ کسی متعین شخص کے بارے میں وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہتے کہ: وہ جنت میں جائے گا۔ اس لیے کہ اس کا زمرہ متقین میں شامل ہونا قطعیت کے ساتھ تو معلوم نہیں۔ جب کسی ذریعہ سے یہ معلوم ہوجائے کہ اس کی موت تقویٰ پر ہوئی ہے تو اس کا جنتی ہونا بھی معلوم ہوجائے گا۔ بنابریں اہل سنت ان لوگوں کو جنتی قرار دیتے ہیں جن کے جنتی ہونے کی بشارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ [1]

---

[1] مثلاً صحابہ کرام میں سے دس حضرات کے بارے میں سالار رسل صلی اللہ علیہ وسلم نے جنتی ہونے کا مژدہ سنایا، مگر شیعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت سے صرف نظر کرکے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا ان سب اصحاب کو جہنمی قرار دیتے ہیں، ان کی دریدہ دہنی کا یہ عالم ہے کہ اس سے بڑھ کر وہ افضل الصحابہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو ''جبت وطاغوت'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

جو شخص لوگوں میں اپنے اوصاف حمیدہ کی بنا پر معروف ہو اور لوگ اس کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہتے ہوں، تو اس کے بارے میں اہل سنت کے دو قول ہیں:

مذکورۃ الصدر بیانات اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ شیعہ کے یہاں کوئی ایسا محمود جزم و وثوق نہیں پایا جاتا جو اہل سنت میں موجود نہ ہوں۔ اگر شیعہ کہیں کہ ہم جس آدمی کو بھی شرعی واجبات پر عمل پیرا اور منہیات سے باز رہنے والا دیکھتے ہیں اسے قطعی جنتی قرار دیتے ہیں خواہ اس کے باطن کا حال ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو۔تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ اس مسئلہ کا امامیہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر اس کی جانب کوئی صحیح راستہ جاتا ہے تو بالاتفاق اہل سنت کا راستہ ہے اور کوئی راستہ موجود نہیں تو یہ قول بلا علم ہے جو کسی فضیلت کا موجب نہیں، بلکہ اس کا نہ ہونا فضیلت کا باعث ہے۔

خلاصہ کلام! بہر حال شیعہ جس بھی علم صحیح کے دعویٰ دار ہوں اہل سنت ان کی نسبت اس کے زیادہ حق دار ہوں گے اور اگر وہ جہالت کے مدعی ہوں تو جہالت ایک نقص ہے اور اہل سنت اس سے بعید تر ہیں۔

کسی مخصوص آدمی کے جنتی ہونے کی ضمانت یا تو معصوم [1] (نبی ﷺ) کے قول کی بنا پر دی جا سکتی ہے یا مومنین کے متفق علیہ قول کی وجہ سے۔اس لیے کہ اہل ایمان اس خطہ ارضی پر اللہ کے گواہ ہیں، حدیث صحیح میں وارد ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے نزدیک سے ایک جنازہ گزرا، لوگوں نے مرنے والے کی مدح و ستائش کی، یہ سن کر آپ نے فرمایا:

"وَجَبَتْ "(واجب ہوگئی)۔ پھر ایک اور جنازہ گزرا اور لوگوں نے اس کی مذمت کی تو آپ نے وہی الفاظ دہرائے۔صحابہ نے جب رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کا مفہوم دریافت کیا تو آپ نے فرمایا:"جس جنازہ کی تم نے تعریف کی اس کیلئے جنت واجب ہوگئی اور جس کی مذمت کی اس کے لیے جہنم، تم زمین پر اللہ کے گواہ ہو۔" [2]

اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے: نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"قریب ہے کہ تم اہل جہنم میں سے اہل جنت کو پہچان لو۔" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ کیسے؟

---

[1] معصوم سے مراد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے، ان کے سوا اس امت میں دوسرا کوئی معصوم نہیں، آپ نے دس صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے متعلق جنت کا مژدہ سنایا ہے، شیعہ اس بشارت کو تسلیم نہیں کرتے۔

[2] صحابہ کی شان میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ" تم کائنات ارضی پر اللہ کے گواہ ہو" صحابہ کی عظیم مدح و منقبت پر مشتمل ہے، بنی اسرائیل کے کسی نبی نے اگر ان کی مدح میں ایسا کوئی جملہ کہا ہوتا تو اسرائیلی اس دن کو ایک بڑا مذہبی تہوار بنا لیتے اور ایسے کلمات کو بڑی اہمیت کا حامل سمجھتے، مگر شیعہ صحابہ کی شان میں وارد شدہ مدحیہ کلمات کو چنداں وقعت نہیں دیتے، رسول اللہ کا ارشاد گرامی" انتم شهداء الله في الارض "دراصل سورہ بقرہ کی آیت "لتكونوا شهداء على الناس "کی جانب اشارہ ہے۔ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد مبارک سے صریح انکار غضب الٰہی کو دعوت دینے کے سوا اور کیا ہے؟ صحيح بخاري، كتاب الجنائز، باب ثناء الناس على الميت، (ح:١٣٦٧)، صحيح مسلم: كتاب الجنائز، باب فيمن يثنى عليه خير أو شر من الموتى، (ح:٩٤٩)۔

آپ نے فرمایا: لوگوں کے اچھی اور بری تعریف کرنے کی وجہ سے۔'' ❶

اور بسا اوقات اس کا سبب مسلسل مؤمنین کے لیے نیک خواب کا دیکھنا بھی ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

'' میرے بعد نبوت میں سے صرف اچھے خواب باقی رہ گئے ہیں۔ جو کہ نیک انسان خواب میں دیکھتا ہے یا اسے دیکھایا جاتا ہے۔'' ❷

آپ ﷺ سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے میں سوال کیا گیا:

﴿لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ﴾ [یونس ٦٤]

''ان کے لیے دنیا اور آخرت کی زندگی میں خوشخبری ہے۔''

تو آپ نے فرمایا: ''یہ اچھے خواب ہیں جو نیک انسان دیکھتا ہے یا اسے دیکھایا جاتا ہے۔'' ❸

اس کی تفسیر اہل ایمان کے تعریف کرنے سے بھی کی گئی ہے۔ آپ سے پوچھا گیا: یارسول اللہ ﷺ! کوئی انسان اپنی ذات کے لیے نیک کام کرتا ہے' اور لوگ اس پر اس کی تعریف کرتے ہیں؛ تو آپ نے فرمایا: ''یہ اسے جلدی میں ہی مل جانے والی خوشخبری ہے۔'' ❹

خواب کبھی کبھار اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں اور کبھی انسان کے اپنے خیالات ہوتے ہیں اور کبھی کبھار شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں۔ جب اہل ایمان کا خواب کسی بات کے مطابق ہو جائے تو وہ حق ہوتا ہے؛ جیسا کہ بسا اوقات خواب اور روایات اور رائے میں مطابقت پائی جاتی ہے۔ اس لیے کہ ایک انسان کبھی جھوٹ بھی بول سکتا ہے' اور اس سے غلطی بھی ہوسکتی ہے۔ اور کبھی رائے میں خطاء بھی ہوسکتی ہے۔ یا جان بوجھ کر باطل بھی کرسکتا ہے۔ لیکن جب تمام [اہل ایمان] لوگ جمع ہو جائیں تو وہ کبھی بھی گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتے۔ اور جب روایات تواتر کے ساتھ ہوں تو ان سے یقین کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ یہی معاملہ خواب کا بھی ہے۔

---

❶ سننِ ابنِ ماجه:٢/ ١٤١١؛كتاب الزهدِ، باب الثناءِ الحسنِ، وقال المعلق فِي الزوائِدِ:إسناده صحِيح، رِجاله ثِقات، وليس لأبِي زهير هذا عنِ ابنِ ماجه سِوى هذا الحدِيثِ، وليس له شي فِي بقِيةِ الكتبِ السِتةِ، والحدِيث فِي المسندِ؛ ط. الحلبي ٣/ ٤١٦۔

❷ البخارِي:٩/ ٣١؛ كتاب التعبِيرِ، باب المبشِراتِ ، وجاء جزء مِن حدِيث آخر بِنفسِ المعنى عنِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فِي مسلِم: ١/ ٣٤٨؛ كتاب الصلاةِ، باب فِي الدعاِ فِي الركوعِ والسجودِ، سننِ أبِي داود:١/ ٣٢١؛ كتاب الصلاةِ، باب فِي الدعاِ فِي الركوعِ والسجودِ، سننِ النسائِي:٨/ ١٤٨، كتاب التطبِيقِ، باب تعظِيمِ الربِ فِي الركوعِ، سننِ ابنِ ماجه:٢/ ١٢٨٣؛ كتاب تعبِيرِ الرؤيا، باب الرؤيا الصالِحةِ يراها المسلِم أو ترى له.

❸ سننِ التِرمِذِي:٣/ ٣٦٤؛ كتاب الرؤيا، باب ذهبتِ النبوة وبقِيتِ المبشِرات، وقال التِرمِذِي عن حدِيثِ أبِي الدرداِ: وهذا حدِيث حسن. سننِ ابنِ ماجه:٢/ ١٢٨٣؛ كتاب تعبِيرِ الرؤيا، باب الرؤيا الصالِحةِ.

❹ مسلِم:٤/ ٢٠٣٤؛ كتاب البِرِ والصِلةِ والآدابِ، باب إذا أثنِي على الصالِحِ فهِي بشرى ولا تضر، سننِ ابنِ ماجه:٢/ ١٤١٢؛ كتاب الزهدِ، باب الثناءِ الحسنِ ؛ مسند أحمد ٥/ ١٥٦.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

’’میں دیکھتا ہوں کہ تمہارا خواب میں دیکھنا آخری سات راتوں کے مطابق ہے تو جو آدمی لیلۃ القدر کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیئے کہ وہ اسے آخری سات راتوں میں تلاش کرے۔‘‘ ❶

یہ باب بھی اہل سنت والجماعت کے ہاں شیعہ کی نسبت کامل و اکمل ہے۔انہیں اپنی سعادت و کامیابی کے علم اور اس کے حصول کے لیے کوئی ایسی علمی راہ میسر نہیں ہے جس پر اہل سنت والجماعت گامزن نہ ہوں۔

[کامیابی ونجات پر یقین]:

پانچویں وجہ:...... یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اہل سنت اپنے ائمہ کی فلاح ونجات پر جس پختگی کے ساتھ یقین رکھتے ہیں؛ شیعہ اس سے محروم ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد اہل سنت کے ائمہ سابقین اولین مہاجرین و انصار ہیں؛ جو ان کے نزدیک قطعی جنتی ہیں۔اہل سنت کے یہاں یہ امر مسلم ہے کہ عشرہ مبشرہ یقیناً جنتی ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بدری صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

((اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَکُمْ .)) ❷

’’تم جو چاہو کرو میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔‘‘

اہل سنت اس سے بڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ:’’جن صحابہ نے درخت کے نیچے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی تھی ان میں سے کوئی بھی جہنم میں نہیں جائے گا۔‘‘ جیسا کہ حدیث صحیح سے ثابت ہے۔ ❸ اس سے واضح ہوتا ہے کہ بیعتِ شجرہ میں شریک چودہ صد سے زائد صحابہ اہل سنت کے امام اور یہ قطعی جنتی ہیں؛ ان میں سے کوئی ایک بھی جہنم میں نہیں جائے گا؛ یہ دعوی علم کی روشنی میں ہے' اور اس پر کتاب وسنت کے دلائل پر مبنی ہے۔

چھٹی وجہ:...... اہل سنت جن لوگوں کے حق میں جنتی ہونے کی شہادت دیتے ہیں، خواہ مطلقاً ہو یا معیناً؛ ان کی شہادت علم و دلیل پر مبنی ہے۔اس کے عین برخلاف روافض اگر گواہی دیتے ہیں تو ایسی بات کی گواہی دیتے ہیں جس کی حقیقت کے بارے میں وہ خود بھی کچھ نہیں جانتے؛ یا پھر ان کی شہادت جھوٹ کا پلندہ ہوتی ہے؛ اور انہیں اس کے جھوٹ ہونے کے بارے میں علم بھی ہوتا ہے۔اسی بنا پر امام شافعی رحمہ اللہ کو کہنا پڑا:

((مَا رَاَیْتُ قَوْمًا اَشْهَدَ بِالزُّوْرِ مِنَ الرَّافِضَةِ .))

’’میں نے شیعہ سے زیادہ جھوٹی شہادت دینے والا کسی قوم کو نہیں دیکھا۔‘‘

---

❶ البخاري:۳/ ٤٦؛ کتاب فضلِ لیلةِ القدرِ، باب التِماسِ لیلةِ القدرِ فِی السبعِ الأواخِرِ، مسلِم:۲/ ۸۲۲؛ کتاب الصِیامِ، باب فضلِ لیلةِ القدرِ، الموطِ:۱/ ۳۲۱؛ کتاب الِاعتِکافِ، باب ما جاء فِی لیلةِ القدر، المسندِ ط. المعارِفِ:٦/ ۲۳۱.

❷ صحیح بخاری، کتاب المغازی۔ باب فضل من شهد بدراً (حدیث:۳۹۸۳، ۳۰۰۷) صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة۔ باب من فضائل حاطب بن ابی بلتعة (حدیث: ۲٤۹٤)

❸ صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل اصحاب الشجرة (حدیث: ۲٤۹٦)۔

ساتویں وجہ:...... یہ امر قابل غور ہے کہ شیعہ جس امام کے جنتی ہونے کی شہادت دیتے ہیں یا تو وہ ہر چیز میں واجب الاطاعت ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ دوسرے اہل ایمان لوگ اس ضمن میں ان سے اختلاف کرتے ہوں۔ یا اس کی اطاعت صرف انہی امور میں کی جائے گی جو اللہ ورسول کے بیان کردہ ہوں؛ یا اس کے اجتہاد پر مبنی ہوں۔ یہ اس صورت میں ہوگا جب اس سے بڑھ کر کسی اہل علم اور افضل کا علم نہ ہو۔ بصورت اول اہل سنت والجماعت کے یہاں ایسا کوئی امام ہی نہیں جس کی ہر بات اور ہر حکم میں اطاعت کی جاتی ہو سوائے رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کے۔ ان کا قول وہی ہے جو کہ امام مالک، مجاہد اور حکم رحمہم اللہ فرمایا کرتے تھے:

''ہر شخص کی بات کو (بشرط صحت) تسلیم بھی کیا جا سکتا ہے اور (غلط ہونے کی صورت میں) رد بھی کیا جا سکتا ہے، مگر سرور کائنات ﷺ کی ہر بات قابل تسلیم ہے۔''

اہل سنت اپنے امام (سالار رسل ﷺ) کو خیر الخلائق قرار دیتے ہیں؛ اور اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ آپ کی پیروی کرنے والا ہر شخص جو آپ کے اوامر کو بجالاتا ہو؛ اور منع کردہ چیزوں سے رک جاتا ہو؛ وہ جنت میں جائے گا۔ یہ شہادت شیعہ کی اس یقین دہانی سے اتم و اکمل ہے کہ امام عسکری کے متبعین اور ان کے ہمنوا و امثال جنتی ہیں۔ اس سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اہل سنت کا امام اور ان کی شہادت دونوں شیعہ کی شہادت کی نسبت زیادہ مکمل اور قابل اعتماد ہیں۔ ان دونوں کے مابین کوئی برابری اور مساوات نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ءٰ آللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ [النمل ۵۹]

''کیا اللہ بہتر ہے یا جو کچھ وہ شریک ٹھہراتے ہیں؟۔''

مقابلہ کے وقت خالص شر اور برائی کے مقابلہ میں خالص نیکی اور بھلائی کا ذکر کیا جائے گا؛ اگرچہ شر میں کوئی خیر نہیں ہوتی۔

اگر شیعہ کی امام سے مراد محدود و مقید امام ہے؛ تو اہل سنت کے نزدیک کوئی امام اس وقت تک واجب الاطاعت نہیں ہوتا جب تک اسکے اوامر امام مطلق سرور کائنات ﷺ کے ارشادات سے ہم آہنگ نہ ہوں۔ اہل سنت جب شرعی حکم کے مطابق اللہ تعالیٰ کے احکام میں ایسے امام کی اطاعت کرتے ہیں تو انہیں اس بات کی مطلقاً پروا نہیں ہوتی کہ آیا وہ جنت میں جائے گا یا نہیں، اس لیے کہ وہ دراصل اللہ ورسول کے احکام کی اطاعت کر رہے ہوتے ہیں۔ جس طرح امام معصوم کی اتباع بعض اوقات اس کے نائبین کی اطاعت کرتے ہیں، حالانکہ وہ دوزخی بھی ہو سکتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض اوقات امام کے نائب یہ بھی نہیں جانتے کہ کیا وہ وہی حکم دیتے ہیں جو حکم امام معصوم نے دیا ہے۔ کیونکہ انہیں امام معصوم کے کسی حکم کا کوئی علم ہی نہیں ہوتا۔ بخلاف ازیں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی کسی سے ڈھکے چھپے نہیں؛ جب کوئی اہل سنت حدیث کے مطابق حکم دیتا ہے تو یہ بات فوراً معلوم ہو جاتی ہے کہ کون ان کے موافق حکم دے رہا ہے اور کون مخالف۔ اختلافی امور کا فیصلہ اجتہاد سے کر لیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حدیث نبوی پر عمل پیرا ہونا امام معصوم کے نائبوں کی اطاعت کرنے سے بدرجہا افضل ہے۔

خصوصاً جب کہ یہ پتہ بھی نہ ہو کہ امام غائب نے کیا حکم دیا، اور نہ اس کی کچھ خبر ہو کہ نائب آیا امام کے موافق ہے یا مخالف۔ اگر شیعہ یہ دعویٰ کریں کہ نائبین اپنے پیش کردہ علماء کے اقوال پر عمل پیرا اور ان کے عالم ہوتے ہیں۔ تو اس سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ اہل سنت کے علماء کو حدیث نبوی کے بارے میں جو علم حاصل ہے وہ ان کے علم سے بدر جہا اتم و اکمل ہے۔ اگر کسی شیعہ سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ اس ضمن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے امام سے کوئی روایت صحیح بتلا دے تو وہ ایسا کرنے پر ہرگز قادر نہ ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیعہ کا درجہ احادیث کی اسناد اور اسماء الرجال کے فن میں اہل سنت کے علماء کی نسبت فروتر ہے۔

[کامیابی کا دار و مدار]:

آٹھویں وجہ:...... رافضی کے کلام کا جواب یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو کامیابی اور سعادت کی ضمانت دی ہے جو اس کی اطاعت کریں اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں۔ اور جو لوگ ایسا نہ کریں انہیں شقاوت و بدبختی سے ڈرایا ہے۔ پس سعادت کا دار و مدار اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ [النساء ۶۹]

''اور جو بھی اللہ تعالیٰ کی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کرے، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا، جیسے نبی اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ، یہ بہترین ساتھی ہیں۔''

اور اس طرح کی دیگر آیات بھی بہت سی ہیں۔

جب معاملہ ایسے ہی ہے تو اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتے ہیں:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ [التغابن ۱۶]

''تم سے جتنا ہو سکے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔''

پس جو کوئی بھی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں اپنی وسعت بھر کوششیں کرے؛ وہ ان شاء اللہ تعالیٰ اہل جنت میں سے ہوگا۔ پس رافضیوں کا یہ کہنا کہ جنت میں صرف وہی داخل ہوگا جو امامیہ میں سے ہوگا؛ یہ بالکل یہود و نصاریٰ کے قول کی طرح ہے؛ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ० بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ [البقرة ۱۱۱۔۱۱۲]

''یہ کہتے ہیں کہ جنت میں یہود و نصاریٰ کے سوا اور کوئی نہ جائے گا یہ صرف ان کی آرزوئیں ہیں، ان سے کہو کہ: اگر تم سچے ہو تو کوئی دلیل تو پیش کرو۔ سنو جو بھی اپنے آپ کو خلوص کے ساتھ اللہ کے سامنے جھکا

دے۔ بیشک اسے اس کا رب پورا بدلہ دیگا اس پر نہ تو کوئی خوف ہوگا، نہ غم اور اداسی۔''

یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جس منتظر کے دعویدار رافضی ہیں؛ اس کی اطاعت کسی ایک پر بھی واجب نہیں ہے۔اس لیے کہ اس سے کسی منقول قول کا علم حاصل ہی نہیں ہوسکا۔ پس پھر جو کوئی رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرے گا' وہ جنت میں داخل ہوجائے گا۔ بھلے وہ اس خودساختہ امام پر ایمان نہ رکھتا ہو۔اور جو کوئی اس امام پر ایمان رکھتا ہو وہ اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہوسکتا جب تک وہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت نہ کرلے۔اس لیے کہ سعادت کا دارو مدار اپنے عدم اور وجود کے اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت پر ہے۔ پس یہی چیز اطاعت گزاری اہل جنت اور اہل جہنم میں فرق کرنے والی ہے۔محمد رسول اللہ ﷺ لوگوں کے درمیان وجہ فرق ہیں۔اللہ تعالیٰ نے اپنی خلقت کو آپ کی اطاعت کا حکم دیا ہے' اور اس طرف رہنمائی فرمائی ہے۔ پس اس سے ظاہر ہوگیا کہ اہل سنت والجماعت ان لوگوں کی نجات کے بارے میں پختہ یقین رکھتے ہیں جو کہ سنت پر پابند ہوں۔

[منہاج السنہ کی تیسری جلد مکمل ہوئی]

❀❀❀❀

فصل:...... بارہ ائمہ کے خصائص پر رافضی کا کلام

جھوٹا رافضی دعوی اور مذہب کی ظاہری چمک

[اشکالات] شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''شیعہ مذہب کی صداقت کی چوتھی دلیل یہ ہے کہ: ''انہوں نے یہ مذہب ان ائمہ معصومین سے اخذ کیا ہے جو علم و فضل ؛ زہد و ورع میں شہرت رکھتے تھے۔اور ہر وقت دعا و عبادت اور تلاوت قرآن میں مشغول رہتے۔ ان کا یہی حال بچپن سے لیکر آخری عمر تک رہا۔اور ان میں ایسے بھی تھے جو لوگوں کو علوم سکھانے میں مشغول رہتے۔ان ہی کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی:﴿ هل أتى ﴾ [الإنسان ۱]۔اور آیتِ طہارت؛اور ان کے لیے وجوب محبت کی آیت؛اور آیت مباہلہ وغیرہ اسی بارے میں نازل ہوئیں۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کثرت عبادت کا یہ عالم تھا کہ آپ جنگوں میں مشغول رہنے کے باوجود شب و روز میں ایک ہزار رکعات نوافل پڑھا کرتے تھے۔''

ان میں سب سے پہلے امام حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں۔آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب مخلوق میں سے افضل ترین انسان تھے۔اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات قرار دیا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اَنۡفُسَنَا وَ اَنۡفُسَكُمۡ ﴾ [آل عمران ٦١] ''اور ہمارے نفسوں کو اور تمہارے نفسوں کو۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اپنا بھائی بنایا ؛ اور اپنی بیٹی کو آپ کی زوجیت میں دیا۔آپ کی فضیلت کسی پر مخفی نہیں ہے۔آپ سے بہت سارے معجزات ظاہر ہوئے ۔یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے آپ کے رب ہونے کا دعوی کیا ؛ پھر انہیں قتل کر دیا گیا۔ پھر یہی بات ان کی جگہ کچھ دوسرے لوگ کہنے لگے؛ جیسے کہ غالیہ اور نصیریہ وغیرہ۔آپ کے دو بیٹے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے تھے؛ جو کہ جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں۔اور وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح اور واضح حکم کے مطابق امام تھے۔یہ دونوں حضرات اپنے دور کے سب سے بڑے زاہد اور بڑے عالم تھے۔انہوں نے اللہ کی راہ میں ایسے جہاد کیا جیسے جہاد کرنے کا حق ہے ؛ یہاں تک کہ دونوں اللہ کی راہ میں شہید کردیے گئے۔حضرت حسن رضی اللہ عنہ اپنے فاخرانہ لباس کے نیچے اون کا لباس اس طرح پہنا کرتے تھے کہ اس کا کسی کو پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اپنی دائیں ران پر بٹھایا اور ابراہیم کو اپنی بائیں ران پر بٹھایا؛ تو جبریل امین نازل ہوئے اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ان دونوں کو آپ کے لیے جمع نہیں کرے گا۔آپ ان دونوں میں سے جس کو چاہیں اختیار کرلیں۔تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر حسین مر گیا تو میں علی اور فاطمہ رضی اللہ عنہم تینوں روئیں گے۔اور اگر ابراہیم مر گیا تو اس پر مجھے ہی رونا پڑے گا؛ پس میں ابراہیم کی موت کو اختیار کرتا ہوں ۔اس واقعہ کے تین دن بعد ابراہیم کا انتقال ہوگیا۔اور اس کے بعد جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ تشریف لاتے تو آپ فرماتے : ''خوش آمدید و مرحبا اے بیٹے !

جس کے بدلے میں میں نے اپنے بیٹے ابراہیم کی قربانی پیش کی ہے۔اسی طرح امام زین العابدین اور امام باقر بھی بڑے عابد شب زندہ دار تھے اور کتاب اللہ کی تلاوت میں مگن رہتے ۔ اور دن و رات میں ایک ہزار رکعت پڑھا کرتے تھے۔اور ہر دو رکعتوں کے بعد اپنے آباء کرام سے منقول دعائیں پڑھا کرتے۔اور بے قراری کے عالم میں مصحف کو چھوڑ دیتے؛......اور پھر فرمایا کرتے: مجھے علی رضی اللہ عنہ والی عبادت کہاں نصیب ہوگی؟ آپ بہت زیادہ رویا کرتے تھے یہاں تک کہ کثرت گریہ کی وجہ سے آپ کے گالوں کا گوشت ختم ہوگیا تھا۔اور آپ کو لمبے سجدہ کرنے کی وجہ سے آپ کو ذاثفن (لمبا سجدہ کرنے والا] کا نام دیا گیا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو زین العابدین کا خطاب دیا تھا۔جب ہشام بن عبد الملک نے حج کیا تو حجر اسود کو بوسہ دینے کی کوشش کی؛ مگر رش کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکا۔اتنے میں زین العابدین تشریف لائے؛ تو لوگ ٹھہرے گئے ؛ اور آپ کے لیے جگہ چھوڑ دی؛ یہاں تک کہ آپ نے حجر اسود کا استلام کیا۔اس وقت آپ کے علاوہ کوئی ایک بھی حجر اسود کے پاس باقی نہ رہا۔ یہ دیکھ کر ہشام بن عبد الملک نے کہا: یہ کون ہے؟ تو فرزدق شاعر نے اپنا وہ مشہور قصیدہ پڑھ دیا جو امام زین العابدین کے بارے میں زبانِ زد خلائق ہے۔[قصیدہ یہ ہے:]

اس قصیدہ کو سن کر ہشام طیش میں آ گیا اور اس نے مکہ اور مدینہ کے درمیان فرزدق کو قید کر دینے کا حکم دے دیا اس پر فرزدق نے اسے یہ اشعار لکھ بھیجے:

''کیا تو مجھے مدینہ کے درمیان اور اس شہر کے درمیان قید کرتا ہے جس کی طرف لوگوں کے دلوں کو راغب کیا گیا ہے۔کیا تم اس سر کو پلٹتے ہو جو سردار کا سر نہیں اور اس آنکھ کو بدلتے ہو جو بھینگی ہے اور اس کا بھینگا پن بالکل عیاں ہے۔''

❀ تو حضرت زین العابدین رحمہ اللہ نے فرزدق کو ہزار دینار بھیجے ۔ اس نے وہ دینار واپس کردیے؛ اور کہا: میں نے یہ اشعار اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے غصہ کھاتے ہوئے کہے ہیں میں ان پر کوئی اجرت نہیں لیتا ۔ تو حضرت علی بن الحسین رحمہ اللہ نے فرمایا:'' ہم اہل بیت ہیں ؛ جو کچھ ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتا ہے' ہم اسے واپس نہیں لیا کرتے ۔تو فرزدق نے وہ دینار قبول کرلیے۔

❀ مدینہ میں کچھ لوگ تھے جنہیں رات میں ان کا غلہ پہنچ جایا کرتا تھا؛ مگر انہیں علم نہیں ہوتا تھا کہ یہ کہاں سے آتا ہے۔ جب زین العابدین کا انتقال ہوگیا تو اس رزق کا آنا بند ہوگیا؛ تو انہیں پتہ چل گیا کہ یہ زین العابدین رحمہ اللہ کی طرف سے تھا۔آپ کا بیٹا محمد الباقر رحمہ اللہ لوگوں میں سب سے بڑا عابد و زاہد انسان تھا۔آپ کی پیشانی پر سجدہ کی وجہ سے نشان پڑ گئے تھے۔آپ اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا نام باقر رکھا تھا۔جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہ آپ کے پاس آئے ۔آپ اس وقت بہت چھوٹے تھے؛ جابر نے کہا: آپ کے نانا نے آپ کو سلام کہا ہے۔آپ نے کہا: اور میرے نانا پر بھی سلام ہو۔حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا:'' میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا؛ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ آپ کی گود میں کھیل

رہے تھے۔آپ نے فرمایا:''اے جابر! اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا؛ اس کا نام علی ہوگا۔ جب قیامت کا دن ہوگا تو آواز لگانے والا آواز لگائے گا: سید العابدین کہاں ہے' اسے چاہیے کہ وہ کھڑا ہو جائے۔تو اس کا بیٹا کھڑا ہوگا۔ پھر اس کے گھر ایک بیٹا پیدا ہوگا؛ اس کا نام محمد الباقر ہوگا۔ وہ ایک بار پڑھنے سے سارا علم حاصل کر لے گا۔ جب تم اس کو دیکھو تو اسے میرا اسلام کہنا۔آپ سے ابوحنیفہ اور دوسرے علماء نے روایات نقل کی ہیں۔

❀ آپ کا بیٹا الصادق اپنے زمانہ کا سب سے افضل اور عابد انسان تھا۔علماء سیرت کا کہنا ہے: آپ حکومت طلبی چھوڑ کر عبادت میں ہی مشغول رہے۔عمر بن ابوالمقدام کہتے ہیں: جب میں جعفر بن محمد الصادق کی طرف دیکھا کرتا تو پتہ چل جاتا تھا کہ آپ انبیاء کی اولاد میں سے ہیں۔آپ نے ہی فقہ امامیہ؛ معارف حقیقت اور عقائد یقینیہ کی نشرو اشاعت کا کام کیا۔آپ جب بھی کسی بات کی خبر دیتے تو وہ بالکل ویسے ہی پوری ہوتی۔اس لیے آپ کا نام صادق اور امین رکھا گیا تھا۔

❀ عبداللہ بن الحسن نے تمام علویوں کو اپنی اولاد کی بیعت کے لیے جمع تو امام صادق نے فرمایا: ایسے نہیں ہوسکتا۔اس پر عبداللہ کو غصہ آگیا۔اوراس نے کہا: یہ پیلے جبے والے کا ساتھی ہے- اس سے منصور کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا-۔ جب منصور تک یہ خبر پہنچی تو وہ بہت خوش ہوا کیونکہ جیسے آپ نے خبر دی تھی ویسے ہی ہونا تھا۔اوراس نے جان لیا کہ اب خلافت اسے مل کر رہے گی۔اور جب وہ بھاگ رہا تھا تو کہہ رہا تھا: تمہارے صادق کی پیشین گوئی کہاں ہے؟ اور پھر بعد میں خلافت اسے ہی مل کر رہی۔

❀ آپ کا بیٹا موسیٰ الکاظم ہے؛ اسے العبد الصالح [نیک انسان] کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔آپ اپنے زمانے کے سب سے بڑے عابد و زاہد تھے۔ دن کو روزہ رکھتے اور رات کو نماز پڑھتے رہتے۔آپ کو کاظم اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ جب آپ کسی کے متعلق سنتے کہ وہ آپ کی برائی بیان کر رہا ہے تو آپ اس کے پاس کچھ مال بھیج دیا کرتے۔آپ کے فضائل موافقین و مخالفین نے نقل کیے ہیں۔حنابلہ میں سے ابن جوزی رحمہ اللہ کہتے ہیں: شقیق البلخی سے روایت کیا گیا ہے:'' وہ کہتے ہیں: میں ایک سو چورانوے ہجری میں حج کے لیے نکلا۔ پس میں نے وہاں پر ایک نوجوان کو دیکھا؛ خوبصورت چہرہ اور گوری رنگت۔اس پر اونی لباس تھا؛ جو کہ شملہ پر مشتمل تھا۔اوراس کے پاؤں میں دو جوتیاں تھیں۔ وہ لوگوں سے الگ تھلگ بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اپنے جی میں کہا:''یہ نوجوان صوفیاء میں سے ہے جو لوگوں پر بوجھ بننا چاہتا ہے۔اللہ کی قسم! میں اس کے پاس جاؤں گا اور اسے جھڑکوں گا۔جب میں آپ کے قریب ہوا؛ تو آپ نے مجھے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ لیا۔آپ نے فرمایا: اے شقیق! بدگمانی سے بہت زیادہ بچا کر۔اس لیے کہ بدگمانی گناہ کا کام ہے۔ میں نے اپنے جی میں کہا: یہ کوئی نیک انسان ہے' اس نے وہی بات کہی جو میرے دل میں تھی۔ میں ضرور اس کے پاس جاؤں گا' اوراس سے سوال و جواب کروں گا۔تو آپ میری نظروں سے غائب ہوگئے۔ جب ہم نے اگلی منزل پر پڑاؤ ڈالا تو آپ وہاں پر نماز پڑھ رہے تھے۔اور آپ کے اعضاء

کانپ رہے تھے۔ اور آنسو رواں دواں تھے۔ میں نے کہا: میں ان کے پاس جا کر معذرت کروں گا۔ آپ نے نماز مختصر کی؛ اور فرمایا: اے شقیق ! [اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں]:

﴿وَ اِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی﴾ [طه ۸۲]

''اور بیشک میں انہیں بخش دینے والا ہوں جو توبہ کریں ایمان لائیں نیک عمل کریں اور راہ راست پر بھی رہیں۔''

میں نے کہا: ''یہ کوئی ابدال ہے۔ آپ نے دو بار میری اسرار کی بات کہی ہے۔ جب ہم نے اگلے مقام پر پڑاؤ ڈالا تو دیکھا کہ آپ وہاں کنوئیں پر کھڑے؛ آپ کے ہاتھ میں چھاگل ہے اور پانی نکال کر پلا رہے ہیں؛ آپ کے ہاتھ سے چھاگل کنوئیں میں گر گیا۔ آپ نے نظریں آسمان کی طرف اٹھائیں اور کہا:

''یا اللہ! تو میرا رب ہے جب مجھے پانی کے لیے پیاس محسوس ہو' اور تو ہی میرا کھانا ہے جب مجھے کھانے کی حاجت ہو۔'' اے میرے آقا! میرے لیے اس کے سوا کوئی نہیں۔ شقیق بلخی کہتے ہیں: ''اللہ کی قسم! میں نے دیکھا کنوئیں کا پانی بلند ہوا؛ آپ نے چھاگل لیا؛ اور اسے بھر لیا؛ پھر وضوء کر کے چار رکعت نماز پڑھی۔ پھر وہاں پر ایک ریت کے ٹیلے کے پاس چلے گئے آپ ایک ایک مٹھی [ریت] بھر کر چھاگل میں ڈالتے اور اس سے پیتے جاتے۔ میں نے کہا: جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے فضل سے دیا ہے' اور جو آپ پر انعام کیا ہے؛ اس میں سے مجھے بھی کچھ کھلا دیجیے۔ آپ نے فرمایا: ''اے شقیق! ہم پر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی ظاہری و باطنی نعمتیں جاری و ساری رہی ہیں۔ اپنے رب سے اچھا گمان رکھیں۔ پھر آپ نے مجھے وہ چھاگل پکڑا دیا۔ میں نے جب اس میں سے پیا تو دیکھا کہ وہ ستو اور شکر تھا۔ اللہ کی قسم! میں نے اس سے میٹھا اور خوشبودار کبھی بھی نہیں پیا۔ میں نے خوب سیر ہو کر پیا۔ پھر میں کئی دن ایسے ہی رہا۔ نہ ہی مجھے کھانے کی خواہش ہوتی اور نہ ہی پیاس لگتی۔ پھر میں نے آپ کو نہیں دیکھا یہاں تک کہ مکہ مکرمہ میں داخل ہو گئے۔ پھر ایک رات میں نے آپ کو میزاب کے قریب قبہ کے پاس دیکھا۔ آپ آدھی رات میں خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے اور رو رہے تھے۔ آپ ساری رات ایسے ہی روتے رہے۔ جب صبح طلوع ہو گئی تو آپ اپنی نماز کی جگہ پر بیٹھ گئے اور تسبیح میں مشغول ہو گئے۔ پھر آپ نماز فجر کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اور اس کے بعد بیت اللہ کے سات چکر لگائے۔ پھر آپ باہر نکل گئے تو میں بھی آپ کے پیچھے چل پڑا۔ میں نے دیکھا کہ آپ کے اموال ساز و سامان اور غلام ہیں۔ اب آپ کی وہ حالت نہیں تھی جو میں نے راستہ میں دیکھی تھی۔ لوگ آپ کے گرد گھوم رہے ہیں' اور آپ کو سلام کرتے ہیں' اور تبرک حاصل کرتے ہیں۔ میں نے ان لوگوں سے کہا ہے: یہ کون ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: ''موسیٰ بن جعفر۔ میں نے کہا: مجھے بھی یہی تعجب ہو رہا تھا کہ ایسے عجائب صرف کسی سید سے ہی صادر ہو سکتے ہیں۔'' یہ حنبلی کی روایت ہے۔

❀ آپ کے ہاتھ پر بشر الحافی نے توبہ کی۔ قصہ یہ ہیکہ آپ کا بغداد کے ایک محلے سے گزر ہوا۔ آپ نے ساز و موسیقی

اور گانے بجانے کی آوازیں سنی۔اور لوگ ایک گھر سے نکل رہے تھے۔ وہاں سے ایک لونڈی نکلی۔اس کے ہاتھ میں کوڑے والا تھیلا تھا۔ وہ اسے لیکر گلی میں سے گزری۔آپ نے اس لونڈی سے کہا: اے لڑکی! اس گھر والا آزاد ہے یا غلام؟ اس نے کہا: آزاد ہے۔تو آپ نے فرمایا:'' تم نے سچ کہا: اگر غلام ہوتا تو اپنے آقا سے ڈرتا۔جب وہ لونڈی واپس گھر میں گئی تو اس کے آقا نے جو کہ اس وقت نشہ کی حالت میں تھا؛ اس سے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی؟ تو اس نے کہا: ایک آدمی نے مجھ سے ایسے ایسے کہا ہے۔آپ یہ سن کر ننگے پاؤں موسیٰ بن جعفر کے پیچھے نکل پڑے یہاں تک کہ انہیں جالیا اوران کے ہاتھ پر توبہ کی۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[سلسلہ جوابات]: ان باتوں کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے:

پہلا جواب:...... ہم شیعہ کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں کرتے کہ انہوں نے یہ مذہب اہل بیت سے اخذ کیا ہے؛ نہ ہی اثنا عشریہ نے اور نہ ہی کسی دوسرے نے۔ کیونکہ شیعہ جن اصولوں میں بھی اہل سنت سے متفرق ہوئے ہیں ان تمام اصولوں اور فروعات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ائمہ اہل بیت کی مخالفت کرتے ہیں؛ جیسے توحید؛ عدل اور امامت۔حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ائمہ اہل بیت صفات الٰہی اور تقدیر کا اثبات کرتے؛ خلفاء ثلاثہ کی خلافت اور حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی فضیلت کے قائل ہیں۔اسی طرح دیگر بھی کئی ایک مسائل ہیں جن میں رافضی مذہب تناقض کا شکار ہے؛ جو کہ اہل علم کی کتابوں میں منقول موجود ہیں اس باب میں ائمہ اہل بیت سے منقول علوم کی معرفت سے پتہ چلتا ہے کہ رافضی اہل بیت کے مخالف ہیں موافق نہیں ہیں۔

دوسرا جواب:...... اس سے کہا جائے گا کہ: یہ بات معلوم شدہ ہے کہ رافضیوں کے مابین امامت؛ صفات الٰہیہ اور تقدیر اور کئی ایک اصول دین کے مسائل پر بہت بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔تو پھر ان میں سے کون سا قول اہل بیت سے ماخوذ ہے۔ یہاں تک کہ مسئلہ امامت میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے اور اس باب میں ان کا اضطراب و اختلاف بڑا مشہور ہے۔

اس سے پہلے مہدی منتظر اور امام منصوص کے بارے میں ان کا اختلاف گزر چکا ہے۔امام منتظر کے بارے میں ان کے کئی ایک اقوال ہیں: ان میں سے بعض کہتے ہیں: جعفر بن محمد زندہ باقی ہے۔بعض کہتے ہیں: عبد اللہ بن معاویہ زندہ باقی ہے۔بعض کہتے ہیں: محمد بن عبد اللہ بن حسن زندہ باقی ہے۔بعض کہتے ہیں: اس کا بیٹا موسیٰ بن جعفر زندہ باقی ہے۔ بعض کہتے ہیں: محمد بن الحنفیہ زندہ باقی ہے۔ایک گروہ کے لوگ کہتے ہیں کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو امام مقرر فرمایا تھا؛ جب کہ دوسرا گروہ کہتا ہے: نہیں' بلکہ محمد بن الحنفیہ کو امام بنایا تھا۔پھر ایک گروہ کہتا ہے کہ علی بن الحسین نے اپنے بیٹے ابو جعفر کو امام بنانے کی وصیت کی تھی؛ جب کہ دوسرا گروہ ان کے بیٹے عبد اللہ کی امامت کا قائل ہے۔اس گروہ کے لوگوں کا کہنا ہے کہ عبد اللہ نے اپنے بیٹے محمد بن عبد اللہ بن الحسن کو امام بنانے کی وصیت کی تھی۔جب کہ دوسرے گروہ کے لوگ کہتے ہیں کہ جعفر نے اپنے بیٹے اسماعیل کو امام بنایا تھا۔ یہ لوگ کہتے ہیں: اسماعیل نے اپنے بیٹے محمد کو امام بنایا تھا۔جب کہ دوسرے گروہ کے لوگ کہتے ہیں: اپنے بیٹے عبد اللہ کو امام بنایا تھا۔پھر یہ کہتے ہیں

کہ: اس کا بیٹا موسیٰ امام بنا تھا۔ یہ لوگ محمد بن حسن تک سلسلہ امامت کو اسی موسیٰ کی اولاد میں مانتے ہیں۔ جب کہ دوسرے گروہ کے لوگ امامت کو عبد اللہ بن میمون القداح شیعہ حکمران تک تسلیم کرتے ہیں۔ پھر ایک گروہ کہتا ہے: امامت بنی ہاشم سے بنی عباس میں منتقل ہوگئی تھی۔ [جب ان کے آپس میں اتنے اختلافات ہیں] تو پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ یہ تمام متناقض اقوال ائمہ اہل بیت سے ماخوذ ہوں۔ پس شیعہ کا یہ دعوی باطل ٹھہرا کہ ان کا مذہب اہل بیت سے ماخوذ ہے۔

تیسرا جواب:......تصور کیجیے حضرت علی رضی اللہ عنہ معصوم تھے۔ جب شیعہ کا آپس میں اس قدر اختلاف ہے؛ اور مسئلہ امامت میں اتنا سخت تنازع ہے تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرمان کی صحت کیسے معلوم ہوسکتی ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا دعوی ہے کہ جو کچھ بھی وہ کہتا ہے؛ اس کا قول ائمہ معصومین سے ماخوذ ہے۔ اس پر مزید یہ کہ شیعہ کے یہاں اسانید متصلہ نہیں ہیں جن کو تحقیق کی کسوٹی پر رکھ کر جانچا جا سکے۔ البتہ یہ ایسے اقوال ہیں جو جھوٹ پر مشتمل اور منقطع اسناد سے روایت کیے گئے ہیں۔ ان کے ہاں نقل کرنے میں تناقض اور جھوٹ کی کثرت شہرت کی بلندیوں کو چھو رہی ہے۔ تو پھر کیا کوئی عاقل ان کی باتوں کی تصدیق کرسکتا ہے۔ شیعہ کے یہاں دروغ گوئی کی فراوانی ہے، اگر وہ ان نصوص کے تواتر کا دعویٰ کریں تو کوئی چیز مخالفین کو بھی ایسے دعویٰ سے باز نہیں رکھ سکتی۔ جب دوسرے لوگ بھی اسی قسم کا دعویٰ کھڑا کر دیں گے تو فریقین کے دعاوی میں کچھ فرق و امتیاز باقی نہیں رہے گا۔ اگر بالفرض حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عصمت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو پھر بھی ان وجوہات کی بنا پر ماننا پڑے گا کہ امامیہ کا مذہب اہل بیت سے ماخوذ نہیں ہے۔ اس سے ان کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے معصوم ہونے کا دعوی بھی ویسے ہی باطل ثابت ہوا؛ جیسے عیسائیوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رب ہونے کا دعوی۔ کیونکہ عیسائی جو تعلیمات پیش کررہے ہیں وہ حضرت عیسی علیہ السلام سے ماخوذ نہیں۔

چوتھا جواب:......شیعہ اپنے مذہب کی صداقت کے اثبات میں دو باتوں کے محتاج ہیں:

۱۔ ائمہ کی عصمت کا دعوی جن کی طرف ان کا مذہب منسوب ہے۔

۲۔ دلائل و براہین سے ائمہ سے اس نقل کو ثابت کرنا۔ شیعہ کے پاس مذکورہ بالا دونوں امور کو ثابت کرنے کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں۔ لہٰذا دونوں باتیں باطل ٹھہریں۔

بیشک جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام الہ اور رب نہیں ہیں۔ بلکہ آپ ایک مہربان اور عزت والے رسول ہیں۔ بالفرض اگر مان لیا جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی رب ہیں؛ تب بھی جو کچھ عیسائی پیش کررہے ہیں' وہ آپ کی تعلیمات نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ میں ایک گونہ مشابہت عیسیٰ علیہ السلام کی پائی جاتی ہے: کچھ لوگوں نے آپ کو آپ کے اصلی مقام سے بہت آگے بڑھایا [یہاں تک کہ آپ کو رب بنا دیا] اور کچھ لوگوں نے آپ کو آپ کے شایان شان مقام ہی نہیں دیا۔ پس یہ دوسرا گروہ یہودیوں کی طرح ہے [جنہوں نے حضرت عیسی علیہ السلام کے صحیح مقام و مرتبہ کا خیال ہی نہیں کیا]؛ بلکہ آپ کو کافر اور زانیہ کی اولاد کہنے لگے۔ اور پہلا گروہ عیسائیوں کی طرح ہے جنہوں نے آپ کو ہی رب اور معبود بنالیا۔ [یہ دونوں گروہ راہ حق سے بھٹکے ہوئے ہیں]۔

پانچواں جواب:......حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ حضرت حسن اور حضرت حسین ؛علی بن الحسین ؛ان کے بیٹے محمد ؛ جعفر بن محمد ؛ رضی اللہ عنہم اجمعین اور ان کے ابناء و احفاد کے حق میں جو مناقب و فضائل ثابت ہیں، شیعہ مصنف نے ان کا ذکر تک نہیں کیا، البتہ کچھ جھوٹے مناقب تحریر کر دیے ہیں، جو اس کی جہالت کی کرشمہ سازی ہے۔

شیعہ مصنف کے ذکر کردہ حسب ذیل مناقب وفضائل قابل ملاحظہ ہیں:

۱۔ شیعہ مصنف لکھتا ہے کہ: آیت: ﴿ هَلْ اَتٰى ﴾ اہل بیت کے بارے میں نازل ہوئی۔ حالانکہ یہ سورت بالاتفاق مکی ہے اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا غزوۂ بدر کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر میں آباد ہوئیں۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ ہجرت کے تیسرے سال اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ چوتھے سال پیدا ہوئے۔ یہ سورت اس سے کئی سال پہلے نازل ہو چکی تھی۔

نظر بریں شیعہ مصنف کا یہ کہنا کہ سورہ مذکور اہل بیت کے بارے میں نازل ہوئی صریح کذب ہے اور اس سے ہر وہ شخص آشنا ہے جو علم نزول قرآن اور اہل بیت کے کوائف و احوال سے معمولی واقفیت بھی رکھتا ہے۔

۲۔ جہاں تک آیت تطہیر کی تعلق ہے؛ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴾ ''اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اے نبی کی گھر والیو! تم سے وہ (ہر قسم کی) گندگی کو دور کر دے اور تمہیں خوب پاک کر دے۔'' کا تعلق ہے اس میں نجاست کو دور کرنے کی خبر نہیں دی گئی، بلکہ پاکیزگی اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے جیسے درج ذیل آیت میں ہے:

﴿ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ ﴾ (المائدۃ : ۶)

''اللہ تعالیٰ تمہیں تکلیف میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا بلکہ پاک کرنا چاہتا ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَ يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ يَتُوْبَ عَلَيْكُمْ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌo وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ وَ يُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًاo يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴾ (النساء: ۲۶۔ ۲۸)

''اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہارے واسطے خوب کھول کر بیان کرے اور تمہیں تم سے پہلے کے (نیک) لوگوں کی راہ پر چلائے اور تمہاری توبہ قبول کرے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اور اللہ چاہتا ہے کہ تمہاری توبہ قبول کرے اور جو لوگ خواہشات کے پیرو ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم اس سے بہت دور ہٹ جاؤ۔ اللہ چاہتا ہے کہ تم پر تخفیف کر دے اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔''

مذکورۃ الصدر آیات میں ارادہ کا لفظ حکم دینے اور محبت و رضا کے معنوں میں استعمال اس کا ہوا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس بات کا ارادہ کیا تھا اسے عملی جامہ پہنا دیا۔ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ جس کی تطہیر کا ارادہ کرتے وہ پاک و صاف ہو جاتا۔ ہمارے معاصر شیعہ کے قول کے مطابق آیت کا مطلب بالکل واضح ہے۔ ہمارے زمانہ کے شیعہ معتزلہ کے ہم خیال ہیں اور ان کی ہم نوائی میں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسی باتوں کا ارادہ بھی کرتا ہے، جو عالم وجود میں نہیں

آ تیں، اور ایسی باتیں بھی وجود میں آ جاتی ہیں؛ جن کا اللہ تعالیٰ کوئی ارادہ نہیں کرتا۔ ان کے خیال میں آیت قرآنی اسی قبیل سے ہے:

﴿اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا﴾ (الاحزاب ۳۳)

''اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اے نبی کے گھر والیو! تم سے وہ (ہر قسم کی) گندگی کو دور کر دے اور تمہیں خوب پاک کر دے۔''

آیت تطہیر کا مطلب یہ ہے کہ اگر اہل بیت شرعی اوامر و احکام پر عمل پیرا ہوں گے اور محرمات سے باز رہیں گے تو ان کو پاک کر دیا جائے گا۔ اگر ایسا نہیں کریں گے تو انہیں پاک نہیں کیا جائے گا۔ ان لوگوں [معتزلہ اور شیعہ قدریہ] کا یہ بھی کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے افعال کا خالق نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کو پاک کرنے اور ان سے نجاست کے دور کرنے پر قادر نہیں ہے۔ جب کہ تقدیر کا اثبات کرنے والے کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ ان تمام امور پر قادر ہے۔ جب اللہ تعالیٰ انہیں افعال کا بجالانا اور ممنوعات کا ترک کرنا الہام کر دے تو ان کے لیے پاکی حاصل ہو جائے گی؛ اور ان سے نجاست ختم کر دی جائے گی۔

گویا ان کی تطہیر ان کے اپنے ارادوں اور افعال سے وابستہ ہے۔ وہ دلیل جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا آیت امر ہے خبر نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث ہے کہ آپ نے حضرت علی، فاطمہ، اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم اجمعین کو چادر میں چھپا لیا، اور فرمایا:

''اے اللہ! یہ بھی میرے اہل بیت ہیں تو ان سے بھی نجاست کو دور کر کے ان کو پاک کر دے۔'' [1]

[اس حدیث سے پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ نجاست کو دور کرنے اور پاک وصاف کرنے پر قادر ہے۔ نیز معتزلہ کے عین برخلاف یہ بھی ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ افعال العباد کا خالق ہے، مندرجہ ذیل آیت سے یہ بھی امر مستفاد ہوتا ہے، کہ مذکورۃ الصدر آیت میں حکم دیا گیا ہے، خبر نہیں بیان کی گئی]۔

یہ حدیث دو وجوہات کی بنا پر رد رافضیت پر دلالت کرتی ہے:

پہلی وجہ:...... نبی کریم ﷺ نے ان کی طہارت اور پاکیزگی کے لیے دعا فرمائی ہے؛ یہ دلیل ہے کہ ان لوگوں کو پاک کرنے کی ابھی تک خبر نہیں دی گئی تھی۔ اگر ایسے ہی ہوتا تو پھر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی جاتی اور اس کا شکر بجالایا جاتا۔ محض دعاء پر اکتفاء نہ کیا جاتا۔

دوسری وجہ:...... یہ دعا دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں پاک کرنے اور ان سے ناپاکی کے ختم کرنے پر قادر ہے۔

---

[1] صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابة باب فضائل اهل بیت النبی ﷺ (ح:۲٤۲٤) عن عائشه، رضی اللہ عنہا، و مسند احمد (٦/ ۲۹۲) سنن ترمذی۔ کتاب المناقب۔ باب ما جاء فی فضل فاطمة رضی اللہ عنہا (ح:۳۸٦۷) و عن ام سلمة ۔ کتاب تفسیر القران۔ باب و من سورة الاحزاب (ح:۳۲۰۵، ۳۷۸۷) عن عمر بن ابی سلمة رضی اللہ عنہ)

اس میں یہ دلیل بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کا خالق ہے۔اس آیت کے سیاق سے ظاہر ہوتا ہے کہ آیت کریمہ امرو نہی کو متضمن ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ مَنْ یَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ یُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرًا ○ وَ مَنْ یَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَاۤ اَجْرَهَا مَرَّتَیْنِ وَ اَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِیْمًا ○ یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ○ وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰى وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتِیْنَ الزَّكٰوةَ وَ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا ○ وَاذْكُرْنَ مَا یُتْلٰى فِیْ بُیُوْتِكُنَّ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ وَ الْحِكْمَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِیْفًا خَبِیْرًا○﴾ (الاحزاب: ۳۰۔۳۴)

''اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو بھی کھلی بے حیائی (کا ارتکاب) کرے گی اسے دوہرا دوہرا عذاب دیا جائے گا۔اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بہت ہی سہل (سی بات) ہے۔اور تم میں سے جو کوئی اللہ کی اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے گی اور نیک کام کرے گی ہم اسے اجر (بھی) دوہرا دیں گے اور اس کے لئے ہم نے بہترین روزی تیار کر رکھی ہے۔اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم پرہیزگاری اختیار کرو تو نرم لہجے سے بات نہ کرو کہ جس کے دل میں روگ ہو وہ کوئی برا خیال کرے اور ہاں قاعدے کے مطابق کلام کرو۔اور اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور قدیم جاہلیت کے زمانے کی طرح اپنے بناؤ کا اظہار نہ کرو اور نماز ادا کرتی رہو اور زکوٰۃ دیتی رہو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت گزاری کرو۔اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اے نبی کی گھر والیو! تم سے وہ (ہر قسم کی) گندگی کو دور کر دے اور تمہیں خوب پاک کر دے۔اور تمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور رسول کی جو احادیث پڑھی جاتی ہیں ان کا ذکر کرتی رہو یقیناً اللہ تعالیٰ مہربانی کرنے والا خبردار ہے۔''

اس سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں امرونہی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات اہل بیت میں شامل ہیں۔کیونکہ آیت کے سیاق میں ان سے ہی خطاب کیا گیا ہے۔اور آیت میں ضمیر خطاب ﴿لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ﴾ ضمیر مذکر سے معلوم ہوا کہ ازواج مطہرات کے علاوہ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ و فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ان کے ابناء واحفاد بھی شامل ہیں۔آیت میں جمع مذکر کی ضمیر لائی گئی ہے؛ اس لیے کہ اس میں مذکر ومونث سب شامل ہیں۔ان ازواج مطہرات کو اہل بیت میں سے ہونے کی وجہ سے خاص کیا گیا ہے۔اسی لیے باقی کے حضرات [علی و فاطمہ اور حسن وحسین رضی اللہ عنہم] کو چادر کے نیچے داخل کر کے ان کے لیے دعا کی گئی۔

جس طرح مسجد نبوی اور مسجد قبا دونوں کی اساس خلوص وتقویٰ پر رکھی گئی تھی، بلکہ مسجد نبوی اس وصف میں افضل و

اکمل تھی، جب آیت قرآنی:

﴿لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ﴾ (التوبہ:۱۰۸)

''البتہ جس مسجد کی بنیاد اول دن سے تقوی پر رکھی گئی ہے وہ اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں اس میں ایسے آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالی خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

نازل ہوئی تو مسجد کے لفظ سے مذکورہ دونوں مساجد کو مراد لیا جانے لگا، بلکہ مسجد نبوی اس میں بدرجہ اولی شامل ہے۔ پھر علماء کرام رحمہم اللہ کے مابین اختلاف واقع ہوا ہے کہ کیا آپ کی ازواج مطہرات بھی اہل بیت میں شامل ہیں؟ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے اس بارے میں دو روایتیں منقول ہیں۔ بروایت صحیح تر منقول ہے کہ ازواج مطہرات اہل بیت میں شامل ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے:

((اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّاتِهٖ))❶

دوسرے مقام پر یہ درود تفصیل کے ساتھ ہے۔

جب کہ ان کے غلام اور باندیاں وغیرہ بلا اختلاف اہل بیت میں سے نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صدقہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے لیے مباح تھا۔ ابو رافع رضی اللہ عنہ کا شمار بھی آپ کے موالین میں سے ہوتا ہے۔ اسی لیے انہیں صدقہ لینے سے منع کیا گیا؛ اس لیے کہ کسی قوم کے موالی انہی میں سے شمار ہوتے ہیں۔ ان پر صدقہ حرام ہونے کا سبب بھی ان کو اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے مطابق پاک کرنا ہے۔ اس لیے کہ صدقہ لوگوں کا میل کچیل ہوتا ہے۔

اسی طرح ان کے لیے وجوب محبت کی تفسیر میں بھی غلطی ہوئی ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی بابت پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ قُلْ لَا اَسْاَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾ [الشوری ۲۳]

''کہہ دیجئے! کہ میں اس پر تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا مگر محبت رشتہ داری کی۔''

تو میں نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت کا تعلق رکھنے والوں سے محبت کرو۔''

اس پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرمانے لگے: ''تم نے بہت جلدی کی۔ قریش کی کوئی بھی شاخ ایسی نہیں ہے جس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلقِ قرابت داری نہ ہو۔❷

---

❶ صحیح بخاری کتاب أحادیث الانبیاء باب (۱۰)، (حدیث:۳۳۶۹)، صحیح مسلم۔ کتاب الصلاۃ۔ باب الصلاۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعد التشهد(حدیث:۴۰۷)

❷ صحیح بخاری کتاب التفسیر۔ سورۃ الشوری۔ باب قوله﴿الا المودّة فی القربیٰ﴾ (ح:۴۸۱۸)

بنا بریں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، جس کا مفہوم یہ ہے کہ (اے نبی) آپ فرمائیں کہ میں اس کے سوا تم سے کچھ اجر طلب نہیں کرتا کہ ان قرابت دارانہ تعلقات کی بنا پر جو میرے اور تمہارے درمیان پائے جاتے ہیں تو مجھ سے الفت و محبت کا سلوک روا رکھو۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اہل بیت کے ایک بڑے فرد اور تفسیر قرآن کے علماء میں سے ہیں۔ یہ تفسیر آپ سے ثابت ہے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ مذکورہ آیت میں " اِلَّا الْمَوَدَّةَ لِذِي الْقُرْبٰى " کے الفاظ نہیں فرمائے بلکہ یوں فرمایا " فِي الْقُرْبٰى " حالانکہ جہاں اقارب مراد لینا مقصود ہوتا ہے وہاں لِذوی الْقُرْبٰى " کی تصریح ہوتی ہے، کیا آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ جب اقارب مراد تھے؛ تو یہی الفاظ استعمال کئے ؛ جیسے اس آیت کریمہ میں ہے:

﴿وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى﴾ (الانفال: ۴۱)

''اور جان لو کہ تمہیں جو کچھ بھی مال غنیمت ملے؛ بیشک اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور قریبی رشتہ داروں کے لیے۔'' [یہاں صراحتاً یہ الفاظ موجود ہیں۔]

اگر یہاں بھی قرابت داروں کی محبت مقصود ہوتی تو ﴿ وَلِذِي الْقُرْبٰى﴾ : کے الفاظ استعمال کیے جاتے۔یوں تو بولا ہی نہیں جا سکتا کہ: ﴿ الْمَوَدَّةَ فِي ذوى الْقُرْبٰى﴾۔ تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ﴿ الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾ سے مراد اقرابت داروں کی محبت ہے۔اس کی مزید وضاحت اس امر سے ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عمل پر کسی قسم کے اجر و بدلہ کے طلب گار تھے ہی نہیں۔ بیشک آپ کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے۔اور مسلمانوں پر لازم ہوتا ہے کہ آپ سے اور آپ کے اہل بیت سے موالات اور دوستی رکھیں؛ لیکن اس کا ثبوت اس آیت سے نہیں دوسری آیات سے ملتا ہے۔اہل بیت کے ساتھ ہماری دوستی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجر میں داخل نہیں اس لیے آپ کہ اجر سے بے نیاز تھے اور صرف اللہ تعالیٰ سے اجر طلب کیا کرتے تھے۔

نیز یہ آیت مکی ہے؛ اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی ہی نہیں ہوئی تھی؛ اور نہ ہی اس وقت میں ان کی کوئی کسی قسم کی اولاد تھی۔

باقی رہا آیت مباہلہ کا معاملہ۔صحیح بخاری میں ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی اور حضرت فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم اجمعین کے ہاتھ پکڑ لیے تا کہ ان سے مباہلہ کریں۔ [1] انہیں خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ دوسرے لوگوں کی نسبت آپ کے زیادہ قریبی تھے۔اور آپ کی کوئی نرینہ اولاد بھی نہ تھی جس کو آپ ساتھ لیکر مباہلہ کے لیے چلتے۔لیکن آپ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں ارشاد فرمایا کرتے تھے: میرا یہ بیٹا سردار ہوگا۔'' پس یہ دونوں اور آپ کے بیٹے اور عورتیں مباہلہ کے لیے چلے۔اس لیے کہ اس وقت تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی باقی بیٹیاں وفات پا چکی تھیں۔مباہلہ کا قصہ اس وقت کا ہے جب نجران کا وفد حاضر خدمت ہوا تھا۔ یہ لوگ عیسائی تھے۔یہ فتح مکہ کے بعد سنہ ۹

[1] صحيح مسلم ٤/ ١٨٧١۔ والترمذي ٤/ ٢٩٣۔

ہجری کا قصہ ہے۔اسی بارے میں سورت آل عمران کے شروع کی آیات نازل ہوئیں۔اسی سال آپ ﷺ پر حج فرض کیا گیا۔اس سال کو وفود کا سال بھی کہا جاتا ہے۔ جب سن آٹھ ہجری میں مکہ مکرمہ فتح ہوا تو ہر طرف سے وفود آنے شروع ہوگئے۔ یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کمالِ تعلق وصلہ پر دلالت کرتی ہے۔جیسا کہ اس قسم کی دلالت حدیث کساء میں بھی ہے۔لیکن اس آیت کا تقاضا یہ بھی نہیں ہے کہ ان سے بڑھ کر کوئی بھی دوسرا افضل یا بڑا عالم نہ ہو۔اس لیے کہ فضیلت کمال ایمان اورتقوی کی وجہ سے ہوتی ہے۔نہ کہ نسبی قرابت کی وجہ سے۔جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ﴾ [الحجرات ۱۳]

''بیشک اللہ کے ہاں تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے؛ جو تم میں سے بڑا متقی ہو۔''

اور یہ بات ثابت شدہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس امت میں سب سے بڑے متقی اور کتاب وسنت کے بڑے عالم تھے۔ نبی کریم ﷺ سے تواتر کے ساتھ منقول ہے آپ نے فرمایا:

''اگر میں نے اہل زمین میں سے کسی کو اپنا دوست بنانا ہوتا تو میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنا دوست بناتا۔''❶

یہ مسئلہ دوسری جگہ پر پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ایک ہزار رکعات؟:

[اشکال]: شیعہ مصنف کا یہ دعویٰ کہ:''حضرت علی رضی اللہ عنہ شب و روز میں ایک ہزار رکعات پڑھا کرتے تھے۔''

[جواب]: ایسا کہنا درست نہیں۔ یہ دعوی مصنف کی جہالت اور حقائق سے لاعلمی پر دلالت کرتا ہے۔

پہلی بات :......[یہ کہنا کہ] آپ ایک رات میں ایک ہزار نفل پڑھا کرے تھے۔ یہ کوئی فضیلت نہیں ہے۔اس کے عین برخلاف صحیحین میں ثابت ہے کہ سرور کائنات ﷺ رات بھر میں ۱۳ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھا کرتے تھے۔❷

رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:

''سب سے بہترین قیام حضرت داؤد علیہ السلام کا تھا۔آپ آدھی رات تک سوئے رہتے ۔ پھر ایک تیسرا حصہ قیام فرماتے ۔اور پھر رات کا چھٹا حصہ سو جاتے۔''❸

نیز یہ بھی ثابت ہے کہ آپ صبح کو مرغ کی آذان سننے کے بعد بیدار ہوا کرتے تھے۔اور یہ بھی ثابت ہے کہ جب آپ ﷺ کو کچھ لوگوں کے بارے میں خبر ہوئی کہ:

''ایک نے کہا میں رات بھر نماز پڑھا کروں گا، دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا، تیسرے نے کہا میں نکاح نہیں کروں گا اور عورت سے ہمیشہ الگ رہوں گا، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس

---

❶ البخاري ١/ ٨٦۔ ومسلم ٤/ ١٨٥٤۔ ❷ البخاري ٢/ ٥١؛ مسلم ١/ ٥٠٨۔

❸ مسلم ٢/ ٨١٦۔ البخاري ٤/ ١٦١؛ كِتاب الأنبِياءِ: باب: أحب الصلاةِ إِلى اللهِ صلاة داود ونصه: أحب الصِيامِ إِلى اللهِ صِيام داود، كان يصوم يوما ويفطِر يوما، وأحب الصلاةِ إِلى اللهِ صلاة داود، كان ينام نِصف الليلِ ويقوم ثلثه، وينام سدسه .

تشریف لائے اور فرمایا: کیا تم لوگوں نے یوں یوں کہا ہے؟ اللہ کی قسم! میں اللہ تعالی سے تمہاری بہ نسبت بہت زیادہ ڈرنے والا اور خوف کھانے والا ہوں، پھر میں روزہ رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور ساتھ ساتھ عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، یاد رکھو جو میری سنت سے روگردانی کرے گا، وہ میرے طریقے پر نہیں۔'' ❶

آپ ﷺ ساری رات کے قیام کو ناپسند فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کو خبر ملی کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہہ رہے ہیں: میں دن کو روزہ رکھا کروں گا اور رات کو قیام کیا کروں گا تو آپ ان سے یوں مخاطب ہوئے:

''ایسا نہ کرنا۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تیری آنکھوں میں گڑھے پڑ جائیں گے اور بدن کمزور ہو جائے گا۔ اور بیشک تیرے رب کا تجھ پر حق ہے' اور تمہاری جان کا تم پر حق ہے؛ تمہاری ملاقات کے لیے آنے والے کا تم پر حق ہے۔ اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے۔ پس ہر حق دار کو اس کا حق ادا کرو۔'' ❷

پس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ساری ساری رات عبادت کرنا مستحب یا پسندیدہ نہیں ہے۔ بلکہ نبی کریم ﷺ سے ثابت سنتوں کی روشنی میں ایسا کرنا مکروہ ہے۔ ایسے ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روزہ رکھنے کا حکم بھی ہے۔ بیشک افضل ترین روزے حضرت داؤد علیہ السلام کے روزے تھے۔ آپ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کیا کرتے تھے۔

احادیث مبارکہ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ شب و روز میں تقریباً چالیس رکعات پڑھا کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے طریق کار سے بخوبی آگاہ تھے، اور بڑھ چڑھ کر آپ ﷺ کی سنتوں کی پابندی کرنے والے تھے۔ آپ سے سنت کی مخالفت ممکن ہی نہیں۔ پھر اس حد تک وہ آپ کی مخالفت کیوں کر کر سکتے تھے، بشرطیکہ ایک ہزار رکعات ادا کرنا ممکن بھی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ دیگر واجبات کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ ایک ہزار رکعات پڑھنا ممکن ہی نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان مختلف قسم کے مشاغل میں گھرا رہتا ہے، جسم کی راحت و آرام سونا، کھانا پینا، وضو کرنا، وظیفہ زوجیت ادا کرنا، اہل و عیال کی دیکھ بھال کرنا، رعیت کے امور سے عہدہ برآ ہونا، غرض یہ کہ دسیوں قسم کے لوازمات ہیں جن پر بلا مبالغہ انسان کا نصف وقت صرف ہو جاتا ہے، ایک گھنٹہ میں اسی رکعات ادا نہیں کی جاسکتیں، بجز اس کے کہ صرف سورہ فاتحہ پڑھی جائے اور وہ بھی بلا سکون و اطمینان کوے کی طرح ٹھونگیں ماری جائیں۔ ہمارے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مرتبہ اس سے کہیں بلند ہے کہ آپ نماز میں منافقوں کی طرح ٹھونگے مارنے لگیں اور اللہ کو بہت کم یاد کریں، جیسا کہ بخاری و مسلم کی روایت میں مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

❶ صحیح بخاری۔ کتاب التهجد۔ باب کیف صلاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم (ح:۱۱۳۸، ۱۱۴۰)، صحیح مسلم۔ کتاب صلاۃ المسافرین۔ باب صلاۃ اللیل (ح:۷۳۷، ۷۳۸، ۷۶۴)

❷ صحیح بخاری کتاب الصوم۔ باب حق الجسم فی الصوم، (حدیث:۱۹۷۵) صحیح مسلم۔ کتاب الصیام، باب النهی عن صوم الدهر، (حدیث:۱۱۵۹)

''یہ منافق کی نماز ہے کہ سورج کو بیٹھے دیکھتا رہتا ہے جب وہ شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان میں ہوتا ہے تو کھڑا ہوکر چار ٹھونگیں مارنے لگ جاتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کرتا مگر بہت تھوڑا۔'' ❶

نبی کریم ﷺ نے کوّے کی طرح ٹھونگیں مارنے سے منع فرمایا ہے۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس قسم کی حکایات نقل کرنا مصنف کی جہالت کا آئینہ دار ہے۔ پھر راتوں کو تہجد پڑھنا اور ایک رکعت میں قرآن ختم کرنا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بھی ثابت ہے۔ اور آپ کی تہجد گزاری اور تلاوت قرآن صاف ظاہر ہے۔

انفس سے کیا مراد ہے؟:

[اشکال]: شیعہ مصنف کہتا ہے: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے افضل ترین ہستی ہیں۔''

[جواب]: یہ فقط خالی [اور خیالی] دعوی ہے؛ جس میں اگلے اور پچھلے جمہور مسلمین کی مخالفت کی گئی ہے۔ [شیعہ کے پاس اس کی کوئی مستند دلیل نہیں ہے؛ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو اپنے سے افضل مانتے تھے]۔

[اشکال]: شیعہ کا قول کہ: اللہ نے آپ کی ذات کو رسول اللہ ﷺ کی ذات قرار دیا اور فرمایا: ﴿وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَکُمْ﴾ ''اور ہمارے نفسوں کو اور تمہارے نفسوں کو۔'' رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھائی بنالیا تھا۔''

[جواب]: [مذکورہ] حدیث مواخات سند کے اعتبار سے موضوع ہے؛ اس لیے کہ آپ نے کسی کو بھائی نہیں بنایا۔ مزید برآں مواخات کا رابطہ آپ ﷺ نے مہاجرین کے درمیان آپس میں یا انصار کے مابین استوار نہیں تھا بلکہ مہاجرین و انصار کے درمیان تھا؛ جیسا کہ آپ نے سعد بن ربیع اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا۔ اور سلیمان الفارسی اور ابودرداء رضی اللہ عنہما کے مابین؛ جیسا کہ صحیحین میں ثابت ہے۔ ❷

[باقی رہا] شیعہ مصنف کا یہ کہنا کہ سورہ آل عمران کی آیت ﴿وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَکُمْ﴾ (آل عمران: ۶۱) میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نفس رسول قرار دیا گیا ہے؛ بالکل غلط ہے۔ اس آیت میں انفس کا لفظ اسی طرح استعمال کیا گیا ہے کہ جس طرح مندرجہ ذیل آیات میں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا﴾ (النور: ۱۲)

''اسے سنتے ہی مومن مردوں عورتوں نے اپنے حق میں نیک گمانی کیوں نہ کی۔''

یہ آیت کریمہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی برأت میں قصہ افک میں نازل ہوئی۔ یہاں پر مؤمنین میں سے کسی بھی

---

❶ صحیح مسلم: ح ۱۴۰۷؛ کتاب المساجدِ و مواضعِ الصلاۃ فیھا، باب استِحباب التبکِیرِ بالعصرِ سننِ ابی داود: ۱/ ۱۶۷، کتاب الصلاۃ، باب فِی صلاۃ العصرِ، سننِ الترمِذِي: ۱/ ۱۰۷؛ کتاب الصلاۃ، باب ما جاء فِی تعجِیلِ العصرِ؛ سننِ النسائِي: ۱/ ۲۰۳؛ کتاب المواقِیتِ، باب التشدِیدِ فِی تأخِیرِ العصرِ، المسندِ ط. الحلبِي: ۳/ ۱۴۹.

❷ البخارِی: ۵/ ۳۱۳۲، کتاب مناقِبِ الأنصارِ، باب إخاءِ النبِي ﷺ بین المھاجرِین والأنصار: ۵/ ۶۹؛ کتاب مناقِبِ الأنصارِ، باب کیف آخی النبِی ﷺ بین أصحابِہِ۔ مسلِم: ۴/ ۱۹۶۰؛ کتاب فضائِلِ الصحابۃِ، باب اخاءِ النبِیِ ﷺ بین صحابِہِ۔ سننِ الترمِذِي: ۴/ ۲۳ کتاب الزھدِ، باب: ۴۸.

مؤمن مرد یا عورت کو دوسرے مؤمن کی ذات [نفس] سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ❶

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِئِکُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ﴾ (البقرہ:۵۴)

''اب تم اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع کرو، اپنے آپ کو آپس میں قتل کرو۔''

یعنی آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو۔ ❷ نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ لَا تَسْفِکُوْنَ دِمَآءَ کُمْ وَ لَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ﴾ (البقرہ:۸۴)

''اور جب ہم نے تم سے وعدہ لیا کہ آپس میں خون نہ بہانا (قتل نہ کرنا) اور ایک دوسرے کو جلاوطن مت کرنا۔''

یعنی آپس میں ایک دوسرے کو اپنے شہروں سے نہ نکالنا۔ یہاں پر انفس [نفوس] سے مراد اپنے بھائیوں کے نفس ہیں؛ خواہ یہ بھائی چارہ نسبی ہو یا دینی۔ ان آیات میں انفس سے نسبی یا دینی بھائی مراد ہیں۔ ❸

سرور کائنات ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا: ((اَنْتَ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْكَ)) ❹

''تم مجھ سے ہو اور میں تجھ سے ہوں۔''

نیز نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''کسی غزوہ کے دوران جب قبیلہ اشعر کے لوگوں کا توشہ ختم ہو جاتا ہے تو وہ اپنے باقی ماندہ توشہ کو ایک چادر میں جمع کر کے اسے برابر برابر تقسیم کر لیتے ہیں اس لیے یہ میرے ہیں اور میں ان کا ہوں۔'' ❺

سرور کائنات ﷺ نے حضرت جلبیب رضی اللہ عنہ ❻ کے بارے میں فرمایا:

((هٰذَا مِنِّیْ وَاَنَا مِنْهُ .)) یہ دونوں روایتیں صحیح ہیں۔ ❼ ان کی تفصیل اپنی جگہ پر موجود ہے۔

---

❶ البخاري:۵/ ۱۱۶ قالت عائشة: كان رسول الله ﷺ إذا أراد سفرا أقرع بين أزواجه، .... والحديث في: البخاري:۳/ ۱۷۳؛ كتاب الشهادات، باب تعديل النساء بعضهن بعضا، مسلم:٤/ ۲۱۲۹، ۲۱۳۸، كتاب التوبة، باب في حديث الإفك ، المسند ط. الحلبي:٦/ ۱۹٤، ۱۹۷ .

❷ دیکھو: تفسیر الطبری ط: المعارف؛ ۲/ ۷۲۔ اثر نمبر ۹۳٤ ۔

❸ اس آیت: ﴿انفسنا و أنفسکم﴾ کی تفسیر کے لیے شیعہ علماء کی تفاسیر بھی دیکھیں؛ ان سے یہ کلام ڈاکٹر احمد صبحی نے اپنی کتاب ''شیعہ اثنا عشریہ اور نظریہ امامت'' ص ۲۷۷ پر نقل کیا ہے۔

❹ صحیح بخاری، کتاب الصلح، باب کیف یکتب هذا ما صالح فلان (حدیث: ۲٦۹۹)، مطولاً

❺ صحیح بخاری، کتاب الشرکة۔ باب الشرکة فی الطعام والنهد(حدیث:۲٤۸٦) صحیح مسلم۔کتاب فضائل الصحابة۔ باب من فضائل الاشعريين رضی الله عنهم(حدیث: ۲۵۰۰)

❻ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی کی وجہ یہ تھی کہ صحابی حضرت جلبیب رضی اللہ عنہ ایک غزوہ میں گم ہو گئے اور آپ نے ان کو تلاش کرنے کا حکم دیا، تلاش کرنے پر آپ کی نعش ملی، سات مشرکین آپ کے ارد گرد مقتول پڑے تھے، ان کو ٹھکانے لگانے کے بعد آپ نے جام شہادت نوش کیا، یہ منظر دیکھ کر آپ نے ان کے حق میں دعائے خیر کی، نیز فرمایا: '' هٰذَا مِنِّیْ وَاَنَا مِنْهُ ''

❼ صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابة ۔ باب من فضائل جلبیب رضی الله عنه (ح: ۲٤۷۲)۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نکاح:

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نکاح سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ان کی عظمت وفضیلت کا موجب ہے، جس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شادی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی دونوں بہنوں کے ساتھ (یکے بعد دیگرے) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے باعث فضیلت ہے، اور نبی کا عقد مبارک حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی بیٹیوں کے ساتھ ان دونوں کی عزت افزائی کا موجب ہے، خلاصہ کلام یہ کہ چاروں خلفاء رضی اللہ عنہم اجمعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رشتہ مصاہرت [سسرالی] میں جکڑے ہوئے تھے۔

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بہت سے معجزات صادر ہوئے۔'' [انتھی کلام الرافضی]

[جواب]: اگر معجزات کے لفظ سے شیعہ مصنف کرامات مراد لیتا ہے جیسا کہ لوگ یہ اصطلاح استعمال کرتے ہیں' تو اس میں شبہ نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بہت سے صاحب کرامات اولیاء سے افضل تھے۔اور کرامات بہت سے ان اہل سنت والجماعت عوام سے بھی ثابت ہیں جو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ترجیح دیتے ہیں۔تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کرامات کیسے ثابت نہیں ہوسکتیں؟ اور صرف کرامات کا ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ آپ سے دوسرا کوئی افضل نہیں ہے۔

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق دعویٰ ربوبیت]:

[اشکال]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ''بہت سے لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ربوبیت کا دعویٰ کیا اور آپ نے انہیں قتل کروا دیا۔''

[جواب]: یہ عقیدہ جہالت کی انتہاء ہے۔اس کی کئی ایک وجوہات ہیں:

پہلی وجہ:......سالار انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات بہر حال اکثر و اعظم تھے اور اللہ کا شکر ہے کہ آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے کسی ایک نے آپ کو رب قرار نہ دیا۔

دوسری وجہ:......حضرت ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے معجزات بہت بڑے اور بہت زیادہ ہیں؛ لیکن ان میں سے بھی کسی ایک کو رب نہیں قرار دیا گیا۔

تیسری وجہ:...... ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات سے بہت زیادہ ہیں مگر پھر بھی ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی رب نہیں مانا گیا جیسا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں لوگوں نے غلو کیا۔

چوتھی وجہ:......حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں بڑے زور وشور سے رب ہونے کا دعویٰ کیا گیا؛ ایسا دعویٰ محمد' ابراہیم اور موسیٰ علیہم السلام کے بارے میں نہیں کیا گیا؛ مگر پھر بھی کسی نے نہیں کہا کہ حضرت مسیح ابراہیم اور موسیٰ علیہم السلام سے افضل ہیں۔اور نہ ہی یہ دعویٰ کیا کہ آپ کے معجزات ان سے بڑھ کر اور زیادہ زوردار ہیں۔

پانچویں وجہ:......ان دونوں کے متعلق رب ہونے کا دعوی باطل ہے۔ اس کے مقابلہ میں بھی ایک باطل دعوی پیش کیا جاتا ہے۔ یہ حضرت عیسی علیہ السلام کے متعلق یہودیوں کا دعوی ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق خوارج کا دعوی ہے۔ خوارج حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر کہتے ہیں۔ اگر قوتِ شبہ کی بنا پر آپ کے متعلق یہ دعوی کرنا جائز ہوسکتا ہے کہ آپ رب ہیں تو پھر قوت شبہ کی بنا پر خوارج کا دعوی بھی صحیح ہوسکتا ہے۔ اور یہ کہنا بھی جائز ہوسکتا ہے کہ آپ سے کچھ ایسی خطائیں ہوگئی تھیں جن کی بنا پر خوارج نے آپ کو کافر کہا۔ اور خوارج ان لوگوں سے بڑھ کر دین دار اور عالم تھے جنہوں نے آپ کے رب ہونے کا دعوی کیا تھا۔ اگر ایسے دعووں کو دلیل بنانا اور انہیں منقبت شمار کرنا جائز ہے؛ تو پھر آپ سے بغض رکھنے والوں اور خوارج کا دعوی بھی اس سے کئی درجہ زیادہ قوی ہے۔ اس بارے میں رافضی غالی خوارج کا مقابلہ کہاں کرسکتے ہیں؟

خوارج لوگوں میں سب سے زیادہ نمازی؛ روزہ دار اور قرآن کی تلاوت کرنے والے تھے۔ ان کے اپنے لشکر اور فوجیں تھیں۔ وہ ظاہری اور باطنی طور پر دین اسلام کے دعویدار تھے۔ جب کہ ان کے مقابلہ میں غالی رافضی یا تو لوگوں میں سب سے بڑے جاہل ہوا کرتے تھے یا پھر سب سے بڑے کافر۔ امامیہ غالیہ کے کافر ہونے پر تمام لوگوں کا اجماع ہے۔ جب کہ خوارج کو وہی لوگ کافر کہتے ہیں جو امامیہ کو بھی کافر کہتے ہیں۔ بلکہ خوارج امامیہ سے بہت بہتر ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کو کافر نہ کہتے تھے۔ اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک پر قدرت پاکر اسے قتل کرنے کا حکم دیتے۔ جس طرح غالیہ کو آگ میں جلانے کا حکم دیا تھا۔ بلکہ انہیں اس وقت تک قتل نہیں کیا گیا جب تک انہوں نے عبداللہ بن خباب کو قتل نہ کیا اور لوگوں پر شبِ خون نہ مارا۔

صحابہ کرام' علماء امت اور دیگر کے اجماع سے ثابت ہے کہ خوارج غالیہ شیعہ سے بہت بہتر اور افضل ہیں۔ پھر اس کے باوجود اگر شیعہ کے لیے جائز ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق غالیہ کے دعوی الوہیت کو آپ کی فضیلت میں حجت تسلیم کریں تو پھر شیعان عثمان رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگوں کے لیے جائز ہے کہ وہ خوارج کے دعوی کفر کو بھی دلیل بنالیں۔ پس معلوم ہوا کہ ایسے دلائل سے صرف جاہل لوگ ہی حجتیں پکڑتے ہیں۔ پھر یہی دلیل ان پر حجت بن جاتی ہے' ان کے حق میں نہیں رہتی۔ اسی لیے لوگ جانتے تھے کہ رافضی نواصب سے بڑے جاہل اور جھوٹے ہوا کرتے ہیں۔

[حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما اور جہاد فی سبیل اللہ]:

[اشکال]: آپ کے دو بیٹے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے تھے؛ جو کہ جنت کے نوجوانوں کے سردار ہوں گے۔ اور وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح اور واضح حکم کے مطابق امام تھے۔''

[جواب]: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا:

''میرا یہ بیٹا سردار ہے اور عنقریب اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں میں صلح کرائے گا۔'' [1]

[1] صحیح بخاری، حوالہ سابق (ح:٣٦٢٩) ۔

صحیح احادیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ رضی اللہ عنہ آپ کو ایک ران پر بٹھاتے اور اسامہ بن زید کو دوسری ران پر بٹھاتے اور فرمایا کرتے تھے:

''اے اللہ میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں' تو بھی ان دونوں سے محبت کر۔ اور ان لوگوں سے بھی محبت کر جو ان دونوں سے محبت کریں۔'' [المسند ٥/ ٢٠٥؛ فضائل الصحابة ٢/ ٧٦٨؛ ح:١٣٢]

اس سے ظاہر ہوا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے خلافت کے مسئلہ پر جو جنگ ترک کی؛ اور مسلمانوں کے درمیان صلح کروائی؛ تو یہ امر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب تھا؛ یہ کوئی معصیت نہ تھی۔ بلکہ جنگ وقتال کی نسبت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں محبوب ترین چیز تھی۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے اور اسامہ سے محبت کا اظہار کیا' ان دونوں کے لیے دعا بھی فرمائی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں حضرات جنگ وقتال اور فتنہ کو نا پسند کرتے تھے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے تو جنگ وقتال میں حصہ ہی نہیں لیا؛ نہ ہی آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا اور نہ ہی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ ہمیشہ اپنے والد محترم کو جنگ بند کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔

یہ رافضیوں کے عقیدہ اور دعوی کے الٹ ہے۔ اس لیے کہ وہ صلح کو مصیبت اور ذلت شمار کرتے ہیں۔ اگر اس وقت کوئی امام معصوم ہوتا تو ہر ایک پر اس کی اطاعت واجب ہوتی۔ اور جو کوئی اس معصوم کے علاوہ کسی دوسرے کو امام بناتا تو اس کی امامت وولایت باطل ہوتی۔ نہ ہی اس کے ساتھ جہاد کرنا جائز ہوتا اور نہ ہی اسکے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہوتی۔ تو پھر اس صورت میں یہ صلح امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے بڑے مصائب میں سے ایک ہوتی۔ اور اس کی وجہ سے ان لوگوں کا دین فاسد ہو جاتا۔

تو پھر اس صلح میں کونسی ایسی فضیلت تھی جس پر رافضہ ان کی تعریف وثنا بیان کرتے ہیں۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ آپ کو کمزوری کی وجہ سے جنگ کرنے سے معذور سمجھا جاتا۔ جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو صلح کی وجہ سے قابل تعریف سردار قرار دیا ہے' عاجز اور معذور نہیں کہا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی نسبت لڑائی سے نہ ہی عاجز آگئے تھے اور نہ ہی کمزور پڑے تھے۔ بلکہ آپ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر قتال پر قادر تھے؛ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس وقت تک جنگ کی حتی کہ آپ کو شہید کر دیا گیا۔ جو کچھ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کیا اگر ایسا کرنا افضل اور واجب ہوتا تو پھر حضرت حسن رضی اللہ عنہ اس واجب کو ترک نہ کرتے اور کمزوری کی وجہ سے پیچھے نہ ہٹتے۔ اور اگر جو کچھ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کیا تھا؛ وہی افضل اور زیادہ مناسب تھا تو یہ دلیل ہے کہ جنگ کو ترک کرنا اور صلح کر لینا ہی افضل تھا۔ اور جو کچھ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کیا وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ محبوب اور پسندیدہ تھا۔ اور اللہ تعالیٰ اہل تقوی مؤمنین کے درجات کو آپس میں ایک دوسرے پر بلند کرتا ہے۔ اور یہ سب کے سب جنت میں ہوں گے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

پھر اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو امام بنایا تھا؛ تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ان کو امام بنانا کیا معنی رکھتا ہے؟ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو امام مقرر کرنا معنی رکھتا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اس دنیا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو خوشبودار پھول تھے۔اور یہ بھی ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو ان کے والدین کے ساتھ اپنی چادر میں داخل کیا تھا اور دعائی فرمائی تھی:

''اے اللہ! یہ بھی میرے اہل بیت ہیں۔ان سے ناپاکی کو دور کردے؛ اور انہیں ہر طرح سے پاک کردے۔''

مباہلہ کے وقت آپ نے ان دونوں کو بھی ساتھ بلایا تھا۔ان کے فضائل بہت زیادہ ہیں۔اور آپ اہل ایمان کے بڑے جلیل القدر سرداروں میں سے ہیں۔باقی رہا یہ دعوی کرنا کہ یہ دونوں اپنے زمانے کے سب سے بڑے زاہد اور سب سے بڑے عالم تھے؛ یہ دعوی بغیر دلیل کے ہے۔

[رافضی کا دعوی جہاد]

[اشکال]: رافضی کا کہنا ہے:''ان دونوں نے اللہ کی راہ میں حق کیساتھ جہاد کیا حتی کہ شہید کردیے گئے۔''

[جواب]: ان دونوں کے متعلق یہ دعوی جھوٹ ہے۔کیونکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ یہ تمام معاملات حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو تفویض کرکے خود کنارہ کش ہوگئے تھے۔اس کے ساتھ ہی عراقی لشکر بھی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ چلے گئے۔ آپ جنگ وقتال کو ہرگز پسند نہیں کرتے تھے یہ بات آپ کی سیرت سے صاف ظاہر ہے۔

آپ کی موت کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔کہا جاتا ہے کہ آپ کو زہر دیکر مارا گیا۔یہی آپ کی شہادت اور آپ کے حق میں کرامت ہے۔لیکن آپ کی موت قتال کرتے ہوئے نہیں آئی۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی جنگ وقتال کے لیے نہیں نکلے تھے۔آپ کا خیال تھا کہ لوگ آپ کی اطاعت کریں گے۔ جب آپ نے دیکھا کہ لوگ آپ سے منہ موڑ چکے ہیں تو آپ نے تین مطالبات کیے:

۱۔ آپ کو واپس اپنے وطن جانے دیا جائے۔

۲۔ آپ کو محاذ جنگ پر جانے دیا جائے تاکہ دشمن سے جہاد کرسکیں۔

۳۔ یا پھر آپ کو یزید کے پاس پیش ہونے دیا جائے۔

پس ان ظالموں نے ان تینوں میں سے ایک بات بھی نہ مانی؛ بلکہ آپ سے گرفتاری پیش کرنے مطالبہ کیا تاکہ آپ کو قیدی بنا کر یزید کے سامنے پیش کیا جائے۔آپ نے ایسا کرنے سے انکار کردیا' یہاں تک لڑتے ہوئے مظلومیت کے ساتھ شہید ہوگئے۔لیکن شروع میں آپ کا ارادہ ہرگز جنگ کرنے کا نہیں تھا۔

[اشکال]: رافضی کا کہنا کہ:''آپ فاخرانہ لباس کے نیچے اونی لباس پہنا کرتے تھے۔''

[جواب]: یہ قول بھی بالکل ویسے ہی ہے جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ ایک رات میں ایک ہزار رکعت پڑھا کرتے تھے۔اس میں کوئی فضیلت نہیں ہے۔بلکہ یہ ایک سفید جھوٹ ہے۔اس لیے کہ کاٹن کے فاخرانہ لباس کے نیچے اونی لباس پہننے میں اگر کوئی فضیلت ہوتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ضرور اپنی امت کی اس طرف رہنمائی فرماتے۔ یا آپ خود ایسا کرتے؛ یا پھر ایسا کرنے کا حکم دیتے؛ یا پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے آپ کے عہد مبارک میں ایسا کیا ہوتا

اور آپ نے اسے برقرار رکھا ہوتا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے ایسا نہیں کیا؛ اور نہ ہی ایسا کرنے کا حکم دیا؛ اور نہ ہی آپ کے عہد مبارک میں صحابہ کرام میں سے کسی ایک نے ایسے کیا۔تو ظاہر ہوا کہ اس فعل میں فضیلت کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ایک سفر میں اپنے عام لباس کے اوپر اونی جبہ پہنا تھا۔صرف اونی جبہ پہننے میں کوئی فضیلت نہیں ہے اور نہ ہی نبی کریم ﷺ نے اس طرف ہماری رہنمائی فرمائی ہے۔حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے کہا گیا: کچھ لوگ اونی لباس پہنتے ہیں' اور کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اونی لباس پہنا کرتے تھے۔تو آپ نے فرمایا: ہمارے لیے ہمارے نبی کریم ﷺ کا طریقہ دوسروں کے طریقوں سے بڑھ کر محبوب اور پسندیدہ ہے۔

علمائے کرام رحمہم اللہ کے مابین اختلاف ہے کہ کیا اقامت کی حالت میں بغیر ضرورت کے اونی لباس پہننا مکروہ ہے یا نہیں؟ جب کہ سفر میں اونی لباس پہننا اچھی بات ہے' اس لیے کہ سفر میں اس کی ضرورت ہوتی ہے۔

پھر اگر مان لیا جائے کہ اونی لباس پہننا اطاعت گزاری اور قربت کا کام ہے۔تو پھر اس صورت میں اونی لباس کو تواضع کے اظہار کے لیے فاخرانہ لباس کے نیچے چھپا کر پہننے کے بجائے اس کے اوپر پہننا افضل اور بہتر تھا۔اس لیے کہ اندر میں اونی لباس پہننے میں صرف نفس کے لیے بلا فائدہ تکلیف ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اسی چیز کا حکم دیا ہے جو ان کے لیے زیادہ نفع بخش اور سہل ہو۔انہیں کسی ایسی چیز کا حکم نہیں دیا جس میں ان کے نفس کے لیے عذاب تو ہو مگر کوئی فائدہ نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''اللہ تعالیٰ انسان کے اس کے نفس کو عذاب دینے سے بے پرواہ و بے نیاز ہے۔''[1]

[حضرت ابراہیم اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما]

[اشکال]: رافضی مضمون نگار رقم طراز ہے:''ایک روز سرور کائنات ﷺ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے آپ کا لخت جگر ابراہیم رضی اللہ عنہ گود میں تھا،اسی اثناء میں حضرت جبریل تشریف لائے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ حسین و ابراہیم کو جمع نہیں ہونے دے گا،اس لیے آپ جس کو چاہیں پسند فرمائیں،آپ نے فرمایا:حسین رضی اللہ عنہ کی موت کی صورت میں علی و فاطمہ اور میں تینوں روئیں گے اور اگر ابراہیم موت سے ہم کنار ہوا تو میں اکیلا آہ و بکا میں مبتلا ہوں گا،اس لیے میں ابراہیم کی موت کو ترجیح دیتا ہوں۔'' چنانچہ تین دن کے بعد ابراہیم فوت ہوگئے۔اور اس کے بعد جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ تشریف لاتے تو رسول اللہ ﷺ فرماتے:''مرحباً اور خوش آمدید جس کے بدلے میں نے اپنے بیٹے ابراہیم کا فدیہ پیش کیا ہے۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں: یہ روایت کسی بھی قابل اعتماد اہل علم نے نقل نہیں کی۔نہ ہی اس کی کوئی معروف سند ہے؛

---

[1] سنن ابي داؤد ٣/ ٣١٩؛كتاب الإيمانِ والنذورِ، باب من رأى عليهِ كفارة إذا كان فِي معصِية. وجاء الحدِيث مختصرا فِي: البخارِي:٨/ ١٤٢؛ كتاب الإيمانِ والنذرِ، باب النذرِ فِيما لا يملِكه وفِي معصِية. وجاء مطولا فِي: سننِ الترمِذِي:٣/ ٤٦ كتاب الإيمانِ والنذورِ، باب فِيمن يحلِف بِالمشيِ ولا يستطِيع ، المسندِ ط. الحلبِي:٣/ ١٠٦.

اور نہ ہی معروف کتب حدیث میں اس روایت کا کوئی نام و نشان ملتا ہے۔اس حکایت کو نقل کرنے والے نے اس کی کوئی سند ذکر نہیں کی اور نہ ہی اسے کسی معروف کتاب کی طرف منسوب کیا ہے۔ بلکہ شیعہ مصنف نے اپنی عادت کے مطابق ایک بے سند بات کی ہے اور بہت گھٹیا قسم کا جھوٹ بولا ہے۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ منقولات میں سچی اور جھوٹی روایت میں فرق اس کی اسناد کی بنا پر ہوتا ہے۔ورنہ یہ بھی محض ایک جھوٹا دعوی ہے؛ کئی ایک لوگوں نے اس طرح کے دیگر بھی دعوے کر رکھے ہیں۔

پھر اس سے یہ بھی کہا جائے گا کہ:اس روایت کے جھوٹ ہونے پر تمام محدثین کا اتفاق ہے۔

اس قسم کی باتیں جاہل لوگ کیا کرتے ہیں، بھلاحضرت ابراہیم و حسین رضی اللہ عنہما کو جمع کرنے میں کونسا نقصان ہے جو حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو جمع کرنے میں نہیں۔ اگر حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کی موت ابراہیم کی موت سے بڑھ کر تھی تو پھر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی زندگی بھی ان سے بہت زیادہ بڑھ کر ہوتی۔ حالانکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ زندہ رہے۔

نیز یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق باقی لوگوں کے حق سے بہت زیادہ اور بڑھ چڑھ کر ہے۔اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جانتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اپنی جان سے بڑھ کر محبوب ہیں۔ اور آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی جان سے بڑھ کر محبت کرتے تھے۔تو اس صورت میں اگر حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ مر جاتے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اس سے بہت زیادہ روتے جتنا وہ اپنے بیٹے حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر روتے۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ بیٹے کی محبت طبعی ہوتی ہے؛ جس کو ختم کرنا ممکن نہیں ۔تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ یہی وصف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں موجود ہے۔ جب ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو آپ فرما رہے تھے:

''آنکھ رو رہی ہے ۔ دل غمگین ہے ۔ اور ہم زبان سے صرف وہی کہیں گے جس سے ہمارا اللہ راضی ہوجائے۔اے ابراہیم! ہم تیری جدائی پر غمگین ہیں۔''[1]

یہ تو صحیح احادیث میں ثابت ہے۔ پھر ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی جگہ اپنے بیٹے کی قربانی پیش کی ؛ اور ان کی جگہ اپنے بیٹے کی موت کو اختیار کیا؟

پھر کیا یہ بھی جائز ہے کہ ایک معصوم انسان کے بدلے کسی دوسرے معصوم کے خون کا بدلہ پیش کیا جائے؟

اگر ایسا کرنا جائز ہوتا تو اس کا الٹ کرنا زیادہ مناسب تھا۔اس لیے کہ اگر کسی انسان کے پاس کچھ بھی نہ ہو صرف اتنا خرچہ ہو جو یا تو اپنے بیٹے پر خرچ کرے یا پھر اپنے نواسے وغیرہ پر خرچ کرے؛ تو باتفاق مسلمین اس پر اپنے بیٹے پر خرج

[1] البخاري:٢/ ٨٣؛كتاب الجنائز، باب قول النبي ﷺ إنا بك لمحزونون . مسلم:٤/ ١٨٠٧؛كتاب الفضائل، باب رحمته ﷺ الصبيان والعيال وتواضعه، سنن أبي داود:٣/ ٢٦٢؛كتاب الجنائز، باب في البكاء على الميت، وعن أسماء بنت يزيد حديث مقارب في المعنى في: سنن ابن ماجه:١/ ٥٠٦؛ كتاب الجنائز، باب ما جاء في البكاء على الميت.

کرنا واجب ہوتا ہے۔ اس اصول کے پیش نظر اگر واقعی ایسے ہی ہوتا کہ اپنے بیٹے یا نواسے میں سے کسی ایک کی موت کو اختیار کیا جائے تو آپ کو چاہیے تھا کہ اپنے بیٹے کا خیال رکھتے۔ خصوصاً جب کہ شیعہ کے ہاں اصل تو نبی کریم ﷺ کی قرابت ہے۔ اور حضرت علی اور حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہم اجمعین کے بڑے فضائل میں سے ایک نبی کریم ﷺ کی قرابت کو شمار کرتے ہیں۔

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ باقی لوگوں کی نسبت بیٹے کا رشتہ زیادہ قریبی ہوتا ہے۔ تو پھر دور کے رشتہ کو قریبی رشتہ پر مقدم کیسے کیا جا سکتا ہے؟ جب کہ فضیلت اور خصوصیت تو قرابت میں ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اگر نبی کریم ﷺ کے بعد کسی نبی کے ہونے کو تسلیم کر لیا جاتا تو پھر آپ کے بعد ابراہیم رضی اللہ عنہ زندہ رہتے۔ دوسرے لوگوں نے حضرت انس کے ساتھ اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا آپ کے بعد بھی کسی نبی کو پیدا کرنے کا ارادہ ہوتا تو اس کے لیے ضروری نہیں تھا کہ ابراہیم ہی نبی ہوتا۔

پھر یہ کہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا فدیہ کیوں قرار پائے حضرت حسن رضی اللہ عنہ یہ فدیہ کیوں نہیں بنے؟ جب کہ احادیث میں واضح دلالت موجود ہے کہ ان دونوں بھائیوں میں سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ افضل تھے۔ اس پر تمام شیعہ اور اہل سنت کا اتفاق ہے۔ صحیح بخاری کی حدیث میں ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا کرتے تھے:

> ''اے اللہ! میں اس سے محبت کرتا ہوں' تو بھی اس سے محبت کر؛ اور اس سے بھی محبت کر جو کوئی اس سے محبت کرے۔''[1]

فصل: ......حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہ

حضرت علی بن حسین رحمہ اللہ کبار تابعین میں سے تھے؛ آپ علم اور دینداری کے اعتبار سے سردار شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے والد اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما؛ مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ؛ ابو رافع رضی اللہ عنہ غلام نبی ﷺ؛ اور امہات المؤمنین میں سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا؛ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا' اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے علم حاصل کیا۔ ان کے علاوہ مروان بن حکم؛ سعید بن مسیّب؛ عبد اللہ بن عثمان بن عفان؛ ذکوان مولی عائشہ؛ وغیرہ رحمہم اللہ سے بھی کسب فیض کیا۔ آپ سے علم نقل کرنے والوں میں سلمہ بن عبد الرحمٰن؛ یحی بن سعید انصاری؛ زہری؛ ابو زناد؛ زید بن اسلم اور ان کے بیٹے جعفر رحمہم اللہ کے نام شامل ہیں۔ یحی بن سعید رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میں نے آپ کو مدینہ کے ہاشمیوں میں سب سے افضل پایا۔''

---

[1] البخاري: ٧/ ١٥٩؛ كتاب اللباس، باب السخاب للصبيان۔ مسلم: ٤/ ١٨٨٣؛ كتاب فضائل الصحابة، باب فضائل الحسن والحسين رضي الله عنهما، سنن ابن ماجه: ١/ ٥١ المقدمة، باب: ١١، المسند ط. المعارف: ١٣/ ١٢٩، المسند ط. الحلبي: ٢/ ٣٣١.

محمد بن سعد رحمہ اللہ طبقات میں فرماتے ہیں:

''آپ کثرت کے ساتھ حدیث روایت کرنے والے ثقہ؛ مامون؛ بلند قدر اور عالیشان عالم تھے۔''

حماد بن زید نے یحی بن سعید الانصاری سے روایت کیا ہے: وہ فرماتے ہیں: میں نے حضرت علی بن حسین رحمہ اللہ کو سنا؛ آپ کو میں نے سب ہاشمیوں میں سے افضل پایا؛ آپ فرما رہے تھے: ''اے لوگو! ہم سے اسلام کے اصولوں کے مطابق محبت کرو۔ تم ہم سے ایسی محبت کرتے رہے کہ اب تمہاری محبت ہمارے لیے عار بن گئی ہے۔''

شیبہ بن نعامہ کا قول ہے: حضرت علی بن حسین رحمہ اللہ لوگوں کو بخیل لگتے تھے۔ جب آپ کا انتقال ہوگیا تو پتہ چلا کہ آپ چپکے سے خاموشی میں اہل مدینہ کے ایک سو گھرانوں کی مدد کیا کرتے تھے۔''

نماز میں آپ کا خشوع ؛ خفیہ صدقات وغیرہ کے علاوہ آپ کے کئی ایک ایسے فضائل ہیں جو لوگوں کے مابین بڑے معروف ہیں۔ آپ کی دینداری اور خیر خواہی کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے لوگوں کی مجلس میں شریک ہوتے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے غلام زید بن اسلم رحمہ اللہ کی مجلس میں بیٹھا کرتے۔ اور تابعین میں سے آپ کا شمار بڑے اہل علم اور دیندار لوگوں میں سے ہوتا ہے۔ آپ سے کہا جاتا: آپ اپنی قوم کی مجلس چھوڑ کر اس آدمی کی مجلس میں بیٹھتے ہیں؟۔ تو آپ جواب میں فرمایا کرتے: ''انسان وہیں بیٹھتا ہے جہاں وہ اپنے دل کی اصلاح پاتا ہے۔''

❀ باقی رہا مسئلہ کہ آپ کے بارے میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے کہ آپ رات کو ایک ہزار رکعت نماز پڑھا کرتے تھے؛ تو اس کا جواب پہلے گزر چکا ہے۔ شریعت ایسے امور کو ناپسند کرتی ہے۔ نیز ایسا کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے۔ ایسی باتوں کو مناقب میں ذکر کرنا کسی طور پر بھی مناسب نہیں۔''

[اشکال]: شیعہ مضمون نگار یہ بھی کہتا ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے علی بن حسین کا نام ''زین العابدین'' تجویز کیا۔

[جواب]: یہ بے اصل بات ہے اور کسی عالم نے یا دیندار انسان نے ایسی کوئی روایت بیان نہیں کی [1]۔

[اشکال]: شیعہ کا یہ قول کہ: ''ابوجعفر محمد بن علی [بن حسین] اپنے زمانہ کے سب سے بڑے اور بہترین عالم اور دیندار تھے۔ اور کہا جاتا ہے کہ آپ کو باقر اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ آپ نے تمام علوم پر دسترس حاصل کر لی تھی؛ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ آپ کی پیشانی پر سجدہ کے نشانات تھے۔''

[جواب]: آپ کے متعلق زمانے کا سب سے بڑا عالم ہونے کا دعویٰ بلا دلیل ہے۔ امام زہری اسی زمانہ میں بقید حیات تھے اور وہ لوگوں کے نزدیک ابوجعفر رحمہ اللہ کی نسبت بڑے عالم تھے۔ یہ صریح جھوٹ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] وأورد ابن الجوزي في كتابه الموضوعات: ٢/ ٤٤، ٤٥۔ هذا حديث موضوع بلا شك، والمتهم به الغلابي. قال الدارقطني: كان يضع الحديث وانظر عن هذا الحديث الموضوع: اللآلىء المصنوعة: ١/ ٤٥١، ٤٥٣، الفوائد المجموع، ص: ٤١٨، تنزيه الشريعة: ١/ ٤١٥.

نے ابوجعفر کا نام باقر تجویز کیا تھا۔ اہل علم کے ہاں کسی بھی ایسی روایت کی کوئی خبر نہیں ملتی۔ بلکہ اس کا شمار من گھڑت روایات و حکایات میں ہوتا ہے۔ یہی حال حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب سلام پہنچانے والی روایت کا ہے۔ یہ روایت بھی موضوع اور من گھڑت ہے۔لیکن اس راوی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے دیگر چند روایات نقل کی ہیں۔جیسے کہ غسل اور حج کی احادیث ؛ اوران کے علاوہ دیگر بھی کئی ایک صحیح احادیث منقول ہیں۔آپ اپنے والد علی بن حسین کے ساتھ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے پاس اس وقت تشریف لے گئے جب وہ نابینا ہو چکے تھے۔حضرت جابر رضی اللہ عنہ ان لوگوں سے بہت زیادہ محبت کیا کرتے تھے ۔آپ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے علم حاصل کیا تھا۔ اوراس کے ساتھ ہی صحابہ کرام میں سے ابن عباس رضی اللہ عنہما ابوسعید؛ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اجمعین وغیرہ سے بھی روایات نقل کی ہیں۔ان کے علاوہ سعید بن المسیب ؛محمد بن الحنفیہ ؛ وعبیداللہ بن ابی رافع منشی حضرت علی؛ ابواسحٰق ہمدانی؛عمرو بن دینار زہری؛ عطاء ابن ابی رباح؛ ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن رحمہم اللہ علیہم سے بھی کسب فیض کیا ہے۔امام اعرج عمر میں آپ سے بڑے تھے۔ان کے بیٹے جعفر؛ ابن جریج؛ یحی بن ابی کثیر اوراوزاعی وغیرہ -رحمہم اللہ علیہم- سے بھی کسب علم کیا ہے۔

جعفر بن محمد رحمہ اللہ کی مدح وستائش:

جعفر الصادق رحمہ اللہ اہل علم و دین کے بہترین لوگوں میں سے تھے ۔آپ نے اپنے دادا سے کسب فیض کیا؛ ان کی والدہ ام فروہ بنت القاسم بن محمد بن ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ تھیں۔ان کے علاوہ محمد بن المنکدر ؛ نافع مولی ابن عمر؛ زہری؛ عطاء ابن ابی رباح ؛ اور دوسرے تابعین کرام رحمہم اللہ علیہم سے بھی علم حاصل کیا۔آپ سے یحی بن سعید الانصاری ؛ مالک بن انس ؛ سفیان ثوری ؛ سفیان بن عیینہ؛ ابن جریج ؛ یحی بن سعید القطان ؛ حاتم بن اسماعیل؛حفص بن غیاث؛ محمد ابن اسحٰق ابن یسار رحمہم اللہ علیہم نے کسب فیض اورنقل علم کیا ہے۔عمروابن ابوالمقدام رحمہ اللہ فرماتے ہیں:''جب میں امام جعفر بن محمد رحمہ اللہ کو دیکھتا تھا تو پتہ چلتا تھا کہ آپ انبیاء کرام علیہم السلام کی اولاد میں سے ہیں۔''[1]

[اشکال]: شیعہ مصنف آپ کی بابت کہتا ہے:''آپ حکومت طلبی کو چھوڑ کر عبادت میں مشغول ہو گئے۔''

[جواب] : یہ امامیہ کے اقوال میں تناقض کی نشانی ہے۔اس لیے کہ ان کے نزدیک امامت کا بوجھ برداشت کرنا امامت کے واجبات میں سے ہے۔آپ کے زمانے میں آپ کے علاوہ کوئی دوسرا امام بھی نہیں تھا۔اگر اس عظیم الشان امر کوادا کرنا واجب تھا تو پھراس کے حقوق پورے کرنا نفل عبادت میں مشغول ہونے سے زیادہ اولی تھا۔

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''جعفر بن محمد نے امامیہ کی فقہ اورعقائد ومعارف کوخوب پھیلایا۔''

---

[1] أبو عبدِ اللهِ جعفر بن محمدِ بنِ علِي بنِ الحسينِ بنِ علِي بنِ بى طالِب ، الملقب بِالصادِقِ ، الِمام السادِس عِند الرافِضةِ . ولِد بِالمدِينةِ سنة:٨٠ وتوفِي بِها سن:١٤٨ . هـ؛ انظر ترجمته فِي: تذكِرةِ الحفاظِ:١/ ١٦٦ ، صِفةِ الصفوة٢/ ٩٤ ، ٩٨ ، وفياتِ الأعيانِ: ١/ ٢٩١ ، ٢٩٢ ، حِليةِ الأولِياءِ: ٣/ ١٩٢ ، ٢٠٦ ، الأعلامِ:٢/ ١٢١ . وانظر عنه كِتاب الإِمامِ الصادِقِ لِلشيخِ محمد أبِي زهرة رحِمه الله ، ط . دارِ الفِكرِ العربِي ، القاهِرِ ، بِدونِ تارِيخ .

[جواب] :اس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ جعفر بن محمد رحمہ اللہ نے وہ مسائل اختراع کیے جو متقدمین کو معلوم نہ تھے یا یہ کہ اس کے پیش رو اپنے واجبات کی ادائیگی اور علم کی نشر و اشاعت میں کوتاہی کا ارتکاب کرتے رہتے تھے۔ کیا اس میں کوئی مسلمان شک کر سکتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تمام علوم و معارف اور امور عقائد و ایمان بوجہ اکمل سیکھے تھے؛ اور پھر انہیں آگے مسلمانوں تک بھی پہنچایا تھا۔

اس دعوی کا مقتضی آپ کی تعریف نہیں' بلکہ آپ کی شان میں قدح کرنا ہے۔ بلکہ امام جعفر الصادق پر ان کے متقدمین ائمہ کی نسبت بہت زیادہ جھوٹ بولا گیا ہے۔ یہ تمام تر آفات جھوٹ گھڑنے والوں کی طرف سے پیش آئی ہیں' آپ اس سے بری ہیں۔ حقیقت میں حضرت جعفر رحمہ اللہ سے متعلق جھوٹ کا طومار باندھنے والے اس آفت کے ذمہ دار ہیں۔ انہوں نے جھوٹ موٹ کتاب البطاقہ، کتاب الجفر ، کتاب الھفت ،کلام فی النجوم ؛ مقدمہ رعود و بروق؛ اختلاج الاعضاء اور دیگر کتب کو ان کی طرف منسوب کر دیا تھا۔ ایسے ہی [شیعہ مفسر] ابوعبدالرحمٰن [السلمی] نے اپنی تفسیر'' حقائق التفسیر''میں آپ پر وہ جھوٹ باندھے جن سے آپ اللہ کے نزدیک بری ہیں۔ یہاں تک کہ جو بھی انسان اپنے جھوٹ کی دکان چمکانا چاہتا ہے' وہ اسے جعفر الصادق کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔

دروغ گوئی کی حد یہ ہے کہ'' رسائل اخوان الصفا'' بعض لوگوں کے نزدیک امام جعفر سے ماخوذ ہیں۔ اس کا جھوٹ ہونا ہر ایک پر عیاں ہے۔ اس لیے کہ امام جعفر رحمہ اللہ کا انتقال ۱۴۸ ہجری میں ہوا۔ حالانکہ یہ رسائل ان کے دوصد سال بعد اس زمانہ میں تصنیف کیے گئے تھے جب اسماعیلیہ باطنیہ نے مصر کی حکومت پر قبضہ جمایا اور قاہرہ میں المعز یہ نام سے شہر قائم کیا۔ یہ سن ۳۵۰ ہجری کے بعد کی بات ہے۔ اس وقت میں اس مذہب کے زور پکڑ جانے کی وجہ سے یہ رسائل تصنیف کیے گئے۔ جن کے ظاہر میں شیعیت ٹپکتی ہے اور اندر خالص کفر و شرک بھرا ہوا ہے۔ اور یہ دعویٰ کیا کہ وہ شریعت کے پیرو ہیں اور شریعت کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن، باطن شریعت اس کے ظاہر سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ دراصل یہ لوگ درپردہ فلسفہ زدہ لوگ تھے اور اسی اساس پر انہوں نے وہ رسائل تصنیف کیے تھے۔ نصاریٰ نے ملک شام کے جس علاقے پر قبضہ کر لیا تھا اس کا ذکر ان رسائل میں ملتا ہے۔ ان میں سے پہلا رسالہ چوتھی صدی ہجری کے شروع میں لکھا گیا تھا۔

فصل :......موسیٰ بن جعفر [1]

❀ [شیعہ مصنف نے کہا ہے]: جعفر کے بعد موسی بن جعفر کا نام آتا ہے۔ ان کے متعلق محدث ابوحاتم الرازی لکھتا ہے:

'' آپ ثقہ اور صدوق ہیں اور مسلمان ائمہ میں سے ایک امام ہیں۔'' [الجرح والتعدیل (۸/ ۱۳۹)]

---

[1] أبوالحسنِ موسى بن جعفرِ بنِ محمد، المعروف بِالكاظِمِ، الإمام السابع عِند الرافِضةِ. عالِم عابِد، ولِد سن:۱۲۸ وتوفِي سن:۱۸۳ . لم أجِد له ترجمة فِي طبقاتِ ابنِ سعد. ط. بيروت. انظر ترجمته فِي: تهذِيبِ التهذِيبِ: ۱۰/ ۳۳۹، ۳۴۰، وفياتِ الأعيانِ:۴/ ۳۹۳، ۳۹۵، مِيزانِ الاعتِدالِ:۴/ ۲۰۱، ۲۰۲، تارِيخِ بغداد:۱۳/ ۲۷، ۳۲, صِفةِ الصفوةِ: ۲/ ۸، ۱۰۵، الأعلامِ:۸/ ۲۷۰. وانظر جزء الطبقاتِ ط. الجامِعِ الإِسلامِي بِتحقِيقِ زِياد محمد منصور ص:۲۶۹، ۴۷۴۔

[جواب] : میں کہتا ہوں: موسی کی پیدائش ایک سوبیس ہجری کے بعد مدینہ طیبہ میں ہوئی۔ [خلیفہ] مہدی آپ کو ساتھ لے کر بغداد آئے؛ اور پھر مدینہ طیبہ واپس کر دیا۔ خلیفہ رشید کے دور تک آپ مدینہ میں مقیم رہے۔ ہارون جب عمرہ سے واپس آتے ہوئے مدینہ سے گزرا تو اس نے موسی کو بھی اپنے ساتھ بغداد لے لیا۔ اور آپ کو وہاں پر نظر بند کر دیا؛ یہاں تک کہ نظر بندی کے عالم میں ہی آپ کی موت واقع ہوگئی۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ ۱۸۳ ہجری میں آپ کا انتقال ہوا۔ نیز ابن سعد نے یہ بھی لکھا ہے کہ: ''موسیٰ بن جعفر کثیر الروایت نہیں ہے۔'' آپ نے اپنے باپ جعفر سے روایات نقل کی ہیں اور آپ سے آپ کے بھائی علی نے روایت کیا ہے؛ ان سے امام ترمذی اور ابن ماجہ نے روایات نقل کی ہیں۔

جہاں تک موسیٰ بن جعفر کے بعد میں آنے والے ائمہ کا تعلق ہے ان سے علوم وفنون اور فتاویٰ کے اخذ واستفادہ اور علم وتاریخ کے بارے میں شیعہ نے جو روایات ذکر کی ہیں ان میں سے ایک بھی درست نہیں۔ پہلے تینوں سے ذکر کردہ روایات صحاح؛ سنن اور مسانید میں موجود ہیں۔ اور سلف کے فتاوی کی کتابوں میں ان کے فتاوی جات پائے جاتے ہیں؛ جیسے کہ ابن مبارک کی کتابیں؛ سعید بن منصور اور عبدالرزاق؛ ابوبکر ابن ابی شیبہ؛ اور دیگر لوگوں کی کتابیں [بھی ان کے فتاوی سے منور ہیں]۔ جب کہ ان کے بعد آنے والوں سے کوئی بھی روایت کسی بھی مستند کتاب حدیث میں نہیں ملتی۔ جب کے ان کے بعد نہ ہی کسی اہم ترین کتاب حدیث میں ان سے کوئی روایت نقل کی گئی ہے اور نہ ہی سلف کے فتاوی کی معروف کتابوں میں ان کا کوئی فتوی ہے؛ اور نہ ہی تفاسیر کی کتابوں میں ان کا کوئی قول نقل کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے وہ فضائل ومناقب مسلمہ ہیں جن کے وہ اہل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب پر راضی ہوجائے۔

ان میں سے موسی بن جعفر زہد وعبادت میں بڑی شہرت رکھتے ہیں۔

باقی رہی شقیق بلخی کی طرف منسوب حکایت؛ وہ محض جھوٹ کا پلندہ ہے۔ اس لیے کہ یہ حکایت موسی بن جعفر کے معروف احوال کے برعکس ہے۔ موسی اپنے والد جعفر کی وفات کے بعد مدینہ میں ہی مقیم رہے۔ جعفر کا انتقال ۱۴۸ ہجری میں ہوا۔ آپ اس وقت تک بغداد تشریف ہی نہیں لائے تھے کہ آپ قادسیہ کے مقام پر موجود ہوتے۔ نیز آپ کی شہرت کی وجہ سے آپ کو اکیلا بھی نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ اس لیے کہ لوگ آپ کی بہت تعظیم کیا کرتے تھے۔ نیز آپ پر یہ تہمت بھی تھی کہ آپ ملک حاصل کرنا چاہتے ہیں؛ اسی لیے پہلے مہدی نے آپ کو ساتھ بغداد میں لے لیا تھا؛ اور پھر منصور آپ کو ساتھ لے گیا۔

[اشکال]: شیعہ کی یہ روایت کہ: ''حضرت بشر حافی رحمہ اللہ نے موسیٰ بن جعفر کے ہاتھ پر توبہ کی تھی۔''

[جواب] : یہ صاف جھوٹ ہے۔ اور وہی شخص اس کو تسلیم کرسکتا ہے جو تاریخی حقائق سے نابلد ہو۔ اصل قصہ یہ ہے کہ ہارون الرشید عباسی نے موسیٰ بن جعفر کو عراق بلا کر قید کر دیا تھا اور بس! آپ کو یہ موقع ہی نہیں دیا گیا تھا کہ آپ بشر وغیرہ کے محلّہ میں یا عام لوگوں کے ساتھ گھومیں پھریں۔

فصل:......علی بن موسی الرضا [1]

[اشکال] :شیعہ مصنف لکھتا ہے:''علی بن موسیٰ الرضا اپنے زمانے میں سب سے بڑے عالم وزاہد تھے۔آپ سے جمہور فقہاء نے علم روایت کیا ہے۔مامون نے آپ کو آپ کے علم وفضل اور کمال کی وجہ سے والی بنالیا تھا۔ایک دن آپ نے اس کے بھائی زید کو وعظ کیا۔آپ نے فرمایا:''اے زید تم رسول اللہ ﷺ کو کیا جواب دو گے جب خون بہایا جائے' اور ناحق اور حرام طریقہ سے مال چھینا جائے اور راستوں کو پر خطر بنادیا جائے۔اور اہل کوفہ کے بیوقوف آپ کو دھوکہ میں مبتلا کردیں۔حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی تھی؛ اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد کو جہنم پر حرام کردیا ہے۔''اور ایک روایت میں ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یارسول اللہ! آپ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا نام کیوں رکھا؟ آپ نے فرمایا:''اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کی اولاد کو جہنم کی آگ سے آزاد کردیا تھا۔اور یہ عفت و پاکدامنی ان کے اولاد کے لیے جہنم کی آگ پر حرام ہونے کا سبب ہے؛ اور تو ان پر ظلم کررہا ہے۔اللہ کی قسم! انہوں نے یہ مقام اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے حاصل کیا ہے؛ اور تم یہ مقام اللہ کی نافرمانی سے حاصل کرنا چاہتے ہو جو انہوں نے اسکی فرمانبرداری سے حاصل کیا ہے۔

''مامون نے درہم اور دینار پر آپ کا نام لکھنا شروع کیا؛ اور ملک کے ہر کونے میں آپ کی بیعت کے لیے آڈر جاری کیا اور کالے لباس اتار کر سبز لباس پہننے کا حکم دیا۔''

کہتے ہیں: ابونواس سے کہا گیا کہ:تم رضا کی مدح میں قصیدہ گوئی کیوں نہیں کرتے؟ تو اس نے کہا:

''مجھ سے کہا جاتا ہے تم تازہ اور شیرین اور فی البدیہ کلام میں بہترین انسان ہو؛تمہارے کلام سے نایاب قسم کے موتی اور جواہر نکلتے ہیں۔تو تم ابن موسی کی تعریف کیوں نہیں کرتے؛ اوران کے خصائل کیوں نہیں بیان کرتے۔تو میں نے کہا:'' میں اس امام کی مدح نہیں کرسکتا جس کے بابا کا خادم حضرت جبریل علیہ السلام ہوں۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب] :واقعہ یہ ہے کہ:حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور آپ کے متعلقین جن مصائب وآلام میں مبتلا ہوئے ان میں سے شیعہ کا آپ کی طرف منسوب ہونا ہے۔شیعہ نے ان کی مدح وستائش میں حد درجہ مبالغہ آمیزی سے کام لینا شروع کیا۔

---

[1] أبو الحسن علي بن موسى بن جعفر، الملقب بالرضا، ثامن الأئمة عند الرافضة، ولد في المدينة سن:۱۵۳ من أم حبشية، وأحبه الخليفة المأمون، فعهد إليه بالخلافة من بعده، وزوجه ابنته، وضرب اسمه على الدينار والدرهم، وغيّر من أجله الزي العباسي من السواد إلى اللون الأخضر، وثار أهل بغداد لذلك وخلعوا المأمون وولوا عمه إبراهيم ابن المهدي، ولأن المأمون تغلب عليهم وقمع ثورتهم، ومات الرضا سن: ۲۰۳ في حياة المأمون. انظر ترجمة الرضا في: تهذيب التهذيب: ۷/ ۳۸۹، ۳۸٦، وفيات الأعيان: ۲/ ٤۳۲، ٤۳٤، ميزان الاعتدال: ۳/ ۱۵۸، الأعلام:۵/ ۱۷۸.

اور آپ کی مدح میں ایسی باتیں کرنے لگے جو حقیقت میں مدح نہیں تھیں۔ اور آپ کے متعلق ایسے دعوے کرنے لگے جن کی کوئی دلیل نہیں۔ اور آپ کے فضائل میں ایسی باتیں کرنے لگے کہ اگر دوسرے لوگوں کی روایات سے آپ کے فضائل و مناقب معلوم نہ ہوتے تو شیعہ رافضہ کا کلام مدح کے روپ میں حقیقت میں آپ کی مذمت اور جرح و قدح پر مشتمل ہوتا۔ اس لیے کہ حضرت علی بن موسی رحمہ اللہ کے فضائل و معارف اور محاسن معلوم و مشہور ہیں۔ اور آپ کی تعریف و توصیف بھی ان مناسب الفاظ میں ہونی چاہیے جنہیں اہل معرفت جانتے ہیں۔ جب کہ یہ رافضی ایسے الفاظ میں آپ کے فضائل بیان کرتا ہے جن کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

[اشکال]: شیعہ مصنف کا قول کہ: ''آپ اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم اور زاہد تھے۔''

[جواب]: یہ دعوی بغیر دلیل کے ہے۔ جو کوئی بھی کسی کی شخصیت میں غلو کرتا ہے؛ اس کے لیے ایسے دعوے کرنا ممکن ہیں۔ یہ درست ہے کہ علی بن موسیٰ عظیم المرتبت بزرگ تھے، مگر ان کے زمانہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو آپ سے بڑے عالم اور زاہد تھے۔ بڑے عالم جیسے امام شافعی؛ اسحق بن راہویہ؛ احمد بن حنبل؛ اور اشہب بن عبد العزیز رحمہم اللہ بقید حیات تھے جو ان کی نسبت بہت بڑے عالم تھے۔ اور معروف کرخی و ابو سلیمان دارانی رحمہم اللہ بھی تھے جو علی بن موسیٰ سے کہیں زیادہ زہد و تقویٰ رکھتے تھے۔ ان محدثین میں سے کسی ایک نے بھی آپ سے کوئی حدیث روایت نہیں کی۔ اور نہ ہی معروف کتب صحاح ستہ میں آپ سے کوئی روایت نقل کی گئی ہے۔ البتہ یہ درست ہے کہ چند افراد مثلاً ابو الصلت ہروی وغیرہ نے ان سے ان روایات میں استفادہ کیا تھا جو وہ اپنے آباء و اجداد سے نقل کرتے ہیں' مگر اس میں اتنا جھوٹ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے عام سچے لوگوں کو بھی منزہ رکھا ہے' تو پھر سچے اہل علم کا کیا حال ہوگا؟

[اشکال]: شیعہ مصنف کا کہنا ہے کہ ''جمہور فقہاء نے علی بن موسیٰ سے بہت کچھ اخذ کیا۔''

[جواب]: یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ اور بہتان عظیم ہے۔ ان مشہور فقہاء و محدثین رحمہم اللہ میں سے کسی نے بھی آپ سے کوئی ایسی روایت نقل نہیں کی جو کہ اہل علم میں معروف ہو۔ اگر کسی نے کوئی روایت نقل کی بھی ہوگی تو کوئی ایسا ہوگا جو مشہور و معروف فقہاء میں سے نہیں؛ تو اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ علم کے طلب گار متوسطین اور اس سے بھی کم درجہ کے لوگوں سے بھی علم حاصل کرتے ہیں۔ اور بعض لوگوں نے جو ذکر کیا ہے کہ معروف کرخی آپ کے خادم تھے؛ اور آپ کے ہاتھ پر انہوں نے اسلام قبول کیا تھا؛ اور آپ کو علی بن موسی کی طرف سے خرقہ بھی ملا تھا۔ یہ تمام باتیں بالاتفاق جھوٹ ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بات بھی معروف نہیں ہے۔

شانِ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا میں مبالغہ آمیزی:

[اشکال]: رافضی مضمون نویس کا یہ قول کہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عفت و عصمت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد پر دوزخ کو حرام کر دیا۔''

[جواب]: یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ اس روایت کے من گھڑت ہونے پر تمام اہل علم محدثین کا اتفاق ہے۔ عام لوگوں

کیلئے بھی اس روایت کا جھوٹ اس کے الفاظ سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہ کہنا کہ: ''سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عفت و عصمت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد پر دوزخ کو حرام کر دیا۔''

اس کا تقاضا یہ ہے کہ: کسی عورت کا اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنا اس کے لیے اور اس کی اولاد کے لیے جہنم کی آگ سے آزادی کا سبب بن جائے گا۔ یہ بات قطعی طور پر باطل ہے۔ اس لیے کہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا نے بھی اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی تھی؛ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی تمام اولاد کو جہنم کی آگ پر حرام نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ o وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰى اِسْحَاقَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ﴾ [الصافات ۱۱۲۔۱۱۳]

''اور ہم نے اس کو اسحاق (علیہ السلام) نبی کی بشارت دی جو صالح لوگوں میں سے ہوگا۔ اور ہم نے ابراہیم و اسحاق (علیہما السلام) پر برکتیں نازل فرمائیں اور ان دونوں کی اولاد میں بعضے تو نیک بخت اور بعض اپنے نفس پر صریح ظلم کرنے والے ہیں۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ وَّكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ﴾ [الحدید ۲۶]

''بیشک ہم نے نوح اور ابراہیم (علیہما السلام) کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا اور ہم نے دونوں کی اولاد میں پیغمبری اور کتاب جاری رکھی تو ان میں کچھ تو راہ یافتہ ہوئے اور ان میں سے اکثر نافرمان رہے۔''

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ بنی اسرائیل حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کی اولاد میں سے ہیں۔ اور ان میں اتنے کافر ہیں جن کی صحیح تعداد کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اور ایسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی صفیہ رضی اللہ عنہا پاک دامن عورت تھیں؛ ان کی اولاد میں سے ظالم بھی تھے اور نیک وکار اور احسان کرنے والے بھی۔

خلاصہ کلام! معصوم وعفیف عورتیں اتنی لا تعداد ہیں؛ ان کی صحیح تعداد کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اور ان کی اولاد میں اچھے اور برے؛ مؤمن اور کافر سبھی قسم کے لوگ ہیں۔ بنا بریں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو صرف عفت و عصمت کی وجہ سے یہ فضیلت نہیں حاصل ہو سکتی۔ اس لیے کہ اس وصف میں جمہور مسلمان عورتیں شامل ہیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا صرف اس وصف کی بنا پر تمام جہان کی خواتین کی سردار قرار نہیں پائیں۔ بلکہ اس کا ایک خاص سبب ہے۔ رافضی ہمیشہ اسی طرح کے دلائل سے استدلال کرتے ہیں۔ اپنی جہالت کی وجہ سے انہیں صحیح طرح سے استدلال کرنا بھی نہیں آتا۔ اور جھوٹ بھی ایسے بولتے ہیں کہ وہ نفاق کا مظہر ہوتا ہے [اور فوراً پکڑا جاتا ہے]۔

مزید برآں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تمام اولاد کو جہنم کی آگ پر حرام نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان میں نیک لوگ بھی ہیں اور بدکردار بھی ہیں۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ خود شیعہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اہل سنت اولاد پر جو کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت

رکھتے ہیں کفر وفسق کا فتوی لگاتے ہیں، مثلاً حضرت زید بن علی۔آپ کو صرف اسی وجہ سے کافر قرار دیتے ہیں کہ آپ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے محبت رکھتے تھے۔رافضیہ شیعہ نے اسی بنا پر آپ کا ساتھ چھوڑ دیا؛ اور آپ کو کافر و فاسق کہنے لگے۔اس بنا پر رافضی اولاد فاطمہ سے سب سے زیادہ دشمنی رکھنے والے ہیں؛ خواہ ایسا ان کی جہالت کی وجہ سے ہو یا بغض وعناد کی وجہ سے۔

پھر حضرت علی بن موسی رحمہ اللہ کی اپنے بھائی کو وعظ و نصیحت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد میں مطیع و فرمانبردار بھی ہیں اور نافرمان بھی۔اور انہوں نے کرامت اور عزت اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی وجہ سے پائی ہے۔ یہ قدر تمام مخلوق کے مابین مشترک ہے۔ جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے؛ اللہ تعالیٰ اسے عزت دیتے ہیں۔اور جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ذلیل و رسوا کردے۔اس پر کتاب وسنت سے دلائل موجود ہیں۔

باقی رہا جو شیعہ مصنف نے خلیفہ مامون کی طرف سے آپ کو خلیفہ بنانے کا لکھا ہے؛ یہ بات صحیح ہے۔لیکن پھر ایسا نہیں ہوسکا۔ بلکہ یہ معاملہ ایسے ہی رہا یہاں تک کہ علی بن موسی کا انتقال ہوگیا۔آپ کو خلیفہ نے اپنا ولی عہد نہیں بنایا تھا۔ رافضیوں کا خیال ہے کہ آپ کو زہر دیکر مارا گیا [1]۔ اگر مامون کا آپ کو خلافت کے لیے تجویز کرنا حجت ہوسکتا ہے تو پھر یہ بھی حجت ہے کہ آپ حقیقت میں خلیفہ بن نہیں سکے۔ اگر یہ پہلا فعل حجت نہیں ہے؛ تو دوسرا بھی حجت نہیں ہوسکتا۔اور ایسی باتوں کو مناقب میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔مگر رافضیوں کا کیا جائے وہ حقیقت میں مناقب و مثالب کو جانتے ہی نہیں۔اور نہ ہی انہیں ان اسناد کا کچھ علم ہے جن سے علم حاصل ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کسی صحیح دلیل کے بجائے ابونواس کے اشعار سے استدلال کیا ہے۔اگر یہ سب کچھ صحیح تسلیم بھی کرلیا جائے؛ تو تب بھی ابونواس جیسے جھوٹے اور فاسق و فاجر شاعر کے ابیات سے استدلال کرنا صحیح نہیں۔اس کا فسق و فجور کسی ادنی علم رکھنے والے پر بھی مخفی نہیں ہے۔ یہ اپنے شعر میں کہتا ہے:

''میں اس امام کی مدح کیسے بیان کرسکتا ہوں جس کے باپ کے خادم حضرت جبریل تھے۔''

یہ بات سبھی جانتے ہیں [اگر یہ منقبت ہے تو] اس میں تمام انبیاء کی اولاد شامل ہے۔اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تمام اولاد بھی اس میں برابر کی شریک ہے۔تو پھر اس میں کون سی ایسی خصوصیت ہے کہ باقی لوگوں کو چھوڑ کر آپ ہی امام ہوں؟ اس کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے کسی ایک کی بھی تعریف وتوصیف نہ کی جائے۔اس لیے کہ یہ

[1] امام طبری نے اپنی تاریخ میں ۲۰۱ھ کے واقعات میں لکھا ہے:''بیشک مامون نے حضرت علی بن موسی کو مسلمانوں کا ولی عہد بنا دیا؛ کہ آپ اس کے بعد خلیفہ ہوں گے۔ اس کے نتیجہ میں عباسیوں نے اس کے خلاف بغاوت کردی؛ اور اسے خلافت سے معزول کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ دوسرے سال ۲۰۲ھ میں اہل بغداد نے مامون کے چچا ابراہیم بن مہدی کی بیعت کرلی۔اور ۲۰۳ھ میں علی بن موسی الرضا کا انتقال ہوگیا۔اور انہوں نے دوبارہ سے مامون کی خلافت پر بیعت کرلی۔ دیکھو: تاریخ الطبری ۸/ ۵۵٤۔ الکامل لابن الاثیر ٦/ ۱۱٦۔ الاعلام / ۱۸۷۔

وصف تو ان تمام کے مابین مشترک ہے۔ پھر انبیاء کرام علیہم السلام کی اولاد ہونا لوگوں کے مابین ایک مشترکہ وصف ہے۔اس لیے کہ تمام لوگ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ایسے ہی بنی اسرائیل خواہ وہ یہودی ہوں یا غیر یہودی وہ حضرت ابراہیم؛ حضرت اسحق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کی اولاد میں سے ہیں۔

ایسے ہی حضرت جبریل علیہ السلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خادم قرار دینا بھی ایک اچھوتی بات ہے۔ ایسی بات وہی کہہ سکتا ہے جو ملائکہ کی قدر و منزلت سے ناواقف ہو۔ اور نہ ہی انہیں فرشتوں کے انبیاء کرام علیہم السلام کے پاس آنے کی وجہ و منزلت کا علم ہو۔ مگر کیا کریں رافضیوں کا یہی حال ہوتا ہے کہ وہ اپنی جہالت کی وجہ سے اشعار سے ایسی دلیلیں حجت میں پیش کرتے ہیں جو ان کی جہالت اور ظلم کے مناسب ہوتی ہیں۔ اور ایسی من گھڑت اور جھوٹی روایات پیش کرتے ہیں جو کہ رافضیوں کے ہی شایان شان ہوسکتی ہیں۔ کیا ایسے اشعار اور روایات سے دین کے اصول ثابت ہوسکتے ہیں؟ ایسا تو وہی انسان کرسکتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے بصیرت چھین لی ہو۔

فصل:......مناقب محمد بن علی الجواد [1]

[قول الرافضی]: ''آپ کا بیٹا محمد بن علی الجواد علم و تقوی' اور جود وسخا میں اپنے باپ کے نقش قدم پر گامزن تھا۔ جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو آپ کی چھوٹی عمر کے باوجود کثرت علم؛ دینداری اور وفور عقل کی وجہ سے خلیفہ مامون آپ سے محبت کرنے لگا۔ اور اس کا خیال یہ ہوا کہ وہ اپنی بیٹی ام فضل آپ کو بیاہ دے۔ اور اس سے پہلے اس کے باپ امام رضا سے اپنی بیٹی ام حبیب کی شادی کر چکا تھا۔ اس وجہ سے عباسیوں کو اس بات پر بہت غصہ ہوا: اور انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں حکومت ان کے ہاتھوں سے نہ نکل جائے۔ اور آپ کی بھی اسی طرح بیعت کر لی جائے' جیسے آپ کے والد کی بیعت کر لی گئی تھی۔

❀ پس خلیفہ کے حاشیہ نشین جمع ہوگئے اور اسے اپنے ارادہ سے باز رہنے کے لیے کہا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ: ابھی یہ چھوٹا بچہ ہے' اسے کوئی علم نہیں۔ اس کے جواب میں خلیفہ نے کہا: ''میں اسے تم سے زیادہ جانتا ہوں۔'' اگر تم چاہتے ہو تو پھر اس کا امتحان لے لو۔ وہ لوگ اس بات پر راضی ہوگئے۔ انہوں نے قاضی یحی بن اکثم کو اس کا بہت سخت امتحان لینے کے لیے بہت بڑی رشوت دی کہ ایسا سوال پوچھا جائے جس کا جواب دینے سے یہ عاجز آجائے۔ ایک دن کا وقت مقرر ہوا۔ مامون نے آپ کو حاضر کیا۔ قاضی اور عباسیوں کی ایک جماعت بھی حاضر ہوئی۔ قاضی نے کہا: میں آپ سے ایک چیز کے بارے میں سوال کروں گا؟ آپ نے کہا: پوچھو۔ اس نے پوچھا: تم

---

[1] وهو أبو جعفر محمد بن علي بن موسى، الملقب بالجواد، الإمام التاسع عند الرافضة. ولد في المدينة سن:١٩٥ وانتقل مع والده إلى بغداد حيث كفله الخليفة المأمون بعد وفاة والده الرضا، وزوجه ابنته م الفضل، وتوفي في بغداد سن:٢٢٠. انظر ترجمته في: تاريخ بغداد: ٣/ ٥٤، ٥٥، وفيات الأعيان: ٣/ ٣١٥، شذرات الذهب:٢/ ٤٨، الإعلام:٧/ ١٥٥.

اس محرم کے بارے میں کیا کہتے ہو جس نے شکار کو مار دیا ہو؟

❀ آپ نے اس کے جواب میں پوچھا: کیا اس نے حل میں شکار مارا ہے یا حدود حرم میں؟ اور کیا وہ اس مسئلہ کا علم رکھتا تھا یا اس سے جاہل تھا؟ جانور کو پہلی بار مارا ہے یا پھر دوسری بار پلٹ کر مارا ہے یا پھر اپنی طرف سے بغیر کسی بات کے اسے مار ڈالا؟ اور کیا جانور چھوٹا تھا یا بڑا؟ کیا شکار پرندہ تھا یا پھر کوئی دوسرا؟ اس پر یحی بن اکثم بہت حیران ہوا؛ اور عاجزی کے آثار اس کے چہرہ پر نمایاں نظر آنے لگے۔حتی کہ اہل مجلس کو آپ کی قدر و منزلت کا علم ہوگیا۔ مامون نے اپنے اہل بیت سے کہا: کیا جس چیز کا تم انکار کرتے تھے' اب اس کو سمجھ لیا؟ پھر امام صاحب خلیفہ کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: کیا آپ اب یہ رشتہ مجھے دیں گے؟ خلیفہ نے کہا: ہاں۔آپ نے فرمایا: آپ خود ہی خطبہ نکاح پڑھ دو۔ پس خلیفہ نے خطبہ پڑھا' اور پانچ سو عمدہ دراہم پر نکاح ہوا جس مہر پر آپ کی دادی فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ہوا تھا۔اور پھر اس کی شادی کردی۔'' [انتہی کلام الرافضی]

جــواب: محمد بن علی الجواد بنی ہاشم کے مشہور و معروف افراد میں سے تھے' آپ سخاوت و قیادت میں مشہور تھے۔اسی وجہ سے آپ کو جواد کہا جاتا ہے۔آپ کا انتقال جوانی میں ہی پچیس سال کی عمر میں ہوگیا تھا۔آپ کی پیدائش سن پچانوے ہجری میں ہوئی اور ایک سو بیس یا ایک سو انیس ہجری میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ مامون نے اپنی بیٹی کی شادی آپ سے کردی تھی۔خلیفہ ان کے پاس دس لاکھ درہم بھیجا کرتا تھا۔ پھر آپ کو بغداد بلالیا' اور وہیں پر آپ کا انتقال ہوگیا۔

باقی جو کچھ اس رافضی مصنف نے ذکر کیا ہے' یہ بھی اس سے پہلے کے کلام کی طرح ہے۔اس لیے کہ رافضیوں کے پاس نہ ہی عقل صریح موجود ہے اور نہ ہی نقل صحیح۔ نہ ہی حق کو قائم کرسکتے اور نہ ہی باطل کو مٹا سکتے ہیں۔ نہ ہی حجت و بیان کے ساتھ اور نہ ہی ہاتھ اور شمشیر کے ساتھ۔اس لیے کہ جو کچھ اس نے ذکر کیا ہے اس سے محمد بن علی کی فضیلت ثابت نہیں ہوتی چہ جائے کہ اس سے امامت ثابت ہوجائے۔اس لیے کہ یہ حکایت جسے یحی بن اکثم سے بیان کیا جارہا ہے' ان جھوٹی داستانوں میں سے ایک ہے جنہیں سن کر جاہل لوگ ہی بغلیں بجاسکتے ہیں۔ یحی بن اکثم بہت بڑے عالم و فاضل اور فقیہ تھے ؛ ان کا رتبہ اس مقام سے بہت بلند تھا کہ وہ کسی کو عاجز کرنے کے لیے حالت احرام میں شکار کرنے کا سوال پوچھیں۔اس لیے کہ چھوٹے چھوٹے علماء بھی اس مسئلہ کا حکم جانتے ہیں۔ یہ کوئی نادر یا دقیق علمی مسئلہ نہیں ہے جس کے حل کیلئے بڑے علماء کی ضرورت ہو۔

پھر جو کچھ اس نے بیان کیا ہے' اس میں فقط شکاری کے مختلف احوال کا بیان ہے۔اور صرف اس تقسیم کا ہونا اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ ان میں سے ہر قسم کا حکم بھی معلوم ہو۔ بس اس سے صرف سوال کرنے کا اچھا انداز ظاہر ہوسکتا ہے۔ ہر اچھا سوال کرنے والے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ اچھی طرح جواب بھی دے سکتا ہو۔اور پھر اگر اس نے ان ممکنہ اقسام کو اگر بطور واجب کے ذکر کیا ہے تو ان اقسام کا مکمل احاطہ نہیں کیا گیا۔اور اگر ایسا کرنا واجب نہ تھا تو پھر بعض چیزوں کی تفصیل ذکر کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔اس لیے کہ ان جملہ اقسام کے بارے میں اتنا ہی پوچھ لینا

کافی تھا کہ کیا اس نے یہ شکار غلطی سے کیا ہے یا جان بوجھ کر؟۔

ان الفاظ میں سوال کرنا یہ زیادہ بہتر تھا بجائے یہ کہنے کے کہ: کیا وہ اس کا حکم جانتا تھا یا نہیں جانتا تھا؟ اس لیے کہ خطاء کار اور متعمد کے مابین فرق ثابت ہونے پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے۔ جب کہ خطاء کی جزاء لازم ہونے کے بارے میں اختلاف مشہور ہے۔ امام احمد اور سلف و خلف کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ خطاء کار پر کوئی جزاء نہیں ہوتی۔ سلف کی ایک جماعت کا یہی مذہب ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ ﴾ [المائدۃ ۹۵]

''اور جو کوئی تم میں سے اسے عمداً قتل کردے تو اس کا بدلہ برابر کا جانور ہوگا جو اس نے قتل کیا ہے۔''

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے جان بوجھ کر شکار کرنے والے کے ساتھ خاص طور پر جزاء کا ذکر کیا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ خطاء کار پر کوئی جزاء نہ ہو۔ اصل تو اپنی ذمہ داری سے برأت ہے۔ اور اس نص کی روشنی میں یہ جزاء متعمد پر واجب ہوتی ہے۔ جبکہ خطاء کار اپنی اصل پر ہے۔ اور اس لیے بھی کہ اس حکم میں خاص طور پر متعمد کا ذکر کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ خطا کار پر اس حکم کا اطلاق نہ ہو۔ سیاق شرط سے یہ مفہوم بالکل واضح ہوتا ہے۔ یہاں پر عام کے بعد خاص کا ذکر کیا گیا ہے۔ اگر ان دونوں کا حکم ایک ہی ہوتا تو پھر اتنا کہہ دینا کافی تھا: ﴿وَ مَنْ قَتَلَهٗ منكم ﴾ ''اور جو شخص تم میں سے اس کو قتل کرے۔'' اس طرح انتہائی اختصار کے ساتھ حکم واضح ہوجاتا۔ لیکن یہاں واضح طور پر کہا گیا ہے: ﴿وَ مَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا ﴾ ''اور جو شخص تم میں سے اس کو جان بوجھ کر قتل کرے۔'' یہاں پر متعمد کا لفظ زیادہ کرنے سے اس کے معانی میں کمی آگئی۔ یہ حکمت لوگوں میں سے کسی ادنی ترین آدمی کے کلام سے بھی سمجھی جاسکتی ہے؛ تو پھر کلام اللہ جو کہ بہترین اور افضل ترین کلام ہے' اور اس کلام کی فضیلت بھی مخلوق کے کلام پر ایسے ہی ہے جیسے خالق کی فضیلت مخلوق پر؛ [تو پھر اس سے کیوں یہ بات سمجھ نہیں آسکتی]۔

وہ علماء جو کہ خطاء کار پر جزاء کو واجب کرتے ہیں' وہ عموم احادیث اور آثار صحابہ سے استدلال کرتے ہیں۔ نیز وہ قتل خطا پر بھی قیاس کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے متعمد کو بطور خاص ذکر کیا ہے' اس لیے کہ اس موقع پر ان لوگوں کے لیے احکام اور وعید بیان ہورہی تھی جو عمداً ایسے کام کرتے ہیں۔ اور پھر اس کے بعد جزاء بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ وَ مَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ﴾ [المائدۃ ۹۵]

''تاکہ وہ اپنے اعمال کا مزہ چکھے، اللہ تعالیٰ نے سابقہ معاف کردیا اور جو کوئی دوبارہ ایسی ہی حرکت کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس سے انتقام لے گا۔''

جب یہاں پر اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کا ذکر کیا ایک جزاء اور دوسرا انتقام؛ تو ان دونوں کا مجموعہ متعمد کے ساتھ خاص ہے۔ جب مجموعی سزا متعمد کے لیے خاص ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سزا کا بعض حصہ خطا کار کے لیے ثابت نہ ہوتا ہو۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ﴾ [النساء ۱۰۱]

''اور جب تم لوگ سفر کے لیے نکلو تو تم پر کوئی مضائقہ نہیں کہ تم نماز میں قصر کر دو اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر تمہیں فتنہ میں ڈال دیں گے۔''

یہاں پر مراد تعداد اور ارکان دونوں میں قصر [کمی] کرنا ہے۔ اس قصر میں دونوں اقسام شامل ہیں: نماز سفر؛ اور نماز خوف۔ یہاں ان دونوں احکام کے ان دو قسموں کی نماز کے بارے میں خاص ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان میں سے کسی ایک نماز کے لیے کوئی ایک حکم خاص ہو۔ اس طرح کی مثالیں اور بھی ہیں۔

ایسے ہی مناسب تھا کہ وہ یہ سوال کرتا کہ: جب اس نے شکار کیا تو کیا اسے اپنا حالت احرام میں ہونا یاد تھا یا پھر اسے بھول گیا تھا۔ اس لیے کہ بھولے ہوئے انسان پر حکم لگانے کے بارے میں جاہل سے زیادہ اختلاف ہے۔ انہیں تو یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ کیا اس نے شکار اس وجہ سے کیا ہے کہ شکار نے اس پر حملہ کر دیا تھا' اور وہ اپنے دفاع پر مجبور ہو گیا تھا' یا پھر اس نے بغیر کسی وجہ کے شکار کر ڈالا۔

نیز اس قسم کی تقسیم سے سائل کی جہالت ٹپکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو ان ائمہ محترمین کو اس قسم کی جہالت سے مبراء رکھا تھا۔ نیز یہ سوال کرنا کہ: اس نے شکار حدودِ حرم میں کیا ہے یا پھر حِلّ میں؟ بیکار سی بات ہے۔ اس لیے کہ محرم جب شکار کر دے تو اس پر جزاء واجب ہو جاتی ہے؛ خواہ اس نے حدودِ حرم کے اندر شکار کیا ہو یا اس سے باہر۔ اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے اور حرم کے جانور کا شکار کرنا حالت احرام میں اور بغیر احرام کے ہر دونوں طرح سے حرام ہے۔ لیکن جب کوئی انسان حالت احرام میں حرم کا شکار شکار کر لے تو اس کی حرمت زیادہ متأکد ہو جاتی ہے؛ مگر دونوں کی جزاء ایک ہی ہے۔ نیز یہ سوال کرنا کہ اس نے شکار پر پہلی بار حملہ کیا' یا دوسری بار پلٹ کر مارا؟ یہ بہت ہی کمزور اختلاف ہے۔ بعض اہل علم نے اسے اختلاف سمجھا اور ذکر کیا ہے۔ جب کہ جمہور اہل علم ہر دونوں حالتوں میں شکار کرنے والے پر جزاء کو واجب کہتے ہیں۔ اس لیے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَ مَنْ عَادَ فَیَنْتَقِمُ اللّٰہُ مِنْہُ﴾ [المائدۃ ۹۵]

''اور جو شخص پھر ایسی ہی حرکت کرے گا تو اللہ اس سے انتقام لے گا۔''

کہا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ: جو انسان اسلام لانے کے بعد دوبارہ ایسی حرکات کرے؛ حالانکہ اس سے پہلے عہد جہالت کی غلطیوں کو اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: اس آیت کے نازل ہونے کے بعد مراد ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ لَا تَنْکِحُوْا مَا نَکَحَ اٰبَآؤُکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ﴾ [النساء ۲۲]

''اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپوں نے نکاح کیا ہے مگر جو گزر چکا ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَ اَنۡ تَجۡمَعُوۡا بَیۡنَ الۡاُخۡتَیۡنِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ ﴾ [النساء ۲۳]

''اور تمہارا دو بہنوں کا جمع کرنا۔ ہاں جو گزر چکا سو گزر چکا۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿قُلۡ لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ یَّنۡتَهُوۡا یُغۡفَرۡ لَهُمۡ مَّا قَدۡ سَلَفَ﴾ [الانفال ۳۸]

''کافروں سے کہہ دیجئے! کہ اگر وہ باز آ جائیں تو ان کے سابقہ گناہ معاف کر دئے جائیں گے۔''

اگر اس سے مراد یہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی بار معاف کر دیا ہے؛ تو پھر نہ ہی اس پر جزاء واجب ہوتی اور نہ ہی اس سے انتقام کی بات کی جاتی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے پہلی بار کے ساتھ ہی اس پر جزاء کو واجب کیا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرما دیا ہے:

﴿ لِّیَذُوۡقَ وَبَالَ اَمۡرِهٖ ﴾ [المائدۃ ۹۵]

''تا کہ وہ اپنے کئے کی شامت کا مزہ چکھے۔''

جس انسان کو اللہ تعالیٰ اس کے برے اعمال کا بدلہ دیدیں تو اس کے لیے معافی کیسے ہوسکتی ہے؟ نیز یہ بھی فرمایا کہ:

﴿ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ﴾ ''اللہ تعالیٰ نے گزشتہ کو معاف کر دیا۔''

یہ عام لفظ ہے جس میں تخصیص کا کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا کہ اس سے صرف ایک بار ہی مراد لی جاسکتی ہے۔ یہ چیز عربی زبان میں نہیں پائی جاتی۔ اگر اس آیت سے مراد یہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی بار معاف کر دیا ہے۔ اور ﴿مَن عَادَ﴾ سے مراد دوبارہ قتل کی طرف لوٹنا ہوتا؛ تو ایسا کرنے پر اللہ تعالیٰ کے انتقام سے جزاء ساقط نہ ہوتی۔ اس لیے کہ گناہ کی سختی اور شدت کی وجہ سے واجب ساقط نہیں ہوتا۔ جیسے کوئی انسان کئی ایک قتل کر دے تو اس سے قصاص اور دیت یا کفارہ ساقط نہیں ہوں گے۔

[حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مہر]:

[**اشکال**]: شیعہ عالم کا یہ کہنا کہ: ''حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مہر پانچ سو درہم تھا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[**جواب**]: یہ بات کہیں بھی ثابت نہیں ہے۔ بلکہ ثابت یہ ہے کہ نہ ہی رسول اللہ ﷺ نے کبھی اپنی کسی بیوی کو؛ اور نہ ہی آپ کی بیٹیوں میں سے کسی ایک کو پانچ سو درہم سے زیادہ مہر دیا گیا۔ یعنی ساڑھے بارہ اوقیہ [چاندی]۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہی بات معروف ہے۔[1] لیکن حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی شادی نجاشی نے رسول اللہ ﷺ سے

[1] سنن بی داود:۲/ ۳۱۶، کتاب النکاح، باب الصداق عن أبی العجفاء السلمی، قال: خطبنا عمر رحمه الله فقال: ألا لا تغالوا بصداق النساء، فإنها لو كانت مكرمة في الدنيا أو تقوى عند الله لكان أولاكم بها النبي ﷺ، ما صدق رسول الله ﷺ امرأة من نسائه ولا صدقت امرأة من بناته أكثر من اثنتي عشر أوقية. عن عائشة في الكتاب والباب السابقين:۲/ ۳۱۵، ۳۱۶ عن أبي سلمة۔ سنن ابن ماجه:۱/ ۶۰۷ كتاب النكاح، باب صداق النساء. الدارمي:۲/ ۱۴۱ كتاب النكاح، باب كم كانت مهور أزواج النبي ﷺ وبناته. وانظر حديث عمر في المسند ط. المعارف: ۱/ ۲۲۷. وقال الشيخ احمد شاكر رحمه الله: إسناده صحيح وذكر أنه مروي في سنن أبي داود، والترمذي، والنسائي، وابن ماجه والبيهقي، وقال الترمذي: هذا حديث حسن صحيح.

کرائی تھی؛ اس لیے اس نے اپنی طرف سے زیادہ مہر ادا کیا۔❶ خواہ یہ بات ثابت ہو یا نہ ہو؛ اتنی بات ضرور ہے کہ کم مہر کا خیال رکھنا سنت ہے۔ اسی لیے علماء کرام رحمہم اللہ مستحب سمجھتے ہیں کہ کسی کا مہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں یا بیٹیوں کے مہر سے زیادہ نہ ہو۔ روایت میں آتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو مہر میں اپنی درع دی تھی۔ بہر حال کچھ بھی ہو یہ دونوں باتیں کسی فضیلت پر دلالت نہیں کرتیں؛ چہ جائے کہ اس سے امامت کی فضیلت ثابت کی جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے علاوہ آپ کے [بہت سارے] فضائل ثابت شدہ ہیں۔

فصل:......فضائل علی ھادی العسکری ❷

رافضی کہتا ہے: ''آپ کا بیٹا علی ہادی تھا؛ اسے عسکری بھی کہا جاتا ہے۔ متوکل آپ کو مدینہ سے بغداد لے آیا تھا' پھر وہاں سے ''سُرَّ مَن رأى''، منتقل ہوگئے۔ وہاں آپ جس جگہ پر ٹھہرے ہوئے تھے اس کے قریب ایک عسکر نامی جگہ تھی۔ پھر آپ سامراء چلے گئے اور بیس سال نو ماہ تک وہاں رہے۔ متوکل نے آپ کو اس لیے مجبور کیا تھا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتا تھا۔ جب اسے اطلاع ملی کہ مدینہ میں لوگ حضرت علی الہادی رحمہ اللہ کی کس قدر عزت کرتے ہیں اور ان کی جانب میلان رکھتے ہیں' تو اسے خوف محسوس ہوا۔ اس نے یحی بن ہبیرہ رحمہ اللہ کو بلا کر حکم دیا کہ علی الہادی کو اس کے پاس حاضر کیا جائے۔ اس وجہ سے اہل مدینہ میں خوف و دہشت طاری ہوگئی؛ اس لیے کہ اہل مدینہ کے ساتھ آپ کے بہت بڑے احسانات تھے۔ اور آپ ہمیشہ کے لیے مسجد میں ہی رہتے تھے۔ یحی نے قسم اٹھائی کہ انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ پھر یحی نے ان کے گھر کی تلاشی لی؛ اسے قرآن مجید' کچھ دعاؤں اور اہل علم کی چند کتابوں کے علاوہ کچھ بھی نہ ملا۔ اس وجہ سے اس کی نظر میں آپ کی منزلت بڑھ گئی۔ اور وہ خود آپ کی خدمت میں مصروف رہنے لگا۔ جب واپس بغداد پہنچا تو سب سے پہلے اسحق بن ابراہیم طائی والی بغداد کے پاس گیا۔ اور اس سے کہا: اے یحی! اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنم دیا ہے' اور آپ جانتے ہیں کہ متوکل کون ہے؟ اگر آپ اسے ان کے خلاف برانگیختہ کریں گے تو وہ انہیں قتل کردے گا۔ اور قیامت والے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف سے تیرے خلاف دعوی کرنے والے ہونگے۔ یحی نے اسے جواب دیا: اللہ کی قسم! میں تو ان کے متعلق صرف خیر کا ہی ارادہ رکھتا ہوں۔ آپ کہتے ہیں: جب میں متوکل کے پاس گیا تو اسے آپ کی حسن سیرت' زہد و ورع کے بارے میں خبر دی۔ تو متوکل نے آپ کا خوب احترام کیا۔ پھر متوکل بیمار ہوگیا تو اس نے منت مانی کہ اگر وہ تندرست ہوگیا تو بہت سارے دراہم صدقہ کریگا۔ پھر اس نے تندرست ہونے پر اس بارے

---

❶ فِي سننِ أبِي داود: ٢/ ٣١٦ عن أمِ حبيبة رضي الله عنها ؛ سننِ النسائِي: ٦/ ٩٧ كتاب النكاحِ، باب القِسطِ فِي الصداقِ وزاد: ولم يبعث إليها رسول اللهِ ﷺ بِشيء، وكان مهر نِسائِهِ أربعمِائةِ دِرهم. والحدِيث أيضا فِي المسندِ ط. الحلبِي: ٦/ ٤٢٧.

❷ وهو أبو الحسنِ علِي بن محمدِ بنِ علِي، الملقب بِالهادِي، الإمام العاشِر عِند الرافِضة، ولِد فِي المدِينةِ سن: ٢١٤ واستقدمه المتوكل إلى بغداد ونزله فِي سامراء حيث توفِي بِها سن: ٢٥٤. انظر ترجمته فِي: تارِيخ بغداد: ١٢/ ٥٦٥٧، شذراتِ الذهبِ: ٢/ ١٢٨، ١٢٩، العِبرِ: ٢/ ٦، الأعلامِ: ٥/ ١٤٠.

میں فقہاء سے سوال کیا؛ مگر کسی کے پاس کوئی جواب نہ پایا۔ پھر اس نے علی ہادی کے پاس آدمی بھیج کر دریافت کیا' تو آپ نے کہا: تراسی (۸۳) درھم خیرات کر دو۔ جب متوکل نے اس کا سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ﴾ [التوبہ ۲۵]

''اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے بہت سارے مقامات پر آپ کی مدد فرمائی۔''

❀ یہ مواطن ومقامات اپنی جگہ ایک معنی رکھتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ستائیس غزوات کئے اور چھپن سرایا بھیجے۔ مسعودی نے کہا ہے کہ: اس کے بعد متوکل کے پاس جھوٹی شکایات کی گئیں کہ محمد بن علی رحمہ اللہ اہل قم شیعہ میں تیز دھار اسلحہ کی منزلت رکھتے ہیں اور آپ وہاں اپنا ملک قائم کرنا چاہتے ہیں۔ خلیفہ نے ان لوگوں کی سرکوبی کے لیے ترکوں کی ایک جماعت بھیجی۔ انہوں نے رات کے وقت آپ کے گھر پر حملہ کیا؛ مگر انہیں کچھ بھی نہ ملا؛ اور انہوں نے دیکھا کہ آپ گھر کا دروازہ بند کیا ہوئے ہیں' اور آپ پر ایک اونی جبہ ہے' اور آپ کچھ پڑھ رہے ہیں؛ اور آپ ریت پر ایک چٹائی بچھا کر بیٹھے تلاوت کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہیں۔ آپ کو اسی حالت میں اٹھا کر متوکل کے پاس لایا گیا۔ جب انہیں متوکل کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ شراب کی مجلس میں تھا؛ اور جام اس کے ہاتھ میں تھا؛ اس نے آپ کی بڑی تعظیم کی اور انہیں اُپنے پہلو میں بیٹھایا؛ اس نے ایک جام آپ کے ہاتھ میں بھی دیا؛ تو آپ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! کبھی بھی میرے خون اور گوشت کے ساتھ شراب کا قطرہ نہیں ملا؛ مجھے اس سے معاف رکھیے۔ اس نے آپ کو چھوڑ دیا اور کہا: مجھے اپنی آواز میں کچھ سنائیے۔ تو آپ نے یہ آیت پڑھی:

﴿كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ﴾ [الدخان ۲۵]

''ان لوگوں نے کتنے ہی باغات اور چشمے [اپنے پیچھے] چھوڑے۔''

پھر اس نے آپ سے کہا: مجھے کچھ شعر سنائیے؟ تو آپ نے فرمایا: مجھ شعر بہت کم یاد ہیں۔ اس نے کہا شعر سنانا لازمی ہے۔ تو آپ نے اس وقت یہ شعر پڑھے: [ترجمہ اشعار]:

''انہوں نے پہاڑ کی چوٹیوں پر رات گزاری؛ اور مسلح افراد ان کی پہرہ داری کر رہے تھے؛ مگر انہیں یہ چوٹیاں کچھ کام نہ آئیں۔ انہیں اس عزت کے بعد ان کے ٹھکانوں سے اتارا گیا؛ اور انہیں ایک گڑھے میں رکھا گیا 'یہ ان کے پڑاؤ کی بہت بری جگہ ہے۔ ان کو دفن کرنے کے بعد ایک آواز لگانے والے نے آواز لگائی:'' تمہارا خاندان' تاج اور زیورات کہاں ہیں؟ اور وہ شیریں ودلکش پرنعم چہرے کہاں ہیں جنہیں پردوں میں چھپایا جاتا تھا۔ قبر نے اس سوال کا فصیح جواب دیا اور کہا: ''ان چہروں پر اب کیڑے مسلط ہو چکے ہیں' جو انہیں ختم کر رہے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کھایا پیا تھا' اس پر ایک لمبا زمانہ گزر چکا ہے؛ اور کے بعد اب تو وہ خود ہی کھایا ہوا بھس ہو گئے ہیں۔''

متوکل یہ سن کر اتنا رویا کہ آنسوؤں سے اس کی داڑھی تر ہو گئی۔'' [انتہی کلام الرافضی]

جواب: یہ دعوی بھی اپنے سے پہلے کلام کی طرح ہے۔اس نے کسی بھی صحیح دلیل کے ساتھ آپ کی کوئی منقبت نہیں بیان کی۔ بلکہ اس نے ایسی چیز بیان کی ہے جس کے باطل ہونے کو علماء کرام جانتے ہیں۔

اس نے لکھا ہے کہ بغداد کا والی اسحق بن ابراہیم طائی تھا۔ یہ شیعہ مصنف کی جہالت کی نشانی ہے۔اس لیے کہ اسحق بن ابراہیم اور اس کے اہل خانہ کا تعلق خزاعہ سے ہے۔اس کا پورا شجرہ یہ ہے: اسحق بن ابراہیم بن حسین بن مصعب۔اس کا چچازاد بھائی عبداللہ بن طاہر بن حسین بن مصعب خراسان کا امیر تھا۔اور اس کی سیرت معلوم ومشہور ہے۔اس کا بیٹا محمد بن عبداللہ بن طاہر متوکل کے دور میں بغداد میں اس کا نائب تھا۔یہ وہی انسان ہے جس نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی نماز جنازہ پڑہائی تھی۔ جب کہ اسحق بن ابراہیم معتصم اور واثق کے دور؛ اور خلیفہ متوکل کی خلافت کے کچھ ایام میں ان کا نائب رہا ہے۔

یہ تمام لوگ بنوخزاعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ بنی طے سے ان کا تعلق نہیں۔ان کا خاندان مشہور ہے۔ [1]

رہا اس فتوی کا مسئلہ جو رافضی نے ذکر کیا ہے کہ متوکل نے نذر مانی تھی کہ اگر وہ صحت یاب ہوگیا تو بہت سارے دراہم صدقہ کرے گا۔اور پھر اس نے فقہاء سے اس بارے میں سوال کیا تو ان کے پاس کوئی جواب نہ پایا' اور یہ کہ علی بن محمد نے آپ کو تراسی درہم صدقہ کرنے کا حکم دیا' اور اس کی دلیل میں اس نے یہ آیت پیش کی:

﴿لَقَدۡ نَصَرَكُمُ ٱللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ﴾ [التوبہ ۲۵]

''اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے بہت سارے مقامات پر آپ کی مدد فرمائی۔''

یہ مواطن ومقامات اپنی جگہ ایک معنی رکھتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ستائیس غزوات کئے اور چھپن سرایا بھیجے۔ یہ حکایت تو علی بن موسی رحمہ اللہ کی مامون کے ساتھ بیان کی جاتی ہے۔یہاں پر دو باتوں میں سے ایک ضرور ہے۔ یا تو یہ من گھڑت اور جھوٹی کہانی ہے۔یا پھر فتوی دینے والے کی جہالت پر دلالت کرتی ہے۔

اس لیے کہ جب کوئی اعتراف کرتا ہے کہ فلاں انسان کے مجھ پر بہت سارے دراہم ہیں۔ یا پھر وہ منت مانتا ہے کہ وہ بہت سارے دراہم صدقہ کریگا' یا یہ کہتا ہے کہ میں فلاں آدمی کو بہت سارے دراہم دوں گا تو علماء مسلمین میں سے کوئی ایک بھی یہ نہیں کہتا کہ اس سے مراد تراسی ہوں گے۔

رافضی مصنف کی دلیل کئی وجوہات کی بنا پر باطل ہے:

پہلی وجہ:...... یہ کہنا کہ: قرآن میں ذکر کردہ مواطن یا مقامات میں ستائیس غزوات اور چھپن سرایا تھے؛ یہ بات صحیح

---

[1] ابن عماد نے شذرات الذھب ۲/ ۸۴ پر ۲۳۵ھ کی وفیات میں کہا ہے:''اور اسی سال امیر اسحق بن ابراہیم بن مصعب الخزاعی جو کہ طاہر بن حسین کا چچازاد تھا؛ وہ بغداد کا والی بنا؛ تقریباً بیس سال تک اس منصب پر رہا۔اسے ''صاحب جسر'' کہا جاتا تھا۔یہ سخت گیر؛ پختہ عزم سیاسی آدمی تھا۔وہ مامون کے حکم پر علماء کو بلا کران کا امتحان لیتا تھا۔اس کا انتقال ہوا۔مزید دیکھو: العبر ۱/ ۴۲۰۔ الکامل لابن الاثیر ۷/ ۱۷۔ الاعلام ۱/ ۲۸۳۔

نہیں ہے؛ اس لیے سیرت نگار علماء کا اتفاق ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ستائیس سے کم غزوات کئے ہیں۔ [1]

دوسری وجہ: ...... یہ آیت غزوہ حنین کے موقع پر نازل ہوئی۔ اس آیت میں یقیناً اللہ تعالیٰ نے ان مواقع کی خبر دی ہے جو اس سے پہلے گزر چکے ہیں۔ پس واجب ہوتا ہے اس آیت میں اس سے پہلے مواطن کثیرہ کے واقعات پیش آ چکے ہوں۔ غزوہ حنین کے بعد غزوہ طائف اور تبوک پیش آئے۔ اور بہت سارے سرایا حنین کے بعد پیش آئے ہیں؛ جیسا کہ سریہ جریر بن عبداللہ بجلی؛ ذی الخلصۃ بت کی طرف۔ حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی وفات سے ایک سال قبل اسلام قبول کیا تھا۔ جب بہت سارے سرایا اور کچھ غزوات اس آیت کے نزول کے بعد پیش آئے ہیں تو پھر یہ ممتنع ہے کہ اس آیت میں ماضی میں ہی تمام غزوات اور سرایا کی خبر دی گئی ہو۔

تیسری وجہ: ...... مسلمانوں کی ہر موقع پر نصرت نہیں ہوئی؛ بلکہ بعض مواقع پر انہیں پیچھے بھی ہٹنا پڑا۔ احد کے دن ایسا ہی ہوا تھا؛ یہ سخت آزمائش و امتحان کا دن تھا۔ ایسے ہی موتہ اور بعض دوسرے سرایا میں فتح حاصل نہیں ہوئی۔ اگر مان لیا جائے کہ تمام غزوات اور سرایا کی تعداد تراسی تھی؛ تو اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان تمام غزوات و سرایا میں مسلمانوں کو ہی فتح نہیں ہوئی کہ اس سے مسلمانوں کی فتح و نصرت کے تراسی مقامات ثابت ہوتے۔

چوتھی وجہ: ...... بالفرض اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ اس آیت میں وارد لفظ کثیر سے مراد تراسی ہے؛ تو اس کا تقاضا ہرگز نہیں کہ کثیر کا لفظ صرف تراسی کے عدد کے ساتھ خاص ہو۔ اس لیے کہ کثیر سے مراد ہزار، دو ہزار، ہزاروں میں بھی ہو سکتی ہے۔ جب مقداریں مختلف ہوں تو اس حساب سے اس کا اطلاق بھی ہوا۔ بعض مقادیر کے ساتھ اس کو خاص کرنا غلطی ہے۔

پانچویں وجہ: ...... بیشک اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً﴾ [البقرۃ ۲۴۵]

''ایسا بھی کوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کو اچھا قرض دے پس اللہ تعالیٰ اسے بہت بڑھا چڑھا کر عطا فرمائے گا۔''

نص قرآنی سے یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکی کا ثواب سات سو گنا تک بڑھاتے ہیں۔ اور حدیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ اجر و ثواب دس لاکھ گنا تک بڑھایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بڑھانے اور زیادہ کرنے کو بالکل ویسے ہی کثیرہ کہا ہے جیسے مواطن کثیرہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

[1] علامہ ابن کثیر نے اپنی کتاب البدایہ و النهایه ۲/ ۲۵۲ میں نقل کیا ہے؛ امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے؛ حضرت زید بن ارقم سے پوچھا گیا: رسول اللہ ﷺ نے کتنے غزوات کئے تھے؟ تو آپ نے فرمایا: ''اُنیس۔'' ان میں سے سترہ میں خود شراکت کی؛ ان میں سے پہلا غزوہ عشیرہ تھا؛ ...... اور پھر ابن کثیر رحمہ اللہ نے امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سولہ غزوات کئے تھے۔ اور مسلم کی روایت میں انیس غزوات کا ذکر ہے۔ ان میں سے آٹھ میں لڑائی تک نوبت پہنچی۔ ہشام دستوائی نے حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے؛ فرماتے ہیں: بیشک رسول اللہ ﷺ کے غزوات اور سرایا کی تعداد تینتالیس ہے۔ ان میں سے چوبیس سرایا تھے؛ اور انیس غزوات۔

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ [البقرة ۲۴۹]

''بسا اوقات چھوٹی اور تھوڑی سی جماعتیں بڑی اور بہت سی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غلبہ پا لیتی ہیں، اللہ تعالیٰ صبر والوں کے ساتھ ہے۔''

یہاں پر اس آیت میں کثیر سے مراد کئی قسم کی مقداریں ہیں۔ اس لیے کہ وہ جماعتیں جن کا ذکر کیا جا رہا ہے معلوم ہونے کے باوجود انہیں کسی متعین عدد میں محدود کرنا ممکن نہیں۔ ایسے بھی ہوسکتا ہے کہ کبھی چھوٹی جماعت کی تعداد ایک ہزار ہو اور بڑی جماعت کی تعداد تین ہزار ہو۔ اور کبھی اس سے کم و زیادہ بھی ممکن ہے۔ پس کثیر تعداد کا اطلاق اس کی نسبت سے کم کے ساتھ مقابلہ کے طور پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا وَ لَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَ لَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ﴾ [الأنفال ۴۳]

''جب اللہ آپ کو آپ کے خواب میں دکھا رہا تھا کہ وہ تھوڑے ہیں اور اگر وہ آپ کو دکھاتا کہ وہ بہت ہیں تو تم ضرور ہمت ہار جاتے اور ضرور اس معاملے میں آپس میں جھگڑ پڑتے؛ لیکن اللہ نے سلامت رکھا۔''

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کو سو سے کچھ زیادہ دیکھایا تھا۔ یہ کمی اور زیادتی باعتبار نسبت کے ہے۔

اس تمام بحث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قلت اور کثرت کا انحصار اس کی اضافت کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے کہ جب کوئی انسان اقرار کرے کہ فلاں انسان کا مجھ پر بہت سارا مال ہے' یا بہت زیادہ مال ہے؛ یا کہے کہ: کافی مقدار میں مال ہے؛ تو اس کی وضاحت کے لیے اسی آدمی سے رجوع کیا جائے گا؛ اور وہی اس کی وضاحت بیان کرے گا۔ جیسا کہ امام شافعی اور امام احمد کے اصحاب میں سے ایک گروہ کا قول ہے۔ اور اس کی وضاحت بھی اس مقدار میں ہی تسلیم کی جائے گی جسے زیادہ مانا جاسکتا ہو۔ جیسا کہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک اور اصحاب احمد میں سے بعض کا قول ہے۔ دوسری رائے والوں میں سے بعض کا کہنا ہے: اتنا مال جو چوری کی حد کی مقدار کو پہنچتا ہو؛ وہ مال کثیر ہے۔ اور بعض کہتے ہیں: اتنا مال جس کے نصاب پر زکوٰۃ لازم آتی ہو۔ اور بعض کہتے ہیں: دیت کی مقدار میں مال کثیر تصور ہوگا۔ اور یہ نزاع بھی اقرار میں ہے۔ اس لیے کہ یہ واقعہ کی خبر دی جا رہی ہے۔ اور ماضی کی خبر کو اقرار کرنے والا جانتا ہے۔ جب کہ مذکورہ بالا مسئلہ کا تعلق خبر سے نہیں بلکہ انشاء سے ہے۔ جیسا کہ اگر کوئی بہت سارے دراہم کی وصیت کرے تو راجح یہ ہے کہ بات کہنے والے کے عرف کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ پس جتنی مقدار کو وہ کثیر کہتا ہو؛ اس پر اس کے کلام کا اطلاق ہوگا۔

جب خلیفہ نذر مانتے ہوئے بہت سارا مال کہے تو اس کی نذر کو سو یا دو سو درہم پر محمول نہیں کیا جائے گا؛ بلکہ یہاں پر اس کی علیحدہ سے مستقل حیثیت ہے۔ یہاں پر اگر اس کلام کو دیت کی مقدار یعنی [کم از کم] بارہ ہزار درہم پر محمول کیا جائے

تو یہ اس سے کم پر محمول کرنے کی نسبت سے زیادہ اولی ہوگا۔اس لفظ میں اس سے زیادہ کا بھی احتمال ہے۔لیکن شریعت میں مسلمان نفس کی دیت اسی مقدار میں رکھی گئی ہے؛ اور شریعت میں مسلمان نفس کی دیت زیادہ مال ہی ہوسکتی ہے [چند ٹکے نہیں]۔

جب خلیفہ ''کثیر'' کا لفظ استعمال کرے تو اس اطلاق اتنی مقدار پر ہوگا جس پر عام لوگوں کے اس لفظ کے استعمال کرنے سے اطلاق نہ ہوسکتا ہو۔

اس لیے کہ اگر ہزار درہم رکھنے والا یوں کہے کہ فلاں کو کافی سارے دراہم دیدو؛ تو اس سے مراد دس؛ بیس دراہم بھی ہوسکتے ہیں۔ یہ تمام باتین حالات کے اعتبار سے ہوتی ہیں۔اس لیے کہ کم اور زیادہ ہونا اضافت اور نسبت کے اعتبار سے ہے۔ جیسے کہ لفظ عظیم وغیرہ۔لوگوں کے اختلاف کے لحاظ سے ان کلمات کے اطلاق میں موقع و مناسبت کی طرح اختلاف ہوتا ہے۔اور جو حکایت مسعودی سے ذکر کی گئی ہے' وہ منقطع الاسناد ہے۔تاریخ مسعودی میں اتنی جھوٹی روایات ہیں جن کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔تو پھر اس کی بیان کردہ ایسی حکایت کو جس کی کوئی سند ہی نہ ہو ؛ کیسے معتبر سمجھا جاسکتا ہے؟ مسعودی جھوٹی روایات ذکر کرنے میں معروف ہے۔اور اس کے ساتھ ہی اس حکایت میں کوئی فضیلت کی بات بھی نہیں' اس لیے عام مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو اس سے زیادہ فہم و دانست اور علم رکھتے ہیں۔

حسن عسکری

رافضی مصنف کا یہ قول کہ:''اس کا بیٹا حسن عسکری اپنے زمانہ میں بہت بڑا عالم و فاضل؛ عابد و زاہد تھا۔اور ان سے عوام الناس نے بہت بڑی مقدار میں احادیث روایت کی ہیں۔''

یہ دعوی بھی اس سے پہلے کے دعوی کی طرح محض ایک جھوٹ اور فقط دعوی ہی ہے۔کیونکہ حسن بن علی عسکری کے زمانہ میں جو محدثین احادیث روایت کرنے میں مشہور تھے' ان سے کوئی ایک روایت بھی کسی معتمد محدث کی کتاب میں جیسے امام بخاری' امام مسلم' ابوداؤد' ترمذی؛ ابن ماجہ اور امام نسائی وغیرہ کے ہاں ؛ایسی نہیں ملتی جس کی سند حسن عسکری سے ملتی ہو۔

یہ لوگ اس زمانے میں موجود تھے؛ یا اس کے قریب قریب تھوڑا پہلے یا تھوڑا بعد میں ہوگزرے ہیں۔حافظ ابوالقاسم بن عساکر رحمہ اللہ نے ان تمام محدثین کے شیوخ کی روایات جمع کی ہیں۔ان ائمہ میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے حسن بن علی عسکری سے کوئی ایک بھی روایت نقل کی ہو' حالانکہ انہوں نے ہزاروں علماء و محدثین سے روایات نقل کی ہیں ۔تو پھر یہ دعوی کرنا کیسے درست ہوسکتا ہے کہ عامۃ الناس نے آپ سے روایات نقل کی ہیں۔

اور یہ دعوی کہ:''آپ اپنے زمانہ میں افضل ترین انسان تھے۔''

یہ بھی اس سے پہلے دعوی کی طرح صرف دعوی ہی ہے۔

فصل:......محمد بن حسن مہدی

''رافضی مصنف کہتا ہے: '' پھر ان کے بیٹے: ہمارے آقا مہدی علیہ السلام ہیں۔''ابن جوزی رحمہ اللہ نے اپنی سند سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا؛ آپ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'' آخری زمانے میں میری اولاد میں سے ایک آدمی نکلے گا؛ اس کا نام میرے نام پر اور کنیت میری کنیت پر ہوگی؛ وہ زمین کو عدل وانصاف سے ایسے بھر دیگا جیسے وہ ظلم سے بھری ہوگی؛ آگاہ رہو وہی مہدی ہوگا۔''

[جـــواب]: اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ:محمد بن جریر الطبری اور عبدالباقی بن قانع [1] اور دوسرے اہل علم مؤرخین ومحدثین اور ماہرین علم انساب نے لکھا ہے کہ:'' حسن بن علی عسکری کی کوئی نسل باقی نہیں رہی اور نہ ہی انہوں نے اپنے پیچھے کوئی اولاد چھوڑی۔

امامیہ جن کا خیال ہے کہ آپ کا ایک بیٹا بھی تھا جس کے بارے میں ان کا دعوی ہے کہ وہ اپنے بچپن میں ہی سامراء کے تہ خانہ میں داخل ہوگیا تھا۔بعض کہتے ہیں اس وقت اس کی عمر دو سال تھی۔اور بعض کہتے ہیں تین سال' اور بعض کے ہاں پانچ سال۔اگر امامیہ کی اس رائے کو درست بھی تسلیم کرلیا جائے تو اس کے متعلق کتاب اللہ' سنت رسول اللہ اور اجماع امت کی نصوص کی روشنی میں ایسے نوخیز بچے کا اپنی والدہ [2] دائی یا کسی اور قریبی رشتہ دار کے زیر تربیت ہونا ضرور تھا، جو اس

[1] ابن قانع کا نام ونسب عبدالباقی بن قانع بن مرزوق کنیت ابوالحسن نسبت بغدادی اور لقب الحافظ ہے، ماہ شوال ۳۵۱ میں بعمر ۸۶ سال فوت ہوا، اس نے حارث بن ابی اسامہ اور ابراہیم بن ہیثم بلدی اور ان کے طبقہ کے دیگر علماء سے حدیث روایت کی، اس نے متعدد کتب تصنیف کیں، حسن عسکری کی وفات ابن قانع کی ولادت کے قریب زمانہ میں ہوئی، ابن قانع کے اقارب واساتذہ امام حسن عسکری کے زمانہ کے چشم دید گواہ تھے۔

[2] اگر یہ بات تسلیم کرلی جائے کہ حسن عسکری کا نوزائیدہ فرزند اس وقت پانچ برس کا تھا جیسا کہ امامیہ کا دعوی ہے تو اسے اپنے چچا جعفر کے زیر سرپرستی وتربیت ہونا چاہیے تھا، علاوہ ازیں یہ بھی ضروری تھا کہ حسن عسکری کا جو ورثہ ان کے بھائی جعفر کی زیر سرپرستی تقسیم کیا گیا تھا، اس میں سے ان کے نوعمر فرزند کا حصہ بھی الگ کیا جاتا، جیسا کہ احتیاط کا تقاضا ہے،جعفر نے اپنے بھائی کی بیویوں اور لونڈیوں کو آدمیوں کے ساتھ اتصال واختلاط سے بدیں وجہ روکے رکھا کہ مبادا ان میں سے کوئی حاملہ ہو مگر کسی کا حاملہ ہونا ظاہر نہ ہوا اور کسی لونڈی نے بھی......خواہ وہ نرگس نامی باندی ہو یا کوئی اور...... یہ دعویٰ نہ کیا کہ حسن عسکری سے اس کے یہاں کوئی بچہ ہے، علاوہ ازیں کوئی سیاسی امر بھی اس بات کا متقاضی نہ تھا کہ نومولود کو اس حد تک مخفی رکھا جائے کہ علویہ کے نقیب کو جو بڑے اہتمام کے ساتھ ایک مخصوص رجسٹر میں اس کنبہ کے افراد کی تاریخ ولادت تحریر کیا کرتا تھا پتہ نہ چل سکا، اس پر مزید یہ کہ اس مزعوم نومولود کے والد حسن عسکری اپنے زمانہ میں بڑی عزت ووقعت کی نگاہ سے دیکھتے جاتے تھے اور کوئی حاکم یا غیر حاکم ان کی حریت وکرامت میں دخل انداز نہیں ہوسکتا تھا، پھر ایسے بچے کو پوشیدہ رکھنے کی کیا ضرورت تھی جو نہ تو حکام وقت کا اقتدار غصب کرنا چاہتا تھا، نہ انقلاب بپا کرنے کا خواہاں تھا اور نہ کسی کے خلاف نبرد آزما ہونا چاہتا تھا۔

روافض کا عقیدہ ہے کہ حسن عسکری کا یہ کم سن لڑکا اس وقت تک موت سے نہیں ہوگا جب تک شیعہ کو چھوڑ کر سب مخالفین کو تہ تیغ نہ کرلے، اب قابل غور بات یہ ہے کہ جب اسے موت کا اندیشہ لاحق نہ تھا تو پوشیدہ رہنے کا کیا مطلب؟ تہ خانہ جس کے متعلق شیعہ کا گمان ہے کہ وہ لڑکا وہاں پوشیدہ ہے ایک سراب ہے، جس کی حقیقت کچھ بھی نہیں، جس گھر میں بقول شیعہ یہ تہ خانہ موجود تھا، حسن عسکری کے بھائی جعفر کی ملکیت میں آچکا ہے، ظاہر ہے کہ گھر کا مالک اس امر سے بخوبی آگاہ ہے کہ گھر میں کیا کچھ پوشیدہ ہے، جن لوگوں نے یہ گپ ہانکی ⇦⇦⇦

کی پرورش وتربیت کرے۔ نیز یہ بھی ضروری تھا کہ کوئی دوسرا شخص اس کے مال ومتاع کی دیکھ بھال کرتا، یا تو یہ محافظ اس کا کوئی وصی ہوتا؛ یا غیر وصی؛ پھر یا تو کوئی قریبی رشتہ دار ہوتا یا سلطان کی طرف سے کوئی نائب۔اس لیے کہ ایسا بچہ اپنا باپ مرجانے کی وجہ سے یتیم ہوگیا ہے۔اللہ تعالیٰ یتیم کے بارے میں فرماتے ہیں:

﴿وَ ابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ وَ لَا تَاْكُلُوْهَاۤ اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ﴾ [النساء ۶]

''اور یتیموں کو آزماتے رہو، یہاں تک کہ جب وہ بلوغت کو پہنچ جائیں، پھر اگر تم ان سے کچھ سمجھداری معلوم کرو تو ان کے مال ان کے سپرد کر دو اور فضول خرچی کرتے ہوئے اور اس سے جلدی کرتے ہوئے انھیں مت کھاؤ کہ وہ بڑے ہو جائیں گے۔''

یہ جائز نہیں ہے کہ یتیم بچے کے بالغ و ہوشیار و سمجھدار ہونے سے پہلے اس کا مال اس کے سپرد کردیا جائے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے۔ مقام حیرت ہے کہ ایسا بچہ جو کہ اپنی جان و مال میں تصرفات کے اختیار سے محروم اور دوسروں کے زیر تربیت ہو وہ پوری امت مسلمہ کا امام معصوم بن جائے؟اور کوئی انسان اس امام پر ایمان رکھے بغیر مؤمن نہ ہوسکتا ہو؟۔

مزید برآں اگر ایسے امام کے وجود یا عدم وجود کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو اس سے کوئی دینی یا دنیوی مصلحت حاصل نہیں ہوسکتی۔اور نہ ہی اس امام نے کسی ایک کو بھی کسی چیز کی کوئی تعلیم دی۔اور نہ ہی اس کی کسی اچھی یا بری بات کا کسی کو کوئی اتا پتہ ہے۔اس امام کی وجہ سے مقاصد ومصالح امامت میں سے کسی بھی عام یا خاص کو کوئی بھی چیز حاصل نہیں ہوسکی۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔اگر ایسے امام کے وجود کو تسلیم کرلیا جائے تو یہ تمام اہل ارض کے لیے بلا مقصد اور نقصان دہ ہے۔اس لیے کہ اس امام پر ایمان لانے والوں کو تو اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔نہ ہی کوئی مصلحت حاصل ہوئی اور نہ ہی کوئی مہربانی۔اور اس امام کے جھٹلانے والے اس کے ماننے والوں کے نزدیک مبتلائے عذاب ہیں۔تو اس سے ثابت ہوا یہ کہ امام محض ایک شر و برائی ہے جس میں خیر کی کوئی ایک بات بھی نہیں۔ایسا امام کسی حکیم و عادل کی تخلیق نہیں ہوسکتا۔

اگر یہ کہا جائے کہ وہ لوگوں کے ظلم کے خوف سے چھپ گیا تھا۔''

⇦⇦⇦ تھی کہ اس گھر کے تہ خانہ میں حسن عسکری کا بیٹا پوشیدہ ہے، ان کا رابطہ اس گھر سے کٹ گیا تھا اور وہ اس کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتے تھے، تیل فروش یا گھی فروش کا بیٹا (ابن الزیات أو السمّان) جس کی دوکان مذکورہ گھر کے قریب تھی حسن عسکری کی وفات کے بعد ان کے بھائی جعفر سے نہ کبھی اور نہ اسے کبھی اس گھر میں داخل ہونے کا اتفاق ہوا جس میں وہ سرد خانہ تھا واقعہ یہ تھا کہ گھی فروش کے بیٹے کی دوکان کے قریب ایک درخت تھا، شیعہ عوام جن کو کوئی مسئلہ دریافت کرنا ہوتا تھا شام کے وقت آتے اور اپنے استفتا اس درخت کے سوراخ میں رکھ جایا کرتے تھے، ان کے چلے جانے کے بعد گھی فروش کا بیٹا آ کر یہ کاغذ نکال لیتا اور کسی رافضی فقیہ سے ان کا جواب لکھوا کر پھر اسی سوراخ میں رکھ دیتا، نادان شیعہ اس زعم فاسد میں مبتلا تھے کہ ان کا بارھواں امام جو ہنوز پیدا نہ ہوا اور نہ اس نے کسی سے تعلیم پائی...... یہ جوابات لکھ رہا ہے شیعہ اور ابن الزیات (زیت فروش کا بیٹا) کا رابطہ اس تہ خانہ یا درخت کے ساتھ بس اتنا ہی تھا دگر ہیچ۔

[جواب] : ہم جواباً کہتے ہیں کہ: پہلی بات: ''ظلم تو اس کے آباؤ اجداد کے زمانہ میں بھی ہو رہا تھا،مگر انہوں نے چھپنے کو مناسب خیال نہ کیا۔ ❶

دوسری بات: مزید برآں اس کے عقیدت مند ہر جگہ کرۂ ارضی پر موجود ہیں؛ تو امام صاحب چلو بعض اوقات چند گھڑیوں کیلئے ہی اپنے ماننے والوں کے ساتھ مل کر کیوں نہیں بیٹھ جاتے۔ یا پھر وہ اپنا کوئی ایلچی ان لوگوں کی طرف بھیجتا جو ان لوگوں کو کوئی نفع بخش علم کی باتیں سکھاتا۔

تیسری بات:...... امام صاحب کے لیے ممکن تھا کہ وہ کسی ایسی جگہ ظہور پذیر ہو گیا ہوتا، جہاں اس کے ارادت مند بکثرت ہوں۔ جیسا کہ بلاد شام کے پہاڑ ؛ جن میں کثرت کے ساتھ رافضی آباد ہیں۔ اور ان کے علاوہ بھی شیعہ کی کئی ایک مضبوط پناہ گاہیں اور بستیاں ہیں۔

چوتھی بات:...... جب امام صاحب کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس خوف کی وجہ سے کسی ایک انسان کو بھی علم یا دین کی کوئی فائدہ مند بات بتا سکے تو پھر اس امام کی وجہ سے کونسا فائدہ یا مصلحت حاصل ہوئی؟ پس یہ بات نظریہ امامت کے بنیادی اصولوں کے ہی خلاف ہے؟ بخلاف ان انبیاء کرام و مرسلین عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا ؛ انہیں جھٹلایا گیا، مگر انہوں نے اپنی ذمہ داریاں پوری کیں، اور رسالت کا حق ادا کیا۔ لوگوں کو اللہ کا دین پہنچایا اور سکھایا اور ان پر ایمان لانے والوں کو فائدہ اور مصلحت بھی حاصل ہوئی؛ جو کہ ان اہل ایمان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑا انعام تھا۔ جب کہ اس معدوم و موہوم؛ کبھی بھی نہ آنے والے امام کے ماننے والوں کو سوائے اس انتظار طویل اور حسرت والم اور دنیا بھر کی دشمنی کے سوا کیا فائدہ پہنچا؟ یہ کس قدر ستم ظریفی ہے کہ شیعہ ساڑھے چار سو (۴۵۰) سال سے اس کے خروج و ظہور کی دعائیں کرتے چلے آ رہے ہیں مگر ان کی دعائیں قبولیت سے ہم کنار نہیں ہوتیں [اور کبھی بھی قبول نہ ہوں گی] ❷

❶ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اکابر شیعہ نے جن کے سرغنہ نصیر الدین طوسی، ابن العلقمی اور ابن ابی الحدرد تھے...... مسلمانوں کے خلاف سازش کر کے ان کو موت کے گھاٹ اتارا، یاجوج ماجوج (تاتار) کی تلواروں سے اسلامی سلطنت کا چراغ گل کر دیا اور علوم اسلامیہ کی لاکھوں کتب دریائے دجلہ میں پھینک دیں، جن کی وجہ سے اس کا پانی کئی دن تک سیاہ رہا تو ایسے آڑے وقت میں بقول شیعہ تہ خانہ کا یہ مکین کس لیے تہ خانہ سے باہر نہ نکلا نہ ان کے سامنے اپنی موجودگی کا اعلان کیا؟ حالانکہ شیعہ مذہب کے مطابق وہ اس وقت بقید حیات تھا اور اب بھی زندہ ہے اور شیعہ اس کے عاجلانہ ظہور کے لیے دست بدعا بھی رہتے تھے اس وقت سے موزوں تر وقت اور کون سا ہو سکتا تھا......؟

علاوہ ازیں یہ سوال بھی ذہن میں ابھرتا ہے کہ آج کل اطراف عالم میں شیعہ کی کثرت ہے، دجلہ و فرات کے دونوں کنارے اور ایران شیعہ سے بھرپور ہیں، پھر دور حاضر میں کون سا ظلم امام غائب کے خروج سے مانع ہے......؟ اس پر مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے امام غائب کی حفاظت اور اس کے تحفظ و بقا کی ذمہ داری اپنی ذات پر عائد کی ہے، ظاہر ہے کہ تحفظ و بقا کی اس گارنٹی کی موجودگی میں ان کی زندگی کو کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے؟ آخر تہ خانہ کی تاریکیوں میں دفن رہنے اور دریائے دجلہ و فرات کے جاذب نظر مناظر سے ممتنع نہ ہونے میں کیا مصلحت پائی جاتی ہے، رب کریم ہمیں اصلاح عقائد کی توفیق عطا فرمائیں آمین۔ "برحمتك یا ارحم الراحمین"

❷ اس چھپا چھپی کے کھیل کو ساڑھے بارہ سو برس گزر چکے ہیں، شیعہ ابھی تک بعجز و انکسار مصروف دعا ہیں، کیا اتنی طویل مدت میں ایک بھی مستجاب الدعوات شیعہ نہ تھا جس کی دعا قبولیت سے آراستہ ہوتی، اور امام غائب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو جاتے۔

پھر ستم ظریفی یہ ہے کہ امت محمدیہ کے کسی مسلمان کو اگر اتنی لمبی عمر مل بھی جائے تو اس پر اس جھوٹ کا پردہ کھل جائے گا۔ اسلام میں کسی انسان کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ اس نے ایک سوبیس سال سے زیادہ کی عمر پائی ہو۔ چہ جائے کہ کسی کو پانچ سو یا ہزار سال کی عمر ملے [تاکہ وہ اس امام کی صحبت سے شرفیاب ہو]۔ صحیح حدیث میں نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے آپ نے فرمایا:

''تمہاری آج کی رات میں نے تمہیں دیکھا؛ بیشک جو لوگ آج زمین پر موجود ہیں ایک سو سال گزرنے کے بعد ان میں سے ایک بھی زندہ باقی نہیں رہے گا۔''❶

پس جس انسان کی عمر اس وقت ایک سال یا اس کے قریب تھی؛ وہ قطعی ایک سو سال سے زیادہ زندہ نہیں رہا۔ پس جب اس وقت میں لوگوں کی عمریں اس حد سے تجاوز نہیں کرتی تھیں؛ تو عام طور پر غالب عادت کے مطابق اس کے بعد کے لوگوں کی عمریں اس حد تک نہیں پہنچ سکتیں۔ اس لیے کہ بنی آدم کی عمریں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتی جاتی ہیں 'بڑھتی نہیں۔

بیشک حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم میں ساڑھے نو سو سال قیام کیا تھا؛ اور حضرت آدم علیہ السلام کی عمر صحیح روایت کے مطابق ایک ہزار سال تھی۔ [یہ صحیح حدیث میں ثابت ہے' اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔]❷

اس زمانہ میں عمریں بہت لمبی ہوا کرتی تھیں؛ جب کہ اس امت کی عمریں ساٹھ سے ستر سال کے درمیان میں ہیں' بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو اس عمر سے تجاوز کریں گے۔'' [یہ صحیح حدیث میں ثابت ہے]❸

[حضرت خضر کی زندگی سے استدلال]

اس موقع پر حضرت خضر علیہ السلام کی زندگی سے دلیل لینا؛ باطل در باطل ہے۔ بقائے خضر کی ان کی بات کو کون تسلیم کریگا۔ تمام محقق علماء کرام رحمہم اللہ کا اتفاق ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کا انتقال ہو چکا ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ آپ ابھی تک زندہ ہیں' تو پھر بھی آپ کا شمار اس امت میں نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سارے ایسے جھوٹے جنات اور انسان پائے جاتے ہیں جن کا خضر ہونے کا دعوی ہے۔ اور جو کوئی انہیں دیکھ لیتا ہے اس کا خیال یہ ہوتا ہے کہ وہ میں نے خضر کو دیکھا ہے۔ اس بارے میں بہت ساری صحیح روایات ہمارے علم میں ہیں' مگر ان کا یہاں پر تذکرہ کرنا باعثِ طوالت ہوگا۔

❶ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے؛ دیکھیں: بخاری ۱/ ۱۱۹؛ كتاب مواقيت الصلاة؛ باب السمر فى الفقه و الخير بعد العشاء؛ مسلم ٤/ ١٩٦٥؛ كتاب فضائل الصحابة باب قوله صلى الله عليه وسلم لاتأتى مائة سنة على الأرض؛ سنن أبى داؤد ٤/ ١٧٦ ـ كتاب الملاحم ؛باب قيام الساعة ـ سنن الترمذي ٣/ ٣٥٤ ؛ كتاب الفتن۔؛

❷ سنن الترمذى / ١٢٣؛ كتاب التفسير ؛ باب الأخير فيه ؛ وقال الترمذي :هذا حديث حسن غريب من هذا الوجه ؛ وقد روي من غير وجه عن ابى هريرة رضی اللہ عنہ؛ وقال الألباني: في تخريج مشكاة ٢/ ٥٤٣ ـ صححه الحاكم ووافقه الذهبي ؛ وه هو كما قالا۔

❸ سنن الترمذي ٣/ ٣٨٧ ؛ كتاب الزهد؛ باب ما جاء في أعمار هذه الأمة۔ وقال الترمذي هذا حديث حسن غريب . سنن ابن ماجة ٢/ ١٤١ ؛ كتاب الزهد ؛ باب الأمل و الأجل۔

یہی حال امام منتظر محمد بن الحسن کا ہے۔ بلاشبہ بہت سارے لوگ ایسے بھی ہیں جن میں سے ہر ایک کا محمد بن الحسن مہدی ہونے کا دعوی ہے۔ان میں سے بعض لوگوں کے گروہوں کے سامنے بھی آتے اوراظہار کرتے ہیں۔اور بعض اس بات کو چھپاتے ہیں؛ ایک یا دوافراد کے علاوہ کسی پر ظاہر نہیں کرتے۔ان میں سے کوئی ایک دعویدار بھی ایسا نہیں ہے جس کا جھوٹ خضر کے مدعی ہونے والے کے جھوٹ کی طرح سامنے نہ آجاتا ہو۔

فصل:......حدیث مہدی اور رافضی شبہ پر ردّ

شیعہ مصنف نے کہا ہے: ابن جوزی رحمہ اللہ نے اپنی اسناد سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''آخری زمانہ میں میری اولاد میں سے ایک شخص نکلے گا؛اس کا نام میرے نام پراورکنیت میری کنیت پر ہوگی؛ وہ زمین کوعدل وانصاف سے ایسے بھر دیگا جیسے وہ ظلم سے بھری ہوگی؛ آگاہ رہو وہی مہدی ہوگا۔''

[سلسلہ جوابات]:

پہلا جواب:......آپ لوگ تو اہل سنت و الجماعت کی احادیث سے استدلال نہیں کرتے ؛ ایسی روایت کے نقل کرنے سے آپ کواس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔اگرآپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ اہل سنت پر حجت ہے تو پھر اہل سنت علماء کرام کا کلام بھی آگے آرہا ہے[اسے بھی تسلیم کرنا پڑے گا]۔

دوسرا جواب:......اس حدیث کاتعلق خبر واحد سے ہے؛ پھر اس سے اصول دین میں سے کوئی ایسی اصل کیسے ثابت کی جاسکتی ہے جس کے بغیر ایمان صحیح نہ ہوتا ہو۔

تیسرا جواب:......حدیث کے الفاظ کی دلالت خودتمہارے حق میں نہیں بلکہ خلاف ہے۔اس لیے کہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ:''اس کا نام میرے نام پر ہوگا'اوراس کے والد کا نام میرے والد کے نام پر ہوگا۔پس ثابت ہوا کہ جس مہدی کی خبررسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں اس کا نام محمد بن عبداللہ ہوگا نہ کہ محمد بن الحسن۔اور یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ یہ مہدی حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہوگا نہ کہ حسین بن علی کی اولاد سے رضی اللہ عنہم اجمعین۔

مہدی کے بارے میں احادیث بہت مشہور ومعروف ہیں۔انہیں امام احمد' امام ابوداؤد' امام ترمذی اور دوسرے محدثین رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے۔جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت۔حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہوگا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے نہیں۔ [1]

[1] سنن ابی داود، کتاب المهدی، حدیث:(٤٢٩٠) اموی خلافت کے آخری دور میں بنوہاشم قبیلہ قریش کے محمد نفس زکیہ بن عبداللہ بن حسن المثنیٰ بن حسن السبط کومہدی خیال کرتے تھے،ایک مرتبہ مکہ کو جاتے ہوئے،ابواء کے مقام پر یہ واقعہ پیش آیا کہ وہاں حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی نسل کے چندلوگ جمع ہوگئے،عباسی خاندان کے ابراہیم وسفاح،منصوراور صالح بن علی بھی موجود تھے۔عبداللہ بن حسن المثنیٰ اوران کے دونوں بیٹے محمداورابراہیم ان سب کے سردار تھے۔ابوجعفرمنصور کے ایماء پران سب لوگوں نے محمد بن عبداللہ بن حسن بن حسن کی بیعت کرلی۔منصور نے سب سے پہلے بیعت کی، جب عباسی خاندان برسراقتدار آیا اورمنصور خلیفہ قرار پایا،تو اس کی سب سے ⇦⇦⇦

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اگر دنیا کے ختم ہونے میں صرف ایک دن بھی باقی ہوگا تو اللہ نے اس دن کو اتنا لمبا کر دیں گے یہاں تک کہ ایک آدمی اہل بیت میں سے بھیجیں گے جس کا نام میرے نام سے اور جس کے باپ کے نام میرے باپ کے نام سے مطابقت رکھتا ہوگا۔ وہ زمین کو عدل وانصاف سے بھر دے گہ جیسے وہ ظلم وجور سے بھر دی گئی تھی۔'' ❶

چوتھا جواب: ...... یہ حدیث جو ذکر کی ہے' اس میں ہے کہ اس کا نام میرے نام کے مطابق اور اس کی کنیت میری کنیت کے مطابق ہوگی۔ اس میں یہ نہیں کہا کہ: اس کا نام میرے نام پر اور اس کے والد کا نام میرے والد کے نام پر ہوگا۔ اہل علم نے حدیث کی معروف ترین کتب میں یہ روایت ان الفاظ میں نقل نہیں کی۔ اس رافضی نے حدیث کو کتب احادیث میں وارد اس کے معروف الفاظ میں نقل نہیں کیا؛ جیسا کہ مسند احمد؛ سنن ابی داؤد ترمذی اور دوسری کتب حدیث میں ہے۔ بلکہ اس نے اپنی طرف سے تراشے ہوئے جھوٹے الفاظ میں نقل کی ہے [تا کہ اپنے مسئلہ پر استدلال کر سکے]۔

❀ شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ''ابن جوزی نے اپنی سند سے روایت کیا ہے۔''

❀ اگر اس سے مراد وہ مشہور عالم ہیں جن کی بہت زیادہ کتب ہیں؛ یعنی ابوالفرج ابن جوزی؛ تو پھر یہ آپ پر جھوٹ ہے اور اگر اس سے مقصود ان کا نواسہ یوسف بن قزاُوغلی ❷ ''مرأۃ الزمان'' تاریخ کا مصنف ہے؛ اور جس نے

⇦⇦⇦ پہلی آرزو یہ تھی کہ کسی طرح اپنے مرشد وہادی محمد بن عبداللہ کی بیعت سے آزاد ہوا اور ان کے ساتھ ان کے بھائی ابراہیم کو بھی تہ تیغ کر دے۔ اس ضمن میں خاص بات یہ ہے کہ بنی ہاشم کے عقیدہ کے مطابق مہدی امام حسین کی اولاد سے نہیں، بلکہ حضرت حسن کی نسل سے ہوگا۔ چونکہ محمد بن عبداللہ بن حسن حدیث نبوی میں مندرج شرائط کے مطابق تھے اور حضرت علی کی روایت کے مطابق آپ حضرت حسن کی اولاد سے تھے، بنا بریں بنی ہاشم نے مہدی سمجھ کر ان کی بیعت کر لی، خواہ ان کا یہ اقدام صحیح ہو یا غلط، اس لیے کہ حدیث سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہدی کا نام رسول اللہ کے نام پر اور ان کے والد کا نام رسول اللہ کے والد کے نام پر ہوگا، چونکہ شیعہ اس بات کے مدعی تھے کہ حسن عسکری کا ایک بیٹا موجود ہے مگر وہ حسن کے نام کو عبداللہ کی صورت میں تبدیل کرنے پر قادر نہ تھے لہٰذا انہوں نے صرف اسی پر اکتفا کیا کہ بارہویں امام کا نام محمد ہوگا، مگر حدیث نبوی نے انہیں رسوا کر دیا (کیونکہ ان کے والد کا نام عبداللہ نہیں، بلکہ حسن ہے) بہرکیف مہدی سے متعلق احادیث کی چھان بین اور ان کا دقیق وعمیق مطالعہ ضروری ہے۔

❶ سنن ابوداؤد:٤/ ١٥١؛ ح٨٩٠؛ کتاب المهدی ؛ و صححه الألبانی في صحيح الجامع الصغير / ٧٠۔ اس طرح کی ایک اور حدیث بھی مروی ہے۔ سننِ الترمِذِي:٣/ ٣٤٣ کتاب الفِتنِ ، باب ما جاء فِی المهدِی وقال الترمِذِی: وفِی البابِ عن علِی ، وأبِی سعِید ن وأمِ سلمة ، وأبِی هريرة ، هذا حسن صحِيح . وأورده ابن ماجه فِی سننِهِ:٢/ ٩٢٨ کتاب الجِهادِ، باب ذِکرِ الديلمِيِ وفضلِ قزوِين .

❷ اس کا پورا نام ابومظفر یوسف بن قزاُوغلی بن عبداللہ بن سبط ابوالفرج بن الجوزی ہے۔ قزاوغلی ترکی زبان کا لفظ ہے؛ جس کا معنی ہے نواسا۔ یہ مؤرخ اور وعظ ہو گزرا ہے۔ ۵۸۱ھ میں بغداد میں پیدا ہوا؛ پھر دمشق منتقل ہو گیا؛ اور وہیں پر زندگی گزاری؛ ۶۵۴ھ میں وفات پائی۔ اس کی کتاب ''مرأة الزمان'' اور ''تذكرة خواص الأمة بذكر خصائص الائمة'' ہیں۔ یہ کتابیں ۱۹۶۴ء میں نجف اشرف سے طبع ہو چکی ہیں۔ علامہ ذہبی نے اس کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے کہا ہے: ''اس نے اپنے نانا کے علاوہ علماء کی ایک جماعت سے روایت کیا ہے۔ اس کی کتاب مرأۃ الزمان میں منکر روایات ہیں۔ اور روایت نقل کرنے میں ثقہ نہیں ہے۔ پھر یہ کہ یہ آدمی رافضی ہو گیا تھا۔ اس کی ایک کتاب اس سلسلہ میں بھی ہے۔ [میزان الاعتدال ٤/ ٤٧١]

''اثنا عشریہ'' پر بھی کتاب لکھی ہے جس کا نام اس نے رکھا ہے: ''اعلام الخواص''؛ تو یہ انسان اپنی کتابوں میں ہر طرح کی باتیں ذکر کر دیتا ہے۔ اور اپنے مطلب کی بات پر حجت پیش کرنے کے لیے ضعیف اور موضوع روایات تک سے استدلال کرتا ہے۔ یہ صاحب لوگوں کی حاجات اور مقاصد کے مطابق تالیف کیا کرتے تھے۔ شیعہ کے لیے ایسی کتابیں لکھتے جو ان کے لیے مناسب ہوتیں تا کہ ان سے معاوضہ حاصل کر سکیں۔ اور بعض بادشاہوں کے لیے حنفی مذہب کے مطابق کتب لکھتے تا کہ ان سے اپنی اغراض پوری کر سکیں۔ ان کا طریقہ اس واعظ جیسا تھا جس سے پوچھا گیا: تم کس مذہب پر ہو؟ تو اس نے جواب میں پوچھا: کون سے شہر میں؟

یہی وجہ ہے کہ اس کی بعض کتابوں میں خلفاء راشدین اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی شان میں تنقید اور مثالب پائے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شیعہ کے بارے میں نرم گوشہ اختیار کر کے ان کی توجہ چاہتے تھے۔ اور بعض کتابوں میں خلفاء راشدین اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہما کی تعظیم و مناقب پائے جاتے ہیں۔ جب اہل علم کے سلف و خلف کے ہاں مہدی کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشہور حدیث ان الفاظ میں تھی:

''جس کا نام میرے نام سے اور جس کے باپ کے نام میرے باپ کے نام سے مطابقت رکھتا ہوگا''

تو پھر بہت سارے لوگ یہ تمنا کرنے لگے کہ کاش وہی مہدی ہوں۔ یہاں تک کہ منصور نے اپنے بیٹے کا نام محمد رکھا اور اسے مہدی کا لقب دیا تا کہ اس کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے اور اس کے باپ کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باپ کے نام کے مطابق ہو جائے۔ مگر یہ مہدی موعود ہر گز نہیں تھا۔

ابو عبد اللہ محمد بن التومرت جس کا لقب مہدی تھا؛ جس کا ظہور مغرب میں ہوا' اور اس نے اپنی جماعت کے لوگوں کو موحدین کا نام دیا۔ اس کے احوال معروف ہیں۔ اس کا یہ دعوی تھا کہ وہ وہی مہدی ہے جس کے متعلق احادیث میں بشارت سنائی گئی ہے؛ اسکے ماننے والے خطبہ دیتے ہوئے منبر پر اس کا نام لیا کرتے تھے۔ وہ اپنے خطبات میں یوں کہا کرتے تھے:

((الإمام المعصوم المهدي المعلوم الذي بشرت به في صريح وحيك الذي الكتنفته بالنور الواضح والعدل اللائح؛ الذي ملأ البرية قسطاً و عدلاً كما ملئت ظلماً و جوراً.))

''اس مہدی کا ظہور سن پانچ سو ہجری کے کچھ عرصہ کے بعد ہوا اور پانچ سو چوبیس ہجری میں انتقال کر گیا۔ اس کی نسبت آل حسن رضی اللہ عنہ کی طرف کی جاتی تھی۔ چونکہ یہ علم حدیث رکھنے والا انسان تھا؛ اس لیے اس نے یہ دعوی کیا کہ اسی کے متعلق بشارت دی گئی ہے۔ حالانکہ معاملہ ایسا نہیں تھا۔ اور نہیں ہی اس نے زمین کو عدل و انصاف سے بھرا۔ اس نے دین میں کئی بدعات بھی داخل کیں' اور کئی ایک اچھے کام بھی کئے۔''

اس سے قبل عبید اللہ بن میمون قداح نے بھی مہدی ہونے کا دعوی کیا تھا۔ مگر نہ ہی اس کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

نام سے مطابقت رکھتا تھا اور نہ ہی اس کے والد کا نام رسول اللہ ﷺ کے والد کے نام سے مطابق تھا۔ اس کا دعوی تھا کہ وہ محمد بن اسماعیل بن جعفر کی اولاد سے ہے۔ اور میمون ہی محمد بن اسماعیل ہے۔ شجرہ نسب کے ماہرین اور دوسرے علماء کرام جانتے ہیں کہ اس کا نسب کا دعوی جھوٹ پر مبنی ہے۔ اور یہ کہ اس کا والد خود یہودی تھا جو کہ ایک مجوسی کا لے پالک تھا۔ اس لحاظ سے اس کی دو نسبتیں ہیں: ایک نسبت یہود کی طرف اور دوسری نسبت مجوس کی طرف۔

عبیداللہ اور اس کے اہل خانہ ملحدین تھے۔ ان کا تعلق اسماعیلیہ فرقہ کے ائمہ میں سے ہوتا ہے؛ جن کے بارے میں علماء کرام فرماتے ہیں: ''ان کا مذہب ظاہر میں رافضیت ہے' اور باطن میں خالص کفر ہے۔''

ان کے اسرار اور خفیہ رازوں سے پردہ چاک کرنے کے لیے علماء کرام نے کئی ایک کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جن میں ان کے نسب کے جھوٹ اور اسلام کے جھوٹے دعوی سے پردہ چاک کیا گیا ہے۔ اور یہ کہ ان لوگوں کا دین اسلام یا نسب کے اعتبار سے رسول اللہ ﷺ سے کوئی تعلق نہیں۔

عبیداللہ بن میمون قداح کا ظہور سن ۲۹۹ ہجری میں ہوا۔ اور سن ۳۲۴ ہجری میں ہلاک ہوگیا۔ پھر اس کے بعد اس کا بیٹا القائم اس کا جانشین بنا۔ پھر اس کے بعد اس کا بیٹا المنصور جانشین ہوا۔ پھر اس کے بعد اس کا بیٹا المعز؛ جس نے قاہرہ شہر کی تعمیر کی۔ پھر اس کے بعد العزیز؛ اس کے بعد الحاکم' پھر اس کا بیٹا الظاہر؛ پھر اس کا بیٹا المستنصر جانشین بنا۔ اس کی ولایت کا عرصہ بہت طویل رہا۔ اسی کے دور میں ''بساسیری'' کا فتنہ بپا ہوا۔ بغداد میں ایک سال تک اس کے نام کا خطبہ دیا جاتا رہا۔ اور ابن الصباح جس نے اسماعیلیہ کے لیے چھری کی بدعت ایجاد کی وہ اسی مستنصر کے پیروکاروں میں سے تھا۔

سن پانچ سو اڑسٹھ ہجری میں دیار مصر [قاہرہ] میں ان لوگوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ یہ لوگ دو سو سال سے زیادہ عرصہ تک مصر پر غالب رہے۔ منافقت وارتداد' الحاد اور اللہ اور اس کے رسول کی دشمنی میں ان لوگوں کے واقعات وقصص سے علماء کرام اچھی طرح خبردار ہیں۔

ابن ماجہ کی وہ حدیث جس میں ہے:

((لا مهدي إلا عيسىٰ ابن مريم)) [سنن ابن ماجة ۲/ ۱۳۴۰]

''عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے علاوہ کوئی مہدی نہیں۔''

یہ حدیث ضعیف ہے۔ یہ حدیث یونس نے شافعی سے روایت کی ہے' اور انہوں نے اسے یمن کے ایک مجہول شیخ سے روایت کیا ہے۔ اس سند کے ساتھ حجت قائم نہیں ہوتی۔ یہ روایت امام شافعی کی مسند میں بھی موجود نہیں۔ بلکہ اس کا سارا دارومدار یونس بن عبدالاعلی پر ہے۔ اور یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ: یونس نے یہ بھی کہا ہے: میرے سامنے امام شافعی سے حدیث بیان کی گئی۔ ''خلیعات'' اور بعض دوسری کتابوں میں ہے: ہم سے یونس نے حدیث نے بیان کی وہ امام شافعی سے روایت کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہا کہ: ان سے شافعی نے حدیث بیان کی۔ پھر اس کے بعد کہا ہے: ''محمد بن خالد جندی کی روایت میں تدلیس پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کی سند کمزور ہوجاتی ہے۔ اور بعض علماء کرام یہ بھی کہتے ہیں کہ:

یہ حدیث اصل میں امام شافعی سے روایت ہی نہیں کی گئی۔

فصل:......عصمت ائمہ اور رافضی کا غرور

شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''یہ تھے معصوم ائمہ جو فضل و کمال کی آخری حد تک پہنچ گئے اور دوسرے اماموں کی طرح حکومت و سلطنت ،فواحش و منکرات ،لغویات اور شراب نوشی میں منہمک نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنے ہی لوگوں سے وہ سلوک کیا جو لوگوں کے مابین تواتر کے ساتھ مشہور ہے۔ اسی بنا پر امامیہ کہتے ہیں کہ اللہ کریم ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کرے گا اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا:

اِذَا شِئْتَ اَنْ تَرْضٰی لِنَفْسِكَ مَذْهَبًا
وَتَعْلَمَ اَنَّ النَّاسَ فِیْ نَقْلِ اَخْبَارٖ
فَدَعْ عَنْكَ قَوْلَ الشَّافِعِیِّ وَ مَالِكٍ
وَاَحْمَدَ وَالْمَرْوِیِّ عَنْ كَعْبِ اَحْبَارٖ
وَوَالِ اُنَاسًا قَوْلُهُمْ وَحَدِیْثُهُمْ
رَوٰی جَدُّنَا عَنْ جِبْرِیْلَ عَنِ الْبَارِیْ

۱۔ جب تو اپنے لیے کوئی مذہب پسند کرنا چاہے اور یہ معلوم کرنا چاہے کہ روایات کے نقل کرنے میں لوگوں کی کیا حالت ہے۔

۲۔ تو شافعی، مالک اور احمد کے اقوال اور کعب احبار کی روایات ترک کر دو۔

۳۔ اور ان لوگوں سے دوستانہ مراسم استوار کر جن کا قول اور حدیث یہ ہے کہ ہمارے نانا نے جبریل سے اور جبریل نے باری تعالیٰ سے روایت کی۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

اہل سنت کے جوابات:

شیعہ مصنف کی ذکر کردہ دلیل کا جواب کئی طرح پر ہے:

پہلا جواب: ......اماموں کے معصوم ہونے کی شیعہ کے پاس اس دعوی کے سوا کوئی دلیل نہیں کہ ہر زمانہ میں امام معصوم کا وجود لوگوں کے لیے لطف و مصلحت کا باعث ہوتا ہے، لہٰذا ایسے امام کا وجود ازبس ناگزیر ہے۔ ہم قبل ازیں اس دلیل کا بطلان و فساد کئی وجوہ سے واضح کر چکے ہیں کہ:

۱۔ یہ لطف و مصلحت موجود نہیں مفقود ہے، اس لیے کہ یہ امام ہنوز مفقود ہے اور شیعہ بے تابی سے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔

۲۔ [رافضی اصولوں کے مطابق] کوئی ایسا امام موجود نہیں ہے جس سے لطف و مصلحت حاصل ہوئی ہو۔

۳۔ ایسے امام کی نفی کیلئے یہی دلیل کافی ہے کہ امام کا وجود صریح عقل کے منافی ہے اور کسی شخص نے امام منتظر سے کوئی

دینی یا دنیوی فائدہ نہیں اٹھایا اور نہ کسی مکلّف کو کوئی مصلحت حاصل ہوئی، تاہم اسکے علاوہ دیگر دلائل و براہین بھی موجود ہیں۔

دوسرا جواب: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ’’ ہر امام فضل و کمال کی انتہا کو پہنچ گیا۔‘‘ یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ بلا علم قول کا بمقابلہ اس جیسے ہی قول سے کیا جاسکتا ہے۔ اور ہر شخص ایسا دعویٰ کرسکتا ہے۔ خصوصاً جب کہ یہ دعویٰ صحابہ و تابعین کے بارے میں کیا جائے جو علم و فضل اور تدین و تشرع میں دونوں گروہوں کے لوگوں میں اور ان کے امثال میں موجود تھے؛ اور ان کے اتباع سے افضل و اشہر تھے۔ تو یہ دعویٰ اولیٰ بالقبول ہوگا۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ وہ دینی اور علمی فضائل کوئی ایک ائمہ دین سے تواتر کے ساتھ نقل کی گئی ہیں؛ وہ ان اخبار سے بہت زیادہ ہیں جو جھوٹ موٹ عسکریین اور ان کے امثال کے بارے میں نقل کی گئی ہیں؛ سچائی کو تو دور چھوڑیے۔

تیسرا جواب: اگر شیعہ مصنف کا قول: ’’ہمارے یہ ائمہ۔‘‘ اگر اس سے مقصود یہ ہے کہ یہ ائمہ قوت و شوکت اور سیف و سنان سے بہرہ ور تھے تو یہ صریح کذب ہے۔ خصوصاً جب کہ وہ خود بھی اس کے مدعی نہیں۔ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا سب امام اپنے آپ کو عاجز و مغلوب قرار دیتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اگرچہ خلافت و سلطنت سے بہرہ ور تھے، تاہم متعدد امور میں آپ کو سخت تکالیف کا سامنا ہوا۔ ❶ اس پر مزید یہ کہ آدھی امت مسلمہ یا اس سے کم و بیش نے سرے سے آپ کی بیعت ہی نہیں کی۔ بلکہ آپ کے خلاف نبرد آزما ہوئے، بہت سے لوگوں نے نہ آپ کی مخالفت کی نہ معاونت بلکہ غیر جانب دار رہے؛ نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑے اور نہ ہی آپ کے ساتھ مل کر لڑے۔ اور ان میں ایسے اصحاب علم و فضل بھی تھے کہ ان جیسے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ نہ تھے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جو لوگ لڑائی سے پیچھے رہے؛ وہ ان لوگوں سے بہت افضل تھے جنہوں نے آپ سے جنگ کی' اور جنہوں نے آپ سے مل کر جنگ کی۔ یہ حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے حرب و پیکار میں حضرت علی کا ساتھ نہ دیا وہ آپ کے احباب و انصار کی نسبت افضل تھے۔

اگر شیعہ قلمکار کی مراد یہ ہے کہ شیعہ کے اکابر علم و دین کے بل بوتے پر امام قرار دیئے جانے کا استحقاق رکھتے تھے تو اگر اس دعوی کی صحت ثابت بھی ہو جائے تو اس سے ان کا واجب الاطاعت امام ہونا لازم نہیں آتا۔ جس طرح کسی شخص کے مستحق امامت یا قاضی بننے کی صلاحیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ فی الواقع امام یا قاضی ہو۔ یا امارت حرب کی صلاحیت سے بہرہ ور ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ درحقیقت اس منصب پر فائز ہو۔ نماز اس شخص کی اقتداء میں جائز ہے جو بالفعل امام ہو نہ کہ مستحق امامت کے پیچھے۔ بعینہ اسی طرح لوگوں کے متنازع امور میں فیصلہ وہی شخص صادر کرے گا جو

❶ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی مشکلات کا دائرہ کافی وسیع ہے، مثلاً یہ کہ آپ کے رفقاء کما حقہ آپ کی اطاعت نہیں کرتے تھے، جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ آپ صدق دل سے قاتلین حضرت عثمان سے قصاص لینا چاہتے تھے، مگر آپ کے شیعہ اس میں روڑے اٹکاتے رہتے تھے، علاوہ ازیں ابن سبا کی، دسیسہ کاریوں سے متاثر ہو کر آپ کے ارادت مندوں میں کفر والحاد کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے ان میں سے ایک فریق کو نظر آتش کر دیا، اور دوسرے کو جلا وطن کیا، نیز آپ کے شیعہ میں سے کچھ لوگ آپ کے مخالف بن گئے تھے، اس کے علاوہ بھی بہت سی تکالیف تھیں جن کا شکوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود فرمایا کرتے تھے۔

صاحب سلطنت وقدرت ہو نہ کہ وہ شخص جو قضا کا استحقاق رکھتا ہو۔لشکر اس شخص کے زیر فرمان لڑے گا جو ان کا امیر حرب ہو نہ کہ مستحق امارت کے زیر اثر؛ جو کہ امیر کارواں ہی نہ ہو۔

خلاصہ کلام! ہر فعل قدرت کے ساتھ مشروط ہوتا ہے۔لہٰذا قدرت وسلطنت سے محروم شخص ولایت وامارت پر فائز نہیں ہوسکتا۔استحقاق ایک جداگانہ شے ہے؛ اگرچہ وہ اس کا استحقاق رکھتا ہو کہ اسے قدرت وسلطنت سے بہرہ ور کیا جائے؛ مگر اس منصب پر بہرہ ور ہونے والے کے ہم پلہ ہرگز نہیں۔پس کسی کا قدرت وسلطنت کا مستحق ہونے سے اس کا ان امور سے فی الواقع بہرہ ور ہونا لازم نہیں آجاتا۔خلیفہ وامام دراصل وہ ہوتا ہے، جو شوکت وقدرت کی صفات سے موصوف ہو۔حقیقت یہ ہے کہ ان ائمہ میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا ایک امام بھی ایسا نہیں جو ان صفات سے بہرہ ور ہو۔

چوتھا جواب:......ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ استحقاق سے تمہاری مراد کیا ہے؟ کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ باقی تمام قریش کو چھوڑ کر ائمہ شیعہ میں سے کسی ایک کا خلیفہ ہونا ضروری تھا؟ یا یہ مطلب کہ ائمہ میں سے ہر ایک ان لوگوں میں سے ہے جو خلافت کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ پہلی بات اس لیے غلط ہے کہ احادیث نبویہ سے صراحۃً امامت قریش کا ثبوت ملتا ہے۔اور اگر دوسری بات تسلیم کی جائے تو اس وصف میں قریش کے دوسرے لوگ مساوی طور پر شریک ہیں۔

پانچواں جواب:......ان سے کہا جائے گا کہ: امام وہ ہے جس کی اقتدا کی جائے؛ اس کے دو طریقے ہیں:

اول:......علم ودین میں اس کی طرف رجوع کیا جائے اور اطاعت کنندہ اس بنا پر اس کی اطاعت اختیار کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اوامر واحکام اس کے بندوں تک پہنچاتا ہے تاہم اس میں ایسی کوئی قوت نہیں ہوتی کہ کسی کو اپنی اطاعت پر مجبور کر سکے۔

دوم:......دوسری صورت یہ ہے کہ وہ صاحب قوت وشوکت اور مالک سیف وسنان ہو۔اور لوگوں کو طوعاً وکرہاً اس کی اطاعت کرنی پڑے، آیت کریمہ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ میں ''اولی الامر'' سے اصحاب قدرت مثلاً امراء حرب اور علماء دونوں مراد لیے گئے ہیں۔اور یہ دونوں معانی حق ہیں۔یہ اوصاف یوں تو چاروں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین میں مکمل طور پر پائے جاتے ہیں۔وہ علم وعدل اور سیاست وسیف وسنان دونوں کے دھنی تھے۔تاہم ان میں بھی تفاوت درجات موجود ہے، مثلاً حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما، حضرت عثمان وعلی رضی اللہ عنہما کی نسبت اکمل وافضل تھے۔ان کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے سوا دوسرا کوئی خلیفہ ان اوصاف کا جامع نہ تھا۔بعض اشخاص خلفاء وسلاطین کی نسبت علم وفضل ودین داری میں آگے تھے، بعض حکومت وسلطنت میں کامل تھے، مگر علم وفضل اور تدین میں ان کو وہ مقام حاصل نہ تھا۔

اگر شیعہ کے ائمہ کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ بااقتدار بھی تھے، تو یہ باطل ہے۔اور وہ خود بھی اس کے مدعی نہیں تھے۔اور اگر اقتدار سے محرومی کے باوصف علم ودین میں ان کی امامت کو تسلیم کیا جائے؛ اور یہ لوگ کسی دوسرے سے اپنی بات منوانے کی قدرت نہ رکھتے تھے؛ تو دوسرے علماء بھی اس وصف میں ان کے شریک تھے۔[یہ پھر ان کی کوئی خصوصیت نہ ہوئی]

بلکہ ان کے معاصرین میں سے بہت سے علماء، علم وتقویٰ میں ان سے بہت آ گے تھے۔اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ان کے معاصرین سے جو علمی آ ثار نقل ہو کر ہم تک پہنچے ہیں وہ ائمہ شیعہ کی علمی خدمات سے بہت زیادہ ہیں۔شیعہ کے متقدمین ائمہ مثلاً علی بن حسین رحمہ اللہ ان کے بیٹے ابوجعفر رحمہ اللہ اور ان کے بیٹے جعفر بن محمد رحمہ اللہ سے کچھ علمی آ ثار نقل ہو کر ہم تک پہنچے ہیں، مگر اس میں شبہ نہیں کہ ان کے معاصرین کی علمی خدمات ان پر بدرجہا فائق ہیں۔

متاخرین ائمہ شیعہ کی علمی خدمات کا دائرہ بے حد محدود ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ اس دور کے مشاہیر اصحاب علم و حدیث وفتویٰ کے زمرہ میں شمار ہی نہیں کیے جاتے، ان کی شان میں جو مناقب ومحاسن ذکر کیے جاتے ہیں اس سے زیادہ فضائل ان کے ہم عصر علماء کے بیان کیے جاتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ: یہ ائمہ علم اور دین کے اعتبار سے تمام امت سے افضل ہیں۔'' [1] [تاریخی حقائق کے پیش نظر ان کو علم دین میں افضل الامت قرار دینا خلاف واقع ہے]۔

دونوں صورتوں میں ائمہ شیعہ کی امامت اہل سنت کے نزدیک مسلم ہے، اس کی وجہ اہل سنت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جو شخص بھی اللہ ورسول کی اطاعت کی دعوت دیتا اور اعمال صالحہ کی تلقین کرتا؛ اور خود وہ کام کرتا ہو جنہیں اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے ہو تو اس کی بات مان لینی چاہیے۔ بنا بریں اہل سنت اعمال صالحہ کی جانب دعوت وتبلیغ میں ائمہ کی اطاعت کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔[بلاشبہ ان امور میں یہ ائمہ مقتدی ہیں]۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ﴾ (سجدۃ: ۲۴)

''اور جب ان لوگوں نے صبر کیا تو ہم نے ان میں سے ایسے پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کرتے تھے، اور وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے۔''

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا:

﴿اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا﴾ (البقرۃ: ۱۲۴)

''میں تجھے لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ شمشیر بکف لوگوں سے لڑیں گے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ آپ واجب الاطاعت ہوں گے، یہ دوسری بات ہے کہ لوگ آپ کی اطاعت کریں یا اس سے منحرف ہو جائیں۔پس یہ لوگ اور ان کے امثال حقیقت میں قابل تقلید نمونہ ہیں۔

شیعہ کے امام، اہل سنت ائمہ کی طرح عزوشرف کے حامل ہیں اور اہل سنت ان باتوں میں ان کی اطاعت کرتے

---

[1] عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو حضرت امیر معاویہ سے افضل واعلم قرار نہیں دیا جا سکتا۔تابعین کرام جیسے حسن بصری اور امام شریک وغیرہ سے منقول ہے اگر لوگ حضرت امیر معاویہ کو دیکھ لیتے تو انہیں مہدی گمان کرنے لگتے۔ابن تیمیہ کے بقول آپ دنیا کے بہترین بادشاہوں میں سے تھے۔[الدراوی]

ہیں جن امور میں شرعاً ان کی فرمانبرداری روا ہے۔ شیعہ کے ائمہ کا اجلال و اکرام اہل سنت کے یہاں اسی طرح ضروری ہے جس طرح ان کے مسلم ائمہ کی عزت و افزائی مثلاً ابوبکر و عمر، ابن مسعود، ابی بن کعب، معاذ، ابو الدرداء اور سابقین اولین میں سے ان کے ہمنوا و ہم پلہ لوگ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ اور تابعین و تبع تابعین میں سے سعید ابن المسیب؛ سلیمان بن یسار، عبید اللہ بن عبداللہ، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، خارجہ بن زید؛ یہ لوگ مدینہ کے سات فقہاء ہیں۔

جیسے علقمہ، اسود بن زید، اسامہ بن زید، محمد بن سیرین، حسن بصری، سالم بن عبداللہ، ہشام بن عروہ، عبدالرحمٰن بن قاسم، زہری، یحییٰ بن سعید انصاری، ابوالزناد۔ علاوہ ازیں امام مالک، اوزاعی، لیث بن سعد، ابوحنیفہ، شافعی، احمد بن حنبل، اسحاق بن ابراہیم وغیرہم رحمہم اللہ۔

مذکورہ بالا اصحاب کی علمی حیثیت ہرگز مساوی نہیں، بلکہ ان میں بعض اکابر کا علمی پایہ حدیث اور فتوی میں دوسروں کی نسبت بلند تر ہے۔ اور ان کی شہرت کثرت علم، قوت دلیل یا دوسرے اوصاف کی رہین منت ہے۔ بنابریں اہل سنت یہ نہیں کہتے کہ یحییٰ بن سعید، ہشام بن عروہ اور ابوالزناد رحمہم اللہ، جعفر بن محمد رحمہ اللہ کی نسبت اولیٰ بالاتباع ہیں۔

علی ہذا القیاس وہ یہ بھی نہیں کہتے کہ امام زہری، یحییٰ بن ابی کثیر، حماد بن ابی سلمہ، سلیمان بن یسار اور منصور بن معتمر کی اطاعت جعفر بن محمد کے والد ابوجعفر الباقر کی نسبت واجب تر ہے، نہ یہ کہ قاسم بن محمد، عروہ بن زبیر اور سالم بن عبداللہ رحمہم اللہ کی فرمانبرداری علی بن حسین کی اطاعت سے زیادہ ضروری ہے۔

اس کے عین برخلاف اہل سنت یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر امام کی مرویات و منقولات وثوق و اعتماد کے قابل ہیں۔ اور جو کچھ ان سے نقل کیا گیا ہے؛ اس میں وہ سچے ہیں۔ اور کتاب و سنت کی روشنی میں ان کا جو حکم واضح ہو؛ تو پس وہی اصل علم ہے جو ان لوگوں سے مستفاد ہو رہا ہے۔ [1] [اور کتاب و سنت کی مطابقت و توضیح میں ان کا ہر ارشاد واجب الاتباع ہے]۔ جب کوئی امام ایسا فتویٰ دے جو دوسرے علماء و ائمہ کے خلاف ہو تو امر متنازع کو بفحوائے قرآن کریم اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹایا جائے گا، یہ حکم سب ائمہ کے لیے عام ہے، کوئی امام استثنائی حیثیت کا حامل نہیں، عہد رسالت اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کے زریں دور میں بھی مسلمان اسی پر عمل پیرا تھے۔

---

[1] بشرطیکہ امام سے روایت کرنے والے صادق الروایت وثقہ ہوں بعض شیعہ نے امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاری رحمہ اللہ کی شان میں اس دعوی کے ساتھ سوء ادبی کی جسارت کی ہے کہ آپ نے اہل بیت کی روایات نقل کرنے میں بخل سے کام لیا ہے، یہ ایک عظیم جسارت و سفاہت ہے، واقعہ یہ ہے کہ امام موصوف نے اس ضمن میں تساہل سے کام نہیں لیا، بخلاف ازیں ان کے یہاں روایت حدیث کے شرائط ان راویوں میں سرے سے مفقود ہیں جو اہل بیت سے روایات نقل کرتے ہیں بلکہ ایسی روایات جھوٹ کا طومار ہیں اور انہوں نے اپنی کتاب کو روایات کاذبہ سے پاک رکھنے کے التزام کو قائم رکھا ہے، صدر کتاب میں ہم امام مالک، شافعی، یزید بن ہارون، اور اعمش کے اقوال درج کر چکے ہیں کہ شیعہ وضاع و کذاب ہوتے ہیں، بے شک صدق شعار مبتدع کی روایت اس شرط کے ساتھ مقبول ہے کہ وہ اپنی بدعت کا داعی نہ ہو، مگر شیعہ اس سے مستثنیٰ ہیں، شیعہ کی روایت اہل بیت و غیر اہل بیت کسی سے بھی مقبول نہیں اس لیے کہ وہ احادیث کو وضع کر کے ان کو دین و مذہب کا درجہ دیتے ہیں، مسلمانوں کے لئے شیعہ کی جھوٹی روایات اور ان کا تاریخی اختلاف ہی کافی ہے، کیا امام بخاری سے انہیں اس بات کی توقع تھی، کہ وہ ان کی دروغ گوئی کے دھوکہ میں آ جائیں گے۔

چھٹا جواب:...... ان سے کہا جائے گا : یہ قول کہ:'' اور دوسرے اماموں کی طرح حکومت وسلطنت ، فواحش و منکرات،لغویات اورشراب نوشی میں منہمک نہ ہوئے۔'' شیعہ مصنف کی یہ بات غلط ہے۔اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک سلاطین وملوک کی ہر جائز و ناجائز بات قابل اطاعت ہےتو یہ ان پر صریح بہتان ہے۔،اہل سنت کے معروف بالعلم علماء کا قول ہے، کہ اللہ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہ کی جائے،اور نہ ایسے شخص کوامام مقرر کیا جائے۔

اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ طاعات وعبادات کے انجام دینے میں اہل سنت سلاطین سے طلب امداد کرتے ہیں۔اور جو کچھ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے کام کرتے ہیں'اس میں ان کی مدد کرتے ہیں۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر انہیں اس اعتبار سے امام بنانا ناروا ہے،تو خود روافض بھی اس جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔اس لیے کہ وہ ہمیشہ کفار و فجار سے طالب امداد ہوتے اور بہت سی باتوں میں خود بھی ان کی امداد کرتے ہیں۔[1] یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہر زمان ومکان میں اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔سب سے بڑھ کر یہ کہ خود اس کتاب'' منہاج الندامہ'' کا شیعہ مصنف اوراس کے ہم نوا بھی اس الزام سے بچ نہیں سکتے اس لئے کہ منگول؛ تاتاری کافر اور دیگر فساق و جہال ان کے اماموں کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

ساتواں جواب:......شیعہ مصنف نے اپنی کتاب میں جن ائمہ کا ذکر کر کے ان کے معصوم ہونے کا دعویٰ کیا ہے وہ اس قوت وشوکت سے بہرہ ور نہ تھے جس کے ساتھ امامت وخلافت کے مقاصد حاصل ہوتے ہیں۔اور نہ ہی ان کی اقتداء عبادت اللہ تعالیٰ اوراس کے ضروری معاونات کے حصول میں کافی تھی۔اور نہ ہی ان سے انہیں کوئی قوت حاصل تھی جس سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے کاموں پر معاونت حاصل ہوسکتی ہو۔ملک وسلطنت سے محروم ہونے کی بنا پر نہ ہم ان کے پیچھے نماز یا جمعہ ادا کر سکتے ہیں۔نہ حج وجہاد میں ان کو امیر مقرر کر سکتے ہیں نہ وہ شرعی حدود قائم کرنے پر قادر ہیں۔اور نہ فصل خصومات کی قدرت سے بہرہ ور ہیں۔ان کی مدد سے کوئی شخص لوگوں سے یا بیت المال سے اپنے حقوق وصول نہیں کر سکتا۔نہ ان کی بدولت راستے محفوظ رہ سکتے ہیں۔یہ جملہ امور ایک صاحب اقتدار خلیفہ کے محتاج ہیں اور صاحب اقتدار وہی ہوگا جو احباب و اعوان رکھتا ہو۔شیعہ کے یہ ائمہ ان سب اوصاف سے محروم تھے۔بخلاف ازیں ان کے مخالفین اس قدرت سے بہرہ ور تھے۔ظاہر ہے کہ جو شخص ایک عاجز امام سے یہ جملہ امور طلب کرے گا وہ حد درجہ جاہل و ظالم شخص

---

[1] شیعہ مصنف ابن المطہر کا استاد نصیر الدین طوسی اس امر کی بہترین مثال ہے کہ شیعہ علماء کس حد تک کفار و فجار سے طلب امداد کرتے اور ان کی خدمت وخوشامد کو اپنے لیے سرمایہ افتخار خیال کیا کرتے تھے،ہم قبل ازیں شیعہ کی معتبر کتاب'' روضات الجنات،ص:۵۷۸'' طبع ثانی سے نقل کر چکے ہیں کہ طوسی نے جس عظیم خیانت کا ارتکاب کیا تھا شیعہ اسے اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں، ہلاکو خاں تاتاری سے لے کر سلطان اللہ بندہ......جس کے لیے ابن المطہر رافضی نے یہ رسوائے عالم کتاب لکھی......تک جتنے بت پرست بادشاہ ہوئے ہیں شیعہ علماء ان کی خدمت واستعانت کو اپنے لیے سرمایہ افتخار تصور فرمایا کرتے تھے، سلطان اللہ بندہ شیعہ مذہب اختیار کرنے سے قبل بت پرست تھا، موجب حیرت ہے کہ ابن المطہر رافضی کے نزدیک اس مشرک بادشاہ کا پایہ حضرت ابوبکر وعمر......جن سے بلند تر حاکم انبیاء کے بعد اس کرۂ ارضی پر پیدا ہی نہیں ہوا...... سے بڑھ کر تھا۔

ہے اور جو صاحب قدرت سے کرے گا وہ راہ حق وصواب پر گامزن ہوگا اور دین و دنیا کی مصلحتوں کو حاصل کر لے گا، اس کے عین برخلاف پہلا شخص دونوں قسم کے مصالح سے محروم رہے گا۔

آٹھواں جواب:...... یہ ہے کہ جملہ خلفاء سے متعلق یہ دعویٰ جھوٹ ہے کہ وہ خمور و فجور میں محو رہا کرتے تھے۔ اس ضمن میں جو حکایات بیان کی جاتی ہیں وہ سب جھوٹ کا پلندہ ہیں ❶ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ ان میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اور خلیفہ مہتدی ❷ باللہ جیسے عادل و زاہد بھی تھے۔ مزید برآں بنوامیہ و بنوعباس کے اکثر خلفاء کا دامن فواحش ومنکرات سے پاک تھا۔

خلفاء میں سے کوئی ایک ❸ اگر کسی گناہ میں ملوث ہو بھی جاتا تو فوراً اس سے تائب ہوجاتا۔ بعض اوقات اس کی نیکیاں بہت زیادہ ہوتیں جن سے اس کی برائیاں مٹ جاتیں یا مصائب و آلام میں مبتلا ہو کر اس کے گناہ معاف کر دیئے جاتے۔❹

خلاصہ کلام! سلاطین وملوک اعمال صالحہ انجام دیتے تھے تو ان کی نیکیاں بھی بڑی ہوتی تھیں اور برائیوں کے بھی مرتکب ہوتے تھے تو ان کی برائیاں بھی بڑی ہوتی تھیں۔ اگر ان میں سے کوئی لاتعداد برائیوں کا ارتکاب کرتا جس کی حد یہ ہے کہ امت کا کوئی فرد اس ضمن میں اس کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا تو بلاشبہ اس کی نیکیاں بھی اتنی زیادہ ہوا کرتی تھیں کہ کوئی شخص

❶ یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے، وہ بھی اس بہتان طرازی میں شامل ہے حالانکہ محمد بن علی بن ابی طالب رحمہ اللہ ...... جن کو ابن الحنفیہ کہا جاتا ہے...... کے نزدیک یزید کا دامن ان معائب و نقائص سے پاک تھا۔ (البدایہ والنہایہ، ابن کثیر: ۸/۲۳۳)۔ یزید نے اپنے ننھیال کے قبیلہ قضاعہ میں پرورش پائی تھی اور اس کی والدہ میسون بنت بجدل نے یزید کو مردانہ کمالات و اوصاف سے آراستہ و پیراستہ کرنے میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا ہاتھ بٹایا تھا، شیعہ مذہب کی کتب یزید کی قباحت و مذمت سے پر ہیں یہ سب کذب و بہتان اور ظلم کے مترادف ہے اور شیعہ اس کے لیے اللہ کے حضور جواب دہ ہوں گے۔

❷ خلیفہ مہتدی باللہ عباسی (۲۲۲۔۲۵۶) کی تاریخ فضائل وفواضل سے لبریز ہے، میں نے دور حاضر کے جس مورخ و ادیب سے بھی خلیفہ مذکور کے محاسن و مناقب کا ذکر کیا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا، حالانکہ تاریخ اسلام کا حق یہ تھا کہ ایسے پاک باز خلیفہ کی سیرت وسوانح سے متعلق لوگوں کے ہاتھوں میں دسیوں تصانیف ہوتیں۔

❸ بنوامیہ و بنوعباس کی تاریخ قلم بند کرنے اور ان کی روایات و اخبار کی تشہیر کرنے والے مصنفین شیعہ یا شعوبیہ تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے امت مسلمہ کی تاریخ کو بگاڑ کر اس کے محاسن کو معائب میں بدل دیا، ذہین طبقہ اگر اسلامی تاریخ کے درس و مطالعہ کی طرف متوجہ ہو کر اس کی اصلاح کے لیے کوشاں ہو تو تھوڑی سی مدت میں ان کثیر تحریفات کی اصلاح ہوسکتی ہے۔

❹ میں مسلم فضلاء و مصنفین کی توجہات سامیہ کو اس حقیقت کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ شیعہ بشر کو بشر نہیں سمجھتے، ان کی رائے میں یا تو انسان فرشتوں کی طرح معصوم ہوتا ہے، بلکہ ان سے بھی بالاتر یا ابلیس کی طرح ملعون بلکہ اس سے بھی گیا گزرا ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بعض انسانوں کو جو نبی بھی نہ تھے معصوم قرار دیا اور مسلمانوں کے خلفاء و حکام اور داعیان حق کے خلاف از راہ بغض و عداوت کذب و دروغ کا طومار جمع کر دیا، ان اصحاب خیر و برکت کا سلسلہ حضرت ابوبکر و عمر سے شروع ہو کر راقم السطور محبّ الدین الخطیب تک پہنچ جاتا ہے، اگر وہ ایسا نہ کرتے تو وہ شیعہ نہ ہوتے اور اس لقب کو ہمیشہ کے لیے کھو دیتے، اس لئے کہ تشیع نام ہے تخریب وتعصب کا اور بس! ونعوذ باللہ من التعصب "آمین یارب العالمین۔"

ان کا حریف نہ ہوسکتا۔ ان کے اعمال صالحہ کا دائرہ خاصا وسیع تھا، مثلاً امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامتِ حدود، جہاد فی سبیل اللہ، اداءِ حقوق، دفع ظلم اور اقامت عدل وغیرہ۔

ہم خلفاء کو گناہوں اور مظالم سے مبرا قرار نہیں دیتے۔ جیسا کہ ہم اکثر عام مسلمانوں کو بھی ایسی چیزوں سے بری قرار نہیں دیتے۔ البتہ یہ کہتے ہیں کہ خلفاء یا عوام سے ظلم و معاصی کے صدور کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کا دامن نیکیوں سے بالکل خالی ہوتا ہے، اور اس بات میں بھی کوئی مانع نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے کام میں ان کے ساتھ تعاون کیا جائے۔

اہل سنت یہ بھی نہیں کہتے کہ جملہ امور میں خلفاء کی موافقت ضروری ہے، بلکہ اطاعت صرف نیک اعمال میں ضروری ہے، معصیت میں نہیں۔ جو شخص طاعات و عبادات میں کسی دوسرے کے ساتھ شریک ہو اور اعمال قبیحہ میں اس سے کنارہ کش رہے تو اسے کوئی ضرر لاحق نہیں ہوتا۔ مثلاً کوئی شخص لوگوں کے ساتھ فریضہ حج ادا کرنے کے لیے جائے اور ان کے ساتھ وقوف و طواف انجام دے تو کسی حاجی کے گنہگار ہونے سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ بعینہ اسی طرح اگر کوئی شخص جمعہ و جماعت یا کسی علمی مجلس یا غزوہ میں شریک ہو اور اس کے رفقاء میں سے کوئی شخص متعدد گناہ کر چکا ہو تو اسے اس کے گناہوں کی وجہ سے کوئی ضرر لاحق نہیں ہوگا۔ حاصل کلام یہ کہ خلفاء اس ضمن میں دوسروں لوگوں کے ساتھ مساوی ہیں کہ وہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے کام کرتے ہیں تو طاعات میں ان کی موافقت کی جائے، اور اگر اللہ کی نافرمانی کے کام کرتے ہیں تو معصیت میں ان کے ساتھ اشتراک کرنے سے اجتناب کیا جائے۔

ائمۂ اہل بیت کا برتاؤ بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ اسی قسم کا تھا۔ جو نیک کاموں میں ان کی اطاعت کرے گا وہ ان کا پیرو کہلائے گا اور جو سابقین اولین و جمہور اہل علم سے اظہار براءت کر کے ان کی دشمنی میں کفار و منافقین کا ساتھ دے گا۔ جیسا کہ شیعہ کا طرز عمل ہے...... تو وہ اپنے کیے کی سزا پائے گا۔

نواں جواب:...... خلیفہ و امام ایسا ہونا چاہیے جو قدرت و شوکت سے بہرہ ور ہو اور جس سے لوگوں کی بہبود و مصلحت کی شیرازہ بندی ہو جائے، مزید برآں خلیفہ میں درج ذیل اوصاف کا پایا جانا بے حد ناگزیر ہے۔

۱۔ خلیفہ کی وجہ سے راستوں میں امن و امان کا دور دورہ ہو۔
۲۔ شرعی حدود قائم کرنے پر قادر ہو۔
۳۔ ظلم کا ازالہ کر سکے۔
۴۔ دشمن کے خلاف جہاد کر سکتا ہو۔
۵۔ دوسروں کے حقوق انہیں دلوانے پر قادر ہو۔

ایسے امام کا ہونا اس امام معدوم سے بہت بہتر ہے جس کا اصل میں کوئی وجود ہی نہ ہو۔

مقام حیرت و استعجاب ہے کہ شیعہ جس امام معصوم کے دعوے دار ہیں وہ سرے سے اس دنیا میں موجود ہی نہیں، گویا شیعہ باطن میں جس امام کے دعوے دار ہیں وہ معدوم ہے۔ اور بظاہر جن کو امام مانتے ہیں وہ کافر و ظالم ہیں (مثلاً تاتاری کافر) اس کے عین برخلاف اہل سنت کے امام اگر ان کے متعلق کتنے ہی ظلم و گناہ کے مرتکب ہونے کو تسلیم کر لیا جائے

تو بھی اس کے باوصف شیعہ کے ان ائمہ اطہار سے بدرجہا بہتر ہیں جن پر وہ اعتماد کرتے ہیں۔اوراس امام سے بھی بڑھ کر ہیں جو بے حقیقت اور معدوم ہے۔ جہاں تک باقی ائمہ کا تعلق ہے جو کہ موجود تھے۔تو اہل سنت بھی ان کی اتباع ایسے ہی کرتے ہیں جیسے ان جیسے دوسرے لوگ اپنے ائمہ کی اطاعت کرتے ہیں۔ظاہر ہے کہ فریقین کے ائمہ کی اطاعت کرنے والا اس شخص سے بہتر ہے جو صرف ایک ہی فریق کے اماموں کا اطاعت گزار ہو۔اس لیے کہ روایت و درایت کا نام علم ہے اور اس میں جس قدر بھی علماء ہوں گے اور ان میں باہم اتفاق و اتحاد پایا جائے گا تو وہ اولیٰ بالاتباع ہوگا۔شیعہ کے یہاں جو خیر بھی موجود ہے اہل سنت اس میں برابر کے شریک ہیں،مگر جو خیر اہل سنت کے یہاں پائی جاتی ہو شیعہ اسے حاصل کرنے کے لیے تیار نہیں۔

دسواں جواب:...... یہ ہے کہ رافضی نے جو دلیل پیش کی ہے اہل سنت اس پر اس سے سخت اور شدید ترین دلیل سے معارضہ کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ سعید بن مسیّب،علقمہ،اسود،حسن بصری،عطا بن ابی رباح،محمد بن سیرین،مطرف، مکحول، قاسم بن محمد،عروہ بن زبیر،سالم بن عبداللہ اور دیگر تابعین و تبع تابعین (رحمہم اللہ) سب ائمہ دین میں شمار ہوتے ہیں۔دینی امور میں جس طرح ان کی اطاعت کی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی بادشاہوں کی اطاعت بھی ان امور دین میں کی جاتی ہے جہاں پر ان کی ضرورت ہو۔ان کے ساتھ ساتھ علی بن حسین اور ان کا فرزند نیز جعفر بن محمد وغیرہم بھی یکساں طور پر اہل سنت کے اماموں میں شامل ہیں۔قصہ مختصر! شیعہ علم و زہد سے بہرہ ور جس امام کی بھی اطاعت کرتے ہیں اہل سنت اس میں ان کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔اور اس کے پہلو بہ پہلو اپنے ائمہ کے بھی تابع فرمان ہیں جو علم و زہد میں شیعہ کے اماموں سے بڑھ کر تھے۔بفرض محال اگر اہل سنت نے معاصی کا ارتکاب کرنے والے کسی شخص کو امام بنانے کی غلطی کا ارتکاب کیا تو شیعہ نے اس سے بھی بدتر شخص کو امام مقرر کرلیا۔پس جن امور میں ائمہ کی اطاعت کرنی ہے' اہل سنت والجماعت ان امور میں ائمہ عدل کے پیروکار ہیں۔اور ظلم و جور کے امور میں ائمہ ظلم کی اتباع سے بہت دور بہت دور ہیں۔اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اہل سنت نے ظالم خلفاء کی اطاعت صرف ان باتوں میں کی تھی، جو ظلم و معصیت نہ تھیں، بنا بریں اہل سنت بہر کیف روافض سے افضل ہوئے۔

گیارہواں جواب:......شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''اللہ تعالیٰ ہمارے اور اہل سنت کے درمیان فیصلہ فرمائے گا؛ وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔''

اس کے جواب میں اس امامی شیعہ سے کہا جائے گا کہ: دلائل و براہین کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ دنیا ہی میں کر دیا ہے، مزید برآں اہل سنت قوت وشوکت کے اعتبار سے بھی ہمیشہ شیعہ پر غالب رہتے ہیں گویا اہل سنت کا یہ غلبہ دو گونہ ہے:

۱۔ حجت و برہان کے اعتبار سے۔

۲۔ سیف و سنان کے بل بوتے پر، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین باقی ادیان کے مقابلہ میں غالب ہوا تھا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴾ (التوبۃ: ۳۳)

''وہ اللہ کی ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت دے کر مبعوث کیا تا کہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے اگرچہ مشرکین کو یہ بات بری ہی کیوں نہ لگے۔''

یہ نا قابل انکار صداقت ہے کہ اہل سنت کے عقائد وافکار ہی دین ہیں جن کی تم مخالفت کرتے ہو۔ان عقائد کا حامل شخص دلیل و برہان کی بنا پر شیعہ پر غالب آئے گا جس طرح دین اسلام باقی ادیان و مذاہب کے مقابلہ میں غالب رہا، یہ امر محتاج بیان نہیں کہ دیگر ادیان و مذاہب پر دین اسلام کو جو غلبہ حاصل ہوا وہ اہل سنت کی وجہ سے ہوا۔ دین اسلام کو جو غلبہ کامل خلفائے ثلاثہ کے عہد سعادت مہد میں حاصل ہوا، وہ دوسرے کسی دین کو نصیب نہ ہو سکا❶ حضرت علی رضی اللہ عنہ اگرچہ خلفائے راشدین میں شامل ہیں اور سابقین اولین کے سرداروں میں شمار ہوتے ہیں مگر آپ کے عہد خلافت میں اسلام کو یہ غلبہ حاصل نہ ہو سکا۔❷ بخلاف ازیں آپ کے دور میں فتنہ پردازی کی وجہ سے اہل اسلام کا شیرازہ بکھر گیا۔اور اعداء دین مثلاً کفار، نصاریٰ و مجوس مختلف دیار وامصار میں بلاد مشرق اور شام کے کفار اسلامی ممالک کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگ گئے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد اہل سنت کے سوا نہ کوئی اہل علم باقی رہا اور نہ ہی زور بازو والا غازی ومجاہد جن کی بدولت اسلام کو غلبہ نصیب ہوتا۔ روافض کا یہ حال تھا کہ یا تو اعداء❸ اسلام کا ساتھ دیتے یا غیر جانب دار رہتے۔❹ اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ بروز قیامت سابقین اولین مہاجرین و انصار اور ان کے اعداء کے درمیان اسی طرح فیصلہ فرمائے گا جس طرح اہل اسلام اور کفار کے مابین فیصلہ صادر کرے گا۔

بارھواں جواب:......ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ آخر کس کے ظلم سے تم آہ وفریاد کر رہے ہو......؟

اگر شیعہ کہیں کہ ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر مظالم ڈھائے تھے اور ہم ان کے ظلم سے فریاد کے خواہاں ہیں۔ تو ہم جواباً کہیں گے کہ اس دعویٰ کا حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پہنچتا تھا، اور آپ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی طرح وفات پا چکے

❶ یہ حقیقت ہے کہ خلفاء ثلاثہ کے بعد اموی خلافت کے زمانہ میں شرق وغرب اور یورپ میں اسلامی دعوت کو جو فروغ حاصل ہوا وہ اموی خلفا کی مساعی جمیلہ کا رہین منت ہے۔

❷ سیدنا علی کی خلافت میں اسلامی دعوت کے ناکام ہونے کے ذمہ دار وہ شیعہ تھے، جو آخر کار کئی حصوں میں بٹ گئے، ان میں سے بعض آپ کے موافق اور بعض مخالف ہوگئے، آپ کے معاصر شیعہ پر مقابلۃً متاخرین شیعہ کی نسبت کم ذمہ داری عائد ہوتی ہے، متاخرین شیعہ نے اسلام کو ایک نئے سانچہ میں ڈھالنے کی مذموم سعی کی تھی اور اس کی ظاہری صورت کو اس طرح مسخ کر کے رکھ دیا تھا کہ وہ اسلام کے سوا کچھ اور معلوم دیتا تھا۔

❸ چنانچہ جب ہلاکو خاں نے یاجوج ماجوج (تاتاری فوج) کی مدد سے بغداد پر حملہ کیا تو شیعہ نے نصیر الدین طوسی اور ابن العلقمی کی قیادت میں کفار کا ساتھ دیا۔

❹ اس کی دلیل یہ ہے کہ تاتاریوں نے جب بلاد اسلامیہ پر حملہ کیا تو شیعہ اس میں غیر جانب دار رہے، پھر صلیبی جنگوں کے زمانہ میں بھی روافض نے یہی کردار ادا کیا اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ان واقعات کے عینی شاہد تھے۔

ہیں؛ ظاہر ہے کہ یہ معاملہ اہل سنت و شیعہ سے متعلق نہیں سوائے اس کے کہ حق کی وضاحت کر کے اہل حق کی موالات کی جائے۔ ہم دلائل قاہرہ کی روشنی میں یہ صداقت واضح کر سکتے ہیں کہ اس امت میں حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے بڑھ کر نہ کوئی عدل و انصاف کے تقاضوں پر عمل کر سکا اور نہ ظلم سے کنارہ کش رہا، ہم آگے چل کر یہ حقیقت واضح کریں گے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ عقیدہ نہ تھا کہ صرف آپ ہی امامت و خلافت کے منصب پر فائز ہیں [1] اور حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو یہ مرتبہ حاصل نہ تھا۔

اگر شیعہ کہیں کہ ہم ان ملوک و سلاطین کے ظلم سے دادرسی چاہتے ہیں جنہوں نے ائمہ شیعہ کو امامت و خلافت کے حقوق سے محروم رکھا تو ہم ان سے دریافت کریں گے کہ کیا ائمہ شیعہ نے خلافت کا مطالبہ کیا تھا؟ یا وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ معصوم امام ہیں؟ یہ ان پر صریح بہتان ہے، بہر کیف! سچ ہو یا جھوٹ؛ اگر ان کا آپس میں واقعی کوئی ایسا جھگڑا تھا تو اللہ تعالیٰ بروز قیامت اس کا فیصلہ فرمائیں گے۔ قرآن کریم میں فرمایا:

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ﴾ (الزمر: ۴۶)

''آپ فرمادیجئے! کہ اے اللہ! آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے، چھپے کھلے کو جاننے والے تو ہی اپنے بندوں میں ان امور کا فیصلہ فرمائے گا جن میں وہ الجھ رہے تھے۔''

اگر وہ ان ملوک و سلاطین کے ظلم سے دادرسی چاہتے ہیں جن کے ساتھ وہ کسی ولایت یا مال کے بارے میں برسر جدل و نزاع تھے تو اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ بروز قیامت سب متنازع فریقین کے مابین فیصلہ فرمائے گا، خود شیعہ کے مابین اتنے مخاصمات اور تنازعات پائے جاتے ہیں؛ جو کہ اہل سنت اور کسی بھی دوسرے گروہ کے باہمی اختلافات سے کہیں زیادہ ہیں۔ بنو ہاشم بھی باہم برسر پیکار رہ چکے ہیں، بنو حسن و بنو حسین کے مابین اسی قسم کی لڑائیاں ہو چکی ہیں، جو آج کل ان جیسے دوسرے لوگوں میں بپا ہیں۔ پچھلے زمانوں میں بعض بنی ہاشم اور دوسرے لوگوں کے درمیان جو معرکے بپا

[1] بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تاہنوز اور تا قیام قیامت ایسا شخص پیدا ہی نہیں ہوگا، مزید یہ کہ سب سے بڑا ظالم تو وہ ہے جو ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ظلم و تعدی کا شاکی ہے، بلکہ بالفاظ صحیح تر وہ حد درجہ کوتاہ فہم اور انسانیت کے اوصاف کمال سے بیگانہ ہے، ابو بکر و عمر کے خلاف بغض و عداوت رکھنے والا ان کی ذات میں اس دین کے سوا اور کوئی نقص و عیب نہیں پائے گا، جس نے انہیں انسانی کمالات کی آخری منزل تک پہنچا دیا، ایسا شخص دراصل اس دین کا دشمن ہے جس کی پیروی کا فخر ابو بکر و عمر کو حاصل تھا، اور جس کی امانتوں کے وہ اس کرۂ ارضی پر سب سے بڑے امین تھے، تاہم ہم ان کو معصوم قرار نہیں دیتے، معصوم ہونا خاصہ انبیاء ہے، البتہ یہ کہنے میں ہمیں کوئی باک نہیں کہ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اللہ کی مخلوقات میں افضل و اکمل تھے، حضرت علی نے جو کلمات کوفہ کے منبر پر ارشاد فرمائے تھے تاریخ اسلام انہیں فراموش نہیں کر سکتی، آپ نے فرمایا تھا، ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت میں سب سے افضل ابو بکر اور پھر عمر فاروق ہیں۔'' آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ''جو شخص مجھے ابو بکر و عمر کے مقابلہ میں افضل قرار دے گا میں اس پر مفتری کی حد لگاؤں گا۔''

ہوئے وہ ان لڑائیوں کی نسبت بہت زیادہ تھے، جو ابتدائی ایام میں بنوامیہ اور بنو ہاشم کے مابین ہوئیں۔ ❶
اس کی وجہ نسبی شرافت نہیں بلکہ اس لیے کہ سب سے بہتر زمانہ وہ تھا جس میں رسول اللہ ﷺ مبعوث کیے گئے تھے، پھر صحابہ کا زمانہ پھر تابعین کا ❷ بہر کیف آپ کے زمانہ میں خیر کا دور دورہ تھا اس کے برعکس آئندہ زمانوں میں شر کا غلبہ ہوگیا۔

اگر شیعہ ان دین دار اور بے ضرر علماء دین کے ہاتھوں فریاد کناں ہیں، جنھوں نے کسی پر ظلم کیا نہ ظالم کی امداد کے مرتکب ہوئے۔ بجز اس کے کہ وہ حق بات کو بدلائل قاہرہ واضح کر دیتے ہیں تو یہ بڑی غلط بات ہے، کوئی احمق شخص ہی اس بات میں شک وشبہ کا اظہار کرے گا کہ امام مالک، اوزاعی، ثوری، ابوحنیفہ، لیث بن سعد، شافعی، احمد، اسحق (رحمہم اللہ) اور

❶ بنوامیہ و بنو ہاشم کے مابین جس طرح اختلافات پائے جاتے تھے بعینہ اسی طرح محبت ومؤدت اور قرابت داری کے روابط بھی موجود تھے، اگر کوئی مورخ ایسے تاریخ حقائق جمع کرنے کی زحمت گوارا کرے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں خاندانوں میں کس حد تک الفت ومحبت کے علائق موجود تھے، اور ان سے کیا ثمرات ظہور میں آئے اور پھر ان واقعات کو اسانید سمیت کسی کتاب میں جمع کرنے کا التزام کرے تو یہ حقیقت منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوگی کہ فریقین میں محبت کے جذبات واحساسات اصلی و پائیدار تھے اور اختلافات ہنگامی و عارضی۔ خالد بن یزید بن معاویہ نے ایک مرتبہ حجاج بن یوسف کی ایک غلطی کی تصحیح کرتے ہوئے لکھا تھا: ''قریش باہم لڑتے جھگڑتے ہیں جب اللہ تعالیٰ صاحب حق کو حق عطا کر دیں گے تو ان کے تعلقات اور لاتعلقی، عقل و دانش اور شرافت و فضیلت کی بنا پر ہوگی۔'' خالد بن یزید کا مطلب یہ ہے کہ قریش میں سے جو لوگ باہم خاندانی علائق و روابط کو قائم رکھیں گے وہ ان مراسم کو توڑنے والوں کی نسبت فہم و فراست اور فضل و شرف میں بڑھ کر ہوں گے بنو ہاشم و بنوامیہ دونوں اس حقیقت سے آگاہ تھے اور اس کے قدر شناس تھے، بخلاف ازیں شیعہ اس سے نابلد محض ہیں اور ان کی راہ بنو ہاشم و بنوامیہ دونوں سے الگ ہے۔ شیعہ کا مقصد وحید فتنہ پروری اور اسلامی حقائق کے خلاف بغض وعناد کی آگ کو ہوا دینا ہے اور بس۔ راقم السطور نے جمادی الاولیٰ ۱۳۶۵ھ میں مجلّہ الفتح کے شمارہ: ۸۳۴ص: ۶، ۷ میں قریش کی اس قدیم عادت کا ذکر کیا تھا کہ بعض اوقات وہ عداوت کے باوجود بھی الفت و محبت کا اظہار کرنے سے نہیں ہچکچاتے، اس مضمون کا محرک یہ ہوا کہ جب امام ضحیانی فوت ہوگئے تو یمن کے امام یحییٰ بن حمید الدین نے ان کی وفات پر ایک دلدوز مرثیہ لکھا، حالانکہ عثمانی حکومت کے عہد میں یہ دونوں مدعی امامت ہونے کی بنا پر عرصہ دراز تک ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار رہے تھے، قریش کے علماء میں بھی اظہار مودت کی یہ رسم جاری رہی، جب تک کرۂ ارضی پر قریش کے ایسے علماء بقید حیات ہیں جو اسلامی اخلاق و آداب سے بہرہ ور ہیں الفت و محبت کے یہ مراسم باقی رہیں گے، اگرچہ فتنہ پرور لوگ ان باتوں کو پسند نہیں کرتے۔

❷ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا: ''سب سے بہتر زمانہ میرا ہے، (جس میں صحابہ تھے) پھر وہ زمانہ جو اس کے قریب ہے (عہد تابعین) پھر وہ زمانہ جو اس کے قریب ہے (تبع تابعین کا عہد مبارک) (صحیح بخاری، کتاب الشھادات، باب لا یشھد علی شھادۃ......(ح:۲۶۵۱)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب فضل الصحابۃ ثم الذین یلونھم...... (ح:۲۵۳۵)۔ آخری زمانہ اموی خلافت کے آخری دور پر ختم ہوتا ہے، عباسی خلافت کا ابتدائی زمانہ بھی اس میں شامل ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں: ''اس بات پر محدثین کا اتفاق ہے کہ تبع تابعین میں سے آخری مقبول القول شخص وہ ہے جو ۲۲۰ھ تک بقید حیات رہا، اسی زمانہ میں بدعات نے پر پرزے نکالنے شروع کیے معتزلہ نے اپنی زبانیں کھول دیں، فلاسفہ نے سر اٹھایا، اور خلق قرآن کے مسئلہ میں علماء کو شدید امتحان میں ڈالا گیا اس دور میں حالات سخت بدل گئے اور آئندہ زمانوں میں تنزل وانحطاط کی یہ رو حافظ ابن حجر کے زمانہ یعنی (۷۷۳-۸۵۲) ہجری تک جاری رہی، رسول اللہ کے ارشاد مبارک کے مطابق اقوال وافعال سے لے کر افکار و معتقدات تک جھوٹ سے ملوث ہوگئے۔ (فتح الباری: ۷/ ٤)

دیگر محدثین کو ہشام بن حکم و ہشام بن سالم اور ان کے ہم نوا روافض کے ہم پلہ ہیں، یہ انتہائی ظلم ہے۔ اسی طرح جو شخص یہ کہے کہ مسئلہ تقدیر کا انکار کرنے والے شیعہ مثلاً النعمی، کراجکی اور ان کے نظائر و امثال معتزلی علماء مثلاً ابوعلی، ابو ہاشم، قاضی عبدالجبار اور ابوحسین بصری کے ہم رتبہ ہیں اس کا ظالم ہونا کسی شک و شبہ سے بالا ہے، یہ معتزلہ کے اکابر علماء ہیں۔ اس ضمن میں اہل سنت علماء کا تو نام لینا ہی مناسب نہیں، مثلاً متکلمین اہل اثبات میں سے محمد بن ہیصم اور قاضی ابوبکر بن الطیب اور حدیث و فقہ اور تصوف کے علماء مثلاً ابو حامد اسفرائنی، ابوزید مروزی، ابوعبداللہ بن بطہ، ابوبکر عبدالعزیز، ابوبکر رازی، ابوالحسین قدوری، ابومحمد بن ابوزید، ابوبکر ابہری، ابوالحسین دارقطنی؛ ابوعبداللہ بن مندہ، ابوالحسن بن سمعون، ابو طالب مکی، ابوعبدالرحمٰن السلمی اور ان کے امثال وہ ہمنوا دوسرے علمائے کرام رحمہم اللہ وغیرہم۔

تحقیق کرنے پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اہل سنت کے مختلف و متعدد فرقوں میں سے ہر فرقہ شیعہ کی نسبت علم و عدل سے قریب تر اور ظلم و جہل سے بعید تر ہے۔ بفرض محال اگر اہل سنت کے کسی فرقہ نے ظالم کی اعانت کا ارتکاب کیا ہے تو شیعہ اس جرم کے ارتکاب میں [ہر موڑ پر] ان سے دو قدم آگے ہی ہوں گے۔ اور اگر شیعہ نے کبھی ظلم و تعدی سے اجتناب کیا ہے تو اہل سنت اس میدان میں بھی کئی قدم آگے ہوں گے۔ یہ بات تجربہ و مشاہدہ پر مبنی ہے اور اس میں ذرہ بھر مبالغہ نہیں، یہ حقیقت ہے کہ اسلامی فرقوں میں شیعہ سے زیادہ جھوٹا اور زیادہ ظالم و جاہل دوسرا کوئی فرقہ نہیں، لطف یہ ہے کہ شیعہ کے شیوخ و علماء نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''اے گروہ اہل سنت! تم میں جوان مردی کے آثار پائے جاتے ہیں، تم پر قابو پانے کی صورت میں ہم تم سے ہرگز وہ سلوک نہیں کرسکتے جو تم عندالقدرت ہم سے روا رکھتے ہو۔''

تیرھواں جواب:......شیعہ نے جس شعر کو پسند کیا اور اس سے استشہاد کیا ہے وہ اس کے ناظم کی جہالت کا مظہر ہے، اہل سنت اس بات کو تسلیم کرتے ہیں: ''رَوٰی جَدُّھُمْ عَنْ جِبْرِیْلَ عَنِ الْبَارِی''، اس سے بڑھ کر اہل سنت اقوال رسول پر بلا توقف عمل پیرا ہوتے ہیں اور یہ دریافت کرنے کی مطلقاً ضرورت نہیں سمجھتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ قول کہاں سے اخذ کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معصوم سمجھتے ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰیo اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی﴾ (النجم: ۳، ۴)

''وہ اپنی مرضی سے نہیں بولتا، بلکہ وہ تو وحی ہے جو آپ کی جانب بھیجی جاتی ہے۔''

اہل سنت کو اہل سنت کہا ہی اس لیے جاتا ہے کہ وہ سنت کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ بات ضرور ہے کہ سنت کے اثبات کے لیے ثقہ راویوں کی ضرورت ہے۔ قطع نظر اس سے کہ روایت کرنے والا حضرت علی کی اولاد میں سے ہو تو اس سے بھی استفادہ کرتے ہیں' یا کوئی اور شخص صرف ہو تو اس کے بھی علم سے استفادہ کرتے ہیں۔ اتنی بات ہرگز کافی نہیں کہ کوئی روایت محض ''عَنْ جِبْرِیْلَ عَنِ الْبَارِی'' کے بل بوتے پر بلا تحقیق مان لی جائے۔ ایسے لوگوں کا کیا کیا جائے؟

یہ بات محتاج بیان نہیں کہ امام مالک، شافعی اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کی بات صرف اس لیے حجت مانی جاتی ہے کہ وہ

اپنے اقوال کو نبی کریم ﷺ کی جانب منسوب کرتے ہیں۔ ورنہ ان کے اپنے اقوال کسی درجہ میں بھی حجت نہیں۔ حالانکہ یہ ائمہ احادیث نبویہ سے بخوبی آگاہ تھے اور ان کی معرفت واتباع میں ان کا اجتہاد حق وصواب پر مبنی ہے، ورنہ ائمہ کی اتباع کی کوئی ضرورت نہ تھی، جس طرح مذکورہ ائمہ احادیث کی روایت کرتے ہیں، اسی طرح دوسرے لوگ بھی اس ضمن میں ان سے پیچھے نہیں اور اگر ائمہ مسائل کا جواب دیتے ہیں تو دوسروں کو بھی یہ شرف حاصل ہے، بایں ہمہ اہل سنت کے نزدیک ان میں سے کوئی بھی معصوم نہیں، اور کسی کا قول بھی واجب الاتباع نہیں۔

بخلاف ازیں ائمہ کے مابین جب بھی کسی بات میں تنازع بپا ہوگا تو اہل سنت اسے اللہ ورسول ﷺ کے احکام کی جانب لوٹائیں گے۔ اگر بچشم خود اس کا مشاہدہ کرنا چاہیں تو اپنے زمانہ کے محدثین وفقہاء کو دیکھ لیں، یہ بات تجربہ سے ثابت ہے کہ شیعہ علماء کی اکثریت حافظ قرآن نہیں ہوتی، اور حدیث نبوی سے بھی انہیں بے حد معمولی لگاؤ ہوتا ہے، کتاب وسنت کے مفہوم ومعنی سے وہ بالکل بے گانہ ہوتے ہیں۔ باقی رہا شیعہ شاعر کا یہ قول کہ " رَوٰی جَدُّنَا عَنْ جِبْرِیْلَ عَنِ الْبَارِیْ"

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ائمہ اربعہ تمہارے نانا کی روایات کو شیعہ سے بہتر جانتے ہیں، اور شیعہ بھی احادیث کے بارے میں ان کی طرف رجوع کرتے ہیں جب متقدمین ومتاخرین بنی ہاشم، احادیث رسول بنی ہاشم کے علاوہ دوسرے لوگوں سے حاصل کرتے ہیں تو یہ اس بات کی کھلی علامت ہے کہ بنی ہاشم دوسروں سے زیادہ علم نہیں رکھتے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگ کس کی اقتدا کریں اور کس سے استفادہ کریں؟ آیا ان لوگوں سے اخذ واستفادہ کریں جو علم سے آگاہ ہیں یا ان لوگوں سے جو اس سے قطعی نابلد ہیں؟ اس میں شبہ نہیں کہ علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء نے درہم و دینار کا ورثہ نہیں چھوڑا بلکہ اپنے پیچھے علم کا ورثہ باقی رکھا ہے، جس نے یہ ورثہ حاصل کر لیا، اس نے بہت بڑا حصہ پایا۔

اگر شیعہ مصنف کہے کہ "میری مراد اس سے بارہ امام ہیں۔" تو ہم کہیں گے کہ علی بن حسین ابوجعفر رحمہ اللہ اور دیگر اہل بیت اپنے جدامجد (نبی اکرم ﷺ) سے جو روایات نقل کرتے ہیں وہ اسی طرح قابل قبول ہیں جس طرح دیگر راویان حدیث کی مرویات، اور اگر لوگ امام مالک شافعی اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے نزدیک موسیٰ بن جعفر، علی بن موسیٰ اور محمد بن علی رحمہم اللہ کی نسبت زیادہ روایات نہ پاتے تو اہل بیت کے علماء کو چھوڑ کر کبھی ان ائمہ دین کی بارگاہ میں حاضر نہ ہوتے۔

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ آخر لوگوں کو کیا پڑی تھی کہ وہ موسیٰ بن جعفر رحمہ اللہ سے ہٹ کر امام مالک بن انس رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوتے، حالانکہ یہ دونوں اکابر بہ یک وقت ایک ہی شہر میں بود و باش رکھتے تھے، بشرطیکہ موسیٰ بن جعفر رحمہ اللہ کے ہاں سے بھی انہیں علمی تشنگی کو دور کرنے کا وہی سامان میسر آتا جو امام مالک رحمہ اللہ کے ہاں دستیاب تھا، خصوصاً جب کہ اس زمانہ کے لوگ حدیث رسول کے شیدائی تھے، اس پر مزید یہ کہ خود بنی ہاشم اپنے چچا زاد موسیٰ بن جعفر رحمہ اللہ کی بجائے امام مالک رحمہ اللہ سے کسب فیض کیا کرتے تھے۔

امام مالک رحمہ اللہ کے بعد امام شافعی رحمہ اللہ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے، آپ نے بہت سے مسائل میں اپنے استاد محترم امام مالک رحمہ اللہ سے اختلاف کر کے ان کی تردید کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امام مالک رحمہ اللہ کے اصحاب وتلامذہ اور امام

شافعی رحمہ اللہ کے مابین شدید تنازعات بپا ہوگئے، امام شافعی رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ کی نسبت بلحاظ نسب بنی ہاشم سے قریب تر تھے، آپ احادیث نبویہ کے سچے عاشق تھے اور جہاں سے بھی حصول علم کی توقع ہوتی اس میں ذرہ بھر تغافل و تکاسل کو راہ نہ دیتے، خواہ یہ علم بنی ہاشم کے یہاں سے حاصل ہو رہا ہو یا کسی اور جگہ سے، اگر آپ امام مالک رحمہ اللہ کی نسبت کسی ہاشمی کے یہاں علم پاتے تو آستانہ مالک کی بجائے بنی ہاشم کی بارگاہ علم پر دستک دیتے، امام شافعی رحمہ اللہ خود اس امر کے معترف ہیں کہ انھوں نے کسی ایسے شخص سے استفادہ نہیں کیا جو امام مالک رحمہ اللہ اور سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ سے بڑا عالم ہو، مزید برآں امام شافعی رحمہ اللہ کی تصانیف ان دونوں اکابر سے ماخوذ معلومات سے لبریز ہیں اور ان میں کوئی بات بھی موسیٰ بن جعفر رحمہ اللہ اور دیگر بنی ہاشم سے مستفاد نہیں، یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ آپ جو علم حاصل کرنے کے درپے تھے بنی ہاشم کی نسبت امام مالک کے یہاں اس کی فراوانی تھی۔

اسی طرح امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا عشق رسول حدیث نبوی کے ساتھ والہانہ شغف، رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال سے ماہرانہ واقفیت و آگاہی، رسول اللہ ﷺ کے احباب و انصار کے ساتھ گہری محبت و مؤدت اور اعداء رسول ﷺ کے ساتھ شدید عداوت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں، بنی ہاشم کے ساتھ آپ کی عقیدت و ارادت کا یہ عالم تھا کہ فضائل صحابہ کے ساتھ ساتھ حضرت علی اور حسن و حسین کے فضائل و مناقب پر کتابیں تصنیف کیں، بایں ہمہ آپ کی تصانیف امام مالک، ثوری، اوزاعی، لیث بن سعد، وکیع بن جراح، یحییٰ بن سعید القطان، ہشیم بن بشیر، عبدالرحمن بن مہدی وغیرہم رحمہم اللہ کی روایات سے لبریز ہیں اور ان میں کوئی روایت موسیٰ بن جعفر، علی بن موسیٰ اور محمد بن علی رحمہم اللہ کے نظائر و امثال سے ماخوذ نہیں، یہ حقیقت ہے کہ اگر امام احمد بن حنبل ان علماء بنی ہاشم کے یہاں اپنا علمی مطلوب پا سکتے تو اس میں انتہائی دلچسپی لیتے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہاشمی علماء گنجینۂ معلومات تھے، ان کے مقابلہ میں دیگر علماء ان علوم سے بے بہرہ تھے، البتہ وہ اپنے علم کا اظہار نہیں کیا کرتے تھے، ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ پوشیدہ علم سے فائدہ؟ جس علم کا اظہار نہ کیا جائے وہ اس خزانہ کی مانند ہے جسے خرچ نہ کیا جائے، جو شخص اپنے علم کا اظہار نہیں کرتا، لوگ اس کی پیروی کیوں کر کریں گے؟ پوشیدہ علم (شیعہ کے) امام معدوم کی طرح بیکار ہے اور دونوں سے کوئی نفع حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

[ہاشمی علماء اور ایک شبہ پر رد:]

[اشکال]: اگر شیعہ کہیں کہ: ''ہاشمی علماء اپنے علوم کا کشف و اظہار صرف خواص پر کرتے تھے۔''

[جواب]: تو ہم کہیں گے کہ: ''یہ ان پر بہتان ہے، جعفر بن محمد بے نظیر عالم تھے اور ان کے بعد ایسا شخص پیدا نہیں ہوا، تاہم وہ تحصیل علم میں امام مالک، ابن عیینہ، شعبہ، ثوری، ابن جریج، یحییٰ بن سعید وغیرہ علماء و مشاہیر کے مرہون احسان تھے، جو شخص اس زعم باطل میں مبتلا ہے کہ ہاشمی علماء مذکورہ ائمہ سے علم کو پوشیدہ رکھتے اور مجہول الحال لوگوں پر اس کا اظہار کرتے تھے، وہ ان اکابر کے بارے میں بدظنی کا ارتکاب کرتا ہے، یہ ایک ناقابل انکار صداقت ہے، کہ ائمہ مذکورین میں اللہ و رسول کی محبت، جذبہ تبلیغ دین، احباب رسول سے محبت اور اعداء رسول سے بغض و عداوت کا جو جذبہ پایا جاتا

ہے، شیعہ کے شیوخ میں اس کا عشر عشیر بھی موجود نہیں، جو شخص ائمہ اہل سنت اور شیعہ کے ائمہ وشیوخ دونوں سے آشنا ہے وہ اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ ہر زمانہ کے شیوخ اہل سنت و روافض میں تقابل کر کے اس حقیقت کو دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ ❶ مثال کے طور پر اسی شیعہ مصنف (ابن المطہر جس کی تردید میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے منہاج السنۃ تصنیف فرمائی) کو لیجئے۔ ❷

❶ الفاظ کے لغوی و اصطلاحی مفہوم میں اہل سنت اور شیعہ کے یہاں جو بین اختلاف پایا جاتا ہے، اس پر غور کرنے سے یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ فریقین کے مابین اختلافات کی ایک زبردست خلیج حائل ہے، شیعہ جب حب الٰہی کا دعویٰ کرتے ہیں تو یہ محبت وجوب علی اللہ کے عقیدہ سے مقید ہوتی ہے، جب شیعہ حب رسول کا دعویٰ لے کر اٹھتے ہیں تو اس کے پہلو بہ پہلو وہ عصمت ائمہ کا دعوی کر کے شریعت کا مصدر و ماخوذ ہونے میں ان کو رسول اللہ رضی اللہ عنہم کا شریک ٹھہراتے ہیں، جس سے حب رسول میں بلاشبہ خلل اندازی ہوتی ہے، علاوہ ازیں یہ اکابر شیعہ کے اس فعل پر اس لیے رضا مند نہیں کہ مصدر شریعت ہونے کے اعتبار سے رسول اللہ کا شریک ہونا ایک غیر شرعی بات ہے، وہ اس سے اظہار براءت کرتے اور اسے ایک افترا قرار دیتے ہیں۔

تحفظ دین سے متعلق بھی شیعہ کا دعویٰ ایک انوکھی چیز ہے، دین کا جو تصور ان کے ذہن میں ہے وہ کتاب وسنت سے بالکل الگ ایک جداگانہ نوعیت کی چیز ہے اس کا انحصار ان روایات کاذبہ کی تشہیر و ترویج پر ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت سے منقول ہیں، اس طرح حب و بغض کا مفہوم بھی اہل سنت اور شیعہ کے یہاں یکساں نہیں تاکہ دونوں میں تقابل کر کے اہل سنت کی موالات کو درست اور شیعہ کی موالات کو ناروا قرار دیا جا سکے، اس میں شبہ نہیں کہ اہل سنت امت محمدی کے تمام صالحین سے یکساں طور پر محبت رکھتے ہیں، ظاہر ہے کہ آل محمد کے صالحین اسی طرح ان میں شامل ہیں جس طرح رسول اللہ کے اصحاب اور آپ کی ازواج مطہرات، بخلاف ازیں شیعہ عصمت کے دعویٰ کی اساس پر بعض اہل بیت سے محبت رکھتے ہیں، حالانکہ خود اہل بیت عصمت کے دعویٰ کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں، شیعہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر نیک اختر رقیہ اور ام کلثوم کے وجود تک میں صرف اس لیے شبہ کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ ان کے دشمن ہیں، چند افراد کو چھوڑ کر شیعہ اصحاب رسول کے جانی دشمن ہیں، خلاصہ یہ کہ اہل سنت اور شیعہ کا اختلاف مقدار محبت میں نہیں، بلکہ محبت کے لغوی، اصطلاحی اور دینی مدلول ومفہوم میں ہے، علی ہذا القیاس فہم قرآن، روایان حدیث کی روایات صحیحہ کا قبول وعدم قبول اور جھوٹے راویوں کی بیان کردہ روایات کاذبہ سے عدم احتجاج، یہ جملہ مسائل فریقین کے مابین متنازع فیہا ہیں۔

❷ اہل سنت وشیعہ کے مابین فرق وامتیاز کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اہل سنت کے نزدیک دینی حقائق تبدیل نہیں ہوتے، بلکہ ہر دور میں یکساں رہتے ہیں، وہ حدیث صحیح جو عہد صحابہ وتابعین میں رسول اللہ سے روایت کی گئی ہو، وہ اہل سنت اور ان کے ائمہ کے نزدیک ایک ابدی حجت اور واجب الاتباع دلیل کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے عین برخلاف شیعہ کی رائے میں دین کا تصور ہر عصر وعہد میں بدلتا رہتا ہے، ہم کئی دفعہ بیان کر چکے ہیں کہ شیعہ عالم المامقانی نے اپنی کتاب ''تنقیح المقال'' میں جہاں غالی شیعہ علماء کی سیرت وسوانح پر روشنی ڈالی ہے۔ جن کی روایات شیعہ علماء کے نزدیک ان کے غلو کی وجہ سے ناقابل قبول تصور کی جاتی تھیں...... وہاں یہ بھی بیان کیا ہے کہ ازمنہ سابقہ میں جو باتیں مبالغہ پر محمول کی جاتی تھیں اب وہ ضروریات مذہب میں شمار ہوتی ہیں یہ بات شیعہ مذکور نے رافضی جرح وتعدیل کی ایک بہت بڑی اور جدید ترین کتاب میں تحریر کی ہے اور اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اب شیعہ مذہب وہ نہیں رہا جو پہلے تھا، چنانچہ قدیم زمانہ میں جو بات غلو ہونے کی بنا پر ناقابل قبول تھی، اب ضروریات مذہب میں تصور کی جانے لگی ہے، خلاصہ کلام! شیعہ کا موجودہ مذہب وہ نہیں جو ایران کے سلاطین صفویہ سے پہلے تھا۔ اسی طرح صفویہ سے پہلے جو مذہب تھا، وہ شیعہ مصنف ابن المطہر سے پہلے نہ تھا اور ابن المطہر سے پہلے کا مذہب خاندان بنی بویہ سے قبل موجود نہ تھا، علی ہذا القیاس بنی بویہ سے پہلے کا شیعہ مذہب وہ نہ تھا جو شیطان الطاق سے پہلے تھا اور شیطان الطاق سے پہلے کا مذہب حضرت علی، حسن وحسین اور علی بن حسین رضی اللہ عنہم اجمعین کے زمانہ کے مذہب سے قطعی مختلف تھا۔

شیعہ کے نزدیک یہ یگانہ روزگار عالم تھا، بعض شیعہ کا قول ہے کہ علوم اسلامیہ کے اعتبار سے بلاد مشرق میں یہ عدیم المثال فاضل تھا۔ ❶ بایں ہمہ اس کے رشحات قلم سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرور کائنات ﷺ کے احوال واقوال واعمال میں اس کرۂ ارضی پر شاید ہی کوئی دوسرا آدمی اس سے زیادہ جاہل ہو، وہ ایسی جھوٹی باتیں بیان کرتا ہے، جن کا جھوٹا ہونا مختلف وجوہ واسباب سے ظاہر ہوتا ہے، دو ہی صورتیں ممکن ہیں:

۱۔ اگر وہ دانستہ جھوٹی روایات بیان کرتا ہے تو اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ: ''جو میری طرف سے کوئی حدیث بیان کرے اور وہ جانتا ہو کہ یہ جھوٹی ہے تو وہ جھوٹوں میں سے ہے۔'' ❷

۲۔ اگر اس کے جھوٹا ہونے سے آگاہ نہیں تو وہ رسول اللہ کے بارے میں اجہل الناس ہے۔

کسی شاعر نے کہا ہے:

فَـــاِنْ كُـــنْـــتَ لَا تَـــدْرِیْ فَتِـلْكَ مُـصِيْبَةٌ
وَاِنْ كُـــنْـــتَ تَـدْرِیْ فَـــالْـمُـصِيْبَةُ اَعْـظَـمُ

''اگر تو جانتا نہیں تو یہ مصیبت کا باعث ہے اور اگر جانتا ہے تو یہ اس سے بھی بڑی آفت ہے۔''

شیعہ ناظم کے جو اشعار ازیں تحریر کیے جا چکے ہیں ان کے جواب میں مندرجہ ذیل اشعار کہے گئے ہیں:

اِذَا شِـــئْـــتَ اَنْ تَـــرْضٰـــی لِـنَـفْسِكَ مَـذْهَبًا
تَـنَـــالُ بِـــهِ الـــزُّلْـفٰـــی وَتَـنْـجُـوْ مِنَ النَّارِ
فَـــدِنْ بِـــكِـتَـــابِ الـــلّٰـــهِ وَالسُّنَّةِ الَّتِـــیْ
اَتَـــتْ عَـــنْ رَسُـوْلِ الـلّٰــهِ مِـنْ نَقْلِ اَخْيَـارِ
فَـدَعْ عَـنْكَ دَاعِـــیَ الـــرَّفْضِ وَالْبِدْعِ الَّتِی
يَـــقُـــوْدُكَ دَاعِيْهَـــا اِلَـی الـنَّـــارِ وَالْـعَـــارِ
وَ سِـــرْ خَـلْفَ اَصْـحَـــابِ الـرَّسُوْلِ فَـاِنَّهُمْ
نُـجُـوْمُ هُـدًی فِـیْ ضَـوْئِهَا يَهْتَدِیْ السَّارِیْ

❶ چنانچہ شیعہ جب ''علامہ'' کا لفظ علی الاطلاق بولتے ہیں تو اس سے مراد ابن المطہر لیتے ہیں، شیعہ ابن المطہر کو آیت اللہ فی العالمین، نور اللہ، استاذ الخلائق، مرکز اسلام وغیرہ القاب سے یاد کرتے اور عجمی طرز و انداز کی یہ مبالغہ آمیزی کرتے ہوئے اللہ سے نہیں ڈرتے، کتاب ہذا کا قاری اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ ابن المطہر حد درجہ جاہل اور فریب کار شخص ہے اور اس کا دل رسول اللہ کے اقوال و اعمال کے حامل صحابہ وتابعین کی عداوت سے لبریز ہے، مقام حیرت ہے کہ کرۂ ارضی میں اللہ کے آخری پیغام کو پھیلانے والے صحابہ کے بارے میں شیعہ جس دریدہ دہنی کا ارتکاب کرتے ہیں شائد کوئی غیر مسلم مستشرق بلکہ عیسائی مشنری بھی ایسا نہ کر سکتے۔

❷ صحیح مسلم۔ المقدمۃ باب وجوب الروایۃ عن الثقات (حدیث:......)

وَعُجْ عَنْ طَرِيْقِ الرَّفْضِ فَهُوَ مُوَسَّسٌ
عَلَى الْكُفْرِ تَاسِيْسًا عَلٰى جُرُفٍ هَارِ
هُمَا خُطَّتَانِ اِمَّا هُدًى وَسَعَادَةٌ
وَاَمَّا شَقَآءٌ مَعَ ضَلَالَةِ كُفَّارِ
فَاَيُّ فَرِيْقَيْنَا اَحَقُّ بِاَمْنِهٖ
وَاَهْدٰى سَبِيْلًا عِنْدَ مَا يَحْكُمُ الْبَارِيْ
اَمَنْ سَبَّ اَصْحَابَ الرَّسُوْلِ وَخَالَفَ
الْكِتَابَ وَلَمْ يَعْبَاْ بِثَابِتِ اَخْبَارِ
اَمِ الْمُقْتَدِيْ بِالْوَحْيِ يَسْلُكُ
مَنْهَجَ الصَّحَابَةِ مَعَ حُبِّ الْقَرَابَةِ الْاَطْهَارِ

۱۔ جب تو اپنے لیے ایسا مذہب پسند کرنا چاہے جس سے اللہ کا قرب حاصل کر سکے اور دوزخ سے نجات پائے۔
۲۔ تو کتاب اللہ تعالیٰ اور ان احادیث نبویہ کی اطاعت کیجئے جو نیک لوگوں کی روایت سے ہم تک پہنچیں۔
۳۔ رفض و بدعات کے داعی کو چھوڑ یے کہ یہ شخص نار و عار کی جانب لے جاتا ہے۔
۴۔ اصحاب رسول کے نقش قدم پر چل اس لیے کہ وہ ہدایت کے ستارے ہیں جن کی روشنی میں چل کر سالک راہ ہدایت پا سکتا ہے۔
۵۔ رفض اور تشیع کی راہ سے منحرف ہو جا۔ اس لیے کہ اس کی اساس کفر اور ایک گر پڑنے والے گڑھے پر رکھی گئی ہے۔
۶۔ (دنیا میں) دو ہی باتیں ہیں یا تو ہدایت و سعادت ہے اور یا ضلالت کفار کے ساتھ ملی ہوئی بدبختی ہے۔
۷۔ ذرا غور فرمایئے اہل سنت و شیعہ کے دونوں فریقوں میں سے کون سا فریق اس وقت امن کا زیادہ حق دار اور راہ رست پر ہوگا۔ جب اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ صادر فرمائیں گے۔
۸۔ کیا وہ شخص (حق پر ہوگا) جو اصحاب رسول کو گالیاں بکے، کتاب اللہ تعالیٰ کی خلاف ورزی کرے اور احادیث صحیحہ کی پرواہ نہ کرے۔
۹۔ یا وہ شخص (راہ حق کا سالک ہے) جو وحی کی پیروی کرتا، راہ صحابہ پر گامزن ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اہل بیت اطہار کے ساتھ بھی محبت رکھتا ہے۔

فصل: ......شیعہ کا الزام: اہل سنت اور دنیا پرستی

رافضی نے لکھا ہے: ''اور میرا خیال نہیں ہے کہ آسودہ حال لوگوں میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جسے مذاہب کے بارے میں اطلاع ہو' اور اس نے باطنی طور پر امامیہ مذہب کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کیا ہو۔ بھلے وہ ظاہر میں دنیا طلبی کے لیے کسی دوسرے مذہب کی طرف ہی مائل کیوں نہ رہا ہو۔ اس لیے کہ ان کے لیے مدارس اور رباط کا قیام عمل میں لایا گیا؛ اوقاف مقرر کیے گئے تاکہ بنی عباس کی دعوت باقی رہے' اور عام لوگ ان کی امامت کا اعتقاد رکھتے ہوئے ان کے دست و بازو کو مضبوط کریں۔''

جواب: ...... یہ بات صرف وہی انسان کہہ سکتا ہے جو پرلے درجے کا جاہل انسان ہو؛ اور اسے اہل سنت والجماعت کے احوال کی معرفت بالکل نہ ہو۔ اور وہ لوگوں میں سب سے بڑا جھوٹا اور ضدی بھی ہو۔ اس کلام کا باطل ہونا کئی وجوہات کی بنا پر صاف ظاہر ہے۔

۱۔ اس سے قبل کے اس قسم کے مدارس بنائے جائیں اہل سنت والجماعت اس سے زیادہ طاقتور اور غالب تھے۔ بغداد میں مدارس کا قیام پانچویں صدی ہجری میں عمل میں آیا۔ اور تقریباً چار سو ساٹھ ہجری کے قریب قریب مدارس نظامیہ قائم ہوئے۔ یہ ائمہ اربعہ میں سے صرف ایک امام کے مذہب پر تھے۔ جب کہ اس وقت تک زمین کے مشرق و مغرب میں مذاہب اربعہ پھیل چکے تھے۔ بلاد مغرب میں مالکیہ موجود تھے؛ مگر ان کے ہاں کوئی عباسی نہیں تھا۔

۲۔ بنو عباس کی حکومت سے پہلے اہل سنت والجماعت زیادہ غالب اور قوی تھے۔ اس لیے کہ بنی عباس کی حکومت میں بہت سارے شیعہ اور دوسرے اہل بدعت بھی داخل ہو گئے تھے۔

۳۔ پھر یہ کہ اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے کہ خلافت بنو عباس کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے۔ چنانچہ اگر کوئی علوی یا اموی یا کوئی دوسرا قریشی خاندان حاکم بن جائے تو یہ بھی جائز ہے۔

۴۔ پھر یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ علماء اہل سنت جیسا کہ امام احمد بن حنبل اور امام مالک علیہما السلام وہ لوگ ہیں جو بادشاہوں کا لحاظ کرنے والے [یا ان کے سامنے دب جانے والے] اور ان کی قربت اختیار کرنے والے ہرگز نہ تھے۔

۵۔ پھر یہ کہ اہل سنت والجماعت خلفاء راشدین کی تعظیم بجالاتے ہیں' اور ان میں سے کوئی ایک بھی بنو عباس میں سے نہ تھا۔

۶۔ نیز ہر عاقل انسان یہ بات بھی جانتا ہے کہ مشہور مسلمان علماء کرام رحمہم اللہ میں سے کوئی ایک بھی رافضی نہ تھا۔ بلکہ ان تمام کا روافض کے جاہل اور گمراہ ہونے پر اتفاق تھا۔ ان کی کتابیں اس بات پر بہترین شاہد موجود ہیں۔ یہ تمام گروہوں کی کتابیں پکار پکار کر اس موقف پر اپنی گواہی پیش کر رہی ہیں۔ حالانکہ ان میں سے کسی ایک کو بھی روافض اور ان کی جہالت و گمراہی کا ذکر کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہمیشہ روافض کی گمراہی اور جہالت کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں؛ جس سے اضطراری طور پر معلوم ہو سکتا ہے کہ ان سب علماء کرام کا اعتقاد ہے کہ شیعہ

سب سے بڑے جاہل اور گمراہ لوگ ہیں؛ اور ملت کے تمام گروہوں میں سے مہدی سے سب سے دور یہی لوگ ہیں اور ایسا ہوتا بھی کیوں نہیں ؛ جب کہ امامیہ روافض کے ہاں ہر بڑی بدعت اور برائی پائی جاتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ لوگ جہمیہ قدریہ رافضیہ ہیں۔ اوران میں سے ہر ایک گروہ کی مذمت میں سلف صالحین سے جو کلام وارد ہے' اس کا صحیح علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اور کتابیں ان باتوں سے بھری پڑی ہیں۔ جیسا کہ کتب حدیث وآثار' فقہ و تفسیر؛ اصول وفروع اور دوسری کتابیں۔ یہ تین گروہ باقی کے تمام فرقوں جیسے مرجئہ اورحروریہ کی نسبت سب سے بڑے گمراہ اور بدکردار اور بدعتی ہیں۔

۷۔ اللہ کی قسم ! یہ بات اللہ جانتا ہے کہ میرے کثرت مطالعہ اور تلاش؛ لوگوں کے اقوال و مذاہب کی معرفت کے باوجود مجھے کسی ایک بھی ایسے انسان کے بارے میں علم نہیں ہوسکا جس کے سچے ہونے کا شہرہ لوگوں میں ہو' اور وہ امامیہ مذہب کا ادنیٰ سا بھی اہتمام کرتا ہو چہ جائے کہ وہ باطن میں اس کا عقیدہ رکھتا ہو[اور اسے صحیح سمجھتا ہو]۔

۸۔ حسن بن صالح بن حيي پر زیدی ہونے کا الزام لگایا گیا؛ حالانکہ وہ نیک' صالح ؛ عالم وفقیہ اور زاہد انسان تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ پر یہ الزام جھوٹ ہے۔ ان میں سے کسی ایک سے بھی یہ منقول نہیں ہے کہ انہوں نے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر طعن وتشنیع کی ہو؛ چہ جائے کہ وہ ان کی امامت میں شک کریں۔

۹۔ اوائل شیعہ کے ایک گروہ پر الزام لگایا گیا تھا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ترجیح اور فضیلت دیتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک پر بھی یہ تہمت نہیں ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما پر ترجیح دیتے ہوں۔ بلکہ عام طور پر اوائل شیعہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کرتے تھے؛ اور آپ پر حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ لیکن ان میں ایسا گروہ ضرور موجود تھا جو آپ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ترجیح دیا کرتے تھے۔

۱۰۔ اس فتنہ کے دور میں لوگوں کے دو گروہ ہوگئے تھے۔ عثمانی شیعہ اور علوی شیعہ۔ اور ایسا ہرگز نہیں تھا کہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر شریک جنگ ہو' وہ آپ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر فضیلت بھی دیتا ہو۔ جیسا کہ تمام اہل سنت کا عقیدہ ہے۔

فصل:......اہل سنت والجماعت باطن میں شیعہ؛ اور اس پر ردّ

[الزام] ......رافضی نے کہا ہے:'' اور ہم نے اکثر اوقات ان لوگوں کو دیکھا ہے جو باطن میں امامیہ مذہب رکھتے ہیں۔ مگر وہ دنیا کی محبت اور مقام و مرتبہ کی طلب کی وجہ سے اس کا اظہار نہیں کرتے۔ میں نے حنبلی مذہب کے بعض ائمہ کو دیکھا ہے جو یہ کہتے تھے:'' ہم امامیہ کے مذہب پر ہیں۔ میں نے پوچھا:'' تو پھر آپ حنبلی مذہب پر تدریس کیوں کررہے ہیں؟ تو اس نے کہا:'' تمہارے مذہب میں مشاہراہ اور معاوضہ نہیں ملتا۔ ہمارے زمانے کا ایک بڑا شافعی مدرس تھا؛ جب اس کی وفات کا وقت قریب آیا تو اس نے وصیت کی کہ : میری تجہیز وتکفین شیعہ کے سپرد کی جائے اور اسے سیدنا کاظم کی

درگاہ میں دفن کیا جائے۔ اور اس نے اس بات پر گواہ بھی متعین کیے کہ وہ امامیہ کے مذہب پر تھا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

جواب :......رافضی کا یہ کہنا کہ:'' ہم نے اکثر دیکھا ہے'' یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ ہاں ایسے ضرور ہوا ہوگا کہ مذاہب اربعہ کی طرف منسوب لوگوں میں سے کچھ باطن میں رافضی عقیدہ رکھتے ہوں ۔ جیسا کہ اسلام کا اظہار کرنے والوں میں منافقین بھی پائے جاتے ہیں ۔اس لیے کہ رافضی بھی منافقین کی جنس میں سے ہیں' اور جب انہیں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے عقیدہ کے خلاف ظاہر کریں تو وہ اپنے عقیدہ کو چھپا لیتے ہیں ۔ جیسا کہ منافقین کو ضرورت محسوس ہوئی تھی کہ وہ اپنے کفر کے برعکس ظاہر کریں۔ اور یہ بات صرف ان لوگوں میں پائی جاتی ہے جو نبی کریم ﷺ کے ظاہری و باطنی احوال اور شروع کے دور میں مسلمانوں کے حالات سے جاہل ہوں۔

❀ جبکہ وہ لوگ جنہیں صحیح معنوں میں اسلام کے ابتدائی حالات کا علم ہو؛ اور ظاہری و باطنی طور پر وہ محمد ﷺ کے رسول اللہ ہونے کا اقرار بھی کرتا ہو' اس کا باطن میں رافضی ہونا انتہائی مشکل بات ہے۔اور باطن میں رافضی ہونے کا تصور بھی صرف اس انسان کے متعلق کیا جاسکتا ہے جو زندیق یا منافق ہو یا پھر اسلام کے احوال انتہائی درجہ کا لاعلم اور جاہل ہو۔

❀ جس امام و مدرس کے بارے میں حکایت نقل کی گئی ہے ۔اس کے بارے میں ہمیں بعض اہل بغداد علماء نے اطلاع دی ہے کہ یہ بات محض جھوٹ کا پلندہ ہے۔ اگر رافضی ان بعض مدرسین سے اپنی بات نقل کرنے میں سچا بھی ہو تو بھی اس بات کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ائمہ اربعہ کے مذاہب کی طرف خود کو منسوب کرنے والا کوئی زندیق دائرہ اسلام سے خارج انسان ہو؛ مگر پھر بھی اس کا رافضی ہونا محال لگتا ہے۔اور جس کسی نے بعض لوگوں کے باطن میں زندیق ہونے کی وجہ سے یہ کہہ دیا کہ تمام مسلمان باطن زندیق ہیں؛ وہ پرلے درجے کا جاہل ترین انسان ہے۔اور ایسے ہی جو کوئی بعض لوگوں کے باطن میں رافضی ہونے کی وجہ سے تمام مسلمانوں کو باطن میں رافضی ہو۔

اگر یہ رافضی مصنف اس مدرس کا نام بھی لے لیتا تو ہم ایسی تحقیق کے ساتھ سب بات بیان کر دیتے جس سے حقیقت حال کھل کر سامنے آجاتی اور رافضی کی جہالت واضح ہو جاتی۔

❀ کیا تاتاریوں اور کافروں کے ملک میں یا نئے مسلمانوں ہونے والوں میں محض کسی انسان کے منصب تدریس پر فائز ہونے سے؛ کسی انسان کو وہ مقام مل جاتا ہے جو اس کی فضیلت اور دیانت کی دلیل سمجھا جائے۔ یہاں تک کہ اس کی بات کو بطور عقیدہ دلیل میں پیش کیا جائے۔ حالانکہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اکثر اوقات ظالموں لوگوں کے ہاں تدریس پر مامور لوگ خود بھی بڑے ظالم اور جاہل ہوتے ہیں۔

❀ علماء کی فضیلت پر دلالت کرنے والی چیز لوگوں کے مابین مشتہر ان کے علوم ہوتے ہیں یا پھر جو چیز ان کے کلام اور تحریروں سے ظاہر ہوتی ہے۔تو کیا امام شافعی' امام احمد اور امام مالک رحمہم اللہ کے ساتھیوں میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ رافضی تھا؟ بلکہ یہ بات اضطراری طور پر معلوم ہے کہ ان میں سے ہر ایک انسان

بہت سختی کے ساتھ رافضیت کا رد کرنیوالا تھا۔ ان ائمہ کے متبعین میں سے ایک گروہ پر اعتزال کی ایک قسم کی طرف مائل ہونے کی تہمت لگائی گئی ہے۔ مگر ان میں سے کسی ایک پر بھی رافضی ہونے کی تہمت ہرگز نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رافضی اہل علم کی راہ سے بہت ہی دور ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ معتزلہ کے بعض عقائد و اقوال میں بہت بڑی بدعات پائی جاتی ہیں' مگر پھر بھی یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ان میں علم اور دین داری پائی جاتی ہے۔ اور یہ لوگ یہ شرعی اور عقلی دلائل سے استدلال کرتے ہیں اور اسلام سے دور رہنے والوں فرقوں ملاحدہ اور دوسرے لوگوں پر رد کرتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے رافضہ پر اس طرح سے رد کیا کہ بہت سارے لوگ افرادی اور جماعت کی صورت میں ان کے ساتھ شامل ہوگئے۔ اگرچہ ان میں سے کچھ اپنے آپ کو ائمہ اربعہ کے مذاہب میں سے بعض کی طرف منسوب کرتے ہیں؛ جیسا کہ امام ابی حنیفہ رحمہ اللہ وغیرہ۔

بخلاف رافضہ کے۔ یہ منقول اور معقول میں تمام فرقوں سے بڑے جاہل ہیں۔ اور وہ لوگ بھی ان ہی میں سے ہیں جو علم اور دین کا اظہار کرتے ہوئے ان کے ساتھ شامل ہوگئے۔ ایسا انسان لوگوں میں سب سے بڑا جاہل ہی ہوسکتا ہے؛ یا پھر زندیق اور ملحد ہوسکتا ہے۔

فصل: ......امامیہ کی اتباع کے متعلق خوش فہمی

[رافضی کا کہنا کہ: امامیہ مذہب اس لیے واجب الاتباع ہے کہ وہ دوسروں کے برعکس ناحق تعصب نہیں کرتے]

[تہمت]: رافضی مصنف نے کہا ہے: ''پانچویں وجہ: ''امامیہ مذہب کی اتباع واجب ہونے کے بیان میں۔'' اس لیے کہ انہوں نے مخالفین کے برعکس کبھی بھی ناحق تعصب کا ساتھ نہیں دیا۔ غزالی اور ماوردی رحمہما اللہ ' جو کہ شافعی مذہب کے دو امام ہیں؛ نے ذکر کیا ہے۔ قبروں کی سطح برابر کرنا مشروع ہے۔ مگر جب رافضہ نے اسے اپنا شعار بنالیا تو ہم نے یہ کام چھوڑ دیا اور زمخشری رحمہ اللہ جو کہ حنفیہ کے امام ہیں؛ انہوں نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَ مَلٰٓئِکَتُهٗ﴾ [الاحزاب ۴۳]

''وہی ہے جو رحمت بھیجتا ہے تم پر اور اس کے فرشتے۔''

''اس آیت کی روشنی میں مسلمانوں میں سے کسی ایک پر رحمتیں بھیجنا جائز ہے۔ لیکن جب رافضیوں نے اپنے ائمہ کے متعلق اسے شعار بنالیا تو ہم نے اس سے منع کرنا شروع کردیا۔ حنفیہ میں سے ہدایہ کے مصنف نے کہا ہے: ''مشروع یہ ہے کہ دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنی جائے؛ لیکن جب رافضیوں نے اسے اپنی پہچان بنالیا تو ہم نے بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننا شروع کردیا۔ اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ پس اب یہ دیکھنا چاہیے کہ شریعت کو کون بدلتا ہے؟ اور کون ان احکام میں تبدیلی کرتا ہے جن کے بارے میں شریعت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نصوص منقول ہیں۔ اور ایک متعین قوم کی ضد میں آکر اس کے خلاف کرتا ہے؟؛ تو پھر کیا ان لوگوں کی اتباع کرنا اور ان کے اقوال کی طرف رجوع کرنا جائز ہے؟'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]:اس کا جواب دوطرح سے دیا جاسکتا ہے:

پہلی بات:......اس رافضی مصنف نے جو الزام لگائے ہیں' حقیقت میں خود روافض ان کے زیادہ اہل ہیں۔

دوسری بات:......ائمہ اہل سنت والجماعت عند اللہ ان الزامات سے بالکل بری ہیں۔ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے: ہم نہیں جانتے کہ کوئی فرقہ رافضیوں سے بڑھ کر باطل پر تعصب کرنے والا ہو۔ یہاں تک کہ باقی تمام فرقوں میں رافضی اپنے موافق کی خاطر جھوٹی گواہی دینے [اور جھوٹی قسم اٹھانے] میں مشہور و معروف ہیں۔تعصب میں جھوٹ سے بڑھ کر بڑا گناہ کوئی نہیں ہوتا۔ان کی حالت یہ ہے کہ:

۱۔ انہوں نے تعصب میں آ کر تمام میراث کا وارث صف بیٹی کو ٹھہرایا ہے تا کہ یہ کہہ سکیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وارث صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی تھیں؛ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا اس میں کوئی حصہ نہیں تھا۔

۲۔ شیعہ میں بعض لوگ اونٹ کے گوشت کو حرام قرار دیتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جنگ جمل میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اونٹ پر سوار تھیں۔ اس طرح یہ لوگ کتاب اللہ' سنت رسول اللہ اور اجماع صحابہ کرام و اہل بیت کی مخالفت کے مرتکب ہوئے۔ یہ ایسی بات ہے جو کسی بھی طرح مناسب نہیں تھی۔اس لیے کہ وہ اونٹ جس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سوار ہوئی تھیں وہ تو کبھی کا مر چکا۔اگر بالفرض یہ کہہ لیا جائے کہ وہ اونٹ ابھی تک زندہ ہے؛ تو پھر بھی جب کفار کے اونٹ پر سوار ہونے کی وجہ سے اس کی حرمت واجب نہیں ہوتی؛ اور کفار برابر اونٹ کی سواری کرتے چلے آرہے ہیں اور مسلمانوں کو ان سے یہ اونٹ مال غنیمت میں حاصل ہوتے ہیں اوران کا گوشت ان کے لیے حلال ہوتا ہے۔تو پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اونٹ پر سوار ہونے میں وہ کونسی بات مضمر ہے جس کی وجہ سے اونٹ کا گوشت حرام قرار دیا جاتا ہے؟ اس کی انتہاء تو یہی ہوسکتی ہے کہ جن بعض لوگوں کو یہ رافضی کافر کہتے ہیں؛ وہ اونٹ پر سوار ہوئے تھے۔ حالانکہ رافضی ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر جو تہمت لگاتے ہیں' اس میں وہ جھوٹے اور بہتان تراش ہیں۔

۳۔ ان کے تعصب کی حد یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی زبان پر ''دس'' کا لفظ نہیں لاتے۔ بلکہ یوں کہتے ہیں: نو اور ایک۔اور جب ستون وغیرہ بناتے ہیں تو خصوصی خیال رکھتے ہیں کہ ان کی تعداد دس نہ بنے۔ایسے ہی بہت سارے دیگر امور میں بھی اس چیز کا خصوصی خیال رکھتے ہیں۔حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بہت سارے دس کا لفظ ذکر کیا ہے۔[بلکہ بہت سارے مواقع پر اللہ تعالیٰ نے لفظ ''دس'' کے مسمیٰ کی تعریف کی ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ حج تمتع کے بارے میں فرماتے ہیں]:

﴿فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ﴾ (البقرۃ ۱۹۶)

''تو تین روزے تو ایام حج میں رکھے اور سات گھر واپس پہنچ کر، یہ کل دس روزے ہو جائیں گے۔''

اور دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا﴾ [البقرۃ ۲۳۴]

''تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، وہ عورتیں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن عدت میں رکھیں۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰی ثَلٰثِیْنَ لَیْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ﴾ (الأعراف ۱۴۲]

''ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو تیس شب و روز کے لیے (کوہِ سینا پر) طلب کیا اور بعد میں دس دن کا اور اضافہ کر دیا۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَالْفَجْرِ o وَلَیَالٍ عَشْرٍ﴾ (الفجر ۱۔۲]

اور قسم ہے فجر کے وقت کی' اور دس راتوں کی۔''

اللہ تعالیٰ نے لفظ ''دس'' کے مسمیٰ کا قابل مدح وتعریف مواقع پر کیا ہے۔ جب کہ لفظ ''نو'' کے مسمی کا ذکر قابل مذمت موقع پر کیا ہے۔ جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں؛

﴿وَ کَانَ فِی الْمَدِیْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ یُّفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا یُصْلِحُوْنَ﴾ (النمل ۴۸)

''اس شہر میں نو جتھے دار تھے جو ملک میں فسا پھیلاتے اور کوئی اصلاح کا کام نہ کرتے تھے۔''

لیلۃ القدر کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اسے رمضان کے آخری عشرہ میں تلاش کرو۔''❶

صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ رمضان المبارک کی آخری دس راتیں اعتکاف کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وفات دے دی۔'' [البخاری (۳/ ٤٧) مسلم (۲/ ۸۳۰)]

صحیح حدیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے [ذوالحجہ کے پہلے دس دنوں کے بارے میں] ارشاد فرمایا:

''اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی بھی عمل ان دنوں کے عمل سے بڑھ کر محبوب اور پسندیدہ نہیں۔''❷

جب اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اس عدد ''دس'' کے ساتھ کلام کیا ہے' اور اس کے ساتھ بہت سارے محمود احکام شرعیہ کو معلق کیا ہے تو پھر ان لوگوں کا لفظ ''دس'' سے عشرہ مبشرہ کی اصطلاح وجہ سے نفرت رکھنا؛ کیونکہ ان سے یہ لوگ بغض رکھتے ہیں؛ انتہائی جہالت اور تعصب کی نشانی ہے۔

پھر ان لوگوں کا یوں کہنا: ''نو اور ایک'' عبارت کی طوالت کے ساتھ دس کا یہی معنی ہے۔ جب نو یا دس یا سات کا لفظ اس عدد کے ساتھ معدود ہر چیز پر واقع ہوتا ہے خواہ اس کا تعلق انسانوں سے ہو یا پھر چوپاؤں سے یا پھر لباس اور درہم و

---

❶ البخاري كتاب فضل ليلة القدر ؛ باب تحري ليلة القدر ؛ مسلم (۲/ ۸۲۳) كتاب الصوم باب ما جاء في ليلة القدر ؛ سنن الترمذي ۲/ ١٤٤ ؛ كتاب الصوم ـ المؤطأ ۱/ ۱۳۹ ؛ كتاب الاعتكاب۔

❷ الترمذي ۲/ ۱۲۹؛ كتاب الصوم باب : ما جاء في العمل في أيام العشر ـ سنن ابن ماجة ۱/ ٥٥٠ ؛ كتاب الصيام ؛ باب صيام العشر ؛ قال الشيخ أحمد شاكر : إسناده صحيح۔ البخاري ۲/ ۲۰۔

دینار سے۔ان میں سے بعض معدودات محمود ہوتے ہیں اور بعض مذموم۔

۴۔ پس ان جاہلوں کا گنتی کے یہ اعداد اپنی زبان پر لانے سے نفرت کرنا بالکل ایسے ہی ہے جیسے یہ لوگ ان سے بھی نفرت کرتے ہیں جن کے نام ان لوگوں کے ہم نام ہوں جن سے یہ بغض رکھتے ہوں۔جیسا کہ یہ لوگ ابوبکر وعمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین سے بغض رکھنے کی وجہ سے ان لوگوں سے بھی نفرت کرتے ہیں جن کے نام ان صحابہ کرام کے اسماء پر رکھے گئے ہوں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں ایسے لوگ بھی تھے جن کے ہم نام لوگ کفار میں بھی موجود تھے۔جیسا کہ ولید بن ولید۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نماز میں دعائے قنوت میں یوں دعا کیا کرتے تھے:

((اللھم أنجِ الولِيد بن الولِيدِ وسلمة بن هِشام [وعياش بن أبِى ربِيع] والمستضعفِين مِن المؤمِنِين .)) ❶

''اے اللہ ولید بن ولید کو اور سلمہ بن ہشام کو اور عیاش بن ابی ربیع اور کمزور مسلمانوں کو کفار سے نجات دے۔''

بیٹا ولید مومن اور متقی انسان تھا جب کہ اس کا باپ ولید کافر اور بد بخت ترین انسان تھا۔ایسے کفار قریش میں عقبہ بن ابی معیط بھی تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

((رأيت كأني فى دار عقبة بن رافع وأتينا برطب من رطب ابن طاب. فأولت أن الرفعة لنا فى الدنيا والعاقبة فى الآخرة وأن ديننا قد طاب .)) ❷

''رات میں نے دیکھا گویا ہم عقبہ بن رافع کے گھر میں ہیں۔اور ہمارے پاس ابن طاب کی تازہ تر کھجوروں میں سے رطب لائی گئی۔میں نے اس کی یہ تعبیر وتاویل کی کہ دنیا کی بلندی ورفعت ہمارے لیے ہے: اور آخرت میں عاقبت اور عمدہ انجام بھی ہمارے لیے ہیں اور بیشک ہمارا دین پاکیزہ اور عمدہ ہوگیا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی بن ابی طالب کے لیے دعا کیا کرتے تھے۔اور کفار میں علی بن امیہ بن خلف بھی تھا جو کہ بدر کے دن اپنے والد کے ساتھ حالت کفر میں قتل ہوا۔

صحابہ کرام میں سے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ بھی تھے جو کہ شاعرِ نبی تھے۔اور کعب بن اشرف کافر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی اذیت پہنچائی کہ آپ نے حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو اسے قتل کرنے کے لیے بھیجا۔صحابہ میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ تھے۔جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

---

❶ صحيح بخارى:ح ٧٧٠؛ كتاب التفسير ؛ تفسير سورة البقر ؛ مسلم ١/ ٤٦٦ ؛ كتاب المساجد باب استحباب القنوت فى جميع الصلاة ؛ سنن ابي داؤد ٢/ ٩٢ ؛ كتاب الصلاة؛ باب القنوت]

❷ مسلم ٤/ ١٧٧٩ ؛ كتاب الرؤيا؛ باب رؤيا النبي صلى الله عليه وسلم ؛ سنن ابوداؤد: ٤/ ٤١٨ ؛ ١٦١٩؛ كتاب الادب ؛ باب ما جاء في الرياء .

''بیشک اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ میں تمھیں یہ سورت پڑھ کر سناؤں: ﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ ❶ مراد تبلیغ کے لیے پڑھنا تھا تعلیم کے لیے نہیں۔ جب کہ مشرکین میں بھی ابی بن خلف نامی انسان تھا جسے رسول اللہ ﷺ نے احد کے دن اپنے ہاتھ سے قتل کیا؛ اس کے علاوہ کسی کو آپ نے اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کیا؛ اور فرمایا:

''بروز قیامت سب سے زیادہ سخت عذاب اس انسان کو ہوگا جس نے کسی نبی کو قتل کیا ہو یا پھر اسے کسی نبی نے قتل کیا ہو۔'' [مسند أحمد ٥/ ٣٣٢؛ تحقيق أحمد شاكر]

رسول اللہ ﷺ نے اپنے بیٹے کا نام ابراہیم رکھا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے بیٹوں کے نام ابوبکر و عمر رکھے۔

خلاصۂ کلام! اسم علم کافر اور مسلمان کے مابین مشترک ہوتا ہے۔ جیسا کہ یہود و نصاری بھی ابراہیم' موسیٰ' اسحق اور یعقوب نام رکھتے ہیں۔ اور مسلمان بھی یہ نام رکھتے ہیں۔ کافر کا کوئی نام رکھ لینے میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی وجہ سے اس نام کو سرے سے ترک کر دینا واجب ہوتا ہو۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ صحابہ کرام کافر تھے- العیاذ باللہ- جیسا کہ یہ لعنتی بہتان تراش بکواس بکتے ہیں؛ تو پھر بھی ان اسماء میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کی وجہ سے ان ناموں کا ترک کرنا واجب ہوتا ہو' بلکہ یہ جہالت اور تعصب کی انتہا ہے۔

❀ اگر یہ کہا جائے کہ یہ لوگ ان اسماء سے اس لیے نفرت کرتے ہیں کہ ان کا مسمیٰ اہل سنت ہے۔

❀ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: یہ لوگ انسان کا مذہب جانتے ہوئے بھی اسے اس نام سے مخاطب نہیں کرتے۔ بلکہ اسے کوئی دوسرا نام دیتے ہیں۔ ایسا ان اسماء سے انتہائی نفرت کی وجہ سے کرتے ہیں۔ ان کے تعصب اور جہالت کی انتہاء یہ ہے کہ جب کسی ایسے انسان کو دیکھتے ہیں جس کا نام علی' یا جعفر یا حسن' یا حسین ہو تو اس کی عزت و احترام پیش پیش رہتے ہیں۔ حالانکہ ایسا انسان کبھی تو بالکل فاسق و فاجر ہوتا ہے' اور کبھی وہ اہل سنت ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اہل سنت والجماعت یہ نام رکھتے ہیں۔ ان کی یہ تمام تر حرکات انتہائی تعصب اور جہالت کی وجہ سے ہیں۔

۵۔ ان کے تعصب اور جہالت کی انتہاء یہ ہے کہ رافضی تمام بنوامیہ سے نفرت کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں بعض لوگ ایسے تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے تھے۔

حالانکہ بنوامیہ میں بہت سارے نیکوکار صالحین بھی تھے جو کہ فتنہ کا دور شروع ہونے سے پہلے ہی انتقال کر گئے تھے۔ بنوامیہ وہ لوگ تھے جن میں سے نبی کریم ﷺ کے عمال سب سے زیادہ تھے۔ جب سرور کائنات ﷺ نے مکہ مکرمہ فتح کیا تو:

ا۔ عتاب بن اُسید بن ابوالعاص بن امیہ اموی رضی اللہ عنہ کو حاکم مکہ مقرر کیا؛ جو کہ روئے زمین کا سب سے محترم گوشہ ہے۔ ❷

❶ البخاري ٦/ ١٧٥ ؛ كتاب التفسير ؛ سورة لم يكن ......برواية أنس بن مالك

❷ سنن نسائی، کتاب الاذان، باب کیف الاذان(ح:٦٣٣)، سنن ابن ماجۃ۔ کتاب الاذان۔ باب الترجیع فی الاذان(ح:٧٠٨)، و کتاب التجارات، باب النهی عن بیع ما لیس عندك (ح:٢١٨٩)۔

۲۔ خالد بن سعید بن العاص اموی رضی اللہ عنہ کو صنعاء یمن اور بنی مذحج سے صدقات وصول کرنے پر عامل مقرر کیا تھا۔آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک اسی منصب پر فائز رہے۔

۳۔ اس کے دونوں بھائیوں حضرت ابان بن سعید ابن العاص رضی اللہ عنہ اور سعید بن سعید رضی اللہ عنہ کو دوسرے اعمال[تیماء؛ خیبر؛ اور عرینہ کی بستیوں] پر عامل مقرر فرمایا تھا۔

۴۔ ابان بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو پہلے بعض سرایا پر امیر مقرر کیا اور پھر آپ کو بحرین کا والی مقرر کیا۔آپ حضرت العلاء الحضرمی رضی اللہ عنہ کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک اس منصب پر فائز رہے۔

۵۔ ابوسفیان بن حرب بن امیہ اموی رضی اللہ عنہ اور اس کے بیٹے حضرت یزید رضی اللہ عنہ کو نجران کا عامل مقرر فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو یہ لوگ اسی منصب و ذمہ داری پر تھے۔

ایسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو امیہ سے سسرالی رشتہ قائم کرتے ہوئے اپنی تین بیٹیاں بنوامیہ کو بیاہ کر دیں۔سب سے بڑی بیٹی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی شادی ابوالعاص بن ربیع بن امیہ بن عبد شمس سے کردی۔اور جب حضرت علی رضی اللہ عنہ ابو جہل کی بیٹی سے شادی کا ارادہ کیا تو آپ نے اپنے اس داماد کا ذکر کرتے ہوئے اس کی تعریف کی ؛اور فرمایا:

''اس نے جب بھی مجھ سے بات کی تو سچ بولا'اور جب بھی مجھ سے وعدہ کیا تو اسے پورا کیا۔''❶

اپنی دو بیٹیوں کا نکاح یکے بعد دیگر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے کردیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک فرمادیا تھا:''اگر میرے پاس تیسری بیٹی ہوتی تو میں وہ بھی عثمان رضی اللہ عنہ کو دے دیتا۔''❷

۶۔ ایسے ہی ان لوگوں کے تعصب اور جہالت کی انتہاء یہ ہے کہ اہل شام سے صرف اس لیے بغض ونفرت رکھتے ہیں کہ ان میں وہ پہلا انسان تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتا تھا۔یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ مکہ میں کفار بھی تھے اور اہل ایمان بھی۔یہی حال مدینہ کا بھی تھا کہ وہاں پر اہل ایمان اور منافقین دونوں پائے جاتے تھے۔اس دور میں تو شام میں کوئی ایک بھی ایسا باقی نہیں ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتا ہو؛ یا اس کا اظہار کرتا ہو۔مگر ان کی شدت جہالت کی وجہ سے بغض ونفرت کی دُم ان کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔

۷۔ ان کی جہالت اور تعصب کی انتہاء یہ ہے کہ رافضی ان لوگوں کی انتہائی سخت مذمت کرتے ہیں جو بنی امیہ کے آثار سے فائدہ حاصل کریں؛ مثلاً اگر کوئی نہر یزید سے پانی پی لے۔حالانکہ یہ نہر یزید نے نہیں کھدوائی بلکہ اس نے اس نہر میں فقط توسیع کی ہے۔ایسے ہی بنوامیہ کی تعمیر کی کردہ جامع مسجد اموی میں نماز نہیں پڑھتے۔حالانکہ رسول

❶ من حديث مسور بن مخرمة ؛ البخاري ٣/ ١٩٠ ؛ كتاب الشروط ؛ باب الشروط في المهر عند عقد النكاح ؛ باب ٤/ ١٩٠٢ ؛ كتاب النكاح باب ما يكره أن يجمع بينهن من النساء. سنن الترمذي ٥/ ٣٥٩ ؛ كتاب المناقب باب ما جاء في فضل فاطمة رضي الله عنها.

❷ رواه أحمد في الفضائل ١/ ٤٨١ ؛ مجمع الزوائد ٩/ ٨٣. قال المحقق ضعيف الإسناد للإرسال.

اللہ ﷺ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ اور اس وقت کی تعمیر کعبہ مشرکین کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ ایسے ہی آپ ﷺ کفار کے بنائے ہوئے گھروں میں بھی رہتے تھے۔ ان چشموں سے پانی پیا کرتے تھے جو کفار نے کھودے ہوتے۔ ان کے تیار کردہ لباس پہنتے۔ ان کے تیار کردہ دراہم سے لین دین کرتے۔ جب یہ حال تھا کہ رسول اللہ ﷺ ان کے گھروں سے استفادہ کررہے ہیں' ان کے تیار کردہ لباس' جاری کردہ چشمہ'اور بنائی گئی مساجد سے فائدہ حاصل کرتے تھے تو پھر اہل قبلہ کا کیا عالم ہوگا۔

اگر فرض کرلیا جائے کہ یزید کافر تھا؛ اور اس نے نہر کھودی؛ تو مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اس نہر سے پانی پینا مکروہ نہیں۔ مگر یہ لوگ اپنے انتہائی تعصب کی وجہ سے ان لوگوں کی طرف منسوب چیزوں کو استعمال کرنا حرام سمجھتے ہیں جن سے یہ لوگ بغض ونفرت رکھتے ہیں۔

❀ ہم سے ایک ثقہ آدمی نے بیان کیا ہے کہ کسی ایک رافضی کے پاس ایک کتا تھا؛ ان ہی میں سے ایک دوسرے رافضی نے اسے بکیر کہہ کر بلایا تو اس پر رافضی نے لڑنا شروع کر دیا کہ: ''تم جہنمیوں کے نام پر ہمارے کتے کا نام رکھتے ہو۔'' اور بات خون خرابے تک جا پہنچی۔'' تو پھر کیا ان رافضیوں سے بڑا جاہل کوئی دوسرا ہوسکتا ہے؟

❀ نبی کریم ﷺ اپنے بعض صحابہ کرام کو وہ نام دیتے تھے جو کہ اس سے پہلے جہنمی لوگوں کے نام ہوگزرے ہیں۔ جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بھی کیا۔ [جیسا کہ ولید بن مغیرہ؛ لوگوں میں سب سے بڑا کافر تھا]۔ قرآن میں وارد لفظ ''وحید'' سے یہی مراد ہے:

﴿ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا﴾ (المدثر ۱۱)

''چھوڑ دو مجھے اور اس شخص کو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا۔''

اس کے بیٹے کا نام بھی ولید تھا' اور نبی کریم ﷺ نماز میں ان دونوں باپ بیٹے کا نام لیتے؛ اور قنوت میں یوں دعا فرمایا کرتے تھے:

((اللهم أنج وليد بن وليد بن المغيرة .)) [البخاری ٦/ ٤٨]

''اے اللہ! ولید بن ولید بن مغیرہ کو نجات عطا فرما۔''

جیسا کہ دیگر صحیح روایات میں بھی ثابت ہے۔

۸۔ ان لوگوں کی جہالت کی انتہاء یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ دن یوم عاشوراء کا روزہ نہیں رکھتے بلکہ اس دن افطار کو افضل سمجھتے ہیں۔ حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو یہودیوں کو یوم عاشورا کا روزہ رکھتے ہوئے پایا یہودیوں نے بتایا کہ یہ بہت بڑا دن ہے اسی دن اللہ نے موسیٰ کو نجات دے کر فرعونیوں کو غرق کیا تھا تو شکرانہ کے طور پر موسیٰ نے اس دن روزہ رکھا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں ان سب میں موسیٰ علیہ السلام کے

زیادہ قریب ہوں لہٰذا آپ نے اس کا روزہ رکھا اور دوسروں کو رکھنے کا حکم دیا۔'' ❶

۹۔ ان لوگوں کی جہالت اور تعصب کی حد یہ ہے کہ: یہ بے زبان چوپائے کو پکڑ کر بلاوجہ عذاب دیتے ہیں؛ اور اسے ان لوگوں کی طرح تصور کرتے ہیں جن سے یہ نفرت رکھتے ہیں۔ مثلاً: سرخ رنگ کی دنبی پکڑ کر اس کا نام عائشہ رکھتے ہیں اور پھر اس کے بال نوچ کر اسے تکلیف دیتے ہیں۔ اور کسی چوپائے کو پکڑ کر اس کا نام ابوبکر یا عمر رکھتے ہیں اور پھر اسے ناحق اور بلاوجہ مارتے ہیں۔ اور پھر گھی بھری مشک کو حضرت عمر سے تشبیہ دیکر درمیان سے تیز دھار چیز سے پھاڑتے ہیں۔ اور یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ حضرت عمر کا گوشت کھا رہے ہیں اور ان کا خون پی رہے ہیں۔

دوسری بات: ...... جواب کے اس دوسرے مرحلہ میں ہم کہتے ہیں: ائمہ اہل اسلام کا طریق کار یہ ہے کہ مشروع چیز کو اہل بدعت رافضہ یا کسی بھی دوسرے کے افعال کی وجہ سے ترک نہیں کیا جائے گا۔ تمام ائمہ کے ہاں مسلمہ اصول اس کے موافق ہیں۔ ان ہی میں سے ایک تسطیح [سطح برابر کرنے] کا مسئلہ بھی ہے جس کا رافضی مصنف نے ذکر کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ کا مذہب یہ ہے کہ قبر کو تھوڑا سا اونچا کیا جائے۔ جیسا کہ صحیح روایات میں ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی سطح اونچی تھی۔ ❷ اس لیے کہ ایسا کرنا دنیاوی عمارتوں کی مشابہت سے بہت دور ہوتا ہے۔ اور قبروں پر بیٹھنے سے منع کرنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ قبروں کی سطح کو بالکل برابر کیا جائے۔ اس لیے کہ حدیث میں قبروں کو برابر کرنے کا حکم آیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ قبر کو زمین کو برابر کر دیا جائے۔ ❸ پھر بعض نے کہا کہ: یہ رافضیوں کا شعار ہونے کی وجہ سے مکروہ ہے۔ جب کہ دوسرے اہل علم حضرات نے اس کی مخالفت کی اور فرمایا: ''ایسا کرنا ہی مستحب ہے؛ بھلے رافضی اسے اپنا شعار بنالیں۔''

❀ ایسے ہی جہری بسم اللہ پڑھنا رافضیوں کا شعار ہے۔ اسی وجہ سے اور دعائے قنوت کی بعض لوگوں نے امام شافعی رحمہ اللہ پر تنقید بھی کی ہے۔ اور اسے قدریہ اور رافضہ کا عقیدہ و مسلک بتایا ہے۔ اس لیے کہ عراق میں مشہور تھا کہ جہری بسم اللہ رافضیوں کا شعار ہے۔ یہاں تک کہ امام سفیان ثوری اور دوسرے ائمہ کے عقیدہ میں جہری بسم اللہ کا ترک کرنا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ ان لوگوں کے نزدیک یہ رافضیوں کا شعار تھا۔ جیسا کہ ان سے موزوں پر مسح کرنے کا ذکر نقل کیا جاتا ہے' اس لیے کہ موزے پر مسح ترک کرنا رافضیوں کا شعار تھا۔ مگر اس کے باوجود جب امام شافعی رحمہ اللہ نے دیکھا کہ یہ سنت ہے' تو آپ نے اسے اپنا مذہب بنالیا۔ اگرچہ یہ رافضی عقیدہ کے موافق ہی

---

❶ البخاري: ۳/ ٤٤ ، کتاب الصوم، باب صیام یوم عاشورا؛ مسلم: ۲/ ۷۹۵؛ کتاب الصیام، باب صوم یوم عاشورا؛ سنن ابن ماجه: ۱/ ۵۵۲ ؛ کتاب الصیام، باب صیام یوم عاشورا . وأما حدیث أبي موسی فهو في البخاري ومسلم في کتاب الصوم منهما ؛ وهذا لفظ مسلم: ۲/ ۷۹٦ عن أبي موسی رضي الله عنه قال: ان یوم عاشورا یوما تعظمه الیهود وتتخذه عیدا، فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم صوموه أنتم .

❷ البخاری ۲/ ۱۰۳؛ کتاب الجنائز ؛ باب ما جاء في قبر النبی صلی الله علیه وسلم و ابی بکر وعمر رضي الله عنهما۔

❸ المغني لابن قدامة ۲/ ٤۲۰ ؛ أحکام الجنائز للشیخ محمد ناصر الدین الألباني ص ۱۵۳ .

کیوں نہ ہو۔

❀ ایسے ہی اہل عراق کا عقیق سے احرام باندھنا امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک مستحب ہے؛ اگرچہ رافضیوں کا بھی یہی مذہب ہے۔ اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔

❀ امام مالک رحمہ اللہ موزوں پر مسح کی روایت کو ضعیف سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ سے مشہور ہے کہ: حضر میں موزوں پر مسح نہ کیا جائے۔ بھلے یہ رافضیوں کے مذہب کے موافق کیوں نہ ہو۔ ایسے ہی امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ محرم محمل کے سایہ سے استفادہ نہیں کرسکتا۔ بھلے رافضی مذہب بھی اس کے موافق ہی کیوں نہ ہو۔

❀ ایسے ہی امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک ہے کہ زمین کی جنس کے علاوہ کسی دوسری چیز پر سجدہ کرنا مکروہ ہے۔ ایسے ہی رافضی بھی زمین کے علاوہ کسی دوسری چیز پر سجدہ کرنے سے منع کرتے ہیں۔

❀ ایسے ہی امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ حج تمتع کو مستحب اور افضل سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ کے اور دوسرے ائمہ حدیث کے ہاں مستحب یہ ہے کہ: جس انسان نے حج قران یا افراد کا احرام باندھا ہو وہ اسے فسخ کر کے عمرہ سے بدل دے تاکہ اس کا حج حج تمتع ہو جائے۔ اس لیے کہ صحیح احادیث میں اس کی ترغیب آئی ہے۔ سلمہ بن شبیب نے حضرت امام احمد رحمہ اللہ سے پوچھا: اے ابوعبداللہ! آپ نے اہل خراسان کو حج تمتع کا فتوی دیکر رافضیوں کے دلوں کو مضبوط کردیا؛ تو آپ نے فرمایا: اے سلمہ! مجھے آپ کے بارے میں اطلاع ملا کرتی تھی کہ تم بیوقوف ہو؛ اور میں تمہارا دفاع کیا کرتا تھا؛ اور اب میرے نزدیک بھی یہ ثابت ہوگیا کہ تم احمق ہو۔ میرے پاس اس مسئلہ میں گیارہ صحیح احادیث موجود ہیں؛ تو کیا میں ان احادیث کو تمہاری باتوں کی وجہ سے چھوڑ دوں۔''

❀ ایسے ہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی بھی دوسرے؛ جیسے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر درود پڑھنا جائے۔ امام احمد رحمہ اللہ کے کئی ساتھیوں سے بھی یہی نقل کیا گیا ہے۔ اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول سے استدلال کیا ہے کہ آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: ''صلی الله علیك۔'' آپ پر اللہ کی رحمتیں ہوں۔''

آپ کے اکثر اصحاب نے یہی قول اختیار کیا ہے جیسا کہ قاضی ابویعلی؛ ابن عقیل' ابومحمد عبدالقادر الجیلی؛ اور دیگر۔ جب کہ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ اس سے منع کرتے تھے۔ امام احمد رحمہ اللہ کے بعض اصحاب نے یہی مسلک اختیار کیا ہے' اس لیے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا ہے' آپ فرماتے ہیں: ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور پر درود پڑھنا مناسب نہیں۔''

شاید ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول اس وقت کا ہے جب شیعہ نے بطور خاص صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ پر درود پڑھنا شروع کردیا تھا۔ واللہ اعلم۔ وہ اس پر یوں عمل پیرا ہوگئے تھے گویا کہ انہیں حکم دیا گیا ہو کہ باقی لوگوں کو چھوڑ کر بطور خاص صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ پر درود پڑھا کریں۔ ایسا کرنا بالاتفاق غلط ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر درود پڑھنے کا حکم دیا

ہے' اور نبی کریم ﷺ نے اس کی تفسیر اپنی ذات سے اور اپنی آل سے کی ہے۔ پس آپ کی اتباع میں آپ کی آل پر بھی درود پڑھا جائے گا۔

❀ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک آل رسول وہ لوگ ہیں جن پر صدقہ لینا حرام ہے۔

❀ امام أحمد اور امام مالک رحمہما اللہ کے کچھ اصحاب کا مسلک ہے کہ آل محمد سے مراد آپ کی امت ہے۔

❀ صوفیاء کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ: اس سے مراد آپ کی امت کے اولیاء اور نیک لوگ ہیں۔ اس میں تمام اہل ایمان و اہل تقوی شامل ہیں۔ اس متعلق ایک ضعیف حدیث بھی روایت کی گئی ہے جو کہ اصل میں ثابت نہیں ہے۔

❀ کچھ احناف اور دوسرے لوگوں نے کہا ہے: جب انسان کسی ایسی قوم کے پاس ہو' جو باقی تمام صحابہ کو چھوڑ کر بطور خاص صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ پر درود پڑھتے ہوں' اور جب اس نے بھی صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ پر درود پڑھا' اور یہ گمان پیدا ہوگیا کہ یہ بھی انہی لوگوں میں سے ہے؛ تو ایسا کرنا مکروہ ہے تا کہ اس کے رافضی ہونے کا گمان تک پیدا نہ ہو۔ ہاں اگر یہ پتہ چل سکتا ہو کہ اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین پر بھی درود پڑھا ہے تو پھر ایسا کرنے میں کوئی حرج والی بات نہیں۔

❀ تمام ائمہ کرام رحمہم اللہ یہی فرماتے ہیں کہ: اگر کسی مستحب فعل میں فساد کا پہلو راجح ہو تو پھر وہ مستحب نہیں رہتا۔ یہاں سے بعض ان فقہاء نے دلیل لی ہے جو بعض مستحبات کو اس وجہ سے ترک کردیتے ہیں کہ وہ کسی بدعتی فرقہ کے شعار کے طور پر مشہور ہیں۔ [تا کہ اہل بدعت سے ان مشابہت نہ ہو]۔

لیکن ایسی کسی بات کو بنیاد بنا کر کسی واجب کو ہرگز ترک نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ کہا گیا ہے کہ اس کا اظہار کرنے میں رافضیوں سے مشابہت ہوتی ہے۔ اور سنی اور رافضی میں کوئی تمیز باقی نہیں رہتی۔ اور ان سے امتیازیت کی مصلحت ان کی مخالفت اور قطع تعلقی پر مبنی ہے۔ یہ مستحب کی مصلحت سے زیادہ بڑھ کر ہے۔

❀ اس مذہب کے مطابق بعض مواقع پر مستحب کو بجالانے کی ضرورت بھی پیش آتی ہے بھلے میں اس میں روافض کے ساتھ اختلاف اور ان کی مشابہت لازم آتی ہو۔ لیکن یہ ایک عارضی بات ہے؛ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کسی ایسی چیز کو ہمیشہ کے لیے مشروع بنالیا جائے جو کہ اصل میں مشروع نہیں ہے۔ مثال کے طور پر: کفار کا شعار پہننا۔ اگر کوئی چیز ان کا شعار نہ ہو تو اس کا پہننا مباح ہوتا ہے۔ مثلاً پیلا عمامہ پہننا جائز ہے اگر یہ یہود کا شعار نہ ہو۔ اور اگر ان کا شعار ہو تو پھر اس کا پہننا منع ہے۔

فصل: ......خطبہ جمعہ اور خلفائے راشدین کا ذکر

[الـــزام]: رافضی مصنف نے کہا ہے: ''اس کے ساتھ ہی اہل سنت نے بہت ساری بدعات ایجاد کرلیں' اور ان کے بدعت ہونے کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ اور بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''ہر بدعت گمراہی ہے' اور

ہر گمراہی کا ٹھکانہ جہنم کی آگ ہے۔''

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے: ''جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی چیز داخل کی جو اس میں سے نہیں ہے' تو وہ مردود ہے۔''

اگر ان پر رد کیا جائے تو ان کے جی اسے ناپسند کرتے ہیں' اور دل اس سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ جمعہ کے خطبہ میں خلفاء راشدین کا نام لینا۔ حالانکہ بالا جماع رسول اللہ ﷺ کے دور میں ایسا نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی صحابہ اور تابعین کے دور میں ایسا ہوتا تھا۔ نہ ہی بنو امیہ اور کے؛ اور نہ ہی بنو عباس کے شروع کے دور میں۔ بلکہ یہ ایسی بدعت ہے جو کہ منصور نے اس وقت ایجاد کر لی جب اس کے اور علویوں کے مابین فتنہ پیدا ہوا۔ اس وقت اس نے کہا: اللہ کی قسم! میں ان کے ناک خاک میں ملاؤں گا اور ان پر بنی عدی اور بنی تیم کا ذکر بلند کروں گا۔ اس نے خطبہ میں صحابہ کرام کا نام لینا شروع کیا۔ اور یہ بدعت ہمارے اس دور تک جاری ہے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے:

[پہلی بات]: منبر پر خطبہ میں خلفاء راشدین کا ذکر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے دور میں شروع ہوا۔ بلکہ بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں یہ ذکر شروع ہو گیا تھا۔ اس مسئلہ میں ضبہ بن محصن کی روایت مشہور ترین احادیث میں سے ہے۔ طلمنکی نے میمون بن مہران کی حدیث سے روایت کیا ہے؛ وہ کہتے ہیں: حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بصرہ کے والی تھے۔ جب آپ جمعہ کا خطبہ دیتے تو نبی کریم ﷺ پر درود پڑھتے' اور پھر اس کے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے لیے دعا کرتے۔ اس پر ضبہ بن محصن کھڑے ہوئے اور کہا: تو ان سے پہلے ساتھی کا ذکر کہاں گیا جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی افضلیت دیا کرتے تھے۔ اس سے مراد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔

جب کئی بار ایسے ہوا تو حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دربار میں ضبہ بن محصن کی شکایت لکھ بھیجی کہ وہ ہم پر طعنہ زنی کرتا ہے' اور اس قسم کی دیگر حرکات کا ارتکاب کرتا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے خط لکھ کر ضبہ بن محصن کو اپنے دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے انہیں مدینہ بھیج دیا۔

جب ضبہ مدینہ دربار فاروقی میں پہنچے تو آپ کو اطلاع دی گئی کہ ضبہ العنزی دروازے پر اندر آنے کی اجازت طلب کر رہا ہے۔ تو آپ نے اجازت دیدی۔ جب آپ اندر گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ضبہ کو نہ ہی مرحبا اور نہ ہی اھلا [و سھلاً]۔ اس پر ضبہ نے کہا: '' مرحبا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ جب اھلاً؛ تو میرے پاس نہ ہی اہل ہیں اور نہ ہی مال۔ تو پھر آخر کر تم نے مجھے میرے شہر سے لیکر یہاں تک کی تکلیف کیوں دی؛ میں نہ ہی کوئی برا کام کیا تھا اور نہ ہی گناہ؟ تو آپ نے فرمایا: تمہارے مابین اور تمہارے گورنر کے مابین کیا معاملہ پیش آیا؟

تو میں نے کہا: اے امیر المؤمنین! اس بارے میں میں ابھی آپ کو خبر دیتا ہوں۔ جب وہ [حضرت ابوموسی] خطبہ دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور نبی کریم ﷺ پر درود و سلام کے بعد دوبارہ آپ کے لیے دعا کرتا ہے۔ اس کی اس بات

پر مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے اس سے کہا: ''ان کے دوسرے ساتھی کا تذکرہ کہاں ہے جس پر تو انہیں فضیلت دیتا ہے۔ اس پر اس نے آپ کے دربار میں میری شکایت لکھ بھیجی۔

❀ [حضرت ضبہ کہتے ہیں]: پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ پھوٹ کر رونے لگے؛ اور فرمانے لگے: اللہ کی قسم! تم اس کی نسبت زیادہ توفیق دیے گئے اور ہدایت یافتہ ہو۔ کیا آپ میری غلطی مجھے معاف کر دیں گے اللہ تعالیٰ آپ کے گناہ معاف کر دے گا؟ میں نے کہا: اے امیر المؤمنین! اللہ تعالیٰ آپ کے گناہ معاف فرمائے۔ پھر آپ روتے رہے' اور یہ فرماتے رہے:

''اللہ کی قسم! ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ایک دن اور رات عمر اور آل عمر سے بہتر ہیں۔''

کیا میں تمہیں اس دن اور رات کے متعلق نہ بتاؤں؟ میں کہا: اے امیر المؤمنین! ضرور بتایئے۔

❀ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جہاں تک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رات کا تعلق ہے؛ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین کے شر سے بچنے کے لیے ہجرت کرتے ہوئے رات کے وقت نکلے۔ اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے۔ آپ کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے چلتے اور کبھی پیچھے۔ کبھی دائیں جانب چلتے تو کبھی بائیں جانب۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے کہا:

''اے ابوبکر! آج آپ کچھ اوپری سی حرکت کر رہے ہیں؛ ایسا میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا؟''

اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ! جب مجھ خیال آتا ہے کہ دشمن آپ کے آگے گھات لگا کر نہ بیٹھا ہو تو میں آپ کے آگے چلنا شروع کر دیتا ہوں؛ اور جب یہ خیال آتا ہے کہ دشمن آپ کے پیچھے لگا ہوگا تو پھر میں آپ کے پیچھے اور دائیں بائیں چلنا شروع کر دیتا ہوں۔ مجھے آپ کے متعلق خوف محسوس ہوتا ہے۔''

❀ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پاؤں کی انگلیوں پر چلتے رہے۔ یہاں تک کہ جب آپ تھک گئے؛ تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کی تھکاوٹ کو محسوس کر لیا اور آپ کو اپنے کندھے پر اٹھالیا۔ یہاں تک کہ جب غار کے منہ پر پہنچ گئے تو آپ کو نیچے اتارا؛ اور عرض گزار ہوئے: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے! آپ اس وقت تک غار میں داخل نہیں ہونگے جب تک میں غار میں داخل نہ ہو جاؤں۔ اگر غار میں کوئی موذی چیز ہوگی تو وہ آپ سے پہلے مجھے تکلیف دیگی۔ پھر آپ کو غار میں کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جس سے کوئی پریشانی کی توقع کی جاتی ہو؛ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھا کر غار میں داخل کیا۔ غار میں ایک چھوٹا سوراخ تھا جس میں سانپ تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی ایڑی وہاں پر رکھ دی؛ سانپ آپ کی ایڑی کو ڈسنے لگے؛ یہاں تک کہ درد و تکلیف کی شدت سے آپ کے آنسو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گالوں پر گرنے لگے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا: ''اے ابوبکر غم نہ کر! بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔'' تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر اطمینان اور سکون نازل کیا۔'' یہ اس رات

کا قصہ ہے۔

❀ جہاں تک آپ کے دن کا تعلق ہے تو جب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو عرب مرتد ہوگئے۔ ان میں سے بعض کہنے لگے: ہم نماز تو پڑھیں گے مگر زکواۃ نہیں دیں گے۔ اور بعض کہنے لگے: ہم زکوۃ تو دیں گے مگر نماز نہیں پڑھ سکتے۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تاکہ آپ کو نصیحت کروں۔ میں نے عرض کی: اے خلیفہ رسول اللہ! لوگوں کے ساتھ مہربانی کیجیے؛ اور نرمی سے پیش آیئے۔ تو آپ نے مجھے جواب دیا: کیا تم جاہلیت میں تو بڑے سخت تھے' مگر اس میں خواری دیکھا رہے ہو؟ رسول اللہ ﷺ اللہ کے پاس چلے گئے اور وحی کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اللہ کی قسم! اگر لوگ مجھ سے ایک رسی بھی روکیں گے جو رسول اللہ ﷺ کو دیا کرتے تھے؛ تو میں اس پر بھی ان سے جنگ وقتال کروں گا۔''

ہم نے آپ کے ساتھ مل کر جنگیں لڑیں۔ اللہ کی قسم! آپ اس معاملہ میں رشد و ہدایت پر تھے۔ یہ آپ کے دن کا قصہ ہے۔'' پھر آپ نے ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے نام خط لکھ کر انہیں ملامت کی۔ [1]

اگر یہ کہا جائے کہ: اس میں صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے جو کہ زندہ حکمران تھے۔ تو کہا جائے گا کہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو چکا تھا؛ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا تذکرہ بھی کیا جاتا ہے۔

[دوسری بات]:...... بیشک یہ بھی کہا گیا ہے کہ جمعہ کے خطبہ میں خلفاء اربعہ کا تذکرہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے دور میں اس وقت شروع ہوا جب آپ نے دیکھا کہ بعض بنو امیہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گالیاں دیتے ہیں۔ اس کی جگہ پر آپ نے خلفاء اربعہ کا تذکرہ اور ان سے رضامندی کے اظہار کا اعلان و اقرار شروع کیا۔ تاکہ اس بیہودہ طریقہ کا خاتمہ کیا جا سکے۔

[تیسری بات]:...... رافضی نے جو کہا ہے کہ یہ کام منصور نے شروع کیا؛ یہ ایک باطل اور غلط بات ہے۔ اس لیے کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی ولایت بنوامیہ اور منصور سے بہت پہلے تھی۔ اس میں منصور کے لیے کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ آل علی یا کسی اور کی ناک کو نیچا دیکھا سکتا۔ یہ اسی صورت میں ہوسکتا تھا کہ جب بنی تیم یا بنی عدی کے کچھ لوگ بھی آل علی کی طرح خلافت کے طلبگار ہوتے؛ مگر ان میں سے کوئی ایک بھی ان لوگوں سے اس معاملہ میں اختلاف کرنیوالا نہیں تھا۔

[چوتھی بات]:...... اہل سنت والجماعت ہرگز یہ بات نہیں کہتے کہ خطبہ میں خلفاء اربعہ کا ذکر کرنا فرض ہے۔ بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ: صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذکر پر اکتفا کرنا یا پھر بارہ ائمہ کا ذکر کرنا ایسی بدعت منکرہ ہے جس کا ارتکاب آج تک کسی نے نہیں کیا۔ نہ ہی صحابہ کرام نے اور نہ ہی تابعین نے' نہ ہی بنی امیہ نے اور نہ ہی بنوعباس نے۔ جیسا کہ اہل سنت والجماعت یہ بھی کہتے ہیں کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ یا سلف صالحین میں سے کسی دوسرے پر سب وشتم کرنا انتہائی بری بدعت ہے۔ اگر خلفاء اربعہ کا ذکر کرنا بدعت ہے' حالانکہ بہت سارے خلفاء ایسا کرتے رہے ہیں؛ تو پھر صرف حضرت

[1] الرياض النضرة لمحب الطبري ۱/ ۱۰۵۔

علی رضی اللہ عنہ پر اکتفاء کرنا' حالانکہ اس سے پہلے امت میں سے کسی ایک نے بھی ایسے نہیں کیا ؛تو یہ بدعت ہونے کا زیادہ استحقاق رکھتا ہے۔ اور اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے امیر المؤمنین ہونے کی وجہ سے آپ کا ذکر کرنا مستحب ہے تو پھر خلفاء راشدین کا تذکرہ استحباب کا زیادہ حق دار ہے۔لیکن رافضی لوگ ناپ تول میں کمی کرنے والے ہیں۔اہل سنت والجماعت کی آنکھوں میں تنکا تو انہیں نظر آجاتا ہے' مگر اعتراض کرنے والے کو اپنے اندر پورا تنا نظر نہیں آتا۔

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ: خلفاء ثلاثہ پر تمام مسلمانوں کو اتفاق ہوگیا تھا۔ان کے دور تلوار کفار پر آویزاں تھی اور مسلمانوں سے بہت دور تھی۔جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا معاملہ یہ ہے کہ تمام مسلمانوں کا آپ کی بیعت پر اتفاق نہیں ہوسکا۔ بلکہ اس عرصہ میں فتنہ برپا ہوا؛ اس عرصہ میں تلوار کفار سے دور اور مسلمانوں کے سروں پر آویزاں رہی۔پس اس صورت میں صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذکر پر اکتفا کرنا اور آپ سے پہلے کے ان خلفاء ثلاثہ کا ذکر کردینا جن پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہوگیا تھا؛ اور وہ اپنے دشمنوں پر کامیاب ومنصور رہے تھے ؛ اور صرف اس امام کا ذکر کرنا جس کے دور میں مسلمانوں میں افتراق پیدا ہوگیا اور دشمن ان کے علاقوں کو للچائی نظروں سے دیکھنے لگا؛[یہ بوالعجبی ہے]۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کے مابین فتنہ وافتراق کے اس دور میں بلاد شام اور خراسان کے کفار بلاد مسلمین کو للچائی نظروں سے دیکھنے لگے۔اس لیے کہ مسلمان آپس میں مشغول ہوگئے۔تو اب کیا باقی تمام خلفاء کا ذکر ترک کر کے صرف ایک ایسے خلیفہ کا ذکر کیا جائے جنہیں نہ تو پوری خلافت مل سکی اور نہ ہی مقصود خلافت حاصل ہوا۔

یہی چیز ان لوگوں کی دلیل تھی جو چوتھے خلیفہ کے طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بجائے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا نام لیا کرتے تھے۔جیسا کہ اندلس میں اور بعض دوسری جگہوں پر کیا جاتا تھا۔ان کا کہنا یہ تھا کہ: چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے برعکس حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر تمام لوگوں کا اجماع ہوگیا تھا؛[اس لیے ان کا نام بطور خلیفہ چہارم لیا جاتا ہے]۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ان لوگوں کا یہ نظریہ غلط ہے؛ لیکن ان سے بڑھ کر وہ لوگ غلطی پر ہیں جو خلفاء ثلاثہ کو چھوڑ کر صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذکر پر اکتفاء کرتے ہیں۔اور ان سب سے بڑھ کر وہ لوگ غلطی پر ہیں جو خطبہ میں یا دوسرے مواقع پر بارہ ائمہ کا ذکر کرتے ہیں ؛ یہ دیواروں پر ان کے نام کا نقش بناتے ہیں یا پھر میت کو اس کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ ایسی برائی اور بدعت ہے کہ دین اسلام میں اس کا انتہائی بری بدعت ہونا اضطراری طور پر معلوم ہے۔

اگر خطیب ان چاروں خلفاء کا ذکر کرنا چھوڑ دے تو اس پر انکار نہیں کیا جاسکتا۔ انکار اس بات پر ہے کہ ان سابقہ تین خلفاء کو؛ جن کی خلافت زیادہ کامل تھی؛ اور سیرت کے لحاظ سے بھی وہ افضل تھے؛ انہیں چھوڑ کر صرف ایک کے ذکر اکتفاء کیا جائے۔جیسا کہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ذکر کرنے پر انکار کیا گیا۔حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس وقت زندہ سلطان اور موجود خلیفہ تھے۔

[پانچویں بات]:......اہل سنت والجماعت کے تمام خطباء خطبہ میں خلفاء اربعہ کا ذکر نہیں کرتے۔ بلکہ مغرب میں اور بعض دوسرے شہروں میں بہت سارے خطباء ایسے ہیں جو کہ خطبہ میں نام لیکر کسی ایک خلیفہ کا تذکرہ بھی نہیں کرتے۔

اور مغرب میں بہت سارے خطباء ایسے بھی تھے جو کہ حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے بعد چوتھے خلیفہ کے طور پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا نام لیا کرتے تھے؛ حضرت علی کا نام نہیں لیتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ان باقی خلفاء کی خلافت پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہو گیا تھا جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اجماع نہیں ہوا۔

❀ پس اگر خلفاء کا نام لیکر ان کا ذکر کرنا اچھی بات ہے تو بعض اہل سنت والجماعت ایسا کرتے ہیں۔ اور اگر ایسا کرنا اچھی بات نہیں ہے تو پھر بھی بعض اہل سنت ایسا نہیں کرتے۔ جو بھی صورت حال ہو' حق اہل سنت سے باہر نہیں ہو سکتا۔

[چھٹی بات]:......جن لوگوں نے جمعہ میں منبر پر خلفاء راشدین کا نام لینا شروع کیا؛ انہوں نے اس بدلہ کے طور پر ایسا کیا کہ بعض لوگ ان پر تنقید اور سب وشتم کرتے تھے۔ ایسا کرنے میں اسلام میں جو فساد پیدا ہو گیا تھا وہ کسی پر بھی مخفی نہیں ہے۔ پس اس کے بجائے اعلانیہ ان کا ذکر خیر اور مدح سرائی کی جانے لگی؛ تا کہ ان سے موالات اور دوستی کے اظہار اور ان کی مدح و توصیف کے بیان سے اسلام کی حفاظت کی جائے۔ کیونکہ صحیح احادیث میں ثابت ہے کہ خلفاء راشدین کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

((علیکم بسنتي و سنة خلفاء الراشدین المهديين من بعدي تمسكوا بها و عضوا عليها بالنواجذ . و إيّاكم ومحدثات الأمور؛ فإن كل بدعة ضلالة)) [1]

''تم پر میری سنت اور میرے بعد میرے ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت لازم ہے۔ اس کے ساتھ چمٹے رہو' اور اسے اپنے کچلی کے دانتوں سے مضبوطی سے پکڑ لو۔ خبردار! اپنے آپ کو نئے کاموں سے بچا کر رکھنا؛ اس لیے کہ ہر بدعت گمراہی ہے۔''

❀ ان کی خلافت کی احادیث بہت زیادہ ہیں۔ جب بنو امیہ میں ایسے لوگ پائے جاتے تھے جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گالی دیا کرتے اور آپ کی مذمت کیا کرتے تھے؛ اور یہ کہتے کہ: آپ خلفاء راشدین میں سے نہیں ہے۔ تو پھر ان لوگوں کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ مسند خلافت پر متمکن ہوئے۔ آپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ: سب سے پہلے آپ نے برسر منبر خلفاء اربعہ کا نام لینا شروع کیا؛ ان سے موالات کا اظہار کیا؛ ان کی مدح سرائی کی اور فضائل بیان کئے۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے والوں کا ایک گروہ اس بات کو پسند نہیں کرتا تھا۔ خوارج حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے بغض رکھتے تھے اور انہیں کافر کہتے تھے۔ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ ساتھ ان دونوں حضرات کا ذکرِ خیر کرنے میں ان خوارج پر بھی رد تھا جن سے قتال کرنے کا حکم رسول اللہ ﷺ نے دیا تھا۔

[1] سنن أبي داؤد ٤/ ٢٨٠؛ كتاب العلم، باب الأخذ بالسنة؛ سنن ابن ماجه: ١/ ١٥؛ المقدمة، باب في اتباع سنة الخلفاء الراشدين المهديين؛ سنن الدارمي: ١/ ٤٤؛ المقدمة، باب اتباع السنة؛ المسند ط . الحلبي: ٤/ ١٢٦، ١٢٧، وصححه الشيخ الألباني في صحيح الجامع الصغير: ٢/ ٣٤٦.

❀ روافض ان سب لوگوں سے بڑھ کر برے ہیں ؛ یہ لوگ حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین سے بغض رکھتے ہیں اور ان پر سب شتم کا اظہار کرتے ہیں ۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان حضرات کو کافر تک کہتے ہیں ۔ پس منبر پر ان لوگوں کا ذکر کرنے اور ان کے فضائل بیان کرنے میں ان رافضہ پر رد تھا۔

جب ان لوگوں کو خدابندہ بادشاہ کے ملک میں ؛ جس کے لیے اس رافضی مصنف [ابن مطہر] نے یہ کتاب ''[منہاج الکرامہ]'' لکھی ہے ؛ پذیرائی مل گئی تو ان لوگوں نے چاہا کہ اپنے مذہب کا اظہار کریں اور اہل سنت والجماعت کے حق مذہب کو نیچا دیکھائیں ۔ اور انہوں نے اس فتنہ کو پہلی ترجیح دی ۔ اس لیے ان لوگوں نے بدعات کی لگام کھلی چھوڑ دی ؛ اور وہ شر و فساد اور فتنہ پیدا کرنے کے درپے ہو گئے جس کی صحیح حقیقت کو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے ۔ اس غرض کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے بعض اہل سنت والجماعت کی طرف منسوب لوگوں سے منبر پر خلفاء راشدین کا تذکرہ کرنے کے بارے میں فتوی لیا کہ کیا ایسا کرنا واجب ہے ۔ پس فتوی دینے والوں میں سے بعض نے ان لوگوں کے شر سے خوف کی بنا پر اپنی جان بچاتے ہوئے اور بعض لوگوں نے جہالت کی بنا پر فتوی دیدیا کہ ایسا کرنا واجب نہیں ۔

❀ ان لوگوں کا مقصد یہ تھا کہ منبروں پر خلفاء راشدین کا تذکرہ بند کروایا جائے ۔ اس کے بجائے انہوں نے اپنے گمان کے مطابق گیارہ معصومین میں سے ایک جناب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تذکرہ کرنا اور ان کے فضائل بیان کرنا شروع کر دیے ۔

❀ پس جب مفتی کو یہ معلوم ہو جائے کا سائل کا مقصود یہ ہے کہ اس فتوی سے :

۱۔ خلفاء راشدین کا ذکر ترک کر کے ان کی جگہ [خودساختہ] بارہ ائمہ کا ذکر کیا جائے ۔

۲۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کیساتھ منقول اذان کو ختم کر کے اس کی جگہ حي علی خیر العمل کی نداء لگائی جائے ۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت صحیح احادیث کی قرأت کو روک کر اس کی جگہ اپنی طرف سے من گھڑت اور خود ساختہ قصوں کہانیوں کو جگہ دی جائے ۔

۴۔ دین اسلام کے معلوم اور ثابت شدہ شرائع کو باطل قرار دیا جائے ۔ اور ان کی جگہ خود ساختہ اور گمراہ کن بدعات کو جگہ دی جائے ۔

۵۔ اور لوگ اس فتوی کو ملاحدہ کے دین کے اظہار کے لیے ایک وسیلہ بنالیں' وہ ملاحدہ کو باطن میں فلاسفہ کا مذہب چھپائے ہیں اور دین اسلام کا اظہار کرتے ہیں ؛ جو کہ یہود و نصاری سے بڑے کافر ہیں ۔

۶۔ یا ان کے علاوہ جہالت و ظلم اور دروغ گوئی پر مشتمل کچھ اور مقاصد ہوں جن سے مقصود اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنا اور چالیں چلنا ہو ۔ تو پھر اس صورت میں :

''مفتی کیلئے حلال نہیں ہے کہ وہ کوئی ایسا فتوی دے جس سے مذکورہ بالا شرور و فساد میں سے کوئی شر پیدا ہو سکتا

ہو۔''

❀ جب ایسے احوال میں خلفاء راشدین کا ذکر کرنے سے ماموربہ مقاصد حاصل ہوسکتے تھے؛ تو پھر ان کا تذکرہ کرنا ایسے احوال میں ماموربہ ہوجاتا ہے۔ اگرچہ یہ تذکرہ مطلق واجبات میں سے نہیں ہے۔ اوران نہ ہی ان سنن میں سے ہے جن پر ہر حال میں اور ہر دور اور ہر جگہ پر حفاظت کی جائے۔

جیسا کہ اگر کفار کے لشکر کا کوئی شعار اور خاص علامت ہو' اور مسلمانوں کے لشکر کا بھی کوئی خاص شعار ہوتو پھر اس صورت میں کفار کے شعار کے برعکس مسلمانوں کے شعار کا اظہار کرنا واجب ہوجاتا ہے۔ ایسا ہرگزنہیں کہ یہ بات ہر جگہ اور ہر دور میں واجب ہے۔

اگر یہ بات مان لی جائے کہ واجبات شریعت خلفاء راشدین کا ذکر کئے بغیر قائم نہیں ہوسکتے؛ اور یہ کہ اگر ان کا تذکرہ ترک کردیا جائے تو اہل بدعت وضلال کو اپنے شعار کا اظہار کرنے کا موقع مل جائے گا؛ تو پھر ایسے احوال میں خلفاء راشدین کا برسرمنبر تذکرہ کرنا واجب ہوجاتا ہے۔

ماموربہ امور میں سے کچھ واجب ہوتے ہیں' یا ہمیشہ کے لیے مسنون ہوتے ہیں؛ جیسے کہ پانچ نمازیں؛ اور وتر؛ فجر کی دوسنتیں وغیرہ۔ اور کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کا حکم بعض احوال میں اس وقت دیا جاتا ہے جب اس کے بغیر واجب کا حصول ممکن نہ ہو' یا پھر اس کے بغیر حرام سے بچنا ممکن نہ ہو۔

[ساتویں بات] : اس کو یہ کہا جائے گا کہ: جب منبر پر خلفاء راشدین کے ذکر' یا سلطان وقت کے لیے دعاء' یا اس طرح کے دیگر امور میں جب وہ اہل علم والدین علماء کلام کریں جو کہ شرعی دلائل کی روشنی میں ہی بات کرتے ہیں' تو ان کا کلام مقبول ہوتا ہے؛ اور ان میں سے حق بات کو پالینے والے کے لیے دوہرا اجر ہوتا ہے۔ اور خطاء کار کی خطاء وغلطی معاف ہوتی ہے۔

❀ یہ علیحدہ بات ہے کہ کوئی انسان ان پر تو اعتراض شروع کردے لیکن خود اس سے بھی بڑا شر وفساد پھیلانا چاہتا ہو؛ جیسا کہ ابن تومرت کا گروہ ؛ جوکہ اس کے مہدی ہونے پر ایمان رکھتے تھے۔ اور اسے امام معصوم گردانتے تھے۔ جب اس کا نام بھی منبر پر لیا جانے لگا اور اس کی ایسی صفات بیان کی جانے لگیں جن کا باطل ہونا معلوم شدہ تھا ۔ یہ لوگ اپنے جماعت کے افراد کو خواص امتِ محمد قرار دیتے تھے۔ ان لوگوں نے حضرت ابوبکر وعمر وعثمان و علی رضی اللہ عنہم اجمعین ان خلفاء راشدین ؛ اور ائمہ رشد وہدایت کا تذکرہ کرنا بند کردیا تھا جن کے اس امت کے بہترین افراد ہونے پر کتاب وسنت اور سابقین اولین صحابہ اور تابعین کرام کے کلام سے دلائل موجود ہیں۔ خلفاء راشدین ہی وہ ائمہ ہدایت تھے جن کا تعلق علی الاطلاق افضل زمانہ سے تھا۔

❀ پھر یہی تو مرثیہ گروہ یہ کہنے لگے کہ: منبر پر خلفاء راشدین کا ذکر خیر کرنا سنت نہیں بلکہ بدعت ہے۔ حالانکہ یہ انتہائی بودی اور بے کار بات ہے؛ جوکہ واپس ان کے منہ پر مارے جانے کے قابل ہے۔ حالانکہ یہ لوگ اپنے امام ابن

تومرت کے مرجانے کے بعد بھی منبر پر اس کا نام لیا کرتے تھے۔ حالانکہ اللہ [اور اس کے رسول] پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والا اس بات میں ذرا بھر بھی شک و شبہ نہیں کرسکتا کہ حضرات خلفاء ابوبکر و عمر و عثمان اور علی رضی اللہ عنہم اجمعین اس سے بہت بہتر اور افضل تھے۔ اور وہ اتباع نبوت اور تعمیل احکام میں زیادہ اکمل تھے۔ بلکہ خلفاء بنو امیہ اور بنو عباس میں سے کسی ایک ذکرِ خیر کرنا مہدی کا لقب اختیار کرنے والے اس ابن تومرت کا ذکر کرنے سے بہت بہتر تھا اور زیادہ استحقاق رکھتا تھا۔ اس لیے کہ ان لوگوں کی خلافت ابن تومرت کی خلافت سے بہت بہتر تھی۔ اور ان کا اسلام کو قائم کرنا اس کی نسبت بہت بہتر تھا۔ اور انہیں زمین کے مشرق و مغرب میں اس سے بڑھ کر غلبہ اور پذیرائی حاصل تھے۔ اور ان لوگوں نے اس سے بڑھ کر خیر و بھلائی کے کام کئے تھے۔ اور اس نے جھوٹ، ظلم، جہالت اور شر کے وہ کام کئے جو کہ باقی لوگ نہ کر سکے۔ تو پھر ان دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر یہ انسان کیسے مہدی ہوسکتا ہے؟ یا پھر باقی خلفاء کو چھوڑ کر اس کا نام لینا اور جمعہ کے خطبہ میں اس کا تذکرہ کرنا کیسے مشروع ہوسکتا ہے؟ اور جو اس کا نام لینے والے ہیں، وہ دوسرے لوگوں پر کیسے کوئی اعتراض کر سکتے ہیں؟

❀ ان سے بڑھ کر بودا اور بے کار اعتراض امامیہ کا ہے؛ جو کہ خلفاء راشدین کے تذکرہ پر اعتراض کرتے ہیں لیکن خود بارہ ائمہ کا نام لیتے اور ان کا ذکر کرتے ہیں۔ حالانکہ خلفاء ثلاثہ میں سے ہر ایک ان بارہ ائمہ سے بہتر اور افضل ہے۔ اور ان کی خلافت و امامت زیادہ اکمل ہے۔ جب کہ بارہ ائمہ کی مختلف اصناف ہیں۔ جن میں سے کچھ تو وہ صحابہ ہیں جن کے اہل جنت ہونے کی شہادت دی گئی ہے؛ جیسا کہ حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما۔ اور ان کے علاوہ بھی سابقین اولین میں سے بہت سارے لوگ ہیں جو کہ ان دونوں سے افضل؛ مثلاً: اہل بدر۔

❀ یہ دونوں حضرات اگر چہ اہل جنت نوجوانوں کے سردار ہیں؛ تو اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما جنتی بوڑھوں کے سردار ہیں۔ یہ صنف پہلی صنف سے زیادہ کامل ہے۔

❀ اگر یہ کہا جائے کہ: یہ دونوں حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کے لخت جگر ہونے کی وجہ سے افضل ہیں۔

[جواب]: تو ان سے کہا جائے گا: حضرت علی رضی اللہ عنہ اہل سنت والجماعت اور شیعہ کے نزدیک بالاتفاق ان دونوں حضرات سے افضل ہیں، وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کے لخت جگر نہیں [بلکہ ان کے شوہر ہیں]۔

❀ حضرت ابراہیم بن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان دونوں حضرات کی نسبت زیادہ قربت کا تعلق ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ سابقین اولین سے افضل نہ تھے۔ ایسے ہی حضرت امامہ بنت ابی العاص رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی بھی ہیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ایک بیٹا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نواسہ تھا۔

❀ اگر یہ کہا جائے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد ہیں [اس وجہ سے افضل ہیں]۔

[جواب]: تو ان سے کہا جائے گا کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچاؤں اور چچا زادوں کی ایک جماعت اہل ایمان اور صحابہ کرام میں سے تھے۔ جیسا کہ حضرت حمزہ، عبداللہ و فضل پسران عباس؛ ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہم اجمعین۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں۔ اور حضرت علی اور جعفر رضی اللہ عنہما دوسرے چچا زادوں سے افضل ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عباس سے افضل ہیں۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ فضیلت ایمان اور تقوی کی بنیاد پر ہوتی ہے حسب و نسب کی بنیاد پر نہیں ہوتی۔

❀ ان بارہ ائمہ میں کچھ ایسے بھی تھے جو کہ علم و فضل اور دینداری میں شہرت رکھتے تھے؛ جیسے حضرت علی بن الحسین' ان کا بیٹا ابوجعفر؛ ان کا بیٹا جعفر بن محمد رحمہ اللہ علیہم؛ ان لوگوں کا بھی وہی حکم ہے جو دوسرے اہل علم و فضل کا ہے۔ امت محمد میں خلقت کی بہت بڑی تعداد ان کی ہم مثل بھی ہیں اور ان سے افضل بھی۔ اور ان بارہ ائمہ میں ایسا منتظر بھی ہے جس کا اصل میں سرے سے کوئی وجود ہی نہیں' اور نہ ہی اس سے کسی کو کوئی فائدہ حاصل ہوا۔ ایسے لوگوں کی اتباع صرف شر ہی شر ہے؛ جس میں کوئی خیر نہیں۔

❀ جب کہ ان کے علاوہ جتنے بھی بنی ہاشم ہیں خواہ علوی ہوں یا عباسی؛ ان میں بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو علم و فضل اور دینداری میں ان کے برابر ہیں؛ بلکہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ان ائمہ سے بڑھ کر اہل علم و دین ہیں۔ تو پھر خلفاء راشدین کے ذکر پر کیسے عیب لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام میں ان سے افضل کوئی دوسرا نہیں۔ اور پھر ان کے بجائے مسلمانوں میں ایسے لوگوں کا ذکر کیا جاتا ہے جن سے بڑھ کر اہل علم و دین اور افضل دوسرے مسلمان بھی موجود ہیں۔ اور ان سے مسلمانوں ان ائمہ کی نسبت کئی گنا بڑھ کر دینی اور دنیاوی فائدہ بھی حاصل کیا ہے۔ ان لوگوں کا تو مقصد صرف یہ ہے کہ ائمہ اثنا عشریہ کا ذکر کرکے باقی تمام مسلمانوں سے اختلاف اور ان سے دشمنی کا اظہار کیا جائے اور یہ لوگ اپنے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے کفار و منافقین تک سے مدد حاصل کرتے ہیں تاکہ اللہ کے روشن کردہ چراغ کو بجھا سکیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے پیغام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین حق کی شمع گل کرسکیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اس کا یہ دین باقی تمام ادیان پر غالب آ کر رہے گا۔ یہ لوگ دین میں زندیقیت اور الحاد کا دروازہ کھولنا چاہتے ہیں تاکہ منافقین کو بگاڑ پیدا کرنے کے لیے راہ مل سکے۔

فصل:......وضوء میں پاؤں کے مسح کا مسئلہ

[اعتــراض]: رافضی مصنف کہتا ہے: ''اور جیسا کہ پاؤں پر مسح کرنے کے بارے میں کتاب اللہ العزیز میں نص موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَیْدِیَكُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَی الْكَعْبَیْنِ﴾

''تو اپنے منہ کو اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھولو اور اپنے سروں کو مسح کرو؛ اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں تک۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: دو اعضاء کو دھویا جاتا ہے اور دو پر مسح کیا جاتا ہے۔ مگر ان لوگوں نے اس حکم کو بدل ڈالا اور پاؤں دھونے کو واجب قرار دیا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب] : وہ لوگ جنہوں نے نبی کریم ﷺ سے قولاً وفعلاً وضوء نقل کیا' اور آپ ﷺ سے وضوء کرنے کا طریقہ سیکھا' اور آپ کے عہد مبارک میں وضوء کرتے رہے اور رسول اللہ ﷺ انہیں اس طرح کرتے ہوئے دیکھتے اور پھر اس فعل پر برقرار رکھتے ؛ اور انہوں نے اپنے بعد والوں کے لیے یہ طریقہ نقل کیا؛ ان کی تعداد ان سے بہت زیادہ ہے جنہوں نے اس آیت کا یہ معنی ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

اس لیے کہ سبھی مسلمان رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں وضوء کیا کرتے تھے۔اور انہوں نے وضوء کرنا طریقہ بھی رسول اللہ ﷺ سے ہی سیکھا تھا؛ اس لیے کہ عہد جاہلیت میں وضوء نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اور خود نبی کریم ﷺ کو وضوء کرتے ہوئے اتنے لوگوں نے دیکھا ہے کہ جن کی صحیح تعداد کو صرف اللہ ہی جانتا ہے؛ ان لوگوں سے مروی تمام احادیث میں پاؤں کو دھونے کا ذکر آیا ہے۔ یہاں تک کہ صحاح اور دوسری کتب احادیث میں کئی ایک اسناد سے رسول اللہ ﷺ سے روایت نقل کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا: ((ویل لِلأعقابِ وبطون الأقدام مِن النارِ)) [1]

''ایڑیوں اور پاؤں کی ہتھیلیوں کے لئے آگ سے تباہی ہوگی۔''

❀ اگر پاؤں پر صرف مسح کرنے کا حکم ہوتا تو ظاہری پاؤں پر مسح کر لینا کافی تھا؛ اور تمام پاؤں کو دھونا ایک ایسا تکلف ہوتا جسے طبیعت جلدی سے تسلیم نہ کرتی۔ جیسا کہ طبیعت میں مال و جاہ کی طلب ہوتی ہے۔

❀ اگر یہ کہا جائے کہ: ان لوگوں نے جھوٹ بولا ہے' یا پھر وضوء کا طریقہ نقل کرنے میں ان سے غلطی ہوگئی ہے تو یہی جھوٹ یا غلطی کا احتمال فرد واحد کی روایت میں اس سے بڑھ کر ہے۔

❀ اگر یہ کہا جائے کہ: نہیں' بلکہ آیت کا لفظ تواتر کے ساتھ ثابت ہے جس میں غلطی کا احتمال و امکان نہیں۔

❀ تو اس کا جواب یہ ہے کہ: وضوء کا طریقہ بھی اسی طرح نقل متواتر کے ساتھ ثابت ہے۔اور آیت کے الفاظ کا ثابت شدہ سنت کے ساتھ کوئی اختلاف نہیں۔اس لیے کہ لفظ مسح دو جنس کو شامل ہے:

۱۔اسالہ [پانی بہانا] ۲۔غیر اسالہ [صرف ہاتھ پھیرنا]

[1] صحیح بخاری:جلد اول:ح ۱٦۳ ۔میں پوری روایت اس طرح ہے:حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں: کسی سفر میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم سے پیچھے رہ گئے، پھر آپ ﷺ نے ہمیں پالیا؛ اور ہم کو عصر کی نماز میں دیر ہوگئی تھی، لہٰذا ہم وضو کرنے لگے اور اپنے پیروں پر جلدی کے مارے مسح کرنے لگے، آپ ﷺ نے بلند آواز سے پکار کر دو مرتبہ یا تین مرتبہ فرمایا کہ:'' ویل للعقابِ مِن النارِ۔'' اس روایت میں بطون الاقدام کے الفاظ نہیں۔ یہ الفاظ مستدرک حاکم سے لیے گئے ہیں۔مزید دیکھیں:

البخارِي:١/ ١٧، ١٨، كتاب العِلمِ، باب من رفع صوته بِالعِلم، ١/ ٢٦، ٢٧كتاب العِلمِ، باب من عاد الحدِيث: ١/ ٤٠، كتاب الوضو، باب غسلِ الرِجلينِ ولا يمسح العقِبينِ، باب غسلِ الأعقاب ؛ مسلِم:١/ ٢١٣، ٢١٥ كتاب الطهارةِ باب وجوبِ غسلِ الرِجلينِ بِكمالِهِما؛ المسندِ ط. المعارِف الأرقام:٦٨٠٩، ٦٨٨٣، ٦٩٧٦، ٧١٠٣، ٧١٢٢، ٧٧٨٨. وجاء الحدِيث بِلفظِ ويل لِلأعقابِ وبطونِ الأقدامِ مِن النار. فِي: سننِ التِرمِذِي١، كتاب الطهارةِ، باب ما جاء: ويل لِلأعقابِ مِن النار ؛ المسندِ ط. الحلبِي:٤/ ١٩١، عن عبدِ اللهِ بنِ الحارِسِ بنِ جز رضی اللہ عنہ.

جیسا کہ عرب کہتے ہیں: ''تمسحت للصلاۃ۔'' (میں نے نماز کے لیے مسح کیا)۔پس جو چیز اسالہ [پانی بہانے] سے ہو اسے غسل کا نام دیا جاتا ہے۔اگر کسی ایک نوع کو غسل کے نام کے ساتھ خاص کیا جا سکتا ہے تو دوسری قسم کو بنام مسح بھی خاص کیا جا سکتا ہے۔پس لفظ مسح عام ہے جس کے تحت غسل کا لفظ بھی آ جاتا ہے۔اور کبھی یہ لفظ خاص ہوتا ہے جس کے تحت غسل کا معنی شامل نہیں ہوتا۔

اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔مثال کے طور پر ''ذوی الارحام'' کے لفظ کو لیجیے۔یہ لفظ تمام عصبہ اور اصحاب الفروض کو شامل ہے۔تو پھر جب عصبہ اور اصحاب الفروض کے کچھ خاص اسماء بھی تھے تو اب صرف ''ذوی الارحام'' کا لفظ باقی رہ گیا۔یہ عرف میں ان لوگوں کے لیے مختص ہو گیا جنہیں فرائض یا تعصیب کسی ایک میں سے بھی میراث کوئی حصہ نہیں ملتا۔

یہی حال لفظ ''جائز'' اور ''مباح'' کا ہے۔یہ ان تمام چیزوں کے لیے عام الفاظ ہیں جو کہ حرام نہ ہوں۔پھر انہیں پانچ اقسام میں سے کسی ایک کے ساتھ خاص کر دیا گیا۔

یہی حال لفظ ''ممکن'' کا ہے۔یہ اس چیز کے لیے بولا جاتا ہے جو ممتنع نہ ہو۔پھر اسے اس کے لیے خاص کر دیا گیا جو نہ ہی واجب ہو اور نہ ہی ممتنع۔پس واجب اور جائز' ممکن؛ اور خاص و عام کے مابین فرق کیا جائے گا۔یہی حال لفظ ''حیوان'' کا ہے۔یہ لفظ انسان اور دوسروں کو شامل ہے۔مگر بعد میں اسے غیر انسان کے لیے مختص کر دیا گیا ہے۔اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔

جب دو اقسام میں سے کسی ایک کا ایسا نام ہو جو صرف اسی کے ساتھ خاص ہو' تو پھر دوسری قسم کے لیے اسم عام ہی باقی رہ جاتا ہے۔لفظ مسح کا تعلق بھی اسی باب سے ہے۔بلکہ غسل بھی مسح کی ہی ایک قسم ہے۔قرآن کی آیت میں وارد لفظ مسح سے مراد وہ مسح نہیں جو کہ غسل کے ساتھ اس لفظ سے مراد دوسری قسم ہے؛ بلکہ اس سے مراد عین غسل ہے جو کہ معانی مسح میں سے ایک ہے۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿اِلَی الْکَعْبَیْنِ﴾ ۔''دونوں ٹخنوں تک۔'' یہ نہیں فرمایا کہ: ٹخنے تک۔جیسا کہ ہاتھ دھونے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا تھا: ﴿اِلَی الْمَرَافِقِ﴾ ۔''کہنیوں تک۔تو اس سے واضح ہوا کہ ہر پاؤں ایسے ہی ایک ٹخنہ نہیں ہے جیسے کہ ہر ہاتھ میں ایک کہنی ہوتی ہے' بلکہ ہر پاؤں میں دو ٹخنے ہوتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے جوان دو ابھری ہوئی ہڈیوں تک مسح کرنے کا حکم دیا ہے۔اس سے مراد انہیں دھونا ہے۔اس لیے کہ اگر اس سے مراد عرف عام کا مسح ہوتا تو پھر پاؤں کی پشت پر ہاتھ پھیر کر مسح کر لینا ہی کافی تھا۔[مگر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ دھونے کی حد مقرر کر دی گئی ہے]۔

دوسری جو بات اہم ترین ہے وہ یہ کہ: پہلے دو دھوئے جانے والے اعضاء کا ذکر کر کے پھر مسح والے عضو کا ذکر کرنا اور پھر دھوئے جانے والے عضو کا ذکر کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پہلے دو اعضاء میں وضوء کرنے کے لیے ہر حال میں دھونا واجب ہے؛ اور تیسرے عضو میں ہر حال میں مسح ہی واجب ہے جب کہ چوتھے عضوء میں کبھی دھونا ہی واجب ہوتا ہے؛ جس وقت کہ پاؤں کھلے ہوئے ہوں؛ اور کبھی موزے پہنے ہوئے ہونے کی صورت میں مسح بھی کفایت کر جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے متواتر سنت کے ساتھ پاؤں کو دھونا اور ان پر مسح کرنا دونوں باتیں ثابت ہیں۔ رافضی اس سنت متواترہ کی مخالفت کرتے ہیں۔ جیسا کہ خوارج بھی اس جیسی سنت میں مخالفت کے مرتکب ہیں۔ یہاں پر یہ وہم پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ ان کا عمل ظاہر قرآن کے مخالف ہے۔ ایسا ہرگز نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ سے تواتر کے ساتھ دونوں سنتیں ثابت ہیں؛ پاؤں کو دھونا اور ان پر مسح کرنا۔ یہ تواتر چوتھائی دینار' یا تین دراہم یا دس دراہم میں چور کا ہاتھ کاٹنے یا اس جیسے دیگر متواترات سے بڑھ کر ہے۔

پاؤں کا ذکر کرتے ہوئے مسح کا لفظ ذکر کرنا اس بات کی طرف تنبیہ بھی ہے کہ پاؤں دھوتے وقت پانی کم استعمال کیا جائے اور اس میں اسراف سے کام نہ لیا جائے۔ کیونکہ عام عادت کے مطابق پاؤں دھوتے ہوئے پانی بہت زیادہ استعمال کیا جاتا ہے جو کہ فضول خرچی کی علامت ہے۔ نیز اس میں کلام کرتے ہوئے اختصار کے ساتھ کلام لیا گیا ہے۔ اس لیے کہ جب معطوف اور معطوف علیہ پر واقع ہونے والے فعل کی جنس ایک ہی ہو تو پھر ان میں سے کسی ایک کا ذکر کر لیا جانا ہی کافی ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ ٥ بِأَكْوَابٍ وَّأَبَارِيقَ وَكَأْسٍ مِّنْ مَّعِينٍ ٥ لَا يُصَدَّعُونَ عَنْهَا وَلَا يُنزِفُونَ ٥ وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُونَ ٥ وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ ٥ وَحُورٌ عِينٌ﴾

[الواقعة ۱۸۔۲۲]

''ہمیشہ نو جوان رہنے والے خدمت گارلڑکے ان کے پاس پھرتے رہیں گے۔ نتھری شراب کے جام و ساغر اور آبخوروں کے ساتھ۔ اس شراب سے نہ تو انہیں سردرد ہوگا اور نہ عقل میں فتور آئے گا۔ انہیں وہ پھل (کھانے کو) ملیں گے جو وہ پسند کریں گے۔ نیز پرندوں کا گوشت جونسا وہ چاہیں گے۔ اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں ہوں گی۔''

حالانکہ حورعین کو تو نہیں پھیرایا جارہا ہوگا۔ یہاں پر معنی یہ ہے کہ ان پر ہر چیز پیش کی جائے گی۔ یہاں پر ان الفاظ کو حذف کر دیا گیا ہے جن کی جنس پر ظاہر میں دلالت موجود تھی۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا﴾ [الإنسان ۳۱]

''وہ جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور ظالموں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

معنی یہ ہے کہ ظلم کرنے والوں کو وہ دردناک عذاب دے گا۔

اس [مذکورہ بالا] آیت [وضوء] میں دو مشہور قرأتیں ہیں۔ ایک زبر کے ساتھ ہے اور دوسری زیر کیساتھ۔ جو لوگ اس کو زبر کے ساتھ [أرجلَکم] پڑھتے ہیں؛ تو ان میں سے کئی ایک نے کہا ہے کہ: یہاں پر دوبارہ پاؤں دھونے کا حکم دیا جارہا ہے۔ گویا کہ یوں کہا جارہا ہے: [وامسحوا برؤسکم واغسلوا أرجلکم إلی الکعبینَ] ''یعنی اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں تک دھولو۔'' ان دو قراتوں کا مطلب یہ ہے گویا کہ یہ دو آیتیں ہیں۔

جن لوگوں [نے اسے زیر کے ساتھ [أرجلِكم] پڑھا ہے؛ان کا] کہنا ہے: یہ جارو مجرور کی جگہ پر عطف ہے۔اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ:[وامسحوا برؤسكم وامسحوا أرجلِكم إلى الكعبينَ]''یعنی اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں کا ٹخنوں تک مسح کرلو۔'' عربوں کا یہ کہنا:[مسحت الرجلَ]''میں نے اپنے پاؤں کا مسح کیا۔'' یہ اس قول کے مترادف نہیں:[مسحت بالرجل]۔اس لیے کہ جب فعل کو حرف باء کے ساتھ متعدی بنایا جائے تو اس سے الصاق''یعنی متصل'' کا معنی پیدا ہوتا ہے۔یعنی میں نے کسی چیز کو اس پر چسپاں کردیا۔اور اگر اس سے حرف باء کو حذف کردیا جائے تو بالا جماع اس سے مجرد مسح ہی مراد ہوگا۔تو اس سے واضح ہوگیا کہ یہاں پر پانی کے ساتھ پاؤں کا مسح کرنا مقصود ہے؛ جس سے مراد پاؤں کا دھونا ہے ۔ یہ ایک مجمل کلام ہے جس کی تفسیر و توضیح سنت نبوی سے ہوتی ہے اور زیر کے ساتھ قرأت سے یہی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

خلاصہ کلام! قرآن میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کی بنا پر پاؤں دھونے کے وجوب کی نفی ہو۔ بلکہ اس میں مسح کا وجوب ہے۔اگر اس بات کو مقدر مان لیا جائے کہ سنت نے قرآن کی عبارت سے زائد کسی چیز کو واجب کیا ہے؛ تو پھر بھی اس صورت میں قرآنی حکم میں کوئی فرق نہیں آتا۔تو پھر اس صورت میں کیسے کوئی اعتراض کرسکتا ہے جب سنت قرآن کی وضاحت اور تفسیر کررہی ہو۔ یہ مسئلہ اپنی جگہ پر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاچکا ہے۔

جملہ طور پر یہ جان لینا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ کی سنت قرآن کی وضاحت کرتی ہے'اور اس کی تفسیر بیان کرتی ہے' اس کے معانی پر دلالت کرتی ہے۔ پس سنت متواترہ کا تقاضا وہی ہے جو کہ بعض لوگوں نے قرآن کے ظاہری الفاظ سے سمجھا ہے۔اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کے لیے قرآن کے الفاظ اور اس کے معانی بیان کیا کرتے تھے۔جیسا کہ حضرت ابوعبدالرحمٰن سلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ہم سے ان لوگوں نے بیان کیا جو قرآن پڑھایا کرتے تھے' جیسے حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ کرام؛ وہ فرماتے ہیں:''ہم جب نبی کریم ﷺ سے دس آیات سیکھ لیتے تو اس وقت تک اس سے آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک کہ ان کے معانی بھی آپ سے نہ سیکھ لیتے۔''

جو کچھ امامیہ فرقہ کے لوگ کہتے ہیں کہ: پاؤں کا ٹخنوں تک مسح کرنا فرض ہے؛ تو یہ ایسی بات ہے کہ قرآن سے کسی طرح بھی اس کی کوئی دلیل نہیں ملتی ۔اور نہ ہی ایسا کرنا سنت رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔اور نہ ہی سلف امت میں یہ چیز معروف تھی۔ بلکہ یہ لوگ قرآن کریم' سنت متواترہ' اور سابقین اولین صحابہ اور تابعین کے اجماع کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔اس لیے کہ [أرجلَكم] کو جب زبر کے ساتھ پڑھتے ہیں تو اس کا عطف ہاتھوں کے دھونے پر ہوتا ہے۔پس زبر کے ساتھ اس کی قرأت پاؤں کے دھونے کے وجوب پر دلالت کرتی ہے۔ ظاہری قرأت قرآن بھی اسی پر دلیل ہے۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو ظاہر قرآن کا بھی کچھ بھی علم نہیں ۔ یہی حال ان تمام لوگوں کا ہے جو ضعیف اقوال پر عمل کرتے ہیں اور ظاہر قرآن پر عمل کے دعویدار ہیں؛ حقیقت میں وہ لوگ سنت نبوی کی مخالفت کے مرتکب ہیں۔ اس لیے کہ ظاہر قرآن میں ہرگز کوئی ایسی چیز نہیں پائی جاتی جو کہ سنت کے مخالف ہو۔جیسا خوارج کا دعوی ہے کہ ہم سفر

میں صرف چار رکعت ہی پڑھیں گے۔ اور جو لوگ یہ کہتے ہیں: صرف میں چار رکعت پڑھنا دو رکعت پڑھنے سے زیادہ افضل ہے۔ اور جو لوگ کہتے ہیں: ہم ایک گواہ اور قسم کی موجودگی میں حکم نہیں لگا سکتے۔

اس مسئلہ پر کئی مواقع پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ اور یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ جس پر ظاہر قرآن دلالت کرتا ہے' وہ حق ہے۔ اور یہ عام مخصوص نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہاں پر کوئی لفظی عموم نہیں پایا جاتا۔ بلکہ یہ مطلق ہے۔ جیسا فرمان الٰہی ہے:

﴿ فَاقۡتُلُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴾۔[التوبة ۵]

''اور مشرکین کو قتل کرو۔''

یہ تمام اعیان مشرکین کے لیے عام حکم ہے۔ اور تمام احوال میں مطلق ہے۔ اور جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿يُوۡصِيۡكُمُ اللّٰهُ فِيۡۤ اَوۡلَادِكُمۡ ﴾۔[النساء ۱۱]

''اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت فرماتا ہے۔''

یہ حکم بھی تمام اولاد کے لیے عام ہے اور ہر حال میں مطلق ہے۔

لفظ ''ظاہر'' سے کبھی مراد وہ چیز ہوتی ہے جو کسی انسان کے لیے ظاہر ہو۔ اور کبھی اس سے مراد وہ معنی ہوتا ہے جس پر لفظ دلالت کرتا ہو۔ پہلی مراد لوگوں کے افہام کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ اور قرآن میں بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جو کہ فاسد فہم کے خلاف ہیں۔ جب کہ ساری بحث کا مرکز دوسرا معنی ہے۔

فصل:......حج تمتع اور متعہ کا مسئلہ

[اعتـــراض] : رافضی مصنف کہتا ہے:''اور جیسا کہ متعتین جن کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے۔ متعۃ الحج کے متعلق قرآن کریم میں آیا ہے:

﴿فَمَنۡ تَمَتَّعَ بِالۡعُمۡرَةِ اِلَى الۡحَجِّ فَمَا اسۡتَيۡسَرَ مِنَ الۡهَدۡىِ﴾ [البقرة ۱۹۶]

''تو جو شخص حج کا زمانہ آنے تک عمرہ کرنے کا فائدہ اٹھانا چاہے وہ قربانی کرے جو اسے میسر آ سکے۔''

جب رسول اللہ ﷺ نے حج قران کیا تو حج تمتع کے چھوٹ جانے پر افسوس کا اظہار کیا؛ اور فرمایا:''اگر مجھے اس کا بروقت علم ہو جاتا تو میں قربانی کا جانور اپنے ساتھ نہ لاتا اور میں بھی تم سے پیچھے نہ رہتا۔'' اور متعہ نساء کے متعلق فرمایا:

﴿ فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهٖ مِنۡهُنَّ فَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ﴾ [نساء ۲۴]

''اور ان خواتین میں سے جن سے تم فائدہ اٹھالو' انہیں ان کی اجرت دیدو۔''

رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے شروع کے دور میں ان دونوں چیزوں کے متعلق یہی عمل سنت رہا۔ یہاں تک کہ عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ منبر پر

چڑھے اور اعلان کیا:

''دو قسم کے متعہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں حلال تھے؛ میں ان سے منع کرتا ہوں ۔ اور ایسا کرنے والوں کو سزا دوں گا۔'' [انتہی کلام الرافضی]۔

[جواب] : اس رافضی سے کہا جائے گا کہ: حج تمتع کے جواز پر تمام ائمہ اسلام کا اتفاق ہے۔ یہ دعوی کرنا کہ اہل سنت نے حج تمتع کی حرمت کی بدعت گھڑ لی ؛ یہ ان پر جھوٹا الزام ہے۔ بلکہ اکثر علماء اہل سنت حج تمتع کو یا تو واجب کہتے ہیں اور اسے ترجیح دیتے ہیں یا پھر اسے مستحب سمجھتے ہیں۔ تمتع ایک جامع نام ہے جو ان لوگوں کو شامل ہے جو کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرلیں اور پھر اسی ایک سفر میں حج بھی کریں' خواہ اس نے عمرہ کرنے کے بعد حلال ہوکر دوبارہ حج کا احرام باندھا ہو یا پھر بیت اللہ کا طواف شروع کرنے سے قبل حج کی نیت کرلی ہو تو اس کا حج قران ہوجائے گا۔ یا پھر طواف کے بعد صفا و مروہ کے مابین سعی کرتے ہوئے حلال ہونے سے پہلے اس لیے حج کی نیت کرلی کہ وہ اپنے ساتھ قربانی کا جانور بھی لایا تھا یا پھر مطلق طور پر حج کی نیت کرلی۔ اور بسا اوقات تمتع سے مراد حج کے مہینوں میں عمرہ کرلینا بھی لیا جاتا ہے۔

اکثر علماء جیسے امام احمد بن حنبل اور دیگر فقہاء حدیث رحمہم اللہ ؛ اور امام ابوحنیفہ اور دیگر فقہائے عراق رحمہم اللہ ؛ اور ایک قول میں امام شافعی اور دیگر فقہائے مکہ رحمہم اللہ ؛ حج تمتع کو مستحب کہتے ہیں۔ اگرچہ ان میں ایسے بھی ہیں جو کہ حج قران کو ترجیح دیتے ہیں جیسا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ۔ اور بعض فقہاء بالخصوص حج تمتع کو ترجیح دیتے ہیں؛ جیسا کہ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ سے ایک قول میں منقول ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ سے صراحت کے ساتھ منقول ہے کہ: اگر حاجی اپنے ساتھ قربانی لیکر آیا ہے تو پھر اس کے حق میں حج قرآن افضل ہے۔ اور اگر قربانی ساتھ نہیں لایا تو پھر عمرہ کے بعد احرام کھول کر حلال ہوجانا ہے افضل ہے۔ اس لیے کہ حج قران خود رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا۔ اور حج تمتع کا اپنے صحابہ کرام میں سے ان لوگوں کو حکم دیا تھا جو اپنے ساتھ قربانی کا جانور نہیں لائے تھے۔''[1]

❀ بلکہ بہت سارے علمائے اہل سنت والجماعت ایسے بھی ہیں جو حج تمتع کو واجب کہتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا ہے؛ اہل جیسے امام ابن حزم وغیرہ کا یہی قول ہے۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو اس کا حکم دیا تھا۔

❀ جب اہل سنت والجماعت حج تمتع کے جواز پر متفق اور یک زبان ہیں اور اکثر لوگ اسے مستحب کہتے ہیں؛ اور ان میں ایسے بھی ہیں جو حج کی اس قسم کو واجب کہتے ہیں۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اہل سنت پر حج تمتع کے حرام ہونے کی بدعت ایجاد کرنے کا الزام لگا رہے ہیں' وہ اپنے اس قول میں سخت جھوٹے ہیں۔

❀ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جو نقل کیا گیا ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ: تصور کیجیے : حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بات کہہ دی ؛

[1] البخاری ۲/ ۱۵۹ ؛ کتاب تقضی الحائض المناسك کلها إلا الطواف ؛ مسلم ۲/ ۸۷۹ ؛ کتاب الحج ؛ باب بیان وجوه الاحرام ۔ سنن أبی داؤد ۲/ ۲۱۰ ؛ کتاب المناسك ؛ باب افراد الحج .

جس میں دوسرے صحابہ کرام اور تابعین نے آپ کی مخالفت کی ہو؛ یہاں تک کہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم نے رسول اللہ ﷺ کے عہد میں حج تمتع کیا؛ اور اس کے متعلق قرآن نازل ہوا؛ پھر ایک آدمی نے اپنی مرضی سے اس میں کچھ کہہ دیا۔''[1]

❀ اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ لوگوں میں سے ہر ایک کی بات قبول بھی کی جاسکتی ہے اور رد بھی کی جاسکتی؛ سوائے رسول اللہ ﷺ کے قول کے۔ پس رافضی کا اگر مقصد مطلق طور پر اہل سنت والجماعت پر رد کرنا ہے تو پھر یہ اعتراض ان پر وارد نہیں ہوتا۔ اور اگر مقصد یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مسئلہ میں خطاء کا ارتکاب کیا ہے تو پھر بھی اہل سنت رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی کو بھی خطاء سے منزہ ومبرا نہیں مانتے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خطائیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت بہت کم ہیں۔ علماء نے فقہ کے وہ مسائل جمع کیے ہیں جن میں ان دو میں سے کسی ایک کے قول کو ضعیف قرار دیا گیا ہے؛ تو پتہ چلا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زیادہ اقوال ضعیف ہیں۔ مثال کے طور پر:

۱۔ بیوہ کی عدت کے مسئلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فتوی یہ ہے کہ: اس کی عدت ابعد الاجلین (یعنی زیادہ لمبے وقت والی) ہے۔ جبکہ کتاب اللہ کے موافق رسول اللہ ﷺ سے ثابت سنت یہ ہے کہ بچہ جننے کے ساتھ ہی اس کی عدت ختم ہوجائے گی۔ یہی فتوی حضرت عمر بن خطاب اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا ہے۔

۲۔ آپ کا فتوی ہے کہ مفوضہ کا مہر موت کی وجہ سے ساقط ہوجاتا ہے۔ جب کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فتوی مہر مثل کا ہے۔ جیسا کہ اشجع قبیلہ والوں نے بروع بنت واشق کے مسئلہ میں رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ بھی نقل کیا ہے۔

۳۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول مسائل میں طلاق اور ام الولد اور میراث کے حصوں کے بارے میں متناقض اقوال پائے جاتے ہیں۔

❀ جو انسان حج کو عمرہ سے فسخ کے فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہو؛ تو اس مسئلہ میں فقہائے حدیث امام احمد بن حنبل اور دیگر فقہاء رحمہم اللہ کے مابین اختلاف ہے۔ یہ حضرات بطور استحباب حج کو عمرہ سے فسخ کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ اور بعض لوگ اسے واجب کہتے ہیں جیسا کہ ظاہریہ کا مسلک ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول اور شیعہ کا مسلک ہے۔ جب کہ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ فسخ کو جائز نہیں سمجھتے۔ اس مسئلہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے مابین بھی اختلاف پایا جاتا تھا۔ بہت سارے صحابہ ایسا کرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ جب کہ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ اور صحابہ کے ایک گروہ سے اس کی ممانعت نقل کی گئی ہے۔ اگر حج کو عمرہ سے فسخ کرنا درست ہے تو یہ اہل سنت والجماعت کے اقوال میں سے ایک قول ہے۔ اور اگر ایسا کرنا درست نہیں تو پھر بھی اہل سنت کے اقوال میں سے ایک قول یہ بھی

[1] البخاری ۲/ ۱٤٤؛ کتاب الحج؛ باب التمتع علی عهد النبي ﷺ؛ مسلم ۲/ ۹۰۰؛ کتاب الحج باب جواز التمتع؛ سنن النسائی ٥/ ۱۲۰؛ کتاب المناسك باب التمتع .

ہے۔الغرض حق کسی طرح بھی اہل سنت والجماعت سے باہر نہیں۔

❀ اگر یہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اس کے منع کرنے کی وجہ سے قدح کرتے ہیں تو پھر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بھی آپ سے بڑھ چڑھ کر اس سے منع کرتے تھے؛ آپ فرمایا کرتے تھے: ''حج تمتع اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھا۔''

شیعہ حضرات حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے دوستی کا اظہار کرتے ہیں اور آپ کی بہت زیادہ تعظیم کرتے ہیں۔ اگر اس مسئلہ میں غلطی کرنا جانا قدح کی موجب ہے تو پھر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ پر بھی قدح ہونی چاہیے۔ وگرنہ یہ کیا معیار ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اسی مسئلہ میں قدح کی جائے اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی باری خاموشی اختیار کرلی جائے حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ سے افضل بڑے فقیہ اور بڑے عالم تھے۔

❀ دوسرا جواب یہ ہے کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حج تمتع کو حرام نہیں کیا۔ بلکہ یہ ثابت ہے کہ حضرت ضبی بن معبد رحمہ اللہ نے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ عرض کیا کہ: میں نے حج اور عمرہ کا احرام باندھا ہے تو آپ نے فرمایا: ''آپ نے سنت نبوی کی اتباع کے لیے ہدایت پالی۔'' [1]

❀ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما لوگوں کو حج تمتع کا حکم دیا کرتے تھے۔ ان سے کہا جاتا کہ: آپ کے اباجی تو اس سے منع کیا کرتے تھے؛ تو آپ فرمایا جواب میں فرمایا کرتے: ''میرے اباجی کا مقصد وہ نہیں جو کچھ تم لوگ مراد لینے لگے ہو۔'' جب لوگ بہت زیادہ اصرار کرتے تو آپ فرمایا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کے زیادہ حق دار ہیں کہ تم ان کی اتباع کرو یا پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ؟''

❀ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے: ''اگر میں حج کرتا تو تمتع کرتا؛ اگر میں حج کرتا تو تمتع کرتا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مراد یہ تھی کہ لوگوں کو افضل چیز کا حکم دیتے۔ لوگوں نے سہولت کی وجہ سے اشہر الحج کے علاوہ باقی مہینوں میں عمرہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ آپ یہ چاہتے تھے کہ سارا سال بیت اللہ کو ایسے خالی نہ چھوڑا جائے۔ پس جب لوگ حج افراد کرنے لگیں گے تو باقی سارا سال عمرہ جاری رہے گا۔ اشہر الحج کے علاوہ باقی مہینوں میں حج کرنا اشہر الحج میں حج تمتع کے لیے عمرہ کرنے سے افضل ہے؛ اس پر تمام ائمہ اربعہ اور دیگر علماء کرام رحمہم اللہ کا اتفاق ہے۔

❀ ایسے ہی حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی یہ تفسیر منقول ہے: ﴿وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ﴾ ''حج اور عمرہ کو اللہ تعالیٰ کے لئے پورا کرو۔''

[یہ دونوں حضرات] فرماتے ہیں: حج اور عمرہ کے پورا کرنے کا مطلب یہ ہے ان دونوں کا احرام اپنے گھر سے

[1] رواه النسائي ٥/ ١١٣؛ كتاب المناسك؛ باب القران؛ سنن ابن ماجه ٢/ ٩٨٩؛ كتاب المناسك باب من قرن الحج والعمرة؛ المسند ط: معارف ١/ ١٨٩؛ وصححه الشيخ أحمد شاكر.

باندھا جائے۔ان حضرات کی مراد یہ تھی کہ: حج کے لیے علیحدہ سفر کیا جائے اور عمرہ کے لیے علیحدہ سفر کیا جائے۔ وگرنہ نہ ہی ان دونوں حضرات نے اپنے گھر سے احرام باندھا اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ نے ایسے کیا اور نہ ہی آپ کے خلفاء راشدین میں سے کسی ایک نے ایسے کیا۔

❀ جب امام اپنی رعیت کے لیے کسی افضل چیز کو اختیار کرے؛ تو اس صورت میں کسی بات کا حکم دینا گویا کہ اس کی ضد [الٹ] سے منع کرنا ہے۔تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حج تمتع سے منع کرنا افضل کے اختیار کرنے کے لحاظ سے تھا تحریم کے لیے نہیں تھا۔آپ نے یہ بھی نہیں فرمایا تھا: ''میں ان دونوں کو حرام کرتا ہوں'' جیسا کہ رافضی نے نقل کیا ہے۔ بلکہ آپ نے فرمایا تھا: ''میں ان دونوں سے منع کرتا ہوں۔'' پھر حج تمتع سے منع کرنا بھی اس لیے تھا کہ لوگ افضل چیز کو اختیار کریں تحریم کے لیے یہ ممانعت نہیں تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ نے تو حج کو عمرہ سے فسخ کرنے سے منع کیا تھا۔

❀ بہت سارے فقہاء کے نزدیک فسخ حرام ہے۔ یہ اجتہادی مسائل میں سے ہے۔امام ابوحنیفہ'امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ فسخ کو حرام کہتے ہیں۔لیکن امام احمد رحمہ اللہ اور دوسرے فقہاء حدیث فسخ کو حرام نہیں کہتے؛ بلکہ اسے مستحب کہتے ہیں' اور بعض اسے واجب قرار دیتے ہیں۔اور اس مسئلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول نہیں لیتے۔ بلکہ اس مسئلہ میں حضرت علی' حضرت عمران بن حصین اور حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم اجمعین کا قول اختیار کرتے ہیں۔

[متعہ کا مسئلہ]:

❀ ایسے ہی عورت سے متعہ کرنا بھی متنازع فیہا مسائل میں سے ایک ہے۔آیت کریمہ میں اس کے حلال ہونے کے متعلق نص صریح نہیں پائی جاتی۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان یہ ہے:

﴿وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾-[النساء ۲۴]

''ان کے ماسوا جتنی بھی عورتیں ہیں انہیں اپنے مال کے ذریعہ حاصل کرنا تمہارے لیے جائز قرار دیا گیا ہے۔ بشرطیکہ اس سے تمہارا مقصد نکاح میں لانا ہو، محض شہوت رانی نہ ہو۔ پھر ان میں سے جن سے تم (نکاح کا) لطف اٹھاؤ تو انہیں ان کے مقررہ حق مہر ادا کرو۔ ہاں اگر مہر مقرر ہو جانے کے بعد زوجین میں باہمی رضا مندی سے کچھ سمجھوتہ ہو جائے تو پھر تم پر کوئی گناہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ یقیناً سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔''

❀ اس آیت میں یہ قول: ﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ﴾ ''پھر ان میں سے جن سے تم لطف اٹھاؤ'' یہ تمام مدخول بہا

عورتوں کو شامل ہے۔اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ ان تمام عورتوں کو ان کا حق مہر ادا کیا جائے۔ بخلاف اس عورت کے جسے دخول سے پہلے ہی طلاق ہو جائے؛ اور اس سے کوئی لطف نہ اٹھایا گیا ہو۔ اس لیے کہ ایسی عورت صرف آدھے مہر کی حق دار ہوتی ہے؛ پورے مہر کی نہیں۔ یہ بالکل اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے:

﴿وَ كَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَ قَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا﴾-[النساء۲۱]

''اور تم لے بھی کیسے سکتے ہو جبکہ تم ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں۔''

- اس آیت کریمہ میں عقدِ نکاح کیساتھ ایک دوسرے سے لطف اندوزی کو استقرار مہر کا موجب قرار دیا ہے۔اس سے واضح ہوا کہ اس میں اجرت کی ادائیگی کو نکاحِ مؤبد کو چھوڑ کو نکاح مؤقت کے ساتھ خاص کرنے کا کوئی معنی نہیں بنتا۔ بلکہ نکاح مؤبد میں پورا مہر ادا کرنا یہ زیادہ اولی ہے۔تو ضروری ہوا کہ آیت بھی نکاح مؤبد پر دلالت کرتی ہو۔ خواہ یہ دلالت بطور تخصیص کے ہو یا بطور عموم کے۔
- اس کی یہاں سے بھی ملتی ہے کہ نکاح کے بعد لونڈیوں کا ذکر کیا گیا ہے؛ تو اس سے معلوم ہوا کہ جو کچھ اس سے پہلے بیان گزرا ہے وہ مطلق طور پر آزاد عورتوں سے نکاح کے متعلق تھا۔

[اعتراض] : اگر کوئی یہ بات کہے کہ: ایک قرأت میں یوں بھی آیا ہے:﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ اِلٰىٓ اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ ''پھر ان میں سے جن سے تم لطف اٹھاؤ ایک مقررہ وقت تک۔'' ❶

---

❶ (الی اجل مسمی): کی قرأت کے راوی صرف عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ہیں جن کی عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت صرف ۱۳ سال تھی۔ جمع و تدوین قرآن کے وقت آپ قسم اٹھا کر کہتے ہی رہے کہ یہ آیت اسی طرح نازل ہوئی ہے (اور ممکن ہے کہ جن ایام میں متعہ کا جواز تھا یہ قرات بھی پڑھی گئی ہو۔لیکن ایسی قرات بھی رخصت اور نسخ کے ضمن میں آتی ہیں)۔مگر آپ کی اس بات کو دو وجوہ کی بنا پر پذیرائی نہ ہوسکی۔ایک یہ کہ جمع و تدوین قرآن کے معاملہ میں خبر متواتر کو قبول کیا گیا تھا اور آپ کی یہ خبر واحد تھی۔جس کا دوسرا کوئی راوی نہ تھا۔اور دوسری وجہ یہ تھی کہ پہلے سے دو مکی سورتوں مومنون اور معارج میں یہ محکم آیات موجود تھیں: ﴿والذین هم لفروجهم حافظون﴾ (المؤمنون) یعنی حفاظت فروج کے دو ہی ذریعے ہیں ایک بیوی، دوسرا لونڈی۔ان کے علاوہ جو کچھ ہے وہ حد سے گزرنا ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ ممتوعہ عورت نہ بیوی ہوتی ہے نہ لونڈی۔ لونڈی نہ ہونے میں تو کوئی کلام نہیں اور بیوی اس لیے نہیں ہوتی کہ بیوی کو میراث ملتی ہے۔اور ایسی عورت کو میراث نہیں ملتی۔

نکاح متعہ ایک اضطراری رخصت تھی:۔دور نبوی میں نکاح متعہ تین مواقع پر مباح کیا گیا اور پھر ساتھ ہی اس کی حرمت کا اعلان کیا۔ یہ جنگ خیبر، فتح مکہ اور اوطاس اور جنگ تبوک ہیں۔ان مواقع پر ابتدا نکاح متعہ کی اجازت دی جاتی تھی اور جنگ کے اختتام پر اس کی حرمت کا اعلان کر دیا جاتا تھا۔ گویا یہ ایک اضطراری رخصت تھی۔اور صرف ان مجاہدین کو دی جاتی تھی جو محاذ جنگ پر موجود ہوتے تھے اور اتنے عرصہ کے لیے ہی ہوتی تھی۔اور اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ جنگ بدر، احد اور جنگ خندق کے مواقع پر ایسی اجازت نہیں دی گئی۔ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم نے حنین کے دن ایک لشکر اوطاس کی طرف روانہ کیا۔ان کا دشمن سے مقابلہ ہوا، مسلمانوں نے فتح پائی اور بہت سے قیدی ہاتھ آئے۔صحابہ کرام نے ان قیدی عورتوں سے صحبت کرنے کو گناہ سمجھا کہ ان کے مشرک شوہر موجود تھے۔اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر عدت کے بعد ان لونڈیوں کو ان کے لیے حلال کر دیا۔(مسلم۔ کتاب الرضاع، باب جواز وطی المسبیة) ⇦⇦⇦

[جواب]: پہلی بات یہ قرأت متواتر نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ خبر واحد کی طرح ہی ہو سکتی ہے۔ تو ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ شروع اسلام میں متعہ حلال تھا۔ لیکن انکار تو اس مسئلہ میں قرآن سے استدلال لینے پر ہے۔

❀ دوسری بات: ان حروف میں اگرچہ قرآن نازل ہوا تھا؛ لیکن اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ قرأت مشہور اور ثابت قرأءات میں سے نہیں۔ پس اس لحاظ سے یہ قرأت منسوخ ہوگی۔ اور اس کا نزول اس وقت ہوا ہوگا جب متعہ مباح تھا۔ جب متعہ حرام ہوگیا تو یہ قرأت بھی منسوخ ہوگئی۔ تو اس صورت میں مہر دینے کا حکم مطلق نکاح میں

⇦⇦⇦ صحیح مسلم شریف میں حضرت سبرہ بن معبد جہنی رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے کہ فتح مکہ کے غزوہ میں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے آپ نے ارشاد فرمایا اے لوگو میں نے تمہیں عورتوں سے متعہ کرنے کی رخصت دی تھی یاد رکھو بیشک اب اللہ تبارک وتعالی نے اسے قیامت تک کے لئے حرام کردیا ہے جس کے پاس اس قسم کی کوئی عورت ہو تو اسے چاہئے کہ اسے چھوڑ دے اور تم نے جو کچھ انہیں دے رکھا ہو اس میں سے ان سے کچھ نہ لو۔'' قیدی عورتوں اور لونڈیوں سے تمتع کی شرائط یہ تھیں:

۱۔ صرف اس قیدی عورت سے تمتع کیا جا سکتا ہے جو امیر لشکر دیگر اموال غنیمت کی طرح کسی مجاہد کی ملکیت میں دے دے۔ اس سے پہلے اگر کوئی شخص کسی عورت سے تمتع کرے گا تو وہ دو گناہوں کا مرتکب ہوگا۔ ایک زنا کا اور دوسرے مشترکہ اموال غنیمت کی تقسیم سے پیشتر ان میں خیانت کا۔

۲۔ امیر لشکر کا کسی عورت کو کسی کی ملکیت میں دینے کے بعد اس سے نکاح کی ضرورت نہیں رہتی۔ ملکیت میں دے دینا ہی کافی ہوگا اور اس کا سابقہ نکاح از خود ختم ہو جائے گا۔

۳۔ تقسیم کے بعد ایسی عورت سے فوری طور پر جماع نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک اسے کم از کم ایک حیض نہ آ لے۔ اور یہ معلوم نہ ہو جائے کہ وہ حاملہ ہے یا نہیں اور اگر وہ حاملہ ہوگی تو اس کی عدت تا وضع حمل ہے۔ اس سے بیشتر اس سے جماع نہیں کیا جا سکتا۔ اور مزید احکام یہ ہیں:

۴۔ ایسی عورت سے صرف وہی شخص جماع کر سکتا ہے جس کی ملکیت میں وہ دی گئی ہو۔ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔

۵۔ اگر اس قیدی عورت سے اولاد پیدا ہو جائے تو پھر اسے فروخت نہیں کیا جا سکتا۔

۶۔ اگر ایسی قیدی عورت کو اس کا مالک کسی کے نکاح میں دے دے تو پھر وہ اس سے دوسری خدمات تو لے سکتا ہے لیکن صحبت نہیں کر سکتا۔

۷۔ جب عورت سے مالک کی اولاد پیدا ہو جائے تو مالک کے مرنے کے بعد وہ از خود آزاد ہو جائیگی۔ شرعی اصطلاح میں ایسی عورت کو ام ولد کہتے ہیں۔

۸۔ اگر امیر لشکر یا حکومت ایک عورت کو کسی کی ملکیت میں دے دے تو پھر وہ خود بھی اس کو واپس لینے کی مجاز نہیں ہوتی۔ الا یہ کہ اس تقسیم میں کوئی ناانصافی کی بات واقع ہو جس کا علم بعد میں ہو۔ اس طرح چند در چند شرائط عائد کر کے اسلام نے ایسی عورتوں سے تمتع کی پاکیزہ ترین صورت پیش کر دی ہے جس میں سابقہ اور موجودہ دور کی فحاشی، وحشت اور بربریت کو حرام قرار دے کر اس کا خاتمہ کیا گیا ہے اور تمتع کے بعد اس کے نتائج کی پوری ذمہ داری مالک پر ڈالی گئی ہے۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جس شخص کے پاس کوئی لونڈی ہو وہ اس کی تعلیم وتربیت کرے اسے ادب سکھائے پھر اسے آزاد کر کے اس سے نکاح کر لے تو اس کے لیے دوہرا اجر ہے۔ (بخاري، كتاب العتق، باب فضل من ادب جاريته و علمها)

ان سب باتوں کے باوجود یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ لونڈیوں سے تمتع ایک رخصت ہے حکم نہیں ہے اور یہ اللہ کی رحمت ہے کہ اس نے ایسی اجازت دے دی ہے کیونکہ جہاد اور اس میں عورتوں کی گرفتاری ایسی چیز ہے جس سے مفر نہیں اور ایسا بھی عین ممکن ہے کہ جنگ کے بعد قیدیوں کے تبادلہ یا اور کوئی باعزت حل نہ نکل سکے اسی لیے اللہ نے سے کلیتا حرام قرار نہیں دیا۔

رہ گیا۔

❀ اس کی زیادہ سے زیادہ حد یہ ہوسکتی ہے کہ یوں کہا جائے: یہ دونوں قرأتیں ہیں اور دونوں حق ہیں' اور مقررہ وقت تک لطف اندوزی کی صورت میں عورت کا حق دینے کا حکم اسی صورت میں نافذ ہوگا جب یہ حلال ہو۔ اور یہ سارا معاملہ اس وقت تک تھا جب تک ایک مقررہ وقت تک کے لیے نکاح کرنا حلال تھا۔ یہ اسلام کے شروع کی بات ہے۔ اب اس آیت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے ایک مقررہ وقت تک نکاح کے حلال ہونے کا ثبوت مل سکتا ہو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ: ''میں تمہارے لیے عورتوں سے ایک مقررہ وقت تک کے لیے لطف اندوزی کو حلال کرتا ہوں۔'' بلکہ یہ ارشاد فرمایا: ﴿ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ﴾ ''پھر ان میں سے جن سے تم (نکاح کا) لطف اٹھاؤ تو انہیں ان کے مقررہ حق مہر ادا کرو۔''

پس یہ ہر استمتاع اور لطف اندوزی کو شامل ہے جو یا تو حلال ہو یا پھر شبہ کی وجہ سے وطی واقع ہو جائے۔

❀ یہی وجہ ہے کہ نکاح فاسد میں سنت نبوی اور اجماع امت کی روشنی میں مہر مثل واجب ہو جاتا ہے۔ اور جب متعہ کرنے والا اس کے حلال ہونے کا اعتقاد رکھ کر متعہ کر لے تو اس پر مہر واجب ہو جاتا ہے۔ جب کہ یہ آیت حرام لطف اندوزی کو شامل نہیں۔ اس لیے کہ اگر کسی عورت سے بغیر عقد نکاح کے لطف اندوزی کی گئی؛ اگر وہ عورت اس پر راضی ہو؛ تو اسے زنا شمار کیا جائے گا۔ اور اس میں کوئی مہر نہیں ہوگا۔ اور اگر اسے زبردستی مجبور کیا گیا تھا تو پھر اس مسئلہ میں اختلاف مشہور ہے۔

❀ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جو نکاح متعہ کی ممانعت نقل کی جاتی ہے؛ تو یہ بات یقیناً ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کو حلال قرار دینے کے بعد حرام بھی کر دیا تھا۔ ثقہ راویوں نے ایسے ہی نقل کیا ہے۔

❀ بخاری و مسلم میں ہے: امام زہری عبداللہ و حسن پسران محمد بن حنفیہ سے نقل کرتے ہیں' وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں؛ وہ کہتے ہیں: جب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے متعہ کو مباح کہا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: ''تم بیکار آدمی ہو؛ بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر والے دن نکاح متعہ سے اور گھریلو گدھوں کے گوشت سے منع فرما دیا تھا۔''

امام زہری رحمہ اللہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم اور سنت کے سب سے بڑے محافظ تھے۔ ان کے زمانہ میں بڑے بڑے ائمہ اسلام پائے جاتے تھے جیسے حضرت مالک بن انس' حضرت سفیان بن عیینہ رحمہما اللہ اور دیگر وہ علماء کرام جن کے علم و فضل؛ عدالت اور حافظہ پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ اور اس حدیث کے صحیح اور قابل قبول ہونے کے متعلق حدیث کا علم رکھنے والے کسی ایک عالم نے بھی انکار نہیں کیا۔ اور نہ ہی اہل علم میں سے کوئی فرد ایسا ہے جس نے اس حدیث کے صحیح ہونے پر کوئی جرح یا تنقید کی ہو۔

ایسے ہی صحیح حدیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ: فتح مکہ کے غزوہ کے موقع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کو

قیامت تک کے لئے حرام کر دیا ہے۔'' [صحیح مسلم کی یہ حدیث دوصفحات پہلے حاشیہ میں گزر چکی ہے]۔

❀ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث نقل کرنے والے راویوں میں اختلاف ہے؛ کہ آپ کا قول: ''خیبر والے سال'' کیا یہ گدھے کے گوشت کی حرمت کا وقت بیان کرنے کے لیے ہے یا پھر اس کے ساتھ ساتھ متعہ کی حرمت کے لیے بھی؟

❀ پہلا قول امام ابن عیینہ رحمہ اللہ اور دیگر علماء کا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ: متعہ فتح مکہ والے سال حرام ہوا ہے۔ جب کہ دوسرے قول والے اصحاب کا کہنا ہے کہ: خیبر والے متعہ حرام ہوا تھا پھر حلال ہوا' پھر دوبارہ حرام ہوا۔اور ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس کے بعد بھی ایک بار متعہ حلال ہوا اور حجۃ الوداع والے سال حرام ٹھہرایا گیا۔

❀ اس بارے میں مشہور روایات متواتر کی حد تک پہنچتی ہیں کہ حلال ہونے کے بعد پھر حرام ٹھہرایا گیا۔درست بات یہ ہے کہ متعہ جب سے حرام ہوا ہے اس کے بعد دوبارہ کبھی حلال نہیں ہوا۔اور اس کی حرمت کا صحیح وقت فتح مکہ کا ہے۔ اس کے بعد کبھی بھی حلال نہیں ہوا۔ خیبر کے موقع پر اس کی حرمت نہیں آئی۔خیبر والے سال گھریلو پالتو گدھوں کا گوشت حرام ہوا تھا۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما گدھے کے گوشت اور متعہ دونوں کو مباح سمجھتے تھے۔ جس پر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے سخت انکار کیا اور فرمایا:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے ساتھ متعہ کرنے کو اور گدھے کے گوشت کو خیبر کے دن حرام ٹھہرایا ہے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ ان دونوں چیزوں کو ملا کر اس لیے بیان کیا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ان دونوں کو مباح سمجھتے تھے۔اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ جب آپ کو نہی [ممانعت] کی حدیث پہنچی تو آپ نے اپنے سابقہ قول سے رجوع کر لیا تھا۔

پس اہل سنت والجماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول روایت پر عمل کے لیے حضرت علی اور دوسرے خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کی پیروی کرتے ہیں۔ جب کہ شیعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منقول اس روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف چل رہے ہیں' اور آپ کی مخالفت کرنے والوں کی پیروی کر رہے ہیں۔

❀ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں شادی اور ملک یمین کو حلال ٹھہرایا ہے۔متعہ کروانے والی عورت ان دونوں میں سے کسی ایک قسم سے بھی تعلق نہیں رکھتی۔اس لیے کہ اگر یہ بیوی ہوتی تو میاں بیوی دونوں ایک دوسے کے وارث بنتے۔اور خاوند مرجانے کی صورت میں اس پر وفات کی عدت گزارنا بھی واجب ہوتی۔اس پر طلاق ثلاثہ کے احکام بھی مرتب ہوتے ۔اس لیے کہ بیوی کے یہ احکام کتاب اللہ میں موجود ہیں۔جب لوازم نکاح ثابت نہیں ہوتے تو نکاح کی نفی ہوگئی ۔اس لیے کہ لازم کے انتفاء کا تقاضا ہے کہ ملزوم کا بھی انتفاء ہو۔

❀ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں دو ہی چیزیں حلال ٹھہرائی ہیں: عقد نکاح اور ملک یمین ۔اس کے علاوہ جو بھی طریقہ

اختیار کیا جائے اس کا شمار حرام کاموں میں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ o اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ o فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ﴾۔[المؤمنون۵۔۷]

''اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ مگر اپنی بیویوں یا (کنیزوں سے) جو ان کی ملک ہوتی ہیں کہ (ان سے) مباشرت کرنے سے انہیں ملامت نہیں۔ اور جو ان کے سوا اوروں کے طالب ہوں وہ (اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے) نکل جانے والے ہیں۔''

❀ اس تحریم کے بعد متعہ کی جانے والی عورت نہ ہی بیوی رہتی ہے اور نہ ہی ملک یمین۔ پس قرآنی نصوص کی روشنی میں اس کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔ ملک یمین یعنی لونڈی تو نہیں ہوسکتی؛ یا صاف ظاہر ہے۔ اور بیوی اس لیے نہیں ہوسکتی کہ یہاں پر نکاح کے لوازم نہیں پائے جاتے۔ اس لیے نکاح کے لوازم میں سے ایک دوسرے کا وارث بننا' اور شوہر کی موت کی صورت میں عدت وفات ؛ اور طلاق ثلاثہ کے احکام کا لازم آنا ہے۔ اور اگر دخول سے پہلے طلاق ہو جائے تو اس صورت میں مرد پر آدھا مہر لازم آئے گا۔ ان کے علاوہ دیگر لوازم بھی ہیں۔

❀ اگر یہ کہا جائے کہ: کبھی بیوی ایسی بھی ہوتی ہے جو کہ وارث نہیں بنتی ؛ جیسے کہ: ذمیہ اور لونڈی۔

❀ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: پہلی بات: شیعہ کے نزدیک ذمیہ سے نکاح جائز نہیں۔ اور لونڈی سے نکاح ضرورت کے وقت میں ہوتا ہے۔ جب کہ یہ لوگ مطلق طور پر متعہ کو مباح ٹھہراتے ہیں۔

دوسری بات :...... ذمیہ اور لونڈی سے شادی کرنا توارث کے اسباب میں سے ہے؛ مگر یہاں پر توارث کے موانع پائے جاتے ہیں اور وہ مانع ہے غلام ہونا اور کفر۔ جیسا کہ نسب وراثت کے اسباب میں سے ہے سوائے اس صورت کے کہ بیٹا یا تو کافر ہو یا پھر غلام ہو۔ پس مانع اپنی جگہ پر موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر غلام بیٹے کو آزادی مل جائے یا پھر کافر بیٹا اسلام قبول کر لے تو وہ اس کی زندگی میں والد کا وارث بنے گا۔ بس یہی حال ذمی بیوی کا ہے۔ اگر وہ اپنے شوہر کی زندگی میں اسلام قبول کر لے تو تمام مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وہ اپنے شوہر کی وارث بنے گی۔ اور ایسے ہی اگر وہ غلام ہو اور شوہر کی زندگی میں اسے آزادی مل جائے ؛ اور وہ اس نکاح کو برقرار رکھے تو باتفاق مسلمین وہ وارث بنے گی۔ بخلاف اس عورت کے جس سے متعہ کیا گیا ہو؛ اس لیے کہ نکاح متعہ سے وراثت ثابت نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی کسی بھی صورت میں یہ وارث بن سکتی ہے۔ پس یہ نکاح اس ولد زنا کی طرح ہے جو کسی شوہر کے بستر پر پیدا ہوتا ہے' تو اس کا نسب کسی بھی صورت میں زانی سے نہیں ملایا جاسکتا۔ پس وہ اس کا بیٹا ثابت نہیں ہوسکتا کہ اس کا وارث بنے۔

❀ اگر یہ کہا جائے کہ: نسب کے بعض احکام کی تبعیض ممکن ہے۔ پس کی صورت اس نکاح کی بھی ہے۔

❀ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ جمہور اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن اس میں شیعہ کے لیے کوئی حجت نہیں ہے۔ اس لیے کہ متعہ کی جانے والی عورت سے بیوی کے تمام احکام منتفی ہیں۔ اس

میں حلال نکاح کے خصائص میں سے کوئی ایک بات بھی نہیں پائی جاتی۔ اور جو چیزیں اس میں ثابت ہیں جیسے: نسب کا الحاق، وجوب استبراء، حد کا خاتمہ؛ وجوب مہر وغیرہ۔ اس طرح کے احکام تو وطی ءشبہ میں بھی ثابت ہوجاتے ہیں۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ مستمتع سے وطی کرنا حلال بیوی سے وطی کرنے جیسا نہیں۔ لیکن اگر اس کے حلال ہونے کا اعتقاد رکھا جائے تو پھر اس کی مثال وطی شبہ جیسی ہے۔ رہ گیا یہ مسئلہ کہ کیا اس سے وطی کرنا حلال ہے؟ تو یہ مسئلہ محل نزاع ہے۔ اس سے متنازعین میں سے کوئی ایک بھی استدلال نہیں کرسکتا۔ بلکہ فریق مخالف پر موارد نص و اجماع سے ہی حجت قائم کی جاسکتی ہے۔

فصل:......میراث حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مسئلہ

[سلسلہ اعتراضات]: [پہلا اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ❶ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ورثہ دینے سے انکار کر دیا۔ تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کہنے لگیں:

اے ابوقحافہ کے بیٹے! کیا تم اپنے باپ کے وارث بن سکتے ہو اور میں اپنے باپ کی وارث نہیں بن سکتی؟ اور ایک منفرد روایت سے احتجاج کیا۔- اور آپ [ابوبکر رضی اللہ عنہ] پر ان کا قرض تھا؛ آپ کے لیے صدقہ حلال تھا- اور اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہم انبیاء کی جماعت ہیں۔ ہم وراثت نہیں چھوڑتے؛ جو کچھ ہم اپنے پیچھے چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔'' حالانکہ اس بارے میں جو کچھ آپ سے روایت کیا گیا ہے قرآن اس کے خلاف کہہ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ﴾ [النساء ۱۱]

''اللہ تمہاری اولاد کی بابت تم کو وصیت فرماتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دولڑکیوں کے حصے کے برابر ہے۔''

اس حکم کو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر صرف امت کے ساتھ خاص نہیں کیا۔ بلکہ ان کی روایات کو جھٹلایا ہے۔ جیسا کہ دوسرے موقع پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ﴾ [النمل ۱۶] ''اور حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے وارث بنے۔''

حضرت زکریا علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۝ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ﴾ [مریم ۵-۶]

''اور میں اپنے بعد اپنے بھائی بندوں سے ڈرتا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے تو مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا فرما۔ جو میری اولاد اور اولاد یعقوب کی میراث کا مالک ہو۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جوابات]: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے:

پہلا جواب :......شیعہ نے جو قول حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: کیا تم اپنے باپ کے وارث بن سکتے ہو اور میں اپنے والد کی وارث نہیں بن سکتی؟ اس قول کی صحت کا کوئی علم نہیں ہو سکا۔ اگر یہ قول صحیح ثابت بھی ہو جائے تو اس میں رافضی کے لیے کوئی حجت نہیں ہے۔ اس لیے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے والدِ محترم کو کائنات بھر کے کسی فرد و بشر پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اور ابو بکر مؤمنین کو ان کی جانوں سے بڑھ کر عزیز نہیں ہو سکتے۔ جیسا کہ آپ کے والد محترم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور نہ ہی آپ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے نفلی یا فرض صدقہ کو حرام کیا ہے جیسے آپ کے والد محترم پر تھا۔ اور نہ ہی آپ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کی محبت کو اللہ تعالیٰ اپنی جان و مال اور اہل خانہ کی محبت سے مقدم کرنے کا حکم دیا ہے؛ جیسا کہ آپ کے والد محترم کے لیے یہ حکم تھا۔ ❶

انبیائے کرام علیہم السلام اور دوسرے لوگوں کے درمیان ایک فرق یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا کے وارث بننے سے پاک رکھا ہے۔ تاکہ ان لوگوں کے لیے شبہ کی گنجائش نہ رہے جو کہتے ہیں:

''انبیاء کرام علیہم السلام نے دنیا اس لیے طلب کی تھی کہ اسے اپنے بعد اپنے وارثوں کے لیے چھوڑ جائیں۔''

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ان کے امثال کو وہ مقام نبوت حاصل نہیں ہے جس پر قدح کا اندیشہ نہ ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو خط و کتابت؛ شعر گوئی وغیرہ سے محفوظ رکھا تھا تاکہ نبوت پر کوئی شبہ واقع نہ ہو۔ اگرچہ کسی دوسرے کے لیے اس حفاظت میں کوئی حجت نہیں ہے۔

دوسرا جواب :......ہم کہتے ہیں: شیعہ مصنف کا اس کو منفرد روایت قرار دینا صاف جھوٹ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان: 'ہم وراثت نہیں چھوڑتے؛ جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔'' ❷

یہ حدیث خلفاء اربعہ، حضرت طلحہ، زبیر، سعید، عبدالرحمٰن بن عوف، عباس، ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہم اجمعین) اور آپ کی ازواج

---

❶ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ترکہ چھوڑا تھا تو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اس کی تنہا وارث نہ تھیں، بلکہ آپ کی ازواج مطہرات اس میں برابر کی شریک تھیں۔ مزید یہ کہ سیدہ عائشہ صدیقہ بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا اس ضمن میں سرفہرست تھیں جن کے گھر میں آپ نے وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے، حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا بھی برابر کی وارث تھیں۔ اگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ورثہ نہ پا سکیں تو آپ کی ازواج مطہرات اور آپ کے چچا عباس بھی ورثہ سے محروم رہے، مگر شیعہ سیدہ فاطمہ کے سوا دیگر اقارب کا ذکر تک نہیں کرتے۔ علاوہ ازیں باغ فدک اور خیبر کا خمس اہل بیت کے لیے مباح تھا اور وہ ان سے اپنی ضروریات اسی طرح پوری کرتے تھے جس طرح آپ کی زندگی میں، جو بچ جاتا وہ ان مصارف میں صرف کیا جاتا، جہاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔

❷ صحیح بخاری؛ کتاب: وصیتوں کے مسائل کا بیان؛ باب: وقف کی جائیداد کا اہتمام کرنے والا اپنا خرچ اس میں سے لے سکتا ہے۔ ح نمبر: 2776؛ یہ پوری روایت اس طرح ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو آدمی میرے وارث ہیں؛ وہ اشرفی اگر میں چھوڑ جاؤں تو وہ تقسیم نہ کریں وہ میری بیویوں کا خرچ اور جائیداد کا اہتمام کرنے والے کا خرچ نکالنے کے بعد صدقہ ہے۔'' اس کے علاوہ یہ روایت مختلف الفاظ سے ان کتابوں میں موجود ہے: البخاری / ۸۹؛ کتاب المغازی؛ باب غزوة خیبر ۔ مسلم ۳/ ۱۳۷۶؛ کتاب الجهاد و السیر؛ باب حکم الفیء ؛سنن ابی داؤد ۳/ ۱۹۲؛ کتاب الخراج الإمارة و الفیء؛ باب في صفایا رسول الله ﷺ؛ سنن الترمذی ۳/ ۸۱؛ کتاب السیر؛ باب ما جاء فی ترکة النبی ﷺ.

مطہرات (رضی اللہ عنہن) نے روایت کی ہے۔ان لوگوں سے یہ روایت مسانید' صحاح ؛ اور دوسری مشہور کتب احادیث میں موجود ہے؛ جسے محدثین کرام اچھی طرح جانتے ہیں ۔اب رافضی کا اس روایت کو منفرد کہنا اس کی انتہائی جہالت یا جان بوجھ کر جھوٹ بولنے پر دلالت کرتا ہے۔

تیسرا جواب :......شیعہ مصنف کا یہ قول کہ:'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ، فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مقروض تھے'' صریح کذب ہے۔ کیونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ کے دعویٰ دار نہ تھے؛ اور نہ ہی اس مال کو اپنے اہل خانہ کے لیے روکنا چاہتے تھے۔ بلکہ آپ کا ترک کردہ مال صدقہ تھا اور وہ ان کو ملنا چاہیے تھا جو اس کے مستحق ہیں۔ جیسا کہ مسجد مسلمانوں کا حق ہے۔اور عدل یہ ہے کہ اگر کوئی انسان کسی دوسرے پر گواہی دے کہ اس نے اپنے گھر کو مسجد کے لیے وقف کرنے کی وصیت کی تھی یا اپنے پانی کے کنوئیں کو عام گھاٹ بنانے یا پھر اپنی زمین کو قبرستان بنانے کی وصیت کی تھی۔تو ایسی گواہی باتفاق مسلمین جائز ہے۔ اس کنوئیں سے پانی پیا جائے گا؛ اور اس زمین میں مردوں کو دفن کیا جائے گا۔اس لیے کہ یہ گواہی عوام کی طرف سے غیر محصور ہے۔ اور گواہ بھی اس عموم کے حکم میں داخل ہے۔ اس کے متعین ہونے کے لیے کسی خاص حکم کی کوئی ضرورت نہیں۔ایسے معاملات میں کوئی فریق مخالف [خصوم] نہیں ہوتا۔

ایسے ہی کسی مسلمان کی بیت المال کے لیے گواہی کا مسئلہ ہے۔مثال کے طور پر کوئی گواہی دے کہ فلاں انسان کے پاس بیت المال کا کوئی حق ہے ؛ اور یہ گواہی دینا کہ فلاں انسان کا بیت المال کے علاوہ کوئی وارث نہیں ؛ اور ذمی پر گواہی دینا کہ اس نے عہد ذمہ توڑ دیا تھا؛ اور اب اس کا مال مالِ فئے کے طور پر بیت المال میں داخل ہوگا؛ وغیرہ۔

اگر کوئی انسان گواہی دے کہ فلاں انسان نے اپنا مال فقراء اور مساکین پر وقف کر دیا تھا تو اس کی گواہی قبول کی جائے گی۔ اگرچہ گواہی دینے والا کوئی فقیر انسان ہی کیوں نہ ہو۔

چوتھا جواب :......حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس صدقہ کے مستحق نہ تھے۔ بلکہ وہ ایسی چیزوں سے بے نیاز انسان تھے۔ اور نہ ہی آپ نے خود اور نہ ہی آپ کے اہل خانہ نے اس صدقہ سے کسی قسم کا فائدہ اٹھایا۔آپ کی مثال ایسے ہی ہے جیسے مالدار لوگوں کی ایک جماعت کسی انسان کے متعلق گواہی دے کہ اس نے اپنا مال فقراء کے لیے صدقہ کرنے کی وصیت کر دی تھی تو ان لوگوں کی گواہی بالاتفاق مقبول ہوگی۔

پانچواں جواب :...... یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اگر اس کا فائدہ یہ حدیث روایت کرنے والے صحابہ کو بھی حاصل ہوتا ہوتو تب بھی ان کی روایت قبول کی جاتی ۔اس لیے کہ اس کا شمار روایت کے باب میں ہوتا ہے گواہی کے باب میں نہیں۔اسی لیے جب محدث کوئی ایسی حدیث بیان کرے جس میں اس کے اور فریق مخالف کے درمیان فیصلہ کن حکم موجود ہوتو اس کی روایت حدیث کو قبول کیا جائے گا۔اس لیے کہ روایت کا حکم عام ہے اس میں راوی اور دوسرے لوگ برابر کے شریک ہوتے ہیں ۔اس کا تعلق خبر کے باب سے ہے۔ جیسے کہ چاند دیکھنے کی گواہی۔اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حکم بیان کیا ہے وہ راوی اور دوسرے لوگوں کے لیے عام ہے۔ ایسے ہی جس چیز سے آپ نے منع کیا ہو؛ یا جس چیز کو مباح قرار دیا ہو۔

یہ حدیث بھی ایک شرعی حکم کی روایت کو متضمن ہے۔اسی وجہ سے یہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لیے بھی میراث کی حرمت کو شامل ہے۔اور یہ میراث کی اشیاء کو آپ کے ورثہ سے خرید نے کی حرمت کو بھی متضمن ہے۔اور اس حدیث میں اس مال کو صدقات کے مصاریف میں خرچ کرنے کے وجوب کا حکم بھی ہے۔

آیات میراث پر بحث:

چھٹا جواب :......شیعہ مصنف نے کہا ہے کہ: حالانکہ اس بارے میں جو کچھ آپ سے روایت کیا گیا ہے قرآن اس کے خلاف کہہ رہا ہے۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یُوۡصِیۡکُمُ اللّٰہُ فِیۡۤ اَوۡلَادِکُمۡ لِلذَّکَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَیَیۡنِ﴾ [النساء ۱۱]

’’اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو وصیت فرماتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دولڑکیوں کے حصے کے برابر ہے۔‘‘

اس حکم کو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر صرف امت کے ساتھ خاص نہیں کیا۔

[جواب]: اس کا جواب یہ ہے کہ: آیت کے الفاظ کے عموم سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وارث بنیں گے۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یُوۡصِیۡکُمُ اللّٰہُ فِیۡۤ اَوۡلَادِکُمۡ لِلذَّکَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَیَیۡنِ فَاِنۡ کُنَّ نِسَآءً فَوۡقَ اثۡنَتَیۡنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَکَ وَ اِنۡ کَانَتۡ وَاحِدَۃً فَلَهَا النِّصۡفُ وَ لِاَبَوَیۡهِ لِکُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَکَ اِنۡ کَانَ لَهٗ وَلَدٌ فَاِنۡ لَّمۡ یَکُنۡ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ فَاِنۡ کَانَ لَهٗۤ اِخۡوَۃٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ﴾ [النساء ۱۱]

’’اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو وصیت فرماتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دولڑکیوں کے حصے کے برابر ہے اور اگر اولادِ میت صرف لڑکیاں ہی ہوں (یعنی دو یا) دو سے زیادہ؛ تو کل ترکے میں انکا دو تہائی اور اگر صرف ایک لڑکی ہو تو اس کا حصہ نصف۔اور میت کے ماں باپ کا یعنی دونوں میں سے ہر ایک کا ترکے میں چھٹا حصہ ہوگا؛ بشرطیکہ میت کی اولاد ہو اور اگر اس کی اولاد نہ ہو اور صرف ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں تو ایک تہائی ماں کا حصہ ہے؛ اور اگر میت کے بھائی بھی ہوں تو ماں کا چھٹا حصہ۔‘‘

دوسری آیت میں ہے:

﴿وَ لَکُمۡ نِصۡفُ مَا تَرَکَ اَزۡوَاجُکُمۡ اِنۡ لَّمۡ یَکُنۡ لَّهُنَّ وَلَدٌ فَاِنۡ کَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَکُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَکۡنَ ....إلی قوله تعالی........ مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِیَّۃٍ یُّوۡصٰی بِهَاۤ اَوۡ دَیۡنٍ غَیۡرَ مُضَآرٍّ﴾

[النساء ۱۱]

’’اور جو مال تمہاری عورتیں چھوڑ مریں، اگر ان کے اولاد نہ ہو تو اس میں نصف حصہ تمہارا ہے اور اگر اولاد ہو تو

ترکے میں تمہارا حصہ چوتھائی ہے......آگے یہاں تک کہ فرمایا......ادائے وصیت وقرض کے بعد؛ بشرطیکہ میت نے ان میں سے کسی کا نقصان نہ کیا ہو۔''

یہ ان لوگوں کے لیے ایک شامل خطاب ہے جو کہ یہاں پر مقصود ہیں۔ اس میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے موجب ظاہر ہوتا ہو کہ رسول اللہ ﷺ بھی اس آیت میں مخاطب ہیں۔

مخاطب کا ''کاف'' ان کو شامل ہوتا ہے جو خطاب سے مقصود ہوں۔ اگر یہ معلوم نہ ہو کہ کوئی خاص اس خطاب سے مقصود ہے تو وہ اس خطاب میں شامل نہیں ہوگا۔ پھر بعض علماء کرام نے یہ بھی کہا ہے کہ ضمائر مطلق طور پر تخصیص کو قبول نہیں کرتے۔ تو پھر ضمیر مخاطب کا کیا حال ہوگا؟ اس لیے کہ ضمیر خطاب تو صرف اس کے لیے ہوتی ہے جو مخاطب کا مقصود ہو؛ یہ ضمیر ان لوگوں کو شامل نہیں ہوتی جن کا قصد نہ کیا جائے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ ضمیر عام ہے' اور تخصیص قبول کرتی ہے؛ تو بلاشبہ یہ ان لوگوں کے لیے عام ہے جو اس خطاب سے مقصود ہیں۔ اس آیت میں کوئی ایک اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کا تقاضا ہو کہ نبی کریم ﷺ بھی ان مخاطبین سے مقصود ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ: تصور کیجیے! تمام ضمائر خطاب؛ متکلم اور غائب بذات خود کسی متعین چیز پر دلالت نہیں کرتیں؛ مگر اپنے قرائن کی روشنی میں ان کی دلالت واضح ہوتی ہے۔ پس ضمائر خطاب ان لوگوں کے لیے وضع کی گئی ہیں جو مخاطب کے خطاب سے مقصود ہو۔ اور ضمائر متکلم کلام کرنے والے کے لیے ہیں خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ لیکن یہ بات معروف ہے کہ قرآن میں خطاب سے مقصود رسول اللہ ﷺ اور تمام مؤمنین ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ [البقرۃ ۱۸۳]

''اے مومنو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَیْدِیَكُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ﴾ [المائدہ ۶]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھولو۔''

اور ایسے ہی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ﴾ [النساء ۱۱]

''اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو وصیت فرماتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے۔''

بلکہ کبھی کبھار قرآن مجید میں جمع کا ''کاف'' نبی کریم ﷺ اور مؤمنین کے لیے آتا ہے۔ اور کبھی کبھار صرف مؤمنین کے لیے آتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاعْلَمُوْا اَنَّ فِیْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ یُطِیْعُكُمْ فِیْ كَثِیْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَیْكُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَیْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ﴾ [الحجرات ۷]

''اور جان رکھو کہ تم میں اللہ کے رسول ہیں اگر بہت سی باتوں میں وہ تمہارا کہا مان لیا کریں تو تم مشکل میں پڑ جاؤ؛ لیکن اللہ نے تمہارے لیے ایمان کو عزیز بنا دیا اور اس کو تمہارے دلوں میں سجا دیا اور کفر اور گناہ اور نافرمانی سے تم کو بیزار کر دیا یہی لوگ راہ ہدایت پر ہیں۔''

یہاں پر کاف صرف امت کے لیے ہے نبی کریم ﷺ کے لیے نہیں۔ اور ایسے ہی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْكُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ﴾ [التوبة ۱۲۸]

''تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں۔ تمہاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے اور تمہاری بھلائی کے بہت خواہشمند ہیں۔ اور مومنوں پر نہایت شفقت کرنیوالے اور مہربان ہیں۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ﴾ [محمد ۳۳]

''مومنو! اللہ کی اطاعت کرو اور پیغمبر کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ ہونے دو۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ [آل عمران ۳۱]

''فرما دیجئے! اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو خود اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرما دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔''

اس طرح کی دیگر مثالیں بھی ہیں۔ ان مواضع پر ''کاف'' خطاب میں رسول اللہ ﷺ شامل نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ان تمام لوگوں کو شامل ہے جن کی طرف آپ کو رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں: ﴿یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْٓ اَوْلَادِكُمْ﴾ بھی ''کاف'' اسی طرح ہے جیسے مذکورہ بالا آیات میں۔ پس سنت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ظاہر قرآن کے مخالف ہو۔ اسی آیت کی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے:

﴿وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا﴾ [النساء ۳-۴]

''اگر تمہیں ڈر ہو کہ یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے تم انصاف نہ رکھ سکو گے تو اور عورتوں میں سے جو بھی تمہیں

اچھی لگیں تم ان سے نکاح کرلو، دو دو، تین تین، چار چار سے، لیکن اگر تمہیں برابری نہ کر سکنے کا خوف ہو تو ایک ہی کافی ہے یا تمہاری ملکیت کی لونڈی یہ زیادہ قریب ہے (کہ ایسا کرنے سے نا انصافی اور) ایک طرف جھکنے سے بچ جاؤ۔اور عورتوں کو ان کے مہر راضی خوشی دے دو ہاں اگر وہ خود اپنی خوشی سے کچھ مہر چھوڑ دیں تو اسے شوق سے خوش ہو کر کھاؤ پیو۔''

ان آیات میں ضمائر جیسے: ﴿ وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ ﴾اور﴿ تُقۡسِطُوۡا ﴾اور﴿فَانۡكِحُوۡا﴾اور﴿ مَا طَابَ لَكُمۡ ﴾ ﴿مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ ﴾ امت کے لیے ہیں؛ نبی کریم ﷺ کے لیے نہیں ۔اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کے لیے جائز تھا کہ آپ چار سے بیویوں سے شادیاں کریں۔اور آپ کو یہ بھی اختیار حاصل تھا کہ بلا مہر شادی کریں۔جیسا کہ نص اور اجماع کی روشنی میں ثابت ہے۔

اگر کوئی یہ بات کہے کہ: جو دلائل تم نے ذکر کیے ہیں ان مثالوں میں ایسے قرآئن موجود ہیں جو ان کے امت کے لیے خاص ہونے کا تقاضا کررہے ہیں ۔پس بیشک آپ ﷺ کی اطاعت کے وجوب کا ذکر کیا جائے ؛ یا آپ کی اطاعت و محبت کے لیے خطاب کیا جائے تو اس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ آپ ﷺ اس خطاب میں شامل نہیں ہیں۔

تو اس اعتراض کرنے والے کو کہا جائے گا: ایسے ہی میراث والی آیت کا حال ہے؛ جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يُوۡصِيۡكُمُ اللّٰهُ فِيۡۤ اَوۡلَادِكُمۡ لِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ﴾ [النساء ۱۱]

''اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو وصیت فرماتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصٰى بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ غَيۡرَ مُضَآرٍّ ﴾ [النساء ۱۲]

''ادائے وصیت و قرض کے بعد؛ بشرطیکہ ان سے میت نے کسی کو کوئی تکلیف نہ دی ہو۔''

پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ وَ مَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ يُدۡخِلۡهُ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا وَ ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ٥ وَمَنۡ يَّعۡصِ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوۡدَهٗ يُدۡخِلۡهُ نَارًا خَالِدًا فِيۡهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ﴾ [النساء ۱۳۔۱۴]

''یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کریگا اسے اللہ تعالیٰ جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہونگی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول (ﷺ) کی نافرمانی کریگا اور اس کی مقررہ حدوں سے آگے نکلے گا اسے وہ جہنم میں ڈال دے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لئے رسوا کن عذاب ہے۔''

جب اللہ تعالیٰ نے ان سے عدم درایت کا خطاب کیا؛ جو کہ رسولوں کے احوال کے متناسب نہیں ہوسکتی ؛ تو پھر اس

کے بعد وہ امور ذکر کیے جن میں ان رسولوں کی اطاعت واجب ہوتی ہے ؛ ان ہی امور میں سے میراث کے حصوں کی مقدار بھی تھی اور یہ کہ اگر وہ ان حدود کو قائم رکھنے کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کریں گے تو ثواب کے مستحق ٹھہریں گے۔ اور اگر اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کریں گے تو سزا کے مستحق ٹھہریں گے۔ یہ مخالفت اس طرح ہوگی کہ کسی وارث کو اس کے مقرر شدہ حصہ سے زیادہ دیا جائے۔ یا وارث جتنے حصہ کا مستحق ہے؛ اس میں سے کچھ حصہ روک لیا جائے۔ آیات مبارکہ دلالت کرتی ہیں کہ ان کے مخاطبین سے درایت کا علم سلب ہے۔ تبھی رسول اللہ ﷺ کی اطاعت پر وعدوں کا ذکر کیا گیا۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرنے پر برے انجام سے ڈرایا گیا ہے۔ حدود میراث میں تجاوز کے خطاب میں رسول اللہ ﷺ شامل نہیں ہیں۔ جیسا کہ اس جیسے دوسرے خطاب کے مواقع پر امت کو خطاب شامل ہے' آپ کو نہیں۔

جب مال وراثت میں مقرر شدہ حصے ذکر کرنے کے بعد حدود سے تجاوز کرنے کی حرمت کا ذکر کیا گیا تو اس سے دلالت واضح ہوتی ہے کہ کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی کے مقررہ شدہ حصہ میں زیادہ کرے؛ اور آیت دلالت کرتی ہے کہ ان ورثاء کے لیے وصیت کرنا بھی جائز نہیں۔ یہ حکم پہلے حکم کا ناسخ ہے جس میں والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لیے وصیت کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا:

''اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق دیدیا ہے۔ اب وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں ہے۔''[1]

یہاں تک کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس حدیث سے آیت وصیت منسوخ ہوئی ہے۔ اس لیے کہ استحقاق میراث اور استحقاق وصیت میں کوئی منافات نہیں پائی جاتی۔ اور نسخ اسی وقت ہوتا ہے جب ناسخ اور منسوخ کے مابین منافات پائی جائے۔

سلف اور جمہور مسلمین کہتے ہیں: یہاں پر ناسخ آیت میراث ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے میراث کے حصے مقرر کر دیے ہیں۔ اور پھر ان حصوں سے تجاوز کرنے سے منع کر دیا ہے۔ پس جب مرنے والا اگر وارث کو اس کے مقرر حصہ سے زیادہ دے گا تو وہ اللہ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنے والا ہوگا۔ اور ایسا کرنا حرام ہے۔ اس لیے کہ جو کچھ اس نے مقرر کردہ حصہ میں زیادہ کیا ہے حقیقت میں وہ دوسرے وارثوں کا اور عصبہ کا حق تھا۔ جب عصبہ کا حق لیا جائے اور اس کو دیا جائے تو ایسا کرنے والا اللہ کے ہاں ظالم ٹھہرے گا۔

اس لیے علمائے کرام کے مابین اس انسان کے مسئلہ میں اختلاف واقع ہوا ہے جس کا کوئی عصبہ نہ ہو۔ تو کیا یہ مال باقی ورثہ پر رد کیا جائے گا یا نہیں؟ جس نے اس رد سے منع کیا ہے؛ انہوں نے کہا ہے: میراث بیت المال کا حق ہے۔ کسی

---

[1] رواه اهل السنن' ابو داؤد ۳/ ۱۵۵؛کتاب الوصايا؛ باب ما جاء : في الوصية للوارث ؛ والترمذي ۳/ ۲۹۳۔کتاب الوصايا؛ باب ما جاء : لا وصية للوارث ؛سنن النسائى ٦/ ٢٠٧ ؛ كتاب الوصايا ؛ باب إبطال الوصية ؛ ورواه اهل سير؛ واتفقت الأمة عليه۔

دوسرے کو دینا جائز نہیں۔اور جنہوں نے جائز کہا ہے؛ وہ اس پر رد کرتے ہوئے کہتے ہیں: اس مال کو بیت المال میں اس وقت رکھا جائے گا جب اس کا کوئی خاص مستحق نہیں ہوگا۔ جب کہ ان لوگوں کے عام اور دیگر خونی [رحمی] رشتہ دار موجود ہیں۔جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے:

''حصہ والے اس کے زیادہ حقدار ہیں جن کا کوئی حصہ نہ ہو۔''

یہاں پر بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ رافضیوں کے لیے یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ وہ اس آیت کے رسول اللہ ﷺ کو شامل ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کرسکیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ: اگر نبی کریم ﷺ کی اولاد میں سے کوئی ایک مر جائے؛ جیسے آپ کی تین بیٹیوں کو انتقال ہوا؛ اور آپ کے بیٹے ابراہیم کا انتقال ہوا؛ تو کیا آپ ان کے وارث بنیں گے؟

جواب: اس آیت میں خطاب موروثین کے لیے ہے' وارثین کے لیے نہیں۔تو اس سے لازم نہیں آتا کہ جب آپ کی اولاد موروثین ہونے کی وجہ سے کاف خطاب میں داخل ہیں؛ تو وارثین میں بھی شامل ہوں۔اس کی وضاحت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ہوتی ہے:

﴿ وَلِاَبَوَیْهِ لِکُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ کَانَ لَهٗ وَلَدٌ﴾ [النساء ۱۱]

'' اور میت کے ماں باپ کا یعنی دونوں میں سے ہر ایک کا ترکے میں چھٹا حصہ ہوگا؛ بشرطیکہ میت کی اولاد ہو۔''

اللہ تعالیٰ نے یہاں پر غائب کی ضمیر کے ساتھ ذکر کیا ہے' ضمیر خطاب کے ساتھ نہیں۔پس نبی کریم ﷺ کے علاوہ آپ کی اولاد یا باقی لوگوں سے میں جتنے بھی موروث ہیں سب کو شامل ہے۔ نبی کریم ﷺ ان مخاطبین کے وارث تھے۔ اور آپ کو اس طرح خطاب نہیں کیا گیا ہے کہ کوئی آپ کا وارث بنے۔ نبی کریم ﷺ کی اولاد بھی ان میں سے ہیں جن کو کاف خطاب شامل ہے۔تو ان کو وصیت کی گئی ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہوگا۔ پس حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اللہ تعالیٰ کی وصیت ہے کہ بیٹوں کے لیے دو لڑکیوں کے برابر حصہ ہے۔اور ان کے والدین کے لیے اگر [اولاد] والدین کی موجودگی میں فوت ہوجائیں؛ تو ان میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے۔

❀ اگر یہ کہا جائے کہ: آیت زوجین میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:'' تم [شوہروں کے لیے] اور ان [بیویوں کے لیے]۔''

جواب: پہلی بات یہ ہے کہ: نبی کریم ﷺ کی بیویاں آپ کی وارث نہیں بنیں اور نہ ہی آپ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ آپ کے وارث بنے؛ بس صرف آپ کی اکیلی بیٹی ہی آپ کی وارث بنی تھی۔

دوسری بات:...... اس آیت کے نزول کے بعد آپ ﷺ کی کسی ایسی بیوی کے مرنے کا علم نہیں ہوسکا جس کے پاس مال ہو اور آپ اس کے وارث بنیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال مکہ میں ہوگیا تھا۔اور زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا الہلالیہ کا انتقال مدینہ میں ہوا؛ لیکن ہمیں کہاں سے پتہ چلے گا کہ آپ نے کوئی مال بھی چھوڑا تھا؟ اور اس سے پہلے آیت

فرائض نازل ہوچکی تھی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ان سب کو شامل ہے:

﴿وَ لَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ﴾ [النساء ۱۱]

''اور جو مال تمہاری عورتیں چھوڑ مریں تو اس میں نصف حصہ تمہارا ہے۔''

یہ خطاب عام ہے تم میں سے جس کی بھی بیوی مرے، اور اسکا کوئی ترکہ ہو۔ پس اگر کسی کی بیوی مری ہی نہیں، یا اگر مری ہے تو اس نے اپنے پیچھے کوئی مال نہیں چھوڑا تو ایسا انسان اس کاف خطاب میں شامل نہیں ہے۔

اگر اس کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو اس سے لازم نہیں آتا کہ ایک کاف کے شامل ہونے کی وجہ سے دوسرے کاف کا شمول بھی لازم آئے گا۔ بلکہ یہ امر دلیل پر موقوف ہے۔

اگر یہ کہا جائے: تم کہتے ہو: ''جو احکام آپ کے حق میں ثابت ہیں؛ وہ آپ کی امت کے حق میں بھی ثابت ہیں۔ اور ایسے ہی اس کے برعکس۔ پس بیشک جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا حکم دیتے ہیں تو وہ تمام امت کو شامل ہوتا ہے۔ یہ بات شارع کی عادت سے معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا﴾ [الأحزاب ۳۷]

''پس جب زید نے اس عورت سے اپنی غرض پوری کرلی تو ہم نے اسے آپ کے نکاح میں دے دیا تاکہ مسلمانوں پر اپنے لے پالک کی بیویوں کے بارے میں کسی طرح تنگی نہ رہے جب کہ وہ اپنی غرض ان سے پوری کرلیں۔''

اللہ تعالیٰ نے اسے آپ کے لیے حلال کردیا ہے تاکہ آپ کی امت کے لیے بھی حلال ہوجائے۔ آپ کو اس حلت میں خاص نہیں کیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اگلے حکم میں ارشاد فرمایا:

﴿وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [الأحزاب ۵۰]

''اور وہ باایمان عورت جو اپنا نفس نبی کو ہبہ کردے یہ اس صورت میں کہ خود نبی بھی اس سے نکاح کرنا چاہے یہ خاص طور پر صرف آپ کے لئے ہی ہے اور مومنوں کے لئے نہیں۔''

تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ یہ کاف آپ کو شامل نہیں ہے؟

جواب: شارع کی عادت سے معلوم ہے کہ جب اس کی طرف سے خطاب آتا ہے تو وہ عام اور شامل ہوتا ہے۔ جیسا کہ بادشاہوں کی عادت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ کسی امیر کو کوئی حکم دیتے ہیں، تو اس امیر یا عامل کے امثال و نظائر بھی اس میں مخاطب ہوتے ہیں۔ تو یہ عادت اور استقراء سے مخاطب کے لیے کئے گئے خطاب سے معلوم ہوتی ہے۔ جیسا کہ الفاظ کے معانی اہل لغت کے ہاں استقراء و تتبع سے معلوم ہوتے ہیں کہ ان کے ہاں فلاں کلمے کا یہ معنی لیا

جاتا ہے۔

پس قرآن کریم کی عادت مبارک ہے کہ جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے مختلف رنگ واسلوب اختیار کرتا ہے۔کبھی یہ خطاب رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کو شامل ہوتا ہے اور کبھی شامل نہیں ہوتا۔تو اس سے واجب نہیں آتا کہ اس موقع پر بھی یہ خطاب آپ ﷺ کو شامل ہو۔مدعی کے دعوی کی آخری حد یہ ہوسکتی ہے کہ: اصل میں ''کاف'' خطاب آپ کو بھی شامل ہے۔جیسا کہ اصل میں آپ ﷺ ساری امت کے ساتھ احکام میں برابر ہیں۔اوراحکام شریعت میں آپ اس امت کے ساتھ مساوی ہیں۔یہاں تک کہ کسی مسئلہ کے آپ کے ساتھ خاص ہونے کی کوئی دلیل مل جائے۔یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بہت سارے خصائص ہیں جو باقی امت کے برعکس صرف آپ کی ذات کے ساتھ خاص ہیں۔اہل سنت والجماعت کہتے ہیں: یہ بھی آپ کی خصوصیت ہے کہ آپ وراثت نہیں چھوڑتے۔پس کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اس حکم میں آپ کی خصوصیت کا انکار کرے؛ یہ انکار وہی کرسکتا ہے جو باقی تمام خصوصیات کا انکار کرتا ہو۔لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ کسی بھی انسان کو حق حاصل ہے کہ وہ آپ کی خصوصیت کے لیے دلیل طلب کرے۔بطور دلیل اس بارے میں صحیح اور مشہور بلکہ متواتر احادیث موجود ہیں کہ آپ نے وراثت نہیں چھوڑی۔آپ کے اختصاص میں مروی اہم ترین احادیث میں سے مال فئے کے آپ کے ساتھ خاص ہونے کی احادیث ہیں۔

سلف وخلف میں بہت سارے احکام کے متعلق اختلاف موجود ہے کہ کیا یہ احکام آپ کے ساتھ خاص تھے؟ جیسا کہ فئے اور خمس کے متعلق اختلاف ہے کہ کیا یہ مال آپ کی ملکیت ہوا کرتا تھا یا نہیں؟ اور کیا جو عورتیں آپ پر حرام تھیں وہ آپ کے لیے مباح کردی گئی تھیں یا نہیں؟ لیکن سلف وخلف کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ آپ نے کوئی وراثت نہیں چھوڑی؛ کیونکہ یہ مسئلہ آپ سے صاف ظاہر منقول اور اصحاب کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں مشہور تھا۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ﴾ (الانفال ۱)

'' وہ تجھ سے غنیمتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دے غنیمتیں اللہ اور رسول کے لیے ہیں۔''

اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ ﴾ (الانفال ۴۱)

''اور جان لو کہ بے شک تم جو کچھ بھی غنیمت حاصل کرو تو بے شک اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور قرابت دار اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کے لیے ہے۔''

اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿مَاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتَامٰی

وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾ (الحشر۷)

''جو کچھ بھی اللہ نے ان بستیوں والوں سے اپنے رسول پر لوٹایا تو وہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور قرابت دار اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کے لیے ہے۔''

آیت کریمہ میں لفظ فئے بالکل ویسے ہی ہے جیسے لفظ خمس ۔سورۃ انفال کے نزول کا سبب بدر کا واقعہ تھا۔تو اس میں اموال غنیمت بلا شک وشبہ داخل ہیں۔اور اس میں وہ تمام اموال فئے بھی شامل ہیں جو اللہ تعالیٰ کفار کے مال میں سے مسلمانوں پر انعام کرتے ہیں۔اور جیسے لفظ ''فئے'' سے وہ تمام اموال مراد لئے جاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو بغیر جنگ کے عطا کرتے ہیں ؛ تو غنیمت کا مال بھی اس میں شامل ہوتا ہے۔اور کبھی یہ صرف اس مال فئے کی حد تک خاص ہوتا ہے جو بغیر لڑائی اور قتال کے ہاتھ آجائے۔جس پر سوار یا پیادے نہ دوڑے ہوں۔ پہلے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان گرامی ہے:

''جو کچھ اللہ تعالیٰ نے مجھے مال فئے دیا ہے' اس میں سے میرا صرف پانچواں حصہ ہے۔اور یہ پانچواں حصہ بھی آپ لوگوں کی ہی واپس دیا جاتا ہے۔''[1]

یہ خمس اور فئے کے بارے میں ہے۔پس یہاں پر رسول اللہ ﷺ کی طرف اضافت اس حیثیت سے ہے؛ اسی لیے علماء کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس اضافت کا تقاضا ہے کہ آپ ﷺ اس مال کے ایسے ہی مالک ہیں جیسے تمام لوگوں کی املاک ہوتی ہیں۔اور پھر اس میں سے اموال غنیمت کو لڑنے والے مجاہدین کے لیے خاص کر دیا گیا۔اور اس میں سے پانچواں حصہ ان لوگوں کا ہے جن کا نام لے کر قرآن میں ذکر آیا ہے۔ باقی رہ گیا مال فئے یا بقیہ چار حصے تو وہ رسول اللہ ﷺ کی ملکیت ہیں؛ جیسا کہ امام شافعی اور امام أحمد رحمہما اللہ کے اصحاب میں سے ایک گروہ کا خیال ہے؛ کہ اسے فئے میں لوٹایا جائے گا۔ جب اکثر علماء کہتے ہیں: مال فئے میں سے خمس نہیں نکالا جائے گا۔اس کے خمس کا صرف امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے اصحاب میں سے کچھ لوگوں نے کہا ہے؛ جیسے امام خرقی۔جبکہ امام مالک؛ امام ابو حنیفہ اور امام احمد رحمہم اللہ؛ اور ان کے جمہور اصحاب؛ اور دیگر تمام ائمہ مسلمین کے نزدیک مال فئے میں سے خمس نہیں نکالا جائے گا۔فئے اس مال کو کہتے ہیں: جو مشرکین سے لڑے بغیر حاصل ہو؛ جیسے جزیہ اور خراج۔

علماء کے ایک دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ اس اضافت کا تقاضا نہیں کرتی کہ آپ ﷺ اس مال کے مالک ہوں؛ بلکہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا نظام اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ ہے۔اور آپ ﷺ اللہ کے حکم سے اس مال کو تقسیم کرتے ہیں۔جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

---

[1] سنن النسائي:۷/ ۱۱۹؛کتاب قسم الفيء؛ وفي سنن بي داود:۳/ ۱۰۹ کتاب الجهاد، باب في الإمام يستأثر بشيء من الفيء لنفسه؛ صحيح الجامع الصغير:٦/ ۲۷۲؛ سلسلة الأحاديث الصحيحة:۲/ ۵۸۷؛ جاء الحديث مرسلا عن عبد الله بن عمرو في: الموطأ:۲/ ٤٥۷؛ کتاب الجهاد، باب ما جاء في الغلول.

''اللہ کی قسم! میں تم میں سے کسی کو نہ کچھ دیتا ہوں اور نہ ہی کسی سے کچھ روکتا ہوں؛ بلکہ میں تقسیم کرنے والا ہوں؛ میں وہیں پر رکھتا ہوں جہاں کا مجھے حکم دیا جاتا ہے۔''❶

اور ایک دوسری صحیح حدیث شریف میں ہے؛ آپ ﷺ نے فرمایا:

''میرے نام پر نام رکھو؛ اور میری کنیت پر کنیت نہ رکھو؛ بیشک میں تقسیم کرنے والا ہوں؛ جو تمہارے مابین تقسیم کرتا ہوں۔''❷

پس رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے اوامر ونواہی پہنچانے والے ہیں۔ پس جس مال کی نسبت اللہ اور اس کے رسول کی طرف کی گئی ہو؛ وہ ایسا مال ہے جو ان جگہوں پر خرچ ہوگا جہاں کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے؛ خواہ وہ واجب ہو یا مستحب۔ بخلاف ان اموال کے جن کا مالک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بنادیتے ہیں۔ ان کے لیے اس مال کا مباح امور میں خرچ کرنا جائز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ معاہدہ کرنے والے غلاموں کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿ وَّآتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ آتَاكُمْ ﴾ (النور ۳۳)

''اور انھیں اللہ کے مال میں سے دو جو اس نے تمھیں دیا ہے۔''

اکثر علماء جیسے امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ اور دیگر حضرات کا کہنا ہے کہ: ''تمہیں دیا ہے'' سے مراد وہ اموال ہیں جن کا مالک اللہ تعالیٰ نے بندوں کو بنایا ہے۔ کیونکہ اس مال کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب نہیں کیا گیا جیسے دوسری جگہ پر دوسرے مال کو منسوب کیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ مال صرف وہاں پر خرچ کیا جائے گا جہاں کا حکم اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے۔

نفلی اموال اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے ہیں؛ کیونکہ ان کی تقسیم اللہ اور رسول کے مرضی کے مطابق ہوتی ہے۔ وہ ان اموال وراثت کی طرح نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے مستحقین میں تقسیم کردیے ہیں۔ یہی حکم مال خمس اور مالِ فئے کا بھی ہے۔

مال خمس اور مالِ فئے کے متعلق علماء کرام کا اختلاف ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور دیگر علماء کہتے ہیں: ان دونوں قسم کے اموال کا مصرف ایک ہی ہے۔ یہ اللہ اور اس کے رسول کا اختیار ہے۔ اور کچھ اصناف اس کے لیے متعین کردی گئی ہیں؛ جیسے ایتام؛ مساکین؛ مسافر؛ انہیں بالخصوص ذکر کیا گیا ہے۔ اور امام احمد رحمہ اللہ سے بھی اس کی موافقت روایت کی گئی ہے۔

❶ البخاري:٤/ ٨٥؛ في المسند ط. الحلبي:٢/ ٤٨٢: ونصه فيه:" والله ما أعطيكم ولا أمنعكم، وإنما أنا قاسم أضعه حيث أمرت. وقال ابن حجر في تعليقه على حديث البخاري فتح الباري: ٦/ ٢١٨.

❷ البخاري:٤/ ٨٤؛ كتاب فرض الخمس، باب قول الله تعالى: فإن لله خمسه؛ مسلم:٣/ ١٦٨٢؛كتاب الآداب، باب النهي عن التكنية بأبي القاسم؛ سنن أبي داود:٤/ ٣٩٩كتاب الأدب، باب في الرجل يتكنى بأبي القاسم، باب من رأى أن لا يجمع بينهما، باب في الرخصة في الجمع بينهما؛ سنن الترمذي:٤/ ٢١٤كتاب الأدب، باب ما جاء في كراهية الجمع بين اسم النبي ﷺ وكنيته؛ المسند ط. المعارف الرقم:٧٣٠.

آپ خمس کے مال کو معدنیات اور ذخائر کی طرح سمجھتے ہیں۔ اور یہ مال فئے مال غنیمت کے خمس کے تابع ہے۔ جب کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کے تین حصے کیے جائیں گے۔ آپ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے قرابت داروں کے حصہ کو ساقط قرار دیتے ہیں۔ اور داؤد بن علی رحمہ اللہ کا کہنا ہے: بلکہ مال فئے کو بھی پانچ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ جبکہ پہلا قول صحیح ترین قول ہے۔ جیسا کہ یہ تفصیل اپنی جگہ پر گزر چکی ہے۔ اور سنت رسول اللہ ﷺ اور سنت خلفائے راشدین اسی پر دلالت کرتی ہے۔

فرمان ربانی: ﴿فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ﴾ ''تو وہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے'' یہ خمس اور فئے سے متعلق ہے۔ جیسا کہ انفال کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے: ﴿لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ﴾ اس مال کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ ان اموال کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے تقسیم کرتے ہیں۔ یہ اموال کسی کی ملکیت نہیں ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''اللہ کی قسم! میں تم میں سے کسی کو نہ کچھ دیتا ہوں اور نہ ہی کسی سے کچھ روکتا ہوں؛ بلکہ میں تقسیم کرنے والا ہوں؛ میں وہیں پر رکھتا ہوں جہاں کا مجھے حکم دیا جاتا ہے۔'' [سبق تخریجہ]

یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ آپ ان اموال کے مالک نہیں؛ بلکہ آپ ﷺ ان میں اللہ تعالیٰ کے حکم کو نافذ کرنے والے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اختیار دیا تھا کہ آپ بادشاہ نبی بن جائیں یا پھر اللہ تعالیٰ کے متواضع بندے اور رسول بن جائیں تو آپ نے متواضع بندہ اور رسول بن جانے کو اختیار فرمایا۔ یہ ان دونوں منزلتوں میں سے اعلیٰ ترین منزلت ہے۔ بادشاہ مال کو اپنی پسند میں خرچ کرتا؛ اس کا اس پر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ جب کہ متواضع بندہ رسول مال کو صرف اس جگہ پر خرچ کرتا ہے جہاں کا اسے حکم دیا جائے۔ پس اس لحاظ سے آپ جو بھی کام کرتے؛ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی اطاعت ہوتی۔ آپ کی تقسیم میں کوئی ایسا مباح امر نہیں ہوتا تھا جس پر آپ کو ثواب نہ ملے۔ بلکہ آپ کو ہر ایک کام پر ثواب ملتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے:

''جو کچھ اللہ تعالیٰ نے مجھے مال فئے دیا ہے' اس میں سے میرا صرف پانچواں حصہ ہے۔ اور یہ پانچواں حصہ بھی آپ لوگوں کی ہی واپس دیا جاتا ہے۔''[1]

یہ حدیث اس کی تائید کرتی ہے۔ اس لیے کہ حدیث میں لفظ: ''اس میں سے میرا'' کا مطلب ہے کہ اس کا معاملہ میرے ذمہ ہے۔ اسی لیے فرمایا: ''اور یہ پانچواں حصہ بھی آپ لوگوں کی ہی واپس دیا جاتا ہے۔''

اس اصل کی بنیاد پر آپ کے ہاتھ میں جو بھی اموال تھے؛ اموال بنی نضیر؛ فدک؛ خیبر کا خمس وغیرہ؛ یہ تمام اموال

---

[1] سنن أبي داؤد ۳/ ۱۰۹ ـ کتاب الجهاد ؛ باب في الإمام يستأسر بشئي من الفئی لنفسه ـ و الحديث صحيح ؛ صححه الألباني في صحيح الجامع الصغير ٦/ ۲۷۲ ـ والنسائی ۷/ ۱۱۹ ـ کتاب قسم الفئی ـ الموطأ ۲/ ٤٥٧ .

مالِ فئے تھے؛ جوکہ آپ کی ملکیت نہیں تھے؛ اس وجہ سے وہ آپ کی طرف سے کسی کو وراثت میں نہیں ملیں گے۔ وراثت میں تو وہ مال ملتا جو آپ کی ملکیت ہوتا۔ بلکہ ان اموال کے متعلق واجب تھا کہ انہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے پسندیدہ اور محبوب کاموں میں خرچ کیا جائے گا۔ یہی بات تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے تھے۔

رہی وہ روایات جن کی بنا پر یہ گمان کیا جاتا ہے کہ آپ اس مال کے مالک تھے۔ جیسے کہ وہ مال جس کا ایک حصہ حضرت مخیریق کو دینے کی وصیت کی تھی؛ تو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ: اس مال کا حکم پہلے مال کا ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ مال آپ کی ملکیت تھا۔ لیکن اس میں اللہ تعالیٰ کا حکم یہ تھا اس میں سے اپنی ضرورت کے مطابق لے لیا کریں اور جو ضرورت سے بچ جائے وہ صدقہ ہوگا' اسے وراثت میں نہیں دیا جائے گا۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''میرے ورثہ درہم و دینار تقسیم نہیں کریں گے۔ جو کچھ میں اپنے بعد چھوڑوں گا وہ میری بیویوں کا خرچہ ہوگا اور میرے عمال کی محنت مزدوری ہوگی [جو اس سے بچ جائے] وہ صدقہ ہوگا۔'' ❶

اور صحیحین میں ہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''ہم وراثت نہیں چھوڑتے؛ جو کچھ ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔'' ❷

اسے امام بخاری رحمہ اللہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی ایک جماعت سے نقل کیا ہے جن میں سے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی ہیں اور امام مسلم نے بھی آپ سے اور دوسرے صحابہ کرام سے یہ حدیث نقل کی ہے۔

یہ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے سیاق میں واقع ہے: [اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں]:

﴿ وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝ وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ﴾ [النساء ۳۔۴]

''اگر تمہیں ڈر ہو کہ یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے تم انصاف نہ رکھ سکو گے تو دیگر عورتوں میں سے جو بھی تمہیں اچھی لگیں تم ان سے نکاح کر لو، دو دو، تین تین، چار چار سے، لیکن اگر تمہیں برابری نہ کر سکنے کا خوف ہو تو ایک ہی کافی ہے یا تمہاری ملکیت کی لونڈی؛ یہ زیادہ قریب ہے (کہ ایسا کرنے سے ناانصافی اور) ایک طرف جھکنے سے بچ جاؤ۔ اور عورتوں کو ان کے مہر راضی خوشی دے دو ہاں اگر وہ خود اپنی خوشی سے کچھ مہر چھوڑ دیں تو اسے شوق سے خوش ہو کر کھاؤ پیو۔''

---

❶ البخاري ٤/ ١٢ـ كتاب الوصايا؛ باب نفقة القيم للوقف؛ مسلم ٣/ ١٣٨٢ـ كتاب الجهاد والسير؛ باب قول النبي ﷺ لا نورث؛ سنن أبي داؤد ٣/ ١٩٨؛ كتاب الخراج الإمارة و الفئي؛ باب صفايا الرسول ﷺ۔

❷ البخاري ٨/ ١٢٥؛ ومسلم ٣/ ١٣٧٩ـ وسبق تخريجه .

یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم ارشاد فرمایا:

﴿یُوْصِیْکُمُ اللّٰهُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ﴾ [النساء ۱۱]

''اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو وصیت فرماتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دولڑکیوں کے حصے کے برابر ہے۔''

یہ بات معلوم شدہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اس آیت میں مخاطب نہیں ہیں۔اس لیے کہ آپ ﷺ کے لیے دو تین یا چار بیویاں نہیں تھیں۔ بلکہ آپ کو یہ اختیار حاصل تھا کہ اس سے زیادہ جتنی بھی چاہیں شادیاں کرلیں۔اور نہ ہی آپ کو یہ حکم تھا کہ بیویوں کو ان کا مہر پورا پورا ادا کریں۔ بلکہ آپ کو اختیار حاصل تھا کہ اگر کوئی عورت اپنا نفس آپ کو ہبہ کردے تو آپ اسے بغیر مہر کے قبول کرسکتے تھے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِیْٓ اٰتَیْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَ مَا مَلَکَتْ یَمِیْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَیْكَ وَ بَنٰتِ عَمِّكَ وَ بَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَ بَنٰتِ خَالِكَ وَ بَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِیْ هَاجَرْنَ مَعَكَ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِیِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِیُّ اَنْ یَّسْتَنْکِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَیْهِمْ فِیْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ لِکَیْلَا یَکُوْنَ عَلَیْكَ حَرَجٌ وَّ کَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا﴾ [الأحزاب ۵۰]

''اے نبی! ہم نے آپ کے لئے وہ بیویاں حلال کر دی ہیں جنہیں آپ ان کے مہر دے چکے ہیں؛ اور وہ لونڈیاں بھی جو اللہ تعالی نے غنیمت میں آپ کو دی ہیں اور آپ کے چچا کی لڑکیاں اور پھوپھیوں کی بیٹیاں اور آپ کے ماموں کی بیٹیاں اور آپ کی خالاؤں کی بیٹیاں بھی جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہے اور وہ باایمان عورت جو اپنا نفس نبی کو ہبہ کر دے یہ اس صورت میں کہ خود نبی بھی اس سے نکاح کرنا چاہے یہ خاص طور پر صرف آپ کے لئے ہی ہے اور مومنوں کے لئے نہیں ہم اسے بخوبی جانتے ہیں جو ہم نے ان پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کی بابت احکام مقرر کر رکھے ہیں یہ اس لئے کہ آپ پر حرج واقع نہ ہو اللہ تعالی بہت بخشنے والا اور بڑے رحم والا ہے۔''

جب یہ سیاق کلام ہے' تو اس سے واضح ہوگیا کہ یہ [سابقہ آیت میں] خطاب امت کے لیے ہے آپ کے لیے نہیں ؛ آپ اس آیت کے عموم میں داخل نہیں ہیں۔

❀ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ: اس آیت [سابقہ] میں خطاب عام ہے جو کہ آپ ﷺ کو اور امت کو شامل ہے؛ مگر اسے آیت نکاح اور آیت مہر سے خاص کیا گیا ہے۔

جواب: تو اس سے کہا جائے گا: ایسے ہی آیت میراث سے بھی اس حکم کو خاص کیا گیا ہے۔ جو کچھ بھی تم اس کے جواب میں کہو گے وہی تمہارے اعتراض کا جواب ہوگا۔ بھلے آپ یہ کہو کہ آیت کے الفاظ آپ کو شامل ہیں اور پھر آپ کو

اس سے خاص کیا گیا ہے۔ یا پھر یہ کہا جائے کہ: یہ آیت آپ کو شامل نہیں ہے؛ اس لیے کہ آپ اس کے مخاطبین میں سے نہیں تھے۔ یہی بات اس موقع پر بھی کہی جائے گی۔

ساتویں وجہ:......اس آیت کا مقصود یہ بیان کرنا نہیں کہ کون وارث بنے گا اور کون وارث نہیں بنے گا اور نہ ہی اس میں وارث اور موروث کے احوال واوصاف کا بیان ہے۔ بلکہ یہاں پر مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ مالِ موروث اس تفصیل کیساتھ ورثاء میں تقسیم کیا جائے گا۔ پس یہاں پر مقصود یہ ہے کہ ان حصہ داروں کو جب وہ وارث بنیں تو اس تفصیل کے ساتھ حصے دیے جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر مرنے والا مسلمان ہو؛ اوراس کے ورثاء کافر ہوں تو تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ وہ کفار اس مسلمان کے وارث نہیں بنیں گے۔ اور ایسے ہی اگر مرنے والا کافر ہو اور اس کے اقرباء مسلمان ہوں تو بھی وہ اس کے مال کے وارث نہیں بنیں گے؛ جمہور مسلمین کا یہی مسلک ہے۔ ایسے ہی اگر مرنے والا غلام ہو اور اس کے ورثہ آزاد ہوں' یا مرنے والا آزاد ہو اور اس کے ورثہ غلام ہوں؛ اور ایسے ہی جان بوجھ کر کسی کو قتل کرنے والا بھی جمہور مسلمین کے نزدیک وارث نہیں بنیں گے۔ ایسے ہی غلطی سے قتل کرنے والا دیت میں وارث نہیں بنے گا۔ اس طرح کے باقی مسائل میں بھی اختلاف ہے۔ جب یہ علم حاصل ہو گیا کہ مرنے والوں میں بعض ایسے بھی ہونگے جنکی اولاد ان کی وارث بنے گی اور بعض کی اولاد ان کی وارث نہیں بنے گی۔ آیت نے اس کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی کہ کون اس کا وارث بنے گا اور کون اس کا وارث نہیں بنے گا۔ اور نہ ہی وارث اور موروث کے کوئی اوصاف واحوال بیان ہوئے ہیں۔ تو اس سے معلوم ہوا یہاں پر مقصود اس کی تفصیل کا بیان کرنا نہیں' بلکہ ان وارثوں کے حقوق بیان کرنا ہے۔ پس اس آیت میں یہ بیان نہیں ہوا کہ کون وارث بنے گا اور کس کا وارث بنے گا۔ اس میں کوئی ایسی دلالت نہیں ہے کہ غیر نبی وارث بنے گا یا اسے وراثت نہیں دی جائے گی۔ تو پھر اس میں نبی کریم ﷺ کے موروث نہ ہونے پر دلالت بدرجہ اولی موجود ہے۔

ایسے ہی رسول اللہ ﷺ کا فرمان گرامی ہے:

''اس زمین میں عشر ہے، جسے آسمان یا چشمہ کا پانی سیراب کرے یا خود بخود سیراب ہو اور جس زمین کو کنوئیں سے سیراب کیا جائے، اس میں بیسواں حصہ واجب ہے۔''[1]

اگر اس سے مقصود یہ فرق کرنا ہو کہ کس چیز میں دسواں حصہ واجب ہے؛ اور کس چیز میں بیسواں حصہ واجب ہے؛ اور یہ بیان مقصود نہیں کہ ان میں سے کسی ایک میں کیا واجب ہے اور کیا واجب نہیں ہے؛ یہی وجہ ہے کہ اس حدیث کے عموم سے سبزیوں میں زکاۃ کے واجب ہونے پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

فرمان الٰہی ہے:

[1] البخاري:۲/ ۱۲٦؛ کتاب الزکاۃ، باب العشر فیما یسقی من ماء السماء؛ مسلم:۲/ ٦۷۵؛کتاب الزکاۃ، باب ما فیه العشر و نصف العشر؛ سنن أبي داود:۲/ ۱٤۵؛کتاب الزکاۃ، باب صدقة الزرع؛ سنن الترمذي؛کتاب الزکاۃ، باب ما جاء في الصدقة فیما یسق بالنهار وغیرها۔

﴿وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ [البقرۃ ۲۷۵]

''اور اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا ہے؛ اور سود کو حرام۔''

یہاں پر تجارت اور سود میں فرق بتانا مقصود ہے۔ یہ کہ ان میں سے ایک میں حرام ہے اور دوسرا حلال۔ یہاں پر یہ بیان مقصود نہیں کہ کس چیز کی تجارت جائز ہے اور کس کی ناجائز۔ پس اس آیت کے عموم سے ہر ایک چیز کے بیچنے پر استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ اور جس کسی کا خیال یہ ہو کہ ''اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا ہے'' یہ حکم مردار؛ خنزیر اور شراب اور کتے؛ اور لونڈی اور وقف اور دوسرے کی ملکیت؛ اور پھلوں کی پکنے سے پہلے کی خرید و فروخت کو شامل ہے؛ تو یقیناً وہ غلطی کا ارتکاب کر رہا ہے۔

آٹھویں وجہ:......اس سے کہا جائے گا: تصور کیجیے! اس آیت کے الفاظ عام ہیں۔ اور اس میں سے کسی کافر بیٹے؛ یا غلام یا قاتل کو ایسے دلائل سے خاص کیا گیا ہے جو ان دلائل سے کمزور تر ہیں جن کی روشنی میں نبی کریم ﷺ کو اس آیت کے عموم سے خارج کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ جن صحابہ کرام نے یہ حدیث نبی کریم ﷺ سے نقل کی ہے کہ: آپ وراثت نہیں چھوڑتے۔'' وہ ان صحابہ سے زیادہ جلیل القدر اہل علم اور کثرت کے ساتھ ہیں جنھوں نے یہ روایت نقل کی ہے کہ کافر مسلمان کا وارث نہیں بنے گا۔ یا قاتل کو میراث نہیں ملے گی۔ اور یہ کہ جو کوئی اپنے غلام کو فروخت کرے؛ اور اس غلام کا کچھ مال بھی ہو، تو وہ مال بیچنے والے کا ہوگا سوائے اس صورت کے کہ خریدنے والا اس مال کی شرط بھی لگائے۔

خلاصہ کلام! جب یہ آیت کسی نص سے یا اجماع سے مخصوص ہے تو پھر کسی دوسری نص سے اس کی تخصیص کرنا باتفاق مسلمین جائز ہے۔ بلکہ علمائے کرام رحمہم اللہ کے ایک گروہ کا نکتہ نظر یہ ہے کہ عام مخصوص مجمل ہی باقی رہے گا۔ عموم قرآن جب کہ خبر واحد سے مخصص نہ ہو تو اس کی تخصیص کی بابت علماء کا اختلاف ہے۔ جب کہ عامِ مخصوص کی تخصیص عام خبر واحد سے کی جاسکتی ہے؛ خصوصاً ایسی خبر جسے قبول عام حاصل ہو۔ بلا شک و شبہ وہ اس سے عموم قرآن کی تخصیص پر متفق ہیں۔

❀ اس خبر کو صحابہ کرام میں قبول عام حاصل رہا ہے؛ اور اس پر عمل کرنے پر ان کا اجماع ہے۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

❀ مستفیض نصوص اور اجماع سے تخصیص متفق علیہ مسئلہ ہے۔ جو لوگ اس مسلک پر چلتے ہیں وہ کہتے ہیں: ظاہر آیت عموم کا فائدہ دیتی ہے؛ لیکن یہ عموم مخصوص ہے۔ اور جو حضرات پہلے مسلک پر عمل پیرا ہیں؛ وہ اس عموم کے ظہور کو صرف ان لوگوں تک تسلیم کرتے ہیں جن کے بارے میں علم ہو کہ وہ وارث بنیں گے۔ اور یہ نہیں کیا جائے گا کہ: اس کا ظاہر متروک ہے۔ بلکہ ہم کہتے ہیں: یہاں پر مقصود صرف وارث کے حصے کا بیان ہے۔ اس حال کا بیان نہیں جس میں وراثت ثابت ہوگی۔ پس آیت مرنے والوں کے ورثاء اولاد میں عام ہے؛ اور موروثین میں مطلق۔ جب کہ اس آیت میں وراثت کی شروط سے تعرض نہیں کیا گیا۔ بلکہ یہ آیت میں مطلق ہیں؛ نہ ہی اس میں نفی کی دلیل ہے اور نہ ہی اثبات کی۔ جیسا کہ حکم ربانی ہے:

﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ﴾ (التوبة ٥]

''مشرکین کو جہاں کہیں پاؤ؛ انہیں قتل کر ڈالو۔''

یہ حکم ربانی اشخاص میں عام ہے: اور جگہ اور احوال میں مطلق ہے۔ پس جو خطاب اس مطلق کو مقید کرنے والا ہوگا؛ وہ اس شرعی حکم کے بیان سے شروع ہوگا جس سے پہلے کوئی ایسی چیز نہ گزری ہو جو اس کے منافی ہو۔ اور نہ ہی اس ظاہری خطاب شرعی کو ختم کرنے والا اور اس اصل کا مخالف ہو۔

نویں وجہ:...... نبی کریم ﷺ کا وراثت نہ چھوڑنا قطعی دوٹوک سنت اور اجماع صحابہ سے ثابت ہے۔ سنت اور اجماع میں سے ہر ایک دلیل قطعی ہے۔ اس کا مقابلہ کسی ایسی روایت سے نہیں کیا جاسکتا جس کے عام ہونے کے بارے میں گمان کیا جاتا ہو۔ اگر ایسا کوئی عموم ہو بھی تو نبی کریم ﷺ کا مسئلہ مخصوص ہے۔ اور اگر اسے دلیل تسلیم بھی کرلیا جائے تو یہ دلیل ظنی ہوگی۔ دلیل قطعی کو دلیل ظنی سے ختم نہیں کیا جاسکتا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس روایت کو کئی ایک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے مختلف اوقات اور مختلف مجالس میں بیان کیا ہے۔ ان میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جس نے اس کا انکار کیا ہو۔ بلکہ ہر ایک نے اسے مانا اور اس کی تصدیق کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے کسی ایک نے بھی میراث حاصل کرنے کے لیے اصرار نہیں کیا۔ اور نہ ہی آپ کے چچا محترم [حضرت عباس رضی اللہ عنہ] نے میراث کے لیے اصرار کیا۔ بلکہ ان میں سے اگر کسی نے ایسا کوئی مطالبہ کیا بھی تو اسے جب نبی کریم ﷺ کے اس قول کی خبر دی گئی تو انہوں نے اپنے مطالبہ سے رجوع کرلیا۔ یہ معاملہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کے مبارک عہد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور تک ایسے ہی رہا۔ اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ کی گئی اور نہ ہی آپ کا ترکہ تقسیم کیا گیا۔

[[صحابہ اس بات پر یقین رکھتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اس ضمن میں پیش پیش تھے...... کہ سرور کائنات ﷺ کا وارث کوئی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علی رضی اللہ عنہ جب منصب خلافت پر فائز ہوئے، تو انہوں نے آپ کے ترکہ کو تقسیم کیا نہ اس کے مصرف میں کوئی تبدیلی پیدا کی۔ آیت میراث کے عموم سے آپ کی وراثت پر استدلال کرنا اس لیے صحیح نہیں کہ انبیاء کی وراثت اس سے مستثنیٰ ہے، جس طرح یہ مسائل استثنائی حیثیت رکھتے ہیں، کہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا اور قتل عمد کا مرتکب ورثہ سے محروم رہتا ہے، نیز یہ کہ غلام وارث نہیں ہوتا]]

دسویں وجہ:...... یہ امر قابل غور ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے متعلقین کو رسول اللہ ﷺ کے ترکہ سے کئی گنا زائد مال دے دیا تھا۔ اس کے پہلو بہ پہلو یہ بات بھی فراموش کرنے کے قابل نہیں کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے خود اس مال سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا؛ بلکہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا متروکہ مال حضرت علی رضی اللہ عنہ و عباس رضی اللہ عنہ کو اس مقصد کے پیش نظر دے دیا تھا کہ وہ اسے انہی مصارف میں خرچ کریں جن میں رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے [1] اس سے اس تہمت کا ازالہ ہوجاتا ہے جو ان دونوں اکابر پر عائد کی جاتی ہے۔

[1] صحیح بخاری ٣٠٩٨٤، صحیح مسلم:٤٩/ ١٧٥٧۔

گیارھویں وجہ :......شیعہ کے جواب میں کہا جائے گا کہ : ظالم بادشاہوں کی عادت رہی ہے کہ وہ جب ان دوسرے لوگوں کے بعد اقتدار میں آجاتے ہیں جنہوں نے ان کے ساتھ احسان کیا ہو؛اور ان کی اچھی تربیت کی ہو؛ اور انہوں نے اس گھرانے سے بادشاہی چھین لی ہو؛ تو وہ اس متاثرہ گھرانے کے ساتھ مہربانی اور نرمی کا سلوک کرتے ہیں؛ اور انہیں عطیات سے نوازتے ہیں تاکہ انہیں اس منازعت [تنازعہ] سے روک سکیں ۔[اور انہیں کچھ دیکر خاموش کرادیں]۔

اگر شیعہ کا یہ مفروضہ تسلیم کرلیا جائے کہ -العیاذ باللہ- حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما ظالم و غاصب تھے، اور انہوں نے جبراً خلافت پر قبضہ جما لیا تھا تو اس کا تقاضا تھا کہ وہ ان ورثاء سے مزاحم نہ ہوتے جو خلافت و امامت کا استحقاق رکھتے تھے، بلکہ خلافت کے دعوی سے دور رکھنے کے لیے انہیں من مانی دولت عطا کر دیتے تاکہ وہ حکومت وخلافت کا مطالبہ نہ کریں ۔جب کہ حکومت بھی چھین لینا اور میراث بھی کلی طور پر روک لینا بادشاہوں کی سیرت میں ایسی کوئی بات معلوم نہیں ہوسکی؛ اگرچہ وہ سب سے ظالم اور فاسق و فاجر حکمران ہی کیوں نہ ہو۔اس سے معلوم ہوا کہ جو کچھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا گیا ہے وہ بادشاہوں اور حکمرانوں کی عادت وطبیعت سے خارج امر ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی مؤمنین کی عادات شرعیہ سے بھی خارج ہے ۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس معاملہ میں خاص کیا ہوا تھا یہ خصوصیت دوسرے حکمرانوں کے نصیب میں نہیں آئی ۔آپ کی خصوصیت نبوت تھی ؛ اور انبیاء کرام علیہم السلام وراثت نہیں چھوڑا کرتے ۔

انبیاء کی میراث:

بارھویں وجہ :......شیعہ قرآن کریم کی آیت: ﴿ وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ ﴾ ''اور سلیمان داود کے وارث بنے'' نیز: ﴿فَهَبْ لِي مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا ۝ يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ﴾ [مریم ۵۔۶]

''پس تو مجھے اپنے پاس سے وارث عطا فرما۔ جو میرا بھی وارث ہو اور یعقوب علیہ السلام کے خاندان کا۔''

[ان مذکورہ بالا آیات] سے انبیاء علیہم السلام کی وراثت پر استدلال کرتے ہیں۔حالانکہ ان کا دعوی اس آیت سے ثابت نہیں ہوتا۔اس لیے کہ'' ورثہ'' اسم جنس ہے اور اس کے تحت متعدد انواع ہیں۔ اور ایک عام چیز کا ذکر کرنے سے کسی خاص چیز کا ذکر لازم نہیں آتا۔مثلاً اگر کہا جائے کہ یہاں حیوان موجود ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہاں انسان یا گھوڑا یا اونٹ موجود ہے ۔بعینہ اسی طرح ورثہ کا لفظ میراث علم و نبوت اور ملوکیت اور مادی وراثت پر بولا جاتا ہے، مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

﴿ ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ﴾ (فاطر: ۳۲)

''پھر ہم نے ان لوگوں کو (اس) کتاب کا وارث بنایا جن کو ہم نے اپنے بندوں میں پسند فرمایا۔''

نیز فرمانِ الٰہی ہے:

﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ ۝ الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴾ [المؤمنون]

''وہ ہی ہیں میراث لینے والے۔ جو فردوس کے وارث ہونگے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ اُوْرِثْتُمُوْهَا بما كنتم تعملون﴾ (الزخرف:۷۲)

''یہ وہ جنت ہے جس کے وارث تمہیں بنایا گیا ہے؛ ان اعمال کی وجہ سے جو تم کرتے تھے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وديارهم و أرضاً لم تطؤوها﴾ (االاحزاب: ۲۷)

''اور تمہیں ان کی زمینوں اور دیار کا وارث بنایا؛ اور اس زمین کا بھی جیسے ابھی تم نے نہیں روندا۔''

(یہاں پر وراثت سے مراد بادشاہی وخلافت ارضی ہے)۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَاءُ من عباده والعاقبة للمتقين ﴾ (الاعراف:۱۲۸)

''بے شک زمین اللہ کی ہے اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اس کا وارث بنائے؛ اور اچھا انجام کار اہل تقوی کے لیے ہے۔''

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ في مشارق الأرض و مغاربها التي باركنا فيها ﴾ (الاعراف: ۱۳۷)

''ہم نے اس زمین کے مشرق ومغرب کا؛ جس میں ہم نے برکت دی تھی؛ کا وارث اس قوم کو بنایا جس کو ضعیف سمجھا جاتا تھا۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿ وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ﴾

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا کہ بے شک یہ زمین، اس کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔'' (الانبیاء۱۰۵)

محدث ابوداؤد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بیشک انبیاء علیہم السلام کسی کو درہم و دینار کا وارث نہیں بناتے، بلکہ علمی ورثہ عطا کرتے ہیں۔جس نے یہ علمی ورثہ لے لیا اس نے بہت بڑا حصہ پالیا۔''[1]

ایسے ہی خلافت کا لفظ بھی ہے۔اسی لیے میت کے پیچھے رہ جانے والوں کو بھی خلیفہ کہتے ہیں۔یعنی اس نے اپنے ترکہ میں فلاں پیچھے [اپنا خلیفہ] چھوڑا۔[اس لحاظ سے] خلافت کبھی مال میں ہوتی ہے' اور کبھی علم میں ہوتی ہے' اور کبھی

[1] سنن ابی داود۔ کتاب العلم۔ باب الحث علی طلب العلم، (ح:۳۶۴۱) سنن ترمذی۔ کتاب العلم۔ باب ما جاء فی فضل الفقه علی العبادة(حدیث:۲۶۸۲)، ابن ماجة، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم(ح:۲۲۳)

ان کے علاوہ دیگر امور میں ۔

جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب سمجھ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ ﴾ 'نیز: ﴿يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ﴾ ان میں لفظ ارث جنس وراثت پر دلالت کرتا ہے۔ مالی وراثت پر دلالت نہیں کرتا۔ پس ان آیات سے خاص طور پر مالی وراثت پر استدلال کرنا مصنف کی وجوہ دلالت سے جہالت کی نشانی ہے۔

جیسا کہ اگر کہا جائے: یہ شخص اس کا خلیفہ ہوگا۔ اور اس نے اسے اپنے بعد چھوڑا ہو۔ تو اس سے مطلق خلافت پر دلالت ہوتی ہے؛ اس میں کہیں بھی یہ دلیل نہیں ہے کہ وہ اس کے مال کا یا اس کی عورت و اہل خانہ کا یا اس کی املاک کا وراث بنے گا۔

تیرھویں وجہ: ......ہم ان نصوص صریحہ کی روشنی میں کہتے ہیں کہ: زیر تبصرہ آیت میں مالی ورثہ مراد نہیں، بلکہ علم و نبوت کی میراث مقصود ہے۔ اسی لیے فرمایا: ﴿ وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ ﴾ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت سلیمان کے سوا حضرت داؤد کے متعدد بیٹے اور بھی تھے، اگر مالی ورثہ مراد ہوتا تو وہ تنہا حضرت سلیمان علیہ السلام کو نہ ملتا۔ علاوہ ازیں حضرت سلیمان علیہ السلام کے مالی ورثہ پانے میں کسی کی مدح و ستائش نہیں کی جارہی نہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی اور نہ حضرت داؤد علیہ السلام کی۔ اس لیے کہ نیک و بد سبھی اپنے والد کا مالی ورثہ پاتے ہیں؛ اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی کیا خصوصیت ہے؟ حالانکہ آیت کا سیاق حضرت سلیمان علیہ السلام کی مدح اور ان کی خصوصیات کا متقاضی ہے۔ ظاہر ہے کہ مالی میراث ایک عام چیز ہے جو سب لوگوں کے یہاں مشترک ہے؛ جیسے کھانا پینا؛ میت کو دفن کرنا۔ لہٰذا اس طرح کے امور کا انبیاء کرام علیہم السلام کے متعلق ذکر و بیان عبث اور کسی فائدہ سے خالی ہے۔ بلکہ وہ چیز بیان کی جاتی ہے جس میں عبرت اور فائدہ ہو۔ وگرنہ کوئی کہنے والا کہے: فلاں انسان مرگیا اور اس کا بیٹا اسکے مال کا وارث بنا۔''

❀ یہ تو اسی طرح ہے جیسے کوئی کہے: اسے دفن کیا؛ اور کوئی کہے: انہوں نے کھایا پیا اور سو گئے؛ یعنی اس طرح کی باتیں جن کا ذکر کرنا [بے موقع اور بے فائدہ ہے] قرآن کے ساتھ اچھا نہیں لگتا۔

اسی طرح زکریا علیہ السلام کے متعلق آیت قرآنی: ﴿يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ﴾ (مریم: ٦)

اس آیت میں بھی مالی ورثہ مراد نہیں، اس لیے کہ حضرت یحییٰ نے آل یعقوب سے مالی میراث حاصل نہیں کی تھی، بلکہ یہ میراث ان کی اولاد اور دیگر ورثہ نے پائی ہوگی؛ اگر ایسا ہوگا۔ [ورنہ انبیاء کرام علیہم السلام کی مالی وراثت نہیں ہوتی]۔ اور نبی اللہ زکریا علیہ السلام نے بیٹا اس لیے طلب نہیں کیا تھا کہ ان کے مال کا وارث بنے۔ اس لیے کہ اگر مالی وراثت مراد ہوتی تو لازمی طور پر یہ مال آپ سے دوسرے لوگوں کو منتقل ہونا ہی تھا خواہ وہ آپ کا بیٹا ہو یا کوئی اور ہو۔ نیز یہ کہ اگر اس سے مقصود یہ ہوتا کہ صرف بیٹا ہی مالی وارث بنے؛ تو اس سے لازم آتا کہ بیٹے کے علاوہ کوئی دوسرا وارث نہ بنے۔

ایسا کوئی بخیل سے بخیل انسان بھی نہیں کرسکتا۔ اس لیے کہ اگر بیٹا موجود ہو تو اسے دیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا مقصود ہی بیٹے کو نوازنا ہے۔ اور اگر بیٹا نہ ہو تو؛ پھر بیٹے سے صرف یہ مراد نہیں ہوسکتی کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا یہ مال نہ

لے۔اس سے بڑھ کر یہ کہ حضرت زکریا علیہ السلام مال دار نہ تھے جن کا ورثہ حاصل کیا جاتا۔آپ بڑھئی کا کام کرتے تھے اور حضرت یحییٰ علیہ السلام دنیوی مال و متاع سے بے نیاز تھے، لہٰذا حضرت یحییٰ علیہ السلام کا مالی میراث حاصل کرنا خارج از بحث ہے۔مزید برآں آپ کا یہ فرمان بھی ہے:

﴿ وَ اِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّ رَآءِ ی﴾ (مریم] ''اور بیشک میں اپنے پیچھے قرابتداروں سے ڈرتا ہوں۔'' یہ معلوم ہے کہ آپ اپنے مرنے کے بعد مال کے لینے سے نہیں ڈرتے تھے؛ کیونکہ یہ کوئی ڈرنے والی بات نہیں۔

فصل:......جاگیر فدک کا اعتراض اور اس کا جواب

[اعتـــراض] : شیعہ مصنف رقم طراز ہے:''جب فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ:''میرے والد محترم نے مجھے فدک کی جاگیر ہبہ میں عطا کی تھی۔'' [1] تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواباً کہا کہ''کوئی کالا یا گورا لائیے جو اس

[1] فدک مدینہ منورہ سے دو دن کی مسافت پر واقع حجاز میں ایک بستی ہے۔یہ بستی ۷ھ میں غزوہ خیبر کے بعد مصالحت کے نتیجہ میں کسی جنگ وقتال کے بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضہ میں آئی۔اس میں پانی کا چشمہ اور کچھ کھجوروں کے درخت تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی آمدنی صدقات و خیرات اور رفاہ عام کے کاموں میں صرف فرمایا کرتے تھے۔حضرت صدیق رضی اللہ عنہ بھی اپنی خلافت کے زمانہ میں اسوۂ نبوی پر گامزن رہے۔حضرت فاروق رضی اللہ عنہ جب خلیفہ بنے تو آپ نے حضرت علی و عباس رضی اللہ عنہما کے ذمہ یہ خدمت تفویض فرمائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح اس بستی کی آمدنی کو رفاہ عام کے کاموں میں صرف کرتے رہیں۔بعض اوقات حضرت علی و عباس رضی اللہ عنہما کے مابین اختلاف رونما ہوتا اور عقدہ کشائی کے لیے بارگاہ فاروقی پر حاضر ہوتے،حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے مابین فیصلہ صادر کرنے سے گریز فرمایا کرتے تھے۔جب اموی خلافت کا زمانہ آیا تو فدک کی بستی پہلے مروان پھر اس کے بیٹوں اور پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی تحویل میں آئی، خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ فدک کا مال اپنے پیش رو خلفاء اربعہ کے مطابق رفاہ عام کے کاموں پر صرف کیا کرتے تھے۔۲۱۰ھ میں خلیفہ مامون کے حکم سے یہ بستی اولاد فاطمہ کے زیر تصرف آئی، چنانچہ محمد بن یحییٰ بن حسین بن زید اور محمد بن عبداللہ بن حسین بن علی اس کے متولی قرار پائے،خلیفہ متوکل عباسی کے عہد خلافت میں جب فدک کے بارے میں اولاد فاطمہ کے مابین نزاع بپا ہوا تو اس نے حکم دیا کہ فدک کی آمدنی حسب سابق رفاہی کاموں پر خرچ کی جائے جیسا کہ خلافت صدیقی سے لے کر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے زمانہ تک ہوتا رہا تھا، یہ طے پایا کہ حکومت اس کی آمدنی اصلاحی کاموں پر صرف کرے گی اور دوسرا کوئی شخص خواہ وہ اولاد فاطمہ میں سے ہو یا کوئی اور اس کا متولی نہیں ہوگا۔

ایک شیعہ عالم ابن المیثم اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: بے شک آپ کو اتنا مال ملے گا جو آپ کے والد گرامی لیتے تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فدک کے باغ سے تمہارا خرچ لیتے تھے باقی غرباء میں تقسیم کر دیتے یا مجاہدین کی ضروریات میں خرچ کر دیتے۔لہٰذا آپ بتائیں کہ آپ اس باغ میں کیسے تصرف کریں گی۔انہوں نے کہا: میں اپنے والد محترم کے نقش قدم پر چلوں گی۔اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آپ سے وعدہ رہا کہ میں ایسے ہی تصرف کروں گا جیسے آپ کے والد گرامی کیا کرتے تھے۔انہوں نے کہا: اللہ کی قسم کیا تم اس میں ایسے ہی تصرف کرو گے۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:''اللہ کی قسم! میں ضرور ویسا ہی تصرف کروں گا۔حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اے اللہ گواہ ہو جا۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس باغ کا غلہ لے کر اہل بیت کی ضروریات پوری کرتے اور باقی ماندہ تقسیم کر دیتے۔اس طرح حضرت عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما نے اپنے اپنے دور خلافت میں کیا۔پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اس باغ کا انتظام اسی طریقے پر چلایا۔'' [شرح نهج البلاغة: ٥/ ١٠٧۔ الدرة النجفية: ٣٣١] جناب زید بن علی بن حسین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:''اللہ کی قسم! ⇦⇦⇦

کی گواہی پیش کرے۔''سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ام ایمن رضی اللہ عنہ کو گواہ کے طور پر پیش کیا؛ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر اسے واپس کر دیا کہ'' یہ عورت ہے لہٰذا اس کی شہادت مقبول نہیں۔'' حالانکہ روایات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ'' ام ایمن ایک جنتی عورت ہے۔'' پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حق میں شہادت دی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ'' یہ آپ کے خاوند ہیں لہٰذا ان کی شہادت بھی مقبول نہیں۔''تمام لوگوں نے یہ روایت نقل کی ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:'' علی رضی اللہ عنہ حق پر ہے اور علی رضی اللہ عنہ اور حق لازم وملزوم ہیں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ بروز قیامت میرے حضور حوض کوثر پر وارد ہوں۔''

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا یہ سن کر ناراض ہوگئیں اور حلف اٹھایا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بات چیت نہیں کریں گی اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور (بعداز وفات) حاضر ہوں گی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا شکوہ کریں گی۔

جب ان کی وفات کا وقت آیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وصیت فرمائی:'' مجھے رات کی تاریکی میں دفن کرنا اور میرا جنازہ پڑھنے کے لیے ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں بلانا۔

سب روایات میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فاطمہ رضی اللہ عنہا! تیری رضا رضائے الٰہی کے موجب ہے اور تیری ناراضگی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے۔''سب کتب احادیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا:'' فاطمہ میرا جگر پارہ ہے؛ جس نے اسے تکلیف دی اس نے مجھے تکلیف دی؛ اور جس نے مجھے تکلیف دی اس نے اللہ کو تکلیف دی۔'' اگر حدیث نبوی ''لَا نُـوْرِثُ'' صحیح ہوتی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار؛ عمامہ اور خچر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نہ دیتے۔ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے دعوی کے مقابلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مطالبہ قابل ترجیح نہ ہوتا۔ اور اہل بیت جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نجاست سے پاک قرار دیا ہے؛ اس چیز کے مرتکب نہ ہوتے جو ان کے لیے جائز نہیں ہے؛ اس لیے کہ ان پر صدقہ لینا حرام ہے۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس بحرین کا مال آیا تو حضرت جابر انصاری رضی اللہ عنہ کے یہ کہنے پر کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تھا:''جب بحرین کا مال آئے گا تو میں تمہیں تین لپیں بھر کر دوں گا۔'' تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:'' آگے بڑھو اور اس تعداد میں لے لو۔'' اس طرح وہ مال ان کو

⇦⇦⇦ اگر معاملہ میرے ہاتھ میں آجائے تو میں اس میں وہی فیصلہ کروں گا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔''[شرح نهج البلاغة: ١٦/ ٢٢٠ (ومن كتاب له الى عثمان بن حنيف الأنصاری)۔ الصوارم المهرقة ٢٤٣۔ مبر: ٧٥۔]

ستم تو یہ ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وراثت کا رونا وہ شیعہ روتے ہیں جن کے ہاں عورت کو وراثت نہیں ملتی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کتاب میں یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ اس میں لکھا ہے: جب کوئی شخص فوت ہو جائے تو اس کی غیر منقولہ جائیداد (مکان، زمین وغیرہ) میں سے عورتوں کو وراثت نہیں ملتی۔ ابوجعفر کہتے ہیں:'' اللہ کی قسم! یہ بات علی علیہ السلام کے ہاتھ سے لکھی ہوئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی املا کرائی ہوئی ہے۔'' [بصائر الدرجات: ١٨٥۔ ح: ١٤۔ باب فی الائمه عليهم السلام وأنه صارت اليهم ......۔'']الکلینی نے ابوجعفرؒ سے بیان کیا ہے کہ:'' عورتیں زمینی جائیداد میں کسی چیز کی وارث نہیں ہوتیں۔'' فروع الكليني: ٧/ ١٦٧٨ كتاب المواريث، حديث:٤ ، باب ان النساء لا يرثن۔ بحار الأنوار:٢٦/ ٥١٤۔ ح: ١٠١ (باب جهات علومهم ......''

دے دیا گیا اور گواہ بھی طلب نہ کیا؛ صرف ان کے قول پر اعتبار کیا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

جواب :

پہلی وجہ: شیعہ مصنف کے اعتراضات میں سے مذکورۃ الصدر واقعہ روافض کا پہلا بہتان نہیں ہے بلکہ وہ ایسے لاتعداد جھوٹ وفساد اور بہتان تصنیف کر چکے ہیں۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ یہ معاملہ دو حال سے خالی نہیں:

شیعہ مصنف نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے متعلق جاگیر فدک کے جس دعوی کا ذکر کیا ہے؛ یہ دعوی ان کی میراث کے متناقض ہے۔ اگر وہ جاگیر بطور ہبہ آپ کی ملی ہوئی تھی تو پھر اسے بطور وراثت ملنے کا سوال باطل ہے۔ یعنی:

۱۔ اگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا فدک کی جاگیر ورثہ کی بنا پر طلب کرتی تھیں، تو یہ ہبہ نہیں ہوسکتا۔

۲۔ اور اگر یہ جاگیر آپ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دی تھی تو ورثہ باطل ہوا۔

اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں یہ جاگیر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دی تھی- حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے منزہ ہیں- اور اس کے ساتھ یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ دوسروں کی طرح آپ کا ترکہ ورثاء کے مابین تقسیم کیا گیا تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ آپ نے اپنی بیماری کی حالت میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لیے ان کے حق سے زیادہ مال کی وصیت کی حالانکہ آپ وارث تھیں۔ اور اس طرح کی وصیت کرنا وارث کے حق میں ناروا ہے۔ [یا حالت مرض میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ان کے حق سے زیادہ مال عطا کیا]۔ اور اگر حالت صحت میں آپ نے فدک کی جاگیر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو عطا کی تھی، تو وہ ہبہ قبضہ ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ ہبہ کرنے والا اگر کوئی چیز ہبہ کرے اور جس کو ہبہ کیا گیا ہے، وہ اس پر قابض نہ ہو، یہاں تک کہ ہبہ کرنے والے کی موت واقع ہو جائے تو ایسا ہبہ جمہور علماء کے نزدیک باطل ہے۔

یہ امر موجب حیرت واستعجاب ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فدک کی جاگیر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو عطا کی اور ام ایمن رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا جملہ صحابہ میں سے کسی کو بھی پتہ نہ چل سکا۔

دوسری وجہ: سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے متعلق اس قسم کے دعوی کا دعوی کرنا آپ پر بہتان ہے۔ امام ابوالعباس بن سریج نے جو کتاب عیسیٰ بن ابان کے رد پر تصنیف کی ہے؛ جس میں انہوں نے ان کیساتھ ''قسم اور گواہ'' کے بارے میں گفتگو کا تذکرہ کیا ہے اور انہوں نے وہاں پر کئی دلائل ذکر کیے ہیں؛ اور عیسیٰ بن ابان کے معارضات کا جواب دیا ہے۔

آپ فرماتے ہیں: ''بختری بن حسان نے حضرت زید بن علی سے حدیث ذکر کی ہے جس میں انہوں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے متعلق کہا ہے کہ: انہوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فدک کی جاگیر عطا کی تھی۔ اور آپ گواہی میں ایک مرد اور ایک عورت کو لیکر پیش ہوئیں۔ اور فرمایا: مرد کیساتھ مرد اور عورت کیساتھ عورت۔ سبحان اللہ! یہ کتنی عجیب بات ہے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے اپنی میراث کا سوال کیا؛ اور آپ نے

انہیں بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''ہم [انبیاء کی جماعت] وارث نہیں بنتے۔'' دیگر احادیث میں کوئی ایسی چیز روایت نہیں کی گئی کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس کے علاوہ بھی کسی چیز کا دعوی کیا ہو' یا کوئی گواہ پیش کیا ہو۔

جریر نے مغیرہ سے اوراس نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے' آپ فدک کی بابت فرماتے ہیں:

''حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا تھا کہ جاگیر فدک آپ کو ہبہ کر دی جائے' تو رسول اللہ ﷺ نے انکار کر دیا۔اس لیے کہ نبی کریم ﷺ خود اس میں سے خرچ کیا کرتے تھے' اور بنی ہاشم کی بیواؤں کی شادیاں کراتے اور ان کے کمزور اور ضعیف لوگوں پر خرچ کرتے ۔رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں معاملہ ایسے ہی رہا۔آپ نے اس کے صدقہ کرنے کا حکم دیا؛ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اسے قبول کر لیا۔اور میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں اس جاگیر کو اسی ڈھنگ پر واپس کرتا ہوں جس پر رسول اللہ ﷺ کے دور میں تھی۔'' [1]

اس کے علاوہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کبھی یہ نہیں سنا گیا کہ انہوں نے دعوی کیا ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں یہ جاگیر ہبہ کر دی تھی۔ایسی کوئی ایک بھی حدیث متصل سند کے ساتھ ثابت نہیں ہے۔اور نہ ہی کسی گواہ نے آپ کے حق میں کوئی ایسی گواہی دی۔اگر کوئی ایسا معاملہ ہوتا تو اسے ضرور نقل کیا جاتا۔اس لیے کہ آپ اس جھگڑے میں فریق تھیں' اور آپ کا معاملہ ظاہر تھا۔اس معاملہ میں امت کا بھی اختلاف واقع ہوا؛ اور آپس میں بحث مباحثے ہوئے۔ان میں سے کسی ایک مسلمان نے بھی یہ گواہی نہیں دی کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کوئی جاگیر عطا کی ہے۔یا آپ نے کسی چیز کے بارے میں دعوی کیا ہو۔ یہاں تک کہ بختری بن حسان کا دور آ گیا۔اس نے حضرت زید سے کچھ ایسی چیزیں روایت کیں جن کی کوئی اصل ہی نہیں۔اور نہ ہی یہ پتہ چلتا ہے کہ انہیں اس سے پہلے کس نے روایت کیا۔یہ سند اہل علم کے ہاں روایت کردہ احادیث [کی اسناد] میں سے نہیں ہے: فضل بن مرزوق نے البختری سے؛ اس نے زید سے روایت کیا ہے۔مصنف کو چاہیے تھا کہ بعض ان جملوں پر توقف کر کے غور وفکر کرتا جن کا کوئی معنی ہی نہیں بنتا۔

اس روایت میں حضرت زید رحمہ اللہ کے یہ الفاظ بھی ہیں: اگر اس جگہ پر میں ہوتا تو میں بھی وہی فیصلہ کرتا جو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کیا ہے۔اس سے کوئی بات نہ ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر ثابت ہوتی ہے اور نہ ہی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر؛ اگر چہ اس [روایت] کی مخالفت کرنے والا کوئی ایک بھی نہ ہو۔اور اگر چہ اس بارے میں مناظرہ بھی نہ ہوا ہو۔تو پھر کیسے یہ ہوسکتا ہے جب کہ اس بارے میں روایات بھی موجود ہوں۔دین کی بنیاد اس پر قائم ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث ثابت ہو جائے؛ اور پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کے خلاف کہیں [تو حجت حدیث رسول اللہ ﷺ ہوگی]۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسے لوگوں سے ایسی بات ہوسکتی ہے؛ جیسا کہ دادی کے مسئلہ پر آپ سے غلطی ہوگئی تھی؛ مگر جب آپ کو صحیح حدیث پہنچ گئی تو

[1] ذکر ابن الجوزي في كتابه "سيرة عمر بن عبد العزيز، ص:۱۰۹، ط. المؤيد، القاهرة:۱۳۳۱، ۱۹۲۱، قصة عمر بن عبدالعزيز مع أراضي فدك التي ورثها عن أبيه وكيف ردها إلى الصدقة.

آپ نے اس کی طرف رجوع کرلیا۔

اگر یہ حدیث ثابت بھی ہوجائے تو پھر بھی رافضی کے لیے اس میں کوئی حجت نہیں ۔حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے یہ نہیں فرمایا: میں اپنے گواہ کے ساتھ قسم اٹھاتی ہوں ؛ اور آپ کو منع کر دیا گیا ہو۔ یا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا ہو کہ: میں گواہ کیساتھ قسم اُٹھانے کو جائز نہیں سمجھتا۔ نیز علماء کرام رحمہم اللہ یہ بھی کہتے ہیں کہ: یہ حدیث غلط ہے۔اس لیے کہ حضرت اسامہ بن زید سے زہری روایت کرتے ہیں ان سے مالک بن اوس بن حدثان روایت کرتے ہیں: آپ نے فرمایا:''جس چیز سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے احتجاج کیا ہے' کہ آپ نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تین قسم کے اموال تھے: بنونضیر۔ خیبر اور فدک۔'' [سنن ابی داؤد ۳/ ۱۹۵؛ کتاب الخراج]

بنونضیر کے اموال کو آپ کے نائبین وعمال کے لیے روک کر رکھا گیا تھا۔

فدک کی جاگیر مسافروں اور ابناء سبیل کے لیے تھی۔

خیبر: اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ دو حصے مسلمانوں کے مابین تھے۔اور ایک حصہ آپ کے اہل خانہ کے نان ونفقہ کے لیے تھا۔ جو کچھ آپ کے اہل خانہ کے اخراجات سے بچ جاتا اسے آپ دو حصے کر کے فقراء مہاجرین میں تقسیم کر دیتے تھے۔

حضرت لیث نے عقیل سے ؛ وہ ابن شہاب سے ؛ وہ عروہ سے روایت کرتے ہیں: بیشک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو خبر دی کہ: دختر نبی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے (کسی کو) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس ان کے زمانہ خلافت میں بھیجا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مال کی جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو مدینہ اور فدک میں دیا تھا اور خیبر کے بقیہ خمس کی میراث چاہتے ہیں۔تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''ہمارے مال کا کوئی وارث نہیں ہوتا، جو کچھ ہم چھوڑیں وہ صدقہ ہے ہاں آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس میں سے (بقدر ضرورت) کھا سکتی ہے۔''اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ میں آپ کے عہد مبارک کے عمل کے خلاف بالکل تبدیلی نہیں کر سکتا ؛ اور میں اس میں اسی طرح عمل درآمد کروں گا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔'' یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس میں ذرا سی چیز بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔'' [1]

امام زہری رحمہ اللہ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے ؛ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ:

''حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ صدیق کے پاس آدمی بھیج کر ان سے اپنی میراث طلب کی یعنی وہ چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو فئے کے طور پر دی تھیں ؛ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مصرف خیر جو مدینہ منورہ اور فدک میں تھا اور خیبر کی متروکہ آمدنی کا پانچواں حصہ۔ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

[1] صحیح بخاری:ح:۱٤١٦۔٥/ ٢٠ ؛ كتاب فضائلِ أصحابِ النبي ، باب مناقبِ قرابة رسولِ اللهِ ﷺ ومنقبةِ فاطمة .

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

''ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے؛ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس مال؛ یعنی اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ مال میں سے کھا سکتے ہیں' ان کو یہ اختیار نہیں کہ کھانے سے زیادہ مال لے لیں۔'' [1]

صالح ابن شہاب سے' وہ عروہ بن زبیر سے' وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں آپ فرماتی ہیں:

''حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ مال دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ اس میں تصرف فرمایا ہے میں اس میں سے آپ کے کسی عمل کو نہیں چھوڑ سکتا؛ میں ڈرتا ہوں کہ اگر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ عمل سے کچھ بھی چھوڑ دوں گا تو گم کردہ راہ ہو جاؤں گا۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مال موقوفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو دے دیا تھا۔ لیکن خیبر اور فدک اپنی نگرانی میں رکھا تھا اور کہا تھا کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا وقف ہے اور آپ نے ان دونوں کو ان مصارف وضروریات کے لیے رکھا تھا جو درپیش ہوتے رہتے تھے۔ اور ان کے انتظام کا اختیار خلیفہ وقت کو دیا تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ دونوں آج کی تاریخ تک اپنی اسی حالت و کیفیت میں بطور وقف موجود ہیں۔'' [2]

یہ احادیث ثابت شدہ اور اہل علم کے ہاں بڑی معروف ہیں۔ ان احادیث کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جناب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اپنے والد کی میراث طلب کی تھی۔ اس لیے کہ آپ یہ جانتی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ کی میراث ہے۔ لیکن جب انہیں رسول اللہ ﷺ کی حدیث بتائی گئی؛ تو آپ نے اسے مان لیا' اور واپس چلی گئیں۔ اور آپ اسے بطور وراثت کیسے طلب کر سکتی تھیں کہ آپ کے متعلق ان چیزوں کی ملکیت ہونے کا دعوی بھی تھا۔ یہ تو ایک لا یعنی سی بات ہے۔

اس کتاب کے مصنف [ابن مطہر] کو چاہیے تھا کہ وہ غور وفکر سے کام لیتا۔ مگر کسی بھی چیز کی محبت انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا: ......میں بھی [قرآن کو] ایسے ہی پڑھتا ہوں؛ جیسے آپ پڑھتی ہیں؛ لیکن میرے علم میں آپ نے کہیں بھی یہ نہیں فرمایا کہ: [یہ سارا مال آپ کے لیے ہے]

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: کیا یہ مال آپ کے لیے اور آپ کے اقارب کے لیے ہے؟

آپ نے فرمایا: نہیں؛ اور آپ میرے نزدیک سچی اور امانت دار ہیں۔ کیا رسول اللہ ﷺ نے آپ سے اس قسم کا کوئی عہد لیا ہے' یا آپ سے کوئی وعدہ کیا ہے' یا پھر کوئی ایسی بات کہی ہے جس کے موجب یہ صدقات آپ کے ہو سکتے ہیں؟

---

[1] صحیح بخاری:ح ۹۲۵۔ [2] صحیح بخاری: جلد دوم: حدیث نمبر ۳٤٤۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: نہیں، ایسی کوئی بات نہیں؛ صرف اتنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

''اے آل محمد! تمہیں خوشخبری ہو؛ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے تونگری لے آئے ہیں۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا' اور آپ بھی سچ کہتی ہیں۔ آپ کے لیے مال فئے ہے۔ اور میرے علم کے مطابق اس آیت کی تاویل کی روشنی میں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ پورے کا پورا حصہ آپ لوگوں کو دیدیا جائے۔ لیکن آپ کے لیے آپ کی ضرورت کے مطابق مال فئے ہے۔''

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی بات سنتے اور مانتے تھے۔ تو پھر جب آپ کے ساتھ ایک مرد اور ایک عورت گواہ بھی موجود ہوں تو آپ کی بات کیسے رد کی جاسکتی تھی؟

تیسری وجہ:...... اگر اس مفروضہ کی صحت تسلیم کر لی جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ بھی تقسیم کیا جاتا؛ تو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دعویٰ کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اور آپ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ [اس وراثت میں] آپ کے شریک ہوتے۔ اور ظاہر ہے کہ ان کے خلاف صرف ایک عورت یا صرف ایک مرد اور ایک عورت کی شہادت جمہور مسلمین کے نزدیک قابل قبول نہیں۔ اور اگر آپ کا ورثہ نا قابل تقسیم تھا تو اس معاملہ میں فریق حریف تمام مسلمان ہیں؛ ان کے خلاف بھی صرف ایک عورت یا صرف ایک مرد اور ایک عورت کی شہادت جمہور مسلمین کے نزدیک قابل قبول نہیں۔ البتہ ایسے واقعات میں فقہاء حجاز اور محدثین کے نزدیک مدعی کے حق میں ایک گواہ کیساتھ اس کی حلف کو شامل کر کے فیصلہ صادر کیا جاسکتا ہے۔

بیوی کے حق میں خاوند کی شہادت کے بارے میں علماء کے دو مشہور اقوال ہیں، امام احمد سے بھی اس ضمن میں دو روایتیں منقول ہیں:

۱۔ پہلی روایت: مقبول نہیں، امام ابوحنیفہ، مالک، لیث بن سعد، اوزاعی، اسحاق رحمہم اللہ اور دیگر ائمہ کا مذہب بھی یہی ہے۔

۲۔ امام احمد کا دوسرا قول: خاوند کی شہادت بیوی کے حق میں مقبول ہے، امام شافعی، ابوثور اور ابن المنذر کی بھی یہی رائے ہے۔

بنا بریں اگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے اس واقعہ کی صحت کو تسلیم بھی کیا جائے، تو حاکم وقت ایک مرد یا ایک عورت کی شہادت کی بنا پر فیصلہ صادر نہیں کرسکتا، خصوصاً جب کہ اکثر علماء کے نزدیک خاوند کی شہادت بیوی کے حق میں مقبول ہی نہیں۔ اور پھر علماء کرام کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو صرف ایک گواہ اور قسم کی بنا پر فیصلہ کرنے کو جائز نہیں سمجھتے۔ اور جو کوئی ایک گواہ اور قسم کی بنا پر فیصلہ کرنے کا کہتے ہیں: تو وہ بھی طالب دعوی کے لیے اس وقت تک فیصلہ کرنے کا نہیں کہتے جب تک اس سے پختہ حلف نہ لے لیا جائے۔

چوتھی وجہ:...... شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کو لے کر آئیں؛ اور

انہوں نے گواہی دی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: عورت کی گواہی قبول نہیں کی جاتی۔'' سب محدثین نے روایت کیا ہے کہ ام ایمن ایک جنتی خاتون ہیں۔''

جواب : یہ ایک جاہلانہ بات ہے، شیعہ مصنف ایسی روایات سے استدلال کرنا چاہتا ہے جو اس کے حق میں مفید ہونے کی بجائے مضر ہے۔ اگر ایسی بات حجاج بن یوسف یا مختار بن ابی عبید جیسے ظالم لوگوں کے منہ سے بھی نکلتی تو اس کی صداقت میں ذرہ بھر بھی شبہ نہ ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مالی معاملات میں ایک عورت کی شہادت کی بنا پر فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا خصوصاً جب کہ مدعی ایک ایسی چیز کی ملکیت کا دعویٰ کر رہا ہو جو کسی اور کے زیر تصرف ہو اور ظاہر میں وہ کسی غیر کا حق ہو۔ مگر یہاں تو اس کے قائل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسے صادق القول بزرگ ہیں۔

[اشکال] : شیعہ مضمون نگار نے کہا ہے کہ حدیث'' ام ایمن ایک جنتی عورت ہے۔'' سب محدثین نے روایت کی ہے۔''

[جواب] : یہ صریح کذب ہے۔ یہ روایت کتب حدیث میں مذکور نہیں اور نہ ہی کسی محدث نے اسے روایت کیا ہے۔ ام ایمن اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی والدہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دایہ رہ چکی تھیں۔ [1] یہ ہجرت کر کے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ پہنچی تھیں اور صحابیات میں بڑی احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ بایں ہمہ روایت حدیث میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل علم پر افترا پردازی کر کے کوئی روایت بیان نہیں کی جا سکتی۔

باقی رہی یہ بات کہ بقول شیعہ مصنف'' یہ روایت سب نے ذکر کی ہے۔'' بالکل غلط ہے، ایسا دعویٰ صرف حدیث متواتر کے بارے میں کیا جا سکتا ہے۔ جو شخص اکابر صحابہ کی بیان کردہ حدیث'' لَا یورث '' کا منکر ہو اور ام ایمن کے بارے میں ذکر کردہ حدیث کو متواتر قرار دیتا ہو اس کے اجہل الناس اور منکر حق و صداقت ہونے کے بارے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

اگر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بشرط صحت حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کے بارے میں جنت کی بشارت دی ہے؛ تو ایسا مژدہ آپ نے دیگر صحابہ کے بارے میں بھی سنایا ہے۔ آپ نے دس صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں جنت کی بشارت سنائی ہے۔

نیز یہ بھی فرمایا کہ: بیعت الشجرہ میں شمولیت کرنے والوں میں سے کوئی بھی دوزخ میں نہیں جائے گا۔ [2]

یہ حدیث سنداً صحیح اور محدثین کرام کے نزدیک مسلّم ہے۔ وہ حدیث جس میں آپ نے صحابہ کے بارے میں جنت

[1] وجدتْ حديثين في حق ام أيمن ؛ أم أيمن أمي بعد أمي۔" وضعفه السيوطي و الألباني في ضعيف الجامع الصغير ١/ ٣٨٩۔ والثاني: من سره أن يتزوج امرأة من أهل الجنة فليتزوج أم أيمن ۔" ذكر السيوطي أن ابن سعد رواه عن سفيان بن عقبة مرسلاً ؛ وضعفه الألباني في ضعيف الجامع الصغير ٥/ ٢٠٥۔ اس کا نام بركة بنت ثعلبة بن عمرو بن حصن تھا۔ الاصابة ٤/ ٤١٥۔

[2] صحيح مسلم۔ كتاب فضائل الصحابة۔ باب من فضائل اصحاب الشجرة رضي الله عنهم (ح:٢٤٩٦)

کی شہادت دی ہے، اہل سنن نے متعدد طرق سے بروایت عبدالرحمٰن بن عوف، سعید بن زید نقل کی ہے۔[1] یہ روایات محدثین کے نزدیک عام طور سے معروف ہیں۔

پھر جن احادیث میں صحابہ کے جنتی ہونے کی بشارت دی گئی ہے، شیعہ ان کی تکذیب کرتے ہیں اور صحابہ پر یہ کہہ کر معترض ہوتے ہیں کہ وہ اس حدیث کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس لیے کہ انہوں نے ایک عورت کی گواہی قبول نہیں کی؛ جس کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اسے جنتی ہونے کی بشارت دی گئی ہے، کیا اس سے بڑا جہل وعناد اور بھی ہوسکتا ہے؟

علاوہ ازیں یہ ضروری نہیں کہ جو شخص جنتی ہو وہ مقبول الشہادۃ بھی ہو۔ اس لیے کہ اس امر کا احتمال موجود ہے کہ وہ شہادت دینے میں غلطی کا ارتکاب کررہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اگر حضرت خدیجہ، فاطمہ و عائشہ رضی اللہ عنہن جیسی جنتی عورتیں شہادت دیں تو قرآن کے حکم کے مطابق ان کی شہادت کو مرد کی شہادت کے مقابلہ میں نصف شہادت قرار دیا جائے گا۔ جس طرح ان میں سے کسی ایک کا میراث میں حصہ مرد کے مقابلے میں نصف ہوتا ہے۔ اور اس کی دیت بھی مرد سے آدھی ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف مذکور نہیں، تمام مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے۔ پس کسی عورت کے جنتی ہونے سے اس کا مقبول الشہادۃ ہونا لازم نہیں آتا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ شہادت دینے میں غلطی کر رہی ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک جھوٹا شخص دروغ گوئی سے تائب ہوکر جنت میں جاسکے۔

پانچویں وجہ: ......شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت اس لیے قبول نہ کی کہ وہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے خاوند تھے۔'' یہ صریح کذب ہے، اگر اس کی صحت کو تسلیم کرلیا جائے تو بھی ہمارے حق میں مضر نہیں۔ اس لیے کہ بیوی کے حق میں خاوند کی شہادت اکثر علماء کے نزدیک ناقابل قبول ہے۔ جو علماء اس کی قبولیت کے قائل ہیں وہ اس شرط کے ساتھ قبول کرتے ہیں کہ شہادت کا نصاب پورا ہوجائے، مثلاً خاوند کے ساتھ ایک مرد گواہ اور بھی ہو یا دو عورتیں ہوں، ایک آدمی اور ایک عورت کی شہادت کی بنا پر فیصلہ صادر کرنا جب کہ مدعی سے حلف بھی نہ لیں؛ ناروا ہے۔

چھٹی وجہ: ......شیعہ مصنف کی پیش کردہ روایت کہ ''حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر ہیں اور حق آپ کے ساتھ لگا لپٹا رہے گا؛ اور یہ اس وقت تک جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض پر وارد ہوجائیں۔'' اور پھر یہ کہنا کہ یہ روایت سب علماء نے بیان کی ہے۔ یہ کذب و جہالت کی انتہا ہے۔ یہ روایت بسند صحیح یا ضعیف کسی نے بھی نقل نہیں کی۔ پھر یہ کہنا کس حد تک صحیح ہے کہ ''یہ روایت سب محدثین نے بیان کی ہے۔'' اس شخص سے زیادہ جھوٹا اور کون ہوسکتا ہے، جو کسی روایت سے متعلق کہے کہ سب صحابہ وعلماء نے یہ روایت بیان کی ہے، حالانکہ وہ حدیث اصلاً کسی ایک سے بھی منقول نہ ہو؛ یہ کھلا ہوا کذب وافترا ہے۔

البتہ اگر یوں کہا جاتا کہ بعض علماء نے یہ روایت بیان کی ہے تو یہ بات کسی حد تک دائرہ امکان کے اندر ہوسکتی تھی۔

---

[1] سنن ابی داؤد۔ کتاب السنة۔ باب فی الخلفاء(ح:٤٦٤٩، ٤٦٥٠) و سنن ترمذی کتاب المناقب۔ باب مناقب سعید بن زید رضی اللہ عنہ (ح:٣٧٥٧) عن سعید بن زید رضی اللہ عنہ (ح:٣٧٤٧) عن عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ۔

لیکن اس روایت کا اعتبار ہی کیا ہے کہ یہ نبی کریم ﷺ پر سراسر بہتان اور جھوٹ ہے۔ بخلاف اس روایت کے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''ام ایمن جنتی عورتوں میں سے ہے۔'' ایسا کہنا ممکن ہے۔ اس لیے کہ ام ایمن رضی اللہ عنہا نیک عورت تھیں، آپ مہاجرات صحابیات میں سے تھیں؛ آپ کو جنت کی بشارت دیے جانے میں کوئی حرج والی بات نہیں۔ بخلاف اس کے کہ کسی ایک انسان کے متعلق کہا جائے کہ: ''حق اسی کیساتھ ہوگا وہ جہاں کہیں بھی ہوگا اور یہ اس وقت تک جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض پر وارد ہو جائیں۔'' رسول اللہ ﷺ کی ہستی ایسے کلام سے منزہ ومبراء ہے۔

[مذکورۃ الصدر حدیث درج ذیل وجوہ واسباب کی بنا پر معنوی اعتبار سے بھی نا قابل قبول ہے]:

اوّل:...... حوض نبوی پر اشخاص وارد ہوں گے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے انصار سے فرمایا تھا:

''تم صبر کرو یہاں تک کہ حوض پر مجھ سے آملو۔''❶

اور دوسری روایت میں ہے:

''بیشک میرا حوض ایلہ سے لیکر عدن تک بڑا ہوگا۔ اور اس حوض پر آنے والے سب سے پہلے لوگ فقراء مہاجرین ہوں گے۔ پراگندہ سروں والے؛ میلے کپڑوں والے، جو مالدار عورتوں سے شادی نہیں کر سکتے، اور جن کے لیے بند دروازے نہیں کھولے جاتے۔ ان میں سے کسی ایک کی موت آتی ہے تو اس کی خواہش اس کے سینے میں ہوتی ہے۔ اس کی خواہش پوری نہیں ہوسکتی۔''❷

جب کہ حق کوئی مجسم چیز یا اشخاص میں سے نہیں جو حوض پر وارد ہونے کے قابل ہو۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

''میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں؛ وہ کتاب اللہ اور میرے اہل بیت کی عترت: یہ دونوں جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض پر وارد ہو جائیں۔''❸

وہ حدیث [حضرت علی رضی اللہ عنہ والی] بھی اسی باب سے ہے۔ اس میں کچھ کلام بھی ہے جو کہ اپنے موقع پر ذکر کیا جائے گا۔

اگر اس کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس سے مراد قرآن کا ثواب ہوگا۔ رہا یہ مسئلہ کہ حق ایک شخص کیساتھ گھومتا ہو، اور وہ شخص حق کے ساتھ گھومتا ہو؛ وہ اس شخص کی صفت [لازمہ] ہو کہ اس سے آگے تجاوز نہ کر سکتا ہو۔ تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ اس کا قول سچا ہوگا؛ عمل نیک اور صالح ہوگا؛ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں ہوسکتی کہ اس کے علاوہ کسی غیر کے پاس حق میں سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔

❶ البخاری ٥/ ٣٣ کتاب مناقب الانصار؛ باب قول النبی ﷺ للأنصار: "اصبروا حتی......"و مسلم ٣/ ١٤٧٤؛ کتاب الإمارة؛ باب الأمر بالصبر عند ظلم الولاة"۔

❷ رواه مسلم ٤/ ١٩٠٢؛کتاب الفضائل؛ باب اثبات حوض نبینا ﷺ و صفاته؛ البخاری ٣/ ١٩٠]۔سنن الترمذي ٤/ ٤٧؛ کتاب صفة القيامة؛ باب ما جاء في صفة أواني الحوض۔

❸ سنن الترمذي ٥/ ٣٢٨؛ کتاب المناقب؛ باب مناقب أهل بيت النبی ﷺ۔ حسن غریب۔

حالانکہ حق صرف آنحضرت ﷺ کیساتھ گردش کرتا ہے اور دوسرا کوئی انسان اس خصوصیت کا حامل نہیں ۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ میں یہ وصف تسلیم کیا جائے تو اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا رسول اللہ ﷺ کی طرح معصوم ہونا لازم آتا ہے۔ شیعہ جہالت کی بنا پر عصمت علی رضی اللہ عنہ کا دعویٰ کرتے ہیں۔ جو شخص اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ علی، ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کی نسبت معصوم تر نہ تھے؛ بلکہ یوں کہیے کہ ان میں سے کوئی بھی معصوم نہیں ۔ اور لوگ شیعہ کی دروغ گوئی سے بخوبی واقف ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مسائل و فتاویٰ بالکل اسی طرح ہیں جس طرح ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے فتاویٰ۔ ایسا ہرگز نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فتاویٰ خلفاء ثلاثہ کے فتاویٰ کی نسبت اولیٰ بالصواب ہوں۔ یہ بات بھی غلط ہے کہ خلفاء ثلاثہ کے اقوال حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشادات کی نسبت ضعیف و مرجوح ہیں۔ یہ بھی درست نہیں کہ آپ ﷺ دیگر خلفاء کی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ خوش اور ان کے زیادہ ثنا خواں تھے۔ بخلاف ازیں اگر کوئی شخص کہے کہ رسول اللہ ﷺ عمر بھر میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کبھی ناراض نہیں ہوئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو متعدد مرتبہ زجر و عتاب فرمایا تو اس میں ذرہ بھر مبالغہ نہیں ہوگا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بارگاہ نبوی میں یہ شکوہ پہنچایا اور کہا: ''لوگ کہتے ہیں کہ آپ اپنی بیٹیوں کی حمایت نہیں فرماتے۔'' تو آپ مسجد نبوی میں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا:

''بنی ہشام بن مغیرہ نے مجھ سے اپنی بیٹی کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دینے کی اجازت طلب کی ہے۔ واضح رہے کہ میں اس کی اجازت نہیں دیتا، میں اس کی اجازت نہیں دیتا، میں اس کی اجازت نہیں دیتا،[آپ نے تین مرتبہ یہ الفاظ دہرائے]۔ البتہ علی رضی اللہ عنہ اگر میری بیٹی کو طلاق دے دیں تو ان کی بیٹی کے ساتھ نکاح کر سکتے ہیں۔ فاطمہ! میرا جگر پارہ ہے جو اس کو شک میں ڈالتا ہے، وہ مجھے شک میں مبتلا کرتا ہے اور جو چیز اس کو ایذا دیتی ہے وہ مجھے ایذا دیتی ہے۔ پھر آپ نے اپنے ایک داماد (1) کا ذکر کیا جو بنی عبد شمس

(1) ان کا نام ابو العاص بن ربیع بن عبد العزی بن عبد شمس بن عبد مناف ہے، یہ رسول اللہ ﷺ کے سب سے پہلے داماد اور آپ کی سب سے بڑی دختر فرخندہ اختر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے خاوند تھے، ان کی بیٹی کا نام امامہ تھا جن کو حالت نماز میں آپ کندھے پر اٹھا لیا کرتے تھے، جب سجدہ کو جاتے تو زمین پر رکھ دیتے اور جب کھڑے ہوتے اٹھا لیا کرتے تھے،(صحیح بخاری۔ کتاب الصلاۃ ، باب اذا حمل جاریۃ صغیرۃ علی عنقہ فی الصلاۃ (ح:٥١٦)،صحیح مسلم۔ کتاب المساجد، باب جواز حمل الصبیان فی الصلاۃ(حدیث:٥٤٣) یہ وہی امامہ بنت ابو العاص ہیں کہ جب ان کی خالہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوگیا تو حضرت علی نے ان سے نکاح کر لیا تھا۔ ابو العاص متاخر الاسلام ہیں۔ غزوۂ بدر میں یہ قریش کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑنے کے لیے گئے تھے، اور قید کر لئے گئے، جب اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کو چھڑانے کے لیے فدیہ بھیجا تو حضرت زینب نے وہ ہار مدینہ روانہ فرمایا جو رخصتی کے وقت ان کی والدہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان کو پہنایا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ ہار پہچان لیا اور آبدیدہ ہو کر فرمایا: ''اگر تم مصلحت دیکھو تو زینب کے قیدی کو رہا کر دو اور ہار اسے واپس دے دو۔'' (سنن ابی داؤد۔ باب فی فداء الاسیر بالمال، (ح:٢٦٩٢) ⇦⇦⇦

کے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے فرمایا: ''اس (آپ کے داماد ابوالعاص) نے جب بات کی تو سچ بولا اور جب وعدہ کیا تو اسے پورا کیا۔'' ❶

ایک مرتبہ سرور کائنات ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دروازہ پر دستک دے کر دریافت فرمایا:

''کیا تم نماز (تہجد) نہیں پڑھتے۔''؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ہماری جانیں اللہ کے قبضہ میں ہیں جب چاہتا ہے جگا دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ یہ سن کر افسوس کے عالم میں اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے چل دیئے، زبان مبارک پر بے ساختہ یہ الفاظ جاری تھے:

﴿ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴾ [الکھف۵۴]

''انسان جھگڑا کرنے میں سب چیزوں سے بڑھا ہوا ہے۔'' ❷

جہاں تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مسائل و فتاویٰ کا تعلق ہے، آپ نے فتوی دیا تھا کہ جب کسی عورت کا خاوند فوت ہو جائے اور وہ حاملہ ہو تو اس کی عدت ''اَبْعَدُ الاجَلَیْنِ'' (عدت وفات اور وضع حمل ہر دو میں سے جو بعید تر ہو) ہے،

⇦⇦⇦ صحابہ نے تعمیل ارشاد کر دی۔ بعد ازاں حضرت زینب نے ابو العاص سے ہجرت کی اجازت طلب کی جو اس نے دے دی، ابوالعاص ایک تجارتی قافلہ کو لے کر ملک شام گئے، ساحل سمندر پر مسلمانوں کی ایک جماعت آباد تھی جس میں ابو جندل اور ابوبصیر بھی شامل تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر ابوالعاص کو قید کر لیا اور مدینہ پہنچا دیا۔ نبی ﷺ نے یہ دیکھ کر فرمایا: زینب نے ابوالعاص کو مال و متاع سمیت پناہ دی ہے۔ قید کرنے والوں نے ابوالعاص کو اسلام لانے کی ترغیب دلائی اور ابوالعاص کو مخاطب کر کے کہا ''ابوالعاص! آپ اشراف قریش میں شمار ہوتے ہیں اور اس کے علاوہ آپ رسول اللہ کے چچا زاد اور داماد بھی ہیں اگر آپ مشرف باسلام ہو جائیں تو اہل مکہ کا سب مال آپ کو غنیمت میں مل جائے گا۔ ابوالعاص نے جواباً کہا ''تم نے یہ بہت بری بات کہی ہے، کہ میں مکر و فریب کے ساتھ اپنے مذہب کو چھوڑوں۔'' جب آپ نے ابوالعاص کو رہا کیا تو پہلے مکہ گئے اور حق داروں کی ایک ایک پائی ادا کی، پھر کھڑے ہو کر اہل مکہ کو مخاطب کر کے کہا ''مکہ والو! بتایئے کیا میں نے واجب الاداء حقوق ادا کیے یا نہیں۔''؟ انہوں نے کہا 'اللہ کی قسم! ضرور۔'' تب ابوالعاص نے کلمہ شہادت پڑھا اور عازم مدینہ ہوئے، سرور کائنات ﷺ نے حضرت زینب کو ابوالعاص کے یہاں بھیج دیا، اور نکاح جدید کی ضرورت نہ سمجھی۔ (مستدرك حاكم (۳/۲۳۶۔ ۲۳۷) سیرة ابن هشام (ص:۳۱۲،۳۱٤) سنن ابی داؤد۔باب الی متی ترد علیه امراته (ح۲۲٤۰) بذکر النكاح فقط۔ ابوالعاص اموی اور ان کے اشباہ و امثال جن بلند اخلاق اور اوصاف کے حامل تھے، ان کا ذکر و بیان یہاں ممکن نہیں۔

ظہور اسلام سے قبل وہ جس طرح عرب بھر میں ممتاز تھے، اسلام لانے کے بعد تاریخ اسلام میں بھی انہیں بلند مقام حاصل ہوا۔ عربوں کے اخلاق جلیلہ اور ان کی بلند پایہ عربی فطرت ہی ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس عظیم قوم کو اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے منتخب فرمایا۔

❶ صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ۔ باب ذکر اصهار النبی ﷺ (ح: ۳۷۲۹، ۵۲۳۰)۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة۔ باب من فضائل فاطمة رضی اللہ عنہا، (ح:۲٤٤۹) اس کے سیاق و سباق میں اختلاف ہے۔

❷ البخاری، کتاب التهجد۔ باب تحریض النبی ﷺ علی قیام اللیل، (ح: ۱۱۲۷) صحیح مسلم ۔ کتاب صلاة المسافرین۔ باب الحث علی صلاة اللیل و ان قلت۔(حدیث:۷۷۵)۔

عہد نبوت میں جب ابو سنابل بن بعلک نے یہی فتوی دیا،تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ابو سنابل جھوٹ کہتا ہے۔ ❶
اس کے نظائر و امثال بہت ہیں۔ بہر کیف صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کی بنا پر فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا تھا۔جیسا کہ وہ خود اپنے حق میں فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔

ساتویں وجہ:......شیعہ مضمون نگار نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا جو واقعہ ذکر کیا ہے وہ ان کے شایان شان نہیں۔اس سے کوئی جاہل ترین انسان ہی حجت پکڑ سکتا ہے۔شیعہ مصنف اس زعم باطل میں مبتلا ہے کہ اس سے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی مدح وستائش ہو رہی ہے، حالانکہ یہی واقعہ ان کے حق میں تنقیص شان کا موجب ہے۔ بشرط صحت اس واقعہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حق میں فیصلہ صادر نہ کیا تو آپ کس لیے ناراض ہوگئیں......؟ اس لیے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ حق وصداقت پر مبنی تھا، جس کی خلاف ورزی کسی کے لیے بھی درست نہیں، لہٰذا اس میں ناراض ہونے کی کوئی بات نہ تھی۔ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اللہ و رسول ﷺ کے حکم کے برخلاف اس کے حق میں فیصلہ صادر کیا جائے اور جب حاکم ایسا نہ کر سکے تو وہ اس سے ناراض ہو جائے اور بات چیت ترک کرنے کی قسم کھا لے تو یہ بات اس شخص کے لئے نہ موجب مدح ہے اور نہ حاکم کے حق میں سبب جرح وقدح۔ بخلاف ازیں یہ بات ایسا تقاضا کرنے والے کے لیے جرح وقدح سے قریب تر ہے۔

ہم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا و دیگر صحابہ سے اس قسم کے جو واقعات منقول ہیں ان میں سے اکثر صریح کذب اور بعض تاویل پر مبنی ہیں۔اور اگر ان میں سے بعض گناہ کے موجب بھی ہوں تو ہمیں کب اس سے انکار ہے، کیونکہ ہم صحابہ کو معصوم نہیں مانتے۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ صحابہ اولیاء اللہ اور اہل جنت میں سے ہونے کے باوصف گناہوں سے بری نہ تھے۔ہم پر امید ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کی مغفرت فرمائے گا۔

رافضی مصنف نے جو ذکر کیا ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے گفتگو نہ کرنے کی قسم کھا لی اور کہا کہ اپنے والد محترم (ﷺ) سے مل کر اس کا شکوہ کریں گی؛ یہ بات شان فاطمہ رضی اللہ عنہا کے منافی ہے۔شکوہ صرف بارگاہ ربانی میں کیا جا سکتا ہے اور بس! قرآن میں ارشاد ہوتا ہے اللہ کے ایک نبی نے کہا تھا:

﴿ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ﴾ (یوسف:۸۶)

''میں بارگاہ ایزدی میں اپنے حزن و ملال کا شکوہ کرتا ہوں۔''

موسیٰ علیہ السلام دعا فرمایا کرتے تھے:

''بارالٰہی! مدح وستائش صرف تیرے لیے ہے، تیرے حضور ہی میں شکایت کی جاتی ہے تجھی سے مدد چاہی جاتی ہے اور تجھی سے فریاد رسی کی جاتی ہے، ہمارا تکیہ صرف تیری ہی ذات پر ہے۔''

---

❶ صحیح بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب فضل من شهد بدراً(ح:۳۹۹۱) صحیح مسلم۔ کتاب الطلاق ، باب انقضاء عدة المتوفی عنها زوجها ، (ح:۱۴۸۴) مسند احمد(۱/ ۴۴۷)۔

سرور کائنات ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

''سوال کرنا ہو تو صرف اللہ سے کیجیے، اور اگر مدد طلب کرنا ہو تو اللہ سے کیجیے۔''❶

آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ مجھ سے سوال کیجیے یا مجھ سے طلب امداد کیجیے، قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ﴾ (الانشراح:۷، ۸)

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ جب کوئی شخص حاکم سے مال طلب کرے اور غیر مستحق ہونے کی بنا پر حاکم اس کا مطالبہ پورا نہ کرے اس پر مزید یہ کہ حاکم اس مال کو اپنے عزیز و اقارب پر بھی صرف نہ کر رہا ہو بلکہ حسب موقع و مقام سب مستحق مسلمانوں کو دیتا ہو۔❷ پھر کہا جائے کہ وہ طالبِ مال حاکم سے بگڑ گیا۔ تو ظاہر ہے کہ اس کی ناراضگی کا موجب صرف یہ امر ہے کہ حاکم نے اس کو مال نہ دیا اور یہ کہہ دیا کہ دوسرے لوگ اس کی نسبت اس مال کے زیادہ مستحق ہیں۔ اس ناراضگی میں طالب مال کے لیے مدح وستائش کا کوئی پہلو باقی نہیں رہتا اگرچہ طالب مظلوم بھی ہو۔ تاہم اس کی ناراضگی صرف دنیوی مال کی خاطر ہے۔ اس صورت میں طالب مال کو متّہم کرنا حاکم کو مطعون قرار دینے کی نسبت اقرب الی الصحت ہے۔ خصوصاً جب کہ حاکم یہ مال خود نہیں لے رہا اور طالب مال اسے خود اپنی ذات کے لیے حاصل کرنے کے درپے ہے۔ حاکم واشگاف الفاظ میں کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم مجھے مال دینے سے مانع ہے، میرے لیے یہ کیوں کر روا ہے کہ مستحق سے مال لے کر غیر مستحق کو دے دوں؟ طالب مال اس کے سوا آخر کیا کہہ سکتا ہے کہ میری ناراضگی کا باعث صرف قلیل مال ہے دگر ہیچ۔

جو شخص سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے متعلق ایسا واقعہ بیان کر کے اسے ان کی مدح پر محمول کرتا ہے، اس کا جاہل ہونا کسی شک وشبہ سے بالا ہے، اللہ تعالیٰ منافقین کی مذمت ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

﴿وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ فَإِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَ إِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ o وَ لَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ رَسُوْلُهٗٓ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ﴾ (التوبہ: ۵۸۔ ۵۹)

---

❶ مسند احمد (۱/ ۲۹۳، ۳۰۷) سنن ترمذی۔ کتاب صفة القيامة۔ باب (۵۹) (حدیث: ۲۵۱۶)۔

❷ اگر حدیث نبوی ''لانورث'' سے صرف نظر کر لیا جائے تو اس میں شبہ نہیں کہ سیدہ عائشہ بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما اور حفصہ بن عمر رضی اللہ عنہما دونوں ورثاء میں شامل تھیں، حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے مذکورۃ الصدر حدیث کی تعمیل میں دونوں کو ورثہ سے محروم کر کے آپ کے صدقہ کو عام صدقات میں جمع کر دیا تھا، تاہم آپ نے رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے، اہل بیت کو بیت المال سے اپنی ضروریات پوری کرنے کی اجازت دے دی تھی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جملہ امور میں رسول اللہ ﷺ کے نقش قدم پر چلنے کے التزام کو قائم رکھا اور ہر صورت میں اسے نبھانے کی کوشش کی، آپ نے بدعات سے کنارہ کش رہنے کی قسم کھائی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑی بدعت اور کیا ہوتی کہ آپ حدیث ''لانورث'' کی خلاف ورزی کرتے، حالانکہ یہ روایت کثیر صحابہ سے مروی ہے، اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی یہ روایت بیان کی ہے۔

''بعض منافق صدقات کے متعلق آپ پر طعن کرتے ہیں، اگر صدقات مل گئے تو خوش، ورنہ ناخوش اور اگر وہ اللہ کے عطا کردہ مال پر رضا مندی کا اظہار کرتے، اور یوں کہتے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لیے کافی ہے اور وہ ہمیں اپنے فضل وکرم سے دیتا رہے گا؛ اور اس کا رسول، ہماری رغبت صرف بارگاہ ربانی کی جانب ہے۔''

اس آیت میں منافقین کی یہ خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ وہ دیے جانے کی صورت میں خوش ہوتے ہیں اور اگر نہ دیا جائے تو غیظ وغضب کا اظہار کرنے لگتے ہیں، منافقین کی زندگی کا یہی پہلو ان کی مذمت کا موجب ہوا ہے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ جو شخص اسی خصوصیت کی بنا پر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی مدح سرائی کرتا ہے، جس کی مذمت بیان کی گئی ہے تو وہ بلاشبہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ روافض نے اہل بیت کی شان میں جو گستاخیاں کی ہیں اور جس طرح ان کی زندگیوں کو داغ دار کرنے کی کوشش کی ہے، وہ کسی بھی اہل بصیرت پر مخفی نہیں ہے۔ اہل بیت کی جانب سے اللہ تعالیٰ ہی اس کا انتقام لے گا۔

[اشکال]: اگر کوئی شخص یہ کہے: سیدہ فاطمہ اپنا حق طلب کرنے آئی تھیں اور حق کا مطالبہ کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔''

[جواب]: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تو یہود و نصاریٰ تک کے حقوق ادا کرنے میں تامل نہیں کرتے تھے، بھلا آپ سیدۃ النساء سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حق ادا کرنے سے کیوں کر انکار کر سکتے تھے؟، مزید برآں اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی شہادت دی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنا مال اللہ کی راہ میں صرف کیا کرتے تھے، پھر آپ لوگوں کے حقوق ادا کرنے سے کیوں کر باز رہ سکتے تھے۔ ❶

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مال کا مطالبہ کیا تھا؛ اور آپ اسے پورا نہ کر سکے۔ بخاری و مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بارگاہ نبوت میں خادم طلب کرنے آئیں اور آپ نے خادم عطا کرنے کی بجائے ان کو تسبیح کے کلمات پڑھتے رہنے کی تلقین فرمائی۔ ❷

❶ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے ایک عزیز مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ کی مالی امداد فرمایا کرتے تھے، اس ضمن میں سورہ نور کی یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَالْمُهَاجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (نور: ۲۲) (صحیح بخاری کتاب المغازی، باب حدیث الافک، (حدیث: ٤١٤١) صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب فی حدیث الافک (حدیث: ۲۷۷۰)

اگر یہ آیت کریمہ کسی انسان کے بارے میں انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی پر نازل ہوتی تو اس نبی کی امت کا سخت بے شرم آدمی بھی اس شخص کی شان میں گستاخی کرنے سے شرم محسوس کرتا، جس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی مگر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخی کرنے والے جذبہ حیاء سے عاری ہیں، اس لیے کہ حیا ایمان کا جزء ہے، اور انہیں ایمان سے کوئی سروکار نہیں۔

❷ صحیح بخاری کتاب فضائل الصحابة باب باب مناقب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (ح:٣٣١٨)، صحیح مسلم کتاب الذکر والدعاء باب التسبیح اوّل النہار و عند النوم (حدیث:۲۷۲۷)۔ یہ پوری حدیث اس طرح ہے: فاطمہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے چکی پیسنے کی تکلیف کی شکایت کی، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ قیدی آئے تو فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کے پاس آئیں لیکن آپ موجود نہیں تھے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ان کی ملاقات ہوئی تو ان سے اس کے بارے میں انہوں نے بات کی جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ⇦⇦⇦

جب یہ جائز ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی چیز طلب کریں اور آپ یہ مطالبہ پورا نہ کریں اور اس کا پورا کرنا آپ پر واجب بھی نہ ہو؛ تو اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ وہ خلیفہ رسول سے کوئی چیز طلب کریں اور آپ اس مطالبہ کی تکمیل سے قاصر رہیں۔ خصوصاً جبکہ ہم اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا معصوم نہیں اور ممکن ہے آپ ایسا مطالبہ کریں جس کی تکمیل ضروری نہ ہو۔ جب مطالبہ کا پورا کرنا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر واجب نہ ہوا تو ایک غیر واجب امر کے ترک کرنے پر آپ ہرگز قابل مذمت نہیں، یہ امر مباح ہی کیوں نہ ہو۔ جب ہم یہ فرض کرلیں کہ اس مطالبہ کا پورا کرنا سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے مباح بھی نہ تھا تو اس کی عدم تکمیل پر آپ مدح کے قابل ہوئے نہ کہ مذمت کے مستحق اور یہ کبھی معلوم نہیں ہوسکا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اور آپ کے بعد کسی کا حق ادا کرنے سے کبھی انکار نہیں کیا۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے وصیت فرمائی تھی کہ: ''انھیں رات کو دفن کیا جائے تاکہ ان میں سے کوئی ایک بھی ان کا جنازہ نہ پڑھے۔'' صرف وہی شخص اس قصہ کو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرسکتا ہے جو بالکل جاہل ہو اور سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا پر ایسے الزامات لگانا چاہتا ہو جو کہ آپ کی شان کے لائق نہیں۔ آپ کی شان میں ایسے کلمات کہے جو آپ کی عزت وعظمت کے منافی ہوں۔ بشرط صحت یہ بات چنداں مفید نہیں۔ اس لیے کہ جنازہ پڑھنے سے میت کو فائدہ ہی پہنچتا ہے کسی ضرر کا اندیشہ نہیں۔ نیز یہ کہ اگر ایک کم درجہ کا شخص افضل الخلق کا جنازہ پڑھے تو اسے کچھ نقصان نہیں پہنچتا۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی لیجیے کہ سب ابرار واشرار اور منافقین آپ پر درود وسلام بھیجتے ہیں۔ بفرض محال اگر اس سے آپ کو نفع نہیں پہنچتا تو ضرر بھی لاحق نہیں ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ آپ کی امت میں منافقین بھی ہیں۔ اس کے باوصف آپ نے کسی کو بھی درود وسلام سے نہ روکا، بلکہ مومن ومنافق سب کو درود وسلام کا حکم دیا۔

مذکورۃ الصدر حقائق اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ قبل ازیں ذکر کردہ واقعہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی مدح وستائش پر دلالت نہیں کرتا اور اس سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت پر وہی شخص استناد کرتا ہے جو جاہل مطلق ہو۔ مزید برآں یہ مسئلہ اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ اگر کوئی شخص وصیت کرے کہ مسلمان اس کا جنازہ نہ پڑھیں تو اس کی وصیت نافذ نہیں کی جائے گی اس لیے کہ نماز جنازہ اُس کے لیے ہر حال میں مفید ہے۔ ❶

⇦⇦ تو عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فاطمہ رضی اللہ عنہا کے آنے کی اطلاع دی، اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود ہمارے گھر تشریف لائے، اس وقت ہم اپنے بستروں پر لیٹ چکے تھے، میں نے چاہا کہ کھڑا ہو جاں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یوں ہی لیٹے رہو، اس کے بعد آپ ہم دونوں کے درمیان بیٹھ گئے اور میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کی ٹھنڈک اپنے سینے میں محسوس کی، ۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگوں نے مجھ سے جو طلب کیا ہے کیا میں تمہیں اس سے اچھی بات نہ بتاں، جب تم سونے کے لیے بستر پر لیٹو تو چونتیس مرتبہ اللـه اکبر، تینتیس مرتبہ سبحان الله اور تینتیس مرتبہ الحمدلله پڑھ لیا کرو، یہ عمل تمہارے لیے کسی خادم سے بہتر ہے۔'' ح: ۳۷۰۷۔

❶ امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے الاستیعاب میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا ذکر کرتے ہوئے آپ کی اس وصیت کا ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیوی اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کو غسل دیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیوی ہی نے آپ کے لیے نعش کا انتخاب کیا تھا جیسا کہ وہ ملک حبشہ میں بچشم خود ملاحظہ کرچکی تھیں۔ دیکھئے حلیة الاولیاء، ابونعیم: ۲/ ٤۲، نیز السنن الکبریٰ امام بیهقی: ٤/ ۳٤، نیز ۳/ ۹٦۔

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر کسی انسان پر کسی نے ظلم کیا ہو اور مظلوم وصیت کر جائے کہ ظالم اس کے جنازہ میں شریک نہ ہو تو اس کا یہ فعل ایسی نیکی نہیں ہے جو اس کے لیے قابل ستائش ہو۔ اللہ و رسول ﷺ نے بھی اس کا حکم نہیں دیا۔ مقام تعجب ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تعریف وتوصیف کرنے والے ایسے واقعات کس لیے بیان کرتے ہیں جو ان کے لیے موجب مدح ہونے کی بجائے ان کی شان میں قدح وارد کرتے ہیں جیسا کہ کتاب وسنت اور اجماع سے مستفاد ہوتا ہے۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: سب لوگوں نے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اے فاطمہ رضی اللہ عنہا! تیرے ناراض ہونے سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے اور تیرے راضی ہونے سے وہ راضی ہوتا ہے۔''

یہ صریح کذب ہے۔ یہ روایت آپ سے منقول نہیں اور کتب حدیث میں اس کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ علاوہ ازیں اس کی کوئی سند صحیح یا حسن رسول اللہ ﷺ تک نہیں پہنچتی۔ اس پر مزید یہ کہ جنتی ہونے اور اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کی شہادت اگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شان میں ملتی ہے تو یہی شہادت حضرات صحابہ کرام، حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، طلحہ، زبیر، سعید اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں بھی موجود ہے۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نےصحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے اپنی رضا مندی کا اظہار فرمایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ﴾ (التوبة: ۱۰۰)

''اور جو مہاجرین اور انصار سابق اور مقدم ہیں اور جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہوئے اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اس سے راضی ہوئے۔''

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ (الفتح: ۱۸)

''یقیناً اللہ تعالی مومنوں سے خوش ہوگیا جبکہ وہ درخت تلے آپ سے بیعت کر رہے تھے۔''

احادیث نبویہ سے یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب وفات پائی تو آپ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے رضا مند تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ و رسول ﷺ جس سے راضی ہوں تو دنیا میں سے کسی شخص کی ناراضگی بھی اسے ضرر نہیں پہنچا سکتی۔ خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ نیز اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جس شخص سے راضی ہوگیا وہ بھی اللہ تعالیٰ سے راضی ہوگا۔ اور جانبین کی رضا مندی وخوشنودی میں کامل یگانگت ومطابقت ہوگی۔ گویا ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے حکم پر راضی ہوگا اور اللہ تعالیٰ کا حکم اس کی رضا کے موافق ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے حکم پر راضی ہے وہ اس کے ناراض ہونے سے ناراض بھی ہو گا۔ اس لیے کہ جو شخص کسی دوسرے کے ناراض ہونے پر راضی ہوتا ہے وہ اس کے غضب آلود ہونے پر غضب آلود بھی ہو گا۔ وللہ المثل الاعلی.

شیعہ کی پیش کردہ حدیث پر نقد و جرح:

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''شبعی نے روایت کیا ہے کہ: آپ نے فرمایا: ''فاطمہ میرا جگر پارہ ہے۔ جو کوئی اسے تکلیف دیتا ہے وہ مجھے تکلیف دیتا ہے' اور جس نے مجھے تکلیف دی اس نے اللہ تعالیٰ کو تکلیف دی۔'' یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں کی گئی۔ احادیث میں مذکور الفاظ اس سے مختلف ہیں، جس حدیث میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

''بنو ہشام بن مغیرہ نے مجھ سے علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح کرنے کی اجازت طلب کی ہے، میں ہرگز اس کی اجازت نہ دوں گا۔'' یہ الفاظ آپ نے تین مرتبہ دہرائے۔ پھر فرمایا: ''فاطمہ میرا جگر پارہ ہے، مجھے بھی وہ چیز شک میں ڈالتی ہے جو اسے شک میں ڈالتی ہے۔ اور جو چیز اسے ایذا دیتی ہے اس سے مجھے بھی دکھ پہنچتا ہے۔'' البتہ یہ ممکن ہے کہ علی رضی اللہ عنہ میری بیٹی کو طلاق دے کر ابوجہل کی بیٹی کے ساتھ نکاح کر لے۔'' ایک روایت میں یوں ہے: ''مجھے ڈر ہے کہ فاطمہ کہیں دینی ابتلاء میں نہ پڑ جائے۔'' پھر آپ نے اپنے ایک داماد (ابوالعاص) کا ذکر کر کے اس کی تعریف فرمائی اور کہا: ''اس نے جب بھی بات کی سچ بولا۔ اور جب وعدہ کیا تو اسے پورا کر دکھایا۔ میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال تو نہیں کرتا۔ مگر اللہ کی قسم! جگر گوشۂ رسول اور اللہ کے دشمن کی بیٹی ایک شخص کے گھر میں جمع نہیں ہوسکتیں۔''[1]

یہ حدیث حضرت علی بن حسین نے مسور بن مخرمہ سے روایت کی ہے۔[2] حدیث بیان کرنے کا سبب خود روایت میں موجود ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ابوجہل کی بیٹی کو اپنے نکاح میں لانا چاہتے تھے۔ بنا بریں بیان کردہ سبب کو حدیث سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ حدیث کے الفاظ واضح ہیں:

[1] صحیح بخاری۔ کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب ذکر اصہار النبی صلی اللہ علیہ وسلم (ح:۳۷۲۹، ۵۲۳۰) و صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ۔ باب من فضائل فاطمۃ رضی اللہ عنہا (ح۲٤٤۹) تاہم اس کے سیاق و سباق میں اختلاف ہے۔

[2] یہ پوری حدیث صحیح بخاری [ح:3110] میں اس طرح ہے: حضرت علی بن حسین [زین العابدین رحمہ اللہ] نے بیان کیا کہ جب ہم سب حضرات حسین بن علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد یزید بن معاویہ کے یہاں سے مدینہ منورہ تشریف لائے تو مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ نے آپ سے ملاقات کی اور کہا اگر آپ کو کوئی ضرورت ہو تو مجھے حکم فرما دیجئے۔ [زین العابدین نے بیان کیا کہ] میں نے کہا: مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پھر مسور نے کہا تو کیا آپ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار عنایت فرمائیں گے؟ کیونکہ مجھے خوف ہے کہ کچھ لوگ [بنو امیہ] اسے آپ سے نہ چھین لیں۔ اور اللہ کی قسم! اگر وہ تلوار آپ مجھے عنایت فرما دیں تو کوئی شخص بھی جب تک میری جان باقی ہے اسے چھین نہیں سکے گا۔ پھر مسور رضی اللہ عنہ نے ایک قصہ بیان کیا کہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کی موجودگی میں ابوجہل کی ایک بیٹی [جمیلہ نامی] کو پیغام نکاح دے دیا تھا۔ میں نے خود سنا کہ اسی مسئلہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسی منبر پر کھڑے ہو کر صحابہ کو خطاب فرمایا۔ میں اس وقت بالغ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ میں فرمایا کہ فاطمہ مجھ سے ہے۔ اور مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ [اس رشتہ کی وجہ سے] کسی گناہ میں نہ پڑ جائے کہ اپنے دین میں وہ کسی فتنہ میں مبتلا ہو۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاندان بنی عبد شمس کے ایک اپنے داماد [عاص بن ربیع] کا ذکر کیا اور دامادی سے متعلق آپ نے ان کی تعریف کی آپ نے فرمایا کہ انہوں نے مجھ سے جو بات کہی سچ کہی جو وعدہ کیا اسے پورا کیا۔ میں کسی حلال [یعنی نکاح ثانی] کو حرام نہیں کر سکتا اور نہ کسی حرام کو حلال بناتا ہوں۔ لیکن اللہ کی قسم! رسول اللہ کی بیٹی اور اللہ کے دشمن کی بیٹی ایک ساتھ جمع نہیں ہوں گی۔''

''جو چیز فاطمہ رضی اللہ عنہا کو شک میں مبتلا کرتی ہے وہ مجھے بھی شبہ میں ڈالتی ہے اور جس بات سے فاطمہ کو دکھ پہنچے وہ میرے لیے بھی رنج والم کی موجب ہے۔''

حدیث میں آپ نے واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے:

''جو اسے شک میں ڈالتی ہے۔اور جو چیز اسے ایذا دیتی ہے اس سے مجھے بھی دکھ پہنچتا ہے۔''

یہ بات قطعی طور پر معلوم ہے کہ نبی کریم ﷺ کو یہ تکلیف محض اس لیے پہنچی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابو جہل کی بیٹی کے ساتھ نکاح کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اگر یہ وعید ایذا دینے والے کو لاحق ہوسکتی ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اس وعید کی لپیٹ میں آنا ضروری ہے۔ اور اگر اس کا احتمال نہیں ہے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت اس وعید سے بعید تر ہوں گے۔

اگر شیعہ کہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابو جہل کی بیٹی کے ساتھ نکاح کرنے کا ارادہ ترک کر کے اس سے توبہ کر لی تھی۔ تو ہم کہیں گے کہ اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا غیر معصوم ہونا لازم آتا ہے۔ نیز یہ کہ اگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ایذاء کا ازالہ توبہ سے ہوسکتا ہے تو اس کے علاوہ دیگر نیک اعمال بھی یقیناً اس کو محو کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اعمال صالحہ مصائب و آلام اور توبہ سے تو اس سے بھی بڑے گناہ ختم ہو سکتے ہیں۔ مزید براں یہ گناہ کفر نہیں ہے کہ بلا توبہ معاف نہ ہوسکتا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کی زندگی ہی میں مرتد ہو چکے ہوتے۔ (العیاذ باللہ)۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے مبرا و منزہ قرار دیا ہے۔ [اس لیے آپ کا مومن و مسلم ہونا ایک یقینی امر ہے]۔ خوارج جنھوں نے آپ کے مرتد ہونے کا دعویٰ کیا تھا وہ بھی یہی کہتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد اسلام سے منحرف ہو گئے۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ آپ رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارک میں ہی مرتد ہو گئے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عہد نبوی میں مرتد ہونے والے کو یا قتل کر دیا جاتا تھا یا وہ پھر دین اسلام کی طرف لوٹ آتا تھا۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دامن اس سے پاک رہا۔ اگر آپ کا یہ فعل شرک سے کم تر تھا تو یہ جان لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ (النساء:۱۱۶)

''اللہ معاف نہیں کرتا کہ اس کیساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے اور اس سے کم جس کو چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔''

اگر شیعہ لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا کفر ثابت کرنے کے لیے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ایذاء کو کفر قرار دیں تو اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی کافر ہونا لازم آئے گا اور جب لازم باطل ہے تو ملزوم کے بطلان میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ شیعہ کی یہ پرانی عادت ہے کہ وہ حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کی عیب چینی کرتے ہیں؛ اور ایسے امور کی بنا پر ان کی تکفیر کرتے ہیں جن کی مثل بلکہ اس سے بھی پرے بلا عذر افعال حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صادر ہو چکے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان افعال میں اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ ماجور یا معذور ہیں تو خلفاء ثلاثہ بالاولیٰ اجر یا عذر کے مستحق ہوں گے اور اگر کسی معمولی امر کی بناء پر خلفاء ثلاثہ فاسق یا کافر قرار پائیں گے تو کیا وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس سے شنیع تر فعل کے

مرتکب ہونے پر بھی کفر و فسق سے بچ جائیں؟

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ستانا اس لیے بڑا گناہ ہے کہ اس سے ان کے والد محترم کو دکھ پہنچتا ہے۔ کسی معاملہ میں جب یہ سوال پیدا ہو جائے کہ آیا سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ایذا دینے سے احتراز کیا جائے یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ستم رانی کرنے سے۔ تو ظاہر ہے کہ اندریں صورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذاء سے دست کشی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اذیت کی نسبت واجب تر ہوگی۔

حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (انبیاء کی عدم توریث) ایک حکم دیا تھا اور یہ دونوں اصحاب اس کی خلاف ورزی کر کے آپ کو ایذا پہنچانے سے امکانی حد تک کنارہ کش رہنا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے عہد لیا تھا؛ اور ان کو اس بارے میں ایک حکم دیا تھا۔ یہ دونوں حضرات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکم عدولی سے بچنا چاہتے تھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی حکم عدولی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوں یا آپ کو کوئی تکلیف پہنچے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی رعایت کرنا زیادہ اہم تھا [یعنی جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی بات کا حکم دیں اور سیدہ فاطمہ اس کے برخلاف مطالبہ کریں تو حکم رسول کی مراعات اولیٰ ہوگی۔ ہر سلیم العقل آدمی اس بات سے اتفاق کرے گا کہ] آپ کی اطاعت گزاری واجب؛ جب کہ نافرمانی حرام ہے۔ اور اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنے سے کسی کو دکھ پہنچتا ہے تو وہ غلطی پر ہے اور آپ کی اطاعت کرنے والا حق اور راہ راست پر ہے۔ یہ اس صورت سے مختلف ہے جب کوئی شخص اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے لیے نہیں بلکہ کسی اور مقصد کے لیے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ستائے۔

جو شخص اس بات پر غور کرے گا کہ مذکورہ واقعہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مقصد صرف نبی کریم رضی اللہ عنہ کی اطاعت تھی اور اس کے سوا کوئی بات آپ کے پیش نظر نہ تھی تو وہ اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوگا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ فعل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اقدام کے مقابلہ میں اکمل و افضل ہے۔ تاہم دونوں کی عظمت و فضیلت میں کلام نہیں۔ آپ دونوں اکابر اولیاء اللہ سابقین اولین اور اللہ کے مقربین؛ کامیابی پانے والی اللہ کی جماعت [حزب اللہ] میں سے' اور اللہ کے نیک بندے اکابر متقین میں سے تھے جو حوض تسنیم سے سیراب ہوں گے۔ [ان شاء اللہ تعالیٰ]۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

''اللہ کی قسم! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت ذاتی قرابت کی نسبت مجھے عزیز تر ہے۔'' [1]

یہ بھی آپ ہی کا قول ہے: ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کا خیال رکھیے۔'' [2]

مقصود یہ ہے کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو رنج و الم پہنچایا تھا تو یہ ماننا پڑے گا کہ آپ نے کسی ذاتی غرض کے تحت ایسا نہیں کیا تھا، اس کی اصل وجہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت، نیز یہ جذبہ اس کا محرک تھا کہ حق دار کو حق مل کر رہے۔ [3]

---

[1] البخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ باب مناقب قرابۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ح: ۳۷۱۲) مسلم۔ کتاب الجهاد، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم " لا نورث ما ترکنا فھو صدقة" (ح: ۱۷۵۹) مطولاً۔

[2] صحیح بخاری، حوالہ سابق (حدیث: ۳۷۱۳)

[3] یعنی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق یہ آمدنی رفاہ عام کے کاموں پر صرف کی جائے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ ابوجہل کی بیٹی کے ساتھ شادی کرکے آپ کو دکھ پہنچانا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام ذاتی غرض پر مبنی تھا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ مذکورہ بالا واقعات اس بات کے زندہ گواہ ہیں کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ایذا سے متعلق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہا کی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فعل مذمت کا زیادہ استحقاق رکھتا ہے، اس لیے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے لیے ایسا کیا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ذاتی غرض کی بنا پر۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا شمار ان بزرگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہجرت کی تھی۔ ظاہر ہے کہ کسی عورت سے نکاح کرنے کی نیت سے ہجرت کرنے والا، ان کا ہم پلہ کیسے ہوسکتا ہے۔ [1]

بے شک سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ایذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے باعث رنج و ملال ہے، بشرطیکہ وہ بات حکم الٰہی کے خلاف نہ ہو۔ جب کسی بات میں حکم الٰہی موجود ہو تو اس کی انجام دہی ضروری ہے، قطع نظر اس سے کہ یہ امر کسی کے لیے موجب اذیت ہو۔ اللہ کی اطاعت کرتے ہوئے باعث اذیت وہ بات ہوگی جو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے منافی ہو۔ اس کی مثال مندرجہ ذیل حدیث نبوی ہے:

''جس شخص نے میری اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی، جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی حکم عدولی کی، اور جس نے میرے امیر کے حکم

[1] اہل سنت کی بلند اخلاقی کی اعلیٰ مثال ہے کہ وہ ابوجہل کی بیٹی کے ساتھ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے عزم نکاح اور اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وسیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شدید ناراضگی کا واقعہ شاذ و نادر ہی ذکر کرتے ہیں۔ حالانکہ اس ضمن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کے منبر پر جو شہرۂ آفاق خطبہ دیا وہ قرآن کریم کے بعد صحیح ترین کتب حدیث کے اوراق میں محفوظ ہے۔ دوسری جانب شیعہ کا یہ حال ہے کہ تمام تاریخی اَدوار میں انھوں نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خلاف شور و شغب بپا کیے رکھا۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا جرم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایسے حکم کو نافذ کرنے کی غلطی کی جو انھوں نے بذات خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا۔ علاوہ ازیں کثیر صحابہ اور خود سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی براہ راست اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن چکے تھے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نہایت موزوں طریقہ سے امر نبوی کی تکمیل فرمائی۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور دیگر اہل بیت کو اس جاگیر سے اپنی ضروریات پوری کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اور جو باقی رہ جاتا تھا اس کو اسوۂ نبوی کے مطابق رفاہ عام کے کاموں پر صرف کرنے کی ہدایت کی۔ شیعہ کے شور و شغب اور دروغ گوئی کا نتیجہ ہے کہ لوگ مسئلہ فدک کی تفصیلات سے آگاہ ہیں، اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے عزم نکاح سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدہ فاطمہ کس حد تک برہم ہوئے تھے، یہ دونوں واقعات (مسئلہ فدک اور ابوجہل کی بیٹی سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا عزم نکاح) جملہ اختلافی مسائل میں اہل سنت و شیعہ کے مابین ایک عمدہ معیار کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس سے عیاں ہوتا ہے کہ صحابہ و اہل بیت کے بارے میں فریقین کا موقف کیا ہے۔ یہ دونوں واقعات اس بات کے شاہد عدل ہیں کہ اہل سنت صحابہ و اہل بیت دونوں کو عزت و وقار کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بخلاف ازیں شیعہ کے دل بغض صحابہ سے لبریز ہیں اور اہل بیت کی محبت کے بارے میں ان کے سب دعوے بے بنیاد ہیں، اہل بیت کی محبت شیعہ میں صرف اس حد تک پائی جاتی ہے کہ ان کی قبروں کو بت بنا کر ان کی پرستش کرتے رہیں اور اس طرح صنم پرستی کے دور کی یادیں تازہ کردیں۔ دیگر بہنوں کو چھوڑ کر صرف سیدہ فاطمہ سے اظہار محبت کذب و دروغ پر مبنی ہے۔ علاوہ ازیں شیعہ، بعض بنی فاطمہ رضی اللہ عنہا سے محبت کرتے ہیں اور بعض سے بغض و عناد رکھتے ہیں۔ مگر حق و صداقت کسی کے چھپائے چھپتی نہیں اور اس کا نور ظاہر ہوکر رہتا ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ يُحِقُّ الْحَقَّ وَ هُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ﴾

سے سرتابی کی اس نے میری نافرمانی کی۔'' ❶

پھر آپ ﷺ نے ان الفاظ میں اس حدیث کی توضیح فرمائی:

''کسی کی اطاعت صرف نیکی کے کاموں میں ہے۔'' ❷

جب نبی کریم ﷺ نے اپنے امراء کی اطاعت کو مطلق بیان کیا' اور پھر اسے اس شرط کے ساتھ مقید کر دیا کہ اطاعت صرف نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ہوگی۔ پھر نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان مبارک کہ:

''جس نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ایذا دی اس نے مجھے تکلیف دی۔'' بالاولیٰ اذی فی المعروف پر محمول ہوگا۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کے امراء کی اطاعت فرض ہے اور ان کی نافرمانی کبیرہ گناہ ہے، مگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ایذا پہنچانے کا فعل نبی کریم ﷺ کی نافرمانی کے مساوی نہیں، ورنہ لازم آئے گا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اللہ و رسول ﷺ کی نافرمانی کا ارتکاب کیا تھا۔ کیوں کہ نبی کریم ﷺ کے امراء کی نافرمانی آپ کی نافرمانی ہے، اور آپ کے حکم سے سرتابی معصیت الٰہی ہے۔

پھر اعتراض کرنے والے سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ: حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما دونوں ولی الامر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ولی امر کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ ولی امر کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت؛ اور اس کی نافرمانی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔ جو ولی امر کے حکم اور فیصلہ پر ناراض ہو؛ یقیناً وہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور فیصلہ پر ناراض ہے۔

پھر اعتراض کرنے والا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر تنقید کرتے ہوئے یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ: '' انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو رد کیا؛ اور اس کے فیصلہ پر ناراض رہے۔ اور اس چیز کو ناپسند کیا جس پر اللہ راضی ہوگیا تھا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تو اس پر راضی ہوتا ہے کہ اس کی اور اس کے ولی امر کی اطاعت کی جائے۔ پس جو کوئی ولی امر کی اطاعت کو ناپسند کرتا ہے وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی رضامندی کو ناپسند کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی نافرمانی پر ناراض ہوتا ہے؛ اور ولی امر کی نافرمانی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔ پس جو کوئی ولی امر کی معصیت کی اتباع کرے یقیناً وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے پیچھے چلتا ہے۔ اور اللہ کی رضامندی کو ناپسند کرتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر یہ جرح کرنا روافض کے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر جرح کرنے کی نسبت زیادہ معقول و مقبول ہو سکتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی جانب سے وارد ہونے والی نصوص میں ولاۃ امور [حکمرانوں] کی اطاعت اور مسلمان کی جماعت کے ساتھ منسلک رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور [اگر ان حکمرانوں کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچے تو اس پر] صبر کرنے کا حکم دیا گیا

❶ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب یقاتل من وراء الامام و یتقی به، (حدیث:۲۹۵۷)، صحیح مسلم۔ کتاب الامارة۔ باب وجوب طاعة الامراء فی غیر معصیة (حدیث: ۱۸۳۵) باختلاف۔

❷ صحیح بخاری، کتاب الاحکام۔ باب السمع والطاعة للامام ما لم تکن معصیة (ح: ۷۱۴۵)، صحیح مسلم۔ کتاب الامارة۔ باب وجوب طاعة الامراء فی غیر معصیة (ح:۱۸۴۰)

ہے۔ اس بارے میں وارد احادیث کثرت کے ساتھ اور بہت مشہور ہیں ۔ بلکہ کوئی کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

((عنقریب میرے بعد حقوق تلف کئے جائیں گے [اور ایسے امور پیش آئیں گے جنہیں تم ناپسند کرتے ہو] پس تم صبر کرتے رہنا یہاں تک کہ حوض پر مجھ سے آملو)) ❶

ایک دوسری روایت میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

'' تم پر کسی کا جو حق ہو وہ ادا کردو اور اپنے حقوق تم اللہ سے مانگتے رہنا۔'' ❷

اس طرح کی دیگر بھی کئی ایک روایات ہیں ۔ اگر بالفرض یہ تسلیم کرلیا جائے کہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما ظالم تھے' وہ اپنی ذات کے لیے لوگوں کا مال چھیننا چاہتے تھے تو اس کے باوجود احادیث مبارکہ کی روشنی میں ان کے ظلم پر صبر کرنا اور نیکی کے کاموں میں ان کی اطاعت کرنا واجب تھا۔

پھر اگر یہ اعتراض کرنے والا حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما پر طعن وتنقید اور جرح وقدح کرنا شروع کردے' او رکہے کہ: ان لوگوں نے صبر نہیں کیا [جیسا کہ احادیث مبارکہ میں حکم تھا] اور انہوں نے جماعت کا ساتھ چھوڑ دیا بلکہ انہوں نے جماعت میں تفریق پیدا کی جو کہ بہت بڑا گناہ ہے ۔ تو یقیناً یہ جرح حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما پر روافض کی جرح نسبت زیادہ معقول اور حق پر ہے۔ اس لیے کہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے خلاف کوئی ایسی دلیل نہیں ملتی جس کی روشنی میں واجب آتا ہو کہ آپ نے کسی واجب کو ترک کیا ہو اور یا کسی حرام کا ارتکاب کیا ہو ۔ اور جس دلیل سے حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما کو اس معصیت سے مبراء ومنزہ مانا جائے گا' اسی دلیل کی روشنی میں حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کسی بھی ظلم ومعصیت سے بدرجہ اولیٰ منزہ ومبرا ہوں گے ۔ اور جو شبہ بھی حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما پر وارد ہوگا کہ آپ نے واجب کو ترک کیا یا کسی حرام فعل کا ارتکاب کیا؛ تو وہ شبہ زیادہ قوت اور زور کے ساتھ حضرت علی اور فاطمہ رضی اللہ عنہما پر بھی وارد ہوگا۔

کوئی انسان اگر حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما کو گناہوں سے پاک اور معصوم قرار دیکر ان کی مدح سرائی اور تعریف وتوصیف بیان کرے؛ اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو گنہگار' اور ناقابل مغفرت وبخشش خیال کرتا رہے تو یہ اس کی طرف سے سب سے بڑا ظلم اور جہالت ہوگی۔ وہ ان لوگوں سے بھی بڑھ کر جاہل ہیں جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی تعریف کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات پر طعن وتشنیع کرنے لگے۔

آٹھویں وجہ:......شیعہ مصنف کا قول: '' اگر حدیث '' لا نُورِث '' صحیح ہوتی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی تلوار، خچر اور عمامہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے دعویٰ کی موجودگی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تفویض نہ فرماتے۔''

جواب: ہم پوچھے ہیں کہ: حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے یہ فیصلہ کب فرمایا تھا؟ اور کس نے یہ واقعہ نقل کیا ہے؟ یہ ان پر صریح بہتان ہے، زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ یہ اشیاء جہاں تھیں وہاں رکھی رہتیں اور کوئی ان کا مالک قرار نہ پاتا۔

❶ صحیح مسلم قد تقدم تخریجہ۔ ❷ صحیح مسلم قد تقدم تخریجہ۔

جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقات کو حضرت علی و عباس رضی اللہ عنہما کی تحویل میں دے دیا تھا کہ وہ اسے شرعی مصارف میں صرف کردیں۔

[اہل بیت کا تزکیہ اور اس کی حقیقت:]

❀ شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''ورنہ اہل بیت جن کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں پاکیزہ قرار دیا ہے ناروا امور کے مرتکب ٹھہریں گے۔''

❀ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب اہل بیت کو پاک و صاف نہیں کیا۔ اور ایسا دعویٰ کرنا اللہ تعالیٰ پر افتراء پردازی کرنے کے مترادف ہے۔ یہ دعوی کیوں کر صحیح ہوسکتا ہے؟ جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ بعض بنی ہاشم گناہ و نجاست سے پاکیزہ نہیں ہیں؛ اور نہ ہی انہیں گناہوں سے پاک کیا گیا ہے۔ اس کی حد یہ ہے کہ خود روافض کو بھی اس کا اعتراف ہے؛ شیعہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ بنی ہاشم میں سے جو شخص ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت رکھتا ہے وہ پاک نہیں ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ﴾ (الاحزاب)

''اے اہل بیت! اللہ تعالیٰ تم سے نجاست کو دور کرنا چاہتے ہیں۔''

مندرجہ بالا آیت سورہ مائدہ کی حسب ذیل آیت کی مانند ہے:

﴿مَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیَجْعَلَ عَلَیْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّ لٰكِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَهِّرَكُمْ وَ لِیُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ (المائدۃ:۶)

''اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی کرے اور لیکن وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور تاکہ وہ اپنی نعمت تم پر پوری کرے، تاکہ تم شکر کرو۔''

سورہ نساء کی حسب ذیل آیت بھی اسی قبیل سے ہے:

﴿یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُبَیِّنَ لَكُمْ وَ یَهْدِیَكُمْ سُنَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ یَتُوْبَ عَلَیْكُمْ﴾ (النساء:۲۶)

''اللہ چاہتا ہے کہ تمھارے لیے کھول کر بیان کرے اور تمھیں ان لوگوں کے طریقوں کی ہدایت دے جو تم سے پہلے تھے اور تمہاری توبہ قبول فرمائے۔''

علاوہ ازیں اس نوع کی وہ آیات جن میں یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے لیے فلاں چیز کو پسند کرتے اور اس کا حکم دیتے ہیں جو شخص یہ کام کرے گا وہ مقصود کو پالے گا اور جو ایسا نہیں کرے گا وہ اپنے مقصد سے دور رہے گا۔ دوسرے موقع پر اس کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں؛ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات منکرین تقدیر روافض پر چسپاں ہوتی ہے۔ شیعہ اس بات کے قائل ہیں کہ ارادۂ الٰہی سے اس کا حکم مراد ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ وہی کام کرتا ہے

جس کا وہ ارادہ کرتا ہے۔ بنا بریں یہ ثابت ہوا کہ تطہیر کا ارادہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ شخص فی الواقع پاک بھی ہو جائے۔ شیعہ کے نزدیک یہ جائز نہیں کہ کوئی کسی کو پاک کرے بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو پاک کرنا چاہتے ہیں اگر وہ چاہے تو اپنے آپ کو پاک کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ شیعہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کسی کی تطہیر پر قادر نہیں ہے۔

[صدقات اور بنی ہاشم]:

[اشکال]: شیعہ مصنف کا یہ قول: ''بنی ہاشم پر صدقہ حرام ہے۔''

[جواب] : ہم کہتے ہیں کہ: صرف فرض صدقات بنی ہاشم پر حرام ہیں۔ نفلی صدقات مباح ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ بنی ہاشم وہ خیراتی پانی پی لیا کرتے تھے جو مکہ و مدینہ کے مابین تقسیم کیا جاتا تھا۔ اور کہا کرتے تھے کہ فرضی صدقات ہم پر حرام ہیں نفلی صدقات نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب بنی ہاشم اجنبی لوگوں کے نفلی صدقات سے متمتع ہو سکتے تھے تو نبی کریم ﷺ کے صدقات سے نفع اندوز ہونا ان کے لیے بالاولیٰ روا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ مال زکوٰۃ نہ تھا جسے لوگوں کی میل کچیل کہا گیا ہے، اور جو بنی ہاشم پر حرام ہے۔ بلکہ یہ وہ مال تھا جو کسی جہاد و قتال کے بغیر صلح کے نتیجہ میں نبی کریم ﷺ کو ملا تھا۔ یہ بنی ہاشم کے لیے حلال تھا اور نبی ﷺ یہ سب مال صدقہ کر دیا کرتے تھے۔ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ آپ کی ملکیت تھا اور آپ صدقہ کے طور سے اسے مسلمانوں میں تقسیم فرما دیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ آپ کے اقارب صدقہ کے زیادہ مستحق تھے کیوں کہ صدقہ مسلمانوں کے حق میں صرف صدقہ ہے اور اقارب کے حق میں صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی۔[1]

نویں وجہ:......شیعہ قلم کار نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت پر جو معارضہ کیا ہے۔'' ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کسی غیر کے حق کا دعویٰ نہیں کیا تھا جو اس سے چھین کر ان کو دیا جائے۔ ان کا مطالبہ بیت المال سے تھا جو حاکم بآسانی نبی کریم ﷺ کے وعدہ کے بغیر بھی پورا کر سکتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے وعدہ کرنے کی صورت میں حاکم کے لیے اس مطالبہ کی تکمیل اولیٰ بالجواز ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس میں گواہ کی ضرورت محسوس نہ کی۔

اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص آتا ہے اور وہ بیت المال کی کسی زمین پر دعوی کرتا ہے کہ یہ میرا حق ہے۔ تو امام کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ بغیر شرعی حجت [اور گواہی] کے وہ زمین بیت المال کے قبضہ سے نکال کر اس کو دیدے۔ بخلاف اس کے ایک دوسرا انسان آتا ہے' اس کا کوئی ایسا دعوی تو نہیں' مگر وہ بیت المال میں سے جو مال مسلمانوں میں تقسیم ہونے کے لیے موجود ہے' اس سے میں سے کچھ بغیر دعوی کے طلب کرتا ہے۔ تو ایسے انسان کے لیے جائز ہے کہ بغیر گواہی کے بھی اس کی طلب پوری کر دی جائے۔

کیا آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے صدقات اوقاف ہیں۔ اور آپ کے علاوہ باقی مسلمانوں کے

---

[1] سنن ترمذی۔ کتاب الزکاۃ۔ باب ما جاء فی الصدقة علی ذی القرابة (حدیث:٦٥٨)، سنن نسائی۔ کتاب الزکاۃ باب الصدقة علی الاقارب (حدیث:٢٥٨٣)، سنن ابن ماجه، کتاب الزکاۃ، باب فضل الصدقة (حدیث:١٨٤٤)۔

صدقات کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ان صدقات کے اصل مال کا مالک بن جائے۔ اور یہ جائز ہے کہ اس کے نفع کو ایسے تقسیم کیا جائے جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں۔ پس جو مال حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے طلب کیا تھا' وہ اسی قسم سے تعلق رکھتا ہے جو مسلمانوں کے درمیان تقسیم کے لیے تھا۔ بخلاف اصول اموال کے۔

اسی لیے حضرت ابوبکر و عمر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹوں حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد کو اور دیگر بنی ہاشم رضی اللہ عنہم اجمعین کو بیت المال سے اس سے بہت زیادہ دے دیا کرتے تھے جیسے جابر رضی اللہ عنہ کو دیا۔ یہ مال مسلمانوں کے درمیان میں تقسیم کے لیے ہوا کرتا تھا۔ بھلے ان میں سے کسی کے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کوئی عہد و پیمان نہ بھی ہو [تب بھی یہ مال انہیں ملا کرتا تھا]۔

جاہل رافضی کا یہ قول کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کے بیت المال سے بغیر کسی گواہی اور دلیل کے صرف اپنے دعوی کی بنیاد پر مال لے لیا؛ یہ ایسے جاہل انسان کا کلام ہوسکتا ہے جو اس بارے میں اللہ تعالیٰ کے احکام کو نہ جانتا ہو۔ اس لیے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو جو مال دیا گیا اس کا تعلق ان اموال سے تھا جن کا مسلمانوں کے مابین تقسیم کیا جانا واجب تھا۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ بھی مسلمانوں میں سے ایک ہیں۔ اور ان کا اس مال میں حق بھی تھا۔ وہ بیت المال کے شرکاء میں سے ایک ہیں۔ جب مسلمان حاکم مسلمانوں میں سے کسی ایک کو مسلمانوں کے بیت المال میں سے کچھ مال دے دے تو یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے بغیر کسی دلیل کے مسلمانوں کے بیت المال میں سے مال دے دیا۔ اس لیے کہ مسلمانوں کے درمیان تقسیم کرنے اور انہیں عطیات دینے کے لیے کسی گواہی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بخلاف اس کے کہ کوئی انسان تمام مسلمانوں کے برعکس کسی اصل مال کا ہی دعوی کرے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان حکمران کو اپنے اجتہاد و تقدیر سے مال تقسیم کرنے کی اجازت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حثیات بھر بھر کر مال تقسیم کیا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح منقول ہے۔ حثیات ایک قسم کا پیمانہ ہے [اس کا لفظی ترجمہ بھری ہوئی لپیں ہے۔ دراوی]۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تین حثیات بھر کر دینے کا وعدہ فرمایا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک میں یہ عام سا فعل ہے [اس لیے کہ آپ لوگوں کو ایسے ہی نوازا کرتے تھے]۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے صرف وہی چیز بیان کی تھی جس کا آپ سے وعدہ کیا گیا تھا۔ اور اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء و اتباع کرنی چاہیے تھی۔ پس حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کو اتنا دیا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا۔ [1]

---

[1] یہ پوری حدیث صحیح بخاری کتاب الکفالۃ باب من تکفل عن میت دیناً میں نقل کی ہے؛ حدیث نمبر: 3164؛ اس کے الفاظ یہ ہیں: حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اگر ہمارے پاس بحرین سے روپیہ آیا، تو میں تمہیں اتنا، اتنا، اتنا [تین لپ] دوں گا۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی اور اس کے بعد بحرین کا روپیہ آیا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر کسی سے کوئی دینے کا وعدہ کیا ہو تو وہ ہمارے پاس آئے۔ چنانچہ میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اگر بحرین کا روپیہ ہمارے یہاں آیا تو میں تمہیں اتنا، اتنا اور اتنا دوں گا۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ اچھا ایک لپ بھرو، میں نے ایک لپ بھری، تو انہوں نے فرمایا کہ اسے شمار کرو، میں نے شمار کیا تو پانچ سو تھا، پھر انہوں نے مجھے ڈیڑھ ہزار عنایت فرمایا۔''

پھر آپ نے جب ان کی تعداد دیکھی تو اتنا ہی آپ کو دوبار مزید بھی دیا۔ تا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق ہو جائے [اور اس میں کسی قسم کی کمی نہ ہو]۔ اس لیے کہ حسب امکان فرمان نبوت کی موافقت کرنا واجب ہوتا ہے۔ اگر اس کا علم حاصل ہو جائے تو ٹھیک ہے' ورنہ اجتہاد سے کام لیا جائے گا۔ باقی رہا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دعوی ہبہ کا قصہ ؛ اور آپ کا گواہوں کو لانا وغیرہ۔ اگر اس قصہ کو صحیح تسلیم کر بھی لیا جائے تو جو لوگ اس سے مدح کا پہلو نکالنا چاہتے ہیں' ان کے لیے اتنی ہی قدح اس قصہ سے ثابت ہوتی ہے۔

فصل: ......حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اور لقب صدیق؟

[اعتراض]: رافضی مضمون نگار لکھتا ہے: ''سب محدثین نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''نہ ہی آسمان نے کسی پر سایہ کیا ہوگا اور نہ ہی زمین نے کسی کو اٹھایا ہوگا جو ابوذر سے بڑھ کر سچے لہجے والا ہو۔'' ❶

[اہل سنت نے] ان کا نام تو صدیق نہیں رکھا؛ جب کو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہی نام دیا جانے لگا۔ حالانکہ آپ کے حق میں کوئی ایسی روایت وارد نہیں ہوئی۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: یہ روایت تمام محدثین نے روایت نہیں کی؛ نہ ہی شیخین نے روایت کی ہے اور نہ ہی اصحاب سنن نے۔ بلکہ اسے اجمالی طور پر روایت کیا گیا ہے۔ ❷ اور اگر اس کی صحت اور ثبوت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو وہ بعض دیگر حدیث کی کتابوں میں روایت کی گئی ہے۔ یہ بھی جاننا چاہیے کہ اس حدیث سے یہ مراد نہیں ہے کہ ابوذر رضی اللہ عنہ تمام مخلوق سے بڑھ کر سچے ہیں۔ کیونکہ پھر اس سے لازم آتا ہے کہ آپ رسول اللہ ﷺ سے اور باقی سارے انبیاء کرام علیہم السلام سے بھی بڑھ کر سچے ہوں۔ علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ سے بھی بڑھ کر سچے ہوں۔ یہ بات شیعہ و اہل سنت تمام مسلمانوں کے اجماع کے خلاف ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ابوذر رضی اللہ عنہ سچے انسان ہیں؛ ان سے بڑھ کر کوئی سچائی کا طلب گار نہیں۔

جب کوئی انسان سچائی کی تلاش میں رہتا ہو تو کہا جاتا ہے کہ فلاں سچے لہجے والا ہے۔ اگرچہ اسے انبیاء کرام علیہم السلام کی لائی ہوئی تعلیمات سے بہت کم آگاہی ہو۔ نبی کریم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ: آسمان نے کسی ایسے پر سایہ نہیں کیا جو ابوذر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر سچائی کی تصدیق کرنے والا ہو۔ بلکہ آپ نے فرمایا ہے: ''سچے لہجے والا۔'' اور صدیق کا معنی یہ ہے کہ جس نے انبیاء کرام علیہم السلام کی تصدیق کی؛ صرف اس کے سچا ہونے کے بنا پر نہیں؛ بلکہ آپ کی مدح انبیاء کرام علیہم السلام کی تصدیق کرنے کی وجہ سے ہے۔ اور پھر نبی کریم ﷺ کی تصدیق تو ایک خاص معاملہ ہے۔ آپ کی مدح اس تصدیق کی وجہ سے کی جاتی ہے؛ جو کہ ایک خاص قسم سے تعلق رکھتی ہے۔ جب کہ کسی انسان کا اپنے من میں سچا ہونا ایک علیحدہ

---

❶ رواه الحاكم في المستدرك و الآجري في الشريعة وابن أبي عاصم في الأحاد و المثاني۔''

❷ سنن الترمذي؛ كتاب المناقب؛ باب مناقب أبي ذر رضی اللہ عنہ؛ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: آسمان نے کسی پر سایہ نہیں کیا اور نہ زمین نے اپنے اوپر کسی کو پناہ دی جو ابوذر رضی اللہ عنہ سے زیادہ سچا ہو۔ امام ترمذی کہتے ہیں: یہ حدیث حسن ہے، ح: ۳۸۰۱ قال: الالبانی: صحیح، صحیح ابن ماجة ۱۵۶۔ وضعفه أحمد الشاكر أسانيده الثلاث.

بات ہے۔پس اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ: ہر صدیق صادق ہوتا ہے۔اور ہر صادق صدیق نہیں ہوتا۔

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''سچ نیکی کا راستہ دکھاتا ہے اور نیکی جنت کی طرف لے کر جاتی ہے۔اور کوئی انسان سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ سچا لکھ دیا جاتا ہے۔اور جھوٹ برائی کا راستہ دکھاتا ہے اور برائی دوزخ کی طرف لے جاتی ہے اور کوئی انسان جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔''❶

پس صدیق سے کبھی تو مراد سچائی میں کامل ہونا ہوتا ہے۔اور کبھی اس سے مراد تصدیق میں کامل ہے۔صدیق کی فضیلت صرف سچائی کی تلاش میں رہنا نہیں ہے۔بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بتایا ہے' آپ اسے اجمالاً وتفصیلاً جانتے تھے۔اور پھر آپ نے ان تمام امور میں قولاً وفعلاً؛ علماً وعملاً تصدیق کی۔

یہ مقام ومرتبہ نہ ہی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو ملا تھا اور نہ ہی کسی دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ کو۔اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی اخبار وانباء کو جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جانتے تھے' ایسے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نہیں جانتے تھے۔اور نہ ہی آپ کو ایسے تصدیق مفصل کا مقام ملا تھا جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حاصل تھا؛ اور نہ ہی آپ کو کمال تصدیق میں وہ مقام حاصل تھا جیسا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا حال تھا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان سے بڑے عالم' اللہ اور اس کے رسول سے سب سے زیادہ محبت کرنے والے؛ اللہ اور اس کے رسول کی سب سے زیادہ نصرت کرنے والے اور اپنی جان و مال سے سب سے بڑھ کر جہاد کرنے والے تھے۔اس کے علاوہ بھی آپ میں وہ صفات موجود تھیں جو کہ آپ کو کمال صدیقیت کے درجہ تک پہنچا دیتی ہیں۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احد پہاڑ پر چڑھے۔حضرت ابوبکر عمر عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔تو وہ پہاڑ حرکت کرنے لگا؛ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے احد! ٹھہر جا؛ کیونکہ تیرے اوپر سوائے نبی یا صدیق یا شہید کے اور کوئی نہیں ہے۔''❷

سنن ترمذی میں ہے: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے متعلق پوچھا: ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا آتَوا وَقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ﴾ [المؤمنون ٦٠]

''اور جو دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور انکے دل اس سے ڈرتے ہیں۔''

❶ البخاري ٥/ ٩؛ كتاب فضائل أصحاب النبى ﷺ؛ بـاب مناقب ابي بكر؛ ......؛ سنن أبي داؤد ٤/ ٢٩٥؛ كتاب السنة؛ باب في الخـلـفاء؛ سنن الترمذي ٥/ ٢٨٦؛ كتاب المناقب: باب مناقب عمر رضي الله عنه. مسلم:ح ٢١٣٨ ـكتاب فضائل أصحاب النبي ﷺ باب من فضائل طلحة و الزبير۔

❷ البخاري٥/ ٩؛ ومسلم ٤/ ١٨٨٠ ـ سننِ ابنِ ماجه:٢/ ١٤٠٤ كتاب الزهدِ، باب التوقِّي على العملِ ، المسندِ ط. الحلبِی ٦: ١٥٩/.

اور عرض کیا کہ:''کیا یہ وہ لوگ ہیں جو شراب پیتے ہیں اور چوری کرتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے صدیق کی بیٹی! نہیں، بلکہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے نماز پڑھتے صدقہ دیتے ہیں اور اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان سے قبول نہ کیا جائے۔'' [جامع ترمذی:ح 1122]

فصل:......خلیفہ رسول اللہ ﷺ خطاب کا مستحق کون؟

[رافضی کا کہنا ہے کہ اہل سنت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ ء رسول کہتے ہیں؛ جبکہ آپ ﷺ نے اپنی زندگی میں اور بعد از وفات آپ کو اپنا خلیفہ (نائب و قائم مقام) مقرر نہیں کیا تھا]

[اعتراض] : رافضی مضمون نگار لکھتا ہے: اہل سنت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ رسول کہتے ہیں، حالانکہ آپ نے اپنی زندگی میں بعد از وفات آپ کو اپنا خلیفہ (نائب و قائم مقام) مقرر نہیں کیا تھا۔ اس کے برعکس اہل سنت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ رسول نہیں کہتے۔ حالانکہ آپ ﷺ نے ان کو کئی بار اپنی عدم موجودگی میں مدینہ کا حاکم مقرر کیا تھا۔ ایسے ہی غزوہ تبوک کے موقع پر بھی آپ مدینہ میں خلیفہ بنے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر فرمایا تھا:''میرے اور آپ کے سوا کوئی شخص حاکم مدینہ بننے کا اہل نہیں ہے۔ کیا آپ کو یہ بات پسند نہیں کہ آپ کو مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارون کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی؛ سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔'' نبی کریم ﷺ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو سالار لشکر مقرر فرمایا؛ اس لشکر میں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے۔ تاہم اہل سنت حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ کے لقب سے یاد نہیں کرتے۔ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ مسند خلافت پر فائز ہوئے تو اسامہ رضی اللہ عنہ نے بگڑ کر کہا:''رسول اللہ ﷺ نے مجھے آپ پر امیر بنایا تھا۔ بتایئے! آپ کو کس نے میرا حاکم بنایا؟ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما دونوں پا پیادہ اسامہ رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچے اور ان کو راضی کیا۔ اور آپ دونوں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو تاحیات امیر کہتے رہے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]

خلیفہ کی تعریف:

اس کا جواب یہ ہے کہ خلیفہ کا لفظ دو معنوں پر بولا جاتا ہے:

۱۔ جو کسی کا قائم مقام ہو، اس کو خلیفہ کہتے ہیں، بھلے اسے پہلے نے اپنے بعد خلیفہ نہ بھی مقرر کیا ہو۔ جیسا کہ لغت میں معروف ہے۔ یہ جمہور کا قول ہے۔

۲۔ اس کا دوسرا معنی: خلیفہ وہ ہے جس کو کوئی شخص اپنا نائب مقرر کرے۔ یہ روافض اور بعض ظاہریہ کا مسلک و مذہب ہے۔ [1]

[1] محدث ابن حزم اپنی کتاب ''الامامة والمفاضلة'' میں جو ان کی شہرہ آفاق تصنیف کتاب الفصل کی جلد چہارم میں شامل ہے۔ صفحہ:۱۰۷، پر رقم طراز ہیں:''اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کے صادق القول ہونے کی شہادت دی ہے اور ان کے ساتھ ساتھ ان کے انصاری بھائی اس امر میں متفق اللسان ہیں کہ سیدنا ابوبکر خلیفۂ رسول تھے۔ اور کسی شخص کا خلیفہ (قائم مقام) وہ ہوتا ہے جس کو وہ خود اپنا نائب مقرر کرے نہ وہ جو کہ از خود کسی کا قائم مقام بن جائے۔

پہلے معنی کی بناء پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے، کیوں کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ ان کے قائم مقام ہوئے اور آپ دوسروں کی نسبت اس منصب کے لیے موزوں تر تھے۔ لہٰذا آپ خلیفہ قرار پائے اور دوسرا کوئی شخص یہ مقام حاصل نہ کر سکا۔ شیعہ اور دیگر فرقوں میں سے کوئی بھی اس مسلمہ صداقت کا منکر نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ قرار پائے تھے آپ نماز پڑھاتے۔ ❶ شرعی حدود قائم کرتے اور صلح کی بنا پر حاصل کردہ مال مسلمانوں میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں آپ کفار سے جہاد کرتے، عمّال و امراء مقرر کرتے اور دیگر سیاسی امور انجام دیا کرتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بالاتفاق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ جملہ امور انجام دیا کرتے تھے۔ لہٰذا بلا نزاع آپ خلیفہ رسول تھے اور اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ❷

اہل سنت والجماعت کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو خلیفہ مقرر فرمایا تھا؛ اور آپ ہی اس خلافت کے سب سے زیادہ حق دار تھے۔ جب کہ [پرانے] شیعہ کہتے تھے: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت کے زیادہ حق دار تھے۔ لیکن حضرت ابوبکر [جب خلیفہ بن ہی گئے تو آپ] کی خلافت درست ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے جائز نہیں تھا کہ وہ خلیفہ بنتے؛ مگر جب آپ بالفعل خلیفہ بن گئے تو اب اس میں تنازع کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور اب آپ اس نام کے مستحق ہیں۔ اس لیے کہ خلیفہ اسی کو کہتے ہیں جو دوسرے کا قائم مقام بنے۔

دوسرے معنی کی بیناد پر: خلیفہ وہ ہے جسے دوسرا اپنا قائم مقام مقرر کرے۔ جیسا کہ بعض اہل سنت اور بعض شیعہ اس دوسرے معنی کو اختیار کرتے ہیں۔ اہل سنت والجماعت میں سے جن لوگوں نے یہ معنی اختیار کیا ہے' وہ اس معنی کی بناء پر کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نص جلی یا خفی کے مطابق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر فرمایا تھا۔ جیسا کہ شیعہ جو کہ نص سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ ہونے کا دعوی کرتے ہیں' ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ آپ نص جلی کی روشنی میں خلیفہ

---

❶ سیدنا علی رضی اللہ عنہ دیگر لوگوں کی طرح سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نماز پڑھا کرتے تھے۔

❷ خلافت صدیقی میں جو مال بنا بر مصالحت بلا قتال و جدال بیت المال میں آیا تھا اس میں سے بنی حنیفہ کے قبیلہ کی ایک لونڈی بھی تھی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے شرعی حکم کے مطابق حق ملکیت حاصل کر کے اسے اپنی لونڈی بنا لیا اور اس کے بطن سے ایک عالم باعمل اور صالح بیٹا محمد بن علی بن ابی طالب تولّد ہوا جو بعد میں محمد بن حنفیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی رائے میں سیدنا ابوبکر کی خلافت غیر شرعی ہوتی تو وہ لونڈی کو اپنے لیے حلال نہ سمجھتے۔ حرام وحلال عورتوں کے مابین فرق و امتیاز ایک طے شدہ بات ہے، جس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ ایک مشہور ترین شیعہ عالم سید عبداللہ بن حسن سُو یدی نے ماہ شوال ۱۱۵۶ھ میں جب اکابر علماء شیعہ کی موجودگی میں اس سے احتجاج کیا تھا تو سب خاموش ہو گئے اور کوئی بھی جواب نہ دے سکا۔ (دیکھیے۔ رسالہ مؤتمر النجف، ص:۳۱۔۳۲) اگر شیعہ حق کے طالب ہوتے اور فتنہ پردازی ان کا مقصد نہ ہوتا تو مذکورہ دلیل اور دیگر سینکڑوں دلائل و براہین ان کے لیے وجہ اطمینان ہوتے۔ مگر شیعہ کا مقصد وحید مسلم معاشرہ میں شور وشر پیدا کرنا، افکار باطلہ کی تشہیر دین حنیف کی تحریف وتغییر اور شریعت کے مآخذ ومصادر کی تبدیلی کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ کا وجود انسانیت کے لیے ایک عظیم آفت سے کم نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ باطل کے پرستار ہیں اور باطل فنا پذیر ہوتا ہے بلکہ جو چیز بھی کذب و افترا پر مبنی ہو وہ بے کار اور عبث ہے۔

اورامام تھے جیسا کہ امامیہ کا عقیدہ ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ: نہیں، بلکہ آپ کی خلافت نص خفی سے ثابت ہے؛ جیسا کہ زیدیہ میں سے جارودیہ کا عقیدہ ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں نص جلی یا خفی کا یہ دعویٰ شیعہ کے اس دعویٰ سے اقوی واظہر ہے جو وہ خلافت علی رضی اللہ عنہ سے متعلق نصوص کے بارے میں کرتے ہیں، اسی لیے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں کثیر التعداد نصوص وارد ہوئی ہیں۔ بخلاف ازیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں واردشدہ نصوص یا تو جھوٹی ہیں یا ان سے یہ دعویٰ ثابت نہیں ہوتا۔ بنابریں یہ مسلمہ صداقت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی موت کے بعد صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کو خلیفہ مقرر فرمایا تھا۔ لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صرف آپ ہی خلیفہ برحق تھے۔ خلیفہ مطلق وہ ہے جو آپ کی وفات کے بعد خلیفہ بنے یا آپ اپنی موت کے بعد اس کو خلیفہ مقرر کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں وصف سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی اور میں موجود نہ تھے؛ اس بنا پر آپ خلیفہ برحق تھے۔

جہاں تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حاکم مدینہ مقرر کرنے کا تعلق ہے تو آپ بات میں منفرد نہ تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی کسی غزوہ میں نکلتے تو مدینہ منورہ میں اپنے صحابہ میں سے کسی ایک کو اس منصب پر فائز کرتے۔ یہ واقعات ملاحظہ ہوں:

۱۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنی نضیر سے لڑنے کے لیے مدینہ سے باہر نکلے تو عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو حاکم مدینہ مقرر کیا۔

۲۔ غزوۂ ذات الرقاع اور غزوہ غطفان کے لیے جاتے وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حاکمِ مدینہ قرار پائے۔[1]

۳۔ غزوۂ بدر؛ غزوہ بنی قینقاع اور غزوہ سویق کیلئے تشریف لے گئے تو ابولبابہ بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ کو حاکم مدینہ مقرر کیا۔[2]

۴۔ غزوہ بدر الموعد میں آپ نے ابن رواحہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ پر عامل مقرر فرمایا۔

۵۔ غزوہ المریسیع میں زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو عامل مقرر فرمایا تھا۔

۶۔ غزوہ ابواء میں سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو عامل مقرر فرمایا۔

۷۔ غزوہ بواط میں سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو عامل مقرر فرمایا۔

۸۔ غزوہ عشیرہ میں ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کو عامل مقرر فرمایا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جن لوگوں پر عامل بنایا وہ ان لوگوں سے اکثر وافضل نہ تھے جن پر آپ کے علاوہ دوسرے لوگوں کو عامل یا خلیفہ مقرر فرمایا تھا۔ بلکہ تقریباً ہر غزوہ کے موقع پر مدینہ نبویہ میں کچھ نہ کچھ مہاجرین وانصار رضی اللہ عنہم اجمعین موجود ہوا کرتے تھے۔ وہ ان لوگوں سے بہت افضل تھے جو کہ غزوہ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے۔ غزوہ تبوک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو بھی پیچھے رہنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اور نہ ہی اس غزوہ میں کوئی پیچھے رہا تھا سوائے منافق یا معذور کے اور تین افراد وہ تھے جن کی توبہ اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی ہے۔ پیچھے رہ جانے والوں کی بڑی تعداد خواتین اور بچوں پر مشتمل تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں نائب بنا کر چھوڑا تو آپ روتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے

---

[1] سيرة ابن هشام(ص:٤٥٤)، جوامع السيرة لابن حزم(ص:١٨٢، ١٨٣)۔

[2] سيرة ابن هشام(ص:٢٩٢)، جوامع السيرة لابن حزم(ص:١٠٧، ١٠٨)۔

چل پڑے ؛ اور آپ کی خدمت میں یوں عرض گزار ہوئے : کیا آپ مجھے بچوں اور عورتوں کے ساتھ چھوڑے جا رہے ہیں؟ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بعض منافقین نے آپ پر طعنہ زنی کی تھی ؛ اور یہ کہا تھا کہ : آپ کو اس لیے پیچھے چھوڑ گئے ہیں کہ آپ ﷺ ان سے بغض رکھتے تھے۔ جب نبی کریم ﷺ نے کئی بار دوسرے لوگوں کو بھی مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا تھا؛ اور وہ لوگ بھی تعداد میں زیادہ ہوا کرتے تھے۔ اور ان لوگوں سے افضل ہوا کرتے تھے جن پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نائب بنایا گیا تھا۔ تو ثابت ہوا کہ یہ نبی کریم ﷺ کی عدم موجودگی میں ایک مخصوص گروہ پر کسی کو نائب مقرر کرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد آپکی امت پر استخلاف مطلق نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان اصحاب میں سے کسی کو بھی خلیفۂ رسول نہیں کہا گیا۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ خطاب دیا جائے تو دوسرے جو صحابہ وقتاً فوقتاً مدینہ میں نائب بنتے رہے ہیں پھر وہ بھی اس خطاب کے مستحق ہیں۔ تو پھر یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی خصوصیت نہ ہوئی۔

نیز یہ بات بھی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جو انسان کسی رسول کے مرنے کے بعد خلیفہ بنتا ہے وہ لوگوں میں سے افضل ترین انسان ہوتا ہے۔ جب کہ دوسرا وہ انسان ہے جو دشمن سے جہاد کی مہم کے دوران خلیفہ بنتا ہے؛ اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ تمام لوگوں سے افضل ہو۔ بلکہ عادتاً دیکھا گیا ہے کہ دوران جہاد جو انسان افضل ہوتا ہے ؛ اسے جہادی ضرورت کے پیش نظر ساتھ لے جایا جاتا ہے۔ بخلاف اس انسان کے جسے عورتوں اور بچوں پر نائب مقرر کیا جائے۔ اس لیے کہ جہاد میں کام آنے والا انسان اس مہم میں ساتھ شریک ہوتا ہے۔ اس کا مقام بچوں پر نائب بن کر پیچھے رہنے والے کی نسبت زیادہ بڑا ہوتا ہے۔

اس لیے کہ نائب بن کر پیچھے رہنے والے کا فائدہ اس انسان کی طرح نہیں ہے جو جہاد میں ساتھ شریک ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت ہارون علیہ السلام سے تشبیہ صرف اصل استخلاف میں دی تھی۔ (1) کمال

(1) صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ تبوک(حدیث:٤٤١٦)، صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابة۔ باب من فضائل علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (حدیث: ٢٤٠٤) سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی موت کے بعد سیدنا یوشع آپ کے قائم مقام قرار پائے تھے نہ کہ سیدنا ہارون علیہ السلام، مزید براں یہ امر قابل غور ہے کہ ہارون نبی تھے اور علی رضی اللہ عنہ نبی نہ تھے۔ ہارون سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے بھائی تھے اور علی رضی اللہ عنہ ان کے بھائی نہ تھے۔ مذکورہ فرق و امتیاز کے علاوہ اب یہ بات باقی رہی کہ غزوۂ تبوک پر جاتے وقت آپ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا تھا جس طرح سیدنا موسیٰ نے کوہِ طور کو جاتے وقت سیدنا ہارون علیہ السلام کو اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ اصل وجہ مشابہت و مماثلت صرف یہی امر ہے، خاص مدینہ پر استخلاف کا شرف دوسرے لوگوں کو بھی حاصل ہوا مگر کسی نے بھی ان کو نبی کریم کا خلیفہ عام تصور نہ کیا۔ لطف یہ ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی اس غلطی میں کبھی مبتلا نہ ہوئے۔ علاوہ ازیں حدیث نبوی ''اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْن'' محدثین کے نزدیک متنازع فیہ ہے، بعض اسے صحیح کہتے ہیں اور بعض ضعیف (۱) امام ابو الفرج ابن الجوزی رحمہ اللہ اس کو موضوع قرار دیتے ہیں۔ نیز یہ کہ نبی کریم ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو حاکم مدینہ مقرر کیا تو انھوں نے اس پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا ''کیا آپ مجھے عورتوں، بچوں اور بوڑھوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔'' یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو مطمئن کرنے کے لیے فرمایا: ''اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْن'' اگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا یہ استخلاف ان کے لیے موجب مدح و منقبت ہوتا تو جیسے کہ شیعہ کا خیال ہے تو اس بات پر اظہار ناراضگی کرنے کی بجائے ان کو خوش ہونا چاہیئے تھا، حالانکہ یہ بات سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی، اہل سنت و شیعہ کے مابین جملہ اختلافی مسائل میں شیعہ کا طرز فکر ہمیشہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور پسران علی رضی اللہ عنہ سے مختلف ہوتا ہے، اگر کوئی شخص سعی کامل کو کام میں لا کر ایسے مسائل تلاش کرنا چاہے، جن میں شیعہ نے علماء اہل بیت کی مخالفت کی ہے تو ان سے ایک بڑی کتاب مرتب کی جا سکتی ہے۔

استخلاف میں نہیں۔ اس استخلاف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شریک کار دوسرے لوگ بھی ہیں۔ اسکی وضاحت یہ ہے کہ اللہ کے نبی موسی علیہ السلام جب اپنے رب سے ملاقات کرنے کے لیے تشریف لے گئے تو ان کے ساتھ اس امر میں کوئی دوسرا شریک نہیں تھا۔ ورنہ حضرت ہارون علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں بنی اسرائیل کے حاکم بنائے گئے تھے۔ اس کے برخلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ جب مدینہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام قرار پائے تو اکثر لوگ وہاں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رفاقت میں جا چکے تھے سوائے معذوروں [اور منافقین] کے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت محض عورتوں، بچوں اور ضعیف لوگوں کے لیے باقی رہ گئی تھی۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے مدینہ میں نائب بنایا جانا ہر لحاظ سے ایسے نہیں تھا جیسے حضرت ہارون علیہ السلام کو بنی اسرائیل میں نائب بنایا جانا۔ بلکہ آپ کو اپنی عدم موجودگی میں ایسے امین بنایا تھا جیسے ہارون علیہ السلام کو حضرت موسی علیہ السلام نے اپنی عدم موجودگی میں امین بنایا تھا۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے لیے واضح کیا کہ نائب بنائے جانے سے مقام و مرتبہ میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ بلکہ اس سے انسان کی امانت داری ظاہر ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضرت موسی علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنی قوم پر اپنا نائب بنایا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے روتے ہوئے چل پڑے تھے۔ اور عرض گزاری کی تھی کہ: کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں کے ساتھ چھوڑے جا رہے ہیں؟ یعنی آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہنا ناپسند کرتے تھے۔

[امارت مدینہ اور من گھڑت روایت پر رد:]

شیعہ مصنف کا قول "اِنَّ الْمَدِیْنَةَ لَا تَصْلُحُ اِلَّا بِیْ اَوْ بِكَ"، صریح کذب اور موضوع روایت ہے۔ ❶

احادیث مبارکہ کے کسی بھی معتمد مجموعہ میں اس کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ جس چیز سے اس روایت کا جھوٹا ہونا ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ کئی بار مدینہ سے باہر کا سفر کر چکے تھے۔ اس وقت مدینہ میں نہ ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ تو پھر آپ کیسے یہ فرما سکتے ہیں کہ: "میرے اور آپ کے سوا کوئی شخص حاکم مدینہ بننے کا اہل نہیں ہے۔ بدر کے دن حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ بدر اور مدینہ کے مابین کئی مراحل کا فاصلہ ہے۔ ان دونوں ہستیوں میں سے کوئی ایک بھی مدینہ میں موجود نہیں تھا۔ بدر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موجودگی تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔ ❷

---

❶ قال ابن جوزی في كتابه الموضوعات ١/ ٣٥٧؛ عن هذا الحديث الموضوع: قال ابو حاتم: ليس هذا الخبر من حديث ابن مسيب و لا من حديث الزهري؛ ولا من حديث مالك؛ فهو باطل؛ ما قاله رسول الله ﷺ؛ وحفص بن عمر كان كذاباً۔ وقال العقيلي: حفص يحدث عن الأئمه البواطيل ۔اللآلی المصنوعه ١/ ٣٤٢؛ و الفوائد المجموعة للشوكاني ص ٣٥٦.

❷ اس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین مکہ کے مبارزت طلب کرنے پر مہاجر مجاہدین کی جو پہلی کھیپ مشرکین سے مقابلہ کے لیے روانہ فرمائی؛ اس میں حضرت ابوعبیدہ؛ حضرت حمزہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے حریف ولید بن عتبہ کو قتل کیا تھا۔ اور پھر فتح بدر کے بعد راستہ میں واپس جاتے ہوئے آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے نضر بن حارث کو الصفر آء کے مقام پر قتل کیا۔ اس غزوہ میں مدینہ طیبہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب حضرت ابولبابہ ابن المنذر رضی اللہ عنہ تھے۔ لیکن رافضی کو عقل کہاں کہ تاریخ کی روشنی میں بات کرے۔ [دراوی]

ایسے ہی فتح مکہ کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موجودگی باتفاق علماء ثابت ہے۔آپ کی بہن ام ہانی رضی اللہ عنہا نے اپنے دونوں دامادوں کو پناہ دے رکھی تھی۔حضرت علی رضی اللہ عنہ انہیں قتل کرنا چاہتے تھے۔تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت کی: یارسول اللہ! میرا بھائی ان آدمیوں کو قتل کرنا چاہتا ہے جنہیں میں نے پناہ دے رکھی ہے۔تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''اے ام ہانی! جس کو تو نے پناہ دی؛ ہم بھی اس کو پناہ دیتے ہیں۔'' ❶

اس موقع پر مدینہ میں نہ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ ایسے ہی خیبر کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو طلب کیا۔آپ کی آنکھیں دکھ رہی تھیں۔آپ نے [ان کی آنکھوں میں لعاب ڈالا] اور پھر انہیں جھنڈا عطا کیا۔اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ پر فتح عطا کی۔اس وقت بھی مدینہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کوئی ایک بھی نہیں تھا۔ایسے ہی حنین اور طائف کے غزوات میں شریک رہ چکے تھے۔حجۃ الوداع کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن سے واپس تشریف لائے تھے؛ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ میں اکھٹے ہوئے اور حج کیا۔اوران دنوں آپ دونوں میں سے کوئی ایک بھی مدینہ میں نہیں تھا۔[آپ کی عدم موجودگی میں دیگر صحابہ مدینہ میں آپ کے قائم مقام تھے]۔

رافضی اپنی جہالت کی وجہ سے ایسا جھوٹ بولتے ہیں جو کہ سیرت کی ادنی معرفت رکھنے والے انسان پر بھی مخفی نہیں رہتا۔

[حضرت اسامہ بن جیش کی امارت:]

[اعتراض] : شیعہ کہتا ہے:''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر مقرر فرمایا؛ اس لشکر میں حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما دونوں موجود تھے۔''

[جواب] : یہ ایسا جھوٹ ہے جو حدیث کے کسی ادنی طالب علم پر بھی مخفی نہیں۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیش اسامہ میں شامل ہی نہ تھے۔ بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آغاز مرض ہی سے ان کو امامتِ نماز کا منصب تفویض فرمایا تھا؛ اور وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ منصب آپ کے ہی پاس رہا۔ ❶

❶ مقریزی نے إمتاع الاسماع ۱/ ۵۳۶ پر لکھا ہے:''یہ بات یقینی طور پر ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بروز پیر چھبیس صفر سن گیارہ ہجری کو غزوہ روم کے لیے تیاری کا حکم دیا۔پھر اگلے دن منگل کو حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو بلایا تاکہ انہیں لشکر کی سربراہی تفویض کی جائے۔تو آپ لشکر لیکر نکلے اور جرف کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔لوگ بھی نکلے؛ مہاجرین اولین اور انصار میں سے کوئی اس غزوہ سے پیچھے نہیں رہا؛ حضرت عمر بن خطاب؛ حضرت ابوعبیدہ؛ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم اجمعین جیسے لوگ شریک ہوئے۔بعض مہاجرین نے ان کی امارت پر اعتراض کیا؛ کہ اس چھوٹے سے نوخیز لڑکے کو مہاجرین اولین پر امیر بنایا جارہا ہے۔پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر غصہ ہوئے۔اور اس سلسلہ میں لوگوں میں خطبہ دیا۔پھر آپ اپنے گھر میں داخل ہوگئے۔یہ بروز ہفتہ دس ربیع الاول کی بات ہے۔جو مسلمان لشکر کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوئے تھے؛ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے الوداعی ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ان میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''جیش اسامہ کو روانہ کیا جائے۔پس لوگ لشکر گاہ کی طرف چل پڑے اتوار کی رات وہاں پر گزاری۔ اتوار کے دن حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لیے تشریف لائے۔اور پھر اپنے معسکر کی طرف لوٹ گئے۔پیر کے دن دوپہر کو آپ وہاں پر تھے۔آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ افاقہ تھا۔حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے؛ تو آپ نے فرمایا:'' صبح اللہ کا نام لیکر چل پڑو۔''حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے الوداع ہوئے تو آپ کو افاقہ تھا۔''مقریزی نے کہا⇦⇦⇦

یہ بھی روایات میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بیماری شروع ہونے سے پہلے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو علم عطا کیا تھا۔ پھر جب آپ بیمار ہوگئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ نماز پڑھائیں۔تو آپ نبی کریم ﷺ کے انتقال تک امامت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ بالفرض اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیماری سے پہلے آپ کو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ جہاد کے لیے جانے کا حکم دیا تھا۔تو پھر نبی کریم ﷺ کا آپ کو نماز پڑھانے کے لیے حکم دینا؛ حالانکہ آپ نے بیماری میں بھی حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو روانگی کی اجازت دے رکھی تھی؛ تو یہ بعد والا حکم پہلے حکم کے لیے ناسخ ہوگا؛ اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی امارت منسوخ ہوگئی۔تو یہ کہنا کیسے روا ہوسکتا ہے خصوصاً جب کہ آپ پر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر ہی نہیں کیا گیا تھا؟

مزید برآں کہ نبی کریم ﷺ کی عادت مبارکہ یہ نہیں تھی کہ کسی سریہ کے لیے یا پھر کسی غزوہ کے لیے نام لیکر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے کسی ایک کو متعین کریں۔لیکن آپ مطلق طور پر ترغیب دیا کرتے تھے۔تو صحابہ کرام کو کبھی علم ہوتا تھا کہ آپ نے نام لیکر کسی کو اپنے ساتھ جانے کے لیے متعین نہیں کیا' لیکن خروج برائے جہاد کی ترغیب دی ہے؛ جیسا کہ غزوہ غابہ کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے ترغیب دی تھی ❶ اور کبھی کبھار بعض لوگوں کو ان کے خاص احوال کی وجہ سے متعین کرتے تھے۔جیسا کہ غزوہ بدر کے موقع پر آپ نے اعلان کیا تھا کہ وہ لوگ نکلیں جن کے پاس سواری ہو۔اسی وجہ سے بہت سارے مسلمان آپ کے ساتھ نہ جا سکے۔اور غزوہ سویق کے موقع پر آپ نے اعلان فرمایا تھا کہ:''صرف وہی لوگ جہاد کے لیے نکلیں جو کہ احد میں شریک ہوئے تھے۔''

بسا اوقات عام کوچ کا حکم ہوتا تھا؛ جس میں کسی کو پیچھے رہنے کی اجازت نہ ہوتی تھی جیسا کہ تبوک کے موقع پر ہوا۔

⇦⇦⇦ ہے:'' پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور عرض گزار ہوئے: یارسول اللہ ﷺ! الحمد للہ کہ آپ کو افاقہ ہے۔'' آج بنت خارجہ کی باری ہے؛ مجھے اجازت دیجیے؛ تو آپ نے اجازت دیدی۔تو آپ سنح کے مقام پر تشریف لے گئے۔اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ معسکر میں واپس چلے گئے۔اور اپنے ساتھیوں کو آواز دیکر لشکر میں پہنچنے کا حکم دیا۔ابھی آپ جرف سے نکلنا ہی چاہتے تھے کہ ان کی والدہ حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کا قاصد آ گیا کہ رسول اللہ ﷺ الوداع ہونے والے ہیں۔تو آپ واپس مدینہ تشریف لائے۔آپ کے ساتھ حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہما بھی تھے۔جب وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچے تو آپ کی آخری گھڑیاں تھیں۔'' مزید دیکھو: سیرت ابن ہشام ٤/ ٢٩١۔

❶ ابن ہشام نے "السیرۃ ٣/ ٢٩٣ " پر کہا ہے:'' بیشک رسول اللہ ﷺ کو مدینہ طیبہ پہنچے ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ عیینہ بن حصین الفرازی نے بنو غطفان کے گھڑ سواروں کے ساتھ مدینہ کے قریب رسول اللہ ﷺ کے اونٹوں پر دھاوا بول دیا۔ یہاں پر بنو غفار کا ایک آدمی اور اس کی بیوی تھے؛ انہوں نے مرد کو قتل کردیا؛ اور اس کی بیوی اور اونٹوں کو ہانک کر لے گئے۔انہیں سب سے پہلے حضرت سلمہ بن عمرو ابن الاکوع رضی اللہ عنہ نے دیکھا؛ وہ دوڑ کر ان تک پہنچ گئے؛ آپ ان پر تیر برساتے اور ساتھ چیخ کر آوازیں لگاتے۔آپ کی چیخ کی آواز مدینہ طیبہ میں نبی کریم ﷺ تک پہنچ گئی تو آپ نے منادی کرادی؛ گھڑ سوار رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے۔لوگ جمع ہوگئے؛ رسول اللہ ﷺ نے ان پر حضرت سعد بن زید کو امیر مقرر کیا؛ اور خود ان لوگوں تک پہنچ گئے۔یہ ایک تفصیلی واقع ہے۔اسے غزوہ ذی قرد بھی کہا جاتا ہے۔'' دیکھو: زاد المعاد ٣/ ٣٧٨۔

آپ ﷺ کے بعد آپ کے خلفاء کا بھی یہی طریق کار رہا۔ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے شام اور دوسرے علاقوں کی طرف لشکر روانہ کیے تو آپ نے لوگوں کو عمومی ترغیب دی۔ جب اتنے لوگ تیار ہوکر نکل پڑتے جن سے مقصود حاصل ہو تو لشکر کو روانہ کر دیتے۔

پس جب نبی کریم ﷺ نے سریہ مؤتہ روانہ فرمایا؛ تو فرمایا: ''تمہارا امیر زید ہوگا؛ اگر وہ قتل ہوگیا تو جعفر ہوگا؛ اور اگر وہ بھی قتل ہوگیا تو عبداللہ بن رواحہ ہوگا؛'' آپ نے تمام مجاہدین رضی اللہ عنہم اجمعین کو متعین نہیں فرمایا۔ اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے نام رسول اللہ ﷺ کے پاس کسی رجسٹر میں لکھے ہوئے تھے۔ اور نہ ہی نقباء گھوم کر لوگوں کو ان کے نام لیکر متعین کر کے جہاد کے لیے نکالتے تھے۔ بلکہ جب اتنے لوگ جمع ہو جاتے جن سے مقصود حاصل ہو جاتا ہو؛ تو پھر ان پر ایک امیر مقرر کر دیتے؛ اور پھر انہیں روانہ کر دیتے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے جب حج کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر فرمایا؛ تو یہ متعین نہیں کیا کہ کون کون لوگ ان کے ساتھ حج کرے گا۔ لیکن جن لوگوں نے آپ کے ساتھ حج کیا؛ آپ ان پر امیر تھے۔ پھر ان کے پیچھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا؛ اور آپ کو یہ بتایا کہ آپ مامور بن کر جا رہے ہیں۔ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ ان پر امیر ہوں گے۔ اور جب حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو ان کے والد کے قتل ہو جانے کے بعد امیر مقرر فرمایا؛ تو انہیں اسی طرف روانہ فرمایا جہاں دشمن نے آپ کے والد کو قتل کیا تھا۔ اس لیے کہ آپ اسی کو مناسب مصلحت دیکھتے تھے۔ اور لوگوں کو آپ کے ساتھ جانے کی ترغیب دی۔ تو وہ لوگ چل پڑے جنہیں جہاد میں رغبت تھی۔ اور روایت کیا گیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ان کے ساتھ نکلے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے ان کے ساتھ جانے کے لیے نہ ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو متعین کیا تھا؛ اور نہ ہی کسی دوسرے کو۔ لیکن جو لوگ آپ کے ساتھ نکلے تھے؛ ان کے امیر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ ہی تھے۔ جیسا کہ آپ نے جب حضرت عتاب بن اسید کو مکہ پر امیر مقرر فرمایا؛ تو آپ ان تمام لوگوں پر امیر تھے جو مکہ میں تھے۔ ایسے ہی جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے کو سرایا کا امیر مقرر کرتے؛ تو وہ ان تمام لوگوں کے امیر ہوتے جو ان کے ساتھ شریک ہوتے۔ سریہ پر جانے کے لیے امیر آپ اپنی مرضی سے مقرر فرمایا کرتے تھے۔ ایسا نہیں ہوتا تھا کہ آپ اس امیر کے ساتھ جانے کے لیے لوگوں کو متعین کرتے۔ یہ نہ تو رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی اور نہ ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے جب کوئی آپ ﷺ کی زندگی میں اپنی قوم کا امامت ہوتا تو اپنی قوم کے لوگوں کو نماز وہی پڑھایا کرتا تھا۔ تو جو کوئی اس کے پیچھے نماز پڑھتا؛ یہ امام اس کا بھی امام ہوتا۔ بھلے کوئی مقتدی امام سے افضل ہی کیوں نہ ہو۔ صحیح مسلم اور دیگر کتب میں ہے؛ حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''لوگوں کی امامت وہ شخص کرے جو کتاب اللہ کو سب سے زیادہ پڑھنے والا ہو، اگر لوگ قرأت میں برابر ہوں تو ان میں جس نے پہلے ہجرت کی ہو وہ امامت کرے۔ اگر ہجرت میں بھی برابر ہوں تو ان میں بڑی عمر والا امامت کرے، آدمی کی امامت اس کے گھر میں نہ کی جائے۔ اور نہ اس کی حکومت میں، اور نہ ہی اس کی

مسند پر اس کی اجازت کے بغیر بیٹھا جائے۔''[1]

تو رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ کسی ذی سلطان امام پر آگے بڑھیں۔ اگرچہ مقتدی اس سے افضل ہی کیوں نہ ہو۔ اسی لیے علمائے کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں: ''بیشک فرائض کے امام پر اس سے افضل آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور یہ سنت چلتی آ رہی ہے کہ سب سے پہلے امیر لوگوں کو نماز پڑھائے گا۔ لیکن فقہاء کے مابین اختلاف ہے کہ جب صاحب خانہ اور متولی جمع ہو جائیں تو پھر امامت کون کروائے گا۔ اس میں دو قول ہیں۔ جیسا کہ نماز جنازہ کے بارے میں اختلاف ہے کہ اس میں والی مقدم ہوگا یا متولی۔ ان میں سے اکثر والی کو مقدم کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کا انتقال ہوا تو حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما نے امیر مدینہ سے آگے بڑھ کر نماز جنازہ پڑھائی۔ اور فرمایا: ''اگر ایسا کرنا سنت نہ ہوتا؛ تو میں آپ سے آگے کبھی نہ بڑھتا۔'' حضرت حسین رضی اللہ عنہ اس امیر سے افضل تھے جس نے آپ کو حکم دیا کہ اپنے بھائی پر نماز جنازہ پڑھیں۔ لیکن جب وہ امیر تھا؛ تو نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث بھی تھی کہ کوئی انسان دوسرے کی سلطنت میں امامت نہ کرائے۔'' تو پھر آپ کو اسی وجہ سے مقدم کیا گیا۔

مغازی میں شریک لوگوں پر امیر کو ہی مقدم کیا جاتا تھا۔ جیسے نماز اور حج میں اسے تقدیم حاصل ہوتی تھی۔ اس لیے کہ وہ اپنے اختیار سے آپ کے پیچھے نماز پڑھتے ؛ اور آپ کے ساتھ حج کرتے۔ حالانکہ ان پر اس امام کے پیچھے نماز پڑھنا اور اس کے ساتھ حج کرنا متعین ہو جاتا تھا۔ اس لیے کہ حج کا ایک ہی امیر ہوتا تھا۔ اور نماز کے لیے ایک ہی امام ہوا کرتا تھا۔ ایسے ہی جو کوئی غزوہ پر جانا چاہتا؛ اور غزوہ کا صرف ایک ہی امیر ہوتا تو وہ اس کے ساتھ نکل جاتا۔ لیکن غزوہ میں رسول اللہ ﷺ تمام لوگوں کو جہاد پر جانے کا حکم نہیں دیا کرتے تھے۔ آپ کسی کو بھی نام لیکر یا شخصی طور پر متعین نہیں کرتے تھے۔ بلکہ آپ ترغیب دیتے؛ پس جو کوئی چاہتا وہ جہاد پر نکل پڑتا؛ یہی وجہ ہے کہ جہاد پر نکلنے والوں کو پیچھے رہ جانے والوں پر فضیلت حاصل ہوتی تھی۔ اگر متعین اشخاص کا جہاد میں نکلنا ہوتا تو سارے لوگ آپ کے حکم کی اطاعت میں نکل پڑتے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًاo دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَ مَغْفِرَةً وَّ رَحْمَةً وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًاo﴾ (النساء۹۵-۹۶]

''ایمان والوں میں سے بیٹھ رہنے والے، جو کسی تکلیف والے نہیں اور اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور

[1] صحیح مسلم ۱/ ٤٦٥؛ کتاب المساجد و مواضع الصلاة باب من أحق بالإمامة۔ سنن ابی داود -کتاب: نماز کے احکام و مسائل -باب : امامت کا زیادہ حقدار کون ھے ؟ ح:٥٨٢ ؛ قال الالبانی: صحیح۔سنن الترمذي ١/ ١٤٩ ؛ کتاب الصلاة باب من أحق بالإمامة ؛ سنن النسائی ٢/ ٥٩ .

جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والے برابر نہیں ہیں، اللہ نے اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر درجے میں فضیلت دی ہے اور ہر ایک سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے اور اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر بہت بڑے اجر کی فضیلت عطا فرمائی ہے۔ اپنی طرف سے بہت سے درجوں کی اور بخشش اور رحمت کی۔ اور اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔''

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ ایک سریہ کے امیر تھے۔ سرایا کے امیراء کو خلفاء نہیں کہا جاتا تھا۔ ❶ اس لیے کہ وہ نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کے نائب قرار پائے اور نہ آپ کی زندگی ہی میں ہر چیز میں آپ کے قائم مقام تھے۔ بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ان لوگوں نے ایک جہادی مہم پر کوچ کیا؛ جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی لوگوں میں سے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو ان پر امیر مقرر کر دیا۔ یہ ایک نئی مہم تھی جس پر آپ متولی تھے؛ اپنے سے پہلے کسی کے خلیفہ یا نائب نہیں تھے۔ اس لیے کہ بستیوں اور شہروں کے امراء [گورنروں] کو بھی خلیفہ کہا جاتا ہے۔ یہ لفظی امور ہیں جن کا اطلاق لغت اور استعمال کے حساب سے ہوتا ہے۔

[اشکال]: شیعہ کا کہنا: ''آپ کا انتقال ہوا اور آپ کو معزول نہیں کیا تھا۔''

[جواب]: [جی ہاں؛ پھر] حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جیش اسامہ رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا۔ حالانکہ بعض لوگوں نے دشمن کے خوف سے اس لشکر کو واپس بلانے کا مشورہ بھی دیا تھا۔ آپ نے فرمایا:

''اللہ کی قسم! میں اس جھنڈے کو کبھی بھی نہیں کھولوں گا جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باندھا تھا؛ اور پھر امکان کے باوجود اسے نہیں کھولا۔''

آپ بھی اس جھنڈے کو کھول سکتے تھے؛ اس لیے کہ اب آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام تھے۔ لیکن آپ نے وہی کیا جو مسلمانوں کے لیے زیادہ مصلحت خیز تھا۔

[شیعہ کا ایک اور جھوٹ]:

جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ خلیفہ مقرر ہوئے تو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے ناراض ہونے کا واقعہ بھی صریح کذب ہے۔ یہ ایک مسجع و من گھڑت پلندہ ہے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے محبت اور آپ کی اطاعت اتنی مشہور ہے کہ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ اسامہ تفرق و اختلاف کے خوگر نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ و معاویہ کی لڑائی میں وہ غیر جانب دار رہے۔ ❷ علاوہ ازیں آپ قریشی نہ تھے اور کسی اور وجہ سے بھی خلافت کے لیے موزوں نہ

---

❶ ورنہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے۔ اس لیے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے سریہ ذات السلاسل میں امیر لشکر مقرر ہوئے تھے۔ (بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ ذات السلاسل، (ح:٤٣٥٨)، مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (ح:٢٣٨٤) اور بڑے بڑے صحابہ مثلاً ابو بکر و عمر و ابو عبیدہ رضی اللہ عنہما آپ کے تابع فرما تھے۔

❷ صحابہ میں سے سیدنا عبد اللہ بن عمر، محمد بن مسلمہ، ابو موسیٰ اشعری، اور ابو بکرہ رضی اللہ عنہم اجمعین بھی غیر جانب دار رہے تھے۔

تھے۔اور نہ ہی کبھی آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ آپ کو خلیفہ بنایا جائے۔تو پھر آپ کے اس سوال میں کون سا فائدہ باقی رہ گیا تھا کہ آپ پوچھتے کہ آپ کو کس نے خلیفہ بنایا؟ حالانکہ آپ جانتے تھے کہ جو بھی اس معاملہ کا مالک بنے گا وہ آپ پر خلیفہ ہوگا۔

بفرض محال اگر نبی کریم ﷺ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر حاکم بنایا تھا، پھر آپ نے وفات پائی اور ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنائے گئے۔تو اب لشکر کو بھیجنا نہ بھیجنا اور امراء کا معزول و متعین کرنا خلیفہ کے ہاتھ میں تھا۔[1] اگر وہ کہتے کہ: مجھے آپ پر امیر بنایا گیا ہے' تو آپ کو مجھ پر خلیفہ کس نے بنا دیا؟ تو اس کے جواب میں آپ کہہ سکتے تھے کہ: اسی نے مجھے آپ پر خلیفہ بنایا ہے جس نے تمام مسلمانوں پر اور آپ سے افضل لوگوں پر خلیفہ بنایا ہے۔

اگر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کہتے کہ: مجھے آپ پر امیر بنایا گیا ہے؛ تو جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی کہہ سکتے تھے کہ: مجھ پر تیری امارت خلیفہ بنائے جانے سے پہلے تھی۔اب جب کہ میں خلیفہ بن گیا ہوں' تو میں ہی تجھ پر امیر بھی ہوں۔یہ ایسے ہی ہے اگر فرض کرلیا جائے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر کسی کو امیر مقرر کیا تھا؛ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ انتقال کر گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بن گئے؛ تو آپ اس پر بھی امیر بن گئے جو کچھ دیر پہلے آپ پر امیر تھا۔اور اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر کسی کو امیر مقرر کردیتے؛ پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو جاتا اور ان دونوں میں سے کوئی ایک امیر بن جاتا تو وہ انسان پر بھی امیر ہوتا جو کہ ان پر امیر بنایا گیا تھا۔

اگر فرض کرلیا جائے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کسی مہم پر روانہ فرمایا ہو' اور آپ پر کسی دوسرے کو امیر بنایا ہو جیسے حج میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آپ پر امیر بنایا تھا۔سن نو ہجری میں جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حج پر روانہ ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ان سے جا ملے۔آپ نے پوچھا: کیا امیر بن کر آئے ہو یا مأمور بن کر؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''بلکہ مامور بن کر آیا ہوں۔''

[اس سفر میں] حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر امیر تھے۔اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی خلیفہ تھے تو آپ اس قابل تھے کہ آپ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر امیر بنایا جائے۔یہ ایسی بات ہے کہ ایک جاہل شخص ہی اس سے منکر ہوسکتا ہے۔تو پھر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ زیادہ عقل مند؛ زیادہ متقی اور اہل علم تھے؛ آپ کی زبان سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسے انسان کے حق میں اس قسم کی ہذیان گوئی نہیں ہوسکتی۔

اس کذاب کا یہ قول موجب حیرت و استعجاب ہے کہ:''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ چل کر گئے اور اسامہ رضی اللہ عنہ کو راضی کیا۔''

دوسری جانب شیعہ یہ کہتے ہیں کہ: ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ و عباس، بنی ہاشم و بنی عبد مناف کو مغلوب کرلیا

---

[1] اس لیے کہ عالم اسلامی میں مصالح حالات کے بدل جانے سے تبدیل ہو جاتے ہیں اگر اسلام کو سیدنا اسامہ یا ان کے لشکر کی کسی اور سلسلہ میں ضرورت لاحق ہوتی تو اسلامی مصلحت کو ہر چیز پر مقدم رکھا جاتا۔

تھا اوران کو راضی نہ کیا۔ مقام حیرت ہے کہ جب ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اشراف قریش اور انصار عرب کے بڑے بڑے قبائل کو راضی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تو کیا پڑی تھی کہ ایک انیس سالہ مفلس وقلاش اور بے یارومدد گار نوجوان کی خوشنودی حاصل کرنے کی سعی کرتے۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نہ ہوتی اور آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقدم نہ کیا ہوتا تو آپ بھی دوسرے فقراء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی مانند ہوتے۔

[اشکال] :''اگر شیعہ کہیں کہ اسامہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے محبّ تھے۔''[اس لیے انہیں راضی کیا گیا]

[جواب] :تم دوسری جانب یہ بھی تو کہتے ہو کہ: ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد و وصیت کو بدل ڈالا تھا۔ اورآپ کے وصی پر ظلم کیااوران کا حق غصب کرلیا۔ جوکوئی صحیح وصریح حکم میں نافرمانی کرے؛ کھلے ہوئے واضح عہد کو بدل ڈالے، ظلم وسرکشی کرے؛ اور دوسروں کو مغلوب کرلے۔ اللہ اوراس کے رسول کی اطاعت کی پرواہ نہ کرے؛ اور نہ ہی آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کسی تعلق وقرابت کا خیال کرے' وہ اسامہ جیسے انسان کا اتنا خیال رکھے گا؟ حتی کہ آپ کو راضی کرنے کیلئے چل کر جائے۔ حالانکہ اس نے[اسامہ کی ماں] ام ایمن رضی اللہ عنہا کی گواہی رد کی ہو؛ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غضبناک کیا ہو اورآپ کو تکلیف دی ہو؛ حالانکہ آپ اس بات کی زیادہ حق دار تھیں کہ آپ کو راضی کیا جاتا۔ جوکوئی اتنا کچھ کرسکتا ہوتو اس کو کون سی ایسی حاجت پڑی ہے کہ وہ اسامہ رضی اللہ عنہ کو راضی کرے؟ اس لیے کہ کسی شخص کو یا تو اس کے دین کی وجہ سے راضی کیا جاتا ہے یا پھر دنیا کی وجہ سے۔ اگراس کے پاس اتنا دین بھی نہ ہو جو کہ راضی کرنے والے انسان کیلئے ترغیب کا سبب بن سکے؛ اور نہ ہی انہیں دنیا کی کسی چیز میں اس کی کوئی ضرورت ہو۔ تو پھر کیا وجہ ہوسکتی ہے کہ انہیں راضی کرنے کی کوشش کی جائے ؟ رافضی اپنی جہالت اور دروغ گوئی کی وجہ سے ایسے تناقضات بیان کرتے ہیں جن کا متضاد اور جھوٹ ہونا بالکل ظاہر ہوتا ہے۔ بیشک ان لوگوں کے اقوال میں انتہائی سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ☆يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ﴾ [الذاریات ۸۔۹]۔

''بلا شبہ تم ایک اختلاف والی بات میں پڑے ہوئے ہو۔ اس سے وہی بہکایا جاتا ہے جو (پہلے سے) بہکا ہوا ہو۔''

فصل:...... فاروق ابن خطاب رضی اللہ عنہ پر رافضی غصہ

[اعتراض]: شیعہ قلم کار لکھتا ہے:''اہل سنت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فاروق کے نام سے یاد کرتے ہیں، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس لقب سے ملقب نہیں کرتے؛ حالانکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں فرمایا تھا:''هٰذَا فَارُوْقُ اُمَّتِيْ'' (یہ میری امت کا فاروق ہے)۔ جوحق اور باطل کے مابین فرق کرنے والا ہے۔'' حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ہم منافقین کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بغض کی وجہ سے پہچانتے تھے۔''

[انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ:

پہلی بات:...... اہل علم محدثین بغیر کسی شک وشبہ کے جانتے ہیں کہ: یہ دونوں حدیثیں جھوٹی اور من گھڑت ہیں۔ شیعہ کی طرف سے یہ پہلی جھوٹی حدیث نہیں، بلکہ وہ متعدد دیگر جھوٹی حدیثیں وضع کر چکے ہیں۔ہمیں اس حدیث کی کوئی سند معلوم نہیں۔اور نہ ہی حدیث کی کسی بھی معتمد کتاب میں ایسی کوئی صحیح روایت موجود ہے۔

دوسری بات:...... جو کوئی اگر فرعی مسائل میں بھی کسی حدیث سے استدلال کرے تو اس کیلئے لازمی ہے کہ وہ اس حدیث کی سند بھی پیش کرے۔تو پھر اصول دین میں کیسے بلا سند حدیث پیش کی جا سکتی ہے؟ کسی کہنے والے کا فقط یہ کہنا کہ:''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' حجت نہیں ہوسکتا؛ اس پر اہل علم کا اتفاق ہے۔اگر یہ حجت ہوتا تو ہر وہ حدیث جس میں کوئی ایک محدث اور اہل سنت یہ کہتا کہ:''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے'' حجت بن جاتی۔ہم اس باب میں اس بات پر قناعت کرتے ہیں کہ حدیث کو ان لوگوں سے نقل کیا جائے جو سچائی میں معروف ہوں' خواہ ان کا تعلق کسی بھی گروہ سے ہو۔

لیکن جب حدیث کی اسناد نہ ہوں' تو ناقل حدیث اگرچہ جھوٹ نہ بھی بول رہا ہو' وہ کسی دوسرے کی کتاب سے نقل کر رہا ہو۔اور نقل کرنے والا نہ جانتا ہو کہ [اس سے پہلے] یہ روایت کس سے نقل کی گئی ہے؟ اس باب میں جھوٹ کی کثرت بڑی ہی معروف ہے۔تو پھر کسی کے لیے کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ پر کسی ایسی حدیث سے استدلال کرے جس کی سند کو وہ نہ جانتا ہو؟

تیسری بات:...... یہ بات ہر علم رکھنے والا انسان جانتا ہے کہ محدثین کرام رحمہم اللہ سب سے زیادہ نبی کریم ﷺ کی احادیث مبارکہ کے علم کی تلاش میں رہنے والے تھے۔اور سب سے زیادہ اتباع حدیث میں رغبت رکھنے والے تھے۔

لوگوں میں سب سے زیادہ اتباع ہوی سے دور رہنے والے تھے۔ اگر محدثین کے ہاں یہ ثابت ہو جائے کہ نبی کریم ﷺ نے کسی بھی موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے کوئی ایسا جملہ ارشاد فرمایا تھا؛ تو ان محدثین سے بڑھ کر کوئی بھی نبی کریم ﷺ کی اتباع کا حریص نہ ہوتا۔اس لیے کہ یہ مقدس جماعت نبی کریم ﷺ کے اقوال پر عمل کرنے کو اپنے ایمان کا حصہ سمجھتے تھے اور آپ کی محبت میں آپ کی اطاعت کرتے تھے۔اس کے علاوہ کسی ممدوح شخص سے انہیں کوئی غرض نہ ہوتی تھی۔اگر ان کے ہاں یہ حدیث ثابت ہو جاتی کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا ہے کہ:''یہ اس امت کے فاروق ہیں'' تو محدثین اسے قبول کرتے۔اور اسے نقل کرتے۔جیسا کہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے لیے فرمایا گیا قول نقل کرتے ہیں:((هذا أمين هذه الأمة .)) ''یہ اس امت کا امین ہے۔''[1]

---

[1] رواه البخاري ٥/ ٢٥ ؛ كتاب فضائل أصحاب النبي ﷺ ؛ باب مناقب ابي عبيده رضي الله عنه ؛ سنن الترمذي ٥/ ٣١٦؛ كتاب المناقب ؛ باب مناقب أبو عبيدة . سنن ابن ماجة ١/ ٤٩ ؛مقدمة .

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے حق میں فرمایا تھا: ((لکل نبی حواري و حواري الزبير .)) ❶

''ہر نبی کا ایک حواری ہوتا ہے' اور میرا حواری زبیر رضی اللہ عنہ ہے۔''

اور جیسا کہ محدثین کرام رحمہم اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان قبول کیا اور نقل کیا ہے:

" لأعطين الراية غداً رجلاً يحب الله و رسوله و يحبه الله و رسوله ۔" ❷

''کل میں یہ جھنڈا ایسے آدمی کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے' اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں۔''

چادر والی حدیث جس میں آپ نے حضرت علی' حضرت فاطمہ اور حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہم اجمعین کیلئے فرمایا تھا:

''یا اللہ! یہ بھی میرے اہل بیت ہیں ان سے پلیدی کو دور کر دے' اور انہیں بالکل پاک کر دے۔'' ❸

ان کے علاوہ ایسی دیگر بھی کئی ایک روایات ہیں۔

چوتھی بات:......ان دونوں روایتوں میں سے ہر ایک کا جھوٹ اور باطل ہونا صاف ظاہر ہے۔ ان روایات کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں۔ اس لیے کہ یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے کے فاروق امت ہونے سے کیا مراد ہے؟ کیا حق و باطل میں فرق کرنا مراد ہے؟ اگر اس سے مراد یہی ہو کہ اس سے اہل حق اور اہل باطل کے درمیان امتیاز ہوتا ہے؛ اور مؤمنین اور منافقین میں فرق ہوتا ہے؛ تو یہ ایسا معاملہ ہے جس پر انسانوں میں سے کسی ایک کا بس نہیں چلتا۔ نہ ہی کسی نبی کا نہ ہی کسی دوسرے کا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ وَ مِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ﴾ [التوبة ۱۰۱]

''اور ان لوگوں میں سے جو تمھارے اردگرد دیہاتیوں میں سے ہیں، کچھ منافق ہیں اور کچھ اہل مدینہ میں سے بھی جو نفاق پر اڑ گئے ہیں، آپ انھیں نہیں جانتے، ہم ہی انھیں جانتے ہیں۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اہل مدینہ میں سے اور مدینہ کے گردونواح کے منافقین میں سے ہر ایک کو متعین طور پر نہیں جانتے تھے؛ تو پھر کوئی دوسرا کیسے جان سکتا ہے؟

اگر یہ کہا جائے کہ: آپ اہل حق اور اہل باطل کی صفات بیان کیا کرتے تھے؛ تو یقیناً قرآن میں مجید میں اس کا کافی

❶ البخاري٥/ ٢١ ؛ كتاب فضائل أصحاب النبي ﷺ ؛ باب مناقب الزبير ابن العوام رضي الله عنه ؛ مسلم ٤ / ١٨٧٩ ؛ كتاب فضائل الصحابة باب من فضائل طلحة و الزبير ؛ سنن ابن ماجة ١/ ٤٥ مقدمة .

❷ یہ حدیث صحابہ کرام کی ایک جماعت نے روایت کی ہے۔ دیکھو: رواه البخاري٥/ ١٨؛ كتاب فضائل أصحاب النبي ﷺ ؛ باب علي بن ابی طالب رضي الله عنه ؛ سنن الترمذي ٥/ ٣٠١؛ كتاب المناقب ؛ باب مناقب علي بن ابی طالب رضي الله عنه . سنن ابن ماجة ١/ ٤٣ ؛ مقدمة .

❸ مسلم٤/ ١٨٨٣؛ سبق تخريجه .

وشافی بیان موجود ہے۔اور قرآن ہی وہ فرق کرنے والی کتاب ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حق و باطل میں فرق کیا ہے؛ اس میں کوئی شک وشبہ والی بات ہی نہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ: جو لوگ آپ کے ساتھ مل کر لڑتے تھے وہ حق پر تھے' اور جو آپ سے لڑ رہے تھے وہ باطل پر تھے۔تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اگر اس بات کو صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے تو اس سے آپ کے اور صرف اس خاص گروہ کے درمیان فرق و امتیاز ہوتا ہے۔پس اس لحاظ سے ابوبکر وعمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین اس کے زیادہ حق دار ہیں۔اس لیے کہ انہوں نے اہل حق مؤمنین کو ساتھ لیکر کفار اہل باطل سے قتال کیا۔ان لوگوں کی وجہ سے جو فرق وتمیز حاصل ہوئی وہ زیادہ اکمل وافضل تھی۔اس لیے کہ کوئی عقلمند اس بات میں شک نہیں کرسکتا کہ جن لوگوں سے خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے قتال کیا وہ باطل پرستی کے زیادقریب تھے بہ نسبت ان لوگوں کے جن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتال کیا۔ اس لیے کہ جب بھی دشمن جتنا زیادہ باطل پر ہوتا ہے اس سے لڑنے والے اس قدر زیادہ حق پر ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بروز قیامت سب سے زیادہ عذاب میں وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے کسی نبی کو قتل کیا ہو' یا پھر کسی نبی کے ہاتھوں سے قتل ہوا ہو۔ وہ مشرکین جو کہ براہ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دیا کرتے تھے؛ جیسے ابوجہل' ابولہب وغیرہ؛ یہ دوسرے لوگوں سے بڑھ کر برے تھے۔پس جب خلفاء ثلاثہ سے لڑنے والے سب سے بڑے باطل پرست تھے تو ان کی ہمراہی میں لڑنے والے سب سے بڑے حق پرست تھے۔اس لحاظ سے یہ لوگ صفت فرقان کے زیادہ حق دار ہیں[کہ انہیں فاروق کا خطاب دیا جائے]۔

اگر یہ کہا جائے کہ:'' آپ اس لیے فاروق ہیں کہ آپ کی محبت اہل حق واہل باطل کے مابین فرق کرنے والی ہے۔''

تو اس کا جواب یہ ہے کہ: اولاً: یہ آپ کا ذاتی فعل نہیں ہے کہ اس وجہ سے آپ کو فاروق کہا جائے۔

ثانیاً: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اہل حق واہل باطل کے درمیان سب سے بڑی وجہ تمیز وتفریق ہے۔اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔

ثالثاً: اگر کوئی اعتراض کرنے والا اعتراض کرے اور کہے کہ: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی محبت اہل حق واہل باطل کے مابین فرق کرنے والی ہے تو ان کا دعوی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہی دعوی کرنے والوں سے کسی طرح کمزور نہیں ہوگا۔ حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا گیا ہے آپ نے جب فتنہ کا ذکر کیا تو [حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق] فرمایا:''اس دن یہ اور اس کے ساتھی حق پر ہوں گے۔'' [1]

اگر یہی دعوی حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں کہا جائے تو یہ بات کسی پر مخفی نہیں ہے کہ ان کا دعوی غالب ہوگا۔ اور جس کسی کا قول صرف دعوے تک محدود ہو تو اس کا مقابلہ ایسے ہی دعوی سے کیا جاسکتا ہے۔اگر اس سے مطلق محبت کا دعوی مراد ہو تو پھر اس میں غالی لوگ بھی داخل ہوں گے؛ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رب یا نبی مانتے ہیں۔تو پھر یہ لوگ زیادہ

[1] الترمذي ٥/ ٢٩١ ؛ كتاب المناقب : باب مناقب عثمان رضي الله عنه ؛ قال الترمذي: حسن صحيح .

حق پر ہوں گے۔ حالانکہ ایسا کہنا صریح کفر ہے اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ اور اگر اس سے مطلق محبت مراد ہو تو پھر اس کا معاملہ بھی علیحدہ ہے۔

اہل سنت والجماعت کہتے ہیں: ہم شیعہ سے بڑھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کرنے والے ہیں۔ اس لیے کہ جس محبت میں غلو پایا جائے' وہ یہود کی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اور نصاریٰ کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے محبت کی طرح ہے۔ یہ محبت باطل ہے۔ صحیح محبت یہ ہے کہ محبت کرنے والا اپنے محبوب سے ان اوصاف و خصال کی وجہ سے محبت کرے جو اس میں موجود ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی نیک انسان کے متعلق یہ نظریہ رکھے کہ فلاں ولی اللہ کا نبی ہے۔ یا اس کا شمار سابقین اولین میں ہوتا ہے؛ وہ اس بنیاد پر اس سے محبت کرنے لگ جائے۔ حقیقت میں اس نے ایسی چیز سے محبت کی ہے جس کی کوئی اصل یا حقیقت نہیں ہے۔ اس لیے کہ محبت کرنے والے نے اس وجہ سے محبت کی ہے کہ وہ صفات اس کے محبوب میں موجود ہیں۔ جب کہ یہ صفات اس میں اصل سے موجود ہی نہیں۔ تو پھر اس نے موجود اوصاف سے محبت نہیں کی بلکہ معدوم سے محبت کی ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی ہے جو کسی عورت سے یہ سوچ کر شادی کرے کہ وہ بڑی مال دار ہے؛ بہت خوبصورت ہے؛ دیندار اور حسب ونسب والی ہے۔ پھر اس کے لیے عیاں ہوں کہ اس میں ان کے خیالات و تصورات میں سے کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ تو یقیناً جتنی اس عورت میں کمی نظر آئے گی؛ اس قدر اس کی محبت میں بھی کمی آئے گی۔ اس لیے کہ جب حکم کسی علت کی وجہ سے ثابت ہو تو اس علت کے ختم ہونے سے حکم بھی ختم ہو جاتا ہے۔

یہودی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے محبت کرتا ہے تو [اگر] وہ اس بنیاد پر محبت کرتا ہے: آپ علیہ السلام نے فرمایا: ''جب تک آسمان و زمین باقی رہیں' تم ہفتہ کے دن میں رکے رہنا۔ اور آپ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کی پیروی کرنے سے منع کیا ہے۔'' حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا۔ جب قیامت والے دن یہودیوں کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حقیقت واضح ہوگی تو وہ جان لیں گے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حقیقی اوصاف کی وجہ سے آپ سے محبت نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ان کی محبت کی بنیاد ایسے اوصاف تھے جن کا اصل میں کوئی وجود ہی نہیں۔ پس اس بنا پر اس کی محبت باطل ہوگی۔ اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی بشارت دینے والا نہ ہوگا۔

صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ)) [1]

''آدمی [بروز قیامت] اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس نے محبت کی ہوگی۔''

یہودی کی محبت صرف اس چیز سے ہے جس کا اصل میں کوئی خارجی وجود ہی نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کوئی ایسی بشارت نہیں دی۔ تو پھر وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے محبت کرنے والا تو نہ ہوا۔ محبت؛

[1] صحیح بخاری، کتاب الأدب 'باب: علامة حب الله عزو جل 'ح: ٥٨٢٢۔ صحیح مسلم ؛کتاب البر ...... 'باب: المرء مع من أحب ؛ح: ٤٨٨٥، صحیح الجامع:٦٦٨٩.

ارادہ اور اس طرح کے امور میں علم اور اعتقاد پر چلا جاتا ہے۔ یہ شعور کی ایک قسم ہے۔ پس جو کسی باطل چیز کو اپنے اعتقاد میں محبوب رکھے؛ تو یقیناً وہ باطل سے محبت کرنے والا ہوگا۔ یہ باطل محبت اسے کوئی نفع نہیں دے گی۔ ایسے ہی جو انسان کسی بشر کے متعلق رب ہونے کا اعتقاد رکھے اور پھر اس بنا پر اس سے محبت کرے؛ جیسے کہ وہ لوگ جو فرعون کو اپنا رب سمجھتے تھے؛ اور اسماعیلیہ [اپنے ائمہ کے متعلق اسماعیلیہ ایسا ہی عقیدہ رکھتے ہیں]؛ اور بعض وہ لوگ جو اپنے مشائخ کے رب ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اور بعض لوگ کچھ اہل بیت کے متعلق ایسا ہی دعوی کرتے ہیں۔ یا بعض لوگ انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء اللہ اور ملائکہ کے متعلق یہی عقیدہ رکھتے ہیں؛ جیسے عیسائی لوگ اور دیگر۔ پس جو انسان حق کی پہچان حاصل کر لیتا ہے وہ اسی سے محبت کرتا ہے؛ تو اس کی محبت بھی حق کی بنیاد پر ہوتی ہے؛ اور جس کی محبت حق کی بنیاد پر ہوتی ہے وہ اسے نفع دیتی ہے؛ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ☆وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ☆ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ﴾ [محمد ۱۔۳]

''وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا، اللہ نے ان کے اعمال برباد کر دیے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اور اس پر ایمان لائے جو محمد پر نازل کیا گیا اور وہی ان کے رب کی طرف سے حق ہے، اس نے ان سے ان کی برائیاں دور کر دیں اور ان کا حال درست کر دیا۔ یہ اس لیے کہ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا انھوں نے باطل کی پیروی کی اور بے شک جو لوگ ایمان لائے وہ اپنے رب کی طرف سے حق کے پیچھے چلے۔ اسی طرح اللہ لوگوں کے لیے ان کے حالات بیان کرتا ہے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ شیعہ کی محبت اسی نوع کی ہے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے نصاریٰ کی محبت؛ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معبود ہونے کا عقیدہ رکھتے تھے- جبکہ آپ اللہ کے بندے اور رسول تھے-۔ پس وہ حقیقت میں ایسی چیز سے محبت کرتے ہیں جس میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ جب ان پر عیاں ہوگا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، تو اس کی ساری محبت کافور ہو جائے گی؛ اور انہیں آپ کا ساتھ بھی نصیب نہ ہوگا۔ اسی طرح شیعہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں اغراق و غلوّ سے کام لیتے ہیں۔ اور ایسے ہی ان لوگوں کی محبت بھی ہے جو صحابہ کرام تابعین عظام اور اولیاء اللہ رحمہم اللہ سے باطل تصورات قائم کر کے ان سے محبت کرتے ہیں۔ تو جس محبت کی بنیاد ہی باطل پر ہو؛ وہ محبت بھی باطل ہوگی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رافضی کے دعویٔ محبت کا یہی عالم ہے۔ اس لیے کہ وہ ایسی چیزوں سے محبت کرتے ہیں جن کا اصل میں کوئی وجود ہی نہیں۔ مثال کے طور پر رافضی کہتے ہیں: آپ امام منصوص ہیں؛ آپ کو امام بنانے کا حکم دیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے علاوہ کوئی دوسرا امام نہیں ہوسکتا۔

ان لوگوں کا اعتقاد ہے کہ حضرات شیخین جناب ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ظالم اور کافر تھے-معاذ اللہ- ۔جب روز محشر واضح ہو جائے گا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان دونوں میں سے کسی ایک سے بھی افضل نہ تھے ؛ بلکہ اس کی آخری حد یہ ہوسکتی ہے کہ آپ ان دونوں کے قریب تر ہوں ؛ اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ ان دونوں اصحاب کی خلافت ؛عظمت و امامت اور فضیلت کے قائل تھے۔اور نہ ہی آپ گناہوں سے معصوم تھے ؛ اور نہ ہی آپ کے بعد کوئی دوسرا منصوص امام ۔تو ان کو پتہ چل جائے گا کہ حقیقت میں وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت نہ کرتے تھے۔بلکہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سب سے بڑھ کر بغض رکھنے والے تھے۔اس لیے کہ جو صفات حضرت علی رضی اللہ عنہ میں کامل طور پر موجود تھیں رافضی تو ان صفات سے بغض رکھتے ہیں۔اس لیے کہ آپ پہلے تینوں خلفاء کی خلافت اور ان کی فضیلت کو مانتے تھے۔آپ ان کو فضیلت دیتے اور ان کی خلافت کا اقرار کرتے تھے۔تو اس وقت رافضیوں کو پتہ چل جائے گا کہ وہ حقیقت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے تھے۔

مذکورہ بالا بیان سے اس حدیث کی وضاحت ہو جاتی ہے، جو صحیح مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے عہد کیا کہ صرف مومن ہی تجھ سے محبت کرے گا۔اور صرف منافق ہی تجھ سے بغض و عداوت رکھے گا۔''❶

یہ حدیث صحیح اور ثابت شدہ ہے ۔ روافض صحیح معنی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کے اصل اوصاف کی بنیاد پر دوستی نہیں رکھتے ، بلکہ ان کی محبت یہودیوں کی حضرت موسی علیہ السلام اور عیسائیوں کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام محبت کی جنس سے ہے ۔ بلکہ رافضی ایک اعتبار سے جناب علی رضی اللہ عنہ سے بغض و عداوت رکھتے ہیں۔جس طرح یہود و نصاریٰ حضرت موسی علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے [حقیقی] اوصاف سے بغض رکھتے ہیں ۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا کرتے ہیں، حالانکہ موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام آپ کی رسالت و نبوت کے معترف تھے۔[[اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ الفت و محبت رکھتے تھے۔مگر شیعہ اس کے باوصف ان سے عداوت رکھتے ہیں، بنا بریں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں داخل ہیں کہ ''صرف منافق ہی آپ سے بغض رکھے گا]]۔''

علی ہذا القیاس جو شخص بھی کسی بزرگ سے ایسی صفت کی بنا پر محبت رکھتا ہے جو فی الواقع اس میں نہیں پائی جاتی تو گویا وہ اس سے عداوت رکھتا ہے۔مثلاً کوئی شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اس کا مرشد اپنے تمام مریدوں کی سفارش کرے گا۔اور یہ کہ وہ شیخ اسے رزق پہنچاتا اور اس کی مدد کرتا ہے، اس کی مشکلات کو دور کرتا ہے؛ یا اس کی حاجات و ضروریات پوری کرتا ہے،یا یہ کہ وہ شیخ اللہ تعالیٰ کے خزانوں کا مالک ہے ؛ یا وہ یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اس کا شیخ عالم الغیب ہے۔یا پھر وہ بادشاہ مطلق بن گیا ہے؛ اور معاملہ حقیقت میں ایسے نہ ہو ؛ تو یقیناً اس نے ایسی چیز سے محبت کی ہے جس کا حقیقت میں کوئی وجود ہی نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان کہ:'' صرف مومن ہی مجھ سے محبت کرے گا۔اور صرف منافق ہی مجھ سے بغض و عداوت

❶ مسلم۔ کتاب الایمان۔ باب الدلیل علی أن حب الانصار و علی رضی اللہ عنہم من الایمان(ح:۷۸)۔

رکھے گا۔'' یہ آپ کے خصائص میں سے نہیں۔ صحیحین میں ہے: سرکار دوعالم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

''ایمان والے کی نشانی انصار سے محبت کرنا ہے' اور منافق کی نشانی انصار سے بغض رکھنا ہے۔''❶

اور آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے: ''جو شخص اللہ تعالیٰ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو، وہ انصار کا دشمن نہیں ہوسکتا۔''❷

نبی کریم ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ''انصار سے صرف مؤمن ہی محبت رکھے گا' اور ان سے منافق ہی نفرت و بغض رکھے گا۔'' صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور ان کی والدہ کے لیے یہ دعا فرمائی تھی کہ ''اللہ تعالیٰ مومنین کے دلوں میں ان کی محبت پیدا کردے۔''❸

آپ فرمایا کرتے تھے: ''آپ کوئی بھی مؤمن نہیں پائیں گے مگر وہ مجھ سے اور میری ماں سے محبت کرتا ہوگا۔''

ان احادیث کی روشنی میں مذکورہ بالا احادیث اور شیعہ کی روایت کردہ حدیث میں فرق واضح ہوجاتا ہے۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ: ''ہم منافق کو صرف بغض علی کی بنا پر پہچانا کرتے تھے۔''

[جواب]: اس روایت کے بارے میں ہر عالم جانتا ہے کہ یہ من گھڑت جھوٹ ہے۔ اس لیے کہ نفاق کی بہت ساری نشانیاں ہیں؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بغض کے علاوہ بھی متعدد اسباب ہیں۔ تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض کے علاوہ کوئی نفاق کی نشانی کیسے نہیں ہوسکتی۔

علامات نفاق:

[نفاق کی بہت سی نشانیاں ہیں]۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''انصار سے عداوت رکھنا علامت نفاق ہے۔''❹

آپ نے یہ بھی فرمایا: ''منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے؛ جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے اور جب اسے امین بنایا جائے تو وہ خیانت کرے۔''❺

❶ البخاري ٥/ ٣٢؛ كتاب مناقب الأنصار، باب حب الأنصار ، مسلم:١/ ٨٥كتاب الإيمان، باب الدليل على أن حب الأنصار...... ، المسند ط. الحلبي:٣/ ١٣٠، وقال: لا يبغض الأنصار رجل يؤمن بالله واليوم الآخر ......؛ في: مسلم: ١/ ٨٦، كتاب الإيمان، باب الدليل على أن حب الأنصار...... ، سنن الترمذي:٥/ ٣٧٣ كتاب المناقب، باب في فضل الأنصار وقريش ، المسند، ط. المعارف: ٤/ ٢٩٣.

❷ البخاري:٥/ ٣٢؛ كتاب مناقب الأنصار، باب حب الأنصار ، مسلم:١/ ٨٥كتاب الإيمان، باب الدليل على أن حب الأنصار...... ، سنن الترمذي:٥/ ٣٧١، كتاب المناقب، باب من فضل الأنصار وقريش ، المسند ط. الحلبي:٤/ ٢٨٣۔

❸ صحيح مسلم۔ كتاب فضائل الصحابة۔ باب من فضائل ابى هريرة رضي الله عنه (حديث: ٢٤٩١)۔

❹ صحيح مسلم، كتاب الإيمان۔ باب الدليل على ان حب الانصار و على رضي الله عنهم......" (حديث:٧٤) صحيح بخارى، كتاب الايمان، باب علامة الايمان حب الانصار (حديث:١٧)

❺ البخارى، كتاب الايمان۔ باب علامات المنافق(ح:٣٣) مسلم كتاب الايمان باب خصال المنافق(ح:٥٩)

قرآن کریم میں منافقین کے اوصاف کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّلۡمِزُكَ فِی الصَّدَقٰتِ فَاِنۡ اُعۡطُوۡا مِنۡهَا رَضُوۡا﴾ (التوبة:۵۸)

''ان (منافقین) میں سے وہ بھی ہیں جو صدقات کے بارے میں آپ کو طعن دیتے ہیں اگر ان کو صدقات دیے جائیں تو وہ راضی ہو جاتے ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿وَ مِنۡهُمُ الَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ النَّبِیَّ﴾ (التوبة:۵۸)

''منافقین میں سے وہ بھی ہیں جو نبی کو ایذا دیتے ہیں۔''

اور ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ عٰهَدَ اللّٰهَ﴾ (التوبة ۷۵)

''ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے [جھوٹے] وعدے کرتے ہیں۔''

اور ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّقُوۡلُ ائۡذَنۡ لِّیۡ وَ لَا تَفۡتِنِّیۡ﴾ (التوبة: ۴۹)

''منافقین میں سے بعض کہتے ہیں کہ ہمیں اجازت دیجیے اور مجھے فتنہ میں نہ ڈالیے۔''

دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّقُوۡلُ اَیُّكُمۡ زَادَتۡهُ هٰذِهٖۤ اِیۡمَانًا﴾ (التوبة:۱۲۴)

''ان میں سے بعض کہتے ہیں: اس آیت نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کیا۔''

اللہ کریم نے سورۂ توبہ اور دیگر مقامات پر منافقین کی جو علامات بیان کی ہیں انھیں یہاں تفصیلاً بیان نہیں کیا جا سکتا۔ شیعہ نے جو جھوٹی روایت ذکر کی ہے، اگر اس کے الفاظ یہ ہوتے کہ ہم منافقین کو بغض علی رضی اللہ عنہ کی بنا پر پہچان لیا کرتے تھے؛ تو بھی ایک بات تھی۔ جس طرح بغض انصار کو علامت نفاق قرار دیا گیا، بلکہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ کے بغض کو بھی نفاق کی علامت ٹھہرایا گیا ہے۔ اس لیے کہ جو شخص دانستہ اس کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے جس کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم محبت رکھا کرتے تھے؛ اور وہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت اور دوستی رکھا کرتا تھا؛ اس کا بغض و عناد بلا شبہ علامات نفاق میں سے ایک علامت ہے۔ یہ دلیل خود ان لوگوں کا رد کرتی ہے؛ جب کہ اس کا عکس کہیں بھی ثابت نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے والے سب سے بڑے منافق سمجھے جاتے تھے۔ کیوں کہ صحابہ میں سے کوئی بھی شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے عزیز تر نہ تھا اور نہ ہی صحابہ میں کوئی شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے زیادہ چاہنے والا تھا، اس سے واضح ہوا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بغض وعناد رکھنا نفاق کی عظیم ترین علامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے عناد رکھنے والے نصیریہ اور اسمٰعیلیہ اور دیگر سب سے بڑے منافق ہوتے ہیں۔

[اعتراض]: اگر کوئی معترض یہ بات کہے کہ: رافضی جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے ہیں' ان کا ایمان تھا کہ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہیں۔ اس لیے کہ ان لوگوں کو ایسی کہانیاں گھڑ کر سنائی گئی ہیں جن کا تقاضا ہے کہ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل بیت اطہار سے بغض رکھتے ہوں۔ اس لیے وہ بھی جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے ہیں۔''

[جواب]: اگر یہ واقعی عذر ہے تو پھر ان لوگوں کے منافق ہونے میں کیا مانع ہے جو جہالت اور تأویل کی بنا پر آپ سے بغض رکھتے ہوں۔تو پھر یہی حال حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے والوں کا ہوگا' جن کا اعتقاد ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کافر اور مرتد ہو گئے تھے۔یا آپ ظالم اور فاسق تھے۔تو وہ بھی آپ سے اس وجہ سے بغض رکھتے ہیں کہ آپ دین اسلام سے بغض رکھتے تھے۔ یا اللہ تعالیٰ نے جو آپ کو عدل و انصاف کا حکم دیا تھا' اس سے محبت نہیں کرتے تھے۔اور ان لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ آپ نے حکومت کی تلاش میں امیر المؤمنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ قتل کروایا۔اور آپ نے زمین میں فساد پھیلایا۔اور آپ کی مثال ایسے ہی تھی جیسے فرعون یا اس جیسے دوسرے لوگوں کی ۔ایسا کہنے والے بھی اگرچہ جاہل ہیں؛ مگر ان لوگوں سے بڑھ کر جاہل نہیں ہیں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس امت کا فرعون کہتے ہیں۔اگر ان لوگوں کا اپنی جہالت اور تاویل کی وجہ سے حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے بغض رکھنا منافقت نہیں ہے؛ تو پھر دوسرے لوگوں [خوارج ونواصب] کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنا بھی بدرجہ اولی منافقت نہیں ہے۔

اگر بغض علی رضی اللہ عنہ نفاق ہے' بھلے وہ جہالت اور تأویل کی وجہ سے ہی کیوں نہ ہو؛ تو پھر اس وقت حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے بغض رکھنا بدرجہ اولی نفاق ہوگا' اگرچہ جہالت وتأویل کی بنا پر ہی کیوں نہ ہو۔

فصل:......تعظیم ام المؤمنین رضی اللہ عنہا پر رافضی غیض وغضب

[حضرت عائشہ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہما کے متعلق رافضی کی ژاژہ خوئی]

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول: ''اہل سنت باقی ازواج مطہرات پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی عظمت وفضیلت کے قائل ہیں حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کو یاد فرمایا کرتے تھے۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی بھی اس کو اس کثرت سے کیا یاد کرتے ہیں؛ حالانکہ اللہ تعالی نے آپ کو ان سے بہتر بدل عطا فرمایا۔تو آپ نے فرمایا:''اللہ کی قسم !اس سے بہتر بدل مجھے نہیں مل سکا۔اس نے اس وقت میری تصدیق کی جب لوگوں نے مجھے جھٹلایا۔اور جب لوگوں نے مجھے جھڑک دیا؛ تو اس نے مجھے اس وقت ٹھکانہ اور پناہ دی۔اس نے اپنے مال کیساتھ میری مدد کی۔اللہ تعالیٰ نے اس سے مجھے اولاد عطا فرمائی۔جب کہ کسی دوسری بیوی سے میری کوئی اولاد نہیں ہوئی۔''

[جواب] : ہم کہتے ہیں: اہل سنت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے سب ازواج سے افضل ہونے کی بابت متحد الخیال نہیں ہیں؛ ہاں اکثر لوگوں کا یہی خیال ہے۔سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی افضلیت کے قائلین وہ حدیث نبوی پیش کرتے ہیں جسے امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت ابوموسی اور انس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے' آپ نے فرمایا:

''عائشہ باقی عورتوں پر اسی طرح فضیلت رکھتی ہیں جیسے ثرید باقی کھانوں سے افضل ہے۔''[1]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب فضائل أصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۔ باب فضل عائشة رضی اللہ عنہا ۔ (ح: ۳۷۶۹، ۳۷۷۰)، صحیح مسلم ۔ کتاب فضائل الصحابة باب فی فضائل عائشة رضی اللہ عنہا (ح:۲٤٤٦)۔

ثرید میں گوشت میں بھگوئی ہوئی روٹی ہونے کی وجہ سے باقی کھانوں سے افضل ہے۔

گندم کی روٹی بہترین کھانا ہے' اور گوشت بہترین سالن ہے۔ جیسا کہ ابن قتیبہ کی روایت میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:'' دنیا والوں کے لیے تمام سالنوں کا سردار گوشت ہے۔'' ❶

جب گوشت ہر قسم کے سالن کا سردار ہے' اور گندم کی روٹی تمام غذاؤں کی سردار ہے' تو ان دونوں کا مجموعہ ثرید ہے؛ جو کہ تمام کھانوں کا سردار ہے۔اس لیے ثرید تمام کھانوں سے افضل ہے۔ نبی کریم ﷺ سے یہ احادیث کئی اسناد سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''عائشہ باقی عورتوں پر اسی طرح فضیلت رکھتی ہیں جیسے ثرید باقی کھانوں سے افضل ہے۔''

صحیح بخاری میں ہے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے کہا:

'' یارسول اللہ ﷺ! ازواج مطہرات میں سے آپ کو کون عزیز تر ہے؟ آپ نے جواباً فرمایا:
''عائشہ رضی اللہ عنہا۔'' میں نے عرض کیا اور مردوں میں سے آپ کس کے ساتھ زیادہ محبت رکھتے ہیں؟ فرمایا:
''ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ۔''
میں نے عرض کیا ان کے بعد اور کس سے ؟ فرمایا:'' عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ۔'' اس کے بعد عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ دریافت کرتے چلے گئے۔اور نبی کریم ﷺ نے درجہ بدرجہ متعدد صحابہ کا ذکر کیا۔ ❷

شیعہ جو کہتے ہیں کہ: آپ ﷺ نے سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی شان میں فرمایا ہے کہ:

((مَا اَبْدَلَنِیَ اللّٰہُ خَیْرًا مِّنْہَا .)) ❸

''اللہ تعالیٰ نے خدیجہ رضی اللہ عنہا کے عوض مجھے ان سے بہتر بیوی عطا نہیں کی۔''

اگر اس کی سند کی صحت ثابت بھی ہو جائے تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی افضلیت کا عقیدہ رکھنے والے بشرط صحت اس کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ آغاز اسلام میں سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ذریعہ آپ کو جو فائدہ پہنچا تھا وہ نفع کسی اور سے حاصل نہیں ہوا۔سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے افضل ہونے کا پہلو گویا یہ امر ہے کہ آپ نے آڑے وقت میں نبی کریم ﷺ کی مدد کی۔اس کے عین برخلاف سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی رفاقت نبوی کی سعادت اس آخری وقت میں حاصل ہوئی جب نبوت پایہ تکمیل کو پہنچ چکی تھی اور دین حق تکمیل کے آخری مدارج طے کر رہا تھا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو کمالِ علم وایمان کی وہ دولت نصیب ہوئی جو آغاز اسلام والوں کے حصہ میں نہیں آئی تھی۔اس اعتبار سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا،سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے افضل ٹھہریں۔

امتِ محمدی بڑی حد تک سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے علم وفضل سے متمتع ہوئی اور آپ نے علم وعمل دونوں سے حظ وافر پایا۔

---

❶ سنن ابن ماجة ٢/ ١٠٩٩؛كتاب الأطعمة ؛ باب اللحم ؛ عن ابي درداء؛ ضعيف؛ قال الألباني : ضعيف جداً '' ضعيف الجامع الصغير ٣/ ٢٣٠ . وضعف العجلوني في كشف الخفاء ١/ ٤٦١ .

❷ صحيح بخاري۔ باب غزوة ذات السلاسل ، (ح:٤٣٥٨) صحيح مسلم۔ كتاب فضائل الصحابة۔ باب من فضائل ابى بكر الصديق رضي الله عنه (ح:٢٣٨٤)۔ ❸ مسند احمد(٦/ ١١٧۔١١٨)۔

گویا سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی افضلیت صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک محدود ہے۔ نہ آپ کو تبلیغ احکام کا شرف حاصل ہوا اور نہ ہی امت آپ سے نفع اندوز ہوسکی۔ جب کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے امت کو بڑا فائدہ پہنچا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دین اسلام اس وقت تکمیل کو نہیں پہنچا تھا اور ابھی ان کمالات کی تحصیل کا وقت نہیں آیا تھا جو بعد میں آنے والے لوگوں نے حاصل کیے۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ جو شخص اپنی توجہات کو ایک ہی بات پر مرکوز کردے، وہ اس کی نسبت بہتر ہوگا جس نے مختلف امور و اعمال کو اپنی نظر و فکر کی آماج گاہ بنا رکھا ہو۔ یہ ہے سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی افضلیت کی وجہ وجیہ! مگر معاملہ یہ ہے کہ نیکی کے جملہ اقسام افضلیت کے اس پہلو میں محصور و محدود نہیں ہیں۔ یہ ایک موٹی سی بات ہے کہ صحابہ کرام میں سے جو لوگ ایمان و جہاد میں پیش پیش تھے، مثلاً حضرت حمزہ، علی، سعد بن معاذ، اُسید ❶ بن حُضیر رضی اللہ عنہم اجمعین وہ ان لوگوں کی نسبت افضل تھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت و نفع رسانی میں ان سے سبقت لے گئے تھے۔ مثلاً ابو رافع اور انس بن مالک رضی اللہ عنہما۔

بہر کیف یہاں سیدہ عائشہ و خدیجہ رضی اللہ عنہما کی افضلیت کی تفصیلات بیان کرنا مقصود نہیں۔ اصلی مقصد یہ بتانا ہے کہ اہل سنت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی تعظیم و تکریم اور محبت کے بارے میں متفق اللسان ہیں۔ نیز یہ کہ جملہ ازواج مطہرات میں سے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آپ کو عزیز تر تھیں؛ آپ ان سب میں سے بڑی عالم تھیں۔ مسلمان بھی جملہ امہات المومنین رضی اللہ عنہن میں سے ان کا زیادہ اکرام و احترام ملحوظ رکھتے ہیں۔

روایات صحیحہ میں موجود ہے کہ صحابہ دانستہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی باری کے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تحائف بھیجا کرتے تھے، کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے محبت رکھتے ہیں۔ اس کی حد یہ ہے کہ دیگر ازواج آپ کو رشک کی نگاہ سے دیکھنے لگیں اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بارگاہ نبوی میں بھیجا۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: آپ کی بیویاں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی کے بارے میں عدل و انصاف کا تقاضا کرتی ہیں۔'' تو آپ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو مخاطب کرکے فرمایا: ''پیاری بیٹی! جس سے مجھے محبت ہے کیا تو اسے محبت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی؟'' سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: کیوں نہیں! تو آپ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''تو اس سے محبت رکھیے۔'' ❷

---

❶ یہ انصار کے قبیلہ بنی عبد الاشہل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد قبیلہ اوس کے مشہور شہسوار اور جنگ بُعاث میں سالار لشکر تھے۔ اسید سابقین اوّلین میں سے تھے۔ یہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے پہلے حلقہ بگوش اسلام ہوئے یہ لیلۃ العقبہ کے نقباء میں سے ایک تھے۔ یہ زندگی بھر شرافت کا مجسمہ رہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسید کو زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا بھائی قرار دیا تھا۔ یہ غزوۂ احد میں ثابت قدم رہے اور ان کے جسد اقدس پر سترہ زخم آئے۔ یہ خلافت فاروقی تک بقید حیات رہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیت المقدس کی فتح کے وقت وہاں موجود تھے۔ سرور کائنات نے ان کی مدح میں فرمایا: ''اسید بہت اچھے آدمی ہیں۔'' (سنن ترمذی۔ کتاب المناقب، باب مناقب معاذ بن جبل...... رضی اللہ عنہ (ح: ۳۷۹۵) مطولاً، مستدرك حاكم (۲۸۸/۳)، جس طرح عمرو بن العاص کی مدح میں فرمایا تھا: ''عبد اللہ کے سب گھر والے اچھے ہیں۔ عبد اللہ، ابو عبد اللہ اور ام عبد اللہ رضی اللہ عنہم سب نیک لوگ ہیں۔'' (مسند احمد (۱۶۱/۱، ۱۵۰/۴) اسید رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نعش اٹھانے میں حصہ لیا اور بقیع میں مدفون ہوئے۔ (مستدرك حاكم (۲۸۷/۳) معجم کبیر طبرانی (۲۰۳/۱)

❷ صحیح بخاری، کتاب الهبة، باب من اهدی الی صاحبه (حدیث: ۲۵۸۱)، صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابة، باب فی فضائل عائشة رضی اللہ عنہا۔ (حدیث: ۲۴۴۱، ۲۴۴۲)

حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

عائشہ! ''جبریل علیہ السلام آپ کو سلام کہتے ہیں۔'' سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: وعلیہ السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، جو کچھ آپ دیکھتے ہیں، ہم کو نظر نہیں آتا۔'' ❶

سرکار دوعالم ﷺ نے جب حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا ❷ کو طلاق دینے کا ارادہ کیا تو انھوں نے آپ کی اجازت سے اپنی باری کا دن سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا۔

جب نبی کریم ﷺ مرض الموت میں مبتلا تھے، تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے باری کے دن کا بے تابانہ انتظار کرتے اور فرمایا کرتے تھے، ''میں آج کا دن کہاں گزاروں گا؟'' پھر سب ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں قیام کی اجازت دے دی۔ آپ آخر دم تک وہاں مقیم رہے۔ ❸ آپ نے اپنے اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے لعاب دہن کو یک جا کیا ❹ اسی دوران سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی آغوش میں عالم آخرت کو سدھار گئے۔ ❺

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا وجود مسعود امت کے لیے لاتعداد فوائد وبرکات کا موجب ہوا۔ جب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی وجہ سے آیت تیمّم نازل ہوئی تو حضرت اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اے آل ابی بکر! یہ تمھاری اوّلین برکت نہیں ہے۔ اے عائشہ! تم پر جو مصیبت بھی نازل ہوئی، اسے

---

❶ صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ۔ باب فضل عائشة رضی اللہ عنہا۔ (حدیث:۳۷۶۸)، صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابة۔ باب فی فضائل عائشة رضی اللہ عنہا۔(حدیث:۲۴۴۷)

❷ ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا قریش کے قبیلہ بنی عامر سے تعلق رکھتی تھیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا وسودہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ایک ہی وقت میں عقد باندھا گیا تھا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اس وقت کم سِن تھیں۔ اس لیے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا ان سے پہلے آپ کے گھر میں آباد ہوئیں۔ جب نبی کریم ﷺ نے ان کو طلاق دینے کا ارادہ کیا تو انھوں نے عرض کیا۔ مجھے خاوند کی حاجت نہیں، میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ میں بروز قیامت آپ کی بیوی کی حیثیت سے اٹھائی جاؤں۔ جب انھوں نے اپنی باری کا دن سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا۔ تو یہ آیت نازل ہوئی: ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ﴾ (سنن ابی داؤد۔ باب فی القسم بین النساء (ح:۲۱۳۵) سنن ترمذی(۳۰۴۰) عن ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ بمعناه. حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں فرماتی ہیں: سودہ رضی اللہ عنہا کے سوا دوسری کوئی عورت نہیں جس کے بارے میں میری یہ خواہش ہو کہ میں اس کی کھال میں داخل ہو جاؤں۔ (اپنے آپ کو اس سے تبدیل کرلوں)(مسلم۔ کتاب الرضاع، باب جواز هبتها نوبتها لضربها، (ح: ۱۴٦۳)۔ خلافت فاروقی میں جب بلا جنگ وقتال بہت سا مال آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں ایک تھیلا درہموں سے بھر کر بھیجا۔ حضرت سودہ نے دریافت کیا یہ کیا ہے؟ جواب ملا: درہم، آپ نے فرمایا: یہ تو کھجوروں کے تھیلے کی طرح بھرا ہوا ہے۔ یہ کہہ کر آپ نے وہ سب درہم تقسیم کردیے۔(طبقات ابن سعد(۸/۵٦)

❸ صحیح بخاری، کتاب المغازی۔ باب مرض النبی ﷺ و وفاته (حدیث:۴۴۵۰)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فی فضائل عائشة رضی اللہ عنہا (حدیث:۲۴۴۳)۔

❹ صحیح بخاری، حوالہ سابق(حدیث:۴۴۵۱)، صحیح مسلم، حوالہ سابق۔

❺ صحیح بخاری ۔ کتاب التیمم(ح:۳۳۴، ۳۳٦) مسلم۔کتاب الحیض۔ باب التیمم(ح:۳٦۷)،

اللہ تعالیٰ نے خیر و برکت کا موجب بنایا۔'' ❶

فصل :......ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر رافضی اعتراضات

[اعتراضات] : رافضی مصنف لکھتا ہے:'' عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ راز افشاء کر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عائشہ سے کہا تھا کہ:'' تو علی رضی اللہ عنہ سے لڑے گی اور تو اس پر ظلم کرنے والی ہو گی۔'' پھر اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کی۔ اللہ تعالیٰ نے ازواج النبی کو حکم دیا تھا:﴿وَ قَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾ ''اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو۔'' عائشہ رضی اللہ عنہا نے حکم الٰہی کی خلاف ورزی کی۔ اور ایک جماعت کی رفاقت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑنے کے لیے نکلیں۔ حالانکہ ان کا کوئی گناہ نہیں تھا۔ اس لیے کہ سب مسلمانوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل پر اتفاق کر لیا تھا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا ہمیشہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرانے کی سازش کرتی رہتی تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ'' بوڑھے احمق کو تہ تیغ کر دو۔''''اللہ اس بوڑھے احمق کو قتل کرے۔'' جب آپ کی قتل کی خبر اس تک پہنچی تو بہت خوش ہوئی۔ پھر پوچھنے لگی: ان کے بعد کون خلیفہ بنا؟ لوگوں نے کہا: علی رضی اللہ عنہ۔ تو اس نے عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کے بدلہ کے نام پر علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا۔ حالانکہ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کیا گناہ تھا؟ اور طلحہ، زبیر رضی اللہ عنہما اور دس ہزار مسلمانوں کو کیوں کر زیب دیتا تھا کہ وہ ان کے زیر اثر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف نبرد آزما ہوتے۔ بروز قیامت یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا منہ دکھائیں گے۔ ہماری یہ حالت ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کی بیوی کے ساتھ بات چیت کرے اور سفر میں اسے اپنے ہم راہ لے جائے، تو اس عورت کا خاوند اس کا انتہائی دشمن بن جائے گا۔ موجب حیرت تو یہ امر ہے کہ یہ سب لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ متحد ہو گئے، مگر جب سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا، ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس اپنا حق طلب کرنے گئیں تو کسی نے بھی ان کا ساتھ نہ دیا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب] : ہم کہتے ہیں: اہل سنت کا زاویہ نگاہ مبنی بر عدل و انصاف اور تناقض سے پاک ہے؛ ان کا کلام حق و عدل سے عبارت ہے جس میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ اس کے برخلاف روافض و مبتدعین کے افکار و آراء میں تناقض پایا جاتا ہے۔ جن میں بعض باتوں کے متعلق آگے چل کر ہم آگاہ کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

[جنتی ہونے کے لیے معصومیت شرط نہیں]:

اہل سنت کے نزدیک بدری صحابہ اور سب امہات المومنین رضی اللہ عنہم قطعی جنتی ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے علاوہ حضرت ابوبکر و عمر و عثمان و علی و طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین یہ تمام لوگ انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد جنت کے سرداروں میں سے ہیں۔

اہل سنت کا زاویہ فکر یہ ہے کہ جنتی ہونے کے لیے گناہ و خطاء سے پاک ہونا ضروری نہیں۔ بلکہ اس امر کا بھی احتمال

❶ صحیح بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب حدیث الافك (حدیث:٤١٤١)، صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب فی حدیث الافك (حدیث:٢٧٧٠)۔

ہے کہ کوئی شخص صغیرہ یا کبیرہ گناہ کا ارتکاب کر کے پھر اس سے سچی توبہ کر لے۔ یہ مسئلہ مسلمانوں کے یہاں متفق علیہا ہے۔ اگر توبہ نہ بھی کرے تو صغیرہ گناہ، کبائر سے اجتناب کرنے کی بنا پر بھی معاف کر دیے جاتے ہیں۔ یہ جمہور کا مذہب ہے۔ اکثر علماء کے نزدیک کبائر، اعمالِ صالحہ بلکہ حوادث و آلام میں گرفتار ہونے کی بنا پر بھی معاف کر دیے جاتے ہیں۔

بنا بریں اہل سنت کہتے ہیں کہ: صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی جو برائیاں بیان کی جاتی ہیں ان میں سے اکثر جھوٹ ہیں۔ اور اکثر ان کے اجتہاد پر مبنی ہیں۔ مگر بہت سارے لوگوں کو وجہ اجتہاد معلوم نہیں ہوسکی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے مفروضہ گناہوں میں سے بعض توبہ کی بنا پر اور بعض اعمال صالحہ اور حوادثِ روزگار یا کسی اور وجہ سے معاف کیے جا چکے ہیں۔ اس کی دلیل وہ احادیث ہیں جن سے ان کا جنتی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ ایسے افعال کا ارتکاب نہیں کر سکتے جو دوزخ میں جانے کے موجب ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب انھوں نے موجبات نار سے اپنا دامن بچائے رکھا تھا؛ اور ان کی موت ایسے اعمال پر نہیں ہوئی جو جہنم میں جانے کا موجب ہوں تو کوئی دوسری چیز ان کے جنتی ہونے میں قادح نہیں ہوسکتی [تو وہ یقیناً جنتی ٹھہریں گے]

وثوق و یقین سے یہ جاننے کے باوجود کہ صحابہ قطعی جنتی ہیں۔ اگر ہمیں کسی متعین صحابی کے جنتی ہونے کا علم حاصل نہ بھی ہو پھر بھی ہم غیر یقینی امور کی بنا پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے جنتی ہونے کی نفی نہیں کر سکتے۔ بلکہ ایک عام مومن؛ جس کا حتمی طور پر جنتی ہونا دوٹوک طور پر معلوم نہ بھی ہو تب بھی اس کے جنتی ہونے کی نفی کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح صرف احتمال کے بل بوتے پر کسی کو دوزخی قرار دینا بھی ناروا ہے۔ خصوصاً صلحاء کے بارے میں ایسی بات کہنا بڑی مذموم حرکت ہے۔ کسی فرد واحد کے ظاہر و باطن اور اعمالِ صالحہ و سیۂ کی تفصیلات معلوم کرنا بڑا دشوار کام ہے۔ اس لیے اس ضمن میں کوئی فیصلہ صادر کرنا بلا علم و دلیل ہے اور کلام بلا علم حرام ہے۔ اسی بنا پر مشاجراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے زبان کو روکنا اس ضمن میں اظہار خیال سے افضل ہے۔ اس لیے کہ اس معاملہ میں زیادہ غور و خوض کرنا اور کلام کرنا بلا علم ہے۔ جو کہ حرام ہے۔ خصوصاً جب کہ اس کے ساتھ ساتھ ہوائے نفس اور حق سے روگردانی بھی شامل ہو۔ پھر جب کلام ہی صرف اس نیت سے کیا جائے کہ ہوائے نفس کو طیش دینا اور حق کو ٹھکرانا مقصود ہو تو پھر اس کی حرمت کا کیا عالم ہوگا؟۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

''قاضی تین ہیں، ان میں سے دو قاضی جہنمی اور ایک جنتی ہے:

۱۔ جو قاضی حق کو معلوم کر کے اس کے مطابق فیصلہ کرے وہ جنتی ہے۔

۲۔ وہ قاضی جو حق سے آگاہ ہو اور دانستہ اس کے خلاف فیصلہ کرے وہ دوزخی ہے۔

۳۔ جو شخص جہالت کی بنا پر فیصلہ کرے وہ جہنمی ہے۔''[1]

---

[1] سنن ابی داؤد۔ کتاب الاقضیۃ۔ باب فی القاضی یخطئ (حدیث:۳۵۷۳)، سنن ابن ماجۃ۔ کتاب الاحکام۔ باب الحاکم یجتھد فیصیب الحق، (حدیث:۲۳۱۵)۔

جب قلیل و کثیر مالی معاملات میں فیصلہ صادر کرنا اس قدر اہم ہو؛ تو مشاجرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین اور دیگر بہت سارے بڑے بڑے امور میں زبان کھولنا کس قدر نازک کام ہو گا۔

نظر بریں جو شخص جہالت کی بنا پر اپنے علم کے خلاف اس موضوع پر زبان سخن دراز کرتا ہے تو وہ سخت وعید کا مستوجب ہے۔ اور اگر کوئی شخص ہوائے نفس یا معارضۂ حق کے لیے سچی بات کہتا ہے؛ اس کا مقصود اللہ تعالیٰ کی رضامندی نہ ہو؛ یا پھر اس سے کسی دوسری حق بات کو ٹھکرانا چاہتا ہو تو وہ بھی مذمّت و عِقاب کا مستحق ہے۔

جو شخص کتاب و سنت کی روشنی میں صحابہ کے فضائل و مناقب، ان کے جنتی ہونے سے؛ نیز اس بات سے آگاہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے رضامندی کا اظہار کیا؛ اور انہیں جنت کا مستحق قرار دیا؛ اور ان کو اس خیر الامت کے بہترین لوگ قرار دیا ہے جو امت لوگوں کی بھلائی کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ وہ ان یقینی امور کو ترک کر کے درج ذیل مشتبہ امور کو خاطر میں نہیں لائے گا، یہ مشتبہ امور حسب ذیل کیفیت کے حامل ہیں:

۱۔ صحابہ سے متعلق بعض شبہات کی صحت معلوم نہیں۔ ۲۔ بعض شبہات صریح کذب ہیں:

۳۔ بعض کا وقوع پذیر ہونا سرے سے معلوم ہی نہیں۔ ۴۔ بعض شبہات کا عذر سب کے نزدیک مسلم ہے۔

۵۔ بعض امور میں صحابہ کا توبہ کرنا سب کو معلوم ہے۔ ۶۔ بعض برائیوں کو اُنکی نیکیوں نے ڈھانپ رکھا ہے۔

نتیجہ ظاہر ہے کہ جو شخص اہل سنت کی راہ پر گامزن ہو گا وہ مسلک استقامت و اعتدال کا سالک ہو گا، ورنہ شیعہ کی طرح جہالت و ضلالت کی گہری کھائیوں میں جا گرے گا۔ جیسا کہ ان گمراہوں کے حال سے واضح ہے۔

[پہلا اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا راز منکشف کر دیا تھا۔'' اللہ تعالیٰ [اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے] فرماتے ہیں:

﴿وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِیْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَیْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ﴾

[التحریم ۳]

''اور یاد کرو کہ جب نبی نے اپنی بعض عورتوں سے ایک پوشیدہ بات کہی پس جب اس نے اس بات کی خبر کر دی اور اللہ نے اپنے نبی کو آگاہ کر دیا تو نبی نے تھوڑی سی بات تو بتا دی اور تھوڑی سی ٹال گئے پھر جب نبی نے اپنی اس بیوی کو یہ بات بتائی تو وہ کہنے لگی اسکی خبر آپکو کس نے دی کہا سب جاننے والے پوری خبر رکھنے والے اللہ نے مجھے یہ بتلایا ہے۔''

صحیح حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اس سے مراد عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما ہیں۔''[1]

---

[1] البخاري: ٦/ ١٥٦؛ کتاب التفسیر، سور التحریم مسلم: ٢/ ١١١٠؛ کتاب الطلاق، باب في الإیلاء واعتزال النساء...... المسند ط. المعارف: ١/ ٥٢، ٣٠١.

پہلا جواب:.......جن نصوص قرآنیہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی بعض لغزشوں کا ذکر ہے؛ شیعہ ان کی تاویلات کر کے ان کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔ اہل سنت ان کے جواب میں کہتے ہیں کہ: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان سے توبہ کر لی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر کے ان کے درجات بلند کر دیئے۔ شیعہ نے افشائے راز کے بارے میں جو آیت ذکر کی ہے وہ اس نوع کی پہلی آیت نہیں ہے؛ اور دیگر آیات کی طرح اس کی تاویل بھی ممکن ہے۔ اگر اس آیت کی تاویل کرنا باطل ہے تو دوسری آیات کی تاویل بھی باطل ہوگی۔

دوسرا جواب:...... بفرض محال اگر سیدہ عائشہ و حفصہ رضی اللہ عنہما نے کوئی لغزش کی بھی تھی تو حسب ذیل آیت کریمہ کے مطابق اس سے تائب ہوگئی تھیں۔ جیسا کہ قرآن کے اس فرمان سے ظاہر ہے:

﴿اِنْ تَتُوْبَا اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا﴾ (التحریم: ۴)

''اگر تم دونوں اللہ کے سامنے توبہ کر لو (تو بہت بہتر ہے) یقیناً تمہارے دل جھک پڑے ہیں۔''

مذکورہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو توبہ کی دعوت دی ہے۔ سیدہ عائشہ و حفصہ رضی اللہ عنہما کی عظمت شان کے پیش نظر یہ بدگمانی درست نہیں کہ انھوں نے توبہ نہیں کی ہوگی۔ حالانکہ ان کے بلند درجات ثابت شدہ ہیں۔ مزید برآں ان کو یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ آپ جنت میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت سے مشرف ہوں گی۔ نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اختیار دیا تھا کہ دنیا کی زیب و زینت یا اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دار آخرت میں سے جس کو چاہیں منتخب کریں؛ تو انھوں نے اللہ و رسول اور دار آخرت کو دنیا کے مقابلہ میں ترجیح دی۔ انھی خصوصیات کا تقاضا تھا کہ ان کے عوض دوسری ازواج سے نکاح کرنے کو حرام قرار دیا گیا تھا اور ان کے علاوہ دیگر مستورات کو نکاح میں لانے کی بھی ممانعت کر دی گئی تھی۔ جب آپ کا انتقال ہوا تو آپ کی ازواج بنص قرآنی امہات المومنین کا درجہ رکھتی تھیں۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ توبہ نیز اعمالِ صالحہ اور مصائب مکفّرہ سے بھی گناہوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

تیسرا جواب:...... ازواج مطہرات کے بارے میں جن گناہوں کی نشان دہی کی جاتی ہے وہ اسی طرح ہیں جیسے اہل بیت و صحابہ میں سے مشہود لھم بالجنۃ کی جانب بعض گناہوں کی نسبت کی جاتی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

''بنو ہشام بن مغیرہ نے مجھ سے علی کے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح کرنے کی اجازت طلب کی ہے۔ واضح ہو کہ میں اس کی اجازت نہیں دیتا۔ آپ نے تین مرتبہ یہ الفاظ دہرائے البتہ اگر علی چاہے تو میری بیٹی کو طلاق دے کر ان کی لڑکی سے نکاح باندھ لے۔ فاطمہ میرا جگر پارہ ہے، جو چیز اسے ایذا دیتی ہے اس سے مجھے دکھ پہنچتا ہے۔''[1]

یہ سوء ظن بے بنیاد ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ظاہری طور پر بنت ابی جہل سے نکاح کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا،

[1] صحیح بخاری۔ کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ باب ذکر اصھار النبی صلی اللہ علیہ وسلم (ح:۳۷۲۹، ۵۲۳۰)، صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابۃ۔ باب من فضائل فاطمۃ رضی اللہ عنہا (ح:۲۴۴۹)

حق یہ ہے کہ آپ نے خلوص دل سے توبہ کی تھی۔ اسی طرح جب سرور کائنات ﷺ نے صلح حدیبیہ میں کفار کے ساتھ مصالحت کی تو صحابہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''اونٹوں کو نحر کیجیے اور سر منڈا ئیے۔'' یہ حکم سن کر جب کوئی صحابی نہ اٹھا؛ تو آپ ناراض ہو کر ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے۔ تو انھوں نے کہا: جس نے آپ کو ناراض کیا اللہ اسے ناراض کرے۔ آپ نے فرمایا:

''میں کیوں کر ناراض نہ ہوں میں ایک حکم صادر کرتا ہوں اور کوئی شخص اس کی اطاعت نہیں کرتا۔''

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: حضرت! آپ اپنی قربانی منگوا کر ذبح کیجیے، اور حجام کو طلب کر کے سر منڈوایے۔ دوران صلح آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دستاویز سے اپنا نام محو کرنے کا حکم دیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا:

''اللہ کی قسم! میں آپ کا نام نہیں مٹاؤں گا۔'' چنانچہ نبی کریم ﷺ نے دستاویز لے کر اپنا نام مٹا دیا۔ ❶

ظاہر ہے کہ مذکورہ واقعات میں ارشاد نبوی کی تعمیل سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کا اس حد تک پس و پیش کرنا کہ نبی کریم ﷺ ناراض ہو گئے۔ اگر یہ کسی کے نزدیک گناہ ہو تو جو جواب اس کا ہے وہی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ کا جواب ہے۔

بعض لوگ تاویل کی پناہ لے کر کہتے ہیں کہ صحابہ نے تعمیل ارشاد میں اس لیے دیر لگائی کہ ان کو مکہ میں داخل ہونے کی امید تھی۔ دوسرے لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر اس میں تاویل کی گنجائش ہوتی تو آپ کے برہم ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ بخلاف ازیں صحابہ نے بارگاہ ایزدی سے اس تاخیر کی معافی طلب کی تھی۔ حالانکہ بلا توبہ، اعمال صالحہ سے بھی ایسے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تاخیر کرنے والوں میں شامل تھے۔ (رضی اللہ عنہم اجمعین)

[دوسرا اعتراض]: ......شیعہ مصنف نے جو ایک روایت نقل کی ہے؛ جس میں [حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا گیا ہے]:

''تم حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑو گی اور اس پر ظلم کرنے والی ہو گی۔''

جواب: [یہ روایت صریح کذب ہے] حدیث کی کسی بھی معتمد کتاب میں ایسی کوئی روایت نہیں ملتی۔ اور نہ ہی اس روایت کی کوئی معروف سند ہے۔ بلکہ یہ ان موضوع روایات میں سے ہے جو اپنی طرف گھڑ لی گئی ہیں۔ اور انہیں صحیح احادیث کے مشابہ بنا دیا گیا ہے۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے نہیں نکلی تھیں اور نہ ہی آپ کی نیت جنگ کرنے کی تھی۔ بلکہ مسلمانوں کے مابین صلح کرانے کے جذبہ سے باہر نکلی تھیں۔ ❷ ان کا خیال

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الشروط۔ باب الشروط فی الجهاد (حدیث: ۲۷۳۱، ۲۷۳۲)۔

❷ مورخہ ۲۵/ ذوالحجہ ۳۵ھ بروز جمعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ منصب خلافت پر فائز ہوئے۔ مسلمان متوقع تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ پر حد شرعی قائم کریں گے۔ مگر ربیع الاوّل ۳۶ ہجری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ عازم عراق ہوئے۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہم اجمعین کی دلی تمنا یہ تھی کہ ان کے والد مدینہ ہی کو اپنا مستقر قرار دیں۔ (تاریخ طبری: ۵/ ۱۷۱)، قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ زیادہ تر کوفہ و بصرہ کے رہنے والے تھے اور وہ آپ کے لشکر میں شامل تھے۔ کوفہ پہنچ کر ان کی قوت اور بڑھ گئی اور ان کے قبائل ان کی امداد کے لیے تیار ہو گئے۔ تاریخ اسلام کے اوراق اس امر کے زندہ گواہ ہیں کہ حضرت علی قاتلین حضرت عثمان سے براءت کا اظہار فرماتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے ⇦⇦⇦

تھا کہ مسلمانوں کی بہبود و مصلحت کا تقاضا یہی ہے۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ مدینہ سے نکلنا ان کے لیے موزوں نہ تھا۔ چنانچہ ان کی یہ حالت تھی کہ جب بھی مدینہ سے نکلنے کا واقعہ یاد آتا تو اس قدر روتیں کہ دوپٹہ تر ہو جاتا۔ [طبقات ابن سعد(۸/ ۵۸]

سابقین اوّلین صحابہ جنہوں نے اس جنگ میں شرکت کی تھی؛ مثلاً: حضرت طلحہ و زبیر اور علی رضی اللہ عنہم اجمعین ❶ نے بھی اس پر اظہار افسوس کیا تھا۔ جمل کا واقعہ قصداً نہیں بلکہ غیر اختیاری طور پر پیش آیا تھا۔

اس لیے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے درمیان جب مراسلت کا آغاز ہوا اور انہوں نے مصالحت پر اتفاق کرلیا کہ جب بھی انہیں قوت حاصل ہوگی وہ اہل فتنہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے بدلہ لیں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ قتل

⇦⇦ رفقاء قاتلین عثمان رضی اللہ عنہما سے قصاص لینے کی اساس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مفاہمت کے خواہاں تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے رفقاء کے مابین مشہور صحابی قعقاع بن عمرو تمیمی رضی اللہ عنہ صلح کی سعی کر رہے تھے۔ مصالحت سے متعلق مساعی بار آور ہو رہی تھیں۔ اندریں اثناء حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت طلحہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے نام پیغام بھیجا جس میں کہا: قعقاع بن عمرو کے ساتھ آپ نے جو گفتگو کی تھی اگر اس پر قائم رہو تو ذرا انتظار کیجیے تاکہ ہم اتر کر اس معاملہ پر غور کرلیں۔ اس کے جواب میں ہر دو اصحاب نے یہ پیغام بھیجا: ہم نے قعقاع بن عمرو کے ساتھ مصالحت کی جو گفتگو کی تھی ہنوز اس کے پابند ہیں۔'' حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: حضرت علی و عائشہ رضی اللہ عنہما کے رفقاء ہر طرح مطمئن اور پر سکون تھے۔ جب رات ہوئی تو حضرت علی نے عبداللہ بن عباس کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے رفقاء سے بات چیت کرنے کے لیے بھیجا۔ ادھر حضرت عائشہ نے محمد بن طلحہ سجاد کو قاصد بنا کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں روانہ کیا۔ فریقین صلح کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ یہ رات سب راتوں کی نسبت زیادہ اطمینان و عافیت سے گزری۔ دوسری جانب قاتلین عثمان رات بھر جاگتے اور لڑائی کی تدبیریں کرتے رہے۔ آخر یہ طے کیا کہ منہ اندھیرے لڑائی چھیڑ دی جائے۔ چنانچہ رات کی تاریکی میں نکلے اور چپکے سے حضرت علی اور ان کے برادران طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین کے مابین جنگ چھیڑ دی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے رفقاء اس زعم میں مبتلا تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دھوکا دیا۔ دوسری جانب حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ اللہ و رسول اور دین حق کے ساتھ یہ خیانت کرنے والے قاتلین عثمان تھے، جو شیعہ کے اسلاف میں سے ہیں۔ شیعہ ان کی امداد کا دم بھرتے اور ان کی پشت پناہی کرتے تھے۔ دوسری جانب حضرت عثمان سے بغض و عداوت رکھتے اور اس بات کو سرے سے تسلیم ہی نہ کرتے تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ازواج مطہرات حضرت رقیہ و ام کلثوم رضی اللہ عنہم اجمعین سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر نیک اختر تھیں۔ خلاصہ یہ کہ امت محمدی کے صلحاء اس طرح منافقین و اشرار کی بھینٹ چڑھے۔ اب ان کے درمیان اللہ تعالیٰ ہی اپنا فیصلہ صادر فرمائے گا۔ (البدایہ والنهاية:۷/ ۲۳۹)

❶ حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کے حالات زندگی میں امام شعبی رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک وادی میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو پڑے ہوئے دیکھا تو ان کے چہرے سے مٹی پونچھی اور کہا اے ابو محمد! اس بے کسی کی حالت میں آپ کا مردہ پڑا ہوا ہونا مجھ پر بڑا شاق گزرا ہے میں اللہ کے حضور ہی میں اس کا شکوہ عرض کرتا ہوں۔'' نیز کہا: ''اے کاش! میں آج سے بیس سال پہلے فوت ہو جاتا۔'' مستدرك حاكم (۳/ ۳۷۲، ۳۷۳) ، معجم كبير طبرانی (۲۰۲، ۲۰۳) واقعہ جمل کے بعد حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا بیٹا عمران حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اسے خوش آمدید کہا اور اپنے قریب بٹھا کر فرمایا: مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کے والد کو ان لوگوں میں شامل کرے گا جن کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ﴾ (مستدرك حاكم (۳/ ۳۷۷، ۲/ ۳۵۳)۔ حارث بن عبداللہ اعور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زبردست حامیوں میں سے تھا۔ وہ ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ حارث کہنے لگا۔ یہ بات عدل باری تعالیٰ کے منافی ہے کہ ہم عائشہ رضی اللہ عنہا کے رفقاء کو قتل کریں اور وہ جنت میں ہمارے رفیق بھی ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: دفع ہو جاؤ اگر میں اور طلحہ رضی اللہ عنہ جنت میں نہیں جائیں گے تو اور کون جائے گا؟ یہ کہہ کر آپ نے ایک دوات اعور پر کھینچ ماری مگر وار خطا گیا اور وہ دوات اسے نہ لگی۔

عثمان رضی اللہ عنہ پر ہرگز راضی نہ تھے۔ اور نہ ہی آپ نے اس قتل میں کوئی مدد کی۔ آپ حلف اٹھایا کرتے اور فرمایا کرتے تھے: ''اللہ کی قسم! میں نے نہ ہی عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیا اور نہ ہی ان کے قتل کی کوئی سازش کی۔'' آپ اپنی قسم میں سچے تھے۔ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو اندیشہ لاحق ہوا کہ اگر ان لوگوں کا آپس میں اتفاق ہوگیا تو یہ لوگ ہمیں پکڑ کر قتل کر ڈالیں گے۔ انہوں نے رات کی تاریکی میں طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ ان صاحبان نے یہ خیال کیا کہ شاید حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دھوکہ سے ہم پر حملہ کر دیا۔ ان لوگوں نے اپنے دفاع میں جنگ لڑنی شروع کی۔ دوسری جانب حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ انہوں نے اپنے دفاع میں لڑنا شروع کر دیا۔ پس اس وجہ سے یہ فتنہ غیر اختیاری طور پر پیدا ہوا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اونٹ پر سوار تھیں۔ انہوں نے نہ ہی قتال کیا؛ اور نہ ہی جنگ و قتال کا حکم دیا۔ یہ بات کئی ایک مؤرخین نے ذکر کی ہے۔

[تیسرا اعتراض]: شیعہ مصنف کا قول کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے حکم الٰہی ﴿وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی﴾ ''اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ رہو؛ اور پرانی جاہلیت کی سی بے پردگی نہ کرو'' کی مخالفت کی تھی۔

[جواب]: آپ جاہلیت کی سی بے پردگی کرتے ہوئے نہیں نکلیں۔ نیز یہ کہ کسی مامور بہا مصلحت کے لیے گھر سے نکلنا استقرار فی البیوت کے منافی نہیں۔ مثلاً حج و عمرہ کے لیے جانا یا اپنے خاوند کی معیت میں سفر پر روانہ ہونا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سالار رسل صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اور آپ اس کے نزول کے بعد ازواج مطہرات کیساتھ حجۃ الوداع کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اس سفر میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ دیگر امہات المومنین بھی شریک تھیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بھائی عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا۔ آپ ان کے پیچھے ایک ہی اونٹ پر سوار تھیں۔ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے مقام تنعیم سے آپ کو عمرہ کرایا۔[1]

❀ حجۃ الوداع کا واقعہ اس آیت کے نزول کے بعد اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تین ماہ سے بھی کم عرصہ پہلے وقوع پذیر ہوا۔ خلافت فاروقی میں بھی ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم حج کے لیے جایا کرتی تھیں۔ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو بھیجا کرتے تھے۔ جب امہات المومنین کو کسی مصلحت کی بنا پر سفر کی اجازت تھی تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا واقعہ جمل کے لیے اپنے خروج کو بھی مصلحت عامہ پر محمول کرتی تھیں۔

اس کی مثال یہ ہے کہ مندرجہ ذیل آیات و احادیث میں باہمی جنگ و جدال سے منع کیا گیا ہے، لہٰذا معترض کہہ سکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان میں واردشدہ وعید کے مستحق ہیں کیوں کہ آپ مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور آپ نے ان کو مباح الدم قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ (النساء: ۲۹)

---

[1] صحیح بخاری، کتاب العمرۃ، باب عمرۃ التنعیم، (حدیث: ۱۷۸۴، ۱۷۸۵)، صحیح مسلم۔ کتاب الحج۔ باب بیان وجوہ الاحرام (حدیث: ۱۲۱۲، ۱۲۱۳)

''ایمان والو! اپنا مال آپس میں ناروا طریقے سے نہ کھاؤ۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَ لَا تَقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ﴾ (النساء: ۲۹)

''آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔'' اس آیت میں مؤمنین کو باہم جنگ وقتال کرنے سے روکا گیا ہے۔

اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿وَ لَا تَلۡمِزُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ﴾ (الحجرات: ۱۱)

''ایک دوسرے کو طعن نہ دو۔''

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿لَوۡ لَاۤ اِذۡ سَمِعۡتُمُوۡہُ ظَنَّ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتُ بِاَنۡفُسِہِمۡ خَیۡرًا﴾ (النور: ۱۲)

''جب تم نے یہ (واقعہ) سنا تو مومن مردوں اور عورتوں نے اپنے متعلق کیوں نہ نیک گمان کیا۔''

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تمہارے خون تمہارے مال اور تمہاری آبرو تم پر اسی طرح حرام ہے جیسے اس دن کی حرمت اس مہینہ میں اور اس شہر میں۔'' ❶

آپ ارشاد فرماتے ہیں: ''جب قاتل ومقتول تلواریں لے کر لڑنے لگیں تو وہ دونوں جہنمی ہیں۔'' دریافت کیا گیا کہ یارسول اللہ! قاتل تو جہنمی ہوا مقتول کیوں کہ دوزخ میں جائے گا؟ فرمایا: ''وہ بھی تو اپنے حریف کو قتل کرنا چاہتا تھا۔'' ❷

ان آیات واحادیث کی روشنی میں ایک معترض کہہ سکتا ہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے اپنی تلواروں سے مسلمانوں کا استقبال کیا' اور ان کے خون کو مباح قرار دیا' پس آپ اس فعل پر بیان شدہ وعید کے مصداق ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تاویل کرنے والا مجتہد اس وعید کا مصداق نہیں ٹھہرے گا؛ اگرچہ اس سے غلطی ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ مومنوں کی دعا کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذۡنَاۤ اِنۡ نَّسِیۡنَاۤ اَوۡ اَخۡطَاۡنَا﴾ (البقرۃ: ۲۸۶)

''اے ہمارے رب! اگر ہم سے بھول یا چوک ہو جائے تو ہم پر مواخذہ نہ کر۔'' [اللہ فرماتے ہیں] میں نے ایسا کردیا۔

اللہ تعالیٰ نے مومنین کے نسیان وخطاء کو معاف کردیا ہے، خطا کار مجتہد کی خطا بھی معاف ہے۔ جب مومنین سے برسرپیکار ہونے کے بارے میں ان کی خطا معاف ہے تو اجتہاد کی بنا پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا مدینہ سے خروج بالاولیٰ مغفرت کا مستحق ہوگا۔ اگر کوئی معترض بذیل احادیث کو پیش کرے کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

❶ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم ''رب مبلغ اوعی من سامع''(ح:٦٧)، صحیح مسلم، کتاب القسامة، باب القسامة (حدیث: ١٦٧٩)۔

❷ صحیح بخاری، کتاب الایمان باب ﴿وَ اِنۡ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ﴾ (حدیث:٣١) صحیح مسلم، کتاب الفتن، باب اذا تواجه المسلمان بسیفهما، (حدیث:٢٨٨٨)۔

۱۔ ''مدینہ طیبہ گندی اور خبیث چیزوں کو دور کرتا ہے اور پاک و ناپاک کو چھانٹ دیتا ہے۔''❶

۲۔ ''جو شخص بے اعتنائی سے مدینہ منورہ کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے عوض اس سے بہتر آدمی کو مدینہ میں آباد ہونے کی سعادت عطا کرتے ہیں۔''❷

موطأ امام مالک اور صحیحین حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بیشک مدینہ پاکیزہ ہے۔ یہ گندے لوگوں کو ایسے دور کرتا ہے جیسے آگ لوہے کی میل کو دور کردیتی ہے۔''❸

وہ کہے: بیشک حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مدینہ سے خروج کیا' اورسابقہ خلفاء راشدین کی طرح مدینہ میں مقیم نہ رہے۔اسی وجہ سے آپ پر امت کا اجماع نہ ہوسکا۔ [تو شیعہ کا جواب ہوگا کہ]: حضرت علی رضی اللہ عنہ مجتہد تھے۔اگر کوئی علی رضی اللہ عنہ سے کم مرتبہ کا بھی ہوتو مجتہد ہونے کی بناپر وعیدا سے لاحق نہیں ہوسکتی۔تو علی رضی اللہ عنہ اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ یہ وعیدان پر صادق نہ آئے۔پس سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے خروج کا بھی یہی جواب ہے کہ یہ مبنی براجتہاد تھا اور اجتہادی غلطی ازروئے کتاب وسنت معاف ہے۔

[چوتھا اعتراض]: شیعہ مضمون نگار کا یہ کہنا کہ ''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑنے کے لیے نکلی تھیں حالانکہ آپ بے قصور تھے۔''

[جواب]: یہ سیدہ رضی اللہ عنہا پر عظیم افتراء ہے۔آپ جنگ کی نیت سے نہیں نکلی تھیں' اور نہ ہی حضرات طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کے خواہاں تھے۔اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ دونوں گروہ لڑنے کے لیے نکلے تھے تو یہ وہی قتال تھا جس کا ذکر مذکورہ ذیل آیت میں کیا گیا ہے اوراس خطا کو معاف کردیا گیا ہے:

﴿وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدَاهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْءَ اِلٰى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَائَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ﴾

(الحجرات: ۹۔۱۰)

''اوراگر مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دیا کرو پھر اگر ان دونوں میں سے ایک جماعت دوسری جماعت پر زیادتی کرے تو تم اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے

❶ صحیح بخاری، کتاب فضائل المدینۃ۔ باب المدینۃ تنفی الخبث (حدیث: ۱۸۸۳)، صحیح مسلم۔ کتاب الحج۔ باب المدینۃ تنفی خبثھا (حدیث:۱۳۸۳، ۱۳۸۲)۔

❷ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب المدینۃ تنفی خبثھا (حدیث:۱۳۸۱) مطولاً عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ، موطا امام مالک(۲/ ۸۸۷)، کتاب الجامع(ح:٦) عن عروۃ مرسلاً۔

❸ البخارِی:۳/ ۲۲؛ کتاب فضائِلِ المدِینۃِ، باب المدِینۃ تنفِی الخبث؛ ولفظہ:" إِنھا تنفِی الرِجال کما تنفِی النار خبث الحدِیدِ۔"

حکم کی طرف لوٹ آئے اگر لوٹ آئے تو پھر انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور عدل کرو بیشک اللہ تعالی انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔(یاد رکھو) سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں پس اپنے دو بھائیوں میں صلح کرا دیا کرو۔''

اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ مومن باہم لڑنے جھگڑنے کے باوصف مومن ہی رہتے ہیں۔ یہ حکم جب ان لوگوں کے بارے میں ثابت ہے جو ان حضرات صحابہ کرام سے [علم وعمل وایمان میں] کم تر تھے' تو پھر آپ اس حکم کے زیادہ حقدار ہیں۔

[قتل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اجماع کا دعوی اور اس پر رد]:

[پانچواں اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''قتل عثمان رضی اللہ عنہ پر سب مسلمانوں کا اجماع قائم ہوگیا تھا۔''

[جواب]: اس کے جواب میں کئی نکات ہیں:

پہلی وجہ:...... یہ بڑا گھناؤنا جھوٹ ہے۔ اس لیے کہ جمہور نے نہ ہی قتل کا حکم دیا؛ نہ ہی اس قتل میں شریک ہوئے او نہ ہی وہ اس پر راضی تھے۔ علاوہ ازیں اکثر مسلمان مدینہ میں اقامت گزیں نہ تھے۔ بلکہ مختلف دیار وامصار مکہ؛ شام؛ یمن؛ کوفہ؛ بصرہ؛ مصر اور بلاد مغرب سے لے کر خراسان تک آباد تھے۔ اہل مدینہ ان مسلمانوں کا ایک حصہ تھے۔

دوسری وجہ:...... یہ کہ چند شریر اور فتنہ پرور اوباش؛ زمین میں فساد پھیلانے والے آدمی اس فعلِ شنیع کے مرتکب ہوئے تھے، صلحائے امت نہ اس میں شریک تھے؛ اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک نے آپ کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ حلف اٹھایا کر فرمایا کرتے تھے:

''اللہ کی قسم! میں نے نہ ہی عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیا اور نہ ہی ان کے قتل کی کوئی سازش کی۔'' آپ قاتلین عثمان پر بدعا کیا کرتے اور فرمایا کرتے تھے:

''اے اللہ! تو قاتلین عثمان پر بحر وبرّ اور کوہ ومیدان میں لعنت بھیج۔'' ❶

❶ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے متعدد مواقع پر قاتلین عثمان سے براءت کا اعلان کیا اور ان پر لعنت بھیجی، حافظ ابن عساکر (۷/۸۵) کی روایت کے مطابق آپ نے آخری اعلان واقعہ جمل کے موقع پر کیا۔ مورخ مذکور لکھتے ہیں: جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جنگ جمل کے لیے تشریف لے گئیں تو کعب بن سُور ازدی اونٹ کی مہار پکڑے آگے آگے چل رہا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کعب کو مخاطب کر کے کہا: ''مہار کو چھوڑ دیے اور آگے بڑھ کر لوگوں کو قرآن کی طرف بلایے۔'' یہ کہہ کر آپ نے کعب کو قرآن کریم کا ایک نسخہ دیا۔ دوسری جانب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں سبائی پیش پیش تھے۔ انھیں خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں فریقین میں صلح نہ ہو جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی فوج کو پیچھے دھکیل رہے تھے مگر وہ بزور آگے بڑھتے جاتے تھے۔ سبائیوں نے آگے بڑھ کر کعب پر بیک وقت اتنے تیر چلائے کہ وہ موقع پر ہی جان بحق ہو گئے۔ سبائی پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف بڑھے تو آپ نے پہلی مرتبہ ان الفاظ میں ان کو خطاب فرمایا: ارے لوگو! قاتلین عثمان اور ان کے انصار واعوان پر لعنت بھیجیے۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ بصرہ والے چیخ چیخ کر دعا کرنے لگے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا یہ آہ و بکا کیسی ہے؟ جواب ملا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں بددعا کر رہی ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی دعا کرنے لگے۔ آپ نے فرمایا: ''اے اللہ! قاتلین عثمان اور ان کے ہم نواؤں پر لعنت بھیج۔'' ⇦⇦⇦

اس باب میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ: جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مدد کا حق تھا' ایسے ان کی مدد نہیں کی گئی۔ چونکہ لوگوں کا خیال تھا کہ معاملہ آپ کے قتل تک نہیں پہنچے گا۔ ❶ اس لیے انھوں نے آپ کی عملی مدد کرنے میں سہل انگاری سے کام لیا۔ اگر انہیں اس بات کا یقین ہوتا کہ معاملہ اتنا خطرناک ہو جائے گا تو وہ ضرور آپ کے دفاع میں کھڑے ہو جاتے اور اس فتنہ کو روک لیتے۔ بس یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق ہے:

﴿وَ اتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً﴾ [الأنفال ۲۵]

''اور اس فتنہ سے بچو! جو تم میں سے خاص کر صرف ظالموں پر واقع نہ ہوگا......''

اس لیے کہ جب ظالم انسان لوگوں پر ظلم کرتا ہے؛ تو اس کی وجہ سے لوگ فتنہ و آزمائش کا شکار ہو جاتے ہیں' اور وہ لوگ بھی اس کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں جن کا اس ظلم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس وقت بڑے بڑے لوگ اس فتنہ کو رد کرنے سے عاجز آ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر ظالم کو شروع سے ہی روک دیا جائے تو اس فتنہ کا سد باب ہو سکتا ہے۔

تیسری وجہ:......رافضی انتہائی سخت جھوٹے اور بہت بڑے تناقض کا شکار ہیں۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ اجماع

⇐⇐ جب باغیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ کیا تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو آپ کی حفاظت کا حکم دیا اور فرمایا کہ ہر قیمت پر ان کی حفاظت کرنا خواہ تمہاری جان کیوں نہ چلی جائے۔ مگر حضرت عثمان برابر ان کو مدافعت سے منع کرتے رہے۔ حضرت حسن آخری شخص تھے جو سانحہ شہادت کے دن آپ کے گھر سے نکلے۔ حضرت حسن و حسین کے علاوہ عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر اور مروان بن حکم بھی آپ کی حفاظت کے سلسلہ میں حاضر ہوئے تھے۔ مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بتاکید ان سے کہا کہ ہتھیار رکھ کر اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ (دیکھئے: العواصم من القواصم: ۱۳۴)

❶ حافظ ابن عساکر نے کہا کہ جب حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کیا گیا تو بنو عمرو بن عوف نے حضرت زبیر کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا: ''ابوعبداللہ! ہم آپ کی خدمت میں حضرت عثمان کی مدافعت کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔'' ابوحبیبہ کہتے ہیں: حضرت زبیر نے یہ پیغام دے کر مجھے حضرت عثمان کے پاس بھیجا۔'' بعد از سلام ان سے عرض کیجیے کہ تمہارا بھائی زبیر عرض کرتا ہے کہ بنو عمرو بن عوف نے آپ کی مدافعت کے لیے اپنی خدمات کی پیش کش کی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی آپ کے یہاں چلا آؤں تا کہ جو تکلیف آپ کو پہنچے وہ مجھے بھی پہنچے۔ یا بنو عمرو بن عوف کے ذریعہ آپ کی مدافعت کروں جیسے آپ کا ارشاد ہو۔'' ابوحبیبہ کا بیان ہے کہ میں حضرت عثمان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کے یہاں حضرت حسن بن علی، عبداللہ بن عمر، ابوہریرہ،......اور عبداللہ بن زبیر بھی موجود تھے، میں نے حضرت زبیر کا پیغام پہنچایا تو فرمانے لگے: اللہ اکبر! اللہ کا شکر ہے جس نے میرے بھائی زبیر کو محفوظ رکھا۔ میری جانب سے انھیں کہئے: اگر آپ میرے گھر میں تشریف لائیں گے تو آپ کی وہی حیثیت ہوگی جو ایک مہاجر کی ہوتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ مدافعت کے لیے بنو عمرو بن عوف کا انتظار کریں۔'' ابوحبیبہ کہتے ہیں کہ یہ سن کر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اٹھے اور لوگوں کو مخاطب کر کے کہا: میرے ان دو کانوں نے آں حضرت کو یہ فرماتے سنا تھا کہ میرے بعد فِتَن و حوادث ظہور پذیر ہوں گے۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ان سے نجات کی کیا صورت ہوگی؟ آپ نے حضرت عثمان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''امیر (عثمان) اور اسکی جماعت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیے۔'' (مسند احمد (۲/۳٤٥) و فضائل الصحابة، (۷۲۳) مستدرك حاكم (۳/۹۹، ٤/٤۳۳) و صححه و وافقه الذهبی) لوگوں نے عرض کیا ہمیں لڑنے کی اجازت دیجیے، حضرت عثمان نے فرمایا: میں اپنے اطاعت شعاروں کو بتاکید لڑائی سے روکتا ہوں۔ ابوحبیبہ کا بیان ہے کہ بنو عمرو بن عوف کے آنے سے پہلے ہی فتنہ پردازوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔ (سیرۃ ابن ھشام (ص: ۲۲۷۔۲۲۹)، صحیح بخاری کتاب الصلاۃ۔ باب هل تنبش قبور مشركی الجاهلية (ح: ٤۲۸)، صحيح مسلم۔ كتاب الصلاة۔ باب ابتناء مسجد النبی ﷺ (حديث: ٥۲٤)۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل پر نہیں بلکہ آپ کی بیعت وخلافت پر منعقد ہوا تھا۔ ❶ تمام ملک کے رہنے والے آپ کی بیعت پر یک زبان تھے۔ اگر ظاہری اجماع سے دلیل لینا جائز ہے تو پھر واجب ہوتا ہے کہ آپ کی بیعت بھی حق ہو' اس لیے کہ آپ کی بیعت پر تمام لوگوں کا اجماع ہو گیا تھا۔ اگر اس سے استدلال لینا جائز نہیں تو پھر آپ کے قتل پر اجماع کا کہنا کھلم کھلا ایک باطل بات ہے۔ خصوصاً جب کہ آپ کو قتل کرنے والے چند ایک فسادی لوگ تھے۔ پھر اس پر مزیدار بات تو یہ ہے کہ شیعہ آپ کی بیعت خلافت پر اجماع کے منکر ہیں' اور کہتے ہیں: اہل حق نے زبردستی اور خوف کے مارے آپ کی بیعت کی۔ [مگر قتل پر اجماع ثابت کرنے کے چکر میں لگے ہوئے ہیں]۔ اس کے بجائے اگر یوں کہتے کہ: ''اہل حق آپ کے قتل پر متفق تھے: اور اہل حق کو زبردستی آپ کے قتل میں شریک کیا گیا اور وہ اس پر اپنی کمزوری کی وجہ سے خاموش رہے۔ تو پھر بھی ہم کہہ سکتے تھے کہ یہ بات کسی حد تک ممکن ہے۔ اس لیے کہ لوگ یہ بات جانتے ہیں جو کوئی حکومت سے ٹکرا کر تختہ الٹنا چاہتا ہو' عام لوگ اس کی مخالفت کرنے سے ڈرتے ہیں۔ بخلاف اس کے جو کوئی حاکم کی بیعت کرنا چاہتا ہو۔ اس لیے کہ اسے کسی مخالف سے نہیں ڈرایا جا سکتا۔ جیسے کہ اس انسان سے ڈرایا جا سکتا ہے جو کسی کو قتل کرنا چاہتا ہو۔ کیونکہ قتل کا ارادہ رکھنے والے کا شر زیادہ تیز ہوتا ہے' اور وہ خون بہانے میں دریغ نہیں کرتا؛ لوگ اس سے ڈرتے رہتے ہیں۔

[فرض محال شیعہ کی بات تسلیم کرتے ہیں] کہ تمام لوگوں کا آپ کے قتل پر اجماع ہو گیا تھا؛ تو پھر اس کا کیا جواب دو گے کہ جمہور صحابہ کرام آپ کے قتل کا انکار کرتے تھے۔ اور جن لوگوں نے آپ کے گھر میں رہتے ہوئے آپ کا دفاع کیا جیسے حضرت حسن و حسین حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین وغیرہ؛ یہ علیحدہ داستان ہے۔

مزید برآں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر جو اجماع منعقد ہوا ایسا اتفاق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت وخلافت اور قتل عثمان رضی اللہ عنہ پر اور دوسرے کسی معاملہ میں نہیں ہوا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت سے صرف چند اشخاص پیچھے رہے تھے۔ جن میں سے ایک حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے رہ جانے کا سبب معلوم ہے۔ (والله يغفر لهٗ ويرضى عنه)۔ آپ سابقین اولین انصار میں سے ایک نیک فرد تھے جنہیں جنت کی بشارت سنائی گئی تھی۔ جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے واقعہ افک والی روایت میں ہے آپ فرماتی ہیں: '' آپ منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی کا دفاع کرنے لگے۔ اس سے قبل آپ ایک نیک انسان تھے؛ مگر قبائلی حمیت کی وجہ سے ان سے اس حرکت کا ارتکاب ہو گیا۔''

ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ جس آدمی کے لیے جنت کی شہادت دی گئی ہو وہ بعض اوقات گناہ کا مرتکب بھی ہوتا ہے [اس لیے کہ وہ معصوم نہیں]۔ مگر پھر وہ ان سے توبہ کر لیتا ہے؛ یا اس گناہ کو اس کی نیکیاں مٹا دیتی ہیں۔ یا مصائب وآلام اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں؛ یا کوئی دوسرا سبب ایسا پیدا ہو جاتا ہے۔

---

❶ رواه البخاري ٣/ ١٨٦۔ یہ تخریج گزر چکی ہے۔

[گناہ کی سزا سے بچنے کے اسباب]

جب کوئی انسان گناہ کرلیتا ہے تو اس کے لیے اس گناہ کی سزا بچنے کے دس اسباب ہوتے ہیں ۔ تین سبب اس کی ذات سے ؛ تین سبب لوگوں کی طرف سے ؛ اور چار اسباب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ۔ توبہ و استغفار ؛ گناہ مٹانے والی نیکیاں ؛ اس کے لیے مؤمنین کی دعا ؛ نیک اعمال کا ہدیہ ؛ نبی کریم ﷺ کی شفاعت ؛ دنیا میں کفارہ بننے والے مصائب ؛ برزخ اور میدان محشر میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کا فضل اور اس کی جانب سے بخشش ۔

یہاں پر اس بیان سے مقصود یہ ہے کہ : یہ کہ مسئلہ اجماع ظاہر ہے اور اسے سبھی جانتے ہیں ۔ تو پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل جیسے مسئلہ پر کیسے اجماع کا دعوی کیا جاسکتا ہے ؟ بلکہ یہ بات سبھی جانتے ہیں جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر قتال کرنے سے پیچھے رہ گئے تھے وہ تعداد میں ان لوگوں سے کئی گنا بڑھ کر تھے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں شریک ہوئے ۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لوگ تین گروہوں میں بٹ گئے تھے : ایک گروہ جنہوں نے آپ کے ساتھ مل کر قتال کیا ؛ ایک گروہ جو آپ سے برسر پیکار رہا ؛ اور تیسرا گروہ جو نہ آپ کے ساتھ تھے اور نہ ہی آپ کے خلاف ۔ سابقین اولین کی اکثریت اسی گروہ سے تعلق رکھتی تھی ۔ اگر اور کچھ بھی نہ ہوتا صرف وہی لوگ آپ کی بیعت سے پیچھے رہ گئے ہوتے جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے ؛ کیونکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ہمنواؤں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی تھی ۔ وہ تعداد میں ان لوگوں سے کئی گناہ بڑھ کر ہیں جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیا تھا ۔ نیز جو لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کا انکار کررہے تھے وہ بھی ان لوگوں سے تعداد میں کئی گنا بڑھ کر تھے جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی ۔ [تو پھر اگر] یہ کہنا باطل ہے کہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ پر متفق ہوگئے تھے ؛ پھر یہ کہنا بھی سب سے بڑا باطل ہے کہ لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل پر متفق ہوگئے تھے ۔

اگر یہ کہنا جائز ہے کہ لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل پر جمع ہوگئے تھے ؛ کیونکہ یہ واقع پیش آیا اور آپ کا دفاع نہیں کیا جاسکا ۔ تو پھر معترض کا یہ قول بھی بجا ہے کہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کرنے پر اور آپ کی بیعت سے پیچھے رہنے پر متفق ہوگئے تھے ؛ بلکہ اس قول کا جواز سب سے بڑھ کر ہے ۔ اس لیے کہ یہ واقعہ بھی پیش آیا ؛ مگر اس کا دفاع نہیں کیا گیا ۔

اگر یہ کہا جائے کہ : جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے ان کے لیے ممکن نہیں تھا کہ لوگوں پر آپ کی بیعت کو لازم کریں ۔ اور ان سب کو آپ کے جھنڈے کے نیچے جمع کردیں ؛ اور انہیں آپ سے جنگ کرنے سے روکیں ۔ اس لیے کہ وہ اس سے عاجز آگئے تھے ۔ تو پھر اس کا جواب دیا جائے گا کہ : محاصرہ کے وقت جو لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے ' ان کے لیے بھی آپ کا دفاع کرنا ممکن نہ رہا ۔

اگر یہ کہا جائے کہ : حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں سے تقصیر ہوئی ؛ اور وہ عاجزی کی وجہ سے جنگ پر قابو نہ پاسکے ؛ یا ان پر وہ لوگ غالب آگئے جو جنگ کرنا چاہتے تھے ۔ یا وہ لوگوں کو آپ کی بیعت پر جمع کرنے میں ناکام رہے ۔

تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ:''جو لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے؛ ان سے بھی ایسے ہی کوتاہی و تقصیر ہوئی؛ یہاں تک فتنہ پرداز آپ کو قتل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ پھر یہ دعوی کرنا یہ ایک کھلا ہوا واضح جھوٹ ہے کہ لوگوں کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل اجماع ہوگیا تھا؛ حالانکہ جمہور امت اس کا انکار کرتی ہے؛ اور لوگ آپ کی مدد کے لیے اور پھر بعد میں آپ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

شیعہ مصنف کا یہ قول اس کی جہالت کا آئینہ دار ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل پر اجماع منعقد ہوا تھا۔ یہ تو بعینہٖ اسی طرح ہے جیسے ناصبی کہتے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے اجماع کے مطابق قتل کیے گئے تھے۔ وہ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ لڑنے والوں اور آپ کو قتل کرنے والوں میں سے کسی نے بھی آپ کی مدافعت نہیں کی تھی۔ ❶

اس قول میں ناصبی اتنے ہی جھوٹے ہیں جتنے شیعہ اپنے اس دعویٰ میں کہ قتل عثمان رضی اللہ عنہ پر اجماع منعقد ہوا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ قتل عثمان رضی اللہ عنہ کی مذمت قتل حسین رضی اللہ عنہ سے زیادہ کی گئی ہے۔

علاوہ ازیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تائید و نصرت اور ان کے قصاص کا مطالبہ ❷ کرنے والے لوگوں کی تعداد حامیانِ حسین سے بہت زیادہ تھی۔ ❸ قتل عثمان رضی اللہ عنہ سے امت میں جو شر و فساد پھیلا؛ قتل حسین رضی اللہ عنہ کے فتنہ کو اس سے کوئی نسبت

❶ حالانکہ آپ کو شیعی ماحول (عراق) میں قتل کیا گیا تھا۔ وہ شیعہ جو کرۂ ارضی کے دور افتادہ گوشوں سے چل کر آپ کے مقتل پر جمع ہوتے ہیں یہی آپ کو دھوکہ دینے والے تھے۔ پہلے بڑے زور و شور سے خط لکھ کر بلایا۔ جب آپ تشریف لے آئے تو آپ کا ساتھ چھوڑ کر صفِ اعداء میں شریک ہوگئے۔ استاد موسیٰ یعقوبی نجفی ایک معاصر شیعہ ادیب لکھتا ہے:

قَدْ كَاتَبَتْهُ أُولُوا الْخِيَانَةِ أَنَّهَا جُنْدٌ وَلَيْسَ لَهَا سِوَاهُ إِمَامُ

خیانت کار لوگوں نے آپ (حضرت حسین) کو لکھا تھا کہ ہم آپ کے مددگار ہیں اور آپ کے سوا ہمارا کوئی امام نہیں۔''

لٰكِنَّهُمْ خَانُوْا الذِّمَامَ وَلَمْ يَفُوْا أَنّٰى وَمَا لِلْخَائِنِيْنَ ذِمَامُ

''مگر انھوں نے اپنے عہد میں خیانت کی اور اسے پورا نہ کیا اور خیانت پیشہ لوگ عہد کے پابند ہی کب ہوتے ہیں۔''

اگر شیعہ خود فریبی کا شکار نہ ہوتے تو وہ اپنے گھروں میں مقیم رہتے اور خط لکھ کر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو دعوت نہ دیتے تو لوگوں کا خون ضائع ہونے سے بچ جاتا اور امت اس عظیم فتنہ میں مبتلا نہ ہوتی۔ اپنی قدر نہ جاننے کا یہ ثمرہ برآمد ہوا کہ شیعہ تا قیامِ قیامت یہ داغ دور نہ کر سکیں گے۔ حضرت زینب بنت علی رضی اللہ عنہا جب عاشوراء کے بعد کوفہ میں داخل ہوئیں اور اہالیان کوفہ حضرت زینب اور ان کے بھائی کا خوشامدانہ الفاظ میں استقبال کرنے نکلے تو انھوں نے اس وقت یہی الفاظ کہے تھے۔ مزید براں حضرت حسین سے خیانت کرنے والے شیعہ بعد میں آنے والے شیعہ سے بہر حال بہتر تھے۔

❷ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فوج میں طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما جیسے گرامی قدر صحابہ شامل تھے، جو عشرہ مبشرہ میں شمار ہوتے ہیں، اور جن کا مقصد وحید قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مصالحت کرنا تھا۔ جنگ صفین انہی مقاصد کی جدو جہد کے دوران وقوع میں آئی تھی۔

❸ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے سب سے پہلے ذاتِ باری تعالیٰ نے انتقام لیا۔ تفصیلات ملاحظہ فرمایئے:

ا۔ جہجاہ بن سعید غفاری: یہ وہ بد بخت ہے کہ جب حضرت عثمان مسجد نبوی کے منبر پر خطبہ دے رہے تھے تو اس نے عصائے نبوی آپ کے ہاتھ سے چھین لیا اور اس زور سے آپ کے دائیں گھٹنے پر مارا کہ عصا ٹوٹ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے بہت جلد اس سے انتقام لیا۔ عصائے نبوی کا ایک ٹکڑا اس کے زانو میں گڑ گیا اور اس میں کیڑے پڑ گئے پھر پتہ نہ چل سکا کہ اس کا کیا انجام ہوا۔ ظن غالب ہے کہ وہ⇐ ⇐ ⇐

ہی نہیں ۔اس پر مزید یہ کہ قتل عثمان رضی اللہ عنہ قباحت و شناعت کے اعتبار سے اللہ، رسول اور مومنین کے نزدیک قتل حسین رضی اللہ عنہ سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ اس لیے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سابقین اوّلین اور حضرت علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین کے طبقہ سے تعلق ⇦⇦⇦

اسی تکلیف سے جہنم رسید ہوا۔

۲۔ حرقوص بن زہیر سعدی: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مخالفت کے بعد اس نے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ پر خروج کیا تو آپ نے یوم النہروان ۳۹ ہجری میں اسے مروا ڈالا۔

۳۔ حکیم بن جبلہ عبدی: جنگ جمل میں اس کا پاؤں کٹ گیا تھا۔قریب الموت تھا کہ کسی نے ان الفاظ میں پکارا امام مظلوم پر مظالم ڈھانے کی بنا پر جب اللہ کی گرفت میں آئے ہو تو اے خبیث! اب چلا رہے ہو، تم نے مسلمانوں کے شیرازہ کو منتشر کیا اور ناحق خون بہائے۔اب انتقام الٰہی کا مزہ چکھو۔"

۴۔ ذریح بن عباد عبدی: یہ حکیم بن جبلہ عبدی کا رفیق کار تھا جنگ جمل میں مارا گیا۔

بصرہ کے قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ میں سے جو جنگ جمل میں زندہ بچ گئے تھے ان کے قبیلہ والے پکڑ کر ان کو کتوں کی طرح طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں لائے اور وہ سب تہ تیغ کر دیے گئے۔ بصرہ والوں میں سے صرف حرقوس بن زہیر بچا تھا۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے یوم النہروان میں قتل کیا۔

۵۔ جندب بن زہیر غادری: معرکہ صفین میں قبیلہ ازد کے ایک شہسوار کو للکارا تو ازدی نے اسے قتل کر دیا۔اسکا خالہ زاد بھائی مخنف بن سُلَیم کہا کرتا تھا کہ جندب بچپن میں بھی اور بڑا ہو کر بھی دونوں حالتوں میں منحوس تھا۔ جاہلیت و اسلام دونوں اَدوار میں جندب ہمیشہ بری چیز کا انتخاب کیا کرتا تھا۔

۶۔ ابوزینب بن عوف: یہ ۳۷ ہجری میں معرکہ صفین میں مارا گیا۔

۷۔ شریح بن اوفیٰ عَبَسی: اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا تھا۔ پہلے اس کا پاؤں کاٹا گیا اور پھر قتل کیا گیا۔ بوقت قتل اس نے یہ اشعار پڑھے:

اَضْرِبُهُمْ وَلَوْ اَرٰی اَبَا حَسَنٍ ضَرَبْتُهٗ بِالسَّيْفِ حَتّٰى يَطْمَئِنَّ
اَضْرِبُهُمْ وَلَوْ اَرٰی عَلِيًّا اَلْبَسْتُهٗ اَبْيَضَ مُشْرِقِيًّا

"میں ان کو مارتا رہوں گا اور اگر کہیں علی کو دیکھ پایا تو اس کو ضرور تلوار ماروں گا۔ یہاں تک کہ وہ ٹھنڈا ہو جائے۔میں ان کو مارتا جاؤں گا اور اگر علی کو دیکھ لیا تو میں اس کو صیقل شدہ مشرقی تلوار کا لباس پہناؤں گا۔"

۸۔ علباء بن ہُشَیم سدوسی: عمرو بن یثربی قاضی بصرہ نے اسے جنگ جمل میں قتل کیا۔

۹۔ عمرو بن حمق خزاعی: ۵۱ ہجری تک زندہ رہا پھر موصل میں اسے نیزے کی اتنی ہی ضربیں لگیں جتنی اس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لگائی تھیں۔

۱۰۔ عمیر بن ضابی: یہ وہ بدبخت ہے جس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کی پسلی توڑ دی تھی۔ جب حجاج عراق کا حاکم قرار پایا تو یہ اس کی خدمت میں حاضر ہو کر رحم و کرم کا طالب ہوا۔اس کا خیال تھا کہ حجاج اس سے واقف نہیں۔حجاج نے کہا کیا تو وہی شخص نہیں جس نے یہ شعر کہا تھا:

هَمَمْتُ وَلَمْ اَفْعَلْ وَكِدْتُّ وَلَيْتَنِیْ تُرِكْتُ عَلٰی عُثْمَانَ تَبْكِیْ حَلَائِلُهٗ

"میں نے (قتل عثمان کا) ارادہ کیا تھا مگر یہ کام نہ کر سکا اے کاش! مجھے اس معاملہ میں کھلی چھٹی ملتی تو عثمان رضی اللہ عنہ کی بیویاں ان پر رونے لگتیں۔" پھر حجاج کے حکم سے اس کو قتل کر دیا گیا۔

۱۱۔ کعب بن ذی الحبکہ نَہدی: بسر بن ابی ارطاۃ نے اس کو قتل کیا۔ ⇦⇦⇦

رکھتے تھے۔ آپ خلیفۂ برحق تھے اور آپ کی خلافت پر مسلمانوں کا اجماع منعقد ہوا تھا۔ آپ نے کسی مسلمان پر تلوار اٹھائی نہ کسی کو موت کے گھاٹ اتارا۔ آپ کی ساری عمر جہاد کفار میں بسر ہوئی۔ خلافت صدیقی و فاروقی کی طرح خلافت عثمانی میں بھی مسلمانوں کی تلوار اہل قبلہ سے الگ تھلگ اور کفار کے سر پر آویزاں اور اہل قبلہ سے ہر لحاظ سے دور رہی۔

حالت خلافت میں شر پسندوں نے آپ کو قتل کرنا چاہا تو آپ نے صبر سے کام لیا ❶ اور مزاحمت نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے جام شہادت نوش فرمایا۔ ❷ اس میں شبہ نہیں کہ حضرت عثمان، حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی نسبت زیادہ اجر وثواب کے مستحق ہیں۔ اسی نسبت سے قاتلین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والوں کی نسبت بڑے مجرم ہیں۔ اور ان کا گناہ زیادہ گھناؤنا ہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ آپ اقتدار سے محروم تھے اور طلب اقتدار کی خاطر گھر سے نکلے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ برسر اقتدار تھے ان کے اعوان و انصار آپ کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور آپ نے

۱۲۔ کنانہ بن بشر تُجیبی: حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے مصر میں اسے قتل کیا۔ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا شدید مخالف تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں جو لوگ قتل کیے گئے تھے۔ یہ ان کو دفن کرنے سے روکتا تھا۔

۱۳۔ ابن الکوّاء یشکری: اس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف بھی خروج کیا تھا اور قتل ہوا۔

۱۴۔ محمد بن ابی حذیفہ: اس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے احسانات کی ناشکری کی۔ سزا کے طور سے یہ ۳۶ ہجری میں بمقام عریش مقتول ہوا۔'' علی ہذا القیاس قاتلین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آخرت سے پہلے دنیا میں ہی اپنے کیے کی سزا پالی تھی۔ قاتلین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں سے جو لوگ پیش پیش تھے ان کے انجام سے بچے بھی آگاہ ہیں۔

❶ جب باغیوں نے مدینہ طیبہ کا رخ کیا تو اس وقت عساکر اسلامی مختلف بلاد شرق و غرب میں کفار کے خلاف مصروف جہاد تھیں۔ اسلامی لشکر زیادہ تر ان ممالک میں برسر پیکار تھے جو آج کل روس کے زیر تسلط ہیں۔

❷ محبّ الدین الخطیب ''العواصم من القواصم'' ص: ۱۳۲ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ: ''اخبار و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ باغیوں کی مدافعت کرنے یا تقدیر ربانی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے بارے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ وارضاہ کا موقف یہ تھا کہ آپ فتنہ پردازی اور خون ریزی سے ڈرتے تھے۔ آخر کار آپ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اگر آپ ایسی قوت سے بہرہ ور ہوں جس کے سامنے باغیوں کو لامحالہ جھکنا پڑے اور جدال و قتال کی نوبت نہ آئے تو یہ بڑی اچھی بات ہے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ملک شام سے ایک ایسی فوج بھیجنے کی پیش کش کی تھی جو آپ کے اشارہ کی منتظر رہے، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ پیش کش ٹھکرا دی تھی کہ میں مدینہ میں ایسی فوج نہیں رکھنا چاہتا جو یہاں مقیم رہے۔ (تاریخ طبری: ۵/ ۱۰۱)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ مسلمان اس حد تک جرأت نہیں کر سکتے کہ دین اسلام کے اوّلین مہاجر (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کا خون تک بہانے سے گریز نہ کریں۔ جب باغی اکٹھے ہو کر آ گئے اور آپ نے سمجھا کہ مدافعت کرنے میں ناحق خون ریزی ہوگی، تو آپ نے اپنے حامیوں کو بہ تاکید تشدد سے روک دیا۔ اہل سنت و شیعہ سب کی تصانیف ایسے اخبار و آثار سے پُر ہیں۔ تاہم اگر ایسی منظّم قوت و شوکت بروئے کار آتی جو باغیوں کی شرارت و جہالت کو بزور روک دیتی تو یہ بات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے راحت و مسرت کی موجب ہوتی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ آپ شہادت کے متمنی تھے اور اس کے سوا کوئی چیز آپ کے لیے موجب سکون واطمینان نہ تھی۔

اپنی مدافعت کرتے ہوئے شہادت پائی۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ جو شخص اپنی خلافت و ولایت کا دفاع کرنا چاہتا ہے وہ اس شخص کی نسبت لڑنے کا زیادہ حق دار ہے جو دوسروں سے اقتدار کو چھیننے کا خواہاں ہو۔ اس پر مزید یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت سے دفاع بھی نہیں کیا تھا۔ بنا بریں آپ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے ہر حال میں افضل ہیں اور آپ کا قتل قتلِ حسین سے شنیع تر ہے۔ جیسے حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اقتدار کے لیے جنگ نہیں لڑی تھی بلکہ جدال وقتال سے کنارہ کش رہ کر امت میں صلح کرائی تھی۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح جوئی کے اس اقدام پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی مدح وستائش کرتے ہوئے فرمایا:

''میرا یہ بیٹا سردار ہے، اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے گا۔'' ❶

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حامی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور اہل شام تھے۔ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص لینے والے مختار بن ابی عبید ثقفی اور اس کے اعوان و انصار تھے۔ کوئی سلیم العقل آدمی یہ بات کہنے میں تامل نہیں کرے گا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، مختار ثقفی ❷ سے افضل تھے، مختار کذاب تھا اور اس نے نبوت کو دعویٰ بھی کیا تھا۔

---

❶ صحیح بخاری ۔ کتاب الصلح۔ باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم للحسن بن علی رضی اللہ عنہما (حدیث:۲۷۰٤)

❷ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی طرف سے شیعہ کے جواب میں یہ بات الزاماً کہی گئی ہے ورنہ مختار کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے کیا نسبت؟ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خلفاء راشدین کے بعد پہلے قابل فخر خلیفہ تھے۔ حافظ ابن کثیر البدایۃ والنہایۃ :۱۳۳/۸) پر مصر کے مشہور امام اور عالم لیث بن سعد المتوفی ۱۷۵ ہجری سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد اس گھر والے (حضرت معاویہ) سے زیادہ کسی کو حقوق کا پورا کرنے والا نہیں دیکھا۔'' حافظ ابن کثیر کتاب مذکورہ (۱۳۵/۸) پر عبد الرزاق بن ہمام صنعانی سے جو بڑے عالم و حافظ تھے روایت کرتے ہیں، انھوں نے معمر بن راشد سے اور معمر نے ہمام بن منبہ صنعانی سے جو ثقات تابعین میں سے تھے، سنا انھوں نے کہا کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ:'' میں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما سے بڑھ کر کسی شخص کو حکومت وسلطنت کا اہل نہیں دیکھا۔''

ظاہر ہے کہ سلطنت کی اہلیت وصلاحیت اسی شخص میں ہوتی ہے جو حکیم، حلیم اور عادل ہو۔ ملک کا دفاع کرتا اور دین اسلام کی نشرو اشاعت کے لیے کوشاں رہتا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ جو امانت اللہ نے اس کو تفویض کی ہے، اس میں خیانت کو راہ نہ دیتا ہو۔ امام ترمذی ابو ادریس خولانی سے روایت کرتے ہیں : جب عمر رضی اللہ عنہ نے عمیر بن سعد انصاری کو حمص کی ولایت سے معزول کر کے ان کی جگہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا تو لوگوں نے ازراہِ تعجب یہ کہنا شروع کیا۔ ''عمیر جیسے آدمی کو معزول کر کے معاویہ کو مقرر کیا۔'' (سنن ترمذی، باب مناقب معاویۃ بن ابی سفیان (ح:۳۸۴۳)۔

علامہ بغوی معجم الصحابہ میں لکھتے ہیں کہ عمیر کو لوگ '' نَسِیْجُ وَحْدِہٖ'' (اپنی مثال آپ) کہا کرتے تھے۔ ابن سیرین رحمہ اللہ کا قول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کثرت زہد کی وجہ سے عمیر کو یہ نام دیا تھا۔ عمیر نے لوگوں کی یہ گفتگو سن کر کہا:'' معاویہ کا ذکر اچھے انداز میں کیجیے میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ اے اللہ معاویہ کے ذریعہ لوگوں کو ہدایت عطا فرما۔'' (سنن ترمذی، باب مناقب معاویۃ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ (ح:۳۸۴۳)

بعض روایات میں ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں یہ شہادت خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دی تھی۔ بشرط صحت حضرت فاروق کی شہادت سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی عظمت وفضیلت ثابت ہوتی ہے، تاہم اگر یہ شہادت دینے والے عمیر ہوں......اس کے باوصف کہ آپ کو معزول کر کے حضرت معاویہ کو ان کا قائم مقام بنایا گیا تھا......تو بھی اس شہادت کا درجہ حضرت عمر کی گواہی سے کم نہیں ہے، اس ⇦ ⇦ ⇦

احادیث صحیحہ میں وارد ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا:

⇦⇦⇦ لیے کہ عمیر اصحاب رسول اور زہاد انصار میں سے تھے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح کی کتاب ''مناقب الصحابہ'' میں ابن ابی ملیکہ تمیمی سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا گیا کہ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ ایک وتر پڑھتے ہیں۔ یہ سن کر انھوں نے فرمایا: ''معاویہ رضی اللہ عنہ فقیہ ہیں۔'' (صحیح بخاری۔ باب ذکر معاویۃ رضی اللہ عنہ، حدیث:٣٧٦٥)

عبدالرحمٰن بن ابی عمیرہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ دعا فرمائی: "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْہُ ھَادِیًا مَّھْدِیًّا وَاھْدِبِہٖ" (سنن ترمذی۔ کتاب المناقب۔ باب مناقب معاویۃ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ (ح: ٣٨٤٢)

عبدالرحمٰن بن ابی عمیرہ سے کہ نبی ﷺ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں یہ دعا فرمائی: ''اَللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ الْکِتَابَ وَالْحِسَابَ وَقِہِ الْعَذَابَ'' (معجم کبیر طبرانی (١٨/٢٥٢)

مذکورہ بالا روایت امام بخاری نے اپنی تاریخ میں ابومسہر سے نقل کی ہے۔ (تاریخ کبیر بخاری (٧/٣٢٧)، امام احمد یہی روایت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ (مسند احمد (١٢٧/٤)، صحیح ابن حبان (٢٢٧٨: الموارد) مفسر ابن جریر اسے ابن مہدی سے روایت کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں مندرجہ ذیل محدثین نے یہ روایت اپنی تصانیف میں نقل کی ہے:

۱۔ اسد بن موسیٰ المتوفی ۱۳۲۔۲۱۲ ہجری جن کو ''اسد السنہ'' کہا جاتا تھا۔

۲۔ بشر بن السری الافواہ البصری (۱۳۲۔۱۹۵) یہ امام احمد کو استاد تھے ان کی روایت میں "اَدْخِلْہُ الْجَنَّۃَ" کے لفظ بھی ہیں۔

۳۔ عبداللہ بن صالح مصری یہ امام لیث بن سعد کے کاتب تھے۔

۴۔ ابن عدی وغیرہ نے یہ روایت ابن عباس سے نقل کی ہے۔

۵۔ محمد بن سعد۔ صاحب الطبقات یہ روایت مسلمہ بن مخلد فاتح و امام مصر سے بیان کرتے ہیں۔

حضرت معاویہ کے بارے میں مذکورہ دعائے نبوی کے ناقل لاتعداد صحابہ ہیں۔ (دیکھیے البدایۃ النہایۃ: ٨/ ١٢٠۔ ١٢١) نیز ترجمہ معاویہ حرف المیم تاریخ دمشق حافظ ابن عساکر)۔

مذکورۃ الصدر روایات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ حضرت معاویہ ہدایت یافتہ اور لاتعداد فضائل و مناقب کے حامل تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے مقابلہ میں شیعہ کے مفروض مہدی کی کیا حقیقت جو نہ ابھی پیدا ہوا اور نہ اس سے کوئی اس سے مستفید ہو سکا۔ جو شخص دانستہ ان احادیث کو تسلیم نہ کرے وہ حدیث نبوی کا منکر ہے مقام حیرت ہے کہ بعض شیعہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر لعنت بھیجنے اور ان سے بغض و عداوت رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو مسلمان قرار دیتے ہیں ان کو دراصل نبی کریم ﷺ سے بغض رکھنا چاہئے کہ آپ نے حضرت معاویہ کے حق میں ایسی دعا کیوں فرمائی: ''بے حیا باش ہر چہ خواہی کن''

حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ امام ابوزرعہ رازی رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص نے ان سے کہا: ''میں معاویہ سے بغض رکھتا ہوں۔'' تو ابوزرعہ رحمہ اللہ نے کہا: ''معاویہ کا رب بڑا رحیم و کریم ہے اور آپ کے حریف (حضرت علی) بھی بڑے شریف آدمی تھے۔ تم دونوں کے درمیان مداخلت کرنے والے کون ہو۔''

امام بخاری اپنی صحیح میں جو قرآن کریم کے بعد اس کرۂ ارضی پر صحیح ترین کتاب ہے نیز امام مسلم اپنی صحیح کی کتاب ''الامارۃ'' میں نبی کریم ﷺ کے خادم حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب نبی ﷺ مقام قباء میں تشریف لے گئے اور انس کی خالہ ام حرام بنت ملحان کے یہاں قیلولہ فرمایا تو آپ ہنستے ہوئے بیدار ہوئے۔ آپ نے خواب میں دیکھا کہ آپ کی امت کے کچھ لوگ تاج و تخت سے آراستہ اعداء دین سے بحری جنگ لڑ رہے ہیں آپ پھر سو گئے اور وہی خواب دیکھا ام حرام نے کہا: یارسول اللہ! دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان مجاہدین میں شامل کر دے۔ آپ نے فرمایا تو پہلے مجاہدین میں شامل ہے۔'' (صحیح بخاری کتاب الاستئذان۔ باب من زار قوماً فقال عنہا (حدیث: ٦٢٨٣، ٦٢٨٢)، صحیح مسلم۔ کتاب الامارۃ ۔ باب فضل الغزو فی البحر (حدیث:١٩١٢) حافظ ابن کثیر "البدایۃ والنہایۃ" (٣٢٩/٨) پر لکھتے ہیں: ''حدیث میں جس غزوہ کی پیش گوئی کی گئی ہے اس سے مراد وہ بحری ⇦⇦⇦

''ثقیف کے قبیلہ میں ایک کذاب اور ایک قاتل ہوگا۔'' ❶

کذاب سے مختار مراد ہے اور قاتل سے مراد حجاج بن یوسف۔ مختار کا والد ابوعبید ثقفی بڑا نیک آدمی تھا اس نے مجوس سے لڑتے ہوئے شہادت پائی۔ مختار کی بہن صفیہ بنت ابی عبید حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں۔ یہ بڑی نیک دل خاتون تھیں۔ جب کہ مختار بدترین شخص تھا۔

[قتل عثمان میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شراکت کا الزام اور اس پر رد:]

[چھٹا اعتراض]: ......شیعہ کا یہ قول کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرانا چاہتی تھیں اور اسی سازش میں شریک رہا کرتی تھیں۔ اور کہا کرتی تھیں: ''بوڑھے احمق کو قتل کردو۔'' وہ ہمیشہ دعا کیا کرتی تھیں: ''اللہ اس بیوقوف بوڑھے کو قتل کرے۔'' ❷

⇦⇦⇦ لڑائی ہے جو ۲۷ ہجری میں حضرت عثمان کی خلافت کے زمانہ میں حضرت معاویہ کے زیر قیادت لڑائی لڑی گئی اور جس میں آپ نے جزیرہ قبرص کو فتح کیا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کیلئے یہ فخر کیا کم ہے کہ آپ اوّلین اسلامی بحری بیڑے کے بانی تھے۔ یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں شامل ہے کہ ام حرام رضی اللہ عنہا جس نے مجاہدین کے زمرہ میں شریک ہونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور آپ نے اس کو پہلے مجاہدین میں شمولیت کی بشارت دی تھی امیر معاویہ کے بحری بیڑہ میں شریک تھیں ان کے خاوند حضرت عبادہ بن صامت اور دیگر صحابہ میں سے ابودرداء اور ابوذر رضی اللہ عنہما بھی رفیق لشکر تھے۔ ام حرام نے اسی جگہ وفات پائی اور آج تک آپ کی قبر قبرص میں موجود ہے۔ حافظ ابن کثیر مزید فرماتے ہیں:

''غزوہ قسطنطنیہ کے موقع پر دوسرے لشکر کی قیادت کا شرف یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آیا جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے خواب کی تعبیر بروئے کار آئی۔ یہ آپ کی رسالت کی صداقت کے عظیم دلائل میں سے ایک ہے۔''

عباسی خلافت میں تملق و خوشامد کا دور دورہ تھا۔ اور لوگ بنو امیہ کے محاسن کو معائب کا رنگ دے کر عباسی خلفاء کی خوشنودی حاصل کرتے تھے اسی دوران میں چند طالب علم امام الائمہ سلیمان بن مہران الاعمش کوفی رحمہ اللہ کے یہاں جمع ہو کر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے عدل و انصاف کا ذکر کرنے لگے یہ سنکر امام اعمش بولے: ''اگر تم امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت دیکھ لیتے تو پھر کیا ہوتا۔'' طلبہ نے عرض کیا: ''کیا آپ کی مراد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حلم اور بردباری سے ہے۔'' فرمایا اللہ کی قسم! نہیں بلکہ آپ عدل و انصاف میں یکتا تھا۔''

امام اعمش مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے کہا: ''اگر تم حضرت معاویہ کو دیکھ لیتے تو کہتے کہ یہی مہدی ہیں۔''

یونس بن عبید قتادہ بن دعامہ سدوسی رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ اس نے کہا: ''اگر تم حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے کام کرنے لگو تو اکثر لوگ کہنے لگیں کہ تم ہی مہدی ہو۔'' ابواسحاق السبیعی نے ایک دن حضرت معاویہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا: ''اگر تم ان کا زمانہ پا لیتے تو کہتے کہ یہی مہدی ہیں۔''

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی تصنیف کتاب الزہد میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا نام زہد میں ضرب المثل کے طور پر بیان کیا ہے۔ محی الدین خطیب نے کتاب ''العواصم من القواصم'' کے حواشی پر اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ ایک طرف امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی یہ اصلی تصویر ہے جو صلحائے امت محمدی سے منقول ہے۔ دوسری جانب شیعہ کی پیش کردہ جعلی تصویر ہے جو فساق و فجار نے اپنی پر از ضلالت کتب میں امت محمدی کے لاتعداد لوگوں کو مبتلائے فریب کرنے کے لیے وضع کی ہے۔ (فَاللّٰهُ حَسِيْبُهُمْ وَ هُوَ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ)

❶ صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابۃ۔ باب ذکر کذاب ثقیف و مبیرھا (حدیث: ۲۵۴۵)

❷ یہ شیعہ کا وضع کردہ جھوٹ ہے۔ نعثل کا لفظ صرف قاتلین عثمان کی زبان پر جاری ہوا۔ قاتلین عثمان میں سے اوّلین شخص جس

جب عائشہ رضی اللہ عنہا کو قتل عثمان رضی اللہ عنہ کی خبر پہنچی تو بہت خوش ہوئیں۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جواب] :ا۔پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس روایت کی دلیل پیش کیجیے۔

دوسری بات:......جو چیز اماں عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہے' وہ اس رافضی دعوی کو رد کرتی ہے۔ اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ حضرت کے قتل پر سخت انکاری تھیں۔ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو مذمت اور نفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھتیں اور اس میں شرکت کرنے والوں کو......خواہ ان کا بھائی محمد بن ابوبکر ہو یا کوئی اور مذموم قرار دیتی تھیں۔ انہوں نے اپنے بھائی محمد بن ابوبکر اور مشارکین قتل عثمان رضی اللہ عنہ پر بد دعا کی تھی۔

[غلط فہمی کی بنا پر اہل حق کا باہم کفر ونفاق کا فتوی]:

تیسری بات:......فرض کیجیے صحابہ میں سے کوئی......حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہوں یا کوئی اور......غصہ کی حالت میں کوئی ایسی بات کہے؛ اس لیے کہ وہ بعض خرابیوں کا انکار کرنا چاہتا ہو' تو اس کی بات کیوں کر حجت ہوسکتی ہے۔ [1] اس سے نہ کہنے والے کی شان میں کوئی فرق آتا ہے نہ اس کی شان میں جس کے بارے میں وہ لفظ کہا گیا۔ بایں ہمہ وہ دونوں جنتی بھی ہوسکتے ہیں اور اللہ کے ولی بھی۔ حالانکہ ان میں سے ایک دوسرے کو واجب القتل اور کافر تصور کرتا ہے مگر وہ اس ظن میں خطاء کار ہے۔

جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ سے حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ مذکور ہے؛ جو بدر اور حدیبیہ میں شرکت کر چکے تھے۔ صحیح حدیث میں ثابت ہے ان کے غلام نے کہا: ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ کی قسم! حاطب بن ابی بلتعہ جہنم میں جائے گا۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم نے جھوٹ بولا؛ وہ بدر اور حدیبیہ میں شرکت کر چکا ہے۔'' [2]

⇦⇦⇦ نے نعثل کا لفظ بولا وہ جبلہ بن عمرو ساعدی تھا۔ اس نے کہا: ''اے نعثل میں آپ کو قتل کرکے ایک خارشی اونٹ پر سوار کروں گا اور اسے شہر سے باہر پتھریلی زمین کی طرف ہانک دوں گا۔ (دیکھیے تاریخ طبری:۵/۱۱۴، مطبع حسینیہ) بعدازاں یہ لفظ جنگ جمل کے موقع پر ہانی بن خطاب ارجی کی زبان پر جاری ہوا وہ کہتا ہے۔

اَبَتْ شُیُوْخُ مُذْحَجٍ وَّ هَمْدَانَ　　اَنْ لَّا یَـــرُدُّوْا نَـعْثَلًا كَمَـا كَـانَ

تیسری مرتبہ یہ لفظ عبدالرحمٰن بن حنبل جمحی نے جنگ صفین کے موقع پر بولا۔ وہ کہتا ہے:

اِنْ تَقْتُلُوْنِیْ فَاَنَا ابْنُ حَنْبَل　　اَنَا الَّذِیْ قَتَلْتُ فِیْكُمْ نَعْثَلًا

جب جبلہ بن عمرو ساعدی نے حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کرتے ہوئے پہلی مرتبہ نعثل کا لفظ بولا حضرت عائشہ اس وقت مکہ مکرمہ میں محو عبادت تھیں۔ جب حج سے واپس لوٹیں تو یہ لفظ آپ کے کانوں تک پہنچا۔

[1] اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ انسان خطا ونسیان سے مرکب ہے، اور رسولوں کے سوا کوئی بشر معصوم نہیں ہوسکتا۔ صحابہ کرام اور خاص طور پر خلفاء راشدین انسانیت کی اعلیٰ ترین صفات سے بہرہ ور ہیں، تاہم وہ خطاء کے مرتکب ہو سکتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کی خطا کو درست بھی کرتے ہیں، وہ خطا کے مرتکب ہونے کے باوصف قلبی طہارت، صفاء نیت، صدق جہاد اور سلامت مقاصد کی بنا پر باقی مسلمانوں سے بلند ترین مقام ومرتبہ پر فائز ہیں۔

[2] البخاري ٤/ ٥٩؛ مسلم ٤/ ١٩٤١۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ: ((جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کا ارادہ کیا تو حاطب نے مشرکین مکہ کے نام ایک خط لکھا اور اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے راز منکشف کر دیے۔ وحی کے ذریعہ آپ ان تمام حالات سے باخبر ہوئے ،تو حضرت علی رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ کو بلا کر کہا مکہ کی جانب چلتے جاؤ اور جب باغ خاخ آ جائے تو وہاں تمھیں ایک شتر سوار عورت ملے گی اس کے پاس ایک خط ہوگا۔ وہ خط اس سے لے لیجیے۔ جب علی وزبیر رضی اللہ عنہما وہ خط لے کر واپس لوٹے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب رضی اللہ عنہ کو بلا کر خط لکھنے کا سبب دریافت کیا۔ حاطب رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ! اللہ کی قسم! میں نے یہ فعل اس لیے انجام نہیں دیا کہ میں مرتد ہو گیا یا کفر پر راضی ہو گیا تھا۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ میں نسباً قریشی نہیں ہوں، بلکہ باہر سے آ کر مکہ میں آباد ہوا تھا۔ مدینہ میں جو لوگ ہجرت کر کے آئے ہیں، مکہ میں ان کے عزیز و اقارب ہیں جو ہر طرح ان کے گھر بار کی حفاظت کرتے ہیں۔ میں نے چاہا کہ اس طرح قریش کو ممنون کر دوں تا کہ وہ میرے کنبہ کی حفاظت کرتے رہیں۔'' حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! اجازت دیجیے کہ اس منافق کی گردن اڑا دوں۔ آپ نے فرمایا:'' حاطب بدر میں شرکت کر چکا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کے متعلق فرمایا ہے:﴿اِعۡمَلُوۡا مَاشِئۡتُمۡ فَقَدۡ غَفَرۡتُ لَکُمۡ ﴾ (جو اعمال چاہو انجام دو میں نے تمھیں بخش دیا۔'' اسی دوران میں سورۂ ممتحنہ کی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا عَدُوِّیۡ وَعَدُوَّکُمۡ اَوۡلِیَآءَ تُلۡقُوۡنَ اِلَیۡھِمۡ بِالۡمَوَدَّۃِ ﴾

''ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، تم ان کے ساتھ دوستی لگانا چاہتے ہو۔''[1]

اہل علم حاطب رضی اللہ عنہ کے واقعہ کی صحت پر متفق ہیں۔ یہ واقعہ مفسرین، فقہاء اور علماء سیر وتواریخ کے یہاں خبر متواتر کا درجہ رکھتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے عہد خلافت میں جب فتنہ پروری کا دور دورہ تھا یہ واقعہ بیان فرمایا کرتے تھے۔ اس کا راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کاتب عبداللہ بن ابی رافع ہے۔ واقعہ بیان کرنے سے آپ کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ سابقین اوّلین صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین باہمی مشاجرات وتنازعات کے باوصف اللہ تعالیٰ کے نزدیک مغفور ہیں۔ خواہ ان کے مابین کچھ بھی ہوا ہو۔

اس بات پر مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ: حضرت عثمان وطلحہ زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین حاطب رضی اللہ عنہ سے بہر حال افضل ہیں۔ حاطب اپنے غلاموں کے ساتھ سخت سلوک کرتے تھے۔ نیز یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مشرکین مکہ کو خط لکھ کر حاطب رضی اللہ عنہ نے جس جرم کا ارتکاب کیا تھا وہ ان لغزشوں کی نسبت عظیم تر تھا جو سابقین اوّلین صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی جانب منسوب ہیں۔ بایں ہمہ آپ نے اس کو قتل کرنے سے روکا اور اس کے جہنمی ہونے کی تردید کی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ حاطب رضی اللہ عنہ بدر وحدیبیہ میں شرکت کر چکا تھا۔ تاہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: اجازت دیجیے کہ میں اس منافق کی گردن

[1] صحیح بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب فضل من شهد بدراً (حدیث: ۳۹۸۳، ۴۸۹۰)، صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابة۔ باب من فضائل حاطب بن ابی بلتعة (حدیث: ۲۴۹۴)

اڑادوں۔آپ نے اسے منافق کہا اور مباح الدم قرار دیا۔اس کے باوجود کسی کے ایمان میں فرق آیا نہ جنتی ہونے میں۔

[واقعہ افک سے استدلال]:

صحیحین میں واقعہ افک کی تفصیل مذکور ہیں۔ جب یہ واقعہ پیش آیا تو نبی کریم ﷺ نے منبر پر خطبہ دیتے ہوئے رئیس المنافقین سے نجات حاصل کرنے کے لیے فرمایا:

''مجھے ایسے شخص کی ایذا سے کون نجات دے گا، جس نے میرے اہل کے بارے میں مجھے بڑی تکلیف دی ہے۔اللہ کی قسم! مجھے اپنے اہل خانہ کے بارے میں خیر ہی کی امید ہے اور جس شخص کے ساتھ ان کو متہم کیا جا رہا ہے اس کے بارے میں بھی میں خیر کے سوا اور کچھ نہیں جانتا۔''

یہ سن کر قبیلہ اوس کے سردار سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اٹھے...... یہ وہی سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ہیں جن کی موت پر عرش الٰہی پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ احکام الٰہی میں انھیں کسی ملامت گر کی پروا نہیں ہوا کرتی تھی۔ انھوں نے اپنے حلیف بنی قریظہ کے بارے میں فیصلہ صادر کیا تھا کہ لڑنے والوں کو قتل کیا جائے۔ بچوں کو قیدی بنایا جائے اور ان کے مال کو مال غنیمت تصور کیا جائے۔ یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ:''آپ نے ان کے بارے میں اللہ کا وہ فیصلہ صادر کیا ہے جو سات آسمانوں کے اوپر سے نازل ہوا تھا۔''[1] ......اور [حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے] کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم اس خدمت کے لیے حاضر ہیں، اگر وہ اوس کے قبیلہ سے تعلق رکھتا ہو گا تو ہم اسے موت کے گھاٹ اتا دیں گے اور اگر خزرج کا آدمی ہوا تو اس کے بارے میں ہم آپ کے حکم کی تعمیل کریں گے۔

یہ سن کر سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اٹھے اور کہا:''آپ نے جھوٹ بولا، اللہ کی قسم! آپ اسے قتل نہیں کر سکتے؛ اور نہ ہی اسے قتل کرنے پر قادر ہو سکتے ہیں۔اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر کہا: آپ جھوٹ بولتے ہیں، اللہ کی قسم! ہم اسے قتل کر کے رہیں گے۔آپ منافق ہیں اور اسی لیے منافقین کی وکالت کر رہے ہیں۔''اوس و خزرج آپس میں گتھم گتھا ہونے والے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے منبر سے اتر کر انھیں خاموش کرا دیا۔''[2]

اب ظاہر ہے کہ یہ تینوں اصحاب سابقین اوّلین میں سے تھے۔ اور اس کے باوصف اُسید رضی اللہ عنہ نے سعد رضی اللہ عنہ کو منافق کہا، حالانکہ ان دونوں حضرات کا ولی اللہ اور جنتی ہونا کسی شک وشبہ سے بالا ہے۔اس سے یہ حقیقت منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہے کہ بعض اوقات ایک شخص بنا بر تاویل دوسرے شخص کو کافر قرار دیتا ہے، حالانکہ ان میں سے کوئی بھی کافر نہیں ہوتا۔

---

[1] سیرۃ ابن ھشام ۳/ ۲۵۱ . ولکن مع اختلاف في اللفظ في: صحیح بخاری ٤/ ٦٧۔ کتاب الجھاد والسیر۔ باب إذا نزل العدو علی حکم رجل، صحیح مسلم ۳/ ۱۳۸۸ ؛ ۔ کتاب الجھاد والسیر ؛ باب جواز القتل من نقض العھد ۔

[2] صحیح بخاری، کتاب المغازی۔ باب حدیث الافك(حدیث ٤١٤١)۔ صحیح مسلم کتاب التوبة، باب فی حدیث الافك(حدیث ٢٧٧٠)

حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ تشریف لائے اور گھر میں داخل ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ مگر صحابہ رضی اللہ عنہم آپس میں گفتگو میں مشغول رہے۔[دوران گفتگو مالک بن دخشم کا تذکرہ آیا لوگوں نے اس کو مغرور اور متکبر کہا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی خبر سن کر بھی حاضر نہیں ہوا معلوم ہوا وہ منافق ہے]، صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا:

''ہم دل سے چاہتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کیلئے بددعا کریں کہ وہ ہلاک ہو جائے یا کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: ''کیا وہ اللہ تعالیٰ کی معبودیت اور میری رسالت کی گواہی نہیں دیتا؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ''زبان سے تو وہ اس کا قائل ہے مگر اس کے دل میں یہ بات نہیں۔'' فرمایا: ''جو شخص اللہ تعالیٰ کی توحید اور میری رسالت کی گواہی دے گا وہ دوزخ میں داخل نہیں ہوگا یا یہ فرمایا کہ اس کو آگ نہ کھائے گی۔'' [1]

جب یہ اصول ہے؛ اور پھر یہ ثابت ہو جائے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کوئی ایک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یا حضرت عمار رضی اللہ عنہ یا کوئی دوسرا اصحابی اگر کسی دوسرے صحابی کو کافر سمجھے؛ مثلاً: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے صحابی کو؛ اور تاویل کی بنا پر اس کو قتل کرنا جائز سمجھے؛ تو اس کا شمار بھی مذکورہ بالا تاویل کے باب سے ہوگا۔ اور یہ بات ان میں سے کسی ایک کے ایمان پر بھی قادح نہیں ہوگی۔ اور نہ ہی اس سے کسی کے اہل جنت ہونے میں کوئی فرق آئے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ اور حضرت عمار رضی اللہ عنہما سے افضل ہیں۔ حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کی غلطی بہت بڑی ہے؛ جب آپ کی یہ غلطی معاف کر دی گئی ہے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی غلطی بالاولی مغفرت کی مستحق ہے۔

جب یہ جائز ہے کہ حضرت عمر اور حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہما جیسے انسان کفر کا حکم لگانے اور مباح الدم سمجھنے میں اجتہاد کر سکتے ہیں' اگرچہ یہ اجتہاد حقیقت واقع کے مطابق نہ بھی ہو؛ تو پھر اس قسم کے اجتہاد کا حضرت عمار رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس قسم کے اجتہاد کا ہونا زیادہ اولیٰ ہے۔

[بڑے آدمی کے لیے معصوم ہونا شرط نہیں]:

چوتھی بات:...... ان سے کہا جائے گا: ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر قدح کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جو روایت منقول ہے؛ اگر یہ صحیح سند سے ثابت ہو جائے تو پھر بھی اس میں دو احتمال ہیں: یا تو آپ کی رائے درست ہوگی؛ یا غلط۔ اگر آپ کی رائے درست ہے؛ تو پھر اسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی برائیوں میں شمار نہیں کرنا چاہیے۔ اور اگر آپ کی یہ رائے غلط ہے تو پھر اسے سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی برائیوں میں شمار نہیں کیا جانا چاہیے۔ [ان روایات کی بنا پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

[1] صحیح بخاری، کتاب الصلاۃ، باب المساجد فی البیوت (حدیث:٤٢٥)، صحیح مسلم - کتاب الإیمان- باب الدلیل علی ان من مات علی التوحید......(حدیث:٣٣) واللفظ لہ۔

اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نقائص کو جمع کرنا قطعی طور پر باطل ہے]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے قتل عثمان رضی اللہ عنہ پر جس دکھ و رنج کا اظہار کیا ؛ آپ کے قاتلین کی مذمت کی ؛ اور آپ کے خون کا انتقام چاہا؛ اس کا تقاضا [ہے کہ اگر بالفرض کبھی کوئی ایسی بات سے آپ ہوئی ہے تو اس پر] ندامت ہے۔ جیسا کہ آپ نے مدینہ طیبہ سے جنگ جمل کے لیے نکلنے پر ندامت کا اظہار فرمایا تھا۔ بیشک اگر اس واقعہ پر آپ کی ندامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور ان کے حق کا اعتراف ہے؛ تو پھر یہ [قتل عثمان پر] ندامت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور ان کے حق کا اعتراف ہے۔ اگر یہ اعتراف درست نہیں تو پھلا اعتراف بھی درست نہیں۔

مزید برآں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جمہور صحابہ اور جمہور مسلمین سے جس قدر ملامت کا اظہار حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ہوا ہے؛ ایسی ملامت کا اظہار عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے نہیں ہوا۔ اگر یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ملامت کے لیے حجت ہے؛ تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ملامت کے لیے بھی حجت ہے۔ اگر اس واقعہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ملامت کے لیے کوئی حجت نہیں ہے تو پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ملامت کے لیے بھی کوئی حجت نہیں ہے۔ اگر اس سے مقصود اس ملامت گری پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں قدح کرنا ہے تو پھر یہ جان لینا چاہیے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا [اس مسئلہ میں اکیلی نہیں ہیں' بلکہ آپ] جمہور صحابہ کیساتھ ہیں۔ مگر اس ملامت گری کے درجات مختلف ہیں۔

اگر اس سے مقصود تمام لوگوں پر قدح کرنا ہو' جیسے : حضرت عثمان؛ حضرت علی ؛ حضرت طلحہ؛ حضرت زبیر؛ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم اجمعین نیز ملامت کیے گئے اور ملامت کرنے والے۔

تو ان سے کہا جائے گا کہ: ہم ان میں سے ہر ایک کے لیے معصوم ہونے کا دعوی نہیں کرتے۔ بلکہ ہم کہتے ہیں: یہ لوگ اولیاء اللہ متقین تھے؛ ان کا شمار نجات پانے والی اللہ تعالیٰ کی جماعت میں ہوتا ہے۔ اللہ کے نیک بندے تھے؛ اور جنت کے سرداروں میں سے تھے۔ اور ہم یہ بھی کہتے ہیں: گناہ کا صادر ہونا ان لوگوں کے لیے بھی جائز ہے جو صدیقین سے افضل ہوں' او رصدیقین سے بڑے ہوں۔ مگر ان گناہوں کی سزا توبہ' استغفار؛ گناہ مٹانے والی نیکیوں؛ مصائب و آلام؛ اور دوسرے امور کی وجہ سے ختم ہوجاتی ہے۔ پس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ان کے لیے توبہ و استغفار کرنا بھی ثابت ہے' اور ان کی اتنی نیکیاں ہیں جو ان کے بعد آنے والے کسی کے حصہ میں نہیں آئیں۔ اور انہیں ایسی آزمائشوں اور مصیبتوں سے پالا پڑا ہے [جنہوں نے ان کے گناہ دھو کر ختم کردیے ہیں] یہ مصیبتیں کسی دوسرے پر نہیں آئیں۔ ان کی اتنی قابل شکر کوششیں اور نیک اعمال ہیں جو ان کے بعد آنے والوں کے حصہ میں نہیں آئے۔ یہ برگزیدہ لوگ گناہوں کی بخشش کے بعد میں آنے والے لوگوں کی نسبت زیادہ حق دار ہیں۔

لوگوں کے بارے میں جو گفتگو ہو وہ ظلم و جہل کی بجائے علم و عدل پر مبنی ہونا واجب ہے؛ ظلم و جہالت پر مبنی کرنا اہل بدعت کا شیوہ ہے۔ روافض کا یہ حال ہے کہ وہ دو قریب الفضیلت اشخاص میں تقابل کرتے ہوئے ایک کو معصوم قرار دیتے اور دوسرے کو ظلم و گناہ کا مجسمہ کافر و فاسق قرار دیتے ہیں۔ یہ بات ان کے جہل و تناقض کی آئینہ دار ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی یہودی یا نصرانی جب حضرت موسیٰ یا عیسیٰ کی نبوت کا اثبات کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت

پر تنقید کرے گا تو یہ اس کے عجز و جہل اور تناقض کا اظہار ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ یا عیسیٰ کی رسالت کے اثبات میں وہ جو دلیل پیش کرے گا، اسی دلیل؛ بلکہ اس سے بھی قوی تر دلیل و براہان سے نبی کریم ﷺ کی رسالت ثابت ہوگی۔ اور نبی کریم ﷺ کی نبوت پر جو بھی شبہ پیش کیا جائے گا اس سے زیادہ قوی شبہ حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ علیہما السلام پر پیش کیا جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ جو شخص بھی دو مماثل چیزوں میں تفریق پیدا کرے گا یا ایک چیز کی مدح کرے اور بعینہ اس جیسی چیز کی مذمت کرے یا بالعکس وہ اسی قسم کے عجز و جہل اور تناقض کا شکار ہوگا۔ علماء و مشائخ کے اتباع کا بھی یہی حال ہے، جب کوئی شخص اپنے ہادی و پیشوا کی مدح میں رطب اللسان ہو اور اس جیسے دوسرے بزرگ کی مذمت کا مرتکب ہو تو وہ بھی تناقض کے مرض میں مبتلا ہوگا۔

جب کوئی عراقی یوں کہے کہ: اہل مدینہ نے فلاں فلاں سنت کے خلاف کیا ہے؛ اور ان مسائل میں صحیح حدیث کو ترک کر دیا ہے؛ اور ایسے ہی فلاں فلاں مسئلہ میں رائے کی پیروی کی ہے۔ مثال کے طور پر کوئی اہل مدینہ کے بارے میں کہے کہ: ان کے نزدیک تلبیہ پڑھنے کا وقت جمرہ عقبہ کی رمی تک نہیں؛ اور نہ ہی محرم احرام سے اور تحلل ثانی سے پہلے خوشبو لگا سکتا ہے۔ اور نہ ہی مفصل سورتوں میں سجدہ ہے۔ اور نہ ہی نماز میں تعوذ اور دعا استفتاح اور دو طرف سلام ہے۔ اور ایسے ہی ہر کنچلی والا درندہ بھی حرام نہیں ہے؛ اور نہ ہی ہر ناخن والا پرندہ ان کے نزدیک ناجائز ہے؛ اور وہ حشوش کو بھی حلال سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان کے مابین ان مسائل میں اختلاف نہیں۔ تو اہل مدینہ کہتے ہیں: ہم سنت کے سب سے بڑے پیروکار؛ اور اہل عراق کی نسبت اس کی مخالفت اور رائے سے بہت دور ہیں۔ وہ اہل عراق جن کی رائے میں ہر نشہ آور مشروب حرام نہیں ہوتا؛ اور یہ کہ صرف نجاست کے گر جانے سے کنوئیں کا پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک استسقاء کے لیے نماز نہیں ہے؛ اور نہ ہی نماز کسوف کی ہر رکعت میں دو رکوع ہوتے ہیں۔ اور نہ ہی وہ حرم مدینہ کو حرم سمجھتے ہیں۔ اور نہ ہی ایک گواہ اور قسم کی موجودگی میں فیصلہ کرتے ہیں۔ اور نہ ہی قسامہ میں دونوں مدعیان کو قسم دیتے ہیں۔ اور نہ ہی حج قرآن میں ایک سعی اور طواف پر اکتفاء کرتے ہیں۔ وہ سبزیوں میں تو زکواۃ کو واجب کہتے ہیں؛ مگر اجناس میں اسے جائز نہیں سمجھتے۔ اور نہ ہی نکاح شغار اور نکاح حلالہ کے باطل ہونے پر یقین رکھتے ہیں؛ اور اعمال میں نیت کو شرط نہیں سمجھتے۔ ادنیٰ قسم کے حیلوں سے اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ادنیٰ قسم کے حیلہ سے شفعہ کے حق کو ساقط کر دیتے ہیں۔ اور حرام چیزیں جیسے زنا؛ جوا؛ اور سفاح کو حیلوں سے حلال کر لیتے ہیں؛ ایسے ہی حیلوں سے زکاۃ کو ساقط کرتے ہیں۔ اور عقد میں قصد کو معتبر نہیں سمجھتے۔ اور حدود کو معطل کرتے ہیں؛ حتی کہ ملک کی سیاست صرف ان کی رائے کے مطابق ہو جائے۔ پس یہ لوگ کھانے یا پھل کی چوری اور مباح چیز کی چوری پر چور کا ہاتھ نہیں کاٹتے۔ اور وہ کسی شرابی پر حد نہیں لگاتے حتی کہ وہ اقرار کرلے؛ یا پھر اس پر گواہی قائم ہو جائے۔ وہ کسی کو الٹی کرتا دیکھ کر؛ یا شراب کی بو پا کر حد نہیں لگاتے۔ جب کہ خلفائے راشدین اور نبی کریم ﷺ کی سنت اس کے خلاف ہے۔ اور بھاری چیز سے قتل کرنے پر قصاص کو واجب نہیں کہتے۔ اور نہ ہی قاتل کے ساتھ ویسا سلوک کرتے ہیں جیسا اس نے مقتول کے ساتھ کیا ہے۔ بلکہ بسا

اوقات ظالم نے مظلوم کا ہاتھ اور پاؤں کاٹے ہوتے ہیں ؛ اور اس کا پیٹ چاک کیا ہوتا ہے۔مگر یہ لوگ صرف اس کی گردن زنی کو ہی کافی سمجھتے ہیں ۔اور کسی ذمی کافر کے بدلہ میں کسی بہترین مسلمان کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔ مہاجرین و انصار اور اہل ذمہ کفار کی دیت کو برابر سمجھتے ہیں ۔اور جو کوئی اپنی کسی محرم جیسے ماں یا بیٹی سے وطی کر لے ؛اور وہ اس کا حکم جانتا بھی ہو؛ اس سے حد کو محض عقد کی صورت کی وجہ سے ساقط قرار دیتے ہیں۔مزید برآں وہ منافع کے کرایہ کو ساقط قرار دیتے ہیں ۔اور مزدلفہ اور عرفات کے علاوہ کہیں بھی دو نمازیں اکٹھی پڑھنے کے قائل نہیں ہیں۔اور نہ ہی فجر کو اندھیرے میں پڑھنا مستحب سمجھتے ہیں۔اور نہ ہی سری رکعات میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کی تلاوت کرتے ہیں۔اور نہ ہی رات سے روزہ کی نیت کر لینے کو واجب کہتے ہیں؛ حالانکہ انہیں علم ہوتا ہے کہ کل رمضان ہے۔اور مشاع کے وقف اور ہبہ اور گروی رکھنا جائز نہیں سمجھتے ۔گوہ اور گھوڑے کو حرام کہتے ہیں؛ جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے حلال ٹھہرایا ہے۔اور اس نشہ آور چیز کو حلال کہتے ہیں جسے اللہ اور اس کے رسول نے حرام ٹھہرایا ہے۔ان کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ عصر کا وقت اس شروع نہیں ہوتا جب ہر چیز کا سایہ اس کا دگنا ہو جائے؛ اور کہتے ہیں: بیشک نماز فجر طلوع کے ساتھ باطل ہو جاتی ہے۔اور قرعہ کو جائز نہیں سمجھتے ۔اور حدیث مصراۃ کو قبول نہیں کرتے ؛ اور نہ ہی مشتری کے مفلس ہونے جانے پر اس کی بات مانتے ہیں۔اور کہتے ہیں: جمعہ اور دیگر نماز ایک رکعت سے کم پر بھی ان کا ادراک ہوسکتا ہے۔اور ایک یا دو یوم کی مسافت پر نماز کی قصر کو جائز نہیں سمجھتے ؛ اور نماز کو اس کے وقت سے مؤخر کرنے کو جائز سمجھتے ہیں ۔

ایسے بعض فقہائے حدیث کے متبعین کا حال ہے۔اگر ان میں سے بعض لوگ یہ کہیں کہ ہم سنت کے بڑے متبع ہیں؛ بیشک ہم صحیح حدیث کی اتباع کرتے ہیں؛ جبکہ تم لوگ ضعیف حدیث پر عمل کرتے ہو۔ان کے مقابلہ میں دوسرے لوگ کہیں: بیشک ہم صحیح حدیث کے تم سے بڑے عالم؛ اور تمہاری نسبت جو کہ ضعیف راویوں سے روایت کرتے ہیں؛ اور ان کی صحت کا اعتقاد رکھتے ہیں؛ سے بڑے متبع ہیں۔وہ گمان کرتے ہیں کہ بیشک یہ چیز رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے؛ حالانکہ وہ آپ سے ثابت نہیں ہوتی۔جیسا کہ یہ گمان کیا جاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کبھی کبھار سفر میں پوری نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔اور یہ کہ آپ ﷺ نماز فجر میں رکوع کے بعد قنوت نازلہ پڑھتے رہے؛ حتی کہ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔اور یہ کہ آپ نے مطلق حج کا احرام باندھا تھا۔جس میں آپ نے تمتع یا قران یا افراد کی نیت نہیں کی تھی۔اور یہ کہ مکہ صلح کے ذریعہ فتح ہوا۔اور یہ کہ جو کچھ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما اور دیگر نے جو جائداد کی تقسیم ترک کر دی تھی ؛ یہ متناقض ہے۔یہ مفقود کے بارے میں خلفائے راشدین اور صحابہ کرام جیسے حضرت علی اور ابن عمر رضی اللہ عنہم اجمعین کے حکم اور فیصلہ کے خلاف ہے اور ضعیف راویوں سے منقول کئی ایک احادیث سے استدلال کرتے ہیں ۔

جب ہم یہ کہتے ہیں: ضعیف حدیث رائے سے بہتر ہے۔اس سے مراد وہ ضعیف حدیث نہیں ہوتی جو کہ متروک ہے۔لیکن اس سے مراد حدیث حسن ہوتی ہے۔جیسا کہ حضرت عمرو بن شعیب کی اپنے باپ اور ان کی اپنے والد سے روایت اور حضرت ابراہیم ہجری کی روایت؛ اور ان کی امثال دیگر وہ احادیث جنہیں امام ترمذی صحیح یا حسن کہتے ہیں۔امام

ترمذی سے قبل اصطلاح میں حدیث کی صرف دو اقسام تھیں: صحیح اور ضعیف ۔ اور پھر ضعیف کی دو اقسام تھیں: متروک اور غیر متروک۔ تو ائمہ حدیث اس اصطلاح کے اعتبار سے بات کرتے تھے۔ پھر ان کے بعد ایسے لوگ آئے جو صرف امام ترمذی کی اصطلاح کو ہی جانتے تھے۔ تو انہوں نے جب بعض ائمہ کا یہ قول سنا کہ: ''ضعیف حدیث ہمارے نزدیک قیاس سے زیادہ محبوب ہے۔ تو ان لوگوں نے یہ گمان کر لیا کہ اس سے مراد وہ احادیث ہیں؛ جنہیں امام ترمذی جیسے لوگ ضعیف کہتے ہیں۔ اور وہ ان لوگوں کے طریقہ کو ترجیح دینے لگ گئے جو خیال کرتے ہیں کہ ہم صحیح احادیث کی اتباع کرنے والے ہیں۔ اس مسئلہ میں وہ ان متناقضین میں سے ہوتا ہے جو کسی چیز کو دوسری ایسی چیز پر ترجیح دیتے ہیں جو خود ترجیح کی زیادہ حق دار ہوتی ہے۔ اس سے کسی بھی طرح کم نہیں ہوتی۔

یہی حال مشائخ طریقت کا ہے؛ جب ان میں سے کوئی ایک کسی ایسے شیخ پر طعنہ زنی کرنا چاہتا ہے جس کی کوئی دوسرا تعظیم و تکریم کرتا ہو؛ حالانکہ وہ تعظیم کا زیادہ مستحق اور قدح سے زیادہ دور ہوتا ہے۔ جیسے وہ لوگ جو ابو یزید اور شبلی وغیرہ کو افضلیت دیتے ہیں؛ جو ان سے احوال کی حکایات نقل کرتے ہیں؛ وہ جنید اور اور سہل بن عبداللہ تستری جیسوں پر تنقید کرتے ہیں؛ جو کہ زیادہ استقامت پر اور بلند مقام و مرتبہ والے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ جہالت کی بنا پر کسی کے عظیم انسان ہونے کے صرف دعوی کو اس کی فضیلت کا موجب قرار دیتے ہیں۔ اور یہ نہیں جانتے کہ اس کا آخری انجام یہ ہے کہ یہ انسان خطاؤں سے مغفور لہ ہو؛ نہ کہ اس کی سعی مشکورانہ ہو۔ جو کوئی بھی عدل اور علم کی راہ پر نہیں چلتا؛ نتیجہ میں اسے ان تناقضات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن انسان کی وہی حالت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿ وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًاۙ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ الْمُشْرِكٰتِ وَ يَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [الاحزاب ۷۳]

''اور انسان نے اسے اٹھا لیا، بلاشبہ وہ ہمیشہ سے بہت ظالم، بہت جاہل ہے؛ تاکہ اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو عذاب دے اور (تاکہ) اللہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کی توبہ قبول کرے اور اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔''

پس انسان ظالم اور جاہل ہی ہے؛ سوائے اس کے جس پر اللہ تعالیٰ رحم فرما دے۔

[خلافت علی رضی اللہ عنہ اور اختلاف]

[ساتواں اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا خلافت کے منصب پر کون فائز ہوا ہے؟'' لوگوں نے جواب دیا: حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ قرار پائے ہیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا، عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لینے کے دعویٰ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑنے کے لیے تیار ہو گئیں۔ حالانکہ ان کا کوئی قصور نہ تھا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ عائشہ، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت

عثمان رضی اللہ عنہ کا قاتل قرار دیا تھا۔ اس لیے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف صف آراء ہوئے؛ صریح بہتان ہے۔ ان کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کی تحویل میں دے دیں۔ وہ اس حقیقت سے کلیتاً آگاہ تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دامن قتل عثمان رضی اللہ عنہ سے اتنا ہی پاک تھا جتنا کہ خود ان کا دامن؛ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ مگر چونکہ قاتلین نے آپ کے پاس پناہ لے لی تھی۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ جن قاتلوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاں پناہ لی ہے وہ ان کو تفویض کر دیے جائیں۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا دونوں اس پر قادر نہ تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے قبائل ان کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ فتنہ کی حقیقت بھی یہی ہے کہ ایک مرتبہ جب وہ بپا ہو جاتا ہے تو عقلاء اس کو فرو کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ بڑے بڑے اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اس فتنہ کی آگ بجھانے اور اسے روکنے سے قاصر رہے۔ فتنوں میں ہمیشہ ایسے ہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوْا مِنكُمْ خَاصَّةً ﴾ (الانفال)

''اس فتنہ سے بچ جاؤ جو صرف ظالموں کو ہی اپنی لپیٹ میں نہیں لے گا۔''

جب فتنہ کا ظہور ہوتا ہے تو وہی شخص اس میں آلودہ ہونے سے محفوظ رہتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ بچا لے۔

[آٹھواں اعتراض]: شیعہ مصنف کہتا ہے ''[قتل عثمان رضی اللہ عنہ کی بنا پر] حضرت علی رضی اللہ عنہ پر کیا جرم عائد ہوتا ہے۔''

[جواب]: [یہ اعتراض شیعہ مصنف] کے تناقض کا آئینہ دار ہے۔ رافضی مصنف اس زعم میں مبتلا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، قتل عثمان رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھ جنگ وقتال کو مباح تصور کرتے تھے۔ اور یہ قتل آپ کی مساعی کا رہین منت تھا۔ اس لیے کہ شیعان علی اور شیعان عثمان رضی اللہ عنہما میں سے بہت سے لوگ یہ قتل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ❶

❶ قبل ازیں شیعہ مصنف کا یہ قول بیان کیا جا چکا ہے کہ سب لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے حق میں تھے'' ہم نے وہاں بیان کیا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دیگر صحابہ کرام کی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت کرنا چاہتے تھے۔ اسی بنا پر آپ نے حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما کو ان کی حفاظت ونگرانی کے لیے مامور فرمایا تھا۔ ہم نے یہ واقعہ بھی ذکر کیا تھا کہ ایک مرتبہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں داخل ہوئے تو اپنی بیٹیوں کو روتا ہوا پایا اور جب انھوں نے یہ بتایا کہ وہ قتل عثمان رضی اللہ عنہ پر آنسو بہا رہی ہیں تو آپ نے فرمایا ''روتی رہو'' جنگ جمل میں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سنا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ پر لعنت بھیج رہی ہیں اور فوج کے لوگ آپ کی دعا کو دہرا رہے ہیں تو آپ نے یہ دعا فرمائی: '' اَللّٰھُمَّ الْعَنْ قَتَلَةَ عُثْمَان '' (یا اللہ! قاتلین عثمان پر لعنت بھیج)۔ یہ دلائل و براہین ذکر کرنے سے ہمارا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق وہی رائے رکھتے ہیں جو اہل سنت کی ہے اور وہ بھی قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ پر لعنت بھیجتے تھے۔ نیز یہ کہ آپ روافض کی طرح اس غلط فہمی میں مبتلا نہ تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغض وعناد رکھنا قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کی مدد کرنا اور ان کے فعل شنیع کو سراہنا ایک مستحسن امر ہے۔ ہم شیعہ مصنف کے اس دعویٰ کا ذکر کر چکے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مباح الدم تصور کرتے تھے۔ اب وہ اس کے عین برعکس یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے رفقاء نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر یہ الزام لگایا تھا کہ آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جائز القتل تصور کرتے ہیں اور اسی بنا پر آپ کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔ حالانکہ جن وانس اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق شیعہ کے ہم خیال ہرگز نہ تھے۔ بخلاف ازیں وہ آغاز اسلام سے تادم موت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنا بھائی سمجھتے رہے۔ آپ یہ بھی جانتے تھے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے اعوان وانصار کا مقصد وحید قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ (لَعَنَھُمُ اللّٰہُ وَ اَعَدَّ لَھُم جَھَنَّمَ) سے قصاص لینے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تعاون اور امداد کرنا تھا اور بس!''

ایک گروہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغض کی وجہ سے یہ الزام [بطور فخر] لگاتا ہے' اور دوسرا گروہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض کی وجہ سے یہ الزام [بطور نفرت و اثبات جرم کے] لگاتا ہے۔ [یہ دونوں گروہ تعصب کے مریض ہیں ایک فریق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بے جا طرف داری کا ارتکاب کرتا ہے اور دوسرا حضرت عثمان کا حامی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دشمن ہے]۔ جمہور اہل اسلام ان دونوں فرقوں کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔

روافض کا قول ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، قتل عثمان رضی اللہ عنہ بلکہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے قتل کو مباح سمجھتے اور ان کو قتل کرنے والے کی تائید و نصرت کو اجر و ثواب کا موجب قرار دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو وہ یہ بات کیوں کر کہہ سکتا ہے کہ قتل عثمان رضی اللہ عنہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر کیا گناہ ہے؟ البتہ اہل سنت کے قول کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کو منزہ قرار دے سکتے ہیں یہ امر اس بات کا آئینہ دار ہے کہ روافض کے یہاں کس قدر تناقض پایا جاتا ہے۔

[انبیاء کرام علیہم السلام کی ازواج پر رافضی الزام]:

[نواں اعتراض]: شیعہ مصنف کا قول کہ ''طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے لیے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی اعانت و رفاقت کیوں کر جائز ہوئی؟'' بروز قیامت یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا منہ دکھائیں گے۔ ہماری یہ حالت ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کی بیوی کے ساتھ بات چیت کرے۔ اور سفر میں اسے اپنے ہم راہ لے جائے، تو اس عورت کا خاوند اس کا انتہائی دشمن بن جائے گا۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: یہ شیعہ کے جہل و تناقض کا بین ثبوت ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بڑے بڑے الزام لگاتے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر فحاشی کا الزام لگاتے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بری قرار دیا ہے۔ اور اس بارے میں قرآن نازل ہوا ہے [جو قیامت تک پڑھا جائے گا]۔

ان کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ اس قسم کا دعوی دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کی ازواج کے متعلق کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی ایک غلط کار عورت تھی۔ اور جس بیٹے کو نوح علیہ السلام نے کشتی میں سوار ہونے کے لیے بلایا تھا؛ وہ آپ کا بیٹا نہیں تھا' بلکہ اس بیوی کا تھا [معاذ اللہ]۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ﴾ [هود ۴۶] ''اس کے اعمال اچھے نہیں تھے۔'' سے مراد یہ ہے کہ: یہ بیٹا غلط کام کا نتیجہ ہے۔ اور ان میں سے بعض پڑھتے ہیں:

﴿وَنَادَىٰ نُوحٌ ابْنَهُ﴾ [هود ۴۲] ''نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔''

اور نوح علیہ السلام نے کہا: ﴿يَا بُنَيَّ ارْكَبْ مَعَنَا﴾ ''اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہو جا۔''

اور یہ بھی عرض کی: ﴿إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي﴾ ''بیشک میرا بیٹا میرے اہل خانہ میں سے تھا۔''

اللہ اور اس کا رسول کہتے ہیں: وہ آپ کا بیٹا تھا' یہ جھوٹے افتراء پرداز اور انبیائے کرام علیہم السلام کو اذیت دینے والے کہتے ہیں: وہ آپ کا بیٹا نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: ''وہ آپ کا بیٹا نہیں ہے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ﴾ ''وہ آپ کے اہل خانہ میں سے نہیں۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَ مَنْ اٰمَنَ﴾ [ھود ۴۰]

''ہم نے کہا کہ کشتی میں ہر جاندار میں سے دو (جانور، ایک نر اور ایک مادہ) سوار کرلے اور اپنے گھر کے لوگوں کو بھی، سوائے ان کے جن پر پہلے سے بات پڑ چکی؛ اور سب ایمان والوں کو بھی۔''

یعنی ان کو اپنے ساتھ سوار کر جو ایمان لائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمام اہل خانہ کو سوار کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ بلکہ ان لوگوں کو اس حکم میں سے مستثنیٰ قرار دیا تھا جن کے بارے میں پہلے فیصلہ ہو چکا [یعنی جو ایمان نہیں لائے تھے' اور ان کے غرق ہونے کا فیصلہ ہو چکا تھا] اور آپ کا بیٹا بھی ان لوگوں میں سے تھا جن کے بارے میں پہلے فیصلہ ہو چکا تھا۔ نوح علیہ السلام کو اس بات کا علم نہیں تھا۔ اسی لیے آپ نے یہ کہا:

﴿رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ﴾ [ھود ۴۵] ''اے میرے رب! بیشک میرا بیٹا میرے اہل خانہ میں سے تھا۔''

آپ کا یہ خیال تھا کہ شاید بیٹا ان لوگوں میں سے ہوگا جن کی نجات کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے بہت سارے علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ: ''آپ کے اہل خانہ میں سے نہیں'' اس کی تفسیر یہ ہے کہ: ''آپ کے ان اہل خانہ میں سے نہیں جن کو بچانے کا آپ کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے۔'' اگر چہ وہ نسب کے اعتبار سے آپ کے اہل میں سے ہی تھا؛ مگر دینی اعتبار سے ان میں سے نہیں تھا۔ کفر کی وجہ سے مؤمنین اور کفار کے درمیان موالات ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں: ابو لہب آل محمد اور اہل بیت میں سے نہیں ہے۔ اگر چہ وہ نسب کے اعتبار سے آپ کے قریب ترین رشتہ داروں میں سے تھا۔ پس جب ہم درود پڑھتے ہیں: ''اللھم صل علی محمد و علی آل محمد۔'' ''اے اللہ! محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کی آل پر درود بھیج'' تو ابولہب اس میں داخل نہیں ہوتا۔

نوح علیہ السلام کی بیوی کی ان کے ساتھ خیانت دین میں تھی۔ اس لیے کہ آپ کی بیوی بھی آپ کو پاگل کہتی تھی۔ ایسے ہی لوط علیہ السلام کی بیوی کی خیانت بھی ان کے دین میں خیانت تھی۔ اس نے آپ کے مہمانوں کے بارے میں اپنی قوم کے لوگوں کو آگاہ کیا تھا اور قوم کے لوگ لونڈے باز تھے۔ وہ عورتوں کے ساتھ زنا کی بیماری میں گرفتار نہیں تھے جو کہا جائے کہ اس نے کوئی فحاشی کی ہوگی۔ بلکہ وہ گناہ کے کاموں میں ان کی مدد کرتی تھی؛ اور ان کے ان برے اعمال پر راضی رہتی تھی۔

رافضیوں کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کے انساب کی آباء و ابناء کے لحاظ سے تعظیم کرتے ہیں اور ان کی ازواج پر فحاشی کا الزام لگاتے ہیں۔ یہ سب خواہشات نفس کی پیروی اور عصبیت کی وجہ سے ہے۔ اس طرح وہ حضرت فاطمہ' حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہم اجمعین کی تعظیم کی راہ نکالنا چاہتے ہیں؛ اور اس کے ساتھ ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا -ام المؤمنین- پر فحاشی کا الزام لگاتے ہیں۔ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں- ان میں سے بعض لوگ کہتے ہیں-: ابراہیم علیہ السلام کا والد آزر مؤمن تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین بھی اہل ایمان تھے۔ تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ نبی کا والد کافر تھا؛ اگر باپ کافر ہوگا تو پھر بیٹے کا کافر ہونا بھی ممکن ہے۔ تو خالی نسب سے تو کوئی فضیلت ثابت نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ اس سے ثابت

ہوسکتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا کافر تھا۔ نبی کا بیٹا کافر ہو [شیعہ مذہب کے مطابق] ایسا نہیں ہوسکتا؛ [اسی لیے وہ اسے آپ کا بیٹا ہی نہیں مانتے]۔ ایسے ہی شیعہ کہتے ہیں: جناب ابو طالب مؤمن تھا۔ ان میں سے بعض کہتے ہیں: اس کا نام عمران تھا۔ جو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ [آل عمران ۳۳]

''بیشک اللہ تعالیٰ نے تمام جہان کے لوگوں میں سے آدم علیہ السلام کو اور نوح علیہ السلام کو، ابراہیم علیہ السلام کے خاندان اور عمران کے خاندان کو منتخب فرمایا۔''

[اپنے مطلب کی بات نکالنے کے لیے] ان لوگوں کی یہ کارستانیاں ہیں؛ حالانکہ اس میں جو جھوٹ' افتراء؛ بہتان اور حصول مقصود میں جو تناقض ہے' وہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے؛ جو کسی پر مخفی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی انسان کے باپ یا بیٹے کے کافر ہونے سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس انسان میں کوئی نقص یا کمی واقع نہیں ہوتی۔ یہ اللہ کی مشیت ہے وہ زندہ سے مردہ کو اور مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے۔

اس میں کوئی شک و شبہ والی بات نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اپنے والدین سے افضل تھے۔ ان کے باپ دادا کافر تھے۔ بخلاف اس کے کہ کوئی کسی فاحشہ کا شوہر ہو۔ اس لیے کہ یہ کسی انسان کی مذمت اور عیب جوئی کے لیے سب سے بڑا طعنہ ہے۔ اس کی مضرت انسان کو لاحق ہوتی ہے؛ اس کے برعکس باپ یا بیٹے کے کافر ہونے سے کوئی ایسا فرق نہیں پڑتا۔

مزید برآں اگر ایسے ہی ہوتا کہ مؤمن والدین سے ہمیشہ مؤمن اولاد ہی پیدا ہوگی؛ تو پھر اس کا تقاضا یہ تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تمام اولاد اہل ایمان ہوتی۔ اللہ تعالیٰ آپ کے بارے میں فرماتے ہیں:

﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَ لَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ [المائدۃ ۲۷]

''آدم (علیہ السلام) کے دونوں بیٹوں کا کھرا کھرا حال بھی انہیں سنا دوان دونوں نے ایک نذرانہ پیش کیا، ان میں سے ایک کی نذر قبول ہوگئی اور دوسرے کی مقبول نہ ہوئی تو کہنے لگا کہ میں تجھے مار ہی ڈالوں گا؛ اس نے کہا: اللہ تعالیٰ تقوی والوں کا ہی عمل قبول کرتا ہے۔'' یہ مکمل قصہ ہے۔

صحیحین میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کوئی بھی انسان ظلم کی وجہ سے قتل نہیں کیا جائے گا مگر ابن آدم پر اس کے خون کے برابر گناہ ہوگا؛ اس لیے کہ اس نے سب سے پہلے قتل کرنے کی رسم کی طرح ڈالی۔'' [1]

[1] رواہ البخاري ۲/ ۷۹۔کتاب الجنائز؛ باب قول النبي ﷺ یعذب المیت ببعض بکاء أھله علیه؛ کتاب الأنبیاء وباب قول الله تعالیٰ و إذ قال ربك للملائكة إني جاعل في الأرض خلیفة ؛مسلم ۳/ ۱۳۰٤۔کتاب القسامة؛ باب بیان إثم من سنَّ القتل؛ سنن الترمذي ٤ / ١٤٨ .

مزید برآں شیعہ حضرات رسول اللہ ﷺ کے چچا جناب حضرت عباس رضی اللہ عنہ پر قدح کرتے ہیں؛ حالانکہ ان کا ایمان لانا تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔ جب کہ اس کے برعکس ابوطالب کی مدح وتعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں؛ جس کی موت باتفاق اہل علم کفر کی حالت پر ہوئی ہے۔ جیسا کہ صحیح احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں۔ صحیحین میں حضرت مسیّب بن حزن رحمہ اللہ سے روایت ہے آپ فرماتے ہیں:

''جب ابوطالب کی وفات کا وقت قریب آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آئے (اس وقت) ابوطالب کے پاس ابوجہل بھی تھا۔ تو آپ نے ان سے فرمایا: اے میرے چچا صرف ایک کلمہ'' **لا إله إلا الله** '' کہہ دیجئے تو میں اللہ کے ہاں اس کی وجہ سے (آپ کی بخشش کے لئے) سفارش کرنے کا مستحق ہو جاؤں گا۔ تو ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ نے کہا: ''اے ابوطالب! تم عبدالمطلب کے دین سے پھرے جاتے ہو؟ پس یہ دونوں برابر ان سے یہی کہتے رہے حتی کہ ابوطالب نے ان سے جو آخری بات کہی وہ یہ تھی کہ: (میں) عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میں اس کے لئے اس وقت تک استغفار کرتا رہوں گا جب تک مجھے روکا نہ جائے تو یہ آیت نازل ہوئی:

﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَ لَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ﴾ [التوبة۱۱۳]

''نبی اور ایمان والوں کے لئے مناسب نہیں ہے کہ مشرکین کے لئے استغفار کریں اگر چہ وہ ان کے قرابتدار ہوں جب کہ انہیں یہ ظاہر ہو چکا کہ وہ دوزخی ہیں۔'' [صحيح بخاري:ج ۲:ح۱۰۸٦]

اور یہ آیت نازل ہوئی کہ:

﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ [القصص٥٦]

''آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے؛ مگر اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ہدایت سے نوازتا ہے۔''

صحیح مسلم کی روایت میں ہے: ابوطالب نے کہا: قریش مجھے بدنام کریں گے اور کہیں گے کہ ابوطالب نے ڈر کے مارے ایسا کیا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں کلمہ پڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا۔ اسی پر اللہ تعالی نے آیت کریمہ نازل فرمائی:

﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ [القصص٥٦]

''آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے؛ مگر اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ہدایت سے نوازتا ہے۔''[1]

صحیحین میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا:

---

[1] صحيح مسلم:ح۱۳۸؛ ۱/ ۵۵؛ كتاب الايمان؛ باب الدليل على صحة إسلام من حضره الموت؛ سنن الترمذي ٥/ ۲۱؛ كتاب التفسير؛ باب تفسير سورة القصص.

’’یارسول اللہ ﷺ! ابوطالب آپ ﷺ کی حفاظت کرتے تھے؛ اور آپ ﷺ کی مدد کرتے ؛ اور آپ ﷺ کے لئے لوگوں پر غصے ہوتے تھے تو کیا ان باتوں کی وجہ سے ان کو کوئی فائدہ ہوا؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں میں نے انہیں آگ کی شدت میں پایا تو انہیں نکال کر ہلکی آگ میں لے آیا۔‘‘ ❶

حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آپ کے چچا ابوطالب کا تذکرہ ہوا آپ ﷺ نے فرمایا:

’’یقیناً بروزِ قیامت میری شفاعت سے ابوطالب کو فائدہ پہنچے کہ دوزخ کے اوپر والے حصے میں لایا جائے گا کہ جہاں آگ ان کے ٹخنوں تک پہنچے گی جس کی شدت سے اس کا دماغ کھولتا رہے گا۔‘‘ ❷

مزید برآں صرف نسب پر اللہ تعالیٰ نے کسی کی کوئی تعریف نہیں کی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ ایمان اور تقوی کی بنیاد پر تعریف کرتے ہیں؛ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ [الحجرات ۱۳]

’’بیشک تم میں سب سے زیادہ عزت والا اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔‘‘

اصول یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

’’تم لوگوں کو معدنیات جیسا پاؤ گے جیسے سونے اور چاندی کی کانیں ہوتی ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں جو لوگ بہترین تھے زمانہ اسلام میں بھی وہ لوگ بہترین ہوں گے جبکہ وہ دین میں سمجھ حاصل کریں۔‘‘ ❸

یہ بات صحیح حدیث سے ثابت شدہ ہے۔ معادن حصول مطلوب کی چیز ہوتی ہیں۔ اگر ان سے مطلوب حاصل نہ ہو تو وہ معدنیات ناقص ہوتی ہیں؛ ورنہ حاصل مطلوب اس سے بہتر ہونا چاہیے۔

مزید برآں شیعہ کے تناقض کی انتہاء یہ ہے کہ طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کو ہدف ملامت بنانے کے لیے وہ اس موقع پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی مدح و توصیف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ مگر اتنا نہیں سوچتے کہ ان کے اعتراض کی اصل آماج گاہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بے حد اکرام و احترام کرتے تھے۔ آپ کے موافقین اور آپ کے حکم کی تعمیل کرنے والے تھے۔ اور ان کے یا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کسی غلط کاری کے ارتکاب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر شیعہ مصنف طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہے کہ ’’وہ نبی کریم ﷺ کو کیا منہ دکھائیں گے‘‘ ہماری یہ حالت ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کی بیوی کے ساتھ بات چیت کرے۔ اور سفر

❶ البخاری ۵/ ۵۱ ؛ کتاب مناقب الأنصار ؛ باب قصة ابي طالب ؛ صحيح مسلم:۱/ ۱۹۵ ؛ ح۵۱۱ ؛ کتاب الإيمان ؛ باب شفاعة النبی ﷺ لابی طالب .

❷ صحيح مسلم:ح۵۱۳؛ البخاری ۵/ ۵۱ : کتاب مناقب الأنصار ؛ باب قصة ابي طالب ؛ صحيح مسلم:۱/ ۱۹۵ ؛ ح۵۱۱ ؛ کتاب الإيمان ؛ باب شفاعة النبی ﷺ لابی طالب؛ مسند ۳/ ۹ .

❸ البخاری ۴/ ۱۴۰ ؛ کتاب الأنبياء ؛ باب قوله تعالیٰ: واتخذ الله ابراهيم خليلا ؛ صحيح مسلم:ح۱۹۵۵؛ ۴/ ۲۰۳۱ ؛ کتاب البر والصلة .

میں اسے اپنے ہم راہ لے جائے......'' حالانکہ یہ دونوں حضرات آپ کو ایک ملکہ کی طرح لے کر گئے تھے جس کی بات مانی جاتی ہے اور حکم پر تعمیل کی جاتی ہے۔ان کو گھر سے نکالنے میں کسی برائی کا گمان تک نہیں کیا جا سکتا۔

تو ایک ناصبی (حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مخالف) یہ کہنے کا مجاز ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا منہ دکھائیں گے جب کہ وہ آپ کی بیوی (سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا) کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور آپ کو اس حد تک تکلیف پہنچائی کہ ان کے اعوان و انصار نے اس اونٹ کی کونچیں کاٹ ڈالیں جس پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سوار تھیں۔نتیجتاً سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا محمل سے گر پڑیں۔ اوران کے اعداء ایک قیدی عورت کی طرح آپ کو گھیرے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی تذلیل ہے۔جس میں کسی انسان کی اس کے اہل خانہ میں ہتک عزت ہے؛ اور پھر انہیں قیدی بنانے کی کوشش کرنا' اور اجنبی لوگوں کو ان پر مسلط کرنا' انہیں ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش کرنا فقط گھر سے نکالنے سے زیادہ گناہ کا کام ہے۔ جب کہ حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما مدینہ سے ایک باعزت ملکہ کی طرح بحفاظت تمام آپ کو لائے،کسی کو آپ کے پاس پھٹکنے کی اجازت نہ تھی۔نہ ہی کوئی آپ کے پردہ کی ہتک کر سکتا تھا اور نہ ہی کوئی آپ کی چادر کی طرف دیکھ سکتا تھا۔

نیز طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما اور دوسرے اجنبی آپ کو نہ اٹھاتے تھے۔فوج میں بہت سے لوگ آپ کے محرم تھے۔مثلاً عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ آپ کے بھانجے تھے اور ان کی خلوت آپ کے ساتھ اور آپ کو چھونا کتاب وسنت اور اجماع کی رو سے جائز ہے۔اسی طرح شرعاً محرم کے ساتھ سفر کرنے کی بھی اجازت ہے۔جہاں تک اس لشکر کا تعلق ہے جو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے برخلاف برسر پیکار تھا؛ اگر اس میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بھائی محمد بن ابی بکر......جس نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی جانب دست تعدّی دراز کیا تھا......نہ ہوتا تو اجنبی لوگ آپ پر زیادتی کرنے سے نہ چوکتے۔سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے دست درازی کرنے والے کے بارے میں دریافت فرمایا:'' یہ کس کا ہاتھ ہے اللہ اسے آگ میں جلائے؟'' محمد بن ابی بکر نے کہا:'' ہمشیرہ! کیا آخرت سے پہلے دنیا میں جلائے؟''

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:''ہاں دنیا میں آخرت سے پہلے'' چنانچہ محمد بن ابوبکر کو مصر میں جلا دیا گیا تھا۔

اگر ناصبی نقاد شیعہ کو مخاطب کر کے کہے: جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ قتل کیے گئے تھے تو تمہارے قول کے مطابق آل حسین رضی اللہ عنہ کو قیدی بنا لیا گیا تھا۔ حالانکہ ان کے ساتھ وہی کچھ ہوا جو سلوک سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روا رکھا گیا تھا۔سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو واپس مدینہ بھیج دیا گیا اور حسب ضرورت نان ونفقہ بھی دیا گیا تھا۔اسی طرح قابو پا کر آل حسین رضی اللہ عنہ کو ان کے گھروں میں پہنچا دیا گیا اور نان ونفقہ بھی دیا گیا تھا۔اگر اس کا نام قیدی بنانا ہے اور یہ حرمت نبوی کے منافی ہے تو بے شک سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی قیدی بنایا گیا اور حرمت رسول کو پیش خاطر نہیں رکھا گیا تھا۔''

شیعہ اہل سنت پر زبان طعن دراز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب ایک شامی نے فاطمہ بنت حسین رضی اللہ عنہ کو قیدی بنانا چاہا تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسے روکتے ہوئے کہا:'' اللہ کی قسم! تم لوگ اسی صورت میں ایسا کر سکتے ہیں جب کہ تم اپنا دین چھوڑ کر پورے کافر ہو جاؤ۔''

بفرض محال اگر ایسا ہوا بھی تھا تو جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس بات کی اجازت طلب کرتے تھے کہ جنگ جمل و صفین میں جو لوگ ان کے حریف ہیں ان کو قیدی بنایا جائے اور ان کے مال کو مال غنیمت تصور کیا جائے وہ رفقائے عائشہ رضی اللہ عنہا کی نسبت بڑے مجرم تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جن لوگوں کو قیدی بنانا پیش نظر تھا ان میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر خواتین بھی تھیں۔ علاوہ ازیں جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ مطالبہ کر رہے تھے وہ دینی اعتبار سے اسے جائز سمجھتے اور اس پر اصرار کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے افکار و آراء سے متفق نہ ہوئے۔ تو انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا اور ان کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔ اس کے برعکس جس شامی نے فاطمہ بنت حسین رضی اللہ عنہا کو قیدی بنانا چاہا تھا وہ ایک محروم اقتدار غیر معروف آدمی تھا۔ نیز یہ کہ وہ شخص دینی حیثیت سے نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ جب حاکم با اختیار نے اس سے روکا تو وہ اس سے باز رہا۔

خلاصہ کلام! مسلمانوں کے خون ناموس و آبرو اور حرمت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حلال قرار دینے والوں کی تعداد اموی فوج کی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں زیادہ تھی۔ اس بات پر سب لوگوں کا اتفاق ہے۔ خوارج ہی کو دیکھئے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج سے الگ ہو گئے تھے۔ یہ عسکر معاویہ رضی اللہ عنہ کے شریر ترین لوگوں سے بھی شریر تر تھے۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف جنگ لڑنے کا حکم دیا تھا[1] اور سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور علماء کرام رحمہم اللہ نے ان کے خلاف صف آراء ہونے پر اجماع منعقد کر لیا تھا۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ روافض خوارج سے بھی زیادہ جھوٹے، ان سے بڑے ظالم اور کفر و نفاق اور جہالت میں بھی ان پر سبقت لے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں روافض خوارج کی نسبت عجز و ذلت میں بڑھے ہوئے ہوتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ یہ دونوں فریق حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کی فوج سے وابستہ تھے۔ یہی لوگ تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کمزوری کا سبب قرار پائے اور آپ اپنے حریفوں کے مقابلہ سے عاجز رہے۔

ہمارا مقصد یہاں یہ بتانا ہے کہ شیعہ حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کو جن اعتراضات کا نشانہ بناتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ان سے بھی زیادہ اہم اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ اگر شیعہ یہ جواب دیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مجتہد تھے؛ بنا بریں وہ طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کی نسبت اقرب الی الحق تھے۔

تو ہم کہیں گے: طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما بھی مجتہد تھے۔ اگرچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما سے افضل تھے تاہم اگر عائشہ رضی اللہ عنہا کی امداد کیلئے ان کا مدینہ سے نکلنا گناہ کا کام تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اقدام اس سے بھی بڑا جرم ہے۔

اگر شیعہ کہیں کہ طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما چونکہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو لے کر لڑنے کے لیے آ گئے تھے اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فعل کی ذمہ داری ان دونوں پر عائد ہوتی ہے۔ تو اہل سنت اس کے جواب میں یہ مثال پیش کر سکتے ہیں کہ جب

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ فی الاسلام(حدیث:۳۶۱۱)، صحیح مسلم۔ کتاب الزکاۃ۔ باب التحریض علی قتل الخوارج(حدیث:۱۰۶۶)۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ آپ نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو قتل کرایا؛ حالانکہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا :''اے عمار! تجھے باغی گروہ قتل کرے گا۔''

یہ سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا:''کیا ہم نے عمار رضی اللہ عنہ کو قتل کیا؟ ان کے قتل کے ذمہ دار تو وہ لوگ ہیں جوان کو ہماری تلواروں کے نیچے لے آئے تھے۔''❶

اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی یہ دلیل قابل تسلیم نہیں تو ان لوگوں کی دلیل و برہان بھی نا قابل قبول ہے جو کہتے ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی توہین وتذلیل کے ذمہ دار طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما ہیں۔اور اگر یہ دلیل قابل احتجاج ہے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے استدلال سے بھی انحراف کی گنجائش نہیں۔

روافض دیگر ظالم و جاہل لوگوں کی طرح ہمیشہ اسی قسم کے دلائل کا سہارا لینے کے عادی ہیں جن سے ان کے اپنے اقوال کا فساد وتناقض ثابت ہوتا ہے۔ یہ دلائل ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کے نظائر و امثال سے شیعہ کے خلاف احتجاج کیا جائے تو ان کے اقوال کا تانا بانا ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔اور اگر ان کے نظائر نا قابل احتجاج ہوں تو اس سے ان کے دلائل کا بطلان لازم آتا ہے۔اس لیے کہ متماثلین کے مابین مساوات ضروری ہے،مگر اس کا کیا علاج کہ شیعہ کا منتہائے مقصود صرف خواہش نفس ہے جس کے لیے علم کی چنداں ضرورت نہیں؛ اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت چھوڑ کر خواہش نفس کے پیچھے پڑ جائے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (القصص:۵۰)

''اس سے بڑھ کر بہکا ہوا کون ہے؟ جو اپنی خواہش کے پیچھے پڑا ہوا ہو بغیر اللہ کی رہنمائی کے، بیشک اللہ تعالی ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

جمہور اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما سے افضل ہیں؛ معاویہ رضی اللہ عنہ کی تو بات ہی دور کی ہے۔اہل سنت کہتے ہیں: جب مسلمانوں کے مابین آپ کی خلافت کے دور میں اختلاف واقع ہوگیا تو ایک گروہ وہ تھا جو آپ سے برسر پیکار تھے؛ اور دوسرا گروہ آپ کے ساتھ مل کر قتال کر رہا تھا۔ان دونوں گروہوں میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اوران کے ساتھی حق پر تھے۔جیسا کہ صحیحین میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا تھا:

''جب مسلمانوں میں فرقہ بندی کا ظہور ہوگا تو ایک فریق خروج کرے گا۔انہیں مسلمانوں کی دو جماعتوں میں سے وہ جماعت قتل کرے گی جو اقرب الی الحق ہوگی۔''❷

خروج کرنے والے خوارج تھے۔جنہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ اوران کے ساتھیوں نے قتل کیا۔اس حدیث سے عیاں ہوتا

❶ مسند احمد(٤/ ١٩٩)، مستدرك حاكم(٤/ ٣٨٦، ٣٨٧)۔
❷ صحيح مسلم باب ذكر الخوارج و صفاتهم (ح: ١٥٣). اس کی تخریج اس سے قبل گزر چکی ہے۔

ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جماعت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے گروہ کی نسبت اقرب الی الحق تھی۔ اہل سنت والجماعت علم کی روشنی میں عدل وانصاف کے ساتھ بات کرتے ہیں۔ ہر حق دار کو اس کا حق ادا کرتے ہیں۔

[حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی نصرت پر رافضی کا تعجب]:

[اشکال]: شیعہ مضمون نگار لکھتا ہے: ''یہ کیوں کر ممکن ہے کہ جب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف صف آرا ہوئیں تو دس ہزار مسلمان آپ کی تائید ونصرت کے لیے تیار ہو گئے۔ اور جب سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اپنا حق طلب کرنے کے لیے گئیں تو کسی ایک شخص نے بھی آپ کے حق میں ایک لفظ تک نہ کہا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں: واضح رہے کہ یہ دلیل شیعہ کے حق میں مفید ہونے کے بجائے انکے سخت خلاف ہے [اور ان پر ایک بڑی حجت ہے]۔ کوئی سلیم العقل آدمی اس بات میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں سمجھتا کہ مسلمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتے تھے؛ اسی لیے آپ کی بھی تعظیم کرتے تھے اور آپ کے قبیلہ اور بیٹی کی بھی تعظیم کرتے تھے۔ آپ کے اقارب خصوصاً آپ کی دختر نیک اختر کا ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سب سے زیادہ احترام کرتے تھے؛ اگر آپ رسول نہ بھی ہوتے۔ تو پھر اس وقت کیا عالم ہوگا جب آپ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں' اور لوگوں کو اپنی جان و مال آل واولاد سے بڑھ کر محبوب ہیں۔

یہ امر بھی کسی بھی عاقل کے لیے شک وشبہ سے بالا ہے کہ عرب جاہلیت واسلام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قبیلہ بنی عبد مناف کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قبیلہ بنی تیم اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبیلہ بنی عدی سے زیادہ مطیع فرمان تھے اور ان کی تعظیم کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت صدیق رضی اللہ عنہ منصب خلافت پر فائز ہوئے تو ان کے والد ابوقحافہ رضی اللہ عنہ سے کہا گیا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوگیا۔ تو اس نے کہا: بہت بڑا حادثہ پیش آ گیا۔ آپ کے بعد کون خلیفہ بنا؟ لوگوں نے کہا: ابوبکر رضی اللہ عنہ۔ تو ابوقحافہ نے پوچھا: کیا بنومخزوم اور بنوعبد شمس رضا مند ہیں؟'' لوگوں نے کہا: ہاں! ابوقحافہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یہ خاص عنایت ایزدی ہے۔'' [طبقات ابن سعد(۳/ ۱۸٤)]

یہ امر قابل ذکر ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت ہوئی تو ابوسفیان حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہاں آئے اور کہا: ''تمھیں یہ بات پسند ہے کہ خلافت بنوتیم میں ہو؟''

تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواباً فرمایا: ''ابوسفیان! اسلام کا معاملہ جاہلیت سے مختلف ہے۔''

[سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا مظلوم نہ تھیں]:

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام مسلمانوں میں سے کسی ایک بھی مسلمان نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو مظلوم نہیں سمجھا۔ اور نہ ہی کسی نے حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں یہ کہا کہ: حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا ان کے پاس کوئی حق ہے' اور نہ ہی ان دونوں حضرات کو ظالم تصور کیا تھا۔ کسی مسلمان نے اس بابت ایک لفظ تک زبان پر نہیں لایا۔ بفرض محال اگر مسلمان سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی امداد سے قاصر تھے تو آخر بات کرنے میں کیا حرج تھا؟ تو یہ اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ لوگ جانتے تھے کہ آپ پر ظلم نہیں ڈھایا گیا تھا۔ اس لیے کہ اگر لوگوں کو علم ہوتا کہ آپ مظلوم ہیں تو آپ کی

نصرت کا ترک کرنا دو میں سے کسی ایک سبب کے بنا پر ہوتا:

۱۔ یا تو لوگ آپ کی نصرت سے عاجز آ گئے ہوتے۔

۲۔ یا پھر سستی کی وجہ سے آپ کا حق ضائع کر دیا گیا ہوتا۔

۳۔ یا پھر بغض کی وجہ سے لوگوں نے ایسا نہیں کیا ہوگا؟ [یہ سب فرضی احتمالات ہیں]۔

اس لیے کہ انسان اگر کوئی کام نہ بھی کرسکتا ہو؛ پھر بھی جب پختہ ارادہ کر لیتا ہے تو اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا کر چھوڑتا ہے۔ اور جب ایسا نہیں کرنا چاہتا؛ حالانکہ اس چیز کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ کام کیا جائے؛ تو پھر اس کا سبب یا تو اس کام [کی اہمیت] سے جہالت ہے یا پھر کوئی ایسی رکاوٹ موجود ہے جس کی وجہ سے وہ اپنا ارادہ پورا نہیں کرسکتا۔ اگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اپنے شرف' اپنے قبیلہ اور والد محترم کے شرف و احترام کے باوجود مظلوم ہوتیں؛ حالانکہ آپ کے والد محترم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی مخلوق میں سب سے افضل ترین انسان اور امت کو سب سے بڑھ کر محبوب ہستی ہیں۔ اور لوگوں کو یہ علم ہو کہ آپ مظلوم ہیں؛ اور پھر بھی لوگ آپ کی نصرت سے رُکے رہیں؛ تو اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ یا تو لوگ آپ کی نصرت کرنے سے عاجز آ گئے ہوں؛ یا پھر آپ کے ساتھ بغض کی وجہ سے آپ کی نصرت کا ارادہ ترک کر دیا ہو۔ یہ دونوں باتیں [فقط احتمال اور] باطل ہیں۔ اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سارے کے سارے عاجز بھی نہیں آ گئے تھے کہ آپ کی نصرت میں ایک کلمہ تک اپنی زبانوں پر نہ لاسکیں۔ بلکہ وہ کسی بھی بڑی سے بڑی برائی کو روکنے پر قادر تھے۔

اس پر مزید یہ کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس ضمن میں کسی کی گفتگو پر کان دھرنے سے منکر نہ تھے۔ وہ طبعاً جابر بھی نہ تھے۔ نظر بریں یہ کسی طرح تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ الفت و مودّت کے اسباب کی موجودگی میں سب مسلمان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر نیک اختر رضی اللہ عنہا کے دشمن بن گئے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی یہی حال ہے۔ یہ نا قابل انکار حقیقت ہے کہ دورِ جاہلیت و اسلام میں جمہور قریش و انصار کو خصوصاً اور اہل عرب کو عموماً حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کوئی شکایت نہ تھی اور نہ ہی آپ نے اپنے اقارب میں سے کوئی قتل کیا۔ جن لوگوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتل کیا ان کا تعلق کسی بڑے قبیلہ سے نہیں تھا۔ صحابہ میں سے کوئی ایسا نہیں تھا جس نے اپنے کسی قریبی کو قتل نہ کیا ہو۔

البتہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بدو کفار عرب کے حق میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت بڑے سخت تھے۔ یوں بھی آپ کی شدت و حدّت ضرب المثل کی حد تک معروف تھی۔ مگر بایں ہمہ آپ خلیفہ منتخب ہوئے اور اس قدر مقبول ہوئے کہ جب شہید ہوئے تو کوئی شخص آپ سے ناراض نہ تھا؛ بلکہ تمام لوگ اچھے الفاظ میں آپ کی تعریف کرتے تھے اور آپ کے لیے دست بہ دعا تھے۔ سب لوگوں کو آپ کی شہادت کا صدمہ ہوا۔ اس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں شیعہ کے دعوے من گھڑت اور بے بنیاد ہیں۔ نیز یہ کہ مسلمان سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو قطعی طور پر مظلوم تصور نہیں کرتے تھے۔ پھر یہ بات کس قدر حیرت آفریں ہے کہ مسلمان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لینے کے لیے تو اپنی جانیں تک قربان کر دیں مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کا کوئی یار و مددگار نہ ہو۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ صفین میں بنوعبد

مناف کی مخالفت کے باوجود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی نصرت و اعانت کے لیے گردنیں تک کٹوا دیں ؛مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کے بعد ان کو منصب خلافت سے الگ کرنے کے لیے کوئی مسلمان حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہ دے۔حالانکہ بنو عبد مناف ان کے ساتھ تھے۔مثلاً عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ ، بنی ہاشم میں سب سے بڑے تھے اور ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ بنو امیہ میں سب سے بڑے تھے۔اور یہ دونوں اکابر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف مائل تھے۔اب سوال یہ ہے کہ ایسے نازک مرحلہ پر ابتداء ہی میں لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خلاف صف آرائی کیوں نہ کی؟ حالانکہ صدیقی خلافت کا ابھی آغاز تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نصرت وحمایت کے لیے لڑنا اولیٰ وافضل تھا؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے ولایت کا حاصل ہونا آسان بھی تھا۔تاریخ اسلام کے ایسے نازک موڑ پر اگر کچھ لوگ سامنے آ کر یہ کہہ دیتے کہ علی رضی اللہ عنہ وصی ہیں، لہٰذا ہم کسی اور کی بیعت کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کا ارتکاب نہیں کر سکتے۔ نیز یہ کیوں کر ممکن ہے کہ بنو ہاشم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر بنو تیم کے ظالموں اور منافقوں کا ساتھ دیں؟۔حالانکہ بنو ہاشم جاہلیت اور اسلام ہر دور میں بہترین لوگ رہے ہیں۔اگر ایسا ہوتا تو عوام الناس ان کی حمایت کے لیے کھڑے ہو جاتے خصوصاً جب کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس ترغیب وتخویف کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔

فرض کیجیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امداد کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور لوگوں کی ایک جماعت موجود تھی۔تو یہ لوگ کسی صورت میں بھی تعداد کے اعتبار سے ان لوگوں سے زیادہ نہیں ہو سکتے جو واقعہ جمل میں طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما اور واقعہ صفین میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اور اس کے باوصف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے جنگ کی تھی۔ باوجود اس کے کہ یہ لوگ علم و دین کے اعتبار سے حضرات سابقین اولین سے بہت ہی فروتر تھے۔ان میں سابقین اولین کی بہت کم تعداد تھی۔ تو پھر اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت حق پر تھے اور ان کے مخالفین باطل پر تھے تو ان لوگوں سے انہوں نے قتال کیوں نہ کیا جو ان کی نسبت بہت زیادہ افضل تھے؟ حالانکہ اس وقت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اولیاء وانصار کثرت کے ساتھ ساتھ شان و شوکت سے بہرہ ور تھے؛ اور علم وایمان میں بھی عظمتوں کے حامل تھے۔اور آپ کے مخالفین - بالفرض اگر اس وقت کوئی مخالف تھا؛ تو وہ- عاجزی وکمزوری کا شکار تھے؛علم وایمان میں بھی فروتر تھے۔اور دشمنی میں بھی کم تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلاف نبرد آزما ہونے میں کیا چیز مانع تھی؟ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر ہوتے تو ابوبکر وعمر اور سابقین اوّلین صحابہ رضی اللہ عنہم دنیا کے بدترین لوگوں میں سے ہوتے اور ان کا ظالم و جاہل ہونا کسی شک وشبہ سے بالا ہوتا۔کیونکہ انہوں نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کے فوراً بعد دین کو بدل دیا' اور اس میں تحریف کر دی ؛ آپ کے وصی پر ظلم کیا۔اور آپ کی نبوت کے ساتھ وہ حشر کیا جو یہود و نصاری حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کے فوراً بعد نہ کر سکے۔ اس لیے کہ یہودیوں نے موسیٰ علیہ السلام کی موت کے بعد وہ کچھ نہیں کیا جو رافضیوں نے اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے نبی کی موت کے بعد ایسے کیا۔ان کے قول میں اگر واقعی سچائی ہوتی تو اس امت کا شمار بدترین اور شریر ترین امتوں میں ہوتا۔اور اس کے پہلے

لوگ سب سے بڑے شریر ہوتے ۔ حالانکہ یہ بات ظاہر البطلان ہے۔اور اہل اسلام کے لیے اس عقیدہ ونظریہ کا فساد و خرابی معلوم شدہ چیز ہے۔

[شیعہ مذہب کی بنیاد]:

اس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ شیعہ مذہب کا بانی ملحد وزندیق اور دین اسلام واہل اسلام کا دشمن تھا۔اور وہ تاویل کرنے والے مبتدعین مثلاً خوارج وقدریہ کی طرح نہ تھا۔ بعد کے دور میں اہل ایمان میں شیعہ کے اقوال اس لیے رائج ہو گئے کہ وہ جہالت کی بنا پر کھرے اور کھوٹے میں امتیاز قائم نہ کر سکے۔

یہ بڑا اہم سوال ہے کہ وہ کون سے محرکات تھے جن کے تحت صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے جنگ جمل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا ساتھ دیا؟ مگر جب سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اپنا حق طلب کرنے کے لیے آئیں تو کوئی بھی ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے خلاف ان کی مدد کے لیے تیار نہ ہوا؟ اگر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین دنیوی مال ومتاع اور سیاسی اقتدار کے بھوکے تھے تو انھیں بنو ہاشم (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کا ساتھ دینا چاہیے تھا جو عرب بھر میں ممتاز تھے۔اسی بنا پر صفوان بن اُمیہ جمحی نے غزوہ حنین کے موقع پر جب لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے تھے؛اور کسی نے کہا: ان کو اب سمندر ہی قبول کرے گا۔اور کوئی کہنے لگا: سارا جادو ٹوٹ گیا؛[اس وقت صفوان نے] کہا تھا:

’اللہ کی قسم! اگر کوئی قریشی مجھے اپنا غلام بنالے تو یہ بات مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ ثقیف کا کوئی آدمی میرا آقا ہو۔‘‘[سیرة ابن هشام ٤/ ٨٦]

جو لوگ فتح مکہ کے موقع پر مشرف بہ اسلام ہوئے تھے،صفوان ان میں سرکردہ آدمی تھا وہ سابقہ مقولہ کی طرح یہ بات کہنے کا حق رکھتا تھا۔اگر بنی عبدمناف کا کوئی شخص مجھے اپنا غلام بنالے تو یہ بات مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ بنی تیم کا کوئی آدمی میرا آقا ہو۔‘‘اگر اسی بنا پر کسی کو تقدیم حاصل ہوتی تو باتفاق العقلاء بنی ہاشم کو بنی تیم پر تقدیم وسبقت حاصل تھی۔[تو اس صورت میں] اگر علی رضی اللہ عنہ کو آگے نہ کرتے تو حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو خلیفہ بنالیتے۔یہ سوال بھی بے جا نہیں کہ اگر صحابہ دنیوی اقتدار کے حریص تھے تو اس مقصد کے لیے عباس رضی اللہ عنہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نسبت موزوں تر تھے، پھر ان کو خلیفہ کیوں نہ بنالیا؟

[فرض کر لیجیے کہ] اگر یہ لوگ ہاشمی وصی پر ظلم کرنے پر تل ہی گئے تھے؛ اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس لیے مقدم نہیں کیا وہ اس کو ناپسند کرتے تھے؛ تو پھر بھی جن سے مقصود خلافت حاصل ہوسکتا تھا دوسرے ہاشمی تھے؛ یعنی حضرت عباس رضی اللہ عنہ؛ انہیں مقدم کیا ہوتا' اور خلیفہ بنایا ہوتا۔آپ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نسبت اس کام کے لیے زیادہ موزوں ہوسکتے تھے؛ جو لوگوں کی ایسے مدد نہیں کر سکے جیسے عباس رضی اللہ عنہ کرتے۔اور انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر اس کڑوے حق پر بھی لگاتے۔اگر اس کڑوے حق کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ناپسند کیا جانا تھا؛ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے زیادہ ناپسندیدہ لگتا۔اور اگر اس سے مقصود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اس میٹھی اور شیرین دنیا کا حصول تھا؛ تو اس کے مواقع حضرت علی اور حضرت

عباس رضی اللہ عنہما سے بھی تھے۔ حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو چھوڑ کر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانا؛ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ صحابہ نے حق پر عمل کیا تھا اور وہ حق وصداقت کا دامن کسی صورت میں چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اور انہوں نے وہ کام کیا جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کی رہنمائی کی تھی۔ اور صحابہ جانتے تھے کہ اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی تقدیم پر راضی تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو اس بات کا واضح اور کھلا ہوا علم حاصل تھا۔ کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کی باتیں سنتے رہتے تھے [جن سے ابو بکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت ظاہر ہوتی تھی]۔ اس تجربہ' مشاہدہ' اور سماع کی روشنی میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کی تقدیم وفضیلت اور آپ کے واجب الاطاعت ہونے کا پتہ چل گیا تھا۔ اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:

''تم میں سے ایک شخص بھی ابو بکر رضی اللہ عنہ جیسا نہیں جس کی خاطر گردنیں کٹوائی جائیں۔''❶

اس سے مقصود یہ تھا کہ تم پر ابو بکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت ظاہر اور کھلی ہوئی ہے۔ اس میں کسی بحث اور غور وفکر کی ضرورت نہیں۔ ایسے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مہاجرین وانصار کی موجودگی میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''بلکہ آپ ہمارے سردار ہیں اور ہم میں سب سے بہتر ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی سب سے زیادہ آپ کو چاہتے تھے۔''❷

تمام لوگوں نے اس کا اقرار کیا؛ کسی ایک نے بھی انکار نہیں کیا اور نہ ہی کسی ایک نے اس بارے میں کوئی جھگڑا کیا۔ حتی کہ انصار میں سے جو لوگ خلافت کے طلبگار تھے؛ انہوں نے بھی اس دعوے کو رد نہیں کیا؛ نہ ہی کسی ایک نے یہ کہا کہ: نہیں بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ محبوب تھے؛ یا کوئی دوسرا آپ کو زیادہ محبوب تھا؛ اور وہ آپ سے افضل وبہتر ہے۔

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ عادتاً یہ بات ممتنع ہے خصوصاً صحابہ کرام کی عادات کے اعتبار سے؛ جو کہ کمال دین اور معرفت حق کی وجہ سے حق بات کہنے کے خوگر تھے؛ کہ ان میں سے کوئی [باقی صحابہ پر] حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت جانتا ہو اور پھر اس بارے میں گفتگو نہ کرے' بلکہ سارے کے سارے بغیر کسی خوف اور لالچ کے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی تقدیم وفضیلت پر یک زبان تھے۔

❶ صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب رجم الحبلی فی الزنا اذا احصنت (ح: ٦٨٣٠) مطولاً۔
❷ صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ''لو کنت متخذا خلیلا'' (ح:٣٦٦٨) مطولاً۔

فصل: ...... حضرت عائشہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کے متعلق رافضی پر رد

[اعتراض] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:'' عائشہ رضی اللہ عنہا کو ام المومنین کہہ کر پکارتے ہیں جب کہ دیگر امہات المومنین کو اس لقب سے ملقب نہیں کرتے۔ اور ایسے ہی آپ کے برادر محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ان کے شرف و منزلت اور اپنے باپ اور بہن سے قربت کے باوجود مؤمنین کا ماموں نہیں کہتے؛ جب کہ امیر معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما کو مؤمنین کا ماموں کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کی بہن ام حبیبہ بنت ابوسفیان رضی اللہ عنہا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج [مطہرات رضی اللہ عنہن] میں سے ایک تھیں۔ محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بہن اور اس کا باپ معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہن اور باپ کی نسبت بہت بڑے اور عظیم مرتبہ والے تھے۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جواب] : ''شیعہ کا دعوی ہے کہ:'' [اہل سنت] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ام المومنین کہہ کر پکارتے ہیں جب کہ دیگر امہات المومنین کو اس لقب سے ملقب نہیں کرتے۔''

ہم کہتے ہیں کہ: یہ کھلا ہوا بہتان ہے اور ہر کس و ناکس اس سے آگاہ ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ یہ شیعہ مصنف اور اس جیسے اس فرقہ کے دوسرے لوگ جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں' یا پھر خواہشات پرستی میں تجاوز کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھیں اندھی کردی ہیں کہ ان پر اس بات کا جھوٹ ہونا بھی مخفی رہ گیا۔ وہ نواصب پر رد کرتے ہیں کہ: جب ان سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: کیا تم جانتے ہو کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر کا جگر گوشہ ہوں؟ تو وہ کہنے لگے:'' اللہ کی قسم! ہم نہیں جانتے۔'' ایسی بات وہی منکر کہا سکتا ہے جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے نسب کا انکار کرتا ہو۔ اور جان بوجھ کر جھوٹ گھڑتا اور افتراء پردازی کرتا ہو؛ اور اللہ تعالیٰ نے اتباع ہوا کی وجہ سے اس کی آنکھیں اندھی کردی ہوں۔ یہاں تک کہ اس پر ایسا واضح حق بھی پوشیدہ رہ جائے۔ بیشک خواہش پرستی کی آنکھ ہمیشہ کے لیے اندھی ہی ہوتی ہے۔ رافضہ حق کے انکار میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں؛ اور جان بوجھ کر اندھے بنے رہتے ہیں۔ فرقہ نصیریہ کہتا ہے کہ حسن و حسین حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین کے بیٹے نہ تھے۔ بلکہ ان کے والد سلمان فارسی رضی اللہ عنہ تھے۔ اور ان میں سے بعض ایسے ہی جو کہتے ہیں کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ فوت نہیں ہوئے۔ اور ایسا ہی دعوی بعض دوسرے لوگوں کے متعلق بھی کیا گیا ہے۔

بعض شیعہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں مدفون نہیں۔ نیز یہ کہ حضرت رقیہ و ام کلثوم رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں نہیں، بلکہ کسی دوسرے خاوند سے سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بیٹیاں ہیں۔''[1]

[1] ایک اور شخص جس نے حضرت رقیہ و ام کلثوم رضی اللہ عنہما کے دختر رسول ہونے سے انکار کیا ہے اللہ کا دشمن محمد مہدی کاظمی قزوینی ہے۔ موصوف شیعہ مصنف نے اپنی کتاب '' منهاج الشريعة: ۲/ ۲۹۱'' میں نہ صرف دونوں کے دختر رسول ہونے سے انکار کیا ہے بلکہ وہ ان کی فضیلت و عظمت کا بھی منکر ہے۔

اس کے علاوہ بھی انکار حق میں ان کی داستانیں سبھی جانتے ہیں جو ان نواصب کی داستانوں سے بڑھ کر ہیں جنہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ آج کے شیعہ ان ناصبی مردودوں سے بڑے جھوٹے، بڑے ظالم اور بڑے جاہل ہیں؛ جنہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا۔

کسی شخص سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ ازواج النبی میں سے ہر ایک کو آیت قرآنی کے اتباع میں ام المومنین کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ عائشہ؛ حفصہ؛ زینب بنت جحش؛ ام سلمہ؛ سودۃ بنت زمعہ؛ میمونہ بنت الحارث الہلالیہ؛ جویریہ بنت الحارث المصطلقیہ؛ صفیہ بن حیی بن اخطب الہارونیہ؛ رضی اللہ عنہن۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ ﴾ [الأحزاب ٦]

''پیغمبر مومنوں پر خود ان سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں اور پیغمبر کی بیویاں مومنوں کی مائیں ہیں۔''

تمام علماء اس بات کو جانتے ہیں' (کسی پر بھی یہ چیز پوشیدہ نہیں)۔ اور تمام علماء کرام رحمہم اللہ کا اجماع ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ان ازواج مطہرات کا نکاح کسی دوسرے انسان سے حرام ہے۔ اور ان کا احترام تمام لوگوں پر واجب ہے۔ پس آپ نکاح کی حرمت اور عزت و احترام کے لحاظ سے مائیں ہیں۔ محرم ہونے کے لحاظ سے مائیں نہیں۔ ان کے اقارب [محرم] کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے ان کے ساتھ خلوت میں بیٹھنا یا چلنا جائز نہیں تھا۔ اور نہ ہی ان کے ساتھ اکیلے میں سفر کیا جا سکتا تھا۔ جیسے کوئی انسان اپنی محرم رشتہ داروں کے ساتھ سفر کر سکتا ہے۔ اسی لیے انہیں پردہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰٓی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ ﴾ [الأحزاب ٥٩]

''اے نبی! اپنی بیویوں سے اور اپنی صاحبزادیوں سے اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے اوپر چادریں لٹکایا کریں۔ اس سے بہت جلد ان کی شناخت ہو جایا کرے گی پھر نہ ستائی جائیں گی۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ لَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِیْمًا﴾ [الأحزاب ٥٣]

''جب تم نبی کی بیویوں سے کوئی چیز طلب کرو تو پردے کے پیچھے سے طلب کرو تمہارے اور ان کے دلوں کیلئے کامل پاکیزگی یہی ہے؛ اور تمہیں جائز نہیں ہے کہ تم رسول اللہ کو تکلیف دو اور نہ تمہیں یہ حلال ہے کہ آپ کے بعد کسی وقت بھی آپ کی بیویوں سے نکاح کرو۔ یاد رکھو اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔''

ازواج مطہرات عزت و احترام کے لحاظ سے ماں کی منزلت پر ہیں۔ اسی وجہ سے علماء رحمہم اللہ کے یہاں یہ امر متنازع

فیہ ہے کہ آیا ازواج النبی کے بھائیوں کو ''ماموں'' کہا جائے یا نہیں؟ بعض نے اسے جائز ٹھہرایا ہے۔ ❶

کچھ لوگوں نے کہا ہے: انہیں ماموں کہا جائے گا۔ اس قول کے مطابق یہ حکم صرف امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص نہیں؛ اس صورت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد اور عبدالرحمٰن ؛ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے : عبداللہ ؛ عبیداللہ ؛ اور عاصم ان میں شامل ہوں گے۔ ان میں عمرو بن الحارث بن ابوضرار حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے بھائی ؛ اور عتبہ بن ابوسفیان اور یزید بن ابوسفیان اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم اجمعین دونوں بھائی بھی شامل ہوں گے۔

بعض علماء اہل سنت والجماعت کہتے ہیں: ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے بھائیوں کو ماموں نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے کہ اگر انہیں ماموں کہا جائے تو پھر لازم ہوگا کہ ان کی بہنیں خالائیں ٹھہریں گی۔ اگر یہ لوگ ماموں اور خالائیں بن جائیں تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ خالہ کا نکاح بھانجے سے نہیں ہوسکے گا۔ اور ماموں کا نکاح بھانجی سے حرام ہوگا۔

یہ بات نص اور اجماع سے ثابت ہے کہ مومن مردوں اور عورتوں کے لیے جائز ہے کہ وہ ازواج مطہرات کی بہنوں اور بھائیوں سے نکاح کریں۔ جیسا کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ام المؤمنین میمونہ بنت الحارث کی بہن ام الفضل سے شادی کی تھی؛ اور ان سے حضرت عبداللہ اور فضل بن عباس رضی اللہ عنہما پیدا ہوئے۔ عبداللہ بن عمر ؛ عبیداللہ بن عمر ؛ اور عاصم بن عمر رضی اللہ عنہم اجمعین نے بھی مؤمن عورتوں سے شادیاں کی تھیں۔ ایسے ہی معاویہ ؛ عبدالرحمٰن بن ابوبکر' محمد بن ابوبکر ؛ [اور دوسرے افراد] رضی اللہ عنہم اجمعین نے اہل ایمان عورتوں سے شادیاں کی تھیں۔ اگر یہ حضرات ان خواتین کے ماموں ہوتے ؛ تو ماموں کے لیے ہرگز جائز نہ تھا وہ اپنی بھانجی سے نکاح کرے۔

ایسے ہی امہات المؤمنین کی ماؤں کو مؤمنین کی نانیاں اور ان کے باپوں کو نانا نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے کہ امہات المؤمنین کے حق میں نسب کے تمام احکام ثابت نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی حرمت اور تحریم ثابت ہے۔ نسب کے احکام بہت سارے ہیں۔ [اس کا یہی حال ہے] جیسے دودھ پینے سے حرمت اور تحریم تو ثابت ہوتی ہے مگر اس سے نسب کے سارے احکام ثابت نہیں ہوتے۔ اس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے۔

جن لوگوں نے ان میں سے کسی ایک کے لیے مؤمنین کے ماموں ہونے کا کہا' اس نے ان باقی احکام میں کوئی تنازع نہیں کیا۔ مگر ان کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ ان حضرات کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سسرالی رشتہ ہے۔ ان میں سے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ زیادہ مشہور ہوگئے۔ جیسے کاتبین وحی دوسرے لوگ بھی تھے' مگر آپ کو کاتب وحی مشہور کیا گیا ہے اور

❶ یہ جاہل اہل سنت کا قول ہے اور وہ شیعہ کو چڑانے کے لیے اس طرح کہتے ہیں ورنہ دونوں میں کوئی فرق نہیں]۔ چونکہ شیعہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی عظمت وفضیلت کے منکر تھے اور اس میں وہ حد درجہ تجاوز کر گئے تھے اس کا ردعمل یہ ہوا کہ لوگوں نے حضرت معاویہ کو اس لقب (خال المؤمنین) سے نوازا۔ قاضی ابوبکر بن العربی المتوفی (٤٦٨......٥٤٣) لکھتے ہیں کہ انھوں نے عباسی خلافت کے زمانہ یعنی پانچویں صدی کے نصف ثانی اور چھٹی صدی کے نصف اول میں بغداد کی مساجد کے دروازوں پر یہ الفاظ لکھے ہوئے بچشم خود مشاہدہ کیے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب لوگوں سے بہتر ابوبکر ہیں، پھر عمر، پھر عثمان، پھر علی اور پھر مومنوں کے ماموں معاویہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ (العواصم من القواصم ، ص:٢١٣)

نبی کریم ﷺ کے ساتھ سواری پر پیچھے بیٹھنے والے دوسرے لوگ بھی تھے۔[مگر فضل بن عباس رضی اللہ عنہما اس میں زیادہ مشہور ہیں]

جو لوگ ایسا کلام کرتے ہیں' ان کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خصوصیات بیان کریں ؛ بلکہ وہ آپ کا نبی کریم ﷺ کے ساتھ تعلق بیان کرنا چاہتے ہیں[کیونکہ رافضی اس کے منکر ہیں]۔جس طرح آپ کے باقی فضائل بیان کیے جاتے ہیں' ان سے مقصود آپ کی خصوصیات بیان کرنا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''کل میں جھنڈا ایسے آدمی کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوگا' اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں۔''[البخاری ٥/ ١٨؛ مسلم ٤/ ١٨٧١]

نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''نبی امی ﷺ نے مجھ سے یہ عہد لیا تھا کہ مجھ سے محبت صرف وہی انسان رکھے گا جو مؤمن ہوگا اور مجھ سے بغض وہی رکھے گا جو منافق ہوگا۔''[تقدم تخريجه]

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''آپ کو یہ بات پسند نہیں کہ آپ کو مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارون کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی۔بس اتنا ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔''[البخاری ٥/ ١٩؛ مسلم ٤/ ١٨٧١]

یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خصوصیات نہیں ہیں' بلکہ آپ کے فضائل و مناقب ہیں جن کی وجہ سے آپ کی فضیلت پہچانی جاتی ہے۔ یہ روایات اہل سنت کے ہاں مشہور ہیں تاکہ ان سے ان لوگوں پر رد کریں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر قدح کرتے ہیں اور آپ کو ظالم اور کافر کہتے ہیں جیسے خوارج اور نواصب اور بعض دیگر لوگ۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی رسول اللہ ﷺ کی صحبت میسر آئی ہے' اور آپ کے ساتھ خانگی تعلق بھی ہے ۔ جب روافض نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی تکفیر اور ان پر لعنت بھیجنے کی اجازت دے دی تو بعض اہل سنت نے آپ کو ''خال المومنین'' کے لقب سے ملقب کیا۔تاکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آپ کا تعلق لوگوں کو یاد دلائیں۔اور اس طرح سے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تعلق رکھنے والوں کے حقوق کا ان کے درجات کے حساب سے خیال رکھا جائے۔

اگر اس قدر کوئی انسان اجتہاد کرے اور خطاء کا ارتکاب کر جائے ؛ تو وہ یقیناً اس انسان سے بہت بہتر ہوگا جو ان کے ساتھ بغض کرنے میں اجتہاد کرے اور غلطی کا مرتکب ہو۔اس لیے کہ لوگوں کے ساتھ احسان کرنا اور معاف کر دینا برائی کرنے اور بدلہ لینے سے بہتر ہے۔جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

''شبہات کی وجہ سے حدود کو ختم کرو۔''[ضعيف الجامع الصغير ١/ ١١٧؛ للألباني-]

ایسے ہی وہ مجہول جو فقیر ہونے کا دعوی کرے' اسے صدقہ دیا جاسکتا ہے ۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان دو آدمیوں کو دیا تھا جنہوں نے آپ سے سوال کیا تھا۔[آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نگاہ اٹھا کر ان کو دیکھا پھر نظر جھکالی]؛

آپ ﷺ نے پایا کہ یہ دونوں آدمی تندرست جوان ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''اگر تم چاہو تو میں تم کو صدقہ دے دوں گا لیکن صدقہ میں اس شخص کا کوئی حق نہیں جو غنی ہو یا صحت مند ہو اور کمانے کے لائق ہو۔'' [1]

اس لیے کہ مال دار کو دینا فقیر کو محروم رکھنے سے بہتر ہے۔اور مجرم کو معاف کرنا بری انسان کو سزا دینے سے بہتر ہے۔ جب یہ لوگوں میں سے کسی ایک عام انسان کے بارے میں ہے تو نبی کریم ﷺ کے صحابہ اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ ان کے ساتھ یہ سلوک کیا جائے۔ اگر کوئی مجتہد صحابہ کیساتھ احسان؛ ان کے لیے بھلائی کی دعا؛ ان کی تعریف وثناء اور ان کا دفاع کرتے ہوئے غلطی کا مرتکب ہوجائے تو وہ اس انسان سے [لاکھ درجہ] بہتر ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین پر طعن و تشنیع، لعنت و ملامت کرنے میں غلطی کا مرتکب ہو۔

صحابہ کرام کے مابین جو جھگڑے ہوئے؛ ان کی آخری حد یہ ہوسکتی ہے کہ وہ گناہ کا کام تھے۔گناہوں کی مغفرت کئی اسباب کی بنا پر ہوجاتی ہے۔اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین بعد میں آنے والے باقی لوگوں سے بڑھ کر اس مغفرت کے حق دار ہیں۔آپ کسی ایک کو بھی ایسا نہیں پائیں گے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی لغزشوں کو بڑا بنا کر لوگوں میں پیش کر رہا ہو مگر وہ خود اس سے بہت بڑی خامیوں اور کوتاہیوں میں مبتلا ہوتا ہے۔ یہ سب سے بڑی جہالت اور بہت بڑا ظلم ہے۔

رافضی چھوٹے گناہوں اور لغزشوں کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین پر زبان طعن دراز کرتے ہیں؛ مگر ان کفار اور منافقین کے کبیرہ گناہوں سے چشم پوشی کرتے ہیں جن کی یہ لوگ مدد کرتے ہیں۔جیسے یہود و نصاری؛ مشرکین؛ اسماعیلیہ؛ نصیریہ وغیرہ۔پس جو کوئی مسلمانوں کے ساتھ ان کے گناہوں پر تو تکرار کرے؛ مگر کفار اور منافقین کے ساتھ ان کے کفر و نفاق پر بھی خاموش رہے؛ بلکہ اکثر و بیشتر اوقات ان کفار و منافقین کی مدح سرائی میں رطب اللسان رہے' تو ظاہر ہے کہ ایسا انسان لوگوں میں سب سے بڑا جاہل اور ظالم ہے۔بھلے اس کی جہالت اور ظلم وستم اسے درجہ کفر تک نہ بھی پہنچائیں۔

شیعہ کے تناقض اور جہالت کا یہ عالم ہے کہ اس نے یہ تو کہا ہے کہ: معاویہ رضی اللہ عنہ کو لوگ اہل ایمان کا ماموں کہتے ہیں مگر محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ان الفاظ میں یاد نہیں کرتے۔[ہم شیعہ مضمون نگار سے پوچھتے ہیں کہ]اس نے باقی ان لوگوں کا ذکر کیوں نہیں کیا جو اس وصف میں برابر کے شریک ہیں۔اس نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا [جو معاویہ اور محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہما دونوں سے افضل تھے] اور ان جیسے دوسرے لوگوں کا ذکر کیوں نہیں کیا؟

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اہل سنت والجماعت اس وصف کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خصوصیات میں شمار نہیں

---

[1] سننِ أبي داود:۲/ ۱۵۹؛ کتاب الزکاۃ، باب من يعطى الصدقة وحدِ الغنِي؛ سننِ النسائِي:۵/ ۷۵؛کتاب الزکاۃِ، باب مسألةِ القوِي المكتسِب المسندِ ط. الحلبي: ٤/ ٢٢٤، ٥/ ٣٦٢. قال الشيخ أحمد عبد الرحمنِ البنا رحِمه الله فِي بلوغِ الأماني مِن سرارِ الفتحِ الرباني:۳/ ۹۳، عبيد اللهِ بن عدِيِ بنِ الخِيارِ بِكسرِ الخاءِ...... وِلد فِي عهدِ النبِيِ ﷺ وقال العِجلِي: ثِقة مِن كِبارِ التابِعِين وصحح الألباني الحدِيث فِي صحِيحِ الجامِعِ الصغِيرِ

کرتے۔جبکہ رافضی اس کے مقابلہ میں محمد بن ابو بکر کو خاص طور پر پیش کرتے ہیں۔ جب کہ اسے علم و دین [تقویٰ اور زہد] میں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی ہوا بھی نہیں لگی۔ بلکہ وہ اپنے بھائی عبدالرحمٰن بن ابو بکر رضی اللہ عنہما کے برابر بھی نہیں ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر رضی اللہ عنہما کو صحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف حاصل ہے۔جبکہ محمد بن ابو بکر رضی اللہ عنہ حجۃ الوداع والے سال ذوالحلیفہ کے مقام پر پیدا ہوا۔تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کو حکم دیا کہ: حالت نفاس میں ہی غسل کریں اوراحرام کی نیت کرلیں۔ بعد میں آنے والے لوگوں کیلئے یہ عمل ایک سنت بن گیا۔

محمد بن ابو بکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے صرف پچیس ذوالقعدہ سے لیکر ربیع الاول کے شروع تک کے ایام پائے۔ یہ چار ماہ بھی نہیں بنتے۔جب آپ کے والدمحترم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو اس وقت آپ کی عمر تین سال سے بھی کم تھی۔آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی ہونے کا شرف حاصل نہیں۔اور نہ ہی باپ کی منزلت سے کوئی قربت حاصل ہے۔بس صرف اتنی ہی قربت تھی جو اس عمر کے کسی بھی بچے کو اپنے باپ سے ہوتی ہے۔

محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مختص ہونے کی وجہ یہ تھی کہ محمد آپ کے پروردہ اور آپ کی بیوی کے بیٹے تھے۔اس لیے کہ حضرت ابوبکر کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کی بیوی اور محمد کی ماں اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کرلیا تھا۔عثمانی خلافت کے زمانہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے محمد بن ابی بکر پر شرعی حد لگائی تھی؛ جس کا محمد نے اپنے باپ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی منزلت کی وجہ سے اپنے دل میں ملال محسوس کیا۔یہی وجہ تھی کہ جب اہل فتنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کی تو یہ بھی ان کیساتھ تھا۔بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں داخل ہوا اور ان کی داڑھی پکڑی۔تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: تم نے بہت بڑی جگہ ہاتھ ڈالا ہے؛ تمہارا باپ اس داڑھی کو کبھی ہاتھ لگانے والا نہیں تھا۔کہا جاتا ہے: جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ کلمات کہے تو محمد واپس چلا گیا۔جس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیا وہ کوئی دوسرا آدمی تھا۔

پھر اس نے مختلف جنگوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ آپ کی جانب سے والیٔ مصر قرار پایا۔ پھر لڑائی میں مارا گیا۔شیعان عثمان نے اسے قتل کیا؛اور نعش گدھے کی کھال میں بند کر کے جلا دی گئی؛ اسے قتل کرنے والا معاویہ بن حدیج نامی شخص تھا۔[اور اس طرح اسکے گناہوں کا کفارہ ہو گیا اور قتل اسکے حق میں بہتر ثابت ہوا]۔[الاصابہ ۳/ ۴۱۱ ؛ الاعلام ۸/ ۱۷۱ ؛ تاریخ الطبری ۵/ ۱۰۴]

روافض کی یہ پرانی عادت ہے کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والوں کی مدح و ستائش میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے معاونین کی تعریف و توصیف میں مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہیں۔اسی عادت کے مطابق وہ محمد بن ابو بکر رضی اللہ عنہ کی تعریف و توصیف میں مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہیں۔جس کی حد یہ ہے کہ وہ محمد کو ان کے والد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں افضل قرار دیتے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد افضل امت پر تو لعنت بھیجی جائے اور ان کے اس بیٹے کی مدح و ستائش میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جائیں جس کو صحبت نبوی

حاصل ہے نہ کوئی سبقت اور فضیلت۔ اس سے تعظیم فی الانساب میں تناقض لازم آتا ہے۔ اگر کسی شخص کے والد کے کافر یا فاسق ہونے سے اس کو کچھ نقصان نہیں پہنچتا تو ہمارے نبی کریم ﷺ، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کے آباء کے کافر ہونے کی بنا پر کچھ ضرر لاحق نہیں ہوگا۔ اور اگر ضرر پہنچتا ہے تو (العیاذ باللہ) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کفر و فسق سے یقیناً محمد بن ابی بکر کی ذات میں بھی قدح وارد ہوگی۔ شیعہ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کے مداح ہیں۔ ادھر جمہور اہل اسلام محمد کے بیٹے قاسم ❶ اور اس کے پوتے عبدالرحمٰن بن قاسم کو اس سے افضل قرار دیتے ہیں۔ شیعہ محمد کے بیٹے قاسم اور پوتے عبدالرحمٰن کو صرف اس لیے نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ وہ شرارت پسند نہ تھے۔

[محمد بن ابی بکر رحمہ اللہ کا مقام و مرتبہ]

[اشکال]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''محمد بن ابی بکر عظیم المرتبت تھا۔''

[جواب]: اگر عظمت سے مراد عظمت نسب ہے؛ تو یہ بے کار ہے۔ اس لیے کہ شیعہ اس کے والد اور بہن کے بارے میں زبان طعن دراز کرتے ہیں۔ اہل سنت کا معاملہ اس سے یک سر جداگانہ نوعیت کا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے یہاں عظمت و فضیلت کا مدار و انحصار نسب پر نہیں، بلکہ تقوی پر ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ﴾ (الحجرات: ۱۳)

''تم میں سب سے زیادہ باعزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔''

اگر شیعہ مصنف کے نزدیک محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی عظمت شان اس کی سبقت اسلام اور ہجرت و نصرت کی رہین منت ہے۔ تو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ محمد صحابہ میں شمار نہیں ہوتا۔ وہ مہاجرین و انصار صحابہ کے کسی بھی گروہ میں شامل نہیں۔

اور اگر رافضی قلم کار محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو بہت بڑا دین دار تصور کرتا ہے تو وہ غلطی کا شکار ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ محمد علماء و فضلاء اور اپنے طبقہ کے صلحاء میں شمار نہیں ہوتا۔ اور اگر جاہ و منزلت اور ریاست کی بنا پر رافضی مضمون نگار اسے عظیم قرار دیتا ہے تو اس فضیلت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں زیادہ صاحب جاہ و منزلت؛ اور صاحب ریاست تھے۔ اور اس سے بڑھ کر دین دار اور زیادہ حلیم و کریم تھے۔ کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے یہ فضیلت کم ہے کہ آپ حدیثیں روایت کرتے اور فقہی مسائل پر تنقید و تبصرہ فرمایا کرتے تھے۔ محدثین نے آپ کی روایات اپنی کتب میں درج کی ہیں۔ بعض علماء نے آپ کے فیصلہ جات اور فتاوی جمع کیے ہیں، اس کے عین برخلاف حدیث و فقہ کی قابل اعتماد کتب میں محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کا ذکر تک نہیں پایا جاتا۔

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''محمد بن ابی بکر کا باپ اور اسکی بہن معاویہ کے باپ اور اس کی بہن سے افضل تھے۔''

---

❶ قاسم بن محمد فقہائے سبعہ اور ان فضلاء میں سے تھے جو شریعت و سنت کی عمارت کے لیے ایک عظیم ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ابوالزناد عبداللہ بن ذکوان جو امام مالک ولیث بن سعد رحمہ اللہ کے استاد تھے، فرماتے ہیں کہ: ''میں نے قاسم سے بڑھ کر عالم حدیث نہیں دیکھا۔''

[جـــواب] : ہم کہتے ہیں: یہ دلیل سابقہ ذکر کردہ دونوں قاعدوں کی بنا پر باطل ہے۔اس لیے کہ اہل سنت کے یہاں کسی شخص کی فضیلت کا معیار حسب ونسب نہیں، بلکہ اس کی اپنی ذات ہے۔نظر بریں محمد کے لیے یہ امر ذرہ بھر مفید نہیں کہ وہ حضرت ابوبکر و عائشہ رضی اللہ عنہما سے قریبی تعلق رکھتا ہے، دوسری طرف یہ نسبی فضیلت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں کچھ بھی قدح وارد نہیں کرتی۔ اہل سنت کے یہاں یہ معروف اصل ہے۔

❀ اس قاعدہ کو ایک مثال کے ذریعہ یوں واضح کر سکتے ہیں کہ حضرت بلال وصُہیب وخباب رضی اللہ عنہم اجمعین اور ان کے نظائر وامثال وہ لوگ ہیں جو سابقین اوّلین صحابہ میں شامل ہیں اور فتح مکہ سے قبل انفاق و جہاد کے ذریعے عظیم انسانی واسلامی خدمات انجام دے چکے تھے۔دوسری جانب وہ لوگ ہیں جو فتح مکہ کے بعد مشرف باسلام ہوئے۔ مثلاً ابوسفیان بن حرب اور آپ کے دونوں بیٹے معاویہ و یزید رضی اللہ عنہم اجمعین ۔ نیز ابوسفیان بن حارث؛ ربیعہ بن حارث اورعقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہم اجمعین ۔ یہ حسب ونسب کے اعتبار سے پہلے لوگوں کے مقابلہ میں افضل ہیں ؛ یہ لوگ قریش کے بنوعبد المطلب کے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔جب کہ وہ شرافت نسبی سے بہرہ ور نہیں۔مگر ان کی فضیلت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ہے؛ جس کی وجہ فتح سے قبل اسلام لانا ؛ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔اس لیے جو فضیلت ان لوگوں کے حصہ میں آئی؛ وہ دوسرے اس میں شریک نہیں ہیں جو بعد میں ایمان لائے اور اللہ کی راہ میں جہاد کے شرف سے باریاب ہوئے۔[اگر فضیلت وشرافت کا مدار حسب ونسب پر ہوتا تو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہونے والے یہ قریش سب سے زیادہ افضل واکرم ہوتے]۔

اگر روافض حسب ونسب کو فضیلت کا معیار قرار دیں تو محمد ان کے اس معیار پر بھی پورے نہیں اترتے۔ بلکہ وہ ان کے وضع کردہ قاعدہ کی بنا پر شرّ الناس ٹھہریں گے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ شیعہ محمد کے والد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کی ہمشیرہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو نفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کے اپنے قاعدہ کے مطابق محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ عظیم المرتبت نہیں ہو سکتے۔اور اگر شیعہ اہل سنت کو قائل کرنے کے لیے الزامی جواب کے طور پر محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کے حق میں یہ بات کہتے ہیں تو اہل سنت تو صرف تقوی کو معیار عظمت وشرافت قرار دیتے ہیں اور بس! جس کی دلیل یہ آیت قرآنی ہے:

﴿ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ﴾

''تم میں سب سے زیادہ باعزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔''

فصل:......کاتب وحی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر اعتراضات اوران کے جوابات

[پہلا اعتراض]:......شیعہ مصنف لکھتا ہے:''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طلیق بن طلیق (جولوگ فتح مکہ کے دن اسلام لائے ان کوطلیق کہتے ہیں اس کی جمع طلقاء ہے) معاویہ رضی اللہ عنہ پر لعنت کی اور فرمایا:''جب اسے میرے منبر پر دیکھو توقتل کردو۔''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تألیف قلب رکھنے والوں میں سے تھے۔انہوں نے چوتھے خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی جب کہ آپ امام برحق تھے۔اور جو کوئی بھی امام برحق سے جنگ کرتا ہے' وہ ظالم اور باغی کہلاتا ہے۔حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو کاتب وحی کا لقب دیا حالانکہ اس نے وحی کا ایک لفظ بھی نہیں لکھا تھا وہ صرف خطوط لکھا کرتا تھا۔''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چودہ افراد وحی لکھنے پر مامور تھے۔ان میں سب سے پہلے' سب سے خاص اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین شخص حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں۔حالانکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا سارا وقت برابر مشرک رہے؛ وحی کو جھٹلایا کرتے اور اللہ کی وحی اور شریعت کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔''[انتہی کلام الرافضی]

[جواب]:......ہم کہتے ہیں کہ: رافضی مصنف نے جو کہا ہے:''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاویہ رضی اللہ عنہ پر لعنت کی اور فرمایا: جب اسے میرے منبر پر دیکھو توقتل کردو۔''

❀ یہ حدیث کسی بھی نقل و روایت کے اعتبار سے معتمد اسلامی کتاب میں نہیں ہے۔[1] حفاظ حدیث اسے جھوٹ کہتے ہیں؛ جسے اپنی طرف سے گھڑ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کردیا گیا ہے۔رافضی [کٹھ ملّے] نے اس کی کوئی سند ذکر نہیں کی تاکہ اس پر تحقیق کی جاسکے۔محدث ابن جوزی رحمہ اللہ نے اسے موضوعات میں شمار کیا ہے۔جس چیز سے رافضی کا جھوٹ کھل کر سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد ایسے لوگ بھی آپ کے منبر پر چڑھے جو باتفاق مسلمین معاویہ رضی اللہ عنہ سے بھی بدتر تھے؛ اگر صرف منبر پر چڑھنے کی وجہ سے قتل کیا جانا واجب تھا تو پھر کیا ان تمام کا قتل واجب ہوگیا تھا؟[اور انھیں قتل نہ کیا جا سکا]۔[یہ بات ادنی علم و عقل رکھنے والے پر بھی مخفی نہیں] کہ ایسا کرنا اسلام کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہے۔اس لیے کہ صرف منبر پر چڑھنے سے کسی کا قتل کرنا جائز نہیں ہوجاتا۔

اگر اس وجہ سے اس کے قتل کرنے کا حکم دیا ہو کہ آپ خلیفہ بن گئے تھے اور اس منصب کے قابل نہیں تھے۔تو پھر اس سے واجب لازم آتا ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد جتنے بھی لوگ مسند خلافت پر متمکن ہوئے انہیں قتل کردیا جائے؛ اس لیے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ ان سے افضل تھے۔ یہ بات تواتر کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول سنن کے خلاف ہے۔آپ حکمرانوں کو قتل کرنے اور ان کے ساتھ جنگ کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ امت اس نظریہ کے برعکس متفق ہے۔اس لیے کہ امت نے کسی بھی خلیفہ بننے والے کو قتل نہیں

[1] حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو منبر رسول پر دیکھا تھا اور آپ کی اقتداء میں نماز بھی پڑھی اس لیے کہ آپ شرعی امام اور نائب رسول تھے۔اگر یہ قتل بحکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واجب تھا تو حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما اس کی تعمیل نہ کرکے گنہگار ٹھہرے' پھر معصوم نہ رہے۔

کیا اور نہ ہی اس کو جائز و حلال سمجھا۔ کیونکہ اس کے نتیجہ میں وہ قتل و غارت گری اور دنگا وفساد پیدا ہوتے ہیں؛ جو کہ ظالم حکمران کے ظلم پر صبر کرنے سے بڑھ کر نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ تو پھر نبی کریم ﷺ کسی ایسی چیز کا حکم کیونکر دے سکتے ہیں جس کا نقصان اس کے فائدہ سے بڑھ کر ہو؟

[دوسرا اعتراض] : باقی رہا رافضی کا [حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں] قول ''طلیق بن طلیق۔''

[جواب] :اس میں مذمت کی کوئی بات نہیں۔ اس لیے کہ فتح مکہ کے روز جو لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے تھے، انھوں نے خلوص دل سے دین کو قبول کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے [انہیں قیدی نہیں بنایا تھا بلکہ] سب کو آزاد کر دیا تھا۔ ان کی تعداد بارہ سو کے لگ بھگ تھی۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو بعد میں بہترین مسلمان ثابت ہوئے؛ مثلاً حارث بن ہشام اور ان کا بھتیجا حضرت عکرمہ، سہیل بن عمرو [1] صفوان بن امیہ، یزید بن ابی سفیان، حکیم بن حزام؛ ابوسفیان ابن الحارث ابن عبدالمطلب رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد تھے؛ یہ پہلے رسول اللہ ﷺ کی ہجو کیا کرتے تھے بعد میں بہترین مسلمان ثابت ہوئے۔ اور عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ جنہیں رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ کا والی مقرر کیا۔ ان کے نظائر و امثال

[1] سہیل بن عمرو خطیب قریش تھا اور بنی عامر بن لوی کے قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش کا سفیر بن کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، فتح مکہ کے دن جب آپ نے اہل مکہ کو خطاب کر کے کہا تھا: ''تم مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو؟'' تو وہ سہیل ہی تھا جس نے یہ جواب دیا: ''ہم بھلائی کی توقع رکھتے ہیں، کیوں کہ آپ اچھے بھائی اور اچھے بھتیجے ہیں۔'' نبی ﷺ نے جواباً فرمایا: میں وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف علیہ السلام نے کہی تھی، آج تم پر بھی کچھ عتاب نہیں۔'' (ابن زنجویہ فی الاموال، الاصابۃ (۲/۹۵) طبقات ابن سعد (۷/۱۲۶) نبی ﷺ نے تالیف قلب کے طور پر سہیل رضی اللہ عنہ کو سو اونٹ عطا کیے۔ (مستدرک حاکم (۳/۲۸۱)، وانظر الاصابۃ (۲/۹۵)، مسند احمد (۳/۲۴۶)

خلافت فاروقی میں مہاجرین و انصار حضرت عمر کے دروازہ پر کھڑے تھے اور آپ انھیں مقام و مرتبہ کے مطابق باری باری اندر بلاتے جاتے تھے۔ اس موقع پر فتح مکہ کے دن مسلمان ہونے والے چند صحابہ بھی موجود تھے، وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے، سہیل بن عمرو نے یہ دیکھ کر کہا تم خود قصوروار ہو۔ جب نبی کریم ﷺ نے دعوت اسلام دی، تو انھوں نے جلدی اس دعوت پر لبیک کہا اور تم نے دیر لگا دی اب اسی تاخیر کا خمیازہ بھگت رہے ہو، جب جنت کے دروازوں کی جانب دعوت دی جائے گی تو اس وقت کیا کیفیت ہوگی۔'' یہ کہہ کر سہیل جہاد کے لیے روانہ ہوئے اور کہا اللہ کی قسم! میں نے جتنی لڑائیاں کفار کے ساتھ ہو کر لڑی ہیں اب اسی قدر مسلمانوں کی نصرت و حمایت کے لیے لڑوں گا، اور جتنا مال میں نے کفر کی حمایت میں صرف کیا تھا اتنا ہی مسلمانوں پر خرچ کروں گا۔'' (مستدرک حاکم (۳/۲۸۱)، معجم کبیر طبرانی (۶۰۳۸)، و فی اسنادہ انقطاع)

امام شافعی رحمہ اللہ سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرماتے ہیں: جب سے اسلام لائے اسی وقت سے خالص الاسلام تھے۔ جن لوگوں کو شیعہ اور انکے اتباع طنزاً ''طلقاء'' کہہ کر پکارتے ہیں ان کے بارے میں انھیں قطعی طور پر معلوم ہے کہ وہ اولیاء اللہ و اصحاب رسول میں سے تھے، ان میں بعض لوگ سہیل بن عمرو سے بھی افضل اور جہاد میں پیش پیش تھے۔ ان کے سرخیل حضرت معاویہ اور ان کے بھائی تھے، جن کے اسلام پر بڑے احسانات ہیں۔ حضرت معاویہ کی چھوٹی سے چھوٹی فضیلت یہ ہے کہ آپ اوّلین اسلامی بحری بیڑے کے بانی اور پہلے شخص تھے جس نے سمندر میں بحری جنگ کا آغاز کیا۔ سرور کائنات ﷺ نے مقام قباء میں جو خواب دیکھا تھا اس میں آپ نے اس پیشین گوئی کا اظہار فرمایا۔ (صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب من زار قوما فقال عندھم، (حدیث: ۶۲۸۲)، صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضل الغزو فی البحر (حدیث: ۱۹۱۲)۔

یہ سب لوگ خالص الاسلام تھے۔حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو دل کی سچائی سے اسلام لائے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بھائی یزید رضی اللہ عنہ کے بعد ان کو والیٔ شام مقرر کیا تھا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ طرف داری کرنے والے نہ تھے اور نہ انھیں کسی کی ملامت کی پرواہ تھی۔یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما بہترین مسلمانوں میں سے تھے۔آپ کا شمار ان جرنیلوں میں ہوتا ہے جنہیں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے شام فتح کرنے کے لیے روانہ فرمایا تھا۔ان جرنیلوں میں یزید بن ابوسفیان' شرحبیل بن حسنہ؛ عمرو ابن العاص ؛ابوعبیدہ بن جراح اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں۔جب یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوگیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی جگہ ان کے بھائی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس علاقہ پر والی مقرر فرمایا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اللہ کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔اور نہ ہی آپ ولایت سے محبت رکھنے والے تھے۔مزید برآں معاویہ رضی اللہ عنہ کے والد ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے ساتھ آپ کے دوستانہ مراسم بھی نہ تھے۔بلکہ اسلام سے پہلے ابوسفیان کے بڑے دشمنوں میں سے ایک تھے۔یہاں تک کہ جب فتح مکہ کے موقع پر جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ، ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو بارگاہ نبوی میں لائے تھے تو آپ اسے قتل کرنا چاہتے تھے۔[1] اسی بنا پر آپ کے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے درمیان کچھ تلخ گفتگو بھی ہوئی۔کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے بہت زیادہ بغض رکھتے تھے۔اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کرنا کسی دنیاوی لالچ کی وجہ سے نہ تھا۔اگر آپ امیر بنائے جانے کے مستحق نہ ہوتے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کبھی بھی آپ کو امیر نہ بناتے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ دمشق اور دیگر بلاد شام میں بیس سال تک امیر اور بیس سال تک خلیفہ رہے۔آپ کی رعایا آپ کے حسن سلوک، تالیف قلب اور خوبیٔ انتظام و انصرام کی مداح تھی اور آپ پر جان چھڑکتی تھی۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ صفین میں انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہ دیا۔حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نظائر و امثال سے افضل و اولیٰ بالحق تھے۔حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فوجی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت کے معترف تھے۔اور سبھی اس بات کے معترف تھے کے خلافت کے حق دار حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔آپ کی فضیلت کا انکار صرف اسی کو ہوسکتا ہے جو حق کے سامنے سرکش اور خواہشات نفس کے سامنے اندھا ہو۔

ادھر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی مسئلہ تحکیم سے پہلے کبھی بھی اپنی ذات کے لیے خلافت کی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔اور نہ ہی آپ کو امیر المؤمنین کہا جاتا تھا۔آپ نے تحکیم کے بعد خلافت کی طلب کی۔حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں کئی ایک لوگ ایسے تھے جو یہ سوال اٹھاتے تھے: ہم علی رضی اللہ عنہ سے قتال کیوں کریں؟ جب کہ آپ کو نہ ہی سابقت اسلام کا شرف حاصل ہے' اور نہ ہی کوئی دیگر ایسی فضیلت؛ اور نہ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دامادی کا شرف [جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہے] اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کی نسبت خلافت کے زیادہ حق دار ہیں۔امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بھی اس چیز کا اعتراف کیا کرتے

[1] سیرۃ ابن هشام(٥٤٣_٥٤٥)۔

تھے۔تاہم اسکے باوجودانھوں نے جنگ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا، کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ شامل ہیں جنھوں نے سراسر ظلم کا ارتکاب کیا ہے۔اور وہ اب ان سے اس سلوک کا بدلہ لینا چاہتے تھے جو انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کیا ہے۔لڑائی کا آغاز کرنے والے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھی تھے؛ اور حملہ آور سے لڑنا روا ہے۔ یہ لوگ اس وقت تک نہ لڑتے تھے جب تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر سے لوگ ان پر حملہ نہ کردیتے۔یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سرگرم معاون اشتر نخعی نے کہا تھا:''لوگ ہمارے مخالفین کی مدد کرتے ہیں کیوں کہ ہم نے لڑائی کا آغاز کیا ہے۔''

یہ حقیقت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے لشکر میں موجود قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کی سرکوبی سے قاصر تھے۔علاوہ ازیں آپ کے امراء و اعوان آپ کی اطاعت نہیں کرتے تھے، اس کے برعکس حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے رفقاء آپ کے مطیع فرمان تھے۔آپ کا خیال تھا کہ جنگ سے مسئلہ حل ہوجائے گا؛مگر نتیجہ آپ کی سوچ کے برعکس نکلا۔[اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ] حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں ایسے لوگ بھی تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ظلم کا الزام لگاتے تھے؛ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس چیز سے بالکل بری تھے۔امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں سے طالبین حق یہ بھی کہتے تھے:''ہم صرف اس آدمی کی ہی بیعت کرسکتے ہیں جو ہمارے ساتھ عدل و انصاف کرے؛اور ہم پر ظلم نہ کرے۔''

اگر ہم علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کریں گے تو ہم پر ان کا لشکر ایسے ہی ظلم کریگا؛ جیسے انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ظلم کیا۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یا تو ہمارے ساتھ عدل و انصاف کرنے سے عاجز آگئے ہیں؛یا پھر وہ ایسا نہیں کرنا چاہتے۔تو پھر ہمارے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ایسے انسان کی بیعت کریں جو ہمارے ساتھ عدل و انصاف کرنے سے عاجز آگیا ہو یا پھر اس نے عدل و انصاف کرنا ہی ترک کردیا ہو۔

ائمہ اہل سنت والجماعت جانتے ہیں کہ یہ قتال نہ ہی مامور بہ تھا' نہ ہی واجب تھا اور نہ ہی مستحب۔لیکن اس انسان کا عذر مقبول ہے جس نے اجتہاد کیا اور غلطی کا شکار ہوگیا۔

[تیسرا اعتراض]:شیعہ مضمون نگار لکھتا ہے:''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تألیف قلب والوں میں سے تھے۔''

[جواب]:درست بات ہے؛فتح مکہ پر بہت سارے آزاد کردہ لوگ تالیف قلب والوں میں سے تھے۔جیسے حارث بن ہشام ؛عکرمہ بن ابوجہل؛سہیل بن عمرو؛ صفوان بن امیہ؛ حکیم بن حزام؛یہ لوگ بہترین مسلمانوں میں سے تھے۔ تالیف قلب والوں کی اکثر تعداد بعد میں بہت اچھے مسلمان ثابت ہوئے۔ ایسا ہوتا تھا کہ صبح کے وقت کوئی انسان دنیا کی لالچ میں مسلمان ہوتا؛ مگر شام ہونے تک اس کی حالت یہ ہوتی کہ اسلام اس کے لیے روئے زمین کی ہر چیز سے بڑھ کر محبوب ہوگیا ہوتا۔

[کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ باغی تھے؟]:

[چوتھا اعتراض]:شیعہ مضمون نگار لکھتا ہے:''معاویہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف صف آراء ہوئے، حالانکہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ اہل سنت کے نزدیک چوتھے خلیفہ برحق تھے اور جو شخص خلیفہ برحق سے لڑتا ہے وہ باغی اور ظالم ہوتا ہے۔''

[جواب] : **پہلی بات**: ہم کہتے ہیں: باغی بعض اوقات بنابر تاویل اپنے آپ کو حق پر تصور کرتا ہے۔ بعض دفعہ اس کی بغاوت جان بوجھ کر [بغیر تاویل کے] ہوتی ہے۔ اور کبھی محرک اس کی تاویل بازی، شہوت نفس یا کوئی شک وشبہ ہوتا ہے؛ اکثر بغاوت کی یہی وجہ ہوتی ہے۔ بہرکیف یہ اعتراض سرے سے اہل سنت والجماعت کے عقیدہ پر وارد ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ ہم حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بلکہ ان سے افضل لوگوں کو بھی گناہوں سے پاک تصور نہیں کرتے۔ چہ جائے کہ انہیں اجتہاد میں خطاء سے مبرا و منزہ سمجھیں۔ بلکہ اہل سنت والجماعت کہتے ہیں:

''گناہوں کی سزا معاف ہونے کے کئی اسباب ہیں۔ ان میں: توبہ واستغفار؛ گناہ مٹانے والی نیکیاں؛ کفارہ بننے والے مصائب؛ اور ان کے علاوہ دیگر امور۔''

یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور دوسرے لوگوں کے لیے عام ہے۔

حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ تاریخ میں مشہور ہے؛ آپ چھوٹے صحابہ میں سے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت مسور رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ خلوت نشین تھے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: آپ مجھ میں کیا عیب دیکھتے ہیں؟ مسور رضی اللہ عنہ نے چند امور کا ذکر کیا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے مسور! کیا آپ سے کچھ گناہ سرزد ہوئے ہیں؟'' کہا: ''ہاں۔''

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''کیا تمھیں مغفرت کی امید ہے؟'' مسور نے کہا: ''ہاں! کیوں نہیں''

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا'' تم مجھ سے زیادہ رحمت الٰہی کے امیدوار کیوں کر ہوئے؟'' اللہ کی قسم! مجھے جب بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے سوا کسی دوسری چیز میں اختیار دیا گیا تو میں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو ترجیح دی۔ میں حلفاً کہتا ہوں کہ: جہاد، اقامت حدود، امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں میرے اعمال کا پلڑا آپ سے بھاری ہے۔ علاوہ ازیں میں ایسے دین پر عمل پیرا ہوں جس کا اللہ حسنات کو قبول کرتا اور سیئات سے درگزر کرتا ہے۔'' تو پھر کس چیز کی بنا پر آپ مجھ سے زیادہ اللہ کی رحمت کے طلب گار ہوئے؟[1] حضرت مسور رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''امیر معاویہ رضی اللہ عنہ گفتگو میں مجھ پر غالب آ گئے۔''

دوسری بات: یہ کہ: اس باب میں اہل سنت والجماعت اس صحیح اور سیدھی سادی اصل پر قائم ہیں۔ جبکہ تمہارے اقوال میں تناقض پایا جاتا ہے۔ اگر خوارج ونواصب اور دوسرے لوگ [معتزلہ مروانیہ وغیرہ] جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر و فاسق اور ظالم کہتے ہیں؛ اور آپ کے عادل ہونے میں شک کرتے ہیں؛ اگر شیعہ حضرات سے پوچھیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحب ایمان و امام اور عادل ہونے کی کیا دلیل ہے؟ تو تم شیعہ کے پاس کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔

آپ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا مشرف بہ اسلام ہونا اور آپ کی کثرت عبادت تواتر سے ثابت ہے۔

[1] البدایة والنهایة (۸/ ۱۳۳۔۱۳۴) بحواله عبد الرزاق۔

❀ اس کے جواب میں وہ کہہ سکتے ہیں کہ: یہ تواتر صحابہ و تابعین ؛ خلفاء ثلاثہ ؛ خلفاء بنو امیہ؛ جیسے معاویہ ؛ یزیداور عبدالملک رحمہم اللہ وغیرہ سے بھی ثابت ہے۔ جب کہ تم ان کے ایمان پر زبان طعن دراز کرتے ہو۔ ہمارا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگوں کے ایمان پر قدح کرنا تمہارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے ایمان پر قدح کرنے کے برابر نہیں ہوسکتا۔ جن کی شان میں تم قدح کرتے ہو' وہ ان سے بڑھ کراور زیادہ عظمت والے ہیں جن کی شان میں ہم قدح کرتے ہیں۔

اگر شیعہ ظواہر قرآنیہ سے احتجاج کریں کہ قرآن میں ان کی مدح وتوصیف بیان ہوئی ہے۔تو وہ جواب میں کہیں گے: قرآنی آیات عام ہیں یہ حضرت ابوبکر وعمروعثمان اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو ایسے ہی شامل ہیں جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو۔ بلکہ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کران آیات کے موجب مدح وثناء کے مستحق ہیں۔ اگر روافض پوری جماعت کو اس فضیلت سے مستثنیٰ کریں گے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان سے الگ کردینا بہت آسان ہے۔[حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی شان میں بھی احادیث وارد ہیں۔ لہٰذا ان کو بھی قبول کرنا چاہیے اور اگر شیعہ صحابہ کو مطعون کریں گے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اس سے بچ نہیں سکتے]

اگر شیعہ صحابہ کے بارے میں وارد شدہ فضائل ومناقب سے احتجاج کریں تو یہ فضائل جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے روایت کیے ہیں' انہی صحابہ نے دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے فضائل بھی روایت کیے ہیں۔ اگر یہ راوی [تمہارے نزدیک] عادل ہیں تو تمام روایات کو ماننا پڑے گا؛ اور اگر کہو کہ فاسق ہیں تو پھر جب فاسق کوئی خبر لے کر آئے تو اس کے لیے تحقیق کرنا پڑتی ہے [تا کہ حق بات واضح ہوجائے]۔کسی انسان کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ گواہوں کے بارے میں یوں کہے:

''اگر یہ میرے حق میں گواہی دیں تو عادل ہوں گے۔ اور اگر میرے خلاف گواہی دیں تو فاسق و فاجر ہوں گے۔'' یا یوں کہے کہ: ''اگر ان لوگوں کی مدح میں گواہی دیں جن سے میں محبت کرتا ہوں ؛ تو پھر عادل ہوں گے۔ اور اگر ان لوگوں کی مدح میں گواہی دیں جن سے میں بغض رکھتا ہوں' تو پھر فاسق ہوں گے۔''

رہا امامتِ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مسئلہ ؛ تو یہ لوگ اور دیگر فرقے [خوارج ونواصب] آپ سے اس بارے میں تنازع کرتے ہیں۔ اگر تم اپنے دعوی کے مطابق ان کے منصوص ہونے کی دلیل پیش کرتے ہو؛ تو وہ اس کے مقابلہ میں ایسی ہی دلیل پیش کریں گے؛ جیسے ان کا دعوی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں ہے' یا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں [جیسا کہ مروانیہ کا عقیدہ ہے]۔حدیث وآثار کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ ان لوگوں کا دعوی زیادہ قابل قبول ہے۔ ایسے ہی ان حضرات کی خلافت کے برحق ہونے پر ایسے دلائل بھی پیش کیے جاسکتے ہیں جن کو سمجھنے کیلئے علم حدیث کا ہونا ضروری نہیں۔

اگر شیعہ اس بات سے احتجاج کریں کہ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی۔

تو خوارج ونواصب کہہ سکتے ہیں کہ: یہ سبھی جانتے ہیں کہ حضرت ابو بکر وعمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین خلفائے ثلاثہ کی بیعت اس بیعت سے کہیں بڑھ کر تھی، [اس لیے کہ اہل شام اور اکثر اہل مصر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی تھی]۔ جب کہ تم ان کی بیعت کو غلط کہتے ہو۔ تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت پر قدح کرنا بہت ہی آسان ہے۔ تم جس بھی نص سے یا اجماع سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت وخلافت پر استدلال کرو گے تو وہی نص واجماع خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی بیعت و خلافت پر زیادہ قوت سے دلالت کرے گی۔ تو اس طرح جن کی خلافت پر تم قدح کرتے ہو' ان کی خلافت کا اثبات اس سے زیادہ اولی ہوگا جس کی خلافت کے اثبات کے لیے تم دلیل پیش کرتے ہو۔

❀ یہ اشکال اہل سنت والجماعت پر وارد نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اہل سنت تمام خلفاء کی خلافت کو ثابت مانتے ہیں۔ اوران کی خلافت کے درست ہونے پر اس باب میں وارد ہونے والی نصوص سے استدلال کرتے ہیں۔ اہل سنت کہتے ہیں:

''خلافت اہل حل وعقد واصحاب شوکت کی بیعت سے منعقد ہوتی ہے۔ اہل شوکت نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی۔ اگر چہ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر ایسے جمع نہ ہو سکے جیسے پہلے تین خلفاء رضی اللہ عنہم اجمعین کی خلافت پر ان کا اجماع ہوا تھا۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جن اہل شوکت واصحاب قدرت نے آپ کی بیعت کی تھی اس وجہ سے آپ کو قوت وشوکت حاصل ہوگئی تھی۔ اور نص بھی اس پر دلالت کرتی ہے کہ آپ کی خلافت' خلافت نبوت تھی۔''

پس جو لوگ آپ کی بیعت سے پیچھے رہ گئے تھے؛ اس بارے میں ان کا عذر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے عذر سے بڑھ واضح ہے جو کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے پیچھے رہ گئے تھے۔ اگر چہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی بھی آپ کی بیعت سے پیچھے نہیں رہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بلا خلاف لوگوں کے سامنے آپ کی بیعت کی تھی۔ مگر یہ بھی کہا گیا ہے کہ: ''آپ چھ ماہ تک بیعت سے پیچھے رہے' اور بعد میں بیعت کر لی۔''

شیعہ میں سے بھی کچھ لوگ یہی کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں دو باتوں میں سے ایک ہے:

۱۔ یا تو آپ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے پیچھے رہے' اور پھر چھ ماہ کے بعد بیعت کر لی؛ جیسے شیعہ کا اور اہل سنت والجماعت کے ایک گروہ کا خیال ہے۔

۲۔ یا تو پھر آپ نے پہلے ہی دن سے بیعت کر لی تھی؛ جیسے اہل سنت والجماعت کے دوسرے گروہ کا کہنا ہے۔

❀ اگر یہ دوسرا قول درست اور حق ہے؛ تو شیعہ کا استدلال باطل ہوا کہ آپ بیعت سے پیچھے رہ گئے تھے۔ یہ بھی ثابت ہے کہ آپ بیعت کرنے والوں میں سبقت لے جانے والے اور پہلے نمبر پر تھے۔

اگر پہلے قول کو درست مانا جائے تو پھر بھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے پیچھے رہ جانے والوں کا عذر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے پیچھے رہنے والوں کی نسبت زیادہ ظاہر اور مقبول ہے۔ اس لیے کہ جیسی نصوص اور اجماع

ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت ثابت کرنے والوں کے پاس ہیں' ایسی نصوص حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر موجود نہیں۔ صحیحین میں ایک روایت بھی ایسی نہیں ہے جو آپ کی خلافت پر دلالت کرتی ہو۔ بلکہ یہ روایات اہل سنن نے نقل کی ہیں۔

بعض محدثین نے حدیثِ سفینہ پر جرح بھی کی ہے۔ جب کہ اجماع کا دعوی کرنا بھی درست نہیں ہے؛ اس لیے کہ آپ کی بیعت سے آدھی سے زیادہ امت یا اس سے کچھ کم وبیش لوگ پیچھے رہ گئے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نصوص کے مقتضیٰ کے مطابق دونوں فریقوں کے لیے جنگ وقتال ترک کرنا ہی بہتر تھا۔ اور جنگ سے پیچھے بیٹھ جانا جنگ میں شرکت کرنے سے زیادہ افضل تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے باوجود کہ آپ حق پر تھے' حق آپ کے ساتھ تھا؛ اور معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہ نسبت آپ ہی حق خلافت رکھتے تھے؛ پھر بھی اگر آپ جنگ ترک کردیتے؛ تو یہ آپ کے حق میں زیادہ افضل' اصلح اور بہتر تھا۔

اہل سنت والجماعت ان تمام صحابہ کے لیے رحمت کی دعا کرتے اور ان کے لیے استغفار کرتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاءُ وْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (الحشر ۱۰)

''اور (ان کے لیے) جو ان کے بعد آئے، وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے اور ایمانداروں کے لیے ہمارے دل میں کہیں (بغض) نہ ڈال؛ اے ہمارے رب بیشک تو شفقت ومہربانی کرنے والا ہے۔''

جب کہ رافضی جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی شان میں طعن کریگا' اور کہے گا کہ آپ ظالم اور باغی تھے: تو نواصب بھی ان سے کہیں گے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی باغی تھے۔ آپ اپنے دور امارت میں مسلمانوں کو قتل کرنے کی وجہ سے ظالم بھی تھے۔ آپ نے امن عامہ میں خلل ڈالا اور لڑائی کا آغاز کرکے بلاوجہ وبلا فائدہ امت کا خون بہایا؛ نہ ہی کوئی دنیاوی فائدہ حاصل ہوا اور نہ ہی کوئی دینی فائدہ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں شمشیر کفار سے دور اور مسلمانوں کے سر پر آویزاں رہی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ پر قدح کرنے والے کئی گروہ ہیں۔ ایک گروہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ جنگ کرنے والے تمام لوگوں پر قدح کرتے ہیں۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ: علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ ان دونوں میں سے ایک فاسق تھا مگر یہ معلوم نہیں کہ وہ کون ہے؟ ۔ جیسا کہ عمرو بن عبید اور معتزلہ کی ایک جماعت کا عقیدہ ہے۔ یہ لوگ جنگ جمل والوں کے بارے میں کہتے ہیں: ان دونوں گروہ میں سے ایک گروہ فاسق تھا؛ مگر اس کا پتہ نہیں کہ وہ کون سا گروہ تھا۔ کچھ لوگ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو فاسق کہتے ہیں۔ ایک گروہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے برعکس حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ظالم کہتا ہے' جیسا کہ مروانیہ کا عقیدہ ہے۔

ایک گروہ کہتا ہے: پہلے آپ حق پر تھے۔ جب آپ نے دو جرگہ داروں کے جرگہ [تحکیم الحکمین] پر رضامندی کا اظہار کیا تو آپ نے کفر کا ارتکاب کیا اور اسلام سے مرتد ہو گئے' اور کفر کی حالت میں موت آئی۔ یہ خوارج کا عقیدہ ہے۔

[حدیث عمار رضی اللہ عنہ کا جواب]:

خوارج؛ مروانیہ؛ اور بہت سارے معتزلہ اور دوسرے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں جرح وقدح کرتے ہیں۔ یہ تمام لوگ اس مسئلہ میں خطاء پر؛ بدعات کا شکار اور گمراہ ہیں۔مگر ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی شان میں شیعہ کا طعن و تشنیع کرنا ان لوگوں کے جرم سے بڑا جرم اور گھمبیر خطاء ہے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دفاع کرنے والا کہے: ''جن لوگوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ کی وہ[یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی] باغی تھے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

''تجھے باغی جماعت قتل کرے گی۔''❶ اوران لوگوں نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو قتل کیا تھا۔

بعض محدثین نے اس حدیث پر جرح کی ہے۔بعض نے اس کی تاویل کی ہے اور باغی سے طالب مراد لیا ہے۔مگر یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔جب کہ ائمہ سلف جیسے: امام ابوحنیفہ، مالک اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ:

''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے رفقاء میں باغی لشکر کی شرائط نہیں پائی جاتی تھیں۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آغاز کار میں ان سے لڑنے کا حکم نہیں دیا؛❷ بلکہ یہ حکم ملا کہ جب دو فریق لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرادی جائے؛ پھر

❶ صحیح بخاری، کتاب الصلاۃ، باب التعاون فی بنا المسجد، (حدیث:٤٤٧، ٢٨١٢)
ہم کہتے ہیں یہ حدیث صحیح ہے۔ یہ الفاظ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت ارشاد فرمائے۔ باقی صحابہ ایک ایک اینٹ لا رہے تھے اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ دو دو، یہ دیکھ کر آپ نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے یہ روایت ابوسعید خدری نے عکرمہ مولیٰ ابن عباس اور علی بن عبداللہ بن عباس کو سنائی رضی اللہ عنہم اجمعین۔

❷ محبّ الدین خطیب ''العواصم من القواصم'' (ص:۱۷۰) میں حاشیہ پر لکھتے ہیں: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ جنگ صفین میں آپ کی حیثیت ایک باغی کی نہ تھی کیونکہ آپ نے اس کا آغاز نہیں کیا تھا۔ بخلاف ازیں معاویہ رضی اللہ عنہ لڑائی کے لیے اس وقت نکلے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ سے نکل کر شام پر حملہ کرنے کے لیے نخیلہ کے مقام پر پڑاؤ ڈالا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عمار رضی اللہ عنہ مارے گئے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''عمار رضی اللہ عنہ کے قتل کی ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو ان کو یہاں لائے۔''
خطیب فرماتے ہیں: ''میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں جو مسلمان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد مارے گئے، ان کے قتل کے ذمہ دار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتل ہیں۔ اس لیے کہ انھوں نے فتنہ کے دروازوں کو کھولا اور لمبے عرصہ تک اس آگ کو ہوا دیتے رہے۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے مابین جذبات حقد وعناد کے بھڑکانے کا موجب ہوئے۔ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کا سانحہ خون فشاں پیش نہ آتا تو جنگ جمل وصفین وقوع پذیر نہ ہوتے۔ جس طرح یہ فتنہ پرداز احمق لوگ قتل عثمان رضی اللہ عنہ کے مرتکب ہوئے؛ اسی طرح اس واقعہ کے بعد تہ تیغ ہونے والے مسلمانوں کے قاتل بھی یہی لوگ ہیں۔ مقتولین میں نہ صرف حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بلکہ ان سے افضل لوگ بھی شامل تھے، مثلاً طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما، اس فتنہ پردازی کا انجام یہ ہوا کہ ان لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے دم لیا۔ حالانکہ یہ آپ کے لشکر میں شامل تھے۔ ⇦⇦⇦

جو جماعت ظلم و تعدی کی مرتکب ہو اس سے لڑا جائے۔ان لوگوں سے ابتداء میں ہی؛ ان کی طرف سے جنگ شروع کرنے سے پہلے لڑا گیا ہے۔''

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اگر مانعین زکوٰۃ کہیں کہ: ہم زکوٰۃ اپنے ہاتھوں سے ادا کریں گے' ہم حاکم وقت کو زکوٰۃ ادا نہیں کریں گے۔تو امام [حاکم] کے لیے ان سے جنگ کرنا جائز نہیں۔اسی بنا پر امام احمد اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہم اسے ''جنگ فتنہ'' قرار دیتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''باغیوں سے اس وقت لڑنا جائز ہے جب وہ حاکم وقت کے خلاف نبرد آزما ہوں۔'' مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جنگ کا آغاز نہیں کیا تھا۔بلکہ خوارج نے جنگ کا آغاز کیا۔جب کہ خوارج سے جنگ کرنا نص اور اجماع امت سے ثابت ہے۔

اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دفاع کرنے والا کہے کہ: آپ اس بارے میں مجتہد تھے۔

تو فریق مخالف بھی کہہ سکتا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بھی اس مسئلہ میں مجتہد تھے۔

اگر یہ کہا جائے کہ: آپ مجتہد اور حق پر تھے۔

تو اس کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ: معاویہ بھی مجتہد اور حق پر تھے۔لوگوں میں ایسے افراد موجود ہیں جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو مجتہد برحق کہتے ہیں۔اسکی بنیاد یہ ہے کہ ہر اجتہاد کرنے والا حق پر ہوتا ہے۔یہ امام اشعری رحمہ اللہ کا قول ہے۔

ان میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں معاویہ رضی اللہ عنہ مجتہد تھے مگر خطاء پر تھے۔مجتہد کی خطاء قابل مغفرت ہے۔

ایک گروہ ایسا بھی ہے جو کہتا ہے: ان دونوں میں سے ایک گروہ حق پر تھا' مگر یہ پتہ نہیں کہ کون سا گروہ حق پر تھا۔

یہ اقوال امام احمد کے شاگرد ابوعبداللہ بن حامد نے ذکر کئے ہیں۔لیکن خود امام صاحب اور ان کے امثال ائمہ سے منصوص یہ ہے کہ اس جنگ سے لڑائی کا ترک کرنا بہتر تھا۔یہ لڑائی فتنہ کی جنگ تھی۔''

یہی وجہ ہے کہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ اس عرصہ میں اسلحہ فروخت کرنے سے منع کرتے تھے۔اور فرمایا کرتے: ''فتنہ میں اسلحہ نہیں بیچا جاسکتا۔'' یہ قول حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ؛ محمد بن مسلمہ؛ ابن عمر؛ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم اجمعین کا ہے۔اور اکثر ائمہ فقہ و حدیث نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔اور کرامیہ کہتے ہیں: بلکہ دونوں حضرات امام برحق تھے اور

⇦⇦ مذکورۃ الصدر بیان سے عیاں ہے کہ ذکر کردہ حدیث نبوی اعلام نبوت میں سے ہے۔یہ بھی معلوم ہوا کہ صفین میں لڑنے والے دونوں فریق زمرۂ مومنین میں شامل تھے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ بلاشبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے افضل تھے۔تاہم دونوں صحابہ رسول اور دین اسلام کے رکن رکین تھے،اس دور میں جس قدر فتنے بپا ہوئے،اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جنھوں نے اس آگ کو ہوا دی۔آنے والے ادوار میں تا قیام قیامت جو لوگ ان کے فعل کو سراہتے ہیں وہ ان کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔یہ ایک مسلمہ صداقت ہے کہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ ہی وہ باغی ہیں جو بعد میں قتل ہونے والے سب مسلمانوں کے ذمہ دار ہیں۔اسی طرح بعد ازاں جو فتنے بپا ہوئے اس کا اصل سرچشمہ وہی فتنہ پرور لوگ ہیں۔

ضرورت کے تحت ایک وقت میں دو خلفاء کی بیعت کی جا سکتی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ برحق ہونے کے بارے میں تنازع کرنے والوں کی حجتوں اور دلائل کا توڑ کرنا رافضیوں کے بس کا کام نہیں۔ جو لوگ آپ کو امام حق تسلیم کرتے ہیں؛ ان کا وہی عقیدہ و مسلک ہے جو اہل سنت والجماعت کا ہے۔ اہل سنت کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ امام حق کے لیے معصوم ہونا شرط نہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر اس شخص سے لڑا جائے جو اس کی اطاعت کے دائرہ سے خارج ہو۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ معصیت میں بھی اس کی اطاعت کی جائے۔ اس حالت میں اس کی اطاعت کا چھوڑ دینا افضل ہے۔ اسی بنا پر صحابہ کی ایک جماعت جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہیں دیا تھا وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ قتال کا ترک کرنا قتال میں ملوث ہونے سے بہتر ہے۔ اور بعض کا خیال تھا کہ جنگ کرنا گناہ کا کام ہے' اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دینا ان پر واجب نہیں۔

جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف نبرد آزما ہوئے تھے وہ تین حال سے خالی نہیں:

۱۔ وہ عاصی ہوں گے ۲۔ خطا کار مجتہد ہوں گے۔

۳۔ یا اپنے اجتہاد میں صحت و صواب کے حامل ہوں گے۔

بہر کیف کوئی صورت بھی ہو اس سے ان کے ایمان میں اور جنتی ہونے میں قدح وارد نہیں ہوتی۔ نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدَاهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ٥ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ (الحجرات: ۹، ۱۰)

''اگر مومنوں کی دو جماعتیں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرادو۔ اگر ایک فریق دوسرے پر ظلم و تعدی کا مرتکب ہو تو اس سے لڑو یہاں تک کہ وہ حکم الٰہی کی جانب واپس آ جائے۔ اندریں صورت بہ تقاضائے عدل ان میں صلح کرادو کیوں کہ اللہ تعالیٰ باانصاف لوگوں کو چاہتا ہے۔ مومن باہم بھائی بھائی ہیں، لہٰذا بھائیوں کے درمیان صلح کرادیجیے [ ]۔

اس آیت میں متحارب فریقین کو ﴿اِخْوَةٌ﴾ ''بھائی'' فرمایا گیا ہے؛ اور انہیں ایمان سے موصوف بتایا ہے؛ باوجود کہ ان کے درمیان جنگ و قتال پیش آئے۔ اور آپس میں ایک دوسرے پر سرکشی کے مرتکب ہوئے۔

پس جو کوئی بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کرے' اگر اسے باغی شمار کیا جائے تو پھر بھی اسے خارج از ایمان قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ ہی اس وجہ سے اس کو جہنمی کہا جا سکتا ہے۔ نہ ہی اس کے جنتی ہونے میں کوئی چیز مانع ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ جب بغاوت کسی تاویل کی بنا پر ہو تو ایسا باغی مجتہد ہوتا ہے۔ اسی لیے اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ: ان دونوں

گروہوں میں سے کسی کو بھی فاسق نہ کہا جائے۔ اگر چہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ: ان دو میں سے ایک گروہ باغی تھا؛ اور یہ باغی گروہ بھی [خواہش نفس کی وجہ سے نہیں' بلکہ] اجتہاد کی بنا پر بغاوت کا مرتکب ہوا تھا۔ خطا کار مجتہد کو کافر و فاسق نہیں کہا جاسکتا۔ اگر انسان حق بات جانتے ہوئے بھی [بغیر کسی تاویل کے] بغاوت پر اتر آئے؛ تب بھی یہ بغاوت فقط گناہ کا کام ہے۔ اور کئی وجوہات کی بنا پر گناہوں سے معافی مل جاتی ہے جیسے: توبہ و استغفار؛ گناہ مٹانے والی نیکیاں؛ گنہگار کے لیے مؤمنین کی دعا؛ نیک اعمال کا ہدیہ ثواب؛ نبی کریم ﷺ کی شفاعت؛ وغیرہ۔

[پانچواں اعتراض] : شیعہ مصنف کہتا ہے:''اس کا سبب یہ تھا کہ محمد بن ابو بکر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت رکھتے تھے؛ اور اپنے باپ کو چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے تھے......۔''

[جواب] : یہ ایک کھلا ہوا واضح جھوٹ ہے۔ محمد بن ابو بکر اپنے والد کی زندگی میں محض چھوٹے سے بچے تھے جن کی عمر تین سال سے بھی کم تھی۔ اپنے والد کی موت کے بعد لوگوں میں سب سے بڑھ کر اپنے والد کی تعظیم کرنے والے تھے۔ اور اس تعلق کو وہ اپنے لیے شرف سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے لوگ بھی آپ کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔

[چھٹا اعتراض] : شیعہ مصنف کہتا ہے:''محمد بن ابو بکر کو چھوڑ کر معاویہ رضی اللہ عنہ کو مؤمنین کا ماموں کہنے کی وجہ یہ ہے کہ محمد بن ابو بکر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کرتے تھے؛ اور امیر معاویہ ان سے بغض رکھتے تھے۔''

[جواب]: یہ بھی صاف جھوٹ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ان دونوں سے بڑھ کر اس لقب کے مستحق تھے۔ اس لیے کہ آپ نے نہ ایک گروہ کے ساتھ جنگ کی اور نہ ہی دوسرے گروہ کے ساتھ۔ اور آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بہت زیادہ تعظیم کرتے تھے اور آپ سے محبت رکھتے تھے۔ آپ کے فضائل و مناقب کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ جب لوگوں کا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر لوگوں کا اتفاق ہوگیا تو آپ نے بھی ان کی بیعت کی اور ان کے خلاف خروج نہیں کیا۔ آپ کی بہن معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہن سے افضل ہیں؛ اور آپ کے والد معاویہ رضی اللہ عنہ کے والد سے افضل ہیں۔ اور لوگ بھی معاویہ اور محمد رضی اللہ عنہما سے بڑھ کر آپ سے محبت رکھتے اور آپ کی تعظیم کیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود یہ بات مشہور نہیں ہوئی کہ آپ کو مؤمنین کا ماموں کہا گیا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ رافضی کا ذکر کردہ سب جھوٹ کا پلندہ ہے۔

اہل سنت والجماعت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قتال نہ کرنے والوں سے ان لوگوں کی نسبت زیادہ محبت کرتے ہیں جنہوں نے آپ سے قتال کیا۔ اور جن لوگوں نے آپ سے قتال نہیں کیا انہیں قتال کرنے والوں پر فضیلت دیتے ہیں؛ جیسے حضرت سعد بن ابی وقاص؛ اسامہ بن زید؛ محمد بن مسلمہ؛ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم اجمعین۔ اہل سنت والجماعت کے نزدیک یہ حضرات ان لوگوں سے افضل ہیں جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی۔ نیز اہل سنت یہ بھی کہتے ہیں:'' حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت رکھنا؛ اور جنگ کو ترک کرنا؛ آپ سے بغض رکھنے اور جنگ کرنے سے بہتر تھا؛ اس پر اہل سنت کا اجماع ہے۔ نیز اہل سنت کا یہ بھی اتفاقی مسئلہ ہے: آپ سے محبت رکھنا اور دوستی کرنا واجب ہے۔ اہل سنت آپ کے دفاع میں ہر جگہ پیش پیش رہتے ہیں۔ اور خوارج و نواصب کے طعنوں کا جواب دیتے ہیں لیکن ہر بات کے لیے ایک مناسب موقع

محل ہوتا ہے۔

جس طرح اہل سنت والجماعت آپ سے محبت کے وجوب کو [دلیل کی روشنی میں] ثابت کرتے ہیں؛ روافض کے لیے ایسے ثابت کرنا ہرگز ممکن نہیں۔ اہل سنت والجماعت خوارج کی مذمت پر یک زبان ہیں جو کہ حضرت کے سب سے بڑے دشمن اور آپ سے بغض و عداوت رکھنے والے ہیں۔ نیز اہل سنت والجماعت ان لوگوں کیساتھ جنگ کرنے پر بھی یک زبان ہیں۔ تو پھر اس جھوٹے شیعہ مصنف نے اپنی طرف سے کیسے یہ بات گھڑ لی کہ اہل سنت ایک سے محبت اس لیے رکھتے ہیں کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتا تھا' اور دوسرے سے بغض اس لیے رکھتے ہیں کہ وہ آپ سے محبت کرتا تھا۔ [معاذ اللہ]

حالانکہ اہل سنت والجماعت میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض کو نیکی شمار کرتا ہو؛ یا آپ سے بغض رکھنے کا حکم دیتا ہو۔ اور نہ ہی کوئی آپ سے فقط محبت رکھنے کو برائی اور معصیت کا کام کہتا ہے' اور نہ ہی اس سے منع کرتا ہے۔''

اہل سنت والجماعت کے تمام گروہوں کی کتب آپ کے فضائل و مناقب کے ذکر سے بھری پڑی ہیں۔ ان میں ان تمام فرقوں کی مذمت کی گئی ہے جو آپ پر ظلم کرتے ہیں۔ اہل سنت والجماعت ان لوگوں کا انکار کرتے ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گالی دیتے ہیں؛ اور ایسے لوگوں کو ناپسند رکھتے ہیں۔

رہا معاملہ جو ان دونوں لشکروں میں ایک دوسرے پر لعنت کی گئی؛ یہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے ان دونوں لشکروں کے مابین قتال کا حادثہ پیش آیا۔ اہل سنت والجماعت سب لوگوں سے بڑھ کر آپ کے خلاف قتال اور سب وشتم کے امور سے نفرت رکھنے والے ہیں۔ تمام اہل سنت والجماعت آپ کی قدر و منزلت پر متفق ہیں۔ آپ امامت و خلافت کے زیادہ حق دار تھے۔ اور آپ اللہ اور اس کے رسول اور مؤمنین کے نزدیک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے والد اور بھائی کی نسبت زیادہ افضل انسان تھے اور ان لوگوں سے بہتر تھے۔ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان لوگوں سے بھی افضل ہیں جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں جیسے مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین؛ جنہوں نے ببول کے درخت کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی؛ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلفاء ثلاثہ کے علاوہ باقی تمام صحابہ کرام سے افضل ہیں؛ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

اہل سنت والجماعت میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے علاوہ کسی بھی صحابی کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل سمجھتا ہو۔ بلکہ آپ کو [ان تین کے علاوہ] تمام باقی تمام اہل بدر؛ اہل بیعت رضوان؛ اور مہاجرین و انصار سابقین اولین رضی اللہ عنہم اجمعین سے افضل و بہتر مانتے ہیں۔

اہل سنت والجماعت میں کوئی ایک ایسا بھی نہیں جو حضرت طلحہ' زبیر؛ سعد بن ابی وقاص عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم کو آپ سے افضل سمجھتا ہو۔ بلکہ اس کی حد یہ ہے کہ بعض تو اہل شوری کو آپس میں ایک دوسرے پر فضیلت دینے میں سکوت اختیار کرتے ہیں۔ یہ اہل شوری ان کے نزدیک سابقین اولین سے افضل ہیں۔ اور سابقین اولین فتح کے بعد اسلام لانے والوں اور اللہ کی راہ میں انفاق اور جہاد کرنے والوں سے افضل ہیں۔ سابقین اولین صحیح قول کے مطابق وہ

لوگ ہیں جنہوں نے بیعت رضوان میں شرکت کی تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے دونوں قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ اس قول کی کوئی صحت ثابت نہیں۔

حدیبیہ کے بعد اسلام لانے والوں میں حضرت خالد بن ولید؛ شیبہ الحجی؛ عمرو ابن عاص رضی اللہ عنہم اور دوسرے لوگ شامل ہیں۔ جب کہ سہیل بن عمرو؛ عکرمہ بن ابو جہل؛ ابوسفیان بن حرب؛ اس کے دونوں بیٹے یزید اور معاویہ؛ صفوان بن امیہ وغیرہ رضی اللہ عنہم اجمعین یہ فتح مکہ کے مسلمان ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے باپ سے پہلے اسلام لے آئے تھے؛ اس لیے انہیں پہلی قسم کے لوگوں میں شمار کیا گیا ہے۔

صحیح بخاری اور مسلم میں ہے: ''حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے درمیان کچھ جھگڑا ہو گیا حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے خالد! میرے کسی صحابی کو برا نہ کہو کیونکہ تم میں سے کوئی آدمی اگر احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کرے تو وہ میرے صحابی کی ایک مٹھی یا آدھی مٹھی کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتا۔'' [صحیح مسلم:ح ١٩٨٩]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اس سے منع کیا۔ جو کہ بیعت رضوان کے بعد اسلام لائے' اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا؛ اور جہاد فی سبیل اللہ کیا۔ انہیں کہا گیا کہ ان لوگوں سے تعرض نہ کریں جو اس سے پہلے اسلام لائے اور اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور جہاد کیا۔ اور یہ بھی واضح کیا کہ بعد والوں میں سے اگر کوئی احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کر دیں تو سابقین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے خرچ کردہ ایک مٹھی جو یا اس کے آدھے کے اجر و ثواب کو نہیں پہنچ سکتا۔

اگر یہ ممانعت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور ان لوگوں کیلئے ہے جو حدیبیہ کے بعد اسلام لائے۔ تو پھر ان لوگوں کو کیا حق حاصل ہوگا جو فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے؟ جبکہ خالد رضی اللہ عنہ مہاجر تھے۔ بیشک حضرت خالد بن ولید اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ سے قبل اسلام لانے والوں میں سے ہیں۔ آپ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی؛ آپ مہاجرین میں سے تھے۔ جبکہ فتح مکہ کے بعد مسلمان ہونے والوں کو ہجرت کا شرف حاصل نہیں ہو سکا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

''فتح مکہ کے بعد کوئی ہجرت نہیں مگر جہاد اور اس کی نیت ہے؛ اور جب تمہیں جہاد کے لیے نکلنے کا کہا جائے تو نکل پڑو۔''[1]

یہی وجہ ہے کہ جب ان میں سے کسی ایک کو اسلام پر بیعت کے لیے لایا جاتا؛ تو اس سے ہجرت کی بیعت نہیں لی جاتی تھی۔ ان میں سے اکثر لوگ بنی ہاشم میں سے تھے؛ جیسے حضرت عقیل بن ابی طالب؛ ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب؛ ربیعہ بن الحارث؛ اور حضرت عباس؛ رضی اللہ عنہم اجمعین؛۔ ان کی ملاقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت ہوئی جب

[1] البخاري ٤/ ١٥؛ كتاب الجهاد والسير؛ باب فضل الجهاد والسير؛ مسلم ٣/ ١٤٨٧؛ كتاب الإمارة باب المبايعة بعد فتح مكة ...... سنن الترمذي ٣/ ٧٤؛ كتاب السير باب ماجاء في الهجرة.

آپ مکہ جا رہے تھے۔[اور یہ مدینہ کے راستہ میں تھے] ابھی مدینہ نہیں پہنچے تھے۔ اور ایسے ہی ابوسفیان بن الحارث؛ یہ رسول اللہ ﷺ کا چچا زاد تھا؛ یہ ابوسفیان بن حرب کے علاوہ ایک دوسرا ہے؛ یہ شاعر تھا؛ اور نبی کریم ﷺ کی ہجو کیا کرتا تھا۔ اسے بھی آپ نے راستہ میں پایا۔ یہ اچھے مسلمانوں میں سے ہوگیا تھا۔ یہ اور عم رسول اللہ ﷺ حضرت عباس رضی اللہ عنہما حنین کے موقع پر اس وقت بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہے تھے جب لوگ آپ کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خچر کی مہار پکڑی ہوئی تھی۔

جب اہل سنت والجماعت کے ہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے یہ مراتب ہیں؛ جیسا کہ کتاب وسنت کے دلائل سے واضح ہے۔ اور اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ہمنوا دوسرے لوگ وہ ہیں جو فتح مکہ کے بعد اسلام لائے؛ جن کا اسلام لانا حدیبیہ والوں سے متاخر ہے۔ اور حدیبیہ والوں کا اسلام سابقین اولین سے متاخر ہے [اسی لحاظ سے ان کے فضائل ومناقب ہیں]۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان تمام صحابہ کرام سے افضل ہیں۔ خلفاء ثلاثہ کے علاوہ کسی کو آپ پر فضیلت حاصل نہیں۔ تو پھر اہل سنت والجماعت پر کس منہ کے ساتھ یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے برابر سمجھتے ہیں یا آپ پر تقدیم وفضیلت دیتے ہیں؟۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مروانیہ اور دوسرے لوگوں کا ایک گروہ تھا۔ جنہوں نے آپ کے ساتھ مل کر قتال کیا؛ اور ان کے بعد ان کے ماننے والے کہتے ہیں: ''بیشک آپ [حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ] اس قتال میں اصابت رائے والے مجتہد اور حق پر تھے۔'' جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی یا تو ظالم تھے؛ یا پھر مجتہد تھے؛ مگر اجتہاد میں خطأ پر تھے۔ اس بارے میں انہوں نے کتابیں تصنیف کی ہیں جیسے جاحظ کی تصنیف کردہ کتاب ''المروانیہ۔'' اور ایک گروہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل گھڑ لیے۔ اور نبی کریم ﷺ سے ایسی روایتیں نقل کیں جو کہیں بھی ثابت نہیں۔ اس بارے میں ان کی بڑی بڑی حجتیں ہیں جنہیں بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔

اہل سنت والجماعت کے نزدیک یہ لوگ غلطی پر ہیں۔ اگرچہ رافضیوں کی غلطی ان کی غلطی سے بہت بڑھ کر ہے۔ رافضیوں کے لیے یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ وہ امامیہ مذہب پر عقیدہ رکھتے ہوئے ان لوگوں کے دلائل کا رد کرسکیں۔ اس لیے کہ امامیہ کے دلائل میں تناقض پایا جاتا ہے۔ ایسے دلائل سے استدلال کرتے ہیں جنہیں خود ہی دوسرے موقع پر توڑ دیتے ہیں۔ عقلی اور سمعی دلائل سے حجت لیتے ہیں؛ اور جو چیز اس سے بڑھ کر ہے؛ [یعنی کتاب وسنت] اس کا انکار کرتے ہیں۔ بخلاف اہل سنت والجماعت کے؛ ان کے دلائل صحیح اور اپنے موقع محل پر درست ہوتے ہیں۔

[اہل سنت والجماعت کے ساتھ ان روافض کا معاملہ ایسے ہی ہے] جیسے مسلمانوں کیساتھ عیسائیوں اور دیگر اہل کتاب کا معاملہ۔ اہل سنت والجماعت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نصرت میں ان کی مذمت کرنے والوں اور بغض رکھنے والوں؛ یا آپ سے برسر پیکار لوگوں کو حق پر کہنے والوں پر حجت قائم کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ مسلمانوں کے لیے یہ ممکن ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو جھٹلانے والے یہودیوں اور دوسرے لوگوں پر حجت قائم کرسکیں۔ بخلاف نصاری کے۔ اس لیے کہ عیسائی حضرت

عیسیٰ علیہ السلام کو جھٹلانے والے یہود و نصاریٰ پر علمی اور مدلل حجت قائم نہیں کر سکیں گے۔

شانِ حضرت علی رضی اللہ عنہ میں کوتاہی:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں کوتاہی کرنے والے اہل بدعت کے کئی گروہ ہیں:

۱۔ خوارج کا گروہ: جو کہ آپ کو کافر کہتا ہے۔ یہ لوگ آپ کیساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور جمہور مسلمین کو کافر قرار دیتے ہیں ۔ جب کہ اہل سنت والجماعت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایمان کو ثابت مانتے ہیں ؛ اور آپ سے محبت و دوستی کو واجب قرار دیتے ہیں ۔اس کے ساتھ ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ایمان کو ثابت مانتے ہیں۔ اور آپ سے محبت و دوستی کو واجب کہتے ہیں۔

۲۔ ایک گروہ کہتا ہے: ''اگر چہ حضرت علی رضی اللہ عنہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں۔مگر قتال کے مسئلہ میں معاویہ رضی اللہ عنہ حق پر تھے ۔حضرت علی رضی اللہ عنہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے قتال کرنے میں حق پر نہیں تھے۔ یہ کہنے والے لوگ بہت زیادہ ہیں' جیسے کہ وہ لوگ جنہوں نے آپ کے ساتھ مل کر قتال کیا۔ ان کے جمہور یا اکثر لوگ کہتے ہیں :حضرت علی رضی اللہ عنہ ایسے حاکم نہیں تھے جن کی اطاعت واجب ہوتی۔اس لیے کہ آپ کی خلافت نص یا اجماع سے ثابت نہیں۔

۳۔ تیسرا گروہ: ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی نسبت حق پر تھے۔ ان کا کہنا ہے :حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ قتال میں حق پر نہیں تھے۔مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ:'' یہ زمانہ فتنہ اور اختلاف و افتراق کا زمانہ تھا۔اس وقت پوری امت اسلامیہ کا کوئی نہ ہی [متفقہ] امیر تھا اور نہ ہی خلیفہ۔ اس قول کے کہنے والے اہل بصرہ' اہل شام؛ اہل اندلس علاوہ اور بہت سارے دوسرے علماء و محدثین رحمہم اللہ تھے۔ اندلس میں بہت سارے بنو امیہ کے علماء اسی قول کے قائل تھے۔ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے رحم و مغفرت کی دعا کرتے اور آپ کی تعریف کرتے تھے۔لیکن کہتے تھے: آپ خلیفہ نہیں تھے۔اس لیے کہ خلیفہ وہ ہوتا جس کی بیعت پر لوگ جمع ہو جائیں ۔آپ کی بیعت پر لوگ جمع نہیں ہوئے۔

۴۔ ان میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنے جمعہ کے خطبات میں چوتھا خلیفہ شمار کرتے تھے۔ پس تین پہلے خلفاء کو شمار کرتے اور چوتھا خلیفہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو شمار کرتے ۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام نہیں لیا کرتے تھے ۔ یہ لوگ دلیل پیش کرتے تھے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تو آپ پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہو گیا؛ بخلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے؛ آپ کے ہاتھ پر مسلمانوں کا اجتماع نہیں ہو سکا ۔ یہ لوگ کہتے ہیں : ہم امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو چوتھا خلیفہ اس لیے نہیں شمار کرتے کہ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں۔ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ سے افضل ہیں ۔جیسا کہ دوسرے کئی صحابہ کرام حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں' اگر چہ وہ خلفاء نہیں بن سکے۔ امام احمد بن حنبل اور دوسرے علماء رحمہم اللہ جو خلافت علی رضی اللہ عنہ کے قائل تھے نے

آپ کی خلافت پر حدیث سفینہ سے استدلال کیا ہے؛ جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
''میرے بعد تیس سال خلافت ہوگی، پھر ملوکیت کا آغاز ہو جائے گا۔''❶
امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
''حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چوتھا خلیفہ شمار نہ کرنے والے گدھے سے بڑھ کر گمراہ و بدتر ہیں۔''
آپ کے اس جملہ کی وجہ سے بعض لوگوں نے حضرت امام احمد رحمہ اللہ پر کلام کیا ہے' اور کہا ہے: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا انکار کرنے والوں میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور دوسرے وہ لوگ شامل ہیں جن کے متعلق اس طرح کا جملہ کہنا زیب نہیں دیتا۔ اور انہوں نے بہت ساری ان احادیث مبارکہ سے بھی استدلال کیا ہے جن میں خلافت نبوت کا ذکر ہے؛ مگر ان میں خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے علاوہ کسی دوسرے کا تذکرہ نہیں۔
مسند امام احمد میں حماد بن سلمہ سے روایت ہے' وہ علی بن زید بن جدعان سے' وہ عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ رضی اللہ عنہ سے اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ: ایک روز رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا:
''کیا تم میں سے کسی نے خواب دیکھا ہے؟'' میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میں نے دیکھا کہ آسمان سے ایک ترازو ولٹکایا گیا ہے پھر آپ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ وزن کیا گیا اور آپ بھاری نکلے۔ پھر حضرت عمر و ابوبکر رضی اللہ عنہما کو تولا گیا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ والا پلڑا جھک گیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں وزن کیا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ وزنی ثابت ہوئے۔ پھر ترازو اٹھا لیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ خلافت نبوت کی جانب اشارہ ہے اس کے بعد اللہ جسے چاہے حکومت و سلطنت سے نوازے۔''❷
امام ابوداؤد رحمہ اللہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا:
''آج ایک نیک آدمی نے خواب دیکھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رسالت مآب ﷺ سے باندھ دیا گیا ہے، اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے وابستہ کر دیا گیا تھا۔'' حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:
''جب ہم بارگاہ رسالت سے اٹھے تو ہم نے کہا: نیک آدمی سے رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس مراد ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ آپ کے خلفاء ہیں۔''❸
امام ابوداؤد رحمہ اللہ کی سنن میں حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے کہا:

---

❶ سنن ابی داؤد ـ کتاب السنة، باب فی الخلفاء(ح:٤٦٤٦) سنن ترمذی، باب فی الخلافة (ح:٢٢٢٦) ـ
❷ مسند احمد(٥/ ٤٤، ٥٠) سنن ابی داؤد۔ کتاب السنة۔ باب فی الخلفاء (ح: ٤٦٣٤ـ٤٦٣٥) تاہم اس میں خواب دیکھنے والے حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نہیں تھے بلکہ ایک دوسرے صحابی تھے۔ واللہ اعلم)
❸ سنن ابی داؤد۔ کتاب السنة۔ باب فی الخلفاء(حدیث:٤٦٣٦)

''اے اللہ کے رسول! میں نے خواب دیکھا کہ گویا ایک ڈول آسمان پر لٹکایا گیا۔ پس حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے تو انہوں نے اس ڈول کے کنارے پکڑ کر تھوڑا سا پی لیا پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو انہوں نے اس کے کنارے پکڑے اور اتنا پیا کہ پیٹ بھر گیا۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آئے تو انہوں نے اس کے کنارے پکڑ کر پیا؛ یہاں تک کہ سیر ہو گئے۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو انہوں نے اس کے دونوں کنارے پکڑے تو وہ ڈول ہل گیا اس کے پانی کے کچھ چھینٹے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر پڑ گئے۔''[1]

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: ''خلفاء تین ہیں: حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول تمام احادیث صحیحہ برحق ہیں۔ وہ خلافت جس پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہوا تھا؛ اور جس دور میں کفار سے قتال کیا گیا اور دین اسلام کو غلبہ نصیب ہوا وہ حضرات ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کی خلافت ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دور میں مسلمانوں کا آپس میں اختلاف ہو گیا تھا۔ اس دور میں مسلمانوں کی قوت کچھ اچھی حالت میں باقی نہ رہی تھی۔ اور نہ ہی اس دور میں کفار پر کوئی غلبہ اور رعب باقی رہا۔ یہ بات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ راشد ہونے میں قدح کا سبب نہیں بن سکتی۔ [حقائق کے پیش نظر] اتنا کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح پہلے خلفاء کو اقتدار اور قوت حاصل تھی؛ ایسی قوت آپ کو حاصل نہ ہو سکی۔ اور امت آپ کی اطاعت سے ایسے شرفیاب نہ ہو سکی جیسے آپ سے پہلے کے خلفاء کی اطاعت کرتی تھی۔ پس اس بنا پر آپ کے عہد مسعود میں ایسی عام اور مکمل خلافت قائم نہ ہو سکی جیسے آپ سے پہلے تین خلفاء کے دور میں تھی۔ حالانکہ آپ کا شمار بھی ہدایت یافتہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین میں ہوتا ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ: ''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جنگ کرنے میں حق پر تھے؛ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کیساتھ جنگ میں حق پر نہیں تھے۔ ان کا قول پچھلے گروہ کے قول کی نسبت ضعیف ہے۔ ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ: ''حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا مطالبہ کر رہے تھے۔ آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے چچا زاد اور ولی تھے۔ اولاد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے دیگر رشتہ دار حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس جمع ہو گئے تھے؛ اور ان کا مطالبہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یا تو قاتلین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کے حوالے کر دیں' یا پھر خود ان سے قصاص لیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسا نہیں کیا۔ اس وجہ سے انہوں نے آپ کی بیعت ترک کر دی اور آپ کے خلاف برسر پیکار ہو گئے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے جنگ شروع کی تھی؛ انہوں نے اپنے نفوس و بلاد کے دفاع میں اسلحہ اٹھایا تھا۔ اس وجہ سے انہوں نے کہنا شروع کر دیا تھا: کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان پر ظلم اور سرکشی کرتے ہیں۔

رہی وہ حدیث جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا: ''تجھے باغی جماعت قتل کرے گی۔'' بعض محدثین نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ بعض نے اس کی تاویل کی ہے۔ بعض نے کہا ہے: اس سے مراد خون [عثمان رضی اللہ عنہ] کا مطالبہ کرنے والی جماعت ہے۔ جیسا کہ بعض لوگ نعرہ لگاتے تھے کہ ہمیں خون عثمان رضی اللہ عنہ کا بدلہ

[1] سنن ابوداد: جلد سوم: حدیث نمبر ۱۲۳٤۔

چاہیے۔بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ: جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے قتل حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی حدیث کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

''کیا ہم نے انہیں قتل کیا ہے؟ انہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے قتل کیا ہے جو انہیں ہماری تلواروں کے نیچے لے کر آئے۔''

جب یہ تاویل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے ذکر کی گئی تو آپ نے فرمایا:

''تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے جنگ احد کے موقع پر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو قتل کیا ہوگا کیونکہ وہ اس دن مشرکین سے جنگ کر رہے تھے۔''

اس قول کے قائلین کا ائمہ اربعہ کے اصحاب اور معتبر علماء اہل سنت والجماعت کے ہاں کوئی کھوج نہیں مل سکا۔اصل میں یہ بہت سارے مروانیہ اور ان کی موافقت رکھنے والوں کا قول ہے۔

ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے میں شریک تھے۔ پھر بعض کہتے ہیں: آپ نے اعلانیہ اس کا حکم دیا تھا۔بعض کہتے ہیں: نہیں' بلکہ چپکے سے سازش کی تھی۔بعض کہتے ہیں: آپ اس قتل پر راضی رہے اور خوش ہوئے تھے۔اور بعض لوگ اس طرح کی دیگر باتیں بناتے ہیں۔یہ تمام باتیں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر جھوٹ اور بہتان ہیں۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نہ ہی قتل عثمان رضی اللہ عنہ میں شریک ہوئے' نہ ہی اس پر راضی تھے اور نہ ہی اس پر خوش ہوئے اور نہ ہی آپ نے کوئی سازش کی۔آپ سے روایت کیا گیا ہے- اور آپ اپنے اس قول میں بالکل سچے ہیں- آپ فرمایا کرتے تھے:''اللہ کی قسم! میں نہ ہی قتل عثمان رضی اللہ عنہ میں شریک ہوا اور نہ ہی ایسی کوئی سازش کی۔''

دوسری روایت میں ہے آپ نے فرمایا:''نہ ہی میں نے قتل کیا اور نہ ہی اس پر راضی تھا۔''

ایک روایت میں ہے: آپ نے سنا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والوں پر لعنت کر رہے تھے تو آپ نے فرمایا:

''اے اللہ! عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والوں پر خشکی اور سمندر میں اور پہاڑ اور وادی میں لعنت کر۔''

اہل شام کا عذر:

یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ بعض لوگوں نے اہل شام کے پاس جا کر جھوٹی گواہی دی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والوں میں شریک تھے۔ یہ گواہی آپ کی بیعت ترک کرنے کا سبب بنی تھی؛ اس لیے کہ ان لوگوں کو یہ یقین ہوگیا تھا کہ آپ ظالم ہیں؛ اور آپ کا شمار قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ میں ہوتا ہے۔اور آپ نے قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو اس وجہ سے پناہ دی ہوئی ہے کہ آپ اس قتل پر موافق تھے۔

اس طرح کی کئی ایک دیگر باتوں سے ان لوگوں کے قتال میں اجتہاد کی وجہ اور شبہ ظاہر ہو جاتا ہے جنہوں نے آپ سے جنگ کی تھی۔لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ بھی نہیں کہ آپ کے ساتھ قتال اور ترک بیعت کے متعلق اجتہاد میں

انہوں نے حق بات تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ اور نہ ہی قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل ہو جانے کی وجہ سے یہ لازم آتا ہے کہ آپ اس قتل [میں شریک یا پھر اس] پر موافق تھے۔ بعض لوگوں نے علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے یہ بھی عذر پیش کیے ہیں کہ:

۱۔ آپ ان لوگوں کو متعین طور پر نہیں جانتے تھے جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔

۲۔ یا آپ یہ سمجھتے تھے کہ ایک آدمی کے بدلہ میں ایک پوری جماعت کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ آپ کے پاس مقتولین کے وارثوں نے قصاص کا مطالبہ نہیں کیا' جس کی روشنی میں قاتلین میں پکڑا جاتا۔

ایسے عذر پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حقیقت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اتنی قوت حاصل نہ ہوسکی تھی کہ آپ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرتے۔ اگر ایسے ہوتا بھی تو اس سے مزید فتنہ وفساد اور بہت بڑا شر پھیل جاتا۔ جبکہ بڑے فساد سے بچنے کیلئے چھوٹے فساد کو قبول کر لینا یہ مصلحت کے زیادہ قریب ہے۔ اس لیے کہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ پورا لشکر تھے۔ ان کے پیچھے ان کے قبائل تھے جو ان کا دفاع کر رہے تھے؛ اور جو لوگ براہ راست قتل میں شریک ہوئے تھے؛ قلیل تعداد میں ہونے کے باوجود اپنے قبائل کے سرکردہ لوگ تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ آپ کے قتل کرنے پر قادر نہ ہوسکتے تھے۔ جب حضرات طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما قاتلین عثمان کو قتل کرنے کے لیے بصرہ کی طرف چل پڑے تو اس وجہ سے جنگ بپا ہوئی جس میں بہت ساری خلقت قتل ہوئی۔

جس چیز سے یہ معاملہ مزید واضح ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد لوگ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر جمع ہو گئے تھے؛ اور آپ مسلمانوں کے امیر عام بن گئے تھے؛ مگر اس کے باوجود آپ نے قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ میں سے جو لوگ باقی رہ گئے تھے' انہیں قتل نہ کر سکے۔ بلکہ یہ روایت کیا گیا ہے کہ: جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سفر حج کے لیے مدینہ پہنچے تو آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر سے آوازیں سنیں: ہائے امیر المؤمنین! ہائے امیر المؤمنین!۔'' آپ نے پوچھا یہ کیا ہے؟

لوگوں نے کہا: یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیٹی ہے جو ان کے خون کا مطالبہ کر رہی ہے۔ آپ نے لوگوں کو اسی حال میں چھوڑا؛ اور خود اس کی طرف چلے گئے؛ اور یوں گویا ہوئے: اے میری چچا زاد!'' لوگوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی ہماری اطاعت کی ہے۔ اور ہم غصہ کے باوجود ان کیساتھ بردباری اور تحمل مزاجی کا سلوک کر رہے ہیں۔ اگر ہم ان کے ساتھ بردباری نہ کریں تو وہ ہماری اطاعت ترک کر دیں۔ اور یہ کہ تم امیر المؤمنین کی بیٹی کی حیثیت سے عزت واکرام کے ساتھ بیٹھو' اس سے بہتر ہے کہ لوگوں کے ہاتھوں میں کھیل بن جاؤ۔'' آج کے بعد میں نہ سنوں کہ تم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو یاد کیا ہے۔''

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جو کہ آپ کے قصاص کے طلب گار تھے؛ جو کہتے تھے کہ: آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ قتال میں حق پر ہیں؛ اس لیے کہ آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو قتل کرنا چاہتے تھے؛ مگر جب آپ کو قدرت واختیار

حاصل ہو گیا ؛اور لوگ آپ کے ہاتھ پر جمع ہو گئے ؛ تو آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلین کو قتل نہیں کیا ؛ اگر چہ انہیں قتل کرنا واجب بھی تھا؛ اور اب آپ کو قدرت و اختیار بھی حاصل تھا؛ تو مسلمانوں سے جنگ کیے بغیر یہ کام کر گزرنا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھیوں سے جنگ کرنے کی نسبت زیادہ اولی واسہل تھا۔اور اگر معاویہ رضی اللہ عنہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل بھی کر دیتے تو اتنا بڑا فساد نہ پیدا ہوتا جتنا صفین کی راتوں میں ہوا تھا۔

اگر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے میں معذور تھے؛ خواہ اپنے عجز و کمزوری کی وجہ سے یا پھر فتنہ برپا ہونے کے اندیشہ سے؛ کیونکہ اس سے پھر جماعت بندی کا شیرزارہ بکھر جاتا [اور لوگ بغاوت کر جاتے] اور آپ کی حکومت کمزور ہو جاتی ۔تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ عذر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عذر سے زیادہ مقبول ہے۔اس لیے کہ فتنہ گروں اور فسادیوں کو قتل کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔اس سے مزید فتنہ پیدا ہوتا ؛ اختلاف پیدا ہوتا ؛ حکومت کمزور ہو جاتی ؛ خواہ اس بارے میں جتنی بھی سخت کوششیں کی جائیں۔

یہ حقیقت ہے کہ فتنہ کے شر و فساد کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب فتنہ ختم ہو چکا ہوتا ہے۔اس لیے کہ جب فتنہ برپا ہو رہا ہوتا ہے اس وقت وہ خوبصورت نظر آتا ہے؛ اور لوگ گمان کرتے ہیں کہ اس میں خیر و بھلائی ہوگی۔ جب انسان اس کے شر و فساد کی تلخی کو چکھ لیتے ہیں تو اس کے نقصانات ظاہر ہوتے ہیں۔

دونوں گروہوں کی طرف سے جو لوگ اس فتنہ میں شریک ہوئے ؛ انہیں اس جنگ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے حالات کا علم نہیں تھا۔اور انہیں اس فتنہ کے بپا ہونے تک اس کی تلخی کا اندازہ نہیں تھا۔یہاں تک کہ یہ واقعات ان لوگوں کے لیے اور ان کے بعد آنے والوں کے لیے درس عبرت بن کر رہ گئے۔

جو کوئی مسلمانوں کے مابین واقعہ ہونے والے فتنوں کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیتا ہے تو اس کے لیے واضح ہو جاتا ہے کہ کوئی بھی انسان ایسا نہیں ہے جس نے ان فتنوں میں شرکت کی ہو' اور ان کی وجہ سے اس کا انجام کار قابل تعریف رہا ہو۔اس لیے کہ ان فتنوں میں دین و دنیا کا نقصان ہے۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فتنوں میں شرکت سے منع کیا تھا' اور ان سے بچ کر رہنے کا حکم دیا تھا۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾

''ان لوگوں کو ڈرنا چاہیے جو آپ کے حکم کے خلاف کرتے ہیں کہ انھیں کوئی فتنہ آ پہنچے، یا انھیں دردناک عذاب آ پہنچے۔'' [النور۶۳]

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق شبہ اور اس کا جواب]:

معترض کا یہ کہنا کہ:''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے خلاف جنگ شروع کی۔''

[تو اس کا جواب یہ ہے کہ] ان لوگوں نے آپ کی اطاعت اور بیعت سے اپنے ہاتھ کو روکا؛ اور آپ کو ظالم اور خون عثمان رضی اللہ عنہ کا شریک قرار دینے لگے۔آپ کے بارے میں جھوٹے لوگوں کی گواہی قبول کی۔اور آپ کی طرف ایسی باتیں

منسوب کیں جن سے حقیقت میں وہ اللہ کے ہاں بری تھے۔''

❀ اب اگر کوئی کہے کہ:''صرف اس بنا پر تو ان سے جنگ کرنا جائز نہ تھا۔''

❀ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ:''ایسے ہی دوسرے لوگوں کو قتل کرنا بھی آپ کے حق میں مباح نہ تھا؛ اس لیے کہ آپ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے سے عاجز تھے۔ اگر مان لیا جائے کہ آپ ایسا کر سکتے تھے' مگر نہیں کیا؛ تو اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے واجب ترک کیا؛ اس میں یا تو آپ تاویل کررہے تھے' یا پھر گنہگار تھے۔ تو پھر بھی اس بنا پر جماعت مسلمین میں تفریق پیدا نہیں کی جاسکتی تھی اور نہ ہی آپ کی بیعت سے پیچھے رہنا اور آپ سے جنگ کرنا جائز تھا۔ بلکہ آپ کی بیعت کر لینے میں دین کے لحاظ سے ہر حال میں خیر اور بہتری تھی۔ اس میں مسلمانوں کے لیے بھی نفع تھا؛ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے زیادہ قریب تر تھا۔

صحیحین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:

''بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے لیے تین باتیں پسند کرتے ہیں:

۱......تم اللہ کی بندگی کرو' اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔

۲......اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو' اور آپس میں تفرقہ نہ کرو۔

۳......اور جس کو اللہ تعالیٰ تم پر حکمران بنادے اس کے لیے خیر خواہی کرتے رہو۔''❶

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مسلمان مرد پر حاکم کی بات سننا اور اطاعت کرنا لازم ہے خواہ اسے تنگی ہو یا آسانی؛ اور خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند ہو۔ سوائے اس کے کہ اسے کسی گناہ کا حکم دیا جائے پس اگر اسے معصیت و نافرمانی کا حکم دیا جائے تو نہ اس کی بات سننا لازم ہے اور نہ اطاعت کرنا۔''❷

صحیحین میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

''ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تنگی اور آسانی میں پسند و ناپسند میں اور اس بات پر کہ ہم پر کسی کو ترجیح دی جائے؛ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سننے اور اطاعت کرنے کی بیعت کی۔ اور اس بات پر بیعت کی کہ ہم حکام سے حکومت کے معاملات میں جھگڑا نہ کریں گے۔ اور اس بات پر بیعت کی کہ ہم جہاں بھی ہوں گے حق بات ہی کہیں گے اللہ کے معاملہ میں ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہ رکھیں گے۔''❸

بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

❶ رواه البخاري ۲/ ۱۲٤؛ مسلم ۳/ ۱۲٤۱؛ موطأ ۲/ ۹۹۰.

❷ صحيح مسلم؛ امارت اور خلافت کا بیان: ح: ۲۷۰ غیر معصیت میں حاکموں کی اطاعت کے وجوب...... کے بیان میں۔

❸ صحيح مسلم؛ امارت اور خلافت کا بیان: ح: ۲۷۱ غیر معصیت میں حاکموں کی اطاعت کے وجوب...... کے بیان میں۔

''جو شخص اپنے امیر کی کوئی ایسی بات دیکھے جسے وہ ناپسند کرتا ہو تو اس پر صبر کرے، کیونکہ جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر الگ ہوا یقیناً اس اپنی گردن سے اسلام کا طوق اتار پھینکا۔''

اور ایک روایت میں ہے: '' جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر الگ ہوتا ہے، اور اسی حالت میں مرجاتا ہے، تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوتی ہے۔''❶

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس نے اطاعت امیر سے ہاتھ نکال لیا تو وہ قیامت کے دن اللہ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اسکے پاس کوئی دلیل نہ ہوگی اور جو اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں کسی کی بیعت نہ تھی وہ جاہلیت کی موت مرا۔''❷

ایک روایت میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'' تین لوگ ایسے ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ قیامت والے دن بات بھی نہیں کریگا؛ اور نہ ہی انہیں پاک کرے گا اور نہ ہی ان کی جانب دیکھے گا اور ان کیلئے دردناک عذاب ہوگا: پہلا وہ آدمی جو دنیا کی غرض کے لیے حاکم کی بیعت کرے۔ اگر اسے کچھ مل جائے تو خوش ہوجائے' اور اگر کچھ نہ ملے تو ناراض رہے......''

[البخاری ۳/ ۱۷۸؛ مسلم ۱/ ۱۰۳]

بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''سنو اور اطاعت کرو اگر چہ تم پر حبشی غلام ہی حاکم کیوں نہ ہو جس کا سر کشمش کی طرح (یعنی چھوٹا سا) ہو۔''❸

اہل کوفہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی؛ آپ کے وقت میں آپ سے بڑھ کر کوئی دوسرا خلافت کا حق دار نہیں تھا۔ آپ خلیفہ راشد تھے اور آپ کی اطاعت واجب تھی۔ اور یہ بات بھی سبھی جانتے ہیں کہ قاتل کو قتل کرنا خون کی حفاظت کے لیے ہوتا ہے۔ جب ایسا احتمال ہو کہ چند لوگوں کے قتل کیے جانے کی وجہ سے بہت بڑا فتنہ وفساد بپا ہوگا' اور اس سے کئی گنا زیادہ لوگ قتل ہوجائیں گے؛ تو پھر ایسا کرنا نہ ہی اطاعت کا کام ہوتا ہے اور نہ ہی مصلحت۔ صفین [اور جمل] کے موقع پر عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والوں سے کئی گنا زیادہ لوگ قتل ہوگئے۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا کہ:

''مسلمانوں کی تفرقہ بندی کے وقت ایک فرقہ کا ظہور ہوگا' اور ان دو گروہوں میں سے ان کو وہ لوگ قتل کریں گے جو حق کے زیادہ قریب ہوں گے۔'' [مسلم ۲/ ۷٤٥؛ سنن ابو داؤد ٤/ ۳۰۰]

---

❶ صحیح بخاری کتاب الفتن ۔ باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم " سترون بعدی اموراً تنکرونھا" (ح:۷۰٥٤) صحیح مسلم ۔ کتاب الامارۃ۔ باب وجوب ملازمۃ جماعۃ المسلمین(ح:۱۸٤۹)۔

❷ صحیح مسلم:ح :۲۹٦۔ ❸ صحیح مسلم۔ أیضاً (ح: ۱۸۳۸)

یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہ نسبت حق کے زیادہ قریب تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حق کے اتنے زیادہ قریب نہیں تھے۔[جیسا کہ اس حدیث سے پتہ چلتا ہے]

ایسے ہی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا:

''اے عمار! تجھے باغی گروہ قتل کرے گا۔'' یہ سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا:''کیا ہم نے عمار رضی اللہ عنہ کو قتل کیا؟ ان کے قتل کے ذمہ دار تو وہ لوگ ہیں جو ان کو ہماری تلواروں کے نیچے لے آئے تھے۔''❶

اس حدیث کو امام بخاری اور امام مسلم رحمہ اللہ علیہم نے کئی اسناد سے نقل کیا ہے۔ جن لوگوں نے اس میں تاویل کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھیوں نے انہیں قتل کیا۔اور باغی جماعت سے مراد دم عثمان رضی اللہ عنہ کا مطالبہ کرنے والے ہیں۔ان تاویلات کا فاسد ہونا ہر خاص و عام کے لیے ظاہر ہے۔ یہ روایت بخاری اور مسلم میں صحیح اسناد کے ساتھ منقول ہے۔اسے امام احمد بن حنبل اور دیگر ائمہ نے صحیح کہا ہے۔ یہ بھی روایت میں ہے کہ آپ نے اسے ضعیف کہا ہے۔لیکن آخر میں انہوں نے اس حدیث کی تصحیح کر دی تھی۔

یعقوب بن شیبہ نے اپنی مسند میں [مسند اہل مکہ] میں مسند حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے احوال میں کہا ہے:''میں نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے سنا؛ آپ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے متعلق پوچھا گیا:''اے عمار! تجھے باغی گروہ قتل کرے گا۔'' تو امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا:''انہیں باغی گروہ نے ہی قتل کیا؛ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ اور اس سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی احادیث منقول ہیں۔لیکن آپ نے اس بارے میں اس سے زیادہ بات کرنے کو ناپسند کیا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں فرمایا ہے:''ہم سے مسدد نے حدیث بیان کی؛ ان سے عبدالعزیز بن المختار نے؛ اور ان سے خالد الحذاء نے حدیث بیان کی؛ وہ عکرمہ سے روایت کرتے ہیں؛ وہ کہتے ہیں: مجھ سے اور اپنے صاحبزادے علی سے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی خدمت میں جاؤ اور ان کی احادیث سنو۔ہم گئے۔ دیکھا کہ ابوسعید رضی اللہ عنہ اپنے باغ کو درست کر رہے تھے۔ہم کو دیکھ کر آپ نے اپنی چادر سنبھالی اور گوٹ مار کر بیٹھ گئے۔ پھر ہم سے حدیث بیان کرنے لگے۔ جب مسجد نبوی کے بنانے کا ذکر آیا تو آپ نے بتایا کہ ہم تو [مسجد کے بنانے میں حصہ لیتے وقت] ایک ایک اینٹ اٹھاتے۔لیکن عمار دو دو اینٹیں اٹھا رہے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھا تو ان کے بدن سے مٹی جھاڑنے لگے اور فرمایا:

''افسوس! عمار کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی۔ جسے عمار جنت کی دعوت دیں گے اور وہ جماعت عمار کو جہنم کی دعوت دے رہی ہوگی۔''

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ عمار رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ میں فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔''❷

---

❶ رواہ البخاری ٤/ ٢١؛ مسلم ٤/ ٢٢٣٥۔ مسند احمد(٤/ ١٩٩)، مستدرك حاكم(٤/ ٣٨٦)۔

❷ صحيح البخاری ٤/ ٢١؛ كتاب الجهاد؛ باب مسح الغبار عن الرأس في سبيل الله .

امام بخاری نے اسے ایک دوسری سند سے بھی حضرت عکرمہ سے روایت کیا ہے۔لیکن بہت سارے نسخوں میں پوری حدیث کو ذکر نہیں کیا گیا ہے؛ بلکہ ان میں اتنا ہی ہے:

''افسوس! عمار تم انہیں جنت کی دعوت دو گے اور وہ تمہیں جہنم کی دعوت دے رہے ہوں گے۔''

لیکن اس بارے میں اہل علم کا کوئی اختلاف نہیں کہ حدیث میں وارد یہ الفاظ زیادہ ہیں۔

امام ابوبکر البیہقی رحمہ اللہ اور دیگر حضرات نے کہا ہے:'' یہ روایت کئی حضرات نے خالد الحذاء سے روایت کی ہے؛ وہ عکرمہ سے وہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں۔ امام بیہقی رحمہ اللہ کے مطابق امام بخاری نے یہ زیادہ الفاظ ذکر نہیں کیے۔ اوراس کا عذر یہ پیش کیا ہے کہ یہ زیادہ الفاظ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنے۔لیکن آپ کے ایک ساتھی ابوقتادہ نے بیان کیے۔

جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت شعبہ کی ابونضرہ سے روایت میں ہے؛ وہ ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں؛ آپ نے فرمایا؛'' مجھے اس نے خبر دی جو مجھ سے بہتر ہیں ؛ بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے فرمایا:'' تمہیں ایک باغی جماعت قتل کرے گی۔''

داؤد بن ابی ہند کی ابونضرہ سے روایت ابوسعید خدری سے؛ اس میں ہے؛ بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ایک گروہ خروج کرے گا؛ انہیں وہ جماعت قتل کرے گی؛ جو اللہ کے نزدیک زیادہ حق پر ہوگی۔''[1]

حضرت عمار رضی اللہ عنہ دو دو اینٹیں اٹھا کر لا رہے تھے۔ میں نے براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنا؛ لیکن جب میں آیا تو میرے ساتھی کہہ رہے تھے؛ بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمار سے فرمایا:

''اے ابن سمیہ! افسوس ہے کہ تمہیں ایک باغی جماعت قتل کرے گی۔''[مسلم برقم ۷۰]

یہ حدیث امام مسلم روایت کی ہے۔سنن نسائی اور دیگر کتب میں ہے یہ حدیث ابن عون کی سند سے حسن بصری سے مروی ہے؛ وہ اپنی والدہ سے وہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتی ہیں۔فرماتی ہیں؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''عمار کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔''[مسلم برقم ۷۳]

یہ حدیث شعبہ نے خالد سے ؛ اس نے سعید بن ابی الحسین اور حسن سے روایت کی؛ وہ دونوں اپنی والدہ سے وہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتی ہیں۔

اس کی بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جملہ غزوہ یوم خندق کے موقع پر ارشاد فرمایا۔''

بیہقی نے اور دیگر محدثین نے اسے غلط کہا ہے؛ اور صحیح یہ ہے کہ آپ نے یہ جملہ تعمیر مسجد کے موقع پر ارشاد فرمایا۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس بات کا احتمال ہے کہ آپ نے یہ جملہ دو بار ارشاد فرمایا ہو۔ یہ حدیث اس کے علاوہ دیگر اسناد سے بھی روایت کی گئی ہے۔جن میں حضرت عمرو بن العاص اور ان کے بیٹے عبداللہ کی روایات بھی ہیں۔اور حضرت عثمان

[1] سبق الحدیث؛ و هذه الروایة في مسلم و سندها فيه ٢/ ٧٤٦ محمد بن المثنی ؛ حدثنا عبد الأعلی ؛ حدثنا داؤد بن أبي نضرة ......"

ابن عفان رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے؛ اور خود حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے بھی روایت کی ہے۔ یہ تمام اسناد قریب ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اس کی دیگر کمزور اسناد بھی ہیں۔ لیکن صحیح روایت دوسری تمام روایات سے مستغنی کر دیتی ہے۔ ❶ محدثین رحمہم اللہ کے ہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث ثابت ہے۔

وہ لوگ جنہوں نے آپ کو قتل کیا؛ وہی تھے جو براہ راست آپ کے قتل کے مرتکب ہوئے۔ حدیث میں مطلق ''باغی'' کے الفاظ ہیں۔ اسے کسی مفعول کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿خٰلِدِیْنَ فِیْهَا لَا یَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا﴾ (الکهف ۱۰۸)

''ان میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، وہ اس سے جگہ بدلنا نہ چاہیں گے۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان گرامی ہے:

((الذِین هم فِیکم تبع لا یبغون أهلا و لا مالا .))❷

''وہ لوگ جو تم میں تمہارے تابع ہیں؛ وہ نہ اپنا گھر چاہتے ہیں نہ ہی مال۔''

جب لفظ بغی کا اطلاق کیا جاتا ہے؛ تو اس سے مراد ظلم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ﴾ (الحجرات ۹)

''پھر اگر دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ﴾ (البقرہ ۱۷۳)

''پھر جو مجبور کر دیا جائے، اور وہ نہ بغاوت کرنے والا ہو اور نہ حد سے گزرنے والا۔''

مزید برآں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جملے اس وقت ارشاد فرمائے جب وہ مسجد کی تعمیر کے لیے اینٹیں اٹھا کر لا رہے تھے۔ لوگ ایک ایک اینٹ اٹھا کر لاتے۔ جبکہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ دو دو اینٹیں اٹھا کر لاتے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''افسوس! عمار تم انہیں جنت کی دعوت دو گے اور وہ تمہیں جہنم کی دعوت دے رہے ہوں گے۔''

---

❶ سنن الترمذي ۳۳۳/ ٥؛ کتاب المناقب ؛ باب مناقب عمار بن یاسر؛ عن ابی هریرة۔ وصحح الألباني في سلسلة الأحادیث الصحیحة ۲٦۹/ ۲ / برقم ۷۱۰ . وذکر اسناده ؛ وتکلم علی طریقه و الفاظه ۔

❷ هـذا جزء مِن حدِیث رواه مسلِم فِی صحِیحِهِ عن عِیاضِ بنِ حِمار المجاشِعِي رضي الله عنه فِی:٤/ ۲۱۹۷ ، ۲۱۹۹ ؛ کتابِ الجنةِ وصِفةِ نعِیمِها وأهلِها ، بابِ الصِفاتِ التِی یعرف بِها فِی الدنیا أهل الجنةِ وأهل النارِ ونصه فِیهِ: ((أن رسول اللهِ ﷺ؛ قال ذات یوم فِی خطبتِهِ:((ألا إِن ربِی أمرنِی أن أعلِمکم ما جهِلتم مِما علمنِی یومِی هذا . کل مال نحلته عبداً حلال وإِنِی خلقت عِبادِی حنفاء کلهم ......الحدِیث وفِیهِ...... وأهل النارِ خمس: الضعِیف الذِی لا زبر له ، الذِین هم فِیکم تبعا ولا یبغون أهلا ولا مالا...... الحدِیث . وذکر مسلِم له طرِیقا آخر جاء فِیهِ: ((وهم فِیکم تبعا لا یبغون أهلا ولا مالا)) . ومعنی لا زبر له: أی لا عقل له یزبره ویمنعه مِما لا ینبغِی .

اس میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی مذمت کا کوئی پہلو نہیں؛ بلکہ آپ کی مدح و تعریف ہے۔ اور اگر آپ کو قتل کرنے والے حق پر ہوتے تو اس میں حضرت عمار کی کوئی مدح و تعریف کی بات نہ تھی۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا مطالبہ کرنے میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر ان کی مدح و تعریف واجب ہوتی ہو۔

ایسے ہی جن لوگوں نے آپ کے قاتل کے بارے میں تاویل کی؛ کہ اس سے مراد وہ جماعت ہوگی جس کے ساتھ ان کا قاتل ہوگا۔ اس تاویل میں کھلم کھلا خرابی پائی جاتی ہے۔ اور ان پر وہی لازم آتا ہے جو وہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر لازم کر رہے ہیں۔ وہ یہ کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے غزوات میں اپنے ساتھیوں جیسے حضرت حمزہ وغیرہ کو قتل کیا ہو۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ: فلاں نے فلاں کو قتل کیا۔ کیونکہ انہوں نے ان کو ایسا حکم دیا جو ان کی موت کا سبب بنا۔ مگر یہ بات قرینہ پر مبنی ہوتی ہے؛ عندالاطلاق یہ بات نہیں کہی جاسکتی۔ بلکہ عندالاطلاق قاتل وہی ہوگا جس نے قتل کیا ہے؛ نہ کہ حکم دینے والا۔

پھر یہ بات اس سے کہی جاسکتی ہے جس نے غیر کو حکم دیا ہو۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو کسی ایک نے بھی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے اصحاب سے لڑنے کا نہیں کہا تھا۔ بلکہ آپ لوگوں سے بڑھ کر ان سے لڑنے کے حریص تھے۔ اور اس میں سب سے زیادہ رغبت رکھتے تھے۔ آپ کی یہ حرص کسی بھی دوسرے کی حرص سے بڑھ کر تھی۔ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر لوگوں کو اس جنگ کی ترغیب دیا کرتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ عقائد اور مقالات نقل کرنے والے علماء میں سے کسی ایک نے بھی اس رائے کو اختیار نہیں کیا۔ بلکہ حدیث کے ماہر اہل علم کے اس مسئلہ میں تین اقوال ہیں:

۱۔ ایک گروہ نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے؛ کیونکہ ان کے نزدیک یہ حدیث ایسی اسانید سے روایت کی گئی ہے جو ثابت نہیں ہیں۔ لیکن اہل صحیح نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔ امام بخاری نے بھی اسے حضرت ابو سعید سے روایت کیا ہے؛ جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ امام مسلم نے حضرت حسن کی والدہ کی سند سے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابو سعید اور قتادہ اور دیگر حضرات کی اسانید سے روایت کی گئی ہے۔

۲۔ ان میں سے کچھ حضرات کہتے ہیں: یہ اس بات کی دلیل حضرت امیر معاویہ ان کے ساتھی باغی تھے۔ اور یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو ان سے قتال کیا؛ وہ اہل عدل کا اہل بغی سے قتال تھا۔ لیکن یہ باغی متاول تھے۔ انہیں کافر یا فاسق نہیں کہا جاسکتا۔

لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ صرف ان کے باغی ہونے میں کوئی ایسی چیز تھی جو ان سے قتال کو واجب کرتی تھی؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر باغی سے قتال کرنے کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ باغیوں سے جنگ شروع کرنے کا حکم ہی نہیں دیا۔ لیکن یہ ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَی الْاُخْرٰی

فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْءَ اِلٰی اَمْرِ اللّٰہِ فَاِنْ فَآئَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَہُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَo اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَo﴾ [الحجرات]

" اور اگر ایمان والوں کے دوگروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے، پھر اگر وہ پلٹ آئے تو دونوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ مومن تو بھائی ہی ہیں، پس اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ اور اللہ سے ڈرو، تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔"

پس اللہ تعالیٰ نے باغیوں سے جنگ شروع کرنے کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ حکم دیا ہے کہ جب اہل ایمان کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو انہیں کے مابین صلح کرادو۔ یہ حکم ان سب کو شامل ہے؛ بھلے وہ دونوں گروہ باغی ہوں ؛ یا ان میں سے ایک گروہ باغی ہو۔ پھر ارشاد فرمایا:

﴿ فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰاہُمَا عَلَی الْاُخْرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْءَ اِلٰی اَمْرِ اللّٰہِ ﴾

" پھر اگر دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔"

اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان گرامی:

﴿ فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰاہُمَا عَلَی الْاُخْرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ ﴾

" پھر اگر دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے۔"

بسا اوقات یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ: اس بغاوت سے مراد اصلاح کے بعد ہوسکتی ہے۔ لیکن یہ ظاہر قرآن کے خلاف ہے۔ کیونکہ قرآن کے الفاظ صاف ظاہر ہیں:

﴿ فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰاہُمَا عَلَی الْاُخْرٰی ﴾

" پھر اگر دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے۔"

یہ حکم دونوں لڑنے والے گروہوں کو شامل ہے۔ خواہ ان کے مابین صلح کروائی گئی ہو یا نہ کروائی گئی ہو۔ جیسا کہ اصلاح کا حکم دونوں لڑنے والے گروہوں کو مطلق طور پر شامل ہے۔ قرآن کریم میں کہیں بھی باغیوں سے قتال شروع کرنے کا حکم نہیں ہے۔ لیکن حکم یہ ہے کہ جب دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے مابین صلح کرادو؛ اور پھر جب ان میں سے کوئی ایک دوسرے پر تجاوز کرے تو ان سے لڑائی کی جائے حتی کہ وہ اپنے اس عمل سے باز آجائیں۔ اور یہ اس وقت ہو گا جب وہ اصلاح کی بات نہ مانیں۔ لیکن اگر یہ گروہ صلح کی دعوت قبول کرلیں؛ تو ان سے جنگ نہیں لڑی کی جائے گی۔

اور اگر ان سے لڑائی شروع ہو جائے؛ اور پھر وہ صلح کی طرف مائل ہو جائیں تو پھر بھی ان سے جنگ نہیں لڑی جائے گی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان یہی ہے:

﴿ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (9) ﴾ (الحجرات)

''تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے، پھر اگر وہ پلٹ آئے تو دونوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

تو اس لڑائی کے بعد بھی حکم یہی ہے کہ اگر وہ صلح کی طرف پلٹ آئیں کہ ان کے مابین عدل ہو تو پھر ان کے مابین انصاف کیا جائے۔ فتنہ کی لڑائی میں یہ واقعہ نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جنگ شروع کرنے کا حکم نہیں دیا۔ لیکن یہ حکم دیا ہے کہ جب وہ آپس میں لڑیں؛ اور ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے؛ تو پھر زیادتی کرنے والے سے لڑا جائے۔ اور یقیناً اس آیت میں پہلے اصلاح کا حکم ہے؛ اور پھر سب مل کر زیادتی کرنے والے سے لڑیں۔ ان میں سے کسی ایک کو یہ حکم نہیں۔ کبھی ایسے بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی گروہ شروع میں زیادتی کرنے والا ہو؛ لیکن جب اس نے زیادتی کی؛ تو اس سے لڑائی کا حکم دیا گیا۔ تو دریں صورت اسے ان سے قتال کرنے والا شمار نہیں کیا جائے گا؛ بھلے ایسا عدم قدرت کی وجہ سے ہو یا کسی دوسری وجہ سے۔ اور بسا اوقات شروع میں باغی گروہ سے قتال کرنے سے عاجز ہوتے ہیں؛ یا پھر ایسی لڑائی نہیں کی جاسکتی جس میں انہیں اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف لوٹایا جائے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ جو کوئی بھی قتال پر قادر ہو؛ وہ ایسے بھی قتال کرسکتا ہو کہ دوسرے کو اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے پر مجبور کردے۔ جب وہ اتنا لڑنے سے عاجز ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف پلٹا سکیں؛ تو پھر وہ ان سے قتال کے لیے مامور بہ نہیں ہیں۔ نہ ہی یہ حکم واجب ہے اور نہ ہی مستحب۔ لیکن کبھی ایسا ہوسکتا ہے کہ وہ گمان کرتا ہو کہ میں ایسا کرنے پر قادر ہے؛ مگر آخر میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس پر قادر نہیں تھا۔ یہ وہ اجتہاد ہے جس پر مجتہد کو اس کی اچھی نیت اور قصد؛ اور مامور بہ کے بجا لانے کی بنا پر ثواب ملتا ہے۔ اگر وہ غلطی بھی کر جائے تب بھی اس کے لیے ایک اجر ہوتا ہے۔ یہ وہ اجتہاد نہیں ہوتا جس میں دوہرا اجر ہوتا ہے۔ بیشک ایسا اس وقت ہوتا ہے جب اجتہاد باطن میں بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے موافق ہو۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان گرامی ہے: ''جب حاکم اجتہاد کرتا ہے؛ اور اس سے خطا ہو جاتی ہے؛ تو اس کے لیے ایک اجر ہے؛ اور اگر وہ اجتہاد کرے اور حق کو پالے تو اس کے لیے دوہرا اجر ہے۔''[1]

یہ بھی اجتہاد میں سے ہے کہ ولی امر یا اس کے نائب کو دو یا اس سے زیادہ امور میں سے ایک کا اختیار ہوتا ہے۔ ان

[1] رواہ البخاری ۹/ ۱۰۸ ؛ کتاب الاعتصام ؛ باب أجر الحاکم إذا اجتهد فأصاب ؛ أو أخطأ؛ مسلم ۵/ ۱۳۱ ؛ کتاب الأقضية باب بیان أجر الحاکم إذا اجتهد ۔

میں سے وہ زیادہ مناسب کو اختیار کرتا ہے۔ یہ اختیار شہوت کی بنا پر نہیں ہوتا۔ جیسا کہ امام/ حاکم کو جنگی قیدیوں کے بارے میں اکثر علماء کے نزدیک تین باتوں میں سے ایک کا اختیار ہوتا ہے: وہ ان کو قتل کردے؛ غلام بنالے؛ یا پھر احسان کرتے ہوئے رہا کردے۔ بلا شک وشبہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

﴿ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً ﴾ (محمد ۴)

''پھر بعد میں یا تو احسان کرنا ہے اور یا فدیہ لے لینا۔'' یہ حکم منسوخ نہیں ہے۔

ایسے ہی ان لوگوں کے بارے میں اختیار جو دشمن اس سالار کے فیصلہ پر راضی ہو جائیں۔ جیسا کہ بنوقریظہ رسول اللہ ﷺ کے حکم پر قلعوں سے اتر آئے تھے۔ تو اوس میں سے ان کے حلفاء نے عرض کی کہ: جیسے خزرج کے حلفاء بنونضیر پر احسان کیا گیا تھا؛ ایسے ہی ان پر بھی احسان کر کے چھوڑ دیا جائے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کیا آپ اس بات پر راضی نہیں ہونگے کہ میں ان کے بارے میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو فیصلہ کرنے والا بنادوں؟ تو اوس اس پر راضی ہوگئے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد بن معاذ کے پاس آدمی بھیج کر انہیں بلالیا۔ آپ سوار ہوکر تشریف لائے۔ وہ اس وقت زخمی ہونے کی وجہ سے مسجد میں زیر علاج تھے۔ بنوقریظہ مدینہ کی مشرقی جانب آدھے دن کے فاصلے پر ؛ یا اس کے لگ بھگ دور تھے۔ جب حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ تشریف لائے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے سردار کے استقبال کے لیے کھڑے ہوجاؤ۔'' تو لوگ کھڑے ہوگئے۔ راستہ میں آپ کے قرابت دار آپ سے یہی گزارش کرتے رہے کہ ان پر احسان کیا جائے۔ اور انہیں عہد جاہلیت میں ان کی مدد ونصرت یاد دلاتے رہے۔ جب آپ وہاں پہنچ گئے تو فرمایا: ''بیشک اب سعد کے لیے وہ وقت آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہ کرے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے آپ کو حکم دیا کہ ان کے بارے میں فیصلہ کریں۔ تو آپ نے یہ فیصلہ فرمایا:

''ان کے جنگجوؤں کو قتل کیا جائے؛ اور ان کے بچوں کو قیدی بنا لیا جائے اور ان کے مال کو مال غنیمت بنا لیا جائے۔'' تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یقیناً تم نے ان کے بارے میں سات آسمانوں کے اوپر اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔'' [یہ حدیث صحیحین میں ثابت ہے]

ایک دوسری حدیث جسے صحیح مسلم میں روایت کیا گیا ہے؛ اس میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں؛ آپ نے فرمایا: ''جب تم کسی قلعہ والوں کو محاصرہ کرلو اور وہ قلعہ والے یہ چاہتے ہوں کہ تم انہیں اللہ کے حکم کے مطابق قلعہ سے نکالو تو تم اللہ کے حکم کے مطابق نہ نکالو بلکہ انہیں اپنے حکم کے مطابق نکالو کیونکہ تم اس بات کو نہیں جانتے کہ تمہاری رائے اور اجتہاد اللہ کے حکم کے مطابق ہے یا نہیں۔''❶

❶ رواہ مسلم ٣/ ١٣٥٦؛ کتاب الجهاد و السير؛ باب تأمير الإمام الأمراء ......؛ سنن أبي داؤد ٣/ ٥١؛ كتاب الجهاد باب في دعاء المشركين۔ سنن الترمذي ٣/ ٨٥؛ كتاب السير؛ باب ماجاء في وصية النبي ﷺ في القتال. سنن ابن ماجة ٢/ ٩٥٤؛ كتاب الجهاد باب وصية الإمام.

یہ دونوں صحیح احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ایک متعین حکم ہوتا ہے؛ جس میں ولی امر کو مصلحت کی بنا پر فیصلہ کا اختیار رہتا ہے۔ اور اگر اس کے علاوہ کوئی حکم ہوتا؛ تو اس کا حکم ظاہر میں نافذ ہو جاتا۔ پس جو کچھ قتال کے باب میں ہے؛ وہ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس میں اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک دو محبوب ترین کاموں میں سے ایک کا انتخاب کریں۔ خواہ وہ فعل کا بجالانا ہو یا ترک کرنا۔ اس کی وضاحت مصلحت یا خرابی کی بنا پر ہوتی ہے۔ پس جس چیز کا وجود اس کے عدم سے بہتر ہو؛ جس سے دین میں راجح مصلحت حاصل ہوتی ہو؛ تو یہی وہ چیز ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے خواہ وہ واجب ہو یا مستحب۔ اور جس چیز کا نہ ہونا اس کے وجود سے بہتر ہو؛ تو وہ نہ ہی واجب ہوتی ہے اور نہ ہی مستحب۔ اگرچہ اس کا اجتہاد کرنے والا اجتہاد کرنے پر ماجور ہے۔

جنگ اس گروہ سے ہوتا ہے جس کے پاس قوت ہو۔ پھر اگر وہ عدل کے ساتھ صلح پر راضی ہو جائیں؛ تو اب وہ رکاوٹ پیدا کرنے والے باقی نہیں رہتے؛ تو ان سے قتال کرنا بھی جائز نہیں رہتا۔ اگرچہ وہ باغی ہی کیوں نہ ہوں۔ یقیناً ان سے قتال کا حکم اس وقت تک ہے جب تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف نہ لوٹ آئیں؛ فرمایا:

﴿ فَإِنْ فَائَتْ فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ ﴾ (الحجرات)

''پھر اگر وہ پلٹ آئے تو دونوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرادو۔''

جیسا کہ جب ان کے مابین لڑائی کی ابتداء ہو تو ان کے مابین صلح کرانے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے وقوع فتنہ کے وقت ارشاد فرمایا تھا: ''لوگوں نے اس آیت پر عمل کو ترک کر دیا۔'' اور یہ بالکل ویسے ہی ہوا تھا جیسے آپ نے فرمایا۔ اس لیے کہ جب ان دونوں گروہوں کے مابین جنگ شروع ہوئی تو صلح نہیں کروائی گئی۔ اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ آپ باغی گروہ سے جنگ کر رہے تھے؛ تب بھی ان سے جنگ اس وقت کرنا تھی کہ وہ اللہ کے حکم پر لوٹ آئیں۔ اور پھر ان کے مابین عادلانہ صلح کرادی جاتی۔ اللہ تعالیٰ کا حکم یہی ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف لوٹنے تک جنگ کرو؛ جب وہ لوٹ آئیں تو ان کے مابین صلح کرادو۔ صرف لڑائی کا ہی حکم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِي حَتّٰى تَفِيْءَ إِلٰى أَمْرِ اللّٰهِ ﴾ (الحجرات)

''تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔''

وہ اگر اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف رجوع ہو جائیں/ لوٹ آئیں تو قتال رونما نہ ہوتا؛ اگر یہ امر تقدیر میں ہوتا تو قتال نہ ہوتا؛ جب آپ کو اس سے عاجز کر دیا گیا تھا تو پھر وہ اس حکم کا مخاطب نہیں رہے تھے۔

یوم احد میں جب جنگ کا تقاضا مسلمانوں کی فتح تھی؛ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کے گناہ کی وجہ سے یہ سارا نقشہ ہی بدل گیا۔ ایسے ہی حنین کے موقع پر میدان جہاد سے فرار اختیار کرنا گناہ کا کام تھا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اگر ایک گروہ کسی دوسرے گروہ پر زیادتی کرے؛ اور زیادتی کرنے والے کے ظلم سے بغیر جنگ کے دفاع ممکن ہو؛ تو پھر اس صورت میں جنگ کرنا جائز نہیں رہتا۔ اگر بغاوت یا زیادتی کا ازالہ وعظ یا فتویٰ؛ یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے

ہوسکتا ہوتو قتال جائز نہیں رہتا۔ اگر کسی ایک ایسے کے قتل سے بغاوت کا قلعہ قمع ہوسکتا ہو جس پر قدرت پالی گئی ہو؛ یا حد قائم کرکے؛ یا کسی کو سزا دیکر ایسا ممکن ہو؛ جیسا کہ چور کے ہاتھ کاٹ کر؛ یا ڈاکو کو سزا دیکر؛ یا پھر تہمت لگانے والے پر حد قائم کرکے؛ تو پھر اس صورت میں قتال جائز نہیں رہتا۔ اور اکثر طور پر فتنہ تب واقع ہوتا ہے جب ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرتا ہے۔ جب بغیر قتال کے مظلوم کو اس کا حق دلوانا ممکن ہوتو پھر قتال جائز نہیں ہوتا۔

اس آیت مبارکہ میں کہیں بھی ایسا کچھ بھی نہیں کہ اگر کوئی گروہ کسی عادل حکمران کی بیعت کرنے سے انکار کردے تو اس سے قتال کرنا واجب ہوجاتا ہے۔ اگرچہ انہیں امام کی اطاعت ترک کرنے کی وجہ سے باغی کہا جارہا ہو۔ ایسا ہرگز نہیں کہ جو کوئی امام کی بات نہ مانتا ہو اس سے جنگ کی جائے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعین زکواۃ سے جنگ اس لیے کی تھی کہ وہ زکواۃ بالکل ہی ادا نہیں کرتے تھے۔ تو کتاب وسنت کی روشنی میں ان سے جنگ کی گئی۔ ورنہ اگر وہ اس کی ادائیگی کو تسلیم کرتے؛ اور یہ کہتے کہ: ہم آپ کو نہیں دیں گے؛ تو پھر ان سے جنگ جائز نہ ہوتی۔ یہ اکثر علماء کا قول ہے۔

ان لوگوں کا یہ مسئلہ نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس حدیث عمار رضی اللہ عنہ میں ایک تیسرا قول بھی ہے؛ کہ بیشک حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو ایک باغی گروہ نے قتل کیا۔ ان کے لیے حضرت علی سے جنگ کرنا جائز نہ تھا۔ اور نہ ہی آپ کی بیعت اور اطاعت سے لیت ولعل کرنا جائز تھا۔ اگرچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ان سے قتال کے لیے مامور بہ نہ تھے۔ اور نہ ہی صرف آپ کی اطاعت گزاری سے گریز کرنے کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ان سے جنگ کرنا فرض ہوگیا تھا۔ کیونکہ یہ لوگ شرائع اسلام کا التزام کرتے تھے۔ اگرچہ ہر دو لڑنے والے گروہ متأول؛ مسلمان اور اہل ایمان تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے اس فرمان الٰہی کی روشنی میں استغفار اور دعائے رحمت کی جائے گی:

﴿وَالَّذِيْنَ جَآئُوا مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (الحشر ۱۰)

''اور (ان کے لیے) جو ان کے بعد آئے، وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے اور ایمانداروں کے لیے ہمارے دل میں کہیں (بغض) نہ ڈال؛ اے ہمارے رب بیشک تو شفقت ومہربانی کرنے والا ہے۔''

فصل:......حضرت امیر معاویہ کے کاتب وحی ہونے پر اعتراض

[ساتواں اعتراض]: [شیعہ مصنف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں] کہتا ہے: ''[اہل سنت] آپ کو کاتب وحی کہتے ہیں؛ حالانکہ اس نے وحی کا ایک لفظ بھی تحریر نہیں کیا۔''

[جواب]: مصنف کا یہ قول جہالت اور لاعلمی پر مبنی ہے۔ [اس کے دیگر دعووں کی طرح یہ بھی کذب صریح

ہے]۔اس کی کیا دلیل ہے کہ آپ نے وحی کا ایک کلمہ تک نہیں لکھا' بلکہ آپ خطوط لکھا کرتے تھے۔؟ ❶

[آٹھواں اعتراض] : رافضی کا کہنا کہ:'' کاتبین وحی کی تعداد دس سے کچھ زیادہ تھی ان میں سے رسول اللہ ﷺ کے سب سے خاص اور قریب ترین کاتب وحی حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔''

[جــواب] :اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی آپ ﷺ کے لیے وحی لکھا کرتے تھے۔جیسا کہ آپ نے رسول اللہ ﷺ اور مشرکین کے مابین حدیبیہ کا صلح نامہ لکھا۔رسول اللہ ﷺ کے لیے حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہ بھی کتابت کا کام کیا کرتے تھے۔زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بھی آپ کے منشی تھے۔اس میں کوئی شک وشبہ والی بات نہیں ۔

صحیحین میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی :

﴿لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [النساء ۹۵]

''نہیں برابر ہو سکتے مؤمنین میں سے بیٹھ جانے والے......''

تو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کتابت وحی کا فریضہ سرانجام دیا۔آپ ﷺ کے لیے منشی گیری [کتابت] کا کام کرنے والوں میں حضرت ابوبکر صدیق ؛ حضرت عمر فاروق ؛ حضرت عثمان غنی ؛ حضرت علی المرتضے ؛ حضرت عامر بن فہیرہ ؛ حضرت عبداللہ بن ارقم ؛ حضرت ابی ابن کعب ؛ حضرت ثابت بن قیس ؛ حضرت خالد بن سعید بن العاص ؛ حضرت حنظلہ بن الربیع الاسدی ؛ حضرت زید بن ثابت ؛ حضرت معاویہ بن ابی سفیان اور حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہم اجمعین شامل ہیں ۔

[نواں اعتراض] :[رافضی کہتا ہے]:''امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی بعثت کی پوری مدت مشرک رہے۔''

[جــواب] : اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت امیر معاویہ ان کے والد اور بھائی رضی اللہ عنہم اجمعین فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے ۔ یہ نبی کریم ﷺ کی وفات سے تین سال پہلے کا واقع ہے۔تو پھر یہ کہنا کیسے ممکن ہے کہ بعثت کا پورا عرصہ مشرک رہے؟ جب نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے تو اس وقت معاویہ صغیر السن تھے۔ہندا سے کھیلایا کرتی تھی۔معاویہ رضی اللہ عنہ بھی فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہونے والوں کے ساتھ اسلام لے آئے۔ جیسے دوسرے لوگ آپ کا بھائی یزید؛ سہیل بن عمرو ؛ صفوان بن امیہ؛ عکرمہ بن ابو جہل؛ ابوسفیان بن حرب ؛ رضی اللہ عنہم اجمعین اسلام لائے۔ یہ لوگ اسلام لانے سے قبل معاویہ رضی اللہ عنہ کی نسبت سے بڑے کافر اور نبی کریم ﷺ کے بڑے دشمن اور برسرپیکار رہنے والے لوگ تھے۔

صفوان' عکرمہ اور ابوسفیان احد کے موقع پر کفار کے لشکر کے سرادر تھے۔اور غزوۃ خندق کے موقع پر بھی بڑے سردار تھے مگر اس کے باوجود یہ تینوں اصحاب بعد میں بہترین مسلمان ثابت ہوئے ؛ اور یرموک کے موقع پر شہادت پائی۔اسلام

---

❶ رافضی قلم کار نے خود تسلیم کیا ہے کہ حضرت معاو رضی اللہ عنہ یہ سرور کائنات ﷺ کے خطوط لکھا کرتے تھے۔ظاہر ہے کہ آپ کے خطوط میں بھی وہی بات ہوتی ہوگی جو بذریعہ وحی آپ پر نازل ہوئی ہو۔قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ (سورۃ النجم)علاوہ ازیں آپ لکھواتے وقت اس بات کا خیال نہیں رکھتے تھے کہ یہ وحی ہے یا غیر وحی۔ جو صحابہ بھی آپ کی خدمت میں کتابت کا کام کرتے تھے وہ ہر ایسی چیز لکھتے جس کی ضرورت ہوتی تھی۔

لانے سے قبل معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ کبھی بھی آپ نے نبی کریم ﷺ کو اپنی زبان یا ہاتھ سے کوئی تکلیف پہنچائی ہو۔ جو لوگ معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر دشمن اور مخالفت کرنے والے تھے ؛ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے سچی محبت کرنے والے بن گئے [یہاں تک کہ اس راہ میں اپنی جانیں قربان کردیں] اور اللہ اور اس کا رسول ان لوگوں سے محبت کرنے لگ گئے تھے۔ تو پھر کون سی چیز اس راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ بھی ان جیسے ہوگئے ہوں؟''

اپنی ولایت کے عرصہ میں آپ سب سے بااخلاق اور اعلیٰ سیرت و کردار کے حامل تھے۔ آپ ان لوگوں میں سے تھے جو بہترین مسلمان ثابت ہوئے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ اور آپ کے بادشاہ بن جانے کا معاملہ نہ ہوتا تو آپ کا تذکرہ صرف خیر کے الفاظ میں ہی کیا جاتا۔ جیسا کہ آپ جیسے دوسرے لوگوں کو صرف خیر کے ساتھ ہی یاد کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان کا شمار بھی فتح مکہ کے موقع پر اسلام لانے والوں میں ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے اسلام لانے کے بعد نبی کریم ﷺ کے ساتھ کئی ایک غزوات میں شرکت کی۔ جیسے : غزوہ حنین ؛ غزوہ طائف ؛ غزوہ تبوک وغیرہ۔ آپ نے بھی ایسے ہی اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر ایمان کے ساتھ ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہے جیسے آپ جیسے دوسرے صحابہ نے جہاد کیا تھا۔ پھر ان لوگوں کو کفار کیسے کہا جاسکتا ہے حالانکہ یہ لوگ سن آٹھ' نو' دس اور گیارہ ہجری کا عرصہ مؤمنین اور مجاہدین تھے؟

مکہ مکرمہ کی فتح رمضان سن آٹھ ہجری میں ہوئی۔ اس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے۔ اور اس پر بھی لوگوں کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات ربیع الاول سن گیارہ ہجری میں ہوئی۔ ایمان سے پہلے تمام لوگ ہی کافر تھے۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کے دشمن تھے؛ مگر پھر وہ اسلام لائے اور اچھے مسلمان ثابت ہوئے۔ جیسے ابوسفیان بن الحارث بن عبدالمطلب جو کہ نبی کریم ﷺ کا چچازاد بھائی تھا۔ آپ کی سب سے زیادہ ہجو کیا کرتا تھا۔ اور اسلام سے قبل نبی کریم ﷺ سے بہت سخت دشمنی رکھتا تھا۔ جبکہ معاویہ رضی اللہ عنہ اور اس کا والد نبی کریم ﷺ سے بہت سخت دشمنی رکھتے تھے۔ یہی حال ان کی والدہ کا تھا۔ یہاں تک کہ وہ جب مسلمان ہوگئی تو اس نے کہا: یا رسول اللہ!'' اب سے پہلے روئے زمین پر کسی گھرانے کی ذلت مجھے آپ کے گھرانہ کی ذلت سے زیادہ پسند نہ تھی مگر اب روئے زمین پر کسی گھرانے کی عزت آپ کے گھرانے کی عزت سے زیادہ پسند نہیں۔''[1]

ان ہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی تھی:

﴿عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً وَّاللّٰهُ قَدِيْرٌ وَّاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (الممتحنة ۷)

[1] صحیح بخاری:ح۱۰۲۹؛ ۸/ ۱۳۱؛ کتاب الایمان و النذور ؛ باب کیف کانت یمین النبی ﷺ؛ مسلم ۳/ ۱۳۳۹ ؛ کتاب الأقضية ؛ باب قضية هند.

''بہت قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ میں اور آپ کے دشمنوں میں محبت پیدا کر دے اللہ کو سب قدرتیں حاصل ہیں اور اللہ غفور رحیم ہے۔''

بیشک اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ اور آپ سے دشمنی رکھنے والے ابوسفیان' ہند اور دوسرے لوگوں کے مابین محبت پیدا کر دی۔ اور وہ ان لوگوں کی توبہ پر ان کے گناہ جیسے شرک وغیرہ بخشنے والا مہربان ہے۔ وہ مؤمنین پر بڑا رحیم ہے۔ اور یہ سارے لوگ اس کے بعد اہل ایمان ہو گئے تھے۔

[دسواں اعتراض] : شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''جب مکہ فتح ہوا تو معاویہ رضی اللہ عنہ یمن میں نبی کریم ﷺ کو مورد طعن بتانے میں مشغول تھے۔ جب ان کے والد ابوسفیان حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو عار دلانے کے لیے چند اشعار لکھے اور یہ بھی کہا کہ تم دین محمد ﷺ اختیار کر کے صابی ہو گئے ہو۔ فتح مکہ کا واقعہ ہجرت کے آٹھویں سال پیش آیا۔ اس وقت تک معاویہ اپنے شرک پر قائم تھے۔ اور نبی کریم ﷺ سے بھاگ رہے تھے۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو مباح الدم قرار دیا تھا۔ آپ بھاگ کر مکہ چلے گئے۔ جب کوئی جائے پناہ نہ ملی تو مجبوراً بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر نبی کریم ﷺ کی وفات سے صرف پانچ ماہ قبل اپنے اسلام کا اظہار کیا۔ اور معافی طلب کرنے کیلئے حضرت عباس رضی اللہ عنہ پر گر پڑے۔ آپ نے رسول اللہ ﷺ سے ان کے بارے میں سوال کیا؛ تو آنحضرت نے آپ کو معاف کر دیا۔ پھر حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے سفارش کی کہ انہیں شرف بخشا جائے' اور کاتبین کی جماعت میں آپ کا بھی اضافہ کیا جائے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے آپ کی بات مان لی' اور دیگر چودہ کاتبین وحی کے ساتھ آپ کا بھی اضافہ کر دیا۔ اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ آپ کاتب وحی تھے؛ تو اس مختصر سی مدت میں آپ نے کتنا نصیب کمایا ہوگا؟ جو اس کے بدلہ میں دوسروں کو چھوڑ کر آپ کو کاتب وحی کی صفت سے موصوف کیا جائے؟ حالانکہ زمخشری - جس کا شمار مشائخ حنفیہ میں ہوتا ہے - اپنی کتاب ''ربیع الابرار'' میں لکھتے ہیں: انہوں نے چار آدمیوں کیساتھ نبوت کا دعوی کیا تھا۔ جملہ کاتبین میں سے ایک عبداللہ بن سعد بن ابی سرح بھی تھا' جو مرتد ہو کر مشرکین سے جا ملا۔ اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ وَ لٰكِنۡ مَّنۡ شَرَحَ بِالۡكُفۡرِ صَدۡرًا فَعَلَيۡهِمۡ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ لَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴾

[النحل ١٠٦]

''لیکن جو کفر کے لیے سینہ کھول دے تو ان لوگوں پر اللہ کا بڑا غضب ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔''

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

''ابھی یہاں ایک شخص آئے گا جس کی موت تارک سنت ہونے کی حالت میں ہوگی۔'' اتنے میں معاویہ رضی اللہ عنہ نمودار ہوئے۔ نبی ﷺ ایک مرتبہ خطبہ دینے کے لیے اٹھے؛ اسی دوران معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے یزید کا ہاتھ تھام کر باہر چل دیے تو آپ نے فرمایا: ''اللہ قیادت کرنے والے اور جس کی قیادت کی گئی ہے؛ دونوں پر

لعنت کرے۔''یعنی جس دن امت اس گستاخ معاویہ کے ساتھ ہوگی۔

معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ میں پورا زور لگایا۔ اور بہترین صحابہ کو موت کے گھاٹ اتارا۔ خلافت معاویہ میں برسر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر لعنت بھیجی جاتی تھی۔ یہ سلسلہ اسی سال تک جاری رہا یہاں تک کہ عمر بن عبدالعزیز نے اسے بند کیا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو زہر کھلایا اور اس کے بیٹے یزید نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا اور ان کا مال و متاع لوٹا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کے والد ابوسفیان نے غزوۂ احد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اگلے دانت توڑے اور اس کی ماں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا جگر چبایا تھا۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[[سلسلۂ جوابات]] : ہم تردیداً کہتے ہیں: اللہ کی ذات پاک ہے جس نے کذب و دروغ کو روافض کا خاصہ بنایا؛ اس بیچارے مصنف کا یہ حال ہے کہ اسے صحیح تاریخ کا بھی پتہ نہیں' ہم ان شاء اللہ اس کا مبلغ علم آگے چل کر پوری طرح واضح کریں گے؛ اور ایک ایک کرکے اس کے اعتراضات کا جواب دیں گے۔

[گیارھواں اعتراض] : جب مکہ فتح ہوا تو معاویہ رضی اللہ عنہ یمن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مورد طعن بتانے میں مشغول تھے۔ جب ان کے والد ابوسفیان حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو معاویہ نے ان کو عار دلانے کے لیے چند اشعار لکھے......''

[جواب]: اس اعتراض کا جھوٹ ہونا صاف ظاہر ہے۔ کیونکہ معاویہ [فتح مکہ سے قبل] مکہ میں تھے' یمن میں نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابوسفیان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ وارد ہونے سے پہلے اس وقت اسلام لائے تھے جس رات آپ مرّ الظہران [1] نامی مقام پر اترے تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بارگاہ نبوی میں عرض کیا:'' اے اللہ کے رسول! ابوسفیان

[1] ظہران چند مقامات کا نام ہے، اس سے مراد یہاں وہ وادی ہے جو مدینہ سے مکہ آتے ہوئے راستہ میں پڑتی ہے، اس وادی کے قریب ایک گاؤں مرّ نامی آباد تھا اس وادی کی مناسبت سے اسے مرّالظہران کہنے لگے۔ اسی وادی میں ابوسفیان رضی اللہ عنہ مشرف باسلام ہوئے حدیث میں ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے جس گھر کا ذکر کیا گیا ہے یہ وہی جگہ ہے جہاں مکہ میں دولت عثمانیہ کے آخری دور میں ایک شفاخانہ ''مستشفی القبان'' نامی تعمیر کیا گیا تھا۔ یادگار کے طور پر اس گھر کے ایک حصہ میں مسجد تعمیر کی گئی ہے۔ محی الدین خطیب رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے بچشم خود خوبصورت عثمانی خط میں یہ الفاظ دیکھے:'' مَنْ دَخَلَ دَارَ اَبِیْ سُفْیَانَ فَھُوَ اٰمِنٌ'' گھر کے اندر مسجد کے قریب ایک حوض تھا جس میں پانی بہہ رہا تھا۔ شاید مکہ میں صرف وہی ایک حوض ہے جس میں ہمیشہ پانی بہتا رہتا ہے۔ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے گھر کو یہ عظیم خصوصیت اس لیے عطا ہوئی کہ مکہ کے لوگ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دیا کرتے تھے تو آپ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے گھر میں پناہ گزیں ہوتے۔ (دیکھیے :الاصابہ لابن حجر: ۲/ ۱۷۹، بروایت طبقات ابن سعد)۔ بایں وجہ ابوسفیان وہ شخص تھا جو قرابت داری کی بنا پر آپ سے وابستہ تھا اور اس لیے محبت کیے جانے کا مستحق تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ لَّا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی﴾ (الشوریٰ)

''آپ فرما دیں: میں قرابت داری کی محبت رکھنے کے سوا تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتا۔''

ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے حلقہ بگوش اسلام ہونے سے پہلے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے مابین قرابت دارانہ الفت و مودّت کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن امیہ کے ہاتھ ابوسفیان کو بہترین قسم کی کھجوریں ہدیہ کی تھیں۔ ابوسفیان نے یہ ہدیہ قبول ⇦⇦⇦

عزو وقار کے خواہاں ہیں۔'' یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا:

⇦⇦⇦ کیا اور آپ کی خدمت میں چمڑے کا تحفہ بھیجا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ نے یہ ہدیہ خود طلب فرمایا تھا۔ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہونے سے پیشتر نبی کریم ﷺ نے ان کی بیٹی ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تھا، ام حبیبہ کا نام رملہ تھا۔ یہ مسلمان ہو کر اپنے خاوند عبید اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے ساتھ حبشہ چلی گئی تھیں۔ عبید اللہ وہاں نصرانی ہو گیا اور اسی جگہ اس کی موت واقع ہوئی۔ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے خواب دیکھا کہ کوئی شخص انھیں ''ام المومنین'' کہہ کر پکار رہا ہے۔ جونہی ان کی عدت گزری نجاشی شاہ حبشہ کی ایک لونڈی حاضر ہوئی اور کہا: ''شاہ حبشہ نے پیغام بھیجا ہے کہ نکاح کے لیے آپ اپنا وکیل مقرر کر لیں۔'' چنانچہ آپ نے خالد بن سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کو اپنا وکیل مقرر کیا۔ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے نجاشی کے حکم سے نکاح کا خطبہ پڑھا۔ نجاشی نے نبی کریم ﷺ کی جانب سے چار صد دینار مہر ادا کیا۔ (مسند احمد (٤٢٧/٦) مستدرك حاكم (٢٠/٤، ٢١) من طريق الواقدى سنن ابى داؤد ـ كتاب النكاح ـ باب الصداق (ح: ٢١٠٧) مختصرًا۔ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے نجاشی کی لونڈی کو چاندی کے دو کنگن ہدیہ کیے۔

ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کا مطالبہ کرنے میں نجاشی رحمہ اللہ کی جانب نبی کریم ﷺ نے عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کو قاصد بنا کر بھیجا۔ یہ وہی عمرو ہے جو کھجوروں کا ہدیہ لے کر ابوسفیان کے ہاں گیا تھا اور پھر ابوسفیان کا ہدیہ آپ کو پہنچایا۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کے قاصد شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ حبشہ سے مدینہ پہنچیں۔ ابو سفیان رضی اللہ عنہ تاہنوز مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ جب ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے نبی کریم ﷺ کے نکاح میں آنے کی خبر پہنچی تو آپ کی مدح کرتے ہوئے کہا: یہ مرد مجھے رسوا نہیں کرے گا۔'' (مستدرك حاكم (٢٢/٤) طبقات ابن سعد (٩٩/٨) و فى اسناده الواقدى متروك) ابوسفیان جب مشرف باسلام ہوئے تو نبی کریم ﷺ نے آپ کو قریش کے مشہور بت ''منات'' کو منہدم کرنے کیلئے مامور فرمایا۔ چنانچہ آپ نے تعمیل ارشاد کر دی۔ غزوہ حنین و طائف کے موقع پر ابوسفیان نبی کریم ﷺ کے ہم رکاب تھے۔ غزوہ طائف میں ابوسفیان کی آنکھ میں تیر لگا۔ شدید درد ہو رہا تھا۔ اسی اثناء میں سرور کائنات نے فرمایا۔ ''اگر آپ چاہیں تو بارگاہ ایزدی میں آنکھ کی واپسی کے لیے دعا کروں اور آپ کو دوبارہ آنکھ عطا ہو، اور اگر آپ چاہیں تو اس کے عوض جنت خرید لیں۔'' ابوسفیان نے کہا میں جنت کو ترجیح دیتا ہوں۔ یہ وعدہ سرکار دو عالم نے جہاد کے موقع پر فرمایا۔ جو اکمل العبادات ہے، اس سے ابوسفیان کا جنتی ہونا واضح ہوتا ہے۔ خواہ اس کو ناپسند کرنے والا کتنا ہی ذلیل کیوں نہ ہو۔ یہ وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد ابوسفیان اللہ کی راہ میں مسلسل جہاد کرتے رہے۔ ابن سعد بسند صحیح سعید بن مسیّب سے روایت کرتے ہیں، وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ غزوۂ یرموک کے دن سب آوازیں خاموش ہو گئی تھیں صرف ایک آواز آ رہی تھی: '' یَا نَصْرَ اللّٰہِ اِقْتَرِبْ۔''

سعید بن مسیّب کے والد ان لوگوں میں سے تھے جو بیعت الشجرہ میں شامل تھے۔ یہ کہتے ہیں میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ پکارنے والا ابوسفیان تھا، جو اپنے بیٹے یزید کے جھنڈے تلے مصروف پیکار تھا۔ (اسد الغابۃ (۵/۲۱۲) یہ امر موجب حیرت و استعجاب ہے کہ کذب و دروغ کے خوگر روافض کے نزدیک ان مجاہدین ابرار کی شان میں گستاخی کرنا اور ان کے بارے میں غلط سلط روایات بیان کرنا گویا کوئی جرم ہی نہیں۔ دوسری جانب اہل سنت کا یہ حال ہے کہ یہ سب بدگوئی سن کر اس لیے اَن سنی کر دیتے ہیں کہ مسلمانوں کا شیرازہ منتشر نہ ہونے پائے۔ یہ اچھی شیرازہ بندی ہے کہ خلفائے ثلاثہ اور ان مجاہدین صحابہ کی شان میں گستاخی کی جاتی ہے جنھوں نے اقصائے عالم میں دین حق کے جھنڈے گاڑے تھے اور ان کے سِیَر و سوانح کا حلیہ بگاڑ کر پیش کیا جاتا ہے اور ادھر اہل سنت ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ یاد رہے کہ اسلام کی شیرازہ بندی کثرت تعداد سے نہیں بلکہ اکابر اولیاء اللہ مثلاً ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اور ان کے متبعین سے ہوتی ہے۔ جب تک لوگ ان مجاہدین ابرار کی محبت سے سرشار رہے اور اپنے آپ کو ان کے اخلاق و عادات سے آراستہ کیے رکھا، دین حق ترقی پذیر رہا۔ دین کی تفریق دراصل یہ ہے کہ روافض کو اس بات کی کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ صحابہ کے محاسن کو معائب بنا کر پیش کریں اور نہایت مذموم انداز میں ان کی تصویر کھینچیں۔

''جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوا سے امن دیا جائے اور جو مسجد میں داخل ہو وہ بھی امن کا مستحق ہے اور جو ہتھیار ڈال دے وہ بھی مامون ہے۔''❶

ابوسفیان دلائل نبوت سے بے خبر نہ تھے۔انھوں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایام صلح میں اسلام لانے سے چند ماہ قبل خود ہرقل کی زبان سے نبی کریم ﷺ کی رسالت کے براہین و دلائل سنے تھے۔❷ علاوہ ازیں امیہ بن ابی الصلت نے بھی [اس موقع سے] استفادہ کیا تھا۔تاہم حسد❸ کا جذبہ اسے ایمان سے مانع رہا، یہاں تک کہ بحالت مجبوری اس نے اسلام قبول کیا۔مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بھائی یزید رضی اللہ عنہ کے بارے میں شیعہ مصنف نے جو کچھ ذکر کیا ہے وہ سب جھوٹ ہے۔اس کے ذکر کردہ اشعار بھی جھوٹے ہیں۔اس لیے کہ لوگ جانتے ہیں کہ فتح مکہ کے بعد لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا؛ اور تمام بتوں کو ختم کر دیا گیا۔[ان خود ساختہ اشعار میں جس بت عزی کا ذکر ہے]' نبی کریم ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو یہ بت توڑنے کے لیے بھیجا تھا۔یہ بت عرفات کے قریب ایک جگہ پر نصب تھا۔فتح کے بعد مکہ میں نہ ہی کوئی عزیٰ باقی رہا اور نہ ہی کوئی عزیٰ کی پوجا ترک کرنے پر ملامت کرنے والا باقی رہا۔اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اشعار کسی جھوٹے نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زبانی گھڑے ہوئے ہیں۔اور اس کی جہالت کی انتہاء یہ ہے کہ اسے واقعات کا درست علم ہی نہیں۔

ایسے ہی آپ کے نانا ابوامیہ عتبہ بن ربیعہ اور ان کے ماموں ولید بن عتبہ' اور آپ کی والدہ کے چچا شیبہ بن ربیعہ اور اس کے بھائی حنظلہ کے متعلق جو کچھ ذکر کیا گیا ہے؛ یہ معاملہ جمہور قریش اور ان لوگوں کے مابین مشترک ہے۔ان میں

❶ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج۔ باب ما جاء فی خبر مکۃ(ح:۳۰۲۱، ۳۰۲۲)۔

❷ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی۔ باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ (ح:۷)، صحیح مسلم کتاب الجهاد۔ باب کتاب النبی ﷺ الی هرقل ملك الشام(ح:۱۷۷۳)۔

❸ حسد کے لفظ سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس حدیث کی جانب اشارہ کیا ہے جسے ابن سعد نے ابوالسفر سعید بن یحمد ہمدانی ثوری المتوفی ۱۱۲ھ سے روایت کیا ہے کہ ابوسفیان نے جب مرالظہر ان کے مقام پر دیکھا کہ لوگ آپ کے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں اور ہر شخص آپ کے بہت قریب آنا چاہتا ہے تو آتش حسد سے جل اٹھا۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ زور سے اس کے سینہ پر دے مارے اور کہا:''تب اللہ آپ کو رسوا کرے گا۔'' ابوسفیان نے کہا:''میں توبہ کرتا ہوں اور اللہ سے اپنے گناہ کی مغفرت چاہتا ہوں۔اللہ کی قسم! میرے جی میں یہ خیال ضرور آیا تھا۔البتہ میرے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکلا۔''

ابواسحاق السبیعی نے بھی یہ روایت ذکر کی ہے مگر یہ الفاظ زائد ہیں کہ ابوسفیان نے کہا''مجھے اسی وقت یقین آیا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔'' یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب ابوسفیان حضرت عباس کی معیت میں مشرف باسلام ہونے کے لیے بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے۔ یہ چند لمحات ابوسفیان پر اس وقت گزرے جب وہ اپنا پرانا دین چھوڑ کر اسلام میں داخل ہو رہے تھے، اس کو حسد کے لفظ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ابوسفیان جاہ و ریاست کی گود میں پلے تھے ایسے وقت میں ان کا کفر و ایمان کے مابین تردّد و تذبذب حبّ سیادت و قیادت کی دلیل ہے۔اس پر مزید یہ کہ ابھی تک ان کی ملاقات نبی کریم ﷺ سے نہیں ہوئی تھی اور وہ کلام الٰہی سے بھی ناآشنا تھے۔ بنا بریں راہ ایمان پر مخلصانہ گامزن ہونے کے لیے ابوسفیان ایسے معجزہ کے محتاج تھے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابوسفیان بارگاہ ایزدی میں تائب ہوئے اور دین اسلام آپ میں رچ بس گیا۔

سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جس کے کافر رشتہ دار مکہ میں نہ ہوں ۔ جو حالت کفر میں ہی قتل ہوئے' یا اپنی موت مر گئے ۔ تو کیا پھر [ان کا کفر] ان لوگوں کے اسلام لانے میں کسی رسوائی کا سبب ہوسکتا ہے؟

جو لوگ متاخر الاسلام ہیں جیسے حضرت عکرمہ بن ابوجہل ،صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ یہ بہترین مسلمانوں میں سے تھے ۔ [1] ان دونوں کے والد بدر کے موقع پر قتل ہوگئے تھے ۔ اور ایسے ہی حارث بن ہشام [2] کا بھائی بھی بدر کے موقع پر قتل ہوا ۔ ایسی باتیں سامنے رکھ کر طعن و تشنیع کرنا حقیقت میں تمام اہل ایمان پر طعن و تشنیع ہے ۔ [ان پر طعن و تشنیع کرنا کسی طرح بھی روا نہیں ہے]

کیا کسی کے لیے یہ جائز ہوسکتا ہے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر صرف اس وجہ سے طعن و تشنیع کرے کہ آپ کے چچا ابولہب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے دشمن تھے ۔ یا حضرت عباس رضی اللہ عنہ پر طعن کرے کہ ان کا بھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن تھا ۔ یا ابوطالب کے کفر کی وجہ سے حضرت علی یا حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو طعن دلائے ۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ یہ طعن صرف وہی لوگ کر رہے ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ؟

رافضی مصنف کے پیش کردہ اشعار خود ہی اپنے من گھڑت ہونے کی شہادت دیتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے صحابی کی شان سے صادر شدہ نہیں ۔ اس لیے کہ صحابہ کے ساتھ ان اشعار کی کوئی مناسبت ہی نہیں ۔

رافضی کا یہ کہنا کہ: فتح مکہ کا واقعہ ہجرت مدینہ طیبہ کے آٹھویں سال رمضان میں پیش آیا ۔

یہ درست ہے ۔

[حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام]:

[بارھواں اعتراض] : شیعہ کہتا ہے: ''اس وقت تک معاویہ اپنے شرک پر قائم تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھاگ رہے تھے ۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو مباح الدم قرار دیا تھا ۔ آپ بھاگ کر مکہ چلے گئے ۔ جب کوئی جائے پناہ نہ ملی تو مجبوراً بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف پانچ ماہ قبل اپنے اسلام کا اظہار کیا ۔''

---

[1] صفوان کا شمار ان دس آدمیوں میں ہوتا ہے جو دورِ جاہلیت میں بڑے معزز سمجھے جاتے تھے ۔ یہ فتح مکہ کے بعد اسلام لائے ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو امان دی تھی اور ان کے چچا زاد بھائی عمیر بن وہب جمحی رضی اللہ عنہ ان کو لے کر بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے ۔ (طبقات ابن سعد (۴/۱۴۳۔۱۴۷)

[2] حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ ابوجہل کے بھائی اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ابن العم تھے ۔ امام بخاری نے ان سے بڑی اہم روایات نقل کی ہیں ۔ یہ شرفاء مکہ میں شمار ہوتے تھے اور کفار قریش کیساتھ جنگ بدر میں شریک ہوئے تھے ۔ حسان بن ثابت نے جب بدر سے بھاگ جانے کی عار دلائی اور انھوں نے اشعار میں اسکا جو جواب دیا، کہا جاتا ہے کہ وہ اعتذار من الفرار میں عمدہ ترین اشعار ہیں ۔ (مستدرك حاكم ۳/ ۲۷۹ ، الاصابة ۱/ ۲۹۳)

صحيح بخاری ، كتاب الحج ـ باب الحلق والتقصير عند الاحلال (حديث:۱۷۳۰) ، صحيح مسلم ، كتاب الحج ـ باب جواز تقصير المعتمر (حديث:۱۲٤٦)

[جواب] : اس قول کا جھوٹ ہونا صاف طور پر ظاہر ہے۔ یہ بات متفق علیہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس سال مشرف بہ اسلام ہوئے جس سال مکہ فتح ہوا تھا۔شیعہ مصنف ابن المطہر کا یہ قول پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے تھے جن کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تالیف قلب فرمائی تھی۔ ظاہر ہے کہ مولفۃ القلوب کو آپ نے جنگ حنین [ہوازن] کے مال غنیمت میں سے مال عطا کیا تھا۔اور معاویہ بھی ان لوگوں میں سے تھے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تألیف قلب کیلئے مال عطاء فرمایا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قبائل کے سرداروں کی تالیف کے لیے انہیں نوازا کرتے تھے۔ اگر معاویہ یمن بھاگ گئے ہوتے، جیسا کہ شیعہ مصنف نے لکھا ہے، تو آپ مؤلفۃ القلوب میں سے نہیں ہو سکتے۔ اگر چہ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پانچ ماہ قبل ہی اسلام قبول کیا ہو۔تو پھر انہیں حنین کی غنیمت میں سے بھی کچھ حصہ نہ ملا ہوتا۔ اور اگر آپ ایسے ہی ایمان لائے ہوتے' تو پھر تألیف قلب کی ضرورت نہ ہوتی۔'' بعض حضرات کے نزدیک آپ اس سے پہلے اسلام لے آئے تھے۔

❀ صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:''میں نے مروہ پر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بال کاٹے۔''

بخاری اور مسلم میں اس کے الفاظ یوں ہیں:''کیا آپ نے نہیں جانتے'میں نے مروہ پر تیر کی نوک سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بال کاٹے۔'' آپ نے ابن عباس سے یہ ارشاد فرمایا۔تو انہوں نے جواب دیا: میرا خیال ہے کہ یہ بات تم پر ہی حجت ہے۔''[1]

یہ کہا گیا ہے کہ یہ حجۃ الوداع والے سال کا واقعہ ہے۔لیکن یہ ان متواتر اور مشہور احادیث کے خلاف ہے ان سب احادیث میں اس بات پر اتفاق ہے کہ آپ حجۃ الوداع والے سال قربانی کے دن احرام سے حلال ہوئے تھے۔اور آپ نے صحابہ کرم کو حکم دیا تھا کہ جو کوئی قربانی کا جانور ساتھ نہیں لایا؛ وہ عمرہ سے فارغ ہو کر مکمل طور پر حلال ہو جائیں؛ اور حج تمتع کریں۔قربانی ساتھ لانے والے اپنے احرام میں باقی رہیں حتی کہ قربانی کر دی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی اور حضرت طلحہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا ایک گروہ اپنے ساتھ قربانیاں لے کر آئے تھے؛ تو وہ حلال نہیں ہوئے۔ حضرت فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ازواج مطہرات قربانی نہیں لائی تھیں؛ اس لیے وہ حلال ہوگئیں۔ اس سلسلہ کی احادی صحاح؛ سنن اور مسانید میں معروف ہیں۔

تو اس سے معلوم ہوا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بال کاٹنا حجۃ الوداع والے سال نہیں تھا؛ لیکن جن لوگوں کا خیال یہ ہو کہ قربانی لانے والے متمتع کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے بال کاٹ دے؛ جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ سے

[1] البخاري:۲/ ۱۷٤ ، كتاب الحج ، باب الحلقِ والتقصيرِ عند الِحلال مسلم:۲/ ۹۱۳ ، كتاب الحج ، باب التقصيرِ فِي العمرة سننِ أبِي داؤد:۲/ ۲۱۷ ؛ كتاب المناسكِ ، باب فِي القِران ، سننِ النسائِي: ٥/ ۱۹٦؛ كتاب المناسكِ ، باب أين يقصِر المعتمِر ؛ المسندِ ط . الحلبِي:٤/ ۹٦ .

بھی ایک روایت ہے؛ اور دوسری روایت یہ ہے کہ: جب انسان دس تاریخ سے پہلے مکہ پہنچ جائے تو وہ حلال ہو جاتا ہے؛ بھلے وہ قربانی اپنے ساتھ لایا ہو۔ جبکہ امام ابو حنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ کا مشہور مذہب اور دیگر علماء کا قول یہی ہے کہ جو کوئی قربانی ساتھ لایا ہو؛ وہ یوم نحر کو ہی حلال ہوگا۔[المغنی ۳/ ۳۵۱]

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بال کاٹنا حجۃ الوداع والے سال پہلے کا واقعہ ہے؛ یا تو عمرہ قضاء والے سال کا ہے؛ تو پھر اس صورت میں امیر معاویہ فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے؛ جیسا کہ بعض حضرات کا خیال ہے؛ مگر اس قول کی صحت معروف نہیں ہے۔ یا پھر عمرہ جعرانہ کا واقعہ ہے۔ جیسا کہ دیگر روایات میں بھی ہے کہ بال کاٹنے کا یہ واقعہ عمرہ جعرانہ کا ہے۔ یہ فتح مکہ اور غزوہ حنین اور محاصرہ ء طائف کے بعد کا واقعہ ہے۔ اس لیے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے واپس لوٹے تھے تو آپ نے جعرانہ کے مقام پر غزوہ حنین کا مال غنیمت تقسیم کیا تھا۔ اور پھر وہاں سے عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ تشریف لائے۔ اور معاویہ نے آپ کے بال کاٹے ؛ تو اس وقت امیر معاویہ مسلمان ہو چکے تھے۔ یعنی آپ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو آپ کے تجربہ اور امانت داری کی بنا پر کاتب وحی رکھ لیا۔ آپ کے اور آپ کے بھائی یزید بن ابوسفیان کے متعلق یہ معلوم نہیں کہ انہوں نے کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دی ہو جیسے دوسرے بعض مشرکین آپ کو تکلیف دیا کرتے تھے۔

آپ کا بھائی یزید آپ سے بھی افضل تھا۔ بعض لوگ اسے بھی وہ یزید خیال کرتے ہیں جو آپ کا بیٹا تھا اور آپ کے بعد مسند خلافت پر متمکن ہوا۔ اور اسی کے زمانہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید کئے گئے۔ پس وہ یزید بن معاویہ کو بھی صحابہ میں سے شمار کرتے ہیں۔ یہ ایک کھلی ہوئی جہالت ہے۔ اس لیے کہ یزید بن معاویہ کی ولادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہوئی۔ جب کہ اس کا چچا یزید ایک نیک انسان تھا جس کا شمار نیک دل صحابہ میں ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسے شام کا امیر مقرر کیا تھا۔ اور وہ آپ کا ہم رکاب رہا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اس کا انتقال ہوگیا تو اس کے بھائی امیر معاویہ کو شام کا امیر مقرر کیا گیا۔ پھر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو آپ نے اس کی حدود امارت بڑھا دی۔ اور اسے یوں ہی امیر باقی رکھا۔ حتی کہ جب فتنہ برپا ہوا اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین قتل ہوئے ؛ اور اہل عراق نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی بیعت کرلی؛ اور چھ ماہ تک خلیفہ رہنے کے بعد خلافت کی زمام امیر معاویہ کے سپرد کردی؛ اور صحیح حدیث میں وارد یہ عظیم بشارت نبوی پوری ہوئی؛ جس میں آپ نے فرمایا تھا:

''میرا یہ بیٹا سردار ہے اور عنقریب اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں میں صلح کرائے گا۔'' [1]

اس کے بعد امیر معاویہ بیس سال تک خلیفہ رہے؛ اور سن ۶۰ ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

جس چیز سے رافضی کا جھوٹ کھل کر واضح ہوتا ہے وہ یہ کہ اہل مکہ میں سے کسی ایک نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے میں اتنی دیر نہیں کی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سن نو ہجری میں فتح مکہ کے سوا سال بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج

[1] صحیح بخاری، حوالہ سابق(ح:۳۶۲۹) ۔

بنا کر روانہ فرمایا۔ اور یہ اعلان کروایا کہ اس سال کے بعد کوئی بھی مشرک حج نہ کرے۔ اور کوئی برہنہ ہو کر بیت اللہ کا طواف نہ کرے۔ اس سال مشرکین کے ساتھ کئے گئے تمام وعدے واپس کر دیے گئے۔ اور انہیں چار ماہ کی مہلت دی گئی۔ یہ مدت سن دس ہجری میں پوری ہوگئی۔ یہ امان تمام مشرکین عرب کے لیے عام تھی۔ سن نو ہجری میں نبی کریم ﷺ نے اہل شام عیسائیوں سے جنگ لڑنے کے لیے غزوہ تبوک پر تشریف لے گئے۔ اس موقع پر اسلام پورے عرب میں غالب ہو چکا تھا۔

معاویہ رضی اللہ عنہ کے خواہ جتنے بھی گناہ ہوں' وہ ان کے اسلام لانے سے ختم ہو چکے۔ تو پھر کیسے یہ کہا جا سکتا ہے کہ بغیر کسی معلوم شدہ گناہ کے آپ بھاگتے پھرتے ہوں' یا پھر آپ کا خون رائیگاں قرار دیا جائے؟ مغازی اور سیرت نگاروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ معاویہ ان لوگوں میں سے نہ تھے جن کا خون فتح مکہ والے سال رائیگاں قرار دیا گیا تھا۔ عروہ بن زبیر کی مغازی؛ [ان کے علاوہ مغازی] الزہری؛ موسیٰ بن عقبہ' ابن اسحق' واقدی؛ سعید بن یحیی اموی؛ محمد بن عائذ؛ ابو اسحق الفزاری اور دوسرے لوگ ہیں۔ اور ان کے علاوہ کتب تفسیر و حدیث تمام اس رافضی کے دعوی کے خلاف بول رہی ہیں' ان تمام مصنفین نے ان لوگوں کے نام ذکر کیے ہیں جن کا خون نبی کریم ﷺ نے رائیگاں قرار دیا تھا؛ جیسا کہ: قیس بن صبابہ؛ عبداللہ بن اخطل' ان دونوں کو قتل کر دیا گیا؛ ایسے ہی عبداللہ بن ابی سرح کا خون بھی رائیگان قرار دیا تھا؛ مگر اس نے بعد میں [اسلام قبول کرتے ہوئے] بیعت کر لی۔ جن لوگوں کا خون رائیگاں قرار دیا تھا وہ گنتی کے چند آدمی تھے؛ جن کی تعداد دس کے قریب ہے۔

ابوسفیان نبی کریم ﷺ کے سب سے بڑے دشمنوں میں سے تھا۔ یہی وہ شخص ہے جس نے غزوہ بدر کے موقع پر مکہ مکرمہ آدمی بھیج کر مشرکین سے مدد طلب کی تھی۔ غزوہ احد کے موقع پر اس نے اپنے پاس موجود اموال جمع کیے اور لوگوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اس مال کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ میں خرچ کریں۔ اور غزوہ احد کے موقع پر مشرکین کے لشکر کا سب سے بڑا قائد یہی تھا۔ غزوہ خندق کے موقع پر بھی کافروں کے لشکر کی قیادت اسی کے ہاتھ میں تھی۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے انہیں بغیر کسی عہد و عقد کے اپنے ساتھ لیا اور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

---

❶ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں نے مروہ پہاڑی پر تیر کے پھالے سے نبی کریم ﷺ کے بال کاٹے۔'' صحیح بخاری، کتاب الحج - باب الحلق والتقصیر عند الاحلال (حدیث:۱۷۳۰)، صحیح مسلم، کتاب الحج - باب جواز تقصیر المعتمر (حدیث:۱۲٤٦)۔ یہ واقعہ یا تو عمرہ قضا سن سات ہجری کا ہو سکتا ہے' یا فتح مکہ اور غزوہ حنین کے بعد عمرہ جعرانہ کا۔ اس لیے کہ سن دس ہجری میں آپ نے عمرہ کر کے بال نہیں کٹوائے تھے۔ آپ حج قران کر رہے تھے' اور قربانی تک احرام میں ہی رہے تھے۔ حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں معاویہ بن ابی سفیان کے حالات زندگی میں تصریحاً لکھا ہے کہ حضرت معاویہ صلح حدیبیہ اور عمرۃ القضا کے درمیان اسلام قبول کر چکے تھے۔ البتہ قریش کے ڈر سے اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔'' واقعہ یہ ہے کہ دین اسلام قریش کے ذہین نوجوانوں کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا، صرف اتنا فرق ہے کہ جو لوگ ہجرت مکہ کی قدرت سے بہرہ ور تھے وہ مدینہ کا رخ کرتے اور مسلمانوں میں جا ملتے تھے، حضرت خالد بن ولید و عمرو بن العاص اور کعبہ کے کنجی بردار عثمان بن طلحہ عبدری رضی اللہ عنہم اجمعین نے یونہی کیا تھا۔ جو نوجوان مکہ سے ہجرت نہیں کر سکتے تھے وہ مکہ میں اقامت گزیں رہ کر دعوت اسلام کی کامیابی کے منتظر رہتے تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم نوا انہی لوگوں میں شامل تھے۔

اس موقع پر نبی کریم ﷺ کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور یہ عرض گزاری کر رہے تھے کہ: اے اللہ کے نبی! یہ اللہ کا دشمن ابوسفیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بغیر عہد و پیمان کے اسے آپ کے قبضہ میں دیدیا ہے؛ آپ اس کی گردن مار دیجیے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی باتوں کا جواب دیا۔ پس ابوسفیان نے اسلام قبول کرلیا اور نبی کریم ﷺ نے آپ کو امن دیدیا' اور آپ ﷺ نے یہ اعلان فرمایا:

''جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوا سے امن دیا جائے اور جو مسجد میں داخل ہو وہ بھی امن کا مستحق ہے اور جو ہتھیار ڈال دے وہ بھی مامون ہے۔'' [یہ حدیث ابھی گزر چکی ہے]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا خون کیسے رائیگاں قرار دیا جاسکتا تھا' جب کہ آپ اس وقت کم عمر تھے' اور آپ کا کوئی خاص گناہ بھی نہیں تھا۔ اور نہ ہی آپ کے متعلق یہ معلوم ہوسکا ہے کہ آپ نبی کریم ﷺ کے خلاف لوگوں کو ابھارا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے بڑے بڑے گروہوں کے سرداروں کو امان دیدی تھی؛ تو پھر کیا سیرت کے باب میں لوگوں میں سب سے جاہل انسان کے علاوہ کوئی شخص ایسا گمان بھی رکھ سکتا ہے؟

جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے' اس پر اہل علم کا اتفاق ہے' اور اس مسئلہ پر لکھنے والے مؤرخین نے اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ ہم نے اس موضوع پر اپنی کتاب ''الصارم المسلول علی شاتم الرسول'' میں اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ اور ان لوگوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے جن کا خون فتح مکہ کے موقع پر رائیگاں قرار دیا گیا تھا۔ ہم نے وہاں پر ایک ایک کر کے سب کے نام لیے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان لوگوں میں سے عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح بھی تھے' مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ انہیں لیکر آنحضرت ﷺ کے پاس حاضر خدمت ہوئے۔ انہوں نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا' اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے خون کو محفوظ قرار دیدیا۔

[تیرھواں اعتراض] : شیعہ مصنف کہتا ہے:''اہل سنت صرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو کاتب وحی سمجھتے ہیں۔''

[جواب] : یہ اہل سنت والجماعت پر محض ایک الزام ہے۔ اہل سنت میں ایک انسان بھی ایسا نہیں ہے جو یہ کہتا ہو۔ بلکہ ہم کہتے ہیں:'' آپ جملہ کاتبین وحی میں سے ایک تھے۔ جب کہ عبداللہ بن سعد بن ابی رضی اللہ عنہ سرح مرتد ہو گئے تھے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ پر الزام تراشی کی؛ مگر پھر دوبارہ انہوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔''

[چودھواں اعتراض]: شیعہ مصنف نے کہا ہے کہ یہ آیت: ﴿ وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا ﴾[النحل ۱۰۶] ''لیکن جو کوئی کفر کے لیے سینہ کھول دے......''

یہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے بارے میں نازل ہوئی۔

[جواب] : یہ دعوی بالکل باطل ہے۔ یہ آیت مکہ مکرمہ میں اس وقت نازل ہوئی جب حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو کفریہ کلمات کہنے پر مجبور کیا گیا۔'' جب کہ ابن سرح کے ارتداد کا واقعہ ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں پیش آیا۔ اگر فرض محال یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ یہ آیت ابن سرح کے بارے میں ہی نازل ہوئی تھی؛ تو پھر بھی کوئی فرق نہیں

پڑتا، کیونکہ انہوں نے پھر اسلام قبول کرلیا تھا' اور رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَ شَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ○ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ○ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ [آل عمران ۸۶۔۸۹]

''اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کیسے ہدایت دے گا جنھوں نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا اور (اس کے بعد کہ) انھوں نے شہادت دی کہ یقیناً یہ رسول سچا ہے اور ان کے پاس واضح دلیلیں آ چکیں اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ یہ لوگ! ان کی جزاء یہ ہے کہ بے شک ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ ہمیشہ اس میں رہنے والے ہیں، نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ وہ مہلت دیے جائیں گے۔ مگر جن لوگوں نے اس کے بعد توبہ کی اور اصلاح کر لی تو یقیناً اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔''

[پندرھواں اعتراض]: شیعہ مصنف کی ذکر کردہ حدیث یعنی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ والی روایت کہ: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آپ سے سنا کہ فرما رہے تھے: ابھی ایک شخص نمودار ہوگا اس کی موت تارک سنت ہونے کی حالت میں ہوگی۔'' اتنے میں معاویہ رضی اللہ عنہ نمودار ہوئے۔ نبی ﷺ ایک مرتبہ خطبہ دینے کے لیے اٹھے؛ اسی دوران معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے یزید کا ہاتھ تھام کر باہر چل دیے تو آپ نے فرمایا: اللہ قیادت کرنے والے اور جس کی قیادت کی گئی ہے۔ دونوں پر لعنت کرے۔''یعنی جس دین امت اس گستاخ معاویہ کے ساتھ ہوگی۔'' [انتہی کلام الرافضی]

جواب: اس سلسلہ میں کئی جوابات ہیں:

[پہلا جواب]: اس حدیث کی صحت ثابت کیجیے۔ اس لیے کہ اثبات صحت سے پہلے کوئی حدیث قابل احتجاج نہیں ہوسکتی۔ یہ بات ہم بطور مناظرہ کہتے ہیں' ورنہ ہم قطعی طور پر جانتے ہیں کہ یہ اپنی طرف سے گھڑی ہوئی روایت ہے۔

دوسرا جواب: یہ روایت باتفاق محدثین موضوع ہے اور کسی قابل اعتماد کتاب میں اس کا ذکر نہیں۔ علاوہ ازیں یہ حدیث بلا سند ہے اور اس سے احتجاج کرنے والے شیعہ مصنف نے بھی اس کی کوئی معروف سند بھی بیان نہیں کی۔ شیعہ مصنف کی جہالت کا بین ثبوت ہے کہ اس حدیث کا راوی عبداللہ بن عمر کو ٹھہرایا ہے۔ بھلا حضرت عبداللہ ایسی حدیث کے راوی کیوں کر ہو سکتے ہیں جس میں صحابہ کے معائب و مثالب بیان کیے گئے ہیں [آپ صحابہ کرام کے متعلق لب کشائی کرنے والوں سے سب سے دور رہتے تھے] جب کہ آپ نے بہت سی وہ احادیث نقل کی ہیں جن میں صحابہ کے مناقب بیان کیے گئے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مدح و ستائش میں معروف ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

'' میں نے رسول کریم ﷺ کے بعد معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کوئی رئیس ایسا بردبار نہیں دیکھا۔ ان سے دریافت کیا گیا، کیا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی آپ سے بڑھ کر نہ تھے۔؟ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے جواباً فرمایا: ''ابوبکر

وعمر رضی اللہ عنہما ان سے افضل تھے۔'' ❶ [پھر دوبارہ آپ نے فرمایا:

''میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کوئی رئیس ایسا بردبار نہیں دیکھا۔''

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بردبار سردار معاویہ۔'' حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بڑے کریم وحلیم تھے۔''

❁ باقی رہا شیعہ کا یہ کہنا کہ: [[نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ خطبہ دینے کے لیے اٹھے؛ اسی دوران معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے یزید کا ہاتھ تھام کر چلدیے]]۔

❁ تواس کا جواب یہ ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات مختلف قسم کے ہوا کرتے تھے۔ آپ جمعہ، عیدین اور حج کے موقع پر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے والد ابوسفیان رضی اللہ عنہ دیگر مسلمانوں کی طرح بالالتزام آپ کے خطبات میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا معاویہ رضی اللہ عنہ ہر خطبہ سے اٹھ جایا کرتے تھے اور سنتے نہ تھے؟ ظاہر ہے کہ یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور سب صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے موجب اہانت ہے کہ ہمیشہ دو شخص آپ کے خطبہ کے دوران اٹھ کر چلے جایا کریں [اور باقی صحابہ خاموش یہ تماشا دیکھتے رہیں]۔ ان دونوں کو جاتے رہنے دیں یہ نہ ہی کسی خطبہ میں حاضر ہوں اور نہ ہی جمعہ میں۔ نیز یہ کہ اگر وہ دونوں ہر خطبہ میں حاضر ہوا کرتے تھے تو اس سے اٹھ کر چلے جانے کا کیا معنی؟

اس پر مزید یہ کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تکلیف دینے والوں کے مقابلہ میں بڑے حلیم و بردبار اور صابر تھے، جیسا کہ آپ کی سیرت اور حالات زندگی میں یہ بات معروف ہے۔ مقام حیرت ہے کہ وہ اس صبر وحلم کے باوصف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نفرت کرتے تھے؟ حالانکہ آپ دین و دنیا میں سب لوگوں کے سردار تھے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ہر بات میں آپ کے محتاج بھی تھے۔ اور یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ آپ اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو سننا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ حالانکہ جب تاج وتخت سے بہرہ ور ہوئے تو لوگ آپ کے روبروان کو برا بھلا کہتے اور وہ خاموشی سے سنا کرتے تھے اور پھر حیرت بالائے حیرت اس بات پر ہے کہ ایسے شخص کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کاتب وحی بھی مقرر فرماتے ہیں جو آپ کی بات ہی نہ سنتا ہو؟۔

[سولھواں اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ'' معاویہ نے اپنے بیٹے زید یا یزید کا ہاتھ پکڑا اور باہر چل دیا۔''

❶ اسد الغابة(٥/ ٢٢١-٢٢٢)، البداية والنهاية(٨/ ١٣٥).

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ہشیم نے عوام سے اس نے جبلہ بن سحیم سے اور وہ ابن عمر سے روایت کرتے ہیں؛ فرمایا: ''میں نے حضرت امیر معاویہ سے بڑا سردار کسی کو نہیں دیکھا۔ کہتے ہیں: میں نے کہا: حضرت عمر بھی ایسے نہیں تھے؟ تو آپ نے فرمایا: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے بہت بہتر تھے۔ اور وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بڑے سردار تھے۔

ابوسفیان الحمیری نے یہی قول حضرت عوام بن حوشب سے اسی سند سے روایت کیا ہے۔ ان سے کہا گیا: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی آپ سے بڑے سردار نہیں تھے؟ تو فرمایا: حضرت ابوبکر وعمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین ان سے بہتر تھے۔ جب کہ آپ بڑے سیاسی سردار تھے اور یہی بات ابن عمر سے بھی منقول ہے۔ مزید دیکھیں: العواصم من القواصم ص ٢٠٤۔

[جواب] :یہ صریح کذب ہے کیوں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا کوئی بیٹا زید نامی نہیں تھا۔ یزید جو آپ کے بعد تاج وتخت کا وارث بنا اور جس کے عہد میں سانحہ کربلا پیش آیا اس وقت پیدا نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس کی ولادت عثمانی خلافت میں ہوئی؛ اس پر اہل علم کا اتفاق ہے ۔عہد رسالت میں معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔حافظ ابو الفضل ابن ناصر لکھتے ہیں:

’’ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے عہد رسالت میں رشتہ طلب کیا تھا؛ مگر مفلس ہونے کی بنا پر ان کی یہ آرزو بر نہ آئی۔آپ کی شادی خلافت فاروقی میں ہوئی اور یزید حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ۲۷ ہجری میں پیدا ہوا۔‘‘

[تیسرا جواب] :مذکورہ حدیث کا تیسرا جواب یہ ہے کہ معارضہ کے طور پر ہم اس جیسی موضوع روایات بیان کر سکتے ہیں جن سے حضرت معاویہ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔مشہور محدث ابو الفرج ابن الجوزی رحمہ اللہ اپنی کتاب ’’ الموضوعات‘‘ میں لکھتے ہیں:

’’ بعض مدعیان سنت نے شیعہ کو چڑانے کے لیے حضرت معاویہ کی فضیلت ثابت کرنے کے لیے حدیثیں وضع کی ہیں۔ دوسری طرف روافض نے ان کی مذمت میں حدیثیں وضع کیں۔فریقین نے سخت غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ [1]

[سترھواں اعتراض]:شیعہ کا قول کہ:’’ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بہت سخت جنگ کی ۔‘‘

[جواب]:اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں لشکروں کے مابین صفین کے موقع پر لڑائی ہوئی۔ جناب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہرگز ان لوگوں میں سے نہ تھے جو جنگ شروع کرنا چاہتے ہوں۔ بلکہ آپ لوگوں میں سب سے بڑھ کر اس بات کے حریص تھے کہ جنگ تک نوبت نہ آئے۔ جب کہ دوسرے لوگ جنگ و قتال کے لیے بڑے حریص تھے۔

[1] حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیرت وسوانح میں متوسط راستہ وہ ہے جو قبل ازیں آپ کے حالات میں روشنی ڈالتے ہوئے ہم نے اختیار کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قباء کے مقام پر جو خواب دیکھا اور جس کا ذکر قرآن کریم کے بعد صحیح ترین کتاب یعنی بخاری و مسلم میں موجود ہے وہ بھی اسی ضمن میں شامل ہے۔اس خواب کی تعبیر عملی طور پر اس وقت ظہور پذیر ہوئی جب حضرت انس رضی اللہ عنہ کی خالہ فتح قبرص کے موقع پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بحری بیڑے میں شامل ہوکر جہاد کے لیے گئیں اور ان کی موت اسی جگہ واقع ہوئی۔(بخاری ، کتاب الاستئذان۔ باب من زار قوما فقال عندھم(ح:۶۲۸۲) مسلم ، کتاب الامارۃ ، باب فضل الغزو فی البحر(ح:۱۹۱۲) ۔ یہ امیر معاویہ جیسے ولی، صالح اور مجاہد فی سبیل اللہ کا اوّلین وصف ہے۔آخری تعریف وہ ہے جو امام احمد نے اپنی تصنیف ’’ کتاب الزھد‘‘ میں اس امام مظلوم (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ) کے زہد وتقویٰ کے واقعات بیان کرتے ہوئے فرمائی۔ہم نے اس ضمن میں مشہور ومعتبر مصادر وماخذ کے حوالہ سے جو کچھ لکھا ہے اس سے صاف عیاں ہے کہ خلفاء راشدین کے بعد مسلم سلاطین وخلفاء میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا کوئی ہم سر پیدا نہیں ہوا۔ بنا بریں ان کی شان میں ایسی موضوعات گھڑنے کی قطعاً ضرورت نہیں جن کی جانب محدث شہیر ابن الجوزی نے اشارہ کیا ہے۔اسی طرح متعصب روافض کی من گھڑت روایات سے بھی ان کی شان میں کچھ کمی واقع نہیں ہوتی۔ مثلاً زیر تبصرہ حدیث جس کو روافض نے حضرت عبداللہ بن عمر کی طرف منسوب کیا ہے اور جس کو دیکھ کر باانصاف شیعہ بھی مارے شرم کے پانی پانی ہوئے جاتے ہیں۔

جنگ صفین کے بارے میں علمائے کرام کے کئی اقوال ہیں: ان میں سے بعض یہ کہتے ہیں کہ: ''ان دونوں فریقوں میں سے ہر فریق مجتہد تھا' اور ان کا اجتہاد اپنی جگہ پر درست تھا۔'' ان کا کہنا ہے کہ دونوں حضرات مجتہد تھے۔ یہ اکثر اشاعرہ' کرامیہ اور دیگر فقہاء کا قول ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے اصحاب میں سے ایک گروہ اور امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔

کرامیہ کہتے ہیں: ان میں ہر ایک حق پر تھا؛ اور بوقت ضرورت دو امیر مقرر کرنے جائز ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ کا یہ بھی کہنا ہے کہ: ان دو میں سے ایک گروہ حق پر تھا۔ مگر وہ اس گروہ کو متعین نہیں کرتے۔

ایک گروہ کا کہنا ہے کہ: ''صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مجتہد تھے' مگر غلطی پر تھے۔ مذاہب اربعہ کے فقہاء اور اہل کلام میں سے بعض گروہوں کا یہی مسلک ہے۔ یہ تینوں اقوال ابو عبداللہ بن حامد نے امام احمد کے ساتھیوں سے نقل کیے ہیں۔

ان میں سے بعض یہ بھی کہتے ہیں: ''حق تو یہ تھا کہ ان کے مابین جنگ نہ ہوتی۔ جنگ کا ترک کرنا دونوں گروہوں کے حق میں بہتر تھا۔ اس لیے کہ جنگ میں کوئی بھی اصابت نہیں ہوتی۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہ نسبت حق کے زیادہ قریب تھے۔ یہ قتال قتالِ فتنہ تھا' نہ ہی واجب تھا اور نہ ہی مستحب۔ اس قتال کا ترک کرنا ہی دونوں گروہوں کے حق میں بہتر تھا۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حق کے زیادہ قریب تر تھے۔ یہ قول امام احمد اور اکثر اہل حدیث اور اکثر ائمہ فقہاء کا ہے۔ اور یہی قول بہت سارے اکابر صحابہ کرام اور تابعین کا ہے۔ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بھی یہی کہتے ہیں۔ آپ لوگوں کو اس جنگ میں اسلحہ بیچنے سے منع کیا کرتے تھے۔ آپ کہتے تھے کہ: یہ فتنہ میں اسلحہ کی فروخت ہے۔ یہی قول حضرت اسامہ بن زید' محمد بن مسلمہ' ابن عمر' سعد بن ابی وقاص؛ اور باقی زندہ رہنے والے اکثر سابقین اولین اور مہاجرین وانصار رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔ اس لیے اہل سنت والجماعت کا مذہب اور عقیدہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بپا ہونے والی لڑائیوں کے بیان کرنے سے اپنی زبانوں کو روک کر رکھا جائے۔ اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل ثابت شدہ ہیں اور ان سے دوستی اور محبت رکھنا واجب ہے۔ ان کے مابین جو کچھ ہوا اس کا ایسا عذر بھی ہوسکتا ہے جو انسان پر مخفی رہا ہو۔ اور ان میں ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنی اس لغزش سے توبہ کرلی تھی۔ اور ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جن کے گناہ معاف کردیے گئے ہیں۔ پس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین ہونے والے جھگڑوں میں پڑنے سے انسان کے دل میں بغض و مذمت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس معاملہ میں وہ صرف غلطی پر ہی نہیں بلکہ اس معاملہ میں عاصی و گنہگار بھی ہوتا ہے۔ اس طرح یہ اپنے آپ کو بھی اور اپنے ان ساتھیوں کو بھی نقصان پہنچاتا ہے جن کے ساتھ ایسے معاملات میں گفتگو کرتا ہے۔ جیسا کہ ان اکثر لوگوں کیساتھ یہ معاملہ پیش آچکا ہے جو اس موضوع کو اپنے لیے مشق سخن بنایا کرتے تھے۔ اس لیے کہ ان لوگوں نے ایسی باتیں کی تھیں جو اللہ اور اس کے رسول کے ہاں ناپسندیدہ تھیں۔ اس کی وجہ یا تو ان لوگوں کی مذمت کرنا ہے جو مذمت کے مستحق نہیں ہیں۔ یا پھر ایسے امور کی مدح کرنے کی وجہ سے جو مدح کے قابل نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ افاضل سلف صالحین اس سلسلہ میں اپنی زبانوں کو بہت زیادہ روک کر رکھتے تھے۔ جبکہ دوسرے لوگوں میں سے کچھ ایسے تھے جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو فاسق گردانتے تھے؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نہیں۔ جیسا کہ بعض معتزلہ کا عقیدہ ہے۔ اور ان میں سے کچھ آپ کو کافر کہتے تھے؛ جیسا کہ روافض کا عقیدہ ہے۔ اور کچھ لوگوں ان دونوں حضرات علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کو کافر کہتے تھے؛ جیسا کہ خوارج کا عقیدہ ہے اور کچھ لوگ کہتے تھے ان دو میں سے کوئی ایک فاسق ہے؛ لیکن اس کو متعین نہیں کرتے۔ جیسا کہ کچھ معتزلہ کا عقیدہ ہے۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حق پر تھے؛ اور حضرت امیر علی رضی اللہ عنہ ظالم تھے؛ یہ مروانیہ کا عقیدہ ہے۔

کتاب وسنت کے دلائل سے واضح ہوتا ہے یہ دونوں گروہ مسلمان تھے۔ اور جنگ کا نہ ہونا ہی ہر حال میں بہتر تھا۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَاِنۡ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اقۡتَتَلُوۡا فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا ‌ۚ فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰٮهُمَا عَلَى الۡاُخۡرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىۡ تَبۡغِىۡ حَتّٰى تَفِىۡٓءَ اِلٰٓى اَمۡرِ اللّٰهِ‌ ۚ فَاِنۡ فَآءَتۡ فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا بِالۡعَدۡلِ وَاَقۡسِطُوۡا‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ ○﴾ (الحجرات: ۹)

''اگر مومنوں کی دو جماعتیں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرادو۔ اگر ایک فریق دوسرے پر ظلم وتعدی کا مرتکب ہوتو اس سے لڑو یہاں تک کہ وہ حکم الٰہی کی جانب واپس آجائے۔ اندریں صورت بہ تقاضائے عدل ان میں صلح کرادو کیوں کہ اللہ تعالیٰ باانصاف لوگوں کو پسند کرتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے ان دونوں گروہوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جنگ اور بغاوت کے باوجود مسلمان اور بھائی کہا ہے۔

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جنگ آزمائی ایسے امور کی بنا پر تھی جن کی وجہ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خارج از اسلام نہیں ہو سکتے۔ یہ دوسری بات ہے کہ] بخاری ومسلم کی روایت کی بنا پر حضرت علی رضی اللہ عنہ اقرب الی الحق تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

''جب مسلمانوں میں فرقہ بندی کا ظہور ہوگا تو ایک فریق خروج کرے گا اور دوسرا فریق اس سے جنگ آزما ہوگا۔ یہ جماعت اقرب الی الحق ہوگی۔''❶

خروج کرنے والے وہی لوگ تھے جو جنگ نہروان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کیخلاف صف آرا ہوئے۔ اس حدیث سے عیاں ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جماعت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے گروہ کی نسبت اقرب الی الحق تھی۔

صحیح بخاری میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا: ''میرا یہ بیٹا سردار ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں کے مابین مصالحت کرائے گا۔''❷

---

❶ صحيح مسلم- كتاب الزكاة- باب ذكر الخوارج و صفاتهم (حديث: ١٥٣/ ١٠٦٥)

❷ صحيح بخاری، کتاب الصلح، باب قول النبی ﷺ للحسن بن علی رضی اللہ عنہما (حديث:٢٧٠٤)

مذکورہ بالا حدیث میں نبی کریم ﷺ نے مصالحت کرانے کی بنا پر حضرت حسن کی مدح فرمائی اور دونوں جماعتوں کو مومن قرار دیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قابل ستائش فعل صلح کرانا ہے نہ کہ جنگ آزما ہونا۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''عنقریب ایک ایسا فتنہ ہوگا جس میں بیٹھنے والا کھڑا ہونے والے سے بہتر ہوگا، کھڑا ہونے والا چلنے والے سے بہتر ہوگا اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہوگا۔ اور جو آدمی گردن اٹھا کر انہیں دیکھے گا تو وہ اسے ہلاک کردیں گے اور جسے ان میں کوئی پناہ کی جگہ مل جائے تو چاہیے کہ وہ پناہ لے لے۔''❶

آپ نے مزید فرمایا: ''عنقریب مومن کا سب سے بہتر مال بکریاں ہوگا، جن کو لے کر وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر اور بارش والی جگہوں پر چلا جائے گا اور اس طرح اپنے دین کو فتنوں کی زد سے بچالے گا۔''❷

اور ایک صحیح روایت میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں؛ فرمایا:

''میں دیکھ رہا ہوں کہ فتنے تمہارے گھروں میں ایسے واقع ہورہے ہیں جیسے بارش کے قطرے۔''❸

جن صحابہ نے فتنہ سے احتراز و اجتناب کی حدیث روایت کی ہے ان میں سعد بن ابی وقاص ❹ محمد بن مسلمہ ❺ اور اسامہ رضی اللہ عنہم اجمعین شامل ہیں؛ انھوں نے جنگ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ و معاویہ رضی اللہ عنہ میں سے کسی کا بھی ساتھ نہیں دیا تھا۔

''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''جو شخص بھی فتنہ کی لپیٹ میں آجائے مجھے اس کے جادہ مستقیم سے بھٹک جانے کا خطرہ دامن گیر رہتا ہے، مگر محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ میں نے سرور کائنات ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ ''فتنہ و فساد سے محمد بن مسلمہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔''❻

حضرت ثعلبہ بن ضبیعہ رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں کہ: ''میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے فرمایا: ''مجھے وہ شخص معلوم ہے جسے فتنہ پردازی سے کوئی نقصان اور ضرر لاحق نہیں ہوتا، چنانچہ ہم باہر نکلے تو ایک خیمہ نصب کیا ہوا دیکھا جس میں محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ تشریف فرما تھے۔ ہم نے اس ضمن میں ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا میں نہیں چاہتا کہ بلاد و امصار جس فتنہ سے دوچار ہیں میں بھی اس کی لپیٹ میں آجاؤں یہاں تک کہ فتنہ کی آگ فرو ہوجائے۔''❼

❶ صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب تکون فتنة القاعد فیها خیر من القائم، (حدیث: ۷۰۸۱)، صحیح مسلم۔ کتاب الفتن۔ باب نزول الفتن کمواقع القطر (حدیث: ۲۸۸۶)

❷ صحیح بخاری ۔ کتاب الایمان۔ باب من الدین الفرار من الفتن(حدیث:۱۹)

❸ البخاری ۳/ ۲۱ ؛ کتاب فضائل المدینة ؛ باب آطام المدینة ؛ مسلم ٤/ ۲۲۱۱ ؛ کتاب الفتن و أشراط الساعة باب نزول الفتن کمواقع القطر۔

❹ صحیح مسلم۔ کتاب الزهد۔ باب(۱)، (حدیث:۲۹٦٥)

❺ سنن ابن ماجة۔ کتاب الفتن، باب التثبت فی الفتنة، (حدیث:۳۹٦۲)

❻ الاصابة(۳/ ۳۸٤) سنن ابی داؤد کتاب السنة باب ما یدل علی ترك الکلام فی الفتنة(ح:٤٦٦۳)

❼ مستدرك حاکم(۳/ ٤۳۳)، طبقات ابن سعد(۳/ ٤٤٤)

تأویل کی بنا پر امت کے خون ؛ اَموال اور اعراض میں بعض امور کا وقوع :

یہ جان لینا ضروری ہے کہ بلا شک وشبہ امت میں بعض امور خون ؛عزت وآبرواور اموال میں تأویل کی بنا پر واقع ہوتے ہیں۔ جیسے جنگ ؛لعن وطعن اور تکفیر۔ صحیحین میں ثابت ہے کہ حضرت اسامہ بن زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں قبیلہ حرقات کی طرف بھیجا جو قبیلہ جہینہ میں سے ہے۔ ہم صبح صبح وہاں پہنچ گئے اور ان کو شکست دے دی۔ میں نے اور ایک انصاری نے مل کر اس قبیلہ کے آدمی کو گھیر لیا جب وہ ہمارے حملہ کی زد میں آ گیا تو اس نے کہا لا اِلہ اِلا اللہ۔ انصاری تو یہ سن کر علیحدہ ہوگیا؛ لیکن میں نے اسے نیزہ مار کر قتل کر دیا۔ جب ہم نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک اس کی خبر پہنچ چکی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا:

''اے اسامہ! کیا لا اِلہ اِلا اللہ کہنے کے بعد بھی تم نے اسے قتل کر ڈالا؟ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اس نے اپنی جان بچانے کے لئے ایسا کہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار یہی فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ مجھے بار بار آرزو ہونے لگی کہ کاش میں آج سے پہلے مسلمان نہ ہوا ہوتا۔'' [سبق تخریجہ]

صحیحین میں حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ فرماتے ہیں :

''میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ: ''یا رسول اللہ! مجھے بتایئے کہ اگر میں کسی کافر سے بھڑ جاؤں اور باہم خوب مقابلہ ہو اور وہ میرا ایک ہاتھ تلوار سے کاٹ دے اور پھر درخت کی پناہ لے اور کہے میں اللہ پر ایمان لایا ہوں اور اسلام کو قبول کرتا ہوں؛ تو اب اس اقرار کے بعد میں اس کو مار دوں یا نہیں؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اسے مت مار۔''

حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اس نے میرا ہاتھ کاٹ دیا ہے اور اس کے بعد کلمہ پڑھا ہے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: '' کچھ بھی ہوا سے مت قتل کرو؛ ورنہ اس کو وہ درجہ حاصل ہوگا جو تم کو اس کے قتل کرنے سے پہلے حاصل تھا اور پھر تمہارا وہی حال ہوجائے گا جو کلمہ اسلام کے پڑھنے سے پہلے اس کا تھا۔'' [1]

یہ بات بھی یقیناً ثابت شدہ ہے کہ ان حضرات کے ہاتھوں سے کچھ ایسے مسلمان بھی قتل ہو گئے تھے جن کا قتل کرنا حلال نہیں تھا۔ مگر اس کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قتل نہیں کیا۔ اور نہ ہی مقتول کو ضمانت میں قصاص یا دیت ملی ؛ نہ ہی اس قتل کا کفارہ دیا گیا۔ اس لیے کہ قاتل متأول تھا۔ یہ اکثر علماء کا قول ہے جیسے امام شافعی ؛ امام اُحمد رحمہ اللہ اور دیگر حضرات اور کچھ حضرات یہ بھی کہتے ہیں : بلکہ یہ لوگ مسلمان تھے؛ اور انہوں نے ہجرت نہیں کی تھی۔ تو ان کے حق میں

[1] صحیح مسلم:جلد:۱ : ح۲۷۸؛کتاب الإیمان ؛ باب تحریم قتل الکافر ؛ بعد أن قال : لا إله إلا الله ؛ البخاري ۵/ ۸۵ ؛ کتاب المغازي ؛ باب نمبر ۱۲ ؛سنن ابي داؤد ۳/ ۶۱ ؛ کتاب الجهاد ؛ باب علی ما یقاتل المشرکون . المسند ۶/ ۵ .

گناہ کے ساتھ عصمت تو ثابت تھی؛ مگر کوئی ضمانت حاصل نہیں تھی۔ ان کی حالت اہل حرب کی خواتین اور بچوں کے جیسی تھی۔ جیسا کہ امام ابوحنیفہ اور بعض مالکیہ رحمہم اللہ کا قول ہے۔ پھر جمہور علماء جیسے امام مالک؛ امام ابوحنیفہ اور أحمد رحمہم اللہ کا ظاہری مذہب اور امام شافعی رحمہ اللہ کا ایک قول یہ ہے: ''بیشک اہل عدل اور باغی جب آپس میں تأویل کی بنا پر برسر پیکار جنگ ہوں؛ تو حالت جنگ میں ان میں سے ایک گروہ کی طرف سے دوسرے گروہ کا جو نقصان ہوجائے؛ خواہ وہ جانی نقصان ہو یا مالی؛ اس کی کوئی ضمانت نہیں ہوگی۔ کوئی ایک گروہ کسی دوسرے گروہ کا نقصان پورا نہیں کرے گا۔

حضرت امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جب جنگ کا فتنہ واقع ہوا تو اس وقت اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وافر مقدار میں موجود تھے؛ اس بات پر ان کا اتفاق ہوگیا کہ ہر وہ خون اور مال جو تأویل قرآن کی وجہ سے ہوا؛ وہ رائیگاں ہے۔'' اور اسے وہ جاہلیت کا سا معاملہ قرار دیتے تھے۔ یعنی جب قاتل اس فعل کو حرام خیال ہی نہیں کرتا تھا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ: یہ کام نفس امر میں حرام تھا؛ تو یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ یہ ثابت ہے اور مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ جب حربی کافر جب کسی مسلمان کو قتل کردے؛ یا اس کے مال کا نقصان کردے؛ اور پھر وہ اسلام قبول کرلے؛ تو نہ ہی اس پر ضمان ہوگی نہ ہی قصاص اور نہ ہی دیت۔ اور نہ ہی کفارہ۔ حالانکہ اس مسلمان کو قتل بڑے ہی کبیرہ گناہوں میں سے ایک تھا۔ مگر چونکہ وہ تأویل کا شکار تھا؛ بھلے وہ فاسد تاویل تھی۔

صحیحین میں حدیث افک میں ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''ایک ایسے شخص کے بارے میں کون میری مدد کرتا ہے جس کی اذیت رسانی اب میرے گھر پہنچ گئی ہے۔ اللہ کی قسم کہ میں اپنی بیوی کو نیک پاک دامن ہونے کے سوا کچھ نہیں جانتا اور یہ لوگ جس مرد کا نام لے رہے ہیں ان کے بارے میں بھی خیر کے سوا میں اور کچھ نہیں جانتا۔ وہ جب بھی میرے گھر میں گئے تو میرے ساتھ ہی گئے ہیں۔ اس پر سعد بن معاذ انصاری رضی اللہ عنہ اٹھے اور کہا کہ: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں آپ کی مدد کروں گا اور اگر وہ شخص قبیلہ اوس سے تعلق رکھتا ہے تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا اور اگر وہ ہمارے بھائیوں یعنی خزرج میں کا کوئی آدمی ہے تو آپ ہمیں حکم دیں، تعمیل میں کوتاہی نہیں ہوگی۔ راوی نے بیان کیا کہ اس کے بعد سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے، وہ قبیلہ خزرج کے سردار تھے، اس سے پہلے وہ مرد صالح تھے؛ لیکن آج ان پر قومی حمیت غالب آ گئی تھی [عبداللہ بن ابی ابن سلول منافق] ان ہی کے قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا؛ انہوں نے اٹھ کر سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے کہا: اللہ کی قسم! تم نے جھوٹ کہا ہے تم اسے قتل نہیں کر سکتے، تم میں اس کے قتل کی طاقت نہیں ہے۔ پھر اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے وہ سعد بن معاذ کے چچیرے بھائی تھے انہوں نے سعد بن عبادہ سے کہا: اللہ کی قسم! تم جھوٹ بولتے ہو، ہم اسے ضرور قتل کریں گے، کیا تم منافق ہوگئے ہو کہ منافقوں کی طرفداری میں لڑتے ہو؟''

اتنے میں دونوں قبیلے اوس وخزرج اٹھ کھڑے ہوئے اور نوبت آپس ہی میں لڑنے تک پہنچ گئی۔ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر کھڑے تھے۔ آپ لوگوں کو خاموش کرنے لگے۔'' [سبق تخریجہ]

صحیحین میں یہ بھی ثابت ہے کہ جب حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے مشرکین کے نام خط لکھا تھا؛ تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ان کے بارے میں عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! آپ اجازت دیجیے: میں اس کی گردن اڑا دیتا ہوں۔'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: '' حاطب رضی اللہ عنہ غزوہ بدر میں شرکت کر چکا ہے؛ اور تمہیں کیا پتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کی طرف جھانک کر دیکھا اور فرمایا ہے: ((اِعْمَلُوْا مَاشِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَکُمْ .)) ''جو اعمال چاہو انجام دو میں نے تمھیں بخش دیا۔'' [اس کی تخریج گزر چکی ہے]۔

ایسے ہی صحیحین میں یہ بھی ثابت ہے کہ کچھ مسلمانوں نے حضرت مالک بن دخشن کے بارے میں کہا: وہ منافق ہوگیا ہے۔'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر انکار کیا؛ مگر ان کو کافر نہیں کہا۔'' ❶

ایسے ہی صحیح حدیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ عبداللہ الحمار پر کسی نے کثرت مے نوشی کی وجہ سے لعنت کی ؛ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر انکار کیا؛ اور فرمایا: ''بیشک یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔''

مگر آپ نے تاویل کی بنا پر لعنت کرنے والے پر کوئی عتاب نہیں کیا۔'' ❷

خطا کار متأول کتاب وسنت کی روشنی میں مغفور لہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مومنوں کی دعا کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ (البقرۃ: ۲۸۶)

''اے ہمارے رب! اگر ہم سے بھول یا چوک ہو جائے تو ہم پر مواخذہ نہ کر۔''

ایسے ہی صحیح حدیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ اللہ فرماتے ہیں: ''میں نے ایسا کر دیا۔'' ایسے ہی سنن ابن ماجہ اور دیگر کتب میں یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: '' بیشک اللہ تعالیٰ نے میرے لیے میری امت کے خطأ اور نسیان کو معاف کر دیا ہے۔'' ❸

---

❶ یہ حدیث صحیح بخاری میں ہے؛ ۱/ ۸۸؛ کتاب الصلاۃ ؛ باب المساجد في البیوت ؛حضرت عتبان بن مالک سے روایت کرتے ہیں ان کو بیان کرتے ہوئے سنا کہ میرے پاس صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو ایک شخص نے کہا کہ مالک بن دخشن کہاں ہے تو ہم میں سے ایک شخص نے کہا کہ وہ منافق ہے، اللہ اور اس کے رسول سے محبت نہیں کرتا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: '' کیا تم نہیں جانتے کہ وہ لا الٰہ الا اللہ محض اللہ کی رضا جوئی کے لئے کہتا ہے، اس نے کہا ہاں، تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص بھی اس کلمہ کو دل کے خلوص کے ساتھ کہے گا اللہ قیامت کے دن اس پر آگ کو حرام کر دے گا۔'' صحیح مسلم ۱/ ٤٥٥ ؛ کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ باب الرخصۃ في التخلف عن الجماعۃ بعذر ۔''

❷ صحیح بخاري: جلد سوم: ح ۱۷۱۸ ۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جس کا نام عبداللہ اور لقب حمار تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہنسایا کرتا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو شراب پینے کے سبب کوڑے لگوائے تھے ایک دن پھر نشہ کی حالت میں لایا گیا آپ نے اس کو کوڑے مارے جانے کا حکم دیا تو اس کو کوڑے لگائے گئے، قوم میں سے ایک شخص نے کہا کہ اس پر اللہ کی لعنت ہو، کسی قدر یہ [نشہ کی حالت میں] لایا جاتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس پر لعنت نہ کرو، اللہ کی قسم میں جانتا ہوں کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔''

❸ سنن ابن ماجة ۱/ ٦٥٩ ؛ کتاب الطلاق؛ باب طلاق المکرہ و الناسي ؛ صححه الألباني رحمه الله .

فصل:......رافضی دعوی کا فساد

[مقاتلین علی رضی اللہ عنہ کی مذمت اور قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کی تعریف]

جب یہ معاملہ واضح ہوگیا تو اب کہا جائے گا کہ: رافضیوں کا عقیدہ سب سے برا اور بہت بڑے تناقض کا شکار ہے۔ اس لیے کہ ان لوگوں کی بہت سخت مذمت کرتے ہیں جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قتال کیا۔ اور شیعہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کی مدح کرتے ❶ اور ان کے فعل شنیع پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ حالانکہ جن لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ❷ کو قتل کیا' وہ ان لوگوں سے بڑھ کر مذمت کے مستحق اور گنہگار ہیں جن لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی۔ بیشک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایسے خلیفہ تھے جن پر تمام لوگوں کا اجماع ہوگیا تھا۔ آپ نے کسی مسلمان کو قتل نہیں کیا۔ باغی آپ کے خلاف نبرد آزما ہوئے تاکہ آپ خلافت سے دستبردار ہوجائیں۔ آپ کا خلافت پر باقی رہنے کا عذر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اپنے اطاعت کے مطالبہ کے عذر سے بڑھ کر تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صبر کا مظاہرہ کیا یہاں تک کہ آپ انتہائی مظلومیت کی حالت میں شہید کردیے گئے۔ مگر آپ نے اپنی جان بچانے کے لیے جنگ نہیں کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے جنگ کی ابتداء کی۔ جب کہ وہ لوگ جنگ نہیں کرنا چاہتے تھے؛ لیکن وہ آپ کی بیعت نہیں کررہے تھے۔ اگر ان لوگوں سے جنگ کرنا جائز ہے جو کسی ایسے امیر کی بیعت نہ کرنا چاہتے ہوں جن کی بیعت آدھے مسلمان؛ یا اس سے کم یا زیادہ لوگ کر چکے ہوں؛ تو پھر ایسے لوگوں سے جنگ کرنا زیادہ اہم ہے جو ایسے امام یا خلیفہ سے جنگ کریں اور اسے قتل کرڈالیں جس کی بیعت پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہوچکا ہو۔

اگر شیعہ کہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ❸ سے چند ایسے فعل سرزد ہوئے جو کہ آپ کے شایان شان نہ تھے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایسے امور ہیں جن کی وجہ سے خلیفہ کو خلافت سے معزول کرنا یا اسے قتل کردینا جائز نہیں

❶ صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب تکون فتنة القاعد فیھا خیر من القائم، (حدیث: ۷۰۸۱)، صحیح مسلم۔ کتاب الفتن۔ باب نزول الفتن کمواقع القطر (حدیث: ۲۸۸۶) صحیح بخاری۔ کتاب الایمان۔ باب من الدین الفرار من الفتن (حدیث:۱۹) صحیح مسلم۔ کتاب الزھد۔ باب (۱)، (حدیث:۲۹۶۵) سنن ابن ماجة۔ کتاب الفتن، باب التثبت فی الفتنة، (حدیث:۳۹۶۲) صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم للحسن بن علی (ح: ۷۱۱۰) موقوفا علیه

❷ قاتلین عثمان جنگ جمل میں حضرت علی کے لشکر میں تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے رفقاء جب قاتلین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر لعنت بھیج رہے تھے تو یہ لوگ بذات خود سب کچھ سن رہے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم نوا ساتھ ساتھ آمین کہتے جاتے تھے۔ کوفہ کے بعض قاتلین عثمان جنگ صفین تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں موجود تھے جب بھی ان کا ذکر آتا حضرت علی رضی اللہ عنہ ان پر لعنت فرماتے۔

❸ روافض قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے مداح ہیں اور ان سے اظہار خوشنودی کرتے ہیں، حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان پر لعنت بھیجتے اور ان کے فعل پر راضی ہونے والے کو بھی ملعون قرار دیتے تھے۔ جن لوگوں پر حضرت علی رضی اللہ عنہ لعنت بھیجتے ہوں کیا وہ آپ کے شیعہ ہوسکتے ہیں؟ دراصل یہ لوگ فتنہ پردازی میں پیش پیش ہیں۔ قاتلین عثمان کے اعتراضات اور ان کے جوابات کے لیے دیکھیے: ''العواصم من القواصم: ۶۱ تا ۱۴۱، یہ صفحات نادر تحقیقات پر مشتمل ہیں۔

ہو جاتا۔ اگر ان امور کی وجہ سے امام کو معزول کرنا یا قتل کرنا جائز ہو جاتا ہے تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کا ترک کرنا' اور آپ سے انتقام لینا زیادہ مناسب ہے۔ اگر چہ ان لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر بنی امیہ کی اقرباء پروری کا الزام لگایا ہے' تو اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ان کے خلاف شدت اور انصاف ترک کرنے کا الزام لگایا گیا ہے۔ [[حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی ایسے نامناسب افعال صادر ہوئے تھے جن کی وجہ سے بعض صحابہ ان کی بیعت میں دیر سے شریک ہوئے]]

مزید براں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو معزول کرنے میں بڑی عجلت سے کام لیا۔ حالانکہ آپ معزول کیے جانے کے مستحق نہ تھے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے علاقہ پر ابوسفیان کو عامل بنا کر بھیجا۔ جب آپ نے وفات پائی تو ابوسفیان اس وقت بھی امیر نجران تھے۔ آپ کے بہت سے امراء اموی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً آپ نے عتاب بن اَسِید رضی اللہ عنہ کو مکہ کا حاکم مقرر کیا۔[1] اسی طرح خالد بن سعید بن عاص بن امیہ کو بنی مذحج اور صنعاء یمن کے صدقات و اموال پر عامل مقرر فرمایا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک آپ اس عہدہ پر فائز رہے۔

حضرت عمرو کو تیماء؛ خیبر اور عرینہ کا عامل مقرر فرمایا۔ اور ابان بن سعید بن عاص کو اس وقت بحرین کے بحر و بر پر عامل مقرر کیا جب حضرت علاء حضرمی نے اپنے آپ کو اس معاملہ سے الگ کر دیا تھا۔ آپ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک اس منصب پر فائز رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پہلے آپ کو سرایا کا امیر بھی بنایا تھا؛ ان میں سے ہی ایک سریہ بلاد نجد کی طرف تھا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو عامل مقرر کیا۔ آپ کی زندگی دین داری و سیاست رانی دونوں اعتبار سے بے داغ تھی۔ احادیث صحیحہ میں وارد ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تمہارے بہترین خلفاء وہ ہیں جن سے تم محبت کرتے ہو اور جو تم سے محبت کرتے ہوں۔ تم ان کے لیے دعا کرو اور وہ تمھیں دعا دیں۔ بدترین حکام وہ ہیں جن سے تم بغض رکھتے ہو اور جو تم سے بغض رکھتے ہوں۔ تم ان پر لعنت بھیجو اور وہ تم پر لعنت بھیجیں۔''[2]

صحابہ کا قول ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس حدیث کا مصداق تھے؛ کیونکہ رعیت آپ کو چاہتی تھی اور آپ رعیت کو چاہتے اور ان کے لیے دعا کرتے تھے اور رعیت آپ کے لیے دعا کرتی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر رہے گا اور کوئی مخالف ان کو ضرر پہنچا سکے گا اور نہ رسوا کر سکے گا۔''[3]

---

[1] سنن نسائی، کتاب الاذان، باب کیف الاذان(حدیث:٦٣٣)، سنن ابن ماجة (٧٠٨، ٢١٨٩)

[2] صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب خیار الائمة و شرارهم(حدیث:١٨٥٥)

[3] صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب(٢٨)، (حدیث:٣٦٤١)، صحیح مسلم ـ کتاب الامارة، باب قوله ﷺ "لا تزال طائفة من امتی (حدیث: ١٧٤/ ١٠٣٧)

مالک بن یُخامر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میں نے سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے سنا آپ فرماتے تھے کہ اس سے اہل شام مراد ہیں۔'' ❶

صحابہ کا خیال ہے کہ اس سے شامی لوگ مراد ہیں جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی فوج میں تھے۔

صحیح مسلم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

''اہل مغرب ہمیشہ غالب رہیں گے، یہاں تک کہ قیامت بپا ہو جائے گی۔'' ❷

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اہل مغرب سے اہل شام مراد ہیں۔''

ہم نے دوسری جگہ اس پر مکمل گفتگو کی ہے، یہ نص عسکرِ معاویہ رضی اللہ عنہ کو شامل ہے۔

صحابہ کا قول ہے کہ: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بہت سے مقرر کردہ امراء سے افضل تھے۔ لہٰذا ان کو معزول کر کے سیاست میں ان سے فروتر درجہ کے لوگوں کو حاکم مقرر کرنے میں کوئی مصلحت مضمر نہ تھی۔ بیشک حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زیاد بن ابیہ کو امیر مقرر کیا۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا گیا تھا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو امیر رہنے دیں ۔لوگوں نے کہا: انہیں چند ماہ کے لیے عامل مقرر کردیں او پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معزول کر دیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ایسا کر لینے میں مصلحت تھی۔ خواہ ایسا کرنا آپ کے استحقاق کی وجہ سے ہوئیا پھر آپ کی تالیف قلب اور خیر سگالی و نرمی کے لیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے والد جناب ابو سفیان کو والی مقرر کیا۔ معاویہ ان سے بہتر تھے۔ تو جو ہستی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بہتر تھی اس نے ایسے انسان کو والی مقرر کیا جو معاویہ رضی اللہ عنہ سے کم تھا۔ [اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو بدستور والیٔ شام رہنے دیتے تو امت فتنہ پردازی اور خونریزی سے محفوظ رہتی]

اگر یہ کہا جائے کہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اجتہاد کی بنا پر ایسا کیا تھا۔''

تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ: ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بھی جو امور صادر ہوئے وہ ان کے اجتہاد پر مبنی ہیں۔

مزید برآں یہ کیا اجتہاد ہے کہ بعض لوگوں کو ولایت وامارت پر فائز کیا جائے اور بعض کو محروم رکھا جائے اور اس کے پہلو بہ پہلو امت میں خون ریزی کا باب اس حد تک کھل جائے کہ مسلمان ذلیل و خوار ہو جائیں اور کفار کو نیچا دکھانے کے قابل نہ رہیں بلکہ کفار میں مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کی جسارت پیدا ہو جائے۔ اس بات میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ اگر علی و معاویہ کے مابین جنگ صفین پیش نہ آتی۔ ❸ [اور دونوں حضرات اپنے اپنے علاقہ پر قابض رہتے]

❶ البخاری، ح(۳٦٤۱)

❷ مسلم۳/ ۱۵۲۵؛ کتاب الامارۃ، باب قولہ ﷺ " لا تزال طائفة من امتی......" (ح:۱۹۲۵)

❸ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دین اسلام کے تحفظ و بقاء اور اسلامی سلطنت کی سرحدوں کی حفاظت و نگہداشت میں جس حد تک اہتمام کیا تھا، اس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ جب آپ کو معلوم ہوا کہ قیصر روم ایک عظیم لشکر کے ساتھ اسلامی سلطنت پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے تو آپ نے اس کو ان الفاظ پر مشتمل ایک خط لکھا: ''اللہ کی قسم! اگر تو اس حرکت سے باز آ کر واپس اپنے وطن نہ لوٹا تو میں اپنے چچا زاد بھائی (حضرت علی) سے صلح کر لوں گا اور ہم دونوں تجھے تیرے ملک سے نکال کر دم لیں گے اور اللہ کی زمین کو تجھ پر تنگ کر دیں گے۔'' شاہ روم یہ خط پڑھ کر ڈر گیا اور اپنے ارادہ سے باز رہا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی رعایا اور ان کی سیاست پر قائم رہتے' اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی رعایا کی تدبیر وتنسیق و سیاست پر قائم رہتے [تو امت لڑائی کے فتنہ سے بچ جاتی؛ اور لڑائی نہ ہونے سے بڑے دوررس نتائج برآمد ہوتے] اور امت میں اتنا فساد اور خون خرابہ نہ ہوتا جو اس جنگ وقتال کی وجہ سے ہوا۔ کیونکہ اس جنگ کی وجہ سے امت ہمیشہ تفرقہ بازی کا شکار رہی اور ایک امام پر جمع نہ ہوسکی۔ بلکہ خون ریزی کا سلسلہ تادیر جاری رہا اور بغض وعداوت کے جذبات زور پکڑ گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا گروہ جو اُقرب إلی الحق تھا کمزور ہوکر صلح کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہوا۔ حالانکہ شروع میں آپ صلح کے طلبگار نہ تھے۔ ظاہر ہے کہ جس فعل کی مصلحت اس کے فساد پر غالب ہو، اس کا وجود پذیر ہونا اس کے نہ ہونے کی نسبت زیادہ خیر وبرکت کا موجب ہوتا ہے۔ موضوع زیر بحث میں بھی لڑائی سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ بلکہ لڑائی نہ ہونے کے فوائد ومصالح کہیں بڑھ کر تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج کثرت تعداد اور قوت وشوکت کے لحاظ سے برتر تھی۔ اور حضرت معاویہ ان سے مصالحت وموافقت اور جنگ بندی کرنے کے لیے تیار تھے۔ جس اجتہاد سے اس قدر تباہ کن نتائج ظہور پذیر ہوں، اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس میں بے گناہ تصور کیا جائے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے اجتہاد میں بالاولیٰ عفو و درگزر کے مستحق ہوں گے۔

❁ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے اعوان و انصار کہتے تھے: ''لڑائی کا آغاز کرنے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، ہم صرف اپنی جانوں اور اپنے ملک کی مدافعت کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہم سے جنگ کا آغاز کیا تو ہم نے اس کا جواب جنگ کی صورت میں دیا۔ اور ہم نے جنگ کا آغاز نہیں کیا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ظلم وتعدی کا ارتکاب بھی نہیں کیا۔''

جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے رفقاء سے یوں کہا جاتا: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ واجب الاطاعت امام ہیں اور ان کی بیعت آپ کے لیے ناگزیر ہے، کیونکہ بیعت نہ کرنے سے مسلمانوں میں تفرقہ بازی پیدا ہوتی ہے۔''

تو وہ اس کے جواب میں کہتے تھے: ''ہمیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واجب الاطاعت امام ہونا کسی دلیل سے معلوم نہیں۔'' خصوصاً شیعہ کے ہاں امامت نص سے ثابت ہوتی ہے۔ اور ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی کوئی نص موصول نہیں ہوئی جس کی روشنی میں آپ کی امامت اور اطاعت واجب ہوتی ہو۔''

ظاہر ہے کہ اصحاب معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ عذر معقول ہے۔ اس لیے کہ شیعہ امامیہ جس نص جلی کا دعویٰ کرتے ہیں، اگر اسے حق بھی فرض کرلیا جائے (حالانکہ وہ باطل ہے) [1] تو یہ نص ابوبکر وعمر اور عثمان رضی اللہ عنہم خلفاء ثلاثہ کے عہد خلافت میں پوشیدہ رکھی گئی تھی۔ تو پھر ہم کیسے واجب کرسکتے ہیں کہ اصحاب معاویہ رضی اللہ عنہ اس سے آگاہ ہوں۔ یہ مفروضہ اس صورت میں ہے جب نص مذکور حق ہو؛ مگر وہ حق نہیں بلکہ باطل ہے۔

[1] اہل سنت کے نزدیک وہ نص باطل ہے۔ اس لیے کہ اگر ایسی کوئی نص موجود ہوتی تو اصحاب ثلاثہ کی دین داری، اخلاق ومروّت اور حکومت وسلطنت سے بیزاری کی بنا پر توقع کی جاتی تھی کہ سب سے پہلے وہ اس نص پر عمل کرتے۔

[مدت خلافت]

شیعہ کا یہ کہنا کہ:'' خلافت تیس سال تک ہوگی۔'' وغیرہ۔

[جواب] : یہ احادیث [اس وقت] اتنی مشہور نہیں تھیں کہ سبھی لوگ اس کو جانتے ہوتے۔ یہ روایت چند خاص لوگوں نے نقل کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ بخاری اور مسلم وغیرہ جیسے محدثین نے یہ روایت نقل نہیں کی۔ جب عبد الملک بن مروان جیسے انسان پر یہ حدیث مخفی تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا:

'' اے عائشہ !اگر تمہاری قوم سے جاہلیت کا زمانہ قریب نہ ہوتا تو میں خانہ کعبہ کو منہدم کر دیتا اور [اس میں سے جو حصہ نکال دیا گیا ہے اسے میں اس میں شامل کر دیتا] اور اس کو زمین سے ملا دیتا اور اس میں دو دروازے رکھتا۔''❶

جب حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی تعمیر کو منہدم کر دیا گیا' اور اس تک یہ روایت پہنچی تو اس نے کہا:

'' میری تمنا تھی کہ جو کام آپ نے کیا تھا وہ میرے ہاتھوں سے ہوا ہوتا۔''

حالانکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت بالکل صحیح اور متفق علیہ ہے۔پس اسی طرح نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث کہ:'' میرے بعد خلافت تیس سال تک ہوگی' اور پھر اس کے بعد بادشاہت ہوگی۔'' بالاولی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب پر مخفی رہی ہوگی۔ حالانکہ یہ اس وقت کا واقعہ ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی ابتداء تھی؛ اور اس حدیث میں کسی کی ذات کا کوئی تعین نہیں تھا۔ یہ دلالت تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد اس نص کی روشنی میں معلوم ہوئی۔ حالانکہ اس حدیث میں کسی متعین خلیفہ کی تحدید نہیں۔

اور جو لوگ ایک ہی وقت میں دو خلیفہ کی تجویز دیتے ہیں؛ وہ کہتے ہیں:

''ان دونوں کی خلافت خلافت نبوت ہوگی؛ بیشک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے آخری ایام کی نسبت شروع میں اکثر لوگوں کے نزدیک زیادہ قابل تعریف اور محمود تھے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ بیشک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت اہل شان وشوکت کی بیعت کی وجہ سے ثابت ہوگئی تھی؛ جیسے ان سے پہلے حضرات کی خلافت ثابت ہوتی ہے۔اس سے مراد حضرت طلحہ پر رد کرنا ہے جنہوں نے بحالت اکراہ ان کی بیعت کی تھی۔اور جن لوگوں نے آپ کی بیعت کی تھی؛ انہوں نے ہی آپ سے جنگ بھی کی؛ اس لیے اہل شان وشوکت آپ کی اطاعت گزاری پر یک زبان نہ ہوسکے۔

مزید برآں اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کی بیعت بھی ویسے ہی واجب تھی جیسے آپ سے پہلے لوگوں کی بیعت واجب تھی؛ جب آپ اپنے متقدمین کی سیرت پر عمل پیرا رہتے۔ وہ حضرات اپنی بیعت کرنے والوں کا ظلم سے دفاع کرنے پر قادر تھے۔اور اس سلسلہ میں جو کچھ وہ کر سکتے تھے؛ کر گزرتے۔ جب کہ ان حضرات کا کہنا تھا کہ اگر ہم آپ کی

❶ رواہ البخاری' حج کا بیان :ح:۲۳۶۔ مکہ کی فضیلت اور اس کی عمارتوں کا بیان۔

بیعت کر لیں؛ تو ہم آپ کی ولایت میں مظلوم ہی ہوں گے؛ اور اس پر مستزاد اس سے پہلے جو ظلم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ہو چکا ہے؛ انہوں نے تو اپنی عاجزی اور مجبوری کی وجہ سے ہمیں اس سلسلہ میں انصاف نہیں دلایا۔ بھلے یہ آپ کی تأویل کی وجہ سے ہی کیوں نہ ہو۔ یا پھر اس وجہ سے ہو جو کچھ دوسرے لوگ آپ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ آپ ان سے دفاع کرنے میں عاجز تھے۔ اور بلا شک وشبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلین اور ان کے حلیف ہمارے دشمن ہیں۔ اور ان کی بڑی تعداد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں تھی۔ اور آپ ان سے دفاع کرنے میں عاجز تھے۔ اس کی دلیل یوم جمل کا واقعہ ہے۔ بیشک جب آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلین سے انتقام لینے کے لیے حضرت طلحہ اور حضرت زبیر سے مدد چاہی تو وہ لوگ ان کے خلاف جمع ہو کر برسر پیکار جنگ ہو گئے۔

یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگوں پر ہاتھ اٹھانے سے باز رہنا مصلحت کا تقاضا تھا۔ جیسا کہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے مشورہ کے بعد اس پر اتفاق ہو گیا تھا۔ مگر جب قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو اکابرین کے اس اتفاق کا علم ہوا تو انہیں نے فتنہ و فساد پھیلا دیا۔ اور انہوں نے پہل کر کے حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے: ''حملہ کرنے میں پہلے انہوں نے کی ہے۔'' پس ان میں سے ہر دو فریق اپنے اپنے دفاع میں لڑتے رہے۔ اس جنگ سے حضرت علی یا حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ بلکہ یہ فتنہ و فساد قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کا پیدا کردہ تھا۔ [پس اس پر وہ کہتے تھے:]

''جب وہ ہمارے ساتھ ہماری نصرت کے بارے میں اپنی عاجزی یا تاویل کی وجہ سے انصاف نہیں کر سکتے؛ تو ہم پر بھی یہ لازم نہیں ہوتا کہ ہم اس انسان کی بیعت کریں جس کے دور میں ہم ظلم کی شکایت کرتے ہیں' جو لوگ ہم سے جنگ کرنے کو جائز کہتے ہیں؛ ان کا کہنا ہے: ''ہم باغی ہیں۔'' اور بغاوت کرنا ظلم ہے۔ اگر صرف ظلم کی وجہ سے قتال حلال ہو جاتا ہے' تو یہی ظلم بیعت ترک کرنے کے جواز میں زیادہ اولی اور مناسب ہے۔ اس لیے کہ جنگ کرنے میں بغیر جنگ کے بیعت ترک کر دینے سے بڑھ کر فساد ہے۔''

❁ اگر شیعہ کی طرف سے یہ کہا جائے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ ان پر ظلم نہیں کرنا چاہتے تھے' بلکہ آپ عدل قائم کرنے میں مجتہد تھے' وہ ان کے ساتھ بھی عدل کرنا چاہتے تھے اور ان پر عدل قائم کرنا چاہتے تھے۔

❁ تو اسکے جواب میں [اصحاب معاویہ کی طرف سے] کہا جا سکتا ہے کہ: ''ہم بھی عمداً بغاوت نہیں کرنا چاہتے؛ بلکہ ہم ان کیساتھ اور اپنے ساتھ عدل کرنا چاہتے ہیں۔ اور اگر مان لیا جائے کہ ہم تاویل کی بنا پر باغی بھی ہیں' تو اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ جنگ شروع کرنے کا حکم نہیں دیا؛ اور فقط کسی کی بغاوت سے اسے قتل کرنا حلال نہیں ہو جاتا۔ بلکہ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا﴾ [الحجرات ۹]

''اور اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں کے درمیان صلح کرا دو۔''

یہاں پر اللہ نے پہلے ان کے مابین صلح کرانے کا حکم دیا ہے۔ اور پھر یہ ارشاد فرمایا: ﴿فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ﴾ [الحجرات ۹] ''پھر اگر دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔''

یہ زیادتی و بغاوت قتال و جنگ کے بعد کی ہے؛ کہ دو جنگجو گروہوں میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرتا ہے۔ جنگ کے بغیر کوئی زیادتی اور بغاوت نہیں۔ پس اس بنا پر صرف زیادتی کی وجہ سے کسی کو قتل کرنا حلال نہیں ہو جاتا۔ حالانکہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ والی روایت میں موجود ہے کہ انہیں باغی گروہ قتل کرے گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہوں جو آپ کو قتل کرنے میں براہ راست ملوث رہے ہیں۔ اس لیے کہ انہوں نے جنگ کی ضرورت کے بغیر ہی لڑائی شروع کر رکھی تھی۔ اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جنگ سے پہلے باغی نہ ہوں؛ لیکن جب ان کے مابین جنگ واقع ہوئی تو ایک دوسرے پر بغاوت اور زیادتی کرنے لگ گئے۔ پس اس صورت میں حضرت عمار کو ایک باغی گروہ نے ہی قتل کیا ہوگا۔ پس حدیث میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہو کہ یہاں پر بغاوت جنگ سے پہلے ہی ہوگئی ہو۔ تو جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر نے زیادتی کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا لشکر انتہائی کمزوری کا شکار ہوگیا؛ اور وہ جنگ پر قابو نہ پا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں:

''لوگوں نے اس آیت پر عمل نہیں کیا۔''

[اٹھارھواں اعتراض]: شیعہ کا یہ قول کہ ''معاویہ رضی اللہ عنہ نے خیارِ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی ایک کثیر جماعت کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔''

[جواب]: بات یہ ہے کہ مقتولین کسی ایک جماعت میں محدود نہ تھے بلکہ ہر فریق نے فریق مخالف کے اعوان و انصار کو قتل کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ فریقین میں سے جو جنگ آزما لوگ تھے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ و معاویہ رضی اللہ عنہ میں سے کسی کے بھی اطاعت کیش نہ تھے؛ جبکہ حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما دونوں مصالحت چاہتے تھے اور خون ریزی سے بیزار تھے۔ لیکن اس واقعہ کے پیش آنے میں دونوں [فسادیوں کے سامنے] مغلوب ہوگئے تھے۔ [ان دونوں کے رفقاء بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے]۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ فتنہ کی آگ جب ایک مرتبہ مشتعل ہو جاتی ہے تو دانش مندوں کے بجھائے بھی فرو نہیں ہوتی۔ فریقین میں اشتر نخعی؛ ہاشم بن عتبہ [1]، عبد الرحمٰن [2] بن خالد بن

[1] ہاشم بن عتبہ المرقال حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بھتیجا تھا۔ اس نے اپنے چچا کے ساتھ جنگ قادسیہ میں حاضر ہو کر بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جو لشکر جلولاء کے مقام پر یزدگرد شاہ ایران سے لڑنے کے لیے بھیجا تھا۔ ہاشم اس کے سپہ سالار تھے، جنگ صفین میں ہاشم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا، یہ آپ کی فوج کے علم بردار تھے۔ یہ جنگ صفین میں مارے گئے۔

[2] ایک قدیم مورخ سیف بن عمر تمیمی جس سے مورخ طبری بھی استفادہ کر چکے ہیں، لکھتا ہے: ''عبد الرحمٰن بن خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اپنے والد کے ساتھ فتوحات شام میں شریک تھے۔ یہ اس وقت بالکل نوعمر تھے۔ ابن سعد نے ان کو تابعین مدینہ کے طبقۂ اول میں شمار کیا ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی امارت کے زمانہ میں مسلمانوں نے رومیوں سے جو جنگیں لڑیں۔ یہ ان میں سپہ سالار ہوا کرتے تھے، یہاں تک ⇦⇦⇦

ولید؛ اور ابو الاعور السُّلَمِی ❶ جیسے لوگ تھے جو جنگ کی آگ کو فرو نہیں ہونے دیتے تھے۔

کچھ لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شدید حمایت کرتے تھے اور کچھ ان کے خلاف تھے۔ دوسری طرف حامیان علی رضی اللہ عنہ تھے اور کچھ لوگ ان سے اختلاف رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں جو لوگ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حامی تھے، وہ ذات معاویہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ دیگر اسباب و محرکات کی بنا پر شریک جنگ ہوئے تھے۔ جنگ، فتنہ اور قتال جاہلیت کی طرح ایک ہی قسم کے مقاصد و اعتقادات کے تحت وقوع پذیر نہیں ہوتا بلکہ اس کے مقاصد مختلف ہوا کرتے ہیں، امام زہری رحمہ اللہ

⇦⇦⇦ کہ ابو ایوب انصاری جیسے مقتدر صحابہ آپ کے زیر قیادت شریک جہاد ہوئے۔ عبدالرحمٰن اس وقت عنفوان شباب میں تھے۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ عبدالرحمٰن نے چار عجمی کافر قید کیے اور حکم دیا کہ انھیں تیروں سے قتل کیا جائے، جب حضرت ابو ایوب کو پتہ چلا تو انھوں نے اس سے منع فرمایا اور کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو باندھ کر قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔ عبدالرحمٰن نے اس گناہ کی پاداش میں چار غلام آزاد کیے۔ (سنن ابی داؤد۔ کتاب الجہاد۔ باب فی قتل الاسیر بالنبل (حدیث: ۲۶۸۷)، وسندہ ضعیف۔ اس کی سند میں بکیر بن الاشج راوی مجہول الحال ہے۔ خلافتِ عثمانی میں حضرت معاویہ نے عبدالرحمٰن کو ملک شام کی شمالی جانب حمص سے لے کر جزیرہ ابن عمر تک کا حاکم مقرر کیا تھا۔ آپ نے ایک بیدار مغز اور جرأت مند حاکم کی طرح اپنے فرائض منصبی ادا کیے۔ خلافت عثمانی میں جب فتنہ پردازوں نے کوفہ میں شرانگیزی کا آغاز کیا تو حضرت عثمان نے ان کو معاویہ کی خدمت میں بھیجنے کا حکم صادر فرمایا۔ حضرت معاویہ نے اپنے حلم و ادب کے ذریعہ ان کی اصلاح کرنا چاہی مگر وہ حلم و ادب کی لغت سے واقف ہی نہ تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت معاویہ نے ان کو عبدالرحمٰن بن خالد کے پاس بھیجا۔ عبدالرحمٰن نے ان کو متنبہ کرتے ہوئے جو کچھ کہا اس میں یہ الفاظ بھی شامل تھے: ''اے شیطان کے آلہ کارو! میں تمھیں خوش آمدید نہیں کہنا چاہتا۔ اب شیطان تھک کر عاجز آ گیا ہے، مگر تمہاری پھرتی و چالاکی میں کمی نہیں آئی۔ اللہ عبدالرحمٰن کو ناکارہ کردے، اگر ادب سکھا کر وہ تمھیں فرماں بردار نہ بنائے۔ اے ان لوگوں کے گروہ جن کے متعلق مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ عرب ہیں یا عجم۔ تمھیں واضح ہو کہ میں اس خالد بن ولید کا بیٹا ہوں جو بڑی مشکلات سے دوچار ہوئے۔ جنھوں نے فتنہ ارتداد کی آگ کو فرو کیا۔ اے صعصعہ بن ذلّ اگر مجھے پتہ چلا کہ میرے رفقاء میں سے کسی نے تیری ناک توڑی اور پھر تجھے دودھ پلایا تو میں تجھے عبرتناک سزا دوں گا۔'' (تاریخ طبری: ۵/ ۸۷) عبدالرحمٰن بن خالد کہا کرتے تھے: ''جس کی خیر سے اصلاح ممکن نہ ہو اسے شر کے ذریعے ٹھیک کر سکتے ہیں۔'' یہ سن کر سب شریر عبدالرحمٰن سے کہنے لگے: ''ہم بارگاہ ایزدی میں توبہ کرتے ہیں، ہمیں معاف فرمایئے اللہ تعالیٰ آپ کو معاف کرے۔'' (طبری: ۵/ ۸۷۔۸۸)

مگر ان کی یہ توبہ مخلصانہ نہ تھی۔ رہا ہو کر انھوں نے حج کرنے کے بہانے سے امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کردی۔ عبد الرحمٰن بن خالد جنگ صفین میں حضرت معاویہ کے ہم راہ تھے، جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔

❸ ابو اعور کا اصلی نام عمر بن صفوان ذکوانی ہے۔ ذکوان بنی سُلیم کے ایک قبیلہ کا نام ہے۔ یہ صحابی ہیں غزوۂ حنین کے بعد اسلام لائے۔ محمد بن حبیب لکھتے ہیں: ''حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مختلف دیار و امصار کے امراء کو لکھا تھا کہ ہر علاقہ میں سے ایک صالح ترین شخص آپ کی خدمت میں بھیجا جائے۔ چنانچہ بصرہ، کوفہ اور شام و مصر سے چار آدمی آپ کے یہاں بھیجے گئے۔ اتفاق کی بات ہے کہ یہ چاروں قبیلہ بنی سلیم سے تعلق رکھتے تھے اور ان میں سے ایک ابو اعور سُلَمی تھے۔ امام مصر حضرت لیث بن سعد فرماتے ہیں: ''جب ۲۳ھ میں عموریہ کی جنگ ہوئی تو اس میں مصری فوج کے امیر وہب بن عمیر جُمحی تھے اور شامی لشکر کے سپہ سالار ابو اعور سلمی تھے۔'' ابو زرعہ اپنی تاریخ دمشق میں لکھتے ہیں: ''۲۶ھ میں ابو اعور سلمی نے قبرص کی جنگ میں شرکت کی تھی۔'' جنگ صفین میں ابو اعور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں تھے اور بہت بڑے قائد خیال کیے جاتے تھے۔ ان کی شجاعت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ابو اعور نے یہ سمجھ کر اشتر نخعی کا مقابلہ کرنے سے انکار کردیا تھا کہ وہ ان کا حریف نہیں ہوسکتا۔

فرماتے ہیں: ''جب فتنہ بپا ہوا تو اصحاب رسول کی تعداد کچھ کم نہ تھی۔ جمیع صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس بات پر اجماع کر لیا تھا کہ جس خون، مال یا عفت وعصمت کو بنا بر تاویل حلال کیا گیا ہو وہ ہدر ہے (جس پر شرعی سزا نہ دی جائے)؛ اور اسے جاہلیت کا سا معاملہ سمجھا جائے۔''

جہاں تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے لعنت کا تعلق ہے، فریقین دعا میں ایک دوسرے پر لعنت کرتے تھے؛ جیسا کہ ان کے مابین جنگ بھی بپا ہوئی۔ ان کے سردار اُن پر اپنی دعاؤوں میں لعنت کرتے تھے' اور دوسرے گروہ کے سردار پہلے گروہ کے بڑوں پر لعنت کرتے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان میں سے ہر گروہ دوسرے کے خلاف دعاء قنوت پڑھ کر بددعا کرتا تھا۔ کسی کے خلاف جنگ آزما ہونا اس پر لعنت بھیجنے سے بھی عظیم تر ہے۔ لعنت بھیجنے کا فعل خواہ گناہ ہو یا صحیح وغلط اجتہاد پر مبنی ہو، اللہ کی مغفرت کا حصول بنا بر توبہ گناہوں کا ازالہ کرنے والے اعمال صالحہ اور گناہوں کا کفارہ بننے والے حوادث و آلام کی وجہ سے ممکن ہے۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ روافض سَبِّ علی رضی اللہ عنہ کو ناپسند کرتے ہیں اور خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی تکفیر کرنے اور ان کو اور ان سے محبت رکھنے والوں کو برا بھلا کہنے سے نہیں شرماتے۔ بخلاف ازیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے احباب وانصار حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تکفیر نہیں کرتے، آپ کی تکفیر صرف خوارج کرتے ہیں، جو دین اسلام سے نکل چکے ہیں، رافضہ ان سب سے برے ہیں۔ اگر خوارج اس گالم گلوچ کا انکار کرتے تو ان کے قول میں تناقض ہوتا۔ تو پھر رافضی اس کا انکار کیسے کر سکتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے کسی ایک کو گالی دینا جائز نہیں۔ نہ ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اور نہ ہی ان دونوں کے علاوہ کسی اور کو۔ پھر جو کوئی حضرات ابوبکر وعمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کو گالی دے' اس کا گناہ اس سے بڑھ کر ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گالی دے۔ اگرچہ ان صحابہ کو گالی دینے والا کسی تاویل کا بھی شکار ہو؛ تو اس کی تأویل حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گالی دینے والے کی تاویل سے بڑھ کر فاسد اور بے کار ہے۔ اگر ان صحابہ کو تاویل کی وجہ سے گالی دینے والا برا نہیں ہے تو پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھی برے نہیں ہو سکتے۔ اور اگر یہ حرکت مذموم ہے' تو پھر شیعہ جو کہ خلفاء ثلاثہ کو گالی دیتے ہیں وہ نواصب سے بڑھ کر مذمت کے مستحق ہیں جو کہ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گالی دیتے ہیں۔ خواہ جس زاویہ سے بھی اس معاملہ کو لیا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ شیعہ سب سے زیادہ حق سے دور ہیں۔

صحیحین میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میرے صحابہ کو گالی نہ دو، مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم میں سے کوئی شخص احد کے پہاڑ جتنا سونا بھی خرچ کرے، تو وہ ان کے عشر عشیر کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔''[1]

---

[1] صحیح بخاری کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب قول النبی ﷺ، لو کنت متخذاً خلیلاً (ح:۳۶۷۳)، مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب تحریم سب الصحابة ﷺ(ح:۲۵٤۱) العواصم من القواصم: ۳۲تا ۳٤۔

[حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا قاتل کون؟]:

[انیسواں اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''معاویہ رضی اللہ عنہ نے حسن کو رضی اللہ عنہ زہر کھلایا تھا۔''

[جواب]: بعض لوگوں نے یہ بات کہی ہے۔ ❶ مگر کسی شرعی دلیل و برہان سے یا کسی معتبر کے اقرار یا کسی سچے ناقل کے کلام سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی اس کا علم ممکن ہے۔ پس یہ کہنا کہ آپ نے حضرت حسن کو زہر دیا تھا؛ بغیر علم کے بات ہے۔ ہمارے اس زمانے میں بھی کہا جاتا ہے کہ فلاں بادشاہ کو زہر دے کر قتل کیا گیا۔ مگر لوگوں کا اس میں اختلاف ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جس جگہ و مقام پر جس قلعہ میں اس بادشاہ کا انتقال ہوگیا ہو وہاں کے رہنے والوں میں بھی اس حقیقت میں اختلاف ہوتا ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ہر آدمی دوسرے کے برعکس کوئی اور بات کہتا ہے۔ کوئی ایک کہتا ہے: اس کو فلاں نے زہر دی۔ دوسرا کہتا ہے: نہیں اسے فلاں نے زہر دی؛ کیونکہ اس کے ساتھ کوئی معاملہ پیش آگیا تھا۔ یہ حال تو آپ کے زمانے میں پیش آنے والے واقعات کا ہے۔ اور ان لوگوں کا بیان ہے جو خود اس قلعہ کے اندر موجود تھے۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ آپ کو زہر دیا گیا۔ اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ممکن بھی ہے۔ اس لیے کہ زہر دے کر قتل کیے جانے والے کی موت کسی پر مخفی نہیں رہتی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی بیوی نے آپ کو زہر کھلایا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کی موت مدینہ طیبہ میں واقع ہوئی۔ جبکہ معاویہ رضی اللہ عنہ شام میں تھے۔ اس بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے کسی آدمی کو بھیجا ہو، یا پھر کسی کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہو۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کی بیوی نے آپ کو زہر اس لیے دیا چونکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کثرت سے طلاق دیا کرتے تھے۔ اس لیے ممکن ہے کہ ان کی بیوی نے کسی مقصد کے لیے آپ کو زہر کھلایا ہو۔ واللہ اعلم۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ اس عورت کے والد اشعث بن قیس نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو زہر کھلانے کا حکم دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اندرونی طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ و حسن رضی اللہ عنہ سے منحرف ہوگیا تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کے والد کو اس بات پر مامور کیا تھا۔ یہ ظن محض ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَکْذَبُ الْحَدِیْثِ'' ❶

''بدگمانی سے بچو، کیوں کہ یہ بڑی جھوٹی بات ہے۔''

خلاصہ یہ کہ باتفاق مسلمین شرعاً ایسی بلا دلیل بات کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا اور نہ اس پر کسی کی مدح یا مذمت کا ترتب

---

❶ یہ شیعہ کا قول ہے، جو بلا دلیل و ثبوت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر اتہام طرازی کرتے رہتے ہیں یا وہ لوگ اس کے قائل ہیں جو شیعہ کے دام فریب میں آکر ان کے جھوٹے اقوال سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

❷ صحیح بخاری، کتاب الادب۔ باب ما ینهی عن التحاسد والتدابر، (حدیث:٦٠٦٤)، صحیح مسلم، کتاب البر والصلة۔ باب تحریم الظن والتجسس (حدیث:٢٥٦٣)۔

درست ہے۔

پھر یہ کہ اشعث بن کا انتقال ۴۰ ہجری میں ہوا۔اور ۴۱ ہجری بھی کہا گیا ہے۔اسی لیے اس کا نام اس صلح میں نہیں آ تا جو اتفاق والے سال حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے مابین ہوئی تھی۔یہ سن ۴۱ ہجری کا واقعہ ہے۔ اشعث بن قیس حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے سسر تھے۔ ❶ اگر وہ اس موقع پر موجود ہوتے تو ان کا ذکر ضرور کیا جاتا۔اور اگر اس کی وفات حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات سے بیس سے پہلے ہو چکی تھی؛ تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنی بیٹی کو حضرت حسن رضی اللہ عنہما کو زہر دینے کا حکم دیا ہو۔حقیقت حال کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔اور وہی ان کے اختلافی امور میں فیصلہ کرے گا۔اور اگر ایسی کوئی بات ہوئی ہے؛ تو یہ پھر وہی باہمی جنگ وقتال ہے جیسے کہ پہلے گزر چکا؛ کہ مسلمانوں نے آپس میں ایک دوسرے کو تأویل کی بنا پر قتل کیا۔اور ایک دوسرے پر سب وشتم بھی کیا۔اور کفر کے فتوے بھی لگائے۔ یہ ایک بہت بڑا باب ہے؛ جو اس بارے میں حقیقت واجب نہ جانتا ہو تو وہ گمراہ ہو جاتا ہے۔

[حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کس نے قتل کیا]:

[بیسواں اعتراض]: کہتے ہیں:''معاویہ کے بیٹے یزید نے حضرت حسین کو قتل کیا اور ان کی عورتوں کو قیدی بنایا۔''

[جواب]: یزید نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید نہیں کیا' اور نہ ہی آپ کو قتل کرنے کا حکم دیا؛ اس پر اہل علم کا اتفاق ہے۔مگر اس نے ابن زیاد کو یہ خط لکھا کہ آپ کو عراق کی ولایت سے روکے۔جبکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ اہل عراق آپ کی نصرت کریں گے؛ اور آپ کی طرف لکھے گئے وعدے پورے کریں گے۔ ❷ چنانچہ آپ نے اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجا۔جب انھوں نے دھوکہ سے مسلم کو قتل کر کے ابن زیاد کی بیعت کر لی، تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے واپس جانے کا ارادہ کیا، مگر ابن زیاد کی ظالم فوجوں نے آپ کو واپس جانے سے روکا۔آپ نے یہ بھی کہا کہ: مجھے یزید کے پاس جانے دیا جائے۔یا ملکی سرحد کی راہ لینے دی جائے۔یا اپنے شہر کو واپس جانے دیا جائے۔مگر انھوں نے

❶ اشعث بن قیس بن معدیکرب الکندی ابو محمد؛ صحابی ہیں؛ سن دس ہجری میں ستر ساتھیوں کے ساتھ وفد کی شکل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔آپ کندہ کے بادشاہوں میں سے تھے۔آپ نے اسلام قبول کیا۔جنگ یرموک میں شرکت کی۔اور اس جنگ میں آپ کی ایک آنکھ جاتی رہی۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں زکواۃ دینے سے انکار کیا؛ تو ان سے جنگ کی گئی۔جس میں آپ نے ہتھیار ڈال دیے۔پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کو آزاد کر دیا؛ اور ام فروہ سے آپ کی شادی کر دی۔آپ مدینہ میں قیام پذیر رہے۔اور کئی جنگوں میں شرکت کی۔عراق کی جنگوں میں شریک ہوئے۔اور صفین اور نہروان کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔پھر واپس کوفہ چلے گئے اور سن ۴۰ ہجری میں انتقال فرمایا۔بخاری اور مسلم میں آپ سے نو احادیث روایت کی گئی ہیں۔دیکھیں: الاصابہ ۱/ ۶۶؛ الأعلام ۱/ ۳۳۳۔

❷ ہمارے معاصر مشہور شیعہ شاعر محمد جواد خضر نے ان تاریخی حقائق کو تسلیم کیا ہے اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے حق وانصاف کو اس کی زبان پر جاری کر دیا، حضرت علی بن حسین بال بچوں سمیت جب کربلا سے کوفہ پہنچے اور خیانت کار شیعہ مستورات سمیت روتے دھوتے اور دامن پھاڑتے آپ کے استقبال کے لیے نکلے (جیسے شیعہ آج کل عاشوراء کے موقع پر کرتے ہیں) تو آپ نے اہل کوفہ کو مخاطب کر کے کہا:''اہل کوفہ! اب تم رو رہے ہو بتلائیے تمہارے سوا ہمیں اور کس نے قتل کیا ہے؟''

آپ کو قیدی بنانے کے سوا دوسری سب تجویزیں مسترد کردیں۔ آپ نے قیدی ہونے اور عبداللہ بن زیاد کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے سے انکار کردیا اور ان کے خلاف لڑتے ہوئے بحالت مظلومی شہادت پائی۔ جب یزید کو شہادت حسین رضی اللہ عنہ کی خبر پہنچی تو اس نے بڑے درد و کرب کا اظہار کیا اور اس کے اہل خانہ نے آہ و بکا کا آغاز کیا۔ یزید رحمہ اللہ نے اہل بیت کی خواتین میں سے کسی کو قید نہیں کیا تھا۔ ❶ بلکہ انھیں عطیہ جات دیے اور عزت و احترام سے انھیں مدینہ رخصت کردیا۔[اس لیے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو خصوصی وصیت کی تھی کہ ہر قیمت پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا اکرام و احترام ملحوظ رکھے]۔

اگر یہ بات تسلیم کرلی جائے کہ: ''یزید نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا'' تو اس میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا کیا گناہ ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی﴾ [فاطر ۱۸]

''کوئی جی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔''

تمام لوگوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے یزید کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے حق کا خیال رکھنے' آپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے' اور آپ کی تعظیم و توقیر بجالانے کی وصیت کی تھی۔ عمر بن سعد اس جماعت کا سردار تھا جنہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا۔ جب کہ اس کے والد حضرت سعد رضی اللہ عنہ لوگوں میں سب سے زیادہ فتنہ سے دور رہنے والے تھے۔ اس بیٹے کا اپنے باپ کیساتھ طلب خلافت کے مسئلہ میں ایک مشہور مکالمہ ہے؛ جس میں حضرت سعد اس مطالبہ سے باز رہے۔ اس وقت آپ کے علاوہ اہل شوریٰ میں سے کوئی ایک بھی زندہ باقی نہیں تھا۔

صحیح مسلم میں ہے حضرت عامر بن سعد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اپنے اونٹوں میں (موجود) تھے کہ اسی دوران ان کا بیٹا عمر آیا؛ تو جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھا تو فرمایا:

''میں اس سوار کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں۔ جب وہ اترا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے کہنے لگا کہ: کیا آپ اونٹوں اور بکریوں میں رہنے لگے ہیں اور لوگوں کو چھوڑ دیا ہے اور وہ ملک کی خاطر جھگڑ رہے ہیں۔ تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اس کے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: خاموش ہوجا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: ''اللہ اپنے بندے سے پیار کرتا ہے جو پرہیزگار اور غنی ہے اور ایک کونے میں چھپ کر بیٹھا ہو۔'' ❷

---

❶ اس فقرہ سے شیعہ کی تردید مقصود ہے، ورنہ یزید اور اس کے اہل بیت آج کل کے جھوٹے مدعیان حب اہل بیت سے کہیں بڑھ چڑھ کر بنی ہاشم کا اعزاز و احترام بجالاتے تھے، موجودہ شیعہ حب اہل بیت کے بہانہ سے ان کے دین میں مسخ و تحریف کرنا چاہتے ہیں ایک مرتبہ حجاج ثقفی نے بنی ہاشم کے قبیلہ میں رشتہ کرنا چاہا تو بنو امیہ نے اسے ناپسند کیا کیوں کہ وہ حجاج کو بنو عبد مناف کا کفو (ہمسر) تصور نہیں کرتے تھے۔

❷ صحیح مسلم 'زهد و تقوی کا بیان :۱۰۶۔

محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کرنے میں مدد کی تھی۔ جبکہ اس کے والد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں میں سب سے زیادہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تعظیم کرنے والے تھے ۔ تو کیا اس بیٹے کی وجہ سے کسی ایک اہل سنت نے بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شان میں قدح کی ہے؟

[اکیسواں اعتراض]: اگر یہ کہا جائے کہ:''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے یزید کو خلیفہ مقرر کر دیا تھا؛ اس کی ولایت کی وجہ سے یہ فساد پیدا ہوا۔''

[جواب] : حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لئے اس کو خلیفہ مقرر کرنا جائز تھا۔ اس فعل سے آپ کو کوئی ضرر نہیں پہنچتا۔ اگر آپ کے لیے اس کو خلیفہ مقرر کرنا ناجائز بھی ہوتا تو یہ علیحدہ سے ایک گناہ تھا؛ اگر چہ وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل نہ بھی کرتا۔ یزید لوگوں میں سب سے بڑھ کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عزت و آبرو کا خیال رکھنے کا حریص تھا چہ جائے کہ وہ آپ کے خون کا پیاسا ہوتا۔ اس کوشش و جدو جہد کے باوجود فسادیوں کے افعال کو آپ کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

[بائیسواں اعتراض]: رافضی مضمون نگار کا یہ قول کہ''[معاویہ کے والد] ابوسفیان نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اگلے دانت توڑے تھے؛ اور اس کی والدہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ چبایا تھا۔''

[جواب] : اس میں کوئی شک نہیں کہ ابوسفیان احد کے موقع پر مشرکین کے لشکر کا قائد تھا۔ اور اس دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دانت بھی توڑے گئے ۔مگر کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ آپ کے دندان مبارک پر وار کرنے والا ابو سفیان تھا۔ بلکہ یہ دانت توڑنے والا عتبہ بن ابی وقاص تھا۔ ❶

یہ درست ہے کہ ہند زوجۂ ابوسفیان نے سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا جگر لے کر چبایا تو اسے نگل نہ سکی؛ پھر اسے تھوک دیا تھا۔ ❷ یہ اسلام لانے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ پھر یہ تمام گھرانہ عنایت ایزدی سے مشرف بہ اسلام ہو گیا؛ اور اچھے مسلمان ثابت ہوئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہند رضی اللہ عنہا کی اس بنا پر تکریم فرمایا کرتے تھے[کہ رشتہ سے وہ آپ کی ساس ہوتی تھی]۔ نیز یہ کہ اسلام قبول کرنے سے پہلے کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ ❸ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے:

❶ دیکھیے تاریخ طبری (۳/ ۱۷) طبع حسینیہ نیز (ج:۱/ ۴۰۳) طبع یورپ۔ عتبہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بھائی تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ جنتی ہیں اور عتبہ جہنمی۔ محمد بن اسحاق حضرت سعد سے روایت کرتے ہیں کہ وہ کہا کرتے تھے:''اللہ کی قسم! میں عتبہ سے بڑھ کر کسی شخص کو قتل کرنے کا حریص نہ تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ اپنی قوم میں بدخلق مشہور تھا اور سب لوگ اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ میرے لیے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی کافی ہے کہ:''اس شخص پر اللہ کا شدید غضب ہوگا جس نے رسول اللہ کے چہرے کو خون آلود کیا۔''(طبری:۳/ ۲۰)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے شاگرد مقسم روایت کرتے ہیں کہ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عتبہ کے حق میں بد دعا کی تھی کہ سال گزرنے سے پیشتر وہ بہ حالت کفر مر جائے گا۔'' چنانچہ عتبہ ایک سال کے اندر اندر کافر ہونے کی حالت میں مر گیا۔ یہ بھی مروی ہے کہ جنگ بدر کے بعد حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے عتبہ پر قابو پا کر اس کا سر اڑا دیا تھا۔(رواہ الحاکم فی المستدرك) اور سیرة ابن هشام (ص:۳۸٦)۔

❷ سیرة ابن هشام(ص:۳۹۳)، مسند احمد ۱۰/ ٤٦۳)، مطولاً

❸ حیح مسلم، کتاب الایمان، باب کون الاسلام۔ یهدم ما قبله(حدیث:۱۲۱)

﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ﴾ (الانفال:۳۸)

''جولوگ کافر ہیں، ان سے فرمائیں کہ اگر وہ باز آ جائیں تو ان کے سابقہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔''

صحیح مسلم میں حضرت عبدالرحمٰن ابن شماسہ سے مروی ہے؛ فرماتے ہیں: کہ ہم عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے جب وہ مرض الموت میں مبتلا تھے؛ وہ بہت دیر تک روتے رہے اور چہرہ مبارک دیوار کی طرف پھیر لیا۔ ان کے بیٹے ان سے کہہ رہے تھے کہ: ''اے ابا جان آپ کیوں رو رہے ہیں؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو [جنت کی] بشارت نہیں سنائی؟ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ادھر متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ:

''ہمارے نزدیک سب سے افضل عمل اس بات کی گواہی دینا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوائے کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اور مجھ پر تین دور گزرے ہیں ایک دور تو وہ ہے جو تم نے دیکھا کہ میرے نزدیک اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی مبغوض نہیں تھا اور مجھے یہ سب سے زیادہ پسند تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قابو پا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دوں۔ اگر میری موت اس حالت میں آ جاتی تو میں دوزخی ہوتا۔ پھر جب اللہ نے میرے دل میں اسلام کی محبت ڈالی تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یا رسول اللہ! اپنا دایاں ہاتھ بڑھائیں تاکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کروں۔'' جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے عمرو کیا بات ہے؟''

میں نے عرض کیا: ایک شرط ہے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا شرط ہے؟

میں نے عرض کیا: ''یہ شرط کہ کیا میرے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے عمرو کیا تو نہیں جانتا کہ اسلام لانے سے گزشتہ سارے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ اور ہجرت سے گزشتہ سارے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ اور حج کرنے سے بھی گزشتہ سارے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔'' [صحیح مسلم: جلد اول: ح321]

صحیح بخاری میں ہے کہ: جب حضرت معاویہ کی والدہ ہند حلقہ بگوش اسلام ہوئیں تو اس نے کہا: ''اللہ کی قسم! کرۂ ارضی پر کوئی گھر ایسا نہ تھا جس کے اہل خانہ کا رسوا ہونا مجھے آپ کے اہل خانہ کے رسوا ہونے سے زیادہ عزیز تر ہو اور آج یہ عالم ہے کہ اس کائنات ارضی پر کسی اہل خانہ کا معزز ہونا مجھے آپ کے اہل خانہ کے اعزاز و اکرام سے زیادہ محبوب نہیں۔'' ❶

❶ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار۔ باب ذکر ہند بنت عتبۃ بن ربیعۃ رضی اللہ عنہا، (ح:۳۸۲۵)، صحیح مسلم۔ کتاب الاقضیۃ، باب قضیۃ ہند، (حدیث:۸/ ۱۷۱٤)۔

فصل :......سیف اللہ کون تھا؟

[اعتــراض] : رافضی قلم کار رقم طراز ہے:'' اہل سنت چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عناد رکھتے ہیں، اس لیے ان کے بجائے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سیف اللہ کہہ کر پکارتے ہیں۔ حالانکہ آپ اس لقب کے سب سے زیادہ حقدار تھے۔ آپ نے اپنی تلوار سے کئی کافروں کو قتل کیا۔ اور آپ کی وجہ سے دین اسلام کو ثابت قدمی نصیب ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے بارے میں فرمایا تھا کہ:''علی رضی اللہ عنہ اللہ کی تلوار اور اس کا تیر ہیں۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے برسر منبر فرمایا تھا:'' میں اعدائے دین کے لیے اللہ کی تلوار ہوں؛ اور اس کے اولیاء کے لیے اس کی رحمت ہوں۔''

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ہمیشہ دشمن رسول صلی اللہ علیہ وسلم رہے اور آپ کی تکذیب کرتے رہے۔ غزوۂ احد میں مسلمانوں کے شہید کرنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک توڑنے کی ذمہ داری بھی خالد پر عائد ہوتی ہے۔ آپ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کے قتل کا سبب بنے۔ جب خالد رضی اللہ عنہ نے اظہار اسلام کیا تو نبی کریم رضی اللہ عنہ نے اسے بنی جَذِیمہ کی طرف بھیجا تا کہ ان سے صدقات وصول کرے۔ خالد نے اس راہ میں خیانت کی۔ امر رسول کی خلاف ورزی کی اور مسلمانوں کو قتل کرایا۔ یہ دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرام میں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے' آپ نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے ہوئے تھے؛ یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی۔ آپ دعا کر رہے تھے:'' اے اللہ! جو کچھ خالد نے کیا میں اس سے براءت کا اظہار کرتا ہوں۔'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بعد اس قوم کی طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا تا کہ وہ ان کے نقصان کی تلافی کر سکیں۔ اور آپ کو حکم دیا کہ ان لوگوں کو راضی کر کے آئیں۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جـــواب]: حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو''سیف اللہ'' قرار دینا صرف آپ کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ بلا ریب حضرت خالد رضی اللہ عنہ ''سیف من سیوف اللّٰہ'' اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہیں' جنہیں اللہ تعالیٰ نے مشرکین پر مسلط کیا تھا۔ آپ کو اس نام سے ملقب کرنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔[1] سب سے پہلے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لقب سے ملقب فرمایا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ:'' جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت زید و جعفر و ابن رواحہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی شہادت کی خبر ملی تو آب دیدہ ہو گئے، پھر فرمایا:

'' زید نے جھنڈا سنبھالا؛ اور وہ شہید ہو گئے۔ پھر ان کے بعد جعفر نے جھنڈا تھاما؛ وہ بھی شہید ہو گئے۔ ان کے

---

[1] صحیح الجامع الصغیر ؛ ۳/ ۱۰۵؛ و ذکر السیوطي أن ابن عساکر أخرجه عن ابن عمر ؛ و الحدیث في المسند ۱/ ۱۷۳ ؛ رقم ۷۳۔ وفیــہ: بیشک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید کو مرتدین کے خلاف جنگوں میں علمبردار بنایا۔ اور فرمایا:'' بیشک میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؛ آپ فرما رہے تھے:''' بیشک بہترین انسان اور بہترین قبیلہ سے تعلق رکھنے والے خالد بن ولید ہیں؛ وہ اللہ تعالیٰ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہیں جنہیں اللہ عزوجل نے کفار اور منافقین پر مسلط کر دیا ہے۔'' اس حدیث کو شیخ أحمد شاکر نے صحیح کہا ہے۔ دیکھو: مجمع الزوائد ۹/ ۳٤۸ ؛ وذکر الألباني في سلسلة الأحادیث الصحیحة ۳/ ۲٤۱ ؛ برقم ۱۲۳۷ ؛ رواہ ابن عساکر ۵/ ۲۷۱؛۔

بعد ابن رواحہ نے جھنڈا سنبھالا وہ بھی شہید ہوگئے ۔[یہ بیان کرتے ہوئے] آپ کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ اس کے بعد اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار (حضرت خالد رضی اللہ عنہ) نے جھنڈے کو تھاما تو اللہ تعالیٰ نے فتح مرحمت فرمائی۔'' ❶

اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ ❷ کے علاوہ اور کوئی شخص سیف اللہ نہیں ہوسکتا، بلکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ''سیوف اللہ'' اور بھی ہیں۔اور آپ ان جملہ تلواروں میں سے ایک ہیں۔اس میں شبہ نہیں کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے دیگر صحابہ کی نسبت زیادہ کفار کو جہنم واصل کیا۔آپ غزوات میں ہمیشہ نیک فال رہے۔فتح مکہ سے پہلے اور واقعہ حدیبیہ کے بعد اسلام لائے؛ آپ' عمرو بن العاص اور شیبہ بن عثمان نے بیک وقت اسلام قبول کیا اور ہجرت کی سعادت حاصل کی ۔آپ جب سے اسلام لائے اسی وقت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سپہ سالار مقرر کرنا شروع کیا۔آپ نے غزوہ مؤتہ میں شرکت کی ۔جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

''تمہارا امیر زید ہوگا۔اگر وہ قتل کردیے جائیں تو پھر جعفر؛ اور اگر وہ بھی قتل ہوجائیں تو پھر عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ ۔''

یہ واقعہ فتح مکہ سے پہلے کا ہے۔اسی وجہ سے فتح مکہ کے موقع پر ان لوگوں کا نام نہیں ملتا۔جب یہ امراء شہید کردیے گئے تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے بغیر امارت کے جھنڈا سنبھالا ۔تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ پر فتح دی ۔غزوہ مؤتہ کے موقع پر آپ کے ہاتھ میں نو تلواریں ٹوٹیں ۔آخر میں ایک یمانی تلوار آپ کے ہاتھ میں باقی رہی۔'' ❸

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر امیر مقرر فرمایا؛ اور آپ کو عزیٰ نامی بت گرانے کے لیے مہم پر روانہ فرمایا ۔ اور پھر آپ کو بنی جذیمہ کی طرف روانہ فرمایا۔اس کے علاوہ بھی کئی مہمات آپ کو تفویض کیں۔اور کبھی کبھار آپ سے کوئی ایسا کام ہو جاتا جس کا انکار کیا جاتا۔جیسا کہ بنی جذیمہ کے موقع پر آپ سے ہوگیا۔ یہ حقیقت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی جذیمہ کے ساتھ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے فعل سے اظہار براءت کیا۔ ❹ البتہ انھیں معزول نہیں کیا۔ بلکہ

---

❶ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ موتة من ارض الشام، (حدیث:٤٢٦٥)

❷ حضرت خالد بن ولید اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نے اپنی مرضی سے ہجرت کی تھی۔آپ کے والد مکہ کے عظیم رئیس تھے۔اور آپ وہاں فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔آپ نے عیش و مسرت کی زندگی کو لات مار کر اقامت حق کی خاطر عازم مدینہ ہوئے،تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو مخاطب کرکے فرمایا:'' مکہ نے اپنے جگر پارے تمہارے یہاں پھینک دیے ہیں۔'' سیرۃ ابن ہشام (ص:٤٨٤) مستدرك حاکم(٣/ ٢٩٧-٢٩٨)اگر حضرت خالد اپنی عظیم فتوحات کی بنا پر جنت اور تاریخ اسلام کے اوراق میں بقاء دوام سے بہرہ ور ہیں تو اس میں شبہ نہیں کہ وہ جن احوال وظروف میں اسلام لائے اور نبی کریم نے ان پر مدح وستائش کے پھول نچھاور کیے ان کی بنا پر دینی و دنیوی مجد شرافت میں وہ اس سے زیادہ خلود و دوام سے بہرہ ور ہیں۔

❸ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب عزوۃ موتة فی ارض الشام، (حدیث:٤٢٦٥)۔

❹ صحیح بخاری، کتاب المغازی ، باب بعث النبی ﷺ خالد بن الولید...... (حدیث:٤٣٣٩)

آپ اپنی امارت پر برقرار رہے۔بنی جذیمہ کے موقع پر آپ کے اور جناب حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے مابین اختلاف ہوگیا تھا۔یہاں تک کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا:

''میرے اصحاب کو برا نہ کہو۔مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے!اگر کوئی تم میں سے احد پہاڑ کے برابر سونا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرے تو میرے اصحاب کے ایک مد(سیر بھر وزن) یا آدھے کے ثواب کے برابر بھی نہیں پہنچ سکتا۔'' [صحیح بخاری:جلد دوم:ح ۸۸۷]

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مرتدین کے خلاف جنگ میں امیر لشکر مقرر فرمایا۔آپ نے شام اورعراق کے علاقے فتح کیے۔دشمن کے خلاف جنگوں میں آپ کا کردار بہت اہم رہا ہے؛ جس کا کسی کو بھی انکار نہیں ہوسکتا۔بلاشبہ آپ دشمن کے خلاف اللہ کی تلواروں میں سے ایک برہنہ تلوار تھے؛ جسے اللہ تعالیٰ نے مشرکین پر مسلط کردیا تھا۔

[اعتراض]:رافضی قلمکار کہتا ہے:''حضرت علی رضی اللہ عنہ اس لقب کے سب سے زیادہ حق دار تھے۔''

[جواب] : پہلی بات:......یہ بھی درست ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ''سیوف اللہ'' میں سے ایک سیف تھے،اس میں تنازع کی گنجائش ہی کیا ہے؟ صحیح بخاری کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی تلواریں کئی ایک ہیں۔اوراس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان میں سے بڑے معزز اور عظیم مرتبت والے ہیں۔مسلمانوں میں ایک انسان بھی ایسا نہیں ہے جو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر فضیلت دیتا ہو۔اور کسی نے یہ وصف حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کیساتھ ہی مختص نہیں کیا۔آپ کے لیے یہ لقب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:''بیشک خالد اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہیں۔''

دوسری بات:......حضرت علی رضی اللہ عنہ علم وفضل، فصاحت و بلاغت اور سبقت اسلام کی بنا پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے افضل تھے۔آپ کی منزلت اس چیز سے بہت بلند ہے کہ آپ کا مقابلہ کسی تلوار سے کیا جائے۔حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ میں جہاد وقتال کے سوا علم و بیان' دین وایمان اور سبقت اسلام اور دیگر بھی بہت سے فضائل ایسے تھے جن کی وجہ سے آپ کی شان اس امر سے بہت بلند ہوجاتی ہے کہ آپکی صفت صرف اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہونا قرار دیا جائے؛تلوار کا کام صرف لڑنا ہے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جملہ فضائل و اوصاف میں سے ایک وصف قتال بھی تھا۔جبکہ حضرت خالد کا خصوصی اور امتیازی وصف قتال تھا۔آپکو نہ ہی سبقتِ اسلام کی فضیلت حاصل ہے' نہ ہی کثرت علم اور بہت بڑا عابد وزاہد ہونے کی۔ہاں آپ جنگ وقتال میں باقی لوگوں پر فائق تھے؛ یہی ان کی وجہ فوقیت ہے اوراسی بنا پر آپ کو سیف اللہ کا لقب ملا۔

[شبہ]:رافضی کا قول ہے:''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی تلوار سے کئی کفار کو قتل کیا۔''

[جواب] :اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے کچھ کفار کو قتل کیا ہے۔جیسا کہ دیگر مشہور جنگجو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی قتال کیا؛ جیسے حضرت عمر' حضرت زبیر؛ حضرت حمزہ ؛ حضرت مقداد؛ حضرت ابوطلحہ؛ اورحضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہم اجمعین

اور دیگر صحابہ کرام۔ ان میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے اپنی تلوار سے کفار کی ایک جماعت کو قتل نہ کیا ہو۔ براء بن مالک رضی اللہ عنہ ہی کو لیجیے۔ انھوں نے میدان مبارزت میں سو آدمیوں کو قتل کیا تھا۔ یہ تعداد ان لوگوں کے علاوہ ہے جن کے قتل میں شریک ہوئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابوطلحہ کی آواز لشکر میں ایک جماعت سے بہتر ہے۔''[2]

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ہر ایک نبی کا ایک حواری ہوتا ہے' اور میرا حواری زبیر ہے۔''[3] یہ دونوں احادیث صحیح ہیں۔

مغازی میں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے احد کے دن ؛ جبکہ آپ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے تلوار کے بارے میں فرمایا تھا: ''اسے بغیر مذمت کے دھوڈالو۔'' فرمایا: ''اگر تم نے اچھا کیا ہے تو فلاں اور فلاں نے بھی تو اچھا کیا ہے۔''[4]

حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: [رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا]:

''بیشک اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں جو اگر اللہ کے نام پر قسم اٹھالیں تو اللہ تعالیٰ اسے پورا کرتا ہے' ان میں سے براء بن مالک بھی ہے۔''[5]

غزوات میں لوگ حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ سے گزارش کیا کرتے تھے : اے براء! اپنے رب کی قسم اٹھایئے' تو آپ کفار کے خلاف فتح کے لیے اپنے رب کی قسم اٹھاتے ؛ اور اللہ تعالیٰ فتح و کامرانی سے نوازتے۔ پھر جب آپ نے آخری غزوہ میں شرکت کی تو یوں دعا کی : ''اے اللہ! تیرے نام کی قسم اٹھا کر تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ جب تو کفار کی گردنوں کو ہمارے قبضہ میں دے دے تو سب سے پہلے مجھے شہادت نصیب فرما۔'' اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو خلعت شہادت سے سرفراز فرمایا۔

دعا سے بھی جنگ ایسے ہی لڑی جاتی ہے جیسے ہاتھ سے لڑی جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کیا تم رزق دیے جاتے ہو' اور مدد کیے جاتے ہو' مگر تمہارے کمزور لوگوں کی وجہ سے ؛ ان کی دعاؤں ان کی التجاؤں اور ان کے اخلاص کی وجہ سے۔'[6]

---

[1] مصنف عبد الرزاق، ۹٤٦۹) ، طبرانی(۱۱۷۸، ۱۱۷۹)، مستدرك حاكم(۳/ ۲۹۱)

[2] مسند احمد(۳/ ۲۰۲)، طبقات ابن سعد(۳/ ۵۰۵)، مستدرك حاكم (۳/ ۳۵۲، ۳۵۳)

[3] البخاری ۲/ ٤/ ۲۷۔مسلم ٤/ ۱۸۷۹۔

[4] مختصر سيرة لابن هشام ۳/ ۱۰٦۔

[5] رواه البخاری ۳/ ۱۸٦۔ ومسلم ۳/ ۱۳۰۲۔

[6] البخاري:٤/ ۳٦ ؛ كتاب الجهاد، باب من استعان بالضعفاء والصالحين في الحرب۔ سنن النسائي:٦/ ۳۷، كتاب الجهاد، باب الاستنصار بالضعيف المسند ط. المعارف:۳/ ۵۱ ، وقال: الشيخ احمد شاكر رحمه الله في تعليقه: إسناده ضعيف لانقطاعه . وقال ابن حجر في فتح الباري:٦/ ۸۸ .

آپ ﷺ فقراء مہاجرین سے فتح کے لیے دعاء کروایا کرتے تھے۔اس سب کے باوجود جناب سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ جیسے کتنے ہی لوگوں سے افضل ہیں۔تو پھر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے افضل کیوں نہ ہوں گے؟ ❶

[شبہ]: رافضی کا کہنا ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کی تلوار اور اللہ کا تیر ہیں۔''

[جواب] : یہ روایت حدیث کی معروف کتابوں میں کہیں بھی موجود نہیں۔اور نہ ہی اس کی کوئی معروف سند ہے۔ اس کا معنی بھی باطل ہے۔اس لیے کہ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی اللہ تعالیٰ کا تیر اور اس کی تلوار نہیں ہیں۔مصنف کی اس عبارت سے یہ جملہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے محصور اور خاص لگتا ہے۔

جو صحیح روایت ہے وہ کچھ اس طرح ہے: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے غزوہ حنین کے موقع پر یوں ارشاد فرمایا تھا:

''اللہ کی قسم! ہرگز نہیں؛ اب ہم ایسے آدمی کے پاس جائیں گے' جو اللہ کے شیروں میں سے ایک شیر ہے' وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے لڑے گا؛ اور ہم اسے مقتول کا مال دیں گے۔''

مزید برآں ہم کہتے ہیں کہ: اگر اس جملہ سے مقصود یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اکیلے ہی اللہ کی تلوار اور اس کا تیر ہیں؛ تو پھر یہ دعوی باطل ہے۔اور اگر اس سے مقصود یہ ہے کہ آپ بھی اللہ کی تلواروں میں ایک تلوار اور تیروں میں سے ایک تیر ہیں' تو پھر اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان اس سے کئی درجہ بڑھ کر ہے؛ یہ تو آپ کے جملہ اوصاف میں سے ایک وصف ہے۔

[شبہ]: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ آپ نے برسر منبر فرمایا تھا:

''میں اعدائے دین کے لیے اللہ کی تلوار ہوں؛ اور اس کے اولیاء کے لیے اس کی رحمت ہوں۔''

[جواب]: یہ ایسی روایت ہے جس کی نہ ہی کوئی سند پائی جاتی ہے اور نہ ہی اس کی صحت کا کوئی اعتبار ہے۔لیکن اگر آپ نے ایسا فرمایا بھی ہو تو اس کا معنی بالکل صحیح ہے۔اور یہ قدر آپ کے اور دوسرے صحابہ کرام کے درمیان مشترک ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ ﴾ [الفتح ۲۹]

''وہ کافروں پر بڑے سخت ہیں اور آپس میں بہت مہربان ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ ﴾ [المائدۃ ۵۴]

''وہ مؤمنین پر بڑے نرم اور کافروں کے لیے بڑے سخت ہیں۔''

مہاجرین و مجاہدین میں سے ہر ایک دشمن پر اللہ کی تلواروں میں سے تلوار اور اللہ کے اولیاء کے لیے بڑے نرم و بردبار تھے۔ یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی یہ دعوی کرے کہ میں اکیلا اللہ کی تلوار ہوں' اور میں اکیلا اولیاء اللہ کے لیے رحمت

---

❶ ذکر الزمخشری فِی کتابِہِ " الفائِقِ فِی غرِیبِ الحدِیثِ:۲/ ۲۴۶ ؛ ط . عِیسی الحلبِی: ۱۹۴۷ ، ۱۳۶۶؛ النبی ﷺ ان یستفتِح بِصعالِیكِ المهاجِرِین ، أی یفتتِح القِتال تیمناً بِهِم وقِیل: یستنصِر بِهِم ؛ وذکر ابن الأثِیرِ کلاما مقارِبا فِی " النِهایۃِ " .

ہوں۔ یہ ایسا جھوٹ ہے جس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو منزہ ماننا واجب ہے۔

ہاں اگر اس قول سے یہ مقصود ہو کہ دوسروں کی نسبت کامل تھے؛ اور اس میں حصر کمال کے لیے ہو تو پھر ایسا کہنا صحیح ہے؛ اس لیے کہ آپ اپنے زمانے میں دوسروں سے بڑھ کر کامل تھے۔ ورنہ یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غیض وغضب کفار کے لیے دوسروں سے بڑھ کر تھا۔ اور آپ سے مسلمانوں کو فائدہ بھی زیادہ پہنچا۔ یہ بات ہر وہ انسان جانتا ہے جو ان دونوں خلفائے کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی سیرت سے واقف ہو۔ اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مبارک دور میں تمام مسلمانوں کے لیے ان کے دین و دنیا میں وہ رحمتیں اور برکتیں حاصل ہوئیں جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں حاصل نہ ہوسکیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں مشرکین' اہل کتاب اور منافقین پر جو غلبہ و رعب حاصل تھا' وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں نہ ہوسکا۔ یہ بات خاص و عام سبھی لوگ جانتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں مؤمنین کو وہ رحمت اور برکت نہ مل سکی جو اس سے پہلے حضرت ابو بکر' حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے دور میں ملی تھی۔ بلکہ آپس میں لڑتے اور ایک دوسرے پر لعنت کرتے رہے۔ کفار پر ان کا کوئی غلبہ اور دسترس باقی نہ رہی۔ بلکہ کفار ان پر ہاتھ اٹھانے کے لیے طمع کرنے لگے۔ اور کئی شہر اور علاقے مسلمانوں سے چھین لیے گئے۔ تو پھر کوئی یہ کیسے گمان کرسکتا ہے کہ [کفار کیساتھ جنگ و قتال کے] اس وصف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ جناب حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما سے بڑھ کر اور فائق تھے۔

پھر یہ کہ رافضیوں کے قول میں انتہائی سخت تضاد بیانی پائی جاتی ہے۔ ایک طرف تو وہ کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی مدد کرنے والے اور آپ کے ناصر ہیں؛ اگر آپ نہ ہوتے تو یہ دین قائم نہ ہوتا۔ پھر دوسری طرف آپ کو انتہائی عاجزی ولاچاری اور پستی سے موصوف کرتے ہیں۔

[اعتراض]: رافضی کہتا ہے: ''حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کے دشمن رہے اور آپ کو جھٹلاتے رہے۔''

[جواب]: یہ اسلام لانے سے پہلے تھا۔ جیسے باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین بنی ہاشم اور غیر بنی ہاشم اسلام لانے سے قبل رسول اللہ ﷺ سے دشمنی رکھتے تھے اور آپ کو جھٹلاتے تھے؛ جیسے ابوسفیان' ربیعہ؛ حمزہ؛ اور عقیل وغیرہ۔

[حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی اجتہادی غلطی پر اعتراض]:

[اعتراض]: نبی کریم رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد کو بنی جَذِیمہ کی طرف بھیجا تاکہ ان سے صدقات وصول کریں۔ خالد نے اس راہ میں خیانت کی؛ اور امر رسول کی خلاف ورزی کی اور مسلمانوں کو قتل کرایا۔ یہ دیکھ کر نبی کریم ﷺ اپنے صحابہ کرام میں خطبہ دینے کیلئے کھڑے ہوئے' آپ نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی' آپ دعا کررہے تھے: ''یا اللہ! جو کچھ خالد نے کیا میں اس سے براءت کا اظہار کرتا ہوں۔'' پھر نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان لوگوں کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ ان کے نقصان کی تلافی کریں' اور ان کو راضی کر دیں۔''

[جــواب] :اس عبارت کے نقل کرنے میں جہالت اور تحریف کا عنصر موجود ہے جو کہ کسی بھی سیرت کے عالم پر مخفی نہیں۔ فتح مکہ کے بعد سرکار دو عالم ﷺ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو قبیلہ بنی جذیمہ سے لڑنے کے لیے مامور فرمایا۔ انھوں نے اَسْلَمْنَا (ہم اسلام لائے) کی بجائے صَبَانَا (ہم صابی ہو گئے) کہنا شروع کیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اسے اسلام پر محمول نہ کیا اور ان کو قتل کر دیا۔ [1] یہ ان کی اجتہادی غلطی تھی۔ بڑے بڑے صحابہ کرام جیسے سالم مولی ابی حذیفہ عبداللہ بن عمر اور دیگر نے اس فعل پر انکار کیا تھا' اور جب نبی کریم ﷺ تک یہ خبر پہنچی تو آپ نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے ؛اور یہ دعا فرمائی: ''اے اللہ! جو کچھ خالد نے کیا میں اس سے براءت کا اظہار کرتا ہوں۔'' اس لیے کہ آپ کو خوف محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں اللہ تعالیٰ آپ سے یہ پوچھ لے کہ ان لوگوں پر زیادتی کیوں کی؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

﴿فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ﴾ [الشعراء ۲۱۶]

''پھر اگر وہ آپ کی نافرمانی کریں تو فرما دیں کہ بے شک میں اس سے بری ہوں جو تم کرتے ہو۔''

پھر نبی کریم ﷺ نے کچھ مال دے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا اور انھوں نے نصف دیت ادا کر دی۔ جو مالی نقصان ہوا تھا اس کی تلافی کی۔ یہاں تک کہ کتا جس برتن سے پانی پیتا ہے اس کی قیمت بھی ادا کی [2] اور پھر ان کا باقی مال بھی انہیں واپس کر دیا تا کہ ان کا کچھ مال باقی نہ رہ جائے۔ مگر اس کے باوجود حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو امارت سے معزول نہیں کیا۔ بلکہ آپ کو برابر امیر مقرر کیا جاتا رہا اور لشکروں کی قیادت آپ کے سپرد کی جاتی رہی۔ اس لیے کہ جس امیر سے کوئی غلطی یا گناہ ہو جائے تو اسے رجوع کرنے کا حکم دیا جاتا ؛ اور اسے اس کی ولایت پر باقی رکھا جاتا۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی حکم عدولی نہیں کی تھی، بلکہ وہ آپ کے حد درجہ اطاعت کیش تھے۔ البتہ آپ فقہ فی الدین میں دوسرے صحابہ کی منزلت پر نہ تھے؛ اس معاملہ کا حکم آپ پر مخفی تھا۔ اس وجہ سے اس موقع پر ان سے اجتہادی غلطی صادر ہوئی۔

❀ کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ: حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور بنو جذیمہ کے مابین عہد جاہلیت کی رنجش تھی؛ جس کی وجہ سے انہوں نے ان کو قتل کیا؛ اور پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا ایلچی بنا کر بھیجا۔

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بنو جذیمہ روانگی:]

شیعہ کا قول کہ: ''پھر نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ان لوگوں کو راضی کر دیں۔''

جــواب : یہ کلام جہالت پر مبنی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے آپ کو اس لیے بھیجا تھا کہ ان کے ساتھ انصاف کریں' اور ان کے نقصان کی تلافی کریں۔ معاملہ صرف راضی کرنے کا ہی نہیں تھا۔

شیعہ کا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ قول کہ: ''انہوں نے خیانت کی ؛ رسول اللہ ﷺ کے حکم کی مخالفت

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب بعث النبی ﷺ خالد بن الولید...... (ح:٤٣٣٩)۔

[2] سیرۃ ابن ہشام(ص:٥٥٨)۔

کی اور مسلمانوں کو قتل کیا۔''

[جـــواب] : یہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پر جھوٹا الزام ہے۔اس لیے کہ آپ نے عمداً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ خیانت نہیں کی اور نہ ہی آپ کی مخالفت کا ارادہ کیا۔اور نہ ہی ان مسلمانوں کو قتل کیا تھا جو آپ کے نزدیک معصوم تھے۔ لیکن آپ سے یہ غلطی ہوئی۔جس طرح حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے اس شخص کے بارے میں غلطی کی تھی جس نے ''لا الہ الا اللہ'' کہا اور اس کے باوجود حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کر دیا❶ اور جس طرح اس لشکر سے غلطی سرزد ہوئی تھی جس نے بکریوں والے اس شخص کو قتل کر دیا تھا جس نے اپنے اسلام کا اظہار کیا تھا۔ یہ آیت کریمہ اسی موقع پر نازل ہوئی:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَتَبَیَّنُوْا وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓی اِلَیْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِیْرَةٌ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ فَتَبَیَّنُوْا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا﴾(نساء: ۹۴) ❷

''اے ایمان والو! جب تم اللہ کی راہ میں جا رہے ہو تو تحقیق کر لیا کرو اور جو تم سے سلام علیک کرے تم اسے یہ نہ کہہ دو کہ تو ایمان والا نہیں؛ تم دنیاوی زندگی کے اسباب کی تلاش میں ہو تو اللہ تعالی کے پاس بہت سی غنیمتیں ہیں؛ پہلے تم بھی ایسے ہی تھے پھر اللہ تعالی نے تم پر احسان کیا؛ لہٰذا تم ضرور تحقیق اور تفتیش کر لیا کرو، بیشک اللہ تعالی تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔''

حضرت اسامہ بن زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں قبیلہ حرقات کی طرف بھیجا جو قبیلہ جہینہ میں سے ہے۔ہم صبح صبح وہاں پہنچ گئے اور ان کو شکست دے دی۔ میں نے اور ایک انصاری نے مل کر اس قبیلہ کے آدمی کو گھیر لیا جب وہ ہمارے حملہ کی زد میں آ گیا تو اس نے کہا لا اِلٰــہ اِلا الــلّٰـہ۔انصاری تو یہ سن کر علیحدہ ہو گیا؛ لیکن میں نے اسے نیزہ مار کر قتل کر دیا۔ جب ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک اس کی خبر پہنچ چکی تھی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا:

''اے اسامہ! کیا لا اِلہ اِلا اللہ کہنے کے بعد بھی تم نے اسے قتل کر ڈالا؟ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اس نے اپنی جان بچانے کے لئے ایسا کہا تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار یہی فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ مجھے بار بار آرزو ہونے لگی کہ کاش! میں آج سے پہلے مسلمان نہ ہوا ہوتا۔'' [صحیح مسلم:جلد: ۱، ح۲۷۸]

---

❶ صحیح بـخاری، کتاب المغازی۔ باب بعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم اسامۃ بن زید......''(ح: ٤٢٦٩)، صحیح مسلم، کتاب الایمان۔ باب تحریم قتل الکافر بعد قولہ لا الہ الا اللہ، (ح:٦٨).

❷ صحیح بخاری۔ کتاب التفسیر، سورۃ النساء، باب﴿ وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰی اِلَیْكُمْ﴾ (ح٤٥٩١)، صحیح مسلم کتاب التفسیر، باب تفسیر آیات متفرقۃ، (ح: ٣٠٢٥)۔

فصل:......حضرت خالد بن ولید اور مالک بن نویرہ کا واقعہ

[اعتــراض] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:''جب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوگیا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اہل یمامہ سے لڑنے کے لیے لشکر روانہ کیا؛ جنھوں نے اظہار اسلام کے باوجود ۱۲۰۰ آدمیوں کو قتل کر دیا۔ مالک بن نُویرہ کو گرفتاری کی حالت میں قتل کیا گیا' جب کہ وہ مسلمان تھا؛ اور اس کی بیوی سے نکاح کر لیا۔ زکوٰۃ نہ ادا کرنے کی بنا پر بنوحنیفہ کو مرتد قرار دیا؛ جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ انھوں نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو زکوٰۃ نہیں بھیجی تھی اور آپ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ ان کے خون و اموال اور عورتوں کو حلال قرار دیا گیا۔ یہاں تک کہ عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اس کا انکار کیا۔ ان لوگوں نے زکوٰۃ روکنے والوں کو مرتد کا نام دیا۔ اس کے برعکس جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور جنھوں نے مسلمانوں کے خون کو مباح قرار دیا تھا، ان کو مرتد قرار نہ دیا۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

''اے علی! تجھ سے لڑائی کرنا میرے خلاف جنگ آزما ہونا ہے۔''

ظاہر ہے کہ رسول ﷺ کے خلاف صف آرائی کرنے والا اجماعاً کافر ہے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جــواب] :ان سے کہا جائے گا: اللہ اکبر! یہ جھوٹے مرتد؛ مفتری؛ مرتدین کے پیروکار جنھوں نے اللہ' کتاب اللہ' رسول اللہ اور دین اللہ کے لیے اپنی دشمنی کا کھل کر اظہار کیا ہے؛ یہ لوگ دین اسلام سے خارج ہو چکے ہیں' اور اسلام کو پس پشت پھینک دیا ہے۔ یہ اللہ و رسول اور نیک بندوں کی مخالفت کرتے اور اہل ارتداد و شقاق سے الفت و محبت رکھتے ہیں۔ روافض کے ایسے بیانات سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے خلاف روافض کا بغض و عناد کسی طرح ان مرتدین سے کم نہیں جن کے خلاف حضرت صدیق رضی اللہ عنہ صف آراء ہوئے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ اہل یمامہ بنوحنیفہ کے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے؛ جو کہ مشہور مدعی نبوت مسیلمہ کذاب پر ایمان لا چکے تھے۔ مسیلمہ نے نبی کریم ﷺ کی حیات مبارک میں نبوت کا دعوی کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ مدینہ طیبہ آکر اسلام کا اظہار کر چکا تھا۔ پھر جب یمامہ جانے لگا تو اس نے یہ کہا کہ: اگر محمد ﷺ نے اپنے بعد یہ زمام کار میرے سپرد کر دی تو میں اس پر ایمان لے آؤں گا۔ پھر جب یہ انسان واپس یمامہ پہنچا تو اس نے کہنا شروع کر دیا کہ وہ محمد ﷺ کے ساتھ نبوت میں شریک ہے اور یہ کہ نبی کریم ﷺ نے اس بابت اس کی تصدیق کر دی ہے۔ اس بات پر رجال بن عنفوہ نامی انسان نے گواہی بھی دے دی۔

مسیلمہ نے اپنا الگ قرآن تصنیف کیا تھا۔ جس میں یہ کہتا ہے:

۱ ......'' والطاحنات طحناً فالعاجنات عجناً فالخابزات خبزاً إهالة و سمناً إن الأرض بيننا و بين قريش نصفين ؛ ولكن قريشاً قوم لا يعدلون . ''

اس کی جھوٹی وحی میں یہ بھی تھا:

۲......"یَا ضِفْدَعُ بِنْتُ ضِفْدَعَیْنِ نَقِّیْ کَمْ تَنَقِّیْنَ ، لَا الْمَاءَ تُکَدِّرِیْنَ وَ لَا الشَّارِبَ تَمْنَعِیْنَ ، رَاسُكِ فِی الْمَاءِ وَ ذَنْبُكِ فِی الطِّیْنِ ."

۳...... "اَلْفِیْلُ ، وَمَا الْفِیْلُ وَ مَا اَرْدَاكَ مَا الْفِیْلُ ، لَهٗ زَلُوْمٌ طَوِیْلٌ ، اِنَّ ذَالِكَ مِنْ خَلْقِ رَبِّنَا الْجَلِیْلِ ."

مسیلمہ نے جو قرآن مرتب کیا تھا، وہ حد درجہ مضحکہ انگیز اور اس کی حماقت وسفاہت کا آئینہ دار تھا۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ کلام سنا تو فرمایا: ''تمہارے لیے ہلاکت ہو! مسیلمہ تمہاری عقلوں کو کہاں لیے جا رہا ہے، یہ کلام اللہ کا نازل کردہ نہیں۔''

اس کذاب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خط بھی لکھا تھا:

''مسیلمہ رسول اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ کی طرف؛ اما بعد:

''بیشک میں اس امر [نبوت ورسالت] میں آپ کا شریک ہو چکا ہوں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب دیتے ہوئے یہ خط تحریر فرمایا:

''محمد رسول اللہ کی طرف سے مسیلمہ کذاب کی جانب۔''

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اس کی طرف بھیجا۔ آپ نے اپنے ساتھ موجود مسلمان لشکر سے مل کر ان لوگوں سے جنگ کی۔ اس سے پہلے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ طلیحہ اسدی سے قتال کر چکے تھے؛ اس نے بھی جھوٹی نبوت کا دعوی کیا تھا۔ اور اہل نجد کے کچھ گروہ اس کے پیروکار بن گئے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے خلاف مؤمنین کی مدد کی' تو انہیں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس موقع پر جناب حضرت عکاشہ بن محصن اسدی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ اس کے بعد طلیحہ اسدی نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد مؤمنین کا لشکر یمامہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس جنگ میں مؤمنین کو بہت سخت امتحان کا سامنا کرنا پڑا۔ اس جنگ میں خیار [بہترین] صحابہ کرام کا ایک پورا گروہ شہید کر دیا گیا۔ جیسے زید بن خطاب ؛ ثابت بن قیس بن شماس' اسید بن حضیر اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین۔

[[مسیلمہ اس کے علاوہ بڑے بڑے جرائم کا ارتکاب کر چکا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نامہ اعمال میں سب سے افضل عمل یہ لکھا جا چکا ہے کہ آپ نے ان مرتدین سے لڑنے کے لیے بہترین صحابہ کا ایک لشکر بھیجا اور اس کی سپہ سالاری حضرت خالد سیف اللہ کو تفویض کی]]

بہرکیف مسیلمہ کذاب کا دعوائے نبوت، بنوحنیفہ کا اس پر ایمان لانا اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا ان کے خلاف نبرد آزما ہونا تاریخ اسلام کے مشہور واقعات ہیں اور متواتر کی حد تک معروف ہیں۔ عام وخاص سب ان سے آشنا ہیں اور ان کا علم صرف طبقہ خواص ہی تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ لوگ ان واقعات کو جنگ جمل و صفین سے بھی بڑھ کر جانتے ہیں۔ بعض متکلمین نے جنگ جمل وصفین سے انکار کیا ہے، اگرچہ یہ باطل ہے، مگر اہل یمامہ کی لڑائی اور مسیلمہ کے دعوی نبوت سے کسی شخص کو مجال انکار نہیں ہوئی۔ اور یہ کہ مسیلمہ کذاب نے جھوٹی نبوت کا دعوی کیا

تھا؛ اوراسی بنا پر اس سے جنگ لڑی گئی۔

البتہ روافض بنا برعداوت و جہالت ان واقعات سے اسی طرح انکار کرتے ہیں جیسے دیگر تاریخی حقائق سے، شیعہ مندرجہ ذیل مشہور واقعات کوتسلیم نہیں کرتے:

۱۔ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں مدفون ہونا۔

۲۔ شیعہ اس بات کوتسلیم نہیں کرتے کہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو والہانہ محبت تھی۔

۳۔ شیعہ کا دعویٰ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریحاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا تھا۔

۴۔ شیعہ کے نزدیک حضرت زینب، رقیہ اور ام کلثوم رضی اللہ عنہن نبی کریم کی بیٹیاں نہیں تھیں۔❶ بلکہ کہتے ہیں: یہ خدیجہ کی بیٹیاں ہیں جو اس کے پہلے کافر خاوند سے ہیں' جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تھا۔

۵۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیٹی ام کلثوم چھین لی تھی؛ یہاں تک کہ پھر اس سے نکاح کرلیا۔اور یہ کہ یہ شادی اسلام میں غصب ہے۔

۶۔ بعض شیعہ کا قول ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا پیٹ چاک کردیا جس سے آپ کا حمل ساقط ہوگیا۔

۷۔ بقول روافض صحابہ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مکان منہدم کردیا اور اہل خانہ اس کے نیچے دب گئے۔

خلاصہ کلام! اس طرح کے من گھڑت اور جھوٹے قصے بیان کرتے ہیں جن کا جھوٹ ہونا کسی بھی ایسے آدمی پر مخفی نہیں ہوتا جسے تاریخ سے ادنیٰ سی شناسائی ہو۔شیعہ ثابت شدہ تاریخی حقائق کا انکار کرتے اور ان امور کا اثبات کرتے ہیں جو معدوم یا لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ ہیں۔گویا وہ اس آیت کے مصداق ہیں:

﴿وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ﴾ (العنکبوت:۶۸)

''اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا جب حق آئے تو وہ اس کی تکذیب کرنے لگے۔''

روافض صحیح معنی میں مذکورہ بالا آیت کے مصداق ہیں، وہ حق کی تکذیب کرتے اور کذب پر ایمان رکھتے ہیں۔ مرتدین کا بھی یہی حال تھا۔

ان کا دعویٰ ہے کہ ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما اور ان کے اتباع اسلام سے منحرف ہوچکے تھے۔❷ حالانکہ عام وخاص اس حقیقت

❶ شیعہ آج تک اس نظریہ پر مصر ہیں، چنانچہ انھوں نے حال ہی میں ایک کتاب میں جو نجف کے مطبع علویہ میں ۱۳۴۸ھ میں چھپی ہے۔ اس نظریہ کا اثبات کیا ہے۔دیکھیے: کتاب مذکور جلد:۲/۲۹۱)

❷ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے، جس میں مکابرہ ومجادلہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما بلکہ جمیع صحابہ شیعہ کے مخصوص دین سے منحرف تھے اور شیعہ......جیسا کہ وہ خود بھی تسلیم کرتے ہیں......حضرت ابوبکر وعمر اور صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے دین سے مرتد ہوچکے ہیں۔ جو شخص کلمہ توحید کی یگانگت سے دھوکہ کھا کر اس حقیقت کوتسلیم نہیں کرتا، وہ یا تو شیعہ وشیخین کے مذہب ودین کے باہمی فرق وامتیاز سے ناآشنا ہے یا شیعہ کے ساتھ تقیہ کے طریقے پر عمل پیرا ہے جس نے لوگوں کے دین واخلاق کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

سے آ گاہ ہیں کہ وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی تھے جنھوں نے مرتدین کے خلاف جہاد کیا۔

مقام افسوس ہے کہ شیعہ اہل یمامہ کو مظلوم مسلمان قرار دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ انہیں ناحق قتل کیا گیا۔ اور ان لوگوں کے خلاف قتال کے منکر ہیں؛ جس کی بنا پر یہ ثابت ہوسکتا ہے کہ آج کے روافض ان کے خلف ہیں؛ اور وہ مرتدین ان کے سلف تھے۔ اور یہ بھی کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور اس کے ماننے والے ہمیشہ مرتدین سے قتال کرتے ہی رہیں گے۔

فصل:...... بقول روافض اہل یمامہ مرتد نہ تھے

[اعتراض]: شیعہ مصنف کہتا ہے کہ ''بنوحنیفہ نے چونکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو زکوٰۃ نہ دی تھی۔ اس لیے انھیں مرتدین کا نام دیا۔''

[جواب]: یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بنوحنیفہ کے خلاف اس لیے صف آراء ہوئے تھے کہ انھوں نے مسیلمہ کذاب کو نبی تسلیم کیا تھا، اور اس کے نبی ہونے کا عقیدہ رکھتے تھے۔ باقی رہے مانعین زکوٰۃ تو وہ بنوحنیفہ نہ تھے، بلکہ دیگر قبائل تھے۔ مانعین زکوٰۃ کے خلاف جنگ لڑنے میں بعض صحابہ کو شبہ لاحق ہوا تھا۔ البتہ بنوحنیفہ کے خلاف جنگ آزما ہونے میں سب صحابہ یک زبان تھے اور کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا تھا۔ جب کہ مانعین زکاۃ کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: اے خلیفہء رسول اللہ! آپ ان لوگوں سے جہاد کس طرح کریں گے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میں حکم دیا گیا ہوں کہ لوگوں سے جنگ کروں، یہاں تک کہ وہ گواہی دین کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں۔ اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ جب وہ اس کلمہ کا اقرار کرلیں تو مجھ سے اپنے مال اور اپنی جان کو بجز اس کے حق کے بچالیں گے؛ اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا یہ نہیں فرمایا: ''اس کے حق کے ساتھ'' بیشک زکوٰۃ اسلام کا حق ہے۔ اللہ کی قسم! اگر ان لوگوں نے ایک رسی بھی روکی جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں دیا کرتے تھے، تو میں اس کے نہ دینے والوں سے جنگ کروں گا۔'' [1]

ان لوگوں سے اس وجہ سے قتال نہیں کیا گیا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ اگر یہ لوگ اپنے ہاتھوں سے زکوٰۃ ادا کرتے؛ اور خود فقراء و مساکین میں تقسیم کردیتے تو ان کے خلاف جنگ نہ لڑی جاتی۔ یہی جمہور علماء کرام کا قول ہے جیسے کہ حضرت امام ابوحنیفہ؛ امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ۔

ان کا کہنا ہے: اگر کوئی یہ کہے کہ: ہم اپنی زکوٰۃ حکمران کو نہیں دیں گے؛ بلکہ اپنے ہاتھوں سے تقسیم کریں گے۔ تو ان کے خلاف لڑنا جائز نہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کسی ایک سے بھی اپنی اطاعت نہ کرنے کی وجہ سے جنگ نہیں کی۔

---

[1] صحيح بخاري:ح ٢١٦٠؛ ٩/ ٩٣؛ كتاب الاعتصام؛ باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ؛ مسلم ١/ ٥١؛ كتاب الإيمان؛ باب الأمر بقتال الناس حتي يقولوا لا إله إلا الله؛ سنن النسائى ٥/ ١٠؛ كتاب الزكاة؛ باب مانع الزكاة.

اور نہ ہی کسی ایک پر اپنی بیعت کو لازم ٹھہرایا۔ اسی لیے حضرت سعد رضی اللہ عنہ آپ کی بیعت کرنے سے پیچھے رہے' مگر آپ نے انہیں بیعت کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا۔

❀ شیعہ کا یہ کہنا کہ: ''بنوحنیفہ نے چونکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو زکوٰۃ نہ دی تھی؛ اور آپ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس لیے انھیں مرتدین کا نام دیا۔''

❀ **جواب** : ہم کہتے ہیں: یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ اسی طرح یہ دعوی کہ عمر رضی اللہ عنہ نے بنوحنیفہ سے جنگ کا انکار کیا۔ صاف دروغ گوئی پر مبنی ہے۔ [جیسا کہ ابھی سطور بالا میں واضح کیا]۔

[دوبارہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر اعتراض کا جواب]

[اعتـــراض] : شیعہ مصنف رقم طراز ہے:''جن لوگوں نے مسلمانوں کو مباح الدم قرار دیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف نبرد آزما ہوئے، اہل سنت ان کو مرتد نہیں کہتے، حالانکہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سنا ہوا ہے:

((یَا عَلِیُّ حَرْبِیْ حَرْبُكَ وَ سَلْمِیْ سَلْمُكَ .))

''اے علی تیری جنگ میری جنگ ہے' اور تیری صلح میری صلح ہے۔''

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کرنے والا بالاتفاق کافر ہے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جـواب] : یہ دعوی کرنا اہل سنت نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سن رکھی تھی؛ محض کذب و دروغ ہے۔ کس نے یہ بات نقل کی ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہوئی تھی؟ حدیث کی کتب معروفہ میں موجود نہیں اس کی کوئی سند معروف نہیں اور یہ جھوٹی اور موضوع حدیث ہے۔ اگر تسلیم کر لیا جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی موقع پر ایسا فرمایا بھی تھا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سب نے سنا ہو۔ اس لیے کہ جو کچھ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے' تمام لوگ اسے نہیں سنا کرتے تھے [بلکہ وہ صحابہ جو موقع پر موجود ہوتے' وہی سنا کرتے تھے]۔ تو پھر اس وقت کیا کیفیت ہوگی جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی بات کہی ہی نہ ہو۔ اور نہ ہی وہ معروف اسناد کیساتھ منقول ہو۔ بلکہ اس پر مستزاد کہ یہ بھی معلوم ہو جائے کہ یہ روایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ گھڑی گئی ہے۔ اور اس پر تمام اہل علم و محدثین کا اتفاق ہے۔

علاوہ ازیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ جمل و صفین سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی بنا پر نہیں لڑی تھی بلکہ اپنے اجتہاد کی بنا پر لڑی تھی۔ امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں حضرت قیس بن عباد سے نقل کیا ہے' وہ کہتے ہیں: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا: کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے یہ جنگ لڑنے کا عہد لیا تھا یا آپ اپنی مرضی سے جنگ کر رہے ہیں؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:''یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم نہیں بلکہ میری رائے پر مبنی ہے۔''❶

اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف لڑنے والا محارب رسول اور دین اسلام سے مرتد ہوتا تو آپ ان جنگ آزماؤں سے

❶ مسند احمد(۱/ ۱۱٤) و فضائل الصحابة لامام احمد (٤٤٧)، والسنة لعبد الله بن احمد (۱۳۲۷)۔ قیس بن عباد اصحاب علی رضی اللہ عنہ سے ہیں، ان سے روایت کردہ احادیث بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ میں موجود ہیں۔ یہ حضرت حسن بصری کے استاد تھے۔

مرتدین جیسا سلوک کرتے۔ بلکہ بروایات متواترہ آپ سے منقول ہے کہ آپ نے جنگ جمل میں کسی بھاگنے والے کا تعاقب کیا نہ کسی زخمی کو قتل کیا ان کے مال کو مال غنیمت قرار دیا نہ ان کے بچوں کو قیدی بنایا۔آپ نے منادی کرنے والے کو حکم دیا کہ وہ لشکر میں اعلان کرے کہ: بھاگنے والا کا پیچھا نہ کیا جائے۔زخمی کو قتل نہ کیا جائے' اوران کے اموال کو غنیمت نہ بنایا جائے۔اگر یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک مرتد ہوتے تو آپ ان کے زخمیوں کو قتل کرتے' اور بھاگنے والوں کا پیچھا کرتے۔

خوارج نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف یہی اعتراض اٹھایا تھا۔خوارج نے کہا:''اگر آپ کے مخالفین مومن ہیں،تو آپ ان کے خلاف جنگ آزما کیوں ہوئے؟اوراگر کافر ہیں تو ان کی عورتیں اور مال کیوں کر حرام ٹھہرا۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج سے مناظرہ کرنے کے لیے اپنے چچا زاد بھائی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو بھیجا، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے خوارج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''مخالفین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں، اگر تم کہو کہ وہ تمہاری ماں نہیں تو تم نے قرآن کو جھٹلایا اوراگر یہ کہو کہ وہ ہماری ماں ہیں اور تم ان کو قید کرنے اوران سے مجامعت کرنے کو حلال قرار دو تو تم کافر ٹھہرے۔'' ❶

حضرت علی رضی اللہ عنہ اصحاب جمل کے بارے میں فرمایا کرتے تھے:

''وہ ہمارے بھائی ہیں،مگر انھوں نے ہمارے خلاف بغاوت کر دی، اور تلوار نے ان کو گناہوں سے پاک کر دیا۔'' ❷

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انھوں نے فریقین کے مقتولوں کا جنازہ پڑھایا تھا۔اس کے بارے میں تفصیلی گفتگو آگے آرہی ہے۔

''علاوہ ازیں اگر اہل صفین مرتد تھے تو بقول شیعہ امام حسن رضی اللہ عنہ جیسے امام معصوم کے لیے خلافت سے دست برداری اور اسے ایک مرتد کو تفویض کرنا کیوں کر جائز ہوا؟ان کے عقیدہ کے مطابق معصوم نے اسلام کی باگ ڈور ایک مرتد کے سپرد کردی ۔ یہ تو کسی عام مسلمان کا کام بھی نہیں ہوسکتا چہ جائے کہ کوئی معصوم ایسی حرکت کرے؟''

نیز یہ بھی کہا جائے گا کہ:اگر محض حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھی مؤمنین تھے' اوران کے مخالفین مرتد تھے؛ تو اس سے لازم آتا ہے کہ کفاراور مرتد ہمیشہ مؤمنین پر غالب رہے۔جب کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتے ہیں:

﴿إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ﴾ [غافر ۵۱]

---

❶ مسند احمد(۱/ ۸۶۔۸۷) بمعناہ، طبقات ابن سعد(۳/ ۳۲)، معجم کبیر طبرانی (۱۰/ ۳۱۴) مجمع الزوائد(۶/ ۲۳۹)، تاریخ الاسلام للذہبی(عہد الخلفاء: ، ص:۵۸۸۔۵۹۰)

❷ سنن کبریٰ بیہقی(۸/ ۱۸۲)۔

''یقیناً ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد زندگانی دنیا میں بھی کریں گے اور اس دن بھی جب گواہی دینے والے کھڑے ہونگے۔''

نیز اللہ تعالیٰ اپنی کتاب مقدس میں فرماتے ہیں:

﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ o إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنصُورُونَ o وَإِنَّ جُندَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ﴾ [الصافات ۱۷۱۔۱۷۳]

''اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں۔ بیشک یقیناً ان کی مدد کی جائے گی۔اور بیشک ہمارا لشکر ہی غالب رہے گا۔''

اور ایسے ہی اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ﴾ [المنافقون ۸]

''حالانکہ عزت تو صرف اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے ہے۔''

یہ روافض جن کا دعوی ہے کہ ہم مؤمن ہیں یہ ہمیشہ ذلت اور پستی میں رہے ہیں۔[فرمان الٰہی ہے]:

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ﴾

''ان پر ہر جگہ میں ہمیشہ کے لیے ذلت مسلط کر دی گئی ہے' سوائے اس کے کہ یہ لوگوں کا سہارا لیں۔'' اور کچھ اللہ کی طرف سے انہیں ڈھیل مل جائے۔

[لڑنے والے دونوں فریق مومن ہیں]:

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ ذیل آیت میں فریقین کو آپس میں جنگ و قتال اور زیادتی کے باوجود مومن قرار دیا ہے؛ ارشاد فرمایا:

﴿وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا﴾[1] (الحجرات: ۹)

[1] اہل ایمان سے خطاب کرکے فرمایا کہ: ان کا موقف یہ ہونا چاہئے کہ فریقین جب بھی برسر پیکار ہوں وہ ان کے مابین صلح کرانے کے لیے سعی و جہد کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں۔ کسی شخص میں اصلاح بین المومنین کا جذبہ جس حد تک بھی موجزن ہوگا وہ اس قدر صادق الایمان ہوگا اور وہ اتنا ہی زیادہ روح اسلام اور اس کے غایات و مقاصد سے قریب تر ہوگا۔ اور وہ جس قدر متنازع فریقین کے مابین شقاق و نفاق کا آرزومند ہوگا، اسی قدر ضعیف الایمان اور روح ایمان سے بعید تر ہوگا۔ مختلف مذاہب و ادیان کے لوگ اس کتاب کا مطالعہ کریں گے۔ غیر مسلم قاری جب جملہ اختلافی مباحث کے بارے میں اہل سنت وشیعہ کے رجحانات و میلانات کا موازنہ کرے گا تو وہ یہ دیکھ کر حیران ہوگا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپ کے برادران کرام صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان جو اختلافات پائے جاتے ہیں شیعہ کی ہر ممکن کوشش ہوگی کہ وہ شدت وحدت اور الحاح و اصرار سے ان کو بڑھاتا اور پھیلاتا چلا جائے۔ اس کے عین برعکس اہل سنت اس امر میں کوشاں ہوں گے کہ حکمت و دانش اور رفق و انصاف کو کام میں لاکر فریقین کے درمیان کوئی عذر شرعی تلاش کیا جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ دونوں فریق حق سے دور نہیں۔ نیز یہ کہ یہ واقعات خارجی عوامل و اسباب کے تحت وقوع پذیر ہوئے۔ جن میں سب سے بڑا مؤثر اہل فتنہ کا وجود نامسعود ہے۔ اہل سنت ہمیشہ اتحاد و یگانگت اور موافقت و مطابقت کا پہلو اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو مومن خالص اور زیر تبصرہ آیت کا⇦⇦⇦

''اگر مومنوں کے دو گروہ لڑ پڑیں تو ان دونوں کے مابین صلح کرا دیجیے۔''

صحیح حدیث میں یہ بات رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

مسلمانوں کے مابین تفرقہ بازی کے وقت ایک فرقہ کا ظہور ہوگا' اور ان دو گروہوں میں سے ان کو وہ لوگ قتل کریں گے جو حق کے زیادہ قریب ہوں گے۔'' [مسلم ۲/ ۷٤٥؛ سنن ابو داؤد ٤/ ۳۰۰]

سرور کائنات ﷺ نے فرمایا: ''میرا یہ بیٹا (حضرت حسن رضی اللہ عنہ) سردار ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں کے مابین صلح کرائے گا۔''❶

نیز سرور کائنات ﷺ نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: ''اے عمار! تجھے باغی گروہ قتل کرے گا۔'' یہ نہیں فرمایا کہ: ''تجھے کافروں کا گروہ قتل کرے گا۔'' [یہ حدیث پہلے کئی مقامات پر گزر چکی ہے]

یہ احادیث مبارکہ اہل علم کے ہاں صحیح ہیں' اور متعدد اسناد سے روایت کی گئی ہیں۔ ان میں سے کوئی حدیث بھی دوسری روایت سے تعارض نہیں رکھتی۔ ان احادیث کے مضمون سے یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خبر دی ہے کہ یہ دونوں متفرق گروہ مسلمان ہوں گے اور اس انسان کی مدح کی ہے جس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ ان دونوں کے مابین صلح کرائے گا۔ اور یہ بھی خبر دی کہ اسلام سے ایک گروہ نکلے گا' اور انہیں ان دو جماعتوں میں سے وہ لوگ قتل کریں گے جو حق کے زیادہ قریب ہوں گے۔ پھر اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر نواصب (اللہ ان کو رسوا کرے) شیعہ سے کہیں کہ:

'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو مباح الدم قرار دیا اور حصول اقتدار کے لیے جنگ لڑی، حالانکہ رسول ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے لڑنا کفر ہے۔''❷

نبی کریم ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ''میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کو قتل کرتے پھرو۔''❸

⇦ ⇦ اصلی مخاطب تصور کرتے ہیں جب کہ شیعہ اپنے آپ کو اس آیت کا مخاطب تسلیم نہیں کرتے، اس لیے کہ وہ حضرت ابوبکر وعمر اور ان صحابہ رضی اللہ عنہم کی راہ پر گامزن نہیں، جو مسلک محمدی کے سالک تھے۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ اہل سنت صالحین کے وارث ہیں اور شیعہ ان اہل فتنہ کی یادگار ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں شریک تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ شیعہ آج تک اسی ڈگر پر گامزن ہیں اور فتنہ پردازی کے پرانے طریق کار کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ وہی بات ہے جو عبد اللہ بن مصعب بن زبیر نے خلیفہ ہارون الرشید کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہی تھی۔ حضرت عبد اللہ بن مصعب رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: '' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر جن لوگوں نے اعتراضات کیے تھے وہ شیعہ خارجی اور اہل بدعت تھے اور جن لوگوں نے آپ کی حمایت کی تھی وہ وہی لوگ تھے جن کو آج کل اہل سنت والجماعت کہا جاتا ہے۔'' خلیفہ ہارون الرشید نے غور وفکر کے بعد اس بات کو درست پایا اور کہا: ''اس کے بعد مجھے یہ مسئلہ دریافت کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔''

❶ صحیح بخاری، کتاب الصلح، باب قول النبی ﷺ للحسن بن علی رضی اللہ عنہما (حدیث:۲۷۰٤)۔

❷ صحیح بخاری، کتاب الایمان ، باب خوف المؤمن من ان یحبط عملہ، (ح:٤٨) ، صحیح مسلم۔ کتاب الایمان، باب بیان قول النبی ﷺ سباب المسلم فسوق......"(حدیث:٦٤)

❸ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب الانصات للعلماء(ح:١٢١ ، ٧٠٨٠) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان معنی قول النبی ﷺ " لا ترجعوا بعدی کفاراً " (ح:٦٥ ، ٦٦)

تو اس حدیث کی رو سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کافر ٹھہرے۔تمہاری[شیعہ کی] دلیل نواصب کی دلیل سے زیادہ قوی نہ ہوگی۔اس لیے کہ نواصب نے جن احادیث سے استدلال کیا ہے' وہ صحیح روایات ہیں۔ایسے ہی نواصب [روافض سے] یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ: کسی نفس کو قتل کرنا زمین میں فساد پھیلانا ہے۔اور جو کوئی اپنی اطاعت منوانے کے لیے لوگوں کو قتل کرے وہ بلند مرتبہ کی تلاش میں زمین میں فساد پھیلانے والا ہے۔یہی حال فرعون کا تھا۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ (القصص ۸۳)

''یہ آخرت کا گھر، ہم اسے ان لوگوں کے لیے بناتے ہیں جو نہ زمین میں کسی طرح اونچا ہونے کا ارادہ کرتے ہیں اور نہ کسی فساد کا اور اچھا انجام متقی لوگوں کے لیے ہے۔''

جوکوئی زمین میں فساد و سرکشی پھیلائے وہ آخرت میں اہل سعادت میں سے نہیں ہوسکتا۔یا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مانعین زکوٰۃ اور مرتدین سے قتال کی طرح نہیں ہوسکتا۔اس لیے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے انہیں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر قتل کیا تھا؛ نہ کہ اپنی اطاعت پر۔اس لیے کہ زکوٰۃ ان پر فرض تھی۔تو آپ نے ان سے اس کا اقرار کروانے اور ادا کروانے کے لیے قتال کیا۔بخلاف اس کے جو صرف اس وجہ سے قتال کرے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔اسی لیے امام ابوحنیفہ' امام احمد اور دوسرے علماء کرام رحمہم اللہ نے فرمایا ہے:

''جو انسان یہ کہے کہ:'' میں زکوٰۃ ادا کرتا ہوں' مگر حاکم وقت کو نہیں دوں گا[بلکہ خود اپنے ہاتھ سے کسی کو دوں گا] تو امام کے لیے اس کے خلاف جنگ کرنا جائز نہیں۔ ❶

❶ [[اس مسئلہ کی مزید تفصیل منہاج السنہ میں یوں نقل کی گئی ہے]]: واضح رہے کہ فقہائے حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کی ایک جماعت نے مانعین زکوٰۃ اور خوارج سے لڑنے کو باغیوں کے خلاف جہاد و قتال قرار دیا ہے۔ان کے نزدیک جمل وصفین کی لڑائیاں بھی اس میں شامل ہیں۔یہ قول مبنی بر خطا اور امام ابوحنیفہ، مالک، احمد اور دیگر اسلاف کی تصریحات نیز سنت نبوی کے بھی خلاف ہے۔اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوارج سے لڑنے کا حکم دیا تھا اور سب صحابہ اس میں یک زبان تھے۔البتہ جمل وصفین کی لڑائی قتال فتنہ تھی؛ باغیوں کے خلاف جنگ نہ تھی۔اس کے بارے میں آپ نے کوئی حکم دیا نہ اس پر اجماع صحابہ قائم ہوا۔علاوہ ازیں اہل صفین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف لڑائی کا آغاز بھی نہیں کیا تھا۔[اس ضمن میں حضرات صحابہ تین فرقوں میں بٹ گئے تھے۔اس لیے اجماع منعقد نہ ہوسکا۔ایک فریق تو حضرت علی کا معاون تھا اور دوسرا حضرت معاویہ کا۔تیسرا فرقہ جس کے سرخیل عبداللہ بن عمر بن خطاب تھے، اسے فتنہ قرار دیتے اور اس سے کنارہ کش تھے۔یہی وجہ تھی کہ جب تحکیم کے واقعہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو خلافت کی پیش کش کی گئی تو آپ نے معذرت فرمائی۔ان امور میں صحابہ کا اجماع منعقد نہیں ہوا تھا۔'']

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور بعض دیگر علماء باغیوں سے اس وقت لڑنے کی اجازت دیتے ہیں جب وہ حاکم وقت کے خلاف لڑائی کا آغاز کردیں۔امام ابوحنیفہ، مالک اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے نزدیک خلیفہ ان لوگوں سے لڑنے کا مجاز نہیں جو شرعی واجبات ادا کرتے ہوں مگر یہ کہیں کہ ہم فلاں شخص کو زکوٰۃ نہیں دیں گے۔بنابریں قتال مرتدین اور خوارج کے خلاف جہاد و قتال کے مابین فرق و امتیاز ضروری ہے۔البتہ مانعین زکوٰۃ جب زکوٰۃ بالکل ادا نہ کریں اور اس کی فرضیت کے بھی قائل نہ ہوں تو ان کے خلاف صف آراء ہونا خوارج کے مقابلہ میں لڑنے سے زیادہ ضروری ہے۔مزید براں قرآن کریم میں باغیوں کی جس لڑائی کا ذکر کیا گیا ہے وہ سابقاً ذکر کردہ دونوں لڑائیوں سے ⇦⇦⇦

یہ ایسا مسئلہ ہے جس میں فقہاء کے مابین اختلاف ونزاع ہے۔ پس جو لوگ حکمران کی اطاعت ترک کرنے پر قتال کو جائز قرار دیتے ہیں' وہ اس جنگ کو بھی جائز کہتے ہیں۔ یہ فقہاء کی ایک جماعت کا قول ہے' اور امام شافعی سے بھی منقول ہے۔ اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے ترک کے علاوہ کسی چیز پر قتال کو جائز نہیں سمجھتے' اور نہ ہی کسی متعین شخص [حاکم] کی اطاعت ترک کرنے پر قتال کو جائز سمجھتے ہیں' وہ ان لوگوں سے قتال کو بھی جائز نہیں سمجھتے۔

پس جملہ طور پر خلاصہء کلام یہ ہے کہ: جن لوگوں سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے قتال کیا' وہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت سے رکے ہوئے تھے اور آپ کے لائے ہوئے پیغام کو نہیں مانتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ مرتد ٹھہرے۔ بخلاف ان لوگوں کے جو اس کا اقرار کرتے ہیں؛ لیکن کسی متعین شخص کی اطاعت کو تسلیم نہیں کرتے؛ جیسے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور اہل شام۔ اس لیے کہ یہ لوگ ان تمام چیزوں کو مانتے تھے جو رسول اللہ ﷺ لیکر آئے تھے۔ نماز قائم کرتے تھے' زکوٰۃ ادا کرتے تھے۔ اور کہتے تھے: ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت میں داخل ہوئے بغیر بھی واجبات ادا کریں گے۔ ایسا کرنے میں ہمیں ضرر لاحق ہوگا۔ تو پھر کہاں یہ لوگ اور کہاں وہ لوگ؟ [تو شیعہ اس کے جواب میں نواصب کو کیا کہیں گے؟]

[مانعین زکواۃ اور فقہاء کا مؤقف]:

یہ جان لینا چاہیے کہ فقہائے کرام جن کا تعلق امام ابوحنیفہ؛ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے اصحاب سے ہے؛ وہ خوارج اور مانعین زکواۃ سے جنگوں کو باغیوں کے خلاف جنگیں قرار دیتے ہیں۔ اور وہ جمل اور صفین کو بھی اسی باب سے شمار کرتے ہیں۔ یہ قول کبار ائمہ اسلام کے قول کے خلاف ہے؛ اور امام مالک؛ احمد اور ابوحنیفہ اور دیگر ائمہ سلف رحمہم اللہ سے وارد منصوص کے بھی خلاف ہے۔ اور نبی کریم ﷺ سے وارد سنت کے بھی مخالف ہے۔ بیشک آپ ﷺ نے خوارج سے جنگ کرنے کا حکم دیا تھا؛ اور اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا بھی اتفاق تھا۔ جبکہ جمل اور صفین کی جنگیں فتنہ کی

⇐⇐⇐ بالکل مختلف ہے اور وہ قتال کی تیسری جداگانہ قسم ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے باغیوں سے ابتداء لڑنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ ان کی اصلاح کا حکم دیا ہے، حالانکہ مرتدین اور خوارج کے بارے میں شرعی حکم اس سے مختلف ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا جنگ جمل و صفین باغیوں کے خلاف لڑی گئیں یا ان کو قتال فتنہ قرار دیا جائے۔ جس میں بیٹھ رہنے والا کھڑے ہونے والے سے بہتر ہے۔ صحابہ میں سے جو لوگ ان میں شریک نہیں ہوئے تھے اور وہ جمہور اہل حدیث ان کو قتال فتنہ ٹھہراتے ہیں۔

ان کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ اگر اصحاب معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کرنے کی بنا پر باغی ہو گئے تھے تو مذکورہ آیت میں ان کے جنگ آزما ہونے کا حکم موجود نہیں اور اگر فرض کیا جائے کہ وہ جنگ کے بعد باغی ہوگئے تھے تو صلح کرانے والا کوئی نہ تھا۔ امام ذہبی کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ حضرت عمار والی حدیث میں کہ ''تجھے باغی جماعت قتل کرے گی'' ان کو باغی قرار دیا ہے۔ یہ ایسے مباحث ہیں جن کی بنا پر اصحاب معاویہ کی تکفیر ہرگز درست نہیں۔ ایک مرتبہ ابوموسیٰ منبر پر لوگوں کو یہ حدیث سنا رہے تھے، اسی دوران اشتر نخعی نے چند آدمیوں سمیت دارالامارۃ پر قبضہ کرلیا۔ جب ابوموسیٰ دارالامارۃ کی طرف لوٹے تو اشتر نے یہ کہہ کر داخل ہونے سے روک دیا کہ ''ہماری امارت کو چھوڑ دو۔'' ابوموسیٰ فتنہ بازی کی یہ زندگی چھوڑ کر عروض نامی گاؤں میں عزلت گزیں ہو گئے، جب لوگ خون ریزی سے سیر ہو گئے اور انھوں نے محسوس کیا کہ ابوموسیٰ جنگ سے روکنے میں حق بجانب تھے تو انھوں نے حضرت علی سے مطالبہ کیا کہ ابوموسیٰ تحکیم کے معاملہ میں اہل عراق کے نمائندہ ہوں۔ چنانچہ حضرت ابوموسیٰ کو گوشہ عافیت سے اٹھا کر لایا گیا اور آپ نے ایک ناصح کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کیا۔

جنگیں تھیں۔ اس بارے میں نہ ہی اللہ اور رسول کا کوئی حکم تھا اور نہ ہی اجماع صحابہ۔ جب کہ مانعین زکواۃ سے جنگ؛ جب کہ وہ بالکل زکواۃ کی ادائیگی یا اس کی فرضیت کو تسلیم کرنے سے انکار کررہے ہوں؛ تو یہ خوارج کے ساتھ قتال سے بڑا جہاد ہے۔

اہل صفین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ شروع نہیں کی تھی۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور دیگر حضرات باغیوں سے قتال کو اس وقت تک جائز نہیں سمجھتے جب تک وہ امام سے برسر پیکار جنگ نہ ہوجائیں۔ ایسے ہی امام احمد؛ امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہم اللہ ان لوگوں سے قتال کو جائز نہیں کہتے جو واجب ادا کرتے ہوں؛ لیکن کسی وجہ سے انکار کررہے ہوں۔ مثلاً وہ یہ کہیں کہ: ہم فلاں کو زکواۃ نہیں دیتے؛ [بلکہ خود ادا کریں گے]۔ تو اس صورت میں مرتدین اور خوارج کے درمیان جنگ کے لیے فرق کرنا پڑتا ہے۔ قرآن کریم میں مذکور باغیوں سے جنگ ایک تیسری قسم ہے؛ جو کہ پہلی دونوں اقسام میں سے نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے باغیوں سے جنگ شروع کرنے کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ حکم یہ دیا ہے کہ جب اہل ایمان کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے مابین صلح کروادو۔ جبکہ مرتدین اور خوارج کا یہ حکم نہیں ہے۔ جب کہ جمل اور صفین کی لڑائیوں کی بابت اختلاف ہے؛ کیا ان سے جنگ باغیوں کے ساتھ جنگ ہے جس کا حکم قرآن میں دیا گیا ہے۔ یا پھر فتنہ کی جنگ تھی جس میں بیٹھا ہوا انسان کھڑے انسان سے بہتر ہوتا ہے۔ پس اس جنگ سے بیٹھ رہنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ؛ جمہور اہل سنت محدثین ؛ ائمہ فقہاء؛ اور ان کے بعد والے کہتے ہیں: یہ فتنہ کی جنگیں تھیں۔ یہ باغیوں کی ساتھ جنگ نہیں تھی جس کا حکم قرآن کریم میں دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے باغی اہل ایمان سے؛ محض ان کی بغاوت کی وجہ سے جنگ کی ابتداء کرنے کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ حکم یہ دیا ہے کہ جب دو اہل ایمان لڑ پڑیں تو ان کے مابین صلح کرادیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَاِنْ بَغَتْ اِحْدَاهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى ﴾ (الحجرات: ۹)

''اگر ایک فریق دوسرے پر ظلم و تعدی کا مرتکب ہو تو [اس سے لڑو]۔''

یہاں پر ضمیر کا مرجع اہل ایمان کے وہ دو گروہ ہیں جو آپس میں لڑ پڑے ہیں۔ اس کا مرجع وہ مؤمن گروہ نہیں جو کسی سے لڑا ہی نہیں۔ تو تقدیر عبارت یوں ہوگی: ﴿ فَاِنْ بَغَتْ اِحْدَى الطائفتين المؤمنين المقتتلين عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الباغية حَتّٰى تَفِيْءَ اِلٰى اَمْرِ اللّٰهِ ﴾ ''اگر دو متحارب اہل ایمان گروہوں میں سے ایک فریق دوسرے پر ظلم و تعدی کا مرتکب ہو تو اس ظلم کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ حکم الٰہی کی جانب واپس آجائے۔''

پس جب کوئی گروہ باغی تو ہو مگر وہ لڑ نہ رہا ہو؛ تو اس آیت میں ان سے جنگ کرنے کا حکم کہیں بھی نہیں۔

پھر یہ فرمان الٰہی: ﴿فَاِنْ بَغَتْ اِحْدَاهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى﴾ (الحجرات: ۹)

''اگر ایک فریق دوسرے پر ظلم و تعدی کا مرتکب ہو تو......'' اگر اصلاح کے بعد یہ ظلم و زیادتی ہو یہ حکم تاکیدی ہوجاتا ہے۔ اگر جنگ سے بعد میں مقصود حاصل ہوسکتا ہو۔

پس دریں صورت حضرت امیر معاویہ اور ان کے اصحاب نے جنگ سے پہلے زیادتی تو کی کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی۔لیکن اس آیت کریمہ میں کوئی ایسا حکم نہیں ہے کہ جو کوئی زیادتی تو کر رہا ہو مگر جنگ نہ کر رہا ہو؛ اس سے جنگ لڑی جائے۔اگر ان کی یہ زیادتی لڑائی اور صلح کے بعد ہوتی تو ان سے لڑنا واجب ہو جاتا۔مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔کسی ایک نے بھی ان کے مابین صلح نہیں کروائی۔یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے وقوع فتنہ کے وقت ارشاد فرمایا تھا:''لوگوں نے اس آیت پر عمل کو ترک کر دیا۔''

جب ان کی زیادتی لڑائی کے بعد اور اصلاح سے پہلے تھی۔تو یہاں سے اس قتل کے جواز کا نقطہ نکالا جاتا ہے۔اور اسی قدر اس جنگ کے دوران ہوا بھی۔اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھی ڈگمگا گئے؛ اور وہ ثابت قدم نہ رہ سکے؛ اسی لیے انہوں نے قرآنی مصاحف بلند کر لیے۔پس جس حالت میں انہیں جنگ کرنے کا حکم تھا؛ اس میں تو انہوں نے جنگ نہیں کی۔اور جب انہوں نے جنگ کی ؛ اس وقت وہ اس حکم کے مخاطب نہ تھے۔اگر وہ لوگ باغی اور زیادتی کار تھے؛ تو یہ بھی اپنی ذمہ داری میں متساہل اور کوتاہ عمل تھے۔اسی لیے انہیں عاجزی اور پستی کا سامنا کرنا پڑا؛ اور تفرقہ کا شکار ہو گئے۔ اور امام وقت کو ایسے لوگوں کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم نہیں ہوتا۔

خلاصہ کلام! اس بحث کے انتہائی دقیق امور کو تلاش اور بیان کرنا اہل علم میں سے خاص لوگوں کا کام ہے؛ بخلاف اس کے کہ ان کی تکفیر میں کلام کیا جائے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایسا معاملہ ہے جس کی خرابی کو کثیر دلائل کی بنا پر خواص اور عوام سبھی جانتے ہیں۔

جنگ جمل وصفین کی شرعی حیثیت:

❁ شیعہ مصنف کی پیش کردہ حدیث:''اے علی تجھ سے لڑائی مجھ سے جنگ آزما ہونے کے مترادف ہے۔''

❁ **جواب** :اس روایت کا کذب اس بات سے ظاہر ہے کہ اگر حرب علی،حرب رسول ہوتی تو جنگوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کامیابی ناگزیر تھی،اس لیے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء ورسل کی نصرت وتائید کا کفیل ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ﴾ [غافر ۵۱]

''یقیناً ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد زندگانی دنیا میں بھی کریں گے اور اس دن بھی جب گواہی دینے والے کھڑے ہوں گے۔''

نیز فرمایا:﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ o اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ o وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ ﴾ [الصافات ۱۷۱۔۱۷۳]

''اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں۔بیشک یقیناً ان کی مدد کی جائے گی۔اور بیشک ہمارا لشکر ہی غالب رہے گا۔''

اس آیت کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ اگر مذکورہ حدیث صحیح ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعداء ہمیشہ مغلوب

ہوتے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ خوارج جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے قتال کا حکم دیا تھا' وہ حقیقت میں اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے والوں میں سے بھی تھے۔ ان کے خلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نصرت حاصل ہوئی جیسے رسول اللہ ﷺ اور دیگر مرسلین علیہم السلام کے دور میں ان کے مخالفین پر مدد کی جاتی تھی۔ اگر چہ ان جنگوں میں بہت بڑے امتحان کا بھی سامنا کرنا پڑا؛ مگر آخر میں اچھا انجام کار مؤمنین کے حق میں ہی ہوتا۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جنگ رسول اللہ ﷺ کی جنگ ہوتی تو آخر کار آپ کو فتح و کامرانی ضرور نصیب ہوتی۔ حالانکہ ایسا ہوا نہیں۔ بلکہ آخر میں آپ نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے جنگ بندی اور صلح کرنا چاہی۔ اور معاملہ ویسے ہی ہوا جیسے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ شروع میں چاہتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ: یہ جنگ وقتال؛ اگر چہ اس کی بنیاد اجتہاد پر تھی؛ مگر یہ ایسی جنگ بھی نہیں تھی کہ اس جنگ کے لڑنے والوں کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے لڑنے والے سمجھ لیا جاتا۔ اور پھر اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے والے تھے؛ تو ان محاربین کا حکم راہزنوں کا حکم ہوتا ہے؛ اگر یہ مسلمان ہوں تو انہیں کافر نہیں کہا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تفسیر میں لوگوں کا اختلاف ہے:

﴿اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا﴾ (المائدۃ ۳۳)

''ان لوگوں کی جزا جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد کی کوشش کرتے ہیں، یہی ہے کہ انھیں بری طرح قتل کیا جائے، یا انھیں بری طرح سولی دی جائے۔''

کیا یہ آیت کفار کے بارے میں ہے یا مسلمانوں کے بارے میں؟ جو لوگ کہتے ہیں: یہ آیت مسلمانوں کے بارے میں ہے؛ وہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا فرمان یہ ہے:

﴿اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ﴾ (المائدۃ ۳۳)

''ان لوگوں کی جزا جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد کی کوشش کرتے ہیں، یہی ہے کہ انھیں بری طرح قتل کیا جائے، یا انھیں بری طرح سولی دی جائے، یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مختلف سمتوں سے بری طرح کاٹے جائیں، یا انھیں اس سرزمین سے نکال دیا جائے۔''

اگر یہ لوگ کفار اور مرتد ہوتے تو صرف ان کے ہاتھ کاٹنے یا ملک بدر کرنے پر اکتفا کرنا جائز نہ ہوتا۔ بل ان کا قتل کرنا واجب ہوتا۔ کیونکہ مرتد کو قتل کرنا واجب ہے۔

ایسے ہی جو کوئی اپنے محاربہ میں متأول اور مجتہد ہو تو وہ کافر نہیں ہوتا۔ جیسے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا اس مسلمان کو تأویل کی بنا پر قتل کرنا؛ اس وجہ سے آپ کافر نہیں ہوئے۔ اور اگر کوئی کسی معصوم مسلمان کے قتل کرنے کو حلال سمجھتا ہو؛ تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔ یہی حال مؤمن کی تکفیر کرنے والے کا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

''جب کوئی انسان اپنے بھائی سے کہتا ہے: یا کافر؛ تو وہ دو باتوں میں سے ایک کے ساتھ لوٹتا ہے۔''[1]

مگراس کے باوجود اگر وہ یہ جملہ تأویل کی بنیاد پر کہے تو وہ کافر نہیں ہوگا؛ جیسے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا تھا:

''مجھے اجازت دیجیے میں اس منافق اوراس کے ساتھیوں کی گردن اڑا دوں۔''

اورحضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے واقعہ افک میں کہا تھا:

''بیشک تم منافق ہو؛ منافقین کی طرف سے جھگڑا کر رہے ہو۔''

فصل:...... بقول شیعہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ شیطان سے بدتر ؟

[کج فہمی]: شیعہ مضمون نگارلکھتا ہے:''بعض فضلاء نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ:''معاویہ رضی اللہ عنہ شیطان سے بدتر تھے، کیونکہ شیطان نے تو کچھ نیکیاں بھی انجام دی تھیں، اس کے برخلاف معاویہ اعمال صالحہ سے محروم تھے۔ البتہ میدان معصیت میں شیطان کیساتھ تھا۔ علماء کے ہاں مسلّم ہے کہ ابلیس سب فرشتوں سے زیادہ عبادت کرتا تھا۔اوراس نے چھ ہزار سال تک تنہا عرش معلیٰ کو اٹھائے رکھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا' اورانہیں زمین میں خلیفہ بنایا۔اوراسے سجدہ کرنے کا حکم دیا، تو یہ تکبر کرکے ملعون ومردود ٹھہرا۔ مگر معاویہ رضی اللہ عنہ اسلام لانے تک مشرک اورصنم پرست رہا' یہاں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فتح کے ایک لمبے عرصہ بعد اسلام قبول کیا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بنا برکبر خلیفہ [امام] نہ مان کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے تکبر کیا' حالانکہ تمام لوگوں نے آپ کی بیعت کرلی تھی ؛ اورآپ کو مسند خلافت پر بیٹھا دیا تھا؛ لہٰذا وہ ابلیس سے بدتر ٹھہرا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ یہ کلام جہالت وضلالت کا آئینہ داراور دین اسلام اور ہر دین سے خروج ہے۔ بلکہ اس عقل سلیم کے بھی منافی ہے جو بہت سارے کفار کو میسر ہوتی ہے۔اس کی وجوہات کسی بھی غور کرنے والے پر مخفی نہیں رہ سکتیں۔

[پہلی بات]: بلاشبہ ابلیس لعین سب کفار سے بڑا کافر ہے، بلکہ سب کافر اس کے اتباع اور کشتۂ ضلالت ہیں۔ پس جو کوئی بھی جہنم میں داخل ہوگا' وہ اس کے اتباع کاروں میں سے ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَاَمۡلَاَنَّ جَهَنَّمَ مِنۡكَ وَمِمَّنۡ تَبِعَكَ مِنۡهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ﴾ [ص ۸۵]

''میں ضرور جہنم کو تجھ سے اوران لوگوں سے بھردوں گا، جوان میں سے تیری پیروی کریں گے۔''

شیطان ہر برائی کا حکم دیتا ہے' اوراسے لوگوں کے لیے خوبصورت بنا کر پیش کرتا ہے۔ تو پھر کوئی شیطان سے بڑھ کر برا کیسے ہوسکتا ہے؟ اور پھر خاص کر مسلمانوں میں سے اور خصوصاً صحابہ کرام میں سے؟

---

[1] البخاری ۸/ ۲٦ ؛ کتاب الأدب باب من کفر أخاه بغیر تأویل فهو کما قال ؛ مسلم ۱/ ۷۹ ؛ کتاب الإیمان باب بیان حال إیمان من لأخیه مسلم : یا کافر . سنن الترمذي ٤/ ۱۳۲۔

شیعہ کا یہ کہنا ہے کہ: ''معاویہ رضی اللہ عنہ شیطان سے بدتر تھے، کیوں کہ شیطان نے تو کچھ نیکیاں بھی انجام دی تھیں، اس کے برخلاف معاویہ اعمال صالحہ سے محروم تھے۔ البتہ میدان معصیت میں شیطان کیساتھ تھا۔''

❀ اس جملے کا تقاضا یہ ہے کہ جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے' وہ ابلیس سے بدتر ہو۔ اس لیے کہ اس کا اطاعت میں کوئی سابق یا پیشوا نہیں ہوتا۔ اور وہ میدان معصیت میں اس کا ساتھ دیتا ہے۔ تو پھر اس بنا پر آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد ابلیس سے بدتر ہوں گے۔ بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''تمام کے تمام بنی آدم خطا کار ہیں اور ان میں سے بہترین خطا کار توبہ کرنے والے ہیں۔'' [ترمذی ٤/ ٧٠ ؛ سبق تخریجہ]

پھر کیا اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ: ''مسلمانوں میں سے جو کوئی گناہ کرے وہ شیطان ابلیس سے بھی بدتر ہوگا؟ کیا اس قول کا باطل اور فاسد ہونا دین اسلام میں اضطراری طور پر معلوم نہیں ہے؟ ایسی بات کا کہنے والا یقیناً کافر ہے اس کا کفر دین اسلام میں ضرورت کے تحت معلوم ہے۔

اس قول کی بنیاد پر کہہ سکتے ہیں کہ: شیعہ ہمیشہ گناہ کرتے ہیں۔ تو ان میں سے ہر ایک ابلیس سے بھی بڑھ کر برا ہوگا؟ پھر اگر خوارج کہیں: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے گناہ کیا؛ لہٰذا آپ بھی ابلیس سے برے ہوئے۔'' تو روافض کے پاس آپ کی عصمت کے دعوی کی کوئی دلیل نہ ہوگی۔ اور نہ ہی شیعہ اس پر قادر ہیں کہ [اپنے اصولوں کے مطابق] خوارج کے جواب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایمان' امامت اور عدالت پر حجت پیش کرسکیں۔ تو پھر آپ کے معصوم ہونے پر حجت کیسے پیش کرسکتے ہیں؟۔ لیکن اہل سنت والجماعت اس پر قادر ہیں کہ آپ کے ایمان اور امامت پر حجت قائم کرسکیں۔ اس لیے کہ رافضی جس چیز سے استدلال کرتے ہیں ان میں بہت سارا تناقض اور تعارض پایا جاتا ہے اس وجہ سے ان سے استدلال کرنا باطل ہوجاتا ہے۔ پھر جمہور کے قول پر قرآن کریم سے دلیل بھی قائم ہے؛ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ عَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی﴾ [طه ١٢١]

''آدم سے اپنے رب کی نافرمانی ہوئی اور راہِ راست سے ہٹ گیا۔''

[اگر اسے شیعہ مسلک کے مطابق لیا جائے تو اس سے لازم آتا ہے کہ] آدم علیہ السلام ابلیس سے بھی برے ہوں۔ الغرض ان کے اس عقیدہ کی وجہ سے جو برائیاں پیدا ہوتی ہیں' وہ اعداد و شمار سے بڑھ کر ہیں۔

دوسری بات :......رافضی کا کلام بغیر کسی دلیل کے ہے۔ بلکہ وہ فی نفسہ باطل ہے۔ تم نے یہ کیوں کہا کہ: شیطان سے بدتر وہ ہے اطاعت میں جس کا کوئی سلف نہ ہو' اور میدان معصیت میں اس کے ساتھ ساتھ ہو؟۔ اس لیے کہ شیطان کا ہر میدان معصیت میں مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ ہی اس کا تصور کیا جاسکتا ہے کہ انسانوں میں سے کوئی ایک نافرمانی میں ابلیس کے برابر ہو۔ اور وہ لوگوں کو بہکاتا اور گمراہ کرتا ہو۔

ابلیس کی سابقہ اطاعت ؛ اس کے کفر کی وجہ سے ضائع ہوگئی۔ اس لیے کہ مرتد ہوجانے بعد تمام اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔ پس اگر اس نے اس سے پہلے کوئی اطاعت وفرمانبرداری کے کام کیے ہوں گے تو وہ کفر اور ارتداد کی وجہ سے

باطل ہوگئے اور جو کچھ نافرمانی کے کام کرتا ہے' ان میں اس کا کوئی مماثل و مقابل نہیں۔ تو پھر یہ کہنا غلط ہوا کہ فلاں انسان ابلیس سے بڑھ کر برا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہوسکتی ہے جیسے کوئی انسان مرتد ہوجائے' پھر زنا کرے' لوگوں کو قتل کرے' اور اپنی سابقہ اطاعت گزاری کے بعد انواع و اقسام کے گناہ کرے۔ پس جو شخص اس کے بعد آئے؛ وہ ان ضائع شدہ اطاعات میں اس کے مقام کو نہ پہنچ سکے؛ مگر وہ کچھ محدود گناہوں میں اس کے ساتھ شریک رہے؛ تو ان کی وجہ سے وہ اس سے برا نہیں ہوجائے گا۔ تو پھر کوئی ابلیس سے بڑھ کر برا کیوں ہوسکتا ہے؟۔

اس سے خود شیعہ کے اصولوں پر کاری ضرب لگتی ہے۔ خواہ وہ حق ہوں یا باطل۔ اس سے سب سے کم یہ چیز لازم آتی ہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وہ ساتھی جو آپ سے مل کر برسر پیکار رہتے تھے' وہ کبھی کبھار حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نافرمانی بھی کیا کرتے تھے؛ وہ ان لوگوں سے برے ہوئے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین آپ کی بیعت کرنے سے رک گئے تھے۔ اس لیے کہ ان لوگوں نے اصحاب علی رضی اللہ عنہ سے پہلے اللہ کی بندگی کی؛ جب کہ یہ لوگ میدان معصیت میں ساتھ چلتے رہے۔

تیسری بات:......کون کہتا ہے کہ ابلیس فرشتوں سے زیادہ عبادت گزار تھا؟ [اس کی کیا دلیل ہے کہ] اس نے تنہا عرش کو چھ ہزار سال تک اٹھائے رکھا؟ یا پھر اس کا شمار عرش اٹھانے والوں میں ہوتا تھا؟ یا یہ کہ وہ ''طاؤس الملائکہ'' (فرشتوں کا مور) تھا؟ اور اس نے زمین و آسمان پر کوئی جگہ نہیں چھوڑی جہاں سجدہ نہ کیا ہو اور ایک رکعت ادا نہ کی ہو؟ یا اس طرح کی دیگر باتیں جو عوام الناس میں مشہور کی گئی ہیں؛ ظاہر ہے کہ اس کی اساس نقل صادق پر ہونی چاہیے۔ حالانکہ یہ کسی آیت میں یا صحیح حدیث میں مذکور نہیں۔ تو پھر کیا اس سے کوئی انسان استدلال کرسکتا ہے سوائے اس کے جو اصول دین میں سب سے بڑا جاہل ہو۔

[شبہ] : بڑی عجیب بات تو یہ ہے کہ: ''رافضی مصنف کہتا ہے: ''علماء کے مابین اس بابت کوئی شک نہیں کہ ابلیس ملائکہ سے زیادہ عبادت گزار تھا۔''

[جـــواب] : ہم پوچھتے ہیں کہ: ''یہ بات کس نے کہی؟ صحابہ کرام تابعین عظام میں سے کسی نے یا دیگر علماء کرام نے؟۔ تو پھر چہ جائے کہ یہ دعوی کیا جائے کہ علماء کرام کے مابین متفق علیہ ہے۔ یہ بات ہرگز کسی ایسے مسلمان عالم نے نہیں کہی جس کی بات قابل قبول ہو۔ یہ ایسا معاملہ ہے جس میں صرف منقول پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ جب کہ یہ حکایت کسی طرح بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل نہیں کی گئی؛ نہ ہی کسی صحیح سند سے اور نہ ہی کسی ضعیف سند سے۔ شیعہ مصنف کی افتراء پردازی کا یہ عالم ہے کہ اس جھوٹ کو علماء کے ہاں مسلم قرار دیتا ہے، اگر یہ بات کسی وعظ گو ملا نے کہی ہو یا ترغیب و ترہیب [1] کی کسی کتاب میں درج ہو۔ یا کسی ایسی بے اصل تفسیر میں منقول ہو جو اسرائیلیات سے لبریز ہو تو بھی اس سے

---

[1] یہ وہ کتب ہیں جو عوام کو وعظ سنانے کے لیے ترتیب دی گئی ہیں، ان میں ترغیب و ترہیب پر مشتمل مبالغہ آمیز حکایات ہوتی ہیں، جو تاریخ و تراجم کی کسی کتاب میں مذکور نہیں۔ یہ مبالغہ سنت الٰہی کے منافی ہو یا نہ ہو، البتہ کتاب و سنت کی تصریحات کے ضرور خلاف ہوتا ہے، ان کتب کے مصنفین باسند یا بے سند اور مصادر کا نام لے کر یا نام لیے بغیر جو احادیث بیان کرتے ہیں ان کی صحت کے اثبات میں چشم پوشی سے کام لیتے ہیں کہ یہ احادیث عوام کو وعظ سنانے کے لیے ذکر کی جاتی ہیں، استنباط احکام کے لیے نہیں، حالانکہ ان لوگوں کو احادیث سنانے کی بجائے ان کے سامنے اپنا عملی نمونہ پیش کرنا زیادہ مفید ہوتا ہے، اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ احادیث سنتے تو ان میں سے اکثر کو رد فرما دیتے۔

کسی معمولی بات پر احتجاج کرنا بھی درست نہیں چہ جائیکہ اس بات کی دلیل کے طور پر پیش کیا جائے کہ ابلیس گناہ گار بنی آدم سے افضل تھا اور صحابہ کو ان لوگوں کو شامل کیا جائے جن سے ابلیس بہتر تھا۔

اللہ و رسول ﷺ نے کہیں بھی ابلیس لعین کا ذکر مدح و ستائش کے انداز میں نہیں کیا۔ نہ ہی اس کی سابقہ کی عبادت کی وجہ سے اور نہ ہی کسی دوسری وجہ سے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ اگر اس کی کوئی عبادت تھی بھی؛ تو وہ اس کے مرتد ہونے سے ضائع ہوگئی۔

اس سے بھی عجیب رافضی کا یہ کہنا ہے کہ: ''اکیلے ابلیس نے چھ ہزار سال تک اللہ تعالیٰ کے عرش کو اٹھائے رکھا۔''

سبحان اللہ! کیا یہ بات کسی ایسے مسلمان عالم نے کہی ہے جس کی بات مسلمانوں میں مقبول ہو؟ اور کیا کسی جاہل اور غلو کار کے علاوہ کوئی دوسرا بھی یہ بات کہہ سکتا ہے؟ اگر یہ بات سچ ہوتی تو کسی بھی طرح نبی کریم ﷺ سے ضرور منقول ہوتی۔

پھر اکیلے فرشتہ کا بھی عرش کو اٹھانے کا کہنا صحیح احادیث کے خلاف ہے۔ ابلیس تو حاملین عرش میں بھی شامل نہ تھا، تنہا حامل عرش ہونا تو ایک جداگانہ بات ہے۔ یہ سب یاوا گوئی ہے اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ ابلیس کے جملہ اعمال صالحہ اگر تھے بھی تو وہ ضائع ہو گئے تھے۔ [نیز یہ کس نے کہا کہ: اکیلا ابلیس حاملین عرش میں سے تھا؟] یہ سب سے بڑا اور کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿الَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ [غافر ۷]

''وہ جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ جو اس کے ارد گرد ہیں اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے بخشش کی دعا کرتے ہیں جو ایمان لائے۔''

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اس کا عرش اٹھانے والے کئی فرشتے ہیں' صرف کوئی ایک نہیں ہے۔ اور یہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح بیان کرتے ہیں اور اہل ایمان کی مغفرت کے لیے دعا کرتے ہیں۔

اگر کوئی یہ کہے: ''یہ عرش اٹھائے جانے کے متعلق مطلق ایک خبر ہے۔ اس میں کہیں بھی بیان نہیں ہے کہ وہی حاملین ابھی تک عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں۔''

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا: صحیح روایات میں آیا ہے کہ وہی حاملین عرش ابھی تک اللہ تعالیٰ کے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ عبد اللہ بن صالح اور معاویہ بن صالح سے روایت ہے: ''جب اللہ تعالیٰ نے عرش کو پیدا کیا تو فرشتوں کو عرش اٹھانے کا حکم دیا۔ وہ عرض گزار ہوئے: ہم اس عرش کو کیسے اٹھائیں گے جب کہ اس پر آپ کی عظمت ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''کہو: لا حول و لا قوۃ إلا باللّٰہ'' جب فرشتوں نے یہ کلمہ کہا تو ان میں عرش اٹھانے کی طاقت پیدا ہوگئی۔''

چوتھی بات: ان سے کہا جائے گا کہ: ابلیس نے کفر کیا تھا؛ جیسے اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق خبری دی ہے' فرمایا:

﴿اِلَّآ اِبۡلِیۡسَ اسۡتَکۡبَرَ وَ کَانَ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ﴾ [ص ۷۴]

''سوائے ابلیس کے'اس نے تکبر کیا' اوروہ کافروں میں سے تھا۔''

اگر تسلیم کرلیا جائے کہ اس کے کچھ نیک اعمال بھی تھے' تو اس کے کفر کرنے کی وجہ سے وہ سارے ضائع ہوگئے۔ ایسے ہی باقی لوگوں کا حال ہے؛ جو بھی کفر کریگا اس کے اعمال ضائع کردیے جائیں گے۔ تو پھر ایسے مؤمنین سے تشبیہ کیسی؟

پانچویں بات:......ان سے کہا جائے گا: ''تمہارا یہ کہنا کہ معاویہ شرک وکفر میں ہی رہے یہاں تک اسلام قبول کرلیا۔'' اس سے ان دونوں کے درمیان اجتماع کا فرق واضح ہوجاتا ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کفر کے بعد ایمان لائے؛ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے متعلق فرماتے ہیں:

﴿قُلۡ لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ یَّنۡتَہُوۡا یُغۡفَرۡ لَہُمۡ مَّا قَدۡ سَلَفَ﴾ (الانفال:۳۸)

''آپ کافروں سے فرمائیں کہ اگر وہ باز آجائیں تو ان کے سابقہ گناہ معاف کردیجیے جائیں گے۔''

آپ نے اپنے شرک سے توبہ کی؛ نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے والے بن گئے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَاِنۡ تَابُوۡا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخۡوَانُکُمۡ فِی الدِّیۡنِ ﴾ [التوبۃ ۱۱]

''اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔''

ابلیس نے ایمان کے بعد کفر کیا' جس کی وجہ سے اس کے ایمان والے سارے اعمال ضائع ہوگئے۔ جب کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کفر کے بعد اسلام قبول کیا؛ تو اسلام لانے سے ان کے دور کفر کے تمام اعمال ختم ہوگئے۔ تو پھر ان دونوں کے درمیان موازنہ کیسے کیا جاسکتا ہے جب کہ ایک ایمان لانے کے بعد کافر ہوا؛ اور دوسرا کافر تھا ایمان لے آیا؟

چھٹی بات: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اسلام لانا ثابت ہے۔ اسلام سابقہ تمام گناہوں کو مٹا کر رکھ دیتا ہے۔ اب جو کوئی آپ کے مرتد ہونے کا دعوی کرے؛ اور اس کا جھوٹا ہونا معلوم نہ بھی ہو تب بھی یہ دعوی بغیر کسی دلیل کے ہے۔ تو پھر اس وقت کیا عالم ہوگا جب اس دعویدار کا جھوٹا ہونا معلوم ہو۔ آپ مرتے دم تک اسلام پر قائم رہے۔ جس طرح دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا اسلام پر باقی رہنا معلوم ہے۔ جس ذریعہ سے باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا [مرتے دم تک] اسلام پر قائم رہنا معلوم ہوتا ہے؛ اسی ذریعہ سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا بھی اسلام پر قائم و باقی رہنا معلوم ہوتا ہے۔ شیعہ حضرت ابو بکر وعمر وعثمان و معاویہ رضی اللہ عنہم اجمعین اور دیگر صحابہ کو مرتد قرار دینے میں اسی طرح غلطی پر ہیں جیسے خوارج حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر تصور کرنے میں۔ جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر قرار دینے والے جھوٹے ہیں' ایسے ہی ان باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو کافر و مرتد قرار دینے والوں کا جھوٹ بالکل واضح اور ظاہر ہے۔ اس لیے کہ ان لوگوں کے ایمان پر باقی رہنے کی دلیل صاف واضح اور ظاہر ہے۔ اور خوارج کا شبہ روافض کے شبہ سے زیادہ قوی ہے۔

ساتویں بات:......اگر اس دعوی کو سچ تسلیم کرلیا جائے تو اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور دیگر کے

لیے قدح واہانت ہے جو کہ کسی پر بھی پوشیدہ نہیں۔[شیعہ صحابہ کو مرتد قرار دیتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ] حضرت علی رضی اللہ عنہ ہمیشہ مرتدین کے مقابلہ میں مغلوب رہے۔ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے خلافت سے دستبردار ہو کر اسے مرتدین کو تفویض کر دیا۔ جبکہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مرتدین کو مغلوب و مقہور کیا تھا۔ تو نتیجہ یہ ہوا کہ کفار کے خلاف نصرت الٰہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بجائے ہمیشہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے شامل حال رہی۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ عادل ہے ؛ وہ کسی ایک پر بھی ظلم نہیں کرتا۔ تو پھر نتیجہ یہ ہوگا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا فتح و نصرت کا استحقاق حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر تھا۔ اس وجہ سے وہ اللہ کے ہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل ٹھہرے۔

یہی نہیں، بلکہ حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے لشکر اور نائبین کافروں پر غالب و فاتح رہے ؛ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مرتدین کی سرکوبی سے عاجز رہے ؛ یہ مرتدین بھی کفار ہی تھے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں :

﴿وَ لَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [آل عمران ۱۳۹]

''اور نہ کمزور بنو اور نہ غم کرو اور تم ہی غالب رہو گے، اگر تم مومن ہو۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ﴾ [محمد ۳۵]

''پس نہ کمزور بنو اور یہ کہ صلح کی طرف بلاؤ اور تم ہی سب سے اونچے ہو اور اللہ تمھارے ساتھ ہے اور وہ ہرگز تم سے تمھارے اعمال کم نہ کرے گا۔''

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے ملک کی حفاظت نہ کر سکے [اور ہر طرف سے شورشوں کے مقابلہ میں عاجز آ گئے] تو انہوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے اس شرط پر صلح طلب کی کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے علاقہ پر حاکم رہے گا۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ﴾ [محمد ۳۵]

''پس نہ کمزور بنو اور نہ صلح کی طرف بلاؤ اور تم ہی سب سے اونچے ہو؛ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے ؛ اور وہ ہر گز تم سے تمھارے اعمال کم نہ کرے گا۔''

[شیعہ کے مفروضات کے مطابق] اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھی ہی مؤمن تھے' اور ان کے مخالفین مرتد تھے ؛ تو ضروری تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھی غالب رہتے ؛ حالانکہ واقعات حال اس کے خلاف ہیں۔

آٹھویں بات :...... جو کوئی یہ کہتا ہے : ''معاویہ رضی اللہ عنہ نے امیر المؤمنین کو حاکمیت تسلیم کرنے کے حکم میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزاری سے تکبر کیا۔'' [ہم اس سے پوچھتے ہیں] آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ : حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت صحیح ہونے کا علم تھا؟ اور یہ کہ آپ کی اطاعت گزاری ان پر واجب ہے؟ اس لیے کہ آپ کی ولایت کے ثبوت اور اطاعت کے واجب ہونے کی دلیل ان مشتبہ مسائل میں سے ہے جو بحث و نظر کے بعد ظاہر ہوتی ہے۔

بخلاف ان کے کہ جن کی اطاعت پر لوگوں کا اجماع ہو چکا ہے۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس بات کا علم ہو چکا تھا؛ تو [سیاسی مسائل میں] ہر نافرمانی کرنے والا اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے تکبر کرنے والا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ نافرمانی کبھی شہوت کی وجہ سے صادر ہوتی ہے اور کبھی تکبر کی وجہ سے۔ تو پھر کیا یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ ہر نافرمان اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے ایسے ہی تکبر کرنے والا ہے جیسے ابلیس نے تکبر کیا تھا؟

نویں بات:...... [شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بابت کہتا ہے] ''عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد تمام لوگوں نے آپ کی بیعت کی۔'' اگر اس دلیل [اجماع] میں کوئی حجت نہیں تو پھر اس کے ذکر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر یہ حجت ہے تو پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت پر ان تمام کا اجماع تھا اور آپکی بیعت بھی بہت عظیم الشان تھی۔ جبکہ آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اطاعت سے سرکشی کرنے والے کو کافر نہیں کہتے بلکہ اسے مؤمن اور متقی شمار کرتے ہیں۔

دسویں بات:......تمہارے اس قول کے مطابق حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت پر اجتماع زیادہ کامل تھا۔ تم اور دوسرے لوگ کہتے ہو: حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کی خلافت سے ایک مدت تک پیچھے رہے۔ تو تمہارے اس قول کے مطابق حضرت علی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو امام تسلیم کرنے میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک عرصہ تک تکبر کرتے رہے۔ تو تمہاری اس حجت کے مقتضیٰ کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کفر لازم آتا ہے [معاذ اللہ]۔ یا پھر تمہاری یہ دلیل ہی سرے سے باطل ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کفر کا قول باطل ہے؛ تو اس سے لازم ہوا کہ تمہاری دلیل سرے سے باطل ہے۔

گیارھویں بات :...... یہ کہنا کہ: ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد تمام لوگوں نے آپ کی بیعت کی۔'' یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ بہت سارے مسلمان؛ آدھے یا اس سے کچھ زیادہ یا کم آپ کی بیعت میں شریک نہیں ہوئے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم اور دوسرے صحابہ نے آپ کی بیعت نہیں کی۔

بارھویں بات :...... [شیعہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہتا ہے] ''وہ آپ کی جگہ پر بیٹھ گیا۔'' یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے شروع میں اپنے لیے ہرگز خلافت طلب نہیں کی تھی۔ اور نہ ہی آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امارت سے معزول کرنا چاہتے تھے۔ لیکن آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی۔ اور آپ اس علاقے پر والی رہے جہاں کی ولایت حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کے دور میں آپ کے پاس تھی۔ جب فریقین کے درمیان صلح کے لیے جرگہ ہوا تو اس وقت آپ صرف اپنی رعیت کے متولی تھے۔ ہاں اگر اس سے مراد یہ ہے کہ آپ نے اپنے علاقے کا کنٹرول سنبھال لیا؛ تو پھر یہ بات درست ہے۔ لیکن حضرت امیر معاویہ فرمایا کرتے تھے: ''جو چیز آپ کے ہاتھ میں ہے میں اس کے بارے میں آپ سے جھگڑا نہیں کرتا؛ لیکن میرے ہاں کوئی ایسا ثبوت بھی نہیں ہے جس کی روشنی میں مجھ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت گزاری میں داخل ہونا واجب ہوتا ہو۔''

یہ کلام خواہ حق ہو یا باطل؛ مگر اس کے قائل کو ہرگز ابلیس سے برا نہیں کہا جا سکتا۔ پس جو کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو ابلیس سے برا کہتا ہے: تو اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ پر؛ اس کے رسول پر اور اہل ایمان پر جھوٹ گھڑنے والا اور بہتان

تراشی کرنے والا اور خیر القرون پر سرکشی کرنے والا کوئی دوسرا نہیں ھوسکتا۔ اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ:

﴿اِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ﴾ [غافر ۵۱]

''بے شک ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے ضرور مدد کرتے ہیں دنیا کی زندگی میں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے۔''

جب کسی انسان کو ہوا پرستی اس حد تک پہنچادے تو وہ عقل کے دائرہ سے بالکل باہر ہوجاتا ہے۔ چہ جائے کہ اس کے پاس علم اور دین ہو۔ ہم ہر آزمائش سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے ہیں ۔ یہ اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں ایسی باتیں کرنے والوں کو ذلیل و رسوا کرے۔ اور اپنے مؤمن بندوں -اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر- کی نصرت فرمائے۔ اور ان ظالموں اور جھوٹوں کے ظلم سے نجات عطا فرمائے۔

فصل:......اہل سنت پر تعصب کا الزام

[اشکالات] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:''بعض اہل سنت نے اس حد تک غلو سے کام لیا حتی کہ یزید بن معاویہ کو امام تصور کرنے لگے؛ حالانکہ اس نے انتہائی قبیح افعال کا ارتکاب کیا؛ اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کیا؛ ان کے اموال پر قبضہ کرلیا؛ اور عورتوں کو قیدی بنالیا۔ اور اہل بیت خواتین کو ننگے اونٹوں پر سوار کرکے مختلف شہروں میں گھمایا۔ جب کہ زین العابدین کے گلے میں طوق پڑا تھا۔ صرف قتل حسین رضی اللہ عنہ پر ہی اکتفاء نہیں کیا؛ بلکہ آپ کو گھوڑوں کے نیچے کچل ڈالا؛ اور آپ کی پسلیاں توڑ دیں۔ اور آپ کے سر کو نیزے پر اٹھایا گیا۔ حالانکہ مشائخ نے یہ روایت کیا ہے کہ جس دن حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ قتل کیے گئے اس دن آسمان سے خون کی بارش برسی۔ رافعی نے اپنی کتاب ''شرح الوجیز'' میں اور ابن سعد نے ''الطبقات'' میں ذکر کیا ہے کہ: جس دن حسین رضی اللہ عنہ قتل ہوئے اس دن آسمان میں ایک سرخی ظاہر ہوئی جو کہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ: اس دن دنیا میں کوئی ایسا پتھر نہیں اٹھایا گیا جس کے نیچے سے خون نہ نکلا ہو۔ آسمان سے ایسی بارش برسی کہ اس کا اثر کپڑوں میں ان کے ختم ہونے تک رہا۔ امام الزہری فرماتے ہیں :'' قاتلین حسین میں سے کوئی بھی ایسا نہیں بچا جسے دنیا میں سزا نہ مل گئی ہو۔ یا تو اسے قتل کردیا گیا؛ یا پھر وہ اندھا ہوگیا؛ یا اس کا چہرہ کالا ہوگیا؛ یا پھر بہت ہی کم مدت میں اس کی حکومت ختم ہوگئی۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کثرت کے ساتھ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی بابت وصیت فرمایا کرتے تھے۔ اور فرماتے تھے: یہ دونوں تمہارے پاس میری امانت ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿قُلْ لَّا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾ (الشوریٰ ۲۳)

''فرمادیں: میں قرابت داری کی محبت رکھنے کے سوا تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب] : شیعہ مصنف کا یہ قول کہ:''بعض اہل سنت نے اس حد تک غلو سے کام لیا حتی کہ یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کو

امام تصور کرنے لگے۔''

اگر شیعہ مصنف کی مراد یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ یزید بھی ہدایت یافتہ خلفاء راشدین ابو بکر وعمر وعثمان اور علی رضی اللہ عنہم اجمعین کی طرح تھا؛ تو [یہ جان لینا چاہیے کہ] مسلمان علماء میں سے کوئی ایک بھی یہ بات نہیں کہتا۔ اگرچہ بعض جاہل [اور متعصب] لوگ اس طرح کا نظریہ رکھتے ہوں۔ جیسا کہ بعض جاہل کُردوں ﷺ سے نقل کیا گیا ہے؛ جو کہتے ہیں کہ: یزید صحابہ کرام میں سے تھا۔ یا بعض کہتے ہیں: وہ نبی تھا۔ بعض کہتے ہیں: وہ خلفاء راشدین میں سے تھا۔ یہ نظریات رکھنے والے ان قابل اعتماد اہل علم میں سے نہیں ہیں جن کی باتیں قابل نقل وحجت ہوں۔ مگر اس جہالت کے باوجود وہ شیعہ کے جہلاء وملحدین سے بہتر ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے الٰہ ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ یا پھر آپ کو نبی مانتے ہیں۔ یا پھر کہتے ہیں کہ: شریعت کا باطن اس کے ظاہر کے خلاف ہے۔ جیسا کہ اسماعیلیہ' نصیریہ اور دوسرے [شیعہ فرقے] کہتے ہیں کہ: ان کے خواص سے نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج ساقط ہو چکے ہیں۔ یہ لوگ معاد [آخرت] کے منکر ہیں۔ بلکہ ان میں سے غالی لوگ تو خالق کے ہی منکر ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ محمد بن اسماعیل [اسماعیلیہ فرقہ کا امام] محمد بن عبداللہ [رسول اللہ ﷺ] سے بہتر ہے اور اس نے آپ ﷺ کی شریعت کو منسوخ کر دیا ہے۔ اور اپنے ائمہ کے متعلق اعتقاد رکھتے ہیں کہ تمام ائمہ معصوم ہیں۔ ❶

❶ شیخ عدی بن مسافر التوفی (۴۶۷۔۵۵۷) ایک عابد وزاہد شخص تھے انھوں نے دیکھا کہ شیعہ یزید پر طرح طرح کے بہتان باندھتے اور اس کے دین واخلاق پر حملے کرتے ہیں۔ روافض کے اس رویہ سے تنگ آ کر شیخ عدی نے اعلان کر دیا کہ یزید امام تھا اور شیعہ کے سب اتہامات اس کے خلاف کذب ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ ''العدویہ'' میں لکھا ہے کہ شیخ عدی کا مسلک افراط وتفریط سے پاک تھا۔ شیخ عدی کے ایک نائب حسن کے زمانہ میں روافض اتباع عدی کی ایک جماعت پر حملہ آور ہوئے۔ اور عدی کے خلیفہ شیخ حسن کو قتل کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ عدی کے مریدوں نے اس طرح غلو سے کام لینا شروع کیا جس طرح شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کے بارے میں مبالغہ آمیزی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کرد جو شیخ عدی کے مرید تھے یزید کو نبی قرار دینے لگے۔ امام ابن تیمیہ کے زمانہ میں بعض کرد یہی عقیدہ رکھتے تھے۔ شیخ الاسلام نے ان کو راہ راست پر لانے کے لیے ''الرسالہ العدویہ'' تصنیف کیا اور اس میں واضح کیا کہ شیخ عدی نیک آدمی تھے۔ اگر اس وقت زندہ ہوتے تو ارادت مندوں کے اس اغراق ومبالغہ کو ناپسند کرتے۔ ''الرسالہ العدویہ'' کا ایک قدیم ناقص الآخر نسخہ دار الکتب المصریہ میں تاہنوز محفوظ ہے۔ علامہ محقق احمد تیمور پاشا نے الرسالہ العدویہ کے چند فقرے اپنے رسالہ ''الیزیدیت'' میں درج کیے ہیں ہم رسالہ مذکورہ کو دو مرتبہ طبع کرا چکے ہیں۔ آخری مرتبہ یہ ۱۳۵۲ ہجری میں چھپا۔ رسالہ مذکور سے واضح ہوتا ہے کہ کرد یزید کو نبی قرار دیتے ہیں، پھر اس سے بڑھ کر منصب الوہیت پر فائز کر دیا، اس فرقے کا نام ''یزیدیہ'' ہے۔ قبیلہ کرد کی یہ جماعت شمالی عراق کے علاقہ منجار میں بود و باش رکھتی ہے۔ کچھ لوگ روس کے صوبہ اور دمشق وبغداد وحلب کے نواح میں بھی سکونت گزیں ہیں۔ شیخ عدی کردوں کے یہاں جبال ہکار میں جانے سے پیشتر لبنان وشام کے ایک گاؤں میں رہ کر مصروف عبادت رہا کرتے تھے۔ یہ بعلبک کے قریب بیت فار نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ تصوف میں شیخ عبدالقادر جیلانی اور عبدالقاہر سہروردی، عقیل منبجی۔ حماد دبّاس اور ابوالوفا حلوانی کے شاگرد تھے۔ اگر شیخ عدی کے اتباع ان کے طریقہ پر گامزن رہتے تو نہایت ہی صالح مسلمان ہوتے مگر انھوں نے کفر کی حد تک غلو سے کام لیا۔ دراصل ان کا غلوّ روافض کے غلو سے پیدا شدہ اور اس کے توڑ کی کوشش ہے۔

جیسے ان کا مہدی اور اس کی اولاد ؛ مثلاً : معز' حاکم اوران کے امثال۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جولوگ خلفاء بنو امیہ اور بنوعباس کے معصوم ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں[اگر چہ یہ بھی غلط ہے ؛ تاہم] یہ لوگ شیعہ سے کئی وجوہات کی بنا پر بہتر ہیں۔ اس لیے کہ بنوامیہ اور بنوعباس کے خلفاء ظاہری و باطنی طور پر مسلمان تھے۔ ان کے گناہ بھی ایسے ہی تھے جیسے دیگر کسی مسلمان کے گناہ ہوسکتے ہیں ؛ وہ کافر یا منافق نہیں تھے۔

یہ باطنیہ [شیعہ] فرقہ کے لوگ یہود و نصاری سے بڑے کافر ہیں ۔ جوان کے معصوم ہونے کا عقیدہ رکھے وہ ان لوگوں سے بڑھ کر جاہل اور گمراہ ہے جو خلفاء بنوامیہ اور بنوعباس کے معصوم ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ بلکہ اگر کوئی تمام مسلمان بادشاہوں کے معصوم ہونے کا عقیدہ رکھے جو ظاہری و باطنی طور پر مسلمان تھے؛ تو پھر بھی [باطنی شیعہ ان سے بڑھ کر گمراہ ہیں؛ یہ لوگ] ان سے بہتر ہیں جو ان ائمہ کے معصوم ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو جہالت اہل سنت والجماعت کے لوگوں میں پائی جاتی ہے ؛ شیعہ میں پائی جانے والی جہالت اور گمراہی اس سے کئی درجہ بڑھ کر ہے۔ خصوصاً ان [باطنیہ' اسماعیلیہ وغیرہ] کی گمراہی نفاق اور زندیقیت پر مبنی ہوتی ہے نہ کہ جہالت اور تاؤیل کی وجہ سے ۔ جب کہ ان [اہل سنت] میں اس کی وجہ جہالت ہوتی ہے؛ زندیقیت یا نفاق نہیں ہوتے ۔ بلکہ ان کی وجہ بدعات ؛ تاویل یا علم شریعت کی کمی ہوتی ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ کتاب وسنت کا صحیح پیغام جب ان لوگوں کے سامنے آتا ہے تو اپنے سابقہ عمل وعقیدہ سے رجوع کر لیتے ہیں۔ جب کہ ملحدین اپنے باطن میں یہ یقین رکھتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ محمد ﷺ کے لائے ہوئے پیغام کے ساتھ تناقض رکھتا ہے۔ مگر پھر بھی وہ اس مخالفت پر اس لیے کمر بستہ رہتے ہیں کہ ان کا عقیدہ ہے کہ آپ نے اپنے عقل وفضیلت کی بنا پر ناموس [دین کو پوشیدہ اور راز میں] رکھا تھا ۔ پس ہمارے لیے بھی ایسے ہی ناموس رکھنا جائز ہے جیسے آپ نے رکھا تھا۔ [یعنی نبی کریم ﷺ پر دین چھپانے کا الزام لگا کر خود حق بات چھپاتے ہیں]۔ اس لیے کہ ان کے ہاں نبوت ایک کسبی چیز ہے۔ ان کے ہاں نبوت ایسے ہی جیسے علماء وعباد کو حاصل ہونے والی فضیلت ۔ اور شریعت ویسے ہی ہے جیسے کسی عادل بادشاہ کی سیاست ۔ اس بنا پر وہ اس شریعت کو کسی دوسرے امام کی وضع کردہ شریعت سے منسوخ کرنا جائز سمجھتے ہیں ۔ ان کا کہنا ہے :''بیشک شریعت عامہ [عوام الناس ؛ یا اہل سنت] کے لیے ہے ۔ جب کہ ان کے لیے وہی کچھ ہے جس پر باطن میں وہ عمل کرتے ہیں۔ ان سے واجبات ساقط ہو چکے ہیں' اور محرمات ان کے لیے مباح کر دی گئی ہیں ۔

یہ لوگ اور ان جیسے دوسرے لوگ یہود و نصاری سے بڑے کافر ہیں ۔ بلکہ اگر مان لیا جائے کہ کچھ لوگ بنی امیہ یا بنی عباس میں سے کسی ایک عصمت کا عقیدہ رکھتے ہیں' یا [خیال کرتے ہیں کہ] ان کا کوئی گناہ نہیں ؛ یا پھر اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے ان کے گناہوں پر مؤاخذہ نہ کرے گا۔ جیسا کہ بنوامیہ کے بعض اتباع سے نقل کیا گیا ہے کہ خلیفہ کے نیک اعمال قبول کیے جاتے اور برے اعمال سے درگزر کی جاتی ہے۔ یہ لوگ بلاشبہ گمراہ ہیں۔ مگر ان کی گمراہی ان لوگوں کے مقابلہ میں کم ہے جو امام منتظر کی عفت وعصمت کا عقیدہ رکھتے ہیں جو کہ اصل میں معدوم ہے۔ یا ان لوگوں کی عصمت کے قائل ہیں

جنہیں کوئی قوت و اختیار حاصل نہیں جس سے کوئی فائدہ حاصل ہو سکے ۔ اور نہ ہی ان کے پاس کسی عام مسلمان سے بڑھ کر کوئی علم اور دین ہے ۔[جب کہ اس کے برعکس] ان [اہل سنت] کا عقیدہ ہے کہ حاکم کی نیکیاں بھی اتنی زیادہ ہوتی ہیں جو اس کے گناہوں کو ڈھانک لیتی ہیں ۔ اور ایسا ہونا فی الجملہ ممکن ہے ۔ کسی بھی مسلمان کے لیے اس بات کا امکان ہے اس کی نیکیاں اتنی ہوں جو اس کی برائیوں پر غالب آ جائیں ۔ اگر چہ یہ گواہی کسی متعین شخص کے لیے بغیر کسی شرعی دلیل کے نہیں دی جا سکتی ۔ مگر یہ دعوی کرنا کہ مسلمانوں میں کوئی [ایک صاحب شریعت سے] بڑھ کر دیندار اور عالم ہے' اور خطأ سے معصوم ہے ؛ تو یہ نظریہ بالکل باطل ہے ۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی کے لیے بھی معصوم ہونے کا دعوی کرنا قطعی طور پر باطل ہے ۔ اس سے واضح ہو گیا کہ ان لوگوں میں سے جس کسی نے کسی کے معصوم ہونے کا دعوی کیا ہے وہ اپنی جہالت اور گمراہی کے باوجود حق کے زیادہ قریب اور رافضیوں سے کم درجہ کا جاہل ہے ۔ جس انسان نے یزید کے صحابی یا نبی ہونے کا دعوی کیا وہ [گمراہ ہونے کے باوجود] ان رافضیوں سے جہالت و گمراہی میں کم تر ہے جو شیعہ شیوخ کے لیے نبوت و الوہیت کا دعوی کرتے ہیں ۔ خصوصی طور پر اسماعیلیہ اور نصیریہ کے شیوخ ؛ جو کہ یہود و نصاری سے بڑے کافر ہیں' اور ان کے ماننے والے ان کے متعلق الوہیت کا عقیدہ رکھتے ہیں ۔

جب کہ علماء اہل سنت والجماعت کے مقبول و مروی قول کے مطابق ان میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو یزید اور اس جیسے دوسرے خلفاء کو جناب حضرت ابو بکر و عمر و عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین خلفاء راشدین مہدیین کے برابر سمجھتے ہوں ۔ بلکہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ و ایمان اصحاب سنن کی روایت کردہ اس حدیث کے مطابق ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

'' خلافت نبوت تیس سال تک ہوگی پھر ملوکیت کا آغاز ہوگا۔'' [یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے]۔

اگر یزید کی امامت سے مراد یہ ہے کہ وہ دیگر اموی و عباسی خلفاء کی طرح سلطان وقت اور صاحب السیف تھا تو یہ ایک یقینی بات ہے جسے سبھی جانتے ہیں ۔ اور اس کا انکار کرنے والا حقیقت واقعہ کا منکر ہے ۔ یزید کی بیعت اس وقت کی گئی جب ان کے والد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا ۔ اس طرح یزید بلاد شام ؛ مصر' عراق ؛ خراسان اور دیگر علاقوں کا حاکم بن گیا ۔ [1]

---

[1] خلافت یزید کے سلسلہ میں دو باتیں محل فکر و نظر ہیں (۱) آیا یزید منصب خلافت کا اہل تھا یا نہیں؟ (۲) یزید کی نامزدگی ۔
جہاں تک پہلے مبحث کا تعلق ہے، ہم اس پر قبل ازیں اظہار خیال کر چکے ہیں کہ یزید اپنے ننھال قبیلہ قضاعہ کے بدویانہ خیموں میں جرأت و شہامت اور تکلف و تصنع سے پاک و سادہ ماحول میں پروان چڑھا ۔ شیعہ نے اپنی کتابوں میں یزید کی سیرت و سوانح سے متعلق جھوٹ کا جو طوفان باندھا ہے، یہ یزید پر عظیم ظلم ہے ۔ یزید کی سیرت و کردار کے بارے میں حضرت محمد بن حنفیہ کی شہادت کے بعد مزید کسی تصدیق کی ضرورت نہیں ۔ جب حضرت ابن زبیر کا داعی عبداللہ بن مطیع لوگوں کو یزید کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر رہا تھا اور یزید کی جانب ان باتوں کو منسوب کر رہا تھا جو اس میں نہ تھیں مثلاً یہ کہ یزید شراب پیتا ہے ۔ نماز نہیں پڑھتا اور احکام قرآنی سے تجاوز کرتا ہے ۔ یہ سن کر محمد بن علی بن ابی طالب المعروف بہ ابن الحنفیہ نے فرمایا: ⇦⇦⇦

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ سن ٦١ ھ؛ دس محرم کو پیش آیا۔ یہ یزید کی بادشاہی کا پہلا سال تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کسی بھی شہر پر غلبہ حاصل کرنے سے پہلے ہی واقع ہوگئی۔ پھر یزید اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ

⇦⇦⇦ ''تم یزید کے بارے میں جن باتوں کا ذکر کرتے ہو وہ میں نے اس میں نہیں دیکھیں۔ حالانکہ میں نے اس کے یہاں قیام کیا تھا۔ دوران قیام میں نے دیکھا کہ یزید پابندی سے ہمیشہ نماز ادا کرتا۔ نیک اعمال میں پوری دلچسپی لیتا اور فقہی مسائل کا جواب دیتا، اس کے ساتھ ساتھ وہ سنت نبوی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔'' لوگوں نے کہا: ''یزید آپ کو دکھانے کے لیے یہ اعمال انجام دیتا تھا۔'' یہ سن کر امام ابن الحنفیہ نے فرمایا: ''یزید کو مجھ سے کس بات کا خوف یا لالچ تھا کہ اس نے تصنع سے عجز و انکساری کا اظہار کیا؟ کیا تم نے خود اسے شراب پیتے دیکھا ہے؟ اگر تمہارا جواب اثبات میں ہے تو تم شراب پینے میں اس کے شریک ٹھہرے، اور اگر نہیں دیکھا تو علم کے بغیر شہادت دینا تمہارے لیے کیوں کر روا ہے؟'' لوگوں نے کہا: ''اگرچہ ہم نے یزید کو شراب پیتے نہیں دیکھا تاہم یہ بات درست ہے۔'' اس کے جواب میں حضرت ابن الحنفیہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اہل شہادت کے بارے میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے: ﴿ اِلَّا مَنۡ شَهِدَ بِالۡحَقِّ وَ هُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴾ (سورہ زخرف: ٨٦)

میں اس معاملہ میں تم سے بری ہوں۔'' لوگوں نے کہا: ''آپ خلیفہ بننا چاہتے ہیں تو چلیے ہم آپ کو اپنا حاکم تسلیم کرتے ہیں۔''

امام ابن الحنفیہ نے فرمایا: میں حاکم یا محکوم کسی صورت میں بھی لڑائی کو حلال نہیں سمجھتا۔'' لوگوں نے کہا: ''آپ اپنے والد کی حمایت میں لڑ چکے ہیں۔'' ابن الحنفیہ نے فرمایا: ''میرے والد جیسا کوئی شخص لے آؤ، میں اس کی حمایت میں لڑنے سے گریز نہیں کروں گا۔'' لوگوں نے کہا: ''تو اپنے دونوں بیٹوں قاسم اور ابوالقاسم سے کہیے کہ وہ ہمارے ساتھ مل کر دشمن سے لڑیں۔'' ابن الحنفیہ نے کہا: ''اگر میں نے بیٹوں کو لڑائی کا حکم دے دیا تو گویا خود لڑائی میں شریک ہوا۔''

لوگوں نے کہا: ''ہمارے ساتھ کسی جگہ چل کر لوگوں کو جنگ کی رغبت دلائیں۔'' ابن حنفیہ نے کہا: ''سبحان اللہ! میں لوگوں کو ایسی بات کہوں جس پر خود عمل پیرا نہیں اور اسے پسند بھی نہیں کرتا۔'' لوگوں نے کہا: ''تو ہم آپ کو اس بات پر مجبور کریں گے۔''

ابن حنفیہ نے فرمایا: میں تو لوگوں کو اللہ سے ڈرنے اور اس بات کا حکم دوں گا کہ مخلوق کو راضی کرنے کے لیے اللہ کی ناراضگی مول نہ لیں۔'' اس کے بعد ابن حنفیہ عازم مکہ ہوئے۔ (البدایہ والنھایۃ ، لابن کثیر: ٨/ ٢٣٣)

یزید کے حق میں یہ ایک عینی شاہد کی بیان کردہ تاریخی نص ہے۔ ابن حنفیہ ایک ایسے معتبر راوی ہیں کہ اگر ان سے کوئی بھی نص شرعی منقول ہوتی تو سب ائمہ اسلام اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہوتے۔ اس سے بڑھ کر اور کون سا وصف مطلوب ہے کہ ابن حنفیہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جگر گوشہ ہیں۔

صحیح مسلم کی کتاب الامارۃ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ اس ضمن میں عبداللہ بن مطیع کے یہاں گئے، تو اس نے کہا ابوعبدالرحمٰن کے لیے مسند رکھیے۔ حضرت عبداللہ نے کہا: میں آپ کے یہاں بیٹھنے کے لیے نہیں آیا بلکہ ایک حدیث سنانے آیا ہوں جو میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے، آپ نے فرمایا: ''جس نے اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا وہ بروز قیامت اللہ تعالیٰ کو اس حال میں ملے گا کہ اس کے پاس کوئی دلیل نہ ہوگی اور جو شخص بیعت کے بغیر مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔'' (صحیح مسلم۔ کتاب الامارۃ۔ باب وجوب ملازمۃ جماعۃ المسلمین (حدیث: ١٨٥١)

صحیح بخاری کتاب الفتن میں ہے کہ جب اہل مدینہ نے یزید کی بیعت ترک کر دی تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے خدم و حشم اور بچوں کو جمع کیا اور کہا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے: ''ہر دھوکہ باز کے لیے بروز قیامت جھنڈا نصب کیا ⇦⇦⇦

کے مابین جو کچھ واقعات پیش آئے ؛ اور اہل مکہ اور حجاز میں سے جن لوگوں نے حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا۔ آپ کا ظہور یزید کی موت کے بعد ہوا ؛ جب آپ نے خلافت کی طلب شروع کی ۔ اس وقت آپ امیر المؤمنین کہلانے لگے۔ اہل شام کے علاوہ باقی لوگوں نے آپ کی بیعت کر لی ۔ اسی لیے آپ کی ولایت کو یزید کی موت کے بعد سے شمار کیا جاتا ہے۔

⇦⇦⇦ جائے گا۔'' ''ہم اللہ و رسول کے حکم کے مطابق یزید کی بیعت کر چکے ہیں اور میرے نزدیک اس سے بڑا دھوکا اور کچھ نہیں کہ حکم الٰہی کے مطابق ایک شخص کی بیعت کی جائے پھر اس کے خلاف جنگ کا آغاز کیا جائے۔ مجھے جس شخص کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس نے یزید کی بیعت ترک کر کے کسی اور کی بیعت کر لی ہے میں اس سے باز پرس کروں گا۔'' (صحیح بخاری کتاب الفتن۔ باب اذا قال عند قوم شیئاً ثم خرج......''(حدیث:۷۱۱۱)

حافظ ابن کثیر ''البدایہ والنہایة'' (۸/ ۲۲۸) میں امام مدائنی رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے یہاں تشریف لائے، اسی دوران یزید تعزیت کے لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جب یزید چلا گیا تو ابن عباس نے کہا: جب بنو امیہ رخصت ہو جائیں گے تو اہل علم کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ (البدایۃ والنہایۃ :۸/ ۲۲۸)

یہ وہ امور ہیں جو یزید کی صلاحیت امامت، صحابہ کے اس کو تسلیم کرنے اور ابن حنفیہ کی یزید کے حق میں تائید و شہادت سے متعلق ہیں۔ ابن حنفیہ نے تصریحاً کہہ دیا کہ یزید کے بارے میں دھوکہ بازوں نے جو کچھ کہا تھا وہ صاف جھوٹ ہے۔

یہ بات ہنوز محتاج غور و فکر ہے کہ حضرت معاویہ نے یزید کو خلیفہ کیوں مقرر کیا جب قریش کے متعدد نوجوان جو یزید کے معاصر تھے اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر اپنے آپ کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے۔ مثلاً سعید بن عثمان بن عفان بلکہ ان سے فروتر درجہ کے لوگ بھی اس منصب کو سنبھالنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ شوریٰ کے ذریعے خلیفہ کا انتخاب ولی عہد نامزد کرنے سے بلاشبہ اولیٰ و افضل ہے۔ مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ اگر اس وقت شوریٰ کے ذریعہ خلیفہ منتخب کرنے کا سوال اٹھایا گیا تو امت میں خون ریزی کا ایسا دروازہ کھلے گا جو اسی وقت بند ہو گا جب قریش میں ولایت و خلافت کی اہلیت رکھنے والے سب لوگ صفحہ ارضی سے نابود ہو جائیں گے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ بات پوشیدہ نہ تھی کہ فضائل و مناقب اور خصوصیات ان مدعیان خلافت کے مابین تقسیم شدہ ہیں۔ اگر ایک شخص ایک خصوصیت رکھتا ہے تو دوسرا کسی اور وصف کا حامل ہے جو اس میں موجود نہیں۔

جہاں تک یزید کا تعلق ہے وہ اپنے معاصر مدعیان امارت و ولایت کے اوصاف و خصوصیات میں برابر کا سہیم و شریک تھا۔ البتہ حکومت و سلطنت کی ایک لابدی خصوصیت یزید میں ایسی تھی جس سے دوسرے یک سر محروم تھے۔ اور وہ یہ ہے کہ یزید عسکری قوت سے بہرہ ور تھا جو بوقت ضرورت اسلام کی ایک عظیم قوت ثابت ہو سکتی تھی اور اگر یزید خلافت میں مزاحمت کرنے والوں کے خلاف نبرد آزما ہوتا تو یہ قوت وہاں بھی اس کا ساتھ دے سکتی تھی۔ علاوہ ازیں اگر یزید کے ننھال قبیلہ قضاعہ اور اس کے حلیف یمنی قبائل کے سوا اس کا کوئی بھی مددگار نہ ہوتا تو بھی وہ اپنے سب مخالفین کو زیر کر سکتا تھا۔ اس موقع پر ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں حضرت حسین کے سفر عراق کا حال بیان کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ قابل ملاحظہ ہے۔ ابن خلدون مقدمہ تاریخ کی فصل ''ولایۃ العہد'' میں لکھتا ہے: ''قوت و شوکت کا اندازہ لگانے میں حضرت حسین سے غلطی سرزد ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مضر کی عصبیت ان دنوں قبیلہ قریش میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ قریش کی عصبیت عبد مناف میں اور عبد مناف کی حمایت و طرف داری بنو امیہ میں آ کر گھر گئی تھی۔ سب قریش اس حقیقت کا اعتراف کرتے تھے اور کسی کو اس سے مجال انکار نہ تھی۔ آغاز اسلام میں جب لوگ معجزات اور وحی الٰہی میں منہمک ہو گئے تو یہ جاہلی عصبیت فراموش ہو گئی تھی۔ نبوت اور خوارق و معجزات کا انقطاع ہونے کے ساتھ ہی یہ عصبیت لوٹ کر آ گئی اور قبیلہ مضر کے لوگ باقی لوگوں کو چھوڑ کر بنو امیہ کا ساتھ دینے لگے۔'' (مقدمہ ابن خلدون)

یزید کی نامزدگی میں حضرت معاویہ نے اسلامی شہنشاہیت کی مصلحتوں کو پیش نظر رکھا تھا جس کا ان دنوں بڑا چرچا تھا اور ⇦⇦⇦

جب کہ یزید کی زندگی میں پہلے آپ اس کی بیعت کرنے سے گریزاں رہے؛ پھر بیعت کر لی مگر یزید اس پر راضی نہ ہوا اس کا اصرار تھا کہ آپ کو قید کر کے اس کے پاس پیش کیا جائے۔ اسی وجہ سے ان کے مابین فتنہ پیدا ہوا۔ یزید نے آپ کی طرف ایک لشکر روانہ کیا؛ جس نے مکہ میں آپ کا محاصرہ کرلیا۔ آپ محصور ہی تھے کہ یزید کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد اہل شام کے ایک گروہ اور اہل عراق وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔ ادھر یزید کے بعد اس کا بیٹا معاویہ تخت نشین ہوا۔ اس میں کچھ خیر اور اصلاح کا پہلو موجود تھا؛ مگر زندگی نے اسے زیادہ موقع نہ دیا۔ یہ صرف چالیس دن تک حاکم رہا؛ مگر اپنے بعد کسی کو خلیفہ مقرر نہیں کیا۔ اس کے بعد مروان بن الحکم شام کا امیر بن گیا۔ اسے بھی زیادہ مہلت نہ ملی۔ پھر اس کے بعد اس کا بیٹا عبدالملک بن مروان شام کا امیر بن گیا۔ اس نے حضرت مصعب بن زبیر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بھائی اور نائب سے لڑنے کے لیے ایک لشکر عراق روانہ کیا۔ مصعب بن زبیر قتل ہو گئے اور عراق کی حاکمیت عبدالملک کے پاس چلی گئی۔ ایک لشکر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف روانہ کیا؛ جس نے مکہ میں آپ کا محاصرہ کرلیا۔ ان میں جنگ ہوئی۔ یہاں تک کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے۔ اور نظام حکومت مکمل طور پر عبدالملک بن مروان کے ہاتھوں چلا گیا۔ پھر اس کی اولاد میں بھی حکومت مستحکم رہی۔ اسی کی حکومت میں بخاریٰ اور

⇦⇦⇦ جس کے پھلنے پھولنے اور وسعت پذیر ہونے میں دعوت اسلامی کی توسیع کا راز مضمر تھا۔ یہ توسیع زیادہ تر حضرت معاویہ وعثمان رضی اللہ عنہما اور ان کے خلفاء کے عہد میں ہوئی، نظر بریں اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ عرب کے دونوں بازو یعنی یمن ومضر یا قحطان وعدنان میں کامل اتحاد و یگانگت پیدا ہو جائے۔ یزید کو ولی عہد نامزد کرنے سے پیشتر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یزید کو امور سلطنت سکھایا کرتے تھے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ نے ۴۹ ہجری میں یزید کو رومی سلطنت کے استقبال کے لیے روم بھیجا اور اسلام کے جھنڈے قسطنطنیہ کی دیواروں پر لہرانے لگے۔ یہ وہ بابرکت لشکر تھا جس میں حضرت عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، ابوایوب انصاری اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین جیسے جلیل القدر صحابہ شریک تھے۔ اس عظیم اسلامی جہاد کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے خواب کی تعبیر ظاہر کی جو آپ نے بمقام قباء حضرت انس رضی اللہ عنہ کی خالہ کے یہاں دیکھا تھا۔ (صحیح بخاری، کتاب الاستئذان۔ باب من زار قوماً فقال عندھم (حدیث: ٦٢٨٢، ٦٢٨٣)، صحیح مسلم۔ کتاب الامارۃ۔ باب فضل الغزو فی البحر (حدیث:١٩١٢)

اگر ان تاریخی حقائق پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لخت جگر ابن الحنفیہ کی شہادت کا بھی اضافہ کر لیا جائے جس میں انھوں نے یزید پر عائد کردہ اتہامات کو بے بنیاد قرار دیا تھا تو اس مظلوم قریشی نوجوان (یزید) کی اصلی صورت سامنے آجاتی ہے جو اس پر از خیر و برکت زمانہ سے بالکل ہم آہنگ تھی جس کے ائمہ میں سے یزید بھی ایک امام تھا۔ علاوہ ازیں اس سے تاریخ اسلام کے وہ داغ دھبے دور ہو جائیں گے جن سے شریر لوگ اس کو داغ دار کرنا چاہتے ہیں۔

اگر اس کتاب کے دامن میں مزید وسعت ہوتی تو ہم بہت سے تاریخی حقائق بیان کرتے۔ (بعض حقائق کے لیے دیکھیے ہمارے حواشی بر العواصم من القواصم) اگر زندگی نے مہلت دی تو میں اسلام کے اس قرض کو جس سے میری گردن زیر بار ہے صدر اسلام کی ایک ایسی تاریخ پیش کر کے ادا کروں گا جن کو دیکھ کر مسلم نوجوان عش عش کر اٹھیں اور مسلمانوں پر یہ راز آشکار ہو جائے گا کہ اموی دور میں اسلام یورپ اور افریقہ میں کیوں کر اشاعت پذیر ہوا تھا۔ ایسی تاریخ امت مسلمہ کی ایک اہم ضرورت ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کچھ بعید نہیں کہ وہ ایسے شخص کو اس خدمت کی توفیق ارزانی کرے جو بہمہ وجوہ اس کا حق ادا کرنے کے قابل ہو۔

ماوراء النہر کے علاقے فتح ہوئے۔ انہیں قتیبہ بن مسلم نے فتح کیا؛ جو کہ حجاج بن یوسف کا نائب تھا۔ حجاج بلاد عراق پر عبد الملک کا نائب تھا۔ ان میں ظلم وستم ہونے کے باوجود [ان کے دور میں] مسلمانوں نے ترک بادشاہ خاقان سے جنگ لڑی؛ خاقان کو شکست دیکر اسے اس کی اولاد سمیت قید کرلیا۔ نیز اسی کی حکومت میں بلاد سندھ فتح ہوئے۔ بلاد اندلس پر غلبہ حاصل کیا۔ قسطنطنیہ پر غزوہ کیا۔ اور ایک مدت تک اس کا محاصرہ کیے رکھا۔ موسم گرما وسرما میں جہاد کو جاری رکھا۔

پھر جب حکومت بنوعباس کے پاس چلی گئی تو بلاد عراق' شام؛ مصر؛ خراسان؛ حجاز؛ یمن؛ اور دیگر جن علاقوں پر بنو امیہ کی حکومت تھی؛ وہاں پر بنوعباس حاکم بن گئے سوائے بلاد مغرب کے۔ بنوامیہ نے بلاد مغرب [اندلس] پر اپنی حکومت قائم کرلی۔ اور بلاد قیروان کی حکومت ان دونوں کے درمیان میں تھی۔

یزید اپنے عہد ولایت میں مسلمان بادشاہوں میں سے ایک تھا؛ جسے اللہ تعالیٰ نے زمین پر حکومت دی تھی۔ لیکن جب یزید کا انتقال ہوا تو مکہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے اس کی بیعت سے خارج تھے۔ یزید بھی تمام بلاد اسلامیہ پر حاکم نہیں بن سکا جیسے بنوعباس تمام اسلامی ممالک کے حاکم نہ بن سکے۔ بخلاف عبدالملک اور اس کی اولاد کے؛ انہیں تمام بلادِ اسلامیہ پر حاکم بننے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ایسے ہی خلفاء ثلاثہ اور حضرت امیر معاویہ تمام اسلامی شہروں کے حاکم تھے۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام اسلامی شہروں پر حاکم نہ بن سکے۔

ان لوگوں کے امام ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ حکومت وسلطنت اور سیف وسنان سے بہرہ ور تھے کسی کو حاکم مقرر کرتے اور کسی کو معزول کرتے۔ کسی کو دیتے اور کسی کو نہ دیتے۔ ان کے احکام حدود سلطنت میں نافذ ہوتے تھے۔ وہ شرعی سزائیں دیتے، کفار سے جہاد کرتے اور لوگوں میں مال تقسیم کیا کرتے تھے۔ یہ سب باتیں متواتر کی حد تک معروف ہیں اور ان سے مجال انکار نہیں۔ ان کے امام خلیفہ یا سلطان ہونے کا یہی مطلب ہے، جیسے امام صلوٰۃ وہ ہے جو لوگوں کو نماز پڑھاتا ہو جب ہم دیکھیں کہ کوئی شخص لوگوں کو نماز پڑھا رہا ہے تو اس کا امام ہونا ایک مشہود ومحسوس امر ہے جس میں جدل و بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔ باقی رہا اس کا نیک یا بد ہونا؛ نافرمان یا تابع فرمان ہونا تو یہ ایک الگ بات ہے۔

اہل سنت سلاطین وخلفاء مثلاً یزید یا عبدالملک یا منصور میں سے جب کسی کو امام تصور کریں گے تو اس کی یہی حیثیت ہوگی۔ جو شخص اس میں جدل یا بحث سے کام لیتا ہے وہ اسی طرح ہے جیسے کوئی حضرت ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کی ولایت یا قیصر وکسریٰ اور نجاشی کی بادشاہت کو تسلیم نہ کرے اور اس میں جھگڑنے لگے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کیا یہ ائمہ وخلفاء معصوم تھے؟ یا سب باتوں میں عدل وانصاف کے تقاضوں پر عمل پیرا تھے؟ اور سب افعال وامور میں اللہ تعالیٰ کے اطاعت کیش تھے؟ تو کوئی مسلمان یہ عقیدہ نہیں رکھتا۔ ایسے ہی ان کے ہر حکم کے واجب الاطاعت ہونے کا عقیدہ کوئی بھی مسلمان عالم نہیں رکھتا؛ اگر ان کا حکم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر ہو۔

تاہم اہل سنت کا مسلک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعات وعبادات اور جن چیزوں میں ان کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے' ان میں ان کے ساتھ شرکت کرسکتے ہیں۔ چنانچہ ہم ان کی اقتداء میں جمعہ وعیدین اور دیگر نمازیں پڑھ سکتے ہیں، اس

لیے کہ اگر ان کی اقتداء میں نماز نہ پڑھی جائے تو نمازیں معطل ہو کر رہ جائیں گی۔ ہم ان کے ساتھ مل کر کفار کے خلاف جہاد کر سکتے ہیں۔ بیت اللہ کا حج کر سکتے ہیں۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور اقامت حدود میں ان کا تعاون حاصل کر سکتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی انسان ایسے ساتھیوں کے ساتھ حج کرنے جائے جن کے کچھ گناہ ہوں ؛ اور وہ حج کرنے آئے ہوں ۔تو ان کے گناہ اس کو کچھ بھی نقصان نہیں دیں گے۔ایسے ہی غزوات اور دوسرے اعمال صالحہ کا معاملہ ہے۔[کوئی انسان نیک عمل انجام دے] اور اس میں اس کے ساتھ کوئی فاسق و فاجر آدمی بھی شریک ہو تو اس کی شرکت کی وجہ سے اسے کچھ نقصان نہیں پہنچے گا۔اور پھر اس وقت کیا کہنا جب اس طریقہ کے بغیر کسی کام کرنا ممکن ہی نہ ہو۔اور جب ایسا والی ہو جو گناہ کے کام کرتا ہو؟ اسی طرح عدل و انصاف اور تقسیم مال وغیرہ میں بھی ان سے اعانت طلب کی جا سکتی ہے۔اس لیے کہ بسا اوقات ان کے احکام اور ان کی تقسیم عدل و انصاف پر مبنی ہوتی ہے وہ نیک کاموں میں اعانت کرتے ہیں [1] اور اثم و عدوان میں تعاون کرنے میں احتراز کرتے ہیں۔

[اس مسئلہ میں لوگوں کا اختلاف:]

اس مسئلہ کی تفصیل میں لوگوں کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے؛ جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ مثال کے طور پر فاسق حکمران کے عادلانہ احکام کا نفاذ۔ مثلاً فاسق امام کے پیچھے پڑھی ہوئی نماز دوہرائی جائے گی یا نہیں؟ اس باب میں حق اور درست بات یہ ہے کہ جو کوئی عادلانہ حکم اور عادلانہ تقسیم کرے؛ تو اس کا حکم اور تقسیم نافذ ہوں گے۔اور جو کوئی

[1] اللہ کا شکر ہے کہ امت محمدیہ تاہنوز بخیر و عافیت ہے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ امت کے اوّلین ولاۃ و حکام غیر معصوم ہونے کے باوجود صلاح واستقامت کے انتہائی بلند معیار پر فائز تھے اقوام عالم میں جو لوگ مرتبہ و مقام کے لحاظ سے فروتر ہیں وہ ان کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کے کارہائے نمایاں کو اجاگر کرنے کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ان کی لغزشوں کا ذکر نہایت نرم الفاظ میں کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے لیے مناسب عذر تلاش کیا جاتا ہے۔یہ عجیب بات ہے کہ دورِ حاضر کے بعض شریر ہمارے بعض نیک نہاد سلاطین و ملوک کی سیرت وسوانح کو بگاڑنے پر تلے ہوئے ہیں اور ان کے کارہائے نمایاں کو چھپاتے اور ان کی تاویلیں کرتے اور ان سے صادر شدہ لغزشوں کو رائی کا پہاڑ بنا کر دکھار ہے ہیں، وہ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ وہ ان ولاۃ و حکام کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں حالانکہ اس کا سب سے بڑا نقصان ملت اسلامیہ کو پہنچتا ہے اور وہ یہ کہ اس سے ملت کے اذہان وقلوب میں مایوسی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور وہ اپنے ماضی سے بددل ہو جاتی ہے۔حق کے پرستار و مددگار اہل سنت مثلاً امام بخاری و مسلم اور دیگر حفاظ حدیث کا معاملہ اس سے یک سر مختلف ہے، صداقت شعار راویان حدیث کی جمع و تدوین میں انھوں نے حد درجہ اعتدال سے کام لیا۔خلفائے راشدین کے بعد آنے والے ولاۃ و حکام کے اخبار و واقعات جمع کرنے میں مؤرخین غالباً یہ نظریہ رکھتے تھے کہ تقابل کے نقطہ نظر سے وہ حکام خلفائے راشدین کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے، اس لیے انھوں نے ان کے بعض ایسے حقوق ادا کرنے میں فیاضی سے کام لیا جو بذات خود عظیم مگر خلفائے راشدین کے مقابلہ میں فروتر درجہ کے تھے۔ بہر کیف اہل سنت رسول اللہ ﷺ کے ماسوا کسی کو معصوم قرار نہیں دیتے اور ہر مستحق کو اس کا حق دینا چاہتے ہیں۔ دورِ حاضر میں جب ہم از سرِ نو تاریخ اسلام کا جائزہ لے کر اسے کذب و دروغ سے پاک وصاف کرنے کا بیڑا اٹھائیں گے تو ہمیں ان اسباب نصرت و توفیق تک رسائی حاصل ہوگی جو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے مقدر کر رکھے تھے جنھوں نے عالم اسلام کی بنیاد رکھی اور اللہ کی دعوت کو اکناف ارضی تک پہنچایا اس وقت یہ حقیقت ابھر کر سامنے آئے گی کہ باطل پرستوں نے جن لوگوں کی زندگی کو داغ دار کرنے کی سعی کی ہے وہ تاریخ اسلام کے عظیم ہیرو اور اپنے عصر وعہد کے چشم و چراغ تھے۔(رضی اللہ عنہم اجمعین)۔

بھلائی کا حکم دے؛ اور برائی سے منع کرے؛ اس معاملہ میں اس کی مدد کی جائے گی۔ جب تک کہ اس میں کوئی خرابی راجح نہ ہو۔ اور یہ کہ بیشک جمعہ اور جماعت کا قیام بہت ضروری ہے۔ اگر اس کے لیے کسی نیک انسان کو امام مقرر کرنا ممکن ہو تو پھر کسی ایسے بدعتی کو امام بنانا جائز نہیں جو اپنی بدعات کا اظہار کرتا ہو۔ کیونکہ ایسے لوگوں پر حسب استطاعت انکار واجب ہوتا ہے؛ تو پھر ان کو ولایت تفویض کرنا جائز نہیں رہتا۔ اور اگر صرف یہی ممکن ہو کہ دو اہل بدعت و فجور میں سے کسی ایک کو ولایت تفویض کرنا ہو؛ تو پھر ان میں سے ایسے آدمی کو والی بنایا جائے جو اس واجب کی ادائیگی کے لیے زیادہ مناسب ہو۔ ایسے ہی جب غزوات میں دو آدمیوں میں سے کسی ایک کو امیر بنایا جانا ہو؛ ان میں سے ایک دیندار ہو مگر جہادی اعتبار سے کمزور ہو؛ اور دوسرے کے گناہوں کے باوجود وہ جہاد کے لیے زیادہ فائدہ مند ہو؛ تو اسے ولایت تفویض کی جائے جس کی امارت و ولایت مسلمانوں کے لیے زیادہ نفع بخش ہو۔ وہ اس آدمی سے زیادہ بہتر ہے جس کی ولایت سے مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اور جب نماز جمعہ کی ادائیگی اور باجماعت نماز کا قیام صرف فاجر اور بدعتی کے پیچھے ہی ممکن ہو؛ تو اس کے پیچھے نماز پڑھی جائے گا؛ اور اس کا اعادہ نہیں ہوگا۔ اور اگر اس کے علاوہ کسی اور کے پیچھے نماز پڑھنا ممکن ہو تو پھر اس کے پیچھے نماز ترک کرنے میں اس سے قطع تعلقی ہے؛ تاکہ یہ اور اس کے امثال و ہمنوا اپنی بدعات اور فجور سے باز آجائیں؛ تو پھر ضرور ایسا کرنا چاہیے۔ اور اگر ان کے پیچھے نماز ترک کرنے میں کوئی دینی مصلحت نہ ہو تو پھر ان کے پیچھے نماز پڑھ لی جائے گی۔ اور کسی پر بھی ایک نماز کا دو بار پڑھنا فرض نہیں ہوتا۔

خلاصہ کلام! جہاں تک ممکن ہو سکے اہل سنت والجماعت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت گزاری کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان بھی یہی ہے:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ [تغابن ١٦]

''تم سے جتنا ہو سکے اللہ سے ڈرو۔''

اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان گرامی ہے:

''جب میں تمہیں کسی بات کا حکم دوں تو جتنا ہو سکے اسے پورا کرو۔'' [سبق تخریجہ]

وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو بندوں کی معاش اور معاد کی اصلاح کے لیے مبعوث فرمایا تھا۔ اور بیشک آپ نے اصلاح کا حکم دیا ہے؛ اور فساد سے منع کیا ہے۔ پس جس کسی فعل میں صلاح اور فساد دونوں پہلو موجود ہوں تو وہ اس میں سے راجح کو ترجیح دیتے ہیں۔ پس جب اس میں صلاح کا پہلو فساد پر غالب ہو تو وہ اس کے کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور اگر فساد کا پہلو صلاح پر غالب ہو تو اس کے ترک کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

بلا شک و شبہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو مصلحتوں کی تکمیل ان کے حصول اور مفاسد کے خاتمہ اور ان کے انسداد کے لیے مبعوث فرمایا تھا۔ پس جب کوئی خلیفہ خلافت پر فائز ہوتا ہے؛ جیسے یزید اور عبدالملک اور منصور؛ اور ان کے علاوہ دیگر؛ تو پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ: یا وہ اسے ولایت پر فائز ہونے سے روکا جائے اور اس سے جنگ کی جائے حتی کہ کوئی

دوسرا مسند خلیفہ پر فائز ہو جائے؛ جیسا کہ ان لوگوں کا خیال ہے جو حکمرانوں کے خلاف تلوار چلانا جائز سمجھتے ہیں۔ یہ ایک فاسد رائے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس رائے کی خرابیاں اس کی مصلحتوں سے بڑھ کر ہیں۔ اور بہت ہی کم ایسے ہوتا ہے کہ کسی نے کسی شان وشوکت والے حکمران کے خلاف خروج کیا ہو؛ مگر اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا شر اور فساد خیر و بھلائی سے بہت زیادہ اور بڑا تھا۔ جیسے ان لوگوں کے ساتھ ہوا جنہوں نے مدینہ میں یزید کے خلاف خروج کیا تھا۔ اور جیسا کہ ابن اشعث جس نے عراق میں عبدالملک کے خلاف بغاوت کی تھی۔ اور ابن مہلب؛ جس نے خراسان میں اپنے بیٹے کے خلاف بغاوت کی تھی۔ اور داعی ابومسلم؛ جس نے خراسان میں خروج کیا تھا۔ اور وہ لوگ جنہوں نے مدینہ اور بصرہ میں منصور کے خلاف خروج کیا تھا۔ اور ان کے امثال وہمنوا دیگر لوگ۔

ان کا انتہائی انجام یہ ہوسکتا ہے کہ یا تو مغلوب ہو جائیں یا پھر غالب آ جائیں؛ لیکن پھر بھی ان کا ملک ختم ہی ہو جاتا ہے؛ اور انجام کار ان کے حق میں نہیں رہتا۔ عبداللہ بن علی اور ابومسلم وہ دو اشخاص تھے جنہوں نے ایک بہت بڑی تعداد میں لوگوں کو قتل کیا۔ مگر آخر کار منصور نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔ اور اہل حرہ اور ابن اشعث اور ابن مہلب وغیرہ اور ان کے ساتھی شکست کھا کر بھاگ گئے۔ نہ ہی وہ دین قائم کر سکے؛ اور نہ ہی دنیا کو باقی رکھ سکے۔ اگرچہ ایسا کرنے والے بہت بڑے متقی اولیاء اللہ اور اہل جنت میں سے ہو۔ وہ ہرگز حضرت علی اور حضرت عائشہ اور حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین سے افضل نہیں ہوسکتا۔ مگر اس کے باوجود ان کے مابین جو جنگ ہوئی اس میں ان کا کوئی قابل تعریف کام نہیں تھا۔ حالانکہ ان کا مقام اللہ کے ہاں بہت بلند ہے؛ اور ان کی نیت بھی دوسرے لوگوں سے بڑھ صالح اور اچھی تھی۔

ایسے ہی اہل حرہ میں بہت سارے اہل علم اور دیندار لوگ موجود تھے۔ ایسے ہی اشعث کے ساتھیوں میں بھی ایک بڑی تعداد اہل علم و دین لوگوں کی تھی۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی مغفرت فرمائے؛ [آمین]۔

حضرت امام شعبی رحمہ اللہ سے ابن اشعث کے فتنہ کی بابت پوچھا گیا: اس وقت آپ کہاں تھے؟ تو آپ نے فرمایا: ''نہ ہی نیک اور متقی تھے؛ اور بدکردار اور طاقتور۔''

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: ''حجاج اللہ تعالیٰ کا ایک عذاب ہے؛ اور تم اللہ تعالیٰ کے عذاب کو اپنے ہاتھوں سے ختم نہ کرو؛ لیکن اس حالات میں تم پر گریہ وزاری اور انکساری واجب ہوتی ہے؛ بیشک اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿وَلَقَدْ اَخَذْنَاهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ﴾ (المؤمنون ٧٦]

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے انھیں عذاب میں پکڑا، پھر بھی وہ نہ اپنے رب کے آگے جھکے اور نہ عاجزی اختیار کرتے تھے۔''

حضرت طلق بن حبیب رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: ''تقوی اختیار کر کے فتنہ سے بچو۔'' تو آپ سے پوچھا گیا: کہ تقوی کی اجمالی تعریف بیان کریں؛ تو آپ نے فرمایا: ''یہ کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزاری کے کام اس کے عطا کردہ نور کی روشنی میں کرو؛ اور اس کی رحمت کی امید رکھو؛ اور اللہ تعالیٰ کی معصیت اس کے نور کی روشنی میں ترک کردو؛ اور اللہ تعالیٰ کے

عذاب سے ڈرتے رہو۔'' [رواہ احمد وابن ابی الدنیا]

افاضل مسلمین فتنہ کے دور میں خروج اور قتال سے منع کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر؛ اور سعید بن مسیّب اور حضرت علی بن حسین رحمہم اللہ؛ اور ان کے علاوہ دیگر حضرات حرہ والے سال یزید کے خلاف خروج سے منع کرتے رہے۔ اور جیسا کہ حضرت حسن بصری اور مجاہد اور دیگر حضرات ابن اشعث کے فتنہ کے دور میں خروج سے منع کرتے تھے۔ اسی لیے اہل سنت کے معاملہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت صحیح احادیث کی روشنی میں فتنہ کے دور میں قتال ترک کرنے پر استقرار حاصل رہا۔ اور وہ اس مسئلہ کو اپنے ہاں عقائد میں ذکر کرتے رہے۔ اور حکمرانوں اس ظلم پر لوگوں کو صبر کرنے اور قتال ترک کرنے کی تلقین کرتے رہے۔ اگرچہ فتنہ کی لڑائیوں میں بہت سارے اہل علم اور اہل دین حضرات شامل بھی ہوگئے تھے۔

اہل بغاوت سے قتال اور اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے قتال کا باب فتنہ کے بارے میں کفار سے قتال کے باب سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ اور جو کوئی اس باب میں وارد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت صحیح احادیث میں غور وفکر کرتا ہے؛ تو یقیناً وہ اہل بصیرت لوگوں کی سی عبرت حاصل کرتا ہے۔ اور وہ جان لیتا ہے کہ جو کچھ احادیث نبویہ میں وارد ہوا ہے؛ وہ بہترین امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے عراق کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا؛ کیونکہ اہل عراق نے آپ کو بہت زیادہ خطوط لکھ کر بلایا تھا؛ تو اہل علم اور اعلی فاضل دین دار لوگوں نے آپ کو ایسا کرنے سے منع کیا تھا؛ جیسے عبداللہ بن عمر؛ ابن عباس؛ اور ابوبکر بن عبدالرحمن بن الحارث۔ ان کا غالب گمان یہی تھا کہ آپ کو قتل کردیا جائے گا۔ حتی کہ بعض نے تو الوداع کرتے ہوئے یہاں تک کہا تھا: ''اے قتل ہونے والے! ہم تمہیں اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔''

بعض نے کہا تھا: ''اگر شفاعت کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں آپ کو پکڑ لیتا؛ اور اس خروج سے منع کرتا۔''

ان لوگوں کا مقصد آپ کی نصیحت اور خیر خواہی تھا؛ اور وہ آپ کی اور مسلمانوں کی مصلحت چاہتے تھے۔ اللہ اور اس کا رسول اصلاح کرنے کا حکم دیتے ہیں؛ فساد کا نہیں۔ لیکن رائے کبھی درست ہوتی ہے اور کبھی غلط۔

پس بعد میں واضح ہوگیا کہ معاملہ ویسے ہی ہوا جیسے یہ حضرات فرما رہے تھے؛ اس خروج میں نہ ہی کوئی دین کی مصلحت تھی اور نہ ہی دنیا کی مصلحت۔ بلکہ ان ظالم اور سرکش لوگوں کو نواسہء رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم وستم ڈھانے کا موقع مل گیا۔ حتی کہ آپ کو انتہائی مظلومیت کی حالت میں شہید کردیا گیا۔ اور یہی فساد آپ کے خروج اور قتل میں تھا جو کہ اگر آپ اپنے علاقہ میں بیٹھے رہتے؛ تو کبھی بھی پیدا نہ ہوتا۔ اس لیے کہ آپ نے جس خیر و بھلائی کے حصول اور شر اور برائی کے خاتمہ کا ارادہ کیا تھا؛ وہ تو نہ ہوسکا۔ بلکہ آپ کے خروج اور قتل سے شر مزید بڑھ گیا۔ اس کی وجہ سے خیر کم ہوگئی۔ اور بہت بڑا شر پیدا ہوگیا۔ بلا شک وشبہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کی وجہ سے بڑے بڑے فتنے پیدا ہوئے۔ جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی وجہ سے فتنے پیدا ہوئے تھے۔

ان تمام امور سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بادشاہوں کے ظلم پر صبر کرنے ؛ اور ان سے جنگ ترک کرنے کا جو حکم دیا ہے؛ وہ بندوں کے لیے معاش اور معاد ہر لحاظ سے بہتر تھا۔اور جس نے بھی اس کی مخالفت کی ؛ خواہ جان بوجھ کر ہو یا غلطی سے ؛ تو اسے کوئی بھلائی نہیں ملی ؛ بلکہ خرابی اور فساد ہی پیدا ہوا۔یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا:

''میرا یہ بیٹا سردار ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں میں صلح کرائے گا۔''

اس حدیث میں آپ نے صلح کرانے کی بنا پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی مدح وستائش فرمائی۔

آپ نے کسی ایک کی بھی تعریف لڑائی ؛ فتنہ؛ حکمرانوں کے خلاف خروج اور ان کی اطاعت سے روگردانی اور جماعت سے مفارقت کی بنا پر نہیں کی۔

نبی کریم ﷺ سے ثابت تمام صحیح اُحادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے روایت ہے؛ فرماتے ہیں : میں نے حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے سنا؛ وہ فرماتے ہیں : میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا؛ آپ منبر پر تھے؛ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ آپ کے پہلو میں تھے؛ آپ کبھی لوگوں کی طرف دیکھتے اور کبھی حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی طرف اور فرمارہے تھے:

''بیشک میرا یہ بیٹا سردار ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں میں صلح کرائے گا۔''

اس حدیث میں آپ ﷺ نے آپ کے سردار ہونے کی خبر دی ہے؛ اور یہ خبر بھی دی ہے کہ اللہ آپ کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا۔

اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ دونوں گروہوں کے مابین صلح کرانا محبوب اور ممدوح امر تھا؛ ایسا کام جس کو اللہ اور اس کا رسول پسند کرتے تھے۔اور جو کچھ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کیا ؛ وہ آپ کے بڑے فضائل اور ان مناقب میں سے تھا جن پر رسول اللہ ﷺ نے آپ کی تعریف کی ہے۔اگر قتال واجب یا مستحب ہوتا؛ تو نبی کریم ﷺ اس کے ترک کرنے پر کسی کی تعریف نہ کرے۔یہی وجہ ہے کہ جو کچھ جمل اور صفین میں پیش آیا؛ اس پر نبی کریم ﷺ نے کسی کی کوئی تعریف نہیں کی ؛ کجا کہ واقعہ حرہ کا کوئی ذکر ہو؛ یا جو کچھ مکہ مکرمہ میں حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے محاصرہ کے وقت پیش آیا؛ یا پھر جو کچھ ابن اشہب اور ابن مہلب وغیرہ کے فتنوں میں پیش آیا۔لیکن آپ ﷺ سے تواتر کے ساتھ خوارج سے قتال کا حکم منقول ہے؛ جن سے پھر امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نہروان کے مقام پر قتال کیا تھا؛ اس سے پہلے وہ حروراء میں بھی بغاوت کر چکے تھے۔اس بارے میں سنت مشہور ہے کہ آپ ﷺ نے ان سے جنگ لڑنے کا حکم دیا تھا۔جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے جنگ لڑی تو آپ اس جنگ پر بہت خوش تھے۔اور ان کے بارے میں احادیث روایت کی گئی ہیں۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا ان سے جنگ کے مسئلہ پر اتفاق واجماع تھا۔ایسے ہی ان کے بعد ائمہ اہل علم کے نزدیک یہ قتال جنگ جمل اور صفین کی طرح نہیں تھا جس کے بارے میں کوئی نص اور اجماع منقول نہیں ہے۔اور نہ ہی اس میں شریک افاضل

حضرات نے اس کی کوئی تعریف کی ہے؛ بلکہ انہوں نے ندامت کے ساتھ اس سے رجوع کر لیا تھا۔

یہ حدیث ہمارے نبی کریم ﷺ کے معجزات نبوت میں سے ایک ہے۔اس لیے کہ اس میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے اس کردار کا ذکر کیا گیا؛ اور اس پر ان کی تعریف کی گئی ہے۔پس جو کچھ آپ نے بیان فرمایا؛ اور جس پر تعریف کی ؛ وہ تیس سال بعد ویسے ہی حق اور سچ ثابت ہوا۔ بیشک اللہ تعالیٰ کا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے مابین صلح کرانا سن ۴۱ھ میں پیش آیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت رمضان ۴۰ ھ میں ہوئی۔ اور جس وقت نبی کریم ﷺ کی وفات ہوئی اس وقت حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی عمر تقریباً سات سال تھی۔آپ کی پیدائش سن ۳ ہجری کو ہوئی تھی اور حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ فتح طائف والے سال مسلمان ہوئے۔غزوہ طائف فتح مکہ کے بعد پیش آیا تھا۔ یہ حدیث جس میں نبی کریم ﷺ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ کچھ فرمایا ہے؛ یہ سن آٹھ ہجری کے بعد کا واقعہ ہے۔ نبی کریم ﷺ کی وفات کے تیس سال بعد تک خلافت نبوت تھی۔تو اس فرمان کو تیس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔اس لیے کہ آپ نے موت سے قبل یہ جملے ارشاد فرمائے تھے۔اسی مناسبت سے ایک وہ صحیح روایت بھی ہے جو سلیمان تیمی نے ابو عثمان نہدی سے روایت کی ہے؛ وہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں؛ فرمایا:''نبی کریم ﷺ مجھے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اٹھا لیتے اور فرمایا کرتے :''اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں؛ تو بھی ان سے محبت کر۔'' [سبق تخریجہ]

اس حدیث میں حضرت حسن اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہما کے مابین جمع ہے۔اور یہ خبر دی گئی ہے کہ آپ ان دونوں سے محبت کرتے ہیں ؛ اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی گئی ہے کہ وہ بھی ان دونوں سے محبت کرے۔ ان دونوں حضرات سے رسول اللہ ﷺ کی محبت صحیح احادیث کی روشنی میں مشہور و معروف ہے۔جیسا کہ صحیحین میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے؛فرماتے ہیں : رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی بابت فرمایا:

''اے اللہ میں اس سے محبت رکھتا ہوں'پس تو بھی اس سے محبت کر۔''❶

صحیحین میں زہری سے روایت ہے؛ وہ حضرت عروہ سے وہ حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں؛ فرمایا:

''مخزومیہ خاتون[فاطمہ بنت اسود] جس نے[غزوہ فتح کے موقع پر]چوری کر لی تھی ،اس کے معاملہ نے قریش کو فکر میں ڈال دیا۔انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس معاملہ پر رسول اللہ ﷺ سے گفتگو کون کرے؟آخر یہ طے پایا کہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کو بہت عزیز ہیں ۔ان کے سوا اور کوئی اس کی ہمت نہیں کر سکتا......''❷

---

❶ البخاري ٥/ ٢٦؛ كتاب فضائل أصحاب النبي ؛ باب مناقب الحسن و الحسين ؛ مسلم ٤/ ١٨٨٤ ؛ كتاب فضائل الصحابة ؛ باب فضائل الحسن و الحسين ـ سنن الترمذي ٥/ ٣٢٧ ـ

❷ صحيح البخاري ٥/ ٢٣ ؛ كتاب فضائل أصحاب النبي ﷺ؛ باب ذكر اسامة بن زيد رضي الله عنهما؛ مسلم ٣/ ١٣١٥ ؛ كتاب الحدود بـاب قـطـع السـارق الشريف ؛ وغيره۔ سنن أبي داؤد ٤/ ١٨٨؛ كتاب الحدود ؛ باب في الحد يشفع فيه۔والحديث يوجد في سنن الترمذي و ابن ماجة و النسائی۔

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن دینار رحمہ اللہ سے روایت ہے؛ فرمایا:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دن ایک صاحب کو مسجد میں دیکھا کہ اپنا کپڑا ایک کونے میں پھیلا رہے تھے ۔ انہوں نے کہا دیکھو یہ کون صاحب ہیں؟ کاش ! یہ میرے قریب ہوتے ۔ ایک شخص نے کہا اے ابوعبدالرحمٰن ! کیا آپ انہیں نہیں پہچانتے ؟ یہ محمد بن اسامہ رضی اللہ عنہ ہیں ۔ ابن دینار نے بیان کیا کہ یہ سنتے ہی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا سر جھکا لیا اور اپنے ہاتھوں سے زمین کریدنے لگے پھر بولے:''اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دیکھتے تو یقیناً آپ ان سے محبت فرماتے ۔''[1]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو اپنی محبت میں جمع کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ ان دونوں حضرات سے محبت کرے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان دونوں سے انفرادی محبت بھی بڑی معروف تھی۔ یہ دونوں حضرات ان جنگوں میں قتال کی رائے نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ صفین کے موقع پر قتال سے الگ تھلگ رہے۔ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی مل کر جنگ میں حصہ نہیں لیا۔

[شہادت حسین رضی اللہ عنہ اور اہل سنت کا مؤقف]

حضرت حسن رضی اللہ عنہ اپنے والد اور بھائی کو ہمیشہ جنگ ترک کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ پس جب معاملہ آپ کے ہاتھ میں آیا تو آپ نے قتال ترک کر دیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے دو بڑے لڑنے والے گروہوں کے مابین آپ کے ذریعہ سے صلح کرا دی۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بھی آخر میں یہ واضح ہوا کہ جنگ ترک کرنے میں جو مصلحت تھی؛ وہ جنگ کرنے سے زیادہ بڑی اور اہم تھی۔

ایسے ہی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بھی صرف اور صرف مظلومیت کی حالت میں شہید کیا گیا۔ آپ نے امارت کا مطالبہ ترک کر دیا تھا؛ اور آپ واپس جانا چاہتے تھے؛ یا تو اپنے شہر کی طرف چلے جائیں؛ یا محاذ جہاد کی طرف؛ یا پھر لوگوں پر والی یعنی یزید کی طرف۔

جب کوئی کہنے والا کہتا ہے کہ: بیشک حضرت علی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما نے آخری مرحلہ میں عاجز آجانے کی وجہ سے قتال ترک کر دیا تھا؛ اس لیے کہ آپ کے اعوان و انصار باقی نہیں رہے تھے۔ تو اب جنگ لڑنے میں بلاوجہ اور بغیر کسی مصلحت کے حصول کے نفوس کو قتل کروانا تھا۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بعینہ وہ حکمت ہے جس کی رعایت شارع علیہ السلام نے حکمرانوں کے خلاف بغاوت نہ کرنے میں مدنظر رکھی ہے۔ اور آپ نے فتنہ کے دور میں قتال ترک کرنے کی ترغیب دی ہے۔ اگرچہ ایسا کرنے والوں کی رائے میں ان کا مقصود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہوتا ہے۔ جیسا کہ وہ لوگ جنہوں نے حرہ میں یزید کے خلاف اور دیرہ جماجم میں حجاج بن یوسف کے خلاف خروج کیا تھا۔ لیکن برائی ایسے ہی باقی رہی؛ بلکہ پہلے سے زیادہ سخت ہوگئی۔ پس اس

[1] البخاری ٥/ ٢٤؛ کتاب فضائل أصحاب النبي صلی اللہ علیہ وسلم باب ذکر أسامة بن زید رضي الله عنهما .

طرح برائی کو ختم کرنے کی کوشش کرنا خود ایک برائی بن کر سامنے آیا۔ اس لیے کہ اس معروف کو پانے کے لیے ایسی خرابی کا ارتکاب کرنا پڑا جس کی برائی اس بھلائی سے زیادہ تھی۔ تو اس طرح سے اس معروف کا حاصل کرنا خود ایک منکر اور برائی بن کر رہ گیا۔

اسی طریقہ کار پر چلتے ہوئے خوارج نے اہل قبلہ پر تلوار چلانے کو حلال سمجھا۔ حتی کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر مسلمانوں سے جنگ کی۔ اور ایسے ہی معتزلہ؛ زیدیہ اور فقہاء میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو حکمرانوں کے خلاف مسلح بغاوت کو جائز سمجھتے ہیں۔ جیسے وہ لوگ جنہوں نے محمد بن عبداللہ بن حسن بن حسین اور ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ بن حسن بن حسین اور دیگر کے ساتھ مل کر خروج کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے دین دار لوگوں کا مقصود اس چیز کا حصول تھا جسے وہ دین سمجھتے تھے۔ لیکن ان کی خطاء دو وجہ سے تھی:

اوّل یہ کہ جس چیز کو وہ دین سمجھتے تھے؛ وہ حقیقت میں دین نہیں تھی۔ جیسا کہ خوارج اور دیگر اہل اُہواء فرقوں کی رائے تھی۔ بلاشک وہ ایسا عقیدہ رکھتے تھے جو کہ خطاً پر مبنی بدعت تھی۔ اور پھر اسے بنیاد بنا کر لوگوں سے جنگ کرتے تھے۔ بلکہ اس بنیاد پر وہ اپنے مخالفین کو کافر کہتے تھے۔ پس وہ اپنی رائے میں؛ اور مخالفین سے قتال اور ان کی تکفیر اور ان پر لعنت کرنے میں خطا کا ارتکاب کرتے تھے۔

عمومی طور پر خواہشات نفس کے پجاری فرقوں جیسے جہمیہ وغیرہ کا یہی حال ہوتا ہے؛ وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور صفات عالیہ کے انکار کی دعوت دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں: کہ اللہ تعالیٰ کا کلام صرف وہی ہے جو اس نے دوسروں میں پیدا کیا ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا جاسکتا۔ اور ایسے ہی دیگر عقائد۔ اور جب کچھ حکمرانوں نے ان کی طرف میلان ظاہر کیا تو انہوں نے اس مسئلہ میں اپنے مخالف لوگوں کا امتحان لینا شروع کر دیا۔ بھلے اس میں انہیں قتل کر دیا جائے؛ یا پھر قید میں ڈال دیا جائے۔ یا پھر معزول کر کے ذرائع آمدن پر پابندی لگا دی جائے۔ ایسے ہی جہمیہ نے کئی ایک بار کیا۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے اہل ایمان بندوں کے ناصر و مددگار رہے۔

رافضہ کا حال ان سب سے زیادہ برا ہے۔ جب ان کو قوت مل جاتی ہے تو یہ کفار کے ساتھ دوستی اور ان کی مدد کرتے ہیں۔ اور مسلمانوں اور اپنے تمام مخالفین سے دشمنی مول لیتے ہیں۔ اور ایسے ہی ان میں رنگ برنگی بدعات بھی پائی جاتی ہیں ؛ خواہ یہ بدعات حلول کی ہوں؛ یعنی یہ لوگ ذات وصفات میں حلول کا عقیدہ رکھتے ہیں؛ یا پھر خواہ نفی اور اثبات میں غلو کی بدعت ہو۔ یا تو یہ ارجاء کی بدعت ہو گی؛ یا پھر قدر کی؛ یا ان کے علاوہ کوئی دوسری بدعت۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ لوگ انتہائی برے اعتقادات رکھتے ہیں۔ اور اپنے مخالفین کی تکفیر اور ان پر لعنت کرتے ہیں۔ اور اہل سنت والجماعت کی تکفیر اور ان سے قتال میں ان کے ائمہ خوارج ہیں جو حکمرانوں کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔

دوسری وجہ:...... جو کوئی اپنے رائے اور اعتقاد کی طرف دعوت دیتے ہوئے قتال کرتا ہے وہ سنت والجماعت کا مخالف ہے۔ جیسے وہ حضرات جنہوں نے جمل؛ صفین؛ حرہ اور جماجم اور دیگر معرکوں میں حصہ لیا۔ لیکن کبھی ایسا ہوسکتا ہے

کہ ان کا گمان یہ ہو کہ جنگ کرنے سے مطلوب مصلحت حاصل ہوسکتی ہے؛ مگر وہ جنگ قتال سے حاصل نہ ہو۔ بلکہ فساد پہلے سے زیادہ بڑھ جائے۔تو پھر آخر میں اس پر یہ واضح ہو کہ بہتری اسی میں تھی جس کا حکم شارع علیہ السلام نے شروع میں حکم دیا تھا۔

ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن تک نصوص شریعت نہیں پہنچیں؛ یا ان کے ہاں یہ نصوص ثابت نہیں ہو سکیں۔اور بعض کی نظر میں یہ نصوص منسوخ تھیں؛ جیسے ابن حزم۔اور بعض لوگ ان کی تأویل کا شکار تھے۔جیسا کہ بہت سارے مجتہدین سے بہت ساری نصوص کے بارے میں پیش آیا ہے۔

پس ان تین وجوہات کی بنا پر بعض اہل استدلال نے ان بعض نصوص پر عمل کو ترک کر دیا تھا۔ یا تو وہ ان کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہونے کا اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔یہ پھر وہ ان کے مورد استدلال پر دال نہ ہونے کا اعتقاد رکھتے تھے۔یا پھر ان کا عقیدہ تھا کہ یہ نصوص منسوخ ہیں۔

[اقتدار کا فتنہ اور اسلامی تعلیمات]

یہ جاننا ضروری ہے کہ ان فتنوں کے اسباب مشترکہ ہوتے ہیں۔پس دلوں پر ایسے خیالات وارد ہوتے ہیں جو انہیں حق کی معرفت اور اس کے ارادہ سے روک دیتے ہیں۔اسی لیے ایسے لوگ اہل جاہلیت کی منزلت پر شمار ہوتے ہیں۔جاہلیت میں نہ ہی حق کی معرفت ہوتی ہے اور نہ ہی اس کا قصد وارادہ۔جبکہ اسلام علمِ نافع اور عمل صالح لیکر آیا ہے۔جس میں حق کی معرفت اور اس کا قصد شامل ہیں۔پس اسلام اس بات پر متفق ہے کہ بعض حکمران اپنی ترجیحات کی خاطر ایسا ظلم کرتے ہیں کہ نفوس اس پر صبر نہیں کر سکتے۔اور نہ ہی ان کے ظلم سے دفاع اس سے بڑے فساد اور خرابی کے بغیر ممکن ہوتا ہے۔لیکن چونکہ انسان کو اپنے حق کا حصول اور ظلم سے دفاع پسندیدہ ہوتا ہے؛اس لیے وہ اس عمومی خرابی پر نظر نہیں ڈالتا جو اس کے فعل کے نتیجہ میں پیدا ہوگی۔اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:

"میرے بعد تم دیکھو گے کہ تم پر دوسروں کو فوقیت دی جائے گی ، پس تم صبر کرنا یہاں تک کہ مجھ سے آملو اور میری تم سے ملاقات حوض پر ہوگی۔"[متفق علیہ ؛ سبق تخریجہ]

اور صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: سنا،انہوں نے حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک انصاری صحابی نے عرض کیا : یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! فلاں شخص کی طرح مجھے بھی آپ حاکم بنا دیں؟ ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میرے بعد [دنیاوی معاملات میں] تم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے گی اس لیے صبر سے کام لینا ، یہاں تک کہ مجھ سے حوض پر آملو۔"[1]

---

[1] البخاري ٥/ ٣٣ ؛كتاب مناقب الأنصار؛ باب قول النبي ﷺ للأنصار اصبروا...... ؛ مسلم ٣/ ١٤٧٤ ؛ كتاب الإمارة باب الأمر بالصبر عند ظلم الولاة و استئثارهم ......"

صحیح بخاری کی ایک روایت ہے؛ یحیی بن سعید نے سنا جب وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ساتھ خلیفہ ولید بن عبدالملک کے یہاں جانے کے لیے نکلے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار رضی اللہ عنہم اجمعین کو بلایا تاکہ بحرین کا ملک بطور جاگیر انہیں عطا فرما دیں۔ انصار نے کہا جب تک آپ ہمارے بھائی مہاجرین کو بھی اسی جیسی جاگیر نہ عطا فرمائیں ہم اسے قبول نہیں کریں گے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''دیکھو جب آج تم قبول نہیں کرتے ہو تو پھر میرے بعد بھی صبر کرنا یہاں تک کہ مجھ سے آ ملو، کیونکہ میرے بعد قریب ہی تمہاری حق تلفی ہونے والی ہے۔'' [البخاری ؛ سبق تخریجه]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مسلمان مرد پر حاکم کی بات سننا اور اطاعت کرنا لازم ہے خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند ہو؛ تنگی ہو یا آسانی ہو؛ اس کی بات سننا لازم ہے۔'' [1]

صحیح مسلم میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بھی ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:

''ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تنگی اور آسانی میں پسند و ناپسند میں اور اس بات پر کہ ہم پر کسی کو ترجیح دی جائے؛ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سننے اور اطاعت کرنے کی بیعت کی۔ اور اس بات پر بیعت کی کہ ہم حکام سے حکومت کے معاملات میں جھگڑا نہ کریں گے۔ اور اس بات پر بیعت کی کہ ہم جہاں بھی ہوں گے حق بات ہی کہیں گے اللہ کے معاملہ میں ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہ رکھیں گے۔'' [2]

یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ ان پر ترجیح دیے جانے کے وقت صبر کریں؛ اور اگر حکمران ان پر دوسروں کو ترجیح بھی دیں؛ تب بھی وہ اس پر صبر کریں؛ اور حکومت کے معاملہ میں ان سے جھگڑا نہ کریں۔ اور بہت سارے وہ لوگ جو حکمرانوں کے خلاف بغاوت کرتے ہیں؛ یا ان کی اکثریت؛ جو اس لیے بغاوت کرتے ہیں کہ ان پر دوسروں کو ترجیح دی جا رہی ہے؛ وہ اس پر صبر نہیں کر سکتے۔ پھر بیشک حکمران کے اس کے علاوہ دوسرے گناہ بھی ہوتے ہیں؛ اور یہ انسان اپنے اس معاملہ میں دوسرے کو ترجیح دینے کی وجہ سے دوسرے گناہوں کو بھی بہت بڑا سمجھتا ہے۔ اور اس سے جنگ کرنے والا یہی گمان کرتا ہے کہ وہ اس لیے لڑ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دین سر بلند ہو؛ اور کوئی فتنہ باقی نہ رہے۔ اور اس کا سب سے بڑا محرک اور اس کی اپنی غرض کی طلب تھی؛ بھلے یہ غرض مال کا حصول ہو یا ولایت کا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ ﴾ [التوبة ۵۸]

''پھر اگر انھیں ان میں سے دے دیا جائے تو خوش ہو جاتے ہیں اور اگر انھیں ان میں سے نہ دیا جائے تو اسی

[1] مسلم؛ امارت اور خلافت کا بیان: ح:۲۷۱ غیر معصیت میں حاکموں کی اطاعت کے وجوب...... کے بیان میں۔
[2] ایضًا

وقت وہ ناراض ہو جاتے ہیں۔''

اور صحیح حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

'' قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تین آدمیوں سے نہ بات کرے گا، نہ ان کی طرف دیکھے گا، نہ ہی انہیں پاک کرے گا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے: ایک وہ آدمی جس کے پاس چٹیل میدان میں فالتو پانی ہو اور مسافر کو پانی لینے سے منع کرے۔ اللہ تعالیٰ بروز قیامت اس سے کہیں گے: آج کے دن تجھے میں اپنے فضل سے ایسے ہی محروم رکھوں گا؛ جیسے تو نے لوگوں کو محروم رکھا؛ حالانکہ تم نے اپنے ہاتھ سے اس میں کوئی کام نہیں کیا تھا۔ اور دوسرا وہ آدمی جس نے کسی امام کے ہاتھ پر بیعت کی، اور مقصد محض دنیاوی فائدہ تھا، چنانچہ اگر اس نے اسے کچھ دیا تو راضی رہا، اور اگر نہیں دیا تو ناراض ہو گیا۔ اور تیسرا وہ شخص جس نے عصر کے بعد کسی کے ہاتھ سامان بیچا اور اللہ کی قسم کھا کر کہا کہ اس نے یہ چیز اس سے زیادہ میں لی ہے؛ جو اسے دیا جا رہا ہے۔'' [سبق تخریجہ]

پس جب اس کے ساتھ شبہ اور شہوت بھی مل جائیں؛ اور دوسری طرف سے بھی شبہ اور شہوات ہوں تو فتنہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور شارع علیہ السلام نے ہر انسان کو اس چیز کا حکم دیا ہے جس میں اس کی اور مسلمانوں کی مصلحت ہو۔ پس حکمرانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی رعایا کے ساتھ عدل و انصاف اور ان کی خیر خواہی کریں۔ آپ نے فرمایا:

''کوئی بھی انسان ایسا نہیں ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنی رعایا پر نگہبان بناتے ہیں؛ اور پھر جب وہ مرے تو اس حال میں مرے کہ وہ اپنی رعایا سے دھوکہ کرنے والا ہو؛ تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت کی خوشبو بھی حرام کر دیں گے۔''❶

رعایا کو حکم دیا ہے کہ وہ حاکم کی اطاعت گزاری کریں اور خیر خواہی چاہیں۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تین بار ارشاد فرمایا:

'' دین خیر خواہی کا نام ہے۔'' صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! کس کے لیے؟

تو آپ نے فرمایا: '' اللہ کے لیے؛ اس کی کتاب کے لیے؛ اس کے رسول کے لیے؛ مسلمان حکمران کے لیے اور عام مسلمانوں کے لیے۔''❷

ان کے اپنے خواص کو ترجیح دینے کے وقت صبر کرنے کا حکم دیا؛ اور ان سے اختلاف اور جھگڑا کرنے سے منع کیا؛ حالانکہ وہ ظلم کر رہے ہوں گے۔ اس لیے کہ اس جھگڑا اور لڑائی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی خرابی بہت بڑے فتنہ کی شکل

---

❶ البخاری ۹/ ٦٤؛ کتاب الأحکام؛ باب من استرعی رعیة فلم ینصح ۔ مسلم ۱/ ۱۲؛ کتاب الإیمان باب استحقاق الوالي الغاش لرعیته ۔ سنن الدارمي ۲/ ۳۲٤۔

❷ مسلم ۱/ ۷٤؛ کتاب الایمان باب بیان أن الدین النصیحة؛ و سنن الترمذي ۳/ ۲۱۷؛ کتاب البر و الصلة؛ باب في النصیحة؛ وقال الترمذي: هذا حدیث حسن۔

اختیار کر لے گی جو حکمرانوں کے ظلم سے بہت بڑھ کر ہوگی۔ پس دو بڑی خرابیوں میں ایک ہلکی خرابی ہمیشہ سے بہتر سمجھی جاتی رہی ہے۔

جو کوئی کتاب اللہ اور رسول اللہ ﷺ سے ثابت سنتوں پر غور کرے گا؛ اور اپنے نفس میں اور گرد و نواح میں غور و فکر کر کے درس عبرت حاصل کرے گا تو اس پر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی صداقت کی حقیقت عیاں ہوگی:

﴿سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ﴾ (فصلت ۵۳)

''عنقریب ہم انھیں اپنی نشانیاں دنیا کے کناروں میں اور ان کے نفسوں میں دکھلائیں گے، یہاں تک کہ ان کے لیے واضح ہو جائے کہ یقیناً یہی حق ہے۔''

بیشک اللہ تعالیٰ بندوں کو کائنات میں پھیلی ہوئی اور خود ان کی ذات میں موجود اپنی نشانیاں دیکھاتے ہیں؛ حتی کہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہ قرآن حق ہے؛ اور اس کی خبریں سچی ہیں؛ اور اس کا احکام عادلانہ ہیں۔ فرمایا:

﴿وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ (الانعام ۱۱۵]

''اور تیرے رب کی بات سچ اور انصاف کے اعتبار سے پوری ہوگئی، اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔''

اس باب سے متعلق یہ علم میں سے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کوئی بہت بڑا اہل علم اور دین دار انسان؛ خواہ وہ صحابہ و تابعین میں سے ہو؛ یا ان کے بعد قیامت تک آنے والوں میں سے ہو؛ یا اہل بیت میں سے؛ یا کوئی دیگر؛ کبھی اس سے اس کے گمان کی بنا پر کوئی اجتہاد ہو سکتا ہے؛ جس میں کوئی ہلکی پھلکی اپنی خواہش نفس بھی شامل ہو؛ تو اس کا نتیجہ ایسا ہوتا ہے جس میں اس کی اتباع نہیں کی جاسکتی؛ بھلے وہ اللہ تعالیٰ کا بڑا متقی ولی ہو۔

ایسا واقع جب پیش آجائے تو دو گروہوں کے مابین فتنہ پیدا ہو جاتا ہے؛ ایک گروہ اس کی تعظیم و عظمت کا قائل ہوتا ہے؛ وہ اسکے اس فعل کو درست سمجھتے اور اس کی اتباع چاہتے ہیں۔ جب کہ دوسرا گروہ اس پر تنقید اور اس کی ولایت اور تقوی پر قدح کر رہا ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اس کے نیک و کار اور جنتی ہونے پر بھی قدح کرتے ہیں۔ بلکہ اس کے ایمان پر بھی کلام کرتے ہیں؛ اور اسے ایمان سے خارج قرار دیتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک گروہ کی رائے فاسد ہے۔

خوارج اور روافض اور اہل اُھواء فرقوں پر اسی عنصر کا دخل ہے۔ جو کوئی اعتدال کی راہ پر چلتا ہے وہ صرف ان کی تعظیم کرتا ہے جو اس کے لائق ہو؛ پھر ان سے محبت اور دوستی کرتا ہے۔ اہل حق کو ان کا حق دیتا ہے۔ وہ حق کی بنا پر تعظیم کرتا ہے؛ اور حق کی بنا پر رحم کرتا ہے۔ اور وہ جانتا ہے کسی ایک انسان کی نیکیاں بھی ہوتی ہیں اور بدیاں بھی۔ پس وہ لائق ستائش بھی ہے اور لائق مذمت بھی؛ اسے ثواب بھی مل سکتا ہے اور سزا بھی۔ اور ایک بنا پر اس سے محبت کی جاسکتی ہے؛ اور دوسری کی بنا پر بغض۔ یہ اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے؛ جو کہ خوارج معتزلہ اور ان کے ہمنواؤں کے برعکس ہے؛ اور اپنی جگہ پر اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔

[اطاعت اور ولاء و براء کا معیار]

جب یہ بات واضح ہوگئی ؛ تو سمجھ لینا چاہیے کہ یزید کے متعلق وہی قول ہونا چاہیے جو اس کے مشابہ دیگر خلفاء اور ملوک سے متعلق ہے۔ جو کوئی اطاعت الٰہی کے کاموں میں موافقت رکھتا ہو؛ جیسے نماز؛ حج؛ اور جہاد؛ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور اقامت حدود؛ وغیرہ؛ تو وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے کاموں پر ماجور ہوگا۔ نیکو کار اہل ایمان ایسے ہی کرتے رہے ہیں؛ جیسے حضرت عبداللہ بن عمر؛ اور ان کے امثال۔ اور جو کوئی ان کے جھوٹ کی تصدیق کرے؛ اور ان کے ظلم پر ان کی مدد کرے؛ تو وہ گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ان کا مددگار ہوگا۔ اور عذاب اور مذمت کا مستحق ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین یزید کے اور اس جیسے دیگر کے ساتھ جہاد کرتے رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یزید نے اپنے والد محترم حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں غزوہ لڑا تھا۔ اس کے ساتھ اس لشکر میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ یہ پہلا لشکر تھا جس نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا تھا۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جو پہلا لشکر قسطنطنیہ پر حملہ کرے گا؛ وہ بخشا ہوا ہے۔'' [تخریج آگے آئے گی]

عمومی طور پر خلفاء اور ملوک کے دور میں فتنے واقع ہوئے ہیں۔ جیسا کہ یزید بن معاویہ کے دور میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ قتل ہوئے۔ حرہ کا واقعہ پیش آیا۔ مکہ میں ابن زبیر کا محاصرہ کیا گیا۔ اور مروان بن حکم کے زمانہ میں مرج راھط کا فتنہ اس کے اور حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کے مابین پیش آیا۔ اور عبدالملک کے زمانہ میں حضرت مصعب بن زبیر اور ان کے بھائی عبداللہ بن زبیر کے واقعات پیش آئے۔ انہیں مکہ میں محصور کیا گیا تھا۔ اور ہشام کے زمانہ میں حضرت زید بن علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ پیش آیا۔ اور مروان بھی محمد کے زمانہ میں ابو مسلم کے قتل کا فتنہ پیش آیا۔ حتی کہ ان کے ہاتھوں سے زمام حکومت نکل کر بنو عباس کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ پھر منصور کے زمانہ میں محمد بن عبداللہ بن حسن بن الحسین کا واقعہ مدینہ میں پیش آیا۔ اور بصرہ میں ان کے بھائی ابراہیم کا واقعہ۔ یہ اتنے زیادہ فتنے ہیں جن کی تفصیل طوالت اختیار کر جائے گی۔

فتنے ہر زمانہ میں اس عہد کے لوگوں کے حساب سے پیش آتے رہے ہیں۔ پہلا فتنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کا فتنہ تھا؛ جو کہ بہت ہی بڑا فتنہ تھا۔ یہی وجہ ہے امام احمد رحمہ اللہ نے مسند میں ایک مرفوع حدیث روایت کی ہے؛ فرمایا: ''تین فتنے ایسے ہوں گے جو ان سے بچ گیا؛ تو وہ نجات پا گیا۔ میری موت؛ مظلوم خلیفہ کا قتل ناحق؛ اور دجال کا فتنہ۔'' [مسند أحمد: ٤/ ١٠٥]

یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب سمندر کی موجوں کی طرح ٹھاٹھیں مارتے ہوئے فتنہ کے بارے میں پوچھا تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے آپ سے کہا: ''بیشک اس کے اور آپ کے مابین ایک بند دروازہ ہے۔ تو آپ نے پھر پوچھا: کیا اس دروازہ کو کھولا جائے گا یا توڑا جائے گا؟ تو انہوں نے کہا: نہیں؛ توڑا جائے گا۔''

تو آپ نے فرمایا: ''اگر اسے کھولا جاتا تو دوبارہ بند کیا جاسکتا تھا۔''

یہ دروازہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ قتل ہوئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے۔ تو آپ کی خلافت کے آخری عہد میں فتنوں کے اسباب پیدا ہوئے۔ حتی کہ آپ کو قتل کر دیا گاے؛ اور قیامت تک کے لیے فتنہ کا یہ دروازہ کھل گیا۔ اسی سبب کی بنا پر جنگ جمل اور جنگ صفین کا واقعہ پیش آیا۔ ان کے رجال کو ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ بیشک یہ لوگ اپنے بعد آنے والے تمام لوگوں سے افضل تھے۔

ایسے ہی حرہ کا فتنہ اور ابن اشعث کا فتنہ بھی ہے۔ اس میں بہت بڑے ایسے تابعین بھی شامل تھے؛ جن پر بعد میں آنے والوں کو قیاس کو نہیں کیا جاسکتا۔ ان ادوار میں ان فتنوں کے پیش آنے میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس عہد کے لوگوں کو دوسروں سے زیادہ برا ہونے کو واجب کرتی ہو۔ بلکہ ہر دور کا فتنہ اس عہد کے لوگوں کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

''بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے جس میں مجھے مبعوث کیا گیا ہے؛ پھر وہ لوگ ہیں جو ان کے بعد آئیں گے؛ پھر وہ لوگ ہیں جو ان کے بعد آئیں گے۔''[البخاری / سبق تخریجه]

اس زمانہ کے بعد کے فتنے بھی اس عہد کے لوگوں کے اعتبار سے ہوں گے۔ جیسا کہ روایت میں ہے:

''جیسے تم ہو گے تم پر ایسے ہی حکمران مسلط کئے جائیں گے۔''[1]

ایک دوسری روایت میں ہے؛ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:'' میں اللہ عزوجل ہوں؛ بادشاہوں کا بادشاہ؛ اور بادشاہوں کے دل اور پیشانیاں میرے ہاتھ میں ہیں؛ جس نے میری اطاعت کی ؛ میں اس پر رحمت کرتا ہوں ؛ اور جس نے میری نافرمانی کی ؛ میں اس پر اپنی ناراضگی مسلط کرتا ہوں۔ پس بادشاہوں کے سبب سے مشغول نہ ہو جاؤ؛ میری اطاعت کرو؛ میں ان کے دلوں کو تمہارے لیے نرم کردوں گا۔''[سبق تخریجه]

جب احد میں مسلمانوں کو کفار کے ہاتھوں شکست ہوئی؛ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اَوَ لَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ﴾

(آل عمران ١٦٥)

''اور کیا جب تمھیں ایک مصیبت پہنچی کہ یقیناً اس سے دگنی تم پہنچا چکے تھے تو تم نے کہا یہ کیسے ہوا؟ کہہ دے یہ تمھاری اپنی طرف سے ہے۔''

گناہوں کی سزا ختم ہوسکتی ہے؛ توبہ اور استغفار کی وجہ سے؛ اور گناہ مٹانے والی نیکیوں اور کفارہ بننے والی مصیبتوں کی وجہ سے۔ اور جو جنگ و قتل امت میں پیش آیا؛ اللہ تعالیٰ نے اس کی وجہ سے ان کے گناہ معاف کر دیے ہیں۔ جیسا کہ حدیث شریف میں بھی آتا ہے۔ اور فتنہ جاہلیت کی جنس سے ہوتا ہے؛ جیسا کہ امام زہری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ:''جب یہ

[1] رواہ السیوطي ؛ ضعیف الجامع الصغیر ٤/ ١٦٠ ـ شعب الإیمان للبیهقي ؛ وسلسلة الأحادیث الضعیفة و الموضوعة ١/ ٤٢٨ ـ الدرر المنتثرة في الأحادیث المشتهرة ص ١٦٢ .

فتنہ پیش آیا تو اس وقت اصحاب رسول اللہ ﷺ کثیر تعداد میں موجود تھے؛ان کا اس بات پر اجماع ہو گیا کہ: ''ہر وہ خون؛ اور مال اور شرمگاہ جو تأویل قرآن کی بنیاد پر حلال سمجھے گئے ہوں؛ وہ ہدر ہیں۔ اوران کے ساتھ جاہلیت والا معاملہ کیا جائے۔''

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو دین حق اور ہدایت کے ساتھ مبعوث فرمایا تھا۔ پس ہدایت کی بنا پر حق کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اور دین حق سے خیر کی معرفت حاصل ہوتی ہے اوراس پر عمل کیا جاتا ہے۔ پس حق کا علم ہونا بہت ضروری ہے۔ پھراس کا ارادہ بھی ہو اوراس پر عمل کرنے کی طاقت بھی۔ جب کہ فتنہ اس کے بالکل الٹ ہے۔ فتنہ معرفت حق ؛ اس کے قصد وارادہ اوراس پر قدرت میں مانع ہوتا ہے۔اس میں ایسے شبہات ہوتے ہیں جو حق کو باطل کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔ حتی کہ بہت سارے یا اکثر لوگ اس میں فرق ہی نہیں کر سکتے۔ اس میں اتنی خواہشات ؛ اور شہوات ہوتی ہیں جو حق کے قصد وارادہ سے باز رکھتے ہیں۔ اس میں شر میں قوت ظہور اتنی زیادہ ہوتی ہے جو کہ خیر پر قدرت کو کمزور کر دیتی ہے۔

اس لیے انسان فتنہ میں اپنے دل میں نکارت پاتا ہے۔ اور دل پر ایسے خیالات اور وساوس آتے ہیں جو حق کی معرفت اوراس کے ارادہ سے باز رکھتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ: فتنہ اندھا اور بہرا ہوتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: ''فتنے اندھیری رات کے ٹکڑے کی طرح ہوتے ہیں۔ اوراس طرح کے دیگر الفاظ میں بھی فتنہ کو بیان کیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ فتنہ میں جہالت غالب ہوتی ہے اور علم مخفی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل فتنہ کو اہل جاہلیت کی منزلت پر سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے نہ ہی جانوں کی ضمانت دی جاتی ہے اور نہ ہی اموال کی۔ اس لیے کہ ضمانت [/ یا معاوضہ] تو اس چیز کی ہوتی ہے جس میں یہ پتہ چلے کہ فلاں انسان نے کسی دوسرے کی جان یا مال کا نقصان کیا ہے؛ یا حق مارا ہے۔ جس کے بارے میں کچھ پتہ ہی نہ ہو؛ تو وہ کفار مرتدین اور متأول باغیوں میں سے اہل جاہلیت کی طرح ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ اور نہ ہی کوئی ضمانت/ یا معاوضہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس انسان پر کوئی تاوان نہیں ہوتا جو یہ سمجھتا ہو کہ اس نے برحق نقصان کیا ہے۔ اگر چہ یہ حق پر ہو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل جاہلیت یا تو اس جہالت سے توبہ کرلیں۔ پس ان کی توبہ سے ان کے عہد جاہلیت کے اعمال معاف ہوسکتے ہیں۔ یا پھر وہ ان لوگوں میں سے ہوں گے جو اپنی اس جاہلیت کی بنا پر عذاب کے مستحق ہیں ؛ جیسے کفار۔ ان لوگوں کے لیے آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کافی ہوگا۔ یا پھر یہ لوگ مجتہد متأول اور خطا کار ہوں گے۔ تو اس صورت میں جب ان کی خطائیں معاف ہوں گی تو ان کے خطاؤں کے موجبات بھی معاف کر دیے جائیں گے۔

فصل:...... یزید کے بارے میں لوگوں کی آراء

جب یہ معاملہ واضح ہوگیا تو اب ہم کہتے ہیں: یزید کے بارے میں لوگ تین طرح کی رائے رکھتے ہیں:

۱۔افراط ۲۔تفریط ۳۔وسط

پہلا گروہ:......ان کا خیال ہے کہ یزید صحابہ کرام میں سے تھا؛ یا اس کا شمار خلفاء راشدین میں ہوتا ہے؛ یا پھر انبیاء میں سے تھا۔ یہ تمام باتیں باطل ہیں۔ دوسرا گروہ: ان کا خیال ہے: یزید باطن میں کافر اور منافق تھا۔اس نے اپنے کافر رشتہ داروں کا اہل مدینہ اور بنی ہاشم سے بدلہ لیا۔ یہ دونوں قول باطل ہیں؛ ان کا باطل ہونا کسی بھی عقلمند پر مخفی نہیں ہے۔ اس لیے کہ یزید بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا۔اور بادشاہ کا خلیفہ تھا۔ رہا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مسئلہ؛ تو اس میں کسی کو بھی ذرا بھر بھی شک نہیں ہے کہ آپ کو مظلومیت کی حالت میں شہید کیا گیا۔ جس طرح کہ آپ جیسے دوسرے بہت سارے لوگ مظلومیت میں شہید کیے گئے۔حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا یا اس قتل پر راضی رہنا یا قتل پر مدد کرنا ان کے قاتلین کی طرف سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی تھی۔قتل حسین رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے لیے ایک بہت ہی دردناک مصیبت تھی جو کہ اپنوں اور پرائیوں کی وجہ سے پہنچی۔ جب کہ یہ شہادت آپ کے حق میں شہادت؛ درجات کی بلندی اور شرف و منزلت کا سبب تھی۔

آپ کے لیے اور آپ کے بھائی کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سعادت اور خوش نصیبی مقدر ہوچکی تھی۔ جو کہ کسی مصیبت اور پریشانی کے آئے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی تھی۔اہل بیت کے گھرانے میں ان بھائیوں جیسی مثالیں نہیں ملتی۔ انہوں نے اسلامی ماحول میں تربیت پائی؛ عزت و شرف کے ساتھ امن و امان میں رہے۔ پھر ان میں سے ایک کو زہر دیکر شہید کیا گیا؛ اور دوسرے کو قتل کر کے خلعت شہادت سے سرفراز کیا گیا۔ تا کہ یہ دونوں حضرات جنت میں شہداء کی منزلتیں پاسکیں۔

مگر یہ بھی یاد رہے جو کچھ اس واقعہ میں پیش آیا؛ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کے قتل سے بڑھ کر نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں خبر دی ہے کہ بنی اسرائیل اپنے انبیاء کرام علیہم السلام کو ناحق قتل کیا کرتے تھے۔ کسی نبی کا قتل ہونا بہت بڑی مصیبت اور بہت بڑا گناہ ہے۔ ایسے ہی خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قتل حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل سے بڑا گناہ اور مصیبت ہے۔ایسے ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل بہت بڑی مصیبت اور بڑا گناہ تھا۔ جب یہ سارے امور مصائب و ابتلاء ہیں تو مصیبت اور پریشانی کے وقت مسلمان پر صبر و استقامت کے دامن کو تھامنے رکھنا' اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا واجب ہوجاتا ہے ؛اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ٥الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ﴾

[البقرہ]

''اوران صبر کرنے والوں کو بشارت سنا دیجیے' جنہیں جب کوئی مصیبت آتی ہے تو کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم تو خود اللہ تعالی کی ملکیت ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔''

مسند اُمام اُحمد اور سنن ابن ماجہ میں حضرت فاطمہ بنت حسین، حضرت حسین سے روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جس پر کوئی پریشانی آئی پھر وہ اس کو یاد کر کے ازسرنو (إنـا لـلّٰهِ وإنا إليهِ راجعون) کہے؛ خواہ ایک زمانہ گزرنے کے بعد ہو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اتنا ہی اجر لکھیں گے جتنا پریشانی کے دن لکھا تھا۔'' ❶

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور آپ کی دختر محترمہ کی روایت اس قتل گاہ پر ایک گواہی اور شہادت ہے۔ بیشک قتل حسین رضی اللہ عنہ ایسی مصیبت ہے جسے یاد کرتے رہنا چاہیے بھلے جتنا لمبا زمانہ بھی گزر جائے۔ تو مسلمان کے لیے مشروع یہ ہے کہ اس موقع پر ازسرنو (إنـا لِلهِ وإنا إليهِ راجعون) کہے۔ باقی جو کچھ دیکھنے میں آتا ہے اپنے چہرے پیٹنا؛ گریبان پھاڑنا؛ اور جاہلیت کی طرح آہ و بکا کرنا؛ یہ ایسے امور ہیں جن کو اللہ اور اس کا رسول ﷺ ناپسند کرتے ہیں۔ شریعت اسلامیہ میں ایسی حرکات حرام ہیں۔ اور نبی کریم ﷺ نے ان حرکات کے کرنے والوں سے برأت کا اظہار کیا ہے۔

جیسا کہ صحیح احادیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص (غمی و ماتم میں) اپنے رخساروں کو پیٹے اور گریبان پھاڑے اور جاہلیت کے لوگوں کی طرح گفتگو کرے تو وہ ہم میں سے نہیں ہے۔'' [سبق تخریجہ]

ایک روایت میں ہے رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں سے اظہار برأت فرمایا:

''مصیبت کے وقت آواز بلند کرنے والی سے؛ پریشانی میں اپنا سر منڈوانے والی سے؛ اور ماتم میں اپنا گریبان پھاڑنے والی سے۔'' ❷

اور مسلم شریف کی صحیح روایت میں یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نوحہ کرنے والی اگر اپنی موت سے پہلے توبہ نہ کرے تو قیامت کے دن اس حال میں اٹھے گی کہ اس پر گندھک کا کرتا اور زنگ کی چادر ہوگی۔'' ❸

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک نوحہ کرنے والی عورت کو پیش کیا گیا تو آپ نے اسے کوڑے لگانے کا حکم دیا۔ آپ

---

❶ سنن ابن ماجه: حديث نمبر ١٦٠٠ ـ كتاب الجنائز؛ باب ماجاء في الصبر على المصيبة .

❷ صحيح بخاري: ح٧٤٨ ـ ٢/ ٨١؛ كتاب الجنائز؛ باب ليس منا من شق الجيوب؛ مسلم ١/ ١٠٠؛ كتاب الإيمان؛ باب تحريم ضرب الخدود ـ

❸ مسلم ٢/ ٦٤٤ ـ كتاب الجنائز؛ باب التشديد في النياحة؛ سنن ابن ماجة ١/ ٥٠٣؛ كتاب الجنائز باب في النهي عن النياحة ـ مسند أحمد ٥/ ٣٤٢ ـ

سے کہا گیا: اے امیر المؤمنین! اس نے شعر پڑھ کر نوحہ شروع کیا تھا۔ تو آپ نے فرمایا: ''اس نے صبر نہیں کیا؛ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے اور اپنی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس [ماتم اور آہ و بکا] سے منع کیا ہے۔ آہ و بکا کرنا زندہ کو فتنہ میں ڈالتا ہے۔ اور میت کو تکلیف دیتا ہے۔ ...... بیشک یہ میت پر نہیں رو رہی بلکہ تمہارے دراہم کے لیے رو رہی ہے۔''

فصل: ...... قتل حسین رضی اللہ عنہ میں لوگوں کی آراء

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بارے میں لوگ تین گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ افراط و تفریط اور وسط۔

۱۔ ایک گروہ کا کہنا تھا: آپ کو برحق قتل کیا گیا۔ اس لیے کہ آپ مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنا اور مسلمانوں کی جماعت کا شیرازہ بکھیرنا چاہتے تھے۔ صحیحین میں ثابت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب تمہارے پاس کوئی آئے اور تمہارا نظام ایک آدمی کے ہاتھ میں ہو اور وہ تمہاری جماعت میں تفریق پیدا کرنا چاہتا ہو تو اسے قتل کردو۔'' [صحیح مسلم ۳/ ۱٤۷۹؛ وسنن ابو داؤد ٤/ ۳۳٤]

ان لوگوں کا کہنا ہے کہ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے خروج کیا تو اس وقت مسلمانوں کا نظام ایک آدمی کے ہاتھ میں تھا۔ آپ اس جماعت میں تفریق پیدا کرنا چاہتے تھے۔ بعض لوگ کہتے ہیں:

''آپ پہلے خارجی تھے جنہوں نے اسلام میں مسلمان حکمرانوں پر خروج کیا۔''

۲۔ دوسرا گروہ کہتا ہے: ''آپ واجب الاطاعت امام تھے۔ آپ کے حکم کے بغیر امور ایمان میں سے کوئی بھی حکم نافذ نہیں ہوسکتا تھا۔ باجماعت نماز اور جمعہ صرف اسی کے پیچھے پڑھے جاسکتے ہیں جس کو آپ والی مقرر کردیں۔ اور آپ کے حکم کے بغیر کفار سے جہاد بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ان لوگوں کے اور اس طرح کے دیگر اقوال بھی ہیں۔

۳۔ تیسرا گروہ: متوسط گروہ ہے؛ اہل سنت والجماعت؛ یہ نہ ہی پہلی بات کہتے ہیں اور نہ ہی دوسری۔ بلکہ ہم کہتے ہیں: آپ کو مظلومیت میں شہید کیا گیا ہے۔ لیکن آپ اس امت کے ولی امر بھی نہیں تھے۔ حدیث مذکور آپ کو شامل نہیں ہے۔ اس لیے کہ جب آپ کو اپنے چچا زاد حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر ملی تو آپ نے خلافت کی طلب ترک کردی تھی۔ آپ نے مطالبہ کیا کہ آپ کو یزید کے پاس جانے دیا جائے؛ یا پھر انہیں محاذ جنگ پر جانے دیا جائے۔ یا پھر واپس اپنے شہر میں جانے دیا جائے۔ مگر ظالموں نے ایسا کچھ بھی نہیں کرنے دیا۔ بلکہ آپ سے گرفتاری پیش کرنے کا مطالبہ کیا۔ ایسا کرنا آپ پر واجب نہیں تھا۔ [بلکہ آپ کی شان کے خلاف تھا' اسی لیے آپ ڈٹ گئے' اور یہ واقعہ پیش آیا]۔

فصل:......شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ اور بدعات کی شروعات

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے سبب لوگوں میں دوقسم کی بدعات پیدا ہوئیں:

۱۔ یوم عاشوراء پر ماتم اورغم وحزن کی مجالس قائم کرنے کی بدعت ۔جس میں چہروں کو پیٹا جاتا ہے؛ نوحہ گری کی جاتی ہے' اور رویااور چلاّیا جاتا ہے؛ پیاس کاٹی جاتی ہے؛اور مرثیے پڑھے جاتے ہیں ۔سلف صالحین پرلعن وطعن اور ملامت کی جاتی ہے ۔اور گنہگاروں کے ساتھ ان لوگوں کوبھی شامل کردیا جاتا ہےجن کا کوئی گناہ ہی نہیں ۔ یہاں تک کہ سابقین اولین رضی اللہ عنہم کو گالیاں دی جاتی ہیں ۔اورلوگوں کوایسی روایات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں جن میں اکثر جھوٹ ہوتا ہے۔ یہ چیزیں ایجاد کرنے والے کا مقصد مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنا اور فتنہ کا دروازہ کھولنا تھا۔[حالانکہ]ایسا کرنا باتفاق مسلمین نہ ہی واجب ہے اور نہ ہی مستحب ۔بلکہ پرانے مصائب پرگریہ وزاری اور نوحہ کرنا ان بُرے امور میں سے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام ٹھہرایا ہے ۔اور یہی حال فرحت وخوشی کی محفلیں جمانے کا ہے۔

کوفہ میں شیعان حسین رضی اللہ عنہ کی ایک قوم آباد تھی ؛ جوآپ کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ان کا بڑا سردار مختار بن عبید ثقفی کذاب تھا۔اور ایک قوم نواصب کی تھی جوحضرت علی رضی اللہ عنہ اوران کی اولاد سےبغض رکھتے تھے۔ان میں سے حجاج بن یوسف ثقفی تھا۔صحیح مسلم میں سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم سےمنقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

''قبیلہ ثقیف میں ایک کذاب اورایک سفاک (ناحق خون بہانے والا) ہوگا۔''[مسلم ٤/ ١٩٧١]

آپ کے ارشادگرامی کےمطابق ثقیف کا کذاب مختار بن ابی عبید شیعہ تھا اورسفاک حجاج بن یوسف ثقفی ناصبی تھا۔ شیعہ نےغم واندوہ کی مجلسیں لگانی شروع کیں تو ناصبیوں نےخوشی اورمسرت کی مجالس جمالیں۔اورانہوں نے روایات گھڑ لیں کہ: جوکوئی عاشوراء کے دن اپنے اہل خانہ کےکھانے میں وسعت کرتا ہے' اللہ تعالیٰ سارے سال کے لیےاس کے رزق میں وسعت پیدا کردیتے ہیں۔[یہ اللہ اوراس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پرجھوٹ اورالزام تراشی ہے۔دس محرم کےروزے کےعلاوہ کسی چیز کی کوئی فضیلت ثابت نہیں]

امام حرب الکرمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:'' میں نے احمد بن حنبل رحمہ اللہ سےاس روایت کےمتعلق پوچھا: تو آپ نے فرمایا: اس روایت کی کوئی اصل [بنیاد] ہی نہیں ہے۔''سوائے اس روایت کے جوسفیان بن عیینہ نے ابراہیم بن محمد بن منتشرکوفی سے روایت کیا ہے؛ وہ اپنے والد سےنقل کرتا ہے۔وہ کہتا ہے:ہمیں یہ حدیث پہنچی ہے کہ: جوکوئی عاشوراء کے دن اپنے اہل خانہ کےکھانے میں وسعت کرتا ہے......''

ابن منتشرکوفی نے ایسےلوگوں سے سنا اورروایت کیا ہےجنہیں وہ جانتا نہیں ہے۔

ایسے ہی انہوں نے ایک اور روایت گھڑلی ہے کہ: جس نے عاشوراء کے دن سرمہ لگایا؛ اسے پورا سال آنکھ میں

تکلیف نہیں ہوگی۔اور جس نے عاشوراء کے دن غسل کیا وہ اس سال میں بیمار نہیں ہوگا۔اس وجہ سے کچھ لوگ عاشوراء کے دن غسل کرنے اور سرمہ لگانے ؛ اپنے اہل وعیال کے خرچ میں وسعت کرنے اور نئے نئے کھانے بنانے کو مستحب سمجھنے لگ گئے۔

یہ حقیقت میں بدعات ہیں جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر تعصب رکھنے والے لوگوں نے گھڑ لی ہیں۔اور دوسری طرف وہ بدعات ہیں جو آپ کی ذات کے لیے تعصب کرنے والوں نے گھڑ لی ہیں۔[حقیقت میں یہ سب بدعات اور باطل امور ہیں] ہر بدعت گمراہی ہوتی ہے۔ائمہ اربعہ یا ان کے علاوہ دیگر ائمہ میں سے کسی ایک نے بھی اسے مستحب نہیں کہا۔نہ ہی یہ امور اور نہ ہی وہ امور۔اور نہ ہی ان چیزوں میں سے کسی ایک کو بھی مستحب ماننے کی کوئی شرعی حجت موجود ہے۔بلکہ جمہور علماء کرام کے نزدیک یوم عاشورا کا مستحب عمل روزہ رکھنا ہے۔اس کے ساتھ نویں محرم کا روزہ رکھنا بھی مستحب ہے۔اور بعض نے صرف دس تاریخ کے روزہ کو مکروہ جانا ہے۔یہ ایک لمبی تفصیل ہے جس کے بیان کا یہ موقع نہیں۔

جن لوگوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا قصہ نقل کیا ہے؛ انہوں نے اس میں بہت کچھ جھوٹ اپنی طرف سے زیادہ کر دیا ہے؛ جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ نقل کرنے والوں نے اس میں بہت کچھ اپنی طرف سے ملا دیا۔ان لوگوں کا ارادہ یہ تھا کہ اس طرح کے واقعات و حادثات کو لوگوں کے سامنے بڑھا چڑھا کر پیش کریں۔جیسا کہ مغازی اور فتوحات کے ضمن میں اس طرح کی چیزیں زیادہ کی گئی ہیں۔

شہادت حسین رضی اللہ عنہ کا واقعہ لکھنے والوں میں ایسے بھی ہیں جو اہل علم ہیں' جیسے کہ علامہ بغوی اور ابن ابی الدنیا ؛وغیرہما۔مگر اس کے باوجود ان کی مرویات میں منقطع آثار اور باطل قصے بھی پائے جاتے ہیں۔جو واقعات مصنفین نے بغیر اسناد کے ذکر کیے ہیں ان میں بہت سارا جھوٹ ہے۔صحیح بات یہ ہے کہ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کیا گیا تو آپ کا سر عبیداللہ بن زیاد کے سامنے لا کر رکھا گیا۔اس نے چھڑی سے آپ کے دانتوں پر مارا۔اس مجلس میں انس بن مالک اور ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہما موجود تھے۔صحیح بخاری میں ہے؛ محمد بن سیرین حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ:

''جب عبیداللہ بن زیاد کے پاس حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر مبارک لایا گیا اور طشت میں رکھا گیا؛ تو ابن زیاد ان کی آنکھ اور ناک میں مارنے لگا [اور آپ کی خوبصورتی پر اعتراض کیا تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا]:'' آپ سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ تھے۔اور اس وقت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سر اور داڑھی میں وسمہ کا خضاب کیا ہوا تھا۔'' [صحیح بخاری:ح ٩٥٤]

بخاری شریف میں ہی ہے: حضرت ابن ابی نعیم سے روایت ہے انہوں نے فرمایا:

'' میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے سنا ان سے کسی نے یہ مسئلہ دریافت کیا تھا اگر کوئی محرم (یعنی وہ شخص جو احرام کی حالت میں ہو) کسی مکھی کو مار ڈالے (تو کیا حکم ہے؟) تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے

فرمایا:''اے اہل عراق! تم مکھی کے قتل کا مسئلہ دریافت کرتے ہو؛ حالانکہ تم نے رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی کے بیٹے (حسین رضی اللہ عنہ) کو قتل کر دیا؛ جبکہ نبی ﷺ نے فرمایا تھا:'' یہ دونوں میری دنیا کے دو پھول ہیں۔''❶

ایک مجہول سند کے ساتھ یہ بھی روایت کیا گیا ہے یہ واقعہ یزید کے سامنے پیش آیا۔اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر یزید کے پاس لے جایا گیا تھا۔ اور اس نے چھڑی سے آپ کے دانتوں پر مارا تھا۔ باوجود اس کے کہ یہ واقعہ ثابت نہیں ہے؛ پھر بھی روایت میں اس کے جھوٹے ہونے کی گواہی موجود ہے۔ اس لیے کہ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین چھڑی مارنے کے وقت موجود تھے وہ عراق میں تھے' شام میں نہیں تھے۔اور کئی لوگوں نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ یزید نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ اور نہ ہی وہ آپ کو قتل کروانا چاہتا تھا۔ بلکہ وہ آپ کو عزت و اکرام سے رکھنا چاہتا تھا جیسا کہ اس کے والد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے وصیت فرمائی تھی۔مگر اس کی چاہت یہ بھی تھی کہ آپ کو خروج سے روکا جائے' اور آپ کو عراق میں حکومت قائم نہ کرنے دی جائے۔ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ عراق پہنچے تو انہیں معلوم ہو گیا کہ اہل عراق انہیں رسوا کریں گے' اور انہیں گرفتار کرلیں گے؛ تو آپ نے تین مطالبات کیے:

۱۔ مجھے یزید کے پاس جانے دیا جائے۔

۲۔ یا پھر مجھے اپنے وطن واپس جانے دیا جائے۔

۳۔ یا کسی محاذ جنگ پر جانے دیا جائے۔

مگر انہوں نے گرفتار کرنے کے علاوہ کسی بات پر رضامندی ظاہر نہ کی۔ اور آپ سے جنگ کی یہاں تک کہ آپ مظلومیت کی حالت میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اور جب آپ کے قتل کی خبر یزید اور اہل کے اہل خانہ تک پہنچی تو ان پر بہت گراں گزری۔ اور آپ کے قتل پر رونے لگے۔ یزید نے کہا: اللہ تعالیٰ ابن مرجانہ - یعنی عبید اللہ بن زیاد - پر لعنت کرے؛ اللہ کی قسم! اگر اس کے اور حسین کے مابین کوئی رحم کا تعلق ہوتا تو وہ آپ کو قتل نہ کرتا۔'' اور کہا: میں قتل حسین رضی اللہ عنہ کے بغیر اہل عراق کی اطاعت پر راضی تھا۔'' اور پھر اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اہل خانہ کو بہترین انداز میں تیار کر کے مدینہ روانہ کیا۔مگر اس کے ساتھ ہی اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا بدلہ نہیں لیا' اور نہ ہی آپ کے قاتل کو قتل کیا۔

باقی رہا یہ قصہ جو آپ کے اہل خانہ خواتین اور بچوں کو قیدی بنانے اور بغیر پالان کے اونٹوں پر بیٹھا کر شہروں میں گھمانے کے بارے میں نقل کیا گیا؛ یہ سراسر جھوٹ اور باطل ہے۔ مسلمانوں نے کبھی بھی کسی ہاشمیہ کو قیدی نہیں بنایا۔ وللہ الحمد۔ اور نہ ہی کبھی امت محمد ﷺ نے کسی ہاشمیہ کو قیدی بنانے کو حلال سمجھا ہے۔ مگر اہل ہواء اور جاہل لوگ بہت زیادہ جھوٹ بولتے ہیں۔ جیسا کہ ان میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ: حجاج بن یوسف نے بنی ہاشم کی ایک جماعت کو قتل کیا تھا۔''

❶ بخاري:ح٩٥٩؛ البخاري ٥/ ٢٧؛ كتاب فضائل أصحاب النبي ﷺ؛ باب مناقب الحسن و الحسين؛ سنن الترمذي ٥/ ٣٢٢؛ كتاب المناقب؛ باب مناقب أبي محمد الحسن و الحسين.

بعض وعاظ اور علوی ہونے کے دعویداروں؛ جن کے نسب میں طعن تھا؛ کے مابین ایک عجیب قصہ پیش آیا۔ ان میں سے ایک آدمی نے منبر پر کہا: ''حجاج نے سارے سید قتل کر دیے تھے: ان کی عورتوں کے لیے کوئی ایک بھی مرد باقی نہیں بچا تھا؛ پھر انہوں نے دوسرے لوگوں سے شادیاں کرلیں۔ پس یہ لوگ انہی میں سے ہیں۔''

حقیقت میں یہ تمام باتیں جھوٹ ہیں۔ حجاج نے باوجود اس کے کہ اس نے دوسرے لوگوں میں قتل عام کیا تھا مگر بنی ہاشم میں سے کسی ایک فرد کو بھی قتل نہیں کیا۔ اس لیے کہ عبدالملک نے اس کے پاس خصوصی پیغام بھیجا تھا کہ خبردار بنی ہاشم کے ساتھ کچھ بھی تعرض نہ کرنا۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ بنی حرب نے جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے تعرض کیا تو ان کے ساتھ جو معاملہ ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ حجاج نے دیگر بہت سارے عرب سرداروں اور باقی لوگوں کو قتل کیا تھا۔ اس رافضی جاہل نے جب سنا کہ حجاج نے عرب اشراف کو قتل کیا تھا؛ تو اس نے یہ سوچ لیا کہ اس نے سادات ہی کو قتل کیا ہوگا۔ اس لیے کہ عام طور پر اشراف کا لفظ بنی ہاشم یا بعض بنی ہاشم پر بولا جاتا ہے۔ اور بعض علاقوں میں اشراف سے مراد حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد لیے جاتے ہیں۔ اور بعض لوگوں کے ہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تمام اولاد اشراف شمار ہوتے ہیں۔

لفظ ''اشراف'' پر کوئی شرعی حکم مرتب نہیں ہوتا۔ بلکہ حکم کا تعلق بنی ہاشم سے ہے۔ کہ ان لوگوں پر بھی صدقہ حرام ہے۔ اور ان کا شمار آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوتا ہے؛ اس کے علاوہ بھی کچھ احکام ہیں۔

حجاج نے عبداللہ بن جعفر کی بیٹی سے شادی کر رکھی تھی۔ اس پر بنی امیہ راضی نہیں ہوئے یہاں تک کہ اسے طلاق دلوا دی؛ اس لیے کہ بنو امیہ بنو ہاشم کی بہت زیادہ تعظیم کرتے تھے۔ [اس لیے کہ بنو ہاشم اور بنو امیہ دونوں کا تعلق بنو مناف سے ہے]۔

خلاصہ کلام! اسلام کی تاریخ میں ایسی مثال نہیں ملتی کہ انہوں نے کسی ایسی عورت کو قیدی بنایا ہو جس کا تعلق بنو ہاشم سے ہو اور نہ ہی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد کو قیدی بنایا گیا۔ بلکہ جب یہ لوگ یزید کے گھر میں داخل ہوئے تو وہاں پر آہ و بکاء سے کہرام مچ گیا۔ یزید نے ان لوگوں کی خوب عزت افزائی کی؛ اور انہیں اپنے پاس شام میں رہنے یا مدینہ طیبہ واپس جانے کا اختیار دیا۔ ان لوگوں نے مدینہ واپس جانے کو پسند کیا۔ نہ ہی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سر کو گھومایا گیا؛ [اور نہ ہی کچھ دیگر ایسا ہوا] ان واقعات میں اتنے جھوٹے قصے شامل کر دیے گئے ہیں جن کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔

باقی رافضی نے قتل حسین رضی اللہ عنہ کے بعد جن واقعات اور عقوبات کا ذکر کیا ہے؛ تو اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا قتل بہت بڑے گناہوں اور جرائم میں سے ہے۔ اور آپ کو قتل کرنے والا؛ اس قتل پر راضی رہنے والا اور اس پر مدد کرنے والا اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس سزا و عقاب کا مستحق ہے جو ایسے قتل پر ملنی چاہیے۔ لیکن یہ ذہن میں رہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا قتل ان لوگوں کے قتل سے بڑھ کر نہیں ہے جو آپ سے افضل تھے اور قتل کر دیے گئے؛ جیسا کہ انبیاء کرام علیہم السلام اور سابقین اولین؛ اور وہ لوگ جو مسیلمہ کے ساتھ جنگ میں شہید ہوئے۔ اور شہدائے احد؛ اور وہ لوگ جو بئر معونہ پر قتل کیے گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتل سے بڑھ کر نہیں۔ خصوصاً جن لوگوں نے

آپ کے والدِ ماجد کو قتل کیا؛ وہ تو آپ کو کافر اور مرتد سمجھتے تھے۔ اور آپ کے قتل کرنے کو اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

بخلاف ان لوگوں کے جنہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کیا۔ اس لیے کہ وہ لوگ آپ کو کافر نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ ان میں سے اکثر لوگ آپ کو قتل کرنے کے خلاف تھے۔ اور آپ کے قتل کرنے کو بہت بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے اغراض و مقاصد کے لیے قتل کیا۔ جیسا کہ لوگ اقتدار کے لیے آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں۔

اس سے واضح ہوگیا کہ اس بارے میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے اس میں بہت زیادہ جھوٹ ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہنا کہ اس دن آسمان سے خون کی بارش ہوئی۔ ایسا تو کسی ایک کے قتل پر بھی کبھی نہیں ہوا اور یہ واقعہ بیان کرنا کہ اس دن دوپہر کے وقت آسمان پر سرخی ظاہر ہوگئی۔ یہ سرخی اس سے پہلے کبھی ظاہر نہیں ہوئی۔ یہ ایسی من گھڑت باتیں ہیں؛ جن کی مثال سابق میں نہیں ملتی۔ اس لیے کہ یہ سرخی تو ظاہر ہوتی رہتی ہے مگر اس کے کچھ اور طبعی اسباب ہیں؛ یہ ایسے ہیں جیسے شفق۔

ایسے ہی رافضی کا یہ دعوی کرنا کہ: ''اس دن جو بھی پتھر اٹھایا جاتا اس کے نیچے سے خون نکلتا۔''

یہ صاف جھوٹ ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قاتلان حسین رضی اللہ عنہ میں سے کوئی بھی ایسا نہیں بچا جسے دنیا میں سزا نہ دی گئی ہو۔ گناہوں میں سے جس گناہ کی سزا بہت ہی جلد مل جاتی ہے وہ کسی پر ظلم کرنا ہے۔ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر ظلم کرنا سب سے بڑا ظلم ہے۔

[اشکال]: رافضی مصنف کا کہنا ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے متعلق مسلمانوں کو بہت زیادہ وصیت کیا کرتے؛ آپ فرمایا کرتے تھے: ''یہ تمہارے پاس میری امانت ہیں۔'' پھر اللہ تعالیٰ نے آیت نازل کی:

﴿قُلْ لَّا اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾ (الشوریٰ)

''آپ فرمادیں کہ میں قرابت داری کی محبت کے سوا تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتا۔''

[جواب]: حسن وحسین رضی اللہ عنہما کا حق واجب ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ اور مدینہ کے مابین غدیر خم کے مقام پر لوگوں سے خطاب کیا؛ آپ نے فرمایا:

''میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑے جا رہے ہوں، ان میں سے پہلی اللہ کی کتاب ہے، جس میں ہدایت اور نور ہے تو تم اللہ کی اس کتاب کو پکڑے رکھو اور اس کے ساتھ مضبوطی سے قائم رہو اور آپ نے اللہ کی کتاب (قرآن مجید) کی خوب رغبت دلائی، پھر آپ نے فرمایا: ''(دوسری چیز) میرے اہل بیت ہیں۔ میں تم لوگوں کو اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ یاد دلاتا ہوں، میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تم لوگوں کو اللہ یاد دلاتا ہوں، میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تم لوگوں کو اللہ یاد دلاتا ہوں۔'' [1]

---

[1] صحیح مسلم: ح ۱۷۲۵۔ اس حدیث کا بقیہ حصہ یہ ہے: حضرت حصین رضی اللہ عنہ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ سے عرض کیا اے زید! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کون ہیں؟ کیا آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اہل بیت میں سے نہیں ہیں؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ⇦⇦⇦

اس میں کوئی شک نہیں کہ جناب حسن و حسین رضی اللہ عنہما سب سے بڑے اہم ترین اور خواص اہل بیت میں سے ہیں جیسا کہ حدیث شریف سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کو بلوایا اور ان سب پر ایک چادر ڈال دی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے تھے پھر ان پر بھی چادر ڈال دی اور دعا کی: ''یا اللہ! یہ بھی میرے اہل بیت ہیں، ان سے گناہ کی نجاست دور کر دے اور ان کو بھی خوب پاک کر دے۔''[1]

رافضی مصنف کا کہنا ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے متعلق مسلمانوں کو بہت زیادہ وصیت کیا کرتے تھے؛ آپ فرمایا کرتے تھے: ''یہ تمہارے پاس میری امانت ہیں۔''

حدیث کی معروف کتابوں میں اس طرح کی کوئی حدیث نہیں پائی جاتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس بات سے بلند و برتر ہیں کہ اپنے بیٹے مخلوق کے پاس امانت چھوڑ کر جائیں۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی کوئی وصیت کی ہوتی تو ان کی ایسے حفاظت کی جاتی جیسے امانت کی حفاظت کی جاتی ہے۔ مردوں کو امانت نہیں رکھا جاتا۔ اگرچہ بچوں کو ایسے لوگوں کے پاس امانت رکھا جاتا ہے جو ان کی تربیت کریں' اور ان کی خاطر خواہ حفاظت کر سکیں۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب بچے چھوٹے اور گود میں ہوں۔ پھر جب وہ بالغ ہو جائیں تو ان کو گود نہیں لیا جاتا۔ ان میں سے ہر کوئی خود مختار ہو جاتا ہے۔ اور اگر رافضی مصنف یہ کہنا چاہتا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ یہ تھا کہ امت آپ کی حفاظت کرے' اور آپ کی چوکیداری کرے۔ تو یقیناً اللہ تعالیٰ سب سے بہتر حفاظت کرنے والا ہے۔ وہ بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ تو پھر امت کے کسی فرد سے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ مصائب و آفات سے آپ کی حفاظت کرے۔

اگر اس سے مراد یہ ہو کہ انہیں تکلیف نہ دی جائے؛ ان پر ظلم نہ کیا جائے۔ اور جو کوئی ان پر ظلم کرے تو اس کے خلاف ان کی مدد کی جائے؛ تو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کسی ادنی مسلمان کے لیے بھی واجب ہے؛ تو پھر آپ کے لیے کیسے واجب نہ ہوتا؟ یہ مسلمان کے مسلمان پر حقوق میں سے ہے۔ جبکہ ان دونوں شہزادوں کا حق کسی بھی دوسرے کے حق سے بڑھ کر ہے۔

آیت ﴿اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾ کا شان نزول:

❀ شیعہ کا کہنا کہ: پھر اللہ تعالیٰ نے آیت نازل کی: ﴿ قُلْ لَّا اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾ (شوریٰ) ''آپ فرما دیں کہ میں قرابت داری کی محبت کے سوا تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتا۔''

⇦⇦⇦ آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن آپ کے اہل بیت میں سے ہیں، اور وہ سب اہل بیت میں سے ہیں جن پر آپ کے بعد صدقہ (زکواۃ، صدقہ و خیرات وغیرہ) حرام ہے۔ حضرت حصین رضی اللہ عنہ نے عرض کیا وہ کون ہیں؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خاندان، حضرت عقیل کا خاندان، آل جعفر، آل عباس۔ حضرت حصین رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ان سب پر صدقہ وغیرہ حرام ہے؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں! ان سب پر صدقہ، زکوٰۃ وغیرہ حرام ہے۔ اس سے ظاہر ہوا جو لوگ صرف اولاد فاطمہ رضی اللہ عنہا کو عترت یا اہل بیت شمار کرتے ہیں وہ خطاء پر ہیں۔

[1] جامع ترمذی: حدیث نمبر ۱۱۵۳۔

یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ یہ آیت سورت شوریٰ میں ہے۔ جو کہ بالا تفاق مکی سورت ہے۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ اس کا نزول حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی اور حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی ولادت سے بہت پہلے ہوا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہجرت کے دوسرے سال مدینہ میں شادی کی تھی۔ اور غزوہ بدر کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی ہوئی۔ ❶ غزوہ بدر سن دو ہجری میں پیش آیا تھا۔ اس پر تفصیلی کلام پہلے گزر چکا ہے۔ اور اس سے وہی مراد ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں قریش کی کوئی شاخ ایسی نہیں ہے جس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا تعلقِ قرابت داری نہ ہو اس آیت کے بارے میں:

﴿ قُلْ لَا اَسْاَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ﴾ [الشوری ۲۳]

''کہہ دیجئے! کہ میں اس پر تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا مگر محبت رشتہ داری کی۔''

آپ فرماتے ہیں: کہ ان قرابت دارانہ تعلقات کی بنا پر جو میرے اور تمہارے درمیان پائے جاتے ہیں تو مجھ سے الفت و محبت کا سلوک روا رکھو۔'' ❷، ❸

اہل سنت والجماعت اور شیعہ میں سے مصنفین کی ایک جماعت اور امام احمد رحمہ اللہ کے اصحاب نے ایک حدیث ذکر کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو لوگوں نے پوچھا: یارسول اللہ! اس سے کون لوگ مراد ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''علی اور فاطمہ اور ان کے دو بیٹے۔'' یہ روایت باجماع محدثین جھوٹ اور من گھڑت ہے۔

اس کی وضاحت اس چیز سے ہوتی ہے کہ یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی تھی۔ مفسرین کا اتفاق ہے کہ پوری کی پوری سورت شوریٰ مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ بلکہ ساری حوامیم [السبع] مکی سورتیں ہیں۔ حضرت علی اور فاطمہ رضی اللہ عنہما کی شادی مدینہ میں ہجرت کے بعد ہوئی ہے۔ حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کی ولادت بالترتیب سن تین اور چار ہجری میں ہوئی ہے۔ تو پھر یہ کہنا کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ مکہ میں جب یہ سورت نازل ہوئی تو لوگوں نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! اس سے کون لوگ مراد ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''علی اور فاطمہ اور ان کے دو بیٹے۔''

حافظ عبدالغنی المقدسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت حسن رضی اللہ عنہ ۱۵ رمضان ۳ھ کو پیدا ہوئے۔ یہ آپ کی پیدائش کی بابت

---

❶ صحیح بخاری، کتاب فرض الخمس، باب فرض الخمس (ح:۳۰۹۱) صحیح مسلم، کتاب الاشربۃ۔ باب تحریم الخمر (ح:۱۹۷۹)۔

❷ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب المناقب (حدیث:۳۴۹۷)

❸ قبیلہ قریش کے ساتھ سرور کائنات ﷺ کی قرابت داری کی روشن مثال حضرت ابوسفیان کے ساتھ نبی کریم ﷺ کے عزیزانہ مراسم ہیں۔ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ جب کفار مکہ نبی کریم ﷺ کو ستاتے تو آپ ابوسفیان کے گھر میں پناہ لیتے تھے۔ اسی لیے آپ نے فتح مکہ کے دن اعلان فرمایا کہ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگا وہ امن پائے گا۔ (سنن ابی داود۔ کتاب الخراج۔ باب ما جاء فی خبر مکۃ، (ح: ۳۰۲۱، ۳۰۲۲) اس کی تفصیلات کے لیے وہ حاشیہ ملاحظہ فرمائیے جس میں نبی کریم ﷺ اور ابوسفیان کے باہمی روابط و تعلقات کی تفصیل درج ہے۔

صحیح ترین قول ہے۔ اور آپ کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ ۲۵ شعبان ۴ھ کو پیدا ہوئے۔ اور بعض نے سن تین ہجری کہا ہے۔
میں کہتا ہوں: جس نے کہا ہے: حضرت حسن رضی اللہ عنہ سن دو ہجری میں پیدا ہوئے؛ یہ قول ضعیف ہے۔ اس لیے کہ صحیح احادیث میں ثابت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حضرت فاطمہ سے شادی سن دو ہجری میں غزوہ بدر کے بعد ہوئی تھی۔''

[الإِصابة فِي ترجمةِ فاطِمة رَضِیَ اللہُ عنہا:٤/ ٣٦٦]

فصل:...... یزید پر لعنت کا مسئلہ

[اشکالات] :شیعہ مصنف رقم طراز ہے:''اہل سنت کی ایک جماعت یزید کو خلیفہ نہ ماننے کے باوجود اس پر لعنت نہیں بھیجتی ؛ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ یزید ظالم تھا؛ اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کیا؛ اور آپ کے اہل خانہ کو گرفتار کیا۔حالانکہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:﴿ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ﴾ (ھود:۱۸)

''آگاہ ہو جاؤ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔''

حنابلہ کے شیوخ میں سے ابو الفرج ابن جوزی رحمہ اللہ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے' آپ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کی : میں نے یحی بن زکریا علیہما السلام کے بدلہ میں ستر ہزار کو قتل کیا۔ اور میں آپ کے نواسے کے بدلے میں انچاس کروڑ لوگوں کو قتل کروں گا۔ اور اہل سنت کے فضلاء میں سے سدّی رحمہ اللہ نے حکایت نقل کی ہے کہ: جب میں کربلا میں اترا تو میرے پاس تجارت کے لیے غلہ وغیرہ تھا۔ ہم نے ایک آدمی کے پاس پڑاؤ ڈالا اور اس کے ہاں شام کا کھانا کھایا۔ ہم قتل حسین رضی اللہ عنہ کے واقعہ کو یاد کرنے لگے۔ ہم نے کہا: قتل حسین رضی اللہ عنہ میں جو کوئی بھی شریک ہوا تھا وہ انتہائی بری موت مرا ہے۔ تو وہ آدمی کہنے لگا: تم سے بڑھ کر جھوٹا کوئی نہیں۔ میں آپ کے قتل میں شریک تھا۔ اور ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے آپ کو قتل کیا؛ مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ آپ کہتے ہیں: جب رات کا آخری حصہ تھا تو ایک چیخنے والے نے چیخ لگائی۔ ہم نے پوچھا: کیا ہوا؟ کہنے لگے: گھر والا آدمی چراغ کو ٹھیک کرنے کے لیے اٹھا تھا تو اس کی انگلی جل گئی ؛ پھر آگ اس کے جسم پر پھیل گئی اور وہ جل گیا۔ سدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ کی قسم! میں نے اسے دیکھا کہ وہ جل کر کوئلہ بن گیا تھا۔

مُہَنَّا بن یحی نامی ایک شخص نے حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے جب یزید کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا: ''یزید نے جو کرنا تھا کیا۔'' میں نے کہا: اس نے کیا کیا ؟ آپ نے فرمایا: اس نے مدینہ کو پامال کیا۔ امام موصوف کے بیٹے صالح نے آپ سے دریافت کیا کہ بعض لوگ ہمیں یزید کی دوستی سے متہم کرتے ہیں۔''

امام احمد رحمہ اللہ نے جواباً فرمایا: ''بیٹا جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ یزید کا دوست کب ہو سکتا ہے؟'' صالح نے کہا: ''تو پھر آپ یزید پر لعنت کیوں نہیں کرتے۔''

امام احمد نے فرمایا: ''جس پر اللہ نے لعنت کی ہے میں اس پر لعنت کیوں نہ بھیجوں؟'' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوْا أَرْحَامَكُمْ ☆ أُولَئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمٰى أَبْصَارَهُمْ﴾ (محمد: ۲۲،۲۳)

''بہت ممکن ہے اگر تم برسر اقتدار ہوئے تو زمین میں فساد برپا کرو گے اور باہمی تعلقات توڑ دو گے یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت بھیجی اور انھیں بہرا کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔''

❀ اس سے بڑا فساد اور کیا ہوگا کہ یزید نے تین دن تک مدینہ کے شہر کو لوٹا۔ وہاں کے رہنے والوں کو قید کیا۔ سات سو قریش و انصار اور مہاجرین کے بڑے بڑے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اور عام خواتین اور مردوں میں سے دس ہزار ایسے آدمیوں کو قتل کیا جن کے بارے میں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ آزاد تھے یا غلام۔ حتی کہ لوگ خون میں ڈوب گئے۔ یہاں تک کہ روضۂ رسول اور مسجد خون سے بھر گئے۔ پھر کعبہ پر منجنیق سے پتھر پھینک کر اسے منہدم کیا اور آگ لگا دی۔ نبی ﷺ فرماتے ہیں: ''حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا قاتل آگ کے ایک صندوق میں ہوگا اور اسے تمام اہل جہنم سے آدھا عذاب ہو رہا ہوگا۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں آگ کی زنجیروں سے باندھ دیے گئے ہوں گے۔ یہاں تک کہ اسے جہنم کے ایسے انتہائی گہرے گڑھے میں ڈال دیا جائے گا کہ اس کے عذاب اور بدبو سے جہنمی بھی اپنے رب سے پناہ مانگ رہے ہوں گے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ اس دردناک عذاب میں مبتلا رہے گا۔ جب بھی اس کی چمڑی جل کر ختم ہو جائے گی اللہ تعالیٰ اسے ایک دوسری چمڑی سے بدل دیں گے۔ تاکہ اسے خوب عذاب دیا جائے۔ اس عذاب سے اسے ایک پل کے لیے بھی نجات نہیں ملے گی۔ اور اسے جہنمیوں کی پیپ پلائی جائے گی۔ اور اس کے لیے ہلاکت ہو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دردناک عذاب کی۔ آپ نے یہ بھی فرمایا: ''میرا اور اللہ تعالیٰ کا شدید غضب اس شخص پر ہوگا جس نے میرے اہل کا خون بہایا اور میرے اہل بیت میں مجھے ستایا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جوابات]: اس کا جواب یہ ہے کہ: یزید پر لعنت بھیجنے کے بارے میں شرعی حکم وہی ہے جو اس کے نظائر و امثال خلفاء و ملوک کے بارے میں ہے۔ بلکہ یزید مقابلتاً ان سے بہتر ہے۔ مثلاً یزید مختار بن ابو عبید ثقفی امیر عراق سے افضل ہے۔ جس نے قاتلین حسین رضی اللہ عنہ سے انتقام لیا تھا۔ مختار کا دعویٰ تھا کہ اس پر جبرائیل علیہ السلام نازل ہوتا ہے۔ اسی طرح یزید حجاج کے مقابلہ میں بھی بہتر ہے۔ حجاج کے یزید سے بڑے ظالم اور فاسق ہونے پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے۔

تاہم یزید اور اس کے امثال کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ فاسق تھے۔ اور کسی مخصوص فاسق پر لعنت کرنا شرعاً مامور نہیں ہے۔ البتہ سنت نبوی میں مختلف گروہوں پر لعنت کرنے کی اجازت ملتی ہے، مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ چور پر لعنت کرے؛ وہ ایک انڈہ چراتا ہے اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے۔'' [1]

---

[1] البخاری ۸/ ۱۵۹؛ کتاب الحدود باب لعن السارق إذا لم یسم؛ ومسلم ۳/ ۱۳۱٤؛ کتاب الحدود؛ باب حد السرقة و نصابها. سنن النسائی ۸/ ۵۸؛ کتاب قطع السارق؛ باب تعظیم السرقة.

ایسے ہی آپ ﷺ فرمایا:

''جو انسان [دین میں] کوئی نئی چیز ایجاد کرے؛ یا کسی بدعتی کو پناہ دے'اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔'' ❶

❀ نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ سود کھانے والے پر؛ کھلانے والے پر؛ اس کی تحریر لکھنے والے پر اور اس کے لیے گواہ بننے والے پر لعنت کرے۔''❷

❀ نیز فرمایا:''حلالہ کرنے والے اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے ان پر اللہ کی لعنت ہو۔''❸

❀ اور آپ ﷺ فرمایا:''شراب پر؛شراب بنانے والے پر؛جس کے لیے بنائی جائے اس پر؛ جو اٹھا کر لے جائے؛ جس کیلئے اٹھا کر لے جائے؛ شراب پینے اور پلانے والے پر اور اسکی قیمت کھانے والے پر اللہ لعنت کی ہو۔''❹

[متعین فاسق پر لعنت کا مسئلہ:]

متعین فاسق پر لعنت کے بارے میں لوگوں کے مابین اختلاف ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ: ایسا کرنا جائز ہے۔جیسا کہ اہل علم میں سے امام أحمد بن حنبل رحمہ اللہ کی ساتھیوں کی ایک جماعت کا کہنا ہے۔جیسے ابو الفرج بن الجوزی وغیرہ۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: ایسا کرنا جائز نہیں۔ جیسا کہ امام أحمد بن حنبل رحمہ اللہ کے ساتھیوں کی دوسری جماعت ابو بکر بن عبدالعزیز وغیرہ کا خیال ہے۔امام احمد رحمہ اللہ کا معروف قول متعین شخص پر لعنت کرنے سے احتراز ہے؛ جیسے حجاج بن یوسف اور اس کے امثال ۔ یہ کہ انسان کو اس فرمان الٰہی کے مطابق کہنا چاہیے:

﴿ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ﴾ (ھود:۱۸)

''آگاہ ہو جاؤ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔''

یہ بھی صحیح بخاری کی حدیث میں ثابت ہے کہ عبداللہ بن الحمار نامی ایک شخص مے نوش تھا؛ اسے نبی کریم ﷺ کے پاس لایا جاتا؛ اور اس پر کئی بار شراب کی حد قائم کی۔ایک بار آپ کے پاس لایا گیا؛ تو ایک آدمی نے کہا: اس پر لعنت ہو؛ کتنی بار اسے نبی کریم ﷺ کے پاس لایا گیا ہے۔تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''اس پر لعنت نہ کرو؛ بیشک یہ اللہ و رسول سے محبت رکھتا ہے۔''[صحیح بخاری، کتاب الحدود، ح: ٦٧٨٠]

---

❶ مسلم ٣/ ١٣١٤؛ کتاب الأضاحي ؛ باب تحريم الذبح لغير الله تعالىٰ و لعن فاعله ؛ سنن النسائی ٧/ ٢٠٤ ؛ کتاب الضحايا باب من ذبح لغير الله عزوجل .

❷ البخاری ٧/ ١٦٩ ؛ کتاب اللباس ؛ من لعن المصور؛ مسلم ٣/ ١٢١٩؛ کتاب المساقاة ؛ باب لعن آكل الرباء و موكله ؛ سنن أبي داؤد ٢/ ٣٠٧؛ کتاب البيوع ؛ باب لعن آكل الربا و موكله؛ سنن الترمذي ٢/ ٢٩٤ ؛ کتاب البيوع باب ماجاء في آكل الربا . سنن ابن ماجة ٢/ ٧٦٤ .

❸ سنن أبي داؤد ٣/ ٤٤٥؛ کتاب النكاح ؛ باب في التحليل ؛ سنن الترمذي ٢/ ٢٩٤ ؛ کتاب النكاح ؛ باب جاء في المحلل و المحلل له . سنن ابن ماجة ١/ ٦٢٢ ؛ کتاب النكاح ؛ باب المحلل...... .

❹ سنن أبي داؤد٣/ ٤٤٥؛ کتاب الأشربة باب العنب يعصر للخمر . صحيح/ الألباني .

تو یقیناً نبی کریم ﷺ نے اس متعین شخص پر لعنت کرنے سے منع فرمایا؛ جو کہ کثرت کے ساتھ شراب پیتا تھا؛ اور آپ نے اس کی علت یہ بتائی کہ یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہے۔ حالانکہ آپ ﷺ نے مطلق طور پر شراب پینے والے پر لعنت کی ہے۔ تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مطلق پر تو لعنت کرنا جائز ہے؛ مگر اس متعین پر لعنت کرنا جائز نہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہو۔

یہ بات تو معلوم شدہ ہے کہ ہر مؤمن لازمی طور پر اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔ لیکن اسلام کا اظہار کرنے والوں میں منافق بھی تھے۔ وہ لعنتی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت نہیں کرتے تھے۔ اور جب ان میں سے کسی ایک کے حال کا علم ہو جائے تو اس پر نماز جنازہ نہ پڑھی جائے؛ فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَ لَا تُصَلِّ عَلٰۤی اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمۡ عَلٰی قَبۡرِهٖ ﴾ (التوبۃ ۸۴)

''اور ان میں سے جو کوئی مر جائے اس کا کبھی جنازہ نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا۔''

اہل سنت والجماعت میں سے جن لوگوں نے متعین فاسق پر لعنت کو جائز کہا ہے؛ ان کا کہنا ہے کہ یہ جائز ہے کہ ہم اس پر نماز جنازہ بھی پڑھیں؛ اور اس پر لعنت بھی کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ثواب کا بھی مستحق ہے؛ اور سزا کا بھی مستحق بھی۔ اس پر نماز جنازہ اس کے ثواب کے مستحق ہونے کی وجہ سے پڑھی جائے گی؛ اور اس پر لعنت اس کے عقاب کے مستحق ہونے کی وجہ سے ہوگی۔ لعنت کا مطلب ہوتا ہے رحمت سے دوری؛ اس پر نماز جنازہ پڑھنا رحمت کا سبب ہے؛ پس ایک وجہ سے اس پر رحمت ہوگی؛ اور دوسری وجہ سے اسے رحمت سے دوری حاصل ہوگی۔

یہ سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور تابعین رحمہم اللہ اور تمام اہل سنت و الجماعت کا مذہب ہے۔ اور ان کے ساتھ کچھ کرامیہ؛ مرجئہ اور شیعہ بھی شامل ہیں۔ اور بہت سارے شیعہ امامیہ اور دیگر کا بھی مذہب ہے؛ جو کہتے ہیں: فاسق ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا۔ اور جو لوگ کہتے ہیں کہ: وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا؛ جیسے خوارج اور معتزلہ اور بعض شیعہ؛ تو ان کے نزدیک ایک ہی شخص کے حق میں ثواب اور عقاب جمع نہیں ہو سکتے۔

اس بابت سنن نبویہ مشہور ہیں کہ کچھ لوگوں کو شفاعت کی بنا پر جہنم کی آگ سے نکالا جائے گا۔ اور وہ آدمی بھی نکالا جائے گا جس کے دل میں ایک ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا۔ پس اس اصول کی بنیاد پر جو لوگ یزید اور اس کے امثال پر لعنت کو جائز کہتے ہیں؛ انہیں دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے: اول: یہ کہ وہ آدمی ان فاسق اور ظالموں میں سے تھا جن پر لعنت کرنا مباح ہے؛ اور وہ اسی پر مصر مرا ہے۔ دوم: یہ ان میں سے کسی ایک متعین پر لعنت کرنا جائز ہے۔ ان کے ساتھ اختلاف رکھنے والا ان دونوں مقدمات پر طعن کرتے ہیں۔ خصوصاً پہلے مقدمہ پر۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے اس فرمان گرامی کا تعلق ہے:

﴿ اَلَا لَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِیۡنَ ﴾ (ھود:۱۸)

''آگاہ ہو جاؤ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔''

یہ وعید کی طرح ایک عام آیت ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَ سَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا﴾ [النساء ۱۰]

''بے شک جو لوگ یتیموں کے اموال ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ کے سوا کچھ نہیں کھاتے اور وہ عنقریب بھڑکتی آگ میں داخل ہوں گے۔''

اس آیت کریمہ کا تقاضا ہے کہ یہ گناہ لعنت اور عذاب کا سبب ہے۔ لیکن کبھی یہ سبب اس سے ٹکرانے والے راجح سبب کی وجہ سے ختم ہوسکتا ہے؛ جیسے توبہ؛ گناہ مٹانے والی نیکیاں؛ کفارہ بننے والی مصیبتیں وغیرہ۔ تو کسی انسان کو یہ علم کیسے حاصل ہوگا کہ یزید یا کسی دوسرے ظالم نے اس گناہ سے توبہ نہیں کی؟ یا پھر اس کی کوئی ایسی نیکیاں نہیں تھیں جو اس ظلم کے گناہ کو مٹا دیں؟ یا اس پر ایسے مصائب نہیں آئے جو اس کے گناہوں کا کفارہ بن سکیں۔ یا پھر اللہ تعالیٰ اس کا یہ گناہ معاف نہیں کریں گے؛ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ (النساء ۴۸)

''بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور وہ بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے گا۔''

صحیح بخاری میں ثابت ہے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جو پہلا لشکر قسطنطنیہ پر حملہ کرے گا؛ وہ بخشا ہوا ہے۔''❶

وہ پہلا لشکر جس نے یہ غزوہ کیا؛ اس کا امیر یزید تھا۔ لشکر کا لفظ ایک متعین عدد پر بولا جاتا ہے؛ مطلق نہیں ہوتا۔ اور اس لشکر میں موجود کسی ایک فرد کو مغفرت کا شامل ہونا اس میں موجود ہر ایک ظالم کو لعنت کے شامل ہونے سے زیادہ قوی ہے۔ کیونکہ یہ ایک خاص معاملہ ہے۔ جبکہ جیش یعنی لشکر کے لوگ متعین ہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یزید نے غزوہ قسطنطنیہ اسی حدیث کی وجہ سے کیا تھا۔ اور ہم یہ بات جانتے ہیں کہ اکثر مسلمان کسی نہ کسی طرح ظالم ہوتے ہی ہیں۔ اگر یہ دروازہ کھول دیا جائے تو اکثر مسلمان مردوں پر لعنت کرنے کی راہیں وا ہو جائیں گی۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں مردوں کی نماز جنازہ پڑھنے کا حکم دیا ہے؛ ان پر لعنت کرنے کا حکم نہیں دیا۔''

پھر مردوں پر لعنت کرنے کا مسئلہ؛ زندوں پر لعنت کی نسبت بہت ہی زیادہ خطرناک ہے۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی ممانعت ثابت ہے؛ آپ نے ارشاد فرمایا: ''مردوں کو برا بھلا نہ کہو؛ بیشک وہ اپنے اعمال تک پہنچ چکے ہیں۔''❷

---

❶ في البخاري ٤/ ٤٢ ؛ كتاب الجهاد والسير ؛ باب ما قيل في قتال الروم ؛ونص الحديث : أول جيش من أمتي يغزون البحر .

❷ البخاري ٢/ ١٠٤؛ كتاب الجنائز ؛ باب ما ينهى عن سب الأموات ؛ سنن النسائي ٤/ ٤٣ ؛ كتاب الجنائز ؛ باب نهى عن سب الأموات ؛ سنن الدارمي ٢/ ٢٣٩ ؛ كتاب السير؛ باب النهى عن سب الأموات ـ

اور ایک دوسری روایت میں ہے: آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''ہمارے مردوں کو برا بھلا نہ کہو؛ اس سے ہمارے زندوں کو تکلیف ہوتی ہے۔''

یہ جملے آپ نے اس وقت ارشاد فرمائے جب کچھ لوگ ابوجہل اور دوسرے کافروں کو برا بھلا کہہ رہے تھے؛ اور ان کے قرابت دار مسلمان ہو چکے تھے۔ جب انہیں گالی دی جائے تو قرابت داروں کو تکلیف ہوتی ہے۔

جو کچھ امام احمد رحمہ اللہ سے منقول ہے؛ تو صالح کی روایت سے جو منصوص آپ سے ثابت ہے؛ وہ آپ کا یہ فرمان ہے کہ'' آپ نے کب دیکھا کہ آپ کا والد کسی پر لعنت کرتا ہے''؟ یہ اس وقت فرمایا تھا جب آپ سے پوچھا گیا: آپ یزید پر لعنت نہیں کرتے ؟ تو آپ نے فرمایا:'' آپ نے کب دیکھا کہ آپ کا والد کسی پر لعنت کرتا ہے''؟ اور آپ سے یہ بھی ثابت ہے کہ جب کوئی انسان حجاج یا اس جیسے دوسرے ظالموں کا ذکر کرتا ؛ اور ان پر لعنت کرنا چاہتا؛ تو آپ یہ کہتے :﴿ اَلَا لَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيۡنَ﴾ (ھود:۱۸) ''آگاہ ہو جاؤ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔''اور آپ کسی خاص انسان کا نام لے کر اس پر لعنت کرنے کو ناپسند کرتے تھے۔

ایک روایت میں آپ سے یزید پر لعنت منقول ہے؛ کہ آپ نے فرمایا:''میں اس پر کیوں نہ لعنت کروں جس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے؛ اور آپ نے اس آیت سے استدلال کیا۔لیکن یہ روایت منقطع ہے؛ آپ سے ثابت نہیں ہے۔ اور یہ آیت کسی متعین پر لعنت پر دلالت نہیں کرتی۔ اور اگر وہ تمام گناہ بھی ہوتے جن کے کرنے والے پر لعنت کی گئی ہے؛ تو اس معین پر لعنت کی جاتی جس نے یہ کام کئے ہیں؛ کیونکہ جمہور عوام ان پر لعنت کرتی ہے۔ یہ پھر بھی یہ مطلق وعید کی منزلت پر ہے۔اس سے اس کا کسی متعین کے حق میں اس وقت تک ثابت نہیں ہوتا جب تک تمام شروط نہ پائی جائیں اور موانع ختم نہ ہو۔ یہی حال لعنت کرنے کا بھی ہے۔ یہ بھی اس صورت میں ہوگا جب یزید نے قطعی رحم کا کام کیا ہو۔

پھر یہ بات ان بہت سارے بنو ہاشم کے حق میں ثابت ہوتی ہیں جو طالبیین اور بنو عباس سے لڑتے رہے ہیں؛ تو پھر کیا ان تمام پر لعنت کی جائے گی؟ ایسے ہی جو کوئی اپنے کسی قریبی پر ظلم کرتا ہے؛ لازمی ہے کہ اس کے اور اس قرابت دار کے مابین کئی آباء کی شراکت ہو؛ تو کیا ان سب پر لعنت کی جائے گی۔ پھر جب ان میں سے کسی پر لعنت کی جائے تو کیا ان تمام پر لعنت کی جائے گی جس کو یہ الفاظ شامل ہوں۔ اس صورت میں تو پھر جمہور مسلمین پر لعنت کی جائے گی۔

اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان گرامی کہ:

﴿فَهَلۡ عَسَيۡتُمۡ اِنۡ تَوَلَّيۡتُمۡ اَنۡ تُفۡسِدُوۡا فِى الۡاَرۡضِ وَتُقَطِّعُوۡۤا اَرۡحَامَكُمۡ ☆ اُولٰٓـئِكَ الَّذِيۡنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمۡ وَاَعۡمٰۤى اَبۡصَارَهُمۡ﴾ (محمد: ۲۲،۲۳)

''بہت ممکن ہے اگر تم برسر اقتدار ہوئے تو زمین میں فساد برپا کرو گے اور باہمی تعلقات توڑ دو گے یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت بھیجی اور انھیں بہرا کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔''

یہ ایک عام وعید ہے جو ان تمام لوگوں کے حق میں ہے جو یہ کام کرتے ہیں۔ تو پھر بنو ھاشم نے آپس میں ایک

دوسرے پر یزید کے ظلم سے بڑے ظلم کئے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ:اس کے موجب بنی ہاشم میں سے علوی اور عباسی اور دیگران اہل ایمان لوگوں پر لعنت کی گئی ہے جواللہ تعالیٰ کی مراد ہیں [تو یہ ایک علیحدہ معاملہ ہے]۔

جہاں تک ابوالفرج ابن جوزی کا تعلق ہے کہ اس نے اپنی کتاب میں یزید پر لعنت کو مباح کہا ہے؛ تو اس پر شیخ عبد المغیث الحربی نے رد کیا ہے؛ اور کہا کہ: بلاشبہ آپ ایسا کرنے سے منع کیا کرتے تھے۔اور یہ بھی کیا گیا ہے کہ جب خلیفہ ناصر کو اطلاع ملی کہ شیخ عبدالمغیث ایسا کرنے سے منع کرتے ہیں ؛ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا؛ اور اس بارے میں سوال کیا؛ تو شیخ کو پتہ چل گیا کہ یہ سوال کرنے والا خلیفہ ہے؛ لیکن اس نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ انہیں اس کے خلیفہ ہونے کا علم ہوگیا ہے۔تو انہوں نے کہا: ''اے انسان ! میرا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کی زبانوں کو مسلمان خلفاء اور حکمرانوں پر لعنت کرنے سے روکا جائے۔ اگرایسا نہ کریں؛ اور یہ دروازہ کھول دیں تو ہمارے وقت کا خلیفہ لعنت کا زیادہ حق دار ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایسے ایسے برے کام کرتا ہے جو یزید کی برائی سے زیادہ قبیح ہیں۔حتی کہ خلیفہ نے کہا: شیخ محترم ! میرے لیے دعا کرنا؛ اورخود چلا گیا۔ ❶

یزید اور اہل حرہ کا واقعہ:

یزید نے جو کچھ اہل حرّہ ❷ کے ساتھ کیا اس کا اصل واقعہ یہ ہے کہ جب اہل مدینہ نے اس کی بیعت توڑ دی اور اس کے نائبین کو مدینہ سے نکال کر ان کے اہل خانہ کو گھیر لیا۔تو یزید نے اہل مدینہ کو پیہم پیغامات بھیج کر اطاعت کا مطالبہ کیا۔ مگرانھوں نے کچھ پروانہ کی۔ ❸ چنانچہ یزید نے مسلم بن عقبہ مری کو مدینہ بھیجا اور اسے اہل مدینہ کو ڈرانے دھمکانے کا حکم

❶ یہ واقعہ ابن رجب حنبلی نے ''الذیل فی طبقات الحنابلہ ۱/ ۳۵٦ میں عبدالمغیث الحربی کے سوانح میں ذکر کیا ہے۔اور جس کتاب کی طرف ابن تیمیہ نے اشارہ کیا ہے؛ جوابن جوزی نے عبدالمغیث کے رد میں لکھی ہے؛ اس کا نام ہے: ''الرد علی المتعصب العنید المانع من ذم یزید'' مزید دیکھیں: شذرات الذهب ٤/ ۲۷۵ ؛ البدایہ و النهایہ ۱۲/ ۳۲۸۔ امام ابن کثیر لکھتے ہیں: ''اس کی ایک کتاب یزید کے فضائل کے بارے میں ہے؛ جس میں اس نے بڑی عجیب وغریب باتیں لکھی ہیں۔

❷ یزید بن معاویہ کے ایام خلافت ٦۳ ہجری میں حرہ واقم میں یہ مشہور واقعہ پیش آیا تھا۔

❸ قاری اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے متعدد داعی مدینہ میں موجود تھے، ان کے سرخیل عبداللہ بن مطیع العدوی تھے۔ یہ داعی یزید پر طرح طرح کے بہتان لگا کر لوگوں کو اس کے خلاف بھڑکاتے رہتے تھے۔حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ابن مطیع کو راہ راست پر لانے کی بہت کوشش کی اور اسے سمجھایا کہ یزید کی بیعت توڑنا کوئی اچھا کام نہیں ہے بلکہ یہ عظیم غدر اور بے وفائی ہے۔(البخاری کتاب الفتن۔ باب اذا قال عند قوم شیئاً ثم و خرج(ح:۷۱۱۱)، صحیح مسلم۔ کتاب الامارة ، باب وجوب ملازمة جماعة المسلمین (ح:۱۸۵۱)

شہادت حق اور بندوں کی خیرخواہی کے اعتبار سے امام ابن الحنفیہ کا موقف بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے نقطۂ نظر سے کم نہیں ہے، جنھوں نے شیعی اکاذیب کی تردید کرتے ہوئے یہ سچی شہادت دی کہ آپ یزید کے ہاں اقامت گزیں رہ کر اچھی طرح اس کی سیرت و اخلاق کا بچشم خود ملاحظہ کر چکے ہیں۔آپ اس بات کے چشم دید گواہ ہیں کہ یزید پابند نماز، اعمال خیر کا حریص، متبع سنت ⇦⇦⇦

دیا یہ بھی کہا کہ اگر وہ باز نہ آئیں تو ان سے جنگ آزما ہو؛ اور تین دن تک مدینہ کو پامال کرے۔ یہی وہ بات ہے جس پر لوگوں نے یزید کے اس فعل کا انکار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب امام احمد رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ: کیا یزید سے حدیث روایت کی جاسکتی ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں' اس کی کوئی کرامت نہیں' یا یہ فرمایا: کیا یزید وہی نہیں ہے جس نے اہل مدینہ کے ساتھ کیا نہیں کیا؟''

⇦⇦⇦ اور فقیہ تھا۔(البدایہ والنہایۃ: ۸/۲۳۳)

مگر عبداللہ بن عمر اور امام ابن الحنفیہ کی شہادت حق فتنہ پردازی کے شور وشغب میں دب کر رہ گئی۔ مدینہ کی فضا اشاعت و دعایت کے شور وغل سے مسموم ہوگئی اور وہاں کے حکماء و علماء اور صلحاء جاہل اور شر پسند عوام کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ اہل ہوی کا مقصد وحید فتنہ پردازی اور شر پسندی تھا۔ اندریں حالات یزید نے سخت غلطی یہ کی کہ امراء مدینہ کو یکے بعد دیگرے معزول کرتا چلا گیا۔ چنانچہ عمر بن سعید بن العاص کو معزول کر کے اس کی جگہ ولید بن عتبہ کو مقرر کیا۔ پھر عبداللہ بن زبیر کی تدبیر سے متاثر ہو کر ولید کو معزول کر کے عثمان بن محمد بن ابی سفیان کو والی مدینہ مقرر کیا حالانکہ وہ اس منصب کے لیے موزوں نہ تھا۔ اسی دوران نعمان بن بشیر انصاری جو خود صحابی اور صحابی زادہ تھے ملک شام سے مدینہ پہنچے یہ اوّلین نومولود تھے جو اسلام کے بعد انصار کے ہاں پیدا ہوئے، یہ دمشق کے قاضی اور بہترین خطیب تھے۔ مدینہ پہنچ کر انھوں نے انصار کو اطاعت امیر اور لزوم جماعت کی تلقین کی اور فتنہ بازی سے یہ کہہ کر ڈرایا کہ تم اہل شام کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یزید نے ان کو فتنہ کے فرو کرنے کے لیے شام سے روانہ کیا تھا۔ عبداللہ بن مطیع نے نعمان بن بشیر کو مخاطب کر کے کہا: ''نعمان! تم کس لیے ہماری شیرازہ بندی کو منتشر کر کے ہم میں فساد پیدا کر رہے ہو؟''

یہ عجیب بات ہے کہ فتنہ پردازوں نے فتنہ کا نام اصلاح اور اس سے روکنے کا نام فساد مقرر کر رکھا تھا۔ یہ سن کر نعمان نے ابن مطیع کو جواباً کہا: ''جس بات کی طرف آپ دعوت دے رہے ہیں اگر وہ پوری ہوگئی تو آپ دیکھیں گے کہ مدینہ میں خون کی ندیاں بہہ رہی ہونگی اور لوگ شمشیر بکف بے دریغ ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہونگے؛ آپ خچر پر سوار ہو کر عازم مکہ ہوں گے اور یہ انصار غریب شہر کی گلیوں، مسجدوں اور اپنے گھروں کے دروازہ پر مقتول پڑے ہوں گے۔(تاریخ طبری: ۷/۴، ۵، مطبع حسینیہ)۔شیعہ کا مشہور راوی اور مؤرخ ابومخنف لوط بن یحیٰ کہتا ہے: ''لوگوں نے نعمان کی بات نہ مانی؛ تو پھر جس طرح انھوں نے کہا تھا اسی طرح ہوا۔'' نعمان بن بشیر کے نصائح کو ٹھکرانے کے بعد اہل مدینہ نے والی مدینہ عثمان بن محمد بن ابوسفیان کو نکال دیا۔ اعلانیہ یزید کی بیعت توڑ ڈالی اور مدینہ میں جس قدر بنو امیہ اور ان کے ہم خیال قریش موجود تھے سب کا محاصرہ کر لیا۔ ان کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی اور یہ سب مروان کے گھر میں جمع ہو گئے تھے، بنو امیہ نے یزید کے نام ایک خط لکھا۔ عبدالملک بن مروان یہ خط لے کر نکلا۔ حبیب بن کرہ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ حبیب کا بیان ہے کہ عبد الملک نے یہ خط دے کر اسے کہا: میں تجھے چوبیس دن کی مہلت دیتا ہوں، بارہ دن جانے کیلئے اور بارہ دن واپسی کے لیے چوبیس رات میں اسی جگہ بیٹھ کر تمہارا انتظار کروں گا۔''

حبیب کا بیان ہے کہ وہ یزید کے یہاں آیا۔ یزید ایک بیماری کی وجہ سے اپنے پاؤں پانی سے لبریز ایک طشتری میں رکھے ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ یزید نقرس کے مرض میں مبتلا تھا۔ میں نے خط پیش کیا یزید نے خط پڑھ کر استشہاد کے طور پر یہ شعر پڑھا:

لَقَدْ بَدَّلُوا الْحِلْمَ الَّذِیْ مِنْ سَجِیَّتِیْ فَبَدَّلْتُ قَوْمِیْ غِلْظَةً بِلِیَانِ

''علم وتحمل جو میری فطرت میں داخل تھا۔ لوگوں نے اسے بدل دیا اور میں نے اپنی قوم کے لیے اپنی نرمی کو سختی میں تبدیل کر دیا۔''

یزید نے اپنے ایک فوجی سپہ سالار مسلم بن عقبہ المری کو بلایا۔ مسلم بن عقبہ بڑا معمر، کمزور اور بیمار تھا، یزید نے اسے مدینہ جانے کا حکم دیا اور کہا تین شب و روز اہل مدینہ کو صلح کی دعوت دو، اگر وہ قبول کرلیں تو بہتر ورنہ ان سے جنگ کیجیے۔ جب اہل مدینہ پر غلبہ حاصل ⇦⇦⇦

یہ بات غلط ہے کہ یزید نے تمام اشراف مدینہ کو قتل کروا دیا تھا۔ مقتولوں کی جو تعداد دس ہزار بتائی جاتی ہے یہ بھی درست نہیں۔ اس بات میں بھی صداقت کا کوئی عنصر شامل نہیں کہ خون مسجد نبوی [روضہ رسول ﷺ] تک پہنچ گیا تھا۔ خون ریزی شہر سے باہر ہوئی تھی، مسجد میں نہیں مگر اس کا کیا علاج کہ شیعہ دروغ گوئی کے خوگر ہیں اور اگر کوئی بات سچی بھی ہو تو وہ اس میں جھوٹ کی آمیزش کر لیتے ہیں۔ کعبہ کو اللہ تعالیٰ نے شرف و عظمت بخشی ہے۔ اور اسے حرم قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام سے پہلے یا اسلام کے بعد کسی ایک کو بھی کعبہ کی بے حرمتی کرنے کی توفیق و قدرت نہیں دی۔ بلکہ جب ہاتھی والوں نے برائی کے ساتھ کعبہ کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ سزا دی جو کہ مشہور و معروف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝ وَّ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ﴾ [الفیل]

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟۔ کیا ان کے مکر کو بیکار نہیں کر دیا اور ان پر پرندوں کے جھنڈ پر جھنڈ بھیج دیئے۔ جو ان کو مٹی اور پتھر کی کنکریاں مار رہے تھے۔ پس انہیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر دیا۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَ الْبَادِ وَ مَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ [الحج ۲۵]

''جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکنے لگے اور اس حرمت والی مسجد سے بھی جسے ہم نے تمام لوگوں کے لئے مساوی کر دیا ہے وہیں کے رہنے والے ہوں یا باہر کے ہوں جو بھی ظلم کے ساتھ وہاں دین حق سے پھر جانے کا ارادہ کرے ہم اسے دردناک عذاب چکھائیں گے۔''

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اگر عدن کے آخری کونے پر کوئی انسان حرم میں الحاد کا ارادہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے دردناک عذاب چکھائیں گے۔'' [1]

⇦⇦ ہو جائے تو تین شب و روز تک مدینہ کو اپنے لیے مباح سمجھو۔ اس میں جو مال، اسلحہ یا خوراک ہو اس کا مالک لشکر ہوگا، تین شب و روز گزرنے کے بعد اس سے رک جاؤ، علی بن حسین زین العابدین کا ہر طرح خیال رکھو اور انھیں کوئی تکلیف نہ دو۔ انھوں نے بغاوت میں حصہ نہیں لیا۔ ان کا خط میرے پاس آچکا ہے۔'' مسلم بن عقبہ بارہ ہزار جنگجو اشخاص کی معیت میں مدینہ پہنچا۔ یہ واقعہ حرّہ واقم میں پیش آیا۔ مسلم نے ظلم و تعدی کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اسی لیے اہل مدینہ اسے مُسرِف بن عقبہ کہا کرتے تھے۔ یہ ہے واقعہ حرہ کا پس منظر! جس کی تفصیل ہم نے دانستہ ایک شیعہ مورخ کی زبانی بیان کی ہے، یہ راوی و مورخ ابومخنف ہے جو عبدالملک بن نوفل سے روایت کرتا ہے اور وہ بنوامیہ کے قاصد حبیب بن کرّہ سے نقل کرتا ہے۔ (تاریخ طبری: ۷/ ۵۔۷)

[1] رواه احمد في مسنده مرفوعاً وموقوفاً مسند أحمد طبع المعارف ٦/ ٦٥ ؛ رقم ٤٠٧١ ؛ وقال الشيخ أحمد شاكر: إسناده صحيح ؛ والحديث في مجمع الزوائد ٧/ ٧٠ ؛ وقال: رواه أحمد و أبو يعلى والبزار ۔ ورجال أحمد رجال الصحيح۔ ونقله ابن كثير في التفسير ٥/ ٧١.

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ لوگوں میں سب سے بڑے کافر قرامطی باطنی ہیں ۔ جنہوں نے حجاج کرام کو قتل کیا۔ اور انہیں قتل کر کے بئر زمزم میں پھینک دیا۔ اور حجر اسود نکال کر لے گئے ۔ جو ایک عرصہ تک ان کے پاس رہا۔ پھر واپس کر دیا گیا۔ ❶

اس طرح کے کچھ عبرت انگیز واقعات پیش آئے تھے جس کی وجہ سے انہوں نے حجرہ اسود کو واپس کیا؛ حالانکہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سب سے بڑے کافر تھے۔ مگر اس کے باوجود ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ پر مسلط نہیں کیا؛ بلکہ کعبہ ہمیشہ ہی قابل عزت اور عظمت والا رہا ہے۔

جبکہ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ بنوامیہ اور بنوعباس کے مسلمان بادشاہ اور ان کے نوابین میں سے کسی ایک نے بھی کبھی بھی کعبہ کی اہانت کا ارادہ نہیں کیا۔ اور نہ ہی یزید کے نائب نے ایسا کیا ہے۔ اور نہ ہی عبدالملک کے نائب حجاج بن یوسف نے ایسا کیا اور نہ ہی کسی اور نے ۔ بلکہ تمام مسلمان کعبہ کا احترام و تعظیم بجالاتے تھے۔ ان لوگوں کا مقصود حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کرنا تھا۔ اور منجنیق سے پتھر ان پر برسائے گئے تھے بیت اللہ پر نہیں۔ یزید نے کعبہ منہدم نہیں کیا؛ اور اسے جلانے کا قصد بھی نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہی یزید کا یہ کام تھا اور نہ ہی اس کے کسی نواب کا۔ اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کعبہ کو منہدم کر کے اسے ازسرنو پہلے سے بہتر تعمیر کیا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا۔ ❷

اس سے پہلے بات یہ ہوئی کہ ایک عورت کے ہاتھ سے ایک چنگاری اڑ کر کعبہ کے پردوں پر جا گری جس سے کعبہ کا غلاف جل گیا اور کچھ پتھر بھی پھٹ گئے ۔ پھر اس کے بعد عبدالملک نے حجاج بن یوسف کو حکم دیا کہ کعبہ کو دوبارہ اسی طرح تعمیر کیا جائے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تھا۔ سوائے اس کی بلندی کے؛ اس کی بلندی کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔ اس وقت سے لیکر آج تک کعبۃ اللہ ویسے ہی ہے۔

یہ مسئلہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے۔ ابن زبیر اور ان کے موافقین سلف صالحین کی رائے تھی کہ خانہ کعبہ کو دوبارہ اس طرح سے تعمیر کیا جائے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے اظہار کیا تھا؛ آپ نے فرمایا:

''اگر تمہاری قوم سے جاہلیت کا زمانہ قریب نہ ہوتا تو میں خانہ کعبہ کو منہدم کر دیتا اور اسے ابراہیمی بنیادوں پر تعمیر کرتا۔ بیشک جب تعمیر کعبہ کے وقت قریش کے پاس خرچہ کم پڑ گیا تو انہوں نے اسے کم کر دیا اور اس کی

---

❶ یہ واقعہ تین سو سولہ ہجری میں پیش آیا۔ عین حج کے دنوں میں قرامطی شیعہ نے بیت اللہ پر اس وقت حملہ کر دیا جب لوگ حج کا طواف کر رہے تھے۔ تاریخ میں ہے کہ انہوں نے بیت اللہ میں دس ہزار حجاج کرام کو قتل کیا؛ اور حجر اسود نکال کر لے گئے ۔ جو کہ بائیس سال تک ان کے پاس رہا۔ آخرکار تین سو اڑتیس ہجری میں ایک معاہدہ کے تحت حجرہ اسود واپس کیا' مگر اسے توڑ دیا گیا تھا۔ موجود حجر اسود میں اس کو جوڑنے کے نشانات کا بغور دیکھنے سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے ۔ شیعہ کی جانب سے قتل حجاج اور پامالی حرمت کعبہ وحرم کا یہ پہلا واقعہ نہیں ؛ بلکہ اس قسم کے بیسیوں واقعات پیش آچکے ہیں ۔ اس کی تفصیل کتاب " الحاد الخمینی في بلاد الحرمین " کے ترجمہ میں آرہی ہے۔ [دراوی جی]

❷ صحیح بخاری، کتاب الحج۔ باب فضل مکة و بنیانها(حدیث:١٥٨٦)، صحیح مسلم، کتاب الحج۔ باب نقض الکعبة و بنیانها(حدیث:٤٠٢/ ١٣٣٣)۔

پچھلی جانب بھی ایک دروازہ بنا دیتا۔'' [صحیح بخاری:ج۱ ح:۱۵۲۲]

اور ایک دوسری روایت میں آپ فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اگر تیری قوم کے لوگوں نے کفر نیا نیا چھوڑا نہ ہوتا تو میں کعبہ کے خزانے اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتا؛ اور اس کا دروازہ زمین سے ملا دیتا؛ اور حطیم کو اس میں شامل کر دیتا۔''❶

اور امام مسلم رحمہ اللہ اپنی صحیح میں حضرت عطا سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ:

''یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جس وقت کہ شام والوں نے مکہ والوں سے جنگ کی اور بیت اللہ جل گیا اور اس کے نتیجے میں جو ہونا تھا وہ ہوگیا؛ تو حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے بیت اللہ کو اسی حال میں چھوڑ دیا تا کہ حج کے موسم میں لوگ آئیں حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ وہ ان لوگوں کو شام والوں کے خلاف ابھاریں اور انہیں برانگیختہ کریں۔ جب وہ لوگ واپس ہونے لگے تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے لوگو! مجھے کعبۃ اللہ کے بارے میں مشورہ دو میں اسے توڑ کر دوبارہ بناؤں یا اس کی مرمت وغیرہ کروا دوں۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمانے لگے کہ میری یہ رائے ہے کہ اس کا جو حصہ خراب ہوگیا اس کو درست کروا لیا جائے باقی بیت اللہ کو اسی طرح رہنے دیا جائے جس طرح کہ لوگوں کے زمانہ میں تھا۔ اور انہی پتھروں کو باقی رہنے دو کہ جن پر لوگ اسلام لائے اور جن پر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث کیا گیا تو حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ: ''اگر تم میں سے کسی کا گھر جل جائے تو وہ خوش نہیں ہوگا جب تک کہ اسے نیا نہ بنالے تو اپنے رب کے گھر کو کیوں نہ بنایا جائے؟ میں تین مرتبہ استخارہ کروں گا۔ پھر اس کام پر پختہ عزم کروں گا جب انہوں نے تین مرتبہ استخارہ کرلیا۔ تو انہوں نے اسے توڑنے کا ارادہ کیا تو لوگوں کو خطرہ پیدا ہوا کہ جو آدمی سب سے پہلے بیت اللہ کو توڑنے کے لئے اس پر چڑھے گا تو اس پر آسمان سے کوئی چیز بلا نازل نہ ہوجائے تو ایک آدمی اس پر چڑھا اور اس نے اس میں سے ایک پتھر گرایا تو جب لوگوں نے اس پر دیکھا کہ کوئی تکلیف نہیں پہنچی تو سب لوگوں نے اسے مل کو توڑ ڈالا؛ یہاں تک کہ اسے زمین کے برابر کر دیا۔ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے چند ستون کھڑے کر کے اس پر پردے ڈال دیئے یہاں تک کہ اس کی دیواریں بلند ہوگئیں۔

اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرماتے ہوئے سنا کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ: ''اگر لوگوں نے کفر کو نیا نیا چھوڑا نہ ہوتا اور میرے پاس اس کی تعمیر کا خرچہ بھی نہیں ہے اگر میں دوبارہ بناتا تو حطیم میں سے پانچ ہاتھ جگہ بیت اللہ میں داخل کر دیتا اور اس میں ایک دروازہ ایسا بناتا کہ جس

❶ البخاری ۲/ ۱٤٦ ؛ کتاب الحج چباب فضل مکة و بنیانها ؛ و مسلم ۲/ ۹٦۸؛ کتاب الحج باب نقض الکعبة و بنائها . و سنن النسائی ٥/ ۱٦۹ ؛ کتاب مناسك الحج باب بناء الکعبة .

سے لوگ باہر نکلیں۔''

حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آج میرے پاس اس کا خرچہ بھی موجود ہے اور مجھے لوگوں کا ڈر بھی نہیں ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ حضرت ابن زبیر نے حطیم میں سے پانچ ہاتھ جگہ بیت اللہ میں زیادہ کر دی یہاں تک کہ اس جگہ سے اس کی بنیاد ظاہر ہوئی حضرت ابراہیم علیہ السلام والی بنیاد؛ جسے لوگوں نے دیکھا۔ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے اس بنیاد پر دیوار کی تعمیر شروع کرادی اس طرح بیت اللہ لمبائی میں اٹھارہ ہاتھ ہوگیا۔ جب اس میں زیادتی کی تو اس کا طول کم معلوم ہونے لگا پھر اس کے طول میں دس ہاتھ زیادتی کی اور اس کے دو دروازے بنائے کہ ایک دروازہ سے داخل ہوں اور دوسرے دروازے سے باہر نکلا جائے۔ تو جب حضرت زبیر رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے تو حجاج نے جواباً عبدالملک بن مروان کو اس کی خبر دی اور لکھا کہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے کعبہ کی جو تعمیر کی ہے وہ ان بنیادوں کے مطابق ہے جنہیں مکہ کے با اعتماد لوگوں نے دیکھا ہے۔ تو عبدالملک نے جواباً حجاج کو لکھا کہ ہمیں حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے رد و بدل سے کوئی غرض نہیں انہوں نے طول میں جو اضافہ کیا ہے اسے رہنے دو؛ اور حطیم سے جو زائد جگہ بیت اللہ میں داخل کی ہے اسے واپس نکال دو اور اسے پہلی طرح دوبارہ بنا دو اور جو دروازہ انہوں نے کھولا ہے اسے بھی بند کر دو پھر حجاج نے بیت اللہ کو گرا کر دوبارہ پہلے کی طرح اسے بنا دیا۔'' [صحیح مسلم: ج ۲: ح ۷۵۲]

عبداللہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ''حارث بن عبداللہ عبدالملک بن مروان کے دور خلافت میں ان کے پاس وفد لے کر گئے تو عبدالملک کہنے لگے کہ میرا خیال ہے کہ ابوخبیب یعنی ابن زبیر رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنے بغیر روایت کرتے ہیں حارث کہنے لگے کہ نہیں بلکہ میں نے خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث سنی ہے عبدالملک کہنے لگا کہ تم نے جو سنا ہے اسے بیان کرو۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''تیری قوم کے لوگوں نے بیت اللہ کی بنیادوں کو کم کو دیا ہے اور اگر تیری قوم کے لوگوں نے شرک کو نیا نیا نہ چھوڑا ہوتا تو جتنا انہوں نے اس میں سے چھوڑ دیا ہے میں اسے دوبارہ بنا دیتا۔ تو اگر میرے بعد تیری قوم اسے دوبارہ بنانے کا ارادہ کرے تو آؤ میں تمہیں دکھاؤں کہ انہوں نے اس کی تعمیر میں سے کیا چھوڑا ہے۔''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو وہ جگہ دکھائی جو کہ تقریباً سات ہاتھ تھی۔''

یہ عبداللہ بن عبید کی حدیث ہے۔ [صحیح مسلم: جلد دوم: حدیث نمبر ۷۵۳]

اور اس پر ولید بن عطا نے یہ اضافہ کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: ''میں بیت اللہ میں دو دروازے زمین کے ساتھ بنا دیتا ایک مشرق کی طرف اور ایک مغرب کی طرف۔ اور کیا تم جانتی ہو کہ تمہاری قوم کے لوگوں نے اس کے دروازے کو بلند کیوں کر دیا تھا؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض

کیا کہ نہیں آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''تکبر اور غرور کی وجہ سے کہ بیت اللہ میں کوئی داخل نہ ہو سوائے ان لوگوں کے کہ جن کے لئے یہ چاہیں۔ تو جب کوئی آدمی بیت اللہ میں داخل ہونے کو ارادہ کرتا تو وہ اسے بلاتے اور جب وہ داخل ہونے کے قرین ہوتا تو وہ اسے دھکا دیتے اور وہ گر پڑتا۔ عبدالملک نے حارث سے کہا: ''کیا تم نے یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے خود سنی ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ راوی کہتے ہیں کہ: ''عبدالملک کچھ دیر اپنی لاٹھی سے زمین کریدتا رہا اور کہنے لگا کہ کاش کہ میں نے اس کی تعمیر کو اسی حال پر چھوڑ دیا ہوتا۔'' [صحیح مسلم:ج ۲ :ح ۷۵۳]

بخاری کی روایت میں ہے؛ یزید بن رومان کہتے ہیں:

''میں ابن زبیر کے پاس موجود تھا، جس وقت انہوں نے اس کو گرا کر بنایا اور حجر اسود کو اس میں داخل کیا۔ اور میں نے بنیاد ابراہیمی کے پتھر دیکھے، جو اونٹوں کی کوہان کی طرح تھے۔ اور بیان کیا ہے کہ میں نے اندازہ کیا حجر اسود سے چھ گز یا اس کے قریب قریب تھا۔''

میں کہتا ہوں: ابن عباس اور دوسری ایک کی رائے یہی تھی کہ اسے اسی طرح باقی رہنے دیا جائے جیسے نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں تھا۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اسے ایسے ہی باقی چھوڑا تھا۔ پھر جب حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے؛ تو عبدالملک کی رائے یہ ہوئی کہ اسے دوبارہ اپنی پرانی ہیئت پر تعمیر کیا جائے۔ کیونکہ اس کا اعتقاد یہ تھا کہ جو کچھ ابن زبیر نے کیا ہے؛ اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ لیکن جب اسے یہ حدیث پہنچی تو اس نے تمنا کی تھی کہ کاش اگر وہ اسے اسی حالت پر چھوڑ دیتا۔ پھر جب رشید کی خلافت کا زمانہ تھا تو اس نے حضرت مالک بن انس رحمہ اللہ سے مشورہ لیا کہ ایسے ہی کیا جائے جیسے ابن زبیر نے کیا تھا؟ تو آپ نے مشورہ دیا کہ: ایسے نہ کیا جائے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے فعل کو ترجیح دیتے تھے۔

وہ تمام علماء اور حکمران جن کی جو بھی رائے تھی؛ وہ سبھی کعبہ مشرفہ کی تعظیم کرتے تھے۔ ان سب کا مقصد وہ کام تھا جو اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک محبوب اور افضل ہو۔ ان میں سے کسی ایک کا بھی مقصد خانہ کعبہ کی اہانت کرنا نہیں تھا۔ اور جس کسی نے یہ کہا ہے کہ: اللہ کی مخلوق میں سے کسی ایک نے خانہ کعبہ پر منجنیق سے حملہ کیا؛ یا وہاں پر گند پھینکی تو اس نے یقیناً جھوٹ بولا۔ ایسا تو نہ ہی عہد جاہلیت میں ہوا ہے؛ اور نہ ہی اسلام میں۔ اور جو لوگ کفار تھے خانہ کعبہ کا احترام نہیں کرتے تھے؛ جیسے اصحاب الفیل اور قرامطہ [شیعہ]؛ وہ بھی ایسی کوئی حرکت نہیں کر سکے۔ تو پھر مسلمان کیسے کر سکتے ہیں جو کعبہ کی تعظیم اور احترام کرنے والے لوگ ہیں۔

مزید برآں اگر یہ تصور کر لیا جائے کہ - العیاذ باللہ - کوئی خانہ کعبہ کی اہانت کا قصد رکھتا تھا؛ اور وہ ایسا کرنے پر قادر بھی تھا؛ تو پھر بھی اسے منجنیق سے پتھر برسانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ اس کے بغیر بھی تخریب کاری کرنا اس کے لیے ممکن تھا۔ جیسا کہ آخری زمانہ میں جب اللہ تعالیٰ کا ارادہ قیامت قائم کرنے کا ہوگا تو اس کے گھر کو تباہ کر دیا جائے گا۔

اور زمین سے اللہ تعالیٰ کے کلام کو اٹھالیا جائے گا۔ پس مصاحف اور دلوں میں قرآن باقی نہیں رہے گا۔ اور ایک پاکیزہ ہوا چلے گی؛ جو ہر ایمان والے مرد اور عورت کی روح قبض کرلے گی؛ اس کے بعد زمین پر کوئی خیر اور بھلائی باقی نہیں رہے گی۔ جیسے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''حبشہ سے ذوالسویقین خانہ کعبہ کو تباہ کر دے گا۔'' [1]

بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''گویا میں اس سیاہ آدمی کو دیکھ رہا ہوں جو کعبہ کے ایک ایک پتھر کو اکھاڑ پھینکے گا۔'' [2]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَ الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ الْهَدْيَ وَ الْقَلَآئِدَ ﴾

(المائدة ٩٧)

''اللہ نے کعبہ کو، جو حرمت والا گھر ہے، لوگوں کے قیام کا باعث بنایا ہے اور حرمت والے مہینے کو اور قربانی کے جانوروں کو اور پٹوں (والے جانوروں) کو۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اگر لوگ ایک سال بھی بیت اللہ کا حج ترک کردیں تو انہیں کبھی کوئی مہلت نہ دی جائے۔'' اور فرمایا: ''اگر تمام لوگ اس بات پر جمع ہو جائیں کہ بیت اللہ کا حج نہ کیا جائے تو آسمان زمین پر گر پڑے۔'' اور امام احمد رحمہ اللہ نے ''المناسک'' میں بھی یہ بات ارشاد فرمائی ہے۔ اسی لیے امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد کے اصحاب میں سے بہت سارے فقہاء نے کہا ہے: ''ہر سال حج کرنا فرض کفایہ ہے۔''

منجنیق تو وہاں پر استعمال کی جاتی ہے؛ جہاں اس کے بغیر کام نہ ہوسکتا ہو۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل طائف پر منجنیق سے سنگ باری کی تھی۔ یہ اس وقت ہوا جب وہ لوگ قلعہ میں داخل ہو کر قلعہ بند ہو گئے تھے۔ اور جن لوگوں نے ابن زبیر کا محاصرہ کیا تھا؛ اور آپ نے اپنے ساتھیوں سمیت مسجد الحرام میں پناہ لے لی تھی؛ تو انہوں نے ان حضرات پر منجنیق استعمال کی تھی؛ کیونکہ وہ اس کے بغیر ان حضرات پر قابو نہیں پاسکتے تھے۔ پھر جب حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے تو یہ لوگ مسجد حرام میں داخل ہوئے۔ بیت اللہ کا طواف کیا۔ اس سال حجاج بن یوسف نے لوگوں کے ساتھ [بطور امیر حج] حج کیا۔ اسے عبدالملک نے حکم دیا تھا کہ حج کے معاملات میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی مخالفت نہ کرے۔

اگر ان لوگوں کا ارادہ کعبۃ اللہ کے ساتھ برائی کا ہوتا تو جب انہیں قدرت حاصل ہوگئی تھی تو پھر وہ ایسا کر گزرتے۔ جیسے ابن زبیر رضی اللہ عنہما پر قابو پا کر انہیں قتل کر دیا گیا۔

---

[1] البخاري ٢/ ١٤٨ ؛ كتاب الحج ؛ باب قول الله تعالىٰ جعل الله الكعبة البيت الحرام قياماً للناس ؛ باب هدم الكعبة ؛ مسلم ٤/ ٢٢٣٢ ؛ كتاب الفتن و أشراط الساعة ؛ باب لا تقوم الساعة حتى يمر الرجل بقبر الرجل...... ".

[2] البخاري ٢/ ١٤٩ ؛ كتاب الحج ؛ باب هدم الكعبة ؛ المسند ٣/ ٣١٥ .

[قاتلین حسین رضی اللہ عنہ اور اہل سنت کا موقف]:

[اشکال]: شیعہ مصنف کی پیش کردہ حدیث کہ'' حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا قاتل آگ کے ایک صندوق میں ہوگا اور اسے تمام اہل جہنم سے آدھا عذاب ہو رہا ہوگا۔ اور اس کے ہاتھ اور پاؤں آگ کی زنجیروں سے باندھ دیے گئے ہوں گے؛ یہاں تک کہ اسے جہنم کے ایسے انتہائی گہرے گڑھے میں ڈال دیا جائے گا اس کے عذاب اور بدبو سے جہنمی میں بھی اپنے رب سے پناہ مانگ رہے ہوں گے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ اس دردناک عذاب میں مبتلا رہے گا......الخ۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: یہ ایسے شخص کا بیان کردہ جھوٹ ہے جو رسول اللہ ﷺ پر دروغ گوئی سے شرماتا نہ ہو۔ پھر اس پر یہ اضافہ کہ قاتل حسین رضی اللہ عنہ کو سب اہل جہنم سے آدھا عذاب دیا جائے گا۔ کیا جہنم کے عذاب کے آدھا ہونے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے؟ اب سوال یہ ہے کہ پھر آل فرعون؛ آل مائدہ؛ اور باقی سارے منافقین اور کفار کے لیے کیا باقی رہا؟ اور قاتلین انبیاء علیہم السلام سابقین اولین کے قاتلین کے لیے کیا باقی رہا؟ خصوصاً جب کہ حضرت عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم اجمعین کا قاتل حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قاتل سے بھی بڑے مجرم ہیں۔ [1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قاتل حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قاتل سے بڑا گنہگار ہے۔ روافض کا یہ غلو نواصب کے اس قول سے بڑی حد تک ملتا جلتا ہے جن کا عقیدہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ خوارج میں سے تھے اور انھوں نے ملت کے شیرازہ کو منتشر کرنا چاہا۔ لہٰذا نبی کریم ﷺ کی مندرجہ ذیل حدیث کی بنا پر وہ مباح الدم تھے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: '' جو شخص آکر تم میں تفریق پیدا کرنا چاہے؛ اور تمہارا معاملہ ایک انسان کے ہاتھ میں ہو تو اسے قتل کردو خواہ وہ کوئی بھی ہو۔'' [2]

اہل سنت والجماعت ان دونوں گروہوں کے غلو کو رد کرتے ہیں۔ اہل سنت کہتے ہیں کہ: حضرت حسین رضی اللہ عنہ بحالت مظلومی شہید ہوئے اور آپ کے قاتل ستم ران اور ظالم ہیں۔

وہ احادیث مبارکہ جن میں جماعت سے علیحدہ کرنے والے سے قتال کا حکم ہے؛ حضرت حسین رضی اللہ عنہ ان احادیث کا مصداق نہیں ہو سکتے اس لیے کہ آپ نے امت میں انتشار پیدا نہیں کیا تھا۔ آپ کو اس وقت شہید کیا گیا تھا، جب آپ واپس مدینہ جانے کے خواہاں تھے یا محاذ جنگ پر جانا چاہتے تھے؛ یا پھر یزید کے ہاں تشریف لانا چاہتے تھے۔ آپ جماعت میں داخل تھے۔ اور کسی طرح بھی امت میں تفریق نہیں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ایسا مطالبہ اگر کسی ادنی انسان کا بھی

---

[1] مشہور شیعہ علی بن مظاہر واسطی نے شیخ الشیعہ احمد بن اسحاق بن عبد اللہ بن سعد القمی الاحوص سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی شہادت کا دن عید اکبر کا دن ہے اور شیعہ اس دن کو یوم المفاخرہ و یوم البرکۃ و یوم الزکوٰۃ و یوم التسلیۃ اور یوم مسرت کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ احمد بن اسحاق مذکور نے اس عید کا اختراع کیا تھا۔ شیعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قاتل ابولولؤ مجوسی کو '' بابا شجاع الدین'' کے لقب سے ملقب کرتے ہیں اور آپ کے یوم شہادت کو '' عید بابا شجاع الدین'' سے موسوم کرتے ہیں۔ (تحفہ اثنا عشریہ شاہ عبد العزیز دھلوی، ص: ۲۰۸۔۲۰۹)

[2] صحیح مسلم، کتاب الامارۃ۔ باب حکم من فرق امر المسلمین و ھو مجتمع (ح: ۱۸۵۲)۔

ہوتو اسے پورا کرنا واجب ہوجاتا ہے؛ تو پھر حسین رضی اللہ عنہ جیسے انسان کی بات کیوں نہ مانی جاتی ؟ اور اگر حکومت کا طلب گار کوئی ادنی انسان بھی ہوتو پھر بھی اسے محبوس کرنا یا قید کرنا جائز نہ تھا؛ چہ جائے کہ آپ کو گرفتار کیا جاتا اور پھر قتل کر دیا گیا۔

[اہل بیت کے خون سے متعلق روایت کی حقیقت]

[اشکال] : رافضی مصنف کا قول ہے کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا:''میرا اور اللہ تعالیٰ کا شدید غضب اس شخص پر ہوگا جس نے میرے اہل کا خون بہایا اور میرے اہل بیت میں مجھے ستایا۔''

[جواب] : ذکر کردہ حدیث صحیح نہیں۔ایک جاہل انسان ہی ایسی روایت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کرنے کی جسارت کرسکتا ہے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کے خون کی ایمان وتقویٰ کی بنا پر حفاظت وعصمت؛ صرف قرابت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بل بوتے سے بہت بڑھ کر ہے۔اس لیے کہ اگر بالفرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت میں سے کوئی ایسا کام کرے جس کی وجہ سے اسے قتل کرنا یا اس کا ہاتھ کاٹنا جائز ہوتو باتفاق مسلمین ایسا کرنا جائز ہوگا۔ جیسے صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''اے لوگو! تم سے پہلے کئی قومیں ہلاک ہوئیں، جب کوئی شریف چوری کرتا تو وہ لوگ اسے چھوڑ دیتے تھے اور جب کوئی کمزور چوری کرتا تو وہ لوگ اس پر حد جاری کرتے اور قسم ہے اللہ کی! اگر فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی چوری کرتی تو میں ان کا ہاتھ بھی کاٹ ڈالتا۔''[1]

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل بیت کے عزیز ترین فرد (سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا) کے بارے میں بیان فرمایا کہ اگر وہ بھی ایسا کام کرے جس کی وجہ سے حد واجب ہوجائے تو اس پر حد نافذ کی جائے گی۔[اسلام میں مسئلہ حدود میں ادنی واعلیٰ کے مابین کوئی امتیاز سرے سے موجود ہی نہیں]۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ اگر ایک شادی شدہ ہاشمی زنا کا مرتکب ہوگا تو اسے سنگسار کیا جائے گا یہاں تک کہ وہ مرجائے۔ اس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے۔اور اگر کسی کو ظلم اور سرکشی کرتے ہوئے قتل کرے گا تو قصاص میں اسے بھی قتل کیا جائے گا؛ بھلے مقتول کا تعلق حبشہ سے ہو یا روم سے یا ترک سے یا دیلم سے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''سب مسلمانوں کا خون مساوی حیثیت رکھتا ہے۔''[2]

پس ہاشمی اور غیر ہاشمی کا خون اس وقت برابر ہے جب وہ دونوں آزاد ہوں اور دونوں مسلمان ہوں۔ اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔حق بجانب ہوتے ہوئے کسی ہاشمی یا غیر ہاشمی کے خون کے درمیان کوئی فرق نہیں۔تو پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیسے اپنے اہل خانہ کو خاص کر سکتے ہیں کہ جو ان کا خون بہائے گا اس پر اللہ تعالیٰ کا بہت سخت غضب ہوگا۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب اقامة الحدود علی الشریف والوضیع (حدیث: ٦٧٨٧، ٦٧٨٨)، صحیح مسلم، کتاب الحدود۔ باب قطع السارق الشریف وغیرہ، (حدیث:١٦٨٨)۔

[2] سنن ابی داؤد۔ کتاب الجهاد، باب فی السریة ترد علی اهل العسکر (حدیث: ٢٧٥١)۔

اللہ تعالیٰ نے کسی بھی انسان کا ناحق خون بہانے سے منع کیا ہے؛ جب کسی کو حق کے ساتھ قتل کیا گیا ہو تو پھر اس کے قتل کرنے والے پر اللہ تعالیٰ کا غضب کیونکر سخت ہوسکتا ہے؟ خواہ قتل ہونے والا ہاشمی ہو یا غیر ہاشمی ۔اگر کسی کو ناحق قتل کیا جائے ؛ تو پھر جو کوئی بھی کسی مؤمن کو جان بوجھ قتل کردے ؛ تو بدلے میں اس کا ٹھکانہ جہنم میں ہوگا؛ وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا؛ اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوا اور لعنت ہوئی ؛ اور اس کے لیے بہت بڑا عذاب تیار کررکھا ہے۔خون کی حفاظت کرنے والا اسے مباح سمجھنے والا اس میں ہاشمی اور غیر ہاشمی برابر ہیں۔پس رسول اللہ ﷺ کی طرف ایسا کلام منسوب کرنے والا یا تو منافق ہوسکتا ہے جو آپ کی ذات پر قدح کرنا چاہتا ہو یا پھر کوئی جاہل ہوسکتا ہے جو اس عدل کو نہ جانتا ہو جو عدل دیکر اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث کیا تھا۔

[رسول اللہ ﷺ کو آپ کے اہل بیت میں تکلیف دینا]

ایسے ہی رافضی کا قول: ''جس نے مجھے میرے اہل بیت میں تکلیف دی۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے اہل بیت یا حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم یا آپ کی سنت میں سے کسی کی توہین کرکے نبی کریم ﷺ کو ایذا دینا کبیرہ گناہ ہے۔

فصل:......رافضی کا اہل سنت پر الزام

[امامیہ اور اللہ تعالیٰ ؛ ملائکہ؛ انبیائے کرام علیہم السلام اور ائمہ کی تنزیہ]

[خوش فہمی اور دھوکا] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:''صاحب عقل وخرد کو غور کرنا چاہئے کہ فریقین (شیعہ واہل سنت) میں سے کون امن کا زیادہ حق دار ہے؟ وہ فریق جو اللہ تعالیٰ، ملائکہ، انبیاء اور ائمہ کو منزّہ قرار دیتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ شریعت کو مسائل ردیہ سے پاک سمجھتا ہے یا وہ فریق جو اس کے برعکس ہے؟ علاوہ ازیں اہل سنت ائمہ اثنا عشرہ پر درود و سلام نہ بھیج کر اپنی نمازوں کو برباد کرتے ہیں' حالانکہ وہ دوسرے ائمہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔یا جو ان کے برخلاف ذکر کرتے اور عقیدہ رکھتے ہیں۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب] : ہم کہتے ہیں کہ: شیعہ مصنف جس کو تنزیہ تصور کرتا ہے وہ ہمارے نزدیک اللہ ورسول کی توہین وتنقیص اور تعطیل ہے۔اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ جہمیہ کا عقیدہ ہے جو صفات کی نفی کرتے ہیں جس سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جملہ صفات کمال سے عاری اور جمادات ومعدومات کی مانند ہو۔ جب شیعہ کہتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ میں حیات وعلم وقدرت نیز کلام ومشیت اور حب وبغض ورضا وناراضگی میں سے کوئی صفت بھی پائی نہیں جاتی وہ نہ بذات خود کوئی فعل انجام نہیں دیتا اور نہ کسی تصرف پر قادر ہے؛ تو گویا وہ اسے جمادات اور ناقصات کے مشابہ قرار دیتے ہیں جو اس کی تنقیص و تعطیل ہے۔ باری تعالیٰ کی تنزیہ کا مطلب یہ ہے کہ اسے ان نقائص سے منزہ قرار دیا جائے جو کمال کے منافی ہیں۔مثلاً اسے موت، نیند، غفلت عجز وجہل اور حاجت مندی سے پاک سمجھا جائے؛ جیسا کہ قرآن مجید میں اس نے اپنی ذات کو

عیوب سے منزہ قرار دیا ہے۔اور یہ بھی فرمایا کہ اس کا کوئی نظیر و مثیل نہیں ۔پس ان دونوں چیزوں کے مابین جمع کیا جائے گا۔اللہ تعالیٰ کے لیے صفاتِ کمال کو ثابت مانا جائے گا اور جو اوصاف صفات کمال کے منافی ہیں' ان کی نفی کی جائے گی۔ اور اس کی صفات میں سے کسی بھی چیز میں اسے کسی بھی مخلوق کے ساتھ مماثلت اور تشبیہ سے منزہ قرار دیا جائے گا۔اور نقائص سے مطلق طور پر پاک مانا جائے گا۔اور صفات کمال میں اسے کسی بھی مثال سے منزہ مانا جائے گا۔

انبیاء علیہم السلام کے متعلق شیعہ کا زاویہ نگاہ:

انبیائے کرام علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے جو صفات کمال اور بلند درجات عطا کیے تھے' شیعہ انہیں سلب کرتے ہیں ۔توبہ واستغفار نیز ایک کمال سے بڑے کمال کی طرف منتقل ہو کر جو درجات عالیہ حاصل کرتے ہیں شیعہ اس کی نفی کرتے ہیں؛ اور اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے جو خبریں دی ہیں' انہیں جھٹلاتے ہیں' اور اس ضمن میں قرآن میں وارد شدہ آیات کی تحریف کرتے ہیں۔ شیعہ اس زعم باطل میں مبتلا ہیں کہ کسی شخص کا جہالت سے علم اور ضلالت سے ہدایت؛ سرکشی اور بغاوت سے کامیابی اور رشد و ہدایت کی طرف منتقل ہونا نقص وعیب ہے۔اور یہ بات نہیں جانتے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتوں میں سے اور اس کی قدرت کی عظیم تر نشانیوں میں سے ہے کہ بندوں کو نقص سے کمال کی طرف منتقل کیا جاتا ہے۔ حالانکہ جو شخص خیر وشر دونوں کا ذوق آشنا ہوتا ہے اسے اس شخص کی نسبت خیر سے زیادہ محبت اور شر سے زیادہ نفرت ہوتی ہے جو صرف خیر ہی جانتا ہو اور شر سے نا آشنا ہو۔حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:'' جب اسلام میں جاہلیت سے نا آشنا لوگ پیدا ہوں گے تو اسلام کا شیرازہ ایک ایک کڑی کر کے بکھر جائے گا۔'' [1]

باقی رہی یہ بات کہ شیعہ اپنے ائمہ کو عیوب ونقائص سے منزہ قرار دیتے ہیں تو یہ بڑی شرمناک بات ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے بھی انہیں حیاء آنا چاہیے تھی ۔خصوصاً اس امام کا پاک وصاف ہونا جو دین ودنیا میں کسی کام کا نہیں بلکہ وہ ایک معدوم چیز ہے جس کی کوئی حقیقت ہی نہیں (شیعہ کا امام غائب جس کے وہ منتظر ہیں)۔

جہاں تک شریعت کو گھٹیا درجہ کے مسائل سے منزہ قرار دینے کا تعلق ہے، ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ اہل سنت نے یک زبان ہو کر اس قسم کا ایک مسئلہ بھی بیان نہیں کیا۔ جبکہ روافض کے ہاں ایسے مسائل کی اتنی بھر مار ہے کہ اس قدر گھٹیا مسائل کسی بھی دوسرے فرقہ میں نہیں پائے جاتے۔(روافض کے ان شرمناک مسائل کیلئے دیکھئے تحفہ اثنا عشریہ باب السابع ص:۲۰۸ تا ۲۳۷ ط:سلفیہ)

---

[1] حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اوّلین شخص تھے جو اس عظیم حقیقت سے آگاہ ہوئے، آپ نے فرمایا:'' جو شخص شر سے نا آشنا ہے اس بات کا قوی احتمال ہے کہ وہ اس کا شکار ہو جائے۔'' جو لوگ فقر و فاقہ میں مبتلا رہنے کی وجہ سے زہد کی زندگی اختیار کرتے ہیں ان کا حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے زہد سے کیا مقابلہ؟ غور فرمایئے کہ کرۂ ارض کی عظیم ترین حکومت کا مال آپ کے زیر تصرف تھا اور اللہ کے سوا آپ سے کوئی حساب لینے والا بھی نہ تھا اس کے باوصف آپ فقر و زہد کی زندگی بسر کرتے تھے۔

[ائمہ پر صلاۃ وسلام کا مسئلہ]

❀ شیعہ مصنف کا قول کہ: ''اہل سنت ائمہ اثنا عشر پر درود وسلام نہ بھیج کر اپنی نمازوں کو برباد کرتے ہیں حالانکہ وہ دوسرے ائمہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔''

❀ **جواب**: اس سے شیعہ مصنف کی مراد یا تو یہ ہے کہ بارہ ائمہ پر درود بھیجنا واجب ہے۔ یا پھر نبی کریم ﷺ کے علاوہ ان میں سے کسی ایک پر یا کسی دوسرے امام پر درود بھیجنا واجب ہے۔ یا پھر اس سے مراد یہ ہوگی کہ آل نبی کریم ﷺ پر درود بھیجنا واجب ہے۔ اگر اس کی مراد پہلی بات ہے۔ تو یہ ان کی سب سے بڑی گمراہی اور شریعت محمدی سے خروج اور تجاوز ہے۔ اس لیے کہ ہم اور شیعہ سبھی جانتے ہیں اور یہ ایک بدیہی بات ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے نماز میں یا خارج از نماز بارہ ائمہ میں سے کسی امام پر درود وسلام بھیجنے کا حکم نہیں دیا اور نہ ہی آپ کے مبارک دور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے کوئی ایسے کرتا تھا۔ [نہ تابعین نے کبھی اس پر عمل کیا] اور نہ ہی کسی ایک نے نبی کریم ﷺ سے کسی صحیح یا ضعیف سند سے کوئی ایسی روایت نقل کی ہے۔ اور نہ ہی نبی کریم ﷺ کے دور میں کوئی ایک ان بارہ ائمہ میں سے کسی ایک کو اپنا امام مانتا تھا۔ چہ جائے کہ نماز میں ان پر درود بھیجنا واجب ہوتا۔ اس کے باوجود نبی کریم ﷺ [اور صحابہ کرام] کے عہد میں ادا کی جانے والی نمازیں بالکل درست تھیں' اس پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے۔ تو پھر اس کے بعد کس نے نماز میں ان لوگوں پر درود بھیجنا واجب کر دیا۔ اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں ان کی نمازوں کو باطل قرار دے دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو شخص نماز میں بارہ ائمہ پر درود و سلام بھیجنے کو ضروری سمجھتا ہے اور اس کے خیال میں بجز اس کے نماز باطل ہوتی ہے تو وہ تحریف فی الدین کا ارتکاب کرتا ہے۔ اور وہ دین محمدی کو ایسے بدل رہا ہے جیسے یہود و نصاری نے انبیاء کرام علیہم السلام کا دین بدل دیا تھا۔

❀ اگر کہا جائے کہ: ''آل محمد میں ائمہ اثنا عشر بھی داخل ہیں۔''

❀ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آل محمد میں بنو ہاشم ❶ اور امہات المومنین بھی شامل ہیں۔ ❷ اور ایک قول کے مطابق بنو مطلب بھی اس میں داخل ہیں۔ جب کہ امامیہ ان میں سے اکثر کی؛ بطور خاص بنو عباس کی مذمت کرتے ہیں؛ خصوصاً ان میں سے جو خلفاء ہو گزرے ہیں۔ حالانکہ ان کا شمار بھی آل محمد میں ہوتا ہے۔ نیز شیعہ امامیہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی مذمت کرتے ہیں۔ جب کہ جمہور بنی ہاشم ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت کرتے اور ان سے دوستی رکھتے ہیں۔ اور کوئی بھی صحیح النسب ہاشمی اس کا انکار نہیں کرتا؛ سوائے چند ایک محدود بنی ہاشم کے [جن پر جہالت کا غلبہ ہے یا جو شیعہ سے متاثر ہو گئے ہیں]۔ ورنہ اکثر بنی ہاشم جو اہل علم اور دین دار طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں وہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت رکھتے ہیں۔

❶ بنی ہاشم سے مراد بنو عباس و بنو لہب ہیں۔

❷ اس لیے کہ امہات المومنین کو اس آیت میں مخاطب کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿يَا نِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ (الأحزاب)

یہ بات ورطہ حیرت میں ڈال دیتی ہے کہ شیعہ تعظیم آل محمد کے مدعی ہیں حالانکہ انھوں نے خود بھر پور کوششیں کر کے تاتاریوں کو اسلامی دار الخلافہ بغداد پر حملہ کرنے کے لیے بلایا؛ حتی کہ ان کافروں نے اتنی بڑی تعداد میں مسلمانوں کو قتل کیا جن کی صحیح گنتی تو اللہ ہی جانتا ہے۔ ان میں ہاشمی اور غیر ہاشمی سبھی شامل تھے۔ انہوں نے بغداد اور اس کے گردونواح میں اٹھارہ لاکھ ستر ہزار سے زیادہ مسلمانوں کو قتل کیا۔ اولاد علی و عباس میں سے ہزاروں کو قتل کیا۔ ہاشمیوں کے بیوی بچوں کو قیدی بنایا۔ [1]

حقیقت میں بلا شک وشبہ یہ آل محمد ﷺ سے بغض کی نشانی ہے۔ اس لیے کہ کافروں نے یہ کام رافضیوں کی مدد سے کیا تھا۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے ہاشمی عورتوں کو قیدی بنانے کے لیے اپنی کوششیں صرف کیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کے ایسے شرمناک کارنامے ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ الغرض شیعہ جو بھی عیب دوسرے لوگوں پر لگائیں گے وہ خود ان کے اندر بڑھ چڑھ کر بدرجہ اتم موجود ہوگا۔ احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ صحابہ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! ہم آپ پر درود کیسے بھیجیں؟ آپ نے فرمایا یوں کہو:

"اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ كما صليت على إِبراهِيم وعلى آلِ إِبراهِيم إِنك حمِيد مجِيد۔ اللهم بارِك على محمد وعلى آلِ محمد كما باركت على إِبراهِيم وعلى آلِ إِبراهِيم إِنك حمِيد مجِيد۔" وفي رواية: وَعلى اَزْوَاجِهٖ و ذُرِّيّتِهٖ۔" [2]

اور صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''صدقہ محمد اور آل محمد ﷺ کے لیے حلال نہیں ہے۔'' [مسلم ۲/ ۷۵۲؛ سنن ابی داؤد۳/ ۲۰۳]

یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فضل بن عباس رضی اللہ عنہما اور عبد المطلب بن ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے مطالبہ کیا کہ ہمیں زکواۃ وصدقات وصول کرنے پر بھیجا جائے؛ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''بیشک صدقہ محمد اور آل محمد ﷺ کے لیے حلال نہیں ہے؛ یہ لوگوں کا میل کچیل ہے۔'' [مسلم ۲/ ۷۵٤]

اس سے ثابت ہوا کہ آل عباس اور بنو حارث بن عبدالمطلب آل محمد اور ذوی القربی میں شامل ہیں اور ان پر زکوۃ حرام ہے۔ اور حدیث مبارک میں یہ بھی ثابت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے ذوالقربی کے حصہ میں سے بنو مطلب بن

[1] علاوہ ازیں لاتعداد نادر کتب کے مسوّدات جن میں سے بعض کے نام بھی ہم کو معلوم نہیں دریائے دجلہ میں بہا دیے۔

[2] البخاری، کتاب احادیث الانبیاء باب(۱۰)، (ح:۳۳٦۹)، صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ علی النبی ﷺ بعد التشھد (ح:٤۰۷)۔سنن ابی داؤد۔ کتاب الصلاۃ۔ باب الصلاۃ علی النبی ﷺ بعد التشھد (ح :۹۸۲)؛ یہاں پر ان الفاظ میں درود نقل کیا گیا ہے:"اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ وَ اَزْوَاجِهٖ اُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِينَ وَ ذُرِيّتِهٖ وَ اَهْلِ بَيْتِهٖ كَمَا صَلَّيْت عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ۔" (و سنده ضعيف)۔ علماء زیدیہ میں سے قاضی شوکانی نیل الاوطار میں اس حدیث پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:'' علماء کی ایک جماعت نے اس حدیث سے اس بات پر احتجاج کیا ہے کہ ''آل'' سے ازواج واولاد مراد ہے۔''

عبد مناف کو بھی ایک حصہ دیا تھا؛ اور فرمایا تھا:

''بیشک بنو ہاشم اور بنو مطلب دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ یہ نہ ہی ہم سے جاہلیت میں جدا ہوئے اور نہ ہی اسلام میں۔'' ❶

یہ لوگ بنو عباس اور بنو حارث بن عبد المطلب کی نسبت دور کے رشتہ دار ہیں۔لیکن اس کے باوجود ان تمام کا شمار ذو القربی [قریبی رشتہ داروں] میں ہوتا ہے۔ اس بات پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ آل عباس اور بنو حارث بن عبد المطلب آل محمد اور ذوی القربی میں شامل ہیں اور ان پر زکوٰۃ حرام ہے۔اور درود میں بھی یہ لوگ شامل ہوتے ہیں۔ اور یہ لوگ خمس کے مستحق ہیں۔ جب کہ بنو مطلب بن عبد مناف کے بارے میں اختلاف ہے۔کیا ان پر بھی صدقہ حرام ہے؟ اور کیا یہ بھی آل محمد ﷺ میں داخل ہیں؟ اس بارے میں دو قول ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ سے بھی دو روایتیں منقول ہیں:

❀ پہلی روایت: ان پر صدقہ حرام ہے۔ یہ قول امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے۔

❀ دوسری روایت: ان پر صدقہ حرام نہیں ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک وہی لوگ آل محمد ﷺ ہیں جن کے بارے میں صریح حکم آیا ہے۔ یہی مسلک شریف ابو جعفر بن ابو موسی اور اس کے ساتھیوں کا ہے۔جن پر صدقہ حرام ہے وہ بنو ہاشم ہیں۔ بنو مطلب کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔

ایسے ہی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے بارے میں اختلاف ہے۔کیا ان کا شمار بھی آل محمد ﷺ میں ہوتا ہے جن پر صدقہ حرام ہے؟ امام احمد رحمہ اللہ سے اس بارے میں دو روایتیں ہیں:

ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے عتقاء [آزاد کردہ غلام اور لونڈیاں] جیسے کہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا [ان] پر صدقہ باجماع مسلمین جائز ہے۔ اگرچہ بنی ہاشم کے موالین پر بھی صدقہ حرام ہے۔بعض مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک آل محمد سے آپ کی امت مراد ہے۔صوفیہ کا ایک گروہ اس سے اتقیاء امت مراد لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے علاوہ کسی بھی متعین شخص پر نماز میں درود بھیجنے کا حکم نہیں دیا۔ اگر انسان نماز میں بعض اہل بیت پر درود بھیجے اور بعض پر نہ بھیجے؛ جیسا کہ آل عباس پر درود بھیجے اور آل علی پر نہ بھیجے؛ یا اس کے برعکس کرے؛ تو ایسا انسان شریعت کی مخالفت کرنے والا ہوگا۔تو پھر باقی تمام آل محمد کو چھوڑ کر چند متعین افراد پر کیسے درود بھیجا جاسکتا ہے؟

جمہور فقہاء کا نقطہ نظر یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کی آل پر صلوٰۃ بھیجنا نماز میں واجب نہیں ہے۔ جو لوگ درود بھیجنے کو واجب کہتے ہیں وہ صرف آپ پر درود کو کافی سمجھتے ہیں' آل پر درود بھیجنا واجب نہیں۔اور اگر آپ کی آل پر صلوٰۃ بھیجنا نماز میں واجب بھی ہوتا تو بعض آل پر یا باقی لوگوں کو چھوڑ کر چند متعین افراد پر اکتفا درست نہیں۔ بلکہ علماء کرام کا اختلاف یہ ہے کہ کیا کسی معین شخص کے حق میں درود بھیجنے یا دعا کرنے سے نماز باطل ہوجاتی ہے [یا نہیں ہوتی]؟ اس میں دو قول ہیں:

اگرچہ اس کا یہی جواب صحیح ہے کہ اس سے نماز باطل نہیں ہوتی؛ لیکن اسے ائمہ کے ساتھ خاص طور پر واجب بھی نہیں

❶ سنن أبي داؤد ۳/ ۲۰۰؛ النسائي ۷/ ۱۱۸ والمسند ٤/ ۸۱.

کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنت والجماعت نماز میں نبی کریم ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے پر درود بھیجنے کو واجب نہیں کہتے۔ نہ ہی اپنے ائمہ پر نہ ہی دوسروں کے ائمہ پر۔ اس لیے کہ اپنی طرف سے کسی ایسی چیز کو واجب کرنا گمراہ کرنے والی بدعت اور شریعت الٰہی کی مخالفت ہے۔ جیسا کہ شہادتین میں صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا ذکر ہے۔ ایسے ہی آذان، نماز اور دوسرے مواقع پر بھی ہے۔ اگر کوئی انسان شہادتین کے اقرار میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے علاوہ کسی امام کا ذکر کرے تو یہ سب سے بڑی گمراہی ہوگی۔

رافضی مصنف کا یہ قول کہ کسی معین خلیفہ پر صلوٰۃ بھیجنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے؛ باطل ہے۔ جمہور علماء کی رائے میں کسی معین شخص کے حق میں نماز میں دعا یا بد دعاء کرنے سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ کیونکہ نبی ﷺ نماز میں یوں دعا کیا کرتے تھے:

((اللهم أنجِ الوليد بن الولِيدِ وسلمة بن هِشام [وعياش بن أبِى ربِيع] والمستضعفِين مِن المؤمِنِين اللهم اشدد وطأتك على مضر واجعلها عليهِم سِنِين كسِنِي يوسف.))

''اے اللہ ولید بن ولید کو اور سلمہ بن ہشام کو اور عیاش بن ابی ربیع اور کمزور مسلمانوں کو (کفار مکہ کے پنجہ ظلم) سے نجات دے، اے اللہ اپنی پامالی (قبیلہ) مضر پر سخت کر دے، اور اس کو ان پر قحط سالیاں بنا دے، جیسے یوسف (کے زمانے) کی قحط سالیاں تھیں۔'' [صحيح بخاري:ح ٧٧٠]

اور آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے: اے اللہ رعل و ذکوان اور عصیہ پر لعنت کر۔'' [مسلم ٤/ ١٩٥٣]

دعائے قنوت میں ایک قوم کے حق میں دعائے خیر کرتے اور دوسری قوم کے افراد اور قبائل کا نام لے کر ان پر لعنت بھیجا کرتے تھے۔[1] جو کوئی اسے فاسد کہتا ہو اس کا قول بھی اسی طرح فاسد ہے جس طرح نماز میں چند متعین اشخاص پر درود کو واجب کہنے والے کا قول فاسد ہے۔

اہل سنت والجماعت نہ ہی اس کو حرام کہتے ہیں اور نہ ہی واجب قرار دیتے ہیں۔ بلکہ وہ اسی چیز کو واجب سمجھتے ہیں جسے اللہ اور اس کے رسول نے واجب قرار دیا ہو اور اسے حرام کہتے ہیں جسے اللہ اور اس کے رسول نے حرام کہا ہو۔

اگر [رافضی مصنف کی] مراد یہ ہے کہ نماز میں آل محمد ﷺ پر درود بھیجنا واجب ہے کسی دوسرے پر نہیں۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ: پہلی بات تو یہ ہے کہ: اس مسئلہ میں علماء کرام کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے۔

اکثر لوگوں کا مذہب یہ ہے کہ نماز میں نبی کریم ﷺ یا آپ کی آل پر درود پڑھنا واجب نہیں۔ یہ امام ابوحنیفہ ؛ مالک اور ایک روایت میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ امام طحاوی نے دعوی کیا ہے کہ قدیم میں اس پر اجماع ہے۔

[1] صحيح بخاري، كتاب الاذان، باب (١٢٦)، (حديث:٧٩٧، ٨٠٤، ٤٥٦٠)، صحيح مسلم، كتاب المساجد، باب استحباب القنوت فى جميع الصلوات (حديث: ٦٧٥ ، ٦٧٦)۔

دوسرا قول یہ ہے کہ: نماز میں نبی کریم ﷺ یا آپ کی آل پر درود پڑھنا واجب ہے۔ یہ امام شافعی کا اور دوسری روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ پھر اس روایت کی بنا پر مزید اختلاف ہے؛ کیا یہ درود رکن ہے یا واجب ہے جو کہ بھول جانے کی صورت میں سجدہ کرنے سے ساقط ہو جاتا ہے؟ امام احمد رحمہ اللہ سے اس بارے میں دو روایتیں ہیں۔

پھر جن لوگوں نے نماز میں نبی کریم ﷺ یا آپ کی آل پر درود پڑھنا واجب قرار دیا ہے؛ وہ کہتے ہیں: یہ درود ان ہی الفاظ میں واجب ہے جو احادیث میں منقول ہیں۔ امام احمد کا ایک قول یہی ہے۔ اس صورت میں آل محمد پر درود واجب ہو جاتا ہے۔ اور بعض علماء کرام رحمہم اللہ الفاظ کی قید کو واجب قرار نہیں دیتے۔ جیسا کہ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے مذہب میں بھی معروف ہے۔ اس صورت میں آل پر درود پڑھنا واجب نہ ہوگا۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ اس مسئلہ میں اختلاف بڑا مشہور ہے تو پھر کہا جائے گا کہ اگر نماز میں آل محمد ﷺ پر درود پڑھنا واجب بھی مان لیا جائے تو یہ درود تمام آل محمد کو شامل ہوگا؛ صرف ان کے صالحین یا ائمہ معصومین کے لیے خاص نہیں ہوگا [جیسا کہ رافضیوں کا خیال ہے]۔ بلکہ یہ تمام لوگوں کو شامل ہوگا۔ جیسا کہ اگر مسلمان مردوں اور عورتوں کے لیے اور اہل ایمان مردوں اور عورتوں کے لیے دعا کی جائے تو اس میں وہ تمام لوگ شامل ہوں گے جو ایمان یا اسلام میں داخل ہوئے ہیں۔ عام اہل ایمان کے لیے یا عام اہل بیت کے لیے دعا کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان میں سے ہر ایک نیک اور متقی ہو۔ بلکہ دعا میں اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے فضل و احسان مانگا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہر ایک کے لیے طلب کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں آل محمد ﷺ کا حق زیادہ ہے' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آل محمد ﷺ کے اس امت پر کچھ حقوق ہیں جن میں دوسرے لوگ ان کے ساتھ شریک نہیں ہیں۔ آل محمد ﷺ زیادہ محبت و موالات کے مستحق ہیں۔ جس محبت کے سارے قریشی قبائل مستحق نہیں۔ ایسے ہی قریش اس محبت کے مستحق ہیں جس کے باقی عرب قبائل مستحق نہیں' اور عرب اس محبت کے مستحق ہیں جس کی مستحق باقی اولاد آدم نہیں۔ یہ ان لوگوں کا مذہب جو عربوں کو باقی لوگوں پر فضیلت دیتے ہیں؛ اور قریش کو سارے عربوں پر اور بنی ہاشم کو سارے قریش پر فضیلت دیتے ہیں۔ جیسا کہ امام احمد اور دوسرے ائمہ رحمہم اللہ کا مذہب ہے۔

نصوص اس کی صحت پر دلالت کرتی ہیں جیسا کہ حدیث میں آتا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰـهَ اصْطَفَى كِنَانَةَ مِنْ وَلَدِ اسْمٰعِيلَ ، وَاصْطَفَى قُرَيْشاً مِّنْ كِنَانَةَ ، وَاصْطَفَى مِنْ قُرَيْشٍ بَنِي هَاشَمٍ ، وَاصْطَفَانِي مِنْ بَنِي هَاشَمٍ)) [1]

''بیشک اللہ تعالیٰ نے اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد سے کنانہ کو، اور کنانہ کی اولاد سے قریش کو چن لیا تھا، اور قریش

[1] مسلم کتاب الفضائل؛ باب: فضل نسب النبي ﷺ ح: ٤٣١٨۔ صحيح ابن حبان؛ كتاب التاريخ' ذكر اصطفاء الله جل و علا صفيه؛ ح: ٦٤٢٤۔

سے بنی ہاشم کو، اور بنی ہاشم میں سے مجھے چن لیا ہے۔''

دوسری حدیث میں آتا ہے: ''لوگ ایسے ہی کان کی طرح ہیں جیسے سونے اور چاندی کی کانیں ہوتی ہیں۔ان میں سے جو جاہلیت میں اچھے لوگ تھے وہ اسلام میں بھی اچھے ہیں؛ اگر وہ دین کی سمجھ حاصل کریں۔'' [1]

ایک طائفہ کا خیال ہے کہ ان اجناس کو ایک دوسرے پر فضیلت نہ دی جائے۔ یہ اہل کلام کی ایک جماعت کا قول ہے؛ جیسے قاضی ابوبکر بن الطیب ؛ اور دیگر حضرات۔اور قاضی ابویعلی نے یہی قول المعتمد میں نقل کیا ہے۔اور شعوبیہ کے مذہب میں بھی یہی قول ہے۔ یہ اہل بدعت کے اقوال میں سے ایک ضعیف قول ہے۔جیسا کہ اپنی جگہ پر یہ مسئلہ تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔اور ہم نے بیان کیا ہے مجمل کی مجمل پر تفضیل کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ فرد کو بھی فرد پر فضیلت حاصل ہو۔جیسا کہ قرن اول کی قرن ثانی پر فضیلت ؛ اور قرن ثانی کی قرن ثالث پر فضیلت بھی اس کا تقاضا نہیں کرتی۔ بلکہ قرن ثالث میں بہت سارے ایسے لوگ ہیں جو کئی امور میں قرن ثانی کے بہت سارے لوگوں سے بہت بہتر ہیں۔

بیشک علمائے کرام رحمہم اللہ کا اختلاف غیر صحابہ کے بارے میں ہے؛ ان میں سے کون ایک دوسرے سے بہتر ہے؟ اس میں دو قول ہیں۔اور اس میں کوئی شک نہیں حکم شریعت خصوصی طور پر قریش کے حق میں ثابت ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ حاکم ان میں سے ہوگا؛ دوسرے لوگوں میں سے نہیں ہوگا۔اور بنی ہاشم کی یہ خصوصیت ثابت ہے کہ ان پر صدقہ حرام ہے۔ایسے ہی یہ لوگ اکثر علماء کے نزدیک مالِ فئے کے مستحق ہیں۔اور اس میں ان کے ساتھ بنو مطلب بھی شمار ہوتے ہیں۔پس ان پر درود کا تعلق اسی باب سے ہے۔ان کے خاص احکام میں ہیں جن میں ان کے حقوق اور ان کے فرائض بیان ہیں۔ یہ احکام ان میں سے ہر ایک کے لیے ثابت ہیں بھلے وہ نیک نہ بھی ہو؛ گنہگار اور بدکار بھی ہو۔

رہ گیا یہ معاملہ کہ اہل قرابت میں ثواب اور عقاب میں اسی ترتیب کو برقرار رکھنا؛ اور اللہ تعالیٰ کا کسی متعین شخص کی تعریف کرنا؛ اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا کرامت والا ہوں؛ اس نسب پر مؤثر نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس میں مؤثر ایمان اور عمل صالح ہوتا ہے؛ جو کہ تقوی سے آتا ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ﴾ (الحجرات ۱۳)۔

''بیشک اللہ کے ہاں تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے؛ وہ سب سے بڑا متقی ہو۔''

صحیح بخاری میں یہ ثابت شدہ ہے؛ بیشک رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا گیا:

''یا رسول اللہ! سب سے زیادہ شریف کون ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔'' صحابہ نے عرض کیا کہ: ''ہم آپ سے اس کے متعلق نہیں پوچھتے۔''

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''پھر اللہ کے نبی یوسف بن نبی اللہ بن نبی اللہ بن خلیل اللہ [سب سے زیادہ شریف ہیں]۔''

[1] البخاری ٤/ ١٥٢؛ مسلم ٤/ ١٩٥٨ .

صحابہ نے کہا کہ: ''ہم اس کے متعلق بھی نہیں پوچھتے۔'' نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اچھا عرب کے خاندانوں کے متعلق تم پوچھنا چاہتے ہو۔ سنو جو جاہلیت میں شریف تھے اسلام میں بھی وہ شریف ہیں جبکہ دین کی سمجھ انہیں آ جائے۔'' ❶

اور صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جسے اس کا علم پیچھے چھوڑ دے؛ اسے اس کا نسب آگے نہیں بڑھا سکتا۔'' ❷

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین کی تعریف کی ہے؛ اور یہ خبر دی ہے کہ وہ ان سے راضی ہو گیا ہے؛ جیسا کہ عمومی طور پر اہل ایمان کی تعریف بھی کی ہے۔ پس کسی انسان کا مؤمن ہونا ایسا وصف ہے جس کی بنا پر وہ اللہ کے ہاں مدح اور ثواب کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اور ایسے ہی کسی انسان کا ان لوگوں میں سے ہونا جو نبی کریم ﷺ پر ایمان لائے؛ اور آپ کا ساتھ اختیار کیا؛ یہ ایسا وصف ہے جس پر مدح اور ثواب کا استحقاق بنتا ہے۔ اور وہ اس صحبت میں مختلف ہوتے ہیں۔ جو کوئی اس صحبت میں سب سے زیادہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر قائم رہنے والا ہو؛ وہ دوسروں سے افضل ہے۔ جیسے سابقین اولین اپنے علاوہ دوسرے لوگوں سے افضل ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے فتح مکہ سے قبل اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا؛ اور جہاد کیا۔ ان میں اہل بیعت رضوان بھی شامل ہیں۔ ان کی تعداد چودہ سو سے زیادہ تھی۔ ان میں سے کوئی ایک بھی جہنم میں نہیں جائے گا۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں نبی کریم ﷺ سے یہ بات ثابت ہے۔ [سبق تخریجہ]

جہاں تک صرف قرابت داری کا تعلق ہے؛ تو نہ ہی اس پر کوئی ثواب مرتب ہوتا ہے اور نہ ہی عقاب؛ اور نہ ہی کسی ایک کی صرف اس وجہ سے تعریف کی جا سکتی ہے۔ اور یہ اس کے بھی منافی نہیں ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ بعض اجناس اور قبائل بعض دوسروں سے افضل ہوتے ہیں۔ اس تفضیل کا وہی معنی ہے جو رسول اللہ ﷺ نے بیان کیا ہے؛ فرمایا: ''لوگ کانوں کی طرح ہوتے ہیں؛ جیسے سونے اور چاندی کی کانیں ہوتی ہیں؛ جو لوگ ان میں سے جاہلیت میں بہترین تھے؛ وہ اسلام میں بھی بہترین ہیں جب وہ دین کی سمجھ حاصل کر لیں۔''

پس زمین میں ہی سونے اور چاندی کی کانیں ہوتی ہیں۔ سونے کی کان بہترین ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اس میں ان دونوں میں سے افضل ترین چیز پائے جانے کا امکان ہوتا ہے۔ اگر سونے کی کان ختم ہو جائے؛ اس سے کچھ بھی نہ نکلے؛ تو اس سے چاندی کی کان افضل ہوتی ہے؛ جس سے کچھ نہ کچھ نکل رہا ہوتا ہے۔

ایسے ہی عربوں کی بھی اجناس ہیں۔ اور قریش میں ہاشم بھی ہیں۔ اور قریش میں یہ امید لگائی جاتی ہے کہ دوسروں

❶ البخاري ٤/ ١٤٠؛ كتاب الأنبياء؛ باب قوله تعالىٰ واتخذ الله ابراهيم خليلا.

❷ مسلم ٤/ ٢٠٧٤؛ كتاب الذكر والدعاء؛ باب فضل الاجتماع على تلاوة القرآن و على الذكر؛ سنن الترمذي ٤/ ٢٦٥؛ كتاب القرآن؛ باب منه ٣۔ و سنن ابن ماجه ١/ ٨٢.

سے بڑھ کر خیر و بھلائی پائی جائے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ بنی ہاشم میں سے تھے۔ قریش میں کوئی دوسرا آپ کے ہم پلہ نہیں تھا۔ چہ جائے کہ پورے عرب یا غیر عرب میں آپ کی کوئی نظیر پائی جاتی۔ اور سابقین اولین عرب میں ایسے لوگ پائے جاتے تھے؛ جن کی نظیر باقی تمام لوگوں میں نہیں پائی جاتی تھی۔

پس یہ ضروری ہے کہ اس صنف میں وہ افضل پایا جائے جس کی نظیر مفضول میں موجود نہ ہو۔ اور کبھی مفضول میں کوئی ایسا پایا جاتا ہے جو فاضل کے بہت سارے لوگوں سے افضل ہو۔ جیسا کہ وہ انبیائے کرام علیہم السلام جو عرب میں سے نہیں تھے؛ وہ ان عرب سے افضل ہیں جو انبیاء نہیں تھے۔ اور مؤمن اور متقی غیر قریش میں سے؛ ان قریش سے افضل ہیں جو ایمان و تقوی میں ان کے ہم مثل نہیں ہیں۔ اور ایسے ہی قریش میں سے متقی اور مومن ان بنی ہاشم سے افضل ہیں جو ایمان و تقوی میں ان جیسے نہیں ہیں۔

اس باب میں معتبر یہی وہ بنیادی اصول ہے جس نے مطلق طور پر نسب کی وجہ سے فضیلت کے معیار کو کالعدم کر دیا تھا۔ اور یہ گمان بھی کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کے نسب کی وجہ سے ایمان و تقوی میں اس کے ہم مثل پر فضیلت دیتے ہیں۔ کجا کہ کوئی انسان ایمان و تقوی میں دوسروں سے بڑھ کر ہو۔ یہ دونوں قول خطا پر مبنی اور متقابل ہیں۔ بلکہ نسبت کی وجہ سے فضیلت ایک اچھی چیز ہے؛ اور اس میں سبب کا گمان پایا جاتا ہے۔ اور ایمان و تقوی کی فضیلت جو اس کے حقائق اور مقاصد کو سچ ثابت کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ پہلی فضیلت اس وجہ سے ہے کہ وہ ایک سبب اور نشانی ہے۔ اس لیے کہ اجمالی طور پر باعتبار عدد یہ ان سے افضل ہیں۔ اور دوسری فضیلت اس لیے کہ اس کا مقصود حقیقی اور منتہیٰ ہے۔ اور جو کوئی اللہ تعالیٰ سے جتنا زیادہ ڈرنے والا ہو؛ وہ اللہ کے ہاں اتنی زیادہ عزت والا ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب اس چیز پر ملتا ہے۔ اس لیے کہ یہ وہ حقیقت ہے جو پائی گئی ہے۔ تو یہاں پر کسی حکم کو محض گمان کے ساتھ معلق نہیں رکھا گیا۔ اور اس لیے کہ اللہ تعالیٰ چیزوں کی حقیقی ماہیت کو جانتے ہیں۔ پس اسباب اور علامات سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

اسی لیے سابقین اولین سے اللہ تعالیٰ کی رضا مندی آل محمد پر صلاۃ سے افضل ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان سے اپنی رضامندی کی خبر دیدی ہے۔ پس یہ رضا حاصل ہو چکی؛ جب کہ صلاۃ؛ ایک استدعا اور سوال ہے؛ جو کہ ابھی پورا نہیں ہوا۔ اور محمد ﷺ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے آپ پر درود پڑھتے ہیں۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ﴾ (الاحزاب ۵۶)

''بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔''

تو آپ کی فضیلت محض آپ کی امت کے آپ پر درود پڑھنے کی وجہ سے نہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے خصوصی طور پر آپ پر درود پڑھتے ہیں۔ اگرچہ عمومی طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے عام اہل ایمان پر بھی درود پڑھتے ہیں۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ [احزاب ۴۳]

''وہی ہے جو تم پر صلوٰۃ بھیجتا ہے اوراس کے فرشتے، تاکہ وہ تمھیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لائے۔''

ایسے ہی لوگوں کو خیر و بھلائی کی بات سکھانے والوں پر بھی درود پڑھتے ہیں؛ جیسا کہ حدیث میں ہے:

''بیشک اللہ تعالیٰ اوراس کے فرشتے لوگوں کو خیر و بھلائی کی بات سکھانے والوں پر درود پڑھتے ہیں۔''[1]

پس جب حضرت محمد ﷺ ایمان اورلوگوں کو خیر کی تعلیم اوران امور کی وجہ سے سب سے اکمل تھے جن کی بنا پر درود پڑھا جاتا ہے؛ تو آپ پر درود پڑھنا خبر اور امر ہر اعتبار سے افضل تھا۔ یہ ایسی خصوصیت ہے کہ اس جیسی خصوصیت آپ ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے میں نہیں پائی جاتی۔

پس بنو ہاشم کے بھی کچھ حقوق ہیں؛ اوران کے فرائض بھی ہیں۔ اور جب اللہ تعالیٰ کسی انسان کو ایسا حکم دیتے ہیں جیسا حکم کسی دوسرے کو نہیں دیا؛ تو وہ محض اس وجہ سے دوسروں سے افضل نہیں ٹھہرتا۔ بلکہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرے گا تو وہ اس اطاعت گزاری کی وجہ سے دوسروں سے افضل ہوگا۔ جیسا کہ حکمران؛ اور دیگر وہ لوگ جن کو وہ حکم دیے گئے ہیں جو کسی دوسرے کو نہیں دیے گئے۔ پس ان میں سے جو کوئی اللہ کی اطاعت گزاری کرے گا وہ افضل ہوگا۔ اس لیے کہ اس کی اطاعت اکمل ہے۔ اور جو کوئی ان میں سے اطاعت گزاری نہ کرے؛ تو کوئی دوسرا جو ایمان اورتقوی میں بڑھ کر ہو؛ اس سے افضل ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کو باقی تمام لوگوں پر فضیلت حاصل تھی۔ اورامہات المؤمنین میں سے جن کو فضیلت حاصل ہے؛ انہیں باقی تمام خواتین پر فضیلت حاصل ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے خلفائے راشدین کو وہ احکام دیے تھے جو دوسرے لوگوں کو نہیں دیے گئے تھے۔ پس انہوں نے اعمال صالحہ اس طرح بجا لائے کہ کسی دوسرے میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ تو اس وجہ سے وہ افضل قرار پائے۔ ایسے ہی ازواج مطہرات؛ جن سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا٥ وَ مَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَ اَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا٥﴾ (الاحزاب ۳۰۔ ۳۱)

''اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو کھلی بے حیائی (عمل میں) لائے گی اس کے لیے عذاب دوگنا بڑھایا جائے گا اور یہ بات اللہ پر ہمیشہ سے آسان ہے۔ اورتم میں سے جو اللہ اوراس کے رسول کی فرماں برداری کرے گی اور نیک عمل کرے گی اسے ہم اس کا اجر دوبار دیں گے اور ہم نے اس کے لیے باعزت رزق تیار کر رکھا ہے۔''

الحمد للہ کہ یہ امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن یقیناً اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت گزار اورنیک اعمال کرنے والی تھیں۔ پس اسی لیے دوہرے اجر کی مستحق ٹھہریں۔ پس احکام الٰہی کی اطاعت کی وجہ سے ان کو یہ افضلیت حاصل ہوئی؛

[1] سنن الترمذي ٤/ ١٥٤ ؛ كتاب العلم ؛ باب في فضل الفقه على العبادة ؛ صححه الألباني .

صرف حکم کی وجہ سے نہیں۔ اور العیاذ باللہ- اگر یہ مان لیا جائے کہ ان میں سے کوئی ایک فحاشی کا ارتکاب کرتی تو اسے عذاب بھی دوگنا کر کے دیا جاتا۔

حضرت علی بن حسین رحمہ اللہ سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ اس حکم کو تمام اہل بیت کے لیے عام قرار دیتے تھے۔ اور یہ کہ ان میں سے کسی ایک کی سزا بھی دوگنی ہی ہوگی۔ اور اس کی نیکیاں بھی دوگنی ہوں گی۔ جیسا کہ مسجد الحرام میں جو کچھ کیا جائے اس پر ثواب یا عقاب دوگنا ہوتا ہے۔ اور جو کوئی رمضان میں کوئی کام کرے تو وہ بھی دو چند کر دیا جاتا ہے۔ اسی پر باقی چیزوں کو قیاس کیا جائے۔

ان تمام باتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو عزت صرف تقوی کی بنیاد پر ملتی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''نہ ہی کسی عربی کو عجمی پر اور نہ کسی عجمی کو عربی پر؛ اور نہ کسی کالے کو سفید پر اور نہ ہی کسی سفید کو کالے پر کوئی فضلیت حاصل ہے؛ مگر تقوی کی بنیاد پر۔ تمام لوگ حضرت آدم کی اولاد ہیں۔ اور آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔'' [مسند ۵/۴۱۱]

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

''بیشک اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کے کبر وغرور اور آباء و اجداد پر فخر کرنے کو تم سے دور کر دیا ہے۔ انسان دو ہی قسم کے ہوتے ہیں (۱) مومن متقی (۲) فاسق و فاجر۔ [دیکھیں سابقہ تخریج]

پس آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا مسلمانوں پر ان کا حق ہے؛ اور یہ نسب ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سبب ہے۔ اس لیے اس سے واجب یہ ہوتا ہے کہ بنی ہاشم میں ہر ایک پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کی اتباع میں درود بھیجنا لازم ہے؛ وہ اس سے افضل ہو جس پر درود نہیں پڑھا جاتا۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ﴾ (التوبة ١٠٣)

''ان کے مالوں سے صدقہ لے، اس کے ساتھ تو انھیں پاک کرے گا اور انھیں صاف کرے گا اور ان کے لیے دعا کر، بے شک تیری دعا ان کے لیے باعث سکون ہے۔''

اور صحیحین کی حدیث میں ابن ابی اوفی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب لوگ صدقات لیکر آتے تو آپ ان پر درود پڑھتے۔ اور میرے والد صاحب بھی آپ کی خدمت میں صدقات لیکر حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا: ((اللهم صل علی آل أبی أوفی)) ...... ''اے اللہ آل ابی اوفی پر رحمتیں نازل فرما۔''

اس حدیث میں ان لوگوں کی فضیلت کا اثبات ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں صدقات لیکر آتے تھے؛ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر درود پڑھا کرتے تھے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو کوئی بھی آپ کی خدمت میں اپنے فقر کی وجہ سے

صدقات لیکر حاضر نہیں ہوا؛ وہ اس سے کم مرتبہ کا ہو جو صدقہ لیکر آیا؛ اور آپ نے اس پلا صلاۃ / درود پڑھا۔ بلکہ کبھی وہ ان فقراء مہاجرین میں سے بھی ہوسکتا ہے جن کے پاس صدقہ لانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا تھا؛ مگر وہ ان لوگوں سے افضل ہو جو صدقہ لیکر آئے ؛ اوران پر درود بھی پڑھا گیا۔ اور کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ صدقہ کا مال لینے والا ان لوگوں سے افضل ہو جو صدقہ دینے والے ہیں۔ اور کبھی صدقہ دینے والا اس کے وصول کرنے والے بعض لوگوں سے افضل ہوسکتا ہے: کیونکہ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے۔

پس کسی نوع کی فضیلت سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ انسان مطلق طور پر افضل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اغنیاء میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو جمہور فقراء سے افضل تھے۔ اور فقراء میں ایسے لوگ موجود تھے جو جمہور اغنیاء سے افضل تھے۔ پس حضرت ابراہیم ؛ داؤد؛ اور سلیمان اور یوسف علیہم السلام اور ان کے امثال اکثر فقراء سے افضل ہیں اور حضرت یحی اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام اغنیاء سے بہت زیادہ افضل تھے۔

عمومی طور پر اعتبار تقوی کا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ﴾ [الحجرات ۱۳]

''بیشک اللہ کے ہاں تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے؛ جو تم میں سے بڑا متقی ہو۔''

پر ہر وہ انسان جو زیادہ متقی ہو؛ وہ مطلق طور پر افضل ہوگا۔ اور جب دو انسان تقوی میں برابر ہوں تو وہ فضیلت میں بھی برابر ہوں گے۔ بھلے وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک غنی ہو یا فقیر۔ یا ایک غنی ہو اور دوسرا فقیر۔ یا ایک عربی ہو اور ایک عجمی ؛ اور یا دونوں عربی یا دونوں عجمی ہوں؛ یا دونوں قریشی ہوں؛ یا دونوں ہاشمی ہوں؛ یا یہ کہ ایک کسی ایک صنف سے تعلق رکھتا ہو؛ اور دوسرا دوسری صنف سے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ان میں سے کسی ایک میں فضیلت کا وہ سبب پایا جاتا ہے جس کا دوسرے میں گمان نہیں کیا جاسکتا۔ جب واقعی ایسے ہی ہو؛ تو اس میں حقیقی فضیلت پائی جاتی ہے جو کہ دوسرے میں نہیں پائی جاتی۔ بھلے وہ اس کے حاصل کرنے پر قادر بھی ہو۔ پس عالم جاہل سے بہتر ہوتا ہے؛ اگر چہ جاہل بھی علم حاصل کرنے پر قادر ہوتا ہے [مگر اس نے علم حاصل تو نہیں کیا]۔ اور نیکوکار فاجر سے افضل ہوتا ہے۔ اگر چہ فاجر انسان بھی نیکی کے کام کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اور کمزور مؤمن طاقت ور کافر سے بہتر ہوتا ہے؛ بھلے وہ بھی ایمان لانے پر کمزور مؤمن سے بڑھ کر قدرت رکھتا ہو۔ اس تفصیل سے وہ شبہ ختم ہو جاتا ہے جو اکثر طور پر اس جیسے امور میں پیش آتا ہے۔

[چوتھی جلد؛ تحقیق رشاد سالم والی ختم ہوئی]

❀❀❀❀

ضروری نوٹس